مئی ۱۹۸۸ء

2.5

اِس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے کے عنوان سے مستعار ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان بھیجتے ہوئے شاعر یا افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں۔

اِس صفحے کے لیے قارئین بھی ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہوں۔ پسند آنے والی تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی اور انھیں ان کا معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۳۴۴۸

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۱ — فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — مئی ۱۹۸۸ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی
خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے شمع آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

پچھلے دنوں ایک معروف روسی ادیب اور مصوّر اوگینی بریژیکوف دلّی آئے تو اُردو اکادمی نے ان کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا اہتمام کیا۔ بریژیکوف صاحب نے اس تقریب کے شرکا کو خطاب کرتے ہوئے جو باتیں کہیں وہ روسی سماج میں آزاد خیالی کے اس نئے میلان کو ظاہر کرتی تھیں جو میخائیل گورباچوف کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہاں سامنے آیا ہے۔ بریژیکوف صاحب نے جو کچھ کہا آج سے چند سال پہلے تک کوئی روسی وہ سب کچھ اپنے ملک سے باہر تو کیا اندرونِ ملک بھی نہیں کہہ سکتا تھا اور اگر کوئی کہہ بھی گزرتا تو بلا تامّل اسے سامراجی ایجنٹ قرار دے دیا جاتا۔ اپنے ملک کو سوشلزم کی راہ پر تیزی سے گامزن کرنے کے لیے اسٹالن نے جبر کے ہتھیار سے کام لیا، اختلاف رکھنے والوں کی آواز کا گلا گھونٹا، ادیبوں اور شاعروں کو اپنے اقدامات کی جا و بے جا مدح سرائی پر مجبور کیا اور جو ادیب اور شاعر اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے انھیں نشر و اشاعت کی سہولتوں سے محروم کر دیا گیا؛ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں اب تک سامراجی پروپیگنڈہ کہہ کر مسترد کیا جاتا رہا ہے۔ بریژیکوف صاحب نے کہا کہ اسٹالن کے بعد جب خروشچیف اقتدار میں آئے تو انھوں نے جبر کی ان طنابوں کو کچھ ڈھیلا کیا جن میں پورا روسی معاشرہ جکڑا ہوا تھا لیکن ڈھیل کا یہ وقفہ مختصر تھا؛ دھیرے دھیرے خروشچیف بھی ان طور طریقوں کی طرف لوٹ گئے جو اسٹالن کے وضع کردہ تھے؛ تاہم انھوں نے وہ سختی نہیں برتی جو اسٹالن کا شعار تھی۔ بریژیکوف صاحب نے صدر بریژنیف کے دور کو اسٹالن کے دور ہی کی طرح تاریک قرار دیا اور کہا کہ یہ تاریکی موجودہ سربراہِ مملکت میخائیل گورباچوف کی آمد کے بعد ہی دُور ہوئی۔

بریژیکوف صاحب نے کہا کہ وہ اور ان کا ملک سوشلزم اور لینن ازم کے بنیادی اصولوں کی سچّائی پر غیر متزلزل عقیدہ رکھتے ہیں اور ان میں کسی ترمیم یا تبدیلی کے روادار نہیں۔ سوشلزم کے نفاذ کے بعد روسی سماج جن خرابیوں سے گزرا، اس کا ذمّہ دار انھوں نے ان مقتدر شخصیتوں کو ٹھہرایا جنھوں نے ان اصولوں کی غلط تعبیر و تشریح کی۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان اصولوں کی غلط تعبیر و تشریح کے دروازے اب بند ہو گئے ہیں، ہم اسے روسی سماج کے لیے ایک نیک شگون خیال کرتے ہیں کہ اس کے ذمّہ داروں کو اس سماج میں پائی جانے والی برائیوں کا احساس ہو گیا ہے اور ان کے اعتراف کی اخلاقی جرأت بھی ان میں پیدا ہو گئی ہے۔

پچھلے شمارے کے ساتھ "ایوانِ اُردو دہلی" نے اپنی عمر کا ایک سال پورا کر لیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اُردو دُنیا نے اس رسالے کی خاطر خواہ پذیرائی کی جو ہماری توقعات سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ ہم اس پذیرائی پر یقیناً خوش ہیں لیکن ہمیں یہ احساس بھی ہے کہ ہم "ایوانِ اُردو دہلی" کو جس مقام تک لے جانا چاہتے ہیں وہ ابھی دُور ہے، ہم خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں لیکن ہماری یہ تلاش اپنی منزلِ مراد تک پہنچ سکے اس کے لیے ہمیں اپنے لکھنے والوں کا سرگرم تعاون بھی درکار ہے اور پڑھنے والوں کی بھرپور توجّہ اور شرکت بھی ——— ہم دوسرے سال کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پہنچاتے ہوئے آپ سے ایک مشورے کے طالب ہیں۔

ہمیں کبھی کبھی ایسے خط آتے ہیں جن میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کی ضخامت بڑھائی جائے۔ ہماری بھی یہ خواہش ہے، اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ متنوع تحریریں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکیں گے۔ لیکن اگر ضخامت بڑھائی گئی تو اس کے باوجود کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کاروباری رسالہ نہیں ہے، قیمت میں اضافہ ناگزیر ہوگا۔ سردست ہم یہ چاہیں گے کہ اس کی ضخامت ۵۶ صفحے سے بڑھا کر ۸۰ صفحے کر دی جائے اور قیمت دو روپے پچاس پیسے کی بجائے تین روپے پچاس پیسے۔ لیکن ایسا ہم تبھی کریں گے جب ہمارے ایجنٹ بھی اور عام خریدار بھی اس تجویز سے اتفاق کریں ——— تو اپنی رائے ہمیں فوراً لکھ بھیجیے۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی

ڈاکٹر علیم بحیثیت مارکسی نقاد

ڈاکٹر علیم اُردو کے ان معدودے چند نقادوں میں ہیں جنھوں نے ترقی پسند تنقید کی معیار بندی کی ہے۔ ان کی حیثیت بقول خلیل الرّحمان اعظمی "ایک منّاد اور نظریہ ساز" کی رہی ہے۔ لیکن علیم صاحب کی تنقیدی کاوشیں صرف نظریاتی مباحث تک ہی محدود تھیں۔ انھوں نے عملی تنقید کا کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا چنانچہ بطور نقاد ان کے مقام کا تعیّن کرنے میں ہمیں صرف نظریاتی مباحث ہی سے سروکار رکھنا پڑے گا۔ عملی تنقید کے نمونوں کے فقدان نے ہمارے دائرۂ کار کو بڑی حد تک محدود کر دیا ہے۔

ترقی پسند تنقید کا باقاعدہ آغاز تو ۱۹۳۶ء میں انجمن کے قیام کے بعد ہی ہوا لیکن اس کے رشتے ہندوستان میں آزاد، حالی اور شبلی اور یورپ میں سماجی اور سائنسی تنقید کے نظریات سے جوڑے جا سکتے ہیں۔ خود اُردو میں ۱۹۳۶ء سے قبل اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری نے اپنی حیثیت منوالی تھی۔ ان کے علاوہ نیاز فتح پوری کی عقلیت پسندی بھی ترقی پسندی کی ایک جہت تھی اور ان ادیبوں کی کاوشوں کو ترقی پسند تنقید کے پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اُردو تنقید کو ایک نیا ذہن، ایک نیا مزاج اور ایک نیا آہنگ دیا جس میں علوم، سماج، تبدیلی کی خواہش، ایک بہتر دُنیا کی تعمیر کی تمنا اور حسن اور افادہ ہم رکاب تھے۔ اس ذہن، مزاج اور آہنگ کی بنیاد یوں تو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے پڑی تھی لیکن اس تنقیدی کارنامے نے تخلیق کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ تنقید اب بھی بڑی حد تک مکتبی، تشریحی اور تاثراتی ہی تھی اور زندگی کے تقاضوں اور فکری مسائل سے آنکھیں چار کرنے کا یارا اس میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

ترقی پسند مُصنّفین نے پہلی بار ایک ادبی منشور کے تحت ادب کو ایک سمت دینے اور اسے ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس نقطۂ نظر کے نتیجے میں تنقید کو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہوگیا ورنہ اس سے پہلے اسے ایک ذیلی یا ضمنی چیز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ پہلی بار متعدد ادیب صرف اپنی تنقیدی تحریروں کے سبب صفِ اوّل کے ادیب قرار پاتے۔ ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر علیم کا ہے۔ ترقی پسند تنقید میں ڈاکٹر علیم کے علاوہ احتشام حسین، سردار جعفری، سجاد ظہیر، ممتاز حسین اور آل احمد سرور خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن ڈاکٹر علیم کی ادبی اہمیت صرف چند نظریاتی مضامین اور خطبات پر قائم ہے۔ اتنی چھوٹی سی پونجی پر اہمیت حاصل کرنا بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے لیکن اس کارنامے کی بنیاد اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

ترقی پسند تنقید ادب کو اس کے سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ادب پارہ محض ایک انفرادی کاوش یا حادثہ نہیں ہوتا۔ ادب کی رُوح تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس فضا کو بھی سمجھنا ضروری ہوتا ہے جس میں اس ادیب نے پرورش پائی اور جس ماحول میں اس نے فن پارے کی تخلیق کی کیوں کہ ادیب محض اپنے جذبات کی نہیں بلکہ اپنے ماحول اور فضا اور دوسروں کے جذبات کی بھی ترجمانی

ڈاکٹر علیم

عابد سہیل

معرفت نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

کرتا ہے۔
لیکن ادب کی تخلیق میں شخصیت کا بھی حصّہ ہوتا ہے اور یہ شخصیت بھی ماحول سے متاثر ہوتی ہے، چنانچہ ہر فن پارہ اپنے ماحول سے، جس میں معاشی رشتے، سماجی صورتِ حال اور اجتماعی خواب بھی شامل ہوتے ہیں، متاثر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علیم ادب کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے قائل ہیں اور ظاہر ہے اس ضمن میں ان کا مطالبہ ادب کے پارکھوں اور نقّادوں سے ہے۔

"ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے ـــــ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی کارناموں کو اس معیار سے جانچے ـــــ ناقد کا یہ بھی فرض ہے کہ ادیب کے نقطۂ نظر کو سمجھے اور اس ذریعے یا وسیلے کی تحلیل کرے جو ادیب نے استعمال کیا ہے" (ادبی تنقید کے بنیادی اصول)۔

ایک عرصے تک ادب کو ایک ایسی انسانی کاوش خیال کیا جاتا رہا ہے جسے کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ تنقید کے نفسیاتی دبستان کا منہاج یہ ہے کہ ہر ادیب اپنا معیار خود مقرّر کرتا ہے اور ہر فن پارے کو اس کے داخلی عوامل کی روشنی میں ہی جانچا اور پرکھا جانا چاہیے اور اس کے لیے کوئی قانون یا اصول چاہے وہ 'ادبی' ہی کیوں نہ ہو، استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

برخلاف اس کے ڈاکٹر علیم کا خیال ہے کہ "ادب کو کم از کم ایک ڈھیلے ڈھالے قانون کے تحت ضرور لایا جا سکتا ہے کیوں کہ ادبی تنقید ایک علم ہے اور اس کے لیے ایسے اصول مقرّر کیے جا سکتے ہیں جو ادب پاروں پر اکثر صورتوں میں پورے اُتر سکیں"۔ ان کی خواہش ہے کہ "کم سے کم اتنا تو بالکل ضروری ہے کہ تنقید کے چند بنیادی اصول طے ہو جائیں تاکہ موافق اور مخالف ایک دوسرے کی بات کو سمجھ سکیں" (ادبی تنقید کے بنیادی اصول)۔

ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دقّت ادیب کی انفرادیت اور تنقید کے بنیادی اصولوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ادیب یا شاعر خارجی دُنیا سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اسے اپنے تجربوں اور ذات کی بھٹّی میں تپا کر دوبارہ پیش کرتا ہے۔ اس غیر اختیاری عمل میں اس کا نقطۂ نظر، زندگی کی طرف اس کا رویّہ اور اس کی ذات بھی، جو خود ماحول سے بالکل آزاد نہیں ہوتی، شامل ہو جاتی ہے۔ بعض ترقّی پسند نقّاد ادیب کی انفرادیت کے کچھ ایسے قائل نہ تھے۔ ان کے خیال میں زبان ایک سماجی عمل ہے، بیشتر تشبیہیں اور استعارے ہر ادیب کو ورثے میں ملتے ہیں موضوعات عام زندگی سے آتے ہیں، بحروں کی بنیاد موسیقی پر ہے اور موسیقی کی بنیاد سماجی زندگی کے آہنگ اور ترنم پر۔

لیکن ڈاکٹر علیم ادب کو زندگی کا پرتو سمجھنے کے باوجود ادیب اور ادب کی انفرادیت کے اس وقت بھی مویّد تھے جب اس کا کچھ ایسا رواج نہ تھا۔ ان کے خیال میں:

"شاعری اگر صنّاعی (CRAFT) یا تکنیک ہوتی تو وہ سب شاعر جو فن پر قدرت رکھتے ہیں برابر ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ شاعری فن اسی وقت بنتی ہے جب اس میں فرد کی انفرادیت بھی شامل ہو جاتی ہے محض صنّاعی یا تکنیک شاعری نہیں"۔

(ڈاکٹر علیم سے دو ملاقاتیں 'کتاب' جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۴)

لیکن وہ نراج کی حد تک پہنچی ہوئی انفرادیت کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی انفرادی زندگی اس کے سماجی ماحول کی پابند ہے اور اس انفرادی زندگی کو بھی سماج سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کوئی ذہنی کاوش مادّی وجود سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی فرد کے مسائل، وہ جنسی ہوں یا ذہنی، اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک سماج کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہو۔ چنانچہ ترقّی پسند ادیب کو زندگی کے حقیقی اور ضروری مسائل سے بحث کرنا چاہیے۔

جنس ادب کے حوالے سے غالباً ہمیشہ سے موضوعِ بحث رہی ہے۔ فرائڈ نے تو جنس کا تصوّر اس قدر وسیع کر دیا کہ سارے انسانی اعمال و افعال ایک طرح سے اس کے دائرۂ کار میں آجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے مارکسزم سماج کے اقتصادی ڈھانچے اور معاشی اور طبقاتی رشتوں کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ تحریک کے ابتدائی دنوں میں مروّجہ مواد اور ہیئت کے انحراف اور ترقّی پسندی کو ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا اور یقیناً بعض ایسی تخلیقات سامنے آئی تھیں جن کی وجہ سے پوری تحریک کو مطعون کرنے کا موقع مخالفین کو مل گیا تھا۔ ڈاکٹر علیم نے حیدرآباد کانفرنس میں فحاشی کے خلاف ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تھا "اُردو ادب میں اس وقت فحاشی کے جو رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں اُن کا ترقّی پسند تحریک اور ترقّی پسند ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔

اس تحریک کی مخالفت قاضی عبدالغفار اور مولانا حسرت موہانی نے کی تھی۔ مولانا نے کہا تھا کہ "ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں"۔

بعد میں ڈاکٹر علیم نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار اپنے مشہور مضمون "اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر" میں خاصی تفصیل سے کیا۔ کم و بیش چالیس سال گذر جانے کے باوجود ان کے خیالات کی تازگی آج بھی برقرار ہے اور اس مسئلے پر ان کی حیثیت راہنما اصولوں کی ہے۔

ڈاکٹر علیم کی رائے میں "بہت سے ادیبوں کو جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنسی مسائل دوسرے سماجی مسائل سے زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ دوسرے مسائل کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی"۔ وہ جنسی مسائل کے حوالے سے ادیبوں کو مندرجہ ذیل تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ "ایسے ادیب جو جنسی تعلقات کا ذکر اپنی یا پڑھنے والوں کی لذت اندوزی کے لیے کرتے ہیں۔ یہ سراسر رجعت پسند ہیں اور دراصل ان پُرانے شعرا کے جانشین ہیں جو سلطنتِ مغلیہ اور اودھ کی نوابی کے انحطاطی دور میں لگاوٹ اور معاملہ بندی کے مضامین نظم کرتے تھے۔ ادب برائے ادب کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ اس قسم کے ادیب پیدا ہوں جس شمع کو پُرانے غزل گو شعرا فانوس کے اندر جلاتے ہیں اس کو اس قسم کے نئے ادیب فانوس سے الگ کر کے اپنی بزم میں روشن کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ان ادیبوں کی ہے جو جنسی مسائل کو انسانی نفسیات کی تحلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان کی تمام تر ادبی کاوش اسی ایک عنصر کی تصویر کشی کے لیے وقف ہے ــــ مثلاً بعض ممتاز ادیب جن کے سرگروہ سعادت حسن منٹو ہیں جب ۱۹۴۷ء کے ہولناک واقعات کو ادبی جامہ پہناتے ہیں تو ان کی پوری کوشش محض SADISM کی تصویر کشی پر صرف ہوتی ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان ادیبوں کی ہے جو جنسی مسائل کو پیش تو کرتے ہیں لیکن جن کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک پورے سماج کی بنیاد ہی تبدیل نہ کر دی جائے۔ یہی سچے ترقی پسند ادیب ہیں۔

جنسی مسائل کے ادبی اظہار کے متعلق ان کے خیالات کے ڈانڈے ادب کے بارے میں ان کے تصوّرات سے براہِ راست منسلک ہیں۔ ادب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کی کوئی ایسی تعریف غالباً ممکن نہیں جو سارے ادبِ عالیہ کا احاطہ کرے کیوں کہ یہ تعریف ہیئت، موضوع، اصنافِ سخن اور اسالیب کو گرفت میں لائے بغیر ممکن نہیں۔ متعدد چیزوں کی تعریف اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ وہ کیا کام سرانجام دیتی ہیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ وہ انسانی سماج، افعال اور اس کی زندگی کو کس حد تک اور کس نہج سے متاثر کرتی ہیں۔ اس طرح کی تعریف کو FUNCTIONAL DEFINITION کہا جاتا ہے۔ ادب کی جانب ڈاکٹر علیم کا رویّہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے اور انھوں نے ادب کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"ادب آرٹ کی وہ صنف ہے جس میں ادبی صنّاع یا مصنّف زبان کے وسیلے سے اپنے ماحول سے متعلق اپنی خواہشات یا جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ زبان انسان کا سب سے اہم آلہ ہے اور اسی کی وساطت سے وہ اپنے مشاہدات اور تجربات دوسرے انسان تک پہنچاتا ہے"۔

اس تعریف میں کلیدی الفاظ "ادبی صنّاع"، "ماحول" اور "خواہشات اور جذبات" ہیں۔ ادب کی صنّاعی پر انھیں اصرار ہے لیکن یہ صنّاعی محض پچی کاری نہیں بلکہ اس میں زبان کے وسیلے سے صنّاع کا ماحول اور اس کی خواہشات اور جذبات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ادب کی اس تعریف میں جہاں ماحول، زبان اور اپنے تجربات اور مشاہدات پر زور دیا گیا ہے وہاں ان تجربوں کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مصنّف یا شاعر، تخلیق یا اختراع کرتا ہے۔ مزید یہ کہ ادب اگر صرف ماحول کے متعلق ادیب و شاعر کی خواہشات اور جذبات کا اظہار ہے تو اس میں دوسروں کے جذبات اور خواہشات کیسے شامل ہو جاتے ہیں؟

لیکن اس کے باوجود ادب کی مندرجہ بالا تعریف اگر جامع ترین نہیں تو چند جامع ترین تعریفوں میں ایک ضرور ہے۔ اس تعریف میں دوسروں کے جذبات اور خواہشات کی عدم موجودگی کا احساس زیادہ شدّت سے اس لیے ہوتا ہے کہ ڈاکٹر علیم ادب کو فنِ لطیف کے مقابلے میں فنِ مفید قرار دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں شاعری کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "رجزیہ شاعری جنگ میں جوش دلانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یونانی، عربی اور ہندوستانی شاعری میں ہم کو اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں"۔ ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں "مصوّری اور موسیقی کے مقابلے میں اد

فن تعمیر سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اچھے آرٹ میں تعلیمی اور اخلاقی مقصد بھی ہوتا ہے اور حظ و مسرت بھی۔ شاعری کا مقصد محض تہذیبِ اخلاق ہے نہ محض تفریح۔ یہ دونوں مقصد اچھی شاعری سے پورے ہوتے ہیں۔ اگر شاعری محض وعظ ہو اور اس سے جمالیاتی حس کی تسکین نہ ہو تو وہ آرٹ نہیں۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ شاعری ہمیشہ سے مقصدی اور تعلیمی رہی ہے۔ اس لیے اسے فن مفید سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

ادب کو فن مفید سمجھنے کے باوجود ادبی کارناموں کے پرکھنے میں وہ عمدگی اور حسن کے متلاشی ہیں۔ ڈاکٹر علیم ادب اور جمالیات کے باہمی تعلق پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں "صحیح ادبی تنقید کی بنیاد فلسفۂ جمالیات پر ہی قائم ہوسکتی ہے۔"

لیکن کیا حسن اور افادہ کے درمیان کوئی تعلق ممکن ہے؟ عینیت پسند نقاد ان دونوں کی ہم آہنگی ناممکن تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں افادہ کا تعلق سود و زیاں سے ہے جب کہ حسن ایک آفاقی حقیقت بلکہ آسمانی تصور ہے اور ادب میں ان دونوں کا امتزاج ممکن نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق کسی فن پارے کے مفید ہونے کا تصور ہی اسے ادب کے بلند منبر سے نیچے اتار لانے کے لیے کافی ہے کیوں کہ حسن کا تعلق رُوح سے ہے اور افادہ کا تعلق مادے سے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر علیم کہتے ہیں۔

"تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حسن اور افادہ کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ حسن کے لیے لازمی ہے کہ وہ افادے میں تبدیل ہوسکے اور وہی چیز زیادہ حسین ہے جو زیادہ مفید بھی ہے۔ اگر کوئی چیز انسانی زندگی سے تعلق نہیں رکھتی تو اس میں حسن کا وجود اور عدم برابر ہے۔"

ترقی پسند تنقید میں انقلابی رومانیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ترقی پسند ادب میں رومانی انقلاب پسندی مقبول ہوئی۔ سبب یہ تھا کہ رومانویت کی روایت میں پروان چڑھی ہوئی نسل ادب میں انقلاب کے تصور سے جب دوچار ہوئی تو اس نے تبدیلی کی خواہش کو اپنی فکر کا جزو تو بنالیا لیکن وہ اس کے جذبات اور احساسات کا جزو نہ بن سکی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں ڈاکٹر علیم لکھتے ہیں:

"ہمارے اکثر ادیب انقلاب کا خوش آئند خواب اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی عاشق اپنی محبوبہ کا تصور کرتا ہے۔ ان کے لیے مزدور، کسان، سرمایہ دار، طبقاتی کشمکش اور انقلاب کی وہی حیثیت ہے جو غزل گو شعرا کے لیے گُل، بُلبُل، ہجر، وصال، ساقی، بادہ، رقیب اور محتسب، وغیرہ کی۔ گویا وہ ایک نئی ادبی روایت کے پرستار ہیں اور ان کی تخلیق میں خود ان کے تجربے کو بہت کم دخل ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اکثر اپنی بات کو واضح طور پر نہیں کہتے بلکہ تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے پردے میں چھپا کر پیش کرتے ہیں اور اس میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ اگر یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر ترقی پسند اور انقلاب کا دلدادہ ہے تو ممکن ہے اس کے بہت سے اشعار کی صوفیانہ اور عارفانہ تعبیر و تشریح کردی جائے۔" (اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر)۔

رومانی انقلاب پسندی کی اس متشدد نکتہ چینی کے بعد علیم صاحب انقلابی رومانیت کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے انقلاب سے محض جذباتی وابستگی کو کافی نہیں قرار دیتے۔ ان کے خیال میں " انقلابی رومانیت اس جذباتی گہرائی کا ہمہ گیر اظہار ہے جو سماجی طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور اس اشتیاق سوز و ساز کی آئینہ داری ہے جو انقلابی عوام کے خون کو گرم اور عمل کو تیز رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر علیم انقلابی رومانیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کو ایک ہی بنیادی کیفیت کے اظہار کے دو طریقے قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اشتراکی حقیقت نگاری جہاں ایک طرف سطحی جذباتیت کے اثرات سے خود کو پاک رکھنے کی کوشش کرتی ہے وہاں دوسری طرف میکانکی حقیقت نگاری سے بھی بنیادی طور پر مختلف ہے کیوں کہ میکانکی حقیقت نگاری کو ماضی اور مستقبل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف یہ دیکھ سکتی ہے کہ کیا ہے۔ کیا تھا اور کیا ہونے والا ہے یا کیا ہوسکتا ہے سے اس کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔

ان کا مقصد جو بھی رہا ہو لیکن ڈاکٹر علیم نے رومانی انقلاب پسندی کی نکتہ چینی جن الفاظ میں کی اس نے اُس نقطۂ نظر کو فروغ دیا جس نے سردار جعفری کی زبان میں فیض کی نظم "داغ داغ اُجالا" کو ان الفاظ میں ہدفِ ملامت بنایا "پوری نظم میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی

سحر ہے اور منزل سے مراد عوامی انقلاب کی منزل۔ اس نظم میں داغ داغ اُجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حسینانِ نور کا دامن ہے، فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، نگارِ جہاں ہے، چراغِ سرِ راہ ہے، پکارتی ہوئی بانہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا درد اور اس درد کا مداوا۔ ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے" (ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل۔ شاہراہ)

یہ صحیح ہے کہ علیم صاحب اگر فیض کی شاعری کا جائزہ لیتے تو ان کا رویہ سردار جعفری کی طرح جارحانہ نہ ہوتا اس کے باوجود نظریاتی طور پر سردار جعفری کے اس نقطۂ نظر کو سہارا ان کے نقطۂ نظر ہی سے ملا۔

لیکن علیم صاحب کا غالباً یہ منشا نہ تھا کیوں کہ ان کے بیشتر مضامین میں ادب اور زندگی کا متوازن اور تعمیری نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس کا واضح اظہار ان کے مشہور مضمون "مارکسزم اور ادب" میں بھی ہوتا ہے۔ اس سے قبل وہ انھی خیالات کا اظہار علی گڑھ میں ترقی پسند ادیبوں کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے حسبِ ذیل الفاظ میں کر چکے تھے:

"وہ لوگ جو محض معاشی یا سیاسی نظریات کو نظم کر دیتے ہیں یا شعر کے پیمانے میں ڈھال دیتے ہیں اور ادب کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے وہ ترقی پسند تو ہو سکتے ہیں لیکن ادیب نہیں۔ اس لیے کہ بجائے خود ادب کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہیئت کے پیچھے اچھے موضوع کو تباہ نہیں کرنا چاہیے انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر موضوع صالح بھی ہے اور زندگی کی صحت مند قدروں کی عکاسی بھی کرتا ہے لیکن اگر اسے پیش کرتے وقت ایک خاص پیکر اور خاص انداز میں ڈھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ متاثر کن ہو تو وہ ایک بھونڈی سچی بات ہوگی لیکن ادب نہ ہوگا۔"
(رپورٹ رسالہ ماحول، دہلی، شمارہ ۱۳-۱۴)

اس تقریر کے اگلے سال ہی انھوں نے اپنا مضمون "مارکسزم اور ادب" لکھا جس میں انھوں نے ادب کی مارکسی توضیح نہایت مدلل انداز میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"مارکسزم کے بڑے نمائندوں نے ہمیشہ انسانیت کے قدیم تہذیبی ورثے کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا ہے اور برابر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ مارکسزم کے معماروں نے قدیم ورثے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ جمالیات میں قدیم ورثے کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مارکسزم کے اصلی نمائندے تاریخ کی شاہراہوں کو نگاہ کے سامنے رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ تاریخی اصولوں سے واقف ہیں۔

لیکن مارکسی فلسفۂ تاریخ ہمیں بتاتا ہے کہ ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ اس کو مثال کے طور پر اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کر سکتے ہیں" (فکر و نظر، علی گڑھ، شمارہ ۱۰)

اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیل الرحمان اعظمی اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر علیم ماضی کے ادب سے صرف عبرت و بصیرت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتے ہیں۔ عبرت و بصیرت تو کھدائی میں نکلے ہوئے انسانی ڈھانچوں اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے — مگر کیا اعلیٰ فنی شاہکاروں کو بھی ہم صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھیں؟ ہم انھیں ماضی کا ایک مردہ نقش اور بے جان پیکر سمجھیں؟ یا وہ نمونے اب بھی ہماری رُوح کے تاروں کو چھیڑ سکتے ہیں اور ہماری حسِ لطیف کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے لیے یہ اب بھی زندہ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔"
(اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، صفحہ ۳۷۹-۳۸۰)

اعظمی صاحب ایک زمانے میں نہایت متشدد قسم کے ترقی پسند تھے۔ اس تحریک کے سلسلے میں جیل بھی گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ ظاہر ہے خیالات کی اس تبدیلی پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن ادبی مسائل پر ان کا جو متشدد رویہ ترقی پسند تحریک کی حمایت میں تھا وہی اس کی مخالفت میں بھی رہا۔

علیم صاحب کا مندرجہ بالا پیراگراف بلکہ پورا مضمون پڑھ ڈالیے۔ اس میں قدیم ورثے یا ماضی کے ادب سے عبرت اور بصیرت حاصل کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ انھوں نے ماضی کو زندہ کرنے کی کوشش کی نکتہ چینی کی ہے۔ خلیل صاحب نے اپنے جوشِ جہاد میں ماضی کے ورثے کی قدر اور ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کو ہم معنی سمجھ لیا۔

زندگی کے آخری آٹھ دس برسوں میں علیم صاحب کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ اب وہ شاعری کو بنیادی طور پر رومانی مانتے تھے اور

اس میں تخیّل کو حقیقت سے زیادہ اہم ۔

شاعری کی جانب نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کے ساتھ نظریۂ حیات کی جانب بھی اُن کی رائے میں ایک اہم تبدیلی کا سراغ ملتا ہے ۔ اس انٹرویو کے آخری سوال کے جواب میں جو ماہنامہ کتاب میں شائع ہوا تھا علیم صاحب کہتے ہیں :

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں مارکسزم کے فلسفے کو مانتا ہوں اور اس کو موجودہ دوَر کے لیے بہترین نظریۂ حیات سمجھتا ہوں جو ہمارے سماج کی موجودہ خرابیوں کو اپنے انقلابی افکار سے دور کر سکتا ہے ۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ۔ کوئی نظریۂ حیات یا فلسفہ کسی ایک فرد کی ذات تک محدود نہیں ہو سکتا ۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر اس ایک فرد کی تحریریں حرفِ آخر سمجھی جائیں گی اور ادعائیت (DOGMATISM) پیدا ہو جائے گی ۔ میں دراصل جس فلسفے اور طریقِ فکر کو صحیح سمجھتا ہوں وہ جدلیاتی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) ہے ۔ یہ ایک سائنسی نقطۂ نظر ہے جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنے بنیادی طریقِ کار سے انحراف کیے بغیر بدل بھی سکتا ہے ۔"

فکر و نظر کی اس تبدیلی نے ادب کی جانب ان کے نقطۂ نظر کو بھی متاثر کیا تھا ۔ غزل کے سلسلے میں ان کا رویّہ شروع میں کسی قدر غیر ہمدردانہ تھا لیکن بعد کو اس میں بڑی تبدیلی آگئی تھی ۔ اس انٹرویو میں نئی شاعری کے سلسلے میں انھوں نے کہا ہے :

"جدید شاعری میں فرد اور سماج کا صحت مند رشتہ ملتا ہے اور جو شاعری فرد اور سماج دونوں کے ساتھ انصاف کرتی ہے وہ بلاشبہ شاعری کا اگلا قدم ہے اور خالی سماجی شعور والی شاعری سے زیادہ قابلِ اطمینان ہے ۔ اس وقت ہم نے شاعری کو خانوں میں بانٹ دیا تھا ۔ اب یہ خانے ٹوٹ گئے ہیں اور فرد اور سماج ایک ہی وحدت کے اجزا بن گئے ہیں ۔ اب داخلی اور خارجی، انفرادی اور اجتماعی تجربات میں جو امتزاج ہوا ہے اور انسانی تجربہ جس طرح وحدت بناتا ہے وہ آرٹ کے لحاظ سے بھی زیادہ مکمّل ہے اور تاثرات کے لحاظ سے بھی زیادہ بہتر ۔"

اس نئے نقطۂ نظر سے ادب کو پرکھنے اور ادب کے اصولوں کو منضبط طور پر پیش کرنے کا انھیں موقع نہیں ملا ورنہ شاید ترقّی پسند تنقید ایک دور رس نظری بُعد سے روشناس ہوتی ۔ اس کے باوجود علیم صاحب کا شمار صفِ اوّل کے مارکسی نقادوں میں کیا جائے گا ۔ انھوں نے ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کی وضاحت جس مدلّل اور غیر جذباتی انداز میں کی ہے اس کی کوئی دوسری مثال اُردو تنقید میں نہیں ۔ ان کی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ہمیشہ مدلّل اور نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کی ۔ عبارت آرائی اور تشبیہوں اور استعاروں کو انھوں نے نفسِ مضمون پر حاوی نہیں ہونے دیا ۔ ان کے مضامین اور خیالات میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ۔ وہ ایسے طرزِ بیان پر قادر تھے جس میں بھرتی کے الفاظ نہیں تھے ۔ انھوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اس کی حیثیت قدرِ اوّل کی ہے بعض مقامات پر ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، بلکہ شاید ضروری ہے علیم صاحب نے اُردو ادب کو اس کی روایات کے پس منظر میں مارکسی نقطۂ نظر سے پرکھا اور تنقید کے اصول وضع کرنے کی کوشش کی ۔

وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے لیکن یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ وہ اُردو کے پہلے نقّاد ہیں جنھوں نے ادبی تنقید کے اصول وضع کرنے اور اسے ذاتی پسند اور ناپسند سے بلند کرنے کی کوشش کی ۔ اس ضمن میں ان کا مضمون "ادبی تنقید کے بنیادی اصول" بے حد اہم ہے ۔

ترقّی پسند تنقید کے تشکیلی دور میں سماجی زندگی، معاشی رشتے، رومانویت، اشتراکی حقیقت نگاری وغیرہ اصطلاحیں مروج تھیں ۔ ان اصطلاحات کو عام اور مبہم انداز میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ وہ اُردو کے پہلے اور شاید واحد نقّاد ہیں جنھوں نے ان اصطلاحات کی نہ صرف تعریف کی بلکہ غیر مبہم، واضح اور سیدھے سادے الفاظ میں ان کی وضاحت بھی کی ترقی پسند ادیبوں میں نظری تنقید پر علیم صاحب نے جتنا کچھ لکھا اتنا بھی پروفیسر ممتاز حسین کے سوا کسی نے نہیں لکھا ۔ ان کے بعض افکار اب از کار رفتہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ ہمارے ہاں ادب کی بنیادوں پر کام بہت کم ہوا ہے ۔

خود ان کو اپنی کوششوں کی مکمّل کامیابی کا یقین نہیں تھا ۔ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں اُردو تنقید سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا "تنقید سے بحیثیت مجموعی مطمئن نہیں ہوں ۔ ہماری تنقید معروضی نہیں بن پائی ہے ۔ زیادہ تر تاثراتی ہے اس لیے تنقید میں ذاتیات زیرِ بحث آجاتی ہے ۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید میں ذاتی پسند اور ناپسند ہمیشہ شامل رہے گی

اس لیے ہم تنقید کو سائنٹفک طور پر معروضی نہیں بنا سکتے مگر تنقید کے کچھ ایسے اصول ضرور وضع کیے جاسکتے ہیں جو اسے معروضیت سے قریب تر لانے میں مدد دیں۔ ہمارے یہاں اب تک تنقید کے اصول وضع کرنے کی کوئی مستقل کوشش نہیں ہوئی۔"

ادب، تاریخ، سیاسیات اور اسلامیات کے موضوعات پر ان کے مضامین اور تراجم کا اتنا بڑا ذخیرہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کے ادبی جرائد میں بکھرا پڑا ہے کہ اس کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ علیم صاحب ترقی پسندی کو زندگی کے سارے عوامل اور علوم میں تلاش کرتے تھے۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کی ترویج و اشاعت اور اس کی معیار بندی کے لیے ان کی کوششوں کا محاکمہ ان سارے مضامین کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ "تنقید کے اصول" وضع کرنے کی مستقل کوشش کی خواہش کو عملی شکل دینے کے لیے اس نسل میں ذہنی طور پر ان سے زیادہ کوئی مسلح نہ تھا۔ لیکن وہ یہ سب کچھ نہ کرسکے۔ وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن اس جانب پوری توجہ نہ کرکے انھوں نے اپنا کم اور اُردو ادب اور نظری تنقید کا زیادہ نقصان کیا۔

اس کے باوجود ترقی پسند تنقید کو بنیادی اصول فراہم کرنے، اسے سائنسی بنیادوں پر ڈھالنے اور تنقید کو غیر جذباتی اور معروضی انداز دینے کی کوششوں کے لیے اُردو ادب اور خاص طور سے تنقید میں ان کی کاوشوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اعزاز افضل

تعلقات تو ہر موڑ پر کشیدہ رہے
مگر وہ بچھڑے تو کوسوں ہم آبدیدہ رہے
بہت قریب سے دیکھا تھا آستینوں کو
یہی سبب ہے کہ ہم پیرہن دریدہ رہے
سماعتوں پہ ہمارا نزول کیا ہوتا
ہم آرزو کے صحیفے تھے نا شنیدہ رہے
مرے سفر نے وہ نقشِ قدم بھی دیکھے ہیں
چراغِ راہ بنے اور حریفِ دیدہ رہے
وجود، جسم نہیں تھا کہ چھو لیا تم نے
تمہارے ہاتھ پہنچ کر بھی نارسیدہ رہے
یہ اور بات نظر ذائقہ شناس نہ تھی
لذیذ تھے وہی منظر جو ناچشیدہ رہے

۹۸ نور جٹ پور، کلکتہ ۳۷

○

گُلِ خوابیدہ کو تکتے ہوئے تھک جائے گی
جب وہ جاگے گا مری آنکھ جھپک جائے گی
سات رنگوں میں یہ بکھری ہوئی لمحوں کی دھنک
چھونا چاہوں تو مری پیاس بھڑک جائے گی
جانے کب ہوگا ترے ہجر کا موسم گدلا
کتنے برسوں میں ان اشکوں کی چمک جائے گی
وہ جو شہزادیِ کہسار کی صورت تھی کھڑی
کیا خبر تھی وہی چٹان سرک جائے گی
شہرِ اندیشہ میں تنہا ہے بہت دیکھ کے چل
چھوڑ کر تجھ کو یہ پھولوں کی سڑک جائے گی
آتے جاتے ہوئے موسم کی سرائے ہے بدن
اک مہک آئے گی اور ایک مہک جائے گی

○

بدن کے دیوار و در میں اک شے سی مر گئی ہے
عجیب خوشبو اُداسیوں کی بکھر گئی ہے
تری ہی آواز کے بھنور تھے سیاہ شب میں
ترے ہی لہجے سے ملگجی شب نکھر گئی ہے
جگاؤ مت رِستے خوابوں کی رت جگی تھکن کو
کہ دھوپ دالان سے کبھی کی اتر گئی ہے
نہ ٹوٹ کر اتنا ہم کو چاہو کہ رو پڑیں ہم
دبی دبائی سی چوٹ اِک اِک ابھر گئی ہے
فصیلِ سر کو بچائے رکھتا ہے وہ ابھی تک
گو ریت پستی کی ریشے ریشے میں بھر گئی ہے
وہ رات جس میں زوالِ جاں کا خطر نہیں تھا
وہ رات گہرے سمندروں میں اتر گئی ہے

مصور سبزواری

ڈاکخانہ نوح، ضلع گوڑگاؤں، ہریانہ

ناشناس

ارتھی کے جلوس کے ساتھ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا تھا کہ ضرور ہی کسی بڑے آدمی کی موت واقع ہوئی ہے! آگے شادی کا منڈپ سجا تھا۔ چہل پہل تھی۔ باجے گاجے کا شور تھا۔ فلمی گانوں کی دُھنیں بج رہی تھیں۔ اُدھر اسکولی بچّے بھر بھرا کر اسکول کی عمارت سے باہر نکل کر کُھلی سڑک پر آ گئے تھے۔

بیلا پور جانے والی بس ابھی شہر کے گرد و نواح سے باہر نہیں نکلی تھی۔ گو کہ پچھلی قطاروں میں سُدھاکر کو بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ مل تو گئی تھی، لیکن اب تک اُس کی سانسیں معمول پر نہ آئی تھیں۔ اوّل تو چلتی ہوئی بس میں اُسے تیز تیز چل کر اندر گُھسنا پڑا تھا، پھر یہ کہ کھڑکیاں کُھلی تو ہوئی تھیں، لیکن لوگوں کی ریل پیل ایسی تھی کہ باہر سے تازہ ہوا نہیں آپا رہی تھی۔ سُدھاکر نے اپنے ہاتھوں میں تھمے ہوئے چمڑے کے بیگ کو گود میں رکھ کر ایک بار گہری گہری سانسیں کھینچیں تو اُسے تھوڑی عافیت ملی۔

جیب سے رُومال نکال کر پہلے تو سُدھاکر نے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھا، پھر رُومال سے پنکھے کا کام لینے لگا۔ گرمی ابھی پورے طور سے شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن دھوپ میں تمازت تھی اور ہوا بھی بند تھی۔ اِس لیے اُمس بڑھ گئی تھی۔ ایسے آثار تھے کہ شام آتے آتے دھول بھری آندھی ضرور اُٹھے گی۔ ویسے سُدھاکر کو اطمینان تھا کہ سانجھ اُترنے سے پہلے وہ گھر کی چوکھٹ ضرور لانگھ لے گا۔

صبح سویرے جب وہ گھر سے چلا تو مند مند ہوا چل رہی تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں سے گذرتے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اُس کے بدن میں بار بار جُھرجُھری سی پیدا ہوئی تھی، لیکن شہر کی فصیلوں میں داخل ہوتے ہی موسم نے یکایک اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ ہوا تھم گئی تھی، دھوپ تیز ہو گئی تھی۔

گھنٹے دو گھنٹے میں ہی اُس نے اپنے ضروری کاموں سے فراغت پالی تھی۔ تھوڑی خریداری کی، کچھ مُلاقاتیں کیں، ہنومان مندر میں پرشاد چڑھایا۔ بازار سے بس کے اڈّے تک پہنچنے کے لیے اُسے کوئی سواری نہ ملی تو پیدل ہی چل پڑا۔ خیر سے بس کھلتے کھلتے ہی وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ اگر ایک آدھ منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو یہ بس تو یقیناً چھوٹ جاتی۔ پھر اُسے سہ پہر سے پہلے کوئی بس نہ ملتی اور اُس کے گھر پہنچتے پہنچتے سورج ڈوب جاتا۔ اندھیرے اندھیرے گھر پہنچنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ گاؤں کی پگ ڈنڈیاں اُس کی دیکھی بھالی تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ زمانہ خراب تھا اور اُس کے چمڑے کے بیگ میں لال انگوچھے میں لپٹی ہوئی بارہ ہزار روپیوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔

بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اندر جتنے مسافر ٹُھنسے ہوئے تھے، اُتنے ہی چھت پر بھی لدے ہوئے تھے۔ سُدھاکر کی خوش قسمتی تھی کہ بس کے اندر جُگل کشور نے اُسے پہچان لیا۔ سُدھاکر کو دیکھ کر جُگل کشور نے ہانک لگائی تو سُدھاکر کھنچا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر بڑی مشکل سے اُس کے بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ بن پائی۔ سُدھاکر دمے کا پُرانا مریض تھا۔ شدت گرمی کی ہو یا سردی کی، اُس کے لیے تکلیف کا باعث ہوتی۔ اپنی چڑھی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سُدھاکر کو اپنی گود میں پڑے ہوئے چمڑے کے بیگ — کا لمحہ لمحہ خیال رہا۔ اس میں تو اُس کی ساری پونجی سمٹی ہوئی تھی۔

شنکر پاروتی کے مندر والے موڑ سے آگے بڑھتے ہی بس کے ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈر چالو کر دیا۔ تیز موسیقی کی جھنکار گونج اُٹھی۔ اگلی قطارو[ں] کے کئی ایک مسافروں نے گانے کے سُر تال کے ساتھ چٹکیاں بجانی شروع کر دیں۔ ایک، دو منچلوں نے زور زور سے سیٹی بھی بجا ڈالی۔

کنڈکٹر ٹکٹ کے پیسے وصول کرتا آ رہا تھا۔ راہداری سے گذرتے ہوئے اُسے خاصی دشوا[ری]

عظیم اقبال

گنج ۳، بتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

ہو رہی تھی۔ اولاً تو لوگ ٹھسا ٹھس بھرے تھے، دوئم، جگہ جگہ سامان کا ڈھیر لگا تھا۔ کئی بار اُسے ٹھوکر بھی لگی۔ راستے کی ناہمواریوں کے سبب بس میں جھٹکے لگتے تو اُسے خود کو سنبھالنے کی خاطر کسی کی بانہہ تھام لینی پڑتی یا کسی کا کندھا دبوچنا پڑتا۔

سُدھاکر کے آگے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی ایک نے بیڑی سلگالی تھی۔ بیڑی کا دھواں سُدھاکر کے نتھنوں میں سما رہا تھا۔ دھوئیں سے بچنے کے لیے سُدھاکر ادھر اُدھر پہلو بدلنے لگا۔ پچھلی قطاروں میں سے کسی شخص نے ہتھیلی پر تمباکو ملنا شروع کیا تو اُس کی تیز بُو سے سُدھاکر محفوظ نہ رہ سکا۔ اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ لگاتار کھانستا ہی چلا گیا۔

سُپریہ سنیما پیچھے چھوڑ کر بیلا پور جانے والی گاڑی ابھی فرلانگ دو فرلانگ ہی آگے بڑھی تھی کہ ڈرائیور نے بس کی رفتار کم کیے بغیر ہی یکایک بریک مار دیا تو ایک دھچکے کے ساتھ بس رُک گئی۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے مسافروں کی کھسیانی آوازیں اُبھریں۔

"ارے، کیا ہوا؟"

"بریک کیوں مار دیا؟"

"گاڑی کیوں رُک گئی؟"

"کنڈکٹر ___!"

"ڈرائیور ___!"

ڈرائیور پے بہ پے ہارن بجا رہا تھا۔ بیشتر لوگ اُچک اُچک کر آگے دیکھنے لگے۔ پتلی سی سڑک کے بیچوں بیچ بلیٹ موٹر سائیکل کھڑی کر کے اُس کے دونوں سوار جھکے جھکے اگلے پچھلے پہیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ پہلے تو وہ پیہم ہارن کی آواز کو اَن سُنی کرتے رہے، پھر تیزی سے لپک کر بس میں گھس پڑے۔ دونوں کم و بیش ایک ہی قد و قامت کے تھے۔ البتّہ ایک کے چہرے پر اُلجھی اُلجھی داڑھی تھی تو دوسرے کی مونچھیں گھنی گھنی تھیں اور قلمیں بڑھی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کُھلے، چمکتے، لمبے چُھروں کو دیکھ کر سب نے دم سادھ لیے۔ راہداری میں کھڑے ہوئے لوگ اغل بغل دبتے جا رہے تھے۔ دونوں دندناتے ہوئے آگے بڑھے اور سُدھاکر کے سر پر پہنچ کر تھم گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے چُھرے سُدھاکر کی گردن پر رکھ دیے۔

ہکا بکا ہو کر سُدھاکر نے نظریں اُٹھائیں۔ اُس نے اپنی گود میں پڑے ہوئے چمڑے کے بیگ کو سینے سے چپٹا لیا۔ اُلجھی اُلجھی داڑھی، گھنی گھنی مونچھوں اور بڑھی ہوئی قلموں والے کم و بیش ایک ہی قد و قامت والے دونوں نوجوانوں کے ہاتھوں میں کُھلے، چمکتے، لمبے چُھروں کو دیکھ کر سُدھاکر کی گھگھی بندھ گئی۔ بیٹی کی شادی کے لیے جیون لال صرّاف کے ہاں اپنی بیوی کے پُرانے چاندی، سونے کے زیوروں کو بیچ کر، لال انگوچھے میں کُل بارہ ہزار روپیوں کی گڈیاں سمیٹ کر سُدھاکر دُکان سے باہر نکلا تو یہ دونوں اُسے وہاں نظر آئے تھے، پھر ہنومان مندر کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُن سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ بس کے اڈے پر بھی سُدھاکر نے اُن کی ایک جھلک دیکھی تھی، اور اب وہ یہاں بھی آدھمکے تھے۔

سب کی نگاہیں اُدھر ہی اُٹھ گئیں۔ ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ کنڈکٹر باقی ماندہ مسافروں سے کرایے کے پیسے لیتے لیتے تھم گیا اور جیبیں ایسے سنبھالنے لگا جیسے اُس کے گلے پر بھی چُھرے رکھے جانے والے ہوں۔ زنانہ سیٹوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں نے نئی نویلی دُلہنوں کی طرح اپنے اپنے گھونگھٹ کھینچ لیے۔

اُس کی گردن پر چُھروں کے دباؤ کے بڑھنے کے ساتھ ہی سُدھاکر کی گود میں پڑے چرمی تھیلے پر اُس کی گرفت بھی کستی جا رہی تھی۔

سُدھاکر کو پہچان کر جگل کشور نے اپنے بازو میں اُسے بٹھایا تھا، لیکن اب اُس نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ اگلی قطاروں میں بیٹھ کر بیڑی کے کش پر کش لگانے والوں نے بچے کھچے بیڑی کے ٹکڑے کھڑکی سے باہر پھینک دیے تھے۔ پچھلی قطاروں میں بیٹھ کر ہتھیلیوں پر تمباکو مسلنے والوں کی کھلی ہوئی مٹھیاں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔

چھینا جھپٹی کے باوجود سُدھاکر کا تھیلا اُس کے ہاتھوں سے چُھوٹ نہیں رہا تھا۔ سُدھاکر نے خوب زور لگا کر تھیلے کو اپنے سینے سے چپٹا رکھا تھا۔ سُدھاکر کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن چُھروں کا دباؤ اُس کی گردن پر سخت تھا اور اُس کی ذرا سی حرکت سے اس کی گردن کی کوئی رگ کٹ بھی سکتی تھی!

دھکم دھکّا کے بعد سُدھاکر کو بس سے باہر کھینچ لیا گیا۔ اُلجھی اُلجھی داڑھی والے اور گھنی گھنی مونچھوں اور بڑی بڑی قلموں والے دونوں نوجوانوں نے اُس کے مُنہ پر، پیٹ پر، دو چار گھونسے برسائے تو بھی سُدھاکر کی گرفت کمزور نہ ہوئی تو دونوں طرف سے چُھرے اُس کی پسلیوں میں چُبھے۔ سُدھاکر نے ایک چیخ ماری اور بلبلا کر اپنی بغلوں کو تھامے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ اُس کا تھیلا اُس کے ہاتھوں سے چُھوٹ چکا تھا۔

بلیٹ موٹر سائیکل دھڑ دھڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ دونوں پلک جھپکتے نظروں

سے اوجھل ہو گئے تو ایکا ایکی بس کے سارے مسافر دوڑے دوڑے سُدھاکر کے پاس پہنچے۔ چہ مگوئیاں کرتے ہوئے لوگوں نے سُدھاکر کو گھیرے میں لے لیا۔
پیچھے بھیڑ میں ایک مسافر نے اُکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ کے ملے جُلے لہجے میں کسی سے استفسار کیا ــــ
"اب تو پولس کے آنے تک بس رُکی ہی رہے گی ؟"
مخاطب نے محض ہونٹوں کو بھینچ کر کندھے اُچکا دیے۔
سُدھاکر بین کر رہا تھا۔ لوگوں کی کوئی بات اُسے سنائی نہ دے رہی تھی۔ یکبارگی اُس نے اپنی نگاہیں اُٹھائیں تو اُسے سامنے کچھ بھی نظر نہ آیا ــــ نہ کوئی سراپا، نہ کوئی چہرہ !

دہلی
ایوانِ اردو

اس سال دو خاص نمبر شائع کرے گا

سالِ رواں ہماری صدی کی دو عظیم شخصیتوں

مولانا ابوالکلام آزاد
(ولادت : ستمبر ۱۹۸۸ء)

اور

پنڈت جواہر لال نہرو
(ولادت : نومبر ۱۹۸۹ء)

کے صد سالہ جشنِ ولادت کا سال ہے

ایوانِ اُردو دہلی نے ان دونوں عظیم شخصیتوں کے عظیم کارناموں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے خصوصی شمارے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے

اہلِ قلم سے درخواست ہے کہ اپنے قیمتی مضامین ارسال فرما کر شکریے کا موقع دیں

ــــ ایڈیٹر ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مقالہ نویس

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جہاں شاعری میں اپنی سنجیدگیِ فکر کے گلاب مہکاتے رہے ہیں وہاں نثر میں طنز و مزاح کے شگوفے کھلانا بھی ان کا محبوب شغل رہا ہے۔ زیر نظر مضمون ان کی اسی شگفتہ نگاری کا آئینہ دار ہے ———

خدا مقالہ نویسوں کو زندہ و سلامت رکھے۔ انھیں کے دم قدم سے ادیب اور شاعر زندہ ہیں۔ گھٹیا سے گھٹیا قسم کا شاعر یا ادیب ہی کیوں نہ ہو، بس اس پر ایک سیمینار کر دیجیے اور مقالہ نویسوں کو دعوت نامہ بھیجیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ اس مقام پر یوں حملہ آور ہوں گے جیسے کسی مرمّت طلب مسجد کا امام یا دور افتادہ مندر کا پجاری کسی ضیافت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ جس ادیب یا شاعر پر مقالے پیش کیے جائیں گے، اس کی ادبی یا ثقافتی حیثیت کیا ہے؟ انھیں اُس کی نہیں بلکہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ قوم رائی کا پہاڑ بنانے میں اس قدر ماہر ہوتی ہے اور ذرا ذرا سی بات پر اس قدر طویل مقالے لکھ مارتی ہے کہ سننے والے بور ہو جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے سارا میدان ان کے حوالے کر جاتے ہیں تاکہ یہ دل کھول کر اپنی تحقیق اپنی آواز میں سُن سکیں۔ ذیل میں ایک مقالہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت: میرے لیے یہ باعثِ صد افتخار ہے کہ آپ نے مجھ ہیچمداں کو علامہ ببول صحرائی مرحوم پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی جہاں آپ نے علامہ مرحوم کا انتخاب کر کے اپنی سخن فہمی اور قدر شناسی کا ثبوت دیا ہے، وہاں آپ نے علامہ کی مفکرانہ شاعری ادبی عظمت اور ثقافتی برتری کا بھی اعتراف فرمایا ہے۔ علامہ مرحوم کی قابلیت، جدّت، جُرات، لیاقت، ندرت اور فصاحت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ علامہ مرحوم پر ایک مقالہ تو کیا کتابیں لکھی جائیں تو بھی ان کی شاعری اور علم و فضل کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک ایک شعر کئی کئی دیوانوں پر بھاری ہے لیکن وقت کی کوتاہی اور اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے میں اس مختصر مقالے میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کر پاؤں گا۔ اس لیے ان کا ایک شعر ہی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ چنانچہ شعر ملاحظہ ہو۔ علامہ فرماتے ہیں:

میں نہ سمجھا ہوں نہ سمجھوں گا نہ سمجھاؤ مجھے
دُور پہلو سے مرے دُور سرک جاؤ مجھے

حضرات! اس شعر کے پہلے مصرعے کو لیجیے اس مختصر مگر محکم اعلان، بیان، اعتراف، اقرار و اقبال میں ہی شاعر نے کیا کیا نہیں کہہ دیا۔ اس ایک ہی مصرعے سے اُس ذہنی کشمکش اور جنگ کا بھی شعور ہو سکتا ہے جو روزِ ازل سے نیکی اور بدی، خلوص اور ریا، بردباری اور ہٹ دھرمی اور ناصح اور منصوح (اس ترکیب کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن فاتح اور مفتوح کی ترکیب کو مد نظر رکھتے ہوئے زبان میں اضافہ کرنے کی سعی کی ہے) میں جاری ہے اور جاری رہے گی اس ایک ہی مصرعے میں شاعر نے اپنا ماضی، حال اور مستقبل آپ پر صاف طور پر واضح کر دیا ہے گویا کہ کوزے میں دریا نہیں، ساتوں سمندر بند کر دیے ہیں۔ سمجھانے والا لاکھ سر پیٹتا ہے کہ میاں برخوردار ذرا سوچو اور پھر سمجھو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن شاعر ہے کہ اپنی دُھن کا پکا ہے اور ببانگ دُہل کہہ رہا ہے کہ میں سمجھنے والا نہیں بلکہ میرے آبا و اجداد نے بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی آپ اپنا وقت فضول برباد کر رہے ہیں ادھر "ناصح مشفق" بھی پرلے درجے کا خود بیں خود سر اور خود پسند ہے۔ وہ بھی باز نہیں آ رہا۔ چنانچہ جب یہ تکرار حد سے بڑھ جاتی ہے تو شاعر کی رگ حمیت پھڑکتی ہے اور وہ اس جرأت، ہمّت، ایثار، کردار و گفتار کو بروئے کار لاتا ہے جس نے عاشق کو واقعی عاشق بنایا ہے اور جو اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے ایک تو کیا ہزار

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
ڈبلیو ۵۷، گریٹر کیلاش، پارٹ I، نئی دہلی

جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ اب شاعر کسی حد تک کرخت لہجے میں دوسرے مصرعے میں ناصح سے دور ہو جانے کو کہتا ہے۔

"دُور پہلو سے مرے دور سرک جاؤ مجھے"

ایک سیدھا سادہ سا مصرع نظر آتا ہے لیکن اگر آپ اس پر ذرا غور فرمائیں گے تو آپ پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ اس مصرعے میں علامہ نے اپنے شعوری بلوغ، بے پناہ حوصلہ، لاانتہا محبّت اور بے کراں خود اعتمادی کا کس قدر اچھے اور موزوں الفاظ میں مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے فرہاد کو پہاڑ کا جگر چیرنے کا عزم بخشا، یہی وہ اندرونی قوت ہے جس نے مجنوں کو برسوں تپتے صحراؤں میں دشت نوردی کی توفیق عطا فرمائی۔ یہی وہ احساس ہے جو اجل کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔

حضرات! یہ میں جانتا ہوں کہ بعض ناقد حضرات اس شعر کے دوسرے مصرعے کی ردیف پر اعتراض کریں گے لیکن انھیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں شاعر نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک مجاہد میں ہوتے ہیں اور مجاہد روزِ اوّل سے ہی اپنی دُھن کا پکّا ہوتا ہے۔ شاعر نے بیشک دیدہ و دانستہ ردیف کو محکم سے محکم تر کر دیا ہے اور اس اصول پر عمل کیا ہے کہ ہر شعر میں قافیہ تو بدلتا رہتا ہے لیکن ردیف اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم رہتی ہے۔ چنانچہ "سرک جاؤ مجھے" کا جملہ رکھ کے علامہ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ روایتی ردیف فضول اور بے معنی ہُوا کرتی ہے۔ اس سے علامہ کے شعوری بلوغ، اس کی ندرت، جرأت، فصاحت، زورِ بیان اور قوتِ زبان کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ردیف کے اس استعمال سے علامہ نے اپنی ترقی پسندی اور فرسودہ روایات سے بغاوت کا بھی اعلان فرمایا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کچھ حضرات اس ردیف کو بے معنی اور غیر ضروری قرار دیں گے لیکن کئی حضرات اسے زبان کے ارتقا کی علامت گردانیں گے، اور ہو سکتا ہے کہ اسی ایک شعر پر آنے والی نسلیں قیامت تک بحث کرتی رہیں۔ اگر ایسا ہوا تو علامہ مرحوم کا نام نامی قیامت تک زندہ و تابندہ رہے گا کہ وہ اہلِ سخن اہلِ قلم حضرات کے لیے ایک ایسا موضوع چھوڑ گئے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تحقیق، تنقید و تجسس کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

حضرات! میں ابھی اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن صاحب صدر نے چوتھی بار مجھ کو اشارہ کیا ہے کہ میں اپنا مقالہ ختم کروں، چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے" اور انشاء اللہ قیامت تک روتی رہے گی لیکن علامہ بقول صحرائی ایسا دیدہ ور دوبارہ چمن میں پیدا نہیں ہوگا۔

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوائیے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبّی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

—— ادارہ

ناصر زیدی

وہ ایک شخص کہ جس سے شکایتیں تھیں بہت
وہی عزیز، اُسی سے محبتیں تھیں بہت
وہ جب مِلا تو دِلوں میں کوئی طلب ہی نہ تھی
بچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت
پہنچ گئے سرِ منزل تری تمنّا میں،
اگرچہ راہ کٹھن تھی صعوبتیں تھیں بہت
وہ یوں مِلا ہے کہ جیسے کبھی مِلا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت
ہمیں خُود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رُسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت
ہمارے بعد ہُوا اُس گلی میں سنّاٹا ــــ!
ہمارے دم سے ہی ناصر حکایتیں تھیں بہت

۳-سی، خیابانِ آباد ۲، مری روڈ، راولپنڈی

ایک سودائے سفر تھا جسے سر میں رکھّا
مجھ کو بے سمت ہواؤں کے اثر میں رکھّا
سرکشی کا بھی مری لے لیا بدلہ اُس نے
مجھ کو اندیشۂ امکانِ دگر میں رکھّا
چشمِ طوفاں میں تو محفوظ رکھی اپنی ذات
عمر بھر مجھ کو مگر اُس نے بھنور میں رکھّا
ایک تاریخِ ولادت تھی مری، ایک وفات
ایک سُرخی کے سوا کیا تھا خبر میں رکھّا
برق رکھّی بھی تو اسرارِ بدن میں رکھّی
سانپ کو اُس نے ثمر بار شجر میں رکھّا
حُسن کے باب میں آنکھوں کو چمک دی اُس نے
دل کو احساس دیا، دردِ جگر میں رکھّا
شب چراغ اُس نے عطا کر تو دیا، پر صہبا
زندگی بھر مجھے پھر موم کے گھر میں رکھّا

صہبا وحید

سیکٹر ۴۴/۱۱۴۴، ۱۲، آر.کے. پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

○

زمیں اپنی نہ حصّہ کبھی تھا آسماں میں
انا آئی یہ کیسی حسابِ دوستاں میں
رفاقت کا ہر اِک سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے
ہواؤں کا گذر ہے ہمارے درمیاں میں
جسے ہر حال میں قتل ہونا ہے رفیقو
وہی کردار ہوں میں تمھاری داستاں میں
مجھے ڈھونڈو کہ مشکل نہیں پہچان میری
کہ برگِ سبز ہوں میں خزاں کے کارواں میں
تمھارے نام کے لفظ میں پھر لکھ رہا ہوں
یہی اک حرزِ جاں ہے طلسمِ این و آں میں
مناظر بین کرتے ہیں اِن راہوں میں صہب
بچھا ہے دامِ جادو کا شہرِ بے اماں میں

(آخری قسط)

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

مقبرہ حضرت نظام الدینؒ

بعض موّرخین نے لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے لڑکے خضر خاں نے حضرت نظام الدینؒ کی زندگی ہی میں اُن کا مقبرہ تعمیر کروادیا تھا، لیکن وفات سے قبل حضرت نے وصیت کی کہ انھیں اس مقبرے میں دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ انھیں مقبرے کے باہر دفن کیا گیا اور خضر خاں کے بنائے ہوئے مقبرے کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا، جسے اب جماعت خانہ کہتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت نے خود اپنی زندگی میں وہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا، جس میں وہ مدفون ہیں۔ بہر حال یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

درگاہ کے شمال میں جو چھوٹا سا دروازہ ہے اور جسے مالن دروازہ کہتے ہیں، اگر اس دروازے سے درگاہ میں داخل ہوں تو تقریباً بیس گز کے فاصلے پر حضرت کا مقبرہ ہے۔ درگاہ کا پورا صحن سنگِ مرمر کا تھا جسے محمد شاہ بادشاہ نے بنوایا تھا۔ کچھ ماہ قبل یہ فرش از سرِ نو بنوایا گیا ہے۔ مقبرہ تیس مربع فٹ ہے۔ اور چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ اس چبوترے پر سنگِ مرمر کے بیس ستون ہیں۔ اسی لیے بعض کتابوں میں اس مقبرے کو "بست دری" بھی لکھا گیا ہے۔ مقبرہ اندر سے اٹھارہ مربع فٹ ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے، جس پر سنگِ موسیٰ کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔

گنبد کے اُوپر سنہری کلس ہے۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چار برجیاں ہیں۔ حضرت کی قبر کے اطراف سنگِ مرمر کا دوفٹ اُونچا کٹہرا ہے۔ بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ پہلے یہ مقبرہ بغیر چھت کے تھا۔ محمد شاہ تغلق نے اس پر گنبد بنوایا، جو گر گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے گنبد، حجرے کے اندر کی دیواروں اور جالیوں کی مرمت کرائی۔

۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں سیّد فرید خاں نے سنگِ مرمر کی لوح نصب کی، جس پر یہ قطعہ درج ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

شکر کہ در روضۂ حضرت غوث الانام
از پئے تعمیر شد خان فلک احتشام
مہر نسب را شرف اوج شرف را شہاب
سیّد عالی نسب میر فلک احترام
بانی او ہاشمی ساعی او ہاشمی
آنکہ بدوران شاہ ہست سخن را نظام
از پئے تاریخ آں چوں متفکر شدم
کلک خرد زد رقم قبلہ گہ خاص و عام
روئے بدرگاہ او آر فریدوں بصدق
شاید از الطاف پیر کار تو گردد نظام

کاتب حسین احمد چشتی

جہانگیر کے عہد میں نواب فرید خاں نے ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں مزار پر بہت خوبصورت چھپر کھٹ چڑھایا۔ اس چھپر کھٹ پر سیپ سے پچی کاری کا بہت خوب صورت کام ہے۔ اس چھپر کھٹ کے چاروں طرف سیپ کی پچی کاری سے یہ اشعار منقوش ہیں:

شیخ دہلی نظام راہ و فرید
کار دُنیا و دیں مہیّا کرد
یک فریدش مقامِ فانی داد
یک فریدش مقام احیا کرد
مرتضیٰ خاں فراز مرقد او
قبّہ چوں سپہر برپا کرد
ابر فیروزی از جہاں برخاست
درّ یکدانہ در صدف جا کرد
بر جہاں کعبۂ مربع او
چادر از چہار حدوا کرد
عرشۂ مرقد مبارک او
بر زمیں کار عرش اعلیٰ کرد
عرش در پائے چار قائمہ اش
چار تکبیر بے محابا کرد
ہر کہ رخ از مقام او تابید
پشت بر کعبۂ معلّا کرد

خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو (ہند)، راؤز ایونیو نئی دہلی ۲

زانکہ او در سجود او آورد
رخ چو آئینۂ مصفا کرد
خاک روب مقامش ار باشی
میتواں کرد صد مسیحا کرد
سال تاریخ این بنا جستم
قبّۂ عقل شیخ القا کرد

۱۰۱۱ھ
قدر بانی او رفیع کناد
آنکہ این ہفت سقف خضرا کرد

کا بنا ہوا ہے۔ سرسیّد نے اس مجر کی خوب صورتی کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سر سے پاؤں تک ایک نور کا ٹکڑا ہے۔ اگر منزلِ ماہ کہوں تو بھی بجا ہے کہ اس میں ماہ پارہ مکین ہے اور اگر مکانِ نور کہوں تو بھی دُرست ہے کہ یہ خورشید طلعت کا مکان ہے۔"

(آثار الصنادید، کراچی ایڈیشن، ص ۴۵)

سرسیّد نے یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں آرا نے "تین کروڑ روپے کا اپنا تمام مال و اسباب یہاں

لیکن اب دروازے نہیں ہیں۔ ہاں دروا
چولوں کے نشان باقی ہیں۔ چاروں کو
برجیاں تھیں۔ اب اُن کے آدھے آدھے
گئے ہیں۔ حجرے کے وسط میں جہاں آرا
قبر ہے۔ سنگِ مرمر کی لوح قبر پر سنگِ
پچی کاری سے یہ شعر اور عبارت درج
ھوالحی القیوم
بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار م
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید
خواجگانِ چشت بنتِ شاہ جہاں
بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ
۱۰۹۲ھ

اس مجر میں تین قبریں اور ہیں
سنگین بیگ اور سرسیّد نے یہ نہیں بتا
تین قبریں کس کی ہیں۔ بشیر الدین احمد
لکھا ہے کہ جہاں آرا بیگم کی قبر کی داہنی
شاہ عالم بادشاہ کے لڑکے مرزا نیلی ا
طرف اکبر شاہ ثانی کی لڑکی جمال النسا
قبریں ہیں۔ جنوب کی طرف ایک چھوٹی
جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اکبر شا
کی لڑکی کے بچّے کی قبر ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی ابدی آرام گاہ

مختلف حضرات نے اس مقبرے کی جو مرمّت کرائی ہے، اس کی تفصیل کے لیے بشیر الدین احمد کی "واقعاتِ دار الحکومت دہلی" کا حصّہ ۲ (ص ص ۷۸۹-۷۹۲) ملاحظہ ہو۔

جہاں آرا بیگم کا مجر

حضرت نظام الدینؒ کے مقبرے کے پائیں میں تین حجرے ہیں۔ مغرب کی طرف پہلا حجرہ شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا ہے، بغیر چھت کا یہ مجر پورے کا پورا سنگِ مرمر

کے خادموں کو دے کر یہ زمین اپنے مدفن کو مول لی تھی، لیکن عالم گیر نے دو کروڑ روپیہ اس میں سے لے لیا اور کہا کہ تہائی سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں"۔

(آثار الصنادید، کراچی ایڈیشن، ص ۴۵)

کہتے ہیں کہ جہاں آرا نے یہ حجرہ خود اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ مجر سولہ فٹ لمبا، بارہ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ اُونچا ہے۔ ہر دیوار میں تین تین دلے ہیں اور ہر دلے میں سنگِ مرمر کی انتہائی خوبصورت جالی لگی ہوئی۔ اس مجر کے دروازے چوبی تھے

محمد شاہ بادشاہ کا مجر

جہاں آرا بیگم کے مجر سے ملحق م
طرف سنگِ مرمر کا بنا ہوا ایک اور
جس میں چھے قبریں ہیں۔ درمیان میں
بڑی قبر محمد شاہ بادشاہ کی ہے۔ اس
داہنی طرف محل خاص نواب صاحبہ م
ہے۔ اس کے پائیں میں محمد شاہ کی ا

کی قبر ہے، جس کی شادی مجبوراً محمد شاہ نے نادر شاہ کے لڑکے سے کی تھی۔ اس کے داہنی طرف محمد شاہ کی اسی لڑکی کی کم سن لڑکی کی قبر ہے۔ اس مجر میں دو قبریں اور ہیں، جن کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔ اس مجر کا ساز بھی بالکل وہی ہے، جو جہاں آرا بیگم کے حجرے کا ہے، یعنی بیس فٹ لمبا، سولہ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ اُونچی چار دیواری۔ اس کا دروازہ بھی سنگِ مرمر کا ہے۔ یہ دروازہ اب بھی بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس حجرے کے چاروں کونوں پر مینارے تھے۔ ان میناروں کے اُوپر کے حصّے گر چکے ہیں۔

مرزا جہانگیر اور مرزا بابر کا مجر

محمد شاہ بادشاہ کے مجر کے مشرق میں ایک اور مجر ہے۔ یہ بھی سرتاپا سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور بے سقف ہے۔ یہ مجر ساڑھے چار فٹ اُونچی کرسی دے کر بنایا گیا ہے۔ بیس فٹ لمبا اور سولہ فٹ چوڑا ہے۔

مشرقی اور مغربی دیوار کے درمیان میں دروازے ہیں اور دونوں طرف دو دو دلے ہیں، جن میں بہت خوب صورت سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ مشرقی دیوار کے ایک دلے کی جالی بالکل ٹوٹ گئی ہے، شمالی اور جنوبی دروازوں میں دو دو دلے ہیں، لیکن جالی صرف ایک ایک دلے میں لگائی گئی ہے۔ چاروں کونوں پر مینارے تھے، جواب ٹوٹ چکے ہیں۔

مرزا جہانگیر اکبر شاہ ثانی کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے دِلّی کے ریذیڈنٹ سٹین پر پستول چلائی تھی، وہ بال بال بچ گیا۔ برطانوی حکومت نے سزا کے طور پر انھیں الٰہ آباد بھیج دیا تھا، جہاں ۱۸۲۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز نے مرزا جہانگیر کی لاش دلی منگواکر یہاں دفن کی اور ۱۸۳۲ء میں سنگِ مرمر کا یہ مجر بنوایا۔

اس مجر میں چار قبریں ہیں۔ مغربی دیوار سے ملی ہوئی۔ اکبر شاہ ثانی کے ایک اور صاحبزادے مرزا بابر کی قبر ہے۔ اس کے پاس مرزا جہانگیر کی قبر ہے۔ دو اور قبریں ہیں۔ یہ بھی شاہی خاندان کے افراد کی ہوں گی۔ ایک دلچسپ حقیقت کی طرف بشیر الدّین احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ مرزا بابر کی قبر کا تعویذ اُن کا نہیں ہے بلکہ کسی میر محمد نامی شخص کے مزار کا تعویذ اُکھاڑ کر لگا دیا گیا ہے۔ اسی طرح مرزا جہانگیر کے مزار کا تعویذ کسی خاتون کے مزار کا ہے، کیوں کہ اس پر تختی بنی ہوئی ہے۔

مجر کے مشرقی دروازے سے راستہ ایک مکان میں جاتا ہے۔ جہاں مرزا بابر کی بیوی اور دوسرے افراد کے مزارات ہیں۔

درگاہ امیر خسرو

امیر خسرو کو اپنے مرشد حضرت نظام الدّین اولیاؒ سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو جب حضرت کا وصال ہوا تو امیر خسرو لکھنوتی میں تھے۔ پیر و مرشد کے انتقال کی خبر سُن کر دلّی روانہ ہوگئے۔ انھیں حضرت نظام الدّینؒ کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ انھوں نے سیاہ لباس اختیار کر لیا اور برابر چھ مہینے تک مزار کے پائیں بیٹھے رہے۔ ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۵ھ کو خالقِ حقیقی سے جاملے۔ اور اپنے مرشد کے پائیں میں دفن ہوئے۔ امیر خسرو کی درگاہ، حضرت نظام الدّینؒ کی درگاہ کے جنوب میں ایک الگ احاطہ میں ہے۔ حضرت نظام الدّین کی درگاہ سے امیر خسرو کی درگاہ کے لیے ایک راستہ ہے۔ ۱۹۱۹ء (سنہِ تالیف واقعاتِ دارالحکومت دہلی) تک اس راستے پر ایک دروازہ تھا، جسے درمیانی دروازہ کہا جاتا تھا۔ اس دروازے کے بارے میں بشیر الدّین احمد مرحوم نے لکھا ہے کہ "حضرت سلطان المشائخ اور حضرت امیر خسرو کی درگاہوں کے درمیان جو دروازہ ہے، وہ درمیانی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس دروازے کو سفیدی کی تہ چڑھا چڑھا کر خراب کر دیا گیا۔ اس کے روکار پر کچھ اشعار معلوم دیتے تھے، جن کو کھرچوانے اور صاف کرانے سے یہ قطعۂ تاریخ نکلا، جس پر پہلے کسی کی نظر نہیں پڑی۔ یہ قطعہ عربی خط میں ہے۔

قطعہ

بدورِ سعد ابوالعدل شاہ عالم گیر ثانی
بنائے ساخت جواہر درے برائے ثواب
بہ ہوشیار علی خاں چہ مژدہ ہاتف داد
کشاد بابِ کریم مفتح الابواب"

(واقعاتِ دارالحکومت دہلی، حصہ ۲ صفحہ ۸۱۶)

پندرہ بیس سال قبل بہت تیز آندھی آئی تھی۔ امیر خسرو کی درگاہ کے صحن میں کھرنی کا ایک درخت ہے۔ آندھی کے زور سے اس درخت کا حصّہ اس دروازے پر اس طرح گرا کہ دروازہ منہدم ہوگیا۔ اس دروازے کی سنگِ بست کی بنی ہوئی ایک محراب ہے، جواب درگاہ کے صحن کے ایک کونے میں رکھی ہوئی ہے۔ اس دروازے کا پتھر کا ایک ستون بھی صحن میں رکھا ہے۔

امیر خسرو کی درگاہ کے صحن میں داخل ہو

یہاں حضرت امیر خسروؒ محو استراحت ہیں

تو بائیں طرف حضرت محبوب الٰہی کے مصلّی دار، خاص و خرقہ پوش حضرت خواجہ ابوبکر چشتی نظامی سید بخاریؒ کا مزار ہے۔ اس مزار کے پائیں میں محبوبِ الٰہی کے خلیفہ اور حضرت خواجہ ابوبکر کے صاحبزادے، حضرت خواجہ عزیز کا مزار ہے۔ اس کے بعد صحن میں کئی قبریں ہیں صحن کے جنوب میں ایک چبوترہ ہے، اس پر بھی بہت سی قبریں ہیں۔ صرف دو قبروں پر کتبہ ہے۔ اس چبوترے پر چار حجرے ہیں جو مختلف سجادہ نشینوں کے قبضے میں ہیں صحن کے جنوب مشرقی کونے میں ایک حجرہ ہے۔ جس پر ٹین کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے:

"یہ وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت محبوبِ الٰہی دن کے وقت قیلولہ فرماتے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضور محبوب الٰہی کے وصال کے بعد مولانا شمس الدین نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور دوسرے بزرگان کی موجودگی میں محفلِ عرس منعقد ہوا کرتی رہی ہے۔"

امیر خسرو کا مزار اور اُس کا صحن جس چبوترے پر ہے، اسے چبوترۂ یاراں کہا جاتا ہے۔ یہ وہ چبوترہ ہے، جہاں حضرت سلطان المشائخ اپنے حلقے کے لوگوں سے گفتگو فرماتے تھے۔ اس چبوترے پر جن بزرگوں کی قبریں ہیں، وہ یارانِ چبوترہ کہلاتے ہیں۔ بشیر الدین احمد نے واقعاتِ دارالحکومت، حصہ ۲ میں ان میں سے بعض بزرگوں کے نام لکھے ہیں۔ درگاہ کی لمبائی ایک سو گیارہ فٹ اور چوڑائی اکیاون فٹ ہے امیر خسرو کے مجرے کے جنوب میں مجرے کے دروازے کے سامنے دو قبریں ہیں۔ مغرب کی طرف کی قبر مشہور تاریخ داں ضیاء الدین برنی اور جو قبر مشرق کی طرف ہے وہ شمس الدین عفیف کی بتائی جاتی ہے۔ عفیف کی قبر کے پائیں سے ایک زینہ خواجہ حسن ثانی نظامی کے گھر کو جاتا ہے۔ ضیاء الدین برنی کے مزار کے مغرب میں ایک دالان ہے۔ اسے مرزا اکرام اللہ کا دالان کہا جاتا ہے۔ اس دالان کے شمالی رُخ پر تین محرابی در ہیں اور مشرق اور مغرب میں ایک ایک محرابی در ـــــ دالان میں چار قبریں ہیں کسی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔ دالان کی جنوبی دیوار پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبے پر اس طرح سفیدی پھیری گئی کہ عبارت پڑھنی بہت مشکل ہے۔ مرزا سنگین بیگ نے یہ کتبہ نقل کیا ہے، جو دو فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ اشعار یہ ہیں:

اکرام ز لطفِ نورِ حق داشتہ ضو
چوں ذرہ ز آفتاب دارد پر تو
آسود بپائے خسرو و سیّد گفت
اکرام بیا سود بپائے خسرو

(سیر المنازل، ص ۷۹)

مرزا اکرام اللہ کے دالان کے مشرقی پاکھے کے ایک حصّے پر سفیدی کر کے سیاہی سے علامہ اقبال کے تین شعر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار خواجہ حسن نظامی مرحوم نے لکھوائے تھے۔

حضرت سلطان المشائخ کے
دربار میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا
معروضہ

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جن کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

مرزا اکرام اللہ کے دالان کے مغرب میں درگاہ کا ایک دروازہ ہے۔ جس کا نام قطبی دروازہ ہے۔ اب یہ دروازہ مقفل رہتا ہے۔

امیر خسرو کے مجرے کے چاروں طرف احاطہ ہے، جس میں سنگِ سُرخ کی جالیاں لگی ہوئی

ہیں۔ شمال کی طرف ہر جالی پر دو دو مصرعے کندہ ہیں۔ ایک زمانے میں جالیوں پر اس طرح چونا پھیر دیا گیا تھا کہ یہ اشعار سفیدی میں چھپ گئے تھے۔ بعد میں کھرچ کھرچ کر یہ اشعار نکالے گئے۔ اور جالیوں پر سُرخ رنگ کر دیا گیا۔ یہ اشعار تعداد میں نو ہیں:

شہ ملک سخن خسرو پیرو سالار درویشاں
کہ نامش ہست بر لوحِ جہاں چوں نقش در خارا

چناں در صورت خوبی سخن پرداز شد طبعش
کہ ازپی داد ازاں صورت بخوبی لوحِ ہستی را

شدہ غواص دریائے تفکر و ز محیط فضل
بروں آورد درہائے معانی را ازاں دریا

بسال پنج پنج و ہفتصد از ہجرت حضرت
زدار الملک دنیا کرد رحلت جانب عقبا

بشد سالہے مرغ روحش سدرہ ماوا شد
ندائے ارجعی چوں در رسید از عالم بالا

گزشتہ بود سی و ہشت و نہصد سال از ہجرت
بدوران ہمایوں بادشاہ غازی دانا

شہنشاہی کرمی شاید اگر گرد و بیاں دایم
دعای دولتش گویند نزد ربی الاعلے

رفیع القدر صاحب دولتی پاکی کہ در عالم
تہ ہر دست دنیا شد مثل از بے مثل بے سما

خدایا تا جہاں باشد بدولت باشد و بادش
خداوند جہاں یار و معین و ناصر الاعدا

حجرے کے باہر شمال کی طرف اور حجرے کے احاطے کے اندر سنگ مرمر کی ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ بابر بادشاہ کے زمانے میں سید مہدی نامی ایک امیر نے امیر خسرو کی قبر کا چوبی کٹہرا ۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں بنوایا اور روضے کے باہر قبر کے سرہانے یہ تختی لگوائی۔ تختی آٹھ فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی ہے۔ تختی پر مثبت حروف میں یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

زمین را ازین لوح شد سر فرازی
بدوران بابر شہنشاہ غازی

میر خسرو، خسرو ملک سخن
آن محیط فضل و دریای کمال

نثر او دلکش تر از ماءِ معین
نظم او صافی تر از آب زلال

بلبل دستان سرای بیقرین
طوطی شکر مقالِ بے مثال

از پے تاریخ سال فوت او
چون نہادم سر بزانوی خیال

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او
دیگرے شد "طوطی شکر مقال"

جنوب کی طرف سے روضے میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طرف روضے سے باہر لیکن روضے کے احاطے کے اندر ایک قبر ہے۔ یہ قبر امیر خسرو کے بھانجے خواجہ شمس الدین ماہر کی بتائی جاتی ہے۔ مقبرے کا بیرونی حصہ تیس فٹ لمبا اور بائیس فٹ چوڑا ہے۔ اندر سے مقبرہ پندرہ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ہے۔

حجرے کے اندر کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے بہت خوب صورت آرائش کی گئی ہے۔ حجرے کے باہر جو سجادہ نشین بیٹھے تھے اُن کا کہنا ہے کہ پہلی بار حجرے کی آرائش جہاں آرا نے کرائی تھی۔ بعد کے زمانوں میں کئی بار رنگ و روغن کیا گیا، لیکن ہمیشہ اُسی آرائش اور روغنوں کے رنگوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں روغن کیا گیا تھا۔ اور پھر ۱۹۸۷ء میں بعض حصوں کو درست کیا گیا تھا۔

امیر خسرو کے مقبرے کے اندر جالیوں کے اُوپر یہ فارسی اشعار اور عبارت کندہ ہے:

ای شربت عاشقی بجامت
وز دوست زمان زمان پیامت

در سیر مسافت دو عالم
واصل بمسافت دو گامت

شد سلک فرید از منظوم
زانست کہ شد لقب نظامت

صد جان لطیف و پاک را چرخ
بگداختہ و سرشتہ نامت

سوداز دگان عشق حق را
تسکین ز مفرح کلامت

درگاہ تو کعبۂ ملائک
پران چو کبوتران ز بامت

جاوید بقاست بندہ خسرو
چون شد بہزار جان غلامت

طرف جنوبی معمای خسرو:
مرا نام نیک است و خواجہ سلیم
دو شین و دو لام و دو قاف و دو میم
اگر نام یابی توزین حرف ہا
بدانم کہ ہستی تو مردے [illegible]
کاتب مذکور نبیرۂ شیخ فرید [illegible]

مزار کے سرہانے مقبرے کی دیوار ... درمیانی طاق پر یہ عبارت کندہ ہے:

[illegible] نور الدین محمد
بدور شہنشاہ عالم پناہ ابو المظفر
بادشاہ عادل جہانگیر غازی خلد اللہ
ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ واح...

گلابی موسم کی سیڑھی

پرندے شور کر رہے ہیں۔ (شاید صبح ہو چکی ہے)۔

وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو ذرا وا کرتا ہے۔ سورج کی کرنیں بند کھڑکی کے شیشوں سے گذر کر کمرے کو جگ مگ کر رہی ہیں۔ وہ یوں ہی غنودگی کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔ سورج کی روشنی میں ہاتھ منوّر ہیں لیکن وہاں انگلیوں کی بجائے سبز پتّے چمک رہے ہیں۔ اس کی نظریں پیروں کی طرف بڑھتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ پیروں سے ریشم کی طرح مہین جڑوں کا ایک جال نکل کر پورے کمرے میں پھیل گیا ہے۔ ہر طرف جڑیں ہی جڑیں سرسرا رہی ہیں۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا ہے اور اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دوبارہ دیکھتا ہے۔

"نہیں تو! پتّے یہاں کہاں۔ ہاتھ پاؤں تو اپنی صحیح حالت میں ہیں لیکن ایسا بار بار ہو رہا ہے۔"

وہ کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ کمرے میں روشنی ہے۔

وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اپنے آپ میں بہت سی لہریں ہیں۔

"میرے اندر یقیناً ایک بہت پُر اسرار اور تناور درخت ہے جو بہت دنوں سے میرے وجود میں شور کر رہا ہے، جھوم رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کی جڑیں اکثر کمرے سے نکل کر بہت دُور تک دوڑ جاتی ہیں اور اس کے پتّے سارے آسمان پر چمکنے لگتے ہیں۔ یہ درخت بہت ہی پُر اسرار ہے۔ اس کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں مجھ پر ایک تنویمی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ یا یہ خود مجھے مسحور کر دیتا ہے۔ اکثر محسوس ہوتا ہے کہ یہ درخت شاید میرے فن کی علامت بن کر میرے وجود میں پھیل رہا ہے۔ لیکن میرے اندر کے اس خزانے کو یہاں جانتا ہی کون ہے۔ ہر نیا عہد ایک بڑے فن کار کو دریافت کرتا ہے اور یہ درخت شاید اپنے عہد کو ہی ڈھونڈ رہا ہے جو یہیں کہیں روپوش ہے۔ کوئی ایسا زلزلہ ضرور آنا چاہیے کہ میں پتّھروں کی قید سے آزاد ہو کر چاروں سمت بکھر جاؤں... پھیل جاؤں۔ جنگل کی تیز ہوا کی طرح۔"

وہ ہوا کی تیزی کو محسوس کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

ہوا بہت ہی تیز ہے۔ جنگل سمندری طوفان کی طرح شور کر رہا ہے۔ گھاس پھوس اور پتّے اُڑ رہے ہیں۔ شاخیں لہرا لہرا کر ٹوٹ رہی ہیں۔ درخت اکھڑ رہے ہیں اور پتّوں کا سیلاب دوڑتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ چاروں سمت پتّوں کا بھنور ہے۔ اچانک ایک طرف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ بھیانک آگ۔ دھواں ہی دھواں، شعلے ہی شعلے ـــــ اور تیز ہوا آگ اور شعلوں کی باڑھ لیے ایک ننھے منّے گلاب کے پودے کی طرف بڑھتی ہے۔

وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔

باہر آنگن میں برگد کے درخت کے نیچے
اس کی ننھی منّی بچّی اپنے لگائے ہوئے گلاب کے
پودے کو پانی دے رہی ہے۔

وہ سوچتا ہے "میری طرح اس بچّی
کو بھی پیڑ پودوں سے بہت دلچسپی ہے۔"

وہ خوش ہو کر وہیں سے چلّاتی ہے۔"
جی! جلدی آؤ۔ دیکھو تو سہی..."

وہ اس کے قریب جاتا ہے۔

"ابّا جی" وہ خوش ہو کر کہتی ہے۔ "د
آج اس پودے میں دو نئی پتّیاں نکلی ہیں۔"

"ارے واہ۔ بیٹا اب تمھارا یہ گلاب
پودا بہت جلد بڑا ہو جائے گا۔"

"لیکن ابّا۔ کتنے دن ہو گئے۔ یہ تو بڑ
ہی نہیں ہے اور جولی نے جو پودا لگایا تھا
کتنا اُونچا ہو گیا ہے جیسے شہ پرین۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔" وہ سوچتا
"یہ پودا جُوں کا تُوں ہے اور جولی کا پودا
تیزی سے بڑھ رہا ہے۔"

"اور ابّا جی، امّی کہہ رہی تھیں کہ
کبھی نہیں بڑھے گا کیوں کہ یہاں کی ز

سلطان سبحانی
۱۹۷، ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی، مالیگاؤں (ناسک) ۰۳

...رہے۔"

"بیٹا تمھاری امّی تو میرے بارے میں بھی ...ی کہتی ہے لیکن دیکھو، اگر یہ زمین بنجر ہوتی تو ...د کا یہ درخت اتنا ہرا بھرا اور اُونچا نہ ہوتا۔ ...ے نا۔"

"ہاں ـــ تو پھر یہ پودا بڑھتا کیوں ...یں۔"

"ہاں... لیکن بیٹا فکر مت کرو۔ کسی ...ن میں اس کی جڑوں میں ڈھیر ساری کھاد ...نچاؤں گا۔ پھر دیکھنا..."

اور وہ خود دیکھتا ہے کہ چاروں طرف ...ین جڑیں سرسرا رہی ہیں۔ آسمان پر ...ے شمار پتّے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے ہیں ...ور ہر پتّے سے اس کا اپنا چہرہ جھانک رہا ہے۔ ...ڑیں سرحد بہ سرحد پھیلتی جا رہی ہیں اور وہ ...ک شگفتہ، تازہ اور گلابی موسم کی سیڑھی سے ...ر کر سب کی آنکھوں میں سرایت کر رہا ہے۔

اور گلاب کا پودا؟

سیڑھی اچانک کہیں سے ٹوٹ جاتی ہے۔

شام میں گھر واپس آکر جب وہ آنگن ...یں برگد کے درخت کے نیچے آرام کرسی پر ...یم دراز ہو جاتا ہے تو بچّی چہرے پر ایک عجیب ...سا سوالیہ نشان لیے کچھ کھوئی کھوئی سی اس کے قریب آتی ہے۔

"کیا اباجی۔ امّی مجھے اٹھا کر پلنگ پر ...ٹھیں گی، میں تب سُدھروں گی؟"

"ایں؟" وہ سر اٹھا کر اس کی طرف ...حیرت سے دیکھتا ہے۔ "ارے بیٹا تمھاری امّی ... تو کچھ بھی کہتی رہتی ہے۔ تم دھیان مت ... دیا کرو۔"

"اور اباجی، امّی کہہ رہی تھیں کہ تمھارا اور تمھارے ابا دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو کیا ابا ہم دونوں کا دماغ خراب ـــ ہو گیا ہے؟"

"نہیں تو بیٹے... اچھا یہ بتاؤ آج تم اسکول گئی تھیں؟"

"ہاں گئی تھی۔" وہ خوش ہو کر کہتی ہے۔ مس نے آج ایک بہت اچھی پوئم یاد کروائی ہے۔

"Here We go round The
Mulberry bush."

"واہ بیٹا شاباش۔"

"اباجی آج گلاب کے پودے کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت تتلی آئی تھی لیکن وہ اس پر بیٹھی نہیں، چلی گئی مُنہ پُھلا کر..."

"بیٹا جب یہ پودا بڑا ہو جائے گا اور اس میں بہت سارے پھول کھلیں گے تو بہت ساری تتلیاں آئیں گی۔ خوبصورت، رنگ برنگی، طرح طرح کے نقش کی..."

وہ سوچ میں کھو گیا۔ "اس پودے کو جلد سے جلد بڑھنا چاہیے۔ روشنی، ہوا، پانی، مٹّی سب کچھ موجود ہے تو یہ بڑھتا کیوں نہیں۔ اور میرے اندر جو درخت ہے..."

"اباجی!"

"ہاں بیٹا۔" وہ چونک اٹھتا ہے۔ "میں ذرا کچھ سوچ رہا تھا۔"

"اباجی تم پتہ نہیں کیا سوچ سوچ کر کالے دُھس ہوتے جا رہے ہو۔"

وہ ہنستا ہے "بیٹے میں تمھارے گلاب کے پودے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندر جو درخت ہے اس کی بھی یہی حالت ہے..."

"تمھارے اندر؟"

وہ چونک اٹھتا ہے۔ "نہیں بیٹا کوئی درخت نہیں، یہ تو صرف ایک خیال ہے۔"

سورج کی روشنی میں کمرہ چمک رہا ہے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ جڑوں کا جال پورے کمرے میں پھیل گیا ہے اور اس کے سارے جسم سے کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں۔ دھانی کونپلیں اور ہاتھوں پر گہری سبز پتیاں جو کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا میں آہستہ آہستہ جھوم رہی ہیں اس کی آنکھیں پتیوں اور جڑوں کے جال میں کھو سی جاتی ہیں۔ اچانک وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک بہت بلند اور قدآور درخت اس کے جسم سے چھلانگ لگا کر علاحدہ ہو گیا ہے اور اس کی شاخوں نے چمکتے ہوئے سورج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

"اجی سُنتے ہو ـــ کب تک سوتے رہو گے؟"

بیوی کی آواز سُن کر وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھتا ہے۔

"ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔"

"آرہا ہوں۔ بس ابھی آیا۔"

ناشتے کے دوران اس کی بیوی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"یہی کہ بہت دنوں سے تم کہاں چلے گئے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تم اپنے اندر موجود نہیں رہتے۔ بہت پُر اسرار ہوتے جا رہے ہو۔"

ہر وقت سوچ میں گم۔ ایسا لگتا ہے کہ تمھیں کسی نے کچھ کر دیا ہے۔"

"مجھے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ میں اس وقت ایک عجیب کشمکش میں ہوں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اپنی بچّی نے گُلاب کا جو پودا لگایا ہے وہ بڑھ نہیں رہا ہے۔"

"تو کیا ہوا — یہ تو کوئی اہم بات نہیں۔"

"میں اسے بہت اہم سمجھتا ہوں کہ ایک معصوم بچّی کی محنت یوں رائگاں جا رہی ہے اس پودے کے بارے میں اس نے جتنے خواب دیکھے تھے سب مایوسی میں سما گئے۔ یہ پودا اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اندر سے دُکھی ہو۔"

"تم بہت گہرائی سے سوچ رہے ہو۔"

"نہیں، میں آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی رہا ہوں۔ میں خود ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوں کہ میرے ذہن میں اب صرف تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔ میں نے اپنے فن کے لیے زندگی بھر جو محنت کی ہے کسی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میرے اندر جو فنکار چھپا بیٹھا ہے وہ بے شک عظیم ہے لیکن اسے سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ دُنیا صرف تماشے دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہے جس کی وجہ سے اچھے اور سچّے فن کار گمنامی میں دفن ہو جاتے ہیں اور تماشے دکھانے والے مُستند، مشہور اور معروف"

"تو کچھ تماشے تم بھی دکھا دو۔"

"کیا کروں؟ سات سمندر پار چلا جاؤں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لوں، کالج کا لکچرار بن جاؤں لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو جاؤں یا کسی ریڈیو اسٹیشن میں گھس جاؤں؟ میرے نزدیک یہ سب باہر کے جھمیلے ہیں۔۔۔ یہ درخت دیکھ رہی ہو تم۔۔۔؟"

"کون سا درخت؟" وہ اسے حیرت سے دیکھتی ہے۔

"ہاں تم اسے نہیں دیکھ سکو گی۔ میرے اندر جو درخت ہے اسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کسی بھی زلزلے کا شکار نہ ہو۔"

"تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تمھارا دماغ۔۔۔ خیر۔۔۔ میرا خیال ہے تم کسی بڑے فن کار سے مشورہ کر لو۔ ممکن ہے کوئی راستہ مل جائے۔"

"بڑا فن کار صرف سند دے سکتا ہے۔"

"تو پھر خود کو دماغ کے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھا دو۔" وہ ہنستی ہے۔ "اجی جناب بڑا فن کار تمھارے اندر کے فن کار کو سمجھ بھی تو سکتا ہے۔ سُنا ہے کہ کوئی بھی بیل بغیر سہارے کے آگے نہیں بڑھتی۔"

"سہارا؟" وہ چونک اٹھتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جسم کے اندر بہت ساری ندیاں سمندر کی موجوں کی طرح شور کر رہی ہیں اور ایک شاخ اتنی بلند ہو گئی ہے کہ اس کے گرد ستارے چمکنے لگے ہیں۔ اس کی نظریں آنگن میں کھڑے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑتی ہیں۔ اسے دیکھ کر وہ مُسکرا دیتا ہے۔

اپنی ساری جڑیں، سارے پتّے اور ساری شاخیں سمیٹ کر وہ ایک سلاخ سے گلاب کے پودے کے گرد کی مٹّی کھودتا ہے۔

"ابّاجی، یہ کیا کر رہے ہو؟"

"بیٹا آج ہم اس پودے کو ڈھیر ساری کھاد دیں گے۔ پھر یہ خوب خوب بڑھے گا۔"

"اچھا!" وہ خوش ہو جاتی ہے۔

وہ مٹّی کھودنے لگتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ سلاخ مٹّی میں کہیں اُلجھ گئی ہے
وہ متحیر ہو کر وہاں کی مٹّی ہٹاتا ہے تو دیکھتا ہے
چاروں طرف سے باریک باریک جڑوں کے گچھے
آکر پودے کے جسم سے لپٹ گئے ہیں۔

"ارے ابّاجی! یہ اتنی ساری جڑیں کہ
سے آگئیں؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے — پھر اُ
دیکھتا ہے۔

اُوپر برگد کی شاخوں اور پتّوں کا ایک
مہیب گھنا آسمان۔

"بیٹا گلاب کا یہ پودا یہاں زندہ نہیں
سکے گا۔ اسے کوئی چوس رہا ہے۔" وہ بچّی سے کہ
"اسے اُکھاڑ کر اب ہم کسی گملے میں لگا دیں گے

"کیوں ابّاجی؟"

"بیٹا! اس دُنیا میں برگد کے درخ
بہت ہیں۔ اور ان کے سائے بھی بہت۔
پودے کو صرف اپنے سہارے سے آگے بڑ
ہے۔"

وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جسم
پتّوں کے شور اور جڑوں کی طغیانی سے
رابطہ توڑ لیا ہے۔ وہ خود کو بہت پُرسکون م
کر رہا ہے اور ایک شگفتہ، تازہ اور گلا
کی سیڑھی اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

سورج کی روشنی میں کمرہ چمک
رہا ہے۔

کھڑکی کے شیشوں سے باہر وہ دیکھ
گملے میں لگے ہوئے گلاب کے گھنے پودے میں
پھول کھلے ہوتے ہیں جن پر طرح طرح کے نق
رنگ برنگی تتلیاں رقص کر رہی ہیں اور اس
اس منظر کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔

اکیسویں صدی میں
آبادی گھٹاؤ مہم

بادی کا دباؤ بڑھا جب زمین پر
سخے تمام ہوگئے ناکام سربسر
سیلاب و قحط و جنگ و وَبا سب تھے بے اثر
سبندی و نرودھ ہوں یا فرقہ واریت
چھلی صدی میں کر نہ سکے جب مدافعت
آبادی اور تیز بڑھی کینسر صفت
ارباب حل و عقد نے آخر یہ طے کیا
آدم نے کی تھی خُلد سے ہجرت کی ابتدا
اکیسویں صدی میں ہو ہجرت سُوِ خلا
تھا حسنِ اتفّاق کہ اس دور کا بشر
پہنچا تھا ایک جست میں دُنیا سے چاند پر
سوچا گیا کہ بوجھ زمیں کا ٹلے اُدھر
شقّ القمر کا معجزہ تھا اک اشاریہ
تسخیرِ کائنات کا آتے گا مرحلہ
ہوگا وسیع عظمتِ انساں کا دائرہ
بے آب و بے گیاہ تھی لیکن وہ سرزمیں
موجود اُس کُرے پہ ہوا بھی نہ تھی کہیں
اک دشتِ بے پناہ تھا وہ اور کچھ نہیں
ٹکنولوجی کو لایا گیا پھر بروے کار
بھیجے گئے ربوٹ کے دستے سُوِ مدار
کمپیوٹروں نے دھانگ دیا چاند کا دیار
مشہورِ روزگار تھی بوفورس کمپنی
لک بیک کے اصول پر جو کاربند تھی
اس کاروبار پر وہی مامور کی گئی

پتھّر پہ دُوب جمنے کی مشہور تھی مثل
اس کی بنا پہ تجربہ گہہ میں ہوا عمل
علمِ کیمسٹری نے کیا مسئلے کو حل
آلاتِ برقیہ نے گھٹاؤں کو موڑ کر
بھیجا سمندروں سے خلا میں سُوِ قمر
بارش کی پہلی بوند پڑی ماہتاب پر
چلنے لگے خلائی جہازوں کے کارواں
بھنڈار اوکسیجن کا زمیں سے گیا وہاں
روئیدگی نے پہلے پہل لیں جماہیاں
تیّار کیمیا سے ہوئیں ایسی چادریں
حِدّت کو آفتاب کی جو معتدل کریں
ذی رُوح ہستیاں نہ تمازت سے جل مریں
پیدا ہوئے وہاں پہ جب آثارِ زندگی
ماحولِ خُفتہ ہوگیا سرشارِ زندگی
چلنے لگا زمیں کی طرح کارِ زندگی
بستی بسائی جانے لگی ماہتاب پر
بھیجے گئے خلائی بسوں سے وہ سب بشر
اربابِ اقتدار کو رہتا تھا جن سے ڈر
تھے حزبِ اختلاف کے جو لوگ بھی جہاں
چھاپہ پڑا ٹھکانوں پہ اُن سب کے ناگہاں
بھیجا حکومتوں نے اُنھیں سُوے آسماں
نقّاد و شعر ساز و فسانہ نویس بھی
آبادی جن کی چاروں طرف بے شمار تھی
پُشتِ زمیں تھی بوجھ سے جن کے دبی ہوئی

ایسے تمام لوگوں کو ویزا دیا گیا
جنگی لیول پہ کام یہ پورا کیا گیا
آبادی کے نظام میں ٹھہراؤ آگیا
پہنچے جو ماہتاب پہ انساں کے قافلے
زور آوروں نے ایسے علاقے ہڑپ لیے
زرخیز و خوشگوار جو تھے ہر لحاظ سے
کمزور کا جو حال تھا روے زمین پر
ارضِ قمر پہ جاکے ہوا اور خستہ تر
ان کو وہاں بھی مل نہ سکا گھاٹ ہو کہ گھر
مطلق نہ فرق آیا بشر کی سرشت میں
سب جانتے ہیں اس نے کیا جو بہشت میں
یعنی کبھی تمیز نہ کی خوب و زشت میں
قابیل نے فساد کا بویا تھا جو شجر
اس کے قلم کو لے کے گئے چاند پر بشر
ہونے لگا وہاں بھی تماشاے جنگ و شر
چنگیز اور ہلاکو و ہٹلر کے جانشیں
اسٹار وار کا لیے ہتھیار، آتشیں
روکے ہوئے ہیں سانس، نشانے پہ ہے زمیں
اِک لفظِ کُن سے خلق ہوئی تھی جو کائنات
اِک جوہری دھماکے کی زد میں ہے، اُس کی ذات
اکیسویں صدی میں نہ دم توڑ دے حیات!

رضا نقوی واہی
گردنی باغ، پٹنہ

اقبال کی اختر شناسی

ماقبلِ تاریخ جب تمدنِ انسانی نے آنکھیں کھولی تھیں اور تہذیب کا سورج زندگی کے افق پر ابھی تھرتھرا ہی رہا تھا کہ کسی نے آسمانوں کی بے کراں وسعتوں میں ماہ و انجم کی سبک رفتاری کا مشاہدہ کیا ہوگا اور اس حقیقت سے آگاہ ہوا ہوگا کہ ہر رات ستاروں کے قافلے ایک ہی راہ سے نہیں گزرتے، بعض قافلے اپنی گذرگاہیں بدلتے ہیں۔ انسان کا یہ مشاہدہ قدیم ترین سائنس کا پہلا تجربہ تھا جس سے علمِ نجوم کی بنیاد پڑی۔

دورِ جدید کے ترقی یافتہ انسان نے سائنسی آلات کی مدد سے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ شمس و قمر کے علاوہ بھی دیگر سیّارے سیّارۂ ارضی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح ماضی بعید کی قدیم ترین سائنس (علم نجوم) کے حقائق جدید ترین سائنسی علوم کی رو سے صحیح ثابت ہوچکے ہیں۔ ماہرینِ علمِ نجوم کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ سیّارگانِ فلک زمین پر ہی نہیں، اہلِ زمین پر بھی اپنے اثرات ڈالتے رہتے ہیں۔ امیر خسرو اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں گواہی دیتے ہیں کہ:

"زحل و مریخ بھی ہر شخص کی زندگی میں ایک بار سعد ہوجاتے ہیں"[10]

بعض مفسرینِ قرآن نے آیتِ کریمہ "فَالمُدَبِّرَاتِ اَمراً" سے استدلال کیا ہے اور اُسے "وَالسّٰبِحٰتِ سَبحاً" کا فعل قرار دیا ہے۔

یعنی تیزی سے تیرتے پھرنے والے ہر کام بناتے ہیں۔ اُن کے نزدیک "تیرتے پھرنے والوں" سے مراد سیّارگانِ فلک ہیں۔ "نقشِ سلیمانی" میں حضرت عباسؓ کے حوالے سے کہا گیا ہے:

"علمِ نجوم کا نفع دینے والا ہے اور اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے ہیں۔ ان کی سیر و سیاحت سے اس عالم میں تغیرات ہوتے ہیں اور کیفیاتِ عالم کو متغیر کرتے ہیں، اسی واسطے ان کو مدبّرِ عالم کہتے ہیں۔"[11]

ایک فارسی تفسیر "تفسیرِ حسینی" میں اس آیتِ کریمہ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"گفتہ اند مقسم بنجوم ست کہ شتاباں میروند از مشرق بمغرب و روند از برجے بہ برجے و سیاحت می کنند در فلک و برہم دیگر پیشی می گیرند۔ در سیر مدبرا انند امرے را کہ بدیشاں باز بستہ قسمت باذن اللہ"[12]

سیّارگانِ افلاک کے زمین پر برپا ہونے والے اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ سعد و نحس۔ جس طرح اللہ رب العزت نے ادویہ و سموم میں خاصیتِ شفا و ایذا رکھ دی ہے، اسی طرح سیّاروں کو بھی سعادت و نحوست کی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ انھیں صفات کی بنا پر بعض سیّارے مسعود مانے جاتے ہیں اور بعض منحوس۔

نظامِ شمسی میں ان سیّاروں کی گردش معیّن ہے۔ ماہرین نے اس گردش کی بارہ منازل مانی ہیں، جو اصطلاح نجوم میں "برو…
کہلاتی ہیں۔ دورانِ گردش سیّارے ایک…
معیّنہ وقت میں ان بروج میں سے ہوکر گزر…
ہیں۔ سیّاروں کا ان میں داخل ہونے کا وقت…
بھی ماہرین کے نزدیک سعد و نحس ہوتا ہے…
اس طرح یہ ایک بڑا ہی وقیع علم ہے جو بحیثیت…
فن بھی مشہور ہے اور بصورتِ سائنس بھی ا…
کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بحیثیت فن و سائ…
علم نجوم پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں…
لیکن ادبِ عالیہ میں اِسے بہت کم برتا گیا ہے…

اس فن کو ادب میں سب سے پہ…
پیش کرنے کا سہرا محی الدّین ابن العر…
(م ۱۲۴۰ء) کے سر ہے۔ انھوں نے "فتوح…
مکیہ" میں سبعہ سیّارگان کا ذکر نہایت…
شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ اِسی طرز…
اطالوی شاعر دانتے (م ۱۳۲۱ء) —…
ڈیوائن کامیڈی (طربیۂ خداوندی) لکھی…
جس میں سیرِ افلاک کے ساتھ ہی سیّار…
اور جنت و دوزخ کے حالات پیش کیے گئے…
فارسی ادب میں "نہ سپہر"، "بوستانِ خیا…

سیّد یحییٰ نشیط

کالی (دولت خاں) یوتمال ۴۴۵۲۰

اور اقبال کی "جاوید نامہ" بھی اسی قبیل کی مثنویاں ہیں، جن میں علمِ نجوم کے نکات نہایت ماہرانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

"جاوید نامہ" ایک علوی سفر نامہ ہے۔ شاعر نے اپنی پروازِ تخیل سے ساتوں آسمانوں اور سیّاروں کے علاوہ افلاک سے پرے فلک الافلاک تک کی سیر کی اور اس کی روئداد "جاوید نامہ" میں پیش کر دی ہے۔ "سماوی سفر" پر مشتمل کئی ادب پارے مختلف زبانوں میں ملتے ہیں۔ ہومر کی اوڈیسی (ODY-SSY) آسمانی سفر کی سب سے قدیم روئداد ہے۔ عربی میں ابن شہید الاندلسی (م ۱۰۳۲ء) اور ابوالعلا المعری (م ۱۰۵۵ء) نے بھی اسی قبیل کی کتابیں لکھی تھیں جو بالترتیب رسالۃ التوابع والزوابع اور رسالۃ الغفران کے نام سے معروف ہیں۔ ان دونوں کتابوں پر واقعۂ معراج سے متعلق احادیث نبوی کا زبردست اثر دکھائی دیتا ہے۔ اطالوی شاعر دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس میں بھی آسمانی سفر کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے ادب پارے مستقل بالذات ہیں پھر بھی بقول سعید احمد اکبرآبادی:

"ان میں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ یونانی اثرات بھی پائے جاتے ہیں، چنانچہ دانتے کے زمانے میں واقعۂ معراج پر اسپانوی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں میں تین تراجم موجود تھے"[۵]

جہاں تک اقبال کے "جاوید نامہ" کا تعلق ہے، تو اس کا واقعۂ معراج سے بالراست متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ خود اقبال بھی "علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا 'معراج نامۂ جدید' لکھنا چاہتے تھے"[۶] لیکن "جاوید نامہ" سیاحتِ آسمانی کی روئداد ہونے کے باوجود معراج نامہ نہیں ہے۔ اقبال نے تو اسے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے جواب میں لکھا تھا۔ خود اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ "یہ نظم (جاوید نامہ) ایک قسم کی ڈیوائن کامیڈی ہے"[۷]۔

"جاوید نامہ" میں اقبال نے سیاحتِ علوی کی ابتدا فلکِ قمر سے کی ہے۔ بعدہٗ وہ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کی سیر کر کے افلاک سے پرے فلک الافلاک کی طرف نکل جاتے ہیں۔ "نہ سپہر" میں حضرت امیر خسرو نے یہ سیاحت فلک الافلاک سے زمین کی جانب کی تھی۔ گویا جاوید نامہ میں عروج کی کیفیت ہے اور نہ سپہر میں تنزیل کی

سیّارۂ قمر علمِ نجوم کی رو سے سریع السیر ہے، مزاج اس کا آبی نہایت ٹھنڈا اور نرم ہے۔ ذائقہ اس ستارے کا نمکین اور رنگ سفید مائل بہ زرد ہے۔ خاصیت اس کی سعد اصغر ہے۔ فلک اوّل اس کا مسکن ہے۔[۸] "جاوید نامہ" میں اقبال کی پہلی منزل بھی قمر ہے۔ زندہ رود رومی یہاں سب سے پہلے اقبال کو "جہاں دوست" سے ملاتے ہیں۔ "جہاں دوست" کا لفظی ترجمہ "وشوامتر" ہے اور شارحین نے یہی معنی مراد لیے ہیں، لیکن "جہاں دوست" کی جو لفظی تصویر اقبال نے کھینچی ہے وہ سرتاپا شنکر جی پر صادق آتی ہے۔ مثلاً:

موئے بر سر بستہ و عریاں بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن

یہ ساری خصوصیات "شنکر" کی ہیں، "وشوامتر" کی نہیں۔[۹] برادرانِ وطن کی مذہبی روایات میں بھی چاند اور شنکر دیوتا کا خاص تعلّق ہے۔ دوشنبہ یعنی پیر کو ہمارے یہاں "سوموار" یعنی چاند کا دن کہا جاتا ہے اور شنکر کو "سوم ناتھ" یعنی چاند کا آقا۔ شنکر کی تصویر میں بھی چاند ان کے ماتھے پر دکھایا جاتا ہے۔ ماہرینِ نجوم نے چاند کی اٹھائیس منازل مانی ہیں اور ہر منزل کو ایک نام دیا گیا ہے۔ البیرونی نے ان منازل کے متعلق ایک ہندوی روایت لکھی ہے کہ یہ پرجاپتی کی اٹھائیس لڑکیاں تھیں جن سے چاند نے شادی کر لی تھی۔ چاند کو چوتھی لڑکی روہنی (چاند کی چوتھی منزل) بہت پسند آئی تھی اس لیے وہ دوسری بیویوں پر روہنی کو ترجیح دینے لگا۔ پرجاپتی نے چاند کو بہت سمجھایا کہ ساری بیویوں کو ایک جیسا چاہیے، لیکن چاند پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پرجاپتی نے بددعا دی، جس کے اثر سے چاند کے چہرے پر کوڑھ کے داغ پڑ گئے۔ بددعا کا اثر زائل کرنے کے لیے پرجاپتی نے شنکر کے لنگ کی پوجا کرنے کا مشورہ دیا۔ وغیرہ۔[۱۰] یہ روایت بھی چاند اور شنکر کے تعلّق کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال غالباً ان روایات اور علمِ نجوم کے نکات سے آگاہ تھے تبھی تو انھوں نے فلک قمر پر شنکر کو دکھایا ہے۔ "جہاں دوست" کے علاوہ رومی انھیں گوتم بدھ اور رقاصہ امرپالی سے بھی ملاتے ہیں۔ چاند کی "وادیٔ یرغمید" میں جسے فرشتے "طواسین" کہتے ہیں، اقبال کی ملاقات گوتم بدھ سے ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان کی قدیم روحانیت اور فلسفۂ حیات شاعر کو

سمجھاتے ہیں۔ آگے چل کر شاعر کی ملاقات امر پالی سے ہوتی ہے جس نے گوتم بدھ کے ہاتھوں پر بیعت کرلی تھی۔ یہ رقاصہ عشوہ فروش فلکِ قمر کی خموشی سے تنگ آچکی ہے۔ تھرکنا اور مچلنا جس کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہو، جس کی فطرت میں اضطرار و اضطراب اور سوز و شورش ہو اور سیمابیت جس کی طبیعت میں ہو، وہ قمر کے پرسکون ماحول میں کیوں نہ گھبرا اٹھے؟ امر پالی اقبال سے کہتی ہے[۱۰]:

تا بفراغ خاطرے، نغمہ تازہ اے زنم

باز بہ مرغزار دہ، طائر مرغزار را

طبع بلند دادہ ای بند ز پائے من کشائے

تا بہ پلاسِ تو دہم خلعتِ شہریار را

گوتم و امر پالی کو چاند پر مقیم بتانے میں بھی علم ہی کا نکتہ مضمر ہے۔ امر پالی "رقاصہ قدیم" مشہور ہے اور رقص کے دیوتا نٹ راج (شنکر) کو اس فن میں پوجا جاتا ہے۔ اس طرح چاند، شنکر جی اور امر پالی ایک دوسرے سے نسبت رکھتے ہیں۔ چاند کا گھٹنا، بڑھنا بھی رقص کی حرکات کا غماز ہے۔ چاند کے پرسکون ماحول، اس کی سرد مزاجی اور بارد طبیعت ہی کی مناسبت سے اقبال نے قمر کی وادی طواسین کو طاسین مسیحؑ، طاسین محمدؐ اور طاسین گوتم کا مسکن قرار دیا ہے کہ یہ سارے پیغمبرانِ حق امن پسند تھے۔ نرمی ان کی خو تھی، ظلم اور زیادتی اور سختی کے وہ کبھی پیرو کار نہیں بنے۔

ماہرینِ نجوم کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہلال اور بدر بالوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہلال بالوں کے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور بدر ان کے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

سیّارۂ قمر کے ان دونوں اثرات کی علامات شنکر اور گوتم بدھ ہیں۔ شنکر اپنی جٹاؤں کے لیے مشہور ہیں اور گوتم بدھ اپنے منڈھے ہوئے سر کے لیے۔ سر منڈھے ہوئے گوتم بدھ اور جٹا دھاری شنکر کا تعلق علمِ نجوم کی رو سے سیارۂ قمر سے جوڑا جاسکتا ہے اور قیاس یہی کہتا ہے کہ اقبال نے انھی نکات کی بنا پر فلکِ قمر پر گوتم اور شنکر کو دکھایا ہے۔

فلکِ قمر کی سیاحت کے بعد اقبال بتدریج اوپر اٹھتے چلے جاتے ہیں اور فلکِ مریخ پر پہنچتے ہیں۔ از روئے علمِ نجوم مریخ کا مزاج آتشی ہے اور رنگ سرخ ہے۔ انسانی زندگی میں یہ عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے لیکن اس کے منفی اثرات سے فتنہ و فساد بھی پیدا ہوتے ہیں۔ گویا سیارۂ مریخ منفی اعتبار سے انتشار، بدامنی اور اضطرابی کیفیات کا حامل ہے اور مثبت شکل میں یہ جہدِ مسلسل، تگ و دو اور باقاعدہ حرکت کا محرک ہے۔ اسی لیے مریخ کے زائیدہ لوگ بڑے جفاکش، شجیع اور حریت پسند ہوتے ہیں۔ اقبال نے فلکِ مریخ پر حکیم مریخی کے ذریعے تقدیر کے ایسے نکات بیان کیے ہیں جن سے مسلسل جدوجہد کرنے کی ترغیب اور تقدیر پر تکیہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کے بجائے عمل کی تحریک ملتی ہے۔ یوں بھی اقبال کے نزدیک تقدیر کا اتباع آدمی پر جمود طاری کر دیتا ہے۔ وہ عمل سے زندگی کے جنت یا دوزخ میں تبدیل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"اگر عالم پہلے سے بندھے ٹکے مقاصد (تقدیر) کے حصول کا پابند ہے تو ہماری دنیا آزاد، ذمہ دار اور اخلاقی انسانوں کی دنیا نہ ہوگی، بلکہ وہ ایسی کٹ پتلیوں کی تماشہ گاہ بن جائے گی جن کی ڈور کو پیچھے سے کوئی کھینچ کر حرکت دیتا ہو"[۱۱]

بہرکیف سیارۂ مریخ پر اقبال کا تقدیر پر تدبیر یا عمل کو ترجیح دینے کا جواز پیش کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مریخ کے اوصاف اور اس کے اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ اقبال نے فلکِ مریخ پر ایک تجدد پسند فرنگی عورت سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ فرنگی عورت کا حریت پسندانہ مزاج اور کچھ کر گزرنے کا ٹھوس ارادہ نیز جارحانہ اندازِ بیان، یہ ساری صفات سیارۂ مریخ کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں۔ فرنگی عورت کو سیارۂ مریخ پر بتانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علمِ نجوم کی رو سے یہ سیارہ ملک انگلستان سے تعلق رکھتا ہے[۱۲]۔

مریخ کی سیر کرنے کے بعد اقبال زندہ رود رومی کے ہمراہ مشتری ہوتے ہوئے فلکِ زحل پر پہنچتے ہیں۔ علمائے نجوم کے نزدیک زحل منحوس سیارہ مانا گیا ہے۔ مزاج اس کا خاکی اور منقلب ہے۔ اس کا رنگ سیاہ اور ذائقہ کسیلا ہے۔ یہ عامل فلکِ ہفتم کا ہے۔ زحل بڑا ہی مشکل پسند واقع ہوا ہے، اسی لیے اس کے زائیدہ لوگ اپنی مشکل پسندی کی بنا پر بڑے بڑے دشوار گذار کام کرلیتے ہیں۔ چونکہ سیارۂ زحل کا تعلق ہندوستان سے ہے، اسی وجہ سے اقبال نے "جاوید نامہ" میں فلکِ زحل پر "روحِ ہندوستان" کو دکھایا ہے۔ "جاوید نامہ" کی تخلیق ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء کے درمیان ہوئی[۱۳]۔ یہ دور ہندوستان پر انگریزوں کے ظلم و زیادتی کا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی حالت خستہ تر

ہوگئی تھی۔ اقبال نے ہندوستان کی اس حالت کی مناسبت سے سیارۂ زحل پر اُسے نہایت غمگین وسوگوار بتایا ہے۔ آہ وفغاں اس کے ہونٹوں پر جاری ہے اور وہ نہایت ہی فسردہ لہجے میں ہندوستان کی روبہ زوال حالتِ زار کا بیان کرتی ہے۔ میر جعفر و صادق جو مادرِ ہند کے ناہنجار کپوت تھے، ان کی روحیں چولا بدل بدل کر ہندوستان کو تباہ کررہی ہیں۔ یہ دونوں رُوحیں کسی لباس میں بھی ہوں ملت کش رہیں گی۔ بیت العذاب یعنی دوزخ نے بھی انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اقبال نے ان ارواحِ خبیثہ کو سیّارۂ زحل میں فریاد کناں بتایا ہے۔ "بندۂ غدّار را مولا کجاست؟" یہ جو یاس و درماندگی ہے جو ناامیدی ونامرادی ہے، جو خجالت وشرمندگی ہے، وہ ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن جعفر وصادق کے لیے موت کے بعد بھی مقدر بن گئی ہے۔ ان دونوں کو اقبال نے ایسے سیّارے کے خونیں دریا میں موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دکھایا ہے جو از روے علم نجوم منحوسِ اکبر ہے، سیاہ رو اور کڑوا کسیلا ہے۔ مادرِ وطن کے غدّاروں کو نحسِ اکبر سیّارۂ زحل میں بھی سکون وقرار نہیں ہے۔ اقبال نے سیاہ رو غدّارانِ وطن کی نحوست کی مناسبت ہی سے انھیں سیاہ رنگ منحوس سیّارۂ زحل میں مقیم بتایا ہے۔

یہ چند اشارات ہیں، جو اقبال کی اختر شناسی پر دلالت کرتے ہیں۔ ہاں! اقبال نے کبھی کسی سیارۂ فلک کو اپنی قسمت کا ذمّہ دار نہیں سمجھا۔ انھوں نے تو علی الاعلان کہہ دیا کہ: "بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم" صورتِ حال جب یہ ہو تو: "ستارہ کیا (اسے) تقدیر کی خبر دے گا"۔

حواشی

۱۔ امیر خسرو فلک الافلاک کا ماہِ نو (ڈاکٹر حسن آرزو) مشمولہ "معارف" مارچ ۷۸ء، ص ۲۰۳۔

۲۔ خواجہ اشرف علی: نقشِ سلیمانی: دہلی تاریخ ندارد، حصّہ چہارم، ص ۹۔

۳۔ القرآن (ترجمہ وتفسیر) مطبع الانوری اکبرآباد، ۱۳۱۵ھ، ص ۱۲۲۴۔

۴۔ سعید احمد اکبرآبادی "رسالۃ الغفران" مشمولہ "ارمغانِ مالک" دہلی ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۲۔

۵۔ عبدالسلام ندوی: اقبالِ کامل، اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۰۔

۶۔ علامہ اقبال: اقبال نامہ، مشمولہ اقبالِ کامل، اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۲۔

۷۔ علامہ اقبال: "جاوید نامہ" لاہور تاریخ ندارد مختلف صفحات۔

۸۔ جگن ناتھ آزاد: "اقبال اور ہندوستانی تمدّن"، مشمولہ نگار لکھنؤ اکتوبر ۵۴ء، ص ۲۷۔

۹۔ البیرونی: "کتاب الہند" مشمولہ عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۹۸۔

۱۰۔ یوسف حسین خاں: روحِ اقبال، حیدرآباد ۱۹۴۲ء، ص ۷۰۔

۱۱۔ علامہ اقبال: (المترجم سیّد نذیر نیازی) تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، حیدرآباد، ص ۵۲

۱۲۔ کلام الدین و ڈاکٹر عبدالحق: اسلامی محمدی بڑی تقویم، بمبئی ۱۴۰۶ھ، ص ۹۸۔

۱۳۔ عبدالسلام ندوی: اقبالِ کامل، ص ۱۰۰۔

خیمے

بڑا بھیانک طوفان تھا۔ صبح سے ہی آسمان کالے کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی بوندا باندی کی توقع تو تھی مگر یہ اُمید نہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان اس قدر سیاہ پڑ جائے گا اور ٹھنڈی ٹھنڈی بہتی ہوئی ہوا آندھی کی صورت اختیار کرے گی۔ بادبان زوروں سے ہل رہے تھے اور معمولی سی کشتی (شیشم کی لکڑی کے تختوں کی مدد سے تیار کی ہوئی) سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ کشتی میں صرف دو ہی مسافر تھے۔ ایک بوڑھی عورت ایک اُس کا جوان لڑکا۔

"اب کیا ہوگا؟" بوڑھی عورت کی آنکھوں سے گھبراہٹ جھانک رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا۔" نوجوان بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ "کشتی شاید طوفان کا مقابلہ نہ کر پائے۔"

"کشتی ڈوب سکتی ہے؟"

"ہاں ڈوب سکتی ہے۔"

"پھر ہمارا کیا ہوگا؟" بوڑھی عورت کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

"ہمت!" نوجوان آہستہ سے بولا۔ "ایسے وقت میں ہمت کا دامن چھوڑنا نہیں چاہیے۔ مستقل مزاجی ہی ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب کر سکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اُس نے چپّو چلانا پھر شروع کیا۔ طوفان بڑھتا جا رہا تھا اور کشتی ڈگمگا رہی تھی۔

"تم کشتی پیچھے نہیں لے جا سکتے؟"

"نہیں لے جا سکتا۔" نوجوان نے بہت تھوڑے لفظوں کا سہارا لیا — "اور ماں تم چاہتی ہو ہم پھر وہیں جائیں جہاں خیموں میں بٹے لوگ اسلحوں سے لیس ہمارے انتظار میں ہوں کہ ہم آئیں تو ہماری بوٹی بوٹی کر کے چیل کوّوں کو کھلا دیں —"

"افسوس! دُنیا پر بُرا وقت آیا ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔"

"تم نے غلط سمجھا ماں۔ ایسا ہر زمانے میں تھا۔" ذرا ٹھہر کر... "افسوس ہم پیچھے نہیں جا سکتے۔ مگر تم گواہ رہنا کہ دُنیا کے بُرے سلوک نے ہی ہمیں اس سفر پر آمادہ کیا ہے۔"

"ہاں میں گواہ ہوں۔ مگر تم چپّو سنبھالو۔ کشتی کیسے ڈگمگا رہی ہے۔"

بوڑھی عورت اب پُرسکون تھی۔ آسمان بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ اتنا سیاہ کہ اب اُسے اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہیں دِکھ رہا تھا۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں یہیں ہوں اور کشتی کھے رہا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ بس دل ہی دل میں طوفان تھمنے کی دُعا کرو۔"

"دُعا میں طاقت ہوتی تو وہاں خیمے نہ بنتے اور خیموں میں لڑائیاں نہ ہوتیں۔ دُعائیں اپنا اثر کھو چکی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماں۔ مگر کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں۔ تم چپّو ٹھیک سے چلاؤ۔ جو ہوگا بہتر ہوگا۔"

سمندر کی لہریں گرج رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھیانک لہر اٹھتی اور کشتی بہت اُوپر تک اُٹھ جاتی مگر دوسرے ہی لمحے ایک نئی لہر آتی اور کشتی کو بہت نیچے پھینک دیتی۔

بوڑھی عورت زیرِ لب بڑبڑائی۔ "حرکت ہی زندگی ہے اور انسان بہرحال سب سے طاقتور ہے۔"

نوجوان خاموش رہا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ بوڑھی عورت کے لہجے میں جھوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اندھیرے کے باوجود اُسے دِکھ گیا تھا کہ کشتی میں سوراخ ہوگیا ہے اور اب پانی اُس میں داخل ہو رہا ہے۔ اور اب اُسے یہ بھی احساس ہوگیا تھا کہ سمندر بہرحال انسان سے زیادہ طاقتور ہے۔ کچھ ہی دیر میں یہ کشتی ٹوٹ جائے گی اور وہ سمندر کے رحم وکرم پر ہوں گے۔

مشرف عالم ذوقی

معرفت انجم شاہ، مارگ ٹریولس، ہوٹل جن پتھ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

"تم بولتے کیوں نہیں۔" بوڑھی عورت کی آواز میں عجیب سی گرمی تھی۔

نوجوان نے اب بھی حوصلہ نہیں چھوڑا تھا۔ "ماں تمہارے علم میں یہ بات لے آؤں کہ اب یہ کشتی ہماری تھوڑی دیر کی ساتھی ہے۔ اس لیے کہ کشتی میں سوراخ ہو گیا ہے اور پانی بھرتا جا رہا ہے۔ ہم زندہ رہے تو..."

بوڑھی عورت کی آواز لرز گئی مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے ہمت سے کام لیا۔

"تم تیرنا جانتے ہو؟"

"ہاں مگر سمندر کی لہریں سرکش ہیں۔"

"انسان سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ مجھے بھی تیرنا آتا ہے۔"

"مگر میرے مقابلے میں تمہاری ہڈیاں بوڑھی اور کمزور ہیں۔"

"تو بے وقوف ہے۔ امتحان کے وقت بزدلی کو آواز دیتا ہے۔ دیکھ لینا میں کس بہادری سے تیروں گی۔"

نوجوان اب پُرسکون تھا——

اور پھر ایک تیز لہر آئی۔ سمندر زوردار آواز میں گرجا۔ فضا میں ایک تیز چیخ گونجی۔ کشتی سمندر کی گہرائیوں میں جانے کہاں کھو گئی۔ طوفان آیا بھی اور طوفان گزر بھی گیا۔ اب سب کچھ شانت تھا۔ فضا شانت تھی۔ ایک ویران سا جزیرہ سامنے تھا اور اس غیر آباد سے لگنے والے جزیرے پر سمندر نے دونوں مسافروں کو لاکر پٹک دیا تھا۔

ذرا دیر میں نوجوان کو ہوش آگیا۔ دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ کپڑے پانی سے شرابور تھے۔ "اُف..." اُس نے آنکھ ملی۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سمندر کی لہریں اب خاموش تھیں۔ کچھ فاصلے پر درختوں کی قطار تھی۔ جو عجیب عجیب سے پھلوں سے لدے تھے۔ میٹھے ہوں گے اُس نے سوچا۔ اب کرنا کیا ہے جب قسمت یہاں لے ہی آئی ہے تو کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

"انسان سچ مچ سب سے طاقتور ہے۔"

نوجوان جسم جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ دوسری طرف اُس کی ماں بے سُدھ پڑی تھی۔

"ماں بھی زندہ ہے۔"

نوجوان بوڑھی عورت پر جھک گیا۔ بوڑھی عورت کی آنکھیں بند تھیں نبض دھیمے دھیمے چل رہی تھی۔ تو یہ زندہ ہے مگر ہوش میں نہیں۔ اسے پناہ چاہیے مگر پناہ کہاں ملے گی؟ فوراً اُسے خیال آیا۔ کہیں اس جزیرے پر انسان نہ بستے ہوں۔ اب انسان کہاں نہیں بستے۔ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ چاند ستاروں اور سیاروں پر بھی کھوج کرو تو قسمت کے مارے انسان مل جائیں گے۔ پھر معلوم ہوگا کہ جگہ کی تنگی سے گھبرا کر چُپ چاپ یہ آدم کے بیٹے چاند ستاروں پر بھی اوڑھنا بچھونا لے کر نکل آتے ہیں۔ اس لیے اس جزیرے پر بھی آبادی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہی سوچ کر نوجوان نے بوڑھی عورت کو آرام سے کندھے پر اُٹھا لیا جیسے شکاری رائفل یا سفری بیگ اُٹھاتے ہیں اور پناہ کی تلاش میں نکل گیا۔

پھر وہ چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ شاید گھنٹوں گزر گئے تھے۔ دُور تک آدم ذات کا پتہ نہیں تھا۔ بھوک لگی تو ایک درخت سے پھل توڑا۔ پھل کافی میٹھا تھا۔ پھل کھایا اور آرام کی سانس لی۔ قدم پھر تیز کیے اور اب اُس کی آنکھوں میں دوبارہ چمک نمودار ہوئی تھی مگر یہ چمک فوراً بجھ گئی۔ پھر وہی خیمہ۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

تو یہاں بھی ایک خیمہ ایستادہ تھا۔ بہت بڑا خیمہ۔ وہ ماں کو لیے تیز قدموں سے خیمے کی طرف بڑھا۔ خیمے کے اندر کا منظر وہ اس سے پہلے بھی اپنی دُنیا میں دیکھ چکا تھا۔ اندر بہت سے لوگ تھے۔ سارے کے سارے سفید لباس میں —— شاید عبادت کا وقت تھا اور وہ سجدے میں گرے تھے میز پر نورانی صورت والے ایک بزرگ بیٹھے تھے جو آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہے تھے اور کچھ عجیب سی آواز کمرے میں پھیل رہی تھی۔

دفعتاً نورانی صورت والے بزرگ نے اُسے دیکھ لیا۔ ان آنکھوں سے حیرت برستی تھی۔

"ٹھہرو"۔ وہ تیز آواز میں بولے۔ سجدے میں گرے ہوئے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بزرگ نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھایا۔ اب سب کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔ دفعتاً نورانی صورت والے بزرگ بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور اُس سے دریافت کیا۔

"نوجوان تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ لباس سے تو ہمارے خیمے کے نہیں لگتے۔ پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"خیمہ؟" نوجوان پھر چونک گیا تھا——

"یہ میری بوڑھی ماں ہے"—— اُس نے اشارے سے بتایا۔ "بے ہوش ہے ہمیں پناہ چاہیے۔"

"پناہ۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر کیا تمہارا تعلق ہمارے خیمے سے ہے؟"

"نہیں —— ہم اجنبی ہیں۔"

"اجنبی!" بزرگ کے ہونٹوں پر مایوسی تھی۔ "افسوس نوجوان۔ تمہارے لیے اس خیمے میں کوئی جگہ نہیں۔ تم کوئی دوسری جگہ تلاش کرو۔"

اِسی کے ساتھ بزرگ پلٹے۔ باقی لوگ پھر سے عبادت میں منہمک ہو گئے۔

نوجوان کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر کمزور چال سے آگے بڑھ گیا۔ اب اُس کے قدموں میں نقاہت آگئی تھی۔ بوڑھی ماں کا وجود بوجھ بننے لگا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک بار پھر ٹھہرا۔ آنکھوں میں تھوڑی چمک لہرائی یہاں بھی ایک خیمہ نصب تھا۔ کافی بڑا خیمہ۔ نوجوان تیزی سے آگے بڑھا۔ خیمے کے آگے رُکا۔ اندر جھانکا اور پھر اپنی جگہ جیسے تھم گیا۔ اندر ایک نیتا جیسا آدمی سفید ٹوپی پہنے، کھادی کے کُرتے پاجامے میں ملبوس ہاتھ نچا نچا کر تقریر کر رہا تھا۔ باقی لوگ سُن رہے تھے۔ سب کا لباس ایک جیسا تھا۔ سفید ٹوپی اور سفید کھادی کا کُرتا پاجامہ۔

"شاید یہاں پناہ مل جائے"۔ نوجوان نے سوچا۔

اور یہاں بھی وہی حادثہ ہوا۔ تقریر کرنے والے شخص نے اُسے دیکھ لیا۔ پھر تقریر روک کر وہ حیرت سے اُس کی طرف لپکا۔ اُس کے ہونٹوں پر بھی وہی مکالمہ تھا۔

"نوجوان۔ تم تو ہمارے خیمے کے نہیں لگتے۔ تمہارے سر پر سفید ٹوپی بھی نہیں ہماری طرح کُرتا پاجامہ بھی نہیں۔ پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"پناہ... مجھے پناہ چاہیے۔"

"پناہ"— اب وہ نیتا نما شخص ہنس رہا تھا۔ "افسوس نوجوان ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر کہیں سے تم ہمارا یہ لباس لے آؤ اور ہماری پارٹی جوائن کر لو۔ تو ہم تمہیں پناہ دے سکتے ہیں۔"

یہ لباس... اور پارٹی... نوجوان دھیرے سے بڑبڑایا۔ "یہ اُسے کہاں سے ملیں گے" اب وہ پوری طرح نا اُمید ہو چلا تھا۔ اب وہ کہاں جائے۔ کہاں پناہ تلاش کرے۔ اچانک وہ چونک گیا۔ کندھے پر پڑی ہوئی ماں کافی وزنی ہو گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ پلٹا۔ ماں اب ایک لاش تھی۔ بے حس و حرکت... اور یہ لاش کافی وزنی ہو گئی تھی۔

"ماں مر گئی۔ لیکن ماں کو کسی خیمے میں پناہ نہیں ملی۔"

نوجوان کے چہرے پر آگ سلگ رہی تھی۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ ان تمام خیموں میں آگ لگا دے۔ اُن خیموں نے اُس کی ماں کی جان لی ہے۔ پھر اُسے خیال آیا۔ خیموں کو جلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو بچ جائیں گے وہ پھر اپنا خیمہ بنا لیں گے... پھر وہ کیا کرے...

اچانک ایک خوب صورت سا خیال اُس کے دل میں آیا۔ کیوں نہ وہ خود ہی ایک خیمہ بنا لے۔ ایک الگ خیمہ۔ پُر اُمید چال سے وہ آگے بڑھا۔ درختوں پر طیور چہچہا رہے تھے۔ مگر چلتے چلتے وہ پھر ٹھہر گیا— کچھ سوچ کر ماں کی لاش کندھے سے اُتاری... نہیں وہ خیمہ نہیں بنائے گا... پھر اُس میں اور اُن خیموں والوں میں کیا فرق رہ جائے گا... وہ کوئی خیمہ نہیں بنائے گا...

نوجوان اپنے فیصلے سے مطمئن تھا۔ ماں کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر وہ پھر ایک نئے سفر کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا— ا ⬡

(ہیمنگ وے کے مشہور ناول "دَ اولڈ مین اینڈ دَ سی" سے متاثر ہو کر)

وفا ملک پوری

کبھی شجر تھا پر اب چوبِ خشک صحرا ہوں
عزیزو دیکھو کہ میں کیا تھا اور اب کیا ہوں

میں آدمی ہوں بنایا گیا ہوں مٹی سے
یقیں کرو کہ نہ میں سنگ ہوں نہ شیشا ہوں

جو دیکھنا ہے تو آؤ قریب سے دیکھو
کہ دُور سے تو بظاہر میں اک فرشتا ہوں

مری بلند نگاہی کی ہے خطا شاید
کہ اس بھری پری دُنیا میں بھی میں تنہا ہوں

وفا لباسِ قناعت کی ہے یہ پُرکاری
غریبِ شہر ہوں لیکن امیر لگتا ہوں

کاشانۂ وفا، پورنیا سٹی، ۸۵۴۳۰۲

جو تاریخ کے کچھ حوالوں میں تھا
وہی درد پاؤں کے چھالوں میں تھا

اندھیرے جہاں روز بکتے رہے
میں بازار کے اُن اُجالوں میں تھا

مسائل نے جو زہر اُگلا تھا کل
وہی آج میرے نوالوں میں تھا

جو ناکامیوں میں رہا کامراں
مرا نام ایسی مثالوں میں تھا

نہ کوئی تعلق، نہ کوئی لگاؤ
مگر ایک چہرہ خیالوں میں تھا

رضا تم نے مُنہ تو لگایا نہیں
وہی غم کا طوفاں پیالوں میں تھا

رضا امروہوی

پی اینڈ ٹی بلاک نمبر ۱۳، کوارٹر نمبر ۱ – سی، کالی باڑی مارگ، نئی دہلی ۱

پرکاش تیواری

ہرے پیڑوں پہ پل میں گُل کھلا دینا
رُتوں کا کھیل ہے پتّے سُکھا دینا

بیاباں ہو چلی ہے زندگی میری
مجھے تم زخم پھر کوئی ہرا دینا

تمھارے جسم میں جو مہکی مہکی ہے
وہی خوشبو مرے دل میں جگا دینا

اگر بزمِ جہاں میں زندہ رہنا ہے
دِیا احساس کا اے دل بُجھا دینا

سنو پرکاش یہ بھی ہوشمندی ہے
سمجھ کو طاق پر رکھ کر سجا دینا

۱۵۹/۲ لودھی روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

لیو ٹالسٹائی کا ایک ناقابلِ فراموش کردار

ایوان ایلچ

انسانی زندگی گوناگوں تاثرات، احساسات، جذبات، خواہشات اور تصورات کا ایک لامتناہی دھارا ہے۔ اور وہ انسان جس میں ذہنی توانائی اور جذباتی بہاؤ موجود ہے ہر روز نت نئے تجربات سے گذرتا ہے کسی نئے احساس کی ندرت اور جذبے کی شدت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی خواہشات کی گرمی اور تصوّرات کی رعنائی اسے زندگی کے نشاط دسرور سے ہمکنار کرتی ہے اور اس طرح اس کے لیے روزمرّہ کی زندگی بھی ایک دلچسپ، حیرت انگیز اور بامعنی تجربہ بن سکتی ہے لیکن زندگی کا یہ دھارا اس قدر بھرپور اور تیز رفتار ہے کہ ایک ذی روح اس ریلے میں بہہ تو سکتا ہے اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ لمحہ بہ لمحہ نئے تاثرات اور احساسات پُرانے نقوش کو دھندلاتے رہتے ہیں۔ ہاں لمحوں کے اس تسلسل میں چند لمحے اور انسانوں کے ہجوم میں چند چہرے ضرور اپنے ہوتے ہیں۔ جو اس کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور پھر وقت کے بے رحم ہاتھ بھی ان نقوش کو مٹانے میں ناکام رہتے ہیں۔

زندگی کے دھارے ہی کی طرح بھرپور اور اس سے بھی کچھ زیادہ معنی خیز، فکر انگیز اور تیکھا ادب کا دھارا ہے۔ جس میں لفظ و معنی کے سرچشمے ہمارے تخیل کی سرشاری، فکر کی بالیدگی اور احساس کی شائستگی کا سامان مہیّا کرتے ہیں۔ شعر کی نغمگی ہو، افسانے کا افسوں یا ناول کا نگارخانہ لفظ کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے لیکن یہاں بھی وہی مضمون ہے۔ یعنی:

"دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار"

انسان لاکھ چاہے کہ ادب کے خزانوں کو اپنے اندر سمیٹ لے لیکن انسانی ذہن بیک وقت ہر تاثر کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ وقت کی گرد رفتہ رفتہ ان نقوش کو بھی دھندلا دیتی ہے جو کبھی اس کے لیے سرمایۂ حیات تھے۔ لیکن یہاں بھی چند اشعار، چند تاثرات اور چند کردار ضرور ایسے ہوتے ہیں جو اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں اور جن کی گونج اسے اپنی روح کے نہاں خانوں میں اکثر سنائی دیتی ہے۔

یہ کردار عام طور پر تو وہ ہوتے ہیں جو یا تو خود غیر معمولی ہوں یا پھر کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہوں مثلاً مغربی ادب میں ہیملٹ، کنگ لیر، ایڈی پس، اورس ٹیز، فاؤسٹ وغیرہ یا پھر دیو مالائی کردار جیسے پرمیتھیوس، سسی فس وغیرہ جو تہ در تہ علامتی معنویت کے حامل ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عظیم فنکار کے اعجاز قلم سے ہم ایک معمولی انسان کے خدوخال میں بھی اس کی روح کی عریانی کا منظر دیکھ لیتے ہیں۔ اور وہ ہمارے لیے ایک ناقابلِ فراموش تجربہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی انسان کو ایک غیر معمولی کشش اور لافانی زندگی عطا کرنے میں روسی ادیبوں میں انتون چیخوف اور لیو ٹالسٹائی کو خاص کمال حاصل ہے۔

لیو ٹالسٹائی عالمی ادب کا ایک عظیم نام ہے اپنے دور کے ناول نگاروں میں جن میں ترگنیف، دستاؤسکی، بالزاک، فلوبیر اور ٹومس مان جیسے عظیم فنکار بھی شامل ہیں۔ ان کا نام سرِفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ناول کے فن کو ایک بے حد بلند مقام تک پہنچایا بلکہ اپنی فنی بصیرت، فلسفیانہ فکر اور اخلاقی تصوّرات سے کئی نسلوں کو متاثر کیا جن میں مہاتما گاندھی، رابندرناتھ ٹیگور اور روماں رولاں جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ٹالسٹائی کی بہترین تحریروں میں پہاڑوں کے شکوہ۔ وادیوں کی رعنائی، چشموں کی سرشاری کھلی فضاؤں کی وسعت اور سمندروں کی گہرائی کے ساتھ ساتھ مٹّی کا سوندھا پن بھی ہے۔ ان میں رزمیہ شان و شوکت اور موسیقی کی لطافت کا ایسا انوکھا سنگم ہے جس کی

زاہدہ زیدی
ڈپارٹمنٹ آف انگلش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظیر فکشن کی دُنیا میں ملنا مشکل ہے۔ ساتھ ہی سماجی بصیرت اور اخلاقی تصورات کی کارفرمائی نے ان کی تخلیقات کو سنجیدگی اور وقار عطا کیا ہے۔ ان کے ناولوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے۔ تالستائی کا ہر کردار ایک جیتا جاگتا کردار ہے جسے انھوں نے نفسیاتی دور بینی اور اخلاقی بصیرت کی روشنی میں فنی چابکدستی کے ساتھ ایک سماجی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ان کرداروں میں اس قدر تنوع، انفرادیت، تہہ داری اور بے ساختگی ہے کہ ان کا مقابلہ اکثر شیکسپیر کے کرداروں سے کیا گیا ہے۔ (گو کہ تالستائی خود شیکسپیر کے مداح نہ تھے) ان کے شاہکار ناول "جنگ اور امن" میں ساڑھے پانچ سو سے زیادہ کردار ہیں اور ان میں سے بیشتر عام قسم کے لوگ ہیں۔ لیکن ان میں ہر ایک کے واضح خدوخال ہیں اور ہم کسی نہ کسی حد تک ان کی انفرادیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہی کیفیت کم و بیش ان کے دوسرے ناولوں میں بھی موجود ہے۔

لیکن جب تالستائی کسی مخصوص کردار اور اس کے ماحول کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بناتے ہیں تو وہ معمولی ہو یا غیر معمولی، ہماری رُوح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے تجربات ہمارے لیے فکر و احساس کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ اور ایسا ہی ایک معمولی انسان ایوان ایلیچ ہے جس سے ہم تالستائی کے ایک مختصر ناولٹ "ایوان ایلیچ کی موت" میں روشناس ہوتے ہیں۔

یہ ناولٹ ایوان ایلیچ کی موت کی خبر سے شروع ہوتا ہے۔ جس پر ایوان ایلیچ کے ساتھی عدالت کے ایوان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایوان ایلیچ جو اسی محکمے کا ایک اہم رکن تھا کافی عرصے سے بیمار تھا اور اس کی بیماری کافی پیچیدہ شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس خبر کو سُن کر ان لوگوں کے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں۔ ایوان ایلیچ کی جگہ اب کس کا تقرر ہوگا اور اس شخص کی جگہ خالی ہونے پر کس آدمی کا چانس زیادہ ہے۔ لوگ اپنے اور اپنے رشتے داروں کے پروموشن کے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ خبر سُن کر افسوس بھی ہوتا ہے اور اس کے خاص دوست سوچتے ہیں کہ اب انھیں تعزیت کے لیے جانا پڑے گا اور شام کے پروگراموں میں تبدیلی کرنا ہوگی۔ لیکن ہر شخص کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ضرور ابھرتا ہے کہ مرنے والا ایوان ایلیچ تھا وہ خود نہ تھا اور اسی سے انھیں یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

ناولٹ کے دوسرے سین میں ایوان ایلیچ کا ایک خاص دوست اس کے گھر تعزیت کے لیے جاتا ہے اور ہم اس کی نظر سے ایوان ایلیچ کی لاش اور موت کے گھر کا منظر دیکھتے ہیں۔ ایوان ایلیچ کی بیوی، بیٹی اور عزیز و اقارب ماتمی لباس میں ملبوس ہیں۔ نیم تاریک کمروں میں جلتی ہوئی شمعیں ایک پُر اسرار خاموشی، دبی دبی آہیں، رسمی تعزیتی کلمات، پادری، مذہبی رسومات غرض وہی سب چیزیں ہیں جو عام طور پر ایک موت کے گھر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جب یہ دوست تعزیت کے فرائض انجام دے کر مڑتا ہے تو ایوان ایلیچ کی بیوی اسے روکتی ہے اور اس کے ذہن میں ایک دم یہ خیال گونجتا ہے کہ اسے آج کی تاش کی محفل سے ہاتھ دھونا پڑے گا ایوان ایلیچ کی بیوی جس کا انداز انتہائی شہیدانہ ہے اس سے اس کی پینشن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ جس کے بارے میں وہ پہلے ہی سب ضروری معلومات فراہم کر چکی ہے۔ وہ اسے بار بار اپنی مظلومی کا احساس دلاتی ہے لیکن اس کا دھیان کسی اور طرف ہے۔

ان دو مختصر جھلکیوں کے بعد جن میں نجی رشتوں، سماجی اقدار اور ایوان ایلیچ کے کردار کے مبہم خدوخال موجود ہیں، تالستائی ہمیں ایوان ایلیچ کی جیون کہانی سُناتے ہیں جو خود ان کے الفاظ میں "انتہائی سادہ، معمولی اور خوفناک ہے"۔

ایوان ایلیچ ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا باپ ایک بارسوخ سرکاری ملازم ہے۔ ایوان ایلیچ کا بچپن عام روسی بچوں کی طرح گزرتا ہے لیکن اس کی بچپن کی شرارتیں ہوں، لڑکپن کی ترنگ، جوانی کی رنگ رلیاں، طالب علمی کے زمانے کی آزاد خیالی یا ادھیڑپن کی تفریحات کبھی کوئی چیز حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایوان ایلیچ لڑکپن ہی سے ہونہار، ملنسار اور محنتی ہے۔ وہ ایک مناسب وقت پر قانون کی تعلیم مکمل کرتا ہے۔ اور اپنے باپ کی مدد سے اسی محکمے میں ایک معمولی نوکری حاصل کرتا ہے۔ ترقی کے زینے پر یہ ایوان ایلیچ کا پہلا قدم ہے۔ تالستائی کے الفاظ میں "ایوان ایلیچ خوشامدی تو نہ تھا لیکن وہ اپنے سے برتر لوگوں کی طرف اس طرح کھنچتا تھا جیسے پروانہ شمع کی طرف" وہ ہمیشہ ان کے طور طریقے، خیالات اور نظریات اپنا لیتا ہے اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کو فرض ک

درجہ دیتا ہے۔ اس طرح وہ بڑی آسانی سے حکامِ اعلیٰ کی نظروں میں سما جاتا ہے۔ اور خاصی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔

نوکری کے ابتدائی دور میں اس کی زندگی میں سیر و تفریح اور یار باشی کے عناصر بھی ہیں اور وہ بازارِ حسن کی لذتوں سے بھی آشنا ہوتا ہے، لیکن جوں جوں وہ ترقی کے زینے پر آگے بڑھتا ہے اس کی نوجوانی کی ترنگ اور بچپن کے ولولے ہوا ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے اثر، رسوخ، اقتدار اور بھاری بھرکم پن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جو اس کی تسکینِ طبع کا سامان بنتا ہے۔ اب وہ ہم چشموں میں سر اٹھا کر چل سکتا ہے، ترقی اور تبادلوں کے ساتھ ایوان ایلیچ کا سوشل سرکل بھی بدلتا رہتا ہے۔ اور اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے بہتر لوگوں یا کم سے کم برابر والوں سے سوشل تعلقات قائم کرے۔ عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ایوان ایلیچ شادی کے مسئلے پر غور کرتا ہے۔ اور فیودورنا پروسا کودا اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے، وہ جوان ہے۔ قبول صورت ہے۔ ایک عزت دار خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ایک چھوٹی سی جائداد کی مالک بھی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے حلقے کے لوگ اور افسرانِ اعلیٰ اس جوڑ کو بے حد مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لیے ایوان ایلیچ اس نوجوان خاتون سے شادی کر لیتا ہے۔

شادی شدہ زندگی کا ابتدائی دور ایوان ایلیچ کے لیے مسرت و شادمانی کا دور ہے۔ لیکن جب رومانس کا دور گزر جاتا ہے تو بہت جلد میاں بیوی کے تعلقات میں پژمردگی، سرد مہری اور کشیدگی کے عناصر ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس کی بیوی کی تنگی طبیعت، چڑچڑا پن اور نت نئے مطالبات اس کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ اور ایوانِ ایلیچ کی زندگی کی عمارت جس کی بنیاد اس کے خیال کے مطابق معقولیت خوش باشی اور مہذب رکھ رکھاؤ پر تھی اب کچھ متزلزل نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص مرنجاں مرنج انداز سے اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اور آخر کار پیشہ ورانہ مصروفیات کی بھاری بھرکم اوٹ میں پناہ لیتا ہے۔ یعنی جہاں بیوی کے غصّے کا پارہ چڑھا اور اس نے کسی مقدمے کے فائل نکالے۔ اس بات کا اس کی بیوی پر خاصا رعب پڑتا ہے اور اس طرح اب پیشہ ورانہ مصروفیات کو اس کی زندگی میں اور زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی شادی شدہ زندگی میں رومانس کے دور بھی آتے ہیں۔ اور وہ دو تین بچوں کا باپ بھی بنتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس میں لطف و مسرت اور رفاقت کے جذبے کا فقدان ہے۔ ہاں شادی کے بعد اس کی سوشل پوزیشن اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس میں سفید پوشی، جاہ پرستی اور طمطراق کے عناصر بڑھتے جاتے ہیں۔

لیکن شادی کے ۱۵/۱۶ سال بعد ایوان ایلیچ ایک پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ پروموشن کے سلسلے میں اسے دو بار نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے اسے شدید صدمہ پہنچتا ہے اور ہتک کا احساس اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ اسے ہر وقت یہ خیال ستاتا ہے کہ اس کی تنخواہ زیادہ اور عہدہ بہتر ہونا چاہیے تھا۔ اب اسے یہ دُھن سوار ہو جاتی ہے کہ اسے ایک بہتر نوکری تلاش کر کے ان لوگوں کو نیچا دکھانا ہے جنھوں نے اسے نظر انداز کیا ہے۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ بیوی، بچوں کو بیوی کے میکے چھوڑ کر اکیلا ہی نوکری کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اور آخر کار اسے پیٹرسبرگ میں بالکل ویسی ہی نوکری مل جاتی ہے جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ اب وہ ایک مناسب مکان تلاش کرتا ہے جو ہر اعتبار سے اس کے عہدے اور پوزیشن کے شایانِ شان ہو۔ اور اونچے طبقے کے ذوق کے مطابق اسے سجانے اور سنوارنے میں تن من دھن سے لگ جاتا ہے۔ اور اسی کے دوران اس کی پسلی میں چوٹ آجاتی ہے جسے وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی بچے جب اس گھر کی شان شوکت اور سجاوٹ دیکھتے ہیں تو پھولے نہیں سماتے۔ اور ایک بار پھر ان لوگوں کی زندگی بڑے باعزت اور خوش باش طریقے سے گزرنے لگتی ہے۔ اب وہ متموّل طبقے میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور اس حلقے میں اپنی ساکھ قائم رکھنا ان کی زندگی کا اہم مقصد بن جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں ایوانِ ایلیچ اس کی بیوی اور بیٹی جو اب سولہ سترہ سال کی طرحدار حسینہ ہے بالکل ہم رائے ہیں۔ انھیں معمولی لوگوں سے دامن بچانے اور بڑے لوگوں میں راہ و رسم بڑھانے کے سبھی گر آتے ہیں۔

اب ایوان ایلیچ کی زندگی بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ اس کے عقیدے کے مطابق ہونی چاہیے تھی۔ یعنی آرام دہ، معقول خوشگوار اور مہذب، اس نے اپنی نجی اور سرکاری زندگی کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ لیا ہے۔ اور اس کا ایک بندھا ٹکا معمول ہے۔ دن میں وہ عدالت کے کاموں پر پوری توجہ دیتا ہے اور اس کا رعب اور دبدبہ ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔ آرام کے وقفوں میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چائے اور سگرٹ سے دل بہلاتا ہے اور مختلف

موضوعات پر گفتگو کرتا ہے لیکن زیادہ تر اُن لوگوں کی گفتگو کا موضوع محکمے کی سیاست ہی ہوتی ہے۔ شام کا وقت سوشل سرگرمیوں کے لیے وقف ہے۔ دعوتیں اور رقص کی محفلیں، کبھی اس کے گھر اور کبھی اس کے ہمسر لوگوں کے ہاں، اکثر ساتھیوں کے ساتھ تاش کی پارٹیاں بھی جمتی ہیں۔ اگر کوئی شام خالی ہو تو وہ کوئی ایسی کتاب اٹھالیتا ہے جس کا اس زمانے میں کافی زور شور ہو۔ ایوان ایلیچ اپنے کام میں کافی ہوشیار ہے اور تعریف و توصیف سے اس کے جذبۂ خود پسندی کو تقویت پہنچتی ہے۔ دعوتوں اور رقص کی محفلوں میں جہاں وہ اپنے ذوق، حیثیت اور سوشل پوزیشن کا مظاہرہ کرسکتا ہے اس کے جذبۂ خود نمائی کو تسکین ملتی ہے لیکن سب سے زیادہ خوشی اسے تاش کی محفلوں میں ملتی ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کی سوشل سرگرمیاں بھی پورے عروج پر ہیں اور ایک بڑے گھرانے میں اس کی بیٹی کی شادی کے امکانات روشن ہیں۔ اس کا لڑکا بھی اسی کی طرح ہوشیار اور محنتی ہے۔ ایوان ایلیچ کی عمر اب پینتالیس[۴۵] سال کے قریب ہے اور وہ ہر طرح اپنی زندگی سے مطمئن ہے۔

لیکن یکایک اس کی زندگی میں ایک نہایت ناخوشگوار تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔ اس کی پسلی کی ہلکی ہلکی کسک ایک مستقل درد کی صورت اختیار کرلیتی ہے، بھوک نہیں لگتی، متلی کی شکایت رہتی ہے، نیند اُڑ جاتی ہے، اس کی صحت دن بدن گرتی جاتی ہے۔ نہ وہ اپنا کام پوری توجہ سے کرسکتا ہے نہ تفریح سے لطف اندوز ہوسکتا ہے اس کا مزاج چڑچڑا ہوجاتا ہے اور بیوی سے اس کی نفرت دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب آخر کار بیوی اور دوستوں کے اصرار پر ڈاکٹر سے مشورہ کرنے جاتا ہے تو یکایک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت ڈاکٹر کی حیثیت وہی ہے جو ایک مجسٹریٹ یا جج کی حیثیت سے اس کی ہوتی ہے اور وہ خود ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اسے کئی ڈاکٹروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب کی لن ترانیاں سننی پڑتی ہیں ہر ایک ایک نیا مرض تشخیص کرتا ہے اور وہ کچھ عرصے تک سبھی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے لیکن اب ایوان ایلیچ کا یہ حال ہے کہ "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی"۔

اس طویل بیماری کے دوران ایوان ایلیچ کی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ وہ امید و بیم کی مختلف کیفیتوں سے گزرتا ہے۔ اس کا تنہائی اور بے چارگی کا احساس روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ دفتر کے لوگ اب اس سے کترانے لگے ہیں۔ گھر والوں کے لیے وہ ایک بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ اگر وہ کبھی تاش کی محفل میں شرکت کرتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ وہ نہ صرف خود بے مزہ ہے بلکہ دوسروں کی تفریح میں بھی زہر گھول رہا ہے۔ اس کا درد روز بروز ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے اور وہ ایک شدید وجودی بحران اور روحانی کرب سے گزرتا ہے جس کے سامنے اس کا جسمانی کرب بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ یکایک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا پیشہ ورانہ وقار، دبدبہ اور شان و شوکت ریت کے محل کی طرح ڈھے رہی ہے اور اس کی نجی زندگی ایک ناسور بن چکی ہے۔ کوئی بھی اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس کی بیوی کا خیال ہے کہ ایوان ایلیچ نے صرف ان لوگوں کو ستانے اور جلانے کے لیے اپنی بیماری کو طول دیا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اس کے گردوں اور آنتوں کا عمل ٹھیک نہیں ہے اور یہ صرف انھیں راہ پر لانے کا سوال ہے۔ اس کی بیٹی اس بیماری کو اپنی تفریح اور عشق و عاشقی کی راہ میں ایک غیر ضروری رکاوٹ سمجھتی ہے۔ دوست احباب رسمی مزاج پرسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اور خود ایوان ایلیچ بھی اس تلخ اور دردناک حقیقت کا سامنا کرنے سے تھر تھر کانپتا ہے وہ اپنے آپ سے طرح طرح کی تاویلیں کرتا ہے۔ فرار کے راستے اور پناہیں ڈھونڈتا ہے، لیکن وہ جس طرف بھی مڑتا ہے موت اس ہیبت ناک درد کی صورت میں اس کی تاک میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اور آخر کار جب یہ احساس اس پر پوری طرح غلبہ پالیتا ہے تو وہ چلّا اٹھتا ہے۔ "میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں جینا چاہتا ہوں"۔ اور اس منزل پر وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ وہ کیوں زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تمام زندگی اس کی نظروں کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔ اور بچپن کی مسرتوں اور بے ساختگی کے سوا اس کی زندگی میں کہیں بھی حقیقی مسرت کا پرتو نظر نہیں آتا۔ اور نہ کوئی اور چیز جس کی واقعی کوئی قدر و قیمت ہو۔ اس کے نجی رشتوں میں محبت، خلوص اور رفاقت کے جذبے کا فقدان ہے دوست احباب سے اس کا تعلق سطحی اور سرسری رہا ہے۔ ترقی، کامیابی اور سماجی وقار کے جن معیاروں کو اس نے اپنا نصب العین بنایا تھا اب وہ حقیر اور بے مایہ معلوم ہوتے ہیں جن مادّی

اور سماجی اقدار کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا اب وہ کھوکھلی، گھناؤنی اور بے معنی نظر آتی ہیں۔ اس کی زندگی میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس دردناک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کرسکے اور یکایک اس کے دل میں یہ خیال کوندتا ہے کہ یہ کرب، یہ گھٹن یہ دہشت سب اسی لیے ہے کہ اس کی زندگی ویسی نہیں تھی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی لیکن وہ فوراً ہی خود کو یقین دلاتا ہے کہ یہ سب بکواس ہے۔ اس کی زندگی کو تو نہ صرف قبولِ عام کی سند حاصل تھی بلکہ وہ قابلِ رشک بھی تھی۔ تو پھر یہ کیسے ہوا؟ آخر اسے کس قصور کی سزا مل رہی ہے؟ اگر اسے مرنا ہی تھا تو وہ پیدا ہی کیوں ہوا؟ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات اٹھتے ہیں۔ اپنے بارے میں، خدا کے بارے میں، موت اور زندگی کے بارے میں۔ لیکن کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ ہر طرف ایک اتھاہ تاریکی ہے ایک مہیب سناٹا۔ اب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح جھوٹ کے تانے بانے میں جکڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر جنھیں معلوم ہے کہ اس کا مرض لاعلاج ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی بیماری کو قابو میں لانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کے گھر والے جواب اس کے مرنے کے دن گن رہے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بیماری صرف اس کا وہم اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس کے ساتھی جن میں اب یہ چہ میگوئیاں شروع ہو چکی ہیں کہ اس کے بعد اس کی جگہ کون لے گا، وہی ہلکا پھلکا رویّہ اپنائے ہوتے ہیں۔ ہاں اس کڑے وقت میں اپنے نوجوان دیہاتی نوکر گراسیم کی پُرخلوص ہمدردی اور بے لوث خدمت میں اسے روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے اور یہ زندگی کی مثبت اقدار کا اشاریہ ہے۔

ایوان ایلیچ کا درد و کرب اب ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اور اسے افیم پر رکھا جانے لگا ہے۔ نیم بیہوشی کے عالم میں اسے ایسا لگتا ہے کہ اسے ایک لمبے پتلے سیاہ بورے میں بھرا جا رہا ہے۔ اور وہ باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، آخر کار جب اس کی قوت بالکل جواب دے جاتی ہے تو وہ مدافعت ختم کر دیتا ہے اور اپنے جان لیوا درد سے سمجھوتا کر لیتا ہے، اور اب اسے بورے کے دوسرے سرے پر ایک روشنی نظر آتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے موت کی منزل کو پار کر لیا ہے۔ اس کے دل میں اپنے بیوی، بچوں، نوکروں، ساتھیوں اور ڈاکٹروں کے لیے رحم اور ہمدردی کا ایک نحیف جذبہ جنم لیتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ان سب سے معافی مانگے لیکن اس کی قوت گویائی جواب دے چکی ہے۔ لوگ اس کی جاں کنی کا کرب دیکھتے ہیں لیکن اس جذبے کی صداقت کا عرفان نہیں کرسکتے جس نے اسے اپنی دہشت پر قابو پا کر موت کی مہربان آغوش میں پناہ لینے پر آمادہ کر دیا ہے، اس طرح لیو تالستائی نے موت کی ناگزیر حقیقت کو فلسفیانہ طور پر پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ہماری رسمی اور سماجی زندگی موت کی صداقت سے فرار کے مترادف ہے، جب کہ اس حقیقت کا اعتراف انسانی زندگی کو زیادہ بامعنی بنا سکتا ہے اور اس اعتبار سے دیہاتی نوکر گراسیم کا رویّہ مثالی ہے۔

اس مختصر ناول میں ایک طرف تو لیو تالستائی نے ایوان ایلیچ کی ذہنی کیفیات، جسمانی اور روحانی کرب، وجودی بحران اور موت کے مہیب تجربے کی اس قدر سچی، کامیاب اور دردناک تصویر کشی کی ہے کہ ہم نہ صرف ترس اور دہشت کے اس جذبے سے دوچار ہوتے ہیں جو ارسطو کے خیال کے مطابق المیہ تجربے کا نچوڑ ہے۔ بلکہ اس کے وجودی تجربے کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ تالستائی کی نفسیاتی دروں بینی اور فنی بصیرت کا کمال ہے کہ ہر قاری اپنی روح کے نہاں خانوں میں اس تجربے کی صدائے بازگشت سن سکتا ہے۔ دوسری طرف ہم ایوان ایلیچ کے شب و روز میں سماج کی کھوکھلی مصنوعی اور بے مایہ اقدار اور کامیابی، سفید پوشی اور سماجی وقار کے اس سطحی اور میکانیکی تصوّر کی بے نقابی کا منظر دیکھتے ہیں جس نے ایک عام انسان کی روح کو کھوکھلا، رشتوں کو بے جان اور زندگی کو بے معنی بنا دیا ہے ___ لیو تالستائی نے ایوان ایلیچ اور اس کی زندگی کو ایک ٹھوس سماجی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کیا ہے اس لیے یہ ان کے ہم عصر سماج کی ایک حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر کشی ہے۔ لیکن یہاں بھی لیو تالستائی کی اخلاقی بصیرت اور فلسفیانہ فکر نے اس مخصوص صورتِ حال کو ایک عالم گیر وژن میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور ہمیں یہ اپنے ہی دور اور اپنے ہی سماج کی ایک سچی اور بے لاگ تصویر نظر آتی ہے۔ اور جب ہم اپنے گرد و پیش کے ماحول میں ان کھوکھلی اور بے مایہ اقدار کی کارفرمائی اور بیشتر لوگوں کے شب و روز میں ایوان ایلیچ کے شب و روز کا عکس اور ان کے چہروں پر ایوان ایلیچ کے خد و خال دیکھتے ہیں تو یہ انکشاف ہمارے لیے ایک لمحۂ فکریہ بن جاتا ہے۔ ایوان ایلیچ اور اس کے دردناک انجام سے ہم ہر ہر قدم پر دوچار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایوان ایلیچ ہمارے لیے ایک ناقابلِ فراموش کردار ہے۔

ریزہ ریزہ خواب

ماں جانے کب سے سو رہی تھی۔
تھکی ہاری ماں بہت گہری نیند سوئی تھی۔
وہ تھک بھی تو جاتی ہوگی۔ اس کے سینے پر بوجھ بھی کتنا بہت سا ہے۔
لیکن یہ بوجھ تو صرف ماں ہی اٹھا سکتی ہے۔
اس کا دل بہت بڑا اور گداز ہوتا ہے نا......!

اور اب ماں بیدار ہونے والی تھی۔
پہلے اس کے پپوٹے پھڑکے۔ پھر اس نے ایک انگڑائی لی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف اُجالا پھیل چکا تھا۔ ہر سو روشنی ہی روشنی تھی۔
پھر وہ مکمل طور پر اُٹھ بیٹھی۔ وہ جانے کتنی دیر سوتی رہی تھی۔
ماں کے ایک لاڈلے بچے نے اپنی معصوم زبان میں اس سے پوچھا تھا" ماں تو اتنا کیوں سوتی ہے؟ یہ تو بار بار سو کیوں جاتی ہے ماں......؟"
ماں ـــ جو اپنی آنکھوں میں اب بھی ڈھیر سارے خواب سجائے بیٹھی تھی۔ اپنے پیارے بیٹے کی بات سن کر مسکرا پڑی۔ اور بولی......
"میں ـــ میں خواب دیکھنے کو سو جاتی ہوں میرے لال!"
"ماں! یہ تُو خواب کیوں دیکھا کرتی ہے؟ بتا دے نا ماں۔ تو کیوں روز روز خواب دیکھتی ہے؟"
"میں تجھے اور اپنے دوسرے بچوں کو خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے بیٹے۔"
"ماں ـــ یہ خوشحالی کیا ہوتی ہے؟"
"میرے بچے! خوشحالی ـــ خواب کی ایک تعبیر ہوتی ہے۔ مگر تو یہ سب کیوں پوچھتا ہے۔ میں تیری ماں ہوں ماں۔ کیا مجھے خواب دیکھنے کا بھی حق نہیں ہے!" ماں نے کہا۔ "میں تو تیرے ہی بھلے کے لیے خواب دیکھتی ہوں۔ اور ہاں میں تو اس کے علاوہ بھی خواب میں بہت کچھ دیکھتی ہوں۔"
"وہ بھی بتا دے ماں۔"
"ہاں ـــ میں تیری ترقی، کامرانی، شہرت اور تا ابد زندگی کے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ میں یہ بھی دیکھتی ہوں کہ تو سدا ہنستا مسکراتا رہے۔ یہ میرا خواب ہے شہزادے!"
"ماں ـــ تو آخر یہ سارے خواب کیوں دیکھتی ہے؟"
"میں ماں جو ہوں۔ اور جو ماں ہوتی ہے نا۔ وہ خواب ضرور دیکھتی ہے۔"
"ماں ـــ کیا تو سمجھتی ہے کہ تیرے خواب پورے ہو جائیں گے؟"

"ہاں میرے لال! کیا تو میرا بیٹا نہیں......
اور ہاں ـــ دیکھ وہ جو تیرے پاس کھڑے ہیں، وہ بھی میرے بیٹے اور تیرے بھائی ہیں۔ تم بہت سے بھائی ہو نا۔ اور تم سب مجھے بہت عزیز ہو۔ بہت ہی عزیز اور پیارے۔ کتنے خوب صورت ہو تم میرے شہزادو!"
"ماں......!"
"میرے بیٹو......!"
"ماں آج ہم بہت خوش ہیں۔ دیکھ ہر طرف کتنا سکون ہے۔ کتنی خوشی ہے۔"
"تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔"
چلو اب بہت رات بیت گئی ہے تم سب میری باہوں میں سما کر سو جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اس اندھیری سیاہ رات میں تنہا تنہا جاگتے رہو۔ یوں بھی رات کو دیر تک جاگنے سے آنکھیں بوجھل ہو جاتی ہیں۔ اور بوجھل آنکھوں میں خواب نہیں آتے۔ یا شاید ان آنکھوں سے خواب ناراض ہو جاتے ہیں۔"
"ہاں، ماں تو ٹھیک کہتی ہے۔"
ـــ اور ماں اپنے نونہالوں کو اپنے کلیجے سے لگا کر سو گئی۔
ماں خواب دیکھنے لگی۔ وہ تو جاگتے میں بھی خواب دیکھا کرتی ہے۔ پھر سوتے میں کیسے نہ دیکھتی۔ شاید اس کی قسمت میں خواب دیکھنا ہی لکھا ہے۔
لیکن ان خوابوں کی تعبیر......؟

محمد اطہر مسعود خاں
تالاب ملا ارم، رام پور (یو۔پی)

شاید بے گنتی حسرتیں۔
بہت سے آنسو۔
لاتعداد ٹوٹی پھوٹی آرزوئیں
اور بہت سا کرب!
ماں سوئی تو جانے کتنی دیر کتنے وقت تک سوتی رہی۔ اس کی آنکھ تو اس وقت کھلی جب اس کے کئی بچے اس سے پہلے سو کر اٹھ چکے تھے، اور شور و غل کرنے لگے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کر کسی بات پر وہ آپس میں لڑ پڑے۔ اور گھر چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ پریشان حال ماں ان سب کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ بار بار ان کو آواز دیتی۔ وہ سب جو آپس میں بھائی بھائی تھے، بچھڑ چکے تھے۔ ماں انھیں آواز پر آواز دے رہی تھی۔

پھر ــــ ماں نے زور سے انھیں پیار بھری آواز میں ڈانٹا... "تم سب بولتے کیوں نہیں۔ تم کہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو...؟"
وہ آپس میں تو لڑ پڑے تھے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ماں کی آواز پر وہ سب ــــ یکبارگی بول اٹھے۔
پہلا بولا ــــ "ماں! دیکھ میں نے تیرے ایک بیٹے کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔"
دوسرے نے کہا۔ "میں بھی تیرا بیٹا ہوں۔ دیکھ میرے ہاتھ میں مشین گن ہے۔ میں چند لمحوں میں ہی بہت سے لوگوں کو نیست و نابود کر سکتا ہوں۔"
"ماں!" ایک اور بیٹا بول اٹھا۔ "میں اس میزائل بردار ٹینک پر تعینات ہوں۔ اور بڑے سے بڑے جہاز کو ختم کر سکتا ہوں۔"
"میں بھی تیرا ایک بیٹا ہوں ماں۔" اگلے نے کہا۔ "دیکھ فضائی نظام میرے ہاتھ میں ہے۔ جس طیارے کو چاہوں زمین پر مار گراؤں۔"
ایک اور بولا۔ "ماں میں خلا میں معلق ہوں اور یہاں سے ستاروں کی جنگ لڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور ہاں میں یہاں سے ہی ساری دُنیا کو ملیامیٹ کر سکتا ہوں۔"
"ماں۔ میں کالا ہوں۔"
"ماں۔ میں گورا ہوں۔"
"ماں میں جمہوریت ہوں۔"
"میں ایک فرقہ ہوں ماں۔"
"میں فساد ہوں ماں۔"
"میں جنگ ہوں ماں۔"
"ماں میں ٹینک، توپ، گولہ بارود ہوں۔"
"میں سوشلزم ہوں۔"
"میں حکومت ہوں۔"
"میں کاذب سیاست ہوں۔"
پھر وہ سب ایک ساتھ بول پڑے ــــ
"ہم سب کچھ ہیں ماں۔"
"ہم جنگی جہاز ہیں۔"
"ہم ایٹم بم ہیں۔"
"ہم میزائل ہیں۔"
ماں کرب سے تڑپ اٹھی۔ اس نے جھرجھری لی۔ دل کو ٹھیس لگی۔ اور اس کی پلکوں پر سجے آبگینے پھوٹ بہے۔
"کیا یہ میرا وہی خواب ہے؟" اس نے سوچا۔
"میں نے تو بڑے ارمانوں سے اپنے لاڈلوں کو پالا تھا۔ آج کیا میری آنکھ لگی۔ یہ سب قیامت برپا کر رہے ہیں۔"
"یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔" وہ سوچے جا رہی تھی۔ "شاید یہ ناسمجھ ہیں۔ مگر ہیں تو یہ سب میری اولادیں۔ اور میں ــــ میں ان کی ماں ہوں ماں!
ان کے ارمانوں کو پورا کرنے والی۔
ان کی آرزوؤں پر جان چھڑکنے والی۔
ان کے سلگتے خوابوں کی تعبیر دینے والی۔
ماں دکھی دکھی سی غم کی مورت بنی یہ سب کچھ دیکھ اور سوچ رہی تھی۔
تبھی آکاش میں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایسی بھیانک گڑگڑاہٹ تھی جس سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔
دو درد میں ڈوبی آنکھیں جن سے وہ اپنے بیٹوں کے لیے خواب دیکھا کرتی تھی، اس نے اُوپر اٹھائیں۔
ڈھیر سارے میزائل اور راکٹ اس کے بیٹوں نے چھوڑے تھے۔
ماں نے اپنے نونہالوں کی سلامتی کے لیے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا دیے۔ لیکن ــــ وہ سارے میزائل گر کر اس کی چھاتی کو زخمی کر چکے تھے۔ دھرتی ماں کا سینہ شق ہو گیا تھا۔ اس کے دل کے سینکڑوں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ وہ اپنے بیٹوں کے لیے اب کوئی خواب نہ دیکھ سکتی تھی۔
دھرتی ماں کا خواب بکھر چکا تھا۔ اس کے سارے بیٹے فرقہ فرقہ ہو کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔

غزلیں

حفیظ بیتاب

پھول اشکوں کے تجھ پر لٹاتے رہے
زندگی! ہم ترے ناز اٹھاتے رہے

ہم تری بزم میں روشنی کے لیے
قطرہ قطرہ لہو کو جلاتے رہے

بارشِ سنگ تھی ہر طرف سے مگر
آئینہ وقت کو ہم دکھاتے رہے

یہ نہ سوچا کہ اس کا صلہ کچھ نہیں
ہم شراروں کو شبنم بناتے رہے

میں تو بیتاب چپ تھا مگر بام و در
داستاں میرے غم کی سناتے رہے

گھر سے جُڑے کچھ ایسے کہ بے گھر کے ہو گئے
بچّے جوان ہوتے ہی دفتر کے ہو گئے

جس دن کھلا یہ راز وہ کچرے کا پھول ہے
دروازے اُس پہ بند ہر اک گھر کے ہو گئے

پھر لفظِ انقلاب کو رسوا کیا گیا
جو سر بلند لوگ تھے بے سر کے ہو گئے

دفتر شکایتوں کا لیے آتے تھے مگر
تجھ سے ملے تو ہونٹ ہی پتھر کے ہو گئے

یک لخت چشمِ شوق کا شہپر ہی کٹ گیا
دیکھا تجھے تو ایک ہی منظر کے ہو گئے

خورشید طلب

منظر سلطان

دھواں دھواں سا سمندر ہماری آنکھ میں ہے
سلگتے شہر کا منظر ہماری آنکھ میں ہے

کسی کی چیخ فضاؤں میں بین کرتی ہوئی
کسی کے ہاتھ کا خنجر ہماری آنکھ میں ہے

جسے محلّے کے لوگوں نے مل کے لوٹ لیا
وہ قہقہوں سے بسا گھر ہماری آنکھ میں ہے

تم ان اُداس دریچوں میں جھانک کر دیکھو
تمہاری راہ کا پتھر ہماری آنکھ میں ہے

لرز لرز کے ستاروں کا ٹوٹنا منظر
ابھرتا ڈوبتا پیکر ہماری آنکھ میں ہے

۳/۴ ڈی، بی۔ڈی۔ایونیوفلیٹ، گولمری، جمشید پور ۸۳۱۰۰۳
معرفت ایم۔آئی۔خان، ای۔ای۔ آفس، کالاگڑھ (ضلع گڑھوال)
منشا ٹولہ، بتیا ۸۴۵۴۳۸، بہار

ہم طرح اشعار

پچھلے مہینے ہم طرح اشعار کے لیے جو مصرعہ دیا گیا تھا وہ غالب کا تھا۔ موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر درج ہیں:

تم رہنمائے وقت سہی پھر بھی چند گام
چلنا پڑے گا وقت کی رفتار دیکھ کر (بسمل عظیم آبادی)

مرسلہ: فرحان غنی، دارالغنی، شاہ گنج، مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر
جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر (ثاقب لکھنوی)

مرسلہ: محمد کلیم الرحمٰن معرفت محمد عبدالحلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸

جن کو شبِ سیاہ نے پالا ہے وہ ضمیر
گھبرا رہے ہیں صبح کے آثار دیکھ کر (جگر)

مرسلہ: رحمٰن عرش، ۶-۱-۳۴، حبیب نگر، مسجد صوفیہ، محبوب نگر (اے پی) ۵۰۹۰۰۱

مرتے ہیں تیرے نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: جھلمل بھاگلپور (جبار چک)، نازنین ہلکی (بودھ گیا)، محمد شہزاد عالم ارشاد، جبار چک، بھاگلپور

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیش چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد، جبار چک (بھاگلپور)، صبیحہ فاروقی (بھاگلپور)، محمد رضا کاروی (بودھ گیا)، محفوظ عارف الیاسی (گیا)۔

تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستم گار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: پروین نوشاد (جبار چک)، مجاہد ساجد (بھاگلپور)۔

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں یک بار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: محمد نہال اختر عزیزی، بودھ گیا

طالع نے چشم پوشی کی یہاں تک کہ بنشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: ایم۔اے فاروقی، بھاگلپور

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: ہنس مکھ نگھونوی، بھاگلپور

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: سید وقار عثمانی (دھنباد)، جنرل سکریٹری سرتاج اسپورٹس کلب (بھاگلپور)، ربیعہ فرخندہ، اوکھلا نئی دہلی، تمنا بھاگلپوری (حبیب پور)، حنا حیدر (مرزا پور)۔

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر (میر)

مرسلہ: تنویر احمد (کٹیہار)، محمد شاہد احمد (کلکتہ)، محمد مرغوب الحق (کٹیہار)، محمد ثناء اللہ (مظفر پور)، ح۔ر۔ عثمانی (بودھ گیا)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: بے بی پروین نوشاد (جبار چک)، ولی اللہ حبیب نعمانی (پھولپور)، عالیہ پروین راغب (گیا)، محمد صباح الدین فیروز (جبار چک)، شاہد اختر رضوی، (کلکتہ)، صبا ناز (صاحب گنج)، محمد زبیر انصاری بلیا بازار (بیگوسرائے)، ظہیر اکرم (ہزاری باغ)، محمد فضل الرحیم (محبوب نگر)۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، محمد محمود صدری (وارانسی)، فیاض عالم (مغربی چمپارن)، محمد اشتیاق حسین (حبیب پور)، شبنم اوگانوی (مونگیر)، نسرین بیگم نسرین (جبار چک)

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: ولیمہ خاتون (جبار چک)، نسیم احمد انصاری (الٰہ آباد)، محمد گوہر عالم (جبار چک)، امتیاز احمد امتیاز (حبیب پور)، شکیل ناداں (حبیب پور)، رشید بدر (سری نگر)

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: روشن آرا بیگم منصور الحق، (جبار چک)، بشیر ابن شبیر نعمانی (الٰہ آباد)، شاہ محمد (دھنباد)، شگفتہ مظفر (بہار)، حسان احمد (مغربی چمپارن)، شاکر حسین ایم اے (بدایوں)

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: محمد ایاز الحق منصور (جبار چک)، ہاشم ہادی (بہرائچ)، فضل اللہ انصاری (مدھوبنی)، محمد ریاض الدین (دربھنگا)۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: نیلوفر تبسم (بھاگلپور)، رضوان علی (دربھنگا)، شمیم اختر (مغربی چمپارن)، آصفہ پروین (مرزاپور)۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: بیگم نکہت واحد (صاحب گنج) جاوید احمد خاں معصوم (پٹنہ)، کماری ریناپانڈے (امراوتی)، ظفر عالم (مغربی چمپارن)، نصیر احمد (دربھنگا)، محمد یک۔ رئیس (بھوجپور)، محمد فضل اللہ ضیائی (کانپور)

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد (جبار چک)، عرفان احمد (مغربی چمپارن)، فرزانہ پروین (امراوتی)

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا (صاحب گنج)، محمد معز الدین مکرم (حیدرآباد)، آسی کھتلپوری (مظفرپور)، راشدہ بیگم (مغربی چمپارن)، اسجد حسین (علی گڑھ)، جاوید احمد خاں (جبار چک)، تقی مدنی (لکھمنیاں)، سامران خاں (حبیب پور)، ناصر حسین (برہانپور)، قیصر امام (بھاگلپور)، محمد طارق صدری (دربھنگا)، شفیق احمد سیفی (بجنور)، سید اشہد کریم اُلفت (اورنگ آباد)، وصی اللہ حبیب نعمانی الٰہ آبادی (دیوبند)، محمد انیس فاروقی (کلکتہ)

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: ایم صابر سرگم (صاحب گنج)

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: عارف نیر (لکھمنیاں)، شکیل احمد (صاحب گنج)، شکیل احمد (دربھنگا)

آئیں جو یاد وقتِ گذشتہ کی صحبتیں
رونے لگا میں جانبِ گُل زار دیکھ کر
(اصغر علی خاں نسیم دہلوی)

مرسلہ: محمد علیم الرحمٰن (مومن پورہ) ناگپور۔

آنکھیں چرا رہے ہیں وہ ہر بار دیکھ کر
ہُشیار ہو گئے مجھے ہُشیار دیکھ کر (داغ دہلوی)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا (فیروزآباد)

دل کو نہیں ہے لاگ تو محفل میں ناز سے
کیوں مسکراتے ہو مجھے ہر بار دیکھ کر (نواب رامپوری)

مرسلہ: وقار غالب (سنبھل)۔ یوپی۔

کیا ہو گیا ہے آج الٰہی کہ شام سے
روتے ہیں مجھ کو سب مرے غم خوار دیکھ کر (نواب رامپوری)

مرسلہ: محمد ذکی سروش (سنبھل)

ہونٹوں پہ آسکے نہ سخن ہائے گفتنی
اس بیوفا کی چشمِ شرربار دیکھ کر (راز اورنگ آبادی)

مرسلہ: فردوس کنول (سہسرام)

کہتا تھا وقتِ نزع کے ہر اک سے شیفتہ
دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر
(نواب مصطفٰے خاں شیفتہ)

مرسلہ: ثمینہ پروین (ناگپور)

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر (روش صدیقی)

مرسلہ: محمد یٰسین شبلہ، مہسانہ (شمالی گجرات)
ایم۔ ایس بھیلونی، مہسانہ (شمالی گجرات)

بادہ بقدرِ ظرف سہی، رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مے خوار دیکھ کر (روش صدیقی)

مرسلہ: فاطمہ صغرا عتیق (سعید آباد)

شانہ ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے
محوِ طلسم بندیٔ اسرار دیکھ کر (یاس یگانہ چنگیزی)

مرسلہ: احترام حسین شیخ (بڑودہ)، انوار ادیب (آسنسول)، محمد علیم الرحمٰن، مومن پورہ (ناگپور)

ششدر سا رہ گیا ہوں در یار دیکھ کر
دیوار بن گیا ہوں میں دیوار دیکھ کر (ناسخ)

مرسلہ: محمد محفوظ انصار (کیٹہار)

محشر میں بخشوانے کے آثار دیکھ کر
خوش ہو رہے ہیں ان کو گنہگار دیکھ کر (عزیز آرجاوی)

مرسلہ: ایم عمر انصاری (بریلی)

اب شام ہو چکی ہے وہ جائیں بھی کس طرف
جو رک گئے تھے سایۂ دیوار دیکھ کر
(پرویز ناظم مرادآبادی)

مرسلہ: ریشمہ ناز، نئی بستی (مرادآباد)

صفحوں سے کالی رات کے آثار ہیں عیاں
حیرت زدہ ہوں صبح کا اخبار دیکھ کر
(مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: جاوید اقبال صدیقی، (گیا)

حیران ہوں نہ وقت کی رفتار دیکھ کر
پھولوں سے نرم ہاتھ میں تلوار دیکھ کر (ایچ۔ اے خسرو)

مرسلہ: عامر رضا خرم (مدھوبنی)

دل جیسی کوئی چیز فراہم نہ ہوسکی
ہم لوٹ آئے کوچہ و بازار دیکھ کر (یونس عابدی)

مرسلہ: یونس عابدی (کانپور)

میرا شعور ٹوٹ کے کچھ یوں بکھر گیا
چہرہ لگا نیا اُسے ہر بار دیکھ کر
(صدف جعفری)

مرسلہ: افسر حسین گڈو (کلکتہ)

کیا زندگی ہے خون خرابے کا نام ہی
ہم سوچتے ہیں روز یہ اخبار دیکھ کر (فہیم نادر)

مرسلہ: مولوی عابد حسین رحمانی (مدھوبنی)

حیرت ہوئی ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
کچھ بزدلوں کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
(نامعلوم)

مرسلہ: ایس یوسف بھورنیہ (مہسانہ)

خوش ہوں میں، یہ ذہانتِ اغیار دیکھ کر
پھینکا ہے سنگ، نخلِ ثمر دار دیکھ کر
(روشن لال روشن بنارسی)

مرسلہ: ایم۔ افسر آرٹسٹ (وارانسی)

آنسو خوشی میں رونے کی گھبرا کے پی گیا
اک غم نصیب آپ کو غم خوار دیکھ کر (ذکی پرواز)

مرسلہ: سلمان احمد خاں (دہلی)

سیراب عشق میں کبھی ہوتا نہیں کوئی
بھرتا نہیں ہے جی تمہیں سو بار دیکھ کر
(نامی کوہ سوار نظامی شاہ پوری)

مرسلہ: کلیمہ تسنیم (حیدر آباد)

جب جہان ہی سے ہو گئے بیزار کیا کریں
سر پھوڑنے کو جاتے ہیں دیوار دیکھ کر
(نامی کوہ سوار نظامی شاہ پوری)

مرسلہ: عظیم الرحمٰن (حیدر آباد)

سورج کی تیز آنکھ مری سمت مڑ گئی
ٹھہرا جہاں بھی سایۂ دیوار دیکھ کر (سیف سہسرامی)

مرسلہ: سیدہ ماہ نور (سہسرام)

قاتل کھڑا ہوا تھا محافظ کی شکل میں
مقتول خوش تھا ہاتھ میں تلوار دیکھ کر (سیف سہسرامی)

مرسلہ: رمیصا خانم (سہسرام)

کل تک جو میرے قتل کی سازش میں تھے شریک
اب رو رہے ہیں مجھ کو سردار دیکھ کر (عبدالرب نشتر)

مرسلہ: روشن جبیں (سہسرام)

میں سوچتا ہوں کس کے لہو میں نہائے گی
قاتل کے ہاتھ میں نئی تلوار دیکھ کر (عبدالحلیم سحر)

مرسلہ: شاذیہ فردوس (رانچی)

اچھا ہوا کہ پردہ کسی نے گرا دیا
میں ہوش کھو چکا تھا رخِ یار دیکھ کر (عبدالحلیم سحر)

مرسلہ: اسلم پرویز محسن (رانچی)

وہ اپنا کام کر گئے اک بار دیکھ کر
میں کر سکا نہ کچھ بھی لگاتار دیکھ کر (ناظم ناگپوری)

مرسلہ: اشرف خاں (سکندر آباد)

تجدیدِ رسم و راہ کا آیا مجھے خیال
آنکھوں میں اس کی اپنے لیے پیار دیکھ کر (یعقوب بدر)

مرسلہ: محترمہ خیر النساء نکہت بریلوی (سکندر آباد)

نیلام ہو رہی ہے محبت کی آبرو
خاموش ہوں میں گرمیِ بازار دیکھ کر (فطرت انصاری)

مرسلہ: امروز (سکندر آباد)

واحسرتا پولس نے گرفتار کر لیا
لیٹا جو میں سڑک پہ تری کار دیکھ کر (سرفراز کولوی)

مرسلہ: احمد میاں بی حکیم سائیکل والے (بڑودہ)

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر (غالب)

مرسلہ: بیگم علی (سری نگر)

"گلدستہ" پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر درج اشعار بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

آئندہ کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر ارسال کریں:

صنم آخر خدا نہیں ہوتا

قافیہ: خدا — ردیف: نہیں ہوتا

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

اپریل ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اردو دہلی" کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، قارئین کی طرف سے اس کے بہت سے شعری اور نثری عنوانات آئے ہیں۔ تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں شائع کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گائے جا
(حفیظ جالندھری)

مرسلہ: فیصل ہاشمی، ہاشمی منزل، نیو کریم گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱

اِس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے (فیض)

مرسلہ: شبانہ زیدی "بہار پبلی کیشن" نیا ٹولہ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے محفل محفل گائیں گے
جب تک آنسو پاس رہیں گے تب تک گیت سنائیں گے
(ندا فاضلی)

مرسلہ: مظفر حسین ٹرنر، دھنباد

یہ حرف و صوت کے سب سلسلے تجھی سے ہیں
کہ تجھ سے پہلے تو اک سازِ بے صدا ہم تھے
(ایم۔ آر قاسمی)

مرسلہ: مس فوزیہ حسن، میرٹھ

سازِ دل ٹوٹا ہوا تھا، تار تھے الجھے ہوئے
سننے والے کو ہماری گائیکی اچھی لگی
(آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر)

مرسلہ: شہنشاہ رضوی، پٹنہ

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
(مرزا غالب)

مرسلہ: کشور تحسین وارثی، بھاگلپور

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ (غالب)
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

مرسلہ: فردوس کنول، سہسرام

ساقی بہ جلوہ دُشمنِ ایمان و آگہی (غالب)
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

مرسلہ: فرح زیبا، سہسرام

پر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا (غالب)
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

مرسلہ: نسرین بیگم نسرین، بھاگلپور

نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب (غالب)
کہ ناچتے ہیں پڑے، سربسر، در و دیوار

مرسلہ: محمد ریاض الدین، دربھنگا

نے گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز (غالب)
مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرسلہ: عمر فاروق قاسمی، دھنباد

تری چشمِ مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردشِ جام سے
(جگر مرادآبادی)

مرسلہ: فخرالدین قربان حسین، بیڑ

مجھے چاہیے وہی ساقیا! جو برس چلے جو چھلک چلے
ترے حُسنِ شیشہ بدست سے تری چشمِ بادہ بہ جام سے
(جگر مرادآبادی)

مرسلہ: نورالدین حسین بھائی، بیڑ

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسم، وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا ہوئے ہیں
(جگر مرادآبادی)

مرسلہ: شعیب راجا، دہلی

وہ دمِ رقص، گردشیں اُس کی
ایک پھرکی، نظر میں پھرتی ہے
(مرزا داغ دہلوی)

مرسلہ: محمد وسیم اختر، ناگپور

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا (صفی لکھنوی)
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

مرسلہ: محمد کلیم انور، گیا

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک (مومن)
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

مرسلہ: محمد ظفرالدین (نئی دہلی)، ثمینہ پروین (ناگپور)
بیگم نکہت واحد (صاحب گنج)۔

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں (مومن)
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

مرسلہ: شاہد اختر رضوی، کلکتہ

نغمۂ زیست میں کچھ اور ہی لطف آئے گا! (فرید شمسی)
مَیں اگر ساز ہوں تم میری صدا ہو جانا!!

مرسلہ: ناظم علی خاں، مرادآباد

کوئی ایسا بھی ہے کانٹے چنے صحنِ گلستاں کے (محمد عثمان عارف)
گلوں سے لُطف لینے کو بہت آتے ہیں دیوانے

مرسلہ: شاکر حسین ایم۔اے، بدایوں

جواں ہے جشنِ طرب اور پیار کی لے پر (منظر حسن شاہین)
حیات رقص کناں ہے کوئی غزل چھیڑو

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، گیا

رقصِ ہستی دیکھتے جوشِ تمنا دیکھتے (اصغر گونڈوی)
سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

مرسلہ: محمد قیصر امام، بھاگلپور

لہو کھیلتا ہے تمنا سے پھاگ
جنوں گا رہا ہے تباہی کے راگ
جوانی ہے شعلوں میں لپٹی ہوئی (اختر انصاری)
لگی ہے محبت کے جنگل میں آگ

مرسلہ: م۔ش۔ انصاری، مالیگاؤں

جس ساز کو تم چھیڑو، نغمات کی بارش ہو
جس تار کو ہم چھو دیں رونے کی صدا نکلے
(علی جواد زیدی)

مرسلہ: چلمل بھاگلپوری، بھاگلپور

ہے ساز بھی آواز بھی صہبائے کہن بھی (ولی مدنی)
ہے توبہ شکن رقص میں اک شوخ بدن بھی

مرسلہ: عارف نیر، بیگوسرائے

رباب و چنگ جھوم اُٹھتے تھے جب وہ گنگناتی تھی
گلستاں رقص میں آتا تھا جب وہ مسکراتی تھی
(سلام مچھلی شہری)

مرسلہ: محمد واصف نفیس بھوجپوری، بھوجپور

رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر (اثر لکھنوی)
شبنم میں ہے گھنگھروؤں کی چھن چھن

مرسلہ: محمد حسین گوہر، دلی کینٹ

ٹوٹا ہوا سازِ دل ہے لیکن (حباب ہاشمی)
یہ ساز بھی بے صدا نہیں ہے

مرسلہ: رعنا انجم، رائے بریلی

بے خودی بے سبب نہیں غالب (غالب)
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مرسلہ: محمد طارق صدری، دربھنگا

نوخیز کوئی تتلی دیوانہ وار آئی (افتخار فہیم)
دل بار بار تڑپا وہ بار بار آئی

مرسلہ: افتخار فہیم، کٹیہار

نغمۂ دل سُنائے جاؤ کریم (عبدالکریم اسدی)
سازِ ہستی ابھی سلامت ہے

مرسلہ: محمد قیصر امام، بھاگلپور

کیسے کیسے وہ اُبھرتی ہیں بدن کی لہریں (قتیل شفائی)
ڈگمگایا ہے نگاہوں کا سفینہ کیا کیا

مرسلہ: شیخ احمد میاں، بمبئی

سہمی ہوئی صدائے دلِ ناتواں نہ سن (شکیل بدایونی)
بہکی ہوئی نظر کے اشاروں پہ رقص کر

مرسلہ: جنرل سکریٹری سرتاج اسپورٹس کلب، بھاگلپور

کوئی مانے یا نہ مانے بات یہ سچ ہے وکل (وکل بدایونی)
زندگی کے سازِ پر ہر راگنی اچھی لگے

مرسلہ: فیروز احمد، بدایوں

جو نغمہ بن کے منشا بزم کو مسرور کرتی ہے
اسی آواز کو للکار بن جانا بھی آتا ہے
(محمد منشا الرحمان خاں منشا)
مرسلہ: محمد علی آصف علی، برہان پور

کوئی خاطر نہ مدارات نہ تقریبِ وصال
ہم تو بس چاہتے ہیں تیری نظر میں رہنا (پروین شاکر)
مرسلہ: محمد شمس الدین آسنسول

چھیڑ کوئی رمزی کی غزل
عمرِ رواں کی شب ہے اُداس (خلیل رمزی)
مرسلہ: ابو رشید، آسنسول

ام شراب مست گھٹا مطرب و بہار
سب آگئے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے (وامق جونپوری)
مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پہریوی، بریلی

لے اُڑا ہے دودِ عنبر دو دلوں کے راز کو
دور تک پھیلا دیا ہے گھنگھروؤں کے ساز کو (محمود الحسن محمود)
مرسلہ: منصور عالم شاہین، کشن گنج

نثری عنوانات

"آخرِ شب کے ہم سفر" (ناول قرۃ العین حیدر)
مرسلہ: راز بگھمونوی معرفت ایم۔ اے صدیقی، حبیب پور بھاگلپور

"آنکھ اور خواب کے درمیان" (ندا فاضلی کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: محمد سامران خان، بھاگلپور

"آبشارِ نغمہ" (مجموعۂ کلام، پریم نرائن سکسینہ)
مرسلہ: سکینہ معراج وارثی، بھاگلپور

"آواز کا جسم" (محمود سعیدی کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد، بھارچک

"بند کمرے کی کھلی کھڑکیاں" (راجرہ تسکو کے افسانوں کے مجموعے کا عنوان)
مرسلہ: اُمِّ ہانی احمد میاں، بمبئی

"دائروں میں پھیلی لکیر" (کشور ناہید کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: فرحت وارثی، بھاگلپور

"سپنوں کی شہنائی" (رضیہ صبا خانم)
مرسلہ: جاوید احمد خاں، بھاگلپور

"نغمۂ پریشاں" (نعیم اختر کا افسانہ)
مرسلہ: خالق حسین، برہانپور

"زاگ کا بدن" (الیاس سیتاپوری کا افسانوی مجموعہ)
مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد، بھاگلپور
سید محمد خاں انصاری، بھاگلپور

"لہو ترنگ" (افسانہ، اوم کرشن راحت)
مرسلہ: محمد کامران خاں، بھاگلپور

"ایک آوارہ کی خاطر" (بشریٰ رحمٰن کی کتاب)
مرسلہ: محمد سراج الدین افضل، گیا

"دیوی، دھندلے دھندلکے" (بلراج ورما کا افسانہ)
مرسلہ: محمد محفوظ انصار، کٹیہار

"جھنکار" (رانو کا ناول)
مرسلہ: مرشیدہ بانو مرشو، اورنگ آباد

"سسکتے ساز" (گلشن نندہ کا ناول)
مرسلہ: سید وقار عثمانی انعام، دھنباد

"وفا کی دیوی" (افسانہ، پریم چند)
مرسلہ: محمد عارف انصاری، بھاگلپور

"اے میری زندگی" (نظم، شبیر حسن شبیر)
مرسلہ: ایم۔ اے۔ کریمی، گیا

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

بقیہ: اُردو خبرنامہ

قومی یک جہتی انعامات

پچھلے دنوں آل انڈیا اُردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم برائے قومی یک جہتی کے زیرِ اہتمام قومی یک جہتی انعامات کی تقریب غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں زیرِ صدارت جناب جگ پرویش چندر منعقد ہوئی۔ تقریب کا افتتاح جناب یش پال کپور نے کیا۔ جناب ایم۔ حبیب خاں جنرل سکریٹری آل انڈیا اُردو رائٹرس فورم شاخ دہلی نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ فورم برابر کوشاں ہے کہ فرقہ پرستی کی یلغار کو بے اثر بنایا جائے جو ملک کی ترقی میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ ہمیں اس لعنت سے ملک کو نجات دلانا ہے اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ انعامات سابق صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ نے تقسیم کیے۔ انعام پانے والے حضرات میں جناب حیات اللہ انصاری ایم۔ پی (صحافت) جناب کلانند بھارتیہ (تعلیم) جناب ایچ۔ سی جوشی (جنرل) مسز منور مادیوان (قومی یک جہتی) جناب انجم عثمانی (فکشن) اور پاکستانی گلوکارہ محترمہ ریشماں کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک ہزار ایک روپے ایک شیلڈ ایک گرم شال اور ایک سرٹیفکٹ پیش کیا گیا۔ تقسیم انعامات کے بعد گیانی جی نے اُردو کے کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ملک کی ہر زبان کو احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس سے قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔ مرکزی فورم کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم نے انعام پانے والے حضرات کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ اور جناب مالک رام نے اُردو اور قومی یک جہتی کے موضوع پر تقریریں کیں۔ آخر میں پاکستانی گلوکارہ ریشماں نے اپنی سریلی آواز میں گیت اور غزلیں پیش کیں۔ (ڈاک سے)

نئی کتابیں

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل

مصنف: سیّد حامد
صفحات: ۲۷۴
قیمت: درج نہیں
ناشر: خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ (بہار)

سیّد حامد کی شخصیت کا ہر پہلو بہت متوازن اور بھرپور ہے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں اور ملک و ملت کے مسائل کی طرف ہمدردانہ رویّے اور خلوص کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے رہے ہیں مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا بھرپور اظہار نہیں ہو پایا۔ انتظامی مصروفیات نے ان کی شخصیت کے ادبی اور شعری پہلو کو دبا دیا۔

علی گڑھ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا قیام تاریخی ہے۔ ان کے دَور میں علی گڑھ کو اقلیتی کردار ملا۔ بد انتظامی اور بے راہ روی کی تمام روایتیں ان کے دورانِ قیام ختم ہوئیں اور یونیورسٹی کا نیا سفر شروع ہوا۔ علی گڑھ میں بے پناہ مصروفیات کے باوجود انھوں نے بہت سا ادبی کام کیا۔ تہذیب الاخلاق اور اس کا ہندی قالب نشاناتِ جاری ہوا۔ پیشِ نظر کتاب کے بیشتر مضامین اسی دَور کی یادگار ہیں۔ حامد صاحب کے اسلوب میں وہی شگفتگی اور اچھوتا پن ہے جو ان کی نسل سے بعد کی نسلوں میں منتقل نہ ہو سکا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مضامین علی گڑھ میں تحریر کیے گئے ہیں اسی لیے یہ حامد صاحب کے قیامِ علی گڑھ کی مستند تاریخ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ان مضامین میں ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کیوں مستقل انتشار کا شکار ہے:

"وہ خلوص وہ دردمندی جس سے اس تحریک اور اس کی علامت علی گڑھ یونیورسٹی نے توانائی حاصل کی تھی مفقود ہو گئی اور ان کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کے ساتھ وفاداری ہمدردی اور ہمنوائی کا اعلان ہر کوچہ و بازار میں ہوتا ہے لیکن یہ اعلان کرنے والے کیا یونیورسٹی کا حق ادا کرنے کے لیے کبھی تیار ہوئے ہیں؟"

صفحہ ۲۰۳

"ملک میں لوگ یونیورسٹی کا نام حقارت کے ساتھ لینے لگے۔ جہاں آئے دن فتنہ فساد برپا ہوتا ہے وہاں پڑھائی ہی کیا ہوگی؟ پھر کیا کیا جائے؟ نصاب کا ایک چھوٹا سا حصّہ پڑھا دیا جائے اور امتحان اسی میں سے لے لیا جائے طالب علموں کا سال بھی ضائع نہ ہوگا، ڈگری بھی مل جائے گی دماغ پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی، نہ وقتِ عزیز کو جو بےمقصد یاوہ گوئی کے لیے وضع ہوا ہے، تحقیق اور تحصیلِ علم پر ضائع کرنا پڑے گا اور اگر کوئی سرپھرا اس اختصار، اس انحطاط کے خلاف لب کشائی کرے تو یا تو اس کو بےتکلف پیٹ دیا جائے یا اس کی نیت اور عقائد پر شبہ کی لکیر کھینچ دی جائے۔"

صفحہ ۲۴۷

سیّد حامد نے جذباتیت اور روایت پرستی کی بہت سخت الفاظ میں مذمت کی ہے اور انھی کو ملتِ اسلامیہ کے ناگفتہ بہ حالات کا ذمّہ دار قرار دیا ہے مگر میں انتہائی معذرت اور احترام کے ساتھ عرض کروں گا کہ موصوف خود بھی متعدد مقامات پر (نادانستہ ہی سہی) روایت پرستی کو قابلِ ستائش تصور فرما گئے ہیں علی گڑھ کی روایتوں کے تعلق سے تو یہ تضاد بہت ہی واضح ہے۔ بعض دوسرے مباحث بھی اس سلسلے میں اہم ہیں مثلاً علّامہ شبلی کو سرسید کا دستِ راست کہنا اور شبلی کالج کو علی گڑھ تحریک کا نتیجہ کہنا حامد صاحب جیسے ذی علم اور باریک بین کے لیے مناسب نہیں سیدِ والا گہر کی عقیدت اپنی جگہ مگر علّامہ شبلی سے ان کے اختلافات جس سطح کے تھے ان سے حامد صاحب بہت اچھی طرح نہ صرف واقف ہیں بلکہ انھوں نے یقیناً ان کا تجزیہ بھی کیا ہوگا۔ یہ بات کوئی معمولی درجے کا سرسیّد سے عقیدت رکھنے والا کہے تو خاموش ہوا جا سکتا ہے مگر حامد صاحب سے اس جذباتی عقیدت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بہادر شاہ ظفر
مصنف: ڈاکٹر اسلم پرویز
صفحات: ۴۰۵
قیمت: ۷۰ روپے
ناشر: انجمن ترقیِ اُردو (ہند)، راوز ایونیو،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر اسلم پرویز کی اس کتاب کا موضوع اُردو کی عام کتابوں کی طرح صرف ادبی نہیں ہے بلکہ یہ اعلیٰ پائے کا تحقیقی اور تاریخی کارنامہ بھی ہے۔ انھوں نے مواد کی فراہمی میں تاریخ کی مستند انگریزی کتب سے براہِ راست استفادہ کیا ہے اور نیشنل آرکائیوز میں محفوظ سرکاری کارگزاریوں کی خفیہ فائلوں تک بھی رسائی حاصل کی ہے۔ عہدِ بہادر شاہ ظفر سے متعلق اہم تہذیبی اور ثقافتی مرقعے بھی ڈاکٹر صاحب کے استفادے کے مآخذ میں شامل ہیں۔

کتاب کے حصّہ اوّل میں "سوانح"، "۱۸۵۷ء" اور "شخصیت" حصّہ دوم میں "ادبی پسِ منظر" "تصانیف" اور "ظفر اور ذوق" عنوانات کے تحت متعلقہ موضوع کا کما حقہٗ احاطہ کیا گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً اسلم صاحب نے جو مضامین ظفر کی شاعری پر لکھے تھے انھیں بھی ضمیمے کی شکل میں شاملِ کتاب کر دیا ہے۔

نیشنل آرکائیوز کی فائلوں، لاتعداد اُردو فارسی کتابوں متعدد انگریزی کتابوں، مائکرو فلموں، مکتوبات کے مطالعے کے بعد اسلم صاحب نے یہ معیاری کتاب اُردو دُنیا کو دی ہے۔ کتاب کا اشاریہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ کئی اہم تاریخی اغلاط اور رائج غلط فہمیوں کا ازالہ اس کتاب سے ہو جاتا ہے۔

سات نادر تصاویر کی شمولیت نے کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

—— اطہر فاروقی

کوکن کے سپوت
مصنّفین: انجم عباسی/شیخ اسماعیل
سائز: ڈیمائی
صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

صوبۂ مہاراشٹر کے ساحلی علاقے پر آباد خطّہ جو زیادہ تر ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مشتمل ہے، کوکن کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں بسنے والے ہر فرقے اور مذہب کے افراد ہیں۔ اب سے کچھ سال پہلے تک بہت کم اُردو والے اس خطّے کے نام سے آشنا تھے حالانکہ یہاں کے کئی ادبا و شعرا اُردو ادب میں ایک خاص مقام اور جگہ بنا چکے تھے، مثلاً ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بدیع الزماں خاور، ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر یونس اگاسکر، معروف صحافی عبدالحمید بوبیرے مرحوم اور دوسرے کئی حضرات۔

مذکورہ ادیبوں کی پہچان ہمارے لیے یہی تھی کہ یہ سب صوبۂ مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں۔ اور یہ بات ہمیں پیشِ نظر کتاب کے مطالعے سے ہی معلوم ہو سکی کہ ان سب کا تعلق مہاراشٹر کے ایک مخصوص خطّے کوکن سے ہے۔

گذشتہ چند برسوں سے ارضِ کوکن کے کچھ مخلص اور سرگرم افراد نے ایک تنظیم قائم کر کے وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے اُردو دُنیا کو روشناس کرانے کی کوششیں شروع کی ہیں جس کے نتیجے میں کئی ایسے نام سامنے آئے ہیں جن سے اُردو دُنیا ناواقف تھی لیکن جنھوں نے اُردو کی بے لوث اور اہم خدمت انجام دی ہے۔

"کوکن کے سپوت" میں کوکن کی ۲۱ ایسی ہی شخصیتوں سے انٹرویو لیے گئے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں اُردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ ان انٹرویو کے علاوہ کتاب میں تین سوانحی خاکے بھی ہیں جو ان شخصیتوں پر ہیں جو اب ہمارے درمیان نہیں۔ حالانکہ بعض انٹرویو بہت مختصر اور تشنہ ہیں لیکن ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان و ادب کی خدمت شمالی ہندوستان سے کہیں بہتر طور پر دُور دراز کے اُن علاقوں میں آباد وہ افراد انجام دے رہے ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا، دونوں سے بے نیاز ہیں۔ کتاب میں کچھ ایسے افراد کے انٹرویو بھی شامل ہیں جن کا تعلق اردو ادب سے آشنا نہیں ... اپنے فرقے کی بھلائی اور بہبود سے ہے جے ... وہاں "کوکنی فرقہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کتاب سلیقے سے شائع کی گئی ہے اور ... حضرات کے فوٹو بھی شاملِ کتاب ہیں۔ گ... اس طرح ہر شخصیت سے ہماری ادھور... نہیں پوری ملاقات کا انتظام کر دیا گ... ہے۔

—— فضل الرزاق ...

اُردو خبر نامہ

داراشکوہ لائبریری کا افتتاح

اُردو اکادمی کی مرکزی لائبریری داراشکوہ کا افتتاح ۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو شام چھ بجے اکادمی کے چیئرمین اور دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ لائبریری کا یہ نام محترم کپور صاحب ہی نے تجویز فرمایا تھا جو شاہ جہاں کے سب سے بڑے بیٹے کی یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ مغل شہزادہ تھا جس نے اپنے دور میں علم و تصوف کی بہترین خدمات انجام دیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان میں مذہبی رواداری کو فروغ دینے کی زبردست کوششیں کیں۔ وہ علم و ادب کا قدرداں ہی نہیں خود صاحبِ تصنیف بھی تھا۔

لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے محترم کپور صاحب نے فرمایا کہ "لائبریریاں اور کتب خانے علم و اخلاق کی روشنی عام کرنے کا ایک موثر وسیلہ ہیں۔ داراشکوہ لائبریری قائم کرکے اُردو اکادمی، دہلی نے دہلی والوں کے لیے ایک اور ایسا گوشہ آراستہ کر دیا ہے جہاں اگر وہ طالب علم کی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ لائبریری میں اب بھی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ یہ ذخیرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے اور میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلے میں کوئی مالی دشواری پیدا نہیں ہونے دی جائے گی۔"

اس موقعے پر اکادمی کے وائس چیئرمین اور دہلی کے ایکزیکٹو کونسلر برائے تعلیمات جناب کلانند بھارتیہ، پروفیسر گوپی چند

دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور ربن کاٹ کر لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے۔ محترمہ حبیبہ قدوائی، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ایکزیکٹو کونسلر برائے تعلیمات کلانند بھارتیہ، سیکریٹری اکادمی سید شریف الحسن نقوی، جناب انور علی دہلوی اور لائبریرین محترمہ نزہت مہدی رضوی کو بھی تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اردو اکادمی دہلی (دہلی انتظامیہ) کی
مرکزی لائبریری
دارا شکوہ
کا افتتاح
۱۵ مارچ ۱۹۸۸

دائیں سے: جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جناب ایچ۔ ایل۔ کپور، جنابِ کلانند بھارتیہ اور جنابِ انور علی دہلوی
(تصاویر: سید فضا علی)

اور جنابِ انور علی دہلوی نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ کپور صاحب کی طرح محترم بھارتیہ جی نے بھی یہ یقین دہانی کرائی کہ لائبریری کی توسیع و ترقی کے لیے دہلی انتظامیہ اُردو اکادمی کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہے گی۔ جنابِ انور علی دہلوی نے اپنی تقریر میں اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ انتظامیہ کے بعض حلقوں سے اندر ہی اندر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اکادمی کو موجودہ بلڈنگ سے کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے اکادمی کی کارکردگی پر خراب اثر پڑ سکتا ہے۔ جواباً محترم کپور صاحب اور بھارتیہ جی نے کہا کہ ایسا نہیں ہوگا اور جب تک اکادمی کے دفاتر کے لیے مجوزہ نئی بلڈنگ تعمیر نہیں ہو جاتی، اکادمی موجودہ عمارت ہی میں رہے گی۔ سیکریٹری اکادمی کے شکریے پر یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

محفلِ استقبالیہ

جنابِ سید مظفر حسین برنی کو اقلیتی کمیشن کا چیرمین نامزد کیے جانے پر اُردو اکادمی دہلی کی طرف سے ۱۶ مارچ ۱۹۸۸ء کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک استقبالیہ محفل ترتیب دی گئی۔ اس محفل کی صدارت جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی اور نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ جنابِ ذہین نقوی، ڈاکٹر خلیق انجم، جنابِ حسین علی جعفری، جنابِ خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جنابِ انور علی دہلوی نے بالترتیب اپنی تقریروں میں برنی صاحب کی ان خدمات پر روشنی ڈالی جن کا دائرہ زبان و ادب سے لے کر دیگر ملکی معاملات و مسائل تک پھیلا ہوا ہے۔ جنابِ متین صدیقی نے برنی صاحب کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ سیکریٹری اکادمی سید شریف الحسن نقوی نے مہمانِ محترم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس میں ان کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان توقعات کا اظہار بھی تھا جو موصوف سے اُردو بولنے والی لسانی اقلیت بجا طور پر قائم کرسکتی ہے۔ سپاسنامے کی کاپیاں حاضرین میں تقسیم بھی کی گئیں۔ جنابِ کنور

دائیں سے: پروفیسر گوپی چند نارنگ، حکیم عبدالحمید صاحب، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، جناب سید مظفر حسین برنی، ڈاکٹر خلیق انجم۔ (تصویر: سید فداعلی)

مہندر سنگھ بیدی کے صدارتی کلمات سے پہلے، جن میں موصوف نے برنی صاحب کو اقلیتی کمیشن کا چیئرمین نامزد کرنے پر وزیراعظم جناب راجیو گاندھی کے شکریے کی قرارداد پیش کی، خود برنی صاحب نے بھی حاضرین سے خطاب کیا اور کہا کہ ان سے جن توقعات کا اظہار کیا گیا ہے، اپنے دائرۂ اختیار کی حدود میں انھیں پورا کرنے کے لیے وہ ہمہ وقت کوشاں رہیں گے۔

غیر ملکی مہمان

۸ اپریل کی شام کو اُردو اکادمی کے دفتر میں روسی ادیب اور مصوّر جناب اِوگینی بریژیکوف تشریف لائے۔ وہ ازبکستان رائٹرز یونین کے سربراہوں میں ہیں اور سوویت روس میں ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کے علاوہ ایک مصوّر کی حیثیت سے بھی ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔

اکادمی کی کلچرل اور سیمینار کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے حاضرینِ جلسہ سے محترم مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ بریژیکوف صاحب ایک جامع صفات شخصیت کے مالک ہیں۔ جہاں انھوں نے ایک طرف نفسیاتی موضوعات و مسائل پر افسانے اور ناول لکھے وہیں دوسری طرف انھیں تاریخی عنوانات سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ اسی دل چسپی کی ایک دین ان کا ناول "سُرخ نجارا" ہے جو اس صدی کے آغاز میں ترکستان میں رونما ہونے والے واقعات کی کہانی سناتا ہے۔ انھوں نے وسط ایشیا پر ایسے مضامین بھی لکھے جو علم الاقوام سے ان کی گہری واقفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ۴۶ سال کی عمر کو پہنچ کر انھیں مصوری سے دل چسپی پیدا ہوئی اور جلد ہی اس شعبۂ فن میں انھوں نے امتیاز حاصل کرلیا۔

بریژیکوف صاحب نے اولاً تو اکادمی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس جلسے کا اہتمام کرکے انھیں دِلّی کے دانشوروں کے سامنے اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا پھر "سوویٹ ادب میں دانشورانہ وسیع النظری" کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹالن کے زمانے میں بہت سی سچائیوں پر جھوٹ کے پردے ڈال دیے گئے تھے، اس دور میں جن ادیبوں یا شاعروں نے سچ بولنا چاہا ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ خروشچیف آئے تو

بائیں سے : اوگینی بریژیکوف، ترجمان مور یہ صاحب، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب انور علی دہلوی (تصویر: سید فلاح علی)

انھوں نے شروع شروع میں تنگ نظری کے اس حصار کو توڑنے کی کوشش کی لیکن پھر وہ خود بھی اسی حصار میں سمٹتے چلے گئے۔ تاہم ان کا دور اسٹالن کے دور سے قطعی مختلف تھا اور انھوں نے اپنے تمام تر تعصبات کے باوجود روسی معاشرے میں آزاد خیالی کی ایک لہر پیدا کی اور ان کا یہ کارنامہ یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ بریژیکوف صاحب نے بریژنیف کے دور کو ویسا ہی تاریک دور قرار دیا جیسا اسٹالن کا دور تھا۔ انھوں نے کہا کہ بریژنیف کے دور میں ایک بار پھر فکر و خیال کی آزادی پر وہی پہرے بٹھا دیے گئے جن پہروں میں روس کا دانشور طبقہ اسٹالن کے دور میں دن بتا چکا تھا۔

بریژیکوف صاحب نے روس کے موجودہ سربراہ مملکت میخائیل گورباچیف کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی آمد کے بعد روسی عوام نے حقیقی معنی میں آزادی کی سانس لی ہے اور وہاں کے لکھنے والے بھی اس گھٹن سے باہر آئے ہیں جو برسوں سے ان پر مسلط تھی۔ انھوں نے کہا کہ سوشلزم میں ہمارے سماج کا اٹوٹ عقیدہ ہے لیکن اپنی خامیوں اور خرابیوں کا احساس اور ان کا اظہار سوشلزم کی تعمیر میں معاون ہے، مانع نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے پرانے مسودات جو اب تک شائع نہیں ہو سکے تھے، اب شائع کیے جا رہے ہیں اور کچھ ایسی کتابیں بھی جو روس سے باہر تو چھپ گئی تھیں لیکن روس میں نہیں چھپ سکی تھیں، اب وہاں چھاپی جا رہی ہیں۔ مثلاً پاسترناک کا ناول "ڈاکٹر ژیواگو"۔

بریژیکوف صاحب کی تقریر کے بعد متعدد حضرات نے ان سے سوالات بھی کیے جن کے جواب انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے دیے لیکن اس سوال پر کہ کیا روس میں سولشرے نتسن کے مشہور ناول "کینسر وارڈ" کی اشاعت کا بھی امکان ہے، وہ قدرے برافروختہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم صرف وہ کتابیں چھاپ رہے ہیں جو اب تک اس لیے نہیں چھپ سکی تھیں کہ ان میں ہمارے سماج کے بعض برے پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی تھی لیکن جہاں تک سولشرے نتسن کا تعلق ہے وہ سوشلزم کے بنیادی اصولوں ہی کا مخالف اور منکر ہے۔ ایسے شخص کی تحریریں اگر ہم چھاپیں گے تو صرف اسی صورت میں جب ہمیں یہ دکھانا مقصود ہوگا کہ بری تحریریں کیسی ہوتی ہیں۔

اس جلسے کی صدارت جناب اندر کمار گجرال فرما رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں جناب بریژیکوف کے وسیلے سے پوری روسی قوم کو یہ مشورہ دیا کہ ان

...ں دوستی ہندوستان اور پورے ہندوستانی عوام سے ہونی چاہیے، چند منتخب افراد سے نہیں۔ ریاستی جبر لوگوں کو کتنا بزدل اور بسا اوقات عیار بنا دیتا ہے اس کی مثال انھوں نے ایمرجنسی کے زمانے کے ایک واقعے سے دی۔ ایک ہندوستانی پبلشر نے ایک کتاب چھاپی جو دو جلدوں میں تھی لیکن ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد وہ اس کی دوسری جلد کے وجود سے منکر ہو گیا جب کہ یہ جلد منظر عام پر بھی آچکی تھی۔

گجرال صاحب نے کہا کہ جو کچھ بریژیکوف صاحب نے میخائیل گورباچیف کے بارے میں ہمیں بتایا ہے اگر وہ درست ہے تو میں کہوں گا مہمان محترم اس کا برا نہ مانیں کہ گورباچیف لینن سے بھی زیادہ احترام کے مستحق ہیں۔ ایک بڑا انقلاب برپا کرنا بڑی بات ہے لیکن ایک بگڑے ہوئے انقلابی سماج کو درست راستے پر لانا اس سے بھی بڑا کام ہے۔

بریژیکوف صاحب نے اپنی بنائی ہوئی تصویروں پر مشتمل ایک مطبوعہ کتابچہ تمام حاضرین کو اور اپنی دو پینٹنگز اکادمی کو پیش کیں۔ سیکریٹری اکادمی کے شکریے پر جلسہ ختم ہوا۔ بریژیکوف صاحب کی تقریر روسی میں تھی ترجمان کے فرائض مور بیر صاحب نے انجام دیے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے انعامات

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے سال رواں کے لیے مندرجہ ذیل شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، خوشنویسوں کو انعامات دیے گئے ہیں۔ اس سال کا آل انڈیا قومی اردو انعام جناب اوپندر ناتھ اشک کو (گیارہ ہزار روپے) اور آل مہاراشٹر خصوصی انعام محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ کو (پانچ ہزار روپے) دیا گیا باقی انعام یوں ہیں:

شاعری

اوّل انعام: دشت بے تمنا (قیصر الجعفری، بمبئی) چار ہزار روپے۔ دوم انعام: تزکیہ (سلیم شہزاد، مالیگاؤں) تین ہزار روپے۔ سوم انعام: (الف) مطلع حیات (احسن رضوی (مرحوم)) دو ہزار روپے۔ (ب) شہر کی دھوپ (ساحر شیوی، رتناگری) دو ہزار روپے۔

افسانوی ادب

اوّل انعام: معبر (سلام بن رزاق، بمبئی) چار ہزار روپے۔ دوم انعام: میرا کھویا ہوا ہاتھ (سلطان سبحانی، مالیگاؤں) تین ہزار روپے۔

بچوں کا ادب

اوّل انعام: کسی کو نہیں۔ دوم انعام: جنگل کی امانت (وکیل نجیب، کامٹی) دو ہزار روپے۔

عام ادبیات

اوّل انعام: کسی کو نہیں۔ دوم انعام: نقوش چلپن (مولانا محمد حنیف ملی، مالیگاؤں) تین ہزار روپے۔ سوم انعام: (الف) دشت شفا (ڈاکٹر مرزا انور بیگ، بمبئی) دو ہزار روپے۔ (ب) تاریخ ہند کا المیہ (محمد ضیاء الحق خاں، بلڈانہ) دو ہزار روپے۔

تنقیدی/علمی

اوّل انعام: اردو پر فارسی کے لسانی اثرات (عصمت جاوید، اورنگ آباد) چار ہزار روپے۔ دوم انعام: ڈاکٹر مظفر حنفی حیات، شخصیت اور کارنامے (محبوب راہی، اکولہ) تین ہزار روپے۔ سوم انعام: ودربھ میں شاعری (ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد، کھام گاؤں) دو ہزار روپے۔

اردو صحافت

(۱) حسن کمال (بلٹز، بمبئی) تین ہزار روپے۔ (۲) خلیل زاہد (اخبار عالم، بمبئی) تین ہزار روپے۔

خوشنویسی

(۱) شمس بلیاوی (اردو ٹائمز) دو ہزار روپے۔ (۲) فتحیاب عالم (انقلاب) دو ہزار روپے۔ (۳) ایوب انصاری (ناگپور) دو ہزار روپے۔

طغریٰ نگاری

(۱) سعید انصاری (انقلاب) دو ہزار روپے (۲) عتیق انصاری (بمبئی) دو ہزار روپے۔

مالی اعانت

(۱) احسن یوسف زئی (مرحوم) بیوہ تین ہزار روپے۔ (۲) نزاکت فیضی (ملکاپور) تین ہزار روپے۔

اردو مراٹھی ادبی خدمات

م۔ رخ۔ شاذلی (ناندیڑ) چار ہزار روپے۔ — (پریس ریلیز مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی)

اردو کی ترویج و ترقی کے لیے چند عملی تجاویز

تنظیم رضا انعامات مسلی نے اردو کے بہی خواہوں سے پُرزور اپیل کی ہے کہ خط، منی آرڈر، Regd. A.D لفافہ پر پتہ دیگر فارم اردو میں لکھیں اور مکتوب الیہ کا پتہ بھی اردو ہی میں لکھیں اس ڈاک خانے کے ذمہ دار اگر کسی معاملے میں انکار کریں تو بلا کسی حجت کے اسی ڈاک خانے کی شکایتی بیاض میں اس انتظام کے تعلق سے شکایت درج کر دیں یہ آپ کا جمہوری حق ہے۔

اُردو داں تاجر حضرات کو اپنا حساب کتاب اُردو میں رکھنا چاہیے۔ اس سے اُردو میں روزگار کے وسائل پیدا ہوں گے' اس امر پر خصوصی توجہ درکار ہے۔

قومی بینکوں میں اُردو میں لکھے چیک قبول کروانے کے لیے غور و خوض کر کے اس عملی اقدام میں عوامی نمائندوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور اُردو میں لکھے چیک رائج کرانے کی مہم چلائی جائے۔

اپنے نام کی تختی اُردو میں لکھوایے' تاجر حضرات اپنی دکانوں کے بورڈ اُردو میں بنوائیں اور اپنے Letter head پر اُردو پتہ چھپوائیں اور مقامی میونسپلٹی پر زور دیں کہ وہ محلّوں کے اور راستوں کے نام اردو میں بھی لکھوائے۔

اُردو اکیڈمیاں طلبا کے لیے اُردو لغت' صرف و نحو' مضمون نویسی' کاروباری خطوط' دفتری خطوط اور عام معلومات کی کتابیں ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے امتحانات جیسے آئی۔اے۔ایس وغیرہ کے سوالات و معلومات مرتّب کر کے رعایتی داموں میں مہیّا کریں' اور دیگر معلومات پر بھی رعایتی داموں میں کتابیں مہیّا کی جائیں۔

بھوپال میں مولانا آزاد کی یادگار قائم کیے جانے کا مطالبہ

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے سیفیہ کالج میں منعقدہ ایک جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات' تعلیم' خاندان اور علمی ادبی و سیاسی خدمات کا تعارف کراتے ہوتے بھوپال میں ان کی یادگار قائم کیے جانے کے سلسلے میں تجاویز پیش کیں جنھیں حاضرینِ جلسہ نے اتفاقِ رائے سے منظور کیا۔

تجاویز

۱۔ اہلِ بھوپال مدھیہ پردیش حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ بھوپال یونیورسٹی میں ہندوستان کے بلند مرتبہ سیاسی رہنما اور اُردو کے عظیم صحافی مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر مولانا آزاد چیئر قائم کرے جس کے تحت اُردو میں صحافت کی تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ اُردو میں صحافت کا اعلیٰ معیار قائم ہو۔

۲۔ حکومت مدھیہ پردیش سے اہلِ بھوپال کی پر زور اپیل ہے کہ جنگِ آزادی کے محترم سربراہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر سیفیہ کالج میں اپنے مالی تعاون سے مرکزِ ابوالکلام آزاد قائم کرے جس کے تحت:

(۱) آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہو جہاں آزاد ان کے ہم عصروں اور ان کے دور پر ایسے تحقیقی کام کرائے جائیں جن سے حُبّ الوطنی اور قومی یک جہتی کے کاموں کو فروغ ہو۔

(۲) آزاد لائبریری اور دارالمطالعہ ہو۔

(۳) آزاد پبلشنگ ہاؤس ہو۔

(۴) آزاد ہال ہو۔

(۵) یہ ادارہ سال میں ایک مرتبہ مولانا آزاد یا ان کے ہم عصروں پر یا کسی اور موضوع پر جس سے ملک کی تعمیر میں مدد ملے سیمینار یا سمپوزیم کرائے۔

(۶) یہ ادارہ اُردو میں اہم تحقیقی' تنقیدی اور صحافتی کام کرنے والوں کو اعزازات سے نوازے اور ان کی خدمت میں انعام پیش کرے۔

۳۔ اہلِ بھوپال حکومتِ مدھیہ پردیش سے درخواست کرتے ہیں کہ صد سالہ جشن ولادت مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریبات کے لیے ایک نمائندہ کمیٹی بنائے جس کی نگرانی میں مختلف وقتوں میں جلسے کیے جائیں سیمینار منعقد ہوں اور مولانا آزاد کے متعلق کتابیں شائع کی جائیں۔

(بھوپال ٹائمز' بھوپال)

مشاعروں میں ہوٹنگ ایک انعامی مقابلہ

الحاج عبدالقدیر میموریل ٹرسٹ مرادآباد کے زیرِ اہتمام مضمون نگاری کا مقابلہ منعقد کیا جا رہا ہے موضوع ہے "مشاعروں میں ہوٹنگ" مقابلہ میں شریک ہونے کے خواہشمند اپنے مضامین ٹرسٹ کے فارم کے ساتھ ارسال کریں۔ فارم داخلہ کے شرائط دو روپے کا ڈاک ٹکٹ بھیج کر محترمہ قمر قدیر ارم ڈائریکٹر (الحاج) عبدالقدیر میموریل ٹرسٹ قصرِ قمر' بارہ دری' مرادآباد ۲۴۴۰۰۱ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر آزاد کو ٹیگور ایوارڈ

حیدرآباد آرٹس اینڈ کلچرل سوسائٹی حیدرآباد نے جو آٹھ برس سے علمی' ادبی' فنّی اور تعلیمی شعبوں میں نمایاں کارکردگی پر ٹیگور ایوارڈ دیتی آرہی ہے ۱۹۸۷ء کا ٹیگور ایوارڈ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت تک جو حضرات یہ انعام حاصل کر چکے ہیں اُن میں سنیل دت' نرگس دت' بلقیس علاؤالدین اور جیلانی بانو کے نام شامل ہیں۔

(ڈاک سے)

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

آپ کی رائے

○ مارچ ۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" میں صفحہ ۵۸ پر حیدرآباد کے ایک جلسے میں اُردو زبان کی صورتِ حال سے متعلق میری ایک صدارتی تقریر کا خلاصہ چھپا ہے۔ اس میں ترسیل کی کمی کے سبب رپورٹنگ میں کچھ باتیں میرے منشا سے قدرے ہٹ کر کہی گئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں نے مالک رام صاحب کی ایک نجی بات چیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آپ کو محض بتانے کے لیے کہہ رہا ہوں، اسے چھاپا نہ جائے۔ دوسرے میں نے یہ کہا تھا کہ شمالی ہند میں اُردو کی ابتدائی تدریس میں کمی آرہی ہے لیکن دکن میں ابھی تک بدستور فروغ ہے۔ شاید تاریخ خود کو دہرائے گی اور اُردو کا مرکزِ ثقل پھر شمال سے دکن کو منتقل ہو جائے گا۔ تیسری بات یہ کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اُردو کو اختیاری زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے بلکہ اس بات پر زور دیا تھا کہ آزادی سے پہلے یوپی میں رواج تھا کہ اسکولوں میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک ہندی کے طلبہ کو دوسری زبان کے طور پر اُردو پڑھائی جاتی تھی اور اُردو کے طلبہ کو ہندی۔ اگر یہ طریقہ پھر سے رائج کر دیا جائے تو اُردو کا مسئلہ بہت کچھ حل ہو جائے گا اور اُردو اور ہندی والے ایک دوسرے کے نزدیک آجائیں گے۔ میں شمالی ہند میں چھٹی تا آٹھویں جماعت میں تمام طلبہ کو لازماً اُردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھانے کے حق میں ہوں اور یہ سہ لسانی فارمولے کے مطابق بھی ہوگا۔

—— گیان چند، حیدرآباد

○ خلیق انجم صاحب کا سلسلۂ مضامین "دلّی کے آثارِ قدیمہ" کافی معلوماتی ہے ہمیں دلّی کے آثارِ قدیمہ سے متعلق بہت سی جانکاری ملی ہے لیکن تازہ قسط میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہم طلبا فکر میں مبتلا ہو گئے کہ ابھی تک ہم لوگوں نے لفظ "چھ" ہی پڑھا اور لکھا تھا مگر خلیق انجم صاحب نے اپنے مضمون میں کئی جگہ لفظ "چھے" استعمال کیا ہے۔ ہم انجم صاحب سے گزارش کریں گے کہ وہ ہمیں اس لفظ سے متعلق مفصل معلومات فراہم کریں تاکہ ہمارے علم میں مزید اضافہ ہو سکے۔

—— محمد خالد جیلانی، پٹنہ

○ مارچ ۸۸ء کے شمارے میں ذیابیطس جیسے خطرناک مرض کے بارے میں ڈاکٹر گوردیپ سنگھ کا مضمون شائع کرکے آپ نے اس مرض کے مریضوں کو ایک سہولت فراہم کی جس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں معالج نے علامتوں کے ساتھ ساتھ ادویاتِ مرض بھی تحریر کی ہیں۔

—— شاہد ایوبی، سکندرآباد

○ مارچ کے شمارے میں شاہد میر کی غزل کے مطلع میں "وہ آنکھوں میں چھپا کر موتیوں کی کان رکھتا ہے" پہاڑ جیسی غلطی کو آپ نے کیسے برداشت کر لیا؟ موتی کان میں نہیں سیپ میں ہوتے ہیں۔[1]

—— خلیل رمزی، آسنسول

[1] ولی دکنی کے اس مشہور شعر کے بارے میں آپ کیا کہیں گے:
ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی —!
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کے پچھلے دو تین شمارے اسٹال سے خرید لایا۔ مسرّت کی بات یہ ہے کہ آپ کا موقر جریدہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی نظم و نثر کا معیار بھی قائم ہے۔ اپریل کے شمارے میں شہریار کی نظمیں، رونق نعیم، گوہر عثمانی، فاروق شفق، عرفان حمید اور مسعودہ نکہت کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ افسانوں میں منشا یاد کا افسانہ "دام شنیدن" بطور خاص پسند آیا۔ "ہم طرح اشعار" اور "سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے عنوانات" کا سلسلہ بھی خوب ہے۔ "دلّی کے آثارِ قدیمہ" جیسے مضامین کی اشاعت مفید ثابت ہوگی۔

—— مہدی پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ

○ رسالہ "ایوانِ اُردو دہلی" اپریل ۸۸ء دیکھنے اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ باوجود پوری توجہ کے کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ شاید یہ رسالہ اور توجہ چاہتا ہے۔

اوّل تو یہ کہ شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں بے حد خراب پرنٹ ہوتی ہیں دیکھیے صفحہ ۵ پر اعجاز اعظمی کی تصویر، صفحہ ۱۱ پر رونق نعیم وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ جب کسی ادیب شاعر کی تصویر دستیاب نہیں ہوتی تو وہاں پر خالی جگہ بنا دی جاتی ہے اُس میں کچھ بھی لکھا نہیں جاتا، اب صفحہ ۳۲ پر محترمہ نجمہ عزیز مرادآبادی نے اگر تصویر بھیجنے سے انکار کر دیا تو اس کی تشہیر آپ کیوں کر رہے ہیں؟

آخری صفحہ پر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تصویر کے نیچے ولادت اور وفات کی تاریخ

[illegible] شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ کیا پچھلے شمارے میں آپ نے جو ولادت اور وفات کی تاریخیں چھاپی ہیں وہ سب الہامی ہیں یا کسی کتاب سے حاصل کی گئی ہیں تو ان کے حوالے کیوں نہیں دیے گئے۔[1] شمس الرحمٰن فاروقی کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاریخ ادب اُردو کی جو کتابیں شایع ہو چکی ہیں ان کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ایک نئی روایت شروع کی ہے۔ پھر لفظ "جناب" کو اضافت کے ساتھ کیوں استعمال کیا گیا۔ لفظ جناب تو انگریزی لفظ مسٹر کی جگہ استعمال ہوتا ہے اُردو میں جناب بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔[2]

منشا یاد کو اس قدر اہمیت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ سب کیا لکھا ہے۔ یہ وقت کی بربادی کے سوا کیا ہے۔ کیا چھاپنے سے پہلے آپ کے یہاں انتخاب نہیں ہوتا۔ کیا منشا یاد سرحد پار کے ہیں اس لیے ایک اہم ادیب ہیں۔ ان کی اس تحریر میں طفلانہ تصورات کو بہت عمل دخل ہے اور ہم آپ کے لیے اس میں کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی اس تحریر میں اس بات کا اقرار خود ہی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں: [illegible] تو میں لعل [illegible] لعل ہوں [illegible] سیپیاں [illegible] تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی سکون مل جاتا ہے۔ منشا یاد کو سکون مل جاتا [illegible] ملوان [illegible] جاتا ہے۔

"دام تسنیدن" کی منطق ملاحظہ ہو "میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا بچپن میں ایک بار زکام بگڑ گیا تھا اور اسے ہر چیز سے [illegible] گوشت کی یخنی پلائی گئی تو اسے قے ہو گئی کیوں کہ اسے اس میں مردار کی بدبو آئی حالاں کہ یہ تو اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی مگر اس کا دل اس روز سے ہمیشہ کے لیے گوشت سے پھر گیا۔"

سوال یہ ہے کہ ایسی بدبودار ناک رکھنے والا آدمی گوشت ہی کیوں؟ ہر کھانے کی چیز کو ترک کر سکتا ہے لیکن یہاں منشا یاد نے صرف گوشت ترک کرنے کی بات لکھی ہے اس لیے کہ آگے چل کر ان کو یہ بتانا ہے کہ انھوں نے بھی کسی اور وجہ سے گوشت خوری ترک کر دی ہے۔ واہ صاحب واہ۔

——— سید محی رضا، بمبئی

[1] حوالے دیے گئے ہیں ——— ادارہ

[2] آپ مزید تحقیق فرمائیں جناب اضافت کے ساتھ ہی استعمال ہونا چاہیے، سوا اس صورت کے جب نام کے بعد صاحب کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ ——— ادارہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اپریل ۸۸ء کا شمارہ تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ مضامین میں "عصری معنویت کا افسانہ" اور "حسرت موہانی ایک مردِ قلندر" بہت خوب ہیں۔ میری ناقص رائے میں اگر "ایوانِ اُردو دہلی" میں آئی۔ اے۔ ایس اور یو۔ جی۔ سی جیسے اعلیٰ ترین مقابلہ جاتی امتحانات کے اُردو نصابات کے متعلق ایک گوشے کا اضافہ فرمائیں تو مہربانی ہوگی۔

——— ابن خلیل قاسمی، علی گڑھ

○ سرورق کی پشت پر ایک تصویر دے کر ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو نمایاں کرنا اپنے ورثہ کو محفوظ رکھنے کی ایک ایسی کوشش ہے جو دوسرے اُردو، ہندی رسالوں میں نظر نہیں آتی۔ "دلّی کے آثارِ قدیمہ" تو ایسا مفید مضمون ہے جو مولانا عبدالحلیم شرر کی "گذشتہ لکھنؤ" کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے تاکہ موجودہ نسل اپنے اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر ویسی ہی کارکردگی کا ثبوت دے سکے۔

——— ش۔ م۔ عارف ماہر آروی، پٹنہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا یہ وصف خصوصیت سے داد طلب ہے کہ اس میں لکھنے والے ادیب معیار رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس ماہنامے نے نئے لکھنے والوں کو بھی آگے آنے کا موقع دیا ہے۔

——— خالق حسین، پانچ فوارہ

○ جلد ا شمارہ ۱۱ کے ساتھ آج پہلی بار "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ یہ "ایوانِ اُردو دہلی" کی خطا ہے نہ آپ کی بلکہ میری کوتاہ دستی اور لاعلمی [illegible] ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی پہلی بار ایک ہی رسالے میں مختلف علوم پڑھنے کو ملے۔ مختلف علوم پر مبنی رسائل کا نعم البدل ہونے کی گنجائش اس رسالے میں کسی حد تک موجود ہے ——— جلیس عابدی صاحب کا مضمون "سائنس انسانیت نواز کیوں نہیں" مدلل اور فکر انگیز ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "سائنس کا منشا ——— قدرت سے جنگ آزما نہیں ہم آہنگ ہونا ہے" عصرِ حاضر کی تخریب کاری اور ملکی رقابت کے صحیح حل اور تعمیر و ترقی اور انسان [illegible] کی مثبت پالیسی کے سائن بورڈ کے مترادف ہے ...

عبدالمغنی صاحب کا مضمون "ابوالکلام آزاد کی دانشوری" ایک دانشورانہ سعی ہے لیکن ترجمان القرآن اور تفہیم القرآن کے بارے میں ان کا یہ Statement "اُردو زبان یا کسی زبان میں ان تفسیروں سے بہتر ترجمانی کلام الٰہی کی نہیں کی گئی" دانشورانہ سہو ہے یا دانشورانہ چشم پوشی۔ فارسی و عربی کی بات کجا اُردو تفاسیر کے لیے اس Statement کے اقبال میں دانشوروں کو تامل ہوگا۔

——— علی محمد قاسمی، سری نگر

فون نمبر:
۲۷۴۲۱۱ اور ۲۶۳۳۴۸

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۲ — فی کاپی ۲/۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — جون ۱۹۸۸ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمّہ دار نہیں۔
ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع شدہ تحریریں حوالے کے ساتھ نقل کی جاسکتی ہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عید مبارک

سرورق اور تزئین: ارشد علی
خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (اعزازی ناظر، پرنٹر، پبلشر) نے مسرز آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

مئی ۱۸۵۷ء کا مہینہ ہماری جنگ آزادی کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش مہینہ ہے۔ اس مہینے کے دسویں دن انگریزی افواج کے ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ میں غیر ملکی تسلط کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا اور میرٹھ سے چل کر دلّی آ پہنچے تھے جہاں انھوں نے انگریزوں کی وفادار افواج کی مزاحمت کو ناکام بنا دیا تھا۔ دلّی پر قابض ہوتے ہی باغی سپاہیوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو، جنھیں انگریزوں نے بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اپنا سربراہ تسلیم کر لیا اور ان کی شہنشاہیت کی بحالی کا بھی پُر زور لفظوں میں اعلان کیا۔ بہادر شاہ ظفر اپنی معذوریوں کے پیشِ نظر ابتداءً قدرے تذبذب میں تھے لیکن سپاہیوں کے خلوصِ نیت اور ان کے مجاہدانہ جوش و خروش کو دیکھ کر بالآخر انھوں نے ان کی کمان سنبھال لینے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ وسائل کے فقدان اور اپنی ضعیف العمری کے باوجود شاہ ظفر نے اپنی نئی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی جی توڑ کوشش کی اور وہ تمام تدابیر اختیار کیں جو اس موقعے پر ضروری تھیں؛ یہ اور بات ہے کہ حالات نے مساعدت نہ کی اور ان کی اور ان کے رفقا کی تمام تر جدوجہد ناکامی پر منتج ہوئی۔

بغاوت کامیاب ہو جائے تو انقلاب کہلاتی ہے اور ناکام رہے تو اسے غدر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بھی اُس وقت غدر کا نام دیا گیا لیکن آزادی اور حریّت خواہی کی جن چنگاریوں کو اس ناکام بغاوت نے ہوا دی تھی وہ بجھی نہیں، دھیرے دھیرے سلگتی رہیں اور پھر انھوں نے آزادیٔ وطن کی اس ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کی جس کی قیادت آگے چل کر مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لیڈروں نے سنبھالی اور اپنے ملک کو غیر ملکیوں کی غلامی سے نجات دلائی۔

اس مقدس تاریخی دن کی یادوں کو تازہ کرنے اور ۱۸۵۷ء کے شہیدانِ آزادی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۱۰ مئی کو رات آٹھ بجے دلّی انتظامیہ نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا۔ یہ جلسہ کشمیری گیٹ دلّی کے باہر اس مقام پر رکھا گیا جہاں سے دلّی پر دوبارہ قابض ہونے کے لیے انگریزی فوجوں نے باغیوں پر آخری بھرپور حملہ کیا تھا اور فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہو گئی تھیں۔

اس جلسے کی صدارت دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے فرمائی۔ مرکزی وزیر جناب ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت اور دلّی کے چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر مہمانانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ جلسے کے شرکا کو خطاب کرتے ہوئے جناب جگ پرویش چندر نے کہا کہ ادنیٰ ذاتی اغراض سے اُوپر اُٹھ کر اعلیٰ اجتماعی مقاصد کے لیے سرگرمِ عمل ہو جانے کی جو مثال ۱۸۵۷ء کے مجاہدین نے قائم کی وہ ہر دور میں قابلِ تقلید رہے گی۔ زندہ قوموں کا یہی شعار ہونا چاہیے۔

محترم لیفٹیننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے اعلان کیا کہ اس یادگار مقام پر جہاں آج یہ جلسہ ہو رہا ہے، سٹی میوزیم کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ یہ میوزیم دلّی کے مختلف تاریخی ادوار کے تہذیبی مرقعوں سے آراستہ ہوگا اور اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے احوال و آثار بھی پیش کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر یہ رنج لیے ہوئے اس دنیا سے اُٹھ گئے کہ: "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں" لیکن ان کی روح کو یہ دیکھ کر ضرور آسودگی ملی ہوگی کہ آج دلّی کا ذرّہ ذرّہ ان کی عظمتوں کے گیت گا رہا ہے اور اپنے ملک کی آزادی اور خود مختاری کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل بھی جس کا یہ مصرعہ ہے، دلکش ترنّم میں پڑھ کر سنائی جس کا سامعین نے پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔

جناب ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت نے فرمایا کہ ملک کی آزادی ہماری جدوجہد کا ایک مرحلہ تھی، منزل نہیں۔ ہماری منزل ایک مضبوط، متحد اور خوشحال ہندوستان کی تعمیر ہے۔ بدقسمتی سے آج ملک کے اندر کچھ ایسی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں جو تعمیر کے اس کام میں رکاوٹ ڈالنا چاہتی ہیں۔ ہر محبِ وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ان کی شر انگیزیوں کا مقابلہ کرے اور ان کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنا دے۔

آخر میں اُردو، ہندی اور پنجابی کا ملا جلا مشاعرہ ہوا جس میں شعرا نے موقعے کی مناسبت سے ولولہ انگیز نظمیں پیش کیں۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے قارئین سے رائے طلب کی تھی کہ کیا "ایوانِ اُردو دہلی" کی ضخامت اور قیمت میں کچھ اضافہ کر دیا جائے؟ اس سلسلے میں اب تک ہمیں جو خطوط ملے ہیں ان کی تعداد اتنی نہیں کہ انھیں سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جا سکے اس لیے فی الحال یہ مسئلہ ہم معرضِ التوا میں رکھ رہے ہیں مزید رائیں موصول ہونے پر کچھ فیصلہ کیا جا سکے گا۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

اے ہلالِ عید

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ڈبلیو ۵۷، گریٹر کیلاش، پارٹ I، نئی دہلی

اے ہلالِ عید اے اہلِ عقیدت کے امام
تجھ کو پہنچے ایک مجبورِ محبت کا سلام

دیکھ کر تجھ کو سبھی دلشاد ہیں مسرور ہیں
سب کے چہرے پُرضیا قلب و جگر پُرنور ہیں

بادۂ وحدانیت کا اِک چھلکتا جام ہے
تو وہ ساقی ہے کہ جس کا فیض سب پر عام ہے

قلبِ مومن کے لیے سرچشمۂ ایمان ہے
اور پھر ایماں ہے کیا اس بات کا عرفان ہے

تیرے دم سے ہے تر و تازہ عبادت کا وجود
اُنس کا، اخلاق کا، مہر و مروت کا وجود

آج کے دن تو مٹا دیتا ہے سب ناز و نیاز
دیکھ کر تجھ کو گلے ملتے ہیں محمود و ایاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں سب شاہ و گدا
تیرے در پر آج کے دن ہیں سبھی ہم مرتبہ

عید میں مفلس بھی لگتے ہیں گلے زردار کے
اور مجبوروں پہ کھل جاتے ہیں در مختار کے

آج کے دن تو مٹا دیتا ہے فرقِ نسل و رنگ
آج کے دن صلح میں تبدیل ہو جاتی ہے جنگ

آج کے دن ختم ہو جاتے ہیں سب فسق و فساد
غیریت، بیگانہ پن، مکر و ریا، بغض و عناد

آج کے دن تو مٹا دیتا ہے فرقِ این و آں
سبزۂ پامال پر ہنستا نہیں سروِ رواں

یوں تو دُنیا کے ہر اِک گوشے پہ ہے تیری نظر
اے ہلالِ عید کیا تجھ کو نہیں اس کی خبر

عید کے اگلے ہی دن تک وہ سماں رہتا نہیں
وہ زمیں رہتی نہیں وہ آسماں رہتا نہیں

یہ عقیدت، یہ مروت، یہ رواداری، یہ میل
بن کے رہ جاتے ہیں سارے یہ فقط اِک دن کا کھیل

پھر رگِ مجبور پر خنجر وہی مختار کا
پھر وہی مفلس پہ سب جور و ستم زردار کا

پھر وہی رشک و رقابت پھر وہی فسق و فساد
پھر وہی بیگانہ پن، غیبت، وہی بغض و عناد

پھر وہی حفظِ مراتب، فرقِ محمود و ایاز
پھر وہی کبر و رعونت پھر وہی ناز و نیاز

عید کے دن کا سماں قائم سدا رہتا نہیں
تو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ کہتا نہیں

اے ہلالِ عید اے عرش آشنا عالی مقام
ایک دن صرف ایک دن کے واسطے یہ اہتمام

اے ہلالِ عید اے صدراحت قلب و جگر
عید کے دن کا سماں ہو اور اتنا مختصر

اے ہلالِ عید اے سیارۂ ہفت آسماں
کر نہیں سکتا اگر تو اس فضا کو جاوداں

آ کہ پھر مل کر کریں خالق کی خدمت میں دُعا
اے خدائے دو جہاں اے مالکِ ارض و سما

کرشن کے، نانک کے، عیسیٰ کے، محمد کے خدا
تو صفات و ذات سے ہے ماسوا و ماورا

اپنے بندوں کو ہدایت دے کہ سب مل کر رہیں
جو سُنیں دل سے سُنیں وہ جو کہیں دل سے کہیں

ظاہر و باطن ہوں یکساں سب کی نیت نیک ہو
راستے کتنے ہی ہوں منزل سبھی کی ایک ہو

عید کے دن ہی فقط ایسا سماں آیا تو کیا
ریگزاروں پر اگر ابرِ رواں آیا تو کیا

جو نویدِ جاں فزا جو مژدۂ جاوید دے
اے خدا میرے خدا دُنیا کو ایسی عید دے

غالب کی ایک غزل

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

غالب کی یہ غزل اُس کی مقبول ترین غزلوں میں سے ہے اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اس کی مقبول ترین غزلوں میں سے ہے تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ یہ غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔ اگر غالب کی بہترین غزلوں کی ایک مختصر سی فہرست مرتّب کی جائے تو میرے نزدیک یہ غزل اُس فہرست میں نہیں آسکے گی لیکن اِس کے باوجود اِس میں رچے ہوئے تغزّل کی ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو دل کے تاروں کو چھوتی ہے ـــــ اور وہ جو غالب نے کہا تھا:

"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"ـــــ

اِس کی ایک جھلک اِس غزل میں بھی موجود ہے۔ ہماری غزل کے اکثر پُرانے اور فرسودہ مضامین کو غالب نے اس غزل میں ہاتھ لگایا ہے اور انھیں ایک ایسا اندازِ بیان عطا کیا ہے جو اس سے پہلے ہماری شاعری میں موجود نہیں تھا۔

نو اشعار پر مشتمل یہ غزل دلکش غزل کی ایک مثال ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ خود غالب کو بھی یہ غزل پسند تھی تو غلط نہ ہوگا۔

جب یہ غزل غالب نے کہی تو اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو اس تمہید کے ساتھ بھیجی:

"آج دوپہر کو میں نے ایک غزل لکھی ہے۔ کل یا پرسوں (قلعے میں) جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ (اُردو شاعری) پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اُس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل؟"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب کی نظر میں یہ غزل اُردو شاعری کو پایۂ سحر تک پہنچا رہی ہے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ یہ غزل غالب کی بہترین غزلوں میں سے نہیں ہے لیکن اپنی بات مکمّل کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ یہ ساری غزل اوّل سے آخر تک آپ کو سُنا دوں:

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بات یہ ہے کہ اس غزل میں بیت الغزل شعر یہ ہے:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اور یہ ہر اعتبار سے ایک بڑا شعر ہے۔ اِس کا مضمون اور حُسنِ بیان دونوں کسی بھی زبان کی شاعری کے لیے باعثِ فخر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ 'پردہ چھوڑنا' کے دو مفہوم ہیں اور یہاں دونوں مفہوم شعر کو ایک کائناتِ معنی عطا کر رہے ہیں۔ 'پردہ چھوڑنا' ایک تو استعارہ ہے کائنات سے کیوں کہ یہ کائنات محبوب کے چہرے کا پردہ ہے اور محبوب اِسی کائنات کے اندر پوشیدہ ہے۔ کائنات اِس سے الگ نہیں ہے جیسے خواجہ میر درد نے کہا ہے:

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھُلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

اور "پردہ چھوڑنا" کے لفظی معنی ہیں "پردہ گرانا" جیسے اسٹیج پر پردہ گرا دیا جاتا ہے اور پردے کے پیچھے سب کچھ چھُپ جاتا ہے۔ یہ تعیّن کا پردہ ہے،

جگن ناتھ آزاد
۲۵/اے، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی

تخلیقِ کائنات کا پردہ نہیں ہے، مرزا سودا نے پردۂ تعیّن کا مضمون یوں باندھا ہے:

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے ہٹادے
کُھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

یوسف سلیم چشتی مرحوم غالب کے مذکورہ شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اوّل تو مضمون ہی سراپا نور ہے۔ اس پر اندازِ بیان گو یا نورٌ علیٰ نور ہے" اور اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں تو شک نہیں کہ یہ کائنات بذاتِ خود کچھ نہیں ہے، محض اُس کی جلوہ گری ہے مگر چونکہ وہ خود اس پردے میں پوشیدہ ہوگیا ہے اور عوام النّاس اس پردے کو اُٹھا نہیں سکتے اس لیے وہ عرفانِ حقیقت سے محروم ہیں یعنی بالیقین نہیں کہہ سکتے کہ یہ اُسی کی جلوہ گری ہے۔

ہاں جو لوگ اہلِ معرفت ہیں وہ جانتے ہیں کہ بلاشبہ یہ کائنات اُسی کی جلوہ گری ہے یعنی ان مظاہر سے وہی ظاہر ہو رہا ہے"۔

گویا اس شعر میں غالب نے ایک ایسے انداز سے تلقینِ وحدت الوجود کی ہے جو اس سے پہلے کسی ایک ایسے شعر کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی تھی یعنی جس میں سے 'ہمہ اوست' کے معانی بھی نکلیں اور 'ہمہ ازوست' کے بھی۔

ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے غزل کا یہی شعر ہوا ہو اور اِسی سے غزل کا موڈ بن گیا ہو اور جب موڈ بن گیا ہو تو آٹھ اشعار اور بھی ہوگئے ہوں۔

اس کے علاوہ اِس غزل میں جتنے بھی اشعار ہیں وہ اندازِ بیان اور کے باوجود اس شعر کی سطح تک نہیں پہنچ سکے۔ کیوں کہ بڑی شاعری کے لیے محض اندازِ بیان ہی پہلی اور آخری شرط نہیں ہے۔ اِس کے لیے اور بھی بہت کچھ درکار ہے اِس لیے میرے نزدیک مذکورہ شعر کے علاوہ باقی اشعار بڑی شاعری کی ذیل میں نہیں آتے۔ ہاں اِن اشعار کو میں خوبصورت شاعری ضرور مانتا ہوں۔ پہلے شعر 'نکتہ چیں ہے' سے لے کر چوتھے شعر 'غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر' تک اشعار میں ایک طرح سے وحدتِ تاثر بھی موجود ہے یعنی پہلے شعر میں مرکزی خیال ہے حصولِ مقصد کی دُشواری لیکن یہ مضمون غالب کے یہاں اِس سے کہیں بہتر صورت میں موجود ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

دوسرے شعر میں مرکزی خیال جذبِ دل کا امتحان ہے۔ تیسرے میں لذّتِ آزار کی خواہشِ دوام اور چوتھے کا بنیادی تصوّر ہے ناموسِ محبوب کا پاس لیکن پانچواں شعر بہت معمولی ہے۔ اِس میں کوئی ایسا مضمون نہیں جو قاری کو متاثر کر سکے:

اِس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

اِس شعر میں بُرا اور بھلا کی صنعتِ تضاد تو ہے لیکن جہاں تک محبوب کی نزاکت کے موضوع کا تعلق ہے انشا کا یہ شعر غالب کے شعر سے کہیں بہتر ہے:

نزاکت اُس گلِ رعنا کی دیکھیے انشا
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

اب آخر میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے اِس غزل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی بڑی شاعری کی مثال نہیں ہے۔ اسے میں نے معمولی غزل نہیں کہا ہے۔ یہ غزل ایک خوبصورت اور دلکش غزل ہے جو طرح طرح کے محاسن سے مملو ہے۔ اِس میں زبان کی صفائی اور بے تکلّفی ہے، ایک شعر میں مصرعوں کا تقابل پوری شان کے ساتھ نظر آتا ہے، نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے حُسن سے بھی یہ غزل خالی نہیں اور حُسنِ بیان کی کیفیت یہ ہے کہ ساتویں شعر:

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلاتے نہ بنے

کا حسرت موہانی، طباطبائی، بیخود اور عبدالباری آسی نے الگ الگ مفہوم بیان کیا ہے اور پھر عبدالباری آسی نے تو اِسی ایک شعر کے چار مختلف معانی لکھے ہیں۔ ردیف اور قافیے میں نغمگی کی کیفیت ایک ایسی کمک پیدا کرتی ہے کہ قاری ایک شعر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ہمارے موسیقاروں نے گانے کے لیے غالب کی جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے ان میں بعض شاہکار غزلیں شامل ہوں یا نہ ہوں مثلاً:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

یا:

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے

لیکن یہ غزل:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے

شامل ہے۔ اِن تمام خوبیوں سے لبریز غزل بڑی شاعری ہو یا نہ ہو، معمولی یا چھوٹی شاعری نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

ٹوٹے سنّاٹے

میں دراصل ایسا سائل ہوں جو دروازے پر یہ دیکھے بغیر صدا لگا رہا ہے کہ دروازہ باہر سے مقفل ہے ـــــ لیکن جب دروازے کے تالے پر نظر پڑتی ہے تو دو قدم آگے چل کر پھر لوٹ آتا ہوں ـــــ اب تو میں یہ جان گیا ہوں کہ گھر بالکل خالی ہے ـــــ اس کی دیواریں، اس کے ستون اس کا فرش، اس کی چھت، کسی ایسے سنّاٹے کو جنم دے رہے ہوں گے جو تمھیں بھی پہچانتا ہے، مجھے بھی ـــــ ایسے میں باہر سے لگائی ہوئی میری صدائیں کتنی دیر تک اس سنّاٹے کی ولادت کو روک سکیں گے جو اندر جنم لے کر رہے گا۔

تم ہی بتاؤ اس رات جب ہم ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے یکایک لائٹ آف ہو گئی تھی ـــــ ہم اپنی قربت کی دولت پر نہ نازاں تھے نہ پشیماں ـــــ تمھاری سانسوں سے میری سانسوں کا رشتہ کچھ اس طرح تھا کہ جیسے ٹوٹ جائے گا تو نہ میں ٹوٹوں گا اور نہ تم بکھر جاؤ گی ـــــ محبت کا یہ لمحاتی رویّہ اپنا کوئی ورثہ تو نہیں ـــــ ہم کبھی بھی لمحے کے اس تصور سے آشنا نہ تھے ـــــ میں نے پہلے بھی محبت کی تھی، اپنی مرحوم بیوی سے ـــــ اُس کو چاہا تھا تو اس طرح ٹوٹ کر چاہا تھا کہ جدائی اور ہجر کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے تھے ـــــ صرف دو باتیں تھیں۔ درمیان میں کچھ بھی نہ تھا ـــــ اُس کو پالینا ـــــ یا موت اس کو پالینا یا موت ـــــ جب دو دل محبت کو موت سے شروع کرتے ہیں تو زندگی ان کا طواف کرنے لگتی ہے ـــــ لیکن اس رات جب بھک سے اجالے پھیل گئے تھے ـــــ کھوئی ہوئی روشنیاں در و دیوار سے پھر چمٹ گئی تھیں ـــــ تو ہم جدا ہو گئے تھے، تمھاری سانسوں کا رشتہ میری سانسوں سے ٹوٹ گیا تھا ـــــ اور میں تم کو ساتھ لیے تمھاری ہی تلاش میں نکل گیا تھا ـــــ اور تم میرے ساتھ چلتے ہوئے بھی مجھ سے جدا ہو گئی تھیں ـــــ یہ کیسی بے بسی ہے ـــــ مجبوریوں کی آخر یہ کون سی منزل ہے کہ مجھے تمھاری محبت کا یقین ہے اور تمھیں میری وفاؤں پر بھروسہ ـــــ پھر بھی تمھارے میرے درمیان نہ کوئی عہد و پیمان ہے نہ کوئی وعدہ و اقرار ـــــ ہم جدا ہو جانے کو اپنی محبت کا مقدر بناتے ہوئے اپنی اپنی قسمت پر شاکر نہیں ـــــ گویا میرا مقدر میرا اپنا ہے اور تمھاری قسمت، تمھاری ـــــ محبت کا یہ کون سا فلسفہ ہے ـــــ آج بھی اگر 'تم' تم ہو اور 'میں' میں ہوں تو پھر ہم کیا ہیں ـــــ تم ہی بتاؤ کیا ہم کسی جھوٹ سے محبت کے نام پر سمجھوتہ تو نہیں کر رہے ہیں ـــــ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سچ کیا ہے۔

سوتے جاگتے میں، کسی کو اپنی زندگی میں اس طرح شامل کر لینا کہ اس کی دوری کا احساس کچھ یوں لگے جیسے اپنے ہی جسم و جاں کا ایک حصہ کٹ کر کہیں رہ جاتا ہو ـــــ ایسا بھی تو نہیں ہوتا کہ یہ ایک حصہ کٹ کر کہیں رہ جاتا ہو اور ہم اس پر رو کر بیٹھ رہتے ہوں ـــــ یہ کٹا ہو[ا] حصہ تو ہم اپنے ساتھ اُس وقت تک لٹکائے پھرتے ہیں جب تک ہمارا وجود اپنی تکمیل نہیں کر لیتا ـــــ ایسی صورت میں کیا یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ ـــــ نہ تم مجھ سے پوچھو گی، نہ میں تم سے سوال کروں گا کہ ہم ادھورے ادھورے کیوں ہیں۔

چلو اگر تمھاری یہ بات مان بھی لوں کہ ان فاصلوں کو جو وقت نے تمھارے، میرے درمیان حائل کر دیے ہیں پاٹ دینا مشکل ہے تو پھ[ر] یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ اس سے زیادہ مشکل ہے کہ ہم اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کا غم اٹھائے، متوازی راستوں پر اس طرح چل رہے ہوں جیسے ریل کی پٹریاں ہوں ـــــ کہ ساتھ بھی ہیں اور ملتی بھی نہیں ہیں ـــــ اور تم بس اتنی ہی یگانگت کو زندگی کا حاصل سمجھ بیٹھی ہو کہ ہم ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں اُتار کر دل کی سرحد تک لے آتے ہیں اور پھر گھبرا کر ایک دوسرے کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں ـــــ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہم آخر کس جرم کی سزا ایک دوسرے کو

اقبال متین

اے۔ ڈی۔ ۲۰ دودھ گاؤں کالونی۔ پوہم پیٹ (اے پی) ۵۰۳۲۱۹

دے رہے ہیں —— خودکشی کی یہ کون سی صورت ہے —— جو زہر میں تمہاری خاطر پی رہا ہوں اس زہر کے میرے رگ و ریشے میں سرایت کرنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ ہم کیا اپنی بے گناہی کی سزا بھگتنے کے لیے ایک دوسرے کو بڑے خوب صورت انداز سے قتل کر رہے ہیں کہ دُنیا ہم پر کھل کر ہنس بھی نہ سکے ——

آخر یہ سب کچھ کیوں ہے —— کیا ہے —— تمھیں یاد ہے —— میں نے تم سے ایک بار پوچھا تھا —— کچھ سوچا تم نے ؟ —— تم چپ رہیں —— میں نے اصرار کیا —— تم نے مجھ سے کہا کہ تمھیں سوچنے کو وقت ہی نہیں ملتا —— تم ہی بتاؤ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے —— ہم کب تک آنکھیں بند کیے اندھوں کی طرح چلتے رہیں گے —— دلوں میں ایک دوسرے کو چھپاتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ اس طرح دیے ہوئے جیسے ہاتھ کٹ کر بے جان ہوگئے ہوں۔

ایک بات تم سے پوچھوں ؟ —— کیا تم جانتی ہو کہ تم جو ہوں ’ہاں کر کے‘ میری باتوں کو خاموشی میں دفنا دیتی ہو —— اس ہوں ہاں کے کتنے معانی نکلتے ہیں —— زبان اس وقت گنگ ہو جاتی ہے جب نطق کا بوجھ آنکھیں اٹھا لیتی ہیں —— لیکن جب آنکھیں جھکی ہوں —— تو جی چاہتا ہے ’تمہاری خاموشیاں ٹوٹیں —— تاکہ میں تمھیں اس دروازے سے باہر نکال لاؤں جس کے مقفل در و دیوار میں‘ —— یوں لگتا ہے تم چھپ گئی ہو اور میں باہر قفل دیکھ کر بھی صدائیں لگا رہا ہوں —— تم ہی بتاؤ‘ جب تم میری صدائیں سنتی ہو تو کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ پکار کر یہی کہہ دو کہ جاؤ بابا —— یہاں کوئی نہیں رہتا —— اور میں یہ سمجھ کر آگے بڑھ جاؤں کہ یہ آواز جو ابھی ابھی میرے کانوں سے ٹکرائی ہے‘ وہ اسی سناٹے کی آواز ہے‘ جسے تم نے اپنے وجود کو جھٹلا کر جنم دیا ہے۔ اور میں یہ جان کر بھی تمہاری آواز کو پہچان لینے کی جرأت نہیں کرتا ہوں تو میرا کیا ہوگا —— اس طرح ہم دونوں ہی اپنی اس بے گناہی سے خوف کھاتے ہیں جس کا نام محبت ہے۔ ایسی محبت جو اپنا اظہار نہیں چاہتی۔

اپنے جذبوں کو نگاہ کی طرح چھپا لینا کون سی بُرائی ہے‘ جس پر ہم فخر کرتے ہیں —— اور جب یہ سب کچھ ہوتا ہے تو میں تمھیں سامنے رکھ کر بھی تمھیں تلاش کرتا ہوں۔ یہ تلاش اپنی جگہ خود ہی ایک بزدلی ہے —— اس طرح تو کوئی بھی کسی کو نہیں کھوج سکتا —— جو فریب دوسرے دیتے ہوں اس فریب میں نہ آنا تو سمجھ بُوجھ کی بات ہوئی لیکن جو فریب ہم خود کو دے لیتے ہیں‘ اس کو کیا کہا جا سکتا ہے۔

تمہارا ہاتھ جب پہلی بار میرے ہاتھ میں آیا تھا تو نہ میں جانتا تھا نہ تم جانتی تھیں کہ یہ دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں —— ہم نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن کو کچھ اس طرح سنا تھا جیسے کوئی ٹین کے خالی ڈبے پیٹ رہا ہو —— لیکن جب ہم نے دل کی دھڑکنوں کا مفہوم سمجھا تو میں خوشی سے چلا اٹھا اور تم وحشت زدہ ہوگئیں —— حالاں کہ نہ کسی نے میری خوشی کی آواز سنی نہ تمہاری وحشت کو تمہارے چہرے پر دیکھا —— یہ خود ہم ہی تو تھے کہ ہم نے دلوں کی دھڑکنوں کو ٹین کے خالی ڈبوں کی آواز میں چھپا لینے کے جتن کیے تھے —— یہ کس قسم کی سمجھوتہ بازی ہم کر رہے ہیں —— سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ مان کر اپنے ہی گھر میں اس طرح چھپا رہنا کہ باہر کا قفل دیکھ کر لوٹ جانے والے بھی ہمیں ہوں —— کس قدر بھیانک مذاق ہے۔

جی چاہتا ہے تم سے کہوں کہ وہ چابی جسے ہم زندگی کے کسی موڑ پر مصلحتاً رکھ کر بھول گئے تھے‘ اب نہیں ملتی ہے تو فضول تلاش کیوں کریں —— کیوں نہ ایک پتھر اٹھا کر اپنے گھر کا قفل توڑ دیں اور جب اندر داخل ہوں تو یہ دیکھ کر دنگ ہو جائیں کہ ہم تو پہلے ہی سے گھر میں موجود ہیں۔

⬡

عزیز قیسی

بے سبب روٹھنے منے کا چلن یاد آئے
وہ سمن بر ز چمن تا بہ دمن یاد آئے

سبز پانی میں شفق گھول کے جائے سورج
شام ہوتے ہی ترا سانولا پن یاد آئے

ذکر جب آئے حریفانِ سیہ باطن کا
مجھ کو اک یارِ دل آرائے دکن یاد آئے

ہوک سی اٹھتی ہے سینے میں ترے نام کے ساتھ
جیسے بیمار مسافر کو وطن یاد آئے

ان دنوں وہ ہیں مسیحا کہ جنھیں دیکھے سے
جاں کنی، لاش، لحد اور کفن یاد آئے

تجھ سے کیا ربط ہے کیوں اک ترے یاد آنے سے
تجھ سے پہلے کے کچھ رنج و محن یاد آئے

تو مجھے دیکھے تو کیا جانیے کیوں کانٹوں سے
اوس پیتی ہوئی سورج کی کرن یاد آئے

مہرِ اغیار غریب الوطنی یاد کرو
جب بھی "بے مہریِ یارانِ وطن" یاد آئے

سفلہ خوبانِ وطن کو نہ بھلانا قیسی
جب کبھی تجھ کو ترا شہرِ دکن یاد آئے

بی ۴۶، عثمان چیمبرس، سیکنڈ پانڈیا لین، جوہو، بمبئی ۴۹

رفعت سروش

○

اک زندگی اور سو جھمیلے
اللہ یہ بوجھ مجھ سے لے لے

اپنی بھی عجیب زندگی تھی
سُکھ بھوگے، دکھوں سے مل کے کھیلے

تم موت کی وادیوں میں گم ہو
ہر سمت ہیں زندگی کے میلے

آجاؤ کہ یہ پہاڑ سی رات
کاٹے نہیں کٹتی ہے اکیلے

جس میں نہ بسی ہوں تیری یادیں
اللہ وہ سانس مجھ سے لے لے

○

کس کا جھوٹ اور کیسا سچ
دشمن کے حملے سے بچ

جب اک دن مر جانا ہے
پھر کیا جینے کا لالچ

جو چھپ کر ماریں شب خون
ایسے ہمدردوں سے بچ

جیون ایک پہیلی ہے
آدھا جھوٹ اور آدھا سچ

جھوٹ کی یہ نگری ہے سروشؔ
وہ پاگل جو بولے سچ

D-2A، ڈی۔ڈی۔اے۔ فلیٹس، منیرکا، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

ہائیکو

ہائیکو ایک مختصر ترین جاپانی صنفِ سخن ہے اور اُردو میں جاپانی سے بلاواسطہ نہ آکر براہِ مغرب آئی ہے۔ حقیقت سے زیادہ قریب لفظ کا استعمال کیجیے تو براہِ انگریزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اس جاپانی صنفِ سخن کا اوّلین نام "ہاکو" (HOKKU) اور ثانوی نیز مشہور و مقبولِ عام نام "ہائی کو" (HAIKU) ہے۔ عربی و فارسی زبانوں میں جس طرح قصیدے سے تشبیب کا حصّہ جُدا ہوکر غزل کے روپ میں ڈھل گیا تقریباً اسی طرح جاپانی صنفِ سخن "تنکا" (TANKA) کا پہلا حصّہ اس سے الگ ہوکر ہائیکو کی شکل اختیار کرگیا۔ "تنکا" وہ صنف ہے جو کل پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور مکالماتی انداز میں اس کے اوّلین تین مصرعے ایک شخص کی طرف سے اور آخری دو مصرعے دوسرے شخص کی طرف سے ادا ہوتے ہیں۔ تنکا کے یہی اوّلین تین مصرعے زیادہ اہم اور ہر دل عزیز ہوکر ایک جداگانہ صنف "ہائیکو" میں تبدیل ہوگئے۔

جاپانی شعرا بلکہ کہنا چاہیے کہ جاپانی لوگ مختصر اصنافِ سخن کے بڑے رسیا ہوتے ہیں۔ مختصر نظموں کا رواج وہاں بہت قدیم ہے۔ مختصر اصناف میں حالاں کہ کٹاڈوٹا، سیڈوکا، بسوسیکا، چوکا، تنکا اور رینکا وغیرہ وہاں رائج اور پسندیدہ ہیں لیکن ان سب میں ہائیکو کی مقبولیت عدیم المثال ہے۔

ہائیکو کُل تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تین مصرعے ترتیب وار پانچ، سات اور پانچ سالمے (SYLLABLE) کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک ہائیکو میں اوسطاً دس الفاظ ہوتے ہیں۔ ہائیکو ردیف قافیے کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ جاپانی زبان کی مخصوص ساخت، مخصوص آہنگ نیز مخصوص عروضی تنظیم ہائیکو کی تخلیق میں رچی بسی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ جاپانی شاعری میں بحور و اوزان کا وہ تصوّر نہیں جس کا وجود اُردو میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ جاپانی ہائیکو۔

(۱) توم بو سوری[۱]
روکیو وا دو کو ما
ری اتّا یورا
(آج میرا بچّہ تتلیوں کے تعاقب میں کیا جانے کہاں چلا گیا)۔

(۲) ہو تو توگے سو
ناکی ناکی تو بوزو
ایسو گا واشی
(کوئل کوکتی ہوئی پریشانی کے عالم میں اُڑتی ہے)۔

اپنی زبان کے مخصوص آہنگ موسیقی، تین مصرعوں کی ہئیت کے ساتھ تینوں مصرعوں میں ۵+۷+۵ = ۱۷ سالموں (SYLLABLE) کے شمار کی قید تمام جاپانی شعرا ہائیکو کی تخلیق و تشکیل میں برتتے رہے ہیں اور وہاں اس کی اسی ہئیت میں کوئی تبدیلی تادمِ تحریر نہیں ہوئی ہے۔ خدا جانے جناب شمیم احمد کو ہائیکو کے مصرعوں میں سلے بلز کی تعداد ترتیب وار پانچ، آٹھ، چار ہونے کا مغالطہ کہاں سے ہوا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ مغرب کی نہیں جاپان کی ایک شعری ہئیت ہے لیکن ہم اس سے مغرب ہی کے توسّط سے روشناس ہوئے۔ ہائیکو جاپانی شاعری کی ایک مقبول ہئیت ہے جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ تینوں مصرعے ملا کر صرف سترہ سالمے یعنی سلے بلز ہوں اور ان کی ترتیب ۵+۸+۴ ہو۔ ظاہر ہے ایسی نظم اُردو تو کیا انگریزی میں بھی نہیں ہوسکتی۔ انگریزی ہائیکو بس نام ہی نام کے ہائیکو ہیں۔ ہائیکو میں قافیہ نہیں ہوتا اور پوری بات کہنے کے بجائے صرف اشاروں یا نامکمل جملوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اُردو میں اس ہئیت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔"[۲]

جہاں تک ہائیکو کے موضوع، مواد اور غرض و غایت کا تعلّق ہے یہ اپنے ابتدائی دور سے ہی فطرت اور مشاہدۂ فطرت سے جڑی ہوئی ہے۔ "ہائی کو" میں عام طور پر کسی موسم یا پھر کسی موسمی کیفیت، موسم سے متعلّق جذبات، مناظر، پرندوں یا کسی دوسرے چھوٹے ذی روح کی طرف اشارہ

ناوک حمزہ پوری
ڈاک خانہ: شیر گھاٹی ۸۲۴۲۱۱ ضلع گیا (بہار)

ہوتا ہے۔

لیکن ایک اچھے ہائیکو میں جذبے کی ترسیل اور قدرتی مناظر سے متعلق محاکاتی انداز کے علاوہ دو بظاہر متضاد معلوم ہونے والی اشیا کی باطنی مشابہت و مماثلت کو بھی اُجاگر کیا جاتا ہے۔ اچھے ہائیکو میں کوئی ایک لفظ کلیدی نوعیت کا حامل ہوتا ہے جو ذہن کو اس میں پوشیدہ معانی کے تمام امکانی پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جاپان کا بودھ مذہب سے بھی قدیم رشتہ ہے اس لیے لازمی طور پر بُدھ تہذیب اور اس کے متعلقات سے بھی ہائیکو کے گہرے روابط رہے ہیں۔

یوں آج کل ہائیکو کا دامن بھی کشادہ ہوا ہے اور اس لیے گرد و پیش کے وسیع تر موضوعات اس کے دامن میں سمٹنے لگے ہیں لیکن ہائیکو کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام قسم کے بیانیہ اور سپاٹ اظہار کی شاعری نہیں بلکہ ایجاز و اختصار کے ساتھ ایک مخصوص قسم کی پیکر تراشی، علامت نگاری، اور جمالیاتی کیفیت سے اس کا اسلوب مملو ہے اور یہی مخصوص اسلوب ہائیکو کی روح ہے۔

ہائیکو کے موضوع و مواد سے متعلق جناب کرامت علی کرامت فرماتے ہیں:

"اس نظم میں ایسا لفظی پیکر پیش کیا جاتا ہے جس سے کوئی دیکھی ہوئی یا محسوس کی ہوئی شے نظر کے سامنے پھر جاتی ہے یا ماضی کے کسی واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ..... لیکن اس میں آج کل جدید انداز کی چیزیں بھی شامل ہو رہی ہیں۔"[۳]

اور بقول جناب رفعت خاں:

"ہائیکو کے موضوعات فطرت، موسم، مناظر، نیا سال اور درد و داغ وغیرہ ہیں۔"[۴]

جناب سید حامد حسین نے بڑی اجمالی لیکن پتے کی بات کہی ہے:

"جاپانیوں نے اس سے شاعری، پہیلی اور ڈرامے تینوں کا کام لیا ہے۔"[۵]

جاپانی شاعری کی ماہر ڈونیلڈ کین کے بقول ہائیکو شعرا کا تخیل جن چیزوں کی آماجگاہ ہوتا ہے اُن کی درجہ بندی درجِ ذیل شقوں پر کی جا سکتی ہے:

"(۱) بے خودی (۲) تنہائی (۳) تشکر و امتنان (۴) ماورائیت (۵) عدم عقلیت (۶) تضاد (۷) مزاح (۸) آزادی (۹) اخلاقی ناوابستگی (۱۰) سادگی (۱۱) مادّیت (۱۲) عشق (۱۳) جرأت۔"[۶]

ہائیکو کے کچھ کامیاب ترین شعرا کے ذکر سے پہلے جی چاہتا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف پوئٹری اینڈ پوئٹکس کی وہ عبارت نقل کروں جس سے اثر پذیری کی وجہ سے غالباً اُردو کے اکثر اہلِ قلم نے باشو کو ہائیکو کا اوّلین عظیم شاعر قرار دیا ہے:

"This Japanese Lyric Formed of 17 Syllables in Lines of 5,7,5 Syllables, Emerged in the 16TH Century, Flourished From The 17TH Century and has Adherents to day."

اس قول میں خصوصاً "EMERGED IN THE 16TH CENTURY" پر میری نگاہ رُکتی ہے اس لیے کہ "موری تاکے" (MORI TAKE) کی شارح مس بابٹ ڈائٹش (MISS BAB-ETTE DEUTSCH) کے بقول موری تاکے (۱۴۵۲ء تا ۱۵۴۰ء) بعض پہلوؤں سے باشو سے کم نہیں۔ اس کی ہائیکو میں مذہبی متعلقات سے وابستگی نمایاں عنصر ہے۔ چنانچہ موری تاکے کی ایک ہائیکو جو ایک بودھ کہاوت سے متعلق ہے کہ "ٹوٹا ہوا پھول دوبارہ شاخ سے نہیں جڑتا" آئندہ سطور میں کسی مناسب مقام پر درج کی جائے گی۔ یہاں سولہویں صدی میں ہائیکو کی وجود پذیری پر اعتراض اس نہج سے ہے کہ موری تاکے کا عہد ۱۴۵۲ء تا ۱۵۴۰ء ہے۔ یہ بعید از امکان نہیں کہ موری تاکے نے عمر کے آخری حصے میں ہائیکو کہنا شروع کیا ہو لیکن یہ ایک ناقص مفروضہ ہوگا اس لیے کہ کوئی صنف چشم زدن میں کامیابی کی اس منزل پر نہیں پہنچ جاتی جس پر موری تاکے کی ہائیکو اپنے تمام تر اصول و ضابطے کے ساتھ موجود ہیں۔ خود اُردو میں آزاد غزل اپنی عمر کے قریباً چالیس برس بسر کر لینے کے باوجود ابھی تک تجرباتی منزل میں ہے اور اپنا کوئی ضابطہ مقرر نہیں کر سکی ہے۔ اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ ہائیکو سولہویں صدی سے کہیں قبل عالمِ ظہور میں آئی ہوگی اور موری تاکے کا نام باشو کے پیش رو کامیاب شعرا میں لیا جانا چاہیے۔

موری تاکے کی اوّلیت اپنی جگہ مسلّم لیکن ماتسوو باشو (MATSUO BASHO) جس کا عہد ۱۶۴۴ء تا ۱۶۹۴ء مذکور ہے بالاتفاق ہائیکو کا اوّلین عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی عمر کے اواخر میں بودھ مت کی ایک مخصوص شاخ (ZEN BUDDHISM) اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی تھی۔ عمر کے اسی حصے میں اس نے اعلاترین ہائیکو کی تخلیق کی ہے۔ حیات و ممات کی پُر اسراریت اور اس کے عرفان سے متعلق حقایق کی جھلک اس کی اس زمانے کی تخلیقات میں نمایاں ہیں ساتھ ہی فنّی طور پر بھی اس نے اپنے کمالات کا مظاہرہ اسی دور کی تخلیقات میں کیا ہے۔

شو کے پیروکار نیز اس کے بعد کے شعرا باشو کا
ڑا احترام کرتے تھے۔ باشو کی پیروی میں ان
عرا کی ہائیکو نظموں میں زین بدھزم کے فلسفے کی
لوہ گری بڑی شدّ و مد کے ساتھ ہوئی ہے۔

باشو کے بعد ہائیکو کا قابلِ ذکر شاعر
وسون (BUSON) (۱۷۱۵ء تا ۱۷۸۳ء)
ہوا ہے۔ فنی کمالات میں یہ باشو کا ہمسر تصور کیا
جاتا ہے اور فکری طور پر باشو سے زیادہ جدّت
پسند۔ یہ جدّت پسندی دونوں شعرا کے عہد میں
قریباً ایک صدی کا فرق ہونے کی وجہ سے عین فطری
بھی ہے۔

بوسون کے بعد ہائیکو نظموں کا تیسرا بڑا
شاعر اِئی سا (ISSA) ہوا جس کا عہد ۱۷۶۳ء
تا ۱۸۲۷ء ہے۔ بدقسمتی اس کے ساتھ سایے کی
طرح یوں لگی رہی کہ ناقدوں کی زبان پر جب بھی
اس کا نام آیا ہے بدنصیب (UNFORTUNATE)
کے سابقے کے ساتھ آیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں
اپنے نامور پیش رو شعرا سے شعریت نسبتاً کم
ہے لیکن اس کمی و کوتاہی کے باوجود اس کی
ہائیکو نظمیں موضوع و مواد کے لحاظ سے زیادہ مقبول
ہوئیں۔ بالخصوص وہ نظمیں جو اس نے اپنے بچوں
کی موت پر بطور مرثیہ لکھیں، یا اس کی غربت و
افلاس کے ذکر سے معمور نظمیں یا پھر وہ ہائیکو نظمیں
جو اس نے چھوٹے چھوٹے بظاہر ناقابلِ اعتنا کیڑے
مکوڑوں سے متعلق لکھیں غیر معمولی طور پر مشہور و مقبول
ہوئیں۔

ہائیکو کی جانب مغربی شعرا کے متوجہ ہونے
کے بقول سیّد حامد حسین دو اسباب ہیں۔ اوّل
تو یہ ہے ہائیکو کے ایجاز و اختصار کی خصوصیت۔
مغرب میں رائج رزمیہ اور بیانیہ شاعری کی طوالت
سے ان شعرا نے پیچھا چھڑانا چاہا تو انھیں اظہار
خیال کے لیے مختصر تر پیمانے کی ضرورت محسوس
ہوئی اور انھوں نے ہائیکو کو مفید مقصد پایا۔
دوسرا سبب ہائیکو کی ایمائیت و اشاریت
ہے جس سے ایمیجسٹ تحریک سے متاثر شعرا نے
پورا فائدہ اُٹھایا۔

لیکن ہائیکو کو اس کی تمام تر پابندیوں
کے ساتھ مغربی زبان میں منتقل کرنا ممکن نہ
ہوسکا۔ یہاں تک کہ ہائیکو کے پابند ترجمے بھی اس
طرح کامیابی کے ساتھ ممکن نہ ہوسکے کہ اُن کی
شعریت مجروح ہونے سے بچ جائے۔ اس کی کئی
وجہیں ہیں۔ اوّل تو یہ ہے ہائیکو کی دھان پان ہئیت۔
یعنی تینوں مصرعوں میں صرف سترہ سالوں کا وجود۔
شعریت اور دیگر لوازم کے ساتھ اس کڑی شرط
کی کامیاب پابندی 'کارے دارد' کا درجہ رکھتی ہے۔
دوم یہ کہ ہائیکو جاپانی زبان کے مخصوص آہنگ
موسیقی، جاپانی رسم و رواج، تہذیب و تمدّن،
اور بالخصوص مذہبی روایات سے اس طرح
جڑی ہوئی ہے اور ان وجوہ سے اس میں ایسے اقوال
(QUOTATIONS) کہاوتیں، علامتیں، اشارے
کنایے در آئے ہیں کہ انھیں صرف تعلیم یافتہ جاپانی
ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہائیکو
میں جو زبان استعمال ہوتی ہے اُسے ٹیلی گرافک
زبان کہنا زیادہ مناسب ہوگا اسما، ضمائر،
افعال، حروفِ عطف، حروفِ جار، واحد، جمع
وغیرہ کا استعمال از روئے قواعد یہاں تلاش کرنا
سعیِ رایگاں کے مترادف ہے۔ اکثر حالتوں میں
مکمل جملوں کی تلاش بھی بے سود ہے۔ بلکہ عام
طور پر ہوتا یہ ہے کہ شاعر کچھ الفاظ ایک خاص
آہنگی ترتیب سے علامت و اشارت کے طور پر
چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوتا ہے اور قارئین سے
امید کرتا ہے کہ وہ اپنے تخیّل کی مدد سے تہ در تہ
معانی و مفاہیم تک رسائی حاصل کریں اور تخلیق کار
کے ساتھ شراکت (CO-CREATOR) کا لطف
حاصل کریں۔

مذکورہ مشکلات کے پیشِ نظر مغربی زبانوں
میں بالخصوص انگریزی میں حالاں کہ ہائیکو کے تراجم
بھی ہوئے ہیں اور تخلیق بھی لیکن اکثر حالتوں میں
ہائیکو کے فارم (ہئیت) سے جان چھڑالی گئی ہے
اور غالباً یہی سب سے بڑا سبب ہے جس کے
پیشِ نگاہ جناب شمیم احمد انھیں "بس نام ہی نام
کے ہائیکو" قرار دیتے ہیں۔ ویسے اسے اُن کا منفی
انداز نظر ہی کہا جائے گا۔ دوسری اہم بات یہ ہے
کہ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہائیکو کے پابند تراجم
ہوئے ہی نہیں۔ پابند ترجموں کی دو مثالیں پیش
کی جاتی ہیں۔

موری تاکے کا وہ ہائیکو جس کے بارے میں
گذشتہ سطور میں عرض کیا تھا کہ وہ ایک بودھ
کہاوت پر مشتمل ہے بطور نمونہ دیکھیے۔ مترجم ہیں
مس بابٹ ڈاٹش :

The Falling Flower
I Saw, Drift Back to
the Branch
Was a Butterfly.

اور باشو کا ایک ہائیکو۔ ترجمہ ارل مائنر (EARL MINER) نے کیا ہے:

The Lightning Flashes
And Flashing Through
the Darkness
A Night-Heron's Screech.

ان دونوں ہائیکو کے غیر پابند تراجم بھی دیکھیے۔
مترجم ہیں جی ہیرالڈ ہینڈرسن (G. HAROLD HENDERSON):

Fallen Flowers Rise
Back to the Branch—
I watch.
Oh..... Butterflies.

A Lightning Gleam
Into Darkness Travels
A Night Heron's Scream

غور فرمائیے کہ اوّل تو مترجم نے سلے بلز کی شرط کے قریب رہنے کی سعی بھی کی ہے دوم یہ کہ قافیوں کے حُسن کا اضافہ بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں بس نام ہی نام کی ہائیکو کہنا کیا زیادتی نہیں ؟

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہائیکو سے اُردو کی شناسائی انگریزی کی وساطت سے ہوئی۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اہلِ اُردو نے ہائیکو کا راست مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں جناب سرفراز حسین اور جناب نورالحسن برلاس جب اُردو کے اُستاد مقرّر ہوئے تو انھیں جاپانی شعری ادب سے بھی واسطہ پڑا اور وہاں ہائیکو کی ہر دل عزیزی دیکھ کر نیز جاپانی ادب سے متاثر ہو کر خصوصاً پروفیسر برلاس نے ماہنامہ ساقی دہلی کے مُدیر جناب شاہد احمد دہلوی کو ساقی کا جاپان نمبر نکالنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۶ء میں جب جاپان نمبر شایع ہوا تو اہل اردو جاپانی ادب بالخصوص ہائیکو سے متعارف ہوئے۔ شعرا نے اس صنفِ سخن میں جولانیِ طبع کا مظاہرہ کرنا شروع کیا لیکن یہ کوشش کسی تحریکِ مسلسل کی شکل اختیار نہیں کر سکی اور بہت جلد تمام کاوشیں پردۂ خفا میں چلی گئیں۔ غالباً اس کی وجہ ہائیکو سے متعلق خصوصیات کی اُردو میں کامیاب منتقلی کی راہ میں حائل وہ دشواریاں ہی تھیں جن کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ گذشتہ سطور میں کر چکا ہوں۔ خصوصاً ترجمے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے جناب منصور احمد فرماتے ہیں :

" ہائیکو نظموں کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ حسینِ اجمال کی تفصیل اسے حُسن سے معرّیٰ کر دیتی ہے۔ ہائیکو نظم گھاس کی پتّی کے ساتھ لٹکتا ہوا شبنم کا وہ قطرہ ہے جو مختلف اطراف سے دیکھنے پر کبھی نیلا، کبھی سُرخ اور کبھی ارغواں شعاعیں پیدا کرتا ہے۔"[۶]

اصل ہائیکو کی مطابقت میں سالموں کے شمار کی شرط کے ساتھ منظوم ترجمہ اور ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتا ہے۔ اُردو میں مروّجہ اوزان کو سنبھالا دیجیے تو سلے بلز ہاتھ سے گئے اور سلے بلز کی شرط کا پاس کیجیے تو وزن ندارد۔ چنانچہ کچھ اہلِ قلم نے ہائی کو کے نثری ترجمے پر زیادہ زور دیا۔ بات کچھ زیادہ غیر منطقی بھی نہیں تھی آخر جب اپنے یہاں نثری نظم کا چکّر " نثم " تک کو جنم دے سکتا ہو تو نثری ہائیکو کیا بُرا ہے ؟ چنانچہ بطور نمونہ ایک نثری ہائیکو ملاحظہ فرمائیے۔ مترجم ہیں فضل حق قریشی :

چاول کے ایک پودے کی بال
جُھک گئی ہے بوجھ سے، کیوں کر
ایک مکوڑا اس پر آ بیٹھا ہے

اس ترجمے کے بارے میں پروفیسر عنوان چشتی کا خیال ہے :

" اس ترجمے میں خارجی خصوصیات تو کجا بعض دوسری خصوصیات بھی موجود نہیں ہیں۔ اس ترجمے میں نظم کے پس منظر کے طور پر موسم، منظر اور فطرت نہیں ہے۔ کوئی ایک مخصوص لفظ بھی نہیں ہے جب کہ ہائیکو میں یہ تمام چیزیں ضروری ہیں۔"[۷]

میں جناب عنوان سے اس امر میں اختلاف رکھتے ہوئے کہ اس ترجمے میں " موسم، منظر اور فطرت " نہیں ہے ترجمے کی ناکامی کے سلسلے میں اتفاق کرتا ہوں۔

جارج سیفرس کی ہائیکو کے دو ترجمے اور دیکھیے۔ مترجم ہیں جناب علی ظہیر :

(۱) یہ صدا
یارانِ رفتگاں کی ہے
یا گراموفون کی

(۲) جیسے جیسے لکھ رہے ہو
روشنائی گھٹ رہی ہے
اور سمندر بڑھ رہا ہے

یہ منظوم تراجم ہیں لیکن مختلف نوعیت کے اور ہائیکو کی فنّی پابندیوں سے آزاد۔ ان کے متعلق جناب رفعت خاں رقم طراز ہیں کہ ان میں " صرف جاپانی شاعری کا عکس ہے اور وہ بھی اصلیت سے بہت دور "[۸]۔ جو کچھ ہو اتنا بھی کم اہم نہیں کہ اُردو نظم کو اس نئی ہیئت سے آشنا کرانے میں فضل حق قریشی، عزیز تمنائی اور علی ظہیر صاحبان وغیرہ کی ابتدائی کوششیں رائگاں نہیں گئیں اور اس جہت سے اُردو ان کی ممنون رہے گی۔

جہاں تک اُردو میں ہائیکو کی تخلیقی کاوشوں کا تعلّق ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو شعرا اس ہیئت کی طرف کیوں متوجہ ہوئے۔ جناب سید حامد حسین نے اس کا محرک ہائیکو کے اختصار کے ساتھ " جدّت، روایت سے انحراف اور ایمائی اظہار کے امکانات " کو قرار دیا ہے۔ راقم الحروف کو ان میں سے ایک جدّت کے سوا بقیہ وجوہ سے جزوی طور پر ہی اتّفاق ہے۔ جہاں تک اختصار کا تعلّق ہے خود خود حامد صاحب مقر ہیں کہ اُردو اصنافِ سخن میں غزل کے مفرد اشعار، دوہے، اور یہاں تک کہ ہائیکو سے مشابہت رکھنے والی صنف " مثلث " موجود

ہے۔ روایت سے انحراف کی بات زیادہ وزن دار اس لیے نہیں کہ آج کل کئی ایسے شعرا ہائیکو نظمیں کہہ رہے ہیں جنھیں روایت کا بڑا پاس و احترام ہے۔ ہائیکو کی رمزیت اور ایمائیت کی دہائی دینی بھی بے سود اس لیے کہ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ہماری غزل کی جان ہیں۔ البتہ غزل کے مفرد اشعار اور ہائیکو کی اس مشترکہ خصوصیت میں مفرد غزلیہ اشعار پر یہ اعتراض بجا طور پر وارد ہوسکتا ہے کہ انھیں ان کے اختصار و ایجاز نیز تمام تر رمزیت و ایمائیت کے باوجود ایک تخلیقی اکائی نہیں گردانا جاسکتا ہے اور یہ بڑی وجہ ہے ہائیکو کی طرف رغبت کی۔

دوہے اور مثلث ہر چند کہ ایک تخلیقی اکائی ہیں لیکن ایک مدت مدید سے ان پر طبع آزمائی کرتے رہنے کی وجہ سے ان کی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یوں ان کے مقابلے میں ہائیکو سرتا پا ایک نئی چیز ہونے کی وجہ سے مرکز توجہ بنی۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ سب سے اہم چیز اُردو زبان کی وہ قوت انجذاب نیز وسیع النظری اور کشادہ دامنی ہے جس نے اہلِ اُردو کو نت نئے تجربات قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ بعض حضرات اسے اُردو زبان کی لچک قرار دیتے ہیں میں اسے زبان اور اہلِ زبان کے صحت مند رجحان سے تعبیر کرتا ہوں جس کی وجہ سے اُردو کی شریانوں میں تازہ لہو داخل ہوتا رہا ہے۔

یوں اُردو نے آج سے نصف صدی پہلے بڑے طمطراق کے ساتھ ہائیکو کا ڈولا اپنے آنگن میں اُتارا۔ متعدد شعرا نے اس صنفِ سخن کا استقبال کیا آج بھی کئی شعرا ہائیکو کہہ رہے ہیں مبتدی بھی منتہی بھی۔ ارضِ دکن کے شاعر علیم صبا نویدی کا میں خصوصیت سے ذکر کروں گا اس لیے کہ دوسرے شعرا کی طرح انھوں نے محض چند ہائیکو کہہ لینے بھر کا فریضہ ادا نہیں کیا ہے بلکہ پے بہ پے ہائیکو کے دو مجموعے بنام "ترسیلے" اور "شعاعِ شرق" شایع کرکے جناب شمیم احمد کے اس ریمارک کو کہ "اُردو میں اس ہئیت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے" شرمسار کر دیا ہے۔

اُردو میں ہائیکو نظموں کی تخلیق میں جن مختلف اسالیب و تکنیک کا سہارا لیا جارہا ہے۔ اُن میں ایک تو سب سے زیادہ آسان ہے اور وہ ہے نثری ہائیکو:

(۱) یہ بے آسمان چاہتیں
یہ بے زمین رشتے
ان کا خالق کون ہے

(۲) میں اپنے اندر کی کائنات میں پھیل گیا ہوں
باہر ایک سورج
میری تلاش میں ہے

ان ہائیکو کے بارے میں جناب کرامت علی کرامت فرماتے ہیں کہ" ان نثری ہائیکو کو پابند ہائیکو کی شکل میں ڈھال دیا جاتا تو ان نظموں کی اثر آفرینی میں اچھا خاصہ اضافہ ہوجاتا" میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اثر آفرینی کی باتیں بعد کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب شاعر کے سامنے "وزن" کی پابندی کا بھی سوال نہ ہو تو کم از کم ہائیکو کے لیے مروّجہ سالموں (سلے بلز) کو برتنا کون سا دشوار کام تھا؟ مندرجہ بالا ہائیکو (۲) کو ملاحظہ فرمایئے۔ اس کی پہلی سطر ہی سولہ سلے بلز کی حامل ہے اور پوری ہائیکو کل انتیس سالموں پر۔ یہ کون سی ہنرمندی ہوئی؟ چلیے مان لیا کہ آپ نے باتیں بہت اچھی کہیں لیکن سلیقے سے نہ کہہ سکے تو فائدہ؟ پھر یہ کہ ہائیکو کی تین سطروں یا تین مصرعوں میں سے ایک سطر یا ایک مصرع کی طوالت کی حد آخر کیا ہوگی؟ ایسے طویل مصرعے ہائیکو کی اختصار والی خصوصیت کو مجروح کرنے کے علاوہ یہ سوال بھی اُٹھاتے ہیں۔

دوسری طرح کی ہائیکو نظموں میں اُردو میں مروّجہ مثلث کی تکنیک اپنائی گئی ہے۔ مختلف بحروں میں طبع آزمائی کے ساتھ زیادہ تر ایسی ہائیکو "فاعلاتن مفاعلن فعلن" کے وزن پر علیم صاحب نے بھی کہی ہیں اور دوسرے شعرا نے بھی۔ البتہ علیم صاحب نے اپنی ہائیکو کے پہلے اور تیسرے مصرعوں میں قافیے کا التزام کیا ہے۔ دونوں طرح کی ایک ایک نظم دیکھیے:

(۱) رک گئی ہے خزاں درختوں پر
ہم مسافر ہوتے ہیں جس دن سے
راستے چھاؤں کو ترستے ہیں

(اطہر ادیب)

(۲) سات عالم کا نور سجدے میں
قتل و غارت گری کے دن کالے
اک دلِ ناصبور سجدے میں

(علیم صبا نویدی)

ایسی ہائیکو نظمیں اُردو کی شعری روایت بلکہ کہنا چاہیے کہ روایتی مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور خواہ مقفیٰ ہوں خواہ معریٰ کم از کم اتنا تو ہے کہ طوائف الملوکی کے بجائے ان کا اپنا ایک اصول ہے ضابطہ ہے۔

اسی ذیل میں جناب علیم صبا نویدی کی وہ ہائیکو نظمیں بھی آئیں گی جو انھوں نے دوسری مروّجہ بحروں میں کہی ہیں مثلاً متقارب مزاحف میں کہی گئی ان کی یہ نظمیں۔

(۱) تری ذات دونوں جہاں پر محیط
تجھی سے وجودِ مکاں لامکاں
تو ہی تو ہے قلب و نظر پر بسیط

(۲) رگِ جاں سے بھی پاس موجود تو
ہر اک سانس تیرے کرم کا ظہور
ہے شاہد کہیں اور مشہود تو

تیسری روش ہائیکو کی فنّی تکنیک سے قریب تر ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصل ہائیکو میں سِلے بلز کے شمار کی قید ہے۔ اُردو کے شعرا نے اس راہ میں دُشواری کے پیش نظر اپنے لیے یہ سہولت پیدا کرلی کہ اصول سہ گانہ میں سے سبب اور وتد (فاصلہ اُردو میں مسموع نہیں) کو شمار کے لیے اکائی قرار دے دیا۔ اس طرح کی ہائیکو نظمیں اس لحاظ سے غنیمت ہیں کہ ان کے لیے کم از کم ایک اصول تو وضع کیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) الجھنوں کا سفر ہے
دور تک کوئی منزل نہیں ہے
آرزو مختصر ہے

(۲) بادلوں کی سواری
لائی ٹھنڈی ہوا، رُت حسیں تر
سوئی قسمت ہماری

لیکن یہ بھی کوئی قاعدۂ کُلیہ نہ بن پایا۔ اور جابجا اس اصول سے بھی انحراف برتا گیا ہے۔ مثلاً صبا نویدی ہی کی یہ ہائیکو:

(۱) اوّلیں جلوہ ترا
نور اوّل اور نور کائنات
وصف ہے اعلا ترا

(۲) آئینہ بردار تو
تیرا جلوہ مظہرِ کون و مکاں
نور کا مینار تو

ایک اور روش یہ چل نکلی ہے کہ ہائیکو ہے تو پابند لیکن اوّلین مثالوں میں مذکور نثری ہائیکو کی طرح مصرعوں کی سائز کی نہ کوئی حد نہ قید نہ شرط نہ اصول۔ مثلاً

ہرے بھرے سے پیڑ سب (۸ سالمے)
پھول پھل نہ دے سکے (۷ سالمے)
سہاگ رُت کی مانگ میں اداسیاں بکھر گئیں
(۱۶ سالمے)

اور بعض شاعر تو چار مصرعوں والی ہائیکو بھی کہہ رہے ہیں۔ یہ عجیب تماشا ہے۔

ہائیکو کے ترجمے نیز تخلیقی راہ میں حائل ہائیکو کی روایاتی خصوصیات اور فنّی پابندیوں کے پیش نظر جناب سیّد حامد حسین نے علیم صبا نویدی ہی کی ہائیکو نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اُردو میں جاپانی ہائیکو کی روایت کی پابندی پر زور دینا زیادتی ہوگی اس کی خاص وجہ جہاں جاپانی زبان کے صوتی نظام اور آہنگ موسیقی میں فرق ہے وہیں دونوں ملکوں کے شاعروں کے نفسیاتی، سماجی اور تاریخی تناظر اور فطرت کے ساتھ تعلّق میں فرق ہے۔"[۱۵]

اور جناب شمس الرحمان فاروقی کا خیال ہے:

"اُردو میں اصل ہائیکو یا ہاکو لکھنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے لیے جو شرائط ہیں (اصل جاپانی میں) وہ اُردو میں پوری نہیں ہوسکتیں۔"[۱۶]

اور اوّلین سطور میں جناب شمیم احمد کی یہ رائے نقل کر ہی چکا ہوں کہ "ایسی نظم اُردو میں تو کیا انگریزی میں بھی نہیں ہوسکتی۔"

لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ اکثر شعرا نے یہ زیادتیاں جھیلی ہیں اور ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے مثلاً صبا کی درج ذیل نظمیں:

(۱) تنہائی کا غم
گلشن گلشن تھا زندہ
بادل تھے پُرنم

(۲) پھول شبنم میں
تتلیوں کا ہجوم
مست عالم میں

(۳) جانے پہچانے
شہروں سے مل کر بادل
بھر دے پیمانے

(۴) آسیبی آنگن
شاخوں پہ لٹکے چہرے
مردوں کا درشن

پروفیسر کرامت علی کرامت نے بھی "ایسی بہت سی" پابند ہائیکو نظمیں بقول خود کہی ہیں اور چند ایک بطور مثال پیش کی ہیں۔ دو نظمیں دیکھیے:

(۱) لمحوں کی تتلی
میرے من کے آنگن میں
جانے کیوں آئی

(۲) ایک پل صدی
اور صدی ہے پل میں گم
سوچیے کبھی

راقم الحروف کی بھی چند پابند ہائیکو نظمیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) دروپدی سی
دشاسنوں میں گھری
رواں صدی بھی

(۲) امرت تم پی لو
میں اس یُگ کا شنکر ہوں
وِش مجھ کو دے دو

(۳) برگد کی چھانو
ڈھونڈو گم گشتہ جنّت
وہ اپنا گانو

(۴) آگ کو پھول
کہیے گا، کہ آپ
پھول کو شول؟

ہائیکو سے متعلق میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ ہائیکو مقفّیٰ ہو یا معرّیٰ لیکن نثر نہ ہو نظم ہو۔ وزن پر بھی ہو اور ۵ + ۷ + ۵ سالموں کی قید بھی

قبول کرتی ہو۔ سالموں کے شمار میں میں کرامت صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ اُردو کی خفیف وطویل دونوں طرح کی حرکتوں کو ایک ایک 'سلے بُل' ماننا چاہیے۔ یہ اصل فنکاری ہوگی ہنرمندی ہوگی۔ یہ اگر چہ بڑی دشوار گذار اور صبر آزما راہ ہے لیکن ناقابل عبور نہیں ہے۔ نوجوان تازہ دم شعرا کوشش کریں تو اس راہ سے مردانہ وار اور سُرخ روگزر سکتے ہیں۔

حرفِ آخر کے طور پر عرض کروں گا کہ اُردو میں ہائیکو نظمیں اپنے ورود مسعود کا پچاس سالہ جشن منالینے کے باوجود ابھی تک تجرباتی دَور سے گزر رہی ہیں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ تادم تحریر اس صنف کے لیے کوئی ایک اصول کوئی قاعدہَ کلیہ نہیں بن پایا ہے۔ ہر شخص (شاعر) اپنی اپنی پسند و سہولت کی راہ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ کوئی سُست گام ہے، کوئی لپکا جا رہا ہے تو کوئی دوڑ لگا رہا ہے۔ اِلّاماشاءاللہ

حواشی

۱۔ پروفیسر کرامت علی کرامت کے ذریعے بہم پہنچائی گئی اطلاع کے مطابق یہ ایک جاپانی شاعرہ چی یوکا اپنے بچّے کی وفات پر کہا ہوا مرثیہ ہے اور دوسری ہائی کوباشو کی ہے۔

۲۔ اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں، صفحہ ۱۷۵-۱۷۶۔

۳۔ ترسیلے مُصنّفہ علیم صبا نویدی، صفحہ ۶۔

۴۔ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی، شمارہ یکم اگست ۱۹۸۱ء۔

۵۔ شعاعِ شرق مُصنّفہ علیم صبا نویدی، صفحہ ۱۲۔

۶۔ [illegible]

صفحہ ۱۹۔

۷۔ ماہنامہ ساقی دہلی جاپان نمبر ۱۹۳۶ء، صفحہ ۲۵۔

۸۔ اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، صفحہ ۱۰۵۔

۹۔ مقالہ مطبوعہ ہماری زبان، یکم اگست ۱۹۸۱ء۔

۱۰۔ شعاعِ شرق، صفحہ ۱۲۔

۱۱۔ شعاعِ شرق، صفحہ ۱۵۵۔

○

خبر تو دور بِن خبر نہیں آئے
بہت دنوں سے وہ لشکر ادھر نہیں آئے

طلسم اونگھتی راتوں کا توڑنے والے
وہ مخبران سحر پھر نظر نہیں آئے

ضرور تجھ سے بھی اک روز اوب جائیں گے
خدا کرے کہ تری رہ گذر نہیں آئے

سوال کرتی کئی آنکھیں منتظر ہیں یہاں
جواب آج بھی ہم سوچ کر نہیں آئے

اُداس سونی سی چھت اور دو بجھی آنکھیں
کئی دنوں سے پھر آشفتہ گھر نہیں آئے

○

گھروندے خوابوں کے سورج کے سات رکھ لیتے
پروں میں دھوپ کے اِک کالی رات رکھ لیتے

ہمیں خبر تھی زباں کھولتے ہی کیا ہوگا!
کہاں کہاں مگر آنکھوں پہ ہات رکھ لیتے

کہا تھا تم سے کہ یہ راستہ بھی ٹھیک نہیں
کبھی تو قافلے والوں کی بات رکھ لیتے

تمام جنگوں کا انجام میرے نام ہوا
تم اپنے حصّے میں کوئی تو مات رکھ لیتے

یہ کیا کیا کہ سبھی کچھ گنوا کے بیٹھ گئے
بھرم تو بندۂ مولا صفات رکھ لیتے

آشفتہ چنگیزی

شفا دوا کس، علی گڑھ (یوپی)

نیاز حسین لکھویرا

دیر پا نہیں ہوتا کانچ کا کوئی برتن
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے پیار کا ہر اک بندھن

سائیں سائیں کرتا ہے ہر مکان کا آنگن
اب تو ایسے لگتا ہے شہر بھی ہو جیسے بن

کربِ جاں کے شعلوں پر رات دن سلگتا ہوں
میرا جسم ہو جیسے تیرے ہجر کا ایندھن

اے وفا کی خوش فہمی آج آبدیدہ ہو
لے اُجڑ گیا دل کا وہ ہرا بھرا آنگن

کوئی چاہنے والا اس کو مل ہی جائے گا
دربدر بھٹکتی ہے تشنہ رُوح کی جوگن

این - ۱۰۱/۷، سمن آباد، لاہور (پاکستان)

ڈراپ سین کے آگے

سورج نکلنے سے پہلے کی خوشنما لالی...
ایک نوجوان دل... اور اچانک کسی چہرے کا خیال... ان تینوں کے درمیان موجود رشتے کی کوئی منطق ہے؟... اگر ہے تو اُسے محفوظ رکھیے۔ وہ میرے، سکینہ اور آپ کے کام آئے گی کیوں کہ میرے پاس اس کے سوا دوسری کوئی صورت ہی نہیں کہ میں یعنی ظہیرالدین بائنڈر آپ کو کچھ بھی سمجھا سکوں... میں کیسے سمجھا پاؤں گا کہ بالی روڈ سے گذرتی ہوئی، دوپہر کی دھوپ سے شرابور چھ سات سال کی اُس بچّی کو دیکھ کر مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا جیسے ساری کائنات میرے سینے میں اُتر آئی ہو۔ اُسے دیکھتے ہی میرا جی بے اختیار کیوں چاہنے لگتا کہ خوب اُونچی آواز میں لہک لہک کر گاؤں؛ ایسے گیت جن پر دُنیا کا ہر درد آشنا دل دھڑک اٹھے اور اُن کی مجھ تک نہ پہنچ پانے والی آوازیں میرے سُر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں...

جب دھوپ میرے شانوں کو جھلساتی ہوئی گوند کے برتن پر گرنے لگی اور میں اپنی دُکان کے بورڈ کو ترچھا کرنے لگا تب اچانک سکینہ پر نظر پڑ گئی۔ وہ خراماں خراماں چلی جا رہی تھی... دُنیا کو اپنی حیرت سے چھوتے ہوئے، جیسے اُس نے جو کچھ کل دیکھا تھا وہ آج کہیں موجود نہیں اور جو آج موجود ہے اُسے وہ کل نہیں دیکھ پائی تھی... حسبِ معمول اس کے داہنے ہاتھ میں المونیم کے دو ڈبّوں والا ٹفن کیریر جھول رہا تھا جس کا پالش مسلسل استعمال کے سبب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ہینڈل کے کنارے کند ہو گئے تھے اور قفل کے سوراخ میں ماچس کی دو تیلیاں آڑی ترچھی کر کے ڈال دی گئی تھیں۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں آج بھی پتلی سلائی پر لپٹی ہوئی لالی پاپ جیسی کوئی مٹھائی تھی جسے چوستے رہنے کے لیے سکینہ کو بار بار اپنے چھوٹے سے دوپٹے کا سرا پشت پر پھینکنا پڑتا اور توازن برقرار رکھنے کی خاطر اپنے جسم کو مختلف زاویوں پر ٹیڑھا میڑھا کرنا پڑتا... لیکن جیسے ہی مٹھائی کی لذّت اس کی زبان پر تحلیل ہوتی اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک جاگتی کہ دور سے ہی دکھائی دے جاتی۔ بالکل ویسی ہی چمک جیسے کسی جمناسٹ نے مقابلے میں پورے پورے دس پوائنٹ حاصل کر لیے ہوں۔

اب وہ اپنے باپ کی دُکان تک پہنچ چکی تھی...

زمین سے تقریباً چار چار فٹ اُونچے پایوں پر کھڑی اس گُمٹی میں مکہ مدینہ والے کلینڈر اتنی تعداد میں تھے کہ کسی اجنبی کو پہلی جھلک میں یہ کلینڈروں کی دُکان ہی معلوم ہوتی۔ باہری تختے پر ایک چھوٹا سا ڈیسک تھا جس پر سگریٹ کے کھلے اور بند پیکٹ ایک ترتیب میں پڑے تھے۔ ڈیسک کے پاس ہی مٹی کی ایک ہنڈیا میں آگ جل رہی تھی جن کی آنچ پر تار کی جالی رکھ کر بیڑیوں کے بنڈل کو سینک لگائی جاتی۔

سکینہ کو دیکھتے ہی اس کے باپ جبّار میاں نے عقبی دروازہ کھول دیا جسے تختے کے نچلے سرے کو کاٹ کر تیار کیا گیا تھا۔ سکینہ نے اپنا ہاتھ کاندھے سے اُوپر اُٹھا کر ٹفن کیریر کو دُکان کے اندر ڈالا اور پھر جبّار میاں نے جھک کر سکینہ کا ننھا سا بازو تھام لیا اور اُسے بھی اندر کھینچ لیا۔ جس وقت باپ اپنی اس ننھی سی بیٹی کو اپنی بانہوں میں اُٹھا رہا تھا تو کچھ ایسا منظر نظر کے سامنے پھیل گیا جیسے کسی چابک دست برش نے اُفق اور سمندر کو ایک ساتھ ملا دیا ہو...

دکان کے اندر پہنچتے ہی سکینہ اپنے دوپٹّے کے کنارے سے پیشانی اور ہونٹ کے اُوپر جگمگاتے قطروں کو رگڑ رگڑ کر خشک کرنے لگی۔ اور پھر ڈیسک سے سٹ کر بیٹھ گئی آنے والے گاہکوں کے انتظار میں...

میں اندر آ کر کاغذ کاٹنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جبّار میاں گھر سے بھیجا ہوا کھانا جلدی جلدی چبائیں گے اور پھر پیٹھ اور گھٹنوں کی جکڑن دور کرنے کے لیے تھوڑی دیر سو لیں گے۔

شاہد انور

سی۔ ایم۔ سی، ۷۵۱۔ شاستری بھون نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سکینہ کی دُکان واری تین یا چار بجے تک چلے گی۔ پھر اُس کے ہاتھ میں بغیر دھویا ہوا ٹفن کیریر تھما کر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میں باپ بیٹی کا یہ باہمی انحصار تقریباً دو سال سے مسلسل دیکھ رہا تھا...

لوٹتے ہوئے سکینہ اتنی پرسکون ہوتی جیسے اُس کے ننھے کاندھے سے کوئی بڑی ذمہ داری غیر متوقع طور پر اُٹھالی گئی ہو۔ کبھی رُک کر سڑک کے کنارے کھیلنے والے بچّوں کا تماشہ دیکھنے لگتی تو کبھی ایک بھولے تجسس کے ساتھ آتے جاتے راہ گیروں کے کپڑوں کو گھورتی۔ وہ ٹریفک سے اس حد تک بے خبر ہو جاتی کہ مجھے خوف ہونے لگتا۔ اکثر میں یا کوئی اور دُکان والا اُسے ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیتا..... آخر ایک دن .....

میں سڑک کے کنارے کھڑا "فینسی ٹیلرنگ" والے ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن کی شادی کے لیے قرض کا انتظام کرنا تھا اور ماسٹر صاحب میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ تبھی سکینہ قریب سے گذرنے لگی۔ ماسٹر صاحب نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے پکڑنا چاہا تو مچل کر اُن کی گرفت سے دُور بھاگی۔ اس بھاگ دوڑ میں ٹفن کیریر اس ہاتھ سے دُور جا گرا اور لڑھکتے ہوئے ڈبے سے گوشت کی تین چار بوٹیاں جو غالباً رات کے کھانے کے لیے واپس بھیجی جا رہی تھیں اِدھر اُدھر ناچنے لگیں۔ سکینہ نے اُن کو پکڑنا چاہا اور جلدی جلدی میں ایک تیز رفتار سائیکل سے ٹکرا کر گر پڑی۔ سائیکل کا اگلا پہیہ اس کی داہنی کلائی پر چڑھ گیا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ ماسٹر صاحب نے فوراً اُسے گود میں اُٹھایا اور میرے ساتھ ہسپتال دوڑ پڑے۔ چالیس دِنوں کے لیے پلاسٹر چڑھایا گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب سکینہ کو کم از کم ایک ماہ گھر میں ہی پڑا رہنا پڑے گا۔ نہ جانے کیوں اس خیال سے ہی مجھے اذیت سی ہوئی کہ اب کچھ دنوں کے لیے وہ پالی روڈ پر نظر نہیں آئے گی۔

لیکن وہ تو چھٹے دن ہی موجود تھی ... اس مرتبہ بائیں ہاتھ میں ٹفن کیریر جھلاتے ہوئے۔ اُس کی آسانی کے لیے پلاسٹر والے ہاتھ کو ایک ڈوری کے سہارے گردن سے لٹکا دیا گیا تھا۔ درد اور کمزوری کے سبب زردی اب بھی اُس کے چہرے پر پھیلی تھی ... مگر وہ سڑک پر اسی طرح رواں تھی ... ٹفن کیریر جھلاتی ہوئی ... جسم کو کسی جمناسٹ کی مانند مختلف زاویوں پر جھٹکے دیتی ہوئی۔

ماسٹر صاحب نے جو اُس دُکان پر بیٹھے دیکھا تو چھیڑنے لگے ____

"کیا رے داتی! تیرا ہاتھ ٹھیک ہوگیا...؟"

اُس نے تنک کر جواب دیا ____ "داتی کاہے کو ہیں ... ہم تو اپنے ابّا کے بیٹا ہیں..."

اُس کے جواب پر سبھی ہنسنے لگے ___ اور پھر ماسٹر صاحب دیر تک اُسے چھیڑتے رہے اور اس کی بھولی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہوتے رہے۔

اور اس طرح ... پالی روڈ سے آتے جاتے ہوئے ننھی سکینہ نہ جانے کب میری زندگی میں شریک ہوگئی۔ ٹفن کیریر جھلاتی ہوئی سکینہ... جسم کو جھٹکے دیتی ہوئی سکینہ ... یہ منظر میرے لیے دُنیا کا سب سے مانوس منظر بن گیا اور سکینہ نظروں سے اوجھل رہ کر بھی کسی غیبی طاقت کی صورت میرے ہر کام میں میری مدد کرنے لگی ... کچہری کی فائلوں پر جلد سازی کا اکتا دینے والا کام ہو یا گھر میں ماں اور بیوی کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی کڑھن یا پھر جائداد کی تقسیم کے لیے بھائیوں کے ساتھ ہونے والی چھوٹی بڑی جھڑپوں کی کوفت ... سکینہ ہر آن میری مدد کو پہنچ جاتی۔ اُس کو بس دیکھ لینا ہی مجھ کو مطمئن کر دیتا ... ہے نا عجیب بات؟ ... شاید یہ سب کچھ صرف اس لیے عجیب تھا کہ غیر موروثی رشتے جتنے عجیب ہوتے ہیں اتنے ہی تشفی بخش بھی کیوں کہ ان کی ساخت پرداخت میں اپنی محنت شامل ہوتی ہے ...

جب سکینہ کی عمر تیرہ چودہ سال کو پہنچی تو اس کی نظریں کسی گاہک سے باتیں کرتے ہوئے بلا وجہ بار بار نیچے جھکنے لگیں۔ جبّار میاں بھی بیٹی میں آنے والی تبدیلیوں کو بھانپ رہے تھے۔ پھر دوستوں کے مشورے پر اس کا دُکان آنا بند ہوگیا۔

اب جبّار میاں کا کھانا پہنچانا رفیع کے ذمّے تھا۔ پندرہ سولہ سال کا رفیع اُن کے رشتے کی کسی بہن کا لڑکا تھا جسے وہ گاؤں سے اُٹھا لائے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اُسے کام کا آدمی بنا کر اُس سے سکینہ کی شادی کر دیں گے۔ لیکن رفیع نہایت چالو قسم کا لڑکا تھا۔ گھر سے بھاگ کر دو تین مرتبہ بمبئی بھی ہو آیا تھا۔ مجھ سے کام سیکھنے آتا تو ہر گھڑی بے ہودہ فلمی گیت گنگناتا یا نظریں بچا کر بیڑیاں پھونکتا۔ اور میں سب کچھ برداشت کرتا رہا کیوں کہ معاملہ سکینہ کا تھا۔ میں دو تین سال اسی کوشش میں لگا رہا کہ رفیع جلد سازی کے تمام چھوٹے بڑے گر جان لے تاکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور اُس کے ساتھ سکینہ بھی مزے میں رہے۔ لیکن کام سے اُس کی بے نیازی جیوں کی تیوں بنی رہی۔

ایک دن یونہی میں نے اُس سے پوچھ لیا ___ "سکینہ کیسی ہے؟ ... اب تو کافی سیانی ہوگئی ہوگی ..."

رفیع نہایت بھدّے انداز میں ہنسا
"ہاں چچا! اب تو کافی سیانی ہوگئی ہے۔ جبّار
ماموں نے کل اُس کی خوب مرمّت کی . . ."
"جبّار نے مارا ؟ . . . مگر کیوں . . ." میں
اتنا ہی دکھی تھا جتنا اُس روز جب میرے بھائی
نے ایک معمولی سے جھگڑے میں ماں کو گالیاں دی
تھیں۔
"اب کیا بولیں چچا! . . . گھر کی بات
ہے . . . لوگ کہیں گے جس تھالی میں کھاتے ہو
اُسی میں چھید کرتے ہو . . . مگر آپ بھی تو گھر ہی
کے آدمی ہیں . . ." وہ مکّاری سے میری دل چسپی کی
پیمائش کر رہا تھا۔ اُس کا تیر بالکل نشانے پر
بیٹھا۔ میرے لیے فوراً سب کچھ جان لینا بہت ضروری
ہوگیا۔
"کیا بات ہے ؟" میں نے سرگوشی میں
پوچھا ــــــ
وہ میرے بالکل قریب کھسک آیا
"سکینیا پھنسی ہوئی ہے نا! . . . بغل میں جو
الیس سائیکل والے ہیں . . . اُن کے لڑکے اسلوا
سے . . . کل رات دونوں چھت پر کھڑے چوماچاٹی
کر رہے تھے کہ جبّار ماموں نے دیکھ لیا . . . پھر تو
سکینیا کی وہ گت بنائی کہ . . ."
رفیع چٹخارے لے لے کر سناتا رہا لیکن
میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ بس دیکھتا رہا رفیع
کے دیدوں کا ناچ اور ابروؤں کی جنبش سے بنتے
ہوئے بھونڈے اشارے . . . اور میرے لیے اُس
وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کون غلط
تھا . . . سکینہ یا جبّار میاں . . .
اس واقعہ کے ٹھیک چوتھے دن سکینہ گھر
سے بھاگ گئی۔ اس شام رفیع نے دُکان میں
گھستے ہی اعلان سا کیا ــــــ
"جانتے ہو چچا . . . غضب ہوگیا . . .
سکینیا اسلوا کے ساتھ بھاگ گئی . . . یہی ہوتا
ہے بیٹی ذات کو زیادہ سر چڑھانے کا انجام . . .
اب جبّار ماموں محلّے بھر سے مُنہ چھپاتے پھر
رہے ہیں . . ."
اور میں . . . میں پھر سوچنے لگا کہ کون
غلط تھا . . . سکینہ یا جبّار میاں . . .
یہ خبر ایسی تھی کہ جبّار میاں سے کچھ پوچھ
بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ حسبِ دستور دُکان پر بیٹھتے۔
بے دلی سے دن کاٹتے اور رات شروع ہونے سے
پہلے ہی گھر لوٹ جاتے۔ آہستہ آہستہ پالی روڈ میں
سبھی کو سکینہ کے بھاگ جانے کا علم ہوگیا لیکن
جبّار میاں سے کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ سب نے
اُن کے گرد ہمدردی کی ایک دبیز سی چادر تان رکھی
تھی۔ ایک ہی اولاد اور اُس نے بھی چہرے پر
کالک مل دی . . . بے چارے جبّار میاں . . .
نو دس مہینوں تک پالی روڈ یکساں چال
سے گھسٹتا رہا . . . اچانک رفیع نے ایک اور بم
گھمایا ــــ "چچا سکینیا اسی شہر میں ہے . . .
اسلوا کے ساتھ کالج کے پاس چائے کی دُکان کھول
لی ہے . . . سنا ہے اُسے مرا ہوا بچّہ ہوا . . .
اب دیکھنا باپ کے سینے پر کیسا مونگ دلتی ہے . . ."
اور وہ دیر تک ہی ہی کرتا رہا۔
اونگھتا ہوا پالی روڈ جیسے یک بیک بیدار
ہوگیا۔ جسے دیکھو وہی یہ خبر ڈھوتا ہوا ایک
دوسرے کے پاس دوڑا جا رہا تھا۔ سکینہ کے
بھاگ جانے پر جو خاموشی اختیار کی گئی تھی
لگتا تھا جیسے سب اس کی کسر نکال رہے تھے۔
چہ مگوئیاں اور معنی خیز مُسکراہٹیں اس طرح
پھیلیں جیسے پورا پالی روڈ کسی عجیب وبا کی
لپیٹ میں آگیا ہو۔ سب اپنے اپنے دل کی
بھڑاس نکال رہے تھے۔ کوئی سکینہ اور اسلم کو
جی بھر کے گالیاں دیتا کہ اُنھیں کوئی دوسرا شہر
نہیں ملا جو یہاں چلے آئے غریب باپ کو ستانے۔
کوئی جبّار میاں کے لیے ہمدردی جتاتا۔ یہ خبر آناً فاناً
ایک ایسی آگ بن گئی جس پر ہر شخص کو ہاتھ سینکنے
میں مزہ آئے۔
میں نے باہر نکل کر دیکھا . . . جبّار میاں کی
دُکان بند تھی . . . اور میں پھر اُسی ادھیڑ بن میں
پھنس گیا . . . یہ سب کیسے ہوگیا . . . کون غلط
تھا . . . سکینہ یا جبّار میاں . . . دونوں . . .
یا دونوں میں سے کوئی نہیں . . . کہیں کچھ غلط
تھا بھی یا نہیں . . .
میں نے چپ چاپ سائیکل اُٹھائی اور
کالج پہنچ گیا۔
کالج کی دیوار سے لگی پھونس کی ایک جھونپڑی
کھڑی تھی۔ باہر تازہ تازہ تیار کیا ہوا چولہا سلگ
رہا تھا۔ پاس ہی مٹّی کے چبوترے پر گلاس کے ساتھ
دیگر سامان پڑا تھا۔ سکینہ بالکل سامنے ایک
مونڈھے پر بیٹھی کیتلی میں اُبلتے ہوئے پانی کو دیکھے
جا رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ سر سے
پاؤں تک کانپ گئی لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔
میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ اُس سے کیا
پوچھوں۔ کہاں سے بات کا آغاز کروں۔ جب کچھ بھی
سمجھ میں نہیں آیا تو ہڑبڑا کر بس اتنا کہا ــــــ
"ایک چائے . . . خوب کڑی . . ."
اُس نے ٹٹولتی ہوئی آنکھوں سے مجھے
دیکھا اور میرے ہاتھ میں چائے کا گلاس تھما
دیا۔ میں اُسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا . . . اس کی
پیشانی اور ہونٹ کے اُوپر اسی طرح پسینے کے
قطرے جگمگا رہے تھے جیسے وہ اب بھی پالی روڈ سے
گذرتی ہوئی، ٹفن کیریر جھلاتی ہوئی، لالی پاپ

چوستے رہنے کی کوشش میں جسم کو مختلف زاویوں پر جھٹکے دیتی ہوئی وہی سکینہ ہو۔
بے اختیار جی چاہا کہ اسے اسی طرح چھیڑ دوں ــــ "ارے دائی! ... تم یہاں ..."
اور وہ مجھے اسی طرح تنک کر جواب دے ــــ "دائی کاہے کو ہیں ... ہم تو اب اپنے اسلم کی گھر والی ہیں ..."
لیکن میرے حلق میں ایک ٹکڑا سا پھنس رہا اور میں کچھ بھی نہیں پوچھ سکا۔ جلدی جلدی چائے ختم کی اور ہڑبڑا کر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ سکینہ کی ٹٹولتی ہوئی آنکھیں اب بھی میرے تعاقب میں تھیں ...

شام خوب گہری ہو چکی تھی ... سڑک پر اندھیرا اور سناٹا پھیل چکا تھا ... میری عجیب کیفیت تھی ... نہ جانے کتنی باتیں، کتنے منظر ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہے تھے اور تیزی سے غائب ہوتے جا رہے تھے ... اور میں ... میں کچھ بھی نہیں سوچ پا رہا تھا۔ پیڈل پر پاؤں بھی صحیح نہیں پڑ رہے تھے۔
اسی افراتفری میں سکینہ کی دکان سے تھوڑی ہی دُور آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش میں ہم دونوں اُلجھ پڑے۔ جیسے ہی اس شخص کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا میں چونک پڑا ــــ
"ارے جبّار میاں! ... تو کیا یہ بھی ..." اس کے آگے سوچنے کو کچھ بھی نہیں بچ گیا تھا۔
اس اندھیرے میں ہم دونوں بالکل آمنے سامنے کھڑے تھے ... ایک دوسرے کا کاندھا تھامے ہوئے ... ہم سے کچھ ہی دور مونڈھے پر بیٹھی سکینہ کیتلی میں اُبلتے ہوئے پانی کو گھورے جا رہی تھی ... اور ڈراما محض ایک کردار کے بل بوتے پر ڈراپ سین کے بعد بھی جاری تھا ...

مولانا آزاد کے خطوط، دیگر تحریریں اور تصویریں

مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقعے پر اُردو اکادمی، دہلی نے تین کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ــــ پہلی کتاب مولانا کی تصویروں پر مشتمل ہوگی، دوسری مولانا کے خطوط پر اور تیسری مولانا کی ان تحریروں پر جو اب تک کتابی شکل میں سامنے نہیں آئی ہیں۔
اس ارادے کو عملی شکل دینے کے لیے ہم آپ کی مدد کے محتاج ہیں۔ ابھی برصغیر ہند و پاک میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے جن کے پاس مولانا کے خطوط، دیگر تحریریں یا تصویریں موجود ہوں گی۔
اگر آپ کے پاس بھی مولانا کی کوئی تصویر، تحریر، یا خط موجود ہے تو براہِ کرم عاریتاً ہمیں عنایت فرما دیں۔ ہم اسے آپ کے حوالے سے شاملِ کتاب کریں گے اور استعمال کے بعد بہ حفاظت آپ کو واپس کر دیں گے۔
ہم یہ تینوں کتابیں اسی سال میں شائع کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے آپ سے فوری توجّہ کی گزارش ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک تاریخی اہمیت کا کام ہوگا اور اس میں آپ کی شرکت ایک قومی فریضے کی ادائگی کے مترادف ہے۔

ہم آپ کی عنایات کے منتظر رہیں گے۔ خط و کتابت درج ذیل پتے پر فرمائیں:

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

امیر قزلباش

جنگل جنگل چیخ پکار
ابنِ آدم سے ہشیار

گھر کے اندر قہر سماں
دروازے پر پہرے دار

افواہوں کے دن ہیں یہ
بچّو! مت پڑھنا اخبار

اُس کو اُس کا منصب دے
اپنے سر سے بوجھ اُتار

مجھ کو روز بلاتا ہے
ساحل، سات سمندر پار

بے تیشہ فرہادوں میں
قدم قدم دُنیا کہسار

اپنے بل بوتے پر جی
گھر کے باہر رات گزار

وہ تو اسمِ اعظم ہے
نام لیا اور بیڑا پار

نظر میں ہر دشواری رکھ
خوابوں میں بیداری رکھ

دُنیا سے جھک کر مت مل
رشتوں میں ہمواری رکھ

سوچ سمجھ کر باتیں کر!
لفظوں میں تہہ داری رکھ

فٹ پاتھوں پر چین سے سو
گھر میں شب بیداری رکھ

تو بھی اس جیسا بن جا
بیچ میں دُنیا داری رکھ

ایک خبر ہے تیرے لیے
دل پر پتھر بھاری رکھ

خالی ہاتھ نکل گھر سے
زادِ سفر ہشیاری رکھ

شعر سنا، اور بھوکا مر
اِس خدمت کو جاری رکھ

وہ کون تھا پوچھا نہیں
اپنے لیے سوچا نہیں

گھر میں مرے اک پیڑ ہے
جس کا کوئی سایہ نہیں

یہ نیند ہے یا موت ہے
عرصہ ہوا جاگا نہیں

لڑتے رہے آپس میں سب
لیکن کوئی جیتا نہیں

جلتا ہوا گھر سامنے
لیکن کوئی رستہ نہیں

اک اور آئینہ بدل
یہ بھی مرا چہرہ نہیں

دشمن سمجھتا ہوں اُسے
مجھ کو کوئی خطرہ نہیں

موندی ہوئی آنکھیں سہی
میری نظر میں کیا نہیں

۱۱- اے، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

عرصۂ حیات

میں ایک شاعرہ ہوں۔ پچھلے دنوں میں اِلٰہ آباد گئی تھی، کسی مشاعرے میں شرکت کرنے نہیں بلکہ اپنے داماد کے ساتھ گئی تھی۔ اسے پی۔سی۔ایس۔ کا انٹرویو دینا تھا۔

گاڑی صبح کو اِلٰہ آباد پہنچی۔ چونکہ انٹرویو شروع ہونے میں کافی دیر تھی، اس لیے میں نے اپنے داماد کو پبلک سروس کمیشن کے دفتر چھوڑا اور رکشا میں بیٹھ کر شہر کا سرسری طور پر چکر لگانے چل دی۔

تین بجے کے قریب داماد کو انٹرویو سے فرصت ملی۔ چونکہ واپسی کی گاڑی میں کافی وقت تھا لہٰذا میں نے سوچا کہ کافی ہاؤس میں ایک کافی پینے کے بعد اسٹیشن کا رُخ کروں گی مگر پھر فوراً خیال آیا کہ دوسرے کافی ہاؤسوں کی طرح اس کافی ہاؤس میں بھی شاعر، افسانہ نگار، وکیل، کلرک، سیاست داں، یونیورسٹی کے بے فکر طلبا وغیرہ بیٹھے ہوں گے جو ایک کافی پی کر فضول کی بحثیں کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

نوچندی ایکسپریس میں دوسری گاڑیوں کی طرح بھیڑ نہ تھی، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل دو گاڑیاں اسی سمت جا چکی ہوتی ہیں۔ میں ایک برتھ پر کھڑکی کے کنارے بیٹھ گئی۔ سامنے میرا داماد بیٹھ گیا۔ ان دونوں برتھوں پر صرف ہم دونوں ہی تھے۔ میں ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ گاڑی روانہ ہونے سے چند منٹ قبل میرے کانوں میں آواز آئی۔ "اس برتھ پر کتنے لوگ بیٹھے ہیں؟" جملا ہکلا کر ادا ہوا تھا۔ میں گردن گھما کر مخاطب کرنے والے کو دیکھنے لگی۔ ایک دُبلا پتلا جوان میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "اگر آپ بیٹھ جائیں گے تو ان برتھوں پر بیٹھنے والے کُل تین ہو جائیں گے" اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور داماد کے برابر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی وہ مجھ سے بولا "ارے آپ ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کے ساتھ سفر کرنے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔"

میں لاتعلقی سے پلیٹ فارم کی طرف دیکھنے لگی۔ گاڑی چل دی اور ادھر اس کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ وہ حد درجہ باتونی ہے مگر اس کی باتیں دلچسپی سے خالی نہ تھیں۔ میں بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آخر وہ طویل سفر تو کسی نہ کسی طرح کاٹنا ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں ایک دفتر میں کلرک ہے اور دفتر ہی کے کام سے اِلٰہ آباد آیا تھا۔

معلوم نہیں اس سمت جانے والی سب گاڑیاں پریاگ اور پھاپھامئو جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر کیوں رکتی ہیں؟ بہرحال جیسے ہی پھاپھامئو سے گاڑی روانہ ہوئی، بوندا باندی شروع ہوگئی۔ داماد نے کھڑکی کے شیشے گرا دیے۔

میں نے اس جوان سے پوچھا "آپ اِلٰہ آباد کب آئے تھے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "ایک ہفتے قبل، حالاں کہ کام صرف دو روز کا تھا مگر آج کل کے کلرک ہ پورے چھ دن لگا دیے۔ گھر پر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"گھر میں کون کون ہے؟"

"بیوی، بچے، ایک چھوٹا بھائی، بس۔"

بوندا باندی نے موسلادھار بارش کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ وہ بولا "موسم بے حد رومانٹک ہوگیا ہے۔ میرا دل بے ساختہ غزل گانے کے لیے چاہنے لگا ہے۔ اجازت ہو تو سُناؤں۔" میں نے سوچا کہ وہ اپنی ہکلی آواز کے ساتھ بے سُری غزل گا کر خوامخواہ بور کرے گا مگر کچھ اس کا دل رکھنے کے لیے اور کچھ سفر کٹ جانے کی غرض سے میں نے بے دلی سے کہہ دیا "ارشاد۔" اس نے مجازؔ کی کوئی غزل سنانا شروع کی۔ پہلا مصرعہ ختم ہوتے ہوتے میں چونک پڑی۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ غزل ختم ہوتے ہی میں نے تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیے مگر وہ گردن جھکا کر نہ جانے کیا سوچنے لگا اور پھر اپنی آنکھوں پر رومال بھی رکھ لیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ قہقہہ لگا کر بولا "دیکھا آپ نے ہ میں بھی دوسرے ہکلوں کی طرح گاتے وقت

خورشید ملک
کاریگر گلی، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

نہیں ہکلاتا ہوں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ترنم سے ایک لفظ ادا ہونے میں قدرے وقت لگتا ہے، اس اثنا میں دوسرے لفظ کے ادا ہونے کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی میں بہت برا شاعر نہیں ہوں۔"

"ارے" میں نے بے ساختہ کہا "آپ کی آواز کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ آپ نے اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

وہ سنجیدہ ہو کر بولا "ایک بار آکاش وانی پر بھی غزل گا چکا ہوں مگر آج کل فن کی قدر کون کرتا ہے، سفارش اور گروپ بندی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔"

باتوں باتوں میں جب اسے معلوم ہوا کہ میرے داماد نے پی۔ سی۔ ایس کا انٹرویو دیا ہے تو وہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولا "آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ میں بھی پی۔ سی۔ ایس کا انٹرویو دے چکا ہوں۔"

"اچھا؟" میں نے واقعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "آپ سے کس قسم کے سوالات پوچھے گئے تھے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "چونکہ میں اُردو کا طالب علم رہا تھا" اس لیے مجھ سے غالب کا کوئی طنزیہ شعر سنانے کے لیے کہا گیا تھا۔"

"آپ نے سنایا؟"

"توبہ کیجیے۔" وہ بولا "مجھے غالب کا ایک بھی شعر یاد نہیں تھا، طنزیہ شعر تو بہت دور کی بات تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"بس، اپنے ہکلے پن کا فائدہ اٹھایا" وہ ہنس کر بولا "میں نے اس طرح مُنہ بنانا شروع کیا گویا شعر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کچھ دیر تک انٹرویو بورڈ نے انتظار کیا کہ شاید میرے مُنہ سے شعر نکل ہی آئے مگر شعر کو نکلنا تھا نہ نکلا۔ چونکہ بورڈ کو بہت سے انٹرویو لینے تھے، لہٰذا مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھ سے تشریف لے جانے کے لیے کہہ دیا۔ اس طرح میری جان چھوٹی۔"

"آپ کا انتخاب ہوا؟"

"جی نہیں" اس نے لاپرواہی سے کہا اور گردن جھکا کر نہ معلوم کیا سوچنے لگا۔

میرے دماغ میں معلوم نہیں کیا آیا کہ اس سے پوچھ بیٹھی "کیا آپ نے لو میرج کی ہے"؟ میرے اس سوال پر وہ کچھ افسردہ ہو گیا اور بولا "ارادہ تو تھا مگر ــــ"

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا "محبوبہ نے دھوکا دے دیا؟"

"ارے نہیں۔" وہ جلدی سے بولا "دراصل میرے بڑے بھائی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میں بھابی اور ان کے دو بچوں کے لیے فکرمند ہو گیا۔ میری اتنی تنخواہ نہیں تھی کہ اپنی شادی کے بعد ان کی بھی کفالت کر سکتا۔ چنانچہ بہت غور کرنے کے بعد میں نے بھابی سے شادی کر لی۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ شاید اسے اپنے بڑے بھائی کی یاد آ گئی تھی۔ مگر فوراً ہی اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا "لیکن یقین کیجیے کہ بڑے بھائی کی بیوی ہونے کے باوجود عمر میں وہ مجھ سے کافی چھوٹی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ واقعی قابلِ تعریف ہیں۔ آپ نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر بھابی اور ان کے بچوں کی ذمہ داری بہت مناسب ڈھنگ سے سنبھال لی۔ لیکن آپ کی محبوبہ نے تو مایوس ہو کر دوسری جگہ شادی کر لی ہوگی؟"

"معلوم نہیں۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا "آپ نے پلٹ کر محبوبہ کی خبر ہی نہ لی؟"

وہ ایک دم سے ہنسنے لگا اور بولا "خبر تو جب لیتا اگر اس کا کوئی وجود ہوتا۔"

"میں سمجھی نہیں" میں واقعی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"دراصل میرا ارادہ تھا کہ اپنی ہی طرح ہکلانے والی کسی لڑکی سے محبت کرنے کے بعد شادی کروں گا۔ چونکہ ایسی لڑکی ملی نہیں تھی لہٰذا میں اس کے تصور ہی سے محبت کیا کرتا تھا۔"

"خوب" میں نے ہنستے ہوئے کہا "گویا آپ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔"

"ارے نہیں" اس نے جلدی سے کہا "دراصل میری زندگی خود مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا ــــ

"کچھ نہیں۔" اس نے افسردہ لہجے سے کہا اس کے بعد ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولا۔ "ویسے میں پہلے اپنی بیوی کو اکثر دھمکی دیا کرتا تھا کہ انھوں نے دو شادیاں کی ہیں لہٰذا میں بھی دو شادیاں کروں گا۔"

"کیا آپ کو واقعی اپنی پسند کی لڑکی مل گئی تھی جس سے آپ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

"بالکل نہیں۔" اس کے بدستور ہنستے ہوئے کہا "میں تو صرف انھیں چھیڑنے کے لیے کہا کرتا تھا۔"

"آپ کی اس دھمکی سے وہ ضرور ناراض ہوا کرتی ہوں گی۔"

"ہاں، پہلے تو وہ بہت ناک بھوں چڑھاتی

تھیں مگر ایک دن انھوں نے ایسا جواب دے دیا کہ پھر انھیں چھیڑنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔"

"کیا کہہ دیا انھوں نے؟" میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"وہ بولیں کہ انھوں نے ایک وقت میں دو شوہر نہیں رکھے، لہٰذا میں بھی ایک وقت میں دو بیویاں رکھنے کا حق نہیں رکھتا۔"

"واقعی، انھوں نے بہت معقول جواب دیا تھا۔"

بارش بدستور ہو رہی تھی۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ" اس نے ہاتھ کا پنجہ دکھاتے ہوئے کہا "مگر سب میرے نہیں ہیں، دو بچے بڑے بھائی کے بھی اس گنتی میں شامل ہیں۔" اس کے چہرے پر سوگواری طاری ہو گئی۔ چند لمحے اسی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ پھر ہنسنے لگا اور بولا "مجھ سے سات سال بڑے بھائی نے ۲۴ سال کی عمر میں شادی کی اور پانچ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ پانچ برس میں ان کے دو بچے ہوئے۔ میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں میرے تین بچے ہو گئے۔ اس لحاظ سے میں نے اپنے بھائی پر سبقت حاصل کر لی۔"

وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہو سکا اور گاڑی رائے بریلی پہنچ گئی۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے داماد سے کچھ بندوبست کرنے کے لیے کہا مگر بارش کی وجہ سے چند بھاگتے ہوئے مسافروں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی اور مجھے چائے تک نہ مل سکی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔

میں نے پوچھا "آپ کی بیوی مرحوم شوہر کو بھی کبھی یاد کرتی ہیں؟" وہ ایک دم سے چونک پڑا اور ہنستے ہوئے بولا "میں حتی الامکان یہی کوشش کرتا ہوں کہ ان کو یاد کرنے کا موقع نہ ملے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میرا خیال ہے کہ انسان کے موڈ پر بھی نیوٹن کے اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے جس رو سے ہر شے اپنی ہی حالت میں اس وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی بیرونی طاقت یا وجہ اس کی حالت میں تبدیلی نہ پیدا کر دے یعنی میز پر رکھی کتاب اس وقت تک رکھی رہے گی جب تک اسے ہٹایا یا اٹھایا نہ جائے یا پھر میز ہلا کر اسے گرا نہ دیا جائے۔ یہی کیفیت انسان کے موڈ کی بھی ہوتی ہے۔ مگر اس جوان کی فطرت عجیب و غریب تھی۔ پل پل اس کا موڈ بدلتا تھا کبھی سنجیدہ کبھی خوش مزاج اور کبھی افسردہ۔

میں نے اس سے پوچھا "کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ نے اپنی بیوی کو پہلے رشتے کے سبب بھابی کہہ کر مخاطب کر لیا ہو یا انھوں نے آپ کو دیور سمجھ کر جھڑک دیا ہو؟"

میرے اس سوال پر وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا "شادی ہو جانے کے کچھ عرصے تک ہم دونوں کو کبھی کبھی دھوکا ہوتا رہا۔" اس کے اوپر افسردگی طاری ہو گئی۔ میں اس کوشش میں لگ گئی کہ اس کی خوش مزاجی کو قائم رکھ سکوں۔ چنانچہ میں نے پوچھا "آپ کی عمر کتنی ہے؟"

"ارے؟" اس نے تعجب سے کہا "ابھی تو میں نے چند ایسی باتیں بتائی تھیں جس سے آپ میری عمر کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھیں۔ ویسے میں آپ کو اپنی عمر ضرور بتاؤں گا کیوں کہ عورتیں اپنی عمر بتانے سے گریز کرتی ہیں۔ البتہ مرد اپنی آمدنی چھپاتے ہیں۔"

"ایسا کیوں؟" میں نے پوچھا "کیا انکم ٹیکس والوں کے خوف سے؟"

"نہیں، اس وجہ سے نہیں۔" اس نے وثوق سے کہا "اصل وجہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ویسے سب سے بڑی انکم ٹیکس آفیسر تو اس کی گھر والی ہی ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسا مگر پھر فوراً ہی گردن جھکا کر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس سے پوچھا "کیا کبھی آپ کو ہکلے پن کی وجہ سے سُبکی محسوس ہوئی؟"

وہ پھر ہنسنے لگا اور بولا "سُبکی تو خیر کبھی نہیں محسوس ہوئی البتہ ایک آدھ مرتبہ تھوڑا برا ضرور محسوس ہوا۔ مثلاً جب میں بڑے بھائی کے بچوں کا داخلہ کرانے اسکول گیا تو بات چیت کے دوران ہیڈ مسٹریس نے پوچھا کہ آپ کی طرح کیا یہ بچے بھی ہکلاتے ہیں؟ نہ جانے کیوں اس کا یہ سوال مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ یکایک پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا آپ کے اپنے بچے ہکلاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ اس سوال پر وہ قدرے شرمایا اور بڑی معصومیت سے بولا "معلوم نہیں ابھی تو وہ بہت چھوٹے ہیں۔"

"آپ کا چھوٹا بھائی کیا کرتا ہے؟"

"وہ گنّے کے دفتر میں کلرک ہے۔ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اس کی شادی ہو گئی؟"

"آپ کی یادداشت بہت کمزور ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا "تھوڑی دیر قبل میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے گھر میں بیوی، بچے اور

چھوٹا بھائی ہے، اگر اس کی شادی ہوگئی تو میں اس کی بیوی کو بھی شامل کرکے بتاتا۔ بہر حال وہ غیر شادی شدہ ہے، حالانکہ اس کی ڈبل بھابی نے کئی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں، لیکن میں نے ابھی کسی جگہ بات پکّی نہیں کی ہے۔ ڈبل بھابی کا مطلب تو آپ سمجھ گئیں نا؟"

"وہ تو میں سمجھ گئی۔" میں نے کہا "مگر آپ اس کی شادی کیوں ٹال رہے ہیں؟"

"دراصل میں نے اپنے بھائی سے مزید دو سال رک جانے کے لیے کہہ دیا ہے۔" اس نے نہایت غمگین لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس لیے کہ ممکن ہے اسے پانچ بچّوں کی ذمّہ داری سنبھالنا پڑ جائے۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا اور آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ مگر میرے تجسّس کے فلیتے میں آگ لگ گئی تھی لہٰذا میں نے اس کی کیفیت کی طرف غور کیے بغیر پوچھا "کیا مطلب؟"

اس نے رُندھے گلے سے جواب دیا "دراصل بڑے بھائی کی طرح میرے بھی دونوں پھیپھڑوں میں مکڑی کے جال کی مانند سوراخ ہوگئے ہیں۔ ان کا انتقال ۳۷ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ دو سال بعد میں بھی اس عمر تک پہنچ کر شاید..." وہ کہتے کہتے باقاعدہ رونے لگا۔ اس کے اس انکشاف پر اس کے تئیں میرے دل میں بے پناہ ہمدردی کے جذبات امنڈ آنا قطعی فطری تھا۔ میں بہت افسردہ چہرے سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں؟ اچانک وہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ نے میری عمر پوچھی تھی نا، اب تو آپ کو معلوم ہی ہوگیا ہوگا کہ میری عمر کتنی ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ اب میری کتنی عمر باقی رہ گئی ہے؟" میرا دل اندر ہی اندر رونے لگا۔ میں نے دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا "آپ اتنے مایوس کیوں ہیں؟ ممکن ہے کہ..."

"ممکن تو سب کچھ ہے" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مگر مقررہ وقت تو کسی کا بھی نہیں ٹل سکتا ہے" وہ پھر سسکیاں لینے لگا مگر پھر فوراً ہی ہنسنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی قطعی کھوکھلی ہے۔ اب میں نے غور کیا کہ اس کے سب قہقہے کھوکھلے تھے۔ وہ رونے کے بجائے زبردستی ہنستا تھا یا قہقہہ لگاتا تھا۔

"آپ کو اتنا یقین کیوں کر ہوگیا ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"حالات ایسے ہوتے جارہے ہیں جیسے کہ بھائی کے لیے پیدا ہوگئے تھے۔" اس نے روہانسے انداز سے کہا۔ یکا یک وہ زور سے ہنسا اور بولا "یقین کیجیے کہ پانچ بچّوں کے بعد بھی میری بیوی میں بے انتہا جاذبیت ہے۔ ان کو دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا ہے کہ وہ پانچ بچّوں کی ماں ہیں۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کے لیے بے جوڑ قطعی نہیں ثابت ہوں گی کیوں کہ ان کی عمر میرے بھائی سے بھی کچھ کم ہی ہوگی۔"

"مگر ضروری تو نہیں کہ خدانخواستہ آپ کے نہ رہنے پر وہ یہ ذمّہ داری نبھانے پر رضامند ہو جائے۔"

"وہ میرا بھائی ہے۔" اس نے بہت وثوق سے کہا

گاڑی لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر داخل ہوگئی۔ اس کی رفتار میں بتدریج کمی آتی جا رہی تھی۔ اس جوان نے مجھے بہت افسردہ کر دیا تھا اور مجھے اس پر بے حد ترس آرہا تھا۔

جیسے ہی گاڑی رکی، اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور مجھے بڑے ادب سے سلام کیا۔ اس کے بعد وہ زور سے ہنس کر بولا "میں نے بلاوجہ اپنی کہانی سُنا کر آپ کی طبیعت مکدّر کر دی۔ آپ تو شاعرہ ہیں، آپ نے کچھ زیادہ ہی اثر لیا ہوگا۔" اتنا کہہ کر وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کے لامتناہی بوجھ کو دیکھ کر میں لرز گئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک بار پھر سلام کیا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

موسلا دھار بارش میں دھیرے دھیرے اس طرح اس کا وجود گم ہوگیا جیسے مکڑی کے جال میں مکھی۔

انیس احمد خاں انیسؔ

مرے سر پر کوئی چھپّر نہیں تھا
تھا سر لیکن یہ دردِ سر نہیں تھا

پریشاں ہوں بہت اب گھر بنا کر
پریشاں کل بھی تھا جب گھر نہیں تھا

لیا تھا تاج خودداری کے بدلے
مگر دیکھا تو میرا سر نہیں تھا

ہمارے نام پر تھا شہر لیکن
ہمارے نام کوئی گھر نہیں تھا

انیسؔ اک حشر جو ہر دم تھا برپا
وہ اندر تھا مرے باہر نہیں تھا

سپریم کورٹ، بار لائبریری، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جب رات کی زُلفوں سے شبنم سی برستی ہے
سُلگی ہوئی تنہائی احساس کو ڈستی ہے
اُن آنکھوں میں لَو دیں گے کیا دیپ تمنّا کے
اک عمر سے مایوسی جن آنکھوں میں بستی ہے
اخلاص کی خوبی کو ہم لے کے کہاں جائیں؟
یہ جنسِ گراں یارو! بازار میں سستی ہے
ہر عزم کے پیروں میں پڑ جاتی ہیں زنجیریں
انسان کو ناداری جب بانہوں میں کستی ہے
وحشت کے مناظر ہی ہر دَور کی قسمت ہیں
تہذیب کے لمحوں کو تاریخ ترستی ہے
لہجہ تو شگفتہ ہے اس دَور کے شاعر کا
تاثیر کی خوشبو کو آواز ترستی ہے
مخمورؔ و یگانہ پر موقوف نہیں اے دل!
بڑھتی ہے انا جب بھی فنکار کو ڈستی ہے

مخمور جمالی سنبھلی

مرکزِ ادب، عیدگاہ نہٹور، بجنور

عرشی پہالوی

زمانے بھر سے جدا ہے مقدّمہ میرا
نہ جانے کیا ہو عدالت سے فیصلہ میرا

عجیب نشۂ نخوت میں چور تھا میں بھی
کہ تیر جس پہ چلایا وہ جسم تھا میرا

قدم قدم پہ مری جس نے رہبری کی تھی
اُسی نے مقصدِ منزل بھلا دیا میرا

سفینۂ دل و جاں اب ترا خدا حافظ
ہَوا خلاف ہے دشمن ہے ناخدا میرا

ہر ایک لمحہ مجھے انتظار جس کا تھا
اُسی کے نام سے اب دل ہے کانپتا میرا

محلہ ناگر، قصبہ پہانی، ضلع ہردوئی ۲۴۱۴۰۶

شریف منزل: دہلی کی ایک تاریخی عمارت

دہلی کی تاریخی یادگاروں میں شریف منزل ایک نہایت اہم عمارت ہے۔ گزشتہ ڈھائی سو برس میں اس منزل نے جس طرح ملک کی تاریخ کے بدلتے نقشے دیکھے، والیان ریاست اور رہنمایان ملک وملّت کا استقبال کیا، شاعروں اور ادیبوں کی محفلیں سجائیں، علما و نقبا کی عالمانہ گفتگوئیں سنیں، قومی رہنماؤں کے مشاورتی جلسوں کا نظارہ کیا اور ہزارہا جان بلب مریضوں کو جامِ صحت بخشا۔ اس لحاظ سے نہ صرف دہلی بلکہ ذاتی ونجی زمرہ کی ہندوستان کی کم عمارتیں اس کے برابر درجہ میں شمار کی جاسکیں گی۔ ملک کی بہت سی عمارتیں قومی نوعیت کے جلسوں یا شاعروں، ادیبوں اور نامور شخصیتوں سے انتساب کی وجہ سے منزلت کا خاص درجہ رکھتی ہیں، لیکن شریف منزل کی طرح وہ نہ ڈھائی سو سالہ طویل تاریخ کی امین ہیں، نہ مختلف ادوار میں ان کا وہ تاریخی کردار رہا ہے۔ یہ منزل ملکی سیاست اور قومی مسائل ومعاملات سے لے کر علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایسا گہوارہ رہی ہے، جس کے بغیر دہلی کی سیاسی، ادبی اور تہذیبی تاریخ ادھوری نظر آتی ہے۔

شریف خانی سلسلہ کے مورث اعلیٰ بابر کے عہد میں ہندوستان آئے۔[1] حیدرآباد اور اکبرآباد کے بعد دہلی ان کا مسکن بنا۔ حکیم واصل خاں پہلے شخص ہیں جو اورنگ زیب کے زمانے میں آگرہ سے دہلی منتقل ہوئے۔[2] ان کے بعد ان کے بیٹوں حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں اول کا دہلی قیام رہا۔ دہلی منتقلی کے فوراً بعد ان کا عروج شروع ہوچکا تھا۔ حکیم اکمل خاں جیسا کہ کہا جاتا ہے، محمد شاہ کے دربار سے وابستہ اور حاذق الملک کے خطاب سے مفتخر تھے۔[3] لیکن ان کے قیام کی جگہ کے بارے میں تذکروں میں وضاحت نہیں ملتی ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ اس خاندان کی کئی پشتیں گزر چکی تھیں لیکن حکیم اکمل خاں کے صاحبزادے حکیم شریف خاں (پیدائش ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) کے نام سے جہاں یہ خاندان متصف ہوا اور شریف خانی خانوادہ نے ملک کے نامور خاندانوں کی تاریخ میں امتیازی جگہ پائی وہاں شریف منزل بھی انھی کے نام سے موسوم ہوئی۔ میرے خیال سے حکیم اکمل خاں اور حکیم واصل خاں کا قیام اسی مکان میں رہا۔ حکیم شریف خاں نے جنھیں تعمیر کا بھی خاص ذوق تھا، اس میں اپنی پسند کے مطابق ترمیم کی اور بعد میں یہ عمارت ان کی ذاتی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے نام سے مشہور ہوئی۔ بلی ماران میں واقع شریف منزل پر اگرچہ کوئی تاریخی کتبہ نہیں ہے، جس سے اس کے سنہ تعمیر کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے لیکن اس منزل کے سامنے ان کی باقیات میں سے جو مسجد ہے اس پر یہ کتبہ مرقوم ہے:

شکر خدا بسعی محمد شریف خاں
شد طرح مسجدے کہ بود کعبۂ صفا
برخاست چوں ندائے مؤذن خطیب عقل
گفتا بجوئے سال وے از خانۂ خدا

۱۱۶۱ھ

اسی مسجد کے زیر سایہ غالب کا قیام رہا۔

حکیم شریف خاں دربار شاہی سے وابستہ اور نہایت کامیاب معالج تھے۔ ہندوستان میں ان کی حیثیت طبی مجتہد کی ہے۔ انھوں نے روایت سے انحراف کیا اور معالجے میں نئی طرح کو رواج دیا، کشتے کے استعمال کی وکالت کی، مقامی دواؤں کا چلن بڑھایا اور ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر تاریخ طب کی درخشانی میں اضافے کا باعث بنا۔ انھیں تصنیف وتالیف کا خاص ذوق تھا، طب اور دوسرے موضوعات پر وہ ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ فارسی اور اردو میں انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔[4] اور غالباً وہ اردو میں قرآن مجید کے پہلے مفسر ہیں۔ ۸۴ سال کی عمر میں ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں وفات

سید ظل الرحمٰن

پائی. دخل الجنۃ بلاحساب مادہ تاریخ ہے۔[۵]
حکیم شریف خاں کے چھ صاحبزادوں میں حکیم صادق علی خاں فاضل طبیب و مصنّف تھے متعدد طبی کتابوں کے علاوہ ان کی ایک کتاب تقویت العقائد ہے جو شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویت الایمان کا جواب ہے۔[۶] ۸۰ سال سے کچھ اُوپر عمر پا کر ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں فوت ہوئے۔ "حکیم صادق و کامل حکیم صادق بود" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ تین فرزند ان کی یادگار تھے۔ حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ خاں۔[۷]
حکیم غلام محمد خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں ریاست پٹیالہ سے متعلق رہے۔ حکیم محمود خاں شریف منزل میں خاندانی مسند طبابت پر فائز ہوئے۔ ان کے دم سے شریف منزل کی آبادی اور رونق میں اضافہ ہوا۔ ان کی ذات مرجع انام تھی انھوں نے بزرگوں کی روایات اور خاندانی وقار و وجاہت کو قائم رکھا۔ شریف منزل جو اب تک بکثرت مقامی و بیرونی مرضا، شائقین علم طب اور اور دہلی کے علما، شرفا اور عمائدین کے لیے ایک مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی تھی سلطنت مغلیہ کی تباہی اور انگریزی اقتدار کے زمانہ آغاز میں ایک اور حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز میں وہ باشندگان دہلی کے لیے امن کا گہوارہ بنی اور سینکڑوں لوگوں نے وہاں پناہ لے کر اپنی جان اور آبرو بچائی۔ ۱۸۵۷ء میں شریف منزل تباہی کی زد میں نہیں آئی۔ اس کا ایک سبب خود محمود خاں کا شخصی اعزاز تھا۔ جس وقت برطانوی فوجیں دِلّی میں داخل ہوئیں تو نابھہ، پٹیالہ اور جیند کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں اور ان مہاراجگان نے برطانوی افسران سے کہہ دیا تھا کہ شریف خانی خاندان کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ انگریزی فوج نے دِلّی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت کے لیے پہرہ بٹھادیا۔[۸] غالب کی متعدد تحریروں میں شریف منزل کا ذکر ملتا ہے ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ مرزا لکھتے ہیں "جب دو دن اسی طرح بے آب و نان گزر گئے تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں کے خاندانی مکانوں کی حفاظت کے لیے جو سپاہی بھیجے تھے وہ آپہنچے، لوگوں کو جان کا ڈر تھا وہ کم ہوا تو انھوں نے سپاہیوں سے پانی کے لیے استمداد کیا۔[۹] 'دستنبو' میں غالب نے اس واقعے کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔[۱۰]
غالب نے ایک اور جگہ لکھا ہے "باغیوں کی شکست کے وقت جب دِلّی والے بھاگے تو ہزارہا اشخاص نے حکیم محمود خاں کی حفاظت میں اپنا اثاثہ چھوڑ دیا" حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور اور جواہرات محفوظ کرنے کے لیے لائے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھری بتا دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ چنانچہ یہ کوٹھری چھت تک لوگوں کے پلندوں گٹھریوں اور بکسوں سے بھر گئی۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپے سے زیادہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مرتبہ دِلّی میں محمود خاں ہی کا تھا کہ لوگ ان کی کوٹھریوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال جاتے تھے۔ غدر کے بعد جب لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اس کوٹھری کا دروازہ کھلوا دیا اور فرمایا کہ جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کر لے جائے۔[۱۱]
ایک واقعے کا ذکر مرزا غالب اس طرح کرتے ہیں "شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجہ نریندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) بیہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں۔ اسی خیال سے ۷ فروری (۱۸۵۸ء) کو منگل کے دن (حاکم شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔ ۵/ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲/ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص ۱۳/ فروری کو سنیچر کے (دن) تین شخص اور واپس آگئے۔ (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے"۔[۱۲] شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے "جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا شہر کے کئی اور معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی"۔[۱۳]
حالی نے محمود خاں (وفات ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء بعمر ۷۲ سال) کا جو پُر درد مرثیہ کہا ہے اس کے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ ہے:

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانہ بے گھروں کو گھر دیا

محمود خاں کی عظمت کے اعتراف میں حالی کے دو بند ملاحظہ ہوں:

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گیا سیلِ فنا اس کو بھی اے دلی بہا

اور:

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

شریف منزل متعدد عمارتوں کا مجموعہ تھی، جس کے مختلف حصوں میں اراکین خاندان کی رہائش تھی۔ اسی کی ایک عمارت میں حکیم غلام رضا خاں رہتے تھے، مرزا غالب کے دوست، انھوں نے شریف منزل میں مطبع اکمل المطابع قائم کیا تھا۔ اس مطبع سے ایک اخبار بنام اکمل الاخبار نکلتا تھا۔ مرزا بہاری لال مشتاق شاگرد مرزا غالب مطبع کے مہتمم تھے اور کبھی کبھی اخبار کی کاپی لکھا کرتے تھے۔ اخبار کی ابتدا ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ہو چکی تھی۔ حکیم واصل خاں مطبع اور اخبار کی نگرانی کرتے تھے۔ ۱۸۹۴ء کے بعد تک یہ اخبار جاری رہا۔ مضامین لکھنے والوں میں اس زمانے کے مشہور اہلِ قلم مولوی ذکاء اللہ، سید جالب دہلوی، حکیم سید احمد حسین، نواب سعید الدین خاں طالب، محمد بشیر مرزا دہلوی، مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ شامل ہیں[۱۴]۔ مطبع اکمل المطابع سے ۱۸۶۹ء میں غالب کا مجموعہ خطوط اُردوئے معلیٰ بھی طبع ہوا تھا۔

محمود خاں کے زمانے میں دہلی کی جو باکمال ہستیاں تھیں شریف منزل کے بام و دران کے فیض سے منور تھے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے ادارے اور انجمن کی تھی جہاں علمی مذاکرے، مذہبی مباحث اور فنی مسائل پر تبادلہ خیال کا سلسلہ رہتا تھا، سیاست کی گتھیاں سلجھتی تھیں اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جس طرح ان کے زمانے میں غالب، ذوق، مومن، صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں اور دہلی کی دوسری سرکردہ شخصیتیں وہاں پہنچتی تھیں اسی طرح حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں کے زمانے میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی الٰہی بخش، مولوی ذکاء اللہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک کا وہاں اجتماع رہتا تھا، شریف منزل میں واقع مطبوں میں جہاں کثرت سے مرضا کا ہجوم ہوتا تھا، درس و افادہ کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ حکیم شریف خاں، حکیم صادق خاں، حکیم محمود خاں، حکیم عبد المجید خاں، حکیم واصل خاں اور خاندان کے دوسرے اراکین ۱۸۸۳ء میں مدرسہ طبیہ کے قیام سے پہلے اپنے مطبوں میں طلبا کو علمی و عملی تعلیم دیتے تھے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے عہد میں شریف منزل کی رونق و عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کی شخصیت ایسی مقتدر اور بااثر تھی کہ دہلی میں کوئی سیاسی مشورہ، اجتماع، کانفرنس یا اجلاس ان کے بغیر نامکمل تھا۔ ان کی آواز دہلی کی آواز تھی۔ قومی رہنماؤں میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، بیرسٹر آصف علی، علما میں مولانا محمود الحسن، مولانا شبلی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید سرکردہ شخصیتوں میں رائے صاحب پیارے لال، رائے بہادر سلطان سنگھ، سوامی شردھانند، لالہ سری رام اسی طرح والیانِ ریاست اور دہلی کے رؤسا اور حکام کی کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی۔ کانگریس، مسلم لیگ، تحریک خلافت، جمعیۃ العلما اور دوسری جماعتوں کی مشاورتی نشستوں کے علاوہ علی گڑھ، ندوۃ العلما، جامعہ ملیہ اور دوسری تعلیمی تحریکوں کو بھی وہاں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ جامعہ کے مسائل پر تو آئے دن مشوروں اور غور و خوض کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی طرح تقریباً روز قومی اور تعلیمی مسائل سے متعلق جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک کے بہت سے جلسے ان کے مکان میں ہوتے ہیں[۱۵]۔

حکیم اجمل خاں کی قومی تحریک میں شرکت کے بعد شریف منزل دہلی میں ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے والوں کا اہم مرکز بن گئی تھی۔ وہاں آئے دن جو اجتماعات منعقد ہوتے تھے ان میں سے بعض کا ذکر اجمل خاں کے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں ترکی سے ہمدردی کے نتیجے میں مسلمانوں کے بڑے لیڈر مولانا محمد علی، شوکت علی۔ چھندواڑہ میں حسرت موہانی فیض آباد میں مولانا آزاد رانچی میں ظفر علی خاں پنجاب میں مولانا محمود الحسن مالٹا میں نظر بند کیے گئے۔ ان نظر بندوں کی رہائی کے مسئلے پر ویسرائے سے گفتگو کی غرض سے مسز اینی بسنٹ دہلی آئیں۔ ملک کے بہت سے ممتاز لیڈر بھی اس موقع پر ان کی گفتگو کا نتیجہ معلوم کر کے اپنی تحریک کا پروگرام بنانے کے لیے جمع ہوئے۔ ۳، ۴ اور ۵ نومبر ۱۹۱۷ء کا یہ اجتماع دہلی میں لیڈروں کا ایک یادگار اجتماع تھا۔ شریف منزل اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر پُر جوش اور معتدل

سخت اور نرم سرد اور گرم بہت سے مسلمان لیڈر جمع تھے۔ نظر بندوں کی رہائی کے لیے ایک مرکزی کمیٹی قائم کی گئی۔ راجہ صاحب محمود آباد صدر ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سکریٹری اور حکیم اجمل خاں خزانچی مقرر ہوئے۔[۱۶]

۱۹۱۸ء میں دہلی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم اجمل خاں تھے۔ اس اجلاس کے دوران حکیم صاحب کے مکان پر کانگریسی لیڈروں کے مشورے ہوتے رہے اور پہلی دفعہ گاندھی جی نے بتایا کہ وہ کن خطوط پر قومی تحریکوں کو چلانا چاہتے ہیں۔[۱۷]

دہلی میں ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف جو زبردست عوامی تحریک شروع ہوئی اس میں دہلی کا امن خطرے میں پڑ گیا اور حکومت و عوام کے درمیان سخت ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ اس زمانے میں محض حکیم اجمل خاں کے اثر کی وجہ سے دہلی قتلِ عام سے محفوظ رہی۔ وہ اس وقت دلّی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ شہر کے امن و امان کے لیے تمام محلوں سے نمائندے منتخب کرکے ایک پنچایت قائم کی گئی تھی جس کے کارکن شہر کی حفاظت اور انتظام کے لیے مامور تھے، حکیم صاحب اس پنچایت کے صدر تھے ڈاکٹر انصاری کے الفاظ میں "ان کا گھر شہر کا قلب اور کاموں کا مرکز تھا"۔[۱۸]

تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ۲۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو انھوں نے ملک کے تمام ہندو و مسلمان لیڈروں کو دہلی میں مدعو کیا اور اس مشورے کا جو کئی دن تک شریف منزل میں جاری رہا نتیجہ یہ نکلا کہ شروع اپریل ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے حکومت کے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ حکیم اجمل خاں نے اپنا خطاب حاذق الملک اور اپنا تمغہ قیصرِ حکومت کو واپس کرکے جبر و تشدد کے خلاف اپنے رنج و نفرت کا برملا اظہار کیا۔[۱۹]

حکیم صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے مکان اور مطب پر اور سفر کے دوران خفیہ پولیس کے آدمی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے۔[۲۰]

۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا اس سلسلے میں ملک کے بہت سے ہندو مسلمان لیڈر صبح سے شام تک شریف منزل میں جمع رہتے تھے۔[۲۱]

۲۴ فروری ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک یادگار جلسہ شریف منزل میں منعقد ہوا جس میں بشمول مہاتما گاندھی ملک کا کوئی ممتاز لیڈر ایسا نہ تھا جو موجود نہ ہو۔[۲۲] اس جلسے میں تجویز التوائے قانون شکنی کی سخت مخالفت کی گئی لیکن گاندھی جی کی شخصیت اور دلائل نے سب کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور تحریک التوا کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی منظور کر لیا۔ شریف منزل میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کا منظر بہت حسرتناک تھا۔[۲۳]

سول نافرمانی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ۳۰ جون ۱۹۲۲ء کو شریف منزل میں ابتدائی جلسہ منعقد ہوا جس میں شہادتیں قلمبند کرنے کے لیے کچھ سوالات قائم کیے گئے۔ کمیٹی کی کارروائی یکم جولائی سے شروع ہوئی۔ حکیم صاحب نے تقریباً تمام اجلاسوں میں شرکت فرمائی۔ ۴۵۹ بیانات تحریری وصول ہوئے اور ۳۶۶ اشخاص نے زبانی شہادت دی۔[۲۴]

آخر اگست ۱۹۲۳ء میں اسیرانِ کراچی رہا ہوئے۔ ۲۹ اگست کو مولانا محمد علی بغیر اطلاع کے یکایک حکیم صاحب کے مکان پر پہنچے اور چند گھنٹوں کے قیام میں انھوں نے حکیم صاحب سے فرقہ وارانہ فتنے کے متعلق گفتگو کی۔[۲۵]

۲۷ جون ۱۹۲۴ء کو حکیم صاحب نے شریف منزل میں ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں دلّی کو ہندو مسلم فساد سے محفوظ رکھنے کی تدابیر پر غور کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ہندو مسلم اخبارات سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک ماہ تک کوئی افواہ تحریر نہ کریں جماعتوں سے بھی درخواست کی گئی کہ اشتعال دلانے والا کوئی جلسہ نہ منعقد کیا جائے۔[۲۶]

حکیم صاحب نے دہلی میں ایک اسلامیہ کالج قائم کرنے کی تحریک شروع کی۔ اس سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن ان کے مکان پر جلسے ہوتے تھے۔ ان جلسوں کی اکثر رودادیں وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ پوری اسکیم کا مسودہ انھوں نے خود تیار کیا۔ شہر کے تقریباً تمام باثر افراد خصوصاً ڈاکٹر انصاری، مولوی عبدالاحد، امام صاحب جامع مسجد، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور بہت سے مسلمان وکلا اور بیرسٹر اور تاجر ان کے شریک کار تھے۔ کل اسکیم کے لیے سرمایے کا تخمینہ ساڑھے چھ لاکھ روپے تھا۔ بہت قلیل عرصے میں انھوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع کر لیا۔ بعد میں جب جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی تو حکیم صاحب کی تمام تر توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔[۲۷]

شریف منزل میں مجلس عاملہ خلافت کمیٹی کا خصوصی جلسہ زیر صدارت مسیح الملک ہوا۔ جس میں مقامی وغیر مقامی رہنمایانِ ملک شریک ہوئے۔ اس جلسے میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔[۲۸]

ترکی کے ہلال احمد عثمانی کا ایک وفد فروری ۱۹۲۴ء میں دہلی آیا۔ دوسرے دن حکیم صاحب سے ملنے کے لیے شریف منزل گیا اور انھوں نے انقلاب ترکی کے مسئلے پر اراکین و

سے مفصل گفتگو کی۔[29]

عبدالمجید خواجہ کے بارے میں قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ وہ شریف منزل کی صحبتوں میں اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے ہنگاموں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک میں اجمل خاں کے عزیز ترین شرکار کار میں سے ایک تھے۔[30] گاندھی جی کے خاص دوست اینڈریوز کا بیان ہے کہ میں اکثر اجمل خاں سے ملنے جایا کرتا تھا اور اکثر ان کے ہاں کھانا کھاتا تھا۔[31]

مولانا آزاد کے حکیم بھورے میاں سے خصوصی تعلقات تھے اور دہلی میں ان کا اکثر قیام شریف منزل میں بھورے میاں کے حصّے میں ہوتا تھا۔ نواب حامد علی خاں رامپور اگرچہ شریف منزل میں کبھی نہیں ٹھہرے مگر دہلی کے ہر سفر میں ان کا شریف منزل آنا لازمی تھا۔ اجمل خاں سے بھائی کہہ کر بات کرتے تھے۔ ولی عہد رضا علی خاں دوران معتوبی کسی دوسرے والی ریاست کے ہاں قیام کرنے کے بجائے کئی ماہ شریف منزل میں مقیم رہے۔ ان کا قیام حکیم احمد سعید خاں کے حصّے میں تھا۔ شریف منزل میں یہ حصّہ جمیل میاں کے حصّے کے سامنے واقع تھا۔ دوسرے چھوٹے بڑے رجواڑوں اور نوابوں کے علاوہ جن کی آمد کا سلسلہ تقریباً روز رہتا تھا اجمل خاں کے زمانے میں نواب حمید اللہ خاں بھوپال، مہاراجہ بڑودہ مہاراجہ پٹیالہ شریف منزل میں آتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد بھی حکیم جمیل خاں سے ملنے شریف منزل تشریف لاتے تھے۔ اجمل خاں کی عزت و احترام کا یہ عالم تھا کہ رجواڑے جو ان کے ہاں آتے تھے وہ ان کے خاص ملازم ادریس خاں سے پہلے دریافت کرتے تھے کہ حکیم صاحب کیا کر رہے ہیں۔ اور اس وقت ان کی کیا مشغولیت ہے۔ پھر ان کی برآمدگی سے پہلے بٹن وغیرہ ٹھیک کرتے تھے۔ ادریس خاں بہت مُنہ چڑھے تھے جو آتا تھا پہلے انھی کو پوچھتا تھا۔[32]

مفتی کفایت اللہ نے شریف منزل میں اجمل خاں کی مصروفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مطب سے ۲ بجے فارغ ہو کر کمرے میں تشریف لاتے تو وہاں پہلے سے بیسیوں آدمی منتظر بیٹھے ہوتے تھے۔ طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہندوستانی دواخانہ اور خدا جانے کتنے قومی اداروں کے مہمات حضرت مرحوم کے سامنے ۲ بجے سے چار ساڑھے چار بجے تک پیش کیے جاتے تھے اور کتنی مشاورتی مجلسیں اس عرصے میں منعقد ہو جاتی تھیں۔"[33] مفتی صاحب کا بیان ہے کہ ۹ بجے کے بعد رات کی صحبت میں ان کے یاران قدیم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے تھے اور ہر قسم کی بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی۔ آخر میں چار پانچ سال مفتی صاحب کی بھی ان مجالس میں شرکت رہی۔[34]

اجمل خاں کے ان احباب کا شمار دہلی کی منتخب شخصیتوں میں تھا۔ ان کی وجہ سے شریف منزل علم و ہنر کی صحبتوں اور ارباب کمال کی مجلسوں کا ایک نمونہ تھی جس کی نظیر خود اُس زمانے کی دِلّی میں نہیں ملتی ہے۔ مولانا ابرار حسین فاروقی کے مطابق "رات کو ۱۱ بجے کے قریب شاعرانہ نشست ہوتی تھی جس میں دو چار شاعروں کے علاوہ دو ایک خاص دوست بھی، بحیثیت سامع کے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی نیاز مندانہ حاضر ہو جاتا تھا۔"[35]

حکیم جمیل خاں نے اجمل خاں کے مخصوص احباب میں صرف ان کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کی صحبتیں انھوں نے خود دیکھی ہیں۔ نہ صرف اجمل خاں کے ہم عصر اور شریف منزل کی صحبتوں کے شریک کی حیثیت سے بلکہ دہلی کی یادگار شخصیتوں کے تعلق سے ان کا تعارف دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ "نواب محمد حسن خاں خوش مزاج، نیک اطوار، رئیسانہ زندگی بسر کرنے والے۔ دہلی میں سب رجسٹرار کے عہدے پر مامور تھے اور بے تکلف احباب میں تھے۔ بٹیا محل میں شاندار حویلی (حویلی صدر الصدور) میں رہتے تھے۔ اجمل خاں کی زندگی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ سر رفیق جج خاص دوستوں میں تھے۔ ہائی کورٹ کے جج تھے اس لیے دہلی میں بہت کم رہتے تھے۔ پرانی وضع کے پابند تھے۔ جب دہلی میں ہوتے تھے تو انگرکھا پہن کر باہر نکلتے تھے۔ حاجی عبدالغفار حاجی علی جان عرف بچے میاں کی فرم کے مالک تھے۔ اعتقاداً اہل حدیث تھے اس لیے لباس بالکل سادہ مگر سپید و اجلا ہوتا تھا۔ خوش مزاج و خوش گفتار تھے۔ ہز ہائی نس نواب سراج الدین والی ریاست لوہارو قدیم طرز زندگی پسند کرتے تھے۔ ہر ادا سے نوابی شان ٹپکتی تھی"۔ جمیل خاں کا بیان ہے کہ انھوں نے کسی رئیس کو اس قدر منکسر المزاج نہیں دیکھا۔ موصوف کا مکان شریف منزل سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور وہ ہمیشہ یہ راستہ پیدل طے کرتے تھے۔ راستہ میں اگر کوئی واقف کار دہلی کا باشندہ مل جاتا تو بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ پہلے وہ سلام کرے بلکہ وہ خود ہی پہل کرتے تھے۔ اور اسے ٹھہرا کر مزاج پُرسی کرتے تھے۔ حاجی عبدالرزاق تاجر و رئیس دہلی سے پُرخلوص تعلق تھا، عموماً روزانہ صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ نواب مرزا محمد علی بیگ رئیس دہلی ان کو شاہنامے کے اکثر شعر یاد تھے۔ لطیفہ گو بذلہ سنج تھے۔ اجمل خاں کے انتقال کے بعد بہت کم عرصے زندہ رہے۔ خواجہ تصدق حسین سب جج دہلی۔ گوڑگاؤں کے رہنے والے تھے۔

عموماً رات کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ آدمی باوضع اور صاف باطن تھے۔ اجمل خاں کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ڈپٹی جمیل الدین پرانی وضع کے پابند تھے۔ کیمیاوی نسخہ بنانے کا بہت شوق تھا۔ سیٹھ ہارون کراچی کے رہنے والے اور بہت خلیق آدمی تھے دہلی میں ٹھیکیداری کرتے تھے اور اس سلسلے میں برسوں تک ان کا قیام رہا۔ ڈپٹی نثار حسین سہارنپور کے رہنے والے، 'ہنس مکھ'، وقت کو خوشی کے ساتھ گزارنے والے اور مرنجاں مرنج شخص تھے۔ تمباکو سے سخت نفرت تھی، ہر شخص سے اس کی برائی بیان کرتے تھے۔ اجمل خاں کے خاص دوستوں میں سے تھے اور ہفتوں ان کے پاس ٹھہرتے تھے۔ نواب فیض احمد خاں سب سے زیادہ مخلص دوست بہت سمجھدار اور دوراندیش انسان تھے۔ فقرا کا اعتقا زیادہ تھا۔ کانگریسی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ دہلی کے پبلک معاملات میں دل چسپی لیتے تھے۔ اجمل خاں کے کانگریس میں شریک ہونے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے۔ کئی سال صاحب فراش رہ کر انتقال کیا۔ جمیل خاں سے بے حد شفقت اور تعلق کے باوجود جب ایک مقدمے میں عدالت کی طرف سے ثالث مقرر ہوئے۔ تو ان کے خلاف فیصلہ دیا لیکن ان کے منظوری لے کر۔ یہ ان کے اعلیٰ کردار کی بات تھی۔ لالہ سری رام رئیس دہلی باوضع اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ شعر و سخن سے خاص شوق تھا۔ پرانی کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ پان سے بہت رغبت تھی۔ پاجامہ شیروانی اور رامپوری ٹوپی پہنتے تھے۔ مزاج میں وہم تھا۔ دل کے کمزور تھے۔ طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو سے حکیم صاحب کے برادرانہ تعلقات تھے جب حکیم صاحب گھوڑا کھال میں مقیم تھے تو موصوف مع اپنی صاحبزادیوں کے ان کے پاس ٹھہرے۔ چہرے سے متانت سنجیدگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ کوٹھی میں کبھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ بلکہ ان کی خوش مزاجی اور بے تکلفی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ خاندان کا کوئی با اثر شخص قیام پذیر ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات باورچی کو بلا کر دریافت کرتے تھے کہ آج کیا پکاؤ گے اور اس کے جواب کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بغیر کسی خود غرضی کے قوم کے سچے بہی خواہ، اجمل خاں کے مخلص دوست، 'ہنس مکھ' ہندو مسلم اتحاد کے حامی، پرانی اور نئی تہذیب کو پسند کرتے تھے۔ جامہ زیب تھے۔ انگرکھا بھی کھلتا تھا، شیروانی بھی خوشنما معلوم ہوتی تھی، کوٹ پتلون میں بھی شاندار نظر آتے تھے۔ عالی دماغ، عالی ظرف اور مستقل مزاج تھے۔ آصف علی بیرسٹر کم گو، متین، سنجیدہ، پرانی تہذیب کو پسند کرنے والے، سیاسی امور میں ڈاکٹر انصاری اور اجمل خاں کے مشیر و معتمد تھے۔ سر عبدالرحمٰن وکیل و جج ہائی کورٹ 'ہنس مکھ'، 'قابل' دہلی کے نامور وکیل تھے۔ پھر مدراس ہائی کورٹ اور بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے، اجمل خاں کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ نواب ضمیر مرزا حد درجہ متین اور مذہبی آدمی تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور وظیفہ و وظائف کے انتہائی پابند تھے۔ اجمل خاں سے مخصوص تعلق رکھتے تھے۔ لباس میں سادگی تھی، ماتھے پر سجدے کا نشان، طبیعت میں ظرافت تھی، مسکرا کر گفتگو کرتے تھے۔ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں۔ اجمل خاں کے پرائیویٹ مشاعروں کی جان تھے۔ تقریباً ہر مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ غالب کے کسی شعر پر اعتراض کر دینا ان کی چڑ تھی۔ اس پر بے قابو ہو جاتے تھے۔ ان کو استاد نہ کہنا یا ان کے کسی شعر کی داد نہ دینا ان کے غصے کو دعوت دینا تھا۔ اجمل خاں ان کی اور ان کے حقیقی بھائی نواب سراج الدین احمد خاں سائل کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے تھے، نواب سراج الدین احمد خاں سائل تاباں کے چھوٹے بھائی، خوش گلو شاعر تھے۔ شعر پڑھنے کا لہجہ خاص تھا۔ اجمل خاں کے تقریباً ہر مشاعرے میں بڑے بھائی کے سب وشتم کا شکار ہوتے تھے۔ لیکن انتہائی سعادت مندی کا اظہار کرتے تھے۔ آخر عمر میں معذور ہو گئے تھے۔ رکشا میں پھرتے تھے۔ لیکن ہفتہ دو ہفتے میں شریف منزل میں آتے تھے۔ غرض یہ کہ اجمل خاں کے زمانے میں ایک باغ لگا ہوا تھا جس کے پھولوں کی خوشبو سے دہلی مہک رہا تھا۔[۳۶]

حکیم اجمل خاں کے بعد حکیم محمد احمد خاں، حکیم ظفر احمد خاں، حکیم غلام کبریا خاں اور حکیم جمیل خاں کے زمانے میں بھی شریف منزل کی رونق کسی نہ کسی درجے میں قائم رہی اور ان حضرات نے خاندانی روایات اور دہلی کی شاندار اقدار کو بڑی حد تک برقرار رکھا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ۱۸۵۷ء کی طرح شریف منزل محفوظ رہی اور اس کی وجہ سے بلی ماران اور اس کے آس پاس کا علاقہ غارتگری سے بچا رہا۔ دہلی میں مجھ سے ایک قابلِ اعتبار شخص نے کہا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کا امن تباہ ہوا تو چاندنی چوک میں بلی ماران کے نکڑ پر پنڈت جواہر لال نہرو کی ہدایت پر باقاعدہ فوج متعین تھی۔ پنڈت جی کا کہنا تھا کہ اگر شریف منزل کو کچھ نقصان پہنچا تو میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس

ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد شریف منزل کو ایک اور آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ حکیم محمد احمد خاں کے چھوٹے بیٹے حکیم مجید احمد خاں اور اس سے پہلے حکیم بھورے میاں کے چھوٹے صاحبزادے حکیم حامد سعید خاں پاکستان منتقل ہو گئے۔

حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ ان کے دو نواسے حکیم عبدالصمد خاں اور حکیم عزیز الرحمٰن خاں پاکستان گئے۔ دو اور نواسے حکیم محمد لیئق خاں اور حکیم محمد بشیر خاں نے بھی نقل مکانی اختیار کی۔ اس کی وجہ سے شریف منزل کا کافی حصہ کسٹوڈین میں جا رہا تھا مگر پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے اثرات سے وہ مستثنیٰ قرار پائی اور کسٹوڈین میں نہیں گئی۔

۱۹۷۰ء تک دہلی کے زمانۂ قیام میں راقم سطور کو شریف منزل میں حکیم محمود احمد خاں مرحوم (خلف حکیم محمد احمد خاں) کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حکیم ظفر احمد خاں کے صاحبزادے حکیم شریف احمد خاں سے بھی مراسم قائم تھے۔ ایک مرتبہ حکیم جمیل خاں سے اور دو تین مرتبہ حکیم محمود سعید خاں سے بھی شرف نیاز کا موقع ملا۔ اس وقت تک شریف منزل اپنے قدیم آثار پر قائم تھی۔ اس کی سہ دری، صدر نشین، خاندان کا مطب، اجمل خاں اور دوسرے اراکین خاندان کی نشست گاہیں محفوظ تھیں۔ لیکن اب چند سال سے وہ نقشہ بدل چکا ہے۔ اور آج وہاں جانے والا اس کی شوکت دیرینہ کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔

حواشی

۱۔ سیرت اجمل، صفحہ ۱۔
۲۔ حکیم اجمل خاں، صفحہ ۱۰۰۔
۳۔ تذکرۃ الخواجگان، صفحہ ۸۵۔
۴۔ سیرت اجمل، صفحہ ۳۔
۵۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین صفحہ ۱۶۵۔
۶۔ سیرت اجمل، صفحہ ۴۔
۷۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین صفحہ ۱۷۹۔
۸۔ حیات اجمل، صفحہ ۱۵۔
۹۔ غالب نامہ، صفحہ ۱۲۱۔
۱۰۔ دستنبو (افکار غالب نمبر ۱۹۶۹ء) صفحہ ۲۹۳۔
۱۱۔ حیات اجمل، صفحہ ۱۵ و ۱۶۔
۱۲۔ دستنبو، صفحہ ۳۰۵ و ۳۰۶۔ غالب نے حکیم عبدالحکیم خاں کو حکیم محمود خاں کا بھتیجہ اور مولف حیات اجمل نے محمود خاں کا چچازاد بھائی لکھا ہے (ص ۱۷) اس سلسلے میں موخرالذکر بیان صحیح ہے۔ مولف حیات اجمل نے یہ واقعہ غالب ہی کے حوالے سے لکھنے کے باوجود انھیں چچازاد بھائی تحریر کیا ہے۔ وہ اس خاندان کے ارکان سے خوب واقف تھے۔ اور ان کی کتاب کا مسودہ جمیل خاں کے ملاحظہ سے گزرا تھا۔
۱۳۔ غالب نامہ، صفحہ ۱۲۶۔
۱۴۔ حیات اجمل، صفحہ ۳۵ و ۳۶۔
۱۵۔ سیرت اجمل، صفحہ ۸۸۔
۱۶۔ حیات اجمل، صفحہ ۱۶۸ و ۱۶۹۔
۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۰۔
۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۳۔
۱۹۔ سیرت اجمل، صفحہ ۱۳۳۔
۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵۔
۲۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۵ و حیات اجمل صفحہ ۲۴۲۔
۲۲۔ سیرت اجمل، صفحہ ۱۷۲۔
۲۳۔ حیات اجمل، صفحہ ۲۶۷۔
۲۴۔ سیرت اجمل، صفحہ ۱۷۵۔
۲۵۔ حیات اجمل، صفحہ ۲۹۲۔
۲۶۔ سیرت اجمل، صفحہ ۱۹۱۔
۲۷۔ حیات اجمل، صفحہ ۱۶۴۔
۲۸۔ مآثر المسیح، صفحہ ۱۰۲۔
۲۹۔ حیات اجمل، صفحہ ۲۹۶۔
۳۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۰۔
۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۹۔
۳۲۔ حکیم میر انوار احمد کے صاحبزادے حکیم میر بصیر احمد کا شریف خانی اطبا سے گہرا خاندانی تعلق رہا ہے۔ دہلی میں ایک ملاقات کے دوران ازراہ عنایت انھوں نے یہ معلومات فراہم کیں۔
۳۳۔ تذکرہ مسیح الملک، صفحہ ۷۰۔
۳۴۔ ایضاً، صفحہ ۷۳۔
۳۵۔ مآثر المسیح، صفحہ ۵۷۔
۳۶۔ سیرت اجمل دیباچہ حکیم جمیل خاں، صفحہ ۵۔

کتابیات

۱۔ افکار (غالب نمبر) کراچی ۱۹۶۹ء۔
۲۔ تذکرۃ الخواجگان حکیم احسان اللہ خاں، مطبوعہ گوالیار ۱۹۴۱ء۔
۳۔ تذکرہ مسیح الملک، محمد حسن قریشی، مطبوعہ لاہور۔
۴۔ حکیم اجمل خاں، کوثر چاند پوری، مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۳ء۔
۵۔ حیات اجمل قاضی عبدالغفار، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔
۶۔ سیرت اجمل، مطبوعہ ہندوستانی دواخانہ دہلی۔
۷۔ غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام، مطبوعہ احسان بک ڈپو، لکھنؤ۔
۸۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین حکیم سید ظل الرحمٰن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۶ء۔
۹۔ مآثر المسیح۔ مولانا ابرار حسین فاروقی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۶ء۔

سہمی ہوئی زندگی!

وہ میرے گھر اکثر آیا جایا کرتا ہے۔ اور جب بھی آتا ہے۔ میری بیوی کے لیے قیمتی تحفے اور بچّوں کے لیے مٹھائی ضرور لے کر آتا ہے۔ باوجود کوشش کے میں اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ میرے بچّے اسے چاچا کہتے ہیں اور وہ میری بیوی کو بھابی۔ اور وہ ان سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ انھیں میری موجودگی کی ضرورت تک محسوس ہونے نہیں دیتا۔ خصوصاً میری چھوٹی لڑکی عالیہ کو وہ بے حد چاہتا ہے اور میری بیوی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اسے بھی قیمتی تحفے لاکر دیتا ہے۔

میری بیوی کو اکثر میں نے یہ کہتے سُنا ہے کہ "ہماری عالیہ تو بالکل اپنے چاچا پر گئی ہے۔ ناک، نقشہ، روپ، رنگ ــــ اور پھر ویسی ہی شریر اور ضدی لیکن اچھے بچّے تو ضد نہیں کیا کرتے۔"

"چلو اب زیادہ نخرے نہ دکھاؤ۔ جلد مُنہ ہاتھ دھولو اور یونیفارم پہن کر اسکول کے لیے تیار ہوجاؤ۔ شام جب تمہارے چاچا آجائیں تو یہ فراک اور چوڑیاں پہن لینا۔"

میری بیوی کو اکثر ایسا کہتے، میں تب سُنتا ہوں۔ جب میری چھوٹی لڑکی اپنے چاچا کے دیے فراک اور چوڑیاں پہن کر اسکول جانے کے لیے ضد کرتی ہے۔

اور میں نے کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ جب بھی آتا ہے۔ میری بیوی کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ کچھ کچھ پاگل سی ہوجاتی ہے۔ اگر وہ چائے کی فرمائش کرتا ہے تو رات کا کھانا کھانے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ لیکن وہ چائے پر ہی اکتفا کرلیتا ہے۔ اور اس کی بنائی ہوئی چائے کی تعریف میں آسمان اور زمین ایک کردیتا ہے۔ اور میری بیوی خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتی۔ کھِل کھلا کر ہنستی ہے۔ شرماتی ہے۔ میری موجودگی کا اسے قطعی احساس نہیں رہتا۔ اور سچ پوچھو تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں۔ کیوں کہ میں سطحی زندگی گذارنے کا عادی ہوگیا ہوں۔ زندگی حسبِ معمول گذرتی رہے تو ٹھیک۔ ورنہ معمولی سی تبدیلی بھی میرے لیے پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ تاہم وقت کبھی کبھی کسی نہ کسی موڑ پر تبدیلی سے دوچار کر ہی دیتا ہے۔ تب مجھے ایسی کوفت ہوتی ہے کہ میں چین سے سو نہیں پاتا ــــ ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔

میں اکثر رات گئے گاندھی روڈ پر جس کے سرے پر ان کا مجسّمہ نصب کیا گیا ہے۔ اور جس کے قریب ہی ایک پُل کی چھوٹی سی دیوار ہے، بیٹھا کرتا ہوں وہاں کبھی کبھی کسی ایسے آدمی سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے جسے سارے شہر میں تلاش کرے تو نہ ملے۔

اور وہ پانچ سال قبل مجھے پہلی مرتبہ وہیں ملا تھا۔ تیز، طرار، چالاک، باتونی، پُرکشش شخصیت کا مالک پہلی ہی ملاقات میں دل جیت لیا۔ اس کے ساتھ مل بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی تشنگی باقی رہ جاتی۔

میرے ساتھ چند ملاقاتوں کے بعد وہ پچھلے پانچ سال سے میرے گھر آنے جانے لگا ہے۔

اور ادھر کچھ دنوں سے اس کا آنا جانا مجھے پسند نہیں آرہا ہے۔ شاید اس کی وجہ اور میری خوب صورت بیوی کی اس میں دل چسپی ہے۔ جس کے باعث اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن آگیا ہے۔ اور وہ مجھے بات بات پر جھڑکنے لگی ہے۔

شاید وہ ــــ؟ نہیں ــــ! "شریف اور غریب گھرانوں کی لڑکیاں چاہے وہ کتنی ہی خوب صورت اور اسمارٹ کیوں نہ ہوں اپنے شوہروں پر ہی چاہے وہ کتنے ہی کمزور اور بدشکل ہوں، اکتفا کرلیتی ہیں۔"

اور میری بیوی بھی ایک شریف ــ اور غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔۔۔ مگر ــــ؟ نہیں ــــ! شاید وہ ــــ؟ ہاں ــــ! اب

احمد عارف

شاہی بک ہاؤس، ۱۳۱۔ سلطان روضہ، بیجاپور ۵۸۶۱۰۱ (کرناٹک)

مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں بھی میرے گھر آیا جایا کرتا ہے۔
اور وہ آج شام پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔
اور جب وہ کہہ گیا ہے، تو ضرور آئے گا۔ اور جب وہ آئے گا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ وہ میرے گھر نہ آیا کرے۔

میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا۔ اور اس کے انتظار میں دالان میں آکر بیٹھ گیا۔ سامنے گیٹ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگا تو ذہن میں اس کی آمد کا تصور ابھرنے لگا۔ اور مجھے کوفت ہونے لگی۔ کسی تبدیلی کا قبل از وقت احساس دل ہی دل میں گھٹن پیدا کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آئے گا۔ میری بیوی دروازے میں کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ میں بیٹھا ہوں تو کیا ہوا، کوئی بہانہ بنائے گی یوں ہی مجھ سے باتیں کرے گی۔ اس کا صرف جسمانی وجود دروازے میں ہوگا اور دل و دماغ...

وہ اپنی پُرکشش شخصیت لیے "ہائے بھابی" کہتا ہوا بے خوف و خطر بغیر اجازت کے اندر چلا آئے گا۔ اپنی وضع قطع سے ایک بھرپور جواں مرد ہونے کی گواہی پیش کرے گا۔

"آیئے نا!" میری بیوی پُرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کرے گی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری خوب صورت بیوی کے حسن کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں کوئی تحفہ اور مٹھائی لیے کمرے میں داخل ہوگا۔ اور اندر جاتے جاتے مجھ سے پوچھے گا: "ارے تم آج یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" تو میں کیا جواب دوں گا۔؟

"کیا میں کہہ سکوں گا کہ تم میرے گھر مت آؤ۔؟"
"کیا یوں ہی باتیں بنا کر ٹال دوں گا۔؟"
"باتیں بنانی تو مجھے آتیں ہی نہیں،"
تو پھر.....؟
"میری بیوی ہی کچھ کہہ دے گی۔!!!"

بچوں کا ادب: ضروریات اور مسائل

بچے ہماری قومی امانت ہیں اور اس امانت کا تحفظ قوم کے ہر ذمہ دار باشعور شخص کا فرض ہے۔ لیکن ان کا تحفظ اور پرورش محض اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونوں تک محدود نہیں۔ ان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے۔ بچوں کی ذہنی تربیت اسی وقت ممکن ہے جب اوائل عمر ہی سے انھیں ایسا ادبی مواد فراہم کیا جائے جو تفریحی بھی ہو اور بامقصد بھی۔ ہمارے ملک میں بچوں کی اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونوں سے اگر بات آگے بڑھتی ہے تو بچوں کی اسکولی تعلیم پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ تعلیم ــ مقررہ اور محدود معلومات اور زبان کی واقفیت ــ ایسی تعلیم جو بچے کی شخصیت کے بجائے اس کی زندگی بنانے میں مددگار ثابت ہو۔ زندگی بنانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھا طرز معاش اختیار کر سکے۔ انجینیر بنے، ڈاکٹر بنے، بڑا افیسر بنے۔ انسانی قدریں خواہ ابھریں یا نہ ابھریں۔ ان تمام باتوں کی طرف ہم دھیان نہیں دیتے۔ اوّل تو ایسی کتابوں کا فقدان ہے جو بچے کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوں اور اگر ایسی کتابیں ہیں بھی تو وہ بچوں کے ہاتھوں تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ادب اطفال کا سب سے بڑا المیہ یہی رہا ہے کہ اس موضوع پر جس سنجیدگی اور غور و فکر کی ضرورت تھی، جتنی اس اہم موضوع کو اہمیت ملنا چاہیے تھی وہ اس کو نہیں دی گئی۔ جس کی ایک خاص وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ سماج بڑوں کا سماج ہے۔ اس سماج میں بچوں کی ضروریات اور ان کے حقوق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ پھر ایسے سماج میں بچوں کے ادب کے بارے میں کون سوچے گا؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بچوں کے لیے لکھنے والے مصنفین اور شعرا کو ادب میں کوئی مقام نہیں مل پاتا۔ ہمارے ملک میں بچوں کے لکھنے والوں کو حقیر نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب کہ غیر ممالک میں بچوں کے ادیب اور شاعر کو ادب اور سماج میں امتیاز حاصل ہے۔

بچے قدرت کا ایک کرشمہ ہیں۔ ان کی دماغی قوت، اخذ کرنے اور محسوس کرنے کا جذبہ یہ سب لامحدود ہوتے ہیں۔ بچہ اپنے تخیل کی مدد سے ہر شے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس میں تجسس کا وافر مادہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں مکمل اور مفصل معلومات چاہتا ہے، یہ تمام باتیں بچوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مصنفین کے سامنے مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کیا لکھیں اور کیسے لکھیں؟ مختلف عمروں کے بچوں کے لیے لکھنا ہو تو مزید مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں سب سے زیادہ پریشان کن مرحلہ زبان کا ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا لازمی ہے کہ بچہ کس عمر میں کتنی زبان جانتا ہے۔ بچوں کے ادیب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ مختلف ممالک، اشخاص، مقامات، پرندوں، جانوروں، فطرت انسانی، مناظر قدرت نیز بچوں کی نفسیات کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو۔ اس بات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بچہ براہ راست نصیحت، خشک باتیں اور مذہبی وعظ و پند پسند نہیں کرتا۔

لکھنے سے قبل مصنف کا فرض ہے کہ وہ یہ محسوس کرے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ بچے کے لیے ہے۔ ادب اطفال کی تخلیق سے پہلے مصنف کو خود بچہ بننا پڑے گا۔ اکثر بالغوں کے موضوعات کو آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ تخلیق محض سبق آموز یا نصیحت آموز ہو کر رہ جاتی ہے۔ بچوں کے لیے جس ادب کی ضرورت ہے وہ نہیں لکھا جا رہا۔ میرے خیال میں بچوں کے لیے صحت مند ادب ایک خاص قسم کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جس میں بچوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے، جہاں بچے کی اپنی الگ آزاد دنیا ہے۔ جس سماج میں ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا وہاں یہ کوشش

خوشحال زیدی
۸۰۔ انصار اپارٹمنٹ، غفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کی جاتی ہے کہ بچّہ جتنی جلد ہو 'بڑا' ہو جائے۔ یہی نظریہ بچّوں کے ادب کا مقصد بن کر رہ گیا ہے۔ وقت بے وقت نصیحت کرنے والا ادب' جلد از جلد سمجھ دار بنانے کی کوشش کرنے والا ادب' محض معلومات میں اضافہ کرنے والا ادب' آج کے بچّوں کا ادب ہوگیا ہے' ہمارے ماہرینِ تعلیم' اساتذہ' والدین' ادبا' شعرا اور صحافی اسی کو بچّوں کا ادب کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بچّہ براہِ راست نصیحت اور خشک وعظ کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ بچّے کو نئے مقامات' اشخاص' جانور اور اسی قسم کی چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ مہمّاتی کارناموں سے بچّے کی تشفّی ہوتی ہے۔ موجودہ تفریح کے سامان مثلاً ریڈیو' ٹیلی وژن' وی۔سی۔آر۔ اور سینما وغیرہ نے بچّے کی تعلیمات پر بڑا اثر ڈالا ہے جس کے سبب بچّوں کے لیے ایک خاص قسم کے لٹریچر کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔

بچّوں میں پڑھنے کی عادت اور شوق ان کی عمر کے اعتبار سے بڑھتا ہے۔ ۶ سے ۸ سال کی عمر تک بچّے الفاظ ملا کر پڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تصویر کی مدد سے وہ خود پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض الفاظ کو سمجھنے کے لیے وہ اپنے بڑوں سے مدد چاہتے ہیں۔ اس وقت بچّے کی ہمّت افزائی اور صحیح راہ نمائی کرنے کی ضرورت ہے۔ بچّے کے تجربات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ پہیلیاں' بہادری کی کہانیاں پڑھ کر اور بڑوں سے پوچھ پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ بچّے کو پڑھنے کا چسکا سا لگ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو بھی کتاب آتی ہے اس کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کلاس میں درسی کتاب کے اندر کہانی یا کامکس کی کتاب چھپا کر پڑھنے میں اس کو بہادری کا احساس ہوتا ہے۔ بچّہ جیسے ہی اسکول جانے لگتا ہے اس کی تخیلی دنیا میں ایک انقلاب سا آجاتا ہے۔ اسکول میں جا کر بچّے میں دوسرے بچّوں کے لیے محبت' دوستی' اشتیاق اور دل چسپی کے ساتھ بہادری کے کارناموں میں دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سب افراد سے متاثر نہ ہو کر اپنے چند مخصوص ساتھیوں اور اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے وہ ان میں مخصوص دل چسپی لیتا ہے۔ اس طرح بچّے میں ہیرو- ورشپ (HERO-WORSHIP) کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

مزاح کی حس بچّے میں عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ بچّے ہنسی مذاق' چھیڑ چھاڑ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مزاحیہ نظمیں' مضامین اور کہانیاں بچّوں کو بہت پسند آتی ہیں جنوں' بھوتوں' دیووں' پریوں' بادشاہوں' شہزادوں' شہزادیوں کی کہانیاں اب بھی ہر پڑھنے والے بچّے کے لیے کشش انگیز اور دل چسپی کا باعث ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ان کرداروں پر ہی تکیہ کیا جاتا رہا ہے۔ اور ان کے متبادل کردار تخلیق کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی یہ درست ہے کہ بچّوں کے لیے لکھنے والے حضرات موجودہ صورتِ حال میں بھی چاہتے تو جنوں' بھوتوں' بادشاہوں اور شہزادوں کے کرداروں کو مناسب فضا اور ماحول کے حوالے سے مفید اور بامقصد کرداروں میں ڈھال سکتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ موجودہ دور سائنس کا دور ہے' سائنس کی روز افزوں ترقی نے بچّوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔ آج کا بچّہ چاند کی بڑھیا اور اس کے چرخے پر یقین نہیں رکھتا۔ ابصار عبدالعلی کی نظم "چندا ماما پیارے ماما" کی نظم "چندا ماما پیارے ماما" کی نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ہم کو جو خُدا نے ذہن دیا
ہم اس کو کام میں لائے ہیں
سوچا' سمجھا' ایجادیں کیں
پھر راکٹ ہم نے بنائے ہیں
چھوڑے مصنوعی سیّارے' کُتیا کو خلا میں بھجوایا
ان سیاروں نے تصویروں سے رازِ خلا کا سمجھایا

پھر ہمّت کی انسانوں نے
چندا ماما کی طرف چلے
تھا نام اپولو آٹھ اس کا
جس میں چندا تک جا پہنچے
ہم سب نے اتنا جان لیا گو زیادہ دن ٹھہرے تو نہیں
چندا پہ کوئی رہتا ہی نہیں خالی ہی پڑی ہے اس کی زمیں

یہ نظم اس سائنٹفک دور کے بچّے کے بدلتے ہوئے ترقی یافتہ ذہن کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دور حقیقت پسندی کا دور ہے جس میں مافوق الفطرت اور بے بنیاد باتوں کی گنجائش نہیں لیکن ہمارے ہاں ماضی سے لے کر آج تک بچّوں کے لیے جو ادب بالعموم 'تخلیق' کیا گیا ہے اسے فوری طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ایک عبوری مدّت کے لیے نئے نئے کرداروں کے ساتھ جنوں' بھوتوں اور پریوں کے کرداروں کو بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ ہم پریوں اور تخیلی کہانیوں کو یکسر ردّ نہیں کر سکتے۔ ان کہانیوں سے بچّوں کی قوّتِ متخیلہ تیز ہوتی ہے۔ بچّہ ان کرداروں میں آج بھی دلچسپی لیتا ہے۔

بچّے میں تجسّس کا مادّہ فطری ہوتا ہے۔ کہانیوں میں سسپنس کے ساتھ حقیقت کو خیال کے پیرائے میں اور خیال کو حقیقت کے پیرائے میں پیش کرنے سے رنگینی بھی پیدا ہوگی

اور بچّے کی دِل چسپی بھی برقرار رہے گی۔ بچّوں کی درسی کتب میں بھی ہم بچّوں کی زبان اور ان کی مختلف عمروں کا لحاظ نہیں رکھتے۔ جب بچّے کی عمر زبان سیکھنے کی ہوتی ہے تو اسے اسٹائل سکھانا ٹھیک نہیں۔ اس بناوٹ میں بچّوں کو اپنا ماحول نہیں ملتا' اسی وجہ سے بچّے درسی کتب میں دِل چسپی کم لیتے ہیں۔ ان کتابوں کی غیر فطری زبان کے سبب ان کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اگر زبان آسان اور متاثر کرنے والی ہو تو پڑھنے میں اس کی دِل چسپی برقرار رہتی ہے۔ زبان کے ساتھ ہی درسی کتب میں اسلوب کی اہمیت ہے۔ اسلوب ایسا ہونا چاہیے کہ بچّے کی دِل چسپی کا سبب بنے اور اس کے ذہن کو گرفت میں لے لے۔ درسی کتب کی تدوین اور ترتیب کے لیے ایسے اساتذہ اور مُصنّفین کا انتخاب ضروری ہے جو بچّوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوں اور ان کی دِل چسپیوں اور رجحانات کا گہرا مطالعہ کر چکے ہوں۔

بچّوں کے لیے لکھنے کے سلسلے میں مُصنّفین کے مسائل مختلف ہیں۔ ان کو ادبِ اطفال کے سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ ناشرانِ کتب ادیبوں کو کسی خاص موضوع یا ضرورت (نہ کہ بچّوں کی ضروریات) ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں' کہانیاں' مضامین اور نظمیں گھسیٹ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تخلیقی کام کے بجائے وہ کسی نہ کسی شکل میں متقدمین کے مضامین کو ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔

لوک کتھائیں' راجہ رانی کی کہانیاں اور روایتی کہانیاں بچّوں کو ہمیشہ پسند آتی ہیں یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں۔ دُنیا کے ہر ملک اور ہندوستان کے ہر صوبے کی بیشتر لوک کتھائیں کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کہانیوں کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے اور جو کہانیاں ابھی تک قلمبند نہیں کی گئی ہیں انھیں قلمبند کر لیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ انھیں بھلا دیں گے لوک کتھاؤں کی طرح بچّوں کی لوریوں' پہیلیوں اور کھیل کھیل میں گائے جانے والے گیتوں کو بھی کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے کیوں کہ رفتہ رفتہ ان کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔

بچّوں کی دِل چسپی کہانیوں اور گیتوں تک محدود کرنا دُرست نہیں ہے معلوماتی مضامین کی طرف بھی بچّوں کی توجہ دلانی چاہیے۔ معلوماتی کتابوں کے فقدان کے نتیجے میں ہندوستانی بچّوں اور نوجوانوں کی معلوماتِ عامّہ (GENERAL KNOWLDGE) میں ناواقفیت قابلِ افسوس ہے۔ ہمارے یہاں بچّوں کے ادب میں انسائیکلو پیڈیا کی زبردست کمی ہے۔ انگریزی میں "بک آف نالج (BOOK OF KNOWLE-DGE) جیسی کتب عام ہیں۔ آکسفورڈ جونیئر انسائیکلو پیڈیا اس نوع کی مشہور کتاب ہے۔ ہندی میں وشو بھارتی (विश्व भारती) اور سچتر وشو کوش (सचित्र विश्व कोष) قابلِ تعریف کتابیں ہیں۔ اُردو میں ایسی کوئی کتاب نہیں ملتی جو دُنیا کے تمام علوم و فنون کی بنیادی معلومات بچّوں کو فراہم کر سکے۔

بچّوں کو کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اگر ہم بچّوں کی جیبوں اور بستوں کی تلاشی لیں تو ان کا خزانہ دیکھ کر حیرت ہوگی۔ بچّے کیا جمع کریں؟ کیسے جمع کریں؟ اور جمع کی ہوئی چیزوں کو کیسے رکھیں؟ یہ تمام باتیں بچّوں کو سکھانی چاہئیں جن کا تعلق فرصت کے مشغلے سے ہے۔ انگریزی میں کیسے جمع کریں (HOW TO COLLECET) کے عنوان سے مختلف چیزیں جمع کرنے کے لیے نہایت مفید کتابیں دستیاب ہیں۔ انگریزی میں بچّوں کے لیے "کیسے بنائیں" (HOW TO MAKE) کے عنوان سے بھی مختلف چیزیں بنانے کے بارے میں درجنوں کتابیں ہیں' اُردو میں ایسی کتابوں کا قطعی فقدان رہا ہے۔

چینی زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے "ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔" کسی واقعے یا منظر کو بیان کرنے کے لیے ہزار الفاظ درکار ہیں پھر بھی بچّہ سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ جب کہ اس منظر یا واقعے کی تصویر دیکھ کر وہ بآسانی سمجھ جائے گا' سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ بچّوں کو باتصویر کہانیاں بہت پسند آتی ہیں۔ غالباً کامکس کی مقبولیت کا یہی سبب ہے۔

بچّوں کے لکھنے والوں کے سامنے تصاویر کا بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ تصویر موضوع سے متعلق' دلکش اور رنگین ہو۔ اگر چھ سات سال کے بچّے کے لیے کتاب لکھی گئی ہے تو تصاویر کے رنگ شوخ ہوں' تصاویر میں باریکیاں کم ہوں۔ اگر بچّہ نو دس سال یا اس سے زائد کا ہو تو رنگ نسبتاً ہلکے اور باریکیاں زیادہ ہو سکتی ہیں۔

ہندوستان میں مُصنّف اور مصوّر یا دو تین مُصنّفین کے مل کر کتاب لکھنے کا رواج بہت کم ہے جب کہ بچّوں کے لیے اچھی کتاب لکھنا دراصل جماعتی کام ہے۔ اگر کئی اشخاص مل کر اپنی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں تو یقیناً ہر لحاظ سے معیاری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

ہر چند کہ براہِ راست نصیحت اور اخلاقی تعلیم دینے والی کتابیں بچّوں میں کم مقبول ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ بچّوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنا بہت نازک

اور مشکل کام ہے۔ ادیب میں تخلیقی اور تخیلی صلاحیت ہونا چاہیے۔ زبان میں اثر ہونا چاہیے۔ معمولی لکھنے والے اخلاقی کہانیوں کو پیچیدہ اور خشک بنا دیتے ہیں۔

بچّوں کے ادب سے متعلّق اور بچّوں کے لیے ہندوستان کی ہر زبان میں اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی مکمّل کتابیات تیار کرنا ضروری ہے۔ ایسی کتابوں کی بھی اشد ضرورت ہے جن میں بچّوں کے ادیبوں کی سوانح حیات، ان کے ادبی کارنامے، تصنیفات اور خدمات کا جائزہ لیا گیا ہو۔

بچّے میں خود پڑھنے کی عادت ڈالنے اور کتابوں کا انتخاب کرنے میں لائبریری بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ بچّے کو مختلف موضوعات اور عنوانات پر بھرپور مواد لائبریری میں مل جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوقِ مطالعہ کے لیے جماعت کا کمرہ نہیں بلکہ لائبریری زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ بچّوں کے لیے اچھی لائبریری بے حد ضروری ہے۔ اچھی لائبریری اچھی کتابوں سے ہی بنتی ہے۔ اچھے رسائل، اخبارات اور کتب کے انتخاب سے بچّوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ لائبریری کے لیے کتب کے انتخاب میں بچّوں کی دل چسپی، ان کے رجحانات، تعلیمی ضروریات اور عمروں کے مدارج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ بچّوں کو لائبریری کا استعمال بتانا چاہیے۔ لائبریری سے کتاب کس طرح لے سکتے ہیں؟ مختلف کتب اور رسائل میں بچّوں کو اپنے درسی مضامین سے متعلّق مواد کس طرح مل سکتا ہے؟ — بچّوں کی لائبریری اور اس کی ترقی کے لیے اجمالاً درجِ ذیل اصولوں کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ہندوستان کی سبھی زبانوں میں ملنے والی بچّوں کی کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور یہ فہرست تمام اسکولوں کی لائبریریوں، اکادمیوں اور ناشرانِ کتب کو بھیجی جائے۔

۲۔ تمام اسکول لائبریریوں میں بچّوں کی کتب کا الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ ہر سال سالانہ بجٹ میں بچّوں کی کتب خریدنے کے لیے مقرّر ہونا چاہیے۔

۳۔ سرکاری اور غیر سرکاری ہر لائبریری میں بچّوں کے لیے توسیعی مراکز (Extention Counter) قائم کیے جائیں نیز چلتی پھرتی لائبریریوں کا رواج بھی عام کیا جائے۔

۴۔ دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں کے بچّوں کے لیے ان کے ماحول سے مناسبت رکھنے والے موضوعات پر کتابیں نہیں ملتیں اس لیے دیہاتی زندگی اور ماحول سے متعلّق کتابوں کی فراہمی ضروری ہے۔

بچّوں کے ادب کو فروغ دینے کے لیے:

۱۔ ادبِ اطفال پر لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دے کر ان کی ہمّت افزائی ضروری ہے۔

۲۔ بچّوں کے ادب پر ادبی مقابلے ہونے چاہئیں۔

۳۔ بچّوں کے ادب کو چھاپنے والے اور ان کتابوں کو قارئین تک پہنچانے والے اداروں کی مالی معاونت کرنا سرکار کا فرض ہے۔ جس سے بچّوں کے لیے صحت مند لٹریچر شائع ہو سکے۔

۴۔ بچّوں کے سالانہ اجلاس اور تعلیمی تقریبوں میں بچّوں کے لیے اچھی کتابوں کی نمائش بہت فائدہ مند ہے۔

۵۔ سرکار کی طرف سے بچّوں کے ادب پر سیمینار اور نمائش وقتاً فوقتاً ہونی چاہیے۔

۶۔ محکمۂ تعلیم کے مختلف شعبوں میں بچّوں کے ادب پر کتابیں ہونا ضروری ہیں۔

ہم طرح اشعار

پچھلے ماہ ہم طرح اشعار کے لیے مومن خاں مومن کا مصرعہ دیا گیا تھا۔ مومن کی یہ غزل بہت مشہور ہے اور اس کے اکثر شعر زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اکثر قارئین نے اسی غزل کے شعر بھیج دینے پر اکتفا کی اور اس زمین میں دوسرے شعرا کی جو غزلیں ہیں ان تک رسائی کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ کی طرح بہت سے قارئین نے ایسے شعر بھی بھیجے جو کسی دوسری زمین میں تھے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ناموزوں شعر بھی کثیر تعداد میں آئے۔

موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ایک انعام پانچویں نمبر پر درج شعر پر دیا جا رہا ہے۔ یہ شعر پانچ قارئین کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ قرعہ اندازی میں محترمہ نجمہ شاہین ترانہ کا نام آیا۔ ایک اور انعام سترہ نمبر پر درج شعر پر دیا جائے گا اور تیسرا انعام ۲۳ نمبر پر درج شعر کو۔ یہ شعر تین حضرات نے ارسال کیا تھا۔ انعام کا تحسین الزماں صاحب کے نام نکلا۔

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، محمد کامران خاں (بھاگلپور)، اقبال پروین ریشما (جبار چک)، محمد رضا کاروی (علی گڑھ یونیورسٹی)۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: سکندر اعظمی (اعظم گڑھ)، اسحاق عظیم (شاہ آباد)، بیگم شمع رفیع (کیشہار)، شازیہ فردوس (بریاتو رانچی)، منصور ساجد (گریدیہہ)، عشرت بانو نسرین (جبار چک)، ممتاز علی (بھاگلپور)، گلستاں افروز (جبار چک)، ودیا سکینہ (کانپور)، سید شہزاد شاہی (اورنگ آباد)، فرحت ولدنی (بھاگلپور)، منصور بھائی سلیمان جی (برہان پور)، انور جاوید (سہسرام)، رتن لعل گپتا (صاحب گنج)، محمد انور (بانسواڑہ)، محمد آفتاب اختر (جبار چک)، ع ج عثمانی (علی گڑھ یونیورسٹی)، مرزا عبدالباقی بیگ (مظفر پور)، تابش اقبال (اورنگ آباد)، سہیل اختر آسی (مظفر پور)، وقار عثمانی (دھنباد)۔

حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: عز الشاہین افسانہ (بریاتو۔ رانچی)، محمد رضی الدین معظم (حیدر آباد)، محمد علی آصف علی (برہانپور)، محمد برہان خاں (بھاگلپور)، بیگم نکہت واحد (صاحب گنج)، محمد ارشاد عالم شہزاد (جبار چک)، محمد ضیاء الحق ضیا (صاحب گنج)، نسرین بانو نسرین (جبار چک)، جھلمل بھاگلپوری (جبار چک)، علی شیر اختر (جبار چک)، تسلیم اللہ خاں غوری (بدایوں)، نازنین ہلکی (علی گڑھ یونیورسٹی)، کماری نیلم چودھری (صاحب گنج)۔

تم ہمارے کس طرح نہ ہوتے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: محمد فرقان خاں (بھاگلپور)، عبدالمجید زخمی (اورنگ آباد)، میر شفقت علی وفا (فیروز آباد)، صبا ناز (صاحب گنج)، عفت شاہین ناہید (جبار چک)، ادریس صابری (شاہ آباد)، محمد نہال اختر عزیزی (علی گڑھ یونیورسٹی)، روبی یاسمین (سہسرام)، محمد شکیل الرحمٰن (بھاگلپور)۔

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: نجمہ شاہین ترانہ، معرفت حسن امام پرویز، جبار چک (بھاگلپور۔۲)، محمد اعجاز الحق ڈالو (جبار چک)، راحلہ شبنم (بریاتو رانچی)، محمد بلال اختر شانو (جبار چک)، محمد راشد خان (بھاگلپور)۔

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، مہتاب اختر (جبار چک)، راز عفت ہمراز (جبار چک)، محمد سامران خان (بھاگلپور)۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: اسلم وارثی (بھاگلپور)، محمد اسلم پرویز محسن (بریاتو۔ رانچی)، علی شیر اختر (جبار چک)، بے بی پروین نوشاد (جبار چک)۔

کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: چاند نسرین شاداب (بھاگلپور)، لبنیٰ شاہین (صاحب گنج)۔

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: فضل امام فاروقی (لوہر دگا)، محمد نثار الحق (جبار چک)، محمد عمران خاں (بھاگلپور)۔

یاس سو سو طرح ستاتی ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: لائبریرین، انٹرنیشنل لائبریری، جبار چک

اس نے کیا جانے کیا کیا ہے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: محمد شاہد خان (بھاگلپور)، دلیمہ خاتون (جبار چک)۔

کیوں سُنے عرضِ مضطرب، مومن
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا (مومن)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا (صاحب گنج)، محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)۔

اِک ادا، اِک حجاب، اِک شوخی
نیچی نظروں میں کیا نہیں ہوتا (اصغر گونڈوی)

مرسلہ: محمد تقی الدین اشرق، حیدرآباد

عشق جب تک نہ کر چکے رسوا
آدمی کام کا نہیں ہوتا (جگر)

مرسلہ: وجے کمار (پٹنہ)، جمشید پرویز (پٹنہ)۔

دل ہمارا ہے، یا تمھارا ہے
ہم سے یہ فیصلہ نہیں ہوتا (جگر)

مرسلہ: راشدہ رُخسانہ، بھلائی نگر

جس پہ تیری نظر نہیں ہوتی
اس کی جانب خُدا نہیں ہوتا (جگر)

مرسلہ: محمد فضل اللہ ضیائی، کانپور

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا (جگر)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محلہ بھیکن پور، بھاگلپور

نہ ہو گر آشنا نہیں ہوتا
بُت کسی کا خُدا نہیں ہوتا (سیماب اکبرآبادی)

مرسلہ: عزیزہ فاطمہ، بڑودہ

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا
ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا (نواب محمد علی خاں رشکی)

مرسلہ: محمد سلیم الرحمٰن، ناگپور

ہم وہ گم کردہ راہ ہیں کہ کبھی رشکی
خضر بھی رہنما نہیں ہوتا (رشکی)

مرسلہ: زیبا انجم، [illegible]

ایک رشکی! ہمیں نہیں ہوتے
ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا (رشکی)

مرسلہ: محمد نعیم الرحمٰن، ناگپور

دل نے کچھ اس سے کہہ دیا ہوگا
بے سبب وہ خفا نہیں ہوتا (بیخود دہلوی)

مرسلہ: عذرا بانو، گورکھپور

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا (بشیر بدر)

مرسلہ: تحسین الزماں خاں، معرفت ظہیر حسن خاں ایڈوکیٹ، اُردو محل، اورنگ آباد (بہار)، امتیاز احمد صدیقی (علیگڑھ)، آصف نواز منٹو (سہسرام)۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا (بشیر بدر)

مرسلہ: جاوید حسن ٹیکاری (گیا)، سید اشہد کریم اُلفت (رفیع گنج)۔

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا (بشیر بدر)

مرسلہ: ایچ۔ اے خسرو، مدھوبنی

تو ہی کہہ دینا حالِ دل قاصد
مجھ سے تو کچھ ادا نہیں ہوتا (نواب رامپوری)

مرسلہ: محمد فصاحت کوثر، سنبھل

راہبر یاد اُن کی بنتی ہے
جب کوئی رہنما نہیں ہوتا (وکل بدایونی)

مرسلہ: سنیل رستوگی، بدایوں

آج وہ دَور وہ زمانہ ہے
آشنا آشنا نہیں ہوتا (وکل بدایونی)

مرسلہ: راگنی رستوگی، بدایوں

قتل و غارت گری و فسق و فجور
آج دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
(جمیل کاظمی الجنیدی)

مرسلہ: [illegible]

بات جس کی ہے سامنے کہہ دے
آدمی وہ بُرا نہیں ہوتا
(شاد حسین آبادی)

مرسلہ: رحمت رضا، پٹنہ

یار سے تو جُدائی ممکن ہے
پیار دل سے جُدا نہیں ہوتا (افسر)

مرسلہ: محمد افسر کمال افسر، دربھنگہ

پہلے چُھپ چُھپ کے لوگ ملتے تھے
اب کُھلے عام کیا نہیں ہوتا (نوشاد)

مرسلہ: محمد گوہر عالم، جبار چک

خوب جی بھر کے دیکھ لو افسر
ایسا منظر سدا نہیں ہوتا (افسر)

مرسلہ: انور کمال، مشرقی چمپارن

لوگ ایسے بھی کچھ ہیں دُنیا میں
جن کو خوفِ خُدا نہیں ہوتا
(حبیب انور سہارنپوری)

مرسلہ: تسنیم احمد، سہارنپور

جب بھی ہوتا ہے سامنا اُن کا
ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا
(محسن باعشن حسرت)

مرسلہ: مس نادیہ زبیدی، کلکتہ

منہ برستا ہے آنسوؤں کا مگر
دل کا صحرا ہرا نہیں ہوتا (ہارون سرفراز)

مرسلہ: انصاری شفیق احمد شمس الضحیٰ، مالیگاؤں

اس نے شاید بھلا دیا مجھ کو
زخمِ دل اب ہرا نہیں ہوتا
(رفیع رعنا)

مرسلہ: نکہت افروز، کیٹہار

کیسے کہہ دوں صحیح کو میں غلط
ٹوک دینا بُرا نہیں ہوتا (رہنمائے)

آ نکلتا ہوں تیرے کوچے میں
جب کوئی راستا نہیں ہوتا
(روشن لال روشن بنارسی)
مرسلہ: ایم۔ افسر آرٹسٹ، وارانسی

کون رہبر ہے کون رہزن ہے
یہ جبیں پر لکھا نہیں ہوتا
(محمد نجیب الدین صابر)
مرسلہ: عبدالسلام، سرپور کاغذنگر

بے وفائی کا اس کو دوش نہ دو
خود کوئی بے وفا نہیں ہوتا
(افتخار فہیم)
مرسلہ: افتخار فہیم، ناصر گنج

آئندہ ماہ کے لیے اس مصرعے پر شعرارسال فرمائیں:

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا
(قافیہ: اعتبار، ردیف: کیا)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

مئی ۸۸ء کے "ایوان اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصولہ شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں ترین سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
(جگر)

مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پیہر یموی، پیہر یموئو ہاؤس، گرو نانک نگر، رائے بریلی (یوپی) پن کوڈ نمبر ۲۲۹۰۰۱

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
(اقبال)

مرسلہ: محمد ثناءاللہ، شکیل لوح، نزد مدرسہ جامع العلوم، چندوارا، مظفرپور (۸۴۲۰۰۱)، ایف۔ کے نگری (بشیر گنج)، انور محمد خاں عارف ایم۔ اے (بھوپال)، محمد کوثر اعظم (پٹنہ)، محمد نہال اختر واحد (بھاگلپور)، ...اج اصغر شبنم قیومی (گیا)، جاوید حسن ٹیکاوی (گیا)، محمد مہدی حسن (مدھوبنی)، سید ابرار عالم ابرار (گیا)، مرزا عبدالباقی بیگ (مظفرپور)، محمد سراج الدین افضل (گیا)، محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)۔

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
(اقبال)

عظیم (شاہ...)، نشاط افروز (گیا)، فخرالدین قربان حسن (جبار چک)، منصور ساجد

(گریڈیہہ)۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
(غالب)

مرسلہ: سہیل عارف، بھاگلپور

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریقِ اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم
(میر)

مرسلہ: اسیرالدین شاذ، صاحب گنج

بُت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کریاں جی بہل گیا
(مومن)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروز آباد

شیخ کعبے سے گیا اس تک برہمن دیر سے
ایک تھی دونوں کی منزل پھیر تھا کچھ راہ کا
(امیر مینائی)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا، صاحب گنج

کعبے سے غرض اس کو نہ بُت خانے سے مطلب
عاشق جو ترا ہے، نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا
(نعیر)

مرسلہ: رتن لعل گپتا، صاحب گنج

برہمن یا صنم کہتا ہے زاہد یا صمد یا رب
زباں جس کی ہے جو اُس میں وہ تجھ کو یاد کرتا ہے
(امیر مینائی)

مرسلہ: آصف علی، برہان پور

میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا
(میر)

مرسلہ: محمد احمد، برہان پور

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
(غالب)

مرسلہ: زینت کوثر (بھاگلپور)، بیگم نکہت واحد (صاحب گنج)۔

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
(اقبال)

مرسلہ: نازیہ اختر، جبار چک

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
(اقبال)

مرسلہ: نورالدین حسین بھائی، بیٹر

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
(اقبال)

مرسلہ: سنبل ناز، مُراد آباد

کفر سے ایماں ملا اس ملکِ ہستی میں ہمیں
حق پرستی ہاتھ آئی بُت پرستی میں ہمیں
(بہادر شاہ ظفر)

مرسلہ: شمشاد اختر، چاکند، گیا

سیر آنسوے تماشا ہے طلبگاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا (غالب)

مرسلہ: شکیل ناداں، صاحب گنج

کعبے میں بھی گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
(نواب عنایت اللہ خان تحسین)

مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیاؔ، صاحب گنج

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو (اقبال)

مرسلہ: دلفروز کوثر، پٹنہ

نہ چاند تاروں کی انجمن سے وفا کا پیمان کرکے بیٹھیں
یہ کہہ دو شب کے پجاریوں سے کہ دو گھڑی میں سحر بھی ہوگی
(راجتبیٰ حسین رضوی)

مرسلہ: محمد کلیم انور، گیا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں (انشا)

مرسلہ: فاخرہ شبنم فخری، دھنباد

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں (انشا)

مرسلہ: محمد کاشف رضا رضوی، دھنباد

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے اِسا انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں (انشا)

مرسلہ: محمد راشد منظر (دھنباد) محمد سراج الدین افضل، گیا

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اِک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں (فیض)

مرسلہ: علی شیر اختر، بھاگلپور

خیالِ گردشِ دوراں نہ آسکے گا اِدھر
سجائے بیٹھا ہوں بزم تصوراتِ ابھی (قمر انصاری)

مرسلہ: رفیع احمد اعظمی، بدایوں

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے (اقبال)

مرسلہ: محمد قیصر امام، بھاگلپور

آسماں جلتی زمیں پر نہیں آنے والا
اب یہاں کوئی پیمبر نہیں آنے والا (معراج)

مرسلہ: سید اشہد کریم اُلفت، اورنگ آباد

اِک عمر سے اس دُھن میں کہ اُبھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لیے شمعِ سحری کا (فیض)

مرسلہ: عظمت فراز، پربھنی

مری ایک آنکھ گنگا مری ایک آنکھ جمنا
مرا دل خود ایک سنگم جسے پوجنا ہو آئے (نذیر بنارسی)

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، چاکند

بتوں کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں نورِ خدا
خدا کے دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں (ناسخ)

مرسلہ: شاکر حسین ایم۔ اے، بدایوں

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں (فراق)

مرسلہ: عشرت بانو نسرین، بھاگلپور

یا رب مری نظر سے آخر وہ کیوں نہاں تھا
میں جس کی جستجو میں ہر سو رواں دواں تھا
(شفقت کاظمی)

مرسلہ: تبسم رشید قریشی، نصیر آباد

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں (جلیل)

مرسلہ: جاوید عالم، نصیر آباد

بجھ رہے ہیں چراغِ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے
(سحاب قزلباش)

مرسلہ: شیخ احمد میاں، بمبئی

فتنہ نہیں فساد نہیں شور و شر نہیں
یاں زن نہیں زمین نہیں اور زر نہیں (اکبر الہ آبادی)

مرسلہ: انصاری محمد شاہین، مالیگاؤں

نثری عنوانات

"تلاشِ حق" (آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ)

مرسلہ: مسعود پرویز، وکیل، ۱۵۲، ہوا چکی محلہ، نصیر آباد، راجستھان ۳۰۵۶۰۱

"آباد ویرانے" (نظم، علی سردار جعفری)

مرسلہ: مرزا محمد الحسنی بیگ شاداب، مظفر پور

"گوشۂ عافیت" (ناول، پریم چند)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، بھاگلپور

"خدا کی بستی" (شوکت صدیقی کا ناول)

مرسلہ: محمد طارق صدری، دربھنگا

"متاعِ آخرِ شب" (حفیظ میرٹھی کا شعری مجموعہ)

مرسلہ: بہار عالم، بجنور

"پروازِ خیال" (الیاس سیتاپوری کا ناول)

مرسلہ: عالیہ پروین، گیا

"تلاشِ سحر" (شعری مجموعہ جمال بھارتی)

مرسلہ: ہنس مکھ گمبونوی، بھاگلپور

"صرف ایک سچ" (عظیم اقبال کے افسانے کا عنوان)

مرسلہ: عرشیہ جمیل، بتیا

"مہکتے ویرانے" (مجموعۂ کلام بانو طاہرہ سعید)

مرسلہ: رضیہ سلطانہ، مالیگاؤں

"تلاشِ بہشت" (الیاس سیتاپوری کا ناول)

مرسلہ: راغب مسعود، گیا

"مسرت سے بصیرت تک" (آل احمد سرور کے مضامین کا مجموعہ)

مرسلہ: ارشاد عالم شہزاد، جبار چک

"میرے اندر ایک سمندر" (مجموعۂ کلام پریم وار برٹنی)

مرسلہ: ملک عنبر، مالیگاؤں

گلدستہ پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔ دوسرے نمبر پر درج شعر بہت سے حضرات نے بھیجا تھا، قرعے میں انعام کے لیے محمد ثناء اللہ صاحب کا نام نکلا۔

نئی کتابیں

فیضانِ مصطفیٰؐ (حمد و نعت و منقبت)

شاعر: محمد عثمان عارفؔ نقشبندی
صفحات: ۱۳۲
قیمت: چالیس روپے
ناشر: بیدل اکیڈمی، عارف منزل، بیکانیر (راجستھان)۔

جناب محمد عثمان عارفؔ نقشبندی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ سیاست کے مردِ میداں ہیں اور شعر و ادب کی محفل میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سرگرم سیاست میں آنے سے پہلے وہ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن ان کی سب سے پہلی پہچان غالباً ان کی خدا ترسی اور دینداری ہے۔ ہمارے زمانے کی سیاست میں اخلاق کا کچھ زیادہ دخل نہیں اور عارفؔ صاحب وکالت کی راہ سے ادھر آئے جہاں اخلاق و انسانیت کا گزر اور بھی مشکل ہے۔ ہمارے دور کے شعرا کا جو عمومی شعور ہے اس میں بھی کردار کی پاکیزگی چنداں اہمیت نہیں رکھتی لیکن عارفؔ صاحب ایک کامیاب وکیل اور سیاستداں اور ایک نامور شاعر ہوتے ہوئے بھی ان اخلاقی اور روحانی قدروں کے حامل ہیں جن کے بغیر تہذیب و شائستگی کے لفظ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

عارفؔ صاحب کی دینداری صرف صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے عبارت نہیں وہ باطنی کیفیات کے بھی آدمی ہیں۔ ان کیفیات کا سرچشمہ حبِ رسولؐ اور حبِ اہلِ بیت کا وہ جذبہ ہے جو اُن کی رگ و پے میں ساری ہے اور اولیاے کرام سے ان کی وہ والہانہ عقیدت ہے جو ان کی زندگی کا وظیفہ بن گئی ہے۔ "فیضانِ مصطفیٰؐ" ان کی انھی کیفیات کا شعری اظہار ہے۔ اس کی ابتدا حمدیہ کلام سے ہوئی ہے اور اختتام منقبتی کلام پر۔ درمیان میں سلام اور نعتیں ہیں۔ چونکہ ہر شعر شاعر کے دل سے نکلا ہے اور سچی محبت و عقیدت لیے ہوئے ہے اس لیے قاری کے دل پر بھی اثر کرتا ہے اور اسے اسی پاکیزہ و پُرنور فضا میں لے جاتا ہے جس میں خود شاعر کھویا ہوا ہے۔

"فیضانِ مصطفیٰؐ" اہلِ دل کے لیے بلاشبہ ایک ایمان افروز تحفہ ہے جو ہاتھوں ہاتھ لیا جانا چاہیے۔

—— محمود سعیدی

سوانح حضرت محبوبِ الٰہیؒ

مرتب: اخلاق حسین دہلوی
صفحات: ۲۱۶
قیمت: اٹھارہ روپے
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی۔

اولیاے کرام کی سوانح عمریاں لکھتے ہوئے عام طور پر لوگوں نے وہ احتیاط نہیں برتی جس کی اس باب میں ضرورت تھی۔ کہیں غلوِ عقیدت کی بنا پر اور کہیں تحقیقی مزاج کے فقدان کی وجہ سے ان سوانح عمریوں میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہوگئیں جو سچائی سے دُور ہیں۔ اولیاے کرام کی پاکیزہ زندگیاں ایسا نمونۂ اخلاق ہوا کرتی ہیں جس کی تقلید کرکے ہم جیسے عامی بھی رُوحانی ارتفاع کے مدارج طے کرسکتے ہیں لیکن اکثر سوانح نگار حضرات نے کشف و کرامات کے بیان کو زیادہ اہمیت دی اور جو عملی درس ہمیں ان زندگیوں سے مل سکتا تھا وہ پس پشت جا پڑا۔

زیرِ نظر کتاب اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ جہاں یہ ایک طرف حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے حقیقی واقعات سامنے لاتی ہے وہاں ان تعلیمات سے بھی ہمیں روشناس کراتی ہے جو حضرت نظام الدین اولیا اور چشتیہ سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی قیمتی میراث ہیں۔ ۱۸۰ عنوانات پر منقسم اس کتاب میں حضرت نظام الدین اولیا کے بارے میں ہر وہ بات آپ کو مل جائے گی جسے جاننے کی آپ خواہش کرسکتے ہیں۔ یہی نہیں حضرت کے اہلِ خاندان، اعزہ و اقارب اور آپ کے خلفا اور خاص خاص متوسلین کے معتبر حالات سے بھی آپ باخبر ہو جائیں گے اور درگاہی عمارتوں اور ان کے تاریخی پس منظر سے بھی آپ کو آگاہی ہو جائے گی۔ حضرت کے مصدقہ اوراد و وظائف اور دُعائیں بھی شامل کتاب ہیں جن کی بدولت اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

—— رزاق ارشد

دیوانِ عرشؔ

مرتب: ایم۔ حبیب خاں
صفحات: ۲۵۴
قیمت: چالیس روپے
ملنے کا پتا: انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۲۱۲۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جناب ایم حبیب خاں، ایک باذوق انسان ہیں اور ادب سے انھیں بہت شغف ہے۔ انھوں نے متعدد کتابیں مرتب کی ہیں۔ "دیوانِ عرشؔ" ان کے سلیقۂ تالیف کا تازہ ترین نمونہ ہے۔ یہ میرؔ کے چھوٹے صاحب زادے میر حسن عسکری عرف میر کلو عرشؔ کا دیوان ہے جسے بڑی تحقیقی کاوش کے ساتھ ایم حبیب خاں صاحب نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کا انتساب انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری اور مکاتیب غالب کے ماہر ڈاکٹر خلیق انجم کے نام ہے۔ جب کہ سرورق کی پُشت پر صدر انجمن ترقی اُردو ہند اور ماہر غالبیات جناب مالک رام کی تقریظ ہے، جس کے آخری جملے یہ ہیں:

"اہل اُردو مشہور ادیب و محقق جناب ایم حبیب خاں کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس گنج گم گشتہ کو کھوج کر شائع کر دیا ہے۔ میر کلو عرشؔ اپنے زمانے کے مشہور اُستاد ہیں۔ لکھنؤ میں ان کے دم قدم سے اُردو کو فروغ حاصل ہوا۔ ان کے شاگردوں نے اس زبان کی آبیاری کی اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔"

یہی گنج گم گشتہ "دیوانِ عرشؔ" ہے اور اس کی قدر و قیمت نیز ترتیب و اشاعت کی اہمیت پر جناب مالک رام نے جو پُراثر تبصرہ کر دیا ہے اس پر اضافے کی ضرورت نہیں۔ صرف زیرِ نظر دیوان سے نمونے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن پر ایک مختصر سا تبصرہ کافی ہوگا:

آگیا وحشت میں جو چشم سیہ کا کچھ خیال
بند آنکھیں ہوگئیں چشم غزالاں دیکھ کر

اس گُل کی بُو سے بس کہ معطّر دماغ ہے
آتی ہے بوئے گُل مجھے ہر ایک خار میں

لئے نہ تم جو شدت ابر بہار سے
بجلی گرائی ہم نے دلِ بے قرار سے

یہ اُستادانہ کلام ہے اور لکھنؤ کے مکتب شاعری کی "لفظیت" سے معمور، اس میں دلّی کے میر تقی میرؔ کی "معنویت" کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ بیٹے پر باپ کا سایہ نہیں پڑا اور اس نے اپنی راہ بالکل الگ نکالی۔ کہا جاتا ہے کہ عرشؔ میر کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے جن کے ساتھ میر کی شادی لکھنؤ میں ہوئی اور عرشؔ وہیں پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور بس گئے۔ چنانچہ ان کا کلام لکھنؤ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور ان کی مجبوری کی اہمیت جناب مالک رام کے بقول یہ ہے کہ "ان کے شاگردوں نے اس زبان کی آبیاری کی" جس میں فرزند میر نے شاعری کی۔

حبیب خاں صاحب نے عرشؔ کے کلام کی تالیف کر کے گویا اُردو شاعری کی تاریخ کی ایک گم شدہ کڑی دریافت کی ہے، جو یقیناً ایک علمی کارنامہ ہے اور توقع ہے کہ اہلِ نظر اس کی قدر شناسی کریں گے۔

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، سرورق عُمدہ و اعلیٰ ہے۔

—— (ڈاکٹر) عبدالمغنی

پھل، پھول اور اناج

مصنف: اِندر جیت لال
قیمت: ۲۵/- روپے
ناشر: سلوچنا پرکاشن، ڈی ۱۴۔ گُل مہر پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

اندر جیت لال ہمارے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ اب تک وہ اُردو میں ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، انگریزی میں دو تین اُن پر مستزاد ہیں۔ یہ سب کتابیں ٹکسالی ادب سے باہر اپنا موضوع رکھتے ہوئے بھی اُردو ادب میں خوشگوار اضافہ کہلانے کا حق رکھتی ہیں۔ انھوں نے اب تک جو کچھ پیش کیا ہے وہ بچّوں اور بڑوں دونوں کے لیے ہے اور وہ سب معلوماتی اور سائنسی پہلو رکھتا ہے۔ کہیں انھوں نے بڑوں کے لیے بچّوں پر نفسیاتی اور اخلاقی زاویوں سے نظر ڈالی ہے اور کہیں بچّوں کو قومی رہنماؤں اور اکابرین کے کارناموں سے روشناس کرایا ہے۔ لیکن اُن کے مدِ نظر افادی پہلو برابر رہا ہے۔ وہ بچّوں اور نوخواندہ لوگوں کی آگاہی میں اپنی نگارشات سے متواتر اضافہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا ہے کہ ان کی تصانیف بھی واقعات اور حالات کی کھتونی یا دستاویز بن کر رہ گئی ہوں۔ انھوں نے جب بھی قلم اُٹھایا ہے، خواہ موضوع کچھ بھی رہا ہو، اُن کی تحریر میں ادبی رچاؤ پایا

گیا ہے۔

اُن کی کتاب 'پھل، پھول اور اناج' اُن کے مطمحِ نظر اور طرزِ نگارش کا تازہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ صرف تازہ ہی نہیں بلکہ سہ آتشہ بھی ہے کیونکہ اس میں 'پھلوں کا راجہ۔ آم'، 'پھولوں کی ملکہ گلاب' اور 'اناجوں کے بادشاہ گیہوں' تینوں کو سمو لیا گیا ہے۔

حصۂ اول 'آم' سے متعلق ہے جہاں اس کی تاریخ، غذائیت، اقسام، نام، افادیت سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے، حتیٰ کہ 'مرزا غالب اور آم' اور 'آم سے متعلق ضرب الامثال' کا ذکر بھی نہیں چھوٹا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ 'آم کے آم، گٹھلیوں کے دام' والا معاملہ بھی ہے۔ لہٰذا آخر میں 'آم کی گٹھلی' اور 'دور آمد کے امکانات' پر یہ باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔

حصۂ دوم میں 'گلاب' کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں مصنف نے گلاب کو بادشاہ کے بجائے 'ملکہ' قرار دے دیا ہے جبکہ اُن کے بیان کا آغاز بھی اس شعر سے ہوتا ہے کہ:

سب پھولوں کا راجہ ہے یہ
سب کے من کو بھاتا ہے یہ

اس جملہ معترضہ سے قطع نظر یہاں گلاب کی تاریخ، گل و بلبل، پھول اور کانٹا، گلاب کی باغبانی، عطر کی ایجاد، مشہور باغات کے تذکرے کے علاوہ اور بھی گل کھلائے گئے ہیں۔ اس باب میں نہ شعر و شاعری کی کمی ہے اور نہ ٹھوس معلومات کی۔

حصۂ سوم میں 'گیہوں' ان کا موضوع بنا ہے۔ گیہوں کے پودے کے بیان سے لے کر ہمارے ملک میں گیہوں کی کاشت کی ترقی کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ گیہوں سے متعلق لوک کتھاؤں پر آ گئے ہیں اور گیہوں میں لگنے والی بیماریوں پر آکر رکے ہیں۔

اس طرح اندر جیت لال نے اپنے موضوعات سے متعلق نہ صرف مفید معلومات بہم پہنچائی ہے بلکہ اپنی عبارت میں 'ادبی چاشنی' کا بھی اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے ضرب الامثال، محاورات اور تلمیحات کے علاوہ جا بجا اشعار کی مرصع کاری بھی کی ہے۔

اس کتاب کا 'پیش لفظ' ملک کے مشہور سائنسداں اور سابق ڈائریکٹر جنرل 'انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ' ڈاکٹر بی۔ پی۔ پال کا رہینِ منت ہے۔ کتاب مجلد اور گرد پوش سے آراستہ ہے۔ اسے تصاویر سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ ایسی کتابیں اُردو کے دامن کی وسعت اور افادیت پر دلالت کرتی ہیں۔

—— عبداللہ ولی بخش قادری

فکرِ متین (شعری مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر متین نیازی
صفحات: ۲۱۳
قیمت: چالیس روپے
ناشر: ڈاکٹر متین نیازی ۱۲۴/۱۷، رام نرائن بازار، کانپور ۱

ڈاکٹر متین نیازی کانپور کی ان ادبی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو ادب و زبان کی نصف صدی سے بے لوث اور پُرخلوص خدمت انجام دے رہے ہیں۔ فکرِ متین سے ان کی کہنہ مشقی اور غزل کی روایت سے اکتسابِ فیض کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات کو عوامی اور سماجی مسائل سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔

ان کے اشعار میں زبان و بیان کی شگفتگی، متانت اور رمزیت ہے جس سے ان کا لہجہ الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ انھوں نے اسرارِ کائنات کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر کے اُردو غزل کے کینوس کو وسیع تر کیا ہے۔

'فکرِ متین' ان کی شاعری کا خوبصورت اور خوب سیرت مجموعہ ہے۔ 'فکرِ متین' سے لطفِ سخن ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس مادہ پرستی کے پُر ہنگم دور میں رُوحانی فضیلت اور زندگی کے معتبر قرینے کا درس بھی ملتا ہے۔

مشاہدے کی گہرائی اور فکر کے خلوص نے طویل ریاضتِ فن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر متین صاحب کے دل پذیر کلام کی صورت اختیار کی اور فکرِ متین بن کر ہمارے سامنے ہے اس انتشار اور بے چینی کے دور میں ان کے اشعار تسکینِ رُوح کا کام دیں گے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے قیمت بھی مناسب ہے۔

—— تسکین زیدی

ادبی جائزے

مصنف: ساحل ہمدانی
صفحات: ۱۶۶
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: ساحل ہمدانی، ۱۰۷، پھاٹک دھوبیان، فراشخانہ، دہلی ۶

آزادی کے بعد اُردو تحقیق و تنقید کی رفتار تشویش حد تک تیز ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد آنے والے بیشتر محققوں میں شاید ہی ایسا کوئی محقق ہو جس کے ہاتھوں تحقیقی اصول کی پامالی عمل میں نہ آئی ہو، اسی طرح اس نسل کے ناقدوں میں بیشتر کے یہاں مغربی تنقید کے مسخ شدہ حوالے، اُلٹے سیدھے تراجم، مفروضے اور انھیں صحیح ثابت کرنے کے لیے تراشی گئی تاویلوں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ آج

(بقیہ: صفحہ ۵۴ پر)

اُردو خبر نامہ

سہ روزہ کُل ہند اُردو کانفرنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ مارچ کو اُردو گھر نئی دہلی میں ایک سہ روزہ اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تقریباً ایک سو چالیس مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۲۵ مارچ کی شام ۶ بجے منعقد ہوا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیرِ اطلاعات ونشریات جناب ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت نے کہا کہ پچھلے چالیس سال میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اُردو کی ترقی و فروغ کے لیے خاصا کام کیا ہے لیکن ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ اگر آپ اُردو کے سلسلے میں وزیرِ اعظم سے کچھ مطالبے کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں آپ کا جو وفد وزیرِ اعظم سے ملے گا میں بھی اس میں شامل رہوں گا جلسے کے مہمانِ خصوصی مظفر حسین برنی صاحب نے فرمایا کہ "ہندی اور اُردو دونوں سگی بہنیں ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ دونوں زبانیں ترقی کریں"۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس موقعے پر اُردو کے تمام مسائل پیش کیے اور بتایا کہ انجمن کو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ انھوں نے ان کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا جو انجمن ترقی اُردو (ہند) ان مسائل کو حل کرنے کے لیے پچھلے چالیس سال سے کر رہی ہے۔ انجمن کے سابق صدر مالک رام صاحب نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور اسے وہ حق نہیں مل رہا ہے جو اُسے ملنا چاہیے۔ اُردو کا چلن پہلے کے مقابلے میں کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اُردو والے خود بھی اس صورتِ حال کے ذمّے دار ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ لوگ جو اُردو کے بڑے ادیب اور شاعر ہیں اپنے بچّوں کو اُردو نہیں پڑھاتے۔ اگر تمام اُردو والے اپنے بچّوں کو اُردو پڑھانے لگیں تو ہندوستان میں اُردو پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد

دائیں سے بائیں: جناب مالک رام، جناب سید حامد، جناب ہرکشن لال بھگت، جناب سید مظفر حسین برنی اور جناب شہاب الدین دسنوی
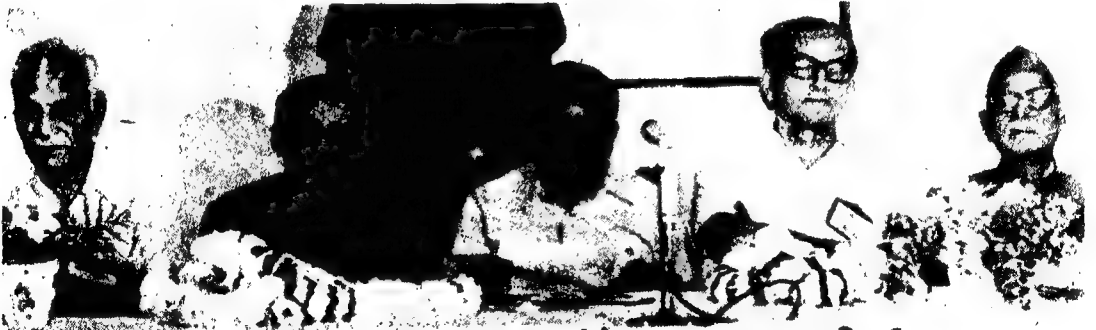
دو تین سال کے اندر اندر چار پانچ گنا ہو جائے گی۔

انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ انجمن نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اُردو تحریک کا کام کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اُردو کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں وزارتِ تعلیم سے مطالبہ کرنا ہوگا کہ نئی تعلیمی پالیسی پر نظرِ ثانی کر کے اُردو تعلیم کی گنجائش پیدا کی جائے۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر سید حامد صاحب نے کہا کہ اس وقت ہمارے سامنے تین کام ہیں۔ انجمن کو اپنے آئینی حقوق کے لیے جدوجہد کرنی ہے۔ ایسے دوستوں اور ہمدردوں کی تلاش کرنی ہے جو اُردو داں تو نہیں ہیں، لیکن حق اور صداقت کی اس جدوجہد میں ہمارے ساتھ ہیں ان میں ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیب اور شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تیسرا اہم کام یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیں اور انفرادی طور پر اُردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کریں۔

استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے فرمایا کہ افسوس ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کے بجائے سنسکرت پڑھائی جا رہی ہے۔ سنسکرت ہماری قابلِ احترام کلاسیکی زبان ہے اسے ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے ضرور پڑھانا چاہیے لیکن اس طرح نہیں کہ اُردو کا حق سنسکرت کو دے دیا جائے۔ کنور صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہمیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ جب بھی کوئی ادارہ قائم کریں تو ہر مذہب کے ادیبوں اور شاعروں کو ساتھ لے کر چلیں تاکہ اُردو کا بنیادی کردار برقرار رہے۔

انجمن کے نائب صدر جناب سید شہاب الدین نے مہمانوں اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایک جمہوری ملک میں ہم جمہوری طریقے استعمال کر کے ہی اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ فرقہ پرست سیاست نے اُردو کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی یہ کانفرنس انھیں دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

۲۶ کی صبح کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کی۔ پروفیسر رضی الدین نے اس اجلاس کی نظامت کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "اُردو اور انتظامیہ" کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ جن علاقوں میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۱۰ فی صد یا اس سے زیادہ ہے، وہاں حکومت کے سارے کام اُردو میں بھی ہونے چاہئیں۔ قدوائی صاحب نے کہا کہ ان علاقوں میں دفتروں میں اُردو درخواستیں قبول کی جانی چاہئیں اور ان درخواستوں کا جواب بھی اُردو میں دینا چاہیے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت مہاویر پرشاد جَین صدر انجمن ترقی اُردو ہریانہ نے کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجام دیے۔ سیدہ شہناز زیدی نے اپنا مقالہ "اُردو کے مختلف مسائل" پڑھا۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اُردو کی تہذیبی اور ثقافتی خوبیاں ایسی ہیں جو کسی دوسری زبان میں نہیں ملتیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ رسم الخط کے مسئلے پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ الیکشن اگلے سال ہونے والا ہے ہمیں ابھی سے دیکھنا ہے کہ ہندی بیلٹ میں اُردو کی مخالفت کیوں ہوتی ہے۔ ہمیں اس کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مہمانِ خصوصی جناب ستیش پال کپور نے کہا اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہمارے قومی کردار کو مضبوط کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔

حیات اللہ انصاری صاحب کا مقالہ "اُردو سرکاری زبان" سری نواس لاہوتی نے پڑھا۔ اس مقالے پر پروفیسر رضی الدین نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کو آزادی کے چالیس سال گزرنے کے بعد بھی ترقی کے مواقع نہ مل سکے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حکومت کو پورے طور پر اُردو کی مشکلات کے بارے میں توجہ دلائیں۔

۲۶ مارچ کے اجلاس کی تیسری نشست سہ پہر ۲ ۱/۲ بجے شروع ہوئی۔ اس کی صدارت جناب حیات اللہ انصاری نے اور نظامت سری نواس لاہوتی صاحب نے کی۔ اُردو اکادمی دہلی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی نے اپنا مقالہ "اُردو تعلیم کے مسائل" اس نشست میں پڑھا۔ نقوی صاحب نے اپنے مقالے میں اُردو تعلیم کے مسائل کی ان گتھیوں کو سلجھانے کی کامیاب کوشش کی، جو آج کل اُردو تعلیم میں سدِّ راہ بنی ہوئی ہیں۔ اس اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ موصوف نے زبان کے مسئلے پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا۔ اور گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں حکومت نے جو بے توجہی اُردو کے ساتھ جاری رکھی ہے اس پر روشنی ڈالی انھوں نے دفعہ ۳۴۷ کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کے چلن کو باقی رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔

۲۶ مارچ کی شام ۶ بجے مشاعرے کی محفل ترتیب دی گئی۔ اس کے شروع حصّے کی صدارت انجمن کے نئے صدر جناب سید حامد نے کی اور آخری حصّے کی صدارت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض جناب ضامن علی خاں مراد آبادی نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں پاکستانی شاعر جناب حمایت علی شاعر

بھی حصہ لیا۔ اور اپنی کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔

۲۷ مارچ کے اجلاسوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ رابطہ اُردو عوام سے قائم کرنا چاہیے اور یہ بھی کہا گیا کہ اُردو اور ہندی کے درمیان کشمکش کی بات کرنا بے بنیاد ہے، اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کی ترقی کے لیے لازم ہے کہ دونوں زبانیں اور ان کے بولنے والے باہم رابطہ قائم رکھیں اور اس لیے ضروری ہے کہ ہندی کے حامیوں سے بھی اُردو والوں کا رابطہ قائم ہو۔

اُردو کی مخالفت زیادہ تر مفاد پرستی یا غلط فہمی پر مبنی ہے، عوام کی اکثریت اُردو کی مخالفت ہرگز نہیں کرتی، بلکہ اُردو کے مشاعروں اور دوسرے جلسوں میں بڑی تعداد اس بات کا ثبوت ہے کہ لوگوں میں اُردو کے لیے خیرسگالی ہے۔

آج کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالمغنیؔ صدر انجمن ترقیِ اُردو بہار نے کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اس اجلاس میں مضمون پڑھتے ہوئے اُردو آبادی کے دستوری حقوق پر روشنی ڈالی۔ اور اس بات پر زور دیا کہ اُردو کو آئینی حیثیت حاصل کرانے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہیے۔

اجلاس کی دوسری نشست میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے "شمالی ہند میں اُردو مسائل" پر مقالہ پڑھتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے مطابق بہار کی طرح دیگر ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں بھی اُردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ آج کا دوسرا اجلاس کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر شبیرالحق کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں بیگم سلطانہ حیات نے اتر پردیش میں اُردو سے متعلق اپنا پرچہ پیش کیا۔

صدر جلسہ شبیر الحق صاحب نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ کوئی بھی زبان ہوا میں ترقی نہیں کرتی، اس کا تعلق ماحول سے ہونا چاہیے۔ اُردو ہمارے ماحول کی زبان ہے۔ مگر اس کی تنظیم کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جا رہی اس لیے اس کا خدشہ رہتا ہے کہ اس کا حلقہ کہیں سمٹ نہ جائے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھے اور اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال عام زندگی میں ہو اور اس کی ذمہ داری اُردو والوں کی ہی ہے۔

فیض احمد فیض بین الاقوامی سیمینار

فیض احمد فیض بین الاقوامی سیمینار لکھنؤ کی اُردو ہندی ادب ایوارڈ کمیٹی کے زیرِ اہتمام رویندرالیہ میں ۲۰، ۲۱ اور ۲۲ مارچ ۱۹۸۸ء کو منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے مشاہیر کے علاوہ پاکستان سے بیگم ایلس فیض، جناب جمیل الدین عالی، پروفیسر ممتاز حسین، کشور ناہید اور فیض احمد فیض کی بڑی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے شرکت کی۔ لندن سے پروفیسر رالف رسل اور افتخار عارف نے حصہ لیا۔ سویت یونین سے پروفیسر سخا چیف، پروفیسر عبداللہ جان غفاروف، ڈاکٹر انا سووو رووا اور ڈاکٹر لامیا وسی لیوا تشریف لائے، نیز سویڈن سے ولید طیر اور رانا ولید طیر اور ڈنمارک سے نصر ملک نے شرکت کی۔ اس سیمینار میں دہلی سے بعض مندوبین کو ڈیلی گیٹ نامزد کر کے دہلی اُردو اکادمی نے تعاون کیا۔

سہ روزہ بین الاقوامی فیض تقریبات کا افتتاح بیگم ایلس فیض کے ہاتھوں ہوا اور جلسے کی صدارت جناب جمیل الدین عالی نے فرمائی۔ بیگم فیض نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ادیب اور شاعر خواہ کسی صنف کا انتخاب کریں، ان کو عوام کے قریب رہنا ہوگا۔ ان عوام کے ساتھ جو اب بھی ایک بہتر اور خوب تر زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی عوام کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے فیض کی خدمات کو تسلیم کیا۔

اس موقعے پر کانگریس کے جنرل سکریٹری جناب غلام نبی آزاد نے بطور مہمان خصوصی فیض کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ہم لوگوں کو معلوم ہے کہ فیض کی شادی کشمیر میں ہوئی تھی اور ان کا نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا تھا۔ سویت روس کے دانشور پروفیسر سخا چیف نے بتایا کہ روس میں فیض کا استقبال ایسے ہوتا تھا جیسے کسی گھر کے آدمی کا ہوتا ہے۔

صدر جلسہ جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ فیض ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو زندگی ہی میں لیجنڈ بن گئے۔ فیض کو فیض بنانے میں ان کی اہلیہ کا خاص رول رہا ہے جنھوں نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر اور ریاستی وزیر پارلیمانی امور ڈاکٹر عمار رضوی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ انھوں نے فیض سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب آخری بار وہ یہاں آئے تھے تو میں نے ان کو اپنے گھر مدعو کیا تھا جہاں متعدد افسران کی بیگمات نے ان ہی کا کلام سنا کر انھیں دنگ کر دیا تھا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس بین الاقوامی سیمینار کو منفرد نوعیت کا سیمینار

قرار دیا اور کہا کہ آج کے دَور میں جب فرقہ وارانہ، علاقائی اور لسانی عصبیت اور دوسرے خطرناک رجحانات سر اٹھا رہے ہیں، اس سیمینار کے انعقاد کی بڑی اہمیت ہے۔ فیض کی شاعری محبت اور انسانیت کی آواز ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ سامراجیت بہت سے ملکوں سے رخصت ہو چکی ہے لیکن استحصال اب بھی جاری ہے، صرف ہتھکنڈے بدل گئے ہیں۔ فیض ہمیشہ حریت اور آزادی کے نقیب رہے، لیکن انھوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی رچاؤ کو یا جمالیاتی رچاؤ پر انقلابی آہنگ کو قربان نہیں کیا بلکہ ایک نئی شعری وحدت کی تخلیق کی جس میں سیاسی آہنگ اور جمالیاتی کیفیت دونوں کی اہمیت ہے اور یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ فیض کی شاعری میں ایسی دل آسائی، دردمندی، نرمی اور شبنمی لمس ہے جیسے دکھتے ہوئے دل پر کسی نے پیار سے ہاتھ رکھ دیا ہو۔

افتتاحی اجلاس کے بعد بزم مقالات کے اجلاس تین دن جاری رہے۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر نصرت چودھری نے جنھوں نے فیض کی شاعری پر پی ایچ ڈی کی ہے، فیض کی شعری انفرادیت پر مقالہ پڑھا، اسی کی تائید میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے روس سے آئی ہوئی اسکالر ڈاکٹر لدمیلا وسی لیوا نے کہا کہ جو لوگ صحتِ زبان کے اعتراضات اٹھاتے ہیں، ان کو اندازہ نہیں کہ فیض کی سیاسی فکر اپنا الگ اظہاری پیکر رکھتی ہے جس کو سمجھنے سے ایسے معترضین معذور ہیں۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے فیض کے تنقیدی رویے پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کا عنوان تھا "فیض کی شناخت" ان کا کہنا تھا کہ فیض نے جہاں شعری تجربے کو اپنے داخلی وجود کا حصہ بنا لیا ہے وہاں کامیاب ہوتے ہیں، ورنہ نہیں، پروفیسر سنہا چیف نے "مطالعۂ فیض سوویت یونین میں" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور بتایا کہ مریم سلگانک کے کیے ہوئے فیض کے تراجم کی بدولت کا نام روس میں گھر گھر جانا جاتا ہے۔

دوسرا اجلاس ۲۱ مارچ کو صبح منعقد ہوا۔ عزیز قیسی نے اپنے مقالے میں سوال اٹھایا کہ فیض کی شاعرانہ عظمت کے عناصر کیا ہیں اور اس کا جواب سامعین پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا مقبولیت کو عظمت کی بنیاد سمجھنا غلط ہے۔ نیز گائکی میں چلن کو ماس میڈیا کی دین سمجھنا چاہیے، بہت سے دیگر شعرا بھی گائے جاتے ہیں لیکن وہ عظیم نہیں۔ اسی طرح قید و بند اور حبس و زنداں بھی شعری عظمت کے لازمی اجزا نہیں۔ ان کے مقالے پر خاص گرما گرمی ہوئی۔ مجروح سلطانپوری نے شکوہ کیا کہ جس طرح ہم ہندوستانی پاکستانی ادیبوں کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کے جشن مناتے ہیں، اس کے مقابلے میں پاکستانیوں نے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو ایک غیر صحت مند رجحان ہے۔ کیفی اعظمی اور ان کی بیگم نے اس اعتراض سے اختلاف کیا۔ پاکستانی ادیبوں بالخصوص جمیل الدین عالی اور کشور ناہید نے اس بات کی شدت کے ساتھ تردید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں ہندوستانی ادیبوں پر خاص نمبر نکالے جاتے ہیں، ان کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں، اور زیادہ تر رسالوں میں ہندوستانی ادیبوں کی تخلیقات نمایاں طور پر شامل رہتی ہیں۔ دوسرا مقالہ جناب فضیل جعفری نے "فیض کی سیاسی شاعری" پر پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ سیاسی شاعری بھی اعلیٰ شاعری ہو سکتی ہے۔ انھوں نے فیض کی کامیاب سیاسی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی جمالیاتی کیفیت اور غنائیت پر زور دیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے "فیض کی غزل گوئی" پر اپنے مقالے میں کہا کہ فیض نے ہمیشہ ماحول سے متاثر ہو کر غزل کہی۔ ان کی شاعری سیاسی شاعری نہیں ہے۔ پروفیسر عبداللہ جان غفاروف نے تاجکستان کے شاعر مرزا ترسون زادہ اور فیض کی شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیا، اور فیض کے تراجم تاجکی فارسی میں پڑھ کر سنائے۔

تیسرے اجلاس میں روسی اسکالر لدمیلا وسی لیوا نے فیض کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین فیض کی پیکر تراشی میں رات کے مناظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن فیض درحقیقت صبح کے شاعر ہیں۔ رات کا ذکر وہ صبح کی معنویت کو ابھارنے کے لیے کرتے ہیں۔ فیض اصلاً سحر آمید کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں رجائیت خاص طور سے نمایاں ہے۔ ڈاکٹر قاضی عبید الرحمان ہاشمی نے "فیض کی عشقیہ شاعری" پر مقالہ پڑھا اور تجزیاتی طور پر ثابت کیا کہ فیض کے یہاں عشق نہایت پر قوت اور متحرک جذبہ ہے جو اپنی تبدیل شدہ شکلوں کے ساتھ ہر عہد کی شاعری میں ان کے ہمرکاب رہا ہے۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی نے "فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو" مسائل حیات کے عرفان کو قرار دیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر "فیض کی غزل" پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے فیض کی غزل کو کلاسیکی شاعری کی توسیع کہا اور ان لفظیات کو فرسودہ قرار دیا گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہی بات فیض کے حق میں جاتی ہے پرانی لفظیات سے انھوں نے نیا جادو جگایا نئی لفظیات اپنی اہمیت رکھتی ہے لیکن لفظیات کی کایا پلٹ کر دینا بہت بڑا تخلیقی

ہے۔ پروفیسر قاضی عبدالستار نے فیض کی شاعری کے ردو قبول کے مراحل پر نظر ڈالی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فیض سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جس وقت فیض پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے، جگن ناتھ آزاد اخباروں کے دفتر میں خبر رسانی کا کام کرتے تھے۔ فیض اپنے چھوٹوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اس نشست کا آخری مقالہ پروفیسر ممتاز حسین کا تھا جنھوں نے "فیض کی شاعری میں تغزلانہ عناصر" کا تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ فیض کو محض سیاسی شاعر کہنا مناسب نہیں، وہ ایک جدید شاعر بھی تھے اور جدیدیت کے بہت سے عناصر ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔

آخری نشست میں ڈاکٹر انیس اشفاق نے "کلام فیض میں صبا کی علامت" پر مقالہ پڑھا اور فیض کی غزل میں ان مختلف مفاہیم کی نشاندہی کی جن کے لیے فیض نے صبا کی علامت استعمال کی ہے۔ ڈاکٹر اناسو دو روانے "فیض کی شاعری میں بے گھری کا موضوع" پر مقالہ پڑھا اور بتایا کہ فیض کے یہاں یہ کیفیت کن معنوی کیفیات کے ساتھ حاوی رہتی ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے "فیض کی شعری حیات اور تعین قدر کا مسئلہ" پر اظہار خیال کیا۔ اور بتایا کہ تعین قدر کے لیے زمانی بعد ضروری ہے۔ کشور ناہید صاحبہ نے فیض احمد فیض، لنگسٹن ہیوز، پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی جسیہ شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور بتایا کہ فیض کے امتیازی شعری نشانات کیا ہیں۔ آخری نشست کا ایک دل چسپ مقالہ پروفیسر رالف رسل نے پیش کیا۔ موضوع تھا "فیض کی شاعری اور انگریزی داں دُنیا"۔ انھوں نے وکٹر کیرنن اور نومی لیزارڈ کے انگریزی تراجم اور مختلف لوگوں کے تراجم کا جائزہ لیا اور تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ وکٹر کیرنن کے تراجم نسبتاً بہتر ہیں اور اصل کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان پر کہ فیض صف اوّل کے شاعر ہیں کہ نہیں، خاصی گرما گرم بحث ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ اُردو میں صرف میر تقی میر اور مرزا غالب صف اوّل کے شاعر ہیں۔ ان کے بعد جناب علی جواد زیدی نے فیض کی شاعری پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ آخر میں پروفیسر شبیہ الحسن نے اس پر مسرت کا اظہار کیا کہ یہ یادگار سیمینار لکھنؤ میں منعقد ہوا کیوں کہ لکھنؤ پر فیض کا حق تھا۔ ڈنمارک سے نصر ملک اسی اجلاس کے دوران لکھنؤ پہنچے اور ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ آخر میں فیض کی بڑی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے فیض کی دو نظمیں رنگین سلائیڈ کے ساتھ پیش کیں۔ "مرے دل مرے مسافر" کی تصاویر میں جن مناظر کو ابھارا گیا تھا وہ بے حد متاثر کن تھے۔ اسی طرح جب فیض کی آواز میں ان کی نظم "دعا" کے الفاظ ہال میں گونجے تو کئی لوگوں کے دل بھر آئے۔ یوں یہ یادگار تاریخی سیمینار فیض کی نظم دعا "آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی" کے ساتھ فیض کی آواز پر اختتام پذیر ہوا۔

اسی شام بیگم حضرت محل پارک میں بیاد فیض ایک عالمی مشاعرہ اتر پردیش اُردو اکادمی کے تعاون سے منعقد ہوا جس کی صدارت مجروح سلطان پوری نے کی اور افتتاح اتر پردیش کے وزیر اطلاعات ویر بہادر سنگھ نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے سوا لاکھ روپے کی گرانٹ کا بھی اعلان کیا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ نے اُردو ہندی ادب ایوارڈ کمیٹی کی طرف سے افتخار عارف (لندن) اور حسن کمال (بمبئی) کو دس دس ہزار روپے کے ادبی ایوارڈ، ٹرافی اور شال بھی پیش کیے۔ بین الاقوامی ادبی خدمات کے لیے سوویت وفد کے لیڈر پروفیسر سخا چیف کو، پاکستان کے سینئر شاعر جناب جمیل الدین عالی کو اور برطانیہ کے اُردو اسکالر پروفیسر رالف رسل کو فیض انٹرنیشنل ایوارڈ پیش کیے گئے جو سند، ٹرافی اور شال پر مشتمل تھے۔ اس یادگار مشاعرے میں بیس پچیس ہزار سامعین نے ساتھ سے بھی زائد شعرا کا کلام سُنا اور جی بھر کر داد دی۔

(اطہر نبی، جنرل سکریٹری)

پروفیسر آزاد کو گولڈ میڈل ایوارڈ

علامہ اقبال کی پچاسویں برسی کے موقعے پر ایک ادبی تقریب میں جس کی صدارت اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے صدر جناب ظہیر الدین نے کی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو اقبالیات کے ضمن میں اُن کی خدمات کے اعتراف میں اقبال گولڈ میڈل پیش کیا گیا۔ تقریب میں ریاست بھر کے اُردو، ہندی اور تیلگو ادیب اور شعرا موجود تھے۔

"دل کی گیتا" کا تحقیقی ایڈیشن

بزم ادب فریدآباد نے خواجہ دل محمد کی کتاب "دل کی گیتا" کا تحقیقی ایڈیشن تیار کرا کے شائع کیا ہے۔ "دل کی گیتا" شریمد بھگوت گیتا کا وہ منظوم اُردو ترجمہ ہے جسے اپنی اشاعت اوّل ہی سے قبول عام کی سند حاصل رہی ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے اور ناشرین کی بے احتیاطی سے متن میں متعدد اغلاط راہ پاتی

محترمہ سشما سوراج جلسے سے خاطب ہیں

گئیں بزمِ ادب فریدآباد کے ایما پر مخمور سعیدی اور ڈاکٹر جاوید وششٹ نے اشاعت اوّل کے ایک معتبر نسخے کی بنیاد پر یہ نسخہ تیار کیا اور اسے بزمِ ادب نے اہتمام کے ساتھ آفسیٹ پر شائع کیا ہے۔ ۳۰ اپریل کو فریدآباد میں ریاستِ ہریانہ کی خاتون وزیر محترمہ سشما سوراج نے اس کی رسمِ اجرا انجام دی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں ہریانہ اور دہلی کے کئی ممتاز شعرا اور شاعرات نے شرکت کی۔ جلسے اور مشاعرے کے اہتمام میں ہریانہ اُردو اکادمی کا تعاون شامل تھا۔ (اوم پرکاش لاغر، جنرل سکریٹری بزمِ ادب فریدآباد)

سیرت اجمیری کا انتقال

موہن سروپ چڈھا (سیرت اجمیری) ۱۲ اپریل کی شام کو مختصر سی علالت کے بعد اجمیر میں وفات پاگئے۔

سیرت مرحوم زندہ دل، مخلص، دوستدار اور وضع دار انسان تھے۔ مشاعرہ تحت میں اس طرح پڑھتے تھے کہ میدان ان کے ہاتھ رہتا تھا۔ غیر اُردو داں حضرات میں اُردو کا ذوق وشوق پیدا کرنا اور انھیں اُردو پڑھانا یہ خدمت وہ بےلوث طریقے پر انجام دیتے تھے۔ شہر کے بہت سے نوجوان ان سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔ اُردو بہت اچھی اور فارسی کسی قدر جانتے تھے۔ کم از کم ۴۵ سال سے مشقِ سخن کا سلسلہ جاری تھا قدیم رنگ سے جدید رنگ کی طرف آئے تھے اور اس میں اپنا ایک انداز پیدا کرلیا تھا۔ سید فضل المتین صاحب

کی مرتبہ کتاب "اجمیر کے موجودہ اور نمائندہ شاعر" میں ان کا ذکر اور کلام شامل ہے معیاری رسائل میں کلام طبع ہوتا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی کلام سناتے رہتے تھے۔ خدا ان کی رُوح کو شانتی دے۔

بقیہ : نئی کتابیں

سنجیدہ طالبِ علم بھی اُردو تنقید کے نام سے بھاگتا ہے مگر ساحل ہمدانی صاحب کا شمار "ادبی جائزے" کے بعد ان ناقدین میں ہونے لگے گا جنھوں نے تنقید کے نام پر تنقید ہی لکھی ہے خانہ پُری نہیں کی، ساحل صاحب کی تحریر میں شگفتگی، اچھوتا پن اور لفظوں کا تخلیقی استعمال ملتا ہے جو ایک بڑا وصف ہے۔ ساحل صاحب نے اُردو کے ان مقتدر اہلِ قلم حضرات پر قلم اُٹھایا ہے جن کی نگارشات اُردو ادب کی تاریخ کا ناقابلِ فسخ حصہ ہیں مگر کساد بازاری کے عادی ہمارے نقادوں کی نظرِ کرم ان پر ہوئی بھی تو برائے نام، یہ ضرور ہے کہ ساحل صاحب کی تحریر میں کہیں کہیں مباحث مختصر معلوم ہوتے ہیں، کہیں کہیں لہجہ کی ناہمواری بھی نمایاں ہے مگر اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان مضامین کے درمیان فصلِ زمانی ہے۔ امید ہے کہ سنجیدہ حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور معمولی قبول نظرِ ثانی کے بعد اشاعتِ ثانی میں نکل جائیں گے۔

——— یعقوب بدر

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اُردو دہلی" (مارچ کا شمارہ) میری نظر سے تاخیر سے گذرا۔ خطوط کے کالم میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لوگوں کو میرا مضمون "من کر" پسند آیا۔ دراصل یہ کہانی صرف میرے اردگرد کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں یہی حال ہے۔ اور اب یہ مسئلہ صرف اُردو زبان کے ساتھ ہی نہیں رہا بلکہ تعلیم کے ہر شعبے میں بے راہ روی آگئی ہے۔

میرے مضمون کی تعریف کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ایک دو حضرات ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ میں نے یہ مضمون کہیں سے چوری کیا ہے۔ چوری کا یہ الزام مجھے پسند آیا کیونکہ پہلے تو میں یہ سوچ کر شرمندہ کہ میرے یہاں ہیں ہی اُردو کے ساتھ یہ مذاق ہو رہا ہے مگر اب معلوم ہوا کہ بمبئی، یوپی، پنجاب ہر جگہ اُردو زبان کو کھلونا بنا دیا گیا ہے جنھوں نے مجھے چور کہا ہے ان سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے بمبئی سے شائع ہونے والے "رنگ" کا نام پہلی بار ہی سُنا ہے۔ اُن کے کہنے کے مطابق میں نے اُسی رسالے سے مضمون نقل کیا ہے۔ ایک دوسرے صاحب کا اعتراض ہے کہ جناب کنہیا لال کپور کے مضمون کو صرف کتابوں کا نام بدل کر میں نے اپنے نام سے شائع کروایا ہے۔ عنوان تک نہیں بدلا۔ جہاں تک عنوان کا تعلق ہے آپ جانتے ہیں کہ میرا عنوان دوسرا تھا۔ آپنے مجھ سے عنوان بدلنے کے لیے اجازت مانگی اور میں نے آپ کو اجازت دے دی۔ اور یہ عنوان "من کر۔۔۔" آپ کا تجویز کردہ ہے۔ لیکن یہ مضمون کی نقل والا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا جناب کنہیا لال کپور نے بھی "رنگ" سے نقل کیا ہے؟ یا کنہیا لال صاحب کے مضمون کی نقل کو "رنگ" میں شائع کروایا گیا ہے؟ کون سا مضمون پہلے شائع ہوا یہ تو یہی دونوں حضرات (جو غالباً ایک ہی آدمی کے دو نام ہیں۔ بلکہ ایک نے تو اپنا نام اتنا مبہم لکھا کہ آپ پڑھ ہی نہ سکے) بتا سکتے ہیں۔

بہرکیف! کوئی خیال کسی خاص شخص کی جاگیر نہیں ہوتا۔ ایک ہی خیال بیک وقت کئی آدمیوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اصل چیز ہے اس کی پیش کش۔ اگر واقعی جناب کنہیا لال کپور کا ایسا کوئی مضمون ہے تو میرا اور ان کا مضمون ایک جگہ رکھ کر دیکھا جائے صاف معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت کیا ہے کسی خیال کے اُبھرنے کا سبب ہوتا ہے تجربہ۔ کنہیا لال کپور صاحب خود بھی پروفیسر اور پرنسپل رہ چکے ہیں۔ جن تجربوں سے میں گزری ہوں انھیں حالات اور واقعات سے ان کا گزرنا کوئی انہونی بات نہیں۔ جن صاحب نے میرے مضمون کے بارے میں مجھ پر نقل یا چوری کا الزام لگایا ہے وہ میرے ہر مضمون کے شائع ہونے کے بعد مختلف فرضی ناموں سے یہ ضرور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرا یہ مضمون پہلے بھی شائع ہو چکا ہے اور وہ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے جو دوسرا مضمون آپ کو بھیجا ہے اس کے شائع ہونے کے بعد اس کے بارے میں بھی یہی کہیں گے۔ وہ اپنا اصلی نام اس لیے نہیں دیتے کہ پھر ان کی پول کھل جائے گی۔ میں تو اس شخص کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتی کہ اس کے بارے میں کوئی بات کروں۔ مگر آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو اس لیے اتنا کچھ لکھنا میں نے ضروری سمجھا۔

— خورشید جہاں، ہزاری باغ

○ "ایوانِ اردو دہلی" (مارچ ۸۸ء) میں پروفیسر عبدالمغنی کا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد کی دانشوری" مولانا آزاد کے کلیات و جزئیات پر ایک اچھے انداز کا مضمون ہے۔ لیکن کچھ جملے غلو پر مبنی ہیں اور کچھ غیر متعلق ہیں۔ مثلاً "۔۔۔۔۔۔ یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن" اس جملے کا مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے دوسری مثال اُردو زبان یا کسی زبان میں ان تفسیروں سے بہتر ترجمانی کلام الٰہی کی نہیں کی گئی ہے۔" یہ جملہ سراسر غلو پر مبنی ہے اور اکابرین علمائے امت کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اور اپنی عدم واقفیت کی تشہیر ہے۔ بایں معنی کہ جو ترجمانی صحیح معنوں میں قرآن کی ہونی چاہیے تھی وہ کسی سے اب تک نہیں ہوئی ۔۔۔ ہم موصوف سے درخواست کریں گے کہ معترضہ جملہ۔۔۔ "یا کسی زبان میں ان تفسیروں سے بہتر ترجمانی کلام الٰہی کی نہیں کی گئی ہے"۔۔۔ کو کسی دوسرے پیرائے میں ادا فرما دیں تو بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن کی تفسیریں جتنی اچھی اچھی عربی زبان میں مثلاً تفسیر ابن کثیر، تفسیر طبری، تفسیر خازن، تفسیر کبیر، تفسیر بیضاوی ابوالسعود، روح البیان، تفسیر کرخی، مدارک، جلالین وغیرہ وغیرہ لکھی جا چکی ہیں ان سے بہتر اُردو میں کسی تفسیر کا لکھا جانا مشکل ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ:

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

پھر اُردو میں بھی ان دونوں سے بہتر تفسیریں موجود ہیں مثلاً تفسیر حقانی اور بیان القرآن وغیرہ ہے۔ یہ تمام باتیں ترجمانی سے متعلق ہیں رہیں، ان بہترین

نثر کی تو یہ زمانے سے تقدم و تاخر سے متعلق ہے بلکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس تحریر کو مولانا آزاد سے نسبت ہو وہ قابل سند ہے۔

مُدیر محترم کی صحافتی دیانتداری سے ہمیں توقع ہے کہ اس خط کو ضرور چھاپ دیں گے!

—— بدرالعریری، مئوناتھ بھنجن

○ میرے اس خط کا سبب ایوانِ اُردو دہلی کے اپریل کے شمارے میں شامل مجروح سلطانپوری کا خط ہے جسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا موصوف اپنے خط میں فرماتے ہیں کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کا شمارہ نمبر دس جو میرے لیے پہلا ہے" اب ظاہر بات ہے کہ جس شخص کا "صرف ڈیڑھ شعر ہی شہرت دلانے کے لیے کافی ہوا ہے"، اُسے مزید کچھ پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حالانکہ علم تو ایک بحرِ زخار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی اپنی آخری عمر تک بے شمار مصروفیتوں کے باوجود مطالعہ کے لیے وقت نکالا کرتے تھے۔ اب کوئی اپنے طور پر یہ سمجھ بیٹھے کہ اُسے تبحرِ علمی حاصل ہو چکا تو یہ ایک الگ بات ہے۔

مجروح صاحب کو اس کی بھی خبر نہیں کہ بیگم صالحہ عابد حسین کا انتقال بھی ہوا؟ اور ہُوا تو کب، پتہ نہیں یہ لوگ کس دُنیا میں رہتے ہیں کہ جہاں ایک اخبار تک میسّر نہیں۔

—— قاصر مجیبی، گیا

○ مجروح سلطانپوری صاحب ادبی دُنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ مگر "آپ کی رائے" میں یہ پڑھ کر اچنبھا ہوا کہ بیگم صالحہ عابد حسین کے اُٹھ جانے کی خبر انھیں "ایوانِ اُردو دہلی" کے اداریہ سے ہوئی۔ جبکہ آل انڈیا ریڈیو نے بر وقت اس خبر کو نشر کیا۔ اور مُلکی اخباروں نے بھی شائع کیا۔

یہ لاتعلقی —— اور وہ بھی مجروح صاحب کی طرف سے کچھ عجیب سی لگی۔

—— محمد شاہجہاں، مونگیر

○ اپریل کے "حرفِ آغاز" میں اُردو غزل کی رسمیت سے متعلق جو تشویش ظاہر کی گئی ہے، وہ بجا ہے۔ اور اس کے افضل ترین یا مہذب ترین شاعری ہونے کے بارے میں بعض حلقوں میں جو خوش عقیدگی پائی جاتی ہے، اس کے گمراہ کُن نتائج برآمد ہونے میں بھی شک نہیں۔ مگر ان کا علاج مختصر ترین نظمیں بھی نہیں ہیں ضرورت بزرگ شاعری کی ہے۔

—— محمد منصور عالم، آرہ

○ جوگیندر پال نے "ایوانِ اُردو دہلی" کا اپریل ۸۸ء کا شمارہ بتلایا اور اپنی کہانی کا تراشہ نکال کر آخرش میرے ساتھ کر دیا کہ میں بھی اس میں لکھوں۔

پیش کش کا انداز، کاغذ، لکھائی چھپائی، مضامین کا تنوع۔ ہر اوٹ سے رسالہ متاثر کرتا ہے۔ صرف دو مضامین پڑھے ہیں اور شہریار کی نظمیں —— کم الفاظ میں بڑی بات کہہ جانے کی ایسی ہُنرمندی جو سیپ میں موتی بن جاتی ہے، شہریار کی پہچان ہے۔

سلیم شہزاد کے مضمون "عصری معنویت کا افسانہ" میں اختلاف کے کئی پہلو نکلتے ہیں —— لیکن ان کی اس بات سے سرِمو اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ؟

"جدید افسانے نے روایتی معیارات سے انحراف کیا ہے۔ انتہا تو یہ کر دی اسے افسانے سے واقعے ہی کو غائب کر دیا، زماں و مکاں کے تصورات کو لایعنی گردانا اور بے ماجرا اور بے کردار ہو رہا۔ لیکن یہ انتہا پسندانہ صورتِ حال مختصر العمر ثابت ہوئی اور جلد ہی افسانے کو واقعے یا کہانی کی طرف مراجعت کرنی پڑی کہ اسی فنی منظر کے بغیر افسانے کا صنفی تصور ہی محال ٹھہرتا ہے۔"

شاہد میر کے مضمون "مہدی حسن اور غزل گائیکی" کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس مضمون سے تشنگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں مہدی حسن کا یہ اعتراف کہ انھیں سیف الدین سیف، قتیل شفائی اور فیض کے کلام سے خاص لگاؤ ہے، اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ صرف گاتے ہی نہیں ہیں شعر پرکھتے بھی ہیں۔ پنکج اُدھاس کا اعتراف مزہ دے گیا۔ کس ڈھنگ سے بات کی ہے۔

—— اقبال متین، پوچمپاد

○ آپ نے خواجہ احمد عباس پر ایسا جامع اور پُرمغز نمبر نکالا جس کی نظیر دورِ جدید میں مشکل سے ہی ملے گی، آئے دن اہم شخصیات پر نمبر نکلتے رہتے ہیں لیکن بہت کم ایسے جرائد ہیں، جنھیں غیر ضخیم ہوتے ہوئے بھی ادبی حلقوں میں یوں سراہا گیا ہو۔ ورنہ زیادہ تر نمبروں کی کامیابی ان کی ضخامت میں ہی مضمر ہوتی ہے۔ اداریہ "حرفِ آغاز" ہر شمارے کی جان ہوتا ہے، جس میں نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں یہ سلسلہ برقرار رکھیے۔

اپریل کے شمارے میں سلیم شہزاد کا مقالہ "عصری معنویت کا افسانہ" کی بعض باتیں سر سے اُوپر گزر گئیں، پیرایۂ بیان —— سادہ و سلیس ہونا چاہیے تاکہ عام قاری کو سمجھنے میں کسی قسم کی دُشواری نہ ہو، البتہ مقالہ لغایت اہمیت کا حامل ہے، ان کا ناقدانہ شعور دیکھ کر ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی اچھے مقالے پڑھنے کو دیں گے!

—— وارث مظہری، سمستی پو

○ "ایوانِ اُردو دہلی" (اپریل ۸۸ء) دیکھنے کا موقع ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو میں ایک اچھ

اور خوبصورت رسالے کا اضافہ ہوا ہے دُعا ہے کہ اللہ اِسے نظرِ بد سے بچائے۔

اس شمارے میں "بحری توانائی" پر جناب ذاکر علی انصاری کا مضمون معلومات افزا تو ہے ہی۔ مگر اُردو سماج۔ آج سائنسی معلومات میں، سائنسی فکر و نظر کا بھی طالب ہے یعنی حقائق کا انکشاف قارئین میں سائنسی فکر پیدا کرے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بعد کوئی ایسی تحریک ہم میں نہیں اُٹھی جو یہ کام انجام دیتی یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا "دیدۂ بیدار" بھی "خوابوں" کا خریدار ہے۔ اُردو کا مزاج آج بھی نثر سے زیادہ شاعری پسند واقع ہوا ہے اُردو کا فنکار ہو یا ناقد ہر جگہ اپنے ہاتھوں میں شعریات کے پیمانے لیے نظر آتا ہے یہاں تک کہ مذہب کو بھی شاعری کا استعارہ بنا دیا گیا ہے۔

اب اسی شمارے میں شائع شدہ جناب منشا یاد کے افسانے "دامِ شنیدن" کو لے لیجیے۔ پورے افسانے پر (ایک ارضی حقیقت پیش کرنے کے لیے) ماورائی کیفیت اور اساطیری فضا کو مسلوط کر دیا گیا ہے۔ داستانوں کی طرف یہ مراجعت حسنِ تعلیل کے لیے کام آئے تو آئے مگر حسنِ فکر و نظر کی ترویج کے کام تو نہیں آسکتی۔

اس شمارے کا گلِ سرسبد تو سلیم شہزاد کا مضمون "عصری معنویت کا افسانہ" ہے چند تجرباتی مثالوں نے تو مضمون کی افادیت کو اور بھی محکم بنا دیا ہے۔ اس مضمون میں، اکثر جگہ، معنویت کے ساتھ، بے معنویت کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ بے معنویت بھی . . . . ایک طرح کی معنویت تو ہے نہیں؟ سلیم شہزاد نے خود ہی "بانسری کی آواز" کا ماقبہ۔ بے معنویت میں معنویت کی تلاش قرار دیا ہے۔ اس سے میرا گمان مجھے بے معنی نظر نہیں آتا۔

—— وہاب تسنیم، نیلور

○ اپریل کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" اس شعر کے حقیقی خالق کا نام جان کر مسرت ہوئی۔ اس کے علاوہ اعجاز اعظمی کی نظم ناسور، گوہر عثمانی اور فاروق شفق صاحبان کی غزلوں نے بیحد متاثر کیا۔ خلیق انجم صاحب کے مضمون دِلّی کے آثارِ قدیمہ کا جواب نہیں۔ گھر بیٹھے دِلّی کی سیر کروا دیتے ہیں۔ خوشونت سنگھ کے افسانے کا اُردو ترجمہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ "ایوانِ اُردو دہلی" کو بہت ٹھوس، معیاری اور معلوماتی مضامین سے سجا کر اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

—— یوسف گوہر شاہجہانپوری، شاہجہانپور

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ (اپریل ۸۸ء) موصول ہوا۔ مجھے خوشی ہے کہ "سرفروشی کی تمنا" کے عنوان سے میں نے جو کچھ تحریر کیا، اُس کی تصدیق ایک اور اہلِ قلم شوکت جمال نے بھی مزید اضافے کے ساتھ مدلّل طور پر کر دی۔ امید ہے کہ اب زیرِ بحث شعر سے متعلق غلط فہمی دُور ہو گئی ہوگی۔

"ایوانِ اُردو دہلی" کے گذشتہ شمارے بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھ چکا ہوں اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہر شمارہ اپنے مخصوص معیار کا حامل ہے۔ اس کی مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ آپ نے ہر طبقے کے قاری کی پسند اور مذاق کا خیال رکھا ہے حسبِ معمول اس دفعہ بھی "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے جو تحریر فرمایا ہے وہ لائقِ غور ہی نہیں، قابلِ عمل بھی ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "مجموعی طور پر ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ غزل کے زوال کا زمانہ تھا" ترقی پسندی کے دَور میں بھی نظم کے ساتھ شعرا غزلیں کہتے رہے اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انھوں نے صنفِ غزل کو نئے خیالات، نئی تشبیہوں، علامتوں اور استعاروں سے آشنا کیا۔ اس طرح تنگنائے غزل میں کچھ اور وسعت کے امکانات پیدا ہوئے۔ جذبی اور مجروح جیسے ترقی پسند شعرا کے ساتھ کچھ اور نام بھی لیے جا سکتے ہیں مثلاً فیض، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، جمیل مظہری، پرویز شاہدی وغیرہ۔ یہ ضرور ہے کہ ترقی پسندی کے نام پر کچھ ایسے حضرات بھی بغلی دروازے سے داخل ہو گئے جنھیں ادب سے خلوص نہ تھا۔ ان نام نہاد ترقی پسند شعرا میں کچھ تو ایسے تھے جنھوں نے اس روش کو محض فیشن کے طور پر اختیار کیا۔ کسی نے سستی شہرت کا وسیلہ بنایا۔ کسی نے اپنے سیاسی عقائد کی تبلیغ کا پلیٹ فارم سمجھا۔ لیکن ان کی منظوم نعرہ بازی زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور وقت کے ساتھ ان کی شاعری بھی مُردہ ہو گئی۔

—— بہزاد فاطمی، پٹنہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" مارچ ۸۸ء کے شمارے میں صـ۵۲ پر ادارتی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ "رام پرشاد بسمل کا شاعر ہونا بھی محقق نہیں"۔ لیکن دو بیانوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ بسمل کی بہن شاستری دیوی نے "روی وار" کے یومِ آزادی نمبر ۱۹۷۸ء میں ہی شائع شدہ مضمون میں بتایا ہے کہ "بسمل کی تعلیم اُردو سے شروع ہوئی تھی اس لیے انھیں شعر و شاعری کا شوق لگ گیا۔ اور آگے چل کر بسمل تخلّص سے کئی راشٹریہ کویتائیں (قومی نظمیں) لکھیں"۔ شاستری دیوی نے اس دلیل کی بنیاد پر اپنے بھائی کو "سرفروشی کی تمنا . . ." کا خالق بتایا ہے جو ظاہر ہے غلط ہے۔

شیلیندر ناتھ بخشی نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ "بسمل کو کویتا اور گیت غزل کا پہلے سے شوق تھا...... ۱۹۲۰ء میں انھوں نے "من کی لہر" عنوان سے گیتوں اور غزلوں کا ایک کتابچہ شائع کیا تھا اور ۱۹۲۱ء کی کانگریس میں اسے بیچنے کی کوشش کی مگر کتابچہ بکا نہیں۔ انھیں آٹھ نو سو روپے کا نقصان بھی ہوا۔

—— جاوید اقبال، رانچی

○ اپریل کے شمارے میں مضامین "عصری معنویت کا افسانہ" اور "حسرت موہانی ایک مرد قلندر" اچھے لگے۔

—— ملک نسیم، سیہور

○ "ایوانِ اُردو دہلی" ایک معیاری رسالہ ہے اور ہندوستان کی تمام اُردو اکادمیوں کے مقابلوں میں سب سے منفرد بھی ہے جس میں علمی، ادبی مضامین کے علاوہ معلوماتی مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ رسالے کی طباعت اور سرورق بھی خوبصورت ہے۔

اپریل ۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" میں شامل جناب نامی انصاری کا مضمون "حسرت موہانی۔ ایک مرد قلندر" نظر سے گزرا۔ عنوان سے وہ پورے طور پر انصاف نہیں کرسکے ہیں۔

حسرت موہانی ایک مرد قلندر تھے اور انھوں نے اپنے اصولوں کے آگے کسی بھی پارٹی یا فرد سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ تمام عمر جدوجہد میں گزار دی اس موضوع سے تعلق سے بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ نامی انصاری صاحب نے اس پر نہایت سرسری انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مذکورہ مضمون میں نامی انصاری صاحب نے مولانا مظہر الحق کے بارے میں جو شعر قلمبند کیا ہے اس کا پہلا مصرعہ درست نہیں ہے۔ کلیاتِ حسرت موہانی میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

—— محمد نعمان خاں، بھوپال

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا مئی کا شمارہ دیکھا حسبِ معمول پسند آیا۔ عابد سہیل اور ریحی نشیط کے مضامین خوب ہیں۔ غزلوں میں اعزاز افضل مصور سبزواری اور ناصر زیدی نے متاثر کیا۔

—— فاروق شفق، کلکتہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا ایک اہم گوشہ اور اس کی انفرادیت کا کالم "دِلّی آثارِ قدیمہ" تھا۔ اگلے پرچے میں خلیق انجم صاحب کے اس کالم کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوگی۔

—— محمد ضیاء الحق ضیا، صاحب گنج

○ میری نظر میں مئی کے شمارے کی خاص چیز زاہدہ زیدی کی تحریر "ایوان ایلچ" تھی۔ لیوٹالسٹائی کا عالمی ادب میں جو مقام ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ تاہم اُردو خواں طبقے کو ایسی باتوں سے آگاہ کرانا ایک مستحسن امر ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا مزاحیہ مضمون "مقالہ نویس" پڑھ کر تو بڑا مزا آیا۔ طنز کا پہلو اس میں نمایاں ہے۔ رضا نقوی واہی کی نظم کی تعریف نہ کرنا بدذوقی سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ غزلیں اُردو ادب کا حسن ہیں، تاہم غزلیں بہت ہوچکیں۔ اُردو شاعری کو غزلوں کا مرہونِ منت بنائے رکھنا سراسر ناانصافی ہے۔ میں کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہتا۔ آپ وہی شائع کریں گے جو شعرا ارسال فرمائیں گے۔ اس شمارے میں دس غزلیں ہیں جبکہ فقط ایک نظم ہے۔ شعرا کو چاہیے کہ شاعری کی ایک صنف کی طرف اس طرح نہ مائل ہوں کہ دوسری اصناف بالکل ترک کردیں۔ آپ وقتاً فوقتاً مختصر ڈرامے بھی شائع کیا کریں۔

—— مرزا محمد الحسنی بیگ شاداب، مظفرپور

○ اُردو اکادمی دہلی کا نقیب "ایوانِ اُردو دہلی" ماہ مئی ۸۸ء مقامی ریلوے بک اسٹال پر نگاہ سے گذرا۔ اُسے فوراً لے آیا۔ مضامین، افسانے، طنز و مزاح، غزلیں، سب اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن دو مستقل عنوان پسند نہیں آئے: "ہم طرح اشعار" اور "شعری اور نثری عنوانات"۔ ان کی جگہ آپ "طرح" دے کر انتخاب شائع کریں تو ایک اچھی اور تعمیری بات ہوگی۔ اور "ایوانِ اُردو دہلی" سے بہت سے شعرا کرام جُڑ جائیں گے۔

عظیم اقبال کی کہانی ناشناس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ وہ بس میں ڈکیتی کی داستان کو Treatment نہیں دے سکے۔ کہانی کوئی تاثر نہیں چھوڑتی۔ سوائے ایک بیان کے جو خامیوں سے بھرپور ہے۔ "خیبے" ایک طاقت ور بیان تھا مگر نہ جانے کیوں مشرف صاحب اسے بیان کرنے میں سُست روی سے کام لیتے رہے۔ شروعات ہی سے اِس نکتے کو ابھارنا چاہیے تھا۔ ۵ کالم تو وہ محض بیان کرنے میں رہے ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر بہتر ہی ہے۔

خلیل رمزی اسنسول کا اعتراض کچھ عجیب لگا۔ آنکھ سیپ کی طرح نہیں ہوتی؟ کان کا مطلب یہاں خزانے سے ہے۔

—— احسان آوارہ، باند

○ مئی کے "ایوانِ اُردو دہلی" میں صفحہ ۵ بہت اچھا سوال اُٹھایا گیا ہے۔ جناب خلیق انجم اس کا مفصل جواب براہ کرم دیں۔ ان کے جواب پر نہ صرف "چھپے" کا بلکہ اُردو اکادمی دہلی کی تمام مطبوعات میں صحتِ املا کا انحصار ہے۔

—— نجم الثاقب شحنہ، بادگ

فون نمبر:
۲۶۳۴۴۸ اور ۲۷۶۲۱۱

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۳ — فی کاپی ۵۰ر ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — جولائی ۱۹۸۸ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

حرفِ آغاز

پچھلے دنوں انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) کی دعوت پر انجمن کے مرکزی دفتر اُردو گھر نئی دِلّی میں اُردو والوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں دِلّی کے علاوہ بیرونِ دِلّی کے متعدّد حضرات نے بھی شرکت کی۔

ہمارا خیال تھا کہ اس جلسے کے لیے انجمن نے اپنے طور پر کچھ تجاویز مرتّب کی ہوں گی جو شرکا کے سامنے رکھی جائیں گی اور ان کی رائے معلوم کی جائے گی لیکن جلسے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے اور یہ جلسہ دوسری اُردو تنظیموں کے نمائندوں کو اُردو کے مسائل پر اظہارِ خیال کا موقع دینے کے لیے بلایا گیا ہے تاکہ اپنا لائحۂ عمل طے کرتے ہوئے اپنے تجربات کے علاوہ انجمن ان کے خیالات کو بھی سامنے رکھے۔

ہم اس جلسے میں شروع سے آخر تک شریک رہے اور سبھی مقرّرین کو سُنا۔ ہمارا تاثّر یہ رہا کہ مقرّرین یا تو وہ باتیں دہراتے رہے جو اس قسم کے موقعوں پر اکثر کہی جاتی رہی ہیں یا پھر اپنی اپنی تنظیموں کی کارگزاری کو کسی قدر مبالغے کے ساتھ بیان کرتے رہے۔

جنابِ آنند نرائن مُلّا اور جنابِ حیات اللہ انصاری نے اس پر بہ طورِ خاص زور دیا کہ ہندی والوں کو اُردو کی طرف سے جو بدگمانیاں ہیں، انھیں دور کیا جانا چاہیے۔

ہماری رائے میں یہ کام دو سطحوں پر انجام دیا جاسکتا ہے: ہندی والوں کو اپنے جلسوں اور محفلوں میں بلا کر اپنا موقف ان کے سامنے رکھا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ ہمارے مطالبات کیا ہیں اور ہم کس قدر حق بجانب ہیں۔ ہندی اور انگریزی کے کثیر الاشاعت اخباروں اور رسالوں میں ایسے مضامین لکھ کر بھی یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جو اُردو کے مسائل اور اُردو والوں کے مطالبات کو حقیقت پسندانہ انداز میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہوں۔

یہ بات بھی کہی گئی کہ اُردو کے مطالبات کو عوامی پشت پناہی حاصل نہیں اس لیے ان مطالبات میں زور پیدا نہیں ہوتا اور حکومت ان کو چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ کہا گیا کہ اُردو عوام جوش و خروش سے خالی نہیں لیکن انھیں اُردو تحریک کی قیادت پر بھروسا نہیں رہا ہے، وہ اس تحریک کے قائدین کو موقع پرست اور غیر مخلص سمجھنے لگے ہیں اور اس لیے ان کی آواز

پر انھوں نے دھیان دینا چھوڑ دیا ہے ــــــ اتفاق سے اس جلسے میں اُردو کے بہت سے عمائدین موجود تھے، انھیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس عوامی بدظنی کے کیا اسباب ہیں اور انھیں کیوں کر دور کیا جاسکتا ہے؟

بعض لوگوں نے یہ تجویز رکھی کہ اب اُردو کے مطالبے کو ایک سیاسی مطالبے کی شکل دے دینی چاہیے اور جو بھی سیاسی جماعت ووٹ مانگنے اُردو والوں کے پاس آئے اس سے یہ واضح یقین دہانی حاصل کی جائے کہ وہ ہمارے مطالبات کی تکمیل میں معاون ہوگی۔ جو جماعت اس یقین دہانی کو پورا نہ کرسکے، آئندہ اُردو والے اسے مُنہ نہ لگائیں۔

آخر میں ایک اہم بات انجمن کے نئے صدر سیّد حامد صاحب نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ــــ سے ہمارے جو مطالبات ہیں، انھیں منوانے کے لیے ہمیں تمام آئینی طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سرکاری سطح پر اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ختم ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں خود اپنی ذمّہ داریوں کو بھی سمجھنا چاہیے۔ آخر اُردو کی تعلیم اور اس کے چلن کو فروغ دینے کے لیے ہم بھی تو کچھ کرسکتے ہیں۔

یہ وہ بات ہے جو ان صفحات پر متعدّد بار عرض کی جاچکی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے بچّوں کو دوسرے مضامین کے ساتھ اُردو نہ پڑھائیں؟ بعض حالات میں کچھ دشواریاں پیش آسکتی ہیں لیکن یہ ایسی نہ ہوں گی کہ دور نہ کی جاسکیں۔ ہم اپنے ماہانہ بجٹ میں سو پچاس روپے اُردو کے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی خرید کے لیے کیوں نہیں رکھتے؟ اپنے مطالعے کی میز پر صرف انگریزی مطبوعات رکھ کر کیوں خوش ہوتے ہیں جو اُردو مطبوعات سے کئی گنی مہنگی ہوتی ہیں؟ اپنی نیم پلیٹوں اور دکانوں اور دفتروں کے سائن بورڈوں پر اُردو کو جگہ دینے سے ہمیں کون روکتا ہے؟ ہم اپنے کاروبار کا حساب اُردو میں رکھیں تو ہم پر کون معترض ہوگا؟ ہم اپنی تقریبوں کے دعوت نامے اُردو میں کیوں نہیں چھپوا سکتے؟ ہم اپنے خطوں کے پتے اُردو میں کیوں نہیں لکھتے؟ کیا اس اندیشے سے کہ پتہ اُردو میں لکھا گیا تو خط منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے گا؟ یہ اندیشہ بے بنیاد ہے۔ ہزاروں لاکھوں خطوں کو محکمۂ ڈاک ضائع نہیں کرسکتا۔ شروع شروع میں یہ ہوگا کہ ایسے خطوں کے پتے محکمہ ہندی یا انگریزی میں منتقل کرائے گا، پھر یہ نوبت آسکتی ہے کہ ڈاک رسانوں کے لیے اُردو جاننے کو ایک اضافی قابلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے نتیجے میں اُردو کی تعلیم اور چلن دونوں کو فروغ حاصل ہوگا۔

انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) اُردو کی قدیم ترین اور معتبر ترین تنظیم ہے، اگر یہ دوسری اُردو تنظیموں کا تعاون حاصل کرکے اُردو تحریک کو آگے بڑھاتی ہے تو یہ اس تحریک کے حق میں یقیناً ایک نیک شگون ہوگا۔

ہم نے اپنے پڑھنے والوں سے "ایوانِ اُردو دہلی" کی ضخامت اور قیمت بڑھانے کے بارے میں مشورہ طلب کیا تھا۔ ہمیں جو خطوط آئے، ان کی روشنی میں سرِدست یہ خیال ترک کر دیا گیا ہے۔

ــــ مخمور سعیدی

ڈاکٹر ذاکر حسین

گا رہے گا رہے یارِ خواں ...

۱۹۵۳ء میں، اُتر پردیش کے اُردو دوستوں نے، ۲۱ لاکھ دستخطوں کے ساتھ اپنے بنیادی مطالبات پر مبنی ایک میمورنڈم اس وقت کے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ یہ میمورنڈم ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں پیش ہوا مگر بے اثر رہا۔ میمورنڈم کی حمایت میں ۲۱ لاکھ دستخطوں کی فراہمی کے بعد ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ میں جو اُردو ورکرز کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں ذاکر صاحب نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا، اس کا ایک ایک لفظ نہ صرف اُردو والوں کے لیے، بلکہ ہندی والوں کے لیے اور ان تمام لوگوں کے لیے بھی جو آزاد ہندوستان میں ایک جمہوری، سیکولر اور مبنی بر انصاف سماج کے خواب دیکھتے آئے ہیں، بلیغ معنویت اور دوررس اہمیت کا حامل ہے۔

اِس خطبۂ صدارت میں پوری دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ جو باتیں کہی گئی ہیں، آج بھی ہماری تمامتر توجہ کی طالب ہیں اور اس قابل ہیں کہ بار بار ذہنوں میں تازہ کی جائیں:

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

——— ادارہ

دوستو! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ اس کانفرنس میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جو کام آپ نے ڈیڑھ سال سے کچھ اُوپر ہوا، اپنے ذمّے لیا تھا۔ اس کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہیں اسی ہال میں ۲۳، دسمبر ۱۹۵۱ء کو اُردو علاقائی زبان کنونشن کے نمائندہ اجلاس میں، یہ فیصلہ ہوا تھا کہ بیس لاکھ اُردو دوستوں کے دستخط حاصل کر کے دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے ماتحت اتر پردیش میں اُردو کی جائز حیثیت کو تسلیم کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت ۲۱ لاکھ دستخط ہمارے پاس موجود ہیں۔ اتّر پردیش کے شہر شہر، قصبہ قصبہ، تحصیل تحصیل کوئی ۵۰۰ مرکزوں میں، ۴۵۰۰ سے اُوپر رضاکاروں نے ہر مذہب و ملّت کے اُردو بولنے والوں سے اس محضر پر ۲۱ لاکھ دستخط حاصل کیے ہیں جلسوں جلوسوں کے بغیر، بے شور وشغب، سیاسی سورش کے رائج الوقت اسلوب سے، اور اپنی بات منوانے کے ڈھنگ سے بہت الگ انداز میں، خاموشی اور متانت سے یہ پھیلا ہوا کام انجام کو پہنچایا گیا ہے۔ میں کام کرنے والوں کو اس پر مخلصانہ مبارک باد دیتا ہوں اور مجھے سچّی خوشی ہے کہ یہ کام اس طرح ہوا کہ جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ کام کے انداز میں مجھے کام کی اصلی روح کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس میں اپنے مطالبے کی سچائی پر بھروسہ دکھائی دیتا ہے، اس میں ہندوستانی سماج کی معقولیت پر اعتماد دکھائی دیتا ہے۔ باوجود ظاہری اسباب مایوسی کے اعتماد:

دلم بکوئے تو باصد ہزار نومیدی
بر ایں خوش است کہ امیدواری گذرد

اس میں مجھے وہ نقشہ دکھائی دیتا ہے جو کہیں شعوری، کہیں نیم شعوری طور پر، کام کرنے والوں کے سامنے اپنے دیس اور اس کے مستقبل کا ہے، اس جمہوری سماج کا نقشہ، اس کی اس جمہوری ریاست کا نقشہ، جس کی بنیاد عدل اور انصاف پر ہوتی ہے، جس کے ذمّہ داروں کو ایک لگن ہوتی ہے کہ اس کی یہ بنیاد دن پر پکّی اور مضبوط ہوتی جائے۔ جس کی اخلاقی ان کے نزدیک اس کی ساری دوسری ترقّی او کا پیمانہ ہوتی ہے، جو برابر اس کے لیے جتن کرتی ہے کہ اپنے شہریوں کی کوشش سے، اپنے قا سے، اپنے عملداروں کے کردار سے، اس میں ہر طبقہ، بلکہ ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی ترقّی کا راستہ روز بروز سہل سے اور سہل جائے۔ مجھے اس میں ایک ملی جُلی گنگا جمنی تہ تمدّن کا نقشہ دکھائی دیتا ہے، جس سے ہما زندگی عبارت ہے، اس چمن کا نقشہ جہاں ہر من بہار کا اثبات ہوتا ہے، جہاں "لالہ و گل نسرین" کے جدا جدا رنگ پر لوگ چڑتے نہیں ہوتے ہیں، جہاں کثرت میں وحدت تلاش کر کی خو عام ہے، جہاں کُل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں مانتا، اس کی تقویت کو اپنی مضبوطی ج ہے۔ مجھے اس میں لاکھوں شہریوں کا یہ یقین دکھائی دیتا ہے کہ ہماری ریاست کی نیو اخلاق اور انصاف پر ہے اور اس نیو کو مضبوط بنا کا فرض ہے، اس لیے کہ نہ تو اخلاقی انفرادی شخ ایک دم بنی بنائی، ترشی ترشائی، ہاتھ آتی۔ نہ اخلاقی ریاست۔ یہ دونوں برابر بنتی رہتی بگڑتی بھی رہتی ہیں۔ قدم آگے بھی بڑھتا۔

کبھی کبھی پیچھے بھی ہٹتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ ریاست جس کی ہر لغزش پر اس کے شہری چونک اُٹھیں اور اُسے پھر سیدھے راستے پرلے جائیں۔ مجھے تو اُتر پردیش میں اُردو کو اس کا حق دلانے کی کوشش میں یہ سب دکھائی دیتا ہے۔

جو لوگ اس میں محض کسی کی ضد یا محض کسی کی سہولت پسندی، کسی کی فرقہ پرستی، کسی کی پاکستان دوستی، کسی کی ہندوستان دشمنی، کسی کی ہندی دشمنی، دیکھتے ہیں یا دکھاتے ہیں وہ بڑی ہی غلطی پر ہیں۔

دوستو! اس کی تہہ میں تو ہماری جمہوری زندگی کا بنیادی سوال پنہاں ہے کہ کیا اس دیس میں جس کی لاٹھی ہوگی، بھینس اسی کی مانی جائے گی؟ کیا ایک زبان دوسری زبان کو یا زبانوں کو، ایک اسلوب زندگی، دوسرے اسلوب کو، ایک طرزِ فکر دوسرے طرزِ فکر کو اپنے زور سے دیس نکالا دے سکے گا؟ یا سب کے میل جول، باہمی رواداری اور تعاون سے اس ملک کی زندگی ترقی کرے گی؟ کیا یہاں زندگی کے مسئلے زور وجبر اور ڈراوے، دھمکاوے سے حاصل کیے جائیں گے یا محبت اور سمجھنے سمجھانے سے؟ کیا یہ دیس اپنی زندگی کی دلفریب رنگا رنگی کی قدر کرے گا، یا بس ایک بھوری بھوری اور مٹیالی مٹیالی سی یک رنگی زیادہ بھائے گی؟ کیا یہ ایک جمہوریت کا پُر فضا چمن بنے گا، آنکھوں کا نور، دل کا سرور یا کسی فوجدار کی کربی کا کھیت؟

دوستو! میں نے ابھی جو اشارہ کیا ہے کہ لوگ ہمارے مطالبے کی تہہ کو نہیں پہنچتے اور اس کی من مانی تعبیریں کرتے ہیں تو یہ میں نے اٹکل سے نہیں کہا ہے۔ یہ سب باتیں کہی گئی ہیں، اور کہی جا رہی ہیں۔ کوئی کھلم کھلا تیز اور کڑوے انداز میں کہتا ہے، کوئی ذرا دھیمی لے میں، مگر بار بار کہا گیا ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے کی کوشش، فرقہ وارانہ کوشش ہے، اس میں مذہبی فرقہ پرستی کارفرما ہے، یہ مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ملک میں ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی، سیاسی پینتروں کی ضرورت، مذہبی جذبات کو مشتعل کرکے سیاسی مقاصد حاصل کرنے ——— ان سب نے اُردو کے مسئلے پر بہت سے پردے ڈال دیے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے ہندو مسلمانوں نے، بہت سے اُردو والوں ہندی والوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کیا۔ جس پر کوئی بجا طور پر فخر نہیں کرسکتا۔ اس قصے کو بار بار یاد کرنے یا دہرانے سے کسی کا فائدہ نہیں سوائے ان کے جن کے فائدے کو روکنا ضروری ہے۔ یعنی ان کو جو ہماری قومی زندگی کے قوام کو درست نہیں ہونے دینا چاہتے، جو جمہوریۂ ہند کے دستور کے دشمن ہیں، جو ملک میں ایک نامذہبی روادار ریاست کے قیام کو پسند نہیں کرتے۔ مگر مجھے اس وقت مسلمانوں کی طرف سے کچھ کہنا نہیں ہے اس وقت تو اُردو کا ذکر ہے۔ اور کیسا ستم ہے کہ اُردو پر اور اُردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے، حالاں کہ اُردو کسی فرقہ کی زبان نہیں ہے، کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے، کسی خاص نیت سے مصنوعی گھڑی ہوئی زبان نہیں ہے، یہ تو زندگی کی ریل پیل میں انسانوں کے میل جول کا پھل ہے۔ لوگوں کی، جنتا کی زبان ہے۔ جن کے دلوں کو کچھ لگی تھی اور وہ اسے دوسرے بھائی انسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے اور جو ان سے محبت کرتے تھے، کان دھر کر ان کی بات سننا چاہتے تھے، اُن ہی کے دلوں کی بولی ہے یہ، یہ فقیروں اور خادمانِ خلق کی زبان ہے بازار میں کاروبار اور لین دین سے بنی ہوئی زبان ہے، منڈیوں میں مبادلۂ اجناس کے ساتھ مبادلۂ افکار کے عمل کا نتیجہ ہے! یہ اُن کی زبان ہے جو کسی خاص روایت سے ایسے لپٹے ہوئے نہ تھے کہ ہر نئی بات سے بھڑکیں، ہر نئے اسلوب سے بدکیں، لوگوں سے ہی نہیں لفظوں سے بھی گھن کریں۔ یہ وسعتِ قلب کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، محبت اور پریم کی زبان ہے۔ اسی لیے ایسی کشادہ دامن زبان ہے۔ ایسی نمو پذیر زبان ہے، ایسی جاندار زبان ہے، یہ اس ملک کے، اس اتر پردیش کے علاقے کے بسنے والے لوگوں کے رابطۂ دلی اور رابطۂ ذہنی کا نتیجہ ہے اور ان بسنے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ کا کوئی امتیاز نہیں۔

غضب ہے دوستو! اگر کوئی تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برجموہن دتاتریہ اور کشن پرشاد کول کی زبان پر مذہبی فرقہ واریت کا بہتان باندھتا ہے۔ دیا شنکر نسیم، جوالا پرشاد برق، برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، منشی نول کشور، لالہ سری رام، پنڈت منوہر لال زتشی، سرتیج بہادر سپرو، منشی دیا نرائن نگم اور مہاراجہ کشن پرشاد کی زبان پر مذہبی تنگ دلی کی تہمت لگائے۔ جس زبان میں آریہ سماج تحریک کا تمام تر مواد موجود ہو، جس سے عیسائی مشنریوں نے پورا کام لیا ہو، اُسے مسلمانوں کی زبان، مسلمانوں کی زبان چلّا چلّا کر بتانا اور تعصباتِ مذہبی کی ہوا دے کر نفرت کی آگ بھڑکانا کیسی ناروا بات ہے؟ بڑا ستم ہے دوستو! اگر جانا بوجھا ظلم نہیں تو کیسی بے سر پیر کی بے تک بات ہے یہ۔ اور اگر بد دیانتی نہیں تو

کیسی نادانی ہے ؟

پھر مذہبی تعصب سے پورا کام نہ چلے تو سیاسی تعصب بھڑکایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اردو بدیسی زبان ہے، لیکن کیا کیجیے کہ تاریخی اور ادبی شواہد پکار پکار کر کہتے ہیں کہ یہ نہ تو بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس میں افعال اور حروف اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہیں۔ صوتی اعتبار سے دیکھیے تو اس کا ایران و عرب سے کوئی رشتہ نہیں، اس میں آوازوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستانی ہے۔ اور تو اور رسم خط تک میں کہ اس کے غیر ملکی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ درجنوں ہندوستانی آوازیں ہیں، جیسے: ڑ۔ ڈ۔ ٹ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ بھ۔ پھ۔ جھ۔ چھ۔ کھ۔ گھ وغیرہ جنھیں کون غیر ملکی بنا سکتا ہے ؟ مگر کہنے والوں کا منہ کون بند کرے ؟

پھر کہنے والوں نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی تحریک، ہندوستانی قومیت میں تفرقہ ڈالنے کی تحریک ہے۔ اس کا جواب کیا دوں ؟ کون نہیں جانتا کہ اس تحریک کے حامیوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اردو کو ہندوستان کی قومی سرکاری زبان مان لو۔ اگر تقسیمِ ہند سے پہلے کے سیاسی بحران سے ملک بچا رہا ہوتا تو یہ مطالبہ بھی چنداں بے جا نہ ہوتا۔ مگر جب سے ہمارے دستورِ سیاسی میں ہندی کو قومی زبان مانا گیا ہے، اردو والوں نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ اردو کے ہر پلیٹ فارم سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اردو والوں کو ہندی بھی سیکھنی چاہیے، اگرچہ گاندھی جی کی یہ دایت کہ ہندی جاننے والوں کو اردو بھی سیکھنی چاہیے، اب آسانی سے کہیں سننے میں نہیں آتی۔ اردو کا حق ایک ملکی زبان کی حیثیت سے مانگنے کو اتر پردیش کے علاقے میں اس کو بھی ایک سرکاری زبان منوانے کی کوشش کو قومی تفرقہ کی کوشش کیسے کہا جا سکتا ہے ؟ ہمارے ملک کی وحدت تو ایسی وحدت اور اس قسم کی کثرت میں وحدت ہے کہ ۱۴ بڑی زبانوں کو ملک کی زبانیں تسلیم کرنے سے قومی وحدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اور اگر اتر پردیش کی وحدت اس تجویز سے خطرے میں نظر آتی ہو تو یاد رکھنا چاہیے کہ کسی ریاست میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو تسلیم کرنے سے اس کی تہذیبی وحدت میں رخنے نہیں پڑتے۔ اس وقت بھی پنجاب اور مدھیہ پردیش میں ایک سے زائد زبانیں سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۳۹ء میں جنگ کے شروع ہونے پر جب میں جرمنی سے گرتا پڑتا سوئٹزرلینڈ پہنچا تو زیورچ میں ایک قومی نمائش کا انھیں دنوں آغاز ہوا تھا۔ یہ نمائش خوش سلیقگی، خوش مذاقی اور خوش انتظامی کا نمونہ تو تھی ہی مگر اس چھوٹی سی قوم کی سیاستِ لسانی کی بھی ایک عجیب موثر مثال یہاں سامنے آتی تھی۔ نمائش لاکھوں ہی چیزوں کی تو تھی' میلوں میں پھیلی ہوئی زندگی کے سب شعبوں پر حاوی' میں نے تو ایسی نمائش آج تک دیکھی نہیں۔ اس عظیم الشان نمائش میں ہر چیز جو دکھائی گئی تھی' وہ چھوٹی ہو یا بڑی' اس کی تشریح تین زبانوں میں ہر چیز کے ساتھ درج تھی۔ اس وقت سوئٹزرلینڈ کی حالت جنگ کی وجہ سے خاصی نازک تھی' ۳۲ دانتوں میں ایک زبان' ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کسی فریقِ جنگ کی فوجیں اس ملک کو اپنی رہ گزر نہ بنا ڈالیں۔ قومی اتحاد کا جذبہ کمال پر تھا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کی تشریح تین زبانوں میں کر کے کسی کو یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ وحدتِ قومی پر ضرب پڑ رہی ہے' بلکہ وحدتِ قومی کے قیام میں اس رواداری سے زیادہ کوئی اور چیز معاون نہ تھی۔ ملک کے ہر بچے کو یہ نمائش سرکاری خرچ پر دکھائی گئی تھی۔ اس لیے کہ یہ ان کی قومی تعلیم کا سب سے اہم کام اور قومی وحدت کو مضبوط کرنے کا سب سے موثر منصوبہ تھا۔ اب سوئٹزرلینڈ نے ایک چوتھی زبان کو بھی جسے کوئی پچاس ہزار آدمی بولتے ہیں' قومی زبان تسلیم کر لیا ہے۔ اور اگر اب کوئی قومی نمائش ہوئی تو ہر چیز کی تشریح چار زبانوں میں کی جائے گی اور ایسا نہ کرنے کے بہانے نہ ڈھونڈے جائیں گے۔ اپنے شہریوں کے جائز حقوق کو پورا کرنے سے' ان کے جذبات کا احترام کرنے، ان کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے سے، ان کی عزیز اور چہیتی چیزوں کی حفاظت اور ترقی میں' ان کی مدد کرنے سے وحدتِ قومی پیدا ہوتی ہے' جذبۂ قومی ایک زندہ کارفرما جذبہ بنتا ہے' وفاداری ایک ذہنی وابستگی بن جاتی ہے' اس کے مطالبے نہیں کیے جاتے' اس کے ثبوت نہیں مانگے جاتے' ساری قومی زندگی کی خوش نیتی اور خوش عملی' منصفانہ خوش معاملگی اور برادرانہ رواداری سے ایک بے ساختہ فطری کیفیت کی طرح ہر شہری کے ذہن میں رچا دیتی ہے۔ وحدتِ قومی کا جذبہ نہ دو زبانیں ماننے سے مرتا ہے' نہ خالی فقرہ بازیوں' طفل تسلیوں یا دھمکیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہ آج اپنی آزاد قومی زندگی کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں' ہمیں اس گر کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ وحدتِ قومی کا نام دل میں نفرت اور کینہ رکھ کر نہیں لینا چاہیے اس کے لیے زبان کو شدھ کرنے کی ضرورت نہیں' دل کو صاف کرنا لازم ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو تو کوئی الگ زبان نہیں' وہ تو ہندی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ یا مظہر العجائب ! اس زبان کی حمایت مسلم

ذہنیت کا مظاہرہ بھی ہے، اس کے حامیوں کو ہجرت کا مشورہ بھی ہے، وہ بدیشی زبان بھی ہے۔ ایک غیر ملکی تسلط کی ناقابلِ برداشت یادگار بھی ہے، اور وہ کوئی الگ زبان بھی نہیں ہے۔ یہ خوب ہے، صاحبو! اس سے ٹھنڈا، اس سے گرم! دونوں قسم کے الزام تو درست نہیں ہو سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو اور ہندی، ایک ہی جڑ سے نکلے ہوئے دو تنے ہیں لیکن دونوں تنے الگ الگ بڑھے ہیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک ہی سوت سے پھوٹے ہوئے دو دھارے ہیں مگر ہر دونوں دھارے الگ الگ بہتے رہے ہیں اور اپنی موجودہ صورت میں ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس لیے اُردو بولنے والوں کے اس مطالبے کو کہ ان کی زبان کو اس کا واجب حق ملنا چاہیے، یہ کہہ کر ٹالنا کہ اُردو تو ہندی کا محض ایک اسلوب ہے۔ ذہنی دیانت کا پتہ نہیں دیتا۔ اس وقت تو اُردو ایک علیٰحدہ زبان ہے، جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت مشترک قواعد کی وجہ سے ہندی سے قریب تر ہے۔ مگر ہر صورت میں اس کا لہجہ، محاورہ اور اس کے اپنے ادبی اسالیب ہیں جو اسے ہندی سے ممتاز کرتے ہیں، اور نئی ہندی جس ڈگر پر ڈالی جا رہی ہے، افسوس ہے کہ اس سے یہ فرق بڑھ ہی رہا ہے، گھٹ نہیں رہا ہے۔ یہ تو معروفِ عام ہے کہ دستورِ ہند نے اُردو کو دوسری بڑی ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ایک علیٰحدہ زبان تسلیم کیا ہے۔

دلیل میں اس قسم کا باریک نکتہ وہ لوگ بھی نکالتے ہیں جو فرماتے ہیں کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے کے کیا معنی؟ اس کا علاقہ کہاں ہے؟ اس نکتے کے سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کروں تو معاف فرمائیے۔ ابھی دو روز ہوتے اس مسئلے پر ایک دوست سے گفتگو ہو رہی تھی اُن کے ہاتھ میں اقبال کے بالِ جبرئیل کا نسخہ تھا انھوں نے جھٹ اسے کھولا اور بتایا کہ بہ نیتِ فال کھولا ہے تو اس قطعے کا دوسرا شعر سامنے آیا:

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

بہر حال یہ تو درست ہے اور بجا کہ اُردو ان معنوں میں علاقائی زبان نہیں ہے جن معنوں میں بنگالی، تامل یا مراٹھی ہیں۔ اس کی نوعیت ایک کل ہند زبان کی بھی ہے۔ ملک میں ہر جگہ، ہر کونے میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اور اُردو والوں کا یہ مطالبہ بھی ہرگز نہیں ہے کہ اُتر پردیش کا کوئی علاقہ اس کے لیے مخصوص کر دیا جائے، اور نہ یہ مطالبہ ہے کہ ہندی کو ہٹا کر کسی علاقے میں اُردو کو جگہ دی جائے اور نہ یہ کہ ہر قدم پر اُردو کو ہندی کے برابر ہی جگہ دی جائے۔ صورتِ حال مختصر یہ ہے کہ اس وقت اُتر پردیش میں پڑھے لکھے لوگوں میں تقریباً ۲۵، ۳۰ فیصدی اپنی تمام ضروریات کے لیے اُردو کو استعمال کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ہندی سے بھی واقف ہیں۔ اُتر پردیش کی سرکار نے زبان کے بارے میں جو قانون بنایا ہے اور عام طور پر اُردو کے ساتھ جو رویّہ رکھا ہے، اس سے ان ۲۵، ۳۰ فیصدی پڑھے لکھے لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود یہ گویا ان پڑھ ہیں، اس اُتر پردیش میں جہاں اُردو پھولی پھلی اور پروان چڑھی اس کو دبانے اور مٹانے کی کوشش سخت ناانصافی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں؟ اُردو ہندی میں رقابت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، دونوں ساتھ ساتھ ترقی کر سکتی ہیں، ایک کی ترقی سے دوسری کا کوئی نقصان نہیں۔ ہندی کو چونکہ اُتر پردیش کی اکثریت استعمال کرتی ہے اس لیے لازمی طور پر سرکاری اور غیر سرکاری کاروبار میں اس کا رواج زیادہ ہوگا۔ لیکن اُردو کو بھی ایک معتد بہ تعداد استعمال کرتی ہے، اس لیے اس کو بھی سرکاری کاروبار میں ایک جگہ ضرور ملنی چاہیے۔ سرکاری نظام کو ساری آبادی کا خیال رکھنا لازم ہے اور انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ پردیش کی سب آبادی کو فائدہ اور آرام ہو۔ اگر اس مسئلے پر ہمدردی اور انصاف سے غور کیا جائے تو مجھے اس کے حل میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی، میری رائے میں حکومت کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ:

(۱) سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اگر کوئی شخص اُردو میں لکھ کر درخواست دے تو وہ قبول کی جائے۔

(۲) سرکار کے اہم اعلانات اور قوانین اُردو میں بھی شائع ہوں تاکہ جو لوگ ہندی سے پوری طرح واقف نہیں، وہ بھی ان سے بے بہرہ نہ رہیں۔

(۳) ابتدائی تعلیم میں اُردو کو بھی ذریعۂ تعلیم تسلیم کیا جائے اور جہاں اُردو میں پڑھنے والے طلبا کافی تعداد میں ہوں اُردو کے ذریعے سے ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا ہونا مسلمہ تعلیمی اصول ہے اور سرکاری طور پر بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مادری زبان کا تعین ظاہر ہے کہ بچے یا بچی کا سرپرست کرے گا۔

(۴) ثانوی تعلیم کے جو مدارس اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیں، ان کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور انھیں بھی ان ہی قواعد اور اصول کے مطابق سرکاری امداد ملے جو عام طور پر دوسرے ثانوی مدرسوں کے لیے نافذ ہیں۔

(۵) اعلیٰ تعلیم اور علم و ادب کے جو ادارے اُردو کی تعلیم اور ادبی ترقی کے لیے اس وقت موجود ہیں یا آئندہ قائم ہوں، ان کو سرکار کی طرف سے معقول امداد ملے۔

(۶) اس علاقے کی کم سے کم ایک یونیورسٹی میں اُردو کو رفتہ رفتہ ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

(۷) ہندوستانی اکادمی سے اُردو کو خارج کرنے کی جو کوشش جاری ہے اس کا سدِباب کیا جائے اور اُردو ادیبوں کو جو نمائندگی اس میں حاصل تھی اس کو برقرار رکھا جائے۔

(۸) سرکار کی طرف سے ہندی کے ادیبوں کو ہر سال انعام دیے جاتے ہیں، یہ بہت اچھی بات ہے، اسی طرح اُردو ادیبوں کو بھی یہ انعامات دیے جائیں تاکہ ان کی بھی ہمّت افزائی ہو۔

اور سب سے اہم بات، سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اُردو کی طرف سے عام رویّہ بدلا جائے، اُردو زبان و ادب اور اُردو داں شہریوں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔ انھیں اجنبی نہ سمجھا جائے اور ہر طرح کے تعصب سے قطع نظر کر کے اُردو کو ملک کی ایک اہم زبان جان کر، اُتّر پردیش سے اس کے خاص تعلّق کو سامنے رکھ کر، اس کی ترقّی میں ہر ممکن مدد دی جائے، تعلیم میں آسانیاں فراہم کی جائیں، اور سرکاری کاروبار میں اسے جگہ دی جائے۔

اب میں ہندی کے حامیوں اور ہندی کے ادیبوں سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہندی کے حامی دوستو! اُتّر پردیش کے ساتھی شہریو! میرا اندازہ ہے کہ ہماری کوشش کو، جو ہم اُردو کے لیے کچھ حق مانگنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں، آپ میں سے بہتوں نے غلط سمجھا ہے۔ اس غلطی کی وجہ میں سمجھتا ہوں۔ لیکن باوجود اس کے صحیح طور پر بات کو سمجھنے کی ذمّہ داری ہٹ نہیں جاتی۔ اُردو ہندی کا جھگڑا ایک مدّت تک ہمارے دیس میں ہندو، مسلمانوں کا جھگڑا بنا رہا۔ اس تاریخ کو بھلانا مشکل ہے مگر ہم اب آزاد ہیں اور ہمارے مسائل اب وہ نہیں، جو پہلے تھے، اب ہمیں ان جھگڑوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم اپنی نئی زندگی کی تعمیر میں بڑی غلطی کریں گے۔ ہم نے جو آزادی حاصل کی ہے وہ کچھ کرنے کے لیے کی ہے۔ ہم ایک خاص انداز کی زندگی اپنے دیس میں چاہتے ہیں، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمارے دستور میں ہے۔

اس زندگی کی بنیاد ہے بے تعصّبی پر۔۔۔ مل جل کر کام کرنے پر، اِس پر کہ کسی طبقے کا غلبہ کسی طبقے پر نہ ہو، کسی کی طاقت کے لیے کسی کی کمزوری ضروری نہ مانی جائے۔ میں نے اُوپر جو باتیں کہی ہیں، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے سامنے اپنے دیس والوں کی زندگی کا کیا نقشہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے اکثر کو یہ ناپسند نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُردو، ہندی کی رقیب ہے۔ آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُردو کی ترقّی سے ہندی کا کوئی بھی نقصان ہے، ہندی تو سارے دیس کی سرکاری زبان ہے، دیس کی دوسری زبانوں کی ترقّی سے اس کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا تو اس میں فائدہ ہی ہے۔ ملک کی ساری زبانوں کے خزانے اس قومی زبان میں آئیں گے، ان کے خزانے کے ساتھ ساتھ ہندی کا خزانہ بڑھے گا۔ آپ کو پچھلی ناگوار باتوں کو چھوڑ کر آگے دیکھنا چاہیے۔ دیس کے کچھ بسنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کو پردیسی محسوس کریں۔ میں آپ سے ایک ساتھی کی طرح، ایک بھائی کی طرح یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ اُردو کو اس کا حق آپ دلائیے۔ اس کے لیے آپ کوشش کیجیے۔ ہندی کے لیے اس سے سارے دیس میں وہ راہیں کھلیں گی جن کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہندی دلوں میں گھر کرے گی، سرکاری مدرسوں کی گشتی چٹھیوں کے ذریعے نہیں پھیلے گی ۔۔۔ قومی زبان کی نیو مضبوط ہو... اچھی زبان اسی طرح چھوٹی چھوٹی ضدوں اور اد... خود غرضیوں کو چھوڑ کر اخلاقی مطالبوں کی حمایت سے آگے بڑھتی ہے، مضبوط ہوتی ہے۔ جمہوری ریا... میں یہ فرض شہریوں پر آتا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے اس فرض کو پورا کریں گے، سارے دیس کی زندگی پر آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

ہندی زبان کے ادیبو! اس ڈیڑھ برس میں، جب سے اُردو کو اُتّر پردیش میں علاقائی زبا... بنوانے کی کوشش شروع ہوئی ہے، بہت سے لوگوں نے اس کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ اس کام کے متعلق بھی... میرے متعلق بھی بزرگوں نے، دوستوں نے، اچھی طرح جاننے والو... بالکل انجان لوگوں نے۔ میں نے کہی اَن کہی برابر رکھ... کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ نیت پر بھی حملے ہوتے... ساری زندگی جو اپنے ایک طرز پر گزاری ہے اس... کو دو جملوں میں ختم ہوتے سُنا، مگر آپ جانتے... ہیں میں نے ایک لفظ اس کے جواب میں نہیں کہا۔ آج بھی کسی سے جھگڑا مول نہیں لوں گا... مگر آپ سے کچھ گلہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ لوگ قوم کی قدروں کے رکھوالے ہیں، زندگی کے اندھیاروں کو روشن کرنے والے ہیں، اس کی پستیوں کو دکھا کر ان سے بیزاری پیدا کرنے والے ہیں، آپ کی نظر آج ہی پر نہیں کل پر بھی ہے... اس لیے آزاد دیس اور اس نئی قوم کے مستقبل کی جو شکل آج آپ کے خیالوں میں، آپ کے... کتابوں میں، آپ کی کویتاؤں میں، آپ کے گیتوں میں...

وہ بہت کچھ کل جیتی جاگتی حقیقت بن جائے گی جب آپ میں سے بعض نے اس تحریک کو پھوٹ ڈالنے کی تحریک، قومی وحدت میں رخنہ ڈالنے کا منصوبہ سمجھا تو بڑا دکھ ہوا۔ کبھی ہوتا ہے کہ لوگ پتھروں کی بوچھار کرتے ہیں اور ذرا دکھ نہیں پہنچتا اور کوئی ایک پھول پھینک کر مارتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ زخم پڑ گیا، یہ شاید اس لیے ہے کہ پتھر کون پھینک رہا ہے اور پھول سے کس نے مارا۔ آپ سے بس اتنا ہی کہنا تھا کہ آپ کے پھول سے دکھ ہوا۔ بس اتنا ہی گلہ ہے، اب یہ التجا ہے کہ اس تحریک کو اس کی حقیقت میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اور اگر اس کو انصاف پر زیرِ بحث پائیے تو اس کو سہارا دیجیے اور اس کی مانگ کو منوائیے۔ ہندی کے ادیب ہندی والے ہی نہیں ہیں وہ اُردو والے بھی ہیں، بنگالی والے بھی ہیں، پنجابی والے بھی، وہ دیس والے ہیں، سچائی والے ہیں، آپ کے ایسا کرنے سے ہندی کو کیا فائدہ ہوگا اور اُردو کو کیا، اس کو اس وقت سوچنا بھی نہیں۔ یہ جانتا ہوں کہ اس نئی قوم کے مستقبل کے لیے جس کی روح اور جس کے ذہن پر آپ کا ایک ایک لفظ اثر ڈالتا ہے، آپ ایک بڑی خدمت انجام دیں گے، آپ کو لوگوں کی تالیوں کی اور جے کاروں کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو ووٹ بھی شاید ہی کبھی درکار ہوں۔ سچی بات پر آپ اڑ سکتے ہیں، آپ اڑیں گے تو آپ کو کوئی مسلم لیگی بھی نہ کہہ سکے گا۔ اُردو کو اس کا حق دلائیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ بھروسے اور محبت کے ایسے سوتے ہمارے دیس میں پھوٹیں گے کہ جن سے ساری قومی زندگی سیراب ہوگی۔ ایک طرح سے زندگی کی رُت ہی بدل جائے گی۔ اُردو والے ہی نہیں سمجھیں گے کہ آپ نے کیا کیا، سارے دیس میں جو جگہ جگہ بیر ڈر ہے، غلط ڈر کہ ہندی اپنے سیاسی اثر سے دوسری زبانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا پہنچانا چاہتی ہے، وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جائے گا۔ اور ذہنی تعاون کی ہزار راہیں کھل جائیں گی۔ اور جب آپ ہمدردی سے اس مسئلے کو دیکھیں گے تو خود آپ پر بہت سی باتیں روشن ہو جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ اُردو ادب کا مطالعہ خود ہندی والوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور اُردو کی ترقی کسی طرح ہندی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ پر روشن ہوگا کہ اُردو ہندی کے جھگڑے نے ان کے باہمی فرق کو جان جان کر بڑھانے کی جو کوشش کرائی ہے اس سے دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا ہے، سچ یہ ہے کہ اُردو کو کم ہندی کو زیادہ، پیچھے دیکھنے کی عادت پیدا کی ہے، آگے سے غافل کیا ہے، زبان کو دو دانوں اور عالموں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں کی چیز سمجھ کر بہت سا کام ہوا ہے اور ان کروڑوں آدمیوں کو بھلا دیا گیا ہے، جن کے ذہنوں کو روشن کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اس میں سے بہت کچھ آپس کی ضد میں ہوا ہے۔ یہ ضد ہٹ جائے تو کیا عجب ہے کہ اُتر پردیش کے سارے علاقے میں ایک سُندر، مدھر اور کومل بھاشا کا رواج ہو۔ اس لیے کہ بناوٹی، کٹھن اور بوجھل زبان کو کچھ عرصے تک تو زبردستی لادا جا سکتا ہے، لیکن زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی زبان بہت دنوں تک ترقی نہیں کر سکتی۔ اُردو کے مسئلے پر تاریخی اتفاقات نے جو پردے ڈال دیے ہیں ان کو ہٹا کر اس مسئلے کی حقیقت کو دیکھیے اور اس کے حل کرنے میں مدد دیجیے آپ پر بڑی ذمہ داری ہے۔

آخر میں ایک بار پھر ان مخلص کارکنوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دستخط حاصل کرنے کی اس مہم میں انجمن کا ہاتھ بٹایا۔ خصوصیت کے ساتھ پنڈت کشن پرشاد کول، جناب حیات اللہ انصاری صاحب اور بیگم حیات اللہ کا جن کی پُر خلوص محنت اور جن کی تدبیر سے یہ کام انجام کو پہنچا۔ بڑی ہمت کا کام کیا آپ نے، بڑی خوبی سے، بڑی خاموشی اور ضبط سے۔ اب ہم اس محضر کو صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں پیش کریں گے، اس یقین کے ساتھ کہ ہماری جائز مانگ مان لی جائے گی۔ لیکن میرے دل میں آپ کے کام پر شکر گزاری کا جو سچا احساس ہے اس کا حق ادا نہ ہوگا اگر میں آپ سے اپنے دل کی ایک بات نہ کہہ دوں، وہ یہ کہ اگر ہمارا مطالبہ پوری طرح مان لیا جائے تب بھی ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔ زبان کی ترقی کے راستے بس وہی نہیں ہیں جن پر حکومت کی مدد سے چلا جا سکے۔ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر یہ سب راستے بند کر دیے جائیں تو بھی ہماری کوشش سے اُردو اُتر پردیش میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی ترقی بھی کر سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب راستے کھل جائیں اور ہماری پست ہمتی سے اُردو کی ترقی ہی ختم نہ ہو جائے بلکہ خود اُردو ہی ختم ہو جائے۔ زبان کا مستقبل اس کے بولنے والوں، اس کے لکھنے والوں، اس کے شاعروں، اس کے ادیبوں، اس کے معلّموں کے ہاتھ میں ہے اور ان کی سعی کے راستوں کی درستی پر، اگر یہ لوگ زبان اور اس کے ادب کو چند خواص کا اجارہ سمجھیں گے تو اس جمہوری دور میں زبان آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ زبان کی ترقی کے اہم کاموں میں زبان کی ترویج ہے، اس ملک میں جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، ترویج کے کام میں بڑی گنجائش ہے۔ آپ کو جب اپنی زبان کے مستقبل سے اتنی دلچسپی ہے تو میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کی ترقی کی راہوں پر بھی غور کریں اور ان پر چلنے کی تدبیریں نکالیں۔ یہ کام اُردو کا ہی نہیں، ہندوستان کا کام ہے۔ ⬡

رنگ کا مرکز مگر کھویا ہُوا سا
ایک دریا نیند میں بہتا ہُوا سا
میرے ہاتھوں کے تلے، الفاظ سارے
اے قلم! میرا ہی دل دھڑکا ہُوا سا
کُچھ نہ کُچھ تفسیر کرنا ہی پڑے گی
کُچھ نہ کُچھ اطراف میں لکھا ہُوا سا
اے ہَوا تُو ہے مری دیکھی ہوئی سی
اے سمندر تو مرا سوچا ہُوا سا
اے زمیں تُو ہے مری لکھی ہوئی سی
اے شرر تُو ہے مرا دیکھا ہُوا سا
اندھے قدموں کی نظر میں کچھ کمی تھی
جاگتا رستا لگا سویا ہُوا سا
اس کی خاطر میں لہو منظور رویا
آئینہ نِکلا مگر دیکھا ہُوا سا

اے دوڑتی سڑک کبھی لینے دے دم ذرا
اِک دو سوال پُوچھ لیں، خود سے بھی ہم ذرا
بارش کے دیوتا! نہیں بارش اگر نصیب
آندھی چلے کہ دُھوپ کی شدّت ہو کم ذرا
شاید یہ تجربہ ترا سمت سفر بنے
مانوس راستوں سے بھی ہٹ کر قدم ذرا
زخمی تھے جلنے ہاتھ، تھے اِس بات کا ثبوت
چاہا بہت گیا تھا، وہ پتّھر ہو نم ذرا
ہم دیکھتے کہ کون سے کردار خام تھے
کرتا اگر وہ اپنا فسانہ رقم ذرا
لکھنی ہے موسموں کے تغافل کی داستاں
میری مدد پر آ، مرے رنگِ قلم ذرا
منظور اپنے شعر کا قد جانتا ہے خوب
کیوں "صاحبوں" کی بات کا ہو اُس کو غم ذرا

حکیم منظور

۱۳ - حکیم منزل، آخون صاحب، گجّ ولا، سری نگر ۱۹۰۰۰۲

دیکھ اکیلا مجھ کو چپکے چپکے آتا
خوب ستاتا ہے ہنس ہنس کر خوب رلاتا
پہلے تو جلتی آنکھوں میں سوکھے آنسو خوب
پھر بیہوشی مل مل کر پلکیں سہلاتا
سرد لبوں پر چیخیں نیلی نیلی ہو کر بیٹھ گ
برفیلی نظروں سے مجھے گھورے ہی جاتا
لمحہ لمحہ روح کے اندر گھلتی جاتی ہے
قطرہ قطرہ شریانوں میں اترا آتا
سینے سے دل نوچے جائیں ڈائن کالی کالی
شہرگ شہرگ چوس کے اپنی پیاس بجھاتا
نرم سنہرے پنکھوں والی گیت پری اب کیا آ
زہریلے کالے جبڑے کھولے غُرّاتا
دھیرے دھیرے تنہائی کی عادت تو ہو ہی ج
پہلے دل گھبراتا ہے پھر راس آجاتا
اپنی اپنی لاش اٹھائے لوگ گھروں کو لو
خون میں ڈوبی کچلی سڑکیں چاٹے جاتا
یا تو اندھی گلیاں ہی ملتی ہیں یا تاریک گ
کیا جانے کس کھنڈر میں اے بلقیس پھرا

بلقیس ظفیر الحسن

شفق

چٹکی بھر زندگی

شاید رات کا پچھلا پہر تھا جب میری آنکھیں کھل گئیں۔

نیم غنودہ ذہن نے گھر میں پُر اسرار سی ہلچل محسوس کی، تیز تیز قدموں کی آوازیں پُرتشویش انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں، مگر آواز دھیمی رہتی اس لیے باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، کبھی کبھی آواز کا حجم بڑھ جاتا، کتنی دیر ہوگئی، میں نے پُرانا کپڑا مانگا تھا، تمھیں تو وقت پر کوئی چیز ملتی ہی نہیں ... خدا غارت کرے بجلی کو بھی ابھی فیل ہونا تھا، لالٹین تیز کرو، روشنی ادھر دکھاؤ۔

میں کچھ دیر تک منتظر رہا کہ کوئی میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر بتائے گا کہ ... مگر دیر ہوگئی تو میں نے سر جھٹک کر کروٹ بدل لی۔ ممکن ہے نیند خراب ہونے کے خیال سے کسی نے مجھے نہ جگایا ہو، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا، مگر نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتے ذہن میں تشویش اور نا اُمیدی کی ہلکی سی لہر ضرور تھی، خوشی کی بات ہوتی تو کیا نیند خراب ہونے کی پروا کی جاتی ...؟

صبح جب میں غسل خانے کی طرف جا رہا تھا ماں اور بہنوں کی نظروں میں ہمدردی اور تاسف دیکھ کر میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا، حالانکہ میں نے ہونے والے حادثے کو پہلے سے ذہن میں رکھ کر اپنا دل مضبوط کر لیا تھا مگر یہ کیسا دھچکہ تھا جس نے عمارت کی نیو تک ہلا دی، کوئی ان دیکھا ہاتھ میرے دل تک پہنچ گیا اور اب کلیجہ مسل رہا تھا مسلے جا رہا تھا۔

غسل کے دوران سرد پانی نے جذبات کو سرد نہیں کیا بلکہ نفرت کی مورتی ڈھل کر اور صاف ہوگئی، کیا محرومیاں اور ناکامیاں ہی میرا مقدر ہیں؟ کیا میں نئے عہد کا پیغمبر ہوں اور خدا نے اپنی آزمائشوں کے لیے میرا انتخاب کر لیا ہے؟ میں بچپن سے اپنی ہر خواہش کا گلا گھونٹتا رہا، اپنے ارمانوں کو اپنے ہاتھوں کفن پہنا کر مفلسی کی قبر میں سُلاتا رہا، ملازمت ملی تو شادی ہوگئی اور گنتی کے کھٹے میٹھے دن بیتے کہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔

"سُنیے جی" بیوی نے سوئٹر بنتے ہوئے مخاطب کیا، "خدا نے جو دیا اس کا کیا شکوہ مگر زمانہ خراب ہوگیا ہے ہمیں ابھی سے بچّی کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ ..."

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی پھول سی بچّی کو دیکھا، پیار سے اس کے گالوں پر انگلیاں پھیریں، میری بیٹی، ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد خدا نے اس لائق بنایا تھا کہ اپنی تشنہ آرزوؤں اور تمنّاؤں میں رنگ آمیزی کرتا مگر تم ... تم پر ابھی سے فکر کا سایہ پڑ گیا تمھاری ماں بھی غلط نہیں کہتی، میری نظروں میں کتنے چہرے ہیں جو بیٹی کی شادی کے لیے پریشان ہیں، رشتوں کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے جاتے، خدا نے عجیب قانون بنایا ہے وہ بیٹی جو جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اُسے دوسرے کو منتوں، خوشامدوں اور قربانیوں کے ساتھ سونپ دیا جاتا ہے اور تماشا یہ کہ دوسرا مفت لینے کو تیار نہیں، کیا لڑکی دُنیا کی سب سے حقیر شے ہے؟

"آپ کیا سوچنے لگے" بیوی نے ٹوکا "میری بات پر دھیان دیجیے۔"

جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو ماں ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے کہہ رہی تھی۔

"بالکل گڑیا جیسی ہے تمھاری یہ بیٹی، بہو کا دیکھو، بیٹی کا سنتے ہی رونے لگی، ماں کے لیے سب اولاد برابر ہوتی ہے، خدا نے اس بار بھی بیٹا نہیں دیا تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔"

میرا جی چاہا، میں اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لوں، چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لوں نہیں چاہیے مجھے یہ بیٹی نہیں چاہیے خدا کی مصلحت مجھے کسی کی ضرورت نہیں، مجھ سے عفریت لپٹ گئے ہیں نوچ نوچ کر میرا گوشت کھا رہے ہیں خون پی رہے ہیں، اب میں انھیں اور نہیں کھلا سکتا، واپس لے لے خدا اپنی امانت میں اس کا اہل نہیں ہوں ... میں نے بڑی مشکل سے اپنی وحشت پر قابو پایا، میرے ہاتھ بے اختیار تولیے سے بال رگڑے جا رہے تھے۔

ماں میری اضطراری کیفیت اور چہرے سے میرے دل کا حال سمجھ گئی تھی اس نے بڑی نرمی سے سمجھایا۔

"بیٹے، تم بے وجہ پریشان ہو اس گھر کی

کمیرگنج، سہسرام (بہار)

بیٹیاں بڑی آسانی سے اُٹھ جاتی ہیں، سوچو تو، تمھاری چار بہنیں ہیں اور تمھارے والد کی اوقات کیا تھی، تم تو خدا کے فضل سے بہت اچھے ہو، جس خدا نے تمھیں اس مقام پر پہنچایا ہے وہی تمھاری مشکلات بھی حل کرے گا۔"

میں نے ماں کی باتوں کی تردید نہیں کی، میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی، بے چینی اضطراب اور تھکن، میں ماں کو اپنی دلی کیفیات نہیں بتا سکتا تھا وہ پریشانیاں یاد دلانا نہیں چاہتا تھا جو بہنوں کی شادی کے وقت پیش آئی تھیں، میں ایسا جواری تھا جو آخری بازی بھی ہار گیا ان چار بیٹیوں کے بعد مزید آزمائش کی گنجائش نہیں اگر پانچویں بھی بیٹی ہو گئی تو؟ اسی انتظار نے تو یہ دن دکھایا، اب یہ فیصلہ ہو گیا کہ میرے یہاں بیٹا نہ ہوگا، کوئی میرا سہارا نہ ہوگا، جب بیٹیاں اپنے گھر چلی جائیں گی تو ہم دونوں بوڑھے بوڑھیا دن رات دروازہ تکیں گے، کوئی آہٹ کوئی آواز، کوئی نہیں آئے گا، یہاں آنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔

"آپ بے وجہ پریشان ہیں۔" پروفیسر شمیم نے سمجھایا: کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بیٹا ہو جاتا تو آپ دونوں دروازے نہ تکتے۔ میں اپنے والدین کا سعادت مند بیٹا رہا ہوں۔ پھر کیا آپ نے اپنے بعد کی جنریشن پر غور کیا ہے، میں قدیم ہوں آپ قدیم اور جدید کا امتزاج ہیں اور یہ صرف جدید، ان کی نظروں میں پرانی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں، پھر آپ کا بیٹا جدید ترین ہوتا، میں تو تیسری نسل سے ہی مایوس ہوں اور آپ چوتھی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔

آفس جانے کو دل نہیں چاہتا مگر یہ سوچ کر وہاں ذہن بٹ جائے گا آفس کے لیے روانہ ہوا تو راستے میں ساجد مل گیا۔

"مبارک ہو بھئی سُنا ہے تمھیں پروموشن ملا ہے اب تو اس پٹیچر سائیکل کا پیچھا چھوڑ کر اسکوٹر لے لو سیکشن آفیسر کو یہ سائیکل زیب نہیں دیتی۔"

"اسکوٹر ــــ" میں تلخی سے مُسکرایا "جب سائیکل سے کام چل ہی رہا ہے تو جلدی کیا ہے لے لیں گے اسکوٹر بھی، تم سُناؤ ہفتوں بعد نظر آئے ہو کہاں رہے؟"

ساجد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "بہن کے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں ایک جگہ بات چل رہی ہے، لڑکا اچھا ہے مگر جہیز کے علاوہ کیش پچاس ہزار مانگ رہے ہیں۔"

جب ابھی لڑکے کی قیمت پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے تو جب ثمن جوان ہوگی تب؟ میں نے محسوس کیا میرے بال کھچڑی ہو گئے ہیں آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور ایک شخص بے رحمانہ لاپروائی سے کہہ رہا ہے: سُنیے جناب کم از کم ایک لاکھ روپے نقد اور جہیز کی جو چیزیں ہیں، ٹی وی، وی سی آر، فرج، صوفے اور ماروتی کار... کم سے کم پندرہ تولہ سونا...

"اچھا ساجد دفتر کا وقت ہو رہا ہے پھر ملاقات ہوگی خدا تمھاری مشکل آسان کرے۔"

سائیکل واقعی تکلیف دہ ہو گئی ہے مگر ساجد کو کیسے بتاتا کہ دو بار اسکوٹر کے لیے روپے جمع کیے مگر عین وقت پر خیال آیا، اسکوٹر صرف میرے کام آئے گا اگر اسے فکسڈ ڈپازٹ میں ڈال دوں تو؟

دفتر میں بھی دل نہیں لگا، کھلی ہوئی فائل کے صفحات پر چہرے ناچنے لگتے۔

سنتے ہیں جی، میرا دل بہت ڈر رہا ہے اس بار بھی بیٹی ہو گئی تو؟

بیٹا ہوگا تو ساس بن کر ایک بے قصو... اپنا بدلہ چکاؤ گی۔

آپ تو ہر بات کا مذاق بنا دیتے ہیں کو کیا پتہ دوسروں کا بیٹا دیکھ کر میں کتنے ا... کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہوں، نہ جانے خدا... کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔

گناہ تم نے کیا ہوگا، میں تو معصوم فر... ہوں۔

ہونہہ بڑے آئے معصوم فرشتہ جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔

اس بار چاہے بیٹا ہو یا بیٹی میں چ... زیادہ کا متحمل نہ ہو سکوں گا اور یہ نمبر چار کیا توازن نہ بگاڑ دے گا، ثمن اور صادقہ... ساتھ سو جاتی تھیں اور ہم تم شابی کے س... اب یہ سکھ بھی چھن جائے گا۔

بیوی کا چہرہ ہلکا گلابی ہو گیا تھا

"فائل میں کوئی خاص بات ہے کمال ص... بہت دیر سے پڑھ رہے ہیں"، کسی کی آواز سُ... میں چونک پڑا، گھبرائی ہوئی نظروں سے چا... طرف دیکھا بیشتر نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ان آنکھوں میں ترحم تھا، میں نے تو کسی کو کچ... نہیں بتایا پھر انھیں کیسے معلوم ہوا یا یہ میر... پژمردہ دل کا فریب ہے اور میں ہی خود کو ... رحم سمجھ رہا ہوں۔

گھڑی پر نظر گئی تو خیال آیا بیٹیاں ... سے واپس آ گئی ہوں گی مگر آج اسکول جاتے... کسی نے مجھ سے پیسہ نہیں مانگا تھا صرف کم... کے سامنے سے کئی بار گذری تھیں، نہ جانے ٹفن... بھی لیا تھا یا نہیں... میں نے جلدی جلدی...

ختم کیا، گھر پہنچا تو بیٹیاں اسکول سے آچکی تھیں مگر کافی دیر گذر جانے کے بعد بھی کوئی میرے پاس نہیں آیا حالانکہ اُن کا روز کا معمول تھا وہ مجھے اسکول کی ذرا ذرا سی باتیں بتاتی تھیں، آج کس نے ہوم ورک نہیں کیا تھا اُس کی پٹائی ہوئی، کس کی کتاب گم ہوئی، سسٹر نے کیا کہا وغیرہ، میں نے سمن کو پکارا تو وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آئی۔

"پاپا آپ ناراض ہیں؟"

میں دھک سے ہوگیا "کیوں گڑیا میں کیوں ناراض ہونے لگا۔"

"ہمارے ایک اور بہن جو آئی ہے۔ سچ پاپا ہمیں بھی بہت ارمان تھا کہ ہمارے ایک بھائی ہوتا ہم سے لڑتا جھگڑتا کاپیاں پھاڑتا کھلونے توڑتا۔"

میں نے کھینچ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ میرا دل بھرایا جا رہا تھا، ان معصوم بچیوں کو بھی میری محرومی کا احساس ہوگیا، انھیں ایک بھائی کی کمی ساری زندگی کھٹکتی رہے گی انھیں ایک بھائی ملنا ہی چاہیے مگر کیسے...؟ چار سے زیادہ کا بوجھ ... چار سے زیا.. کتنا اچھا ہوتا نوزائیدہ مر جاتی... اگر نوزائیدہ مر جاتی تو... میں نے سمن کو اپنے سے الگ کیا اس کا گال تھپتھپایا، پیسہ دیا اور وہ خوش خوش باہر بھاگ گئی تو میں نے سوچا اگر نوزائیدہ مر جاتی تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا، مرنے کا افسوس تو پالتو جانور کا بھی ہوتا ہے مگر ابھی یہ پالتو کہاں ہے ابھی تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے کتنی کم ہو جاتی تو ایک چانس لیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ گناہ ہوگا ___ ضمیر نے ملامت کی تو میں نے اسے جھڑک دیا، اس سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ میں اسے بہتر زندگی اور زندگی کی آسائشیں نہ دے سکوں گا اور خود بھی بوجھ تلے دبتا چلا جاؤں گا۔ نہ جانے کتنی بار ہم دونوں خودکشیاں کریں گے ایک زندگی دوسرا قتل ہے، ایک قتل دوسری زندگی ہوگی مگر کیا بیوی اس قتل کی اجازت دے گی ___ چلتی ہوئی گاڑی میں بریک لگ گیا، نہیں کبھی نہیں، اگر اسے معلوم ہوگیا تو وہ مجھے قاتل سمجھ کر ساری زندگی مجھ سے نفرت کرے گی پھر پھر...

دفعتاً ماں کا وہ جملہ یاد آیا جو بہت غصّہ ہونے پر کہتی تھی، اگر میں جانتی تو پیدا ہوتے ہی نمک چٹا دیتی۔

نمک ___ میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، میں نے نمک دان ہاتھ میں اُٹھا لیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تم میرا کھانا ہی نہیں میری زندگی بھی مزیدار بنانے کی طاقت رکھتے ہو، کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا، میں نے تھوڑا سا نمک اپنی جیب میں ڈال لیا۔

جب ماں نے بچّی دیکھنے کو کہا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ بیوی کے کمرے میں داخل ہوگیا، بیوی کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

"پگلی تم رو رہی ہو" میں نے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھے "اتنا غم کروگی تو تمھاری صحت خراب ہو جائے گی اب قدرت کے کام میں ہمارا کیا دخل" میں نے اسے سمجھایا تو وہ میرے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کیا دُنیا کے سب سے بڑے گنہگار ہم ہی ہیں کہ بیٹے کی دولت سے محروم رہ گئے، میں نے خدا سے کتنی دُعا کی تھی منّتیں مانی تھیں مگر... وہ جانے کیا کیا کہتی رہی میرا ذہن کہیں اور تھا، میں نے بچّی پر پڑا ہوا تولیہ ہٹا دیا، گلابی رنگ کا پھول اپنے اُوپر گذرنے والے حادثے سے بےخبر سو رہا تھا، میں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی بائیں ہاتھ کی اُنگلی جیب میں نمک پر رکھ دی اور میرا داہنا ہاتھ بچّی کے بدن پر پھرنے لگا، کومل لمس نے میری رگوں میں سنسنی سی دوڑا دی تھی، میرے اندر بادل گرج رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی، بارش ہو رہی تھی۔

میں نے بیوی کی طرف دیکھا، وہ دوسری طرف مُنہ پھیرے آنسو پونچھ رہی تھی، میں نے احتیاط سے بائیں اُنگلی جیب سے نکالی اور بچّی پر اس طرح جُھک گیا کہ بیوی میری کارروائی نہ دیکھ سکے۔

ابھی میری اُنگلی بچّی کے ہونٹوں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

دُنیا کی آلودگی سے پاک جیسے دو کنول کھل گئے ہوں، مجھے لگا وہ معصوم اور پاکیزہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

پاپا میرا قصور کیا ہے؟

پھر نہ جانے کیسے ہوا کہ میں بچّی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

میری بیٹی، میری جان!!

م۔ م۔ راجندر

بھلائے نہ بنے:
میری پہلی ریڈیو تقریر

ریڈیو پر بولنے کا شوق یوں تو آج کل بھی ہوگا، مگر صاحب تقریباً چالیس بیالیس سال پہلے تو ریڈیو پر بولنے کو کامیابی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ ٹیلی ویژن اس زمانے میں تھا نہیں۔ فلموں تک رسائی آسان نہیں تھی اور نہ ادیبوں اور شاعروں کی فلم والوں کو ضرورت تھی۔ اُن ادیبوں اور شاعروں کا شمار بھی انگلیوں پر کیا جاسکتا تھا جن کی تخلیقات چوٹی کے ادبی رسائل میں چھپتی تھیں مگر ادبی رسائل سے بلند تر سطح پر تھا آل انڈیا ریڈیو اور ہر ادیب و شاعر کی دلی خواہش ہوتی کہ کسی طرح ریڈیو تک رسائی ہوجائے۔ میں جب کبھی ریڈیو اسٹیشن کی بلڈنگ کے سامنے سے گذرتا تو دل ہی دل میں سوچتا کہ جانے یہ عمارت کون عجوبہ ہے اور حیرت سے ان لوگوں کو دیکھتا جو چوڑی دار پاجامہ اور ململ کا کُرتہ پہنے اس میں داخل ہوتے یا اندر سے باہر آتے۔

ریڈیو پر اُس سیکشن کو جس میں ادیبوں اور شاعروں کو تقریروں، کلام خوانی یا ادبی بحثوں کے لیے بک کیا جاتا تھا، ٹاکس سیکشن کہا جاتا تھا اور عموماً اس کے انچارج یعنی پروگرام اسسٹنٹ اُردو کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر ہوتے تھے۔ ریڈیو پر ملازم شاعر یا ادیب کو باہر کے شاعر اور ادیب بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب ریڈیو سے میری پہلی تقریر براڈ کاسٹ ہوئی تھی تو اعجاز بٹالوی اور ضیا جالندھری اس سیکشن کے انچارج تھے۔

یوں تو میں نے ادبی رسائل میں ۱۹۴۳ء سے لکھنا شروع کر دیا تھا، مگر صرف سال دو سال کی غیر معتبر ادبی زندگی کے بعد ریڈیو پر بولنے کی آرزو کرنا خام خیالی تھی، مگر چونکہ دلی میں مقیم تھا، اس کی طرف نگاہ بھی تھی۔ اس معاملے میں قسمت نے یاوری کی۔ ان دنوں اجمیری گیٹ پر اینگلو عربک کالج میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ہر اتوار کو محفل ہوتی تھی۔ اور میں بھی ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ تابش دہلوی اس کے سیکریٹری تھے۔ وہ محفل شروع کرنے سے پہلے موجود ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی کا نام بطور صدر کے تجویز کر دیتے تھے۔ جس کی تائید رسمی طور پر کوئی دوسرا کر دیتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک موقع پر تابش صاحب کے علاوہ صرف چار ادیب ہی آئے اور وہ بھی گمنام۔ تابش دہلوی نے اچانک میرا نام صدارت کے لیے تجویز کر دیا۔ اور میں نے کرسیِ صدارت سنبھال لی۔ لیکن اب جو ادیب اور شاعر آنا شروع ہوئے تو خاصہ اجتماع ہوگیا اور بلّی کے بھاگوں چھینکا یوں ٹوٹا کہ بمبئی کے کچھ مشہور ادیب جو لاہور جاتے ہوئے دلی ٹھہر گئے تھے اعجاز بٹالوی اور ضیا جالندھری کے ہمراہ یہاں آگئے۔ عام طور پر نئے آنے والے غور سے صدر کو دیکھتے ہیں اور اسے نہ پہچاننے کی صورت میں کسی پاس بیٹھے ہوئے سے پوچھ لیتے ہیں۔ بد قسمتی سے صدر کو سب لوگ صاحبِ صدر کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور جب تک کوئی اس کا نام نہ لے تو اس کی شخصیت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ بہر حال لوگوں کو جلد ہی پتہ لگ گیا کہ اس جلسے کا صدر میں تھا۔ میری غیب سے ایک اور مدد یہ ہوئی کہ میرا ایک تحقیقی مضمون جو میں نے "ہمایوں" میں اس یقین کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ جلد یا بدیر لوٹ آئے گا اتفاق سے "ہمایوں" میں چھپ گیا تھا اور وہ شمارہ اُس وقت اعجاز بٹالوی کے ہاتھ میں تھا۔ اُن دنوں "ہمایوں" میں چھپنا بہت بڑی بات تھی۔ تیسرا حربہ میں نے استعمال کیا کہ صدر کے طور پر پڑھے گئے افسانے اور نظم پر اعجاز بٹالوی اور ضیا جالندھری کی ہر رائے سے میں نے اتفاق کیا اور بحث سمیٹتے ہوئے کئی دوسروں کی صحیح آرا کو رد کر دیا۔ کیوں کہ وہ ان دونوں کی رائے سے مختلف تھیں۔ محفل کے اختتام پر اعجاز بٹالوی میری طرف بڑھے اور مجھے ایک طرف کو لے جا کر بولے:

"آپ ریڈیو کے لیے بھی تو لکھیے۔ میں ایک نئی سیریز شروع کر رہا ہوں جس میں 'انسان اور فن' اور 'انسان اور ادب' پر ابھی کسی کو بک نہیں کیا۔ آپ 'انسان اور ادب' پر لکھیے۔ میں کل ہی کانٹریکٹ بھجوا دوں گا۔"

میری باچھیں کھل گئیں۔ اگرچہ میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے آسمان کو چھو لیا ہے اور خوشی کے مارے

۹۸ چتر وہار دہلی

رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگلے دن کچھ گھبراہٹ سی بھی ہوئی کیوں کہ ان دنوں 'لائیو' براڈ کاسٹ ہوتا تھا یعنی نشر کے وقت خود جاکر بولنا پڑتا تھا۔ پھر پروگرام اسسٹنٹ معیارِ تحریر کے علاوہ حسنِ ادائیگی اور صحتِ الفاظ اور تلفظ پر بڑا زور دیتا تھا۔ اور آپ کو بار بار ٹوکتا اور روکتا تھا۔ اور کئی کئی ریہرسلیں کراتا تھا۔ اس کا مطلب بلاشبہ آپ پر اپنی برتری جتانا ہوتا۔ مگر دھیان رہے کہ ان معاملات میں اسے چیلنج کرنا نہ صرف آئندہ کے لیے اپنے پروگرام بند کروانا بلکہ اُس پروگرام کو بھی خطرے میں ڈالنا تھا۔ ویسے تلفظ کے معاملے میں آپ سے بہتر وہ اس لیے تھا کیوں کہ وہ بڑے بڑے عاملوں اور اساتذہ کو سٹوڈیو میں سُنتا تھا۔ اور اپنے غلط تلفظ ٹھیک کر لیتا تھا۔ بہر حال کانٹریکٹ تو ایک ہفتے بعد آگیا۔ مگر کچھ انگریزی کی کتابیں پڑھ کر تقریر ہم نے پہلے سے ہی لکھ لی تھی۔ کسی مضمون کے لکھنے میں اس سے زیادہ محنت نہیں کی تھی۔ کیوں کہ یہ میری ریڈیو سے پہلی تقریر تھی۔ اور اس کی کامیابی پر آئندہ پروگراموں کا انحصار تھا۔ اس کے علاوہ یہ میری ادب سے پہلی آمدنی ہوئی تھی۔

جس روز ریہرسل تھی اس روز میں نے اپنے مسودے کو کوئی دس بارہ مرتبہ گھڑی سامنے رکھ کر گھر میں بول کر پڑھا ہوگا۔ تقریر کبھی ایک منٹ پہلے ختم ہو جاتی اور کبھی ایک پیرا باقی رہ جاتا۔ حواس الگ باختہ ہو رہے تھے۔ کیوں کہ کسی بھی لمحے ریڈیو اسٹیشن سے کار مجھے لینے کے لیے آنے والی تھی۔ ایک بات جو مجھے عجیب سی لگ رہی تھی وہ یہ تھی کہ میرا خط اتنا باریک تھا کہ پندرہ منٹ کی تقریر کاپی کے کاغذ کے ڈیڑھ صفحے پر ہی ختم ہو گئی تھی۔ بہر حال اوراق دو تھے اور میں نے دونوں ورق پن سے نتھی کر کے انھیں ہاتھ میں تھامے جانے والے مسودے کی شکل دے دی۔

ریہرسل میں پسینے چھوٹ گئے حالاں کہ سٹوڈیو میں ائر کنڈیشنڈ تھا۔ اعجاز بٹالوی مجھے سٹوڈیو میں کرسی پر بٹھا کر متعدد ہدایتیں دینے لگے اور سُرخ اور ہرے سگنل کا مطلب سمجھایا۔ سٹوڈیو کی گھڑی کی طرف اور سیکنڈوں کی سُرخ موٹی سوئی کی طرف خاص توجہ دلائی۔ ہمارے ساتھ ایک دقت یہ تھی کہ دُور کی نظر بہت کمزور تھی مگر چشمے سے گریز تھا۔ لال سوئی کے پورے منٹ پر پہنچتے ہی تقریر شروع کرنی اور ختم کرنی تھی۔ مگر ہمیں لال سوئی کی ٹِک ٹِک کی پریشان کن آواز تو سنائی دے رہی تھی۔ بہر حال آنکھ میچ کر دیکھا تو لال سوئی قدرے ہویدا ہو گئی۔ اگرچہ ہم نے سٹوڈیو میں گھسنے سے پہلے دو مرتبہ پانی پی لیا تھا۔ مگر گلا بار بار خشک ہو رہا تھا۔ شکر تھا کہ پانی کا بھرا گلاس میز پر پاس ہی رکھا تھا۔

ہم نے یہ تقریر کوئی سات مرتبہ پڑھی ہوگی۔ اور چودہ بار اعجاز بٹالوی نے ہمیں ٹوکا ہوگا۔ اور کوئی دس بار وہ اپنی شیشے کے پار والی نشست سے اٹھ کر سٹوڈیو میں ایسے داخل ہوئے ہوں گے جیسے میں نے شاید مائک توڑ دیا ہو۔ کبھی ان کی نظر میں، میں تیز پڑھنے لگتا اور کبھی آہستہ۔ کبھی میرے تیز سانس چلنے کی آواز انھیں سنائی دیتی اور کبھی میرے کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ۔ اعجاز بٹالوی نے دونوں کاغذوں کا پن کھول کر انھیں الگ الگ رکھ دیا اور مجھے یہ ہدایت دے دی کہ جب میں اپنے پہلے صفحے کی آخری دو سطور پر پہنچوں تو ایک ہاتھ سے بغیر پہلے کاغذ پر سے نظر ہٹائے وہ ہاتھ بڑھا کر دوسرا کاغذ اپنی طرف لے آؤں اور پہلے کاغذ کو کمال ہوشیاری اور آہستگی سے پرے کھسکا دوں۔ لیکن جب میں نے ایسا کیا تو ہاتھ مائک پر لگ گیا اور اعجاز بٹالوی کو زبردست جھن جھن کی آواز سنائی دی۔ وہ دوڑ کر سٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ اِدھر میں نے دوسرے کاغذ کو پکڑ کر اپنے سامنے کھسکایا تو اس وقت تک پورے آدھ منٹ کا وقفہ دونوں فقروں کے درمیان آچکا تھا۔ خدا خدا کر کے ریہرسل ختم ہوئی اور صحیح وسالم گھر واپس آئے۔

آٹھ بجے رات کو تقریر نشر ہونی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن کی کار سات بجے ہی آگئی۔ تقریر کا مسودہ تو اعجاز بٹالوی نے ہی رکھ لیا تھا مگر میرے پاس نقل تھی۔ اور گھر پر بھی سٹوڈیو سے لوٹنے کے بعد ریہرسل کر چکا تھا۔ اور کم سے کم دس بار سوچا تھا کہ سٹوڈیو کی ریہرسل کے بعد حواس کچھ ٹھکانے آجائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں کہ اصل ڈراما تو اب شروع ہونا تھا۔ گھبرایا ہوا کار میں بیٹھا اور کار میں بھی تقریر کی اپنی نقل کو دل ہی دل میں پڑھ کر ریہرسل کرتا رہا۔ ایک تسلّی بخش بات یہ تھی کہ اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر اعجاز بٹالوی نہیں ہوں گے اور مجھے مسودہ ڈیوٹی آفیسر دے گا۔ مگر ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر ڈیوٹی روم میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اعجاز بٹالوی تو ڈیوٹی آفیسر کے سامنے ہی بیٹھے ہیں اور میرے مسودے کو پڑھ رہے ہیں۔ انھیں یہاں پاکر میں پھر نروس ہو گیا۔ اعجاز بٹالوی بولے:

"آپ کی پہلی تقریر ہے، میں نے سوچا کہ خود آجاؤں تو آپ کی دل جمعی رہے گی۔ ابھی تو بڑا وقت ہے۔ ایک دفعہ پھر پڑھ لیجیے۔"

میں آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر سٹوڈیو نمبر ۸ میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اعجاز بٹالوی سختی سے سٹوڈیو کا دروازہ بند کر کے کنٹرول روم میں بیٹھ کر مجھے شیشے میں سے گھور رہے تھے۔ میں کرسی

اکبر علی خاں عرشی زادہ

فیض اور اختر شیرانی

کچھ اشارے

فیض اپنی ابتدائی تعلیم مرے کالج سیالکوٹ سے مکمل کر کے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے۔ یہ اُن کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ لاہور کی عظیم ادبی روایات ہی میں فیض نے اپنے ادبی مزاج کو بنایا، سنوارا اور نکھارا، یہیں سے وہ باقاعدہ طور پر ادبی محفل میں داخل ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو کے مشہور رُومانی شاعر، اختر شیرانی کی نغمگی اُردو کی ساری فضا میں بسی ہوئی تھی، جس کے زیرِ اثر آنے سے اختر شیرانی کے معاصر ہم عمر شعرا مثلاً ساغر نظامی، رَوش صدیقی، احسان دانش وغیرہ بھی نہ بچ سکے۔ تو پھر فیض اس نغمگی سے مسحور ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے جن کا مزاج بھی رومانی تھا۔ ان کی کئی ابتدائی نظمیں موضوع اور لہجے دونوں اعتبار سے اختر شیرانی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ اختر شیرانی اُردو کے اوّلین سانیٹ لکھنے والوں میں سے ہیں اور اسی طرح شاید سب سے بہتر سانیٹ نگار بھی۔ فیض کی ان نظموں میں اختر شیرانی کے سانیٹ عکس پذیر نظر آتے ہیں۔ فیض کی یہ نظمیں سانیٹ تو نہیں البتّہ سانیٹ کی ہیئت سے قریب تر ضرور ہیں ان نظموں میں اختر شیرانی کے الفاظ ہی نہیں دکھائی دیتے فضا بھی صاف محسوس ہوتی ہے۔ گو اختر شیرانی سے اپنے نیاز مندانہ تعلقات کے ذکر کے باوجود فیض نے خود کہیں یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ براہِ راست اختر شیرانی سے متاثر ہیں لیکن جن قارئین نے اختر شیرانی اور فیض دونوں کو پڑھا ہے اُن کے لیے فیض کی جانب سے کسی اعتراف کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ البتّہ فیض نے کیٹس اور شیلی نیز انگریزی کے دوسرے رومانی شعرا سے متاثر ہونے کا ذکر اکثر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ فیض کی ابتدائی نظمیں یعنی نقشِ فریادی کا بیشتر حصّہ، اختر شیرانی اور انگریزی کی رومانوی شاعری کا امتزاج معلوم ہوتا ہے۔

گورنمنٹ کالج سے فراغت کے بعد ۱۹۳۵ء میں فیض نے امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں انگریزی کے لکچرار کے طور پر ملازمت کرلی۔ یہاں اُن کی ملاقاتیں رام پور کے صاحبزادے محمود الظفر اور اُن کی باذوق اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئیں۔ یہ دونوں ترقّی پسند تحریک کے زبردست مبلّغ تھے۔ جلد ہی انھوں نے فیض کو متاثر کرلیا اور فیض اس تحریک کے ایسے سرگرم رکن بن گئے کہ پنجاب میں تحریک کی رہنمائی فیض ہی نے کی۔ یہاں قارئین اگر اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھیں تو بہتر ہوگا کہ فیض ذاتی طور پر بھی اختر شیرانی سے بہت نزدیک تھے۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' (ص ۵۰ تا ۵۲ طبع ۱۹۵۹ء) میں لکھا ہے کہ جب وہ اس تحریک کا علم لے کر پنجاب پہنچے تو فیض انھیں اختر شیرانی سے ملانے لے گئے اور اُن سے تحریک کی حمایت میں اس کے محضر پر دستخط حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوتے۔ اس واقعے سے یہ بھی اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سجاد ظہیر اور فیض کی نظر میں اختر شیرانی کی اہمیت کس قدر تھی۔

بگمانِ غالب فیض امرتسر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے عشق میں ناکام ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض کی اس دردمندی کو بھانپ لیا، اور ان کے دل میں غمِ عشق کی جگہ غمِ جہاں کا بیج بو دیا۔ اس نئی تخم ریزی نے فیض کو ایک نئے نشے سے آشنا کیا جو غمِ عشق کے ساتھ مل کر دو آتشہ ہوگیا، اور فیض کی شاعری کو صحیح سمت میسّر آگئی۔ اب فیض نے جو نظمیں کہیں اُن میں شعوری طور پر ترقی پسند خیالات اور عقائد کو بھی سمویا۔ وہ بنیادی طور پر رومانی مزاج کے مالک تھے اس لیے تحریک سے وابستگی کے باوجود بھی ان کی شاعری پر محبوب ہی چھایا رہا، اس زمانے میں انھوں نے "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"، "رقیب سے" اور "موضوعِ سخن" جیسی چونکا دینے والی نظمیں تخلیق کیں۔ ان نظموں میں اگرچہ عشقِ جاناں سے دست برداری کا اعلان کیا گیا ہے لیکن فیض کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ واقعتہً وہ غمِ عشق سے دست بردار کبھی نہیں ہوئے اور نہ کبھی اختر شیرانی کے اثرات ہی سے باہر نکل سکے۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا" پڑھ کر جو فیض کی ایک مشہور نظم کا بنیادی خیال ہی نہیں اُن کے زبان زد مصرعوں میں سے بھی ایک ہے اختر شیرانی کا مصرع:

اور بھی بحثیں ہیں مسجد میں عبادت کے سوا

کا یاد آجانا قدرتی بات ہے۔ اسی طرح فیض کی ایک

محلہ پھلوار، رامپور، یوپی۔

اور نظم میں "رقیب سے" ان کا دوستانہ اور مساویانہ رویّہ بھی اختر شیرانی کی ایک مشہور نظم" او دیس سے آنے والے بتا" کے اسی مصرعے سے متاثر ہوئے بغیر ممکن نہیں :

ہم دونوں تھے جس کے پروانے وہ شمع شبستاں کیسی ہے؟

اس خیال کی اہمیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فراق گورکھ پوری نے عشقیہ شاعری پر اپنا مقالہ لکھا تو اس میں فیض کی نظم "رقیب سے" کا خاص طور پر تذکرہ کیا اور ان الفاظ میں داد دی کہ اس موضوع پر جو کچھ فیض نے اپنی نظم میں لکھا ہے اس سے زیادہ کالی داس سعدی اور شیکسپیر بھی کیا کہہ سکتے تھے ۔ جیسا کہ مندرجہ بالا مصرعے سے ظاہر ہے بنیادی خیال اختر شیرانی کا ہے ۔ اسی لیے اس داد کے پہلے مستحق بھی وہی ٹھہرتے ہیں البتّہ یہ درست ہے کہ فیض نے اختر شیرانی سے موضوع مستعار لینے کے باوجود اس کو اپنی تحریک کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو قلم کاری کی ہے اس نے مضمون کو زیادہ پُرکشش بنا دیا ہے لیکن اپنے چراغ کے لیے تیل اُسی چراغ سے لیا ہے ۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اختر شیرانی کی نظم" او دیس سے آنے والے بتا" کی بحر فیض کی پسندیدہ ترین بحروں میں سے ہے اور فیض کی تقریباً بیس غزلیں / نظمیں اختر شیرانی کی اسی نظم کی بحر میں لکھی گئی ہیں ۔

نقشِ فریادی کے بعد دستِ صبا اور زنداں نامہ دونوں قید و بند کے تجربات پر مبنی ہونے کے باوجود رومان اور حقیقت کے سنگم کو پیش کرتی ہیں ۔ ان کو پڑھتے ہوئے بھی کئی جگہ اختر شیرانی کی یاد آجاتی ہے ۔ دستِ صبا کی ایک مقبول نظم "دو عشق" ہے اس کا مرکزی خیال اختر شیرانی ہی کے چار مصرعوں کا مرہون منت ہے ۔ ملاحظہ ہوں :

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

بلکہ زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ فیض نے تو اس طرح عشق کو قربان کر دینے کی جرأت بھی نہیں کی ۔

فیض نے دستِ صبا اور زنداں نامہ ہی میں نہیں بعد کے کلام میں بھی خاص طور پر غزلوں میں صیاد و قفس کے موضوع کو سیاسی علامت کے طور پر مسلسل استعمال کیا ہے اختر شیرانی ان سے بہت پہلے "گلبانگِ قفس" کے عنوان سے ایک غزل کہہ چکے تھے ۔ جس کا زیادہ موزوں عنوان "زنداں نامہ" ہوتا ۔ اس زنداں نامے کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

مدّت سے نہ آئی کوئی خبر یارانِ گلستاں کیسے ہیں
اے بادِ صبا اتنا تو بتا سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں
پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں اربابِ گلستاں کیسے ہیں
ہر ایک قدم یاں محبسِ غم ہر تازہ ستم اک مصرِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں
ہمدرد ہے اپنا کون یہاں لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اس سال وطن کے باغوں میں گل ہائے بہاراں کیسے ہیں
غربت ہی نہ تھی کم ہوش رُبا اس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آکے ذرا ہم خستہ حرماں کیسے ہیں
صیّاد نے کیوں چُن چُن کے کیا بے جرم و خطا محبوس بلا
ہے کس کو غرض جو پوچھے ذرا آباد یہ زنداں کیسے ہیں
اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن خوش باش سُنا پھر حالِ وطن
کہسار و دمن کس حال میں ہیں وادی و خیاباں کیسے ہیں
کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس افسانۂ رنگ و بو مجھ سے
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب گل کیسے ہیں گلستاں کیسے ہیں

گلبانگِ قفس ہی بن جاتے اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیے کہ اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں

اختر شیرانی سے فیض کی اثر پذیری تفصیلی مطالعے کا موضوع ہے یہاں میرا مقصود صرف چند اشارے کرنا تھا ۔ فیض کی شاعری کو تارِ حریرِ دو رنگ کا حسن نصیب ہوا تو اس میں اختر شیرانی کی شاعری کو ضرور دخل ہے ورنہ فیض جس تحریک سے وابستہ تھے اس کے بیشتر قلم کاروں کا تخلیق کردہ ادب نعروں سے بھرا ہوا ہے اور ایک بلغار کی سی کیفیت نظر آتی ہے ۔ اس کے برخلاف فیض ہیں جن کی شاعری دیوار پر لگے ہوئے پوسٹر اور الیکشنی تقریر سے مختلف ہے ۔

فیض کے پڑھنے والوں کو ان کے کلام میں کہیں کہیں اندازِ بیان کی اجنبیت محسوس ہوتی ہے شاید اس کا سبب فیض کا یہ حسنِ ظن ہے کہ وہ اپنے قاری کو انگریزی شاعری سے اتنا ہی آشنا جانتے ہیں جتنے وہ خود تھے شکر ہے کہ فیض نے اُردو شاعری کے کلاسکی سرمائے سے بھی فیض اٹھایا ۔ اور اس کی لفظیات کو اس خوبی حسن اور سلیقے کے ساتھ استعمال کیا کہ یہی آج ان کی پہچان بھی ہے ۔

فیض تقریباً نصف صدی تک لکھتے رہے ۔ اور ایک پُرتسلسل ادبی شخصیت بنے رہنے کے بعد ۲۰ نومبر ۸۴ء کو ہم سے رخصت ہو گئے ۔ ادیبوں اور شاعروں کی زندگی میں جہاں ان کے خیالات اور شخصی پہلوؤں کو سمجھنا آسان ہوتا ہے وہیں کچھ موانع بھی ہوتے ہیں ۔ لکھنے والے کبھی دلداری کی خاطر یا دل آزاری کے خوف سے مکمل سچ نہیں لکھ پاتے لیکن کسی فن کار کے بزم ہستی سے اٹھ جانے کے بعد جب ایسے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں کہ اُس فنکار کے اندازِ فکر یا اندازِ بیان میں

کوئی تبدیلی آئے، دلداری و دل آزاری کا معاملہ بھی اتنا نازک نہیں رہتا جتنا اُس فنکار کی زندگی میں ہوتا ہے تو نقد و نظر کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اب جائزہ لینے والوں کے سامنے فنکار کا کل سرمایہ ہوتا ہے اور وہ آزادانہ اظہارِ خیال بھی کرسکتے ہیں۔ اس لیے اُمید کی جانی چاہیے کہ آج فیض کی شخصیت اور فن پر لکھنے والوں کا معیار گزشتہ سے بہتر ہوگا اور پرکھ کی بنیاد بھی زیادہ مضبوط دلائل پر رکھی جائے گی۔ اختر شیرانی اور فیض کے رشتوں کی طرف اشارے کرنے کا سبب بس یہی ہے کہ کوئی صاحب اس موضوع پر مفصل اور مبسوط تحریر پیش کرسکیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب کی سب سے زیادہ متاثر کرنے والی اور سب سے زیادہ ہدف تنقید بننے والی تحریک کے لاتعداد شعرا میں سب سے روشن نام فیض ہی کا ہے اور اس منصب پر وہ ہمیشہ فائز رہیں گے۔ یہ شرف ہر دور میں معدودے چند کو نصیب ہوتا ہے فیض اسی مختصر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا آزاد کے خطوط، دیگر تحریریں اور تصویریں

مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقعے پر اُردو اکادمی، دہلی نے تین کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے —— پہلی کتاب مولانا کی تصویروں پر مشتمل ہوگی، دوسری مولانا کے خطوط پر اور تیسری مولانا کی ان تحریروں پر جو اب تک کتابی شکل میں سامنے نہیں آئی ہیں۔

اس ارادے کو عملی شکل دینے کے لیے ہم آپ کی مدد کے محتاج ہیں۔ ابھی برِصغیر ہند و پاک میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے جن کے پاس مولانا کے خطوط، دیگر تحریریں یا تصویریں موجود ہوں گی۔

اگر آپ کے پاس بھی مولانا کی کوئی تصویر، تحریر، یا خط موجود ہے تو براہِ کرم عاریتاً ہمیں عنایت فرمادیں۔ ہم اسے آپ کے حوالے سے شاملِ کتاب کریں گے اور استعمال کے بعد بہ حفاظت آپ کو واپس کردیں گے۔

ہم یہ تینوں کتابیں اسی سال میں شائع کردینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے آپ سے فوری توجّہ کی گزارش ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک تاریخی اہمیت کا کام ہوگا اور اس میں آپ کی شرکت ایک قومی فریضے کی ادائیگی کے مترادف ہے۔

ہم آپ کی عنایات کے منتظر رہیں گے۔ خط و کتابت درجِ ذیل پتے پر فرمائیں:

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

م.ق.خاں

نوشیرواں

نئے بادشاہ کا نام نوشیرواں تھا۔

بادشاہ نے جیسے ہی دربارِ عام میں قدم رکھا کہ سارے درباری اور عملے مؤدب کھڑے ہوگئے۔ بادشاہ تخت نشین ہوا اور سارے لوگ اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ لوگ فرداً فرداً اپنی کارگزاریوں کی روداد پیش کریں۔ بادشاہ کی نظر جس کی جانب اٹھتی وہ شخص دست بدستہ کھڑا ہوتا اور نظم و نسق کا حال سُناتا۔ ان کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ملک میں ہر طرف امن و امان ہے اور ملک دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ لوگ اپنا حال سُنانے سے پہلے بادشاہ سلامت کے اوصافِ حمیدہ کی تعریف بھی کرتے جاتے۔ بادشاہ کا چہرا فخر سے کھل اٹھا تھا اور سر بلند ہوتا جا رہا تھا۔

اسی درمیان ایک درباری اُٹھا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی ہمّتِ گویائی جیسے مفلوج ہوگئی تھی۔ سارے درباریوں اور عملوں کی نظر اس درباری کے چہرے پر تھی۔ بادشاہ بھی اس درباری کو دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ کے چہرے پر عجیب فکر و تردّد کے آثار تھے۔ جب اس درباری کے ہونٹ خاموش رہ گئے تو بادشاہ نے اس کی ہمّت افزائی کرتے ہوئے کہا —— "جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا خوف و خطر کہو۔ ہم تمہاری بات سننے کے منتظر ہیں۔"

"جہاں پناہ!" اس درباری کے ہونٹ پھر ساکت و جامد ہوگئے۔ وہ پورے جسم سے کانپ رہا تھا۔ ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے لیکن اپنے جذبات کو الفاظ دینے سے وہ معذور تھا۔

"کیوں؟ خاموش کیوں ہوگئے؟ تم نہیں جانتے کہ یہ دربارِ عام ہے اور یہاں سب کو اظہارِ رائے کی مکمّل آزادی ہے۔"

"حضور والا! آپ کے محل کی تعمیر کے کام میں ایک رخنہ پڑ گیا ہے۔"

"کیوں؟ آخر کس چیز کی کمی ہے؟ ہم نے تمام عملوں اور ذمّہ داروں کو خاص طور پر ہدایت کر دی ہے کہ تمھیں جس چیز کی ضرورت ہو کہیں سے بھی مہیّا کی جائے۔"

"سوال آپ کے عملوں کا نہیں ہے۔ آپ کے محل کے قریب ایک ضعیفہ کی جھوپڑی ہے۔ وہ ضعیفہ کسی قیمت پر اس جھوپڑی سے ہٹنا نہیں چاہتی۔ میں نے اس سے ایک مکان بنوا کر دینے کا وعدہ کیا۔ مُنہ مانگی قیمت ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم ہے اور اس جھوپڑی کے وہاں رہتے ہوئے قلعے کی دیوار سیدھی نہیں ہوسکتی۔"

لوگوں کی نگاہیں کبھی اس درباری کی جانب جاتیں اور کبھی بادشاہ کی جانب۔ بات کسی عام بادشاہ کی ہوتی تو لوگوں میں کسی قسم کی کش مکش نہ ہوتی —— وہ فیصلہ صادر کرنے کے پہلے ہی اندازہ لگا لیتے کہ جھوپڑی مسمار کر کے دیوار سیدھی کر لی جائے گی۔ یہاں سوال نوشیرواں کا تھا جس کے نام کا دوسرا لفظ عادل تھا۔ لوگوں نے صحیح یا غلط پرانی داستان سُن رکھی تھی اور وہی داستان ان کے ذہنوں پر عفریت کی طرح مسلّط تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نوشیروانِ عادل نے حکم دیا تھا کہ قلعے کی دیوار خواہ کیسی ہی ٹیڑھی کیوں نہ ہو، ضعیفہ کی جھوپڑی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ یہ داستان اس نئے بادشاہ نوشیرواں نے بھی سُنی تھی۔ اس نے درباری سے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود اس ضعیفہ سے نمٹ لوں گا۔"

دوسرے دن بادشاہ ضعیفہ کے پاس گیا۔ اس نے بغور دیکھا تو اُسے یاد آیا کہ کسی وقت جب کہیں سے لُٹی پٹی یہ ضعیفہ اس کے باپ کے پاس آئی تھی تو اس کے باپ نے اس ضعیفہ کو یہ جھوپڑی عطا کی تھی۔ اس نے ضعیفہ سے ملاقات کی اور کہا

"ماں، تم مجھے پہچانتی ہو؟"

"کیوں نہیں، آپ شاہزادہ نوشیرواں ہیں۔ اللہ آپ کو ہزار سال کی عمر عطا کرے۔"

"ماں، اب میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔"

"مبارک ہو! خدا کرے آپ کی سلطنت چہار دانگ میں پھیل جائے ——

حکیم عنایت کالونی، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

آپ آ گئے ہیں تو ایک بات آپ کو بھی بتا دوں۔ ادھر کچھ دنوں سے آپ کا ایک عملہ روز مجھے اس جھونپڑی کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کو کہتا ہے۔ میں اب تک انکار کرتی رہی ہوں۔ کل اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ مجھے اس جھونپڑی سمیت اٹھا کر کسی گڈھے میں دفن کر دے گا۔ خدا کا شکر ہے آپ خود آ گئے۔ میں آج دربار میں جانا ہی چاہتی تھی۔"

"نہیں ماں، تم اسی جگہ آرام سے رہو۔ میں اس درباری سے اس سلسلے میں باز پرس کروں گا۔" بادشاہ نے ضعیفہ کو ڈھارس بندھائی اور وہاں سے چلا آیا۔

واپس جا کر اس نے قلعے کی دیوار کی جانب دیکھا۔ قلعہ فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھا۔ ضعیفہ کی کریہہ جھونپڑی سچ مچ کسی پیکرِ حُسن کی پیشانی پر کوڑھ کا بدنما داغ تھی۔

دوسرے دن پو پھٹنے کے پہلے شور و ہنگامہ سے ضعیفہ کی نیند ٹوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کی جھونپڑی مسلح لوگوں نے گھیر لی ہے۔ بلڈوزر اور ٹینکوں کی قطار جھونپڑی کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ ضعیفہ نے باہر نکل کر احتجاج کرنا چاہا تھا کہ گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ ضعیفہ کا جسم چھلنی ہو گیا اور چشم زدن میں جھونپڑی خاک نشیں ہو گئی۔ بادشاہ نے محل کے جھروکے سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو گیا۔ اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ——— "ضد کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ ضعیفہ سرکش ہوتی جا رہی تھی۔"

پھر مزدور آئے اور قلعے کی دیوار کا نامکمل کام تکمیل کی منزلیں طے کرنے لگا۔ شام تک دیوار پوری ہو گئی۔

دوسرے دن مُنہ اندھیرے بادشاہ اٹھا تو اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس جانب چلی گئیں جہاں کل تک اس ضعیفہ کی جھونپڑی تھی۔ بادشاہ کے غصّے کی کوئی حد نہیں رہی جب اُس نے دیکھا کہ قلعے کی دیوار نامکمل ہے اور جھونپڑی اپنی جگہ موجود ہے۔ بادشاہ سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگا لیکن دن کی روشنی میں بھی اس نے وہی دیکھا۔ اب وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے عملوں کو حُکم دیا کہ جھونپڑی اور جھونپڑی میں رہنے والی ضعیفہ کو روند ڈالا جائے۔ ایک بار پھر مسلح دستہ اور بلڈوزر اور ٹینک کا کارواں وہاں آ دھمکا ——— گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ ضعیفہ کی چیخ ابھری، اس کا جسم چھلنی ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے جھونپڑی زمین بوس ہو گئی اور مزدور قلعے کی دیوار تعمیر کرنے لگے۔

تیسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ایک بار پھر معاً بادشاہ کی نظر اس جانب چلی گئی۔ قلعے کی دیوار کی جگہ جھونپڑی پہلے کی طرح موجود تھی۔ بادشاہ نے ایک بار پھر حُکم صادر کیا ——— مسلح دستے نے ضعیفہ کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا اور بلڈوزر نے جھونپڑی کو مسمار کر دیا۔ اب بادشاہ کے حُکم سے فوج کا مسلح دستہ دن رات پہرہ دیتا لیکن پو پھٹے بادشاہ کی نظر جب بھی اس جانب جاتی وہ جھونپڑی وہاں ایستادہ نظر آتی اور وہ ضعیفہ وہاں موجود ہوتی۔

بادشاہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو جاتا۔ اب وہ جھونپڑی محض اپنی جگہ قائم ہی نہیں تھی بلکہ وہ ہر لمحہ بادشاہ کی نظروں کے سامنے تیرتی رہتی اور ضعیفہ کا گولیوں سے چھلنی جسم بھی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہتا۔

معین اعجاز

ہماری عینک کی پہلی سالگرہ

اس مہینے ہم نے اپنی عینک کی پہلی سالگرہ منائی حالاں کہ سالگرہ منانے کے سلسلے میں ہم کچھ اتنے بخیل واقع ہوتے ہیں کہ آج تک نہ اپنا جشنِ سالگرہ منایا نہ اپنے بچّوں کا! پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عینک میں کیا خوبی تھی جو ہم نے اتنا انقلابی فیصلہ کیا؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم آپ کو اپنی عینک کے بارے میں کچھ ضروری معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ اس عینک کی ہیئت بالکل ویسی ہی ہے جیسی ہم نے اُردو کے قاعدے میں "ع سے عینک" پڑھتے وقت دیکھی تھی۔ اس کا وجود مسلّم ہے اور یہ آنکھوں پر لگانے سے صاف نظر آتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کچھ عینکیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں لیکن انھیں آنکھوں پر لگا کر ہر چیز آپ اپنے ڈھنگ سے اور اپنی مرضی کے مطابق دیکھ سکتے ہیں۔ یہ وہ عینک ہوتی ہے جسے لگا کر کسی بھی فرد کی شناخت اُس کے مذہب، مسلک اور علاقے کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور اُس کی ذاتی صلاحیتیں اور خوبیاں اس عینک کی گرفت میں نہیں آتیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والے انسان بھی اس عینک سے نہیں دکھائی دیتے کیوں کہ لاشوں کا شمار ہم مخصوص ڈھنگ سے کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے بعض نقاد اسی طرح کی عینک لگا کر تنقید کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اس تنقید میں اس بات کا پورا پورا امکان ہوتا ہے کہ تخلیق کار کا مرنے سے پہلے ہی پوسٹ مارٹم بھی ہو جاتے۔

خیر اب ہم اُس عینک کا ذکر یہیں ختم کرتے ہیں ورنہ ہماری تاریخی عینک کا ذکر رہ جائے گا اور ہم اس کے جشنِ سالگرہ کی تفصیلات آپ کو نہیں بتا پائیں گے۔ ہوا یہ کہ پچھلے سال اسی مہینے ہم نے یہ عینک خریدی تھی۔ اس سے پہلے عینک لگانے والے ہر شخص کو ہم شک اور ایک حد تک ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس کرتے کہ عینک ہمیشہ مذاق کا موضوع بنتی رہی ہے۔ ہمارے اس خیال کو اپنے ایک بزرگ شاعر پنڈت آنند نرائن مُلاّ کے ایک شعر سے مزید تقویت اور تائید حاصل ہوئی جو بقول ان کے، ان کا پہلا شعر تھا۔ اور جو انھوں نے اسکول میں اپنے ایک ہم جماعت کے بارے میں کہا تھا:

یہ کیا اندھیر ہے یارو، یہ کیا طرفہ تماشہ ہے
کہ آہو چشم نے بھی آنکھ پر عینک لگائی ہے

لیکن عینک لگانے والا ہر شخص "آہو چشم" نہیں ہوتا۔ ہم سنتے آئے تھے کہ عینک وہی لوگ لگاتے ہیں جن کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے لیکن اس بات کا یقین کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بھی ہم نے کسی کی عینک کا مذاق اُڑایا اُس نے مسکرا کر یہی کہا "گھبراؤ نہیں! آج ہم، کل تمھاری باری ہے" لیکن اپنی "مجوزہ باری" سے ہم قطعی بے نیاز تھے کیوں کہ ہم سمجھتے تھے کہ جن آنکھوں سے آج سب کچھ صاف دکھائی دیتا ہے، ان سے کل بھلا دھندلا اور کم کیوں دکھائی دے گا؟ اس بے نیازی کی سزا ہمیں اُس وقت ملی جب ہم نے اپنی عمرِ عزیز کے تقریباً چالیس سال پورے کر لیے۔ اچانک ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اخبارات اور کتابوں کے حروف ہم سے آنکھ مچولی کرنے لگے ہیں۔ اس آنکھ مچولی میں کبھی ہم اخبار آنکھوں کے قریب لاتے اور کبھی کچھ دور لے جاتے۔ کبھی کبھی تو آنکھوں سے لگا بھی لیتے تھے۔ اس موقع پر آنکھوں سے لگانے کا محاورہ ایک قطعی نئے مفہوم کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوا۔

بہر حال دل نے کہا "تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ" اور ہم نے صورتِ حال کا کچھ دن یونہی مقابلہ کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس مقابلے میں ہم زیادہ دُور تک نہ جا سکیں گے اور اُس روز تو ہم کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گئے جب "فسٹول آف انڈیا" میں حصہ لینے کے لیے ملک کا ایک مشہور و معروف ادیب کچھ غیر ممالک کے دورے پر جانے والا تھا۔ انگریزی اخبار میں اس کی عمر شاید آٹھ سال درج تھی جسے اُردو میں منتقل کرتے وقت ہم نے

اُردو سروس، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

اتنی سال کردیا۔ وہ توخیریت ہوئی کہ اسے
نشر کرنے سے پہلے ہم نے چڑیا گھر والوں سے
رابطہ قائم کرلیا تھا ورنہ نہ جانے کتنے لوگ
ہماری خیریت دریافت کرنے ہمارے پاس
چلے آتے۔

اُس دن ہم نے اپنے کچھ قابلِ اعتماد
دوستوں اور بہی خواہوں سے صورتِ حال پر
تبادلۂ خیال کیا۔ ہر ایک نے یہی مشورہ دیا کہ
"آنکھیں ٹیسٹ کراکے چشمہ لے لو" ہم نے یتیموں
کی سی صورت بناکر ایک ایک سے دریافت
کیا کہ کیا عینک لگائے بغیر صورتِ حال پر قابو
نہیں پایا جاسکتا؟ کیا سائنس اور ٹکنالوجی
کی بے پناہ ترقی کے اِس دور میں ہمیں کوئی
ایسی دوا نہیں مل سکتی جو عینک سے ہمیں
محفوظ رکھ سکے؟ ہر طرف سے ایک ہی جواب
ملا۔ "جتنی دیر کروگے۔ اتنا ہی نقصان ہوگا۔
بینائی مزید کمزور ہوتی جائے گی۔

آخر ہم نے اپنے آپ کو عینک لگانے
پر مائل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ حالاں کہ
یہ سوچ کر کہ ہمیں عینک لگانا ہی پڑے گی،
ہمارے سینٹی مینٹ کو بڑی ٹھیس لگی تھی۔
نہ جانے کیسے کیسے عزیز یاد آتے تھے ہم نے یہ
محسوس کیا کہ عینک لگاتے ہی قیامت
آجائے گی یا کم از کم ایسی اتھل پتھل ضرور ہوگی
جیسے کامیابی کے بعد انقلاب اور ناکامی کے بعد
سازش کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن دل کو فریب
سکون دینے کے لیے ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ
آج دُنیا کی کم از کم ایک تہائی آبادی ضرور عینک
لگاتی ہے۔ کیا یہ سب بے وقوف اور کارٹون
نظر آتے ہیں؟ ہرگز نہیں! پھر ہم نے اپنے دفتر
کے رفقائے کار کی طرف چشمِ تصوّر دوڑائی۔
پتہ چلا کہ ان میں نصف سے زائد ایسے ہیں جو عینک
لگاتے ہیں اور ان کی طرف کوئی بھی عجیب وغریب
نظروں سے نہیں دیکھتا۔ اسی دوران ہمارے
ہم پیشہ و ہم مشرب دوست اشرف عابدی
چھٹیاں گذار کر جب لکھنؤ سے واپس آئے تو
پتہ چلا کہ ایک عدد عینک بھی ساتھ لاتے ہیں۔
اب ہمارے مایوس اور شکستہ دل کے لیے
سکون کے کچھ اور اسباب فراہم ہوئے۔ بلکہ ان
کی عینک اپنی آنکھوں پر لگا کر ہم نے گویا ریہرسل
بھی شروع کردی۔

چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد جب
ہم نے محسوس کرلیا کہ عینک سے مفر ممکن نہیں
نیز یہ کہ عینک لگانے سے کوئی غیر معمولی واقعہ بھی
رونما نہیں ہونے والا' تو ایک دن گھر میں ہم نے
اعلان کردیا کہ آج ہم اپنی آنکھیں ٹیسٹ
کرائیں گے۔ اور پھر شام کو دفتر سے نکل کر ہم
سیدھے کناٹ پلیس کی اُس دُکان پر پہنچے
جہاں ایک باریش بنگالی دادا لوگوں کی آنکھیں
ٹیسٹ کرکے عینک فراہم کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے
مخصوص قسم کی پیشہ ورانہ کارروائیوں کے ساتھ ساتھ
ہم سے چھوٹے بڑے حروف بھی کئی بار پڑھوائے۔
ہمیں ابتدائی تعلیم کا زمانہ یاد آگیا۔ ایک خاص
مرحلے پر جب چشمے والے دادا مطمئن ہوگئے تو
انھوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ کی عینک کا یہی
نمبر ہوگا۔ فریم آپ پسند کرلیجیے۔ اس میں
ہم آپ کے نمبر کا شیشہ لگاتے
دیتے ہیں۔"

جب ہم عینک لے کے چلے تو پان کی
دُکان پر پان کھانے کے بہانے' لوگوں کی نظریں
بچاکر آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کو ہم نے بار بار
دیکھا۔ پھر قریب کے چائے خانے میں جاکر بیٹھ
گئے وہاں ایک اخبار کو کبھی عینک کے بغیر
پڑھنے کی کوشش کی اور کبھی عینک لگاکر پڑھا
عینک کے بغیر' الفاظ حسبِ معمول آنکھ مچولی
کرتے اور عینک لگاتے ہی راہِ راست
آجاتے۔

اُس رات ہم گھر پر بہت دیر تک مـ
مطالعہ رہے اور صبح دفتر' وقت سے کچھ پہلے
پہنچ گئے۔ ویسے بھی ہم بیوقوفوں کی اُس نـ
سے تعلق رکھتے ہیں جو دفتر' وقت پر یا اس
کچھ پہلے پہنچ جایا کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد اد
ساتھی بھی آگئے۔ اب سب کے سامنے عینک
لگاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہورہی تھی۔ د
میں ایک وہم سا پیدا ہوگیا تھا۔ شاید خواتین
مذاق اُڑائیں۔ یا کوئی کسی طرح کی فقرہ باز
ہی کردے۔ بالآخر کنکھیوں سے اِدھر اُدھر د
کر' ڈرتے ڈرتے ہم نے عینک نکالی اور آنکھ
پر لگانے والے ہی تھے کہ ہمارے ایک ساتھ
مجیب صدیقی کی نظر پڑگئی۔ انھوں نے کچھ اس
انداز سے قہقہہ لگایا کہ گویا ہماری آنکھوں
عینک نہ لگی ہو بلکہ اُن کی آنکھوں سے ہمیشہ
لیے اتر گئی ہو۔ پھر انھوں نے کہا "بیٹا! ا
تم بھی ہمارے قبیلے میں شامل ہوگئے۔" دو
طرف سے ایک رفیقۂ کار نے یہ کہہ کر حوصلہ
کہ "بھئی معین صاحب! بخدا عینک لگاکر آ
اسکالر نظر آرہے ہیں۔ آپ کی "ڈگ نیٹی" میں
ایکدم اضافہ ہوگیا۔" اب معلوم نہیں مع
خاتون نے مذاق اڑانے کی غرض سے یہ کہا
یا واقعی سنجیدہ تھیں' ہم نے بہر حال ان
شکریہ ادا کردیا۔ چند ہی روز میں حالات
بالکل نارمل ہوگئے اور ہم عینک لگاکر کا
کرنے کے عادی ہوتے گئے بلکہ اب تو دوسر

دوستوں کو بھی عینک لگانے کے مشورے دینے لگے ہیں۔ اس مہم میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور ہمارے دو اور دوست مسعود ہاشمی اور محمد علی موج رام پوری بھی بفضلِ خدا عینک لگانے لگے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ عینک لینے سے پہلے ہمیں یہ خدشہ تھا کہ ہمارے عینک لگاتے ہی قربِ قیامت کے آثار نظر آنے لگیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ دوسری پیشین گوئیوں کی طرح قیامت سے متعلق یہ پیشین گوئی بھی غلط ثابت ہوئی۔ اب آپ ہی کہیے کہ کیا عینک کی سالگرہ منانے کے لیے یہ جواز کافی نہیں تھا؟

بادشاہی تھی مُقدّر میرا
سر مرا لے گیا لشکر میرا

ایک تلوار محافظ تھی مری
اور اِک نام تھا رہبر میرا

مَیں سرابوں میں خلا کے گُم ہوں
اور سب کچھ ہے زمیں پر میرا

ڈوب جائے گی بُرائی تیری
ظرف ہے یار سمندر میرا

میرے دل میں جو وہ اُترا اظہر
دیکھتا رہ گیا منظر میرا

○

فکر میں ہیں ہمیں بُجھانے کی
آندھیاں میر کے زمانے کی
میرا گھر ہے پُرانے وقتوں کا
اُس کی آنکھیں نئے زمانے کی
اب کوئی بات بُھولتا ہی نہیں
ہائے وہ عمر بُھول جانے کی
اپنے اندر کا شور کم تو ہوا
خامشی میں کتاب خانے کی
ایک منظر تھا یاد رکھنے کا
ایک تصویر تھی بنانے کی
جاگتے میں گزار دیں اظہر
وہ جو راتیں تھیں نیند آنے کی

اظہر عنایتی

پیر شیخ، رامپور، یو۔پی۔

آنچ جب ماند ہوئی، راکھ ہے انگاروں کی
شوخیاں لوٹ کے آتی نہیں رُخساروں کی

دل نے اندازِ طلب، ہائے سکھائے کیا کیا
آنکھ اُٹھتی ہی نہیں تیرے گنہگاروں کی

قدرِ دل، قدرِ جنوں، قدرِ محبت معلوم
کس کو پروا ہے مگر دُنیا کے بازاروں کی

نکہتِ گُل کے لیے بعد میں ہی سوچیں گے
پہلے سینے میں سجائیں تو کھٹک خاروں کی

ہر قدم بادِ حوادث کے تھپیڑے انوار
بات بھی کس لیے ہم سوچیں سمن زاروں کی

انوار رضوی

۲۸ سی، پاکٹ ۱/۷، ۱۰، کالکاجی ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

مودود صدیقی

بیدل بیکانیری

تخلیقی ادب کی پہچان اور پسندیدگی کو جب سے مختلف سیاسی اور نظریاتی خانوں میں بانٹ کر دیکھا جانے لگا، تب سے اچھے اور خالص ادب کی آبرو خطرے میں پڑ گئی۔ قدیم شعری روایات سے جڑے شاعر فیشن پرست نقادوں کی توجہ سے پوری طرح محروم رہے اور اپنے وجود کو بنائے رکھنے کے لیے یا تو مشاعرے کی اسٹیج پر اپنے معیار سے ہٹ کر داد وتحسین حاصل کرتے نظر آتے یا پھر گوشہ نشین ہو کر ادب کی قدیم اور صالح قدروں کی حفاظت کرتے رہے۔

ایسے ہی گوشہ نشین بزرگوں میں، جنھوں نے ادب کی قدیم قدروں کی دل وجان سے نگہبانی کی، ایک نام بیدل بیکانیری کا بھی ہے انھوں نے اُردو شاعری کی ایک صحت مند روایت کی پاسداری کی جو مصحفی سے امیر مینائی، حسرت اور جگر تک ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔

بیدل صاحب اب سے تقریباً سو سال پہلے ۱۸۸۸ء میں بیکانیر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے مختصر خاندانی حالات جو ہم تک پہنچے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ بیدل صاحب کے والد شیخ مولیٰ بخش ایک خدا ترس انسان اور یادِ الٰہی میں اپنے اوقات بسر کرنے والے بزرگ تھے۔ اگرچہ وہ حرفت پیشہ تھے لیکن علم وادب کی قدردانی ان کی زندگی کا ایک ایسا روشن پہلو تھا، جس نے ان کے بعد کی نسلوں کو علمی زندگی کی طرف متوجہ کیا، شیخ مولیٰ بخش نے اپنے فرزند شیخ محمد عبداللہ کو جو بعد میں بیدل بیکانیری کے نام سے مشہور ہوئے، اپنے کاروبار میں نہ لگا کر ابتدائی درسی تعلیم دلانے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ بارہ سال کی عمر میں انھیں دربار ہائی اسکول بیکانیر میں داخل کرا دیا۔ بیدل پیدائشی طور پر ذہین تھے اور نکتہ رس طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ ہر جماعت اور ہر مضمون میں اوّل آتے رہے اور اعزاز کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں گھریلو ذمہ داریوں کے بڑھتے ہوئے بار نے انھیں دربار ہائی اسکول ہی میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا لیکن ملازمت کے دوران بھی تعلیم سے ان کی دلچسپی ختم نہ ہوئی اور وہ پرائیویٹ طالبِ علم کی حیثیت سے آگے کے امتحانات دیتے رہے، یہاں تک کہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔

بیدل کی علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ بہادر نے انھیں اپنے یہاں رجسٹرار کی حیثیت سے متعین کیا۔ بعد میں بیدل صاحب بیکانیر کے منصف ہوئے اور قانون کا امتحان اوّل درجے میں پاس کرنے کے بعد کرسیِ عدالت پر متمکن ہو گئے۔ یہ ہیں وہ مختصر حالات جو بیدل صاحب کی علمی، انتظامی اور عدلیاتی صلاحیتوں کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا وہ روشن پہلو، جو ان کی شاعری سے متعلق ہے اور جو اُن کی ناموری اور شہرت کا سبب بنا، ایسا ہے جس پر ہم ذرا تفصیل سے بات کرنا چاہیں گے۔

جناب بیدل اس صدی کی تیسری دہائی میں جب شاعری کر رہے تھے، تب قدیم دبستانِ سخن میں داغ اور امیر مینائی جیسے شاعروں کا طوطی بولتا تھا، خاص کر داغ دہلوی نے اپنے تلامذہ کے حوالے سے پورے برصغیر میں بے مثال مقبولیت حاصل کی تھی، دوسری طرف اقبال کی قومی اور ملّی شاعری بھی لوگوں کی توجہ کا خصوصی مرکز بن رہی تھی۔ تیسرا مکتبِ خیال وہ تھا، جس نے تصوّف کا دامن تھام کر شعر وسخن کے ذریعے انسان کی روحانی اور باطنی ترجیحات کو لفظوں کا جامہ پہنانے کی سعی میں اعتبار کا درجہ حاصل کیا تھا۔ تینوں دھاراؤں کا یہی وہ سنگم ہے جہاں سے بیدل بیکانیری اپنی شعری ڈگر الگ نکالتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب بھی ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے گا، محسوس ہوگا کہ ان کی طبیعت کا غالب رُجحان تصوّف کے مسائل یا عشقِ حقیقی کی طرف تو ہے ہی، ساتھ ہی انسانی سطح پر معاملاتِ دل بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں بیدل صاحب کا دیوان "باغِ فردوس" کے نام سے شائع ہوا تھا، جس پر ان کے اُستاد بیخود دہلوی نے انھیں ان لفظوں میں داد دی تھی:

"مختلف اوقات میں ان کے کلام کی اصلاح کرتا رہا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ دُنیا کے مال و متاع میں سے اور تو کچھ میرے پاس نہ تھا۔ ایک زبان تھی وہ حضرت بیدل کی نذر ہوئی۔"

اُستاد کی طرف سے کی گئی یہ ستائش اس

بی۔ ۲۲/۳ اے، اندر لوک، سرائے روہیلا، دہلی ۱۱۰۰۳۵

بات کو ثابت کرتی ہے کہ فنِ شعر میں بیدؔل نے استادانِ فن کی نظر میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ جہاں تک ان کے شعری موضوعات کا تعلق ہے، جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے کہ وہ اس عہد کے مروّجہ موضوعات سے الگ نہیں ہیں۔

لیکن بیدؔل صاحب نے ان پر اپنی انفرادیت کی چھاپ ضرور لگائی ہے۔ بیدؔل صاحب کے کلام میں عاشقانہ اور متصوفانہ غزلیات کے علاوہ خاصی بڑی تعداد میں نعتیہ غزلیں بھی شامل ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل

میں عشقِ رسولؐ کی کتنی شدت اور کتنی گرمی تھی۔ مثال کے طور پر مختلف موضوعات سے متعلق ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے، جن سے یہ بات ثابت ہوگی کہ انھوں نے جس موضوع کو بھی برتا سلیقے سے برتا، اور شعری اظہار کا حق ادا کیا ـــــ

بیدؔل بیکانیری افرادِ خاندان کے ساتھ۔ پشت پر (ترکی ٹوپی پہنے سیاہ کوٹ میں ملبوس) ان کے صاحبزادے موجودہ گورنر یو۔پی جناب محمد عثمان عارف نقشبندی

رموز و معارف کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر رنگ میں نمایاں ہے صورت وہ حسن کی
عالم یہ گویا جلوہ ہے، عشقِ مجاز کا

اسرار و معارف کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے جب بیدؔل صاحب انسانی و خلقی تقاضوں کی طرف آتے ہیں تو ایسے با اثر شعر ان کے قلم سے نکلتے ہیں:

تم ظلم کو چھوڑو، میں گلہ چھوڑ رہا ہوں
باہم ابھی ہو جاتا ہے اقرارِ محبّت

یا

گردن جھکی تھی شرم سے آنکھیں بھی جھک گئیں
رکھ لوں دل و جگر میں تمھاری نظر کو میں

ایسے ان گنت شعر ہیں بیدؔل صاحب کے کلام میں، جو بیک نظر پڑھنے والے کی توجّہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اُردو کلام سے قطعِ نظر بیدؔل صاحب نے فارسی زبان میں بھی پاکیزہ غزلیں کہی ہیں بلکہ اگر دیانتداری سے دیکھا جائے تو ان کی اُردو غزلوں سے کہیں زیادہ شیریں، موثّر، رواں دواں اور جاذب۔ توجّہ غزلیں فارسی کی ہیں، جن میں انھوں نے مترنّم اور موسیقی سے لبریز بحروں کا انتخاب کرکے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً ایک فارسی غزل کا شعر:

در طلسماتِ جہاں دیدۂ گریاں حیران
فتنہ سازے عجبے شعبدہ بازے عجبے

مجھے خوشی ہوگی اگر بیدؔل صاحب کے اُردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب سلیقے کے ساتھ شائع ہو اور وہ شعر و ادب کے قارئین تک پہنچے۔ یہ مسرّت کی بات ہے کہ ان کے فرزند جناب محمد عثمان عارف نقشبندی جو خود بھی ایک خوش گو شاعر ہیں، اس طرف توجّہ فرما رہے ہیں اور شعرائے متاخرین میں شامل بیدؔل کے شعری اثاثے کو ادب نواز حضرات تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

⬡

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی
زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوائیے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبّی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

—— ادارہ

مقصود اظہر

کراسنگ

بند گھروں میں دھوپ کا گذر کیوں کر ہو سکتا ہے؟ وہ دن لد گئے جب گھروں کی چھتوں میں روشن دان ہوا کرتے تھے اور دھوپ سیدھی آسمان سے گھروں میں اتر آتی تھی اب اگر دھوپ اندر آنا بھی چاہتی ہے تو اسے آس پاس کی عمارتوں سے اجازت طلب کرنی پڑتی ہے کبھی ان سے بچ کر وہ کھڑکیوں تک پہنچ بھی جاتی ہے تو کھڑکیوں پر لگے شیشے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

روشنی کے لیے انھوں نے مرکری بلب آن کر لیا تھا۔ فرصت کے لمحات میں وہ تینوں دوست اکثر شیکھر کے گھر رمی کی بازی لگا لیتے اور ایک ساتھ مل بیٹھنے کے ساتھ ہی وقت گزاری کا سامان بھی ہو جاتا۔ "واہ! کیا کارڈز دیے ہیں رنجیت۔"

"لیکن ـــ" رنجیت نے اپنے کارڈ دیکھتے ہوئے کہا "بازی صرف کارڈز کے اچھے ہونے سے نہیں جیتی جا سکتی ـــ"

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ شیکھر نے سوچا، وندنا بھی تو بہت اچھی تھی "ہم ایک دوسرے کے برابر کب تک چلتے رہیں گے ـــ شیکھر؟" وہ خاموش رہا تو وندنا جھنجھلا گئی "تم سُن رہے ہو نا۔"

"تمھارے ہونٹ بہت نرم ہیں۔"

"تو تم نہیں سُنو گے۔"

... اور گال کتنے چکنے ہیں جیسے پوڈر چھڑکی کیرم بورڈ کی سطح ـــ اس نے وندنا کے گالوں کو سہلاتے ہوئے کہا ـــ شے ـــ کھر ـــ پرے ہٹو ـــ نہیں، پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"اوں ہوں ـــ پہلے۔"

تم ـــ م ـــ م ـــ م ـــ بہت خراب ہوتے جا رہے ہو۔"

"کیا سچ؟"

"اوں ہنہ۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرا دی تھی۔ "بتاؤ نا کیا ہم . . ."

"اوہ نو ـــ سویٹ ہارٹ ـــ ریل کی پٹریوں پر کہیں تو کراسنگ آئے گی ہی نا۔"

"کہاں کھو گئے ـــ؟" ڈیسوزا نے اسے ٹہوکا دیا تو جیسے وہ نیند سے جاگ پڑا۔ "میں پہلی بازی کے بارے میں سوچ رہا تھا" اس نے کارڈ پھینکتے ہوئے کہا۔

"کون سی ـــ رمی کی یا زندگی کی ـــ؟"

"رمی کی بازی تو روز ہی جمتی ہے ـــ"

زہر خند مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو کڑوا کر دیا۔

"وندنا میں جا رہا ہوں۔"

"اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟ ـــ مجھے بھی جانا ہے۔" اتنا کہنے کے لیے اسے لپ اسٹک کو ہونٹوں سے ہٹانا پڑا تھا۔

"ہماری کمپنی کی میٹنگ ہے . . . بائی دا وے کیسا لگ رہا ہوں اس سوٹ میں ـــ؟"

"کیا میٹنگز (MEETINGS) اتنی صبح ہوتی ہیں؟"

"صبح کے نو بج رہے ہیں ـــ ارے ہاں میں تو بھول ہی رہا تھا میں رات دیر سے لوٹوں گا اور کھانا بھی باہر ہی کھاؤں گا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟ کہیں باہر جانا ہے کیا؟"

وہاٹ اَسِلی کوائسچن (What a Silly question)

"اس لیے کہ تمھارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

"جانتی ہو تو پھر کیوں ـــ"

"ہاں جب انسان گناہ کرتا ہے تو چپ رہتا ہے۔"

"دماغ تمھارا ہے جو چاہو سوچ سکتی ہو ـــ"

"انل کو کون چھوڑے گا؟"

"تم ـــ"

ان کی شادی کے ایک سال بعد جب ننھا منّا انل ان کے درمیان آیا تو وہ دونوں ہی خوش تھے وندنا نے کہا تھا۔ "منّے کا کام کرتے ہوئے کتنی خوشی ہوا کرے گی شیکھر اور ـــ اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے، وقت کے گزرنے کا احساس تک مٹ جائے گا۔"

"اور میرا دل چاہتا ہے کہ اسے سدا اپنی گود میں سموئے رہوں" ـــ اور آج ـــ

پلاٹ نمبر ۴، رُوم نمبر ۸، پُرانا کلکٹر کمپاؤنڈ، ملونی کالونی، ملاڈ (مغربی) بمبئی ۴۰۰۰۹۵

وہ پھر چونک گیا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کارڈز کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "کیا بات ہے ڈیسوزا کیا رات بھابی نے بہت پریشان کیا۔"

"بھابی کے پاس تھا کون گدھا۔" ڈیسوزا نے رنجیت کے مذاق کو مزید گہرا بنادیا۔

اس رات گردن کے گرد حائل وندنا کے ہاتھوں کو الگ کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ "اوہ وندنا! تھوڑا ہٹ کے سوؤ نا ___ پلیز ڈونٹ مائنڈ ___ میں بہت تھک گیا ہوں ___ یو نو آفس کا کام ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔"

"کیوں کلب نہیں جاتے ___ ؟"

"جاتا تو ہوں ___ سوچتا ہوں تھکا ہوا دماغ شانت ہو جائے گا مگر ___"

"مگر کیا ___ ؟"

"تم ___"

"میں نے تو وہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں تمھیں فرصت ہو تب نا۔"

"ایک بات پوچھوں شیکھر ___" وندنا نے چھت سے گھومتے پنکھے کو گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے اب نیند آرہی ہے پھر کبھی پوچھ لینا۔"

"اس روز شام تم کہاں گئے تھے ؟"

"کیا میں نے کبھی پوچھا ہے کہ اکثر رات تم لیٹ کیوں ہو جاتی ہو ___" وندنا کے سوال پر وہ چڑ گیا۔

"___ یا پچھر دیکھتی ہو تو تمھاری بغل کی چیئر پر کون ہوتا ہے ؟"

"وہاٹ ڈو یو مین ؟"

"دیکھو وندنا مجھے نیند آرہی ہے ___"

"ارے بھئی شیکھر، چال چلو۔" وہ پھر چونک پڑا تو رنجیت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا ہارنے کا ارادہ ہے ؟ ___ ویسے حالت خراب نظر آرہی ہے۔"

"کیا تم بھولتے جا رہے ہو کہ کبھی ہماری شادی بھی ہوئی تھی۔" وندنا نے آئینے کے سامنے سے مُڑے بنا ہی اس سے پوچھا تھا تو اس نے جواب دیا تھا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ نہ جانے تمھیں یاد ہے یا نہیں ___ میں تو مانتا ہوں۔"

"اگر تم مان لوگے کہ سامنے رکھا ہوا پانی کا جگ بھرا ہوا ہے تو کیا وہ سچ مچ بھر جائے گا۔"

"تم یہ تو نہیں کہنا چاہتیں کہ میں تمھاری ضروریات کو پورا نہیں کرپا رہا ہوں۔"

"کیا ضرورت کے معنی معلوم ہیں تمھیں ؟"

"دیکھو ہنی ___ میں تمھاری جن ضروریات کو ادھورا سمجھتا ہوں پورا کر دیتا ہوں اور ___"

"ٹرن ___ ٹرن ___ ٹرن۔" فون کی گھنٹی نے ان کی بات کو کاٹ دیا تھا۔ "ہلو ___ شیکھر اسپیکنگ ___ پلیز ہولڈ دا لائن ___ تمھارا فون ہے ___ اور اب میں سمجھتا ہوں تمھیں میری ضرورت نہیں رہی۔"

"او یو شٹ اپ ___" اور وندنا نے جلدی سے ماؤتھ پیس میں کہا "نہیں نہیں تمھیں نہیں ___ وہ تو میں ___"

وہ انل کا ہاتھ تھامے باہر آگیا تھا۔

"سنبھل جاؤ شیکھر ورنہ ہار جاؤگے۔" وہ چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا "کوشش تو یہی کر رہا ہوں کہ ___"

"کیا سوچ رہے ہو ___ ؟" اسے خاموش پاکر ایک دن وندنا نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں ___" کافی دیر غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا "سوچ رہا تھا کہ کیا ہم اپنے ماضی میں لوٹ نہیں سکتے۔"

"تم ایسی باتیں زیادہ سوچنے لگے ہو جو ناممکن ہوں۔"

"لیکن یہ ناممکن نہیں ہے ہم ماضی کو اپنا کر زیادہ مطمئن ہو جائیں گے۔"

"یو مین دنیا جو اتنی ترقی کر کے اس اسٹیج پر پہنچی ہے پھر سے جنگلوں میں گم ہو جائے۔"

"نہیں ___"

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی اس کے سامنے پڑی ایزی چیئر پر دراز ہوگئی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ___"

"مگر ایک شرط ہے ___ قیامت کا نزول۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ وندنا۔۔۔ و۔۔۔ ند۔۔۔ نا۔۔۔ خاتمہ ___ لگتا ہے ضروری ہے۔"

"شیکھر ___" وہ پھر ایک مرتبہ چونک پڑا۔ رنجیت اور ڈیسوزا دونوں ہی اس کی خاموشی اور بے دلی سے کھیلنے پر خفا ہو رہے تھے

"کیا وندنا یاد آرہی ہے ___ سنا ہے کہ ___" کہتے کہتے رنجیت رک گیا "رک کیوں گئے کہو۔" اس نے اپنا کارڈ پھینکتے ہوئے کہا۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ (Please don't Maind) شیکھر ___ نادر اور وندنا شادی

کرنے والے ہیں ــــ کیا تم دونوں ایک دوسرے سے اتنی جلد بور ہوگئے تھے کر ــــ " رنجیت چُپ نہ رہ سکا ۔

" دُنیا ترقی کر رہی ہے رنجیت . . . زمین گرم اور سورج سرد پڑتا جا رہا ہے دیکھو نا دھوپ کو ہم تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے " اور اسے وندنا سے آخری ملاقات یاد آگئی ۔

" تمھیں یاد ہے وندنا ــــ تم نے کہا تھا کہ ماضی میں لوٹنے کے لیے خاتمہ ضروری ہے "

" ہاں ــــ لیکن "

" اور ہماری شادی سے قبل ایک بار میں نے تمہارے پوچھنے پر کہا تھا کہ ریل کی پٹریوں میں کہیں تو کراسنگ آئے گی ــــ "

" تو ؟/! "

تو یہ کہ ــــ کافی نہیں پلاؤ گی "

" اوہ ہاں " وندنا نے ویٹر کو کافی لانے کے لیے کہا تھا اور دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔

" کراسنگ کے بعد پٹریاں آگے بڑھتی ہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں "

" تم یہی کہنا چاہ رہے ہو تا کہ اب ہمیں کراسنگ سے آگے بڑھ جانا چاہیے "

" مجھے معلوم تھا ــــ تم بہت سمجھ دار ہو " دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی مگر وہ خود نہیں جانتے تھے کہ وہ خود پر ہنس رہے ہیں یا ایک دوسرے پر ــــ

" او شِیکر ــــ تم نے بیگم پھینک کر غلطی کر دی نا آخر ــــ میری بازی اسی پر تو رُکی ہوئی تھی " ڈیسوزا نے کارڈ نیچے رکھتے ہوئے کہا جیسے اُس نے ڈیسوزا کی آواز سُنی ہی نہیں بس خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے شیشے کو گھورتا رہا جہاں دھوپ اندر آنے کے لیے صبح سے سر مار رہی تھی ۔ ⬡

(۱)

منزل کتنی دُور ہے، کہاں پڑے گی رات
کانپے مرے سوال پر، کوچوان کے ہات
کوچوان کے ہاتھ پڑی ہے جیون ڈوری
چکّوں کی رفتار کہ جیسے مرتیو لوری
دستہ ہے انجان سارتھی ہے ناقابل
مُنہ چڑاتے سرپٹ دوڑے آگے منزل

(۲)

سُوجھ بُوجھ ایمان کو لیا بُھوک نے پھانس
بے سُدھ ہوکر کھارہی مچھلی اپنا مانس
مچھلی اپنا مانس جاب کر روئی راتوں
ہوا اُسے احساس کُٹی وہ اپنے ہاتوں
بُھوک اگر سازش ہے تو سازش سے جُوجھ
اپنوں پر انیّائے یہ کیسی تیری سُوجھ

(۳)

اندھیارے میں کر گئی آندھی اپنا کام
شیش محل میں زلزلہ پتّھر پر الزام
پتّھر پر الزام بچارہ گونگا اندھا
لوگ سبھی بدنام وہ تھامے کس کا کندھا
دیس یہ کیسا یار یہاں بھٹکے اجیارے
اجیاروں کے بھیس میں پھرتے ہیں اندھیارے

(۴)

نَو کا خستہ حال ہے، ناداں سبھی سوار
نابینا ہے ناخدا کاغذ کی پتوار
کاغذ کی پتوار ہوائیں بھی طوفانی
لے ڈوبے گا ناؤ ندی کا گہرا پانی
لے جائے کس سمت نہ جانے وائیو جھونکا
بھنور ہنسا ہے جُھوم جُھوم خطرے میں نوکا

(۵)

پیچیدہ ہیں راستے، گلیاں ہیں گنجان
گھر اپنا بھی ڈھونڈنا یہاں نہیں آسان
یہاں نہیں آسان، کسی کو اپنا کہنا
اور بھی مشکل اندھی گلیوں کا دُکھ سہنا
دستک بھی دُشوار کہ دروازے بوسیدہ
ہنستے ہیں ہر موڑ پہ یہ رستے پیچیدہ

بھگوانداس اعجاز
۴۵۱ ڈی، بلجیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

ایس کنڈو

سمندر کے نیچے کی دنیا
ماضی اور مستقبل

> قلم بند تاریخ میں انسانی ارتقا کی رفتار قبل از تاریخ دنیا کے ارتقا کے مقابلے میں کم از کم ایک لاکھ گنا تیز ہے۔
>
> (ہکسلے)

کہا جاتا ہے کہ پتھر کے زمانے کے ابتدائی دور میں جن ایجادات کو وجود میں آنے کے لیے ۵۰ ہزار برس لگے تھے، مسلمہ تہذیب کے آغاز کے بعد ان کے لیے یہ مدت کم ہو کر محض ایک صدی رہ گئی۔ ہماری موجودہ جدید دنیا میں تبدیلی کی رفتار مزید تیز ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا ذہن اس کا ساتھ نہیں دے رہا اور صرف مبالغہ آمیزی ہی درست دکھائی دیتی ہے۔ ایجادات، ان کے استعمال اثرات اور مزید ایجادات کے ردِعمل کا ایک لگاتار سلسلہ حرکت میں ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تبدیلی کی یہ رفتار بڑھتی ہوئی انسانی صلاحیت کی نادیدہ بلندیوں تک پہنچ جائے گی اور اس طرح انسان کی بقا کا انحصار کلیتاً ان تبدیلیوں کو اختیار کرنے اور ان کے ساتھ گزر بسر کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہوگا۔

کرۂ ارض کا دو تہائی حصہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ پانی کے نیچے کی اس دنیا میں تیل، کوئلے، ہیروں، یورینیم اور دیگر معدنیات کے بیش قیمت ذخیرے موجود ہیں۔ پانی کے نیچے کی دنیا مچھلیوں، عجیب و غریب پودوں، خوردنی و غیر خوردنی تیلوں سے بھرپور ہے جو ایک بالکل نئی دنیا کھوج کرنے والوں کی منتظر ہے۔ اب تک تو صرف غوطہ خوروں کو ہی سمندر کے نیچے کی دنیا کا کچھ علم ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب پوری آبادیاں حقیقی طور پر سمندر کے نیچے مقیم ہوں گی اور افزائشِ نسل میں مصروف ہوں گی۔

غوطہ خوری کی تاریخ

قدیم ترین قلم بند تاریخ کے دور سے ہی انسان سمندر کی سطح کے نیچے جاتا رہا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے انسانی ہاتھوں سے نکالے گئے موتیوں کو ۴۵۰۰ سال قبل مسیح تک کی مدت کا قرار دیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فوج کی طرف سے غوطہ خوری کا عمل ۱۱۹۴ قبل مسیح میں ٹراجن کی لڑائی میں شروع ہوا تھا۔

بحرۂ روم کو سمندر سے نیچے کھوج کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ سکندرِ اعظم نے ۳۳۲ قبل مسیح میں ٹائر کے سمندری جنوبی مورچوں کو توڑنے کے لیے غوطہ خوروں اور تیراکوں کا استعمال کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سکندر خود غوطہ خوری کا شفاف لباس پہن کر سمندر کے فرش پر جا اترا تھا۔ ارسطو نے چار سو قبل مسیح میں اسفنج نکال کر لانے والوں کی طرف سے غوطہ خوری کے سامان ایک دیگچی یا غوطہ خوری کی گھنٹی کا ذکر کیا ہے۔ یہ گھنٹی یا ناقوس تبدیلیوں اور جدید کاری کے ساتھ آج بھی ساحلی علاقوں میں [illegible] کی تلاش اور بحری غوطہ خوری کے لیے استعمال [illegible] جا رہا ہے۔

یونارڈی وینچی نے ۱۶۸۰ء میں سمندر کے نیچے سانس لینے کے عمل کو قومی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے کام میں بھاری دلچسپی لی اور اس کے نتیجے کے طور پر سمندر کے نیچے تیراکوں کے لیے ایک عمدہ اور انوکھا آلہ تیار کیا۔ سمندر کے نیچے تیراکی کے لیے مچھلی کے پیروں کے استعمال کا سہرا بوریلی کے سر ہے۔ کیوں کہ بے شک وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہیں ہوا لیکن وہ صحیح سمت میں کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد سمندر میں غوطہ خوری کے لیے سخت سطح والی ٹوپیاں آئیں جن کے اندر ہوا مہیا کی جاتی تھی۔ ان دنوں ہوا کو سمندر کے اندر بھیجنے کے لیے ایک بڑی دھونکنی زمین پر رکھ کر استعمال کی جاتی تھی۔

ان قدیم دنوں سے شروع ہو کر غوطہ خوری اب ایک فن کی شکل اختیار کر گئی ہے جن میں کئی اقسام کی غوطہ خوری گہری غوطہ خوری بطور کھیل غوطہ خوری، غاروں میں غوطہ خوری چٹانوں اور برف کو توڑنے کی غوطہ خوری شامل ہے۔ غوطہ خوری کو محفوظ و پر لطف اور یادگاری بنانے کے لیے بھی بہت سی نئی ایجادات کام میں لائی گئی ہیں۔

مستقبل

یہ تو کل کی بات تھی مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟

انسان کے لیے سمندر کے اندر کا ماحول بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ اور وہ سطح سمندر کے

معرفت سینگ سماچار (اردو) ایل۔آئی بلاک، چرچ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

نیچے تین سو میٹر تک ہی کام کر سکتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس حد تک بھی پہنچ پایا ہے۔ کیا وہ سمندر کے نیچے بھی جیسے کہ وہ زمین پر کرتا ہے، غیر محدود پیمانے پر کارروائیاں نہیں کر سکتا؟ ہم مستقبل میں کیا کرنے جا رہے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سمندر کے اندر بغیر کسی اڑچن کے رہنے کی کوشش کرنے والے ہیں چنانچہ میں آپ کو آج سے پچاس برس بعد یعنی ۲۰۳۷ میں سطح سمندر کے تین سو میٹر نیچے لے چلتا ہوں۔

سطح زمین کے برعکس جہاں آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے، میرے کنبے نے اور میں نے حال ہی میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر سمندر کے فرش پر گھر بنا لیا ہے۔ یہاں تاحد نظر وسیع غیر آباد خطہ دکھائی دیتا ہے۔ جو بہت خوب صورت ہے اور جسے انسان کی پرخطر ترقی نے ابھی چھوا تک نہیں۔ شروع شروع میں ماحول کی یہ تبدیلی اس لحاظ سے قدرے مشکل دکھائی دی کہ جہاں ہم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ زمین پر گزارا تھا وہاں ہمیں اپنے آپ کو پانی کے نیچے رہنے کا عادی بنانا پڑا۔ ہم بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے ماحول میں لوٹ آئے تھے حالانکہ حالات بہت حد تک مختلف تھے۔

ہمارا چھوٹا سا گاؤں ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جو شفاف ہے اور پانی کا بھاری دباؤ برداشت کر سکتا ہے۔ ہم اپنے چھوٹے سے گھر میں بالکل خشک ماحول میں رہتے ہیں جو لوگ ہمارے ساتھ رہتے ہیں وہ زیادہ تر کھیتی باڑی پر انحصار رکھتے ہیں اور وہ ایسی عمدہ سبزیاں اگاتے ہیں جو انھوں نے کبھی زمین پر نہیں اگائیں۔ ہمیں آکسیجن ملنے کا بڑا ذریعہ ارد گرد کا سمندری پانی ہے اور ہم بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ اس چھوٹے سے آپس میں جڑے ہوئے کنبے میں کئی سائنس داں، ڈاکٹر اور انجینئر بھی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کسی تحقیقی عمل میں مصروف ہے جس کے نتائج پر ہماری آئندہ نسلیں زندہ رہیں گی لہٰذا ہمارے پاس کرنے کو بہت سے کام ہیں۔

فی الحال تو جب تک ہم سمندر کے نیچے پوری طرح آباد نہیں ہو جاتے ہمیں کئی وجوہ سے کئی بار زمین پر آنا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک مصنوعی گلپھڑا ہے۔ جس میں پانی جمع اور خارج کر کے ہم جب چاہیں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس گلپھڑے سے ہم سمندر کے پانی میں سے باآسانی آکسیجن بھی نکال سکتے ہیں، جیسے کہ سمندری مچھلیاں کرتی ہیں۔ اس مصنوعی گلپھڑے کو تیار کرنے میں ۷۰ برس صرف ہوئے ہیں۔ اور اب سمندر کے نیچے کی دنیا بھی جانے اور ٹھہرنے کا ایک اور ملک بن گئی ہے۔

مستقبل کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری کوشش ہے کہ ہم پانی کے نیچے کی زندگی کی آکسیجن کی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل ہو جائیں۔ ہم نے جو طریقہ اپنایا ہے اس سے لوگوں کو مصنوعی گلپھڑوں کے استعمال کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہم آج کی طرح مصنوعی ذرائع پر انحصار رکھنے کے بجائے آبی ماحول میں زندہ رہنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ہم یہاں مویشی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور ہمارا اگلا مرحلہ انسان کی افزائش نسل کا ہوگا۔ ہم نے تجرباتی طور پر جو مویشی تیار کیے ہیں وہ مچھلی جیسے ہی ہیں اور وہ زمین پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ سمندری جانوروں کی نئی نسل ہیں جو ہمارے لیے ویسے ہی کام کر سکتے ہیں جیسے کہ زمین کے مویشی کرتے تھے ہم تولید کے امور پر بھی غور کر رہے ہیں۔ جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ انسان کی سمندر کے نیچے کی دنیا کے ماحول کو پوری طرح اختیار کرنے کی کلید ہے۔ زیر آب رہنے والی مخلوق کے طور پر انسان کے ارتقا کو بہت عرصہ درکار ہے۔ لہٰذا ہمیں صرف قدرت پر انحصار کا انتظار نہیں کرنا چاہیے انسان کی بقا کا راز اسی میں ہے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے آبی ماحول کو اختیار کرے۔

جہاں تک سامان کی نقل و حمل کا تعلق ہے ہم ڈالفن کا استعمال کرتے ہیں ہر کنبے کے پاس نقل و حمل اور سفر کے لیے ڈالفن کا جوڑا ہے ہم نے ان کے ساتھ گفتگو کرنا سیکھ لیا ہے ہمارے بچے ان دودھیلے جانوروں پر سواری کرنے میں طاق ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم میں سے زیادہ عمر کے لوگ پانی میں کھینچا جانا پسند کرتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ ڈالفن سمندری بھیڑوں کے ساتھ ہمیں کھیتی باڑی میں کام دیں گے۔

آنے والی نسلوں کا انحصار ہم پر ہے۔ اگرچہ ہم نے سمندر کے نیچے کی دنیا کو اپنا لیا ہے لیکن ابھی تک ہم اس کے حقیقی باشندے نہیں بنے۔ بہت سے سوالوں کا ابھی کوئی جواب نہیں ہے۔ ہمارے قدیم ترین اجداد سمندر سے ہی آئے تھے تو ہم پھر وہاں لوٹ جانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ انسان ہمیشہ ایک بے قرار حیوان رہا ہے جس کی بے شمار ضروریات کے لیے سبز چراگاہوں پر قبضہ کرنے اور اس مطلب کے لیے نیلے پانی کے تصرف کی ضرورت ہے۔ انسان کبھی اشرف المخلوقات سمجھے جاتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے کیوں کہ ہم اس سے بھی کہیں بہتر زندگی پیدا کر رہے ہیں جو ہمارے اجداد نے کی تھی۔ ہم سمندر کے نیچے رہنے والی آئندہ نسلوں کے آباؤ اجداد ہوں گے ہمیں آبی انسان کہا جائے گا۔

○

عبدالغنی شیخ

سکڑپیڈ

"نہیں مالو پاپا" امّی کو نہیں مالو"
وہ روتا ہوا پاپا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا لیکن پاپا نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا' پاپا جو کام اپنے ہاتھوں سے لے رہے تھے۔ امّی زبان سے لے رہی تھیں۔ پھر پاپا کے دونوں ہاتھ تیز تیز چلنے لگے اور امّی رونے لگیں۔

جب پاپا نے اپنے ہاتھ روک لیے تو اُن کی مٹھی میں امّی کے سر کے کچھ بال تھے اور امّی کے چہرے پر کئی جگہ خراشیں تھیں۔ کمرے کا سارا سامان تتر بتر تھا۔ صبح سے چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ امّی کمرے کے ایک کونے میں جاکر رونے لگیں۔ وہ امّی کی گود میں چلا گیا اور اس کے آنسو پوچھنے لگا۔

کمرے میں جھانکا خاموشی طاری تھی اور ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔ پاپا کا غصّے سے آگ بگولا چہرہ لمحہ بہ لمحہ شانت پڑنے لگا اور اس پر پشیمانی کی ہلکی سی غیر مرئی لکیریں تننے لگیں۔

پاپا کے مدّھم ہوتے تیور دیکھ کر وہ توتلی زبان میں بولا ——
"اگر تم پھیل مالوگے تو میں تم کو مال ڈالوں گا۔"

پاپا کے گمبھیر چہرے پر ایک لمحے کے لیے مُسکراہٹ آئی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

"امّی جب میں بالا ہو جاؤں گا تو میں تم کو پاپا کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔" اس کا ننھّا سا وجود امّی کو تسلّی دینے لگا۔

پاپا کے جانے کے کچھ دیر بعد انکل جمیل دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا جس میں اس کے لیے پھل تھے۔ انکل کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ انکل نے پھلوں کا تھیلا اس کے ہاتھ میں دیا اور خود امّی کی جانب بڑھا۔ امّی کا چہرہ دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک گیا۔
"کیا آج پھر اس نے ہاتھ اٹھایا؟" انکل جمیل نے پوچھا ——

امّی نے جواب نہیں دیا اور چپکے سے آنسو بہانے لگیں۔

انکل امّی کو دلاسا دینے لگا۔

ننھے نے جب سے آنکھیں کھولیں تو گھر میں یہی ہنگامہ دیکھا۔ پہلے پاپا اور امّی کے درمیان کچھ تُو تُو میں میں ہوتی' جو فوراً گرما گرمی کی صورت اختیار کرتی۔ تب پاپا کا ہاتھ اٹھتا تھا۔ امّی روتی چلاتی تھیں۔ پھر کئی روز تک گھر کی چار دیواری میں ایک تکلیف دہ کھنچاؤ رہتا تھا۔ شروع شروع میں جب کبھی جھگڑا ہوتا' پڑوس کی آنٹی سُنیتا' چچی جمیلہ اور ان کا شوہر صادق آجاتے تھے۔ وہ بیچ بچاؤ کر کے اور سمجھا بجھا کر چلے جاتے تھے لیکن روز روز کے جھگڑوں کے بعد انھوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔

پاپا اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے اکثر باہر رہتے تھے۔ وہ عام طور پر ہفتے عشرے کے بعد گھر لوٹتے۔ کبھی کبھی مہینہ یا اس سے زیادہ مدّت لگا دیتے تھے۔

ایک دفعہ پاپا دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کے لیے کیا تحفہ لایا جائے۔ اس نے پاپا کے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر کہا۔ "پا[illegible] مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم امّی کو کبھی نہیں مالنا۔"
"کبھی نہیں ماروں گا۔" پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے کہا ——

لیکن دو روز بعد جب پاپا گھر لوٹے [illegible] امّی کو پھر مارا تھا۔

پاپا نے ایسے کئی وعدے کیے تھے لیکن [illegible] سارے وعدے عارضی ثابت ہوئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس ماحول کا عادی ہو گیا۔ اس کے دل میں پاپا کے خلاف گہری نفرت پلنے لگی اور امّی کے لیے اس کے روئیں روئیں میں ہمدردی جاگ اٹھی۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو پاپا نے اس کو نرسری میں داخل کیا۔ اور وہ اپنا زیادہ وقت بچّوں کے ساتھ نرسری اور کھیل کود میں گزارنے لگا۔

ایک روز وہ جلدی گھر لوٹا۔ جب سیڑھیاں پھلانگ کر وہ صحن میں آیا تو اندر [illegible]

صدر لداخ ادبی مرکز، لیہہ ۱۹۴۱۰۱، لداخ

سے پاپا کی گرجناک آواز آئی۔ اس کا دل ایک لمحے کے لیے دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے کی آڑ میں دیوار سے ٹیک لگائے سننے لگا۔

"تم کیوں میری غیر موجودگی میں اس بدمعاش کو گھر آنے دیتی ہو؟" پاپا زور زور سے کہہ رہے تھے۔ "کب تک تم اس طرح میری زندگی میں زہر گھولتی رہوگی؟"

پھر اس کے کانوں میں امّی کی سسکیوں کی آواز آئی۔

پاپا کہہ رہے تھے۔ "تم نے میری زندگی کو اجیرن کردیا ہے رضیہ۔ مجھے معصوم بچّے پر ترس آتا ہے۔ ورنہ میں نے تم کو کب کا چھوڑ دیا ہوتا! جی چاہتا ہے کہ کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔"

وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا۔

"پاپا! تم نے امّی کو کیوں مارا؟ بتاؤ پاپا!" وہ روہانسا ہوکر بولا۔

"تم نہیں سمجھوگے بیٹا! تم نہیں سمجھوگے!" پاپا جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اس نے پہلی بار پاپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

وہ حیران ہوا۔ پاپا مارتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔

"تم کیوں رو رہے ہو پاپا؟"

"کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں۔" پاپا نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

چند روز کے بعد پاپا پھر سفر پر روانہ ہوئے۔ اور انکل جمیل روز گھر آنے لگا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ پاپا گھر نہیں لوٹے۔ ایک روز ڈاکیہ آیا۔ اور اس نے پاپا کی طرف سے اس کے نام ایک خط اور تین سو روپے کا منی آرڈر دیا۔

وہ اب نرسری سے اسکول میں آگیا تھا۔

دوسرے ماہ ڈاکیہ دوبارہ آیا اور اس کو پاپا کے بھیجے ہوئے تین سو روپے کے منی آرڈر کی رقم دے گیا۔

اس طرح کئی مہینے بیت گئے۔ پاپا گھر نہیں آئے لیکن ہر ماہ ڈاکیہ بلاناغہ منی آرڈر سے بھیجی ہوئی رقم لاتا تھا۔

پھر ڈاکیہ کا آنا بند ہوگیا۔ اس کے بجائے ایک اور آدمی آیا۔ اس نے بھی ڈاکیے کی طرح خاکی وردی پہنی تھی۔ اس آدمی نے امّی کو ایک لفافہ دیا۔ سفید رنگ کے لفافے میں سے امّی گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگیں۔ اچانک کاغذ امّی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور وہ رونے لگیں۔

"امّی! کیوں رو رہی ہو؟" وہ حیران ہوکر پوچھنے لگا۔

امّی نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر سے آنچل اٹھایا۔

امّی کا چہرہ خزاں زدہ پتّے کی طرح زرد تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی امّی بولیں۔

"تمہارے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے بیٹا۔"

امّی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ایک ہفتے بعد وہ دوبارہ اسکول جانے لگا لیکن اسی شام اسکول کا چپراسی اس کے خلاف ہیڈ ماسٹر کی شکایت لے کر آیا۔ اس نے ایک بچّے کو اسکول کی چھت سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ نت نئی شرارتوں کے لیے ہیڈ ماسٹر نے پہلے بھی کئی دفعہ اس کے خلاف امّی سے شکایت کی تھی۔

ایک روز اس نے کلاس میں اجے کی دوات اُلٹ دی۔ اجے نے غصّے سے اس کو حرامی کہا۔ وہ آپے سے باہر ہوگیا اور اجے کی ناک پر ایک مُکّا رسید کر دیا۔

اجے اپنی ناک سہلاتا ہوا بچّوں سے بولا۔

"یہ حرامی بچّہ ہے۔ تم لوگ اس کو کل سے حرامی بچّہ کہنا۔"

اس روز سے جب بھی کسی بچّے سے اس کی لڑائی ہوتی وہ اس کو حرامی بچّہ کہہ کر چڑاتا۔ اس نے امّی سے شکایت کی کہ بچّے اس کو حرامی کہتے ہیں۔

امّی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"جب باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم ان باتوں کی طرف بالکل دھیان نہ دو بیٹے اور خاموشی سے اپنی پڑھائی جاری رکھو۔"

اس کے چند روز بعد وہ چچی جمیلہ کے بیٹے مجید کے ساتھ اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ مجید نے اس سے پوچھا۔

"لمبو جمیل تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟"

لمبے قد کی وجہ سے سبھی جمیل کو لمبو جمیل کہتے تھے۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"تم اپنے باپ کے بیٹے نہیں ہو شکیل۔" مجید اچانک بول اٹھا۔

"پھر میں کس کا بیٹا ہوں؟" اس نے غصّے سے پوچھا۔

"تم جمیل کے بیٹے ہو۔ جو تمہارے گھر آتا رہتا ہے۔" مجید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کون کہتا ہے؟" اس کی مٹھی بھنچ گئی۔

"میری امّی کہتی ہے۔"
"نہیں، نہیں۔ میں انکل جمیل کا بیٹا نہیں
وں۔" اس نے چلّا کر کہا ۔۔۔ "وہ میرے انکل
ں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجید پر مکّوں کی بارش
ردی اور مجید روتا ہوا گھر چلا گیا۔
وقت رینگتا ہوا گزرنے لگا۔ وہ اور ماں،
پ کی بچائی ہوئی رقم پر جی رہے تھے۔
وہ اب پانچویں جماعت میں پہنچا تھا۔
ی جمیلہ نے ایک روز اس کو اپنے پاس بلایا۔
"لمبو جمیل آج کل نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ
ہاں گیا؟" چچی نے پوچھا۔
"کل ہی تو انکل ہمارے ہاں آئے تھے۔
ں ۔۔۔" وہ معصومیت سے بولا۔
"وہ تمھارا انکل تو نہیں ہے۔ تمھارے
یا کا کوئی بھائی نہیں۔ وہ تو نرا لفنگا ہے۔ تمھاری
ں ایسے آدمی کو گھر آنے کیوں دیتی ہے؟"
چچی جمیلہ کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ اس نے
ں طنز کو محسوس کیا۔ وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر
پس آگیا لیکن اس کے دل میں ایک کرید پیدا ہوئی
ر وہ بے چین رہنے لگا۔ اس نے اس بات کو بھلانے
ی بڑی کوشش کی لیکن جتنی وہ کوشش کرتا اتنی ہی
ب پھانس کی طرح اس کے دل میں یہ بات چبھنے لگتی۔
ھر یہ پھانس اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی
ر وہ اس کو اپنے دل سے نکالنے کے لیے بے تاب
ہنے لگا۔ وہ امّی کو عجیب نظروں سے گھورنے لگا کبھی
ھانا کھاتے ہوئے اس کا ہاتھ رُک جاتا اور
ہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ امّی نے کئی بار اس کی
یشانی کی وجہ پوچھی۔ لیکن اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر
ل دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اندر ہی اندر
یدا اس کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔
ایک روز اس نے اپنے جگری دوست
رفعت کو اکیلے میں پکڑ لیا۔
"رفعت! کیا میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں
ہوں؟"
رفعت حیرت سے اس کا مُنہ تاکنے لگا۔
"یار، خدا را مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، صاف
صاف بولو۔"
"کیسی بات کرتے ہو؟ تم تو بالکل اپنے
باپ پر گئے ہو شکل میں۔ بالکل ویسی ہی آنکھیں،
ویسی ہی آواز اور رُخسار پر ہو بہو ویسا ہی تل۔
کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔
"یہ سارا جھگڑا جھمیلا لمبو جمیل کا پیدا
کیا ہوا ہے۔ جسے تم انکل کہہ کر پکارتے ہو۔"
"کیسا جھگڑا جھمیلا؟" اس نے سوال کیا۔
لیکن رفعت نے اس کے سوال کا جواب
نہیں دیا۔
اس نے دل ہی دل میں تہیّہ کیا کہ وہ ماں
سے یہ راز معلوم کرکے ہی دم لے گا۔
"ماں!" پہلی دفعہ اس نے ماں کو امّی کے
بجائے ماں کہہ کر پکارا۔ وہ حیران ہو کر اس کو
دیکھنے لگیں۔
"ماں! جمیل ہمارے گھر میں روز روز کیوں
آتا ہے؟ وہ ہمارا کیا لگتا ہے؟ سبھی کہتے ہیں۔ وہ میرا
انکل نہیں ہے۔ تمھیں میری قسم ماں! سچ سچ بتاؤ
ورنہ میں زہر کھالوں گا۔ میں مرجاؤں گا۔۔۔"
ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارسی
پھوٹ پڑی ۔۔۔ "بتاؤ ماں! حقیقت کیا ہے؟"
اس نے ماں کو جھنجھوڑا۔
"پاپا!" اس کے دل کی گہرائیوں سے
ایک آواز نکلی۔ اور وہ ننگے فرش پر اوندھے
مُنہ لیٹا زور زور سے رونے لگا۔

غزلیں

اطہر محسن

تھکی نگاہ، حدوں کا نہ کچھ نشان ملا
جہاں جہاں بھی گئے ہم کو آسمان ملا

وہ تیری یاد تھی یا عکسِ لمحۂ قربت
نفس کے دشت میں جو مثلِ سائبان ملا

وہ جس کے جسم پہ تھیں سنگ باریاں میری
ہر ایک حال میں مجھ کو وہ بے زبان ملا

سفینہ کوئی بھی گہرے سمندروں میں نہ تھا
افق میں ڈوبتا ہر نقشِ بادبان ملا

رہا ہمیشہ در و بام سے پرے محسن
عجب طرح کا مجھے دشت میں مکان ملا

۸۹/۹۹ـ بیکن گنج، کانپور

جب اُڑانوں کے موسم گزر جائیں گے
پھر یہ غافل پرندے کدھر جائیں گے

ریت ہی ریت اٹ جائے گی راہ میں
تیز دریا تو چڑھ کے اُتر جائیں گے

کوئی بھی تو شناسا نہیں شہر میں
چل پڑے ہیں مگر کس کے گھر جائیں گے

ٹوٹ جائے گا یہ آسماں بیچ سے
سارے موسم ہوا میں بکھر جائیں گے

سو بہ سو ہم کو ڈھونڈیں گے اہلِ جہاں
ہم ہوا کی طرح جب گزر جائیں گے

خوش دیو مینی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ڈی۔آئی۔سی، پونچھ (جموں کشمیر)

حکیم انور تماپوری

جسے بھی دیکھو یہاں بدحواس لگتا ہے
ہر ایک چہرے پہ خوف و ہراس لگتا ہے

ہرا بھرا تھا کبھی پھول پھل بھی تھے اُس پر
وہ بوڑھا پیڑ جو اب بے لباس لگتا ہے

نہ رنگ و بُو ہے گلوں میں نہ نور تاروں میں
تیرے بغیر یہ عالم اُداس لگتا ہے

نہ جانے کتنی خراشیں بدن پہ ہیں اُس کے
وہ آدمی جو بہت خوش لباس لگتا ہے

حیات لائی ہے کس موڑ پر ہمیں انور
وجود اپنا جہاں اِک قیاس لگتا ہے

شاہ آباد ۵۸۵۲۲۸، ضلع گلبرگہ

ہم طرح اشعار

پچھلے ماہ ہم طرح اشعار کے لیے داغؔ کا مصرعہ دیا گیا تھا۔ اکثر قارئین نے اسی غزل کے شعر بھیج دینے پر اکتفا کی اور اس زمین میں دوسرے شعرا کی جو غزلیں ہیں ان تک رسائی کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ کی طرح سینکڑوں قارئین نے ایسے شعر بھی بھیجے جو کسی دوسری زمین میں تھے۔

موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ انعامات، ساتویں، آٹھویں اور سولھویں نمبر پر درج اشعار پر دیے جائیں گے۔

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا (داغ)

مرسلہ: عتیق احمد ظہور احمد (مالیگاؤں)، واحد اختر اکیلا (صاحب گنج)، محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، محمد گوہر عالم منور (جبار چک)، آسی کستلپوری (اورائی ضلع مظفر پور)، ممبران سراج اسپورٹس کلب (جبار چک)۔

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا (داغ)

مرسلہ: تبسم نوشاد (جبار چک)، شازیہ اختر نازیہ (جبار چک)، نجمہ شاہین ترانہ (جبار چک)، انصاری رئیس احمد شمس الضحیٰ (مالیگاؤں)۔

تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا (داغ)

مرسلہ: فضل امام فاروقی، عمدٹولی (لوہردگا)، آفریں غمگین (جبار چک)، نازنین نوشاد (جبار چک)، صابر علی صابر (سہارنپور)، نازیہ اختر شازیہ (جبار چک)، محمد گوہر عالم نوشاد (جبار چک)، لائبریرین انٹر نیشنل لائبریری (جبار چک)۔

بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو راز نہاں
چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد پرویز احمد چٹان (جبار چک)، محمد فخر الدین غمگین (جبار چک)، آفتاب اختر (جبار چک)، محمد صلاح الدین نوشاد (جبار چک)۔

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا (داغ)

مرسلہ: ترنم نوشاد (جبار چک)، مہتاب اختر (جبار چک)، نسرین بانو نسرین (جبار چک)۔

ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا
مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد (جبار چک)، اعجاز پروین ثریا (جبار چک)، بے بی ناصرہ جبیں (جبار چک)

کہاں کا صبر کہ دم پر ہی بن گئی ظالم
بہ تنگ آئے تو حالِ دل آشکار کیا (داغ)

مرسلہ: ابوالاحتشام ناگپوری، معرفت محمد سعید حیات ایڈوکیٹ، عقب لال اسکول، مومن پورہ، ناگپور۔ (۴۴۰۰۱۸)۔

فسانۂ شب غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد عاصم ظفر، حبیب لاج، بھاگلپور۔

بہار دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے
کہ تھا یہ حسن تو پھر مجھ کو کیوں بہار کیا (نظیر)

مرسلہ: حبیب الرحمٰن عثمانی، مگدھ وشو ودیالیہ

وہ رشکِ ماہ چلا سیر چاندنی کوں جدہاں
قمر نے خوان ستاروں کا لا نثار کیا (داؤد اورنگ آبادی)

مرسلہ: ابن غوری، نلگنڈ

ظفر ہم اس سے بھی گزرے ہیں مسکراتے ہوئے
وہ راستہ جو کسی نے نہ اختیار کیا (ظفر)

مرسلہ: ایس۔ جی۔ میاں، کٹک

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا (عبدالمجید سالک)

مرسلہ: انصاری شفیق احمد شمس الضحیٰ (مالیگاؤں)، اکرم وارثی، حبیب پور (بھاگلپور)۔

وداعِ عشق ہے، اب رخصت اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا (سالک)

مرسلہ: ایم۔ امین چکی، بھیلون (مہسانہ)

کسی کے پاؤں پہ سر رکھ دیا وفا ہم نے
بڑا ہی عرضِ تمنا میں اختصار کیا (میلارام وفا)

مرسلہ: شبانہ یاسمین، ناگپور

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا (جوش)

مرسلہ: محمد عبدالرؤف، محبوب نگر

تمہارا ذکر نہیں ہے، تمہارا نام نہیں
کیا، نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا (جوش)

مرسلہ: عالیہ پروین راغب، گیا

نہ خاک اڑائی، نہ دامن کو تار تار کیا
جنوں میں ہم نے نیا رنگ اختیار کیا (محسن زیدی)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محلہ بھیکن پور، بھاگلپور، بہار۔

وہ رازِ عشق دلوں سے بھی تھے جو پوشیدہ
انھیں خموش نگاہوں نے آشکار کیا (محسن زیدی)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن، بھاگل پور یونیورسٹی

رسائی جوشِ جنوں میں ہوئی نہ جب ان تک
تو اپنے دامنِ ہستی کو تار تار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: محمد شارب ضیاء، پورلا، کیٹھار

وہ نزع تک بھی نہ آئے جنھیں نہ آنا تھا
اور ایک ہم ہیں کہ تا مرگ انتظار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: محمد محفوظ انصاری طوفان، کیٹھہار

مزا تو جب ہے نہ آئے قرار تم کو بھی
ہمیں جو تم نے محبت میں بے قرار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: رضوان راجو سالاری، کیٹھہار

یہ کیا کیا مرے اشکوں کو پونچھ کر اے دوست
خود اپنے دامنِ سادہ کو داغدار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: لبنیٰ شاہین، صاحب گنج

جو مسکراتے تھے بیکل ہمارے رونے پر
کسی کی یاد نے اُن کو بھی اشکبار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: کماری نیلم چودھری، صاحب گنج

قدم قدم پہ مری بے بسی ہی ساتھ رہی
جو راستہ بھی ترے غم میں اختیار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: نجمہ نکہت، صاحب گنج

خیال جس کے بھلانے کا بار بار کیا
اسی کی یاد نے آ آ کے بیقرار کیا (شاکر انصاری)

مرسلہ: شاکر انصاری، سکندر آباد

ترا کرم یہ نوازش تری کہ غم دے کر
مجھے جہانِ محبت میں باوقار کیا (شاہد یعقوبی)

مرسلہ: عرفان سلیم، سکندر آباد

ہمیں ہیں وہ کہ جنھیں شکر کی نہیں فرصت
کرم خدا نے ہر اک آن بیشمار کیا (اسحاق بدایونی)

مرسلہ: تحسین احمد خاں، بدایوں

آئندہ ماہ کے لیے اس مصرعے پر شعر ارسال فرمائیں:

ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں
(قافیہ: خواب — ردیف: نہیں)

ہم طرح اشعار

پچھلے ماہ ہم طرح اشعار کے لیے داغ کا مصرعہ دیا گیا تھا۔ اکثر قارئین نے اسی غزل کے شعر بھیج دینے پر اکتفا کی اور اس زمین میں دوسرے شعرا کی جو غزلیں ہیں ان تک رسائی کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ کی طرح سینکڑوں قارئین نے ایسے شعر بھی بھیجے جو کسی دوسری زمین میں تھے۔

موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ انعامات، ساتویں، آٹھویں اور سولھویں نمبر پر درج اشعار پر دیے جائیں گے۔

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا (داغ)

مرسلہ: عتیق احمد ظہور احمد (مالیگاؤں)، واحد اختر اکیلا (صاحب گنج)، محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، محمد گوہر عالم منور (جبار چک)، آسی کھتلپوری (اورائی) ضلع مظفرپور)، ممبران سرتاج اسپورٹس کلب (جبار چک)۔

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا (داغ)

مرسلہ: تبسم نوشاد (جبار چک)، شازیہ اختر نازیہ (جبار چک)، نجمہ شاہین ترانہ (جبار چک)، انصاری رئیس احمد شمس الضحیٰ (مالیگاؤں)۔

تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا (داغ)

مرسلہ: فضل امام فاروقی، عملہ ٹولی (لوہردگا)، آفریں غمگین (جبار چک)، نازمین نوشاد (جبار چک)، صابر علی صابر (سہارنپور)، نازیہ اختر شازیہ (جبار چک)، محمد گوہر عالم نوشاد (جبار چک)، لائبریرین ناظر نیشنل لائبریری (جبار چک)۔

بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو رازِ نہاں
چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد پرویز احمد چٹان (جبار چک)، محمد فخرالدین غمگین (جبار چک)، آفتاب اختر (جبار چک)، محمد صلاح الدین نوشاد (جبار چک)۔

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا (داغ)

مرسلہ: ترنم نوشاد (جبار چک)، مہتاب اختر (جبار چک)، نسرین بانو نسرین (جبار چک)۔

ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا
مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد (جبار چک)، اعجاز پروین گڑیا (جبار چک)، بی بی ناصرہ جبیں (جبار چک)

کہاں کا صبر کہ دم پر ہی بن گئی ظالم
بہ تنگ آئے تو حالِ دل آشکار کیا (داغ)

مرسلہ: ابوالاحتشام ناگپوری، معرفت محمد سعید حیات ایڈوکیٹ، عقب لال اسکول، مومن پورہ، ناگپور (۴۴۰۰۱۸)۔

فسانۂ شبِ غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا (داغ)

مرسلہ: محمد عاصم ظفر، حبیب لاج، بھاگلپور۔

بہار دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے
کہ تھا یہ حسن تو پھر مجھ کو کیوں بہار کیا (نظیر)

مرسلہ: حبیب الرحمٰن عثمانی، مگدھ وشو ودیالیہ

وہ رشکِ ماہ چلا سیر چاندنی کو جدھر
قمر نے خوان ستاروں کا لا نثار کیا (داؤد اورنگ آبادی)

مرسلہ: ابن غوری، نلگنڈا

ظفر ہم اس سے بھی گزرے ہیں مسکراتے ہوئے
وہ راستہ جو کسی نے نہ اختیار کیا (ظفر)

مرسلہ: ایس۔ جی۔ میاں، کٹک

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا (عبدالمجید سالک)

مرسلہ: انصاری شفیق احمد شمس الضحیٰ (مالیگاؤں)، اکرم وارثی، حبیب پور (بھاگلپور)۔

وداعِ عشق ہے، اب رخصت، اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا (سالک)

مرسلہ: ایم۔ امین چکی، بھیلون (مہسانہ)

کسی کے پاؤں پہ سر رکھ دیا وفا ہم نے
بڑا ہی عرضِ تمنا میں اختصار کیا (میلارام وفا)

مرسلہ: شبانہ یاسمین، ناگپور

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا (جوش)

مرسلہ: محمد عبدالرؤف، محبوب نگر

تمہارا ذکر نہیں ہے، تمہارا نام نہیں
کیا، نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا (جوش)

مرسلہ: عالیہ پروین راغب، گیا

نہ خاک اڑائی، نہ دامن کو تار تار کیا
جنوں میں ہم نے نیا رنگ اختیار کیا (محسن زیدی)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، محلہ بھیکن پور، بھاگلپور، بہار۔

وہ رازِ عشق دلوں سے بھی تھے جو پوشیدہ
انھیں خموش نگاہوں نے آشکار کیا (محسن زیدی)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن، بھاگل پور یونیورسٹی

رسائی جوشِ جنوں میں ہوئی نہ جب ان تک
تو اپنے دامنِ ہستی کو تار تار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: محمد شارب ضیاء، پورلا، کیٹھار

وہ نزع تک بھی نہ آئے جنھیں نہ آنا تھا
اور ایک ہم ہیں کہ تا مرگ انتظار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: محمد محفوظ انصاری طوفان، کیٹھہار

مزا تو جب ہے نہ آئے قرار تم کو بھی
ہمیں جو تم نے محبت میں بے قرار کیا (سیف جعفری)

مرسلہ: رضوان راجو، سالماری، کیٹھہار

یہ کیا کیا مرے اشکوں کو پونچھ کر اے دوست
خود اپنے دامنِ سادہ کو داغدار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: لبنیٰ شاہین، صاحب گنج

جو مسکراتے تھے بیکلؔ ہمارے رونے پر
کسی کی یاد نے اُن کو بھی اشکبار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: کماری نیلم چودھری، صاحب گنج

قدم قدم پہ مری بے بسی ہی ساتھ رہی
جو راستہ بھی ترے غم میں اختیار کیا (بیکل اُتساہی)

مرسلہ: نجمہ نکہت، صاحب گنج

خیال جس کے بھلانے کا بار بار کیا
اسی کی یاد نے آ آ کے بیقرار کیا (شاکر انصاری)

مرسلہ: شاکر انصاری، سکندر آباد

ترا کرم یہ نوازش تری کہ غم دے کر
مجھے جہانِ محبت میں باوقار کیا (شاہد یعقوبی)

مرسلہ: عرفان سلیم، سکندر آباد

ہمیں ہیں وہ کہ جنھیں شکر کی نہیں فرصت
کرم خدا نے ہر اک آن بیشمار کیا (اسحاق بدایونی)

مرسلہ: تحسین احمد خاں، بدایوں

آئندہ ماہ کے لیے اس مصرعے پر شعر ارسال فرمائیں:

ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں
(قافیہ: خواب — ردیف: نہیں)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

جون ۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصولہ سینکڑوں شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں ترین سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

دُھن رے دُھنیے اپنی دُھن
پرائی دُھنی کا پاپ نہ پُن
تیری روئی میں چار بنولے
سب سے پہلے اُن کو چُن

(شیخ فرید الدین گنج شکرؒ)

مرسلہ: رضیہ سلطانہ، مکتبہ اطفال، ۳۶۸ نیو وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (ناسک)۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا (میر تقی میر)

مرسلہ: قمر جہاں جاوید عالم، نصیر آباد، راجستھان

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ (اقبالؔ)

مرسلہ: جنید اختر آسی، اورائی، مظفر پور

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی (اقبالؔ)

مرسلہ: سرفراز نواز، شیخپورہ، سہرام

دِکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

(فراقؔ گورکھپوری)

مرسلہ: آصفہ پروین، مرزا پور

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح (جاں نثار اختر)

مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پہریموی، رائے بریلی

اِک عمر سے اس دُھن میں کہ ابھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لیے شمعِ سحری کا (فیضؔ)

مرسلہ: افتخار علی انجم، صاحب گنج

بن محنت کچھ ہاتھ نہ آئے ناداری
محنت ایسا جادو جس سے ریت بنے پھلواری (رضی اختر شوقؔ)

مرسلہ: نسیم بانو دلسنگکر، ولسنگ، شولاپور

آسان نہیں جہدِ مسلسل سے گزرنا
ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے (جگرؔ)

مرسلہ: نور الدین حُسین بھائی، بیڑ

جب تک حیات موت کی زد سے بچی رہی
غم ہائے روزگار سے وابستگی رہی (قمر انصاری)

مرسلہ: رفیع احمد اعظمی، بدایوں

دیتی مہلت جو گردشِ افلاک
ہم بھی کچھ دیر سو لیے ہوتے (رضا مظہری)

مرسلہ: قمر جاوید، بردوان

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے (وکیل اختر)

مرسلہ: خترم نواز علیمی، نارتھ کلکتہ

موندی ہوئی آنکھیں سہی
میری نظر میں کیا نہیں

(امیر قزلباش)

مرسلہ: امتیاز احمد امتیاز، پوسٹ و ضلع صاحب گنج، بہار ۸۱۶۱۰۹

نثری عنوانات

"روزی کا سوال" (واجدہ تبسم)

مرسلہ: فاخرہ شبنم (دھنباد)، راغب مسعود [illegible] (گیا)، مہ جبیں محبوب صاحب شیخ (شولاپور)، محمد امتیاز [illegible] (سمستی پور)، شاہد اختر رضوی (کلکتہ)، نوشین [illegible] نوشاد (جبار چک)۔

"لمحے لمحے کا کرب" (پرویز باغی، شعری مجموعہ)

مرسلہ: اسرار حنیف (بھاگلپور)، وکیل مسعود [illegible] پرویز، نصیر آباد (راجستھان)۔

"پت جھڑ کی آواز" (ناول، قرۃ العین حیدر)

مرسلہ: صغیر احمد اعظمی، معرفت اُردو لائبریری [illegible] پوسٹ و مقام خیر آباد ۲۷۶۴۰۳، ضلع اعظم گڑھ [illegible] یوپی۔

"دل بیار دست بکار" (سعدی)

مرسلہ: شیخ یوسف حسین، بارہ دری، نیل [illegible]

"سرودِ زندگی" (اصغر گونڈوی کا مجموعۂ کلام)

مرسلہ: شبانہ یاسمین، مومن پورہ، ناگ [illegible]

"شام زندگی" (راشد الخیری کے ناول کا نام)

مرسلہ: پروین نوشاد، جبار چک

"آتے جاتے لمحوں کی صدا" (شعری مجموعہ، مخمور سعیدی)

مرسلہ: قیصر پرویز، تبسم رشید، نصیر آباد، راجستھان

"خواب کا در بند ہے" (شعری مجموعہ، شہریار)

مرسلہ: ہنس مکھ گھونوی، بھاگلپور

"زخمی خوابوں کا کرب" (شمس ندیم کا افسانہ)

مرسلہ: ظہیر اکرم، ہزاری باغ

"سارے دن کا تھکا ہوا پرش" (صلاح الدین پرویز)

مرسلہ: تبسم رشید قریشی، نصیر آباد۔ راجستھان

"زندگی کا بوجھ" (عمر فاروق قاسمی کا افسانہ)

مرسلہ: محمود الحسن انصاری، د [illegible]

گذشتہ پہلے اور آخری نمبر پر درج شعری عنوان اور تیسرے [illegible] پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا [illegible]

نئی مطبوعات

فن اور فنکار (مقالات کا مجموعہ)

مُصنّفہ: صالحہ عابد حُسین
صفحات: ۲۴۰
قیمت: ۳۵ روپے
ملنے کا پتا: عابد ولا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

آج کل ادبی کتب کا مطالعہ کرنا صرف متوسط
بقے کا کام رہ گیا ہے۔ بلکہ اس طبقے میں بھی ان حضرات
ا جو "انٹیلیکچوئل" کہے جاتے ہیں یا وہ اپنے آپ کو
سا سمجھتے ہیں اور یہ طبقہ حساب لگانے میں اتنا ماہر ہوتا
، کہ کوئی بھی چیز خریدنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیتا
ے کہ اتنی ہی رقم میں کوئی دوسری چیز خریدی جائے
ز زیادہ اچھا رہے گا یا یہ چیز زیادہ ضروری ہے۔
ہاں تک کہ رشتے ناتوں اور کتابوں کے معاملے
سا بھی یہ طبقہ نفع نقصان دیکھ کر کام کرتا ہے۔ اور
ر تو یہ ہے کہ زیادہ تر کتاب کے مقابلے میں نیا
رتا، نئی شرٹ اور کبھی کبھی تو نئی ٹائی بھی بازی مار
، جاتی ہے۔

صالحہ عابد حُسین کے مقالات کا مجموعہ پڑھنے
ے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں شامل
قالات کسی خاص طبقے کو مدِ نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے۔
س مجموعے میں شامل مقالات میں نہ تو انٹیلیکچوئل
ں انگریزی سے آلودہ زبان استعمال کی گئی ہے
ور نہ ہی رُوکھا پھیکا اندازِ تحریر اختیار کیا گیا ہے
جو دانشوروں کی 'داد' حاصل کرنے کے لیے ضروری
سا سمجھا جانے لگا ہے، بلکہ تحریر میں اتنی روانی اور
زبان اتنی سادہ ہے کہ ہر طبقے کا آدمی مضمون کو شروع
کرنے کے بعد پورا پڑھے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک
دوسری خصوصیت جو ان مقالات میں نظر آتی ہے
وہ یہ ہے کہ شروع سے آخر تک موضوع پر پکڑ ڈھیلی
نہیں ہوتی اور تشنگی کا احساس بھی بیچارہ جاتا
ہے۔ "ٹیگور کا ایک ناول چوکھیر والی" مضمون
پڑھنے کے بعد ٹیگور کا ناول پڑھنے کی ضرورت
محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح ساڑھے سترہ صفحات
پر پھیلا ہوا "فسانۂ آزاد کا ایک مختصر تجزیہ" پڑھنے
کے بعد قاری پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ساڑھے
تین ہزار صفحات کے ضخیم ناول "فسانۂ آزاد" پر بحث
کر سکتا ہے۔

کُل اٹھارہ مقالات پر مشتمل اس مجموعے
میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہیں ایک
کمزوری بھی ہے وہ یہ کہ عورت کی نفسیات اور
احساسات بیان کرنے میں مُصنّفہ کا قلم جس
زور شور سے چلتا ہے وہ زور شور مردوں کے احساسات
اور جذبات کی عکاسی کرتے وقت قائم نہیں رہتا۔
اس کی واضح وجہ تو یہی ہے کہ قلمکار خود عورت
ہیں اور فطری طور پر وہ مرد کی بہ نسبت عورت
کے جذبات کی کسی قدر بہتر تصویر پیش کر سکتی ہیں۔
شاید اسی وجہ سے مجموعے میں جہاں "عورت۔
اقبال کے کلام میں"، "پریم چند کے ہاں عورت کا
تصوّر"، "جدید شاعری میں عورت کا تصوّر"، "اُردو
ادب اور خواتین"، "ہندوستانی مشترک تہذیب
اور عورت" مضامین ہیں وہیں مرد کی حیثیت،
اس کے جذبات، احساسات اور نفسیات پر کوئی
کیا سمجھتا ہے یا مُصنّفہ کی خود کی کیا رائے ہے اس
بارے میں الگ سے کوئی مضمون نہیں ہے۔ عورت کو
تخت پر بٹھانے کے لیے مُصنّفہ اس قدر بضد ہیں
کہ کہیں کہیں بغیر ضرورت بھی "عورت" لفظ کا
استعمال کرتی ہیں۔ "ٹیگور کا ایک ناول چوکھیر والی"
کی شروع کی چند سطریں دیکھیں۔

"بنگلہ ہندوستان کی وہ زبان ہے،
جس کا ادب دُنیا کی بہترین زبانوں کے ساتھ
رکھا جا سکتا ہے۔ وہ ہر صنفِ ادب سے مالا
مال ہے۔ بہت سے شاعر اور بہت سے ادیب
(جن میں عورتیں بھی شامل ہیں) اس زبان کی خدمت
اور اسے مالا مال کرنے میں کئی سو برس سے لگے ہیں"۔

موجودہ دَور میں ہر چیز کو استعمال میں
آنے والی چیز (commodity) بنا دیا گیا
ہے علم و ادب کو معاشیات کی کسوٹی پر پرکھنا
بہت عام بات ہو گئی ہے۔ فن اور فنکار کو اس
کسوٹی پر اگر پرکھا جائے تو وثوق سے کہا جا سکتا
ہے کہ عمدہ سفید کاغذ پر آفسیٹ پرنٹنگ میں دو سو
چالیس صفحات اور اٹھارہ خوبصورت اور سیر حاصل
مضامین پر مشتمل یہ مجلد کتاب پینتیس روپے میں
مہنگی نہیں ہے۔

—— ارشد گوہر

چراغِ نیم شب (شاعری)

شاعر: ڈاکٹر حنیف کیفی
قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

کیفی کا پہلا شعری مجموعہ بیس سال کی

مشقِ سخن کا ایسا سرمایہ ہے جو ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنے کے ساتھ دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اُردو حلقوں میں موصوف کا نام "اُردو شاعری میں سانٹ" اور "اُردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم" جیسی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے باعث احترام کا حامل ہے۔ یہ دونوں مقالے جس محنت سے تکمیل تک پہنچے اُردو میں اس کی کم مثالیں ملیں گی۔ چراغِ نیم شب کی غزلیں غزل کی دِلکش روایت کے ساتھ جدید اسلوبِ بیان کی حامل ہیں۔ اس مجموعہ میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۶ء تک کی غزلیں ہیں شروع کے کلام میں عاشقانہ رنگ کے ساتھ زندگی کی سچائیاں ہیں جو بتدریج ٹھوس حقائق کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہیں اور رفتہ رفتہ عشق ان کے ہاں زندگی کا صرف ایک حصّہ بن جاتا ہے۔

مدّتیں گذریں مُلاقات ہوئی تھی تم سے
پھر کوئی اور نہ آیا نظر آئینے میں

میری راتوں کی سُلگتی ہوئی تنہائی میں
اب بھی سرگوشیاں کرتی ہے تمھاری آواز

نیچی نظر تھی سارے سوالات کا جواب
وہ کچھ نہ کہہ کے ہم سے ہر اک بات کہہ گئے

کیفی کے ہاں زندگی کا یہ احساس ترقّی کرتا رہا اور اس میں عصری زندگی کی زہرناکیاں شامل ہوتی گئیں۔ عصری میلانات اپنے اندر ایک وسیع دُنیا رکھتے ہیں کیفی دراصل انسانی زندگی کے تنوّع کے شاعر ہیں زمانے کے حالات اور گرد و پیش واقعات کے ساتھ جدید حسیت کی ترجمانی میں بے باکی ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ ناساز گار سماجی ماحول اور غلط نظامِ اقدار میں حیات جن حالات سے دوچار ہوتی ہے اس کی ترجمانی غزل کے اشعار میں کرنا آسان نہیں جس نظام نے زندگی اور اس کے حُسن کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہو اسے شعر کے قالب میں ڈھالنا کسی اچھے شاعر کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ نظم میں ایسے واقعات کا اظہار ذرا آسان کام ہے لیکن غزل میں نہایت مشکل۔

اُڑ نہ جائیں دیکھنا کچّے مکانوں کی چھتیں
پختہ ایوانوں سے بچ کر چل رہی ہیں آندھیاں

حقیقت جان لیتے کاش اپنے قتل سے پہلے
وہی خنجر اُتارے گا جو اکثر ساتھ رہتا ہے

ایک ہی لمحہ کبھی اپنی طرح سے جی لیں
جیتے جی کیا ہمیں حاصل یہ سعادت ہوگی

کیفی نے جہاں زندگی اور اس کے نظام پر طنز کے تیر چھوڑے ہیں وہاں کھوکھلے ادیبوں شاعروں اور نقّادوں پر بھی گہرے طنز کیے ہیں۔

لاکھ ڈھونڈیے ان میں کچھ نیا نہیں ملتا
میز بھر رسائل کے جو نئے شمارے ہیں

یہ تصوّر بھی گراں بار تھا اب سے پہلے
ایسی بازار میں ارزانیِ شہرت ہوگی

معنوی اعتبار سے کیفی کی غزلیں وسعت کا احساس دِلاتی ہیں۔

—— (ڈاکٹر) مجیب الاسلام

رجز (شعری مجموعہ)
شاعر: امیر قزلباش
صفحات: ۱۱۲
قیمت: چالیس روپے
ناشر: ناہید پبلیکیشنز، ۱۱-۸، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی ۱۳۔

"رجز" امیر قزلباش کا چوتھا مجموعہ ہے امیر قزلباش کی ابتدا رومانویت سے ہوئی تھی اس میں کچھ عمر کا تقاضہ اور کچھ طبعی میلان شامل تھا۔ "بازگشت" سے "رجز" تک پہنچتے پہنچتے امیر قزلباش نے زمانی اور ذہنی کئی مرحلے طے کیے۔ کچی عمر کی رومانویت سنِ بلوغ کی حقیقت پسندی میں تبدیل ہوئی اور شاعر کا ایک مخصوص لب و لہجہ سامنے آیا۔ رومانوی عناصر اپنے وسیع تر معنی میں تو برقرار رہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ شاعر کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا بھی ادراک ہوا اور شاعر نے اپنے فن کو ان دو متضاد روّیوں کا "میدانِ کارزار" بنانے کی بجائے نقطۂ اتصال بناد[illegible] اور یوں امیر قزلباش کے لہجے اور روّیے میں تلخی او[illegible] اضطراب کی بجائے نرمی اور ٹھہراؤ نے بار پایا[illegible]

امیر قزلباش کے لہجے اور لفظیات کے رشتے یگا[illegible] (کھرے اور راست لہجے کی حد تک) اور آرزو لکھنو[illegible] [ٹھیٹ اُردو] سے ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے[illegible] یگانہ کی "غم کھاتے کھاتے مُنہ کا مزا تک بگڑ گیا" وال[illegible] تلخی کی بجائے ان کی خود اعتمادی اور کہیں کہیں م[illegible] طلبی والے انداز کو اپنایا۔ پُرانی غزل کے بہت سار[illegible] ٹکسال باہر الفاظ کو آرزو لکھنوی نے "سُریلی بانسر[illegible] کی ٹھیٹ اُردو غزلوں میں استعمال کیا تھا امیر قزلباش نے اس روایت کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش کی[illegible]

اس معاملے میں وہ اپنے بہت سارے ہم عصروں[illegible] یوں مختلف ہیں کہ ثانی الذکر بہت سے اصحاب[illegible] نئے الفاظ کی دُھن میں صوتی آہنگ اور آس پاس[illegible] کے الفاظ میں باہمی توازن کی طرف توجّہ نہیں د[illegible] امیر قزلباش نے یقیناً روزمرّہ کے الفاظ استعمال ک[illegible] لیکن مصرعے کا توازن بگڑنے نہیں دیا اور یہ معمو[illegible] کامیابی نہیں۔ امیر کے ہاں موجودہ دَور کی بے[illegible] بھی ملتی ہے آج کا بے چین ذہن اور روزمرّہ پیش[illegible] آنے والے معمولی معمولی واقعات کا عکس بھی لی[illegible] وہ پیچیدہ صورت حال کو مزید پیچیدہ انداز م[illegible] بیان کرنے کی بجائے آس پاس کی زندگی کے ک[illegible] مانوس واقعے یا منظر سے یوں ہم آہنگ کر کے پیش[illegible] کرتے ہیں کہ اس کی اجنبیت ختم نہیں تو کم ضرور ہو[illegible] ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے قاری اور سا[illegible]

سے ان کا ربط فوری قائم ہو جاتا ہے۔ امیر کے ہاں استعارہ، علامت، تشبیہہ، کنایہ اور تلمیح سب موجود ہے لیکن ان کا شعر پہلے معنوی اعتبار سے متوجہ کرتا ہے اور یہ شعری لوازمات ذیلی بن جاتے ہیں۔

امیر قزلباش کا ایک وصف، جو خاص طور پر متوجہ کرتا ہے یہ ہے کہ وہ تخصیص سے تعمیم کا سفر بڑی آسانی اور فطری انداز میں طے کر لیتے ہیں ان کے اکثر اچھے اشعار شخصی ہوتے ہوئے بھی شخصی نہیں رہتے بلکہ کسی عمومی تجربے کا اظہار بن جاتے ہیں۔ اور وصف کی بات یہ ہے کہ اشعار کی یہ "ماہیتِ قلب" اتنے غیر محسوس طور پر ہوتی ہے کہ اکثر اوقات شعر پڑھنے پر اس کا پتہ ہی نہیں چلتا البتہ قرأت کے بعد شعر کی اس نئی جہت کا احساس ہوتا ہے اور یہی حیرت شعر کی کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے۔

یہاں میں "رجز" کی شعری زبان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس آنے والے شعراء نے یقیناً زبان و بیان کے نئے نئے تجربات کیے، الفاظ اور موضوعات کی "چھوت چھات" کو ختم کیا اور سکہ بند اظہار سے بغاوت کی لیکن اُن میں سے اکثر نئے پن اور بوالعجبی، ابہام اور اہمال، شعر اور غیر شعر میں فرق نہ کر سکے جس کے نتیجے کے طور پر شعر کے اچھے قاری بھی سامع کے کردار پر اکتفا کرنے لگے اور مشاعروں کی گرم بازاری شروع ہو گئی اور اسٹیج کی شاعری اور رسالے کی شاعری کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہونے لگی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد آنے والے کچھ ذہین شعراء نے غیر ضروری مشکل پسندی سے شعوری طور پر گریز کیا اور شعر کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب کرنے کی کوشش کی یہ زبان ایک نئی توانائی لے کر آئی اور شعر نے بجائے لفظی پینتروں کے خود اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا سیکھا امیر قزلباش کے ہاں زبان کا یہ استعمال ابتدا ہی سے ملتا ہے جو ایک طرف توان کی خود اعتمادی کا ضامن بن جاتا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تئیں ان کے مثبت رویّے کی نشاندہی کرتا ہے۔

"رجز" اردو شاعری کے موجودہ مزاج اور رویّوں کو سمجھنے میں مدد دینے والا ایسا مجموعہ ہے جو اپنے معنوی حُسن کے ساتھ ساتھ صوری حُسن کی وجہ سے بھی قابلِ توجہ ہے۔

آخر میں کچھ اشعار پیش ہیں۔

پاؤں شل ہو گئے چلتے چلتے
منزلیں گردِ سفر میں ڈھونڈو

کشتیاں خود بھنور میں آئی ہیں
کشتیوں میں بھنور نہیں آئے

کیسا اندازِ نظر ہے اس کا
نظر انداز نہ کر دے مجھ کو

(سہلِ ممتنع۔ رعایات)

ندامت اُسے مَیں نے ہونے نہ دی
مَیں خود اس کی باتوں میں آنے لگا

قدم قدم پہ بکھرنے کا خوف سا خود سے
نفس نفس میں اِک احساسِ بلا سی ہے

(نفسیات)

دیکھ لے کوئی بجھا کر مجھ کو
لے چلو شرط لگا کر مجھ کو

ایک دن سب سے جُدا ہو جاؤں
اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جاؤں

بے سائباں رکھیں گے تمہیں راہ کے شجر
سایہ نہ ہوگا اپنی گھٹا ساتھ لے چلو

کبھی کبھی مرے دامن کے کام آئے گی
یہ دھوپ دیدۂ تر میں رہے تو اچھا ہے

(خود اعتمادی)

۱۱۲ صفحات کا یہ مجموعہ "آج کی غزلیہ شاعری کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔ قیمت چالیس روپیے کسی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

——— بشر نواز

آخری زمین (ناولٹ)

مصنف: مظہر الزماں خاں
صفحات: ۱۵۲
قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتا: مظہر الزماں خاں، ۲۵۶۔ اسپیشل سی کلاس، سی آئی بی، کاچیگوڑہ، حیدر آباد

"آخری زمین" مظہر الزماں خاں کا تازہ ناولٹ ہے جو مکڑی کے نام معنون کیا گیا ہے جس نے بقول مظہر الزماں خاں سے پوری زمین پر جال بُن رکھا ہے۔ اس کے بعد ابواب کی بجائے مظہر الزماں نے زمینیں زمانے لکھا ہے صفحہ ۹ سے ۱۵ تک ہند و پاک کے ممتاز ناقدین کی رائے کے اقتباسات شائع کیے گئے ہیں پھر حضرت جنید بغدادیؒ کے خطوط کا ایک اقتباس درج ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ناولٹ وہی شخص پڑھے جسے بقول حضرت جنیدؒ کے خطوط کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اور اس طرح یہ ناولٹ کئی اہم عنوانات کے بعد پہلی زمین سے شروع ہوتا ہے اور پھر دس زمینوں تک یعنی پہلی دوسری تیسری سے آگے بڑھتا ہوا گیارہویں زمین یعنی آخری زمین (جو بغیر عنوان کے شروع ہوتی ہے) پہنچ جاتا ہے اور پھر انتہائی برق رفتاری سے اختتام پر پہنچ کر بھی جاری رہتا ہے کیونکہ مصنف نے تمام شد لکھ کر کاٹ دیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناولٹ آخری زمین جب تک زمین ہے تب تک جاری رہے گا چنانچہ پڑھنے پر بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ سفر مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جب تک

انسان اپنی تمام اچھی بُری صفات کے ساتھ زمین پر باقی رہے گا، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس ناولٹ کو قارئین جُوں جُوں پڑھتے جائیں گے اس کی معنویت پرت پرت کھلتی چلی جائے گی اور اَن گنت رازہائے سربستہ سے قاری واقف ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ناولٹ پوری زمین پر پھیلی ہوئی گندی سیاست۔ انسانی استحصال اُن کی اچھی بُری صفات اپنے تمام چہروں کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔

مصنف کے اندازِ بیان کی چند مثالیں :

"کاش ہمارے پانو نہ ہوتے تاکہ ہم اپنے اپنے گھروں کی دہلیزوں کے اندر ہی پورے کے پورے محفوظ رہتے۔"

"اتنی تیز دُھوپ ہے کہ سائے جلنے لگے ہیں اور زمین کو نیند آرہی ہے۔"

"پہلے ہمارے پانوؤں میں منزلیں چھپی ہوئی تھیں جو ہمارے پانوؤں کو اپنی طرف کھینچتی رہتی تھیں اب منزلیں گم ہوگئی ہیں اور صرف پانو باقی رہ گئے ہیں۔"

"ہم وہ درخت ہیں جو مسلسل بادلوں کا تعاقب کررہے ہیں کہ وہ کبھی تو ہم پر مہربان ہوں گے۔"

یہ ناولٹ کئی صدیوں پُرانی اور پھیلی ہوئی زمین کا اظہار ہے بقول مصنف کے یہ ایک بیج ہی نہیں بلکہ دماغوں کا مسکن ہے، روحوں کا پنجرہ، جسموں کا ذخیرہ اور ایک پورا جنگل اور پوری زمین ہے اس ناولٹ کا ایک کردار جو مجذوب کی طرح ہے مسلسل ایک نظم پڑھتا رہتا ہے۔

نہ فاختہ نہ ہُدہُد
نہ ہُما اور نہ شاہین
بس جھر جھر مٹی جھڑتی ہے
اور کولتار کی اندھی مینا
دانہ دانہ کہتی ہے

یہ نظم اس پورے ناولٹ میں پھیلی ہوئی ہے اور جب سردار پورے قافلہ کو ایک غار میں بند کردیتا ہے تو یہ نظم ہر طرف گونجتی رہتی ہے، اس ناولٹ کا سردار ہر زمین پر تبدیل ہوجاتا ہے کہ پوری ناولٹ میں سردار اور قافلہ کے درمیان جو مکالمے بیان کیے گئے ہیں وہ ان زمینوں کی شناخت بن جاتے ہیں۔

کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بعض جگہ پیراگراف تبدیل نہیں کیے گئے جس کی وجہ سے ربط ٹوٹتا ہے، کتابت بس گوارا ہے۔ اور قیمت ۳۰ روپے زیادہ ہے۔

—— یوسف شیرازی

شبِ رفتہ (ناول)
مصنف : وارث رشید قدوائی
صفحات : ۲۹۵
قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتا : ایسٹ ویسٹ بکس، سی ۴۹، جیتار نگر، دہلی

آج کا دَور صنعتی اور سائنسی ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ قاری کو اچھے ناول پڑھنے کی فرصت نہیں۔ اچھے ناول اب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ زیرِ نظر ناول ہمارے معاشرے کا ایسا مرقع ہے جس میں زندگی کے مثبت اور خوشگوار پہلو بھی ملتے ہیں اور تہذیبی ناسور بھی۔ "شبِ رفتہ" اصل میں ۱۹۴۱ء کے ہندوستانی معاشرے کی تہذیبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں چند ایسے کردار ہیں جو اندھے عقیدوں کے مُردہ پیکر ہیں لیکن ایسے کردار بھی ہیں جو ہر عہد میں زندہ رہیں گے۔ اس ناول کے کردار کنور دلیپ سنگھ اور اس کا دوست اختر احتشام حسین اور اس کا دوست مہاراجہ ہرنام سنگھ، ٹھاکر دیدار سنگھ، مان سنگھ ڈرائیور اور پنڈت رام دین ایسے کردار ہیں کہ "اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"۔ گیتا دیوی جس کی شادی نوجوان وطن پرست اور آزادی کے متوالے کنور دلیپ سنگھ سے ہونی قرار پائی تھی اپنے وطن کی آزادی کی خاطر انگریزوں کی گولیوں سے نہ گھبرا کر ہنستے ہنستے موت کے گلے لگ جاتی ہے۔

کتاب کی طباعت اور کتابت نہایت خوشنما ہے۔

—— دلیپ بادل

اُردو خبر نامہ

اُردو تعلیم اور اُردو پریس کی ترقّی سے وزیرِ اعظم کو دلچسپی

وزیرِ اعظم راجیو گاندھی نے اُردو اخبارات کے ایڈیٹروں کے ایک گروپ کو نئی دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر مدعو کرکے ڈیڑھ گھنٹے تک اُردو زبان، اس کی تعلیم، اُردو پریس کے مسائل اور اس کی ترقیات کے منصوبوں پر تبادلۂ خیالات کیا۔ وزیرِ اعظم سے اُردو ایڈیٹروں کی ملاقات کے وقت وزیرِ اطلاعات ونشریات شری ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت بھی موجود تھے۔ اس ملاقات کے لیے ملک بھر سے سولہ ایڈیٹر مدعو کیے گئے تھے۔ جن میں احمد سعید ملیح آبادی، عابد علی خاں، خالد انصاری، عشرت علی صدیقی، شاہد صدیقی، ظفر پیامی، عابد اللہ آبادی، معین فاروقی، رضوان احمد اور دیگر حضرات شامل تھے۔

وزیرِ اعظم کو بتایا گیا کہ پبلک سیکٹر کی کارپوریشنوں، بینکوں اور انڈرٹیکنگس وغیرہ کے اشتہارات سے اُردو اخبار بالعموم محروم ہیں۔ سرکاری اشتہارات کے نرخ میں بھی دوسری زبانوں کے اخباروں کے مقابلے میں یکساں اشاعت کے باوجود فرق برتا جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ اُردو پریس جو ملکی زبانوں کے پریس میں چوتھے نمبر پر ہے، اس کی ترقّی اس لیے بھی رُکی ہوئی ہے کہ اُردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس مہیا نہیں ہے۔ آفسیٹ کی طباعت کے باوجود کتابت کا سُست رفتار عمل ترقّی میں مانع ہے جس کے لیے اُردو نستعلیق کمپیوٹر ضروری ہے تاکہ اخبارات اور رسائل و کتب کی تیز رفتار طباعت واشاعت ہوسکے۔

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے اُردو نستعلیق کمپیوٹر اور اُردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس کے معاملے سے اپنی گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ ایڈیٹر "آزاد ہند" جناب احمد سعید ملیح آبادی نے وزیرِ اعظم کو مطلع کیا کہ حکومتِ ہند کے ترقّی اُردو بورڈ نے ان دو پروجکٹوں پر کام شروع کیا ہے جو آخری مرحلے میں ہے۔ اُردو نستعلیق کمپیوٹر تیار ہوگیا ہے اور پاکستان میں رائج کمپیوٹر کے مقابلے میں بہت ہی کم قیمت پر دستیاب ہے۔ اسے ترقّی اُردو بورڈ کی اُردو کمپیوٹر اور اُردو ٹیلی پرنٹر اکسپرٹ کمیٹی اپنی میٹنگ میں آخری شکل دے گی۔ وزیرِ اعظم نے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور وزیرِ اطلاعات جناب بھگت سے کہا کہ وہ اپنی وزارت کے ذریعے اُردو ٹیلی پرنٹر کے منصوبے کو تیزی سے آگے بڑھائیں۔

اُردو زبان کے تحفّظ اور ترقّی کے مسئلے پر وزیرِ اعظم کو جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" حیدرآباد نے خاص طور سے متوجّہ کرتے ہوئے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بروئے کار لانے پر زور دیا۔ وزیرِ اعظم نے یہ کام بھی جناب بھگت کو سونپا کہ وہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ نکال کر اس کا جائزہ لیں کہ اب تک کیا ہوا اور کیا ہونا باقی ہے۔

احمد سعید ملیح آبادی نے وزیرِ اعظم کی توجّہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی میں خصوصیت کے ساتھ اقلیتوں کی تعلیم کا ایک باب شامل کیا گیا ہے مگر اس میں اُردو کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اُتّر پردیش وغیرہ میں اُردو تعلیم پہلے کی طرح بند ہے۔ وزیرِ اعظم نے اس انکشاف پر تعجب ظاہر کیا کہ اقلیتی تعلیم کے باب میں اُردو کا ذکر موجود نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کو ضرور دیکھیں گے۔ اس مقصد کے لیے بھی گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بروئے کار لایا جائے گا۔

گفتگو کے دوران وزیرِ اعظم نے از خود ایک اہم نکتہ اٹھایا کہ صرف اُردو کی تعلیم کا قابلِ اطمینان بندوبست کرنے سے ہی مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا جب تک کہ اُردو تعلیم کا رشتہ روزگار سے بھی نہ جوڑا جائے۔ وزیرِ اعظم نے اس خیال سے بھی اتّفاق نہیں کیا کہ صرف اُردو رسم الخط کی حفاظت کی جائے خواہ اُردو کے نام سے زبان نہ پہچانی جائے۔ شری راجیو گاندھی نے کہا کہ اُردو زبان اور اُردو رسم الخط دونوں ہی کی حفاظت ضروری ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اُردو پریس کا گہرا رشتہ وطن کی جنگِ آزادی سے جڑا ہوا ہے اور آج بھی اُردو پریس کا مطمحِ نظر قومی ہے کیوں کہ اُردو کسی ایک علاقے تک محدود نہیں اس لیے اُردو پریس کی فکر علاقائیت تک محدود نہیں بلکہ قومی سطح پر اس میں ملک گیر وسعت ہے۔ ("ہماری زبان")

ترقیٔ اُردو بورڈ کے وفد کی وزیرِ اطلاعات سے ملاقات

۱۵ اپریل کو ترقیٔ اُردو بورڈ کی ایکسپرٹ کمیٹی برائے اُردو کمپیوٹر اور اُردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس کی میٹنگ وزارتِ تعلیم کے آفس میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ترقیٔ اُردو بورڈ کے وائس چیرمین سید سبط رضی صاحب وزیرِ تعلیم اتر پردیش نے کی۔ ایکسپرٹ کمیٹی کے کنوینر احمد سعید ملیح آبادی نے کمیٹی کی اب تک کی پیش رفت کا جائزہ لیا۔ اس میٹنگ میں کمپیوٹر بنانے والی فرموں کے نمائندوں کے علاوہ خبر رساں ایجنسی یو۔ این۔ آئی کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر گپتی بھی شریک ہوئے۔ ترقیٔ اُردو بورڈ کے بیورو کی ڈائرکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، پرنسل پبلی کیشنز آفیسر بیورو جناب ابوالفیض سحر، رکن بورڈ و کمیٹی جناب گوپی چند نارنگ اور متعلقہ وزارتوں کے اعلیٰ افسران نے حصہ لیا۔ خصوصی دعوت پر وزارتِ اطلاعات کے اُردو آفیسر جناب خواجہ عبدالخالق بھی شریک ہوئے۔

ایکسپرٹ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد ترقیٔ اُردو بورڈ کا وفد وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ وفد کی قیادت جناب سید سبط رضی نے کی۔ بھگت صاحب کو بورڈ کی جانب سے گجرال کمیٹی کی رپورٹ کی کاپی پیش کی گئی اور اُردو کمپیوٹر اُردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس پر بورڈ کی ایکسپرٹ کمیٹی کی قرارداد کی کاپی نیز ان دو انقلاب آفریں منصوبوں پر وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کے نام احمد سعید ملیح آبادی کے مکتوب مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۸۸ء کی کاپی بھی پیش کی گئی۔ وزیرِ اطلاعات کے ساتھ وفد کی ملاقات گھنٹہ بھر دوستانہ اور پُر اُمید ماحول میں ہوئی۔

بھگت صاحب نے مطلع کیا کہ حکومت نے اُردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس کے آغاز کا فیصلہ کر لیا ہے اور عملی اقدام کے لیے جلد ہی متعلقہ افراد نیز ٹیلی پرنٹر بنانے والی فرموں کے نمائندوں کی میٹنگ طلب کی جائے گی۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کا جائزہ لے کر اور معلومات مہیا کر کے وہ اپنی رپورٹ وزیرِ اعظم کو پیش کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انجمن ترقیٔ اُردو کے ارباب سے بھی وہ ملاقات کر کے اُردو کی ترقی و ترویج کے منصوبوں پر تبادلۂ خیالات کریں گے۔ وزیرِ اعظم نے اس پر زور دیا ہے کہ اُردو ٹیلی پرنٹر بھی کمپیوٹرائز ہو تاکہ دوسری زبانوں کی سروس سے پھر پچھڑ نہ جائے۔ چنانچہ اب اسی پروجکٹ پر عمل شروع کیا جا رہا ہے۔ (ہماری زبان)

انجمن ترقیٔ اردو ہند کا وفد مرکزی وزیر سے ملا

اُتر پردیش میں اُردو کے مسائل حل نہیں کیے گئے تو اس کا اثر پورے ہندوستان پر بہت بُرا پڑے گا۔ اُردو کے معاملے میں تمام ہندی ریاستیں اُتر پردیش کو اپنا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ مرکزی حکومت صدر جمہوریہ ہند سے سفارش کرے کہ اُردو کو اُتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ یہ مطالبہ انجمن ترقیِ اُردو کے ایک وفد نے جناب نرسمہا راؤ سے کیا۔ یہ وفد ۸ جون ۸۸ء کو وزیرِ موصوف سے ملا تھا۔

وفد کی قیادت انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کے صدر جناب سید حامد کر رہے تھے اور اس وفد میں پنڈت آنند نرائن ملا، جناب مالک رام، جناب سید شہاب الدین دسنوی، جناب حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر خلیق انجم شامل تھے۔

اس وفد نے نرسمہا راؤ صاحب کو ایک میمورنڈم پیش کیا میمورنڈم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اتر پردیش اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات کے بارے میں میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ ان پر جلد سے جلد عمل کیا جائے۔

نرسمہا راؤ صاحب نے کہا کہ اگر آپ لوگ فی الحال اپنے مطالبات کو اتر پردیش تک ہی محدود رکھیں تو اُردو کے حق میں ... ہوگا کیوں کہ میں آپ حضرات کے اس ... سے بالکل متفق ہوں کہ اگر اتر پردیش میں ... کا مسئلہ حل ہو گیا تو پورے ہندوستان ... اس کا خوش گوار اثر پڑے گا۔ وزیرِ موصوف نے یقین دہانی کی کہ وہ اُتر پردیش میں ... کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ... کوشش کریں گے۔

(مراسلہ انجمن ترقیِ اُردو (ہند))

اُتر پردیش اُردو اکادمی کا نیا بجٹ

لکھنؤ۔ اُتر پردیش اُردو ا...

مجلسِ انتظامیہ نے اگلے مالی سال کا نظرِ ثانی شدہ بجٹ منظور کرتے ہوئے جو اہم فیصلے کیے ہیں ان کی خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں :

(۱) اُردو تعلیم و ترقّی کے لیے ابھی تک اُتر پردیش اُردو اکادمی ہر سال چھٹے درجے سے ایم اے تک اور اُردو ریسرچ اسکالروں کو ساڑھے چھ لاکھ روپے سالانہ کے وظائف دیتی تھی اور وظائف کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ نظرِ ثانی شدہ بجٹ میں یہ رقم دس لاکھ روپے سالانہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اکادمی نے ہر درجے میں وظائف کی رقم اور تعداد میں اضافہ کیا ہے۔

چھٹے درجے میں بارہ سو وظائف' دو سو روپے سالانہ نویں درجے میں چھ سو وظائف تین سو پچیس روپے سالانہ' گیارہویں درجے میں تین سو وظائف چار سو روپے سالانہ' بی۔ اے سال اوّل میں ہر کالج ہر یونیورسٹی میں تین طالب علموں کو ۸۵۰ روپے سالانہ کے وظائف تعلیمی سال ۸۸-۱۹۸۷ء سے دیے جائیں گے۔ ساتویں' آٹھویں' دسویں' بارہویں' بی۔ اے سال دوم اور ایم۔ اے سال دوم میں حسبِ سابق وظائف کی تجدید کی جائے گی۔ اس طرح اکادمی نے ہر درجے میں ۲۰ روپے سے لے کر ۷۰ روپے سالانہ تک وظیفے کی شرح میں اضافے کے ساتھ ساتھ تقریباً دو ہزار وظائف کی تعداد میں اضافہ بھی کر دیا ہے۔

(۲) بیمار اور معذور شعرا اور ادبا کی ماہانہ امداد میں یکم اپریل سے پچاس روپے ماہانہ کا اضافہ منظور کر لیا ہے اور اس مد میں اکادمی نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا اضافہ کر دیا ہے۔

(۳) اشاعتی پروگرام کے تحت اکادمی نے نادر اور کمیاب' جنگِ آزادی اور بچّوں کے ادب سے متعلّق کتابوں کی اشاعت کا ایک وسیع پروگرام بنایا ہے جس کے لیے اشاعتِ کتب کی مد میں ۷۵ ہزار روپے سالانہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر سال ایک لاکھ پانچ ہزار روپے اس میں صرف کیے جائیں گے۔

(۴) مسوّدات کی مد میں ۲۵ ہزار روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح مسوّدات کی مد میں ایک لاکھ روپے سالانہ صرف کیے جائیں گے۔

(۵) انعاماتِ کتب میں ۲۵ ہزار روپے کا اضافہ کیا گیا ہے اور اب ایک لاکھ ۷۵ ہزار روپے سالانہ کے انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔

(۶) اکادمی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ غیر اُردو داں طبقے میں اُردو سے دِل چسپی پیدا ہو اس کے لیے اُردو کوچنگ میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کو ۳۰ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اُردو ٹائپ سیکھنے والوں کو بھی تیس روپے ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے جدوجہد

حیدرآباد — اورینٹل گریجویٹس ایسوسی ایشن آندھرا پردیش اور اُردو ٹیچرس فیڈریشن آندھرا پردیش نے "اُردو بچاؤ تحریک" میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ دونوں تنظیموں کے نمائندے عملی جدوجہد میں حصّہ لیں گے۔ چنانچہ معظم جاہی مارکیٹ میں ہیلپرس کوارٹر کے تاریخی مقام پر جہاں اس سے پہلے بھی اُردو تحریک کے سلسلے میں بھوک ہڑتال کر چکے ہیں بھوک ہڑتال کیمپ کا قیام عمل میں لایا جائے گا دونوں تنظیموں نے اس مقصد کے لیے اُردو بچاؤ تحریک سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔ جناب نذیر احمد نے جو دونوں تنظیموں کے صدر ہیں' اپنے بیان میں کہا ہے کہ آندھرا پردیش میں اُردو کو تلگو کے علاوہ سرکاری زبان قرار دینے کی تحریک میں بھی اورینٹل گریجویٹس ایسوسی ایشن نے سرگرم حصّہ لیا تھا۔ حیدرآباد سے شروع ہونے والی اس تحریک کے زیرِ اثر ملک کے دوسروں حصّوں میں بھی اُردو تحریک کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔ اور پہلی بار اُردو والوں نے عملی طور پر بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ اب ایک بار پھر وقت آگیا ہے کہ آندھرا پردیش میں' جو بحیثیت سرکاری زبان اُردو کے استعمال اور چلن کی اپنی ایک تاریخ اور مخصوص تہذیبی پس منظر رکھتا ہے اُردو کو بحیثیت سرکاری زبان مٹنے سے بچایا جائے۔ اورینٹل گریجویٹس ایسوسی ایشن تمام ہندوستانی اور مشرقی زبانوں کی نمائندگی کرتی ہے اور ہر سال ہم آہنگی اور خیرسگالی کی برقراری کے لیے سرکاری نظم و نسق میں اُردو کے مستحقہ مقام اور موقف کے تحفّظ کو ضروری سمجھتی ہے۔ دونوں تنظیمیں توقع رکھتی ہیں کہ ریاستی حکومت زبان کے مسئلے پر تنگ نظری کے رویّے کو ترک کرے گی اور اُردو' تلگو' انگریزی اور ہندی تمام زبانوں سے انصاف کرے گی۔

بمبئی میں اُردو گھر تعمیر ہوگا؟

اُردو اپنی خوبیوں کی وجہ سے زندہ ہے اور ترقّی کر رہی ہے' اُردو کا مخالف بھی

اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو مختلف زبانوں کی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ میں اُردو گھر کے لیے قطعۂ اراضی دینے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ اُردو والے اس پر عمارت تعمیر کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ اُردو والوں نے تہیہ کرلیا تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

یہ باتیں مہاراشٹر کے وزیرِ اعلا اور صدر مہاراشٹر اُردو اکادمی شنکر راؤ چوہان نے ۱۹۸۷ء کے لیے تقریبِ تقسیمِ انعامات میں کہیں جو ۲ جون ۸۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بدقسمتی سے ملک بھر میں جس میں مہاراشٹر بھی شامل ہے، ہمارے مشترکہ تہذیبی ورثے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اُردو ادیبوں اور شاعروں کو اس کے خلاف جدوجہد کرنے اور عام فہم زبان لکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اُردو مراٹھی کے تعلق سے کہا کہ اُردو اور مراٹھی ادیبوں کو مل جل کر بھائی چارے کی فضا ہموار کرنی ہوگی۔ مراٹھی ڈرامے میں نہایت کامیاب تجربے ہوئے ہیں۔ اُردو کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، نائب صدر اکادمی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کا انعام اہم اعزاز ہے، اُسے ادبی صلاحیت کا اعتراف نامہ سمجھا جاتا ہے، لہٰذا ہم نے سارے فیصلے دیانت داری سے کیے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ڈرامے کی فضا بنانے میں ناکام رہے، جب کہ مراٹھی اپنے ڈراموں کی تازگی اور تنوع کی بدولت ممتاز ہے۔ ڈرامہ عوامی فن ہے اور براہِ راست سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، اسے اور بھی پھیلانے کی ضرورت ہے۔

جناب سید احمد، وزیر ہاؤسنگ نے کہا کہ مراٹھی اور اُردو کا آپسی رشتہ بہت قدیم ہے اور دونوں زبانوں پر اس کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ ممبر سیکریٹری ڈاکٹر آدم شیخ نے کہا کہ اکادمی اردو کلاسوں کے ذریعے غیر اُردو دانوں میں اُردو پھیلانے کی مؤثر کوشش کر رہی ہے۔ ترجموں کے ذریعے ہم دونوں زبانوں کو قریب ــ لانے کی ج
کر رہے ہیں۔

اُردو/ہندی کا مشترکہ جلس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شع
کے زیرِ اہتمام اُردو ہندی ادب پر م
ایک روزہ مذاکرے کا افتتاح کرتے
پرووائس چانسلر پروفیسر وصی الرحم
کہا کہ افسانہ اور شعر ادب کی دو آنکھ
اور دونوں کی ترقی ہی سے ادب کا چہ
ہوتا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی ک
مذاکرہ ہندی اور اُردو ادب ــ
نئی راہیں متعین کرے گا۔ اپنی صدارت
میں جناب اقبال متین نے کہا کہ اُردو
اپنی شناخت کھوچکی ہے اور کہانی
کے سلسلے میں جتنی پریشانیاں اُردو کہ
اٹھائیں کسی اور زبان نے نہیں۔
کہا کہ اُردو کو زوال پذیر بنانے میں

قائد، ادیب اور اساتذہ زیادہ قصوروار ہیں۔ ہندی کے نقاد پروفیسر کنور پال سنگھ نے ہندی اور اُردو کے مشترکہ جلسوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علیحدگی کے رجحانات سے دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اُردو کے ادیب ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

تھا، بڑے پُرگو شاعر تھے۔ غزل، نظم، سلام، سہری، مرثیہ، مسدس، قطعہ، رُباعی، مخمس بہت سی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ مشاعروں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شرکت کرتے تھے مگر کبھی کسی سے زادِ راہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ مرحوم کامل نظامی دہلوی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ ۲ مئی ۱۹۸۸ء کی شب کو یہ چراغ بجھ گیا۔

شعرا حضرات سے گذارش

خادم مقتول وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے متعلق منظومات ترتیب دے رہا ہے۔ تادمِ تحریر تقریباً ڈیڑھ سو منظومات جمع ہو چکی ہیں۔ مزید منظومات درکار ہیں۔ لہٰذا شعرائے اکرام سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ مذکورہ منظومات (نظم / نثری نظم / رُباعی / تضمین / قطعہ وغیرہ) مع مختصر تعارف کے درجِ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔ کتاب شائع ہونے پر ہر شاعر کو ایک ایک کاپی نذر کی جائے گی انشاء اللہ!

خادم

ک۔ ض۔ سندولکر

پلاٹ نمبر 22/9.5، شیواجی نگر،

گووندی، بمبئی 400043

عشرت خورجوی نہیں رہے

عشرت خورجوی ۱۹۰۲ء کو خورجہ (بلند شہر) کے ایک قریشی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کا رکھا ہوا نام عبدالعزیز

○ کرناٹک کے ایک علمی ادارے نے "ایوانِ اردو دہلی" کو غالب ایوارڈ دینے کا جو فیصلہ کیا ہے۔ اس پر میری جانب سے آپ، نقوی صاحب اور آپ حضرات کے رفقائے کار دلی مبارکباد قبول فرمائیں یہ اعزاز آپ حضرات کی باجماعت لگن اور محنت کا ثمرہ ہے۔

——— رضا نقوی واہی، پٹنہ

○ میں نے "ایوانِ اردو دہلی" میں قسط وار شائع ہونے والے اپنے سلسلۂ مضامین "دلّی کے آثارِ قدیمہ" میں "۶" کے عدد کی اِملا "چھے" کی تھی۔ (املا مونث اور مذکر دونوں طرح جائز ہے) جناب محمد خالد جیلانی (پٹنہ) اور جناب نجم الثاقب شحنہ (یادگیر) نے اس املا کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ "۶" کا عدد عام طور سے "چھ" لکھا جاتا ہے، لیکن ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی اِملا کمیٹی نے اس عدد کی اِملا "چھے" تجویز کی تھی۔ بعد میں ترقیِ اردو بورڈ کی اِملا کمیٹی نے بھی مجوزہ اِملا کو تسلیم کر لیا۔ اس عدد کی اِملا پر گفتگو کرتے ہوئے رشید حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

"چھے" کا املا "چھہ" یا "چھ" قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ "چھ" سے "چھوں" اور "چھتر" بننا چاہیے۔ مگر جیسا کہ لفظ "چھے" میں بہ تفصیل مذکور ہوگا۔ اس لفظ کا مرجح اِملا "چھے" ہے اور اس لحاظ سے "چھیوں" اور "چھیتر" صحیح اِملا مانا جائے گا" (اردو اِملا۔ ص ۴۵۲)۔

غرض یہ ہے کہ دونوں طرح اِملا درست ہے غالب کے خطوط مرتب کرتے ہوئے میں نے متن کے لیے جو اِملا قرار دی تھی، اس میں "۶" کی اِملا "چھے" کی تھی۔ اس لیے اس کی عادت پڑ گئی ہے، ورنہ میں "چھ" کو مرجح سمجھتا ہوں کیونکہ اس کا چلن بہت زیادہ ہے۔

——— (ڈاکٹر) خلیق انجم، دہلی

○ جون ۸۸ء کا شمارہ ملا۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی نظم "اے ہلالِ عید" مجھے خاص طور پر اس لیے پسند آئی کہ شاعر نے اپنے ہر قسم کے خیالات، جو یقیناً بہت عمدہ و اعلیٰ ہیں، نظم کی ہیئتِ اصلی میں کسی نام نہاد آزادی کو روا رکھ کر اس کے فطری سانچے کو توڑے بغیر، عروض کے مقررہ قواعد و ضوابط کے مطابق بہت نفاست کے ساتھ ظاہر کیے ہیں۔

"آپ کی رائے" کے زیرِ عنوان آپ نے "صحافتی دیانت داری" کی دہائی سے مجبور ہو کر جو مکتوب شائع کیا ہے وہ کچھ عجیب سا ہے۔ مکتوب نگار جب مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کی عظمت "زمانے کے تقدم و تاخر" کی منطق پیش کر کے تسلیم کرتے ہیں تو اسی منطق کو تھوڑی سی وسعت دے کر مولانا آزاد کی تفسیر کی وہ اہمیت بھی تسلیم کر لیں جو میں نے واضح کی ہے، اس لیے کہ جن عربی و اردو تفاسیر کے نام انھوں نے لیے ہیں وہ قرآنی موضوعات کے ان مباحث سے خالی ہیں جو مولانا آزاد کے دورِ جدید کی علمی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آئے۔ یہی بات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر قرآن کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

اس طرح میں نے جو کچھ اس سلسلے میں لکھا ہے
واقعات و حقایق پر مبنی ہے اور بہت غور و فکر
نتیجہ ہے۔ اگر کسی کو علمی مطالعے کا ذوق ہو تو وہ
اردو مفسّروں کے کارناموں کے ساتھ دوسر
عربی و غیر عربی مفسّروں کا موازنہ موضوع بہ موض
کر کے دیکھ لے۔ مجھے توقع ہے کہ اس تحقیقی مطا
کے بعد ایک سلیم الطبع صاحبِ علم انشاءاللہ م
رائے سے اتفاق کرے گا۔

مکتوب نگار نے صرف اپنے شخصی مزعوما
کی بنا پر خاکسار کے متعلق جو غیر علمی اظہارِ خیال
ہے اسے میں نظر انداز کرتا ہوں، لیکن میری یہ
ضرور ہے کہ جو حضرات دوسروں کے علمی نتائج
پر تبصرہ کرنے کی جرأت کریں وہ پہلے خود موضو
بحث کا اچھی طرح مطالعہ اور اس پر کافی غو
کریں، تاکہ ان کی باتوں کا کچھ وزن محسوس
جا سکے۔

——— (ڈاکٹر) عبدالمغنی

○ مئی ۸۸ء کے "ایوانِ اردو دہلی" میں ع
کے مضمون "ڈاکٹر علیم: بحیثیت مارکسی نقاد" سے
بطور خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالعلی
تنقید نگاری کی بابت غالباً یہ پہلا مضمون ہے
مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ عابد سہیل نے پورے م
میں ایک جگہ بھی ڈاکٹر عبدالعلیم کا پورا نام نہیں
ہے، حالانکہ ان کی ساری تحریریں اسی نام سے
ہوئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نجی محفلوں میں
ڈاکٹر علیم بھی کہلاتے تھے اور علیم صاحب بھی

ترقی پسند ادبی تحریک سے اپنی قربت
ابتدائی زمانے سے ہی مجھ پر ڈاکٹر عبدالعلیم ک
رعب تھا، اور ان کے گرد ایک رومانی ہالہ بن
ہو گیا جب میں نے ادبِ لطیف کے سالنامہ
میں ترقی پسند ادیبوں کی حیدرآباد کانف

(اکتوبر ۴۵ء) سے متعلق کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" پڑھا۔ مجھے یاد ہے میں اور میرے دوسرے ترقی پسند ادب دوست ڈاکٹر علیم کی جسارت اور بے باکی کی اکثر ستائش کیا کرتے۔ اس کانفرنس میں ایک ہندوستانی انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی۔ جب لوگ اس کی حمایت میں بول چکے تو ڈاکٹر عبدالعلیم مائک پر آئے اور انھوں نے تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں ایسے لوگ نہیں ہیں جو یہ کام کر سکیں۔ کسی منچلے نے پوچھا: اسٹیج پر بھی نہیں؟ اسٹیج پر جواہر لال نہرو، رام سوامی آئنگر، ملک راج آنند اور دوسری اہم شخصیتیں موجود تھیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اسٹیج پر ایک نظر دوڑائی اور کہا: "نہیں!" تجویز گر گئی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے نظریہ ساز تھے۔ انجمن کا دستور جو اپریل ۳۶ء میں انجمن کی تاسیسی کانفرنس میں منظور ہوا، اسے سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے تیار کیا تھا۔ مارچ ۵۳ء میں دہلی میں منعقدہ انجمن کی کل ہند کانفرنس میں جو منشور پیش کیا گیا، اس کا مسودہ میرے خیال میں پورے کا پورا ڈاکٹر عبدالعلیم کا تیار کیا ہوا تھا۔ میرے اس خیال کو تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ شاہراہ کے اپریل ۵۳ء کے شمارے میں یہ منشور شایع ہوا، اور اسی شمارے میں یا اس کے بعد کے شمارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا ایک مضمون چھپا، دونوں کے متن میں بہت کم فرق ہے۔ جملے کے جملے اور الفاظ کے الفاظ یکساں ہیں۔ شاید ڈاکٹر علیم کو پسِ منظر میں رہ کر کام کرنے سے دلچسپی تھی۔ ان کے کچھ معتقدین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ "لندن کی ایک رات" کا اصل مسودہ درحقیقت ڈاکٹر علیم کا لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کا ایک نہایت اہم مضمون "ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں" ہے جو منزل لکھنؤ (فروری، مارچ ۴۴ء) میں شایع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے جو اس وقت عام طور سے ترقی پسند ادب پر کیے جاتے تھے۔ (یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان دنوں ترقی پسند ادب اور نئے ادب میں عموماً کوئی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا)

پانچویں دہائی کے اوائل میں آزاد نظم نگاری پر نقد حضرات بڑے معترض تھے۔ ترقی پسند حضرات بھی محسوس کرتے تھے کہ پیغام رسانی کے لیے مروّجہ ہیتیں ہی موزوں ہیں۔ سردار جعفری نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے ایک مضمون "جدید اُردو ادب اور نوجوانوں کے رُجحانات" (مطبوعہ علی گڑھ میگزین ۱۹۳۶ء) میں مغرب کی تقلید کہہ کر "بلینک ورس" کو مطعون کیا تھا۔ اس ضمن میں سجاد ظہیر کا لہجہ بھی معذرت خواہانہ تھا۔ ۴۴ء میں انھوں نے ایک مقالے میں کہا تھا:

"..... کئی ایسے ترقی پسند شعرا ہیں جو آزاد اور معرّیٰ (شاعری) کو ناپسند کرتے ہیں، پھر اس آزاد اور معرّیٰ نظم کے شیر خوار تجربوں کو ترقی پسندی کے سر کیوں تھوپا جاتا ہے؟"

ڈاکٹر عبدالعلیم کا رویّہ اس معاملے میں زیادہ معقول اور زیادہ معروضانہ رہا۔ انھوں نے اپنے مضمون "ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں" میں آزاد نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ اسلوب اُردو ادب کی ساخت یا مزاج کے خلاف ہے، اس لیے کہ ادب کا مزاج معیّن نہیں ہوتا۔ جس طرح ادب کا موضوع ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے، اسی طرح اسلوب اور طرزِ ادا میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی آزاد نظم کا رواج اتنا بڑھ جائے کہ قافیہ ردیف ہی نہیں، بلکہ بحر کی پابندی بھی بالکل ختم ہو جائے۔ شاعری علم عروض کی تدوین سے بہت پہلے وجود میں آئی اور عروض کی پابندیوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی باقی رہے گی۔ زندگی کے آہنگ کی مناسبت سے شاعری میں بھی نئے آہنگ پیدا ہوں گے۔"

اس طرح انھوں نے ان خیالات کی تائید کی جنھیں حالی، عظمت اللہ خاں وغیرہ پیش کر چکے تھے اسی نوع کے خیالات نے نثری نظم تک کے لیے فضا ہموار کی ہے۔

یہ بات شاید ہی کچھ لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر عبدالعلیم شعر بھی کہتے تھے، اور وہ بھی غزل کے حالانکہ وہ غزل گوئی کو ناپسند کرتے تھے۔ (میں نے خود ایک تقریر میں انھیں غزل کی مخالفت کرتے ہوئے سنا ہے روشن صدیقی نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی تھی لیکن ڈاکٹر علیم کے ایک ہی جملے نے انھیں خاموش کر دیا) علیم صاحب کے چند اشعار کلکتہ کی ایک نجی محفل میں سننے کا مجھے اتفاق ہوا ہے، جس میں ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ل احمد اکبر آبادی اور پرویز شاہدی بھی موجود تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین، جس کی بنیاد تحریک کے پُرجوش نظریہ سازوں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی انھیں کے ہاتھوں پورے بیس سال بعد مئی ۵۶ء میں دفن کر دی گئی۔ اس مہینے حیدرآباد میں ایک کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کئی ترقی پسند ادیب بہ شمول سجاد ظہیر و ڈاکٹر عبدالعلیم موجود تھے۔ ان بانیانِ انجمن نے یہ اعلان کیا کہ انجمن اپنا کام کر چکی ہے اور اب اس تنظیم کی ضرورت نہیں رہی۔ سجاد ظہیر نے کہا:

"پہلے میری رائے تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا چاہیے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے

اسے باعمل بنانا چاہیے لیکن اب میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر عبدالعلیم نے دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میرا اپنا خیال ہے کہ بُرا یا بھلا جو بھی کام کرنا تھا انجمن کر چکی۔ اب اس تنظیم پر توجہ دینے کے بجائے ایک کُل ہند اُردو ادیبوں کی انجمن بنائی جائے، بلالحاظ اس کے کہ اراکین کے معاشی، سیاسی یا مذہبی نظریے کچھ بھی ہوں۔ ہمارے پاس صرف ایک معیار ہو اور وہ یہ کہ ہر رُکن لکھنے والا ہو۔ لکھنے والوں میں بھی ہم کوئی معیار یا سطح مقرر نہیں کر سکتے ہر شخص کو رُکن بننے کا حق ہونا چاہیے۔ ترقی پسند خیالات کی ترویج و اشاعت جس طرح آج ہو رہی ہے، ہوتی رہے گی۔ ایک وسیع انجمن میں جا کر ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے خیالات سے متاثر کر سکیں گے۔"

(صبا حیدرآباد، جون، جولائی ۵۱ء)

یہ خوشی کی بات ہے کہ عابد سہیل نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی تنقید کے بعض گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ نقاد عموماً ذہنوں کو گمراہ کرتا ہے۔ خواہ وہ مارکسی ہو یا غیر مارکسی۔ عابد سہیل نے ایک نشاندہی تو یہ کی ہے کہ سردار جعفری نے فیض اور جذبی کی ایمائیت اور اشاریت پر جو اعتراضات کیے تھے، اس کا سرچشمہ ڈاکٹر علیم ہی کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ بہت سے ترقی پسند ادیب اپنی باتوں کو واضح طور پر نہ کہہ کر تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں میں پیش کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار کی صوفیانہ اور عارفانہ تشریح کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر علیم کی تحریروں نے اس نوع کی گمراہی پھیلانے میں کتنا حصہ لیا ہے؟ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

"ایوانِ اُردو دہلی" کے اسی شمارے میں آخری ٹائٹل پر "سرودِ رفتہ" کے تحت انشا کی مشہور غزل چھپی ہے۔ اس کے مطلعے کا پہلا مصرع یوں شایع ہوا ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے پر یاں سب یار بیٹھے ہیں

ہم سب لوگ "پہ" کی جگہ "کو" پڑھتے رہے ہیں۔ شاید آپ نے تن کی صحت کا خیال رکھا ہوگا۔ اسی طرح میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ شاعر نے ان دو مصرعوں

کہیں ہیں صبر کس کو، آہ ننگ و نام ہے کیا شے؟

اور

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے

کو اس طرح کیوں نہیں لکھا:

کہیں ہیں صبر کس کو آہ ننگ و نام کیا شے ہے؟

اور

نئی یہ وضع شرمانے کی تم نے آج سیکھی ہے

ماہرینِ بلاغت اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟

—— مظہر امام، سری نگر

○ مئی کے شمارے میں عابد سہیل صاحب کا مضمون علمیت سے پُر ہونے کے باوجود خشک ہے۔ افسانے متاثر کن ہیں۔ جبکہ بھول صحرائی پر سحر صاحب کا انشائیہ مقالہ نویس برادری پر صحیح طنز ہے۔ اعزاز افضل، صہبا وحید، منظر سلطان، خورشید طلب وغیرہ کی غزلیں پسند آئیں۔ "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" کی آخری قسط دیکھ کر رنج ہوا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ خلیق انجم صاحب اپنی تحقیقی کاوشیں جاری رکھیں اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے متعلق آثارِ قدیمہ پر مضامین تحریر کرتے رہیں تاکہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو۔

—— کلیم حیدر شرر، بمبئی

○ "ایوانِ اردو دہلی" ماہ مئی ۸۸ء میں پہلے ہی مضمون "ڈاکٹر علیم بحیثیت مارکسی نقاد" پر نظریں ٹھہر گئیں۔ عابد سہیل صاحب نے علیم صاحب پر یہ مضمون لکھ کر تمام ادب نواز حضرات خصوصیت سے ترقی پسند ادیبوں پر ایک احسان کیا ہے کیونکہ ہم اپنے ایک محسن کو تقریباً بھول چکے ہیں۔

افسانوی حصے میں عظیم اقبال کا "ناشناس" اور مشرف عالم کا "خیمے" پسند آئے۔ طنز و مزاح کی دونوں تخلیقات دلچسپ ہیں۔ زاہدہ زیدی صاحبہ نے ٹولسٹائی کے کردار "ایلچ" کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جن لوگوں نے اوریجنل ناولٹ نہیں پڑھا وہ بھی پورا پورا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

—— عارف محمود، کانپور

○ مئی ۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" زیر مطالعہ ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں آپ کا اور ہم سب کا یہ ادبی جریدہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس بار کے سارے مضامین پسند آئے۔ جناب رضا نقوی واہی کی نظم "اکیسویں صدی میں آبادی گھٹاؤ ہم" مزاحیہ ہے۔ اس نظم کے نویں بند کے آخری مصرعے "علم کیمسٹری نے کیا مسئلے کو حل" میں "علم کیمسٹری" کی جگہ علم کیمیا ہونا چاہیے۔ کیونکہ "کیمسٹری" کے لغوی معنی "علم کیمیا" ہے اس طرح علم کیمسٹری کہنے میں قباحت محسوس ہونا لازمی ہے۔

—— (ڈاکٹر) محمد فاروق اعظم، کبیر بھانڈہ

○ مئی ۸۸ء کے شمارے میں جناب خلیل رمزی، (آسنسول) کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ آپ پہاڑ جیسی غلطیوں کو بھی برداشت کر رہے ہیں۔ مثلاً اسی شمارے میں جناب وفا ملک پوری کی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے:

کبھی شجر تھا پر اب چوبِ خشک صحرا ہوں
عزیزو دیکھو کہ میں کیا تھا اور اب کیا ہوں

سبحان اللہ! "چوبِ خشک صحرا" کا بھی جواب نہیں بالکل نئی ترکیب نکالی ہے محترم نے۔ اور آپ اس ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی کو بآسانی برداشت کر گئے

"کبھی شجر تھا پر اب خشک چوبِ صحرا ہوں"

کچھ ایسا مشکل تو نہ تھا۔ بہرحال ایسی غیر معیاری غزلوں کی اشاعت سے "ایوانِ اُردو دہلی" کا وقار مجروح ہوتا ہے جسے آپ برداشت کریں تو کریں، آپ کے باذوق قارئین ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔

——— شاہد اختر، سہسرام

[1] اس ترکیب کی اختراع کا سہرا جنابِ وفا ملک پوری کے سر نہیں، آتش لکھنوی نے بہت پہلے کہا تھا:

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے قافلہ روانہ ہوا

اس میں غلطی کیا ہے وہ آپ کے متوجہ کرنے پر بھی ہمیں نظر نہ آئی۔ ——— (ادارہ)

"ایوانِ اردو دہلی" جلد ۲ شمارہ ۱ پڑھنے کو ملا۔ اتنی گرانی میں اتنا اچھا اور سستا پرچہ وہ بھی اُردو میں تعجب! تعجب!! تعجب!!! اس کے مواد کو بھی پڑھ کر ازحد تسکین ہوئی۔

"ہم طرح اشعار" کے متعلق میری ناقص رائے ہے کہ یہ صفحوں کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں اس کے لیے تین چار صفحوں کا خون گراں گزرتا ہے [1]

——— ایم۔ ایل۔ احمد ہزاری باغ

[1] دوسرے قارئین بھی اپنی رائے لکھیں۔ (ادارہ)

راقم الحروف کے نزدیک ضخامت اور قیمت میں اضافہ غیر ضروری اور نامناسب ہے۔ کچھ نئے اور مفید مضامین کے واسطے موجودہ ضخامت ہی میں چند صفحات کا انتظام یوں ہو سکتا ہے کہ "ہم طرح اشعار" اور سرورق سے اندرونی صفحے کے شعری و نثری عنوانات کے طویل سلسلے کو مختصر کر کے "ہم طرح اشعار" صرف تین عدد جو اوّل، دوم، سوم ٹھہریں اسی طرح اندرونی صفحے کی تصویر کے عنوانات میں سے صرف تین عدد شعری و نثری عنوانات (جو اوّل، دوم، سوم قرار پائیں) شریکِ اشاعت کیے جائیں اس طریقے سے دو تین صفحات دوسری چیزوں کے واسطے

بچ سکتے ہیں۔

——— مقصود گمنام پہرپوی، رائے بریلی

یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ آپ "ایوانِ اُردو دہلی" کے دو خصوصی نمبر شایع کرنے جا رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ نمبران دونوں بزرگوں کے شایانِ شان ہوں گے۔ "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" کی آخری قسط کے بعد کیا کوئی دوسرا سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دِلّی کے باہر جو تاریخی یادگاریں ہیں انھیں قسطوں میں پیش کیا جائے؟ [1]

——— منصور عمر، دربھنگہ

[1] اس طرح کے مضامین ہم بخوشی شایع کریں گے۔ (ادارہ)

امسال دو نمبروں کے شایع ہونے کی خبر پڑھ کر بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خدا کرے دونوں نمبر پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں۔

——— وارانس[illegible]

"ایوانِ اُردو دہلی" کا جون کا شمارہ ملا۔ خلیق انجم صاحب کا مضمون "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" کی کمی کافی محسوس ہوئی لیکن اس کمی کو کسی حد تک جنا[illegible] سید ظلّ الرحمٰن صاحب کے مضمون "شریف منز[illegible] دہلی کی ایک تاریخی عمارت" نے دُور کر دیا۔

——— فضل امام فاروقی، لوہر[illegible]

اُردو اکادمی دہلی
کے
اغراض و مقاصد

① دہلی کی ساتی تہذیب کے مشترک حصے کے طور پر اُردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔
② اُردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔
③ اُردو میں ادبی اور سائنس اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اُردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔
④ اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔
⑤ قدیم اُردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔
⑥ اُردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔
⑦ اُردو کے مستحق مصنفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔
⑧ گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اُردو تصنیفات کے مصنفوں کو انعامات کی تقسیم۔
⑨ اُردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت۔
⑩ اُردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔
⑪ مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔
⑫ ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے پس منظر میں اُردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اسی کے ساتھ اُردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔
⑬ اُردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے، جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔
⑭ اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔
⑮ اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔
⑯ اُردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اُردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔
⑰ ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تعمیل میں مدد مل سکتی ہو۔
⑱ سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر:
۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۴ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● اگست ۱۹۸۸ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے شمع آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

"ایوانِ اُردو" میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ اگر ہم اُردو زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے بچّوں کو اُردو پڑھانا بہت ضروری ہے۔ ہم نجی صحبتوں میں بھی اپنا یہ خیال ظاہر کرتے رہتے ہیں، کچھ لوگ ہم سے اتفاق کرتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو اُردو پڑھا کر ان کا مستقبل خراب کرنا نہیں چاہتے۔ آج بچّے اگر اُردو پڑھتے ہیں تو کل اُن کے سامنے روٹی روزی کے مسائل آکھڑے ہوں گے اور اُردو کی تعلیم ان کی معاشی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔

ہماری رائے میں یہ اندیشہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ بچّوں کو اُردو پڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے نصابی مضامین نہ پڑھیں۔ اگر آپ کا بچّہ اُردو میڈیم سے پڑھ رہا ہے تو اسے ہندی یا انگریزی وغیرہ پڑھنے سے کون روک سکتا ہے اور جو دوسرے ضروری مضامین ہیں ان سے بھی اسے کس طرح نابلد رکھا جاسکے گا؟ اب ہر مضمون پر اُردو میں معیاری نصابی کتابیں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ نے فراہم کردی ہیں جو پورے ملک میں دستیاب ہیں۔ اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا بچّہ دوسرے بچّوں سے پیچھے رہ جائے۔ اس کے برعکس عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے اور ممتاز ماہرینِ تعلیم یہ کہتے بھی رہے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم پانے والا بچّہ ان بچّوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور ذکی ثابت ہوتا ہے جو کسی دوسری زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ پھر بھی ہم اس پر بضد نہیں ہیں کہ آپ اپنے بچّے کو اُردو میڈیم ہی سے پڑھائیں۔ آپ اسے ہندی میڈیم سے پڑھائیں اور چاہیں تو انگریزی میڈیم سے لیکن ایک مضمون کے طور پر اسے اُردو بھی پڑھوائیے۔ یہ آگے چل کر اس کے حق میں ضرر رساں نہیں مفید ہی ثابت ہوگا۔ کئی سرکاری محکمے مثلاً پولیس کا محکمہ، ڈاک اور تار کا محکمہ، عدالتیں، سرکاری لائبریریاں وغیرہ ایسے ہیں جہاں ملازمت کے لیے اُردو دانی ایک اضافی قابلیت ثابت ہوسکتی ہے۔

ہمیں کبھی کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ غلط فہمی جس میں اُردو کے بعض دانشور بھی مبتلا نظر آتے ہیں، اُردو کے مخالفوں کی پھیلائی ہوئی تو نہیں؟ معاش کا مسئلہ ہمیشہ اہم رہا ہے اور موجودہ زمانے میں تو یہ اور بھی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ معاشی تحفّظ کی ضمانت ہر شخص کی پہلی ترجیح بن گئی ہے۔ اندریں حالات اگر کسی گروہ کو یہ باور کرادیا جائے کہ کوئی خاص زبان پڑھنے سے اس کا یا اس کی آنے والی نسلوں کا معاشی مستقبل خطرے میں پڑسکتا ہے تو باوجود اس کے کہ وہ زبان اس کے تہذیبی تشخص کا ذریعہ ہو اور وہ اس کے ساتھ جذباتی وابستگی بھی رکھتا ہو، اس سے کنارہ کشی اختیار کرسکتا ہے ــــــ اُردو کے بارے میں یہ تصوّر اگر اس کے مخالفوں نے پھیلایا ہے تو ہمیں ان کی غیر معمولی ذہانت کا قائل ہوجانا چاہیے اور اگر ہم نے اسے قبول کرلیا ہے تو ہمیں اپنی ناسمجھی کا ماتم کرنا چاہیے۔

اپنے بچّوں کو اُردو پڑھائیے اور اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو بھی اس کی تلقین کیجیے۔

ــــــ سیّد شریف الحسن نقوی

فضا ابن فیضی

نظر شگفتہ، دل آسودہ، جان روشن ہے
ترے چراغ سے سارا مکان روشن ہے

طلسمِ شب بھی ترا، عشوۂ سحر بھی ترا
گھنی ہے چھاؤں، مگر سائبان روشن ہے

سیہ، مہیب سمندر، مگر کرم تیرا
ہوا ہے شمع بہ کف، بادبان روشن ہے

وہ طور کا ہو شجر، یا حرا کے برگ و ثمر
چمن چمن، نفسِ باغبان روشن ہے

تری کشش بنی معراج کا بہانہ مجھے
یہ کس بلندی پہ تیرا نشان روشن ہے

اک اعتراف ہے شانِ الوہیت کا تری
مرے لبوں پہ جو حرفِ اذان روشن ہے

ہیں تیرے ترکشِ قدرت میں کس غضب کے تیر
کہ ہفت رنگ دھنک کی کمان روشن ہے

لکھا ہے جس کو ترے خامۂ مشیّت نے
ورق ورق، وہی اک داستان روشن ہے

شہود و غیب کے اسرار ہیں کہ پرتوِ زار
تمام فاصلۂ درمیان روشن ہے

محمدِ عربی ہوں، کہ جبرئیل و خلیل
ترے کلام سے سب کی زبان روشن ہے

بہ وصفِ بے ہنری لکھ رہا ہوں حمد تری
قلم ہے خوشۂ پرویں، بیان روشن ہے

مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)

سلطان اختر

کئی صدیوں سے اِک ساعت رُکی سی ہے
ابھی تک ان کے زیرِ لب ہنسی سی ہے

یہ قربت اور جدائی دل لگی سی ہے
یہاں سب کی ضرورت عارضی سی ہے

بہت خوش ہوں بہت ہی مطمئن ہوں میں
مرے اندر مگر اِک کھلبلی سی ہے

بظاہر نفرتوں کا خشک دریا ہوں
مگر دل میں محبت کی نمی سی ہے

ضرورت ہو تو پھر دامن نچوڑوں میں
تری آنکھوں میں اشکوں کی کمی سی ہے

لہو کا سُرخ موسم جاچکا لیکن
فضاؤں میں ابھی تک کپکپی سی ہے

مری آنکھوں کے لب بھی ہل رہے ہیں
تری تصویر بھی کچھ بولتی سی ہے

۳۰۳ (اسٹل) ڈپارٹمنٹ، اولڈ سیکریٹریٹ، پٹنہ ۸۰۰۰۱۵

موتی اچھال کر جو تہِ آب کھو گئے
بے درد ساحلوں کی بھی پلکیں بھگو گئے

ماتم گسار لاش پہ اس طرح رو گئے
قاتل کی انگلیوں کے نشانات دھو گئے

روشن ورق ورق ہے، منوّر چراغ ہے
ہم ہی کھُلی کتاب پہ سر رکھ کے سو گئے

اشکوں سے سینچتے رہے اشجارِ بے ثمر
اسلاف کشتِ ذہن میں وہ بیج بو گئے

خوابوں میں جھاگ ابھرتے رہے آفتاب کے
وہ ظلمتوں میں نورِ سحر یوں بلو گئے

ایسے شناوروں سے ہوا سابقہ، ظہیر
ڈوبے خود آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے

ظہیر صدیقی

سریندر پرکاش

بچپن میں سُنی ہوئی ایک کہانی

(کرشن چندر کے نام)

اَندر رنگ کی سرائے میں اکیلا بیٹھا میں راستہ کھُلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

باہر بوند بوند بارش کا پانی زمین پر پھیلے ہوئے کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ آتش دان میں میں نے ایک ایک لکڑی جلانا شروع کر دی ہے۔ اور سرائے کے چوکیدار کی راہ دیکھ رہا ہوں جو میرے لیے کھانے پینے کا سامان لینے دیوز گیا ہوا ہے۔

دیوز یہاں سے سڑکوں سڑک تین کلومیٹر ہے۔ اور اگر شارٹ کٹ سے جایا جائے تو ایک کلومیٹر کے قریب پڑتا ہے۔ چوکیدار امیراللہ شارٹ کٹ سے ہی گیا تھا۔ لیکن آج تین دن ہو گئے ہیں لوٹ کر نہیں آیا۔

کل رات خواب میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں بھٹے لے کر آ رہا ہے۔ مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کا پورا کیچڑ میں دھنستا چلا گیا۔ میں کمبل اوڑھے آتش دان کے پاس بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا۔ صرف اُس کے دونوں ہاتھ ہی جن میں اس نے بھٹے پکڑ رکھے تھے، سطحِ زمین کے اوپر نظر آتے تھے۔ ایسے لگتا تھا اس کے ہاتھ دراصل مکئی کے پودے کے ڈنٹھل ہیں۔ اور یہ منظر بالکل ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔

میں اسی طرح آتش دان کے قریب کمبل اوڑھے بیٹھا ہوں۔ جیسے کہ خواب میں بیٹھا تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہیں۔ دروازے کے فریم میں سے جو دنیا نظر آ رہی ہے اس سے زیادہ کا تصور کرنا اس وقت ممکن نہیں۔ کہ مایوسی کے عالم میں ہر چیز اپنے حجم سے سُکڑ جاتی ہے۔

وہ خواب تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میری بھوک شدید صورت اختیار کر چکی ہے۔ امیراللہ کو اتنی دیر نہیں لگانا چاہیے تھی۔ اس کے قدم یہاں کی زمین پر چلنے کی مہارت رکھتے تھے۔ یہاں کی بارش سے وہ آشنا تھا اور یہاں کے موسم میں وہ جنما پلا تھا۔

اس نے جانے سے پہلے ایک بات ضرور کہی تھی کہ اگر یہ بے موسم کی بارش جلد نہ رُکی تو پھر برف باری شروع ہو جائے گی۔ مگر تین دن ہو گئے ہیں نہ بارش رکی ہے اور نہ برف باری ہوئی ہے اور نہ ہی وہ لوٹ کر آیا ہے۔

میرے پاس جتنے بھی پیسے بچ رہے تھے وہ میں نے اُسے دے دیے تھے۔ بولا تھا۔ کہ کھانے کے لیے جو بھی۔ جتنا بھی ملے لے آنا۔ اور کچھ سگریٹ ضرور لانا۔ اندر رنگ۔

اندر رنگ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جس میں کُل ملا کر دس بارہ گھر ہیں۔ ہر گھر زمین سے تین چار فٹ اُونچا بنایا گیا ہے۔ لکڑی کے یہ مکان دور سے کھلونوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر گھر میں ایک آدھ خاندان رہائش رکھتا ہے۔ خاندان کا بڑا محنت مزدوری کرتا ہے۔ اپنے چھوٹے سے کھیت میں کھیتی کرتا ہے۔ پھلوں کے باغ کی نگہداشت کرتا ہے اور رات کو اندھیرے گھر میں اپنی عورت کے ساتھ لگ کر سو جاتا ہے۔

عورت جو اس کے لیے کھیتی میں ہاتھ ...
ہے۔ کھانا بناتی ہے۔ اور اس کے بچے جنتی ...
بچے دُور دراز اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے ...
ہیں۔ جب جوان ہو جاتے ہیں تو بیکار اِدھر اُدھر ...
کرتے ہیں۔ ان سب کی میٹنگ پلیس بھی چھو...
سرائے ہے۔ جس کے ماتھے پر سرکار کی ملکیت ...
کا بورڈ لگا ہے۔ اسی سرائے کا چوکیدار امی...
ہے جس کا میں انتظار کر رہا ہوں۔

امیراللہ کا باپ وزیراللہ اسی سرا...
چوکیدار تھا جو بیاسی سال کی عمر میں ریٹائر ہوا...
اور اب اپنی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ امیراللہ کا...
بھائی بہن ہیں۔ جنھیں میں نے کبھی دیکھا نہیں ...
سرکاری طور پر امیراللہ کا اس سرائے ...
چوکیدار کی حیثیت سے کام کرنے کا کوئی حق ...
یہ قانون کہتا ہے۔ لیکن امیراللہ کہتا ہے۔

"صاحب جی! میرے باپ نے چھیا...
برس اس سرائے میں نوکری کی ہے۔ میری پ...
بھی اسی سرائے کے ایک کمرے میں ہوئی ...
میں بچپن سے یہاں اپنے باپ کے ساتھ مل...
مسافروں کی خدمت کر رہا ہوں۔ ریٹائر تو م...
باپ ہوا ہے۔ میں کہاں جاؤں گا جی۔ یہ سر...
میری وراثت ہے۔ سرکار یہ بات کیوں نہ...
سمجھتی۔ پھر بھی بار بار نیا چوکیدار بھیجتی ہے

۲- یوگی دھام آشرم، نیو لنک روڈ، کاایتا، بمبئی ۹۸...

اس کو چارج کیسے دوں گا جی"۔

میرے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ عجیب سی غنودگی محسوس ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی جھپکی آجاتی ہے۔ دن ہو یا رات میں اس جھپکی میں عجیب، عجیب خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ ایسے مقام دکھائی دیتے ہیں کو صرف خواب میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ یا پھر صرف خوابوں میں ہی دکھائی دے سکتے ہیں کئی دیکھے ہوئے شہروں کا ایک محلہ کسی گاؤں کے حدود اربع میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک گاؤں کی ساری آبادی دوسرے کسی شہر میں بسی ہوئی ملتی ہے۔ جن چوپایوں کا جس جنگل میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ وہاں آرام سے رہ رہے ہوتے ہیں۔ جو پرندے جن آسمانوں پر کبھی پرواز نہیں کرتے وہاں اپنے پنکھ پھیلائے فضا میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں میں چیزوں کے رنگ اپنے اصلی رنگوں سے مختلف محسوس ہوتے ہیں اور کبھی کبھی لگتا ہے ہزاروں میل کی مسافت طے کر لینے کے باوجود وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ ایسے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جن کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں ہے۔

ایک خواب میں میں اُس شہر میں پہنچ گیا۔ جہاں سے میرا خاندان ہجرت کر کے آیا تھا میرے پُرانے دوست بہت حیران ہوئے کہ میں بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے کیسے آگیا۔ معراج، مقبول، شفیع سب اکٹھے ہو گئے۔ وہ اس صورتِ حال پر غور کرنے لگے اور انھوں نے مجھے پناہ دینے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ مجھے ہمارے گھر لے گئے۔ وہاں دروازے پر کئی تالے لگے ہوتے تھے۔

"یہ تالے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم لوگ ہی لگا کر گئے تھے"۔ انھوں نے جواب دیا۔

"اندر کا سامان؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ اب کہاں ہوگا۔ سامان، سامان کو کھا گیا ہوگا اگر کچھ ہوا بھی تو اس سامان کی ہڈیاں ہوں گی"۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔

پھر ہم سب اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے۔ میں وہ تمام جگہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جن سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ مگر وہ جگہیں وہاں موجود نہ تھیں۔ ان کی جگہ ایسی جگہیں تھیں جنھیں میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

"وہ جگہیں کہاں گئیں؟" میں نے اُن سے دریافت کیا۔

"یہ نئی جگہیں اُن پرانی جگہوں کو کھا گئیں"۔ انھوں نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

میں بہت اداس ہوگیا۔ ان کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چلتا رہا۔ کہ سامنے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ان کی نظر بچا کر مجھے اشارے سے بلا رہا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ آپس میں میرے بارے میں بات چیت میں مصروف تھے۔ میں آہستہ سے اس آدمی کے پاس گیا قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ پرانا شناسا ہے۔

"تم ان کے ساتھ کہاں گھوم رہے ہو؟" اس شناسا آدمی نے پوچھا۔

"وہ... وہ سب میرے پرانے دوست ہیں معراج، مقبول، شفیع"۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر... مگر وہ تو سب مَر چکے ہیں تم بہت پرانی بات کر رہے ہو۔ جب وہ زندہ تھے"۔ اُس نے مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ میں قدرے خوفزدہ ہوگیا۔

"کیا وہ سب مَر چکے ہیں؟ مگر پھر بھی میرے لیے فکرمند ہیں۔ انھوں نے مجھے پناہ دینے کا وعدہ کیا ہے"۔ میں نے اس کو بتایا۔

وہ آدمی قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "پناہ...! وہ کیا پناہ دیں گے؟ وہ تو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں"۔

میں ایکا ایکی سرحد کی طرف بھاگا۔

میں خواب کی حالت میں سے نکل آیا ہوں میری نظریں سامنے دروازے پر جمی ہیں۔ اور دروازے کے فریم میں سے ساری دنیا نظر آرہی ہے جو بس اتنی سی ہے۔

کئی دن پہلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر اس سرائے میں ٹھہرا تھا۔ ہم سب ایک نوٹنکی میں کام کرتے تھے۔ جگہ جگہ گھومتے اور اپنے ناٹک دکھاتے تھے۔ ناٹکوں کا مواد لوگوں ہی کی زندگی کے حادثوں اور واقعات سے لیا جاتا ہے۔ بس ہر بات کو ایک نئے لہر اور چھناک دے دیا جاتا ہے۔ لفظوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ وہ گیت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس گیت کو مکالموں کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ گا کر اور دو تین ہلکے پھلکے سازوں کے تال پر۔ لوگ اس سر تال پر خوش ہوتے ہیں۔ انعام اکرام سے نوازتے ہیں۔ اور ہمارا کھانا پینا اس طرح چلتا رہتا ہے اور ہم ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ پر سفر کرتے رہتے ہیں۔

کئی برس بیت گئے تھے اسی طرح اور ہم سے پہلے بھی لوگ سینکڑوں برسوں تک ایسے ہی زندگی گذارتے رہے تھے۔ مگر یہ اچانک بے موسم کی برسات آگئی اور ہم کو اندر تنگ کی

سرائے میں مجبوراً رکنا پڑا۔

میرے ساتھی کئی دن تک بارش تھمنے کا انتظار کرتے رہے۔ ہماری گاڑیوں کے بیل راستے ہی میں کیچڑ میں پھنس کر مر گئے تھے۔ بیل گاڑیاں اور ان پر لدا ہوا نوٹنکی کا سامان خود ہی کھینچ کر یہاں لانا پڑا تھا۔ اس جدوجہد میں ہمارا ایک ساتھی جو ڈھولک بجاتا تھا بیمار ہو کر مر گیا۔ اسے بری طرح سردی لگ گئی تھی۔ وہ بڑا عبرتناک منظر تھا۔ جب ہم اس کی لاش بغیر آخری رسومات ادا کیے پانی بھرے کھیتوں میں یوں ہی آگے چل دیے تھے۔ اس بات کا فیصلہ کسی نے نہ کیا تھا۔ بس سب خاموش تھے۔ اور آپ ہی آپ خاموشی سے یہ فیصلہ ہو گیا تھا اور ہم سب اداس سر جھکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے تھے۔ اور ہمارے پاؤں کیچڑ میں دھنس دھنس جاتے تھے۔

تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نہ جانے کس نے سوال کیا۔

"اب ڈھولک کون بجایا کرے گا؟" سب کے چہروں پر استعجاب چھا گیا۔

"بجرنگ بجایا کرے گا؟" وہ اتنے دن تک اس کے ساتھ رہا ہے۔ اتنا تو سیکھ ہی گیا ہے۔ نہ جانے کس نے جواب دیا اور سب کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ قدم بھی قدرے تیز ہو گئے۔ پھر بھی اندھیرا ہوتے ہوتے ہم یہاں پہنچے۔

اور دوسرے دن مجھے بخار آ گیا۔ میں نڈھال سا خاموش آتش دان کے قریب لیٹا رہا۔ وہ سب باری باری آتے اور میرے جسم کو چھو کر دیکھتے۔ میں ان کے چہروں کے تاثرات سے ہی اندازہ لگا پاتا کہ مجھے کچھ افاقہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اور میری حالت ہر دم خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں اونگھتا رہتا اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں خواب دیکھتا رہتا۔ خواب میں عام طور پر یہی نظر آتا کہ جس ساتھی کی لاش ہم پانی بھرے کھیتوں میں چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ مجھے ڈھولک بجانے کا فن سکھا رہا ہے۔ ہاتھ کو کس طرح اکڑا کر رکھنا چاہیے۔ پہلی انگلی کو کس طرح حرکت دینی چاہیے۔ اور ڈھولک سے نکلنے والی دھمک کو لفظوں میں کس طرح بدلنا چاہیے۔ یہ سب وہ مجھے سکھاتا تھا۔ اور پھر میں بہت ہی آہستہ سے اس سے کہتا۔

"مگر تم تو مر چکے ہو؟"

"ہاں... میں مر چکا ہوں۔ مگر اس بات کا ڈھولک بجانے کی کلا سے کیا لینا دینا؟" وہ بڑی رواداری میں جواب دیتا اور ڈھولک اپنی طرف کھینچ لیتا۔ میں ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیتا۔

آتش دان میں پڑی لکڑیاں سلگنے لگی تھیں۔ کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ اور وہ دھواں میری آنکھوں کو لگنے لگا تھا۔ اور میرے پھیپھڑوں میں بھر گیا تھا۔ میں زور زور سے کھانسنے لگتا۔ اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح کا پانی بہنے لگتا۔ میرے ساتھی بڑی تشویش سے مجھے دیکھتے اور پھر باہر جھانکنے لگتے۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ بارش تھمنے کے کوئی آثار ہیں یا نہیں۔

"وہ تو سب صبح سویرے منہ اندھیرے ہی چلے گئے تھے صاحب جی۔" امیر اللہ نے مجھے بتایا۔ میں حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر آتش دان کی طرف دیکھا اور پھر اُن دیواروں کو جو کہ اب سفیدی سے بھوری ہو چکی تھیں۔

"انھوں نے میرے لیے کچھ بولا امیر اللہ" میں نے بڑی ہی اداس آواز میں آہستہ سے پو

"کچھ نہیں صاحب جی۔ وہ سب باورچی خانے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ وہیں انھوں نے چائے پی اور بہت دیر تک آپس میں باتیں رہے۔"

"کیا باتیں کر رہے تھے وہ لوگ؟"

"یہی کہ ایک بیمار آدمی کا بوجھ بہت ہوتا ہے۔ اپنا سامان، نوٹنکی کا اسباب کیسے ہی مشکل ہو جائے گا۔ اسے کہاں اٹھائے پھ گے۔ پھر ایک نے کہا تھا یہ نہیں ہوگا تو نا کون لکھے گا۔ گیت کون بنائے گا۔ پھر دو نے جواب دیا تھا۔ بہت کچھ نہیں یاد ہے کچھ اس کی پوتھی میں لکھا ہے۔ کئی برس تک سب بہت ہے اور انھوں نے آپ کے نیچے سے لال رنگ کی ایک پوتھی نکال لی

میں نے دیکھا میرے تکیے کے نیچے وہ نہیں تھی۔ جس میں میں ناٹک لکھا کرتا تھا

"تم ٹھیک کہتے ہو امیر اللہ۔ وہ سب لے گئے ہیں۔ صرف مجھے چھوڑ گئے ہیں۔ ایک بیمار آدمی کو۔" پھر میں خاموش ہو گیا اور مجھے آ گئی۔ خواب میں ہمارا ڈھولک بجانے والا بڑی پھرتی اور فنکاری سے ڈھولک کے طبلوں پر اپنی انگلیاں نچاتا نظر آیا۔ مگر ڈھ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ لے۔ نہ لہر۔ نہ

کئی دن کے بعد میرا بخار اترا ہے

بارش بند نہیں ہو رہی ہے۔ راستے سب ہیں۔ اردگرد پھیلے ہوئے لکڑی کے گھر اور اندھیرے ہیں۔ ان کے پاس جلانے ختم ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی کہیں کوئی حرک دکھائی نہ دیتی۔ وہ اپنے گھروں سے باہر

دکھائی نہیں دیتے۔ شاید اس لیے کہ وہ اندھیرے کے عادی ہو چکے تھے۔

دھیرے دھیرے میرے اردگرد کی ہر چیز بے حرکت ہو چکی ہے۔ لکڑی کے گھر اونچے اونچے پیڑ، ہوا اور فضا۔ مجھے لگ رہا ہے یہ سردی اور جماؤ آہستہ آہستہ میرے پیروں کی طرف سے میرے جسم میں سرایت کرنے لگے گا۔ اور میرا جسم بے حرکت ہونا شروع ہو جائے گا اور آخر میں میں برف کی ایک سِل بن کر رہ جاؤں گا۔

میرا من کئی دن تک اُچاٹ رہا۔ پھر خواب میں کہی ہوئی اس پرانے شناسا آدمی کی بات یاد آئی "یہ سب تو مر چکے ہیں" اور پھر ڈھولک بجانے والے کی لاش جو پانی بھرے کھیتوں میں پڑی تھی کہہ رہی تھی "ہاتھ کو یوں اکڑا کر رکھنا چاہیے۔ پہلی انگلی کو اس طرح حرکت دینی چاہیے اور ڈھولک سے نکلنے والی آواز کو اس طرح لفظوں میں بدلنا چاہیے۔"

"چائے پلا دو تھوڑی سی امیر اللہ۔"

"میں پلاؤں گا صاحب جی۔" اور وہ سیدھا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ میں کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ کمر پہ ہاتھ باندھ کر۔ ایک کونے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اُسے اٹھا لیا۔ وہ کسی پرانے اخبار کا ٹکڑا تھا۔ یہاں تو کبھی اخبار آتا ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک عرصے سے لفظ کے دیدار نہیں کیے میں نے کاغذ پر چھپے ہوئے لفظوں کو بغور دیکھنا شروع کیا اور لفظ ایک عرصہ پہلے ہوئے واقعات کی خبر دے رہے تھے میں بہت خوش ہوا۔ کم از کم زندگی سے میرا ناطہ تو نہیں ٹوٹا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے پھر میں نے دیکھا۔ کاغذ پہ چھپے ہوئے سیاہ لفظ سیاہ سنپولوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔۔۔ انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے پھن اٹھائے ہوئے ہیں اور کاغذ پہ سے کود کر سیدھے دروازے سے باہر نکل گئے ہیں۔ اور پھر بارش میں بھیگتے ہوئے کیچڑ میں گم ہو گئے ہیں۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتہ بالکل کورا رہ گیا تھا۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں صاحب جی؟ لو چائے پیو۔ بارش رک جائے پھر جہاں آپ کہو گے آپ کو میں چھوڑ کر آؤں گا جی" امیر اللہ نے میری طرف چائے کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے چائے لے لی۔

میں امیر اللہ کے بارے میں بہت فکر مند ہو رہا تھا۔ قاعدے کے مطابق اُسے ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ مگر۔۔ آدمی اگر رکنا چاہے تو کتنی دیر تک اپنے ٹھکانے سے دور رہ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی افتاد آ پڑی ہے تو۔۔۔

میرے پاس آخری سگریٹ تھا۔ میں نے سلگانا چاہا۔ مگر رک گیا۔ وہ آ جائے تو معلوم ہو کہ کتنے سگریٹ لایا ہے اور کتنے وقت تک ان سے گذر ہو سکتی ہے۔ سگریٹ کو میں نے انگلیوں میں لے کر پھرایا۔ پھر ناک کے قریب لے جا کر اس کے تمباکو کی بو سونگھی۔ طلب ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک میرے اندر زندہ رہنے کی آرزو ختم ہوتی محسوس ہوتی۔ مجھے وہ لوگ بڑے اہم لگنے لگے جو مر چکے تھے۔ اور جو اب خوابوں میں کھلے عام آ جاتے ہیں۔

میں نے اپنے آپ سے بغاوت کرنے کی ٹھانی اور آتش دان میں سے لکڑی کا ایک سلگتا ہوا ٹکڑا اٹھایا۔ اور سگریٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا۔ اس سگریٹ کے خلاف اخباروں میں اور خود اس کی ڈبیہ پر کتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کہ یہ آدمی کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر میں جو اس کے لیے ترس رہا ہوں وہ کیا موت سے کم تھا۔ دھوئیں کے مرغولے اپنے منہ سے چھوڑتا ہوا میں وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر دھندلکا تھا۔ سورج اور چاند رخصت پر تھے۔ وقت ایک ہی جگہ تھم کر رہ گیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا کا سفر رات کی جانب ہے۔ مگر امیر اللہ کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ دروازے کے فریم میں سے نظر آنے والے کھیت میں اس کا تصور صلیب پہ چڑھے آدمی کی طرح محسوس ہوتا تھا جس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں بجتے ہوں۔ اور ہر لمحہ زمین میں دھنستا جا رہا ہو۔

یہ خواب ہے یا بیداری کا عالم؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اپنے وجود پر میری گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی ہے میں اپنے سوالوں کا جواب دینے کا اہل نہیں رہا ہوں۔ ساتھ والے کمرے سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز برابر آ رہی ہے۔ شاید امیر اللہ آ گیا ہے لیکن نہیں یہ اس کی آواز نہ تھی۔ اس آواز میں تو بلا کا کرب ہے۔ کوئی بڑے سُر میں گنگنا رہا ہے "ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے؟"

میں نے آنکھیں کھول دیں تو یقین آ گیا کہ یہ خواب نہیں تھا۔ وہ آواز بار بار یہی مصرعہ گنگنا رہی تھی۔ اور ہر لحظہ اس میں درد بڑھتا جاتا تھا۔ بڑی کوشش کر کے میں اُٹھا۔ تھوڑی دیر کمرے کے وسط میں کھڑا بجھتے ہوئے آتش دان کو دیکھتا رہا۔ پھر میرے قدم چلنے لگے —— میں دروازے سے باہر نکلا۔ سب طرف گہرا اندھیرا تھا۔ میں برآمدے کا چکر لگا کر دوسرے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اور آتش دان میں آخری لکڑی

جل رہی تھی۔ آگ کی روشنی میں مجھے فرش پر کوئی
لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ بہت سے کپڑوں میں لپٹا ہوا۔
بالکل بے حرکت اور یہ آواز یقیناً اُسی کی تھی۔ "ہم
کہاں کے دانا تھے . . . '

میں کمرے میں داخل ہوا اور اس کے قریب
جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باقاعدہ گنگناتے جا رہا تھا۔ میری
موجودگی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ آنکھیں جب کمرے
کے ماحول سے مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا اس
کے قریب ہی فرش پر ایک چھوٹی سی سارنگی پڑی
ہے۔ اور سارنگی کے تاروں پر چلنے والا گز۔

"تم کون ہو بھائی؟" میں نے اچانک سوال
کیا۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔
بس اس کے منہ سے پھسپھساہٹ سی سنائی دی۔
'کس ہنر میں یکتا تھے'

میں اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ جیسی
بھی روشنی تھی اس میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ
مجھے ایک ایسا سپاہی لگا جو میدانِ جنگ سے زخم
کھا کر بھاگ آیا ہو اور نڈھال ہو کر یہاں آ گرا ہو۔

"تم کون ہو بھائی؟" میں نے اپنا سوال پھر
دوہرایا۔

اس نے بہ مشکل تمام میری طرف ذرا سا
پلٹ کر دیکھا اور پھسپھسانا بند کر دیا۔ اس کی نظروں
میں میرے لیے سوال محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھ سے
پوچھ رہا ہو۔

"تم کون ہو؟"

مگر اچانک اس کے ہونٹ ہلے۔ اور اس
نے کہا "نہیں . . . نہیں معلوم . . . میں خود یاد کرنے
کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں حیران سا ہوا۔ ایسا بھی کیا کہ ایک آدمی
اتنا بھی نہ جانتا ہو کہ وہ کون ہے؟

"عجیب بات ہے۔ بڑی عجیب بات ہے
تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کون ہو؟"

"سچ پوچھو تو اب مجھے اس کی ضرورت نہیں
اگر میں جان بھی گیا کہ میں کون ہوں۔ تو اس سے
آخر فرق ہی کیا پڑے گا۔"

میں خاموش رہ گیا اور پھر اچانک مجھے یہ
احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا۔ مجھے تو معلوم
ہی ہے کہ میں کون ہوں۔ پھر میں نے ہی اپنی بے بسی
پر قابو پانے کے لیے کیا کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ آخری
سگریٹ تک پی چکا ہوں اور مزید سگریٹ ملنے
کی امید نظر نہیں آ رہی۔

اس خاموش لمحے میں اس کی کراہ سنائی
دی۔ لگا وہ زخموں سے چُور ہے۔ میدانِ جنگ سے
بھاگا ہوا سپاہی۔

"کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟" میں
نے پوچھا۔

اس نے جیسے سوچنا شروع کیا۔ پھر وہ
اچانک بولا "کیا مجھے بتاؤ گے کہ میں اس وقت
کہاں ہوں؟"

میں نے اُسے اندر بگ کی اس سرائے کا
جغرافیہ، اپنے وہاں موجود ہونے کی وجہ۔ امیر اللہ
کا میرے لیے کچھ کھانے کا سامان لینے دیوز جانا۔
اور ابھی تک واپس نہ آنا۔ اپنی تشویش اور سرائے
میں لکڑی ختم ہو جانے کے بارے میں سب بتا دیا
وہ سب غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے اطمینان
کی ایک سانس لی اور بولا۔

"مجھے تمہاری تکلیف پر افسوس ہے۔ مگر
یہ ساری مصیبت اس لیے ہے کہ تمہیں اپنے بارے
میں سب یاد ہے۔ میں بہت سُکھی ہوں۔ سب
بھول چکا ہوں۔ اپنے ماضی سے اب میرا کوئی رشتہ
نہیں رہا۔ میں ایک نیا آدمی ہوں۔ میرے پاؤں میں
کوئی زنجیر نہیں۔"

"مگر لگتا ہے تم سخت زخمی ہو؟"

"وہ زخم میرے جسم پر ہیں۔ اور میں ا
جسم کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں جھنجھلا گیا۔ مجھے لگا اس نے مجھے گ
دی ہے۔ زندگی کے بارے میں میرے ر
کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ میں ہڑبڑا کر بول

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ماضی کے بغی
کام کے لگا مجھے؟ میں روز اپنا چہرہ دیکھتے ر
اپنے عیبوں کا پتہ چلتا ہے۔ مزید خوبصور
آنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"

"میری سب خواہشیں مر چکی ہیں۔
خوش ہوں۔" اس نے بے اعتنائی سے
دیا۔

"تم آخر کرتے کیا ہو؟"

"اب تو کچھ نہیں کرتا۔ کبھی کرتا تھا

"کیا؟"

"گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو پرانی
سناتا تھا۔ اُن کو اکساتا تھا کہ وہ پرانی د
میں اپنی نئی زندگی کے معنی تلاش کریں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات تھی۔"

"آہ بہت درد ہو رہا ہے۔ میرا
جسم دُکھ رہا ہے۔ کہاں کیسا زخم ہے معلو

"تمہیں یہ زخم کیسے لگے؟"

"انھوں نے مجھے بہت مارا ہے

"کیوں تم نے ایسا کیا کیا؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جہاں تک
ہے۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا تھا۔ میر
قاعدے کے مطابق اس گاؤں میں پہنچ
کے چوراہے پر چوپال تھی۔ میں وہیں ر
سارنگی کے تار سر میں لانے لگا۔ بہت
اپنے اپنے گھروں سے نکل کر میرے ا

اکٹھے ہونے لگے۔ اس گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں سب نے ایک ہی طرح کا عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا۔ جیسا کہ پرانے زمانے کے راہب پہنا کرتے تھے۔ ان کے گھر بھی ایسے بنے تھے جیسے کوئی عبادت کدہ ہو۔ میں نے ان سب باتوں کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا۔ جب سارنگی سر ہو گئی تو میں نے داستان گانا شروع کیا۔ وہ سب خاموشی سے کھڑے وہ داستان سنتے رہے۔ جب داستان ختم ہوئی تو اپنی جھولی پھیلا کر اُن کی طرف بخشش پانے کے لیے بڑھا۔ میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب کسی نے ایک سکہ بھی میری جھولی میں نہ ڈالا۔ بلکہ عجیب نظروں سے میرے چہرے کو گھورتے رہے۔ میں حسبِ دستور ایک سے دوسرے کی طرف جھولی پھیلائے بڑھتا رہا۔ آخر میں اس آدمی کے سامنے پہنچا جو عمر میں اُن سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے لمبے بال بالکل سفید تھے۔ وہ تھوڑی دیر مجھے گھورتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہر لحظہ نفرت کے تاثرات شدید ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے بڑے بڑے مضبوط ہاتھ میرے دونوں کندھوں پر رکھ دیے۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ میں گھبرا سا گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا "تمھیں .... تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟" میں حیران ہو گیا اور فوراً بولا۔

"کس بات کی جرأت جناب؟"

"ہمارے عقیدے اور ہمارے مذہب اور ہمارے خداؤں کا مذاق اڑانے کی۔"

"نہیں.... نہیں میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ میں آپ کے عقیدے کے بارے میں۔ آپ کے مذہب کے بارے میں اور آپ کے خداؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم.... تم تو اور بھی زیادہ خطرناک ہو۔ لاعلمی سے بڑا گناہ دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔"

میں ششدر سا کھڑا ان سب کے چہروں پر دیکھتا رہا۔ اچانک سارے چہرے اُس بوڑھے آدمی کے چہرے جیسے ہو گئے۔

بوڑھا بلند آواز میں بولا "میرے ہم مذہبو! یہ ایک ایسا شخص ہے جو ہمارے عقیدے... ہمارے مذہب اور ہمارے خداؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ پھر بھی ہمیں وہ داستان سناتا ہے جس میں ہمارے خداؤں کی بے حرمتی کا رمز چھپا ہوا ہے۔ داستان دنیا کی ہے، رمز اس کا ہے۔ اور اس کا رمز ہی اس کا گناہ ہے۔ اس کے بارے میں آپ سب کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ سزا کا مستحق نہیں ہے؟"

"ہے.... ہے.... یہ سزا کا مستحق ہے۔" سب چلائے۔

"تو پھر اسے کیا سزا دی جائے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟"

"ہمارے خدا کریں گے۔ آج تک ہمارے سب فیصلے ہمارے خداؤں نے ہی کیے ہیں۔" تین چار آدمی بلند آواز میں بولے۔

بوڑھے نے مجھے زوردار دھکا دیا۔ میں زمین پر گر گیا۔ پھر اُن سب نے مل کر اپنے مذہب، عقیدے اور خداؤں کی عظمت کا نعرہ لگایا اور مجھے گھسیٹ کر لے چلے۔

ان سب کے گھر، جو عبادت کدے تھے بالکل ایک جیسے تھے۔ ان کے حجرے بھی ایک جیسے تھے۔ مگر ان کے حجروں میں رکھے ہوئے خدا ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اُن کی شکلیں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی تھیں۔ وہ مجھے سب گھروں میں لے کر گئے۔ اپنے سب خداؤں کے سامنے جا کر مجھے کھڑا کیا اور میرے لیے سزا کا حکم مانگا۔

مگر کسی خدا کے ہونٹوں میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ کسی نے اپنے بے ڈول ہاتھ پاؤں سے ہلکا سا بھی اشارہ نہ کیا۔

وہ ہر گھر میں گھستے اور باہر نکلتے ہوئے آپس میں گفتگو کرتے۔ وہ اتنی تیزی سے بولتے کہ ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آتی۔ میں ایک بے بس بٹیر کی طرح ان کے نرغے میں تھا۔ وہ مجھے کشاں کشاں لیے جاتے تھے۔ ان کی گرفت میری گردن، میرے کندھوں اور میرے بازوؤں پر سخت سے سخت ہوتی جاتی تھی۔

وہ مجھے ہر خدا کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑا کر چکے تھے۔ اور میں جب بہ مشکل تمام اپنا سر اٹھا کر اپنی ڈری ڈری نظروں سے اُس خدا کے چہرے پر دیکھتا تو وہاں مجھے سوائے نفرت کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا....

یہ کام بھی ختم ہوا تو وہ مجھے دوبارہ چوپال پر لے آئے۔ بوڑھے نے مجمع پر ایک کریدنے والی نظر ڈالی۔ پھر کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ اور بولا۔

"میرے ہم مذہبو.... خداؤں کی خاموشی کا مطلب سمجھتے ہو؟"

سارا مجمع خاموش رہا۔

"خداؤں کی خاموشی کا مطلب ہے...." اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا "اس شخص کا جرم اتنا سنگین ہے کہ خداؤں کے ہونٹ بھی اسے سزا دینے کے لیے نہیں ہل رہے۔ وہ سب انتہائی غصے میں ہیں۔ پھر تم ہی کہو کہ اسے کیا سزا دی جائے۔ اس کا جرم ہے پرانی داستان میں اپنی رمز شامل کرنا اور اس کی رمز کا مطلب ہے

کہ ہمارے خدا خیر و برکت نہیں دنیا پر قہر نازل کرتے ہیں۔ اور قہر نازل کرنے والا خدا نہیں، شیطان ہوتا ہے۔ اس کی داستان میں بیان کیا گیا جنگل۔ خداؤں کے قہر سے جل جاتا ہے اور اس کے چرند پرند اور چوپائے اس آگ میں جل جاتے ہیں۔ تم سب جانتے ہو کہ جنگل کی آگ کو اس نے شیطان کی کارستانی نہیں کہا۔ ہمارے خداؤں کا قہر کہا ہے۔ یا اگر خداؤں کا نام نہیں بھی لیا اور مہر و قہر تو خداؤں ہی کے ہاتھ ہے۔ اس سے ان کی بے حرمتی ہوئی کہ نہیں۔۔۔؟"

"ہوئی۔۔۔ ہوئی۔۔۔" سب نے گلا پھاڑ کر جواب دیا۔

"تو پھر میں اس کی سزا تجویز کرتا ہوں۔۔" بوڑھا کہہ کر متوقع نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ پھر گویا ہوا۔

"اس کو گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا جائے اور ہر با عقیدہ شخص اسے سات سات ٹھوکریں مارے۔"

ٹھوکریں کھا کھا کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور جب ساری گلیوں میں سے گھسیٹا جانے کے بعد انھوں نے مجھے گاؤں کے باہر ایک کھیت کے کنارے پھینک دیا تو میں بے تحاشا بھاگا۔ بارش بہت زوروں سے ہونے لگی تھی۔ میرے آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی موت۔ ایک لمحہ کے لیے میں اپنے اس جسم کو بھول گیا۔ جس پر سینکڑوں آدمیوں، عورتوں اور بچوں نے اپنی ٹھوکروں سے حملہ کر دیا تھا۔

بارش۔ کیچڑ اور راستے میں بکھرے ہوئے پتھروں نے مزید ظلم ڈھایا اور میرے پیروں سے جگہ جگہ سے خون بہنے لگا۔ میں نہیں جانتا کیسے، کب اور کس طرح میں یہاں پہنچ پایا یا ہوش آیا تو تم یہاں کھڑے تھے۔

اجنبی نے اپنا قصہ بیان کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں بڑی ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا آتش دان میں آگ تم نے جلائی تھی؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"شاید۔۔۔۔ لیکن اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔" اس نے پھسپھسا کر جواب دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ زخموں اور کیچڑ سے اٹا پڑا تھا۔

میں بھی کتنا بے بس تھا۔ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو خود امیر اللہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر وہ آجائے تو اس اجنبی کے لیے گرم گرم چائے بن سکتی تھی۔ اس کے زخموں پر ہلدی کا لیپ لگایا جا سکتا تھا۔ بہت سے زخم تو بالکل نظر آرہے تھے اور ابھی کئی زخم ایسے تھے جو اس کے بوسیدہ لباس کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ کیا وہ صرف اپنی جسمانی طاقت کی وجہ سے زندہ ہے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ نہیں کوئی اور طاقت ہے اس کی داستان میں اور اس کی رمز میں جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ قدرت کا کیسا قاعدہ ہے۔ آدمی جسمانی طور پر مرنے کے باوجود اتنی دیر تک نہیں مرتا۔ جب تک اس کا ذہن زندہ رہتا ہے۔

"کیا تمہارا ذہن زندہ ہے؟ میں نے اس سے اچانک سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس کا جواب تھا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں تم نے ان کو کون سی داستان سنائی تھی اور اس میں تمہاری رمز کیا تھی؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ میں سب بھول چ... اتنی ٹھوکریں کھا کر بھلا کیا یاد رہ جاتا" اُس... اُسی طرح پھسپھسا کر کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی سارنگ... اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا۔ پھر گز... بے اختیار سارنگی کے تاروں پر پھیرا۔ ... بھونڈی سی آواز سارنگی کے پیٹ میں... جیسے کوئی قبرستان میں بیٹھا غم میں ڈوب... رہا ہو۔

وہ چونکا۔ ایکا ایکی اٹھ کر بیٹھ گ... سارنگی میرے ہاتھوں سے جھپٹ لی...

"رہنے دو۔۔۔۔ رہنے دو۔ اسے... کرم کرو۔ اُف کتنی منحوس گھڑی آگئی... سارنگی سے ایسی آواز سننا پڑی ہے"... رو دیا۔ پھر گویا ہوا۔

"بڑی کوشش کی یقین جانو بڑی... کی اسے میں نے اپنے پیٹ کے ساتھ... لیا تھا۔ مگر وہ ٹھوکریں اندھی تھیں۔ انھ... میرے ساتھ ساتھ اسے بھی۔۔۔۔"

وہ سچ مچ رونے لگا۔

"اس کا بھی کیا جینا جس کا ساز... ہو جائے۔ میں تو رو بھی سکتا ہوں۔ کہ... ہوں۔ اپنے زخم دکھا سکتا ہوں۔ ان پر... سکتا ہوں مگر۔۔۔ مگر یہ۔۔۔۔"

وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ اس ک... کا رنگ ایکا ایکی زرد ہو گیا۔ اس کی آ... چمک معدوم پڑنے لگی اور یوں لگا... نے اپنی پتلیاں میرے چہرے پر جما... پھر آہستہ آہستہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔

"ہم کہاں دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا"

"تمھیں واردات کی یادداشت ہے۔ اپنی بھی اور اس کی بھی جو لال قلعہ سے نکل کر چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماران میں داخل ہو رہا تھا، اور یہ بات اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ مگر تمھیں وہ داستان یاد نہیں جس کی وجہ سے تم پر اتنا بڑا حادثہ گذر گیا۔" میں نے کہا۔

"میرا ذہن کہیں اٹک گیا ہے۔ ذرا بھی حرکت نہیں کر رہا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تم جاؤ۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ چیخا۔

میں نے وہاں کھڑے کھڑے ایک مرتبہ اسے دیکھا اور پھر آتش دان میں بجھتی ہوئی آگ کو۔ اور فضا میں گھلی ہوئی سردی کو اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو اور اسی ایک پل میں نے وہاں سے اپنے کمرے میں چلے آنے کا فیصلہ کرلیا۔

کمرے میں اندھیرا بہت تھا۔ میں اپنے بستر میں دُبکا ہوا اندھیرے میں آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے اچانک محسوس ہوا کہ روشنی کی طرح اندھیرا بھی اپنی ایک دنیا آباد کرلیتا ہے۔ اس میں بھی ہیولے پیدا ہوتے ہیں جو فضا میں لہراتے پھرتے ہیں۔ میں ان ہیولوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ اور پل پل وقت گذار رہا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی، جو یقیناً اس اجنبی کی تھی۔ میں چونکا۔ چیخ دوبارہ سنائی دی۔ مجھے لگا جیسے ساتھ والے کمرے میں زخموں سے چور بڑا اجنبی پکار رہا ہے۔

"کوئی ہے۔۔۔۔؟ کوئی ہے۔۔۔۔؟"

میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ تیزی سے اسے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے میں آتش دان کے پاس بیٹھا تھا۔ سب طرف اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں اور آتش دان میں سلگتی لکڑیوں کی روشنی میں وہ کسی تپسوی کی طرح بیٹھا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا تھیں؟" میں نے گھبراہٹ کی حالت میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ بس تم میرے پاس یہاں آکر بیٹھو۔" اس نے ایسی آواز میں کہا جیسے سمندر میں غوطہ لگانے والے کسی شخص کو موتیوں کا ذخیرہ مل گیا ہو۔

میں اُسے اندھیرے میں بیٹھے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اُس نے میرے ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر اپنی گود میں رکھی سارنگی کے تاروں پر گز پھرایا۔ کسی بچے کی کلکاری جیسی آواز سنائی دی۔

"یہ ٹھیک ہوگئی ہے۔ اس کے بولوں میں مٹھاس آگئی ہے۔ دیکھا تم نے۔۔۔۔ تم نے اس کی آواز سنی۔" اس نے کہا اور پھر گز پھرایا۔ آواز پھر اُبھری اب کی بار چار سُر ایک ساتھ نکلے تھے۔ ان سُروں کی تہہ میں موسیقی، مصری کی طرح گھُلی جارہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک سارنگی بجاتا رہا۔ پھر اچانک اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔

"بوڑھے نے ٹھیک کہا تھا۔ داستان دنیا کی تھی مگر اس میں رمز میری تھی۔ میری رمز نے داستان کے معنی بدل دیے تھے۔ بیانیہ کا رنگ آب دار کر دیا تھا۔ تلوار کی دھار بہت تیز تھی۔" وہ آپ ہی آپ کہتا رہا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"اب تیرا جی تو اچھا ہے نا؟"

"بالکل۔۔۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ میرے جسم پر لگے زخم اپنا درد بھول گئے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا اب تم وہ داستان سنا سکتے ہو؟ جو تم نے راہبوں کے اس گاؤں میں سنائی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھارا عقیدہ، تمھارا مذہب اور تمھارا خدا کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔۔۔ میرا کوئی مذہب نہیں، اکیلے، بے بس اور بیمار آدمی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کمرے میں اندھیرے اور خاموشی نے سردی کو منجمد کردیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب بے حرکت مجسموں کی طرح بیٹھے رہے۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔" اس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا۔ "میں تمھیں وہ داستان سُنادوں گا۔ وہ بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی ہے۔"

"تو کیا وہ داستان تم نے خود تخلیق نہیں کی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کس سے سُنی تھی تم نے وہ داستان؟"

"میں نہیں جانتا۔ داستانیں یاد رہتی ہیں اُن کے خالق مرجاتے ہیں۔ لفظ کبھی نہیں مرتا۔ لفظ ذہن ہے۔" اس نے مجھے سمجھایا۔ میں خاموش رہا۔ وہ سارنگی پر گز پھراتا رہا۔ پھر اچانک اس نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ہماری دنیا کے کسی کونے میں ایک گھنا جنگل تھا۔ اُس جنگل میں چرند پرند اور کئی طرح کے جاندار بستے تھے۔ سورج اس کے اونچے درختوں کی چھتریوں سے جھانکتا ہوا اُس جنگل پر سے گذر جاتا تھا۔ سورج کی حرارت سے

جنگل کے پیڑ پودے۔ پھل۔ پھول اور گھاس، زندگی پاتے تھے۔ بڑھتے پھولتے تھے۔ ہری ہری لمبی گھاس پیدا ہوتی تھی۔ اور پھر سورج ہی کی حرارت سے وہ گھاس سوکھ کر ایندھن بنتی تھی۔

ایک بار سورج کو خواہش ہوئی کہ وہ جنگل میں پھیلاتے ہوئے اپنے رنگ روپ کو اپنی اِن آنکھوں سے دیکھے۔ اُس نے گردن جھکائی اور دوسرے ہی لمحے ایندھن بنی گھاس سلگ اُٹھی۔ اور ہوا کے ایک جھونکے نے اُسے آگ میں بدل دیا۔ یہ آگ جنگل کی آگ کی طرح سارے جنگل میں دیکھتے دیکھتے پھیل گئی۔

اس آگ کی وجہ سے سب جل بھُن کر ختم ہونے لگا۔ پیڑ پودے، پھل پھول اور رنگ روپ اور اس کے ساتھ ہی جنگل کے چرند پرند اور جاندار بھی جلنے بھُننے لگے اور آناً فاناً میں سب ختم ہوگیا۔

ایک چھوٹی سی رنگدار پروں والی چڑیا اور ایک بوڑھا باز بچ گئے کہ وہ دونوں پرواز میں تھے۔ انھوں نے آسمان کی بلندیوں سے جنگل کو جلتے دیکھا تھا۔ دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھے تھے اور جنگل کو اس دھوئیں میں منہ چھپا کر روتے سنا تھا۔ وہ اُس وقت تک آسمان میں اُڑتے رہے جب تک کہ دھواں ختم نہ ہوگیا۔ اور وہ آگ سارے جنگل کو کھا نہ گئی۔ یہ خوفناک منظر باز۔ چڑیا اور سورج تینوں نے دیکھے تھے۔ باقی کوئی افسوس زدہ تھا یا نہیں لیکن سورج تو افسوس سے ہاتھ ملتا ہوا مغرب کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر باز اور چڑیا اپنی اپنی جگہ اس ساری واردات پر آنسو بہانے لگے۔

جب وہ نیچے اترے تو منظر بدل چکا تھا۔ ہر طرف کوئلہ ہی کوئلہ پھیلا ہوا تھا۔ ہر چیز کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔

باز اور چڑیا اپنی اپنی جگہ اِدھر اُدھر گھومتے ہوتے اپنے لیے خوراک تلاش کرنے لگے۔ مگر وہاں کھانے کو کیا تھا۔۔۔؟ کہ اچانک دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ باز کی آنکھوں میں چڑیا کو دیکھ کر چمک آگئی۔ اس کی انتڑیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

چڑیا نے جب باز کو دیکھا تو فوراً اس نے اُڑ کر اپنی جان بچانے کا ارادہ کر لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ جتنی پھرتی سے اڑ سکتی تھی اڑنے لگی۔ مگر باز کی پرواز کے سامنے اس کی پرواز کیا معنی رکھتی تھی۔ باز تو باز تھا اور چڑیا بیچاری چڑیا تھی۔ تھوڑی ہی دیر کی مُکن میٹی کے بعد باز نے چڑیا پر جھپٹا مارا اور اگلے ہی پل اُسے دبوچ لیا۔ چڑیا کو موت آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور وہ تو مرٹمک گئی۔ بے بسی سے پر پھڑپھڑانے لگی۔ چوں۔ چوں، چڑیا پر پھڑاتی تھی باز کی اشتہا اور بڑھتی جاتی تھی۔

"فضول ہے۔۔۔۔ فضول ہے چڑیا۔ میرے پنجے میں سے تم نہیں نکل سکتی ہو۔ اب تم میرا نوالہ بنوگی۔ میری بھوک مٹاؤ گی۔"

چڑیا کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"شاید آخری نوالہ۔۔۔۔ مجھے کھا جانے کے بعد پھر کیا کھاؤ گے۔ یہ بھی سوچا تم نے باز۔"

باز ہنسا "کل کی کل دیکھیں گے۔ آج تو پیٹ بھر جائے گا۔" باز نے اپنی طرف سے بڑی عقلمندی سے جواب دیا۔

"تم نے یہ بھی سوچا ہے آج تم مجھے کھا جاؤ گے۔ کل خوراک کی تلاش میں نکلو گے۔ کہیں کچھ نہ پاؤ گے تو بھوک سے ایک نہ ایک دن مر جاؤ گے۔ مگر یہ جنگل یوں ہی اسی طرح تباہی کا منظر بنا کھڑا رہے گا۔ اس میں کوئی بھی جاندار نظر نہ آئے گا۔ اگر تم اور میں زندہ رہتے ہیں تو اس

جلے جنگل میں زندگی کا نشان باقی رہتا ہے
ہر روز خوراک کی تلاش میں نکلیں گے ا
جایا کریں گے مل بانٹ کر کھا لیا کریں گ
جنگل کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھ سکیں
ہر موسم ایک سا نہیں رہتا۔ ایک نہ ایک د
سے رحمت برسے گی۔ اور جنگل پھر ہرا
مگر اس پہلی کونپل کو جو اس راکھ کے ڈ
پھوٹے گی اُسے دیکھنے والا کون ہوگا؟"
اپنی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

باز بوڑھا تھا۔ جہاں دیدہ تھا۔
اس نے چڑیا کے جسم پر اپنی گرفت ڈھیل
اور سوچنے لگا۔ دانا باز نے سوچا چڑیا ک
ہے۔ آج اسے کھا جاؤں گا تو کل کیا کرو
کے اور میرے دم سے اس جلے جنگل
پھر سے شروع ہو سکتی ہے۔ باز نے
چھوڑ دیا۔ اور اپنی چونچ اس کی چونچ
لے جا کر کہا۔

"شکریہ۔۔۔۔ پیاری ننھی رنگ
اور پھر دونوں نے اپنے پنکھ پھیلائے
کی طرف پرواز کی۔ ☆

اجنبی نے اپنی سارنگی پر گرز ب
اپنے لفظوں کو روک لیا۔ اپنے چہر
پلّو سے صاف کیا۔ گلے کو تھوک سے
ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ میں نے سوچ
داستان سنانا شروع کرے گا۔ مگ
کراہنے لگا۔ اُسے شاید شدید درد ہو
کے چہرے کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں
آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"نہیں۔۔۔ نہیں اور نہیں
"میں آگے نہیں سناؤں گا۔"

میں ایکا ایکی جلے جنگل سے واپس آگیا۔
بے اختیار میرے مونہہ سے نکلا۔
" ادھوری داستان . . . ادھوری داستان سناؤگے؟"
" میں مجبور ہوں۔ مجھ میں مزید طاقت نہیں۔ میری ہمت جواب دے گئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔
میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے کندھے کو سہلانا شروع کیا۔ پھر کہا۔
" تم تو داناہو۔ اپنے ہنر میں یکتا ہو۔ ادھوری داستان سناکر میری سوچ کا ہنر کھوٹا نہ کرو۔ میری بات مان جاؤ۔ مجھ پر کرم کرو۔"
اس نے ایک گہری سانس لی۔ اپنی بُجھتی بُجھتی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ تھوڑی دیر سوچا اور پھر اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی۔ سارنگی سے سُر نکلے اس کے ہونٹ ہلے اور لفظ اُبلنے لگے۔

• اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ باز اور چڑیا برسات کے انتظار میں جلے جنگل میں بسیرا کیے رہے۔ وہ دونوں صبح سویرے مخالف سمتوں کو نکل جاتے۔ جہاں جلا ہوا جنگل ختم ہوتا۔ وہاں نیا جنگل شروع ہوتا۔ لیکن ان کے جنگل کی سرحد پر سے ابھی تک دُھواں اُٹھتا دکھائی دیتا۔ وہ بصد یاس و افسوس اس دھوئیں کو دیکھتے اور اگلے جنگل میں سے کھانے پینے کو کچھ ڈھونڈ کر واپس لوٹتے اور شام کو مل بانٹ کر کھاتے اور سو جاتے۔
ایک دن چڑیا کو لگا اس کا وزن کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔ اُسے پرواز کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس بات کا ذکر اس نے باز سے کیا۔ باز نے اپنا سر اس کے پیٹ کے قریب لے جاکر کچھ سُننے اور محسوس کرنے کی کوشش کی اور پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بولا۔

• آج سے تم خوراک کی تلاش میں نہیں جاؤ گی سمجھیں۔ میں لاؤں گا جو بھی ہوگا اور اسی سے گذر بسر کریں گے۔"
اس دن کے بعد سے چڑیا کہیں نہ جاتی۔
ٹھیک سات دن کے بعد اس نے ایک انڈہ دیا۔ چھوٹا سا گول گول سفید انڈہ۔ پھر کئی دن تک اُس انڈے کو اپنے سینے کی حرارت دی اور ایک دن اس میں سے ایک ننھا سا پوٹ نمودار ہوا جس کے جسم پر کوئی بال و پَر نہ تھا۔ آہستہ آہستہ پوٹ بڑا ہونے لگا۔ اس کے جسم پر چڑیا جیسے رنگ دار پَر اُگ آئے مگر اس کا چہرہ اور چونچ بالکل باز جیسی تھی۔ باز اور چڑیا اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ جو کچھ بھی باز لاتا وہ تینوں مل بانٹ کر کھا لیتے۔ چڑیا یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کا بچہ گوشت خور نکل رہا ہے۔ وہ اس بات کو اپنے اندر ہی اندر دبا گئی۔ باز پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ وقت یوں ہی گذرتا رہا اور ایک دن ایسا آیا کہ اس شام باز واپس نہ آیا۔ دونوں بہت دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ اور پھر سب طرف اندھیرا پھیل گیا۔

کئی دن کے انتظار کے بعد چڑیا سمجھ گئی کہ باز کسی ایسی سمت نکل گیا ہے۔ جہاں جنگل کی آگ ابھی بُجھی نہ ہوگی۔ یا پھر اس جنگل کی آگ کسی دوسرے جنگل تک پہنچ گئی ہوگی۔ باز کے پنکھ جل گئے ہوں گے اور وہ جلتے ہوئے جنگل میں گر گیا ہوگا۔ بوڑھا بھی تو ہوگیا تھا وہ۔
چڑیا غمزدہ ہوگئی۔ اس نے اداس نظروں سے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ اب یہی اس کی اُمید تھی اور یہی اس کا مستقبل۔
گھونسلے میں جو کچھ تھا وہ کچھ دن تک چل گیا۔ اور پھر ایک ایسا لمحہ آیا کہ کھانے کو ان کے پاس ایک دانہ بھی نہ رہ گیا ـــــ بچہ اتنا بڑا نہ تھا کہ چڑیا کے ساتھ اُڑ کر خوراک کی تلاش میں جاتا۔ اور نہ ہی اُسے گھونسلے میں اکیلا چھوڑا جاسکتا تھا۔
چڑیا بڑے تذبذب میں پڑگئی۔ دو چار دن تو بھوکے رہ کر گذر گئے۔ آخر بچہ بھوک سے بے حال ہوکر تڑپنے لگا۔ چڑیا سے اس کا اس طرح تڑپنا دیکھا نہ گیا۔ وہ خود بھی بھوک سے بے حال تھی۔ لیکن وہ تو برداشت کرسکتی تھی مگر وہ ننھا سا پوٹ . . . .
چڑیا بچے کی بھوک کی وجہ سے گھبرا گئی۔ بار بار اس کے پنکھ اوپر اُٹھتے اور پھر بیٹھ جاتے۔ چڑیا کے پنجے بے چینی سے ایک ہی جگہ پر حرکت کرتے۔ بچہ چلا چلا کر اپنی بھوک کا اظہار کر رہا تھا۔
مغرب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سورج نے یہ سب دیکھا اور ندامت سے سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔
سب طرف ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا۔ بچہ بُری طرح تڑپنے لگا اور گردن اٹھا کر چڑیا کی طرف دیکھنے لگا۔ چڑیا اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی وہ سمجھ گئی کہ وہ زیادہ دیر نہ زندہ رہ پائے گا۔
چڑیا نے بے بسی کے عالم میں اپنی چونچ اپنی چھاتی میں چبھو دی اتنی زور سے کہ چھاتی میں سے خون نکل آیا۔ چڑیا نے بچے کو اپنے پنکھوں میں سمیٹ لیا۔ بچہ چھاتی سے بہنے والے خون پر اپنی چونچ رکھ کر پینے لگا اور خاموش ہوگیا۔
چڑیا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی وہ جان گئی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا بچہ بھوک سے نہیں مرسکتا۔ اسی سرمستی میں اس نے اپنی چھاتی پر اپنی چونچ سے لگاتار حملے کیے۔ بچہ بڑے اشتیاق سے اپنی ماں کا خون چاٹنے لگا۔ اس

کے جسم میں ہر لحظہ توانائی آتی جا رہی تھی۔ اور
چڑیا.... ناتواں چڑیا.... اور وہ....؟"
اجنبی ایکا ایکی ساکت ہوگیا۔ سارنگی پر
گز پھیرتا ہوا اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رُک گیا
اور لفظ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہوگیا۔
میں تھوڑی دیر تو یہ سب حیرانی سے دیکھتا
رہا پھر میں نے آواز دی۔
"ہاں تو پھر کیا ہوا؟"
مگر اندھیرے کمرے میں میری ہی آواز
کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر لفظ لفظ فرش پر
گری۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے کو جھنجوڑا
اور دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس
کے سارے جسم میں اینٹھن پیدا ہوگئی۔ وہ مر گیا۔
"مگر... مگر یہ تو بتا دیتا کہ اس داستان
میں تیری رمز کیا تھی۔ جس سے ان کے خداؤں کی
بے حرمتی ہوتی تھی؟"
مگر وہ اب کیا جواب دیتا۔ اس کا جسم تو
انھوں نے مار دیا تھا۔ ذہن داستان سناتے سناتے
مر گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اب کیا
کروں میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ مرنے والے کی
تجہیز و تکفین کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔
فی الفور میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ وہ مرنے
والے کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔
صبح ہوئی تو دفن سے پہلے میں نے اس کو
غسل دینے کا ارادہ کیا.... ایک ایک کرکے
اُس کے کپڑے اتارنے شروع کیے۔ ہر کپڑا خون
اور کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ جب سب کپڑے اس
کے جسم سے الگ ہوگئے تو اچانک میری نظر
اس کی چھاتی پر پڑی۔ چھاتی بالکل لہولہان ہو رہی
تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایسے لگا جیسے کسی
چڑیا نے چونچیں مار مار کر اس میں سے خون نکالا ہے
چھاتی پر چونچ سے لگائے گئے ان گنت زخم تھے
میں خوف زدہ ہوگیا۔ اس کے بعد مجھ میں ہمت نہ
ہوئی کہ اس کے جسم کو ہاتھ لگا سکتا۔

شام ہوتے ہوتے بارش تھم گئی اور غروب
ہوتے ہوئے سورج کی شعاعیں پہاڑوں پر پھیلنے
لگیں۔ اور پھر دھندلکا چھا گیا۔ اندھیرا ہوا ہی تھا
کہ ایک گاڑی سرائے کے پھاٹک کے قریب
آکر رُکی۔ اس میں سے ایک سایہ نمودار ہوا....
پھر فضا میں "خدا حافظ، خدا حافظ" کی آوازیں
گونجیں۔ ان آوازوں میں سے ایک آواز بڑی جانی
پہچانی تھی۔ وہ آواز امیر اللہ کی تھی۔
میں اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا امیر اللہ
کو سرائے میں آتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ سائے
کی طرح اندھیرے میں چلتا ہوا میرے سامنے
آکھڑا ہوا۔ اس کے کندھوں پر سامان کے تھیلے
لٹک رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر بولا۔
"آپ حیران ہوئے ہوں گے صاحب جی،
یہ امیر اللہ کہاں رہ گیا؟"
"ہاں امیر اللہ... میں بہت پریشان
ہوگیا تھا... کہاں رہ گئے تھے تم" میں نے
جس آواز میں اُس سے کہا.... میں اُسے خود
پہچان نہیں پایا تھا"
امیر اللہ نے بتایا کہ راستے کیچڑ سے اَٹے
ہوئے تھے وہ ایک لمبا چکر لگا کر دیوز جانے
کی کوشش میں مصروف تھا.... کہ اس نے دیکھا
راستے میں ایک گاڑی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔
اس گاڑی میں پورا ایک خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لوگ
بہت پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ انھوں نے
امیر اللہ سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد کرے
امیر اللہ ایک قریبی گاؤں میں گیا اور وہاں سے مدد
لے آیا اور پھر ان کی گاڑی دلدل سے نک
اُسے پتہ چلا کہ وہ اپنے راستے سے بھٹک
جا پہنچے تھے۔ امیر اللہ انھیں ان کی منزل تک
کے لیے ایک لمبا چکر لگا کر گیسواڑے تک
تھا گیسواڑے سے وہ میرے لیے کھانے
سگریٹ اور اپنی بہت سی ضروریات کی چ
کر انھیں کے ساتھ اندر تک آیا
کے کئی پُل بارش کی کثرت سے ٹوٹ
اور اب واپس جاتے ہوئے وہ اسے سر
چھوڑ گئے تھے۔
میں نے سارا احوال خاموشی
اور پھر اُسے بتایا کہ ایک اجنبی کی لاش
کمرے میں پڑی ہے۔ اور آخری سفر کا
رہی ہے۔
"کوئی بات نہیں جی۔ کسی کی تجہیز
مدد کرنا تو ثواب ہے۔ میں یہ سب کر دو
جی" اس نے تھیلے میں سے موم بتی
جلائی اور اسے میرے بستر کے قریب
رات امیر اللہ نے بڑا مزے دا
بنایا۔ ہم دونوں نے آتش دان کے قر
کر پیٹ بھر کر کھایا.... وہ پچھواڑے
جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آیا تھا۔
صبح ہونے پر ہم دونوں نے مل
آخری رسومات ادا کر دیں اس کی قبر
کر لوٹے تو میں بے انتہا اُداس تھا....
امیر اللہ کے گیسواڑے سے لائے ہوئے سگر
پیکٹ میں سے سگریٹ نکالا اور سلگا
میں ٹہلتے ہوئے دُور دُور تک دیکھنے لگا
راستے صاف دکھائی دینے لگے تھے
گزر کر مجھے جانا تھا۔ میں یہاں رہتے ر
گیا تھا۔ چاہتا تھا.... جلد سے جلد

نکل جاؤں اور اپنے ساتھیوں سے جا ملوں۔ جو مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ یا پھر دیکھوں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔

امیر اللہ چائے بنا کر لایا۔ اس کی بغل میں ایک اخبار تھا۔ اس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "سورج چمکنے لگا ہے صاحب جی راستے سب کھل گئے ہیں اب آپ جہاں جانا چاہتے ہیں جا سکتے ہیں" اس نے اخبار بغل میں سے نکال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کے لئے تازہ اخبار لایا ہوں صاحب جی کیسواڑے سے مِل گیا تھا"

میں نے اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑائی وہ چار دن پرانا تھا۔ پھر میں نے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑائی .... اچانک میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند کا سا چھا گیا .... اخبار کے پہلے صفحے پر موٹے موٹے الفاظ ابھرے" کراچی۔ امرت سر۔ احمد آباد۔ دار جلنگ۔ تلنگانہ۔ ڈھاکہ۔ فلسطین۔ جافنا عراق۔ ایران" پھر وہ الفاظ بم کی طرح ایک ایک کر کے پھٹنے لگے دھائیں .... دھائیں .... دھائیں .... سب طرف دھواں اٹھنے لگا۔ اور یہ دھواں اور دھوئیں کی تہہ میں ابھرنے والے شعلے جنگل کی آگ کی طرح سب طرف پھیلنے لگے پھر دھواں دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا۔ اور وہی الفاظ دوبارہ نظر آنے لگے۔ اس بار وہ الفاظ چھوٹے چھوٹے سنپولیے بن کر سر اُٹھانے لگے اور ایک ہی جست میں مجھ پر حملہ آور ہونے لگے .... میں نے ایک خوفناک چیخ کے ساتھ اخبار کو زمین پر پھینک دیا۔

"کیا ہوا صاحب جی؟" امیر اللہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"امیر اللہ .... امیر اللہ جنگل میں آگ لگی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا راستے ابھی کہاں کھلے ہیں؟ کئی پُل ٹوٹ گئے ہیں میں انتظار کروں گا اور اگر میں مرگیا .... تو تم میری تجہیز و تکفین کر دینا۔ کسی مسافر کی قبر میں مٹی ڈالنا ثواب ہے۔"

امیر اللہ میری رمز کو شاید نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ جس میں کل اجنبی داستان گو کی لاش کو غسل دینے کے لیے میں نے اس کے کپڑے اُتارے تھے۔

سیّد غلام سمنانی

۹۹ - قادری منزل، میر مست، جون پور ۲۲۲۰۰۱ (یو پی)

مسجدِ قرطبہ کی واپسی

ہر نگہِ اشتیاق محوِ تماشائے ذات
توڑ دیے عشق نے عقل کے لات و منات

عشق ہے فتحِ مبیں، عشق ہے نورِ یقیں
عشق غیور و متیں، عشق ہے صبر و ثبات

عشق کا سوزِ نفس گرمیِ بازارِ شوق
عشق کا اشکِ رواں دجلہ و نیل و فرات

کوہکن و قیس ہیں بندۂ بے دامِ عشق
عشق رئیس الکرام، عشق امیر الثقات

عشق ہے مہرِ منیر، عشق سے روشن ہوئی
تیرہ و تاریک تھی انجمنِ کائنات

جنبشِ ابروئے عشق، جنبشِ بالِ قضا
فتنۂ یومِ نشور، عشق کی ادنیٰ سی بات

مٹ گئی اک آن میں کشمکشِ جسم و جاں
اُٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات و صفات

وسعتِ دشتِ طلب عشق کو فردوسِ جاں
نیشِ غمِ جاوداں عشق کو شاخِ نبات

مرحلۂ عشق میں خارِ الم، گل بدوش
میکدۂ عشق میں زہر ہے آبِ حیات

عشق کی تقدیر ہے آتش و خوں، دار و گیر
عشق کو پیش آئے ہیں ایسے بہت سانحات

عزم و عمل کے لیے کچھ نہیں ارض و سما
عزم و عمل کے لیے کچھ نہیں یہ شش جہات

زیرِ قدم آگیا خیمۂ عرشِ بریں
ہوگئی ہے ریزہ ریزہ شیشہ گہِ ممکنات

میرے جنوں کا صلہ مملکتِ تحت و فوق
عقلِ زیاں کوش ہے میرے جنوں کی زکات

مجھ پہ ہوئے منکشف لوح و قلم کے رموز
پوچھ لے مجھ سے کوئی رازِ حیات و ممات

شاطرِ تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی
دیکھتے ہی دیکھتے کھا گئی تدبیر مات

کتنے دنوں پر ملا عشق کو اذنِ سجود
پھر وہی جوشِ اذاں، پھر وہی لطفِ صلات

چشمِ تمنّا میں ہے حسنِ سراپائے دوست
سامعہ افروز ہے لذّتِ آوائے دوست

قافلۂ وقت ہے گرم دو و تیز گام
کس کے لیے ہے قعود، کس کے لیے ہے قیام

کمترک از برگِ خشک، کمترک از ریگِ د...
وقت کے صحرا میں یہ شام و سحر ک...
وقت کے دریا کی موج جوششِ طوفاں بد...
وقت کا ساحل نہیں، اس کا نہیں...
وقت کے تیشے سے آب زہرۂ فولاد و سنگ...
کوشک و ایوان و کاخ، قصر و در...
وقت کی تیغِ اصیل، وقت کی شمشیر...
بے جگر و بے خطر، بے خبر و...
وقت کے محکوم ہیں قیصر و خاقان...
خواجہ و شاہ و سپاہ، وقت کے ا...
وقت سکوں ناشناس، وقت ہے شورش ا...
وقت کا رہوار ہے تندرو و...
مرغِ بلند آشیاں اس کا اسیر ف...
وقت کا صیاد ہے تیز نگہ، تنگ...
وقت کے معبد میں سب محوِ رکوع و...
وقت کے سب مقتدی، وقت ہی...
کس کو ملی ہے یہاں رخصتِ اظہار...
کس کو ملی ہے یہاں فرصتِ...
خوابِ پریشاں سے کم آرزو دل...
خواہشِ عیشِ دوام، ایک...
وقت کی اِک آن ہیں ماضی و فردا...
وقت کی اِک شان ہے انجمنِ...
وقت عظیم و جلیل، وقت محیط...
وقت کو کچھ مت کہو، یہ ہے کس...
وقت ہے درمانِ درد، وقت دمِ...
وقت ہی خود زخم ہے، وقت ہ...

وقت نہیں بے حدود، وقت نہیں بے ثغور
اس کی بھی ہے انتہا، اس کا بھی ہے اختتام
وقت ہے سیلِ رواں، عشق ہے کوہِ گراں
وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام
عشق ازل آشنا، عشق ابد اختیار
عشق ہے دار البقا، عشق ہے دار القرار
اب نگہِ شوق میں غیب ہے عینِ شہود
راز کہاں رہ گیا عالمِ بود و نبود
شاہدِ تقدیر نے رخ سے الٹ دی نقاب
پھر وہی ذکرِ جمیل، پھر وہی گفت و شنود
عشق پہ تیری بنا، عشق سے تیرا خمیر
ہے یہی رازِ دوام، ہے یہی رازِ خلود
نقش ترا لازوال، نقش ترا بے مثال
کام تو کچھ کر گیا عشق کا ذوقِ نمود
جس کے تھے قلب و نظر جلوہ شناسِ ازل
تھا وہ یقیناً ترا نقش طرازِ وجود
جس کے ہنر جمع بہ حسن و کمال
کسوتِ تہذیب کے بکھرے ہوئے تار و پود
جس کو بہا لے گیا ساحلِ مقصود تک
لطمۂ بحرِ عطا، موجۂ دریائے جود
جس کی امیری میں تھا حسنِ فقیری عیاں
جس کی نگاہوں میں ہیچ خوفِ زیاں، شوقِ سود
راز کے بندِ قبا کھل گئے اک اُن میں
عقدۂ مشکل کی تھی جس سے کشاد و کشود
اس کی نگہ دل کشا، اس کی ادا حق نما

بزم گہِ ناز میں جلوہ فزائے کرم
رزم گہِ کار میں ہوش ربائے جنود
زورق و طوفاں شکن مردزن و جاں شکن
قیصر و خاقاں شکن اس کا قدوم و ورود
جس کا خیال و عمل باعثِ تجدیدِ شوق
جس سے کہ توڑا گیا مغربیوں کا جمود
خلوت و جلوت میں تھا نقش گرِ صد یقیں
اُس کا قیام و قعود، اس کا رکوع و سجود
اس کا آئینِ عطا شاہدِ تہذیب و فن
اُس کی رہی گرم کار گہِ دیر و زود
کتنے دنوں تک رہا سازِ نوا بے خروش
کتنے دنوں تک رہی محفلِ جاں بے سرود
اک نئے عنوان سے جشنِ بہاراں ہوا
جشنِ بہاراں ہوا، رقصِ نگاراں ہوا
تیرے ہر اک سنگ میں نورِ دلِ جبرئیل
تو ہے عدیم النظیر، تو ہے عدیم المثیل
تیری ہر اک خشت میں خونِ رگِ دلبری
تیرا ہر اک پیچ و خم رقص گہِ سلسبیل
منبر و محراب و در، یہ ترے نقش و نگار
مصدرِ خیرِ کثیر، مرکزِ اجرِ جزیل
تیری بلندی سے پست رفعتِ چرخِ بریں
تجھ سے ہوا فرشِ خاک کتنا عظیم و جلیل
جن کی بہاروں سے فاش رازِ بہارِ ارم
تیرے وہ گلزار و باغ، تیرے وہ کشت و نخیل
حکمتِ تعمیر کو تجھ سے ملی آب و تاب

وسمۂ ابروئے زیست ہے ترا دودِ چراغ
تیری کفِ خاک سے دیدۂ مغرب کحیل
شمعِ رہِ دیں بنی ظلمتِ مغرب میں تو
علم و ہنر کے لیے تیری بنا سنگِ میل
مجھ کو ہے معلوم، تھا کون وہ آزر ترا
آہ وہ فردِ فرید، آہ وہ مردِ نبیل
مرحلۂ حق میں تھا صبر و رضا کا نقیب
جس سے ہوا آشکار سرِّ ذبیح و خلیل
اُس کا عمل، اُس کا عزم، اُس کا حشم، اُس کا حرم
چشمِ جہاں کے لیے ایک کتاب الدلیل
جس کی زرہ لا الٰہ، جس کی سپر لا الٰہ
جس کے لیے کچھ نہیں تیغ و سناں، اسپ و فیل
عرصۂ پیکار میں، قلزمِ ذخّار میں
کچھ نہ رہا کیف و کم، کچھ نہ رہا قال و قیل
بن گیا مضرابِ جاں، بن گیا مہمیزِ شوق
اُس کے قلم کا صریر، اُس کے فرس کا صہیل
بندۂ مومن کی روح تجھ سے ہے پرتو فشاں
وہ بھی نہیں مستحیل، تو بھی نہیں مستحیل
پھر ہے وہی رستخیز، پھر وہی شورِ ستیز
تازہ نہ ہو جائے پھر قصۂ فرعون و نیل
ضربِ کلیمی بھی ہے اور ید بیضا بھی ہے
ساحرِ عصرِ جدید! تو نے یہ دیکھا بھی ہے

مظفر حنفی

اُردو میں دوہے

اُردو شاعری کی قدیم کلاسیکی اصناف میں سے بیشتر وہ ہیں جو فارسی سے آئی ہیں مثلاً قصیدہ، مثنوی، رُباعی، غزل، مرثیہ وغیرہ۔ ان کلاسیکی اصنافِ سخن میں اُردو نے مرثیے کو چھوڑ کر بقیہ سبھی میں انھی اصولوں، معیاروں اور ضابطوں کی پیروی کی ہے جو فارسی میں مروّج تھے۔ مرثیے کو میں نے اس کلیے سے یوں مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ فارسی کے برعکس اُردو میں اس صنفِ سخن نے ہئیت اور مواد دونوں اعتبار سے تبدیلی ترمیم اور اضافے کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ بحث یہاں اس لیے اٹھائی گئی تاکہ واضح ہو جائے کہ اُردو میں مروّج اصناف میں اصل زبان کے قاعدے قانون کی پیروی کے ساتھ ساتھ ترمیم و اضافے کی اجتہادی شکلیں بھی ابتدا سے ہی نظر آتی ہیں۔

نسبتاً نئی اصنافِ سخن اُردو والوں نے فارسی کے برعکس دوسری زبانوں سے اخذ کی ہیں مثلاً سانیٹ اُردو میں انگریزی سے آیا۔ جب کہ ترائیلے، ثلاثی اور ہائیکو اُردو کو چینی اور جاپانی زبانوں کی دین ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو نے ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں سے بھی کچھ اصنافِ سخن مستعار لی ہیں اور ان کے بدلے میں ان زبانوں کو غزل اور اپنی دیگر اصناف سے استفادہ کی راہ دی ہے۔ مثلاً اُردو میں کافی اور ماہیے پنجابی اور سندھی کے اثر سے آئے اور دوہا قدیم ہندی کے وسیلے سے منتقل ہوا۔ لیکن ان سبھی اصنافِ سخن میں اُردو والوں نے لکیر کا فقیر بننا پسند نہیں کیا بلکہ اپنے لسانی مزاج کی مطابقت سے تبدیلی و تغیر کو روا رکھا ہے اور اکثر مقامات پر اصل زبان میں رائج اصول و ضوابط سے اختلاف کیا ہے۔ جہاں ہم زبانوں کے منفرد اجتہادی حقوق کو تسلیم نہیں کرتے وہاں بڑی مضحکہ خیز صورتیں رونما ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے دنوں ایک محقق نے تحقیق کا پہاڑ کھود کر یہ چوہا برآمد کیا کہ اُردو میں تصدق حسین خالد سے تا حال سانیٹ کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ہے، تکنیکی اعتبار سے اغلاط کا پشتارہ تھا اور لے دے کر محقق موصوف اور ان کے ایک ہم وطن نے ہی صحیح اور معیاری سانیٹ لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے غلط نتائج پر منتج ہونے والی تحقیق دراصل اپنوں میں ہی لڈو بانٹتی ہے ورنہ حقیقتاً سانیٹ کے سلسلے میں اُردو نے اپنے اس جائز اجتہادی اور تخلیقی حق کو استعمال کیا ہے جو مرثیے کے سلسلے میں روا سمجھا گیا تھا۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ میں نے دوہے کو نئی اصنافِ سخن میں کیوں شمار کیا ہے اور ثبوت میں امیر خسرو کا یہ دوہا پیش کیا جا سکتا ہے:

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چودیس

عرض کرنے دیجیے کہ امیر خسرو بلکہ ان کے بھی پیشرو اور دادا پیر بابا فرید گنج شکر نے متعدد دوہے لکھے ہیں جن میں سے ایک سو تیس سکھوں کی مذہبی کتاب "آدگرنتھ صاحب" میں شامل ہیں۔ موصوف کا ایک دوہا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

دُور ہے گھر اور گلی میں چکڑ اور پیا سے پیار
چلوں فرید تو کمبل بھیگے، رہوں تو ٹوٹے پیار

یا شیخ بوعلی قلندر پانی پتی کا یہ مشہور دوہا:

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روتے
بدھنا ایسی کیجیو، بھور کبھو نہ ہوتے

بابا فرید، بوعلی قلندر اور امیر خسرو کے دوہوں کی قدامت مسلّم اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کہ اُردو کی ابتدا کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام نے دوہوں سے استفادہ شروع کر دیا تھا چنانچہ اُردو نثر کی پہلی کتاب یعنی ملّا وجہی کی "سب رس" میں متعدد دوہے درج کیے گئے ہیں لیکن بہ حیثیت صنفِ سخن دوہا ہمارے یہاں کئی صدیوں تک کوئی مستحکم روایت نہیں بنا سکا حالانکہ امیر خسرو کے بعد بھی اُردو میں وقتاً فوقتاً رحمت اللہ بلگرامی، شاہ عالم ثانی، عبدالغفار غفار جیسے معروف اور غیر معروف شعرا دوہے بھی کہتے رہے۔ ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد اور ۱۹۴۷ء تک جن شعرا نے اُردو میں دوہے لکھے ان میں احمد علی خاں رونق، الف شاہ وارثی، شائق وارثی، اوگھٹ شاہ وارثی، نجم آفندی، مضطر خیر آبادی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

یاں ہم اُردو ادب میں دوہے نے صنفِ سخن کی
حیثیت سے اپنے لیے مستقل جگہ آزادیِ ہند کے
بعد بنائی ہے اور اس پُر لطف حقیقت کا اعتراف
بھی کرنا ہوگا کہ ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان
میں دوہے نے زیادہ برگ و بار نکالے ہیں جس
کے اسباب پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے
ہیں کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد چونکہ ہندوستان کے
اُردو جاننے والے ہندی سے بھی جُڑے رہے اس
لیے موجودہ جدّت پسند دَور میں اُردو کے ہندوستانی
شعرا کے لیے دوہا زیادہ پُرکشش ثابت نہیں ہوا
حالاں کہ اِکا دُکا لکھنے والے یہاں بھی دوہا کہتے
رہے۔اس کے برعکس پاکستانی شعرا کی اکثریت
ہندی سے نابلد تھی اس لیے وہاں دوہا اپنی تمام تر
قدامت کے باوجود نسبتاً نئی صنفِ سخن سمجھا گیا
اور متعدد تخلیق کاروں نے اسے لائقِ اعتنا سمجھا۔
چونکہ اسی دَور میں اچھے اور اہم شاعروں کی
قابلِ لحاظ تعداد دوہے لکھنے پر مائل ہوئی اور
معیاری جریدوں میں دوہے مسلسل شائع کیے
جا رہے ہیں اس لیے میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں
دوہے کو نسبتاً نئی صنفِ سخن قرار دیا۔

اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ
میں زبان و ادب کے معاملے میں جغرافیائی سرحدوں
کا قائل نہیں ہوں اس کے باوجود دوہے کے سلسلے
میں گفتگو کے دوران میں نے ہندوستانی اور
پاکستانی شعرا کا الگ الگ ذکر کیا ہے جس کا بنیادی
سبب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندوستانی
شعرا اُردو میں دوہے کے لیے اسی ہئیت کو مناسب
و دُرست سمجھتے رہے جو قدیم ہندی میں رائج تھی لیکن
اس دور کے پاکستانی شعرا نے دوہے کی ہئیت میں
کچھ ترمیم و اضافے سے بھی کام لیا ہے اگر سخت گیر
عروض داں کی نگاہ سے دیکھا جائے تو سرحد پار
لکھے جانے والے بیشتر دوہے تکنیکی اور اصطلاحی معنوں
میں دوہے نہیں کہے جا سکتے لیکن جیسا کہ میں نے
گفتگو کے آغاز میں اشارہ کیا تھا اُردو نے اپنے
ابتدائی دَور سے ہی تخلیق کاروں کو لسانی مزاج
کی مطابقت سے اجتہادی رویّہ اختیار کرنے کی
اجازت دے رکھی ہے اس لیے ہم مرثیے، سانیٹ
اور ہائیکو کی طرح دوہے میں بھی مناسب ترمیم
و اضافہ کر کے لچکیلی ہئیت اختیار کر سکتے ہیں چونکہ
قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سے جمیل الدّین عالی نے
وہاں ایک بدلی ہوئی ہئیت میں دوہا کہنے کا آغاز
کیا اور ان کے بعد آنے والی تخلیق کاروں کی ایک
بڑی نسل نے انھیں کا اتّباع کیا ہے اس لیے ان
تخلیق کاروں کی روش پر انگشت نمائی کرنا میں
مستحسن نہیں سمجھتا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع
پر قدیم ہندی دوہے کی ہئیت بیان کر دی جائے۔

قدیم ہندی میں دوہے کا ہر مصرع چوبیس
ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔غزل کے مطلع کی
طرح دوہے میں دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع
دو حصّوں میں منقسم ہوتا ہے۔مصرعے کا پہلا حصّہ
جس میں تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں 'سم' اور دوسرا
حصّہ جس میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں 'وِسم'
کہلاتا ہے۔نیز ان دونوں حصّوں کے درمیان
لازماً وقفہ دینا ہوتا ہے۔اُردو کے ہندوستانی
شعرا نے عام طور پر اپنے دوہوں میں ان التزامات
کی پابندی کی جس کی مثال کے طور پر کچھ دوہے ملاحظہ فرمائیے:

سوامی مارہروی کہتے ہیں:

ماٹی کی اس کایا بھیتر، بس میں کر کے پران
تم نے ہم کو مَنُش بنایا، آپ بنے بھگوان

تصوّر گوالیاری کا دوہا ہے:

پورا دیش کٹمب ہے، بھائی سب کو جان
بھارت ماں کے پُتر ہیں، سب جن ایک سمان

بیکل اتساہی نے بھی بہت سے دوہے قدیم ہندی
دوہے کی طرز پر لکھے ہیں موصوف کے دو دوہے
بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

بیکل جی کس فکر میں، بیٹھے ہو من مار
کاغذ کی اک اوٹ ہے، زنداں کی دیوار

نشتر چاہے پھول سے، برف سے مانگے خون
دھوپ کھلاتے چاند کو، اندھے کا قانون

وقار واثقی کے یہ دوہے بھی قابلِ سماعت ہیں
کیوں کہ ان میں ہم عصر زندگی کے نئے نئے پہلو
جھلک مارتے ہیں:

گڈّی چڑھ کر گود میں، بات کرے تتلاتے
دفتر کی ساری تھکن، اک پل میں مٹ جاتے

کل تک میری چال میں، پڑ نہ سکا تھا جھول
منڈوے تلے میں بیٹھ کر، آج بکی بے مول

اور دو دوہے راقم الحروف کے بھی پیشِ
خدمت ہیں:

ایک ہاتھ میں پھول ہے، ایک ہاتھ میں تیر
میرے دل پر نقش ہے، ساجن کی تصویر

جانے پھر کب رات ہو، کب یاد آئیں آپ
جی کہتا ہے اور کچھ، پڑے رہو چپ چاپ

مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ ہندوستان میں سرشار
بلند شہری، مہر جائسی، بھگوان داس اعجاز، ملکش
اکبرآبادی، منزل لوہاٹھہری، کرشن موہن وغیرہ
نے بھی دوہے کہے ہیں۔

پاکستان میں جو دوہا کہا جا رہا ہے ہندی
پنگل کے اعتبار سے اسے 'سرسی' چھند کہا جا سکتا
ہے۔سرسی چھند میں بھی مطلعے کی طرح دو مصرعے ہوتے
ہیں اور ہر مصرع دو حصّوں میں منقسم ہوتا ہے پہلے

حصّے میں سولہ ماترائیں ہوتی ہیں اور دوسرا حصّہ گیارہ ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان وقفہ لازمی ہے جسے اصطلاح میں وشرام کہتے ہیں۔ دوہے میں سرسی چھند کے استعمال کی جدّت یا بدعت کا آغاز جمیل الدّین عالی سے ہوا لیکن چونکہ پاکستانی دوہا نگاروں کی ایک بڑی نسل نے ان کی تقلید میں اسی ہئیت کو اپنے دوہوں میں کامیابی کے ساتھ برتا ہے اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ پاکستانی دوہے میں سرسی چھند کے استعمال کو ایک ادبی اجتہاد کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ دیکھیے اس ہئیت میں سرحد پار کے تخلیق کاروں نے کیسی شگفتہ کاری اور ندرت کے مظاہرے کیے ہیں۔

جمیل الدّین عالی کہتے ہیں:

آہا او دل گانے والے پیادے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے ڈوب جائیں

بابوگیری کرتے ہوگئے، عالی کو دو سال
مرجھایا وہ پھول سا چہرہ، بھورے پڑ گئے بال

اِک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ
اے اندھیارو سورج آیا سورج آیا جاؤ

پرتو روہیلہ کے دوہوں کا مجموعہ 'رین اجیارا' کئی سال پہلے منظرِ عام پر آیا تھا عالی کے بعد سب سے زیادہ دوہے انھی نے کہے ہیں:

جیون اِک کنواں ہے جس میں گونجے بس سنّاٹے
دکھ کی ناگن اس میں لوٹے اس کی مٹّی چاٹے

جیون ریل کا اندھا بابو اندھیارے میں مارے
شور مچا کا نادیکھے ناہیں، رستے بیچ اُتارے

توقیر چغتائی کے دو دوہے ملاحظہ ہوں:

تجھ سے پہلے من مندر میں لوگ ہزاروں آئے
تیکھے نینوں والے تو نے، سب کے سب بسرائے

تن کا دیپک جلتا جائے، من بھیتر اندھیارا
تن دیپک من باتی بن کے، بیتے جیون سارا

محمود علی ٹھاکر کے دو دوہے ملاحظہ فرمائیں:

دھنونتوں کے عیب چھپائے، نردھن کو بہلائے
دمڑی سے چھوٹا ہو کر بھی، پیسہ ہی کہلائے

کنگنوا اور پریتم سکھیو! ناہیں کسی کے یار
ایک جرا اکھیاں جھپکیں تو، پار ندی کے پار

اِدھر کچھ لوگوں نے غالباً لاعلمی کے تحت کچھ ایسی ہئیتیں بھی دوہے کے نام پر اختیار کر لی ہیں جن کا تعلّق سرسی چھند سے بھی نہیں ہے اور یہ لوگ خود اپنی اختیار کردہ ہئیت کی پابندی اپنے ہی تمام دوہوں میں نہیں کر پاتے مثلاً رشید قیصرانی کے یہ دو دوہے ملاحظہ ہوں:

بند کیے ہیں آخر ہم نے خواب کواڑ جو کھولے تھے
بے پر چاند چکور بنے تھے ہم بھی کتنے بھولے تھے

موج تھپیڑوں میں تن من کا ریزہ ریزہ صرف ہوا
تب جا کر وہ سوچ سمندر بیٹھا اور اک حرف ہوا

اسی طرح حامد برگی نے بھی دوہوں کے لیے ایک خود ساختہ بحر منتخب کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

کن چہروں نے کن چہروں کی یاد دلائی
روپ کی برکھا سندر سپنے لے کر آئی

اور:

سورج کا آکاش پہ پھیلا جال سنہرا
چاروں کھونٹ لگا ہے اجیارے کا پہرا

ان تخلیق کاروں کے علاوہ پاکستان میں تاج سعید، نگار صہبائی، ناصر شہزاد، عرفانہ عزیز، ظہیر فتح پوری وغیرہ نے دوہے کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

یوسف ناظم

زود فراموشی

زود فراموشی کوئی مرض نہیں ہے

کیوں کہ اگر یہ مرض قسم کی کوئی چیز ہوتی تو اس کا علاج بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا۔ ویسے ڈاکٹر کوئی مرض ہو یا نہ ہو' علاج کرنے سے دریغ نہیں فرماتے۔ وہ کہتے ہیں خدمتِ خلق کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ (ہاں مریض ہی چلا جائے تو کوئی حرج نہیں)۔ اس لیے جب بھی کوئی ایسا شخص جو اپنی زود فراموشی کی شکایت کرنے ان کی زد میں آتا ہے وہ اس کا علاج ضرور کرتے ہیں لیکن احتیاط یہ کرتے ہیں کہ نہ صرف اپنی فیس (جو معقول ہوتی ہے) پیشگی وصول کر لیتے ہیں بلکہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ یہ شخص یہ بات فوراً بھول جائے تاکہ اسے اس کی زود فراموشی کی سزا دوبارہ دی جاسکے اور اگر اتفاق سے اس شخص کو یاد رہا کہ اس نے تو فیس پہلے ہی ادا کر دی تھی (چھوٹی موٹی رقم ہوتی تو وہ شاید بھول بھی جاتا۔ یہ تو بڑا گہرا زخم تھا) تو ڈاکٹر اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ ان کا علاج کامیاب رہا۔ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ زود فراموشی کوئی مرض نہیں ایک اچھی عادت ہے اور اس عادت کو عام طور پر اخلاقِ حسنہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ کئی لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر زود فراموش لوگوں سے ربط پیدا کرتے اور اُن سے (یک طرفہ) خوش گوار تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ زود فراموش لوگوں سے قرض لینا بڑا مُفید ثابت ہوتا ہے۔ قرض دینے والا شخص تو قرض دے کر کچھ دنوں بعد بھولتا ہے لینے والا شخص فوراً بھول جاتا ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اور بھی زیادہ دانشور ہوتے ہیں اور زود فراموش سے قرض نہیں مانگتے بلکہ اپنا دیا ہوا قرض واپس طلب کرتے ہیں۔ ایسا قرض جو انھوں نے کبھی نہیں دیا تھا۔ زود فراموش لوگ اپنی یادداشت کے معاملے میں قلاش تو ہوتے ہی ہیں اپنے ان احباب کے طفیل پوری طرح قلاش ہو جاتے ہیں۔ ان کا علاج بھی یہی ہے۔

زود فراموشی ہے بڑے کام کی چیز۔ اس عادت کی بنا پر کم سے کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ ایک کام بہر حال تیزی سے کرتے ہیں اور وہ ہے بھول جانے کا کام۔ زود گوئی' زود نویسی مشکل کام ہیں زود فہمی اور بھی زیادہ مشکل اس لیے ان سے ہمارا تعلّق سرسری ہے۔ زود رفتاری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ ہمارا یہ کام تو جلد مکمّل ہو جانے والا ہے تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم کوئی کام منسوخ نہیں کرسکتے تو ملتوی ضرور کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی اسکول کے ایک مدرس نے اپنے لیے ایک نئی کُرسی فراہم کیے جانے کی درخواست دی اور وہ کُرسی اسی دن اسے فراہم کر دی گئی تو اسے اتنی شدید خوشی ہوئی کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ غنیمت ہے کہ ہمارے یہاں زود رفتاری کے کارنامے گنتی کے ہیں۔ تعداد میں زیادہ ہوتے تو پتہ نہیں ہماری آبادی کتنی کم ہو جاتی۔

زود فراموشی اکثر صورتوں میں شخصی اور انفرادی حدود کو عبور کر کے قوم کا کردار بن جاتی ہے۔ سیاست داں الیکشن سے پہلے دو چار سو وعدے کرتے ہیں اور الیکشن کے بعد دو چار دنوں ہی میں بھول جاتے ہیں۔ ظاہر ہے سیاسی وعدوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا حالاں کہ عالمی ریکارڈ بُک میں ان کا بھی ذکر ہونا چاہیے لیکن ان کا ریکارڈ شاید اس لیے نہیں رکھا جاتا کہ اگر ایسا کیا جائے تو ہماری ساری اسٹیشنری انھی وعدوں کی کھتونی پر خرچ ہو جائے گی اور مجبوراً ڈاک خانوں سے قیمتاً فراہم کی جانے والی اسٹیشنری کے دام اور زیادہ بڑھانے پڑیں گے۔ ویسے یہ بھی صحیح ہے کہ جہاں تک دام بڑھائے جانے کے کارنامے کا تعلّق ہے اس کے لیے کسی خاص وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نیک کام کے لیے ہر سال ایک موسم آتا ہے اور عوام بے دام بِک جاتے ہیں۔ سیاسی وعدوں کے سلسلے میں ایک اہم اور تاریخی واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ الیکشن کے موقعے پر ایک امیدوار نے گاؤں والوں سے وعدہ کیا کہ وہ گاؤں میں ایک پُل بنوادیں گے۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ پل کہاں بنوائیں گے ہمارے گاؤں میں تو کوئی ندی ہی نہیں ہے تو انھوں نے کہا میں ایک ندی کا بھی انتظام کروں گا تاکہ اس پر پل بن سکے۔

۱۹- الہلال' باندرہ ریکلیمیشن' بمبئی ۴۰۰۰۵۰

وہ تو اچھا ہوا کہ ان کا انتخاب نہیں ہوا ورنہ وہ ایک پُل بنوانے کی خاطر گاؤں میں سیلاب بھی لے آتے۔ لیکن اس قسم کے وعدوں کے لیے الیکشن کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔ وعدہ کرنا خود ایک نیکی ہے اور نیکی کے بارے میں کہا گیا ہے نیکی کرو اور بھول جاؤ۔ اب تو یہ بھی کیا جانے لگا ہے کہ ہماری زمین وعدوں کے لیے بہت زرخیز ہے اور اگر یہ کہیں اور زیادہ نم ہوگئی تو اس زمین سے کوئی اور چیز پیدا ہی نہیں ہوسکے گی۔ ہر طرف وعدے ہی وعدے لہلہاتے رہیں گے۔

عوام بھی زود فراموشی کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہتے۔ ہر دو دن بعد ایک 'بند' ضرور ہوتا ہے۔ آج کسی شہر میں ائر پورٹ بند ہے تو کل کسی شہر میں سول کورٹ بند ہے۔ کہیں بازار بند ہے تو کہیں پورا شہر ہی بند ہے۔ دُکان دار پوچھتے ہیں کہ ابھی چار دن پہلے تو ہم نے کاروبار بند کیا تھا کل پھر کیوں بند کریں تو جواب ملتا ہے وہ بند ہم نے نہیں کروایا تھا ـــــ یہ سُن کر دُکان دار کا مُنہ بند ہوجاتا ہے۔ اب 'بند' کا بھی ایک فلسفہ ہے اگر بند کا حکم ملنے پر دُکان کھلی رکھی جائے تو ہوسکتا ہے کہ دُکان تو کھلی ہو لیکن اس میں ہو کچھ نہیں۔ اصل قصّہ یہ ہے کہ مسائل کی پیداوار بند نہیں ہورہی ہے۔ ہر روز دو چار نئے مسائل پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں اور اگر اس تقریب میں شہر کو بند نہ رکھا جائے تو ڈر یہ رہتا ہے کہ شہر کے کھلے رہنے کی وجہ سے نئے مسائل شہر میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں زود فراموشی کی عادت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے (اور وہ کب نہیں ہوتا) تو ہم اس سے پہلے پیدا ہونے والے مسائل کو بھول جاتے ہیں۔ نہ بھولیں تو ہماری صحت کے بگڑنے کا ڈر رہتا ہے۔ اکثر لوگ تو اپنی رہی سہی صحت کی سلامتی کے لیے یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ان کے بچّے کتنے ہیں۔ نئے بچّے کی پیدائش پر سب بچّوں کو گنتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خانہ زاد کرکٹ ٹیم میں بارہویں کھلاڑی کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ (دو امپائر تو پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں)۔

کچھ ملکوں میں زود فراموشی صرف شادیوں اور طلاقوں کی حد تک محدود ہے۔ وہاں لوگوں کو یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ اب تک کتنی شادیاں کرچکے اور کتنی طلاقیں دے چکے ہیں۔ (یہ بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے)۔ ان لوگوں کی اس زود فراموشی کا خوش گوار پہلو یہ ہے کہ بعض وقت تو طلاق دینا ہی بھول جاتے ہیں۔ انھیں اپنی شادی ہی یاد نہیں رہتی تو وہ طلاق کسے اور کیسے دیں۔

زود فراموشی کے فوائد اور نقصانات ہر شخص کے مقدّر کے حساب سے ہوتے ہیں۔ کسی کو فائدہ زیادہ پہنچتا ہے اور کسی کے نصیب میں سوائے نقصان کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کچھ شوہر جب شام کو گھر واپس پہنچتے ہیں تو انھیں گھر پہنچتے ہی بیوی کی ڈانٹ کھانی پڑتی ہے۔ یہ شام کا ناشتہ ہوتا ہے۔ جن گھروں میں شام کے ناشتے کا رواج نہیں ہوتا اُن گھروں میں بیویاں اپنے اپنے شوہروں کو چائے پلانے سے پہلے ڈانٹ پلاتی ہیں۔ یہ دن کی پہلی خوراک ہوتی ہے۔ اس حسنِ سلوک کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شوہر وہ کام کرنا بھول جاتے ہیں جو انھیں صبح گھر سے نکلتے وقت بتایا گیا اور یہ تاکید کردی گئی تھی کہ بھولیے گا نہیں۔ (زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ بھولا ہوگا)۔ ایسے شوہروں میں سے (جن کی تعداد خیر سے کم نہیں ہے) بھی ایک شوہر کی بیوی ان کی یادداشت کو بحال کرنے کی خاطر ان کی دستی میں ایک گرہ ڈال دیتی ہے تاکہ شوہر جب بھی دستی استعمال کریں انھیں یاد آجائے کہ بیوی نے آج کیا فرمائش کی تھی لیکن ہوتا یہ ہے کہ شوہر کے گھر واپس ہونے پر خبر یہ ملتی ہے کہ یہ تو دستی ہی بھول آتے ہیں اور وہ گرہ جو بیوی نے شوہر کی دستی میں ڈالی تھی بیوی کے دل میں پڑجاتی ہے۔ ہمارے یہاں 'ازدواجی تعلّقات' کا انحصار زیادہ تر انھی گرہوں پر ہے۔ دلوں میں یہ گرہیں نہ ہوں تو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میاں بیوی ایک بندھن میں بندھے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی دونوں شاعر ہیں اور اپنے نکاح کے مصرعِ طرح پر روز ایک نئی گرہ لگاتے ہیں اور اپنے پڑوسیوں سے اپنے کلام کی داد پاتے ہیں۔ اتفاق یہ ہوتا ہے کہ ان کے پڑوسیوں کا کلام بھی اسی نمونے کا ہوتا ہے۔

زود فراموشی کی مشق بچپن ہی سے کرنی پڑتی ہے۔ بچّوں کی ذہنی ساخت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ بچّے ماں باپ کی عملی تربیت کے دس منٹ بعد ہی بھول جاتے ہیں کہ انھیں کس بنا پر اس عملی تربیت سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کے کچھ کچھ نشانات اب بھی ان کے جسم پر موجود ہیں۔ بچّوں کی زود فراموشی انھیں دوبارہ اُسی کام پر راغب کردیتی ہے۔ والدین بچّوں کی سرکوبی کرتے کرتے تھک جاتے ہیں لیکن بچّوں کی مستقل مزاجی برقرار رہتی ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ ان کے بچّے ضدی ہوگئے ہیں۔ یہ ضد نہیں ہوتی زود فراموشی ہوتی ہے۔ بچّے تو معصوم ہوتے ہیں وہ بیچارے کیا ضد کریں گے، ضد تو سربراہانِ ملک کیا کرتے ہیں۔ جس بات پر اَڑ گئے اَڑ گئے۔

بچّوں کی زود فراموشی اسکول میں بھی

برقرار رہتی ہے بلکہ اُستادوں کی مدد سے یہ اور زیادہ پروان چڑھتی ہے۔ چھوٹے بچّوں سے جب بھی اسکول میں ایک ہی لفظ سو مرتبہ لکھوایا جاتا ہے تو بچّوں کو اس لفظ کی شکل وصورت تو یاد ہو جاتی ہے وہ اس کے معنی فوراً بھول جاتے ہیں۔ ہمارے اِس طریقۂ تعلیم نے زود فراموشی کی عادت کو کافی فائدہ پہنچایا ہے۔

غائب دماغی اور زود فراموشی دو الگ الگ اصنافِ زندگی ہیں لیکن یہ ہیں ایک ہی دریا کے دو کنارے اور دو ایسے کنارے جو اکثر و بیشتر مل جایا کرتے ہیں۔ غائب دماغی ذرا اُونچے درجے کی چیز ہے اور غائب دماغ بننے کے لیے بہت پڑھنا پڑتا ہے کئی ڈگریاں (جواب عام ہو گئی ہیں) حاصل کرنی پڑتی ہیں اور اس کے بعد کسی اچھے کالج میں پڑھانے کی خدمت بھی انجام دینی پڑتی ہے۔ (غائب دماغی کی تنخواہ اچھی خاصی ہوتی ہے)۔ زود فراموشی کے لیے ایسی کوئی شرائط نہیں ہیں۔ کسی مجبوری کی بنا پر اگر تعلیم حاصل بھی کرنی پڑی ہو تو فارغ التحصیل ہوتے ہی اس تعلیم کو (بشرطیکہ دی گئی ہو) بھول جانا زود فراموشی میں نام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے تعلیم یافتہ لوگ جب وہ سب کچھ پوری طرح بھول جاتے ہیں جو انھیں پڑھایا گیا تھا تو اُن کی قابلیت سے مرعوب و متاثر ہو کر انھیں کئی اہم ذمّے داریاں سونپی جاتی ہیں اور وہ اِن ذمّے داریوں کو بھی بھول جانا اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔

زود فراموشی کی ایک اور خوبی جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی زود فراموشی کے کسی بھی درجے پر ہو اپنا مفاد نہیں بھولتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر چیز کی حد ہو یا نہ ہو زود فراموشی کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے۔ جی چاہے تو آپ اسے سرحد کہہ لیجیے۔
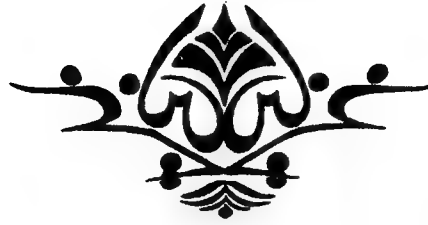
والی آسی

کیا ہجر میں جی نڈھال کرنا
کچھ ذکر شبِ وصال کرنا
جو کچھ بھی گزر رہی ہے سہہ لو
کچھ اس سے نہ عرضِ حال کرنا
غم اُس کے عطا کیے ہوئے ہیں
غم کا نہ کبھی ملال کرنا
جس طرح جیے ہیں ہم جہاں میں
پیش ایسی کوئی مثال کرنا
میں جس کا جواب دے نہ پاؤں
ایسا کبھی کوئی سوال کرنا
میں تم سے بچھڑ کے جی سکوں گا
ایسا نہ کبھی خیال کرنا

مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

شجاع خاور

عروج ہی میں نہیں ہے کمال سورج کا
زوال بھی ہے بڑا بے مثال سورج کا

کچھ ایسا ذہن پہ چھایا جلال سورج کا
کہ چاند پر بھی ہوا احتمال سورج کا

اُمیدیں چاند کے ہمراہ ڈوب جائیں گی
سحر پھر آکے بچھادے گی جال سورج کا

دہکتے دن کو خنک چاندنی سے اُمیدیں
اندھیری رات کے دل میں خیال سورج کا

گزارنا ہے ہر اک دن اسی زمیں پہ شجاعؔ*
بس اب دماغ سے خدشہ نکال سورج کا

ہر طرف سے اس رویّے کی بُرائی ہو رہی ہے
پھر بھی دُنیا میں ابھی تک بے وفائی ہو رہی ہے

گرم لفظوں اور سرد آہوں پہ مرتا ہے زمانہ
درد کے بازار میں اچھی کمائی ہو رہی ہے

دیکھنے والوں میں بالکل بھی نہیں ہے بے نیازی
اس لیے چلمن کے پیچھے سے خدائی ہو رہی ہے

سب یہ کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی گویا یہی تھا
درد کے پردے میں کیسی خود ستائی ہو رہی ہے

شہر والے ٹھیک ہیں، اپنی شجاعؔ صاحب سناؤ
فلسفوں کی قید سے کب تک رہائی ہو رہی ہے

* میں اپنا تخلص اس وزن پر بھی باندھتا ہوں ـــ شجاع

پولیس کوارٹرز (چشانکیوں) آئی ٹی او، نئی دہلی

خورشید انور

نصرتی کے قصائد کا تنقیدی جائزہ

علی عادل شاہ کا ملک الشعرا نصرتی دکنی شعرا میں نمایاں ترین مقام کا حامل ہے۔ ایک طرف اس کی مثنویاں اس کے تاریخی شعور اور فنکارانہ کمالات کی غماز ہیں تو دوسری طرف دکنی قصیدہ اپنی فکری و فنی بلندیوں میں نصرتی کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ نصرتی دکن کا ایک عظیم المرتبت شاعر ہے جس نے مثنوی کے ساتھ قصیدہ نگاری کو بھی معراج کمال تک پہنچایا۔ بڑی شاعری لفظ و خیال اور فکر و فن کے جس حسین امتزاج سے وجود میں آتی ہے وہ نصرتی کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے وہ مثنوی کے علاوہ قصیدے کی فنی و فکری نزاکتوں اور باریکیوں کا رمز شناس تھا چنانچہ اس نے قصیدے کی زبان و اسلوب کی جزالت و متانت اور جوش و خروش کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے دکن کے تمام شعرا کے مقابلے میں نصرتی کے پاس الفاظ کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کی تراش خراش کے بعد موقع و محل کی مناسبت سے انھیں سلیقہ سے اشعار میں پرونے پر نصرتی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ تخیل کی بے پناہ دولت سے بھی مالامال تھا۔ قدرتی مناظر کی رعنائیاں اور سحر کاری اور اپنے بصری تجربوں کو نقطہ و نغمہ کی شکل و صورت دینے پر اسے عبور حاصل تھا یوں تو اس کے قصائد الفاظ کی جادوگری تخیل کی اعجاز کاری مناظر قدرت کی عکاسی مقامی زندگی کی ترجمانی اور حقیقت نگاری کے بہترین مرقعے ہیں لیکن اس کا اصل جوہر جس کی وجہ سے اسے اُردو کے تمام قصیدہ نگاروں میں اوّلیت و افضلیت کا شرف حاصل ہوا اس کی رزم نگاری ہے۔

نصرتی کا زمانہ بڑے انتشار و خلفشار کا زمانہ تھا پورا دکن میدان کارزار بنا ہوا تھا بڑے بڑے قلعوں کی فصیلیں زمین بوس ہو رہی تھیں نصرتی بھی بسا اوقات جنگوں اور معرکوں میں اپنے سلطان کا ہم سفر ہوتا تھا وہ تیروں تلواروں اور توپوں کو چلتے ہوئے اور انسانی خون کو بہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا چنانچہ اس پر آشوب ماحول اور کشت و خون کے لرزہ خیز واقعات کی تصویر کشی اور ان سے مرتب ہونے والے جذبات و احساسات کا پُر جوش اور پُر اثر اظہار ہی نصرتی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کو تخیل و الفاظ کی ہم آہنگی کے ساتھ اپنے قصائد میں بیان کر دیتا تھا۔ رزم جنگ کے واقعات کا ذکر ہو یا بزم کی نیرنگیوں کا عالم، وہ تاریخی حقائق سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ترتیب اور تسلسل کا بھی پورا خیال رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اور مورخین کے بیان کردہ واقعات میں زیادہ فرق نہیں ملتا۔ بلکہ تاریخی اور جنگی حالات اور واقعات کے بیان میں نصرتی ان جزئیات پر بھی نظر رکھتا ہے جن کو اکثر مورخین نظر انداز کر جاتے ہیں چنانچہ اس کے قصائد کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ دکن کی قدیم تہذیب اور تمدن اور سیاسی و سماجی تاریخ کا پتہ لگانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مناظر قدرت کا حسن ہو یا محلات و باغات کی خوبصورتی جنگ و جدل کا خوفناک منظر ہو یا عیش و نشاط کی پُر کیف محفلیں نصرتی اپنے قصائد میں ان تمام مناظر کا نقشہ کھینچتے وقت اپنی رفعتِ تخیل اور وسعت خیال کے علاوہ الفاظ کی شان و شوکت تشبیہات و استعارات کی ندرت و جدت سے ہر جگہ کام لیتا ہے۔

اب ہم اس کے قصائد سے چند اشعار پیش کرتے ہیں جن سے اس کی رزم نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

جب یا علی کی ہانک سوں گھوڑے اچائے جل سوں
ہر دل کا بت خانہ ڈھلیا ہو کافرِ فجّار کا

کھڑکاں کھناکھن سور و سر سوراں کے یوں بجنے لگے
زہرا کا زہرا گل رہیا آواز سُن جھنکار کا

کھڑکاں پہ کھڑکاں لگہ اوکر چوندھر تے یوں چنگیاں اٹھیاں
جوں آگ کیاں بجلیاں چمک برسیا بدل انگار کا

میدان جنگ میں قتل و غارتگری، انسانی سروں کی بے توقیری، مردہ انسان کی آنتوں اور چربیوں کی فراوانی و ارزانی اور شغال و کرگس کی شکم سیری کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

۱۳۳۔ اے، ذاکر نگر، نئی دہلی

چلکتیاں سراں کیاں تیرتے دستیاں کنول کے پھول سیاں
پنجہ جھڑیا سو ڈنڈ تھا ہر تس ڈنڈل کے سار کا

شغال وگرگ آپس میں غنی ہو دوستی کیتے
کلے بھا بار انتڑیاں کے اوڑا چیر بیاں کی چادر کوں

نصرتی اپنے زمانے کی فوجی پوشاک اور آلات حرب کا ذکر یوں کرتا ہے:

جنا ہتھیار سوں اپنی کمر بند مستعد راوت
گرو گلیخ و بکتر پوش وزرہ توپ جنگل کا

سینیاں پاکھراں بینیاں سوں ات ماتی سر کہ ہاتی
سبد کھانٹیاں نکاس ہدریاں گنگن پر مغز منگل کا

انیٹا کوئی چمکتے کھپوا کنارا ہور بلم والے
کسی ہت باکہ تک باکاں دھویں ڈر دل میں جس سل کا

بھلے تیرو کمان انیٹی کٹاری ہور بلم کھپوی
وکھت ضرب فرنگ کر داکتے ہور سیف برنل کا

جنگ میں صرف انسانوں کے سر دھڑ نہیں کٹتے بلکہ ہتھیار بھی ٹوٹ پھوٹ کر منتشر ہوجاتے ہیں۔ چونکہ نصرتی واقعات کے بیان میں جزئیات پر بھی نظر رکھتا ہے لہٰذا وہ اپنے قصائد میں انسانی جسم کے اعضا کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے چکنا چور ہو کر میدان جنگ میں بکھر جانے کے ذکر سے بھی گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ لکھتا ہے:

جھڑے بکتر کے پرزے کہیں پڑے توپ دستانے
پڑے جمٹیاں تے تاتاں نٹ کہن ٹکراج تو نکل کا

یہ بات مسلم ہے کہ نصرتی کے قصائد کی سب سے بڑی خوبی اور انفرادیت اس کی رزم نگاری ہے تاہم قدرتی مناظر باغ و بہار کا ذکر بھی وہ تشبیہات و استعارات کی مدد سے یک گونہ طرفگی کے ساتھ اپنے فطری انداز میں کرتا ہے نصرتی باغ و بہار کے ان عناصر کا ذکر نہیں کرتا جن کا اس نے مشاہدہ نہ کیا ہو یا جن کا تعلق اس کی اپنی سرزمین سے نہ ہو اس لیے وہ روایتی فصل بہار اور قدرتی مناظر و باغات کے بجائے دکن کی جانی پہچانی ہوئی بہار اور اپنے وطن عزیز کے اِرد گرد پھیلے ہوئے قدرتی مناظر کے حسن کی تصویر کشی پر زیادہ یقین رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قصائد میں حقیقت نگاری اور مقامی زندگی کا عکس بہت واضح ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار درج ذیل ہیں:

پڑے منڈویاں منیں تے یوں صبا کی دھوپ بستر پر
ہری اطلس اوپر گویا لکھے ہیں نقش زر حل کا

سیتے ہیں کالے نمر کے یوں کالوے گلشن منے
جیوں کس بکھیرے جاد سے رخ پدمنی دلدار کا

کتے رک جام و جامن ہور بہنس ہور توت تیندو کے
بھیلا واں کیں ہیں بٹرہ کیں ما پھل دمندل کا

صفا پانی کے چشمیاں میں سہے یو چھاون پر ساہی
سواد انکھیاں کو جیوں دیوے درس چشم مکحل کا

کہیں رکھ دار چینی کے دھریں سو پوست میں لذت
رکھے سو مغز میں خوشبو کہیں تو بن کے صندل کا

نصرتی کی رزم نگاری اور اس میں مبالغے کے ساتھ ساتھ دور جاہلیت کے عرب شعرا کی حقیقت پسندی کے رجحان کی خاص طور پر آئینہ داری اس کا وہ قصیدہ کرتا ہے جو علی عادل شاہ کی شیواجی سے جنگ میں صلابت خاں کی بغاوت کو کچلنے اور بادشاہ کے کامران و ظفریاب ہونے کے سلسلے میں اس نے لکھا تھا۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

اے شہ توں ہمنام علی شاہاں پو تیری سروری
دلدل فلک کا راج تج کرتا زمانہ قنبری

اس قصیدے میں استعاروں کا جس کثرت اور جس عمدگی سے استعمال کیا ہے بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نصرتی کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لیے صرف یہی ایک قصیدہ کافی ہے۔ اس کے دوسرے بہت سے قصیدوں کی طرح یہ قصیدہ بھی تشبیب سے عاری ہے لیکن جذبات کا تلاطم، فن کی عظمت، شعری سحر کاری اور زبان و اسلوب کی برجستگی و بے تکلفی اور روانی اس قصیدے کے ہر ہر شعر سے تراوش کر رہی ہے۔ بعض جگہ الفاظ نامانوس اور متروک ہیں لیکن آج بھی ان کا صوتی آہنگ اور مخصوص نغمگی اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے مثال کے لیے صرف ایک شعر درج ذیل ہے:

جاں تو کنک کے تک اتک سنک ہنک سوندل کیا
کھڑکاں کوں کھڑکاں لگ ادک ہر یک کھڑک پائے کھڑی

تشبیہوں اور استعاروں کی مثال کے لیے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

دار استے کجرد اٹل تج داب تل دابے گئے
او چار کو جب جگ میں توں ظاہر کیا اسکندری

کھایا شکست یوں پست ہو اس کل مکھی فوج سوں
تاریاں سوں جونس ہوتے ہوا دیک آفتاب خاوری

تج شہ جواں کے سامنے رستم تو یک نہنواد ہے
دھرتا ہے تس گرز گراں تو جھنجھے تے کمتری

برسیا کھڑک کے ابر تے یوں تس پو پانی قہر کا
خشکی پو ساری بحر ابل چوندھر چلی لہو کی تری

نصرتی نے ایک طویل نعتیہ قصیدہ بھی لکھا ہے جس کی تشبیب سمائیات سے متعلق ہے۔

یہ اُردو کا پہلا قصیدہ ہے جس میں معراجِ نبوی کے حالات کا بیان بالتفصیل کیا گیا ہے۔ نصرتی کی مشکل زبان پر اس کے معاصرین بڑے اعتراضات کیا کرتے تھے چنانچہ ان کی حرف گیری کے جواب میں اس نے ایک بڑی زوردار ہجو لکھی جو قصیدے کی ہئیت میں ہے۔ قصیدے کی ہئیت میں ہجو کی یہ پہلی مثال ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نصرتی اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے قصائد میں ہجو کی داغ بیل ڈالی۔ فارسی میں انوری اور عرفی اس کی عمدہ مثال ہیں۔ نصرتی بھی اس ہجو یہ قصیدے میں گالی گلوج تک اتر آیا ہے اور ایسے اشعار کہہ گیا ہے جو متانت وسنجیدگی سے تجاوز کرکے فحش نگاری کے حدود میں داخل ہوگئے ہیں۔

نصرتی اپنے قصائد میں مقامی زندگی کی گہما گہمی اور بیجاپور میں منائے جانے والے شاہی جشن اور عوامی تیوہاروں کا بیان حقیقت نگاری کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے مجلس عاشورہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو اس کی واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ اس قصیدے کا مطالعہ قاری کو دکن میں اس عہد کے محرّم منانے کے طریقوں سے بخوبی واقف کرا دیتا ہے۔ اور بآسانی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ نصرتی کے زمانے میں مجلس آرائی و نوحہ خوانی اور علموں کی آرائش ونمائش کس طرح کی جاتی تھی۔ علموں کے ساتھ محرم کا جلوس کس طرح نکلتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

نصرتی کے قصائد کی ایک خصوصیت اس کے قصائد کی طوالت اور ایک سے زیادہ مطلعوں کا التزام بھی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ طوالت کے باوجود اس کے قصائد کا تسلسل اور روانی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔

ابتدائی عربی قصائد میں ہی ہم کو دو طرح کے قصائد نظر آتے ہیں: ایک وہ جن میں تشبیب کا پورا اہتمام و التزام کیا جاتا تھا دوسرے خطابیہ قصیدے جو براہ راست مدح سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ مختلف ادوار میں ان کا رواج کم و بیش رہا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ تشبیب قصائد کے مقابلے میں خطابیہ قصائد کی تعداد بہت کم ہے فارسی میں بھی بہت سے لوگوں نے موخرالذکر نوعیت کے قصیدے لکھے ہیں اُردو میں نصرتی وہ پہلا شاعر ہے جس نے التزامی طور پر اس نوع کے قصیدے لکھے چنانچہ اس کے بیشتر قصائد میں تشبیب کا فقدان ہے لیکن اس کو فن کی خامی یا نقص نہیں کہا جاسکتا یہ اس کا انتخاب تھا اور ہر شاعر ایسے انتخاب کا مجاز ہے۔ چنانچہ نصرتی نے علی عادل شاہ کے قلعہ پناله کو فتح کرنے پر جو معرکہ آرا قصیدہ لکھا ہے اس کے مطلعے سے ہی سلطان کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

جب تے جھلک دیکھیا ادک سورج تری تروار کا
تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پر عرق یکبار کا

اسی طرح کا ایک قصیدہ وہ بھی ہے جس کا مطلع ہے:

ہوا ہے کون عالم کے شہاں میں شہ ترے بل کا
سچا توں نادں کاری ہے وصّیِ شاہِ مرسل کا

قصیدے کے فن میں خاتمے کو بڑی اہمیت حاصل ہے نصرتی قصیدے کی اس منزل سے بڑی کامیابی سے گزرا ہے۔ اس نے اپنے ذاتی احوال اور حسن طلب میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ مثلاً:

چمن چمن کورج ہو قافیہ فیض قصیدے میں کتا
یو بارنا ہلنا لگے بن طبع کے زور آوری

حقا کہ ظاہر یوں کروں سحر حلال اس بات میں
جو منج قلم کا اژدہا بسرائے سحر سامری

پن کیا کروں اے شاہ میں کتی بات سے بے ساماں ہوں
اوّل تو گھر ایسا نہیں جہاں ٹھار ہوئے راحت بھری

سونے منگے تو گھر میں تک ناتن میں لہو ہے یک چھٹک
ہو جو کہ لگتا ہے مکن کرتا ہے ہو پیو نشتری

اس سال تو لوٹا کا ستم سامان گھر کا لے گیا
ابر یا ہے یک نہالی لحاف یعنی کنگن ہور دھوتری

فرماں سوں عالی حکم کے بخش منج ایسا گھر دلا
جو صاف تر منج طبع تے ہوئے جاں صفائے بہتری

نصرتی کا عہد دکنی ادب کا بالکل ابتدائی عہد تو نہیں ہے بلکہ اس کے زمانے میں یہ زبان ارتقا کی کئی منزلوں سے گزر کر ادب کے بعض اچھے نمونے بھی پیش کرچکی تھی لیکن اس دور کو زبان کے اعتبار سے بہت زیادہ شاندار عہد بھی نہیں کہا جاسکتا۔ نصرتی کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ نظر رکھنی ہوتی ہے کہ اس پر فارسی اثرات خاصے نمایاں نظر آتے ہیں؛ اور یوں بھی قصیدہ اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی جولانگاہ ہوتا ہے؛ اس لیے نصرتی کے قصائد کی زبان میں مشکل پسندی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے معاصرین بھی اس کی دقت پسندی کے شاکی تھے لیکن وہ اس کو خوبی سمجھتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ قصیدے کی جزالت و متانت کو برقرار رکھنے کے لیے پُرشکوہ اور جزیل الفاظ کے استعمال کے بغیر چارہ بھی نہیں اور جب شاعر مختلف قسم

جذبات و کیفیات اور حالات و واقعات کا بیان قلم بند کرتا ہے تو بعض مواقع پر نامانوس اور مشکل الفاظ کا در آنا خلاف توقع نہیں ہوتا اور نصرتی تو میدان کارزار کا شریک کار اور سلطان کا خاص معتمد تھا۔ اس کے معاشرتی اور علمی حالات کے سبب اگر اس کے قصائد میں کچھ ادق الفاظ داخل ہو گئے تو شاید یہ کوئی بہت بڑا عیب نہیں ہے۔

نہ کوئی صبحِ فراق اور نہ کوئی شامِ وصال
چمک کے بجھ گئے آخر سبھی طرح کے خیال

مرے شجر پہ نہ اُترا کوئی حسین طائر
بدل گئے کئی موسم گزر گئے کئی سال

بس ایک جنبشِ لب داستاں سے آگے
بس اک نگاہ نے پیدا کیے بہت سے سوال

ترے سفر پہ روانہ کبھی ہوا تھا میں
یہ دیکھ سر میں ابھی تک جمی ہے گردِ ملال

ترے وصال کی خوشبو تلک تھیں سب باتیں
سو دل میں اب نہیں آتا بغاوتوں کا خیال

مرے آئینے میں نہ دیکھیے کسی ایسے ویسے ملال کو
میں غبار کرکے اڑا چکا کئی قیمتی مہ و سال کو

مری رات میں ہے جو روشنی اسی اسم کا یہ طلسم ہے
اسی واسطے تو بجھا دیا ہے ہر اک چراغِ وصال کو

مجھے نجدِ خواب میں چھوڑ کر کوئی شخص کب کا بچھڑ گیا
مری وحشتوں کی خبر اگر ہے تو صرف اس کے غزال کو

میں دکھوں کی شمعیں جلاؤں گا مگر اس طرح کہ دھواں نہ ہو
میں سوال میں نہ اٹھاؤں گا کبھی اپنے دستِ کمال کو

جنھیں منظروں میں کسی کمی کا گلہ ہے ربِّ کریم سے
سو انھوں نے دیکھا نہیں ابھی ترے روپ کو تری چال کو

اسعد بدایونی

شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دلیپ بادل

جب نظر میں ایک اندازِ طلب ہوتا ہے دوست
شوق پھر حد سے زیادہ بے ادب ہوتا ہے دوست

نام گھٹنے کا نہیں لیتی ذرا بھی تیرگی
جانے کیوں برہم نظامِ روز و شب ہوتا ہے دوست

جب بھی ملتا ہے تری چشمِ کرم کا آسرا
پھر کشادہ اور دامانِ طلب ہوتا ہے دوست

جانتا ہوں چارہ گر کے پاس ہے میری دوا
دردِ دل منت کشِ درماں ہی کب ہوتا ہے دوست

شاعری میں ندرتِ فکر و نظر بادلؔ کہاں
ان دنوں ذہنی تعیش ہی ادب ہوتا ہے دوست

۱۵۰/اے/پی، پشپ وہار، نئی دہلی ۱۷

سلام بن رزّاق

مراٹھی کا کتھا سمراٹ

۱۲ر اپریل ۱۹۲۰ء کی صبح ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا نوجوان جس کی ابھی مَسیں ٹھیک سے نہیں بھیگی تھیں ساونت واڑی سے شِروڈ کی طرف جانے والی کچّی سڑک پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا ـــــ بدن پر لمبا سا کوٹ، گلے میں شال، گھٹنوں تک ـــــ جھولتی سفید دھوتی جو راستے کی سُرخ مٹّی سے اٹ کر کیسری ہو چکی تھی، آنکھوں پر موٹا سا چشمہ ایک ہاتھ میں چھتری، دوسرے ہاتھ میں جھولا جس میں چار عدد کپڑوں کے ساتھ "کیشوسُت" کی نظموں کا مجموعہ ٹھنسا ہوا۔ جب وہ شروڈ گاؤں کی سرحد پر پہنچا تو مشرق کی پہاڑی سے سورج کسی نٹ کھٹ بالک کی طرح جھانک رہا تھا۔ سورج پر نظر پڑتے ہی نوجوان ٹھٹک گیا۔ جیسے کسی نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا ہو۔ وہ سورج کی طرف مُنہ کر کے چند دعائیہ الفاظ بُدبُدانے لگا۔

"اے سورج دیوتا! میرے شعور کو روشنی عطا کر، میں اب تک ظلمت میں بھٹک رہا تھا مجھے روشنی کی راہ دکھا۔ تیرے نور کے سمندر سے مجھے ایک قطرہ بھی عطا ہو تو میری قسمت چمک جائے۔"

اس نوجوان کا نام وشنو سکھارام کھانڈیکر تھا جو آنے والی نصف صدی میں وی۔ ایس۔ کھانڈیکر کے نام سے مراٹھی ادب پر حکمرانی کرنے والا تھا۔

شروڈ، ساونت واڑی سے پندرہ میل کے فاصلے پر کوکن کا ایک معمولی قصبہ ہے۔ بھاؤ صاحب کھانڈیکر آج سے ۶۵ برس پہلے وہاں ایک معمولی اسکول ٹیچر کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ان کے والد آتمارام پنت سانگلی میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹ر جنوری ۱۸۹۸ء کو ان کا جنم ہوا۔ کھانڈیکر کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم سانگلی ہی میں مکمل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد گھریلو حالت دن بدن سقیم ہوتی گئی۔ ۱۹۱۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کھانڈیکر نے فرگوسن کالج پونا میں داخلہ لیا۔ تعلیم جاری تھی کہ ۱۹۱۶ء میں انھیں اُن کے ماموں نے ساونت واڑی بلا لیا۔ اور انھیں اپنا متبنّیٰ بنا لیا۔

"ایک لیکھک آنی ایک کھیڑے" میں کھانڈیکر کہتے ہیں ... "میں نے سوچا تھا کہ لے پالک ہو جاؤں گا تو تعلیم حاصل کرنے میں مالی پریشانی سے نجات ملے گی۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اس بیچ مجھے ملیریا ہو گیا اور میری صحت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ اپنی خرابیِ صحت اور روپیوں کی تنگی سے پریشان ہو کر میں ۱۹۱۷ء کے شروع میں ساونت واڑی اپنے ماموں کے پاس آگیا اور میری تعلیم نامکمّل رہ گئی۔" اگر نوجوان کھانڈیکر چاہتے تو اس زمانے میں انھیں کسی بھی بڑے شہر میں معقول آمدنی والی ملازمت مل سکتی تھی۔ ایک دو جگہوں سے انھیں بلاوا بھی آیا۔ مگر ان کا رجحان ابتدا ہی سے درس و تدریس کی طرف تھا۔ اس لیے جب شروڈ جیسے پس ماندہ گاؤں میں مدرس کی جگہ خالی ہوئی تو انھوں نے فوراً عریضہ دے دیا اور جلد ہی انھیں وہاں ملازمت مل گئی۔

اُن کا خیال تھا کہ مدرس ہی ایک ایسی ہستی ہے جو اس دُنیا کو نجات کا راستہ دکھا سکتی ہے۔

شروڈ میں وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء تک یعنی پورے پندرہ سال مدرسی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑے ادب کے لیے بڑے شہر کی فضا زیادہ سازگار ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بڑے شہروں کی ہنگامہ آرائیاں، مختلف تحریکوں کا شور و غل، جلسہ جلوس، ہوٹل، کلب، ناٹک گھر، پارٹیاں، آرٹ گیلریاں، نشستیں یہ سب ادیب کو رنگا رنگ تجربات سے روشناس کراتے ہیں۔ لیکن جس کے پاس دیدۂ بینا ہو وہ قطرے میں بھی دجلہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کامو نے ایک جگہ اپنے ایک کردار سے کہلوایا تھا کہ "اگر میری زندگی کا ایک دن بھی باہر گزر جائے تو میں اس ایک دن کی یادوں کے سہارے پوری عمر قیدِ تنہائی گزار سکتا ہوں۔"

۹/۱ "ایل آئی جی" وی۔ بھاوے نگر، کرلا ویسٹ، بمبئی ۷۰۰۰..

شروڈ ایک چھوٹا سا قصبہ ضرور تھا مگر یہی چھوٹا سا قصبہ اپنے دامن میں ایک کائنات لیے ہوئے تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں شروڈ میں ایک مدرس کی حیثیت سے داخل ہوا تو مارکس کے نام سے واقف تک نہیں تھا۔ میرے لیے شروڈ کا ایک ایک دن ایک ایسی کتاب کا ورق تھا جسے ابھی تک کسی نے نہیں پڑھا تھا۔ زندگی کے تلخ و تند حقائق کا تجربہ مجھے پہلی دفعہ شروڈ جیسے قصبے ہی میں ہوا۔ یہیں سب سے پہلے میں نے ایسی محنت کش عورت دیکھی جس کے پاس ستر پوشی کے لیے مناسب کپڑا تک نہیں تھا۔"

"سروں پر مچھلیوں سے بھری ٹوکریاں اٹھائے پندرہ پندرہ میل پیدل چلنے والی مچھیرنیں، بھیانک کالی راتوں میں اچھلتے سمندر میں مچھلیوں کا شکار کرنے والے مچھیرے، ناریل اور تاڑ کے لچکتے جھومتے درختوں پر گلہری کی سی تیزی سے چڑھنے والے چڑھوئیے۔ آگ برساتی دھوپ میں نمک گھروں میں نمک اکٹھا کرتے ہوئے مزدور، موسلا دھار بارش میں سروں پر ارلاڈ لے کیچڑ بھرے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر ان کے گٹھر سروں پر لیے میلوں چل کر بازار میں آنے والے اور انھیں چار چار آنے میں بیچنے والے غریب لکڑہارے، غرض زندگی سے جوجھنے اور اس سے لوہا لینے والے محنت کش طبقے کا مشاہدہ کرنے کا موقع مجھے سب سے پہلے شروڈ ہی میں ہوا ــــ ان جفا پرور مناظر کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں بار بار سوالات اٹھتے تھے کہ آخر سماج میں انسان اور انسان کے بیچ یہ خلیج کیوں حائل ہے۔ انسان ان دکھوں سے کب نجات حاصل کرے گا ۰۰۰ ؟ ایک ہی سماج کے یہ کیسے عجیب روپ ہیں۔ ایک طبقے کے عیش کا انحصار دوسرے طبقے کی محنت پر کیوں ہے ؟ یہ دو الگ الگ دُنیائیں کیسی ہیں جن میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہے۔"

بعد میں انھوں نے اپنے کئی ناولوں جیسے دون دُھرو، ہرواچافا اور اُنکا میں اسی طبقاتی کش مکش کی عکاسی کی ہے۔ ان کا ناول دون دُھرو تو اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں انھوں نے امیری اور غریبی کو ایک ہی دُنیا کے دو الگ الگ سرے بتائے ہیں۔ جس میں ہزاروں برس سے کروڑوں انسان پستے اور کچلتے آئے ہیں۔

کھانڈیکر کے شروڈ میں قیام کے بارے میں جے ونت دلوی لکھتے ہیں:

"شروڈ میں بھاؤ صاحب (کھانڈیکر) کے دو دوست تھے۔ ایک بھکا پہاڑ اور دوسرا بحرِ عرب۔ وہ سمندر کے کنارے گھنٹوں چہل قدمی کرتے اور تھک جاتے تو پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر جانے کن خیالات میں غرق ہو جاتے۔ اس پہاڑ کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں سے حدِ نظر تک سرسبز کھیتوں اور تاڑ کے بلند درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر جس میں غروبِ آفتاب کا منظر بڑا ہی دل پذیر ہوتا ہے۔"

جنوری ۱۹۲۹ء میں سکھا رام پنت کی کنیا منو سے ان کی شادی ہوئی۔ ان کی بیوی جن کا سسرالی نام اوشا تھا، زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں۔ مگر انھوں نے بھاؤ صاحب کو گرہستی کا وہ سارا سکھ دیا جس کی کسی عورت سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنی دھرم پتنی کے بارے میں خود کھانڈیکر لکھتے ہیں:

"میری بیوی زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں تھی مگر وہ ایک سگھڑ گرہستن ضرور تھی۔ اُس زمانے میں میری تنخواہ چالیس پینتالیس روپے ضرور رہی ہوگی۔ گرانٹ حاصل کرنے کے لیے میں ایک سو پچیس روپیوں پر دستخط کرتا تھا تنخواہ میں سے کچھ پیسے ضرورت مند طلبا کی امداد پر اٹھ جاتے تھے باقی پیسوں میں وہ اس طرح ناپ تول کر گھر چلاتی تھی کہ مجھے کبھی گھر کے اخراجات کو لے کر فکر مند نہیں ہونا پڑتا تھا۔"

ان کی کویتائیں اور مضامین تو شروڈ آنے سے پہلے ہی رسالوں میں چھپنے لگ گئے تھے۔ ان کا پہلا مضمون اگست ۱۹۱۹ء میں نویگ نامی ایک رسالے میں چھپا تھا۔ اسی شمارے میں "کمار" تخلص کے ساتھ ان کی ایک نظم بھی شائع ہوئی تھی مگر ان کی پہلی کہانی شروڈ آنے کے بعد اگست ۱۹۲۳ء میں "مہاراشٹر ساہتیہ" میں شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "گھر کنا چے ؟" اس زمانے میں انھوں نے کچھ ناٹک بھی لکھے۔

شروڈ میں پندرہ برس تک مدرسی کی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۳۵ء میں وہ کولہاپور چلے آئے اور فلمی دُنیا سے منسلک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے نویگ پکچرس، پرفل پکچرس اور ہنس پکچرس جیسی مختلف کمپنیوں کے لیے فلمی کہانیاں لکھیں۔

انھوں نے اٹھارہ فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں، جن میں ایک تامل اور تین ہندی فلمیں بھی ہیں۔ فلم انڈسٹری سے منسلک ہو جانے کے بعد ہمارے بیشتر فلمی رائٹرس کی طرح انھوں نے ادب سے منہ نہیں موڑ لیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے بے شمار مختصر افسانے لکھے جو مراٹھی کے معیاری جرائد میں شائع ہوئے اور بے حد

مقبول ہوئے کئی افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اس زمانے میں افسانوی دُنیا میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بعض نقادوں نے انھیں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء کی دہائی کا افسانوی ادب کا سمراٹ کہا۔

۱۹۴۱ء میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی... کھانڈیکر اور ان کے ہم عصروں نے جن سماج قدروں کی آبیاری کی تھی وہ ساری قدریں جنگ کی آگ میں جل کر بھسم ہوگئیں۔ کالا بازاری کا راکشش جس سے اس زمانے کے لوگ قطعی ناواقف تھے انسانوں کا لہو چوسنے لگا۔ لوگ گرانی کے بوجھ سے دبتے چلے گئے۔ سماجی اخلاقیات کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ اچھے اور بُرے کی تمیز اٹھ گئی۔ لوگ ہر وہ کام کرنے پر آمادہ نظر آنے لگے جس سے روپیہ بٹورا جاسکتا تھا۔ پُرانی قدروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ نئی قدروں کے نقوش ابھی واضح نہیں ہوئے تھے۔ لوگ مردوں کے کفن تک بیچ کھانے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے آشوبی دور میں انسانیت اور اس کی عظمت پر اعتقاد رکھنے والے کھانڈیکر کی عقل چکرا گئی۔ انھیں محسوس ہونے لگا ان کا قلم مذکورہ مسائل کی تندی و تیزی کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ اس لیے ۱۹۴۱ء کے بعد پانچ چھ برس تک وہ بالکل خاموش نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں "تین جگّے" کہانی لکھ کر انھوں نے اپنی طویل خاموشی توڑی۔ اس کہانی میں انھوں نے اس عہد کی بھیانک اقتصادی نابرابری اور سماجی انقلاب کے اپنے سیدھے سادے تصوّر کی شکستگی کا عکس پیش کیا ہے۔ انھوں نے سماجی خدمت کا ڈھونگ رچانے والے مکّار سیٹھوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے اور واضح طور پر بتایا ہے کہ کس طرح آج کا سماج تین دُنیاؤں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ پہلی دُنیا سرمایہ داروں کی، دوسری دُنیا غریبوں کی اور تیسری دُنیا ان دونوں کے درمیان ڈولتی متوسط طبقے کی دُنیا۔

ان کی بہت سی تمثیلی کہانیاں بھی اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ انھیں دنوں مرگ جلاتل کلیاں 'کلکا' 'بن دیوتا' سونیری ساولیا کے ناموں سے ان کی تمثیلی کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ انھوں نے لگ بھگ ڈیڑھ سو تمثیلی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں دون میگھ 'چکوچانگ' سندر چترے' 'موتیا چے پیک' 'پرلیس سدھار' کافی مشہور ہیں۔

تمثیل کے پردے میں انھوں نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں پر خوب نشتر زنی کی ہے۔ مراٹھی ادب میں تمثیلی کہانیوں کو انھوں نے معراج پر پہنچا دیا۔ یوں بھی ان کے بعد کسی نے اس میں قلم آزمائی نہیں کی۔ کھانڈیکر نے کچھ مزاحیہ کہانیاں بھی لکھیں مگر پڑھنے سے صاف لگتا ہے کہ مزاح ان کا میدان نہیں ہے۔

غالباً "تین جگّے" آزادی کے بعد ان کی پہلی کہانی تھی تین جگّے کے بعد انھوں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں کوئی نیا موڑ یا نئی جگہوں کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔ ایسا لگتا ہے آزادی کے بعد کے بھارت کے عوام کے سامنے جو نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے انھیں سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی ان میں تاب باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ آزادی کے بعد اپنی کہانیوں میں اپنے آپ کو محض دُہراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ادب میں ان کا نظریہ صاف ہے۔ وہ زندگی میں ان صحت مند قدروں کے پجاری ہیں جو انسان کو انسانیت کے مرتبے پر فائز کر ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"ادب صرف تخیل آرائی یا محض ذاتی احساسات سے تخلیق پذیر نہیں ہوتا۔ احساس کا بیج شعور کی زمین سے سر ابھارتا ہے اور اپنے اردگرد کے خارجی اثرات قبول کر کے بیج سے پود بنتا ہے۔ ہماری تخلیق پر پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب سایہ فگن ہوتی ہے نسل در نسل ہنسا رُلاتا اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہمارا ادبی ورثہ اسے نکھارتا ہے۔ یہی ادب عام آدمی کے لیے باعثِ کشش ہوتا ہے۔"

وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کو تنقید کا نشانہ ہی نہیں بناتے بلکہ اسے ایک صحت مند نظریہ بھی دینا چاہتے تھے۔ ان کے افسانوں کی بہ نسبت ان کے ناولوں میں ان کا نظریہ زیادہ نکھر اور سنور کر آیا ہے۔ انھوں نے گاندھی ازم، سوشلزم، کمیونزم وغیرہ کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ مختلف مکتبِ خیال کے ادیبوں کی تحریروں کو پڑھا۔ انھوں نے اپنے ناو میں عقلیت پرستوں کے خلاف بار بار احتجاج ک ہے کہ انسان عقل کا شکار ہو کر جذبات سے عا ہوتا جارہا ہے۔ یعنی وہ بھی اقبال کی طرح عقل کی اہمیت اور اس کی پاسبانی کو تسلیم کرتے مگر کبھی کبھی دل کو تنہا چھوڑ دینے کے حامی تھے۔

انھوں نے اپنے بیشتر ناولوں میں عور کی غلامی، ہریجنوں پر ہونے والے مظالم، مزدوروں کا استحصال، کسان اور زمین دا کی آویزش، ٹوٹتی بدلتی قدریں، نیز متوسط طبقے

کی ذہنی گھٹن جیسے مسائل پر بڑی چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ وہ قاری کے سامنے محض کوئی سچویشن پیش نہیں کرتے بلکہ اُسے سچویشن کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا موقع بھی دیتے ہیں۔ انھوں نے کل پندرہ ناول لکھے ہیں۔ دون دُھرو' اُلکا' کانچن مرگ' کرونچ ودھ' پانڈھرے ڈھگ' سکھاچا سودھ' ییاتی' امرت ویل اور اشرو' ان کے نمائندہ ناول ہیں۔ ان ناولوں میں انھوں نے ایک عام آدمی کے دکھ درد' اس کی باطنی کش مکش' اس کی سوچ اور اس کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

انھوں نے پہلا ناول "ہردیاچی ہانک" ۱۹۳۰ء میں لکھا اور آخری ناول "امرت ویل" ۱۹۶۷ء میں۔ "پانڈھرے ڈھگ" ان کا پسندیدہ ناول ہے اور کرونچ ودھ ان کا سب سے مقبول اور اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔ جس میں انھوں نے انقلاب کے روایتی تصوّر سے انحراف کرتے ہوئے بتایا کہ جب تک زندگی کے ہر شعبے میں تغیر نہیں آتا اس وقت تک صحیح انقلاب کا تصوّر فضول ہے۔

ان کے ناول "ییاتی" کو پہلے ساہتیہ اکیڈمی انعام اور بعد میں ۱۹۷۵ء کا گیان پیٹھ انعام مل چکا ہے۔ "ییاتی" میں انھوں نے موجودہ انسانوں کے چہروں پر مہابھارت کے پورانک کرداروں کے مکھوٹے لگا کر عصری مسائل پر نہایت خوبی سے بحث کی۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی کے فیلو رہے۔ نیز بھارت سرکار نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ اعزازات اُن کے ادبی قد میں کوئی اضافہ کرتے ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارے اعزاز اور انعامات ان کی عظمت کا اعتراف محض ہیں۔

بعض نقادوں کا اعتراض ہے کہ ان کی تحریروں میں بے محابا وسعت کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر فکر کی وہ گہرائی مفقود ہے جو کسی بھی ادب کا خاصہ ہوتی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ انھوں نے ادبی سفر میں جتنی طویل مسافت طے کی ہے۔ مراٹھی ادب کے کتنے شہسوار ان کا ساتھ دے سکے ہیں۔ اس سفر میں ممکن ہے انھوں نے بہت کچھ گنوایا ہو مگر وہ جو کچھ بچا کر لا سکے اتنا بھی کتنوں کے پاس ہے ۲/۹، ستمبر ۱۹۷۶ء کو میرج (مہاراشٹر) میں مراٹھی کے اس عظیم کہانی کار نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ مگر اُن کی کہانیاں آج بھی آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نظمیں

صابر فخرالدّین

(۱)

پرندے
پھر نہیں آئے
نہ جانے
اب
خلاؤں کی
وہ کس وادی میں
رہتے ہیں

(۲)

میں نے
کب چاہا تھا
پیدائش ہو میری
لیکن
اب یہ
چاہ رہا ہوں
موت نہ آئے
مر نہ سکوں میں!!

(۳)

دن ہے روشن ہمارا
راتیں بھی
خوب روشن ہیں
اُجلے دن کی طرح
کیوں کر
دل خود ہمارے
روشن ہیں!!

(۴)

کچھ دن پہلے
اُس نے کہا تھا
دُنیا
پاگل خانہ ہے
اور اُس میں سب پاگل ہیں
لیکن
اب وہ
خود ہاتھوں میں
سنگ اُٹھائے پھرتا ہے!!

(۵)

بے ربط
سلسلوں کے
سمٹتے سے
دائرے
جب پھیلنے لگے تو
کئی سلسلے بنے!!

نزد بلڈنگ ۱ روبرو پولیس کوارٹرز بن روڈ یادگیر (کرناٹک)

اُونچے پہاڑوں سے اُوپر

معصوم نظر

کوئی اُڑنے والے پرندے سے پوچھے
ترا گھر کہاں ہے؟
تری ذات کیا ہے؟
تو رہتا کہاں ہے؟
تو اُونچے پہاڑوں سے اُوپر یونہی گھومتا ہے
تجھے کچھ پتہ ہے
یہ گہرا سمندر
یہ ہلچل بھری سرزمیں کا سرا
پرسکوں وادیوں سے گھرا
اِن درختوں کا اک سلسلہ بھی یہی پوچھتا ہے
ترا گھر کہاں ہے؟
تری ذات کیا ہے؟
تو رہتا کہاں ہے؟
مگر اُڑنے والا پرندہ نہ کچھ بولتا ہے
وہ اُونچے پہاڑوں سے اُوپر یونہی گھومتا ہے
جہاں دور تک بھی
کوئی ذات ہے
نہ کوئی رہ گزر ہے
نہ شہر و مکاں ہے
فقط
آسماں ہے

شاہد منزل، لال پورہ، ڈونگر پور ۳۱۴۰۰۱ (راجستھان)

اطہر فاروقی

سیاہ روغنی تصویر

"معاف کیجیے گا کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اس بلاک میں ماڈرن آرٹ گیلری کہاں واقع ہے۔۔؟" آشی نے اپنے آگے جا رہی لڑکی کو مخاطب کیا جو اسے پہلی ہی نظر میں کسی مصوّر کا ایسا شاہ کار نظر آئی تھی جس کے بنانے میں اس نے آدھی عمر لگا دی ہو اور آدھی عمر اس کا جائزہ لینے میں ۔۔۔!!!

آشی نے یہ سوال اس لڑکی سے کیا ہی اس لیے تھا کہ تخاطب کا جواز پیدا ہو سکے۔ ورنہ تو وہ ایک روز پہلے ہی کناٹ پلیس آیا تھا اور دِلّی کی سوتی جاگتی زندگی دیکھ گیا تھا۔

اوّل تو سوال ہی بہت عجلت میں کیا گیا تھا دوسرے اس لڑکی نے جب خلافِ توقع اپنی نرگسی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا تو وہ مزید ہڑبڑا گیا۔

"آپ میرے ساتھ تشریف لائیے، میں بھی اتّفاق سے وہیں جا رہی ہوں۔"

سوال کرنے سے قبل آشی نے تصویر کا بیک پورشن (BACK PORTION) ہی دیکھا تھا مگر جب وہ اس سے مخاطب ہوئی تو اسے لگا کہ وہ تو اس کے سامنے اسی طرح ایک عمر تک کھڑا رہ سکتا ہے اور اگر اس کی تصویر بنانے کا ارادہ کرے تو شاید عمر بھر برش ہی رنگ سے نہ اُٹھا سکے گا۔

لڑکی اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے انتہائی بے نیازی سے چل رہی تھی مگر آشی کو اپنا ذہنی ہی نہیں جسمانی توازن بھی برقرار رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ خدا خدا کرکے بمشکل پچاس گز کا یہ فاصلہ طے ہوا اور وہ ماڈرن آرٹ گیلری پہنچ گئے۔

آشی کا شمار ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے مصوّروں میں ہوتا تھا اس کا کلکتے سے دہلی آنے کا مقصد بھی یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر اپنی تصاویر کی ایک نمائش کا اہتمام کرنا تھا۔ آشی خدا کی ایسی مخلوق تھا جس کی تخلیق کا بیش تر کام اس کے خالق نے بہت فرصت سے کیا تھا مگر اختتام بہت عجلت میں۔ قدرت کی مصوّری کا یہ شاہ کار اپنے سینے میں باغی شاعر کا دل رکھتا تھا اور مزاج میں مصوّر کی آوارگی ۔۔۔!

بہت مختصر عرصے میں اس کی شہرت کلکتے کے لسانی پسِ منظر پر ایک چھوٹا نقطہ بن کر رہ گئی، اور بین الاقوامی پسِ منظر پر بنائی ہوئی تصاویر علاقائی عینک کے دائروں میں اپنی افادیت کھونے لگیں۔ گرد پھیلنے کی یہ رفتار جب زیادہ تیز ہوئی تو آشی نے دہلی کا رُخ کیا۔ تمنّاؤں کے ہجوم میں گھرا آشی دہلی کی معروف آرٹ گیلریز کا جائزہ لینے نکل پڑا مگر بدقسمتی سے دہلی میں اس کے قیام کا پہلا دن اتوار تھا۔ دہلی اُونگھ رہی تھی اور بند شٹرز (SHUTTERS) نے مخصوص دہلوی انداز میں اس کا استقبال کیا۔ وہ سارا دن بے وجہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور اگلے روز جب دن چڑھے آنکھ کھلی تو کلکتے کے لسانی تعصّب کی طرح سورج اس کے سر پر سوار تھا۔

ماڈرن آرٹ گیلری کا مالک کھنہ آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی خالص مارواڑی فطرت کا آدمی تھا۔ بات بات میں غصّے سے بے قابو ہو جاتا۔ اس کے بارے میں یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ایک پوسٹر بنانے والے پینٹر کو قدرت نے پیسے کے بوتے پر آرٹ گیلری کھولنے کے مواقع فراہم کر دیے تھے۔ آشی سے ملتے وقت اس کے چہرے پر ابھرتے ڈوبتے تاثرات بمبئی کی لوکل ٹرین کی رفتار کی طرح رنگ تبدیل کرتے رہے۔

ابتدا میں اس نے آشی کو تصویروں کا شوقین بے وقوف امیرزادہ سمجھا مگر جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کا مخاطب کلکتے کا مشہور مصوّر آشیش رائے ہے تو اس کے چہرے سے تمام خوشگوار تاثرات یوں محو ہو گئے جیسے کسی رنگین ٹیلی ویژن کے اسکرین پر ابھر رہی تصویریں سیٹ کے اندر کی راڈز کے پُھنک جانے پر اپنی شکل تبدیل کر لیں۔

۲۷۱، رسالہ دامان، سکندرآباد ۲۰۳۲۰۵ (یو۔پی)

سارا دن خاک چھاننے کے بعد آشی
بری طرح تھک گیا اب وہ جلد سے جلد اپنے
ہوٹل پہنچ جانا چاہتا تھا مگر دلی میں اچھے
لوگوں کی طرح ضرورت کے وقت رکشہ کا ملنا
بھی دشوار ہوتا ہے۔ ابھی وہ رکشے کے انتظار
میں ہی تھا کہ کسی نے بہت آہستہ سے اس کی
پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اجنبی دیس میں پولیس
کے سوا کون شناسا ہو سکتا ہے، مگر جیسے ہی
پلٹ کر دیکھا تمام کوفت اور تھکن یک لخت
کافور ہو گئی —— کئی لمحے تک یقین ہی نہ آیا
—— !! وہی بالکل وہی —— صبح جس کا نام
بھی نہ پوچھ سکا تھا کھڑی مسکرا رہی تھی —— !!
قبل اس کے کہ آشی کچھ مزید سمجھتا یا سمجھنے کی
کوشش کرتا، اس نے پاس سے گزرتے رکشہ کو
ہاتھ کے اشارے سے روکا، انتہائی بے تکلفی سے
تذبذب میں مبتلا آشی کا ہاتھ پکڑ کر اسے رکشے
میں بٹھالیا اور رکشہ کچّا اور کثیف دھواں اپنے
پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

قدم سے ملے قدم ہفتوں ملتے رہے۔
لبوں کو جنبش نہ ہوئی۔ جذبوں کی زبان کبھی
بھی اپنے تشخص کے لیے جامد تعریف و توضیح کی
محتاج نہیں ہوتی۔ عمروں کے دائرے پھیل کر
سمٹ جاتے ہیں، روایتیں دھواں بن جاتی ہیں
ایسے میں کسی باقاعدگی کا تصور ہی محال ہوتا
ہے پھر اس کی کوئی تک بھی کہاں ہوتی ہے۔

دونوں نے پوری محنت کے ساتھ تصاویر
کی نمائش کا اہتمام کیا جو توقع سے کہیں زیادہ
کامیاب رہی اور آشی کی شہرت راتوں رات
کلکتے سے دلی ہوتی ہوئی یورپ کے بازاروں تک
پہنچ گئی۔ نمائش کے بعد آشی کا یہ احساس
ایک عجیب شدت اختیار کر گیا کہ اپنی زندگی کی
بہترین پینٹنگ وہ عجلت کے سبب اس
نمائش میں پیش نہ کر سکا۔ اس کی اس محرومی کا
بڑا سبب شابی تھی جو ہمیشہ ہی اپنی تصویر کے
نام پر مذاق اڑانے کے انداز میں ہنسنے اور
کھلکھلانے لگتی اور پھر آشی کی آغوش اس کی
ہنسی کی انتہا ہوتی۔ بات یہیں تک رہتی تو
شابی کو اعتراض نہ تھا بلکہ ایسے مواقع کا اسے
انتظار رہتا تھا اور جب بھی وہ نمائش کی
بات کرتی یہ موقع اسے بہ آسانی ہاتھ آجاتا۔
مگر اب آشی کی توجہ مصوری میں کم ہوتی جارہی
تھی اور اپنی شخصیت کی مرکزیت آشی کے
انحطاط کی قیمت پر شابی کو تسلیم نہ تھی۔ اس
کے خوابوں کا مرکز آشی کا اسٹوڈیو تھا جو اپنی
مثال آپ ہو لیکن آشی کی کم توجہی کے سبب
اس کام میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔
خدا خدا کر کے اسٹوڈیو شروع ہوا مگر جس
پہلی تصویر پر آشی نے کام کرنا شروع کیا وہ
شابی کی ہی تھی۔ وہ ہفتوں رنگوں کے انتخاب
میں الجھا رہا جب ہفتوں اسی طرح گزر گئے تو
خاموشی کا تہیہ کیے ہوئے شابی کے صبر کا پیمانہ
لبریز ہو گیا مگر اس کے لب کھولتے ہی ہفتوں
سے الجھا ہوا فنکار بے خودی کے حصاروں سے
نکل کر جذبات کے طوفان میں بہہ گیا اور یہ
طوفان جب گزر گیا تو پھر شابی کے لیے کئی
عمروں کے سرور کا سامان فراہم کر گیا اور باقی
زندگی اس نے اسی سرور کے طلسم میں خاموشی
سے گزارنے کا فیصلہ کیا مگر ایک زندگی تو اس
لذت کے لمس کو محسوس کرنے کے لیے اسے بہت
ناکافی معلوم ہوئی —— !

کئی ہفتے کی محنت کے بعد جب اس
شابی کی تصویر کی گراؤنڈ پینٹنگ بلیک (ACK
کی تو رنگ اپنا تشخص کھو بیٹھے اور صرف فنکا
وجود ہی ایک مرتبہ پھر رنگوں کی شناخت ٹھہ
کام کچھ اور آگے بڑھتا اس سے قبل ہی لند
سے بلاوا آگیا آشی کے لیے تو اکیلے جانے
تصور ہی نہ تھا مگر شابی کا خیال تھا کہ
اس کے پیچھے کئی ادھورے پڑے کام نبٹا
کہتے ہیں عورت جتنے کام اپنی مسکراہٹ
ہنسی کے ذریعے نکال لیتی ہے اتنی ہی پُرف
اور پُر اسرار اس کی گریہ وزاری ہوتی ہے
رو رو کر آنکھیں سُرخ کر کے اور کبھی اپنی مس
کے ذریعے اس نے آخر آشی کو اکیلے ہی یو
کے سفر پر روانہ کر دیا۔

لندن میں آشی کی پذیرائی اس کی تو
سے نہ صرف بہت زیادہ تھی بلکہ اس
اس نے اپنا اور شابی کا درخشاں مستقبل
مسکراتے ہوئے دیکھا تھا، مگر اس کے
اسے اپنے ذاتی لمحے بھی نذرِ دیگراں
پڑے مگر اسے یہ سودا کچھ مہنگا نہ لگا پھر
کو روزانہ خط لکھنے کی فرصت نکالنا کچھ
دشوار بھی نہ تھا، مگر آہستہ آہستہ شابی
خطوط کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ د
آیا جب اس کے خط آنے بالکل بند ہو گ
آشی نے فوراً ہندوستان واپسی کا فیص
وہ شابی کی خاموشی کا سبب سمجھنے سے قا
ایرپورٹ اُتر کر وہ سیدھا اسٹ
پہنچا مگر اسٹوڈیو بند ہو چکا تھا اور
ماڈرن آرٹ گیلری کی شاخ کا بورڈ آوی
تھا۔ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان وہ بھا

فلیٹ کی طرف دوڑا فلیٹ کے دروازے پر پہنچتے پہنچتے اس پر وحشت طاری ہو چکی تھی تسو طرح کے وسوسے دماغ و دل میں جگہ بنا رہے تھے اس نے بغیر کچھ بھی دیکھے دروازے کو دھکّا دیا اور جب اس کے اندر سے مقفّل ہونے کا اندازہ ہو گیا تو اس زور سے کال بیل پر ہاتھ رکھا کر سوئچ کا نچلا حصّہ زمین پر آرہا۔ اندر گھنٹی چیخی اور بھڑاک سے دروازہ کھلا سامنے ماڈرن آرٹ گیلری کا مالک کھنّہ اس غیر مہذب انداز میں گھنٹی بجانے والے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہی کچھ سمجھیں، پیچھے سے ایک بری طرح ٹوٹی پھوٹی لڑکی بے ترتیب بال بکھرائے ایک چھوٹے سے بچّے کو گود میں لیے ظاہر ہوئی۔ بچّے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی اس لڑکی کی زندگی عذاب بنا رکھی ہے کیوں کہ اس درمیان بھی وہ بچہ ماں کی گود سے چپکا روئے جا رہا تھا۔ آشی کو وہ لڑکی کچھ جانی پہچانی لگی جب ذرا حواس درست ہوئے اور غور سے دیکھا تو رہی سہی قوّت بھی سلب ہو گئی جس شابی کی تصویر کے گراؤنڈ پینٹ کے لیے وہ ہفتوں بعد بلیک کلر کا انتخاب کر پایا تھا وہ مجسم بلیک آئل پینٹنگ بن چکی تھی۔

آشی نے بغیر کچھ کہے اپنا سامان اٹھایا خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھا اور واپسی کے لیے آہستہ سے مڑ گیا۔

آج پھر اتوار تھا ــــــ

(ڈاکٹر) محمد فاروق اعظم

پوسٹ مارٹم

وقتِ مرگ کا تعین

قانونِ طب میڈیکل سائنس کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جس کی مدد سے بعض قانونی مسائل کا حل میڈیکل سائنس کے چند حقائق کی روشنی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ قانونی افادیت و ضرورت کے لحاظ سے یہ شعبہ میڈیکل سائنس کا ایک بہت ہی اہم اور کافی وسیع شعبہ ہے۔ اس کی مدد سے بہت سے الجھے ہوئے کیس بہ آسانی سلجھائے جاسکتے ہیں۔ خصوصاً قتل کی سازش یا حادثات کی تفصیل جاننے میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔ پوسٹ مارٹم اسی شعبے کی ایک معروف انگریزی اصطلاح ہے جو زبان زدِ خاص و عام ہے۔ پوسٹ مارٹم کی اردو اصطلاح "معائنۂ نعش" ہے۔ یعنی مردہ جسم کا معائنہ۔ پوسٹ مارٹم سے مرنے والے کے متعلق بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مرنے والے نے خودکشی کی ہے یا اسے کسی دوسرے شخص نے مارا ہے۔ یا پھر وہ طبعی موت مرا ہے۔ اگر اسے کسی دوسرے نے مارا ہے تو اسے مارنے کے لیے کونسا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مرنے والے کے وارث جسے مجرم ٹھہرا رہے ہیں وہ واقعی مجرم ہے یا نہیں؟ پوسٹ مارٹم سے مرنے کے صحیح وقت کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔

وقتِ مرگ کا تعین ہو جانے سے بہت سے مسائل کا حل بہ آسانی نکل آتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے پولیس کے ذریعے ایک مردہ ایک گھنی جھاڑی سے برآمد کیا جاتا ہے۔ ہر طرف شور مچ جاتا ہے۔ لوگ اسے پہچاننے کے لیے جوق در جوق آرہے ہیں۔ کسی نے اس مردے کو پہچان لیا۔ پہچاننے والا مردے کا بیٹا ہے۔ بیٹا کہتا ہے کہ اس کا باپ کل سے غائب تھا۔ وہ بالکل صحت مند تھا یعنی وہ طبعی موت نہیں مرسکتا تھا اس نے ایک آدمی پر شک کا اظہار کیا۔ پولیس وہاں کے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگی لیکن کچھ پتے نہیں پڑا۔ کسی نے بتایا کہ مشکوک آدمی کل شام ۵ بجے اس جھاڑی کے پاس اکیلے گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ پھر وہ وہاں سے غائب ہوگیا تھا۔

اب اس لاش کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ پوسٹ مارٹم سے پتہ چلتا ہے کہ کسی نے مرنے والے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ جان بچانے کے لیے دونوں میں کافی جدوجہد ہوئی۔ جس کے آثار مرنے والے کے جسم پر جابجا نمایاں ہیں۔ لیکن اس سے مارنے والے کا پتہ نہیں چلتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو گزشتہ روز شام پانچ بجے وہاں دیکھا گیا تھا۔ اب پوسٹ مارٹم کر کے وقتِ مرگ کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر معائنے سے پتہ چلے کہ مردہ گذشتہ روز شام پانچ بجے ہی مارا گیا ہے تو مذکورہ شخص پر کیا گیا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ اور اس طرح اس شخص کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔

لیکن وقتِ مرگ کا تعین کیسے کیا جاتا ہے؟

وقتِ مرگ کا تعین مردے کے جسم کا درجۂ حرارت دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور سائنسداں نیوٹن کے ایک اصول سے مدد لی جاسکتی ہے۔ نیوٹن نے کسی چیز کے طبعی طور پر ٹھنڈا ہونے سے متعلق ایک اصول دیا ہے جسے "ٹھنڈا ہونے کا کلیہ" (Law of Cooling) کہا جاتا ہے۔ اس کلیے کا لب لباب یہ ہے کہ "کسی چیز کے درجۂ حرارت میں واقع کمی اس میں لگے وقت کے بلاواسطہ متناسب ہوتی ہے"۔ (Falling in temperature of a body is directly proportionate to the time interval) تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ کسی بھی جسم کا درجۂ حرارت موسم سرما میں 1.5°F فی گھنٹہ اور موسم گرما میں 0.75°F فی گھنٹہ کی شرح سے گھٹتا جاتا ہے۔

کسی مردہ جسم کا درجۂ حرارت معلوم ہو جانے کے بعد مذکورہ تناسب سے حساب لگا کر وقتِ مرگ کا تعین کیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے موسم سرما کا زمانہ ہے اور ہمیں اس مردے کا درجۂ حرارت 81°F ملتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی کا اوسط درجۂ حرارت 98.5°F ہے۔ مرنے کے وقت اس کا درجۂ حرارت بھی کم و بیش 98.5°F ہوگا اور اب گھٹ کر

صدر بزم اہلِ قلم، بھاگلپور

81°F ہو گیا ہے۔ یعنی مرنے کے وقت سے لے کر اب تک 17.5°F کی کمی ہوئی ہے اور موسم سرما میں درجۂ حرارت کم ہونے کی شرح 1.5°F فی گھنٹہ ہے۔ اس شرح سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والا تقریباً ساڑھے گیارہ گھنٹے قبل مرا ہے۔ اسی طرح کسی کا بھی وقتِ مرگ اس کے جسم کا درجۂ حرارت دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے۔

یوں تو انسانی جسم کا درجۂ حرارت ہم کئی جگہوں میں تھرمامیٹر استعمال کر کے نوٹ کر لیتے ہیں لیکن سب سے اچھی جگہ جہاں بالکل صحیح درجۂ حرارت ملتا ہے وہ جائے براز (Anus) ہے۔ اس کے علاوہ مردہ جسم کا درجۂ حرارت اندام نہانی میں، کان کے اندرونی حصے میں اور جگر و مغز میں تھرما میٹر کا استعمال کر کے بھی معلوم کیا جاتا ہے۔

جائے براز میں درجۂ حرارت دیکھنے کے لیے ایک ۲۵ سینٹی میٹر لمبے تھرما میٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تھرما میٹر پر 32°F سے 122°F تک کے نشان لگے ہوتے ہیں۔ تھرما میٹر کا ۱۰-۸ سینٹی میٹر حصہ جائے براز میں داخل کر دیا جاتا ہے اور پھر دو منٹ بعد اسے نکال کر درجۂ حرارت نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

درجۂ حرارت نوٹ کر کے کسی کا وقتِ مرگ معلوم کرنے کا مذکورہ طریقہ عام کیسوں میں تو آسان ہے لیکن جسم کا درجۂ حرارت موت کے وقت اوسطاً 98.4°F ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کم یا بہت زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہیضہ اور کالرا سے ہونے والی موت میں درجۂ حرارت 90°F بھی ہو سکتا ہے اور ملیریا اور نمونیا سے واقع شدہ موت میں مرنے کے وقت درجۂ حرارت 110°F بھی ہو سکتا ہے۔

ایسی حالت میں اس بات کا پتہ لگانے کے لیے کہ موت کہیں ملیریا اور نمونیا یا کالرا اور ہیضہ سے تو واقع نہیں ہوئی ہے، مردہ جسم کے آپریشن سے مدد لی جاتی ہے۔ جس قسم کا انفکشن جسم میں پایا جاتا ہے اسی لحاظ سے مرنے کے وقت ممکنہ درجۂ حرارت مان کر نیوٹن کے کلیے کے مطابق وقتِ مرگ معلوم کیا جاتا ہے۔

وقتِ مرگ کا تعین مندرجۂ ذیل طریقے سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ مرنے کے بعد مردہ جسم اکڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ جسم کے اکڑنے کا یہ عمل (Rigor Mortis) بتدریج ہوتا ہے۔ اس عمل کا معائنہ کر کے وقتِ مرگ بتایا جاسکتا ہے۔ انسانی جسم میں ایکٹی نومایوسین (Actino-mysoin) کی تشکیل ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے مردہ جسم اکڑنے لگتا ہے۔ زندہ حالت میں ہمارے پٹھوں میں دو پروٹین ایکٹین اور مایوسین الگ الگ کام کرتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد یہ دونوں مل کر ایکٹینومایوسین کی تشکیل کرتے ہیں اور مردہ جسم اکڑ جاتا ہے۔ مرنے کے دو گھنٹے بعد آنکھ کے پپوٹے اور جبڑے اکڑتے ہیں تین گھنٹے بعد ہاتھ اور بازو اکڑ جاتے ہیں پانچ چھ گھنٹے بعد ٹانگیں بھی اکڑ جاتی ہیں اور انگلیاں اور انگوٹھے سکڑنے لگتے ہیں۔ آٹھ سے سولہ گھنٹے تک سارا جسم اکڑا رہتا ہے۔ لیکن سولہ سے چوبیس گھنٹے تک اس اکڑن میں اسی طرح کمی آنے لگتی ہے جس طرح اکڑنا شروع ہوا تھا۔ بالآخر ۲۴ گھنٹے بعد جسم پہلے جیسا ملائم ہو جاتا ہے۔

وقتِ مرگ کا تعین جسم کے سڑنے کے عمل (Putrifaction) کا معائنہ کر کے بھی کیا جاتا ہے۔ موسم گرما میں موت کے چھ سے آٹھ گھنٹے بعد اور موسم سرما میں بارہ سے سولہ گھنٹے بعد جسم سڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی پہلی علامت مردے کے پیٹ کی رنگت میں تبدیلی ہے یعنی پیٹ کا رنگ بدل کر سبزی مائل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس علامت کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اعضا کے رنگ میں تبدیلی آنے لگتی ہے جنھیں دیکھ کر وقتِ مرگ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ درج ذیل باتوں سے بھی وقتِ مرگ کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً مرنے کے ۲۴ گھنٹے بعد مردہ جسم کی رگیں (Veins) پھولنے لگتی ہیں اور بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس وقت خون کے لال ذرات (Red Blood Cells) ٹوٹنے لگتے ہیں اور ہموگلوبین آزاد ہو جاتا ہے۔ مرنے کے ۴۸ گھنٹے بعد جسم پر بڑے بڑے آبلے (Post-mortem blisters) نظر آنے لگتے ہیں۔ تین دن بعد یعنی موت کے ۷۲ گھنٹے بعد جسم کے بالوں کو بآسانی اکھاڑا جاسکتا ہے۔ چار دن بعد مردے کے ناخن اور پانچ دن بعد اس کے دانتوں کو بآسانی کھینچا جاسکتا ہے۔

تین دن سے پانچ دن کے درمیان مردہ جسم پر جا بجا مکھی کے لاروا (Larva) کی شکل کے دانے دیکھے جاسکتے ہیں ان دانوں کو ماگوٹ (Maggots) بھی کہتے ہیں۔ ماگوٹ کا معائنہ کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موت کو تین دن ہو چکے ہیں۔ اگر یہ ماگوٹ پیوپا (Pupa) کی شکل اختیار کر گیا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مردہ چار دن کا ہے۔ مرنے کے دس دن بعد پیٹ پھٹ جاتا ہے اور اس سے رطوبت کا بکثرت اخراج ہونے لگتا ہے۔

مندرجۂ بالا طریقوں سے وقتِ مرگ کا

تعیّن پہلے زیادہ ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے لیکن جدید سائنسی ایجادات و انکشافات نے اسے اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ اب مختلف اعضا اور ان سے خارج ہونے والی رطوبتوں کی کیمیائی جانچ کر کے زیادہ صحیح وقتِ مرگ معلوم کیا جا سکتا ہے خاص طور سے خون اور ہارمون کی جانچ اور مغز میں موجود مائع مادہ (Cerebrospinal Fluid) اور کانچ جیسی رطوبت (Vitreous humour) کی جانچ کر کے وقتِ مرگ کا حساب لگایا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد ہمارے جسم میں بتدریج تبدیلی ہونے لگتی ہے جس کا مطالعہ ہم پوسٹ مارٹم کے تحت کرتے ہیں اور اس طرح بہت سے قانونی مسائل کے حل میں مدد ملتی ہے۔

مولانا آزاد کے خطوط، دیگر تحریریں اور تصویریں

مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقعے پر اُردو اکادمی، دہلی نے تین کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ـــــ پہلی کتاب مولانا کی تصویروں پر مشتمل ہوگی، دوسری مولانا کے خطوط پر اور تیسری مولانا کی ان تحریروں پر جو اب تک کتابی شکل میں سامنے نہیں آئی ہیں۔

اس ارادے کو عملی شکل دینے کے لیے ہم آپ کی مدد کے محتاج ہیں۔ ابھی برصغیر ہند و پاک میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے جن کے پاس مولانا کے خطوط، دیگر تحریریں یا تصویریں موجود ہوں گی۔

اگر آپ کے پاس بھی مولانا کی کوئی تصویر، تحریر، یا خط موجود ہے تو براہِ کرم عاریتاً ہمیں عنایت فرما دیں۔ ہم اسے آپ کے حوالے سے شاملِ کتاب کریں گے اور استعمال کے بعد بہ حفاظت آپ کو واپس کر دیں گے۔

ہم یہ تینوں کتابیں اسی سال میں شائع کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے آپ سے فوری توجہ کی گزارش ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک تاریخی اہمیت کا کام ہوگا اور اس میں آپ کی شرکت ایک قومی فریضے کی ادائیگی کے مترادف ہے۔

ہم آپ کی عنایات کے منتظر رہیں گے۔ خط و کتابت درجِ ذیل پتے پر فرمائیں:

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی ـــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مرسلہ: اُمِّ عفت (حیدر آباد)

ہم طرح اشعار

پچھلے مہینے ہم طرح اشعار کے لیے مصرعہ دیا گیا تھا:

ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں

اس زمین میں فصاحت جنگ جلیل مانکپوری اور فراق گورکھپوری کے اشعار قارئین کی پسند پر زیادہ پورے اُترے اور بیشتر خواتین وحضرات نے انھی کے شعر ارسال کیے ہیں۔ موصول شدہ دیگر اشعار کا انتخاب بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے "گلدستہ" حاشیے میں درج اشعار بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

تلاش میر کی اب میکدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں (میر تقی میر)

مرسلہ: عبدالرشید نصیر آباد اور محمد نعیم الرحمٰن ناگپور

حساب پاک ہو روز شمار میں تو عجب
گناہ اتنے ہیں میرے کہ کچھ حساب نہیں (میر تقی میر)

مرسلہ: محمد علیم الرحمٰن' ناگپور

مرا خط اس نے پڑھا پڑھ کے نامہ بر سے کہا
یہی جواب ہے اس کا کہ کچھ جواب نہیں (امیر مینائی)

مرسلہ: شبنم جبیں (گیا) عارف انصاری نایاب (بھاگلپور) اور محفوظ الرحمٰن (ناگپور)۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں (جلیل مانکپوری)

مرسلہ: نزہت فاطمہ (لکھنؤ) نسرین بانو نسرین (بھاگلپور) شمیم احمد شمشاد (بھاگلپور) محمد خالد نہال احمد (میرٹھ) محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک) شاہ نواز خاں (سہسرام) علی شبیر اختر (بھاگلپور) اور اظہر اقبال (کٹک)۔

سنا تھا ہم نے کہ ٹھنڈک سے نیند آتی ہے
مگر یہ دیدۂ تر آشنائے خواب نہیں (جلیل مانکپوری)

مرسلہ: ابن غوری (نلگنڈا) فاطمہ صغرا عتیق (حیدرآباد)

بتوں سے پردہ اُٹھانے کی بحث ہے بیکار
کھلی دلیل ہے کعبہ بھی بے نقاب نہیں (جلیل مانکپوری)

مرسلہ: راغب مسعود، گیا

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں (اقبال)

مرسلہ: ابن یوسف (بھورنیر) انصار زبیر اعظمی (مالیگاؤں)۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں (اقبال)

مرسلہ: سید احسن اللہ کلامی (اورنگ آباد) اے۔ ریحان (مالیگاؤں)۔

نظر ملا کے کہا مجھ سے میرے ساقی نے
حرام کہتے ہیں جس کو یہ وہ شراب نہیں (صفیر بلگرامی)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا (صاحب گنج) روشن بنارسی (وارانسی) پرویز اختر پرویز (آسنسول) محمد یونس بن سلیمان (کوٹہ)۔

مرے سوال پہ کیوں سر جھکا لیا اے دوست
یہی کہ بات مری لائق جواب نہیں (شاد عظیم آبادی)

مرسلہ: رتن لعل گپتا (صاحب گنج)

وطن کا چھیڑ دیا کس نے تذکرہ اختر
کہ چشم شوق کو پھر آرزوئے خواب نہیں (اختر شیرانی)

مجھے یہ دعوتِ روزِ حساب کیوں یا رب
مرے گناہ تو شرمندۂ حساب نہیں (فانی بدایونی)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا' ۱۹ محمد حسینی فیروز آباد' آگرہ (یو۔پی)۔

ہر ایک جلوہ ہے اک جلوہ گاہِ حسن وجمال
نگاہِ شوق کو یارائے انتخاب نہیں (سیماب اکبرآبادی)

مرسلہ: ثمینہ پروین' معرفت محمد عبدالحلیم' قدوائی روڈ' مومن پورہ' ناگپور ۴۴۰۰۱۸۔

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں (فراق)

مرسلہ: یوسف خاں (آگرہ) محمد ممتاز (کلکتہ) محمد مرغوب الحق (کٹیہار) اصغر پروین (مرزا پور) ایم۔ علی (برہان پور) کماری رینا پانڈے (کاغذ نگر) فیروز کے نگری (بیڑ)۔

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں (فراق)

مرسلہ: ایم۔ شاکر حسین شاکر' "ویلکم" منظر ٹولہ' صاحب گنج (بہار)۔

اسی شعر کو ان لوگوں نے بھی بھیجا ہے: نورالدین حسین بھائی (بیڑ) ظہیر اکرام (ہزاری باغ) محمد شکیل الرحمٰن (بھاگلپور) کاشف عمر (صاحب گنج) محمد عبدالعلیم رضوی (اندور) ریاض الدین (دربھنگا) حیات احمد قاسمی (سمستی پور) محمد مہدی حسن (مدھوبنی) ایم۔ ایم حسن (مدھوبنی) ایم۔ انور حسین (بردوان) شاکر حسین (بدایوں) اعجاز پروین گڑیا (بھاگلپور) وِدّیا سکینہ (کانپور)۔

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں (فراق)

مرسلہ: نسرین خاں (بھاگلپور) محمد گوہر عالم منّو (بھاگلپور) محمد فیاض (کلکتہ) امتیاز احمد امتیاز (صاحب گنج) شازیہ اختر نازیہ (بھاگلپور) پروین نوشاد (جبارچک) عشرت بانو نسرین (بھاگلپور) محمد نہال اختر (نالندہ) افتخار حسین (بدایوں) محمد آدم گردش (صاحب گنج) ایم۔ صابر سرگم (صاحب گنج) محمد مقصود جالب (بلند شہر)۔

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں (فراق)

مرسلہ: محمد ریاض الدین (دربھنگہ) شارق رضا نسیمی (سستی پور) ایم۔ رضوان خاں (بھوپال) فخرالدین قربان حسین (بیڑ) ٹی۔ اے۔ خاں (مظفر پور) شکیل ناداں (صاحب گنج) نظر احسن کریمی (گیا) ربیعہ فرخندہ (نئی دہلی) بیگم امیرون چنا (صاحب گنج) کماری نیلم چودھری (صاحب گنج) محمد صباح الدین فیروز (بھاگلپور)۔

رکا ہے قافلۂ غم کب ایک منزل پر
کب انقلاب زمانے کا ہم رکاب نہیں (فراق)

مرسلہ: شگفتہ مظفر (صاحب گنج) شاہد رضا (گیا) افتخار علی انجم (صاحب گنج) صبا ناز (صاحب گنج) افروز عالم (مظفر پور) شکیل احمد (دربھنگہ)

حیات درد ہوئی جا رہی ہے کیا ہوگا؟
اب اس نظر کی دعائیں بھی مستجاب نہیں (فراق)

مرسلہ: محمد طارق (دربھنگہ)

جو تیرے درد سے محروم ہیں یہاں ان کو
غمِ جہاں بھی سُنا ہے کہ دستیاب نہیں (فراق)

مرسلہ: خورشید ظفر (دربھنگہ)

غم و نشاط ترے کس طرح کوئی جانے
ہنسی لبوں پہ نہیں آنکھ بھی پُر آب نہیں (فراق)

مرسلہ: محمد امتیاز (سستی پور)

شکست رنگ رخ روزگار دیکھ فراق
وہ مہر و ماہ کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

مرسلہ: محمد کلیم اللہ عاجز (دربھنگہ)

اٹھا دیے ہیں محبت نے جس قدر تھے حجاب
بس اب سوائے محبت کوئی حجاب نہیں (بسمل سعیدی)

مرسلہ: کماری شدئی (بھوپال)

غم حیات کا مفہوم پوچھنے والے!
یہ وہ سوال ہے، جس کا کوئی جواب نہیں (عبدالمجید عدم)

مرسلہ: محمد قیصر امام (بھاگلپور)

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں (مجاز لکھنوی)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن (بھاگل پور) نکہت پروین ماسٹر (مالیگاؤں)۔

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں (اسرارالحق مجاز)

مرسلہ: انصاری عتیق احمد ظہور احمد (مالیگاؤں)

بڑھی ہے حد سے زیادہ جو بیقراریِ دل
قمر یہ جذبۂ الفت ہے اضطراب نہیں (قمر انصاری)

مرسلہ: رفیع احمد اعظمی (بدایوں)

گناہ گار گنہ کر رہا ہے چھپ چھپ کر
بشر سے شرم ہے اللہ سے حجاب نہیں (نامعلوم)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن (بھاگلپور)

لگی ہوئی ہیں تمہاری طرف مری آنکھیں
مری نظر میں زمانے کا انقلاب نہیں (شنکر لال شنکر)

مرسلہ: وقار عثمانی (دھنباد)

مری نظر میں یہی حُسن کا ہے سرمایہ
کہاں کا حُسن اگر آنکھ میں حجاب نہیں (حباب ترمذی)

مرسلہ: ایم۔ عمر انصاری (بریلی)

لبوں پہ ان کے پشیماں سا اک تبسّم ہے
میرے سوال کا شاید کوئی جواب نہیں (رضا مظہری)

مرسلہ: شمشاد رضا (بردوان)

تمام عمر شب و روز جاگتے ہی کٹی
مرے نصیب میں کوئی حسین خواب نہیں (رضا مظہری)

مرسلہ: قمر جاوید (بردوان)

سوال یہ ہے کہ ہم اُن سے کیا سوال کریں
جواب یہ ہے کہ اِس کا کوئی جواب نہیں (شاداں)

مرسلہ: سرفراز نواز (سہسرام)

یہ بات امرِ مسلّم ہے آج بھی شاہد
بغیر سعی و عمل کوئی انقلاب نہیں (شاہد ایوبی)

مرسلہ: محمد ریاض اسلم ایوبی (سکندر آباد)

چمن میں ہنستے ہوئے پھول بارہا دیکھے
نظر فریب ہیں لیکن ترا جواب نہیں (نجمی ابن جاوید)

مرسلہ: انصاری شفیق احمد (مالیگاؤں)

تو اپنے ذہن پر اتنا نہ زور دے جگنو
یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں

شاعر اور ارسال کنندہ: زبیر جگنو (کٹک)

اگلے ماہ کے لیے اس زمین میں اپنی پسند کے شعر ارسال کریں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
　　　قافیہ　　ردیف

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

جولائی کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں ترین سمجھے جانے والے چند یہ ہیں:

شعری عنوانات

کہا دل نے کہ بڑھ کے اُس کو چھو لوں
ادا خود ہی اجازت کی طرح تھی (باقی)

مرسلہ: غلام احمد تمنا پوری، ایم. آر. کے. ای. بی. شوراپور، ۵۸۵۲۲۰۔

اُس نے مجھ کو میں نے اس کو پہن لیا
تم کو یہ پہناوا کیسا لگتا ہے (فیصل عجمی)

مرسلہ: مجاہد عبداللہ، بازار سوئی والان، دہلی

تب پائی فن کی تتلی
کتنا پیچھے دوڑا ہوں (نذیر فتحپوری)

مرسلہ: وکیل مسعود پرویز، نصیر آباد

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ (مجروح سلطانپوری)

مرسلہ: رحمٰن انور، موریہ سنٹر، پٹنہ ۱۔

فضا ہے دہکی ہوئی رقص میں ہے شعلۂ گل
جہاں وہ شوخ ہے اس انجمن کی آنچ نہ پوچھ (فراق گورکھپوری)

مرسلہ: فخر الدین قربان حسین، بیٹھر

رُوپ سنگیت نے دھارا ہے بدن کا یہ رچاؤ
تجھ پہ لہلوٹ ہے بے ساختہ پن کیا کہنا (فراق)

مرسلہ: علی اصغر فخر الدین، بیٹھر

بل کھائے ہوئے جسم پہ وہ ریشمی ململ
سینے کے تموج سے پھسلتا ہوا آنچل (فرحت قادری)

مرسلہ: صابر سرگم، صاحب گنج

جتنے ہیں رُوپ سب یہ دکھاتی ہیں رنڈیاں (نظیر اکبرآبادی)

مرسلہ: ایس مسعود حسن، نیو کریم گنج

لبوں پہ موجِ تبسم، دلوں میں رقصِ بہار
مہک رہی ہے فضا مسکرا رہے ہیں چراغ (رشید فاروقی)

مرسلہ: جمال احمد سیتاپوری، بھوپال

وہ دم رقص، گردشیں اس کی
ایک پھرکی، نظر میں پھرتی ہے (داغ)

مرسلہ: مظہر امام، لہریا سرائے، دربھنگہ

بے ساز بھی آواز جی صہبائے کہن بھی
ہے تو بہ شکن رقص میں اک شوخ بدن بھی (ولی مدنی)

مرسلہ: محمد ماہتاب، پیغمبر پور، دربھنگہ

اس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی
سات رنگوں کی سجل قوس یہ بانہوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھماچھم ساقی
رُخ گل رنگ پہ سنگیت کی یہ تیز دمک (فراق)

مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد، جنبار چک

اُلٹنا روپٹے کا دے دے کے تال
وہ بوٹا سا قد اور گھنگھرو سی چال (میر حسن دہلوی)

مرسلہ: محمد مہدی حسن، مدھوبنی

زندگی رقص پہ آمادہ ہوئی ہے جب بھی
وقت نے حلقۂ زنجیر کے بل توڑ دیے (ناظم سلطانپوری)

مرسلہ: شمیم خاں، بخشی بازار کٹک

نثری عنوانات

"راگ کا بدن" (الیاس سیتاپوری)

مرسلہ: تبسم رشید قریشی، ۱۵۲۸، ہوا چکی محلہ، نصیر آباد، راجستھان پن ۳۰۵۶۰۱

"جھنکار" (ناول رانو)

مرسلہ: ابونصر رضوی، دربھنگہ

"نغمے کا سفر" (جیلانی بانو کا ناول)

مرسلہ: محمد امتیاز، سمستی پور

"فن اور فنکار" (صالحہ عابد حسین، مقالات کا مجموعہ)

مرسلہ: محمد آدم گردش بھاگلپوری، صاحب گنج

"اٹھتی لہریں" (ناول گلزار چودھری)

مرسلہ: رتن لعل گپتا، صاحب گنج

"پیکرِ آواز" (ڈراموں کا مجموعہ محمد خالد عابدی)

مرسلہ: بیگم امیرون نسا، صاحب گنج

"آتی جاتی لہریں" (مضامین مظہر امام)

مرسلہ: علی شبیر اختر جبار چک

"دھنک رنگ" (نو بہار صابر کا شعری مجموعہ)

مرسلہ: قدسیہ طلعت، نیو کریم گنج

"رقص تماشائی" (وجاہت علی سندیلوی، مزاحیہ مجموعہ)

مرسلہ: محمد حسین گوہر نئی دہلی

"رشتے ہیں پیار کے" (ناول رضیہ فرحت)

مرسلہ: عزالہ ہاشمی، نیو کریم گنج

"بہار کی آمد" (کہانی، شیدا بگھونوی)

مرسلہ: عارفین سعیدی، سمتی پور

"نرتکی" (آغا سہیل کا افسانہ)

مرسلہ: ظہیر اکرم، ہزاری باغ

گلدستہ پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

نئی مطبوعات

رانگ نمبر

مصنفہ : شفیقہ فرحت

قیمت : سولہ روپے

ملنے کے پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶۔
شفیقہ فرحت، 186/2 پروفیسرز کالونی، بھوپال

شوکت تھانوی نے اپنے ایک مضمون میں فیشن کا دیسی ترجمہ "بھیڑ چال" کیا تھا۔ بھیڑوں کا گلہ جب چلتا ہے تو اگلی صف میں چلنے والی بھیڑ سر جھکائے، جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، یا رُک کر سامنے کی گھاس پر منہ مارتی ہے، ویسے ہی پیچھے آنے والی بھیڑوں کا قافلہ اُس کی نقل کرتا ہوا چلتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے ادب کے مقتبسوں اور ان کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے والے نقلی نقادوں کا بھی ہے۔ کسی گوشے سے آواز اُٹھی کہ ظریفانہ ادب دوسرے درجے کا ادب ہوتا ہے اور اس آواز پر بغیر سمجھے بوجھے کورس میں تائیدی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ بغیر سمجھے بوجھے کا فقرہ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے بعض نقاد یا مُبصر "پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا؟" کے اصول پر کاربند رہ کر محض فیشن کے طور پر کسی پیش رو آواز پر آوازیں لگانے کے عادی ہیں۔ ادب صرف ادب ہوتا ہے۔ ادب میں درجہ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ادیبوں اور شاعروں کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ کون بڑا ہے، کون منجھولا اور کون بونے قد کا ہے۔ لیکن فیشن پرست ناقدوں کو فنکاروں کا قد ناپنے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔ ان کو تو کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر اچھا اور بُرا ادب تخلیق کرنے والوں کی کھتونی کرنے بیٹھیں گے تو کہیں بھیڑوں کے گلّے سے پیچھے نہ چھوٹ جائیں۔

بہر حال طنز و مزاح لکھنے والوں کی صف میں اچھے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لکھنے والے بھی معاشرے کی اصلاح میں طنز و مزاح وہی رول ادا کرتا ہے جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے۔ نمک زیادہ ہو جائے تو کھانا خراب لگتا ہے اور اگر کم رہ جائے تب بھی مزہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نمک کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ طنز و مزاح کی سرحدیں پھکڑپن سے ملی ہوتی ہیں۔ قلم ذرا بہکا اور پھکڑپن شروع ہوا۔ اس میں قلم پر قابو رکھنا بڑے جاہدے کا کام ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جہاں لاتعداد انشا پرداز نظر آتے ہیں، وہاں طنّاز انشائیہ نگار معدودے چند ہیں۔ اب جبکہ ہمارے نقاد اور محقق غالب کے خطوط کو بھی ظریفانہ ادب کے چوکھٹے میں سجانے لگے ہیں، تو ان کے (غالب کے) دور سے شفیقہ فرحت کے دور تک کل ملا کر تین چار درجن سے زیادہ اہم سنجیدہ طنّاز نہیں ملیں گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سنجیدہ اور مہذب ظرافت خواہ وہ نثری ہو یا شعری، ایک نہایت ہی مشکل فن ہے، جو ہر کس و ناکس کی گرفت سے باہر ہے۔ یہ مہذب ظرافت گہرے عرفانِ ذات یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتی ہے ایسی ظرافت، زبان کی بلوغیت اور شائستگی کا پیمانہ ہوتی ہے۔ افراد ہی نہیں اقوام کی ذہنی سطح اور تہذیبی پختگی کا اندازہ ان باتوں سے لگایا جا سکتا ہے جن پر وہ ہنستی اور جن سے لطف لیتی ہیں۔ لیکن اس ہنسی کے پردے میں وہ آنسو چھپے ہوتے ہیں جو معاشرے کی ناہمواریوں کو دیکھ کر ایک حساس فنکار چشم بصیرت کو نم کرتے ہیں۔ ایسی ہنسی میں درپردہ معاشرے کی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اس تمہید کے فریم میں اگر شفیقہ فرحت کے انشائیوں کے مجموعے "رانگ نمبر" کو رکھ جائے تو ہر مضمون ایک خوبصورت تصویر کی طرح نِک سِک سے درست اور قاری کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتا ہوا نظر آئے گا۔ میں ان مضامین پر کسی پیشہ ور نقاد کی طرح فی البدیہہ کوئی مقالہ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محاکمہ اور محاسبہ کرنے کے جملہ حقوق ان حضرات کے نام محفوظ رہنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ ممکن ہے اس کی خلاف ورزی کرنے سے ان کے دائرۂ عمل میں مداخلت کرنے کا الزام لگ جائے۔ اس لیے اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہوں کہ بطور "مشتے نمونہ از خروارے" چند اقتباسات کے حوالے سے شفیقہ فرحت کے فکر و فن کی اہمیت، ان کے قلم کی کاٹ، اور تحریر کے بیساختہ پن کی جھلکیاں دکھا کر تبصرے کو ختم کر دوں۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون "رانگ نمبر" ہے۔ اس سیریل کا ٹریلر ملاحظہ فرمائیے۔

"ٹرن ــــ ٹرن ــــ ٹرن ــــ ہلو ــــ

تم آئے نہیں، ہم صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔" ابھی ہم اس خبر سے پوری طرح مسرور بھی نہیں ہو پائے تھے کہ کہیں ہمارا انتظار ہو رہا ہے، اور وہ بھی صبح سے کہ اُدھر سے پھر ایک نیوز بلیٹن ایشو ہوا۔

"کموّ نے دن بھر ہمیں ستایا۔ ہم نے اس کی بہت پٹائی کی۔" "ہائے بیچاری کموّ" بے اختیار ہماری زبان سے نکلا اور تب شاید انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "سوری رانگ نمبر" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور ہم کموّ کی حالتِ زار پر تڑپنے کے لیے اکیلے رہ گئے۔

ٹرن .... ٹرن .... پھر گھنٹی بجی....

"بھیاّلال پوسٹ مین کو بلا دینا ذرا۔"

"یہاں کوئی بھیاّلال، چاچالال نہیں ہے۔" ہم نے جھنجھلا کے جواب دیا۔

"نہیں ہے؟ مگر وہ تو ہم کو یہی نمبر دیا ہے۔"

"دیا ہوگا"... "کیا بدلی ہو گئی۔"

"نہیں بھاگ گیا...." "کیا کہا بھاگ گیا؟" "کب؟" "کل۔" "غضب ہو گیا۔ ہم سے پانسو روپیہ لیا تھا۔ ہم تو تھانے میں رپٹ کرتے ہیں جا کے۔" "ہاں... ہاں، کر دینا، مگر پہلے ٹھیک نمبر پر فون تو کر لو۔"

یہ تو ہیں ٹیلیفون کے رانگ نمبر جو موت کی طرح برحق ہیں اور موت ہی کی طرح جن کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور جن سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ ٹیلی فون کٹوا دیں۔

مگر زندگی میں اور بھی بہت سے نمبر ہیں جو موقع بے موقع رانگ ہو جاتے ہیں اور جن کا علاج حکیم لقمان تک کو ڈھونڈنے کا خیال نہیں آیا۔ یا شاید ان کا نمبر بھی رانگ ہو گیا ہو۔

ایک والدہ صاحبہ اپنے گلفام کے لیے جو قطعی گلفام نہ تھے، کسی سبز پری کی تلاش میں تھیں اسی تلاش و جستجو کے چکرّ میں وہ شہر میں ہونے والی ہر تقریب میں پہنچ جاتیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر میں وہ مدعو نہ ہوتیں۔ کہیں ایسی ہی ایک محفل میں انھیں شئے مطلوبہ نظر آئی۔ انگلی سے اشارہ کر کے پاس بیٹھی ہوئی خاتون سے لڑکی کا نام پتہ دریافت کیا۔ حسب نسب سُن کر تلاش کنندہ کے پہلے ہوش اڑے، پھر ہاتھ پاؤں خوشی سے پھولے۔ اتنے بڑے افسر.... محفل ادھوری چھوڑ وہ تو ہانپتی کانپتی گھر پہنچیں، صاحبزادے اور صاحبزادے کے والد ماجد کو داستان دستیاب ہونے ایک پری cum شہزادی کی سنائی۔ گھریلو کیبنٹ کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی، اور دوسرے دن بڑی رازداری سے پیام دیا۔ جو فوراً منظور ہو گیا۔ اور منگنی چٹ اور بیاہ پٹ۔

اب جو دولہے میاں بصد ارمان گھونگھٹ الٹتے ہیں تو ایک کالی بھجنگ چڑیل کو دیکھ کر ڈر کے مارے گھگھی بندھی اور رنج کے مارے بے ہوش ہو گئے۔ پتہ چلا کہ آپ محفل مذکورہ میں اُس حسینہ کے پہلو سے لگی بیٹھی تھیں۔ اب خدا جانے اشارہ کرنے والی انگلی کا زاویہ غلط تھا یا دیکھنے والی نگاہ کا۔ بہر حال نمبر تو رانگ ہو گیا!"

یہ اقتباسات صرف ایک مضمون کے ہیں۔ پوری کتاب اسی طرح کی دھنک رنگ پھلجڑیوں اور پٹاخوں سے بھری پڑی ہے۔

_____ رضا نقوی واہی

نمودِ سحر

شاعر : نیر قریشی گنگوہی

صفحات : ۱۷۶

قیمت : ۳۵ روپے

ملنے کا پتا : نیر ولا گنگوہ ضلع سہارنپور (یوپی)

"نمودِ سحر" نیر قریشی گنگوہی صاحب کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ غزلیات کی تعداد سب سے زیادہ ہے چنانچہ شاعرِ موصوف کے شعری مزاج کی شناخت بھی تغزل آشنائی، ہی میں پنہاں ہے۔ شعر میں تغزل کا وصف جس شائستگی، وضع داری اور گدازِ دل کا متقاضی ہے وہ نیر صاحب کی شخصیت اور فن دونوں ہی کا حصہ ہیں۔ اسی سبب وہ نہایت سادگی کے ساتھ پرکاری کے جوہر شعر میں نمود دیتے ہیں:

شیشے کی نزاکت کو پتھر سے نہ ٹکراؤ
لمحات کے ہاتھوں میں صدیوں کا مقدر ہے

مرے چاکِ دامن پہ کیا سوچتے ہو
جنونِ محبت کی جولانیاں ہیں

نیر نہ کبھی سیلِ حوادث سے ڈرے ہم
سر منزلِ اخلاص و وفا ہم سے ہوئی ہے

نیر صاحب نہ تو ترقی پسندی سے متاثر نظر آتے ہیں اور نہ ہی جدید طرزِ شاعری کے اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ موصوف اس غزلیہ مزاج کے حامل ہیں جو شگفتہ بیانی، تہہ داری، تشبیہات و استعارہ نگاری اور فنی عروضی پاسداری کے ساتھ ماضی اور حال دونوں ادوار میں ادب کا علمبردار رہا ہے۔

کلاسیکی غزل کے شعرا میں نیر قریشی صاحب "نمودِ سحر" کی شکل میں ایک معتبر شناخت نامہ لے کر شامل ہوتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب پاکیزہ لہجے، معنی خیز فکر و خیال اور سلاستِ زبان سے عبارت ہے۔ کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھیر سکتا ہوں رخِ گردشِ دوراں کو مگر
تم مرا ساتھ نبھاؤ گے یہ وعدہ کر لو

قفس سر پر اٹھا لو اب یہ فریاد و فغاں کب تک
فقط باتیں بنانے سے ہے بہتر کام کر جانا

اے نئی زندگی، اے نئی روشنی
اک فریبِ نظر ہے ترا بانکپن

نیرؔ قریشی صاحب کی شاعری ایک ایسا آئینۂ تہذیب ہے جس میں ان کی ذات اور ان کا فن ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ ان کا شعری رویہ شائستگی اور سنجیدگی کی جو فضا قائم کرتا ہے وہ ان کے اسلوب کا مخصوص وصف ہے۔

—— شہپر رسول

قلق میرٹھی: حیات اور کارنامے

مصنف: ڈاکٹر جلال انجم
ضخامت: ۲۶۴ صفحے۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$
قیمت: ستر روپے
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی اور دوسرے
اشاعت: بہ تعاون اردو اکادمی۔ دہلی۔

قدیم دلی کالج سے فیضیاب شخصیتوں میں ڈپٹی نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے ساتھ ایک نام اور بھی اہمیت کا حامل ہے اور وہ ہے محمد غلام مولیٰ قلق میرٹھی کا۔ انقلاب کی چنگاریوں کو ہوا دینے والے شہر میرٹھ میں یہ پیدا ہوئے اور بارہ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے دہلی آگئے ۔ ۔ ۔ راقم السطور نے ترجمے کے سلسلے میں قلق میرٹھی کو پڑھا تھا اور خیال تھا ان کی شاعری کا بھی سرسری مطالعہ کیا تھا۔ ڈاکٹر جلال انجم کے تحقیقی کام نے قلقؔ جیسے انگریزی زبان و ادب پر عبور رکھنے والے اردو شاعر کی دوبارہ شناخت کرائی ہے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ جیسے عاشق مزاج شاعر کے اس شاگردِ عزیز نے جب شاعری کے کوچے میں قدم رکھا تو ایک طرف غالبؔ کی شاعری کا چرچا تھا جس میں بلند خیالی لازمی تھی۔ تو دوسری طرف شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کے زیرِ اثر زبان و بیان کی سلاست پر توجہ دی جا رہی تھی۔ قلقؔ نے ان دونوں رجحانات سے استفادہ کیا۔

باوجود اس کے کہ قلقؔ فارسی گوئی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے اردو کلام میں دہلوی اسکول کی خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے غزل کے علاوہ رباعی، مسدس، تضمین، واسوخت، قطعہ اور مرثیے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا میں تسکینؔ، تصویرؔ، عبدالکریم سوزؔ، ظہیرؔ دہلوی، حالیؔ، داغؔ اور شیفتہؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس عہد کے بعض استادانِ سخن سے قلقؔ کے دوستانہ مراسم تھے۔ مثال کے طور پر غالبؔ۔ قلقؔ اور غالب کی عمر میں کافی فرق تھا۔ لیکن قلقؔ کی شاعرانہ سوجھ بوجھ نے عمر کے اس فرق کو ختم کر دیا تھا۔ غالبؔ قلقؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

قلقؔ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو جو ان کو اردو شعرا میں ممتاز کرتا ہے یہ ہے کہ قلقؔ کی تاحیات کسی ہم عصر شاعر سے کبھی چشمک نہیں رہی۔ وہ سب سے دوستانہ اور برادرانہ سلوک کرتے تھے اور سب ہی انھیں چاہتے تھے۔ سوال یہ نہیں کہ قلقؔ صفِ اول کے شاعر تھے یا درجۂ دوم کے۔ ان کی شخصیت اور سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات غور و فکر کی دعوت دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا شاعرانہ کلام اس عہد کی شہری روایات سے کہاں تک جڑا ہوا ہے اور اس میں کیا ندرت ہے۔

زیرِ نظر مقالہ جلال انجم نے ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کی نگرانی میں کئی برس کی جان توڑ محنت کے بعد مکمل کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے قلقؔ میرٹھی کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بے شمار واقعات میں سے کچھ کا علم اردو حلقوں کو تھا۔ لیکن بہت سے واقعات پوشیدہ تھے۔ اس مقالے میں سوانح شخصیت اور کلام کی خصوصیات پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ دنیائے شعر و ادب میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام بار بار آتا ہے۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد امید ہے کہ قلق میرٹھی کا نام بھی پہلے سے زیادہ سننے میں آئے گا۔

—— ڈاکٹر مجیب الاسلا

اتّفاق

مصنف: ڈاکٹر نریش
صفحات: ۸۷۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔

"اتفاق" ڈاکٹر نریش کے سات یک بابی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان ڈراموں کے موضوعا یا تو معاشرتی ہیں یا پھر تاریخی۔ تاریخی ڈراموں کا مس ازحد پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس پیچیدگی کے ایک بڑے حصے کو انھوں نے یہ کہہ کر بہت کم کر دیا ہے کہ تاریخ کے کم روشن پہلوؤں کو انھوں نے اجاگر کی کوشش کی ہے اور ان کے واقعات، کردا اور تاریخیں مستند ہیں۔ ڈاکٹر نریش کی غالباً پہ شناخت (میری ناقص معلومات کی حد تک) شا ہے۔ اس لیے ان کی یہ کوشش ہر طرح لائق تحسین

مگر ڈراموں کا ٹریٹمنٹ بہر حال کمزور۔ غیر معمولی اختصار اور (غالباً) اسٹیج کی ضرورتیں ڈراموں میں نقص پیدا کر گئی ہیں۔ حالانکہ ڈرامہ نگ نے کم روشن پہلوؤں کی بات ابتدا میں ہی وا کر دی ہے۔ مگر پھر بھی یہاں سے ڈرامے کو شر

ہونا چاہیے وہاں بعض ڈراموں کا اختتام بُری طرح کھٹکتا ہے۔

معاشی ڈراموں میں طنز کا نشتر تو بہت تیز ہے، مگر جہاں مصنف نے دانستہ ناصح اور مصلح کا روپ دھارا ہے وہاں فنی تاثر میں کمی آگئی ہے۔ کرداروں کا پولیس کے ڈنڈے کی طرح سپاٹ اور سیدھا مکالمہ افسانے کا نقص گردانا جاتا ہے۔ اور یہ پہلو "اتفاق" کے معاشی ڈراموں میں نمایاں ہے۔

مصنف نے اسٹیج کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا ہے جو اچھے ڈرامہ نگار کی پہچان ہے۔ مگر اب بعض یونیورسٹیوں نے اُردو میں MASS MEDIA سے متعلق کورس شروع کر دیے ہیں۔ جہاں ڈرامے پر اچھا خاصہ زور دیا جاتا ہے۔ اس لیے اگر آئندہ اشاعت میں وہ AUDIO اور VIDEO کی تخصیص کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

——— اطہر فاروقی

کا فنکار"، اور ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا مضمون۔ "وسیع تناظر کا افسانہ نگار فخر الدین عارفی" اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ جن سے ہماری واقفیت ابھی سرسری ہے۔ فخر الدین عارفی کی کہانی "انتظار" ہمارے معاشرے پر گہرا طنز ہے۔ "بہ شرف نگاہ" کالم میں ادریس صدر... منصور عمر، سید اعجاز حسن امام اور ظہیر غازی پوری کے خطوط دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

حصہ نظم کافی جاندار ہے۔ غزلوں کے چند اشعار ایسے ہیں جو مجھے اپنی جان سے عزیز نظر آئے:

جب وہ موڑ آئے تو پاس اور ذرا ہو جانا
مسکراتے ہوئے پھر ہم سے جُدا ہو جانا
(مخمور سعیدی)

میکدے، مسجدیں، صنم خانے
آدمی مطمئن کہیں بھی نہیں
(مخمور سعیدی)

دل کو توفیق گستہ حاصل نہ تھی
اس لیے میں صوفیِ صافی ہوا
(کرشن موہن)

میں اس بے جواب کی طلب میں
تسبیحِ سوال بن گیا ہوں
(کرشن کمار طور)

ہمارا دور ترقی کا دور ہے لیکن
سکونِ قلب سے محروم آدمی کیوں ہے؟
(مشتاق جوہر)

البتہ کتابت کی چند غلطیاں ضرور ہیں مثلاً مخمور سعیدی کا مقطع:

ایک اک سانس پہ ہو موت کا پہرہ جیسے
زندگی یہ ہے تو مخمور کیا کیا جائے

مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے تھا:

زندگی یہ ہے تو مخمور جیا کیا جائے

——— دلیپ بادل

یہ رسالہ کئی برس سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اور اسے اُردو کے معتبر لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں مشتاق انجم کا تاثراتی اور معلوماتی مضمون "ناشر بلیادی کی شاعری"... ایم. کے. کوثر کا مضمون "ایوب جوہر سادہ کاغذ

اُردو خبر نامہ

اُردو اکادمی، دہلی کی تشکیلِ نو

دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر اور اُردو اکادمی دہلی کے چیئرمین، ایروائس مارشل (ریٹائرڈ) جناب ایچ۔ ایل۔ کپورنے اُردو اکادمی کی کارگزار مجلسِ منتظمہ کی دو سالہ مدت پوری ہو جانے پر ۱۲ جولائی کو نئی مجلس منتظمہ کے ممبران کی نامزدگی فرمائی اور ۱۵ جولائی کو اکادمی کی سب کمیٹیوں کی تشکیلِ نو کا اعلان فرمایا۔ نئی مجلسِ منتظمہ کے ممبر حضرات اور ان کی کمیٹیوں کے نام درج ذیل ہیں:

ایوارڈ اور مشاعرہ سب کمیٹی:

۱۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (چیئرمین)
۲۔ پروفیسر محمد حسن
۳۔ جناب بلراج کومل
۴۔ بیگم حبیبہ قدوائی
۵۔ جناب انیس دہلوی

کلچرل پروگرام اور سیمینار سب کمیٹی:

۶۔ جناب دیوان بریندر ناتھ (چیئرمین)
۷۔ ڈاکٹر شارب ردولوی
۸۔ ڈاکٹر ضمیر حسن دہلوی
۹۔ جناب یونس دہلوی
۱۰۔ بیگم ریحانہ فاروقی

تعلیمی سب کمیٹی:

۱۱۔ پروفیسر اشتیاق عابدی (چیئرمین)
۱۲۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۱۳۔ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی
۱۴۔ جناب صفدر نقوی

تحقیقی اور اشاعتی سب کمیٹی:

۱۵۔ پروفیسر قمر رئیس (چیئرمین)
۱۶۔ پروفیسر عنوان چشتی
۱۷۔ پروفیسر فضل الحق
۱۸۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
۱۹۔ ممبر سیکریٹری: سید شریف الحسن نقوی

اکادمی کے وائس چیئرمین جناب کلانند بھارتیہ (ایگزیکٹو کونسلر برائے تعلیمات) ہیں اور جناب جی۔ بھٹاچاریہ (سیکریٹری تعلیمات دہلی انتظامیہ) نیز جناب ڈی۔ ایس۔ نیگی (ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات دہلی انتظامیہ) بہ اعتبارِ عہدہ ممبر ہیں۔

وزیراعظم کے نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا خط

۶ جون ۱۹۸۰ء کو وزارتِ داخلہ کے ڈائرکٹر جناب آر۔ کے۔ وڈیرا نے تمام صوبوں کے چیف سکریٹریوں کے نام ایک خط بھیجا تھا جس میں اقلیتی زبانوں کے بارے میں کچھ ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اگر ان ہدایتوں پر صوبوں میں عمل کیا گیا تو اردو اور باقی تمام لسانی اقلیتوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے، جو انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے رکن اور انجمن ترقی اُردو (آندھرا پردیش) کے نائب صدر ہیں، اس سلسلے میں انگریزی میں ایک خط وزیر اعظم کے نام بھیجا ہے۔ اس خط کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

ڈیر مسٹر پرائم منسٹر

آندھرا پردیش سرکاری زبان کمیشن کے ص[...] ۲۵ جون ۱۹۸۸ء کو حکومت ہند کا ایک خط نم[بر] NID(II) ـ ۸۰/۱۲/۱۱۰۱۱ ـ ۱ مورخہ ۶ جو[ن] مجھے دیا۔ جسے پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ا[...] میں تمام چیف سکریٹریوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ [...] سرکاری مقاصد کے لیے اقلیت کی زبان کو تسلی[م ...] کے معیار بیان کیے گئے ہیں۔

اس خط میں درجِ ذیل معیار بیان کیے[...]

۱:۔ اگر صوبے میں اقلیت کی آبادی ۳۰ ف[یصد] یا اس سے زیادہ ہوگی تو صوبہ دو لسانی قرار دیا[...]

۲:۔ جس ضلعے میں اقلیت ۶۰ فیصد ہوگی[...] ضلعے کی زبان سرکاری زبان تسلیم کی جائے گی۔

۳:۔ اگر چھوٹے علاقے میں جیسے میونسپلٹی[...] میں کسی لسانی اقلیت کی آبادی ۱۵ سے ۲۰ فیص[د ...] وہاں ضروری سرکاری نوٹس اور اصول وض[وابط ...] زبان میں بھی چھاپے جائیں گے۔

اس خط میں جو کچھ کہا گیا ہے نہ صرف [...] غیر منصفانہ اور قطعی طور پر غیر مناسب ہے [...] سائوتھ زون وزیروں کی کانفرنس کے فیصلو[ں ...] کمیٹی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ہماری گذارش ہے کہ جہاں کہیں کسی ض[لع ...] شل اور میونسپلٹی میں لسانی اقلیت کی آبا[دی ...] ہو وہاں اقلیت کی زبان کو درجِ ذیل مقاصد [...] سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہاں ہم اُ[...] بارے میں بات کر رہے ہیں۔

۱:۔ تمام ضروری اعلانات، اصول وض[وابط ...] کی فہرستیں اس اقلیت کی زبان میں بھی چھپنی[...]

۲:۔ اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ لسانی [...] اپنی زبان میں دستاویز وغیرہ کی رجسٹری کرا س[کے ...]

۳:۔ پبلک کے استعمال کے لیے فارم[...]

زبان میں بھی چھپنے چاہئیں۔ سائن بورڈز، دفتروں اور سڑکوں پر ناموں کی تختیاں اقلیتی زبانوں میں بھی لکھی جاہئیں۔

۴۔ اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ ماتحت عدالتوں یا اسی طرح کے انتظامیہ دفتروں میں لسانی اقلیت اپنی زبان میں دستاویز پیش کر سکے۔ عدالتوں میں گواہی اسی زبان میں لکھی جانی چاہیے جس زبان میں دی جائے۔ اگر کوئی چاہے تو اسے اقلیتی زبان میں عدالتی فیصلے کا ترجمہ فراہم کرایا جانا چاہیے۔

۵۔ میونسپل، پانی اور بجلی کے بل صوبے کی سرکاری زبان اور سرکاری طور پر تسلیم شدہ اقلیتی زبان دونوں میں شائع ہونے چاہئیں۔

۶۔ جن علاقوں میں اقلیت کی آبادی ۱۰ فیصدی ہو۔ وہاں کے موجودہ اسکولوں میں لسانی اقلیتی زبان کے ذریعے تعلیم دینے والی متوازی کلاسیں کھولی جانی چاہئیں۔

۷۔ لسانی اقلیتوں کے علاقوں میں اس طرح کے سرکاری افسروں کا تقرر کیا جانا چاہیے جو اقلیتی زبان کا لکھنا اور پڑھنا جانتے ہوں یا اقلیتی زبان میں ترجمے کا انتظام کیا جانا چاہیے۔

جس ضلع یا اس سے کم انتظامی اکائی میں لسانی اقلیت کی آبادی ۳۰ فیصدی یا اس سے زیادہ ہو اس کی زبان کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اور وہاں انتظامی کام دونوں زبانوں میں ہونے چاہئیں۔

ہماری درخواست ہے کہ آپ ان تمام معاملات پر غور فرمائیں اور نظر ثانی کر کے صوبوں کو دوبارہ ہدایت ارسال فرمائیں۔

احترام کے ساتھ

آپ کا مخلص

راج بہادر گوڑ

(ہماری زبان، نئی دہلی)

نارائن دت تیواری کے نام رام لعل کا کھلا خط

محترم و مکرم جناب نارائن دت تیواری،

وزیر اعلیٰ اتر پردیش، لکھنؤ۔

تسلیم۔ آپ کے اُتر پردیش میں لوٹ آنے پر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ خدا کرے، آپ کی واپسی اُتر پردیش کے عوام کے لیے بہت سی خوشگوار تبدیلیوں کا باعث بنے۔

بارہ کروڑ کی آبادی والی اس ریاست میں جو ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے، لگ بھگ سوا کروڑ لوگوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک قابلِ لحاظ تعداد ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو کا بھی استعمال کرتی اور اسے بخوبی سمجھتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں اسے گیارہ فیصد سے کچھ زیادہ کی مادری زبان قرار دیا گیا ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کی موجودگی میں بھی اس حقیقت کو بجا طور پر تسلیم کر لینا چاہیے کہ اتر پردیش ایک دو لسانی ریاست ہے۔ اور آئینِ ہند کے مطابق اردو عوام کو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی سہولیات دیے جانے کے علاوہ انھیں علاقائی نظم و نسق میں بھی اسی زبان کے حوالے سے جملہ آسانیاں اور مراعات فراہم کی جانی چاہئیں۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد دلانے کی چنداں ضرورت تو نہیں پھر بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ خود کانگریس نے ۱۹۸۴ء کے پارلیمانی انتخابات کے موقع پر جاری کیے جانے والے مینی فیسٹو میں اردو کو ریاست بہار کی طرز پر اتر پردیش میں بھی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اب جب کہ نئے پارلیمانی و عام انتخابات زیادہ دُور نہیں رہ گئے۔ اردو کے وعدے کو جلد از جلد پورا کر دینا چاہیے۔

یہ خیال صرف میرا نہیں بلکہ اُتر پردیش کے علاوہ ملک کے بے شمار دانشوروں کا ہے۔ جس کا اظہار وہ کئی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں کرتے رہے ہیں۔

آخر میں آپ سے ایک بار پھر پوری امید وابستہ کرتے ہوئے گذارش کروں گا کہ آپ اُردو کے بارے میں کانگریس کا وعدہ جلد از جلد پورا کریں۔

نیک خواہشات کے ساتھ،

آپ کا نیاز مند

رام لعل

(ہماری زبان، نئی دہلی)

اصلی سہ لسانی فارمولے کے نفاذ کا مطالبہ

اخبارات میں شائع شدہ اس خبر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہ ایجوکیشن سکریٹریوں اور ڈائرکٹروں کی ایک حالیہ کانفرنس نے ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے سے مادری زبان کو ہٹا کر اس کی جگہ جدید ہندوستانی زبان، وہ بھی ترجیحاً جنوب کی تجویز کر دی ہے ڈاکٹر عبدالمغنی، صدر انجمن ترقی اُردو بہار نے حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس تجویز کو بلا تاخیر رد کر کے سہ لسانی فارمولے کو اس کی اصل شکل میں نافذ کرنے کا، جو حسب ذیل ہے، مناسب و مؤثر بندوبست کرے۔

۱۔ مادری زبان

۲۔ جدید ہندوستانی زبان

۳۔ انگریزی۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے واضح کیا ہے کہ مذکورہ بالا

سہ لسانی فارمولا ۶۵ کے آس پاس وزرائے اعلا اور وزرائے تعلیم کی کانفرنسوں نے منظور کیا تھا۔ اور وزیراعظم نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ لہٰذا اس فارمولے کا اس کی اصل شکل میں نفاذ ضروری ہے اس لیے کہ شمالی ہند میں ہندی بولنے والوں کے ساتھ ساتھ اردو بولنے والوں کی تعداد ہی سب سے زیادہ ہے۔ اور ان کے درمیان قومی یک جہتی کے لیے ناگزیر ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی گنجائش ثانوی تعلیم کی سطح پر سہ لسانی فارمولے میں وضاحت کے ساتھ باقی رہے۔ اور ایک جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے جہاں اُردو بولنے والے ہندی پڑھیں وہیں ہندی بولنے والے بھی اپنی رضامندی سے اُردو پڑھیں۔ ورنہ اصل سہ لسانی فارمولے میں کوئی توڑ مروڑ شمالی ہند میں قومی یک جہتی کو سخت نقصان پہنچائے گا۔

(افتخار عظیم چاند)

ٹیگور کا ۵۸ سال پرانا انٹرویو

روس کے روزنامہ اخبار "ازویستیا" میں رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک ایسا انٹرویو پہلی بار شائع ہوا ہے جو انھوں نے اس اخبار کو ۵۸ سال پہلے دیا تھا۔ یہ انٹرویو ۵۸ برس تک کس لیے سرد خانے میں پڑا رہا اور اب کس لیے شائع ہوا ہے، اس کا جواب صرف ایک ہی ہے:

پرانا پابند نظام اور اظہارِ خیال کی آزادی کی نئی لہر۔

ٹیگور نے یہ انٹرویو ماسکو سے ہندوستان لوٹتے وقت ۲۵ ستمبر ۱۹۳۰ء کو مذکورہ بالا اخبار کو دیا تھا۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ایک اچھے سماج میں مختلف خیالات کے اظہار کی آزادی اور اختلاف رائے کی آزادی کا حق دیا جانا ضروری ہے۔ اگر طاقت کے بل بوتے پر سماج کے اوپر یکساں انداز کے نظریات لاد دیے جائیں تو اس طرح کا سماج ایک گھسا پٹا سماج بن کر رہ جائے گا۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں تشدد کی مذمت کی تھی اور عدم تشدد کو سراہا تھا۔ انھوں نے اس انٹرویو میں یہ تمام تلقین روس کے اس زمانے کے حکمرانوں کو مخاطب کر کے کی تھی۔

(قومی آواز۔ نئی دہلی)

مضمون نگاری کا مقابلہ

فکر تونسوی کی پہلی برسی کے موقع پر فکر میموریل سوسائٹی، اردو زبان میں فکاہیہ مضامین کا ایک مقابلہ منعقد کر رہی ہے جس کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

۱:۔ مقابلے میں صرف ۱۴ سے ۱۸ سال کی عمر تک کے قلمکار حصہ لے سکتے ہیں۔

۲:۔ مضمون ...... الفاظ سے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے۔

۳:۔ مضمون مندرجہ ذیل عنوانات پر ہونا چاہیے۔

(۱) پیسہ پیسہ پیسہ

(۲) میں ادیب بنا

(۳) ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

مضامین سکریٹری، فکر میموریل سوسائٹی، ڈی۔ ۵۰، گل مہر پارک، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۴۹ کو ۱۵ اگست ۱۹۸۸ء تک پہنچ جانے چاہئیں۔

اردو کے تین جانے پہچانے ادیب ان مضامین پر اپنا فیصلہ دیں گے۔ فیصلے کے مطابق اوّل دوم اور سوم آنے والے مضامین پر انعامات دیے جائیں گے۔ تقسیم انعامات کے لیے ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء کو دلّی میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ دلّی کے باہر کے انعام یافتگان کو سفر خرچ بھی دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لیے اس پتے پر لکھیں سکریٹری۔ فکر میموریل سوسائٹی، ڈی۔ ۵۰۔ گل مہر پارک، نئی دہلی۔ ۴۹

بیانیہ افسانے کی کمزوری نہیں قوت ہے

بیانیہ افسانے کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی قو[illegible] ہے اور حوالہ جاتی عنصر کی موجودگی اسے نامیا[illegible] واحدے کی شکل عطا کرتی ہے۔ ان تاثرات کا اظہ[illegible] عصری اردو افسانے کے موضوع پر ۴ جولائی کو لکھ[illegible] میں ہونے والے سیمنار میں کیا گیا۔ سیمنار کی صدار[illegible] ڈاکٹر نیر مسعود نے کی۔

سیمنار کے کنوینر مسٹر شکیب رضوی نے ا[illegible] تعارفی تقریر میں اردو کے عصری مسائل پر مختصر ا[illegible] ڈالی۔ احمد ابراہیم علوی نے اپنی تقریر میں موجود [illegible] معاشرتی صورت حال کو ادب کے لیے ناساز[illegible] قرار دیتے ہوئے کہا کہ معاشرہ فن اور ادب سے ب[illegible] ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاشی بدحالی کی بنا[illegible] فی الوقت ادب کو کل وقتی مشغلہ نہیں بنایا جا سک[illegible] اس کے بعد اقبال مجید نے جو مہمانِ خصوصی [illegible] اپنا افسانہ "جنگل کٹ رہے ہیں" سنایا۔ جس م[illegible] معاشرتی بدحالی اور اخلاقی زوال کو فنکارانہ چابک[illegible] سے اجاگر کیا گیا تھا۔ عابد سہیل نے افسانے پر ا[illegible] خیال کرتے ہوئے کہا کہ اقبال مجید نے اپنے اف[illegible] کو مضبوط واقعاتی اساس فراہم کی ہے۔ جس [illegible] باعث تاثر دو بالا ہو گیا ہے۔ نیز عصری مسائ[illegible] فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رام لعل [illegible] افسانے میں نئے تجربات کو ناکام قرار دیا اور کہا [illegible] تجربے برآمد شدہ تھے لہٰذا ناکام ہو گئے۔

(قومی آواز، لکھ[illegible]

جامعہ عثمانیہ کے طلائی تمغے

۳۰ جون ۱۹۸۸ء کو اُردو کے حسبِ ذیل طلبار کو طلائی تمغے اور انعامات دیے گئے۔

۱۔ جانکی پرشاد یادگار طلائی تمغہ اور گولڈن جوبلی یو۔ پی۔ پرائز

سلمان عابد ولد ایم۔ اے۔ واحد
ایم۔اے اُردو میں درجۂ اوّل میں کامیابی کے لیے

۲۔ ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظام طلائی تمغہ

عتیقہ صدیقہ دختر ایم۔ ایچ مقیت صدیقی
بی۔اے، اُردو اختیاری مضمون میں اوّل آنے پر

(پریس ریلیز)

فنا نظامی اور قمر اقبال کا انتقال

۱۸ جولائی کو اُردو دُنیا دو گہرے صدموں سے دو چار ہوئی۔

کانپور میں بزرگ شاعر جناب فنا نظامی وفات پا گئے۔ وہ پچھلے کئی مہینے سے علیل تھے۔ پس ماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم کی عمر ۶۵ سال تھی۔

فنا صاحب جگر مراد آبادی مرحوم کے مقرّبین میں رہے تھے اور ان کی صحبتوں کے فیض یافتہ تھے۔ وہ اپنی شاعری میں جگر صاحب کے طرزِ سخن ہی کی پیروی کرتے تھے اور جگر صاحب ہی کی طرح انھیں غزل سے خصوصی شغف تھا۔ اپنے کلام کی نشر و اشاعت پر انھوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن مشاعروں کے وہ بڑے معروف و مقبول شاعر تھے۔ کلام تغزّل کے مانوس و مروّج عناصر سے مالا مال اور پڑھنے کا انداز انتہائی متاثر کن، اس لیے وہ مشاعرے پر چھا جایا کرتے تھے اور سامعین کی فرمائش پر انھیں کئی کئی غزلیں سُنانی پڑتی تھیں۔ ان کے بعض اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے تھے، مثلاً :

وہ زندہ ہوں میں جس کے لیے شیخِ حرم نے
راتوں کو کھلا بابِ حرم چھوڑ دیا ہے

یا

ترکِ تعلّقات کو اک لمحہ چاہیے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

یا

اہلِ دیر و حرم رہ گئے
تیرے دیوانے کم رہ گئے

اب، کہ وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ان کا کلام مرتّب کر کے تمام و کمال شائع کر دیا جائے تاکہ یہ ادبی ورثہ آنے والی نسلوں تک بھی پہنچ سکے۔

قمر اقبال ان شاعروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے جو اُردو شاعری میں جدیدیت کا رجحان شروع ہونے کے ساتھ ۱۹۶۰ء کے آس پاس سامنے آئے اور جلد ہی اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بدولت ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ وہ نظمیں بھی لکھتے تھے لیکن انھوں نے غزلیں زیادہ کہیں اور اسی صنف میں اپنی صلاحیتوں کا بہتر مظاہرہ بھی کیا۔ ان کا کلام ملک کے تمام معتبر ادبی رسالوں میں چھپتا رہتا تھا۔ اور کچھ مدّت پہلے "موم کا شہر" کے نام سے کتابی صورت میں بھی منظرِ عام پر آ گیا تھا۔ اس کتاب پر مہاراشٹر اُردو اکادمی کی طرف سے انھیں انعام بھی دیا گیا تھا۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی تھے اور "اورنگ آباد ٹائمز" کے ادارۂ تحریر میں شامل تھے۔ ان کا مستقل قیام اورنگ آباد میں تھا، وہیں صرف ۴۴ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب انتقال کیا۔ پیچھے رہ جانے والوں میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

درجِ ذیل غزل سے ان کے اندازِ سخن کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے :

ایک دیوار اگر ہو تو یہاں سر ماریں
ایک دیوار کے پیچھے ہیں کئی دیواریں

ہم کو لوٹا دے ہمارا وہ پُرانا چہرہ
زندگی! تیرے لیے روپ کہاں تک دھاریں

پاس کچھ اپنے بچا ہے تو یہی اک لمحہ
آخری داؤ ہے، جیتیں کہ یہ بازی ہاریں

تم کبھی آگ میں پل بھر تو اتر کر دیکھو
کون کہتا ہے کہ شعلوں میں نہیں مہکاریں

قید ہیں کون سے زنداں میں نہ جانے ہم لوگ
روز اُونچی ہوئی جاتی ہیں قمر دیواریں

خداوند کریم مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کے غمزدہ خاندانوں کو صبر کی توفیق بخشے۔

آپ کی رائے

○ اس میں کوئی شک نہیں کہ "ایوانِ اُردو دہلی" اپنی نوعیت کا واحد معیاری رسالہ ہے اور ہر ماہ اس کی شان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ "حرفِ آغاز" سے لے کر آخری صفحے تک اس کا حُسن اور معیار برقرار رہتا ہے۔

جون کے شمارے میں سید ظل الرحمٰن صاحب کا مضمون "شریف منزل — دہلی کی ایک تاریخی عمارت" بیحد اہم، دلچسپ، معلوماتی اور شاندار ہے مگر تعجب ہوا کہ اس تاریخی اہمیت کی حامل اور اہم ترین عمارت میں تمام راجہ مہاراجہ، نواب، جاگیردار، شعرا، علما، سیاسی لیڈر اور بڑی بڑی نامور اور قابلِ احترام ہستیوں کا تو گذر ہوا مگر محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور ان کے رفقا اس عمارت میں داخل ہونے سے محروم رہے۔ زیادہ تعجب اس لیے بھی ہوا کہ تمام واقعات ۱۹۴۷ء سے قبل کے بیان کیے گئے ہیں اور ۱۹۴۷ء تک ہمارے مُلک میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں کا شمار بھی اہم اور مشہور و معروف لیڈروں میں کیا جاتا ہے۔

میرے خیال میں تاریخ کو تاریخ کی طرح ہونا چاہیے اور تمام تعصب اور جانبدارانہ رویّوں اور رُجحانات سے پاک وصاف ہونا چاہیے — یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی عظیم اور بلند قامت شخصیت حکیم اجمل خاں سے محمد علی جناح کا کوئی تعلق اور کوئی سروکار نہ رہا ہو۔ جبکہ خود موصوف نے لکھا ہے کہ "شریف منزل دہلی میں ملک کی آزادی کی جدّوجہد میں حصّہ لینے والوں کا اہم مرکز بن گئی تھی"۔ لفظ "پاکستان" کا وجود تو بہت بعد میں ہوا لیکن محمد علی جناح آزادی کی جدّوجہد میں اس وقت سے شریک رہے جب انھیں خود "پاکستان" کے وجود کا احساس نہیں تھا۔

—— سید عبدالاحد آزاد، گیا

○ جون ۱۹۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ خوشحال زیدی کا مضمون "بچوّں کا ادب ضروریات اور مسائل" بہت اہم اور معلوماتی ہے انھوں نے نہایت اہم موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور موجودہ دَور کے ادیبوں اور شاعروں کی توجہ بچوّں کے ادب کی طرف مبذول کرائی ہے۔

اقبال متین کا افسانہ "بولتے سنّاٹے" بھی بہت خوب رہا۔ اس افسانے میں انھوں نے ایسا دلچسپ انداز اختیار کیا ہے جو قابلِ داد ہے۔

—— عبدالرافع، علی گڑھ

○ جون کے شمارے میں ناوک حمزہ پوری کا مضمون "ہائیکو" ایک عمدہ تجزیاتی مضمون ہے۔ "ہائیکو" سے دلچسپی رکھنے والے اس سے استفادہ کرسکتے ہیں خوشحال زیدی نے اپنے مضمون میں بچوّں کے ادب کی ضرورت اور اس سے وابستہ مسائل کو واضح کرنے کی میاب کوشش کی ہے۔

—— فہیم نادر، دربھنگا

○ "ایوان اردو دہلی" (جون ۸۸ء کا شمارہ) میری نظر سے گزرا۔ اس شمارے میں ناوک حمزہ پوری کا مضمون ہائیکو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے مضمون پڑھ کر محسوس ہوا کہ ناوک صاحب نے ہائیکو سے متعلق کافی تحقیق کی ہے اور اس صنف کے امکانات پر غور وخوص بھی کیا ہے۔

موصوف فرماتے ہیں کہ ہائیکو مقفّیٰ ہو یا معـ لیکن نثر نہ ہو نظم ہو۔ اور ۵ + ۷ + ۵ سالموں قید بھی قبول کرتی ہو۔ ان کی اس رائے سے شاید ہ کسی کو اختلاف ہو۔ ہائیکو کے تینوں مصرعے اگر ایک بحر میں نہ ہوں تو اسے مختصر نثری نظم تو کہہ سکتے ہیں لیک ہائیکو نہیں کہہ سکتے۔

کبھی کبھی غزل کے ایک مصرعے کو تین حصّوں میں منقسم کرکے ۵ + ۷ + ۵ سالموں کی شرط تو پوری کی جاسکتی ہے لیکن اس مصرعے کو ہائیکو کہا نہیں جاسکتا۔ مثلاً حفیظ جالندھری کا یہ مصرع لیجیے:

ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے

اُسے یوں لکھا جاسکتا ہے:

ہم	میں	ہی	تھی	نہ
۱	۲	۳	۴	۵

کو	ئی	با	ت	یا	د	نہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷

تم	کو	آ	س	کے
۱	۲	۳	۴	۵

یہاں ایک مصرعے کو تین ٹکڑے کرکے ہائیک کی سیلیبل والی شرط تو پوری کرلی گئی ہے، لیکن یہ مصرعہ بذاتِ خود ایک مکمل مصرعہ نہیں بن سکا یہاں صدر و ابتدا اور عروض و ضرب میں یکسا نہیں ہے۔

اس سے پہلے پروفیسر کرامت علی کرامت نے شا بمبئی (شمارہ جنوری ۸۶ء) میں ہائیکو نظم کے بار میں ایک مختصر نوٹ لکھا تھا جس میں انھوں نے سالموں (۵+۷+۵) پر ہی زور دیا تھا۔ اس نوٹ کے ساتھ جو ہائیکو نظمیں شائع ہوئی تھیں و بحر میں تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موصوف بھی

ہائیکو نظموں کو با بحر اور ۵ + ۷ + ۵ سالموں کے دائرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

میرے خیال میں ہائیکو نظم ہر بحر میں نہیں کہی جا سکتی۔ صرف چند بحریں ہیں جن میں ہائیکو نظم کہی جا سکتی ہے۔ ان بحروں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہم اگر نظم مکمل کریں گے تو وہ نظم با بحر تو ہو جائے گی مگر ضروری نہیں سالموں کی تعداد کی شرط برقرار رہے۔ اس لیے ہم اگر صرف سالموں کی یا صرف بحروں کی شرط پوری کریں گے تو وہ ہائیکو نظم نہیں کہلائے گی۔

غرض کہ ہمیں ہائیکو نظم کہنے کے لیے (بہ قول ناوک حمزہ پوری) وزن اور سالموں کی پابندی قبول کرنی ہوگی۔

لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خود ناوک صاحب کی مندرجہ ذیل نظم با بحر نہیں ہے۔

آگ کو پھول
کہیے گا کر آپ
پھول کو شول

اس لیے اسے ہائیکو نظم کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔

—— قطب کامران، کٹک

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جولائی کا شمارہ زیرِ نگاہ ہے۔ اس کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے واقعی اتنی کم مدت میں آپ لوگوں نے کمال کر دکھایا ہے میں ایک لفظ "طرح" کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اطہر محسن کی غزل کا مقطع پہلے ملاحظہ ہو:

رہا ہمیشہ در و بام سے پرے محسن
عجب طرح کا مجھے دشت میں مکان ملا

صحیح کیا ہے؟ "طرح" بہ فتح اول و سکون رائے مہملہ گلستان سعدی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

بادشاہ بے کہ طرح ظلم فگند
پائے دیوار ملک خویش بکند

مصرعۂ محسن میں اگر طرح اس تلفظ کے ساتھ پڑھا جائے تو مصرعہ ناموزوں ہو جاتا ہے۔ محسن صاحب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات کی توجہ مبذول کرا کر شاید میں غلطی تو نہیں کر رہا ہوں[1]

—— بدر، گیا

[1] یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ استاد جلیل مانکپوری کا مصرعہ ہے:

دل میں ہے اِک چبھن خلشِ خار کی طرح

—— (ادارہ)

○ جولائی کا شمارہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطبۂ صدارت "گلہ ہے گلہ ہے بازخواں" کی اشاعت سے بیشتر قارئین کے لیے دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ اُردو کا مسئلہ جو ۱۹۵۲ء میں تھا آج ۳۵ برسوں بعد بھی وہی ہے اور جب جہاں ضرورت ہو، یہ خطبۂ صدارت آج بھی لفظ بہ لفظ رکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ زندہ تحریر اور کسے کہتے ہیں۔ اس مضمون کی روشنی میں مخمور سعیدی صاحب کا حرفِ آغاز سونے پر سہاگہ ہے۔ تمام مضامین اہم جبکہ افسانوں میں "چٹکی بھر زندگی" اور "کرید" اس شمارے کی آن ہیں۔ افسانہ "نوشیرواں" کا اختتام آج کے سماج میں ہم آپ تو سوچ سکتے ہیں مگر سیاستدان حضرات ہرگز نہیں۔ لہٰذا "پھر مزدور آئے اور قلعے کی دیوار کا نامکمل کام تکمیل کی منزلیں طے کرنے لگا۔ شام تک دیوار پوری ہو گئی" پر ہی م۔ ق۔ خان نے اکتفا کیا ہوتا تو بہتر تھا کہ ہم آپ بادشاہ نہیں ہیں اور موجودہ سوسائٹی میں ایک خاص طبقے کی نظر میں ہماری رعیت بھی مشکوک ہے۔ نظمیں، غزلیں نیز دیگر مشمولات قابلِ قدر ہیں۔

—— کلیم حیدر شرر، بمبئی

○ مخمور سعیدی صاحب نے حرفِ آغاز میں بالکل درست لکھا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم کیوں نہیں دلواتے ہیں اور اُردو رسالے اخبار، کتابیں خرید کر کیوں نہیں پڑھتے؟ میں ایک دو اُردو کے پروفیسروں کو نزدیک سے جانتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں بھیجتے ہیں اور خود اُردو کے ذریعے روزی روٹی حاصل کرتے ہیں! ہم اپنے خطوں کے پتے اُردو میں ضرور لکھیں مگر اس خوف سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں خط گم نہ ہو جائے۔ بہرحال مشورہ اچھا ہے۔

شفق صاحب کا افسانہ لاجواب ہے اور معاشرے کی ایک مخصوص برائی کو خوبصورتی سے ظاہر کرتا ہے لیکن معین اعجاز کا انشائیہ اور م۔ راجندر کا طنزیہ پسند نہیں آیا۔ "بیدل بیکانیری" مقالے کا زیادہ مواد نیا دَور کے عثمان عارف نمبر سے لیا گیا ہے۔

غزلوں کا معیار اچھا ہے۔

—— انوار انصاری، رانچی

○ 'حرفِ آغاز' میں اُردو سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں، برسوں سے ان کی تکرار جاری ہے لیکن کسی نے بھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ خود ادارہ "ایوانِ اُردو" جو اُردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اپنے ایجنٹوں کو جو وی پی پیکٹ روانہ کرتا ہے ان کے پتے انگریزی میں ہوتے ہیں کیوں؟[1]

ہم لوگ اُردو میں اپنے خطوں پر پتے لکھنے کے لیے تیار ہیں اور ہمیں اس بات کی امید بھی ہے کہ محکمہ ڈاک ایسے خط ضائع نہیں کرے گا لیکن کیا اُردو میں پتے لکھ دینے سے اُردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟[2]

—— جمشید پرویز، پٹنہ

[1] ادارے میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ جن خطوں یا پیکٹوں پر پتے اُردو میں لکھے جائیں گے ان کی تقسیم میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ ایوانِ اُردو کا ایجنٹوں تک جلد از جلد پہنچنا چونکہ ضروری ہے اس لیے پتے انگریزی میں لکھے جاتے ہیں۔ جہاں یہ مجبوری نہ ہو وہاں پتے اُردو میں لکھے جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ —— (ادارہ)

[2] یہ محض ایک تجویز ہے، اس پر عمل کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے اقدامات نہ کیے جائیں —— (ادارہ)

ایوانِ اُردو کا تازہ شمارہ ملا۔ 'حرفِ آغاز' میں آپ نے جن نکات کی طرف اشارے کیے ہیں واقعی وہ ہماری زبان اُردو کی بقا اور اس کے مستقبل کے لیے دُور رس نتائج کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خطبۂ صدارت گزرے ہوئے کل کی تحریر سہی لیکن مرحوم کی اُردو سے والہانہ محبت، غیر جانبدارانہ سیاسی بصیرت اور سچی وطن دوستی کی ایسی تحریری دستاویز ہے جو دیر تک اور دُور تک آنے والی نسلوں کی کردار سازی اور ذہنی رہبری کرتی رہے گی۔ سعشی زادہ صاحب کا مضمون "فیض اور اختر شیرانی" اور معین اعجاز صاحب کا "ہماری عینک کی سالگرہ" معلومات افزا اور دلچسپ ہیں۔ بُری غزلوں کی جگہ اگر آپ اچھے نثر لکھنے والوں کو دیں تو رسالے کے وقار میں اور اضافہ ہو سکتا ہے کیونکہ اچھی نثر لکھنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

—— اظہر عنایتی، رامپور

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" کا شمارہ کچھ تاخیر سے باصرہ نواز ہوا۔ محمود سعیدی نے حرفِ آغاز میں سیاہی سے نہیں خونِ جگر سے کام لیا ہے۔ یہ خیال بالکل درست ہے کہ اردو کو ہم اُردو والے نیم پلیٹوں، دعوت ناموں، دُکانوں، سائن بورڈوں، پتوں اور اشتہاروں کے ذریعے فروغ دے سکتے ہیں لیکن کالم "آپ کی رائے" میں جناب ایم۔ ایل احمد اور مقصود گمنام صاحب کے خطوط اُردو دوستی کے منافی ہیں۔ شاید یہ دونوں ہی حضرات اُردو کو اپنی جاگیر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے "ہم طرح اشعار" اور "عنوانِ تصویر" کو ختم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جبکہ فروغ اُردو کا سب سے اہم نکتہ یہی ہے کہ نوجوان طالب علموں کے دِلوں میں اُردو کی محبت پیدا کی جائے۔ اور مذکورہ کالم یہ کام حسن و خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ مدیرانِ گرامی! شاید آپ کو یقین نہ آئے ان کالموں کے شیدائی "ایوانِ اُردو دہلی" کا انتظار اسی طرح کرتے ہیں جیسے معصوم بچے عید کا چاند دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ شہر بھاگلپور کی تمام لائبریریوں سے غزلیات و منظومات کی تمام کتابیں انہی نوجوانوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں۔ کیا یہ عمل دُہراتے دُہراتے ان کے دِلوں میں اُردو کی محبت نہ جاگے گی؟ کیا "ایوانِ اُردو دہلی" کا یہ کالم اُردو کی خدمت کا ایک اہم وسیلہ نہیں۔ مَیں ان کالموں کو اُردو کی ترقی کا زینہ تصور کرتا ہوں۔

بزمِ اہلِ قلم بھاگلپور کے نوجوان طالب علموں کا ذوق و شوق دیکھ کر مَیں ادارے سے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کالموں کے صفحات میں کوئی کمی نہ کریں بلکہ اس میں کچھ تبدیلی لائیں مُشکل سے مُشکل طرح ڈھونڈ کر دیں۔ جس غزل کا مصرعہ دیا جائے اس غزل کے تمام اشعار مقابلے سے خارج کر دیں اور غیر معروف شعرا کے "ہم طرح" اشعار کو ترجیح دیں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔

اکبر علی خاں نے فیض اور اختر شیرانی کے تعلق سے مُفید اشارے کیے ہیں۔ بیدل بیکانیری پر مضمون معلوماتی ہے۔

بے شمار ممبران بزمِ اہلِ قلم بھاگلپور و دیگر نوجوانانِ شہر بھاگلپور آپ سے اس خط کی اشاعت کی گذارش کرتے ہیں۔

—— محمد نوشاد عالم آزاد، جبار چک

آج قلم اُٹھانے کے لیے ہم سب کو ایم۔ ایل۔ احمد، ہزاری باغ اور مقصود گمنام رائے بریلی کے خطوں نے مجبور کیا ہے۔ انھوں نے رائے دی ہے کہ "صرف تین 'ہم طرح اشعار' اور تین سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے شعری اور نثری عنوانات شائع کریں۔" واہ! واہ!!

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ہر طالب علم۔ اقبال، غالب، مومن، آتش، پریم چند، کرشن چندر، راج[illegible] سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، قرۃالعین [illegible] بن کر جنم لیتا ہے؟ اس دَور میں اُردو کی نئی پود کا [illegible] حال ہے وہ کسی سے ڈھکا چُھپا نہیں۔ اسی تفریح[illegible] بہلنے تو وہ "ایوانِ اُردو دہلی" کو پڑھ کر کچھ لکھ[illegible] حوصلہ پیدا کرتے ہیں آج وہ نقل کر کے کسی مش[illegible] شاعر کے اشعار یا عنوان روانہ کرتے ہیں۔ کل وہ [illegible] تخلیق کریں گے۔ "اُردو اکادمی دہلی" نے "گلد[illegible] تحفہ عطا کر کے ان کے حوصلے کافی بڑھائے ہیں۔ [illegible] انھیں مایوس نہ کریں۔

—— علی بشیر اختر اور اُن کے ساتھی، ابھ[illegible]

بڑے شدید انتظار کے بعد آپ کا تحفہ "ای[illegible] اُردو دہلی" ملتا ہے، ہمیشہ سے پڑھتی آئی ہوں۔ گ[illegible] لاتے ہی 'پہلے ہم' 'پہلے ہم' کی تکرار شروع ہو جاتی[illegible] فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بہن پڑھے گی باقی سن[illegible] لوگ لطف اندوز ہوں گے اس بار بھی ایسا ہی ہوا [illegible] "آپ کی رائے" میں مقصود گمنام اور ایم۔ ایل اح[illegible] کے خط پڑھ کر حیرت ہوئی۔ ان کی رائے مان لینے [illegible] مطلب قارئین کے ایک بڑے حلقے پر ظلم کے بر[illegible] ہوگا۔ "ایوانِ اُردو دہلی" کو پڑھنے والے مختلف [illegible] طبقہ، مختلف عمر کے لوگ ہیں جس طرح "ایوانِ اُ[illegible] دہلی" میں مختلف کالم ہیں اسی طرح ہر کالم کو پ[illegible] کرنے والے بھی جُدا جُدا ہیں۔

آپ سے ہم تمام بہنوں کی التجا ہے کہ "ہم طر[illegible] اشعار" اور "تصویری عنوان" والے کالموں کے صف[illegible] کم نہ کریں بلکہ کبھی گنجائش نظر آئے تو کچھ اضافہ [illegible] کر دیں۔

—— اعجاز پروین گڈیا اور ان کی سہیلیاں، جبار[illegible]

"ہم طرح اشعار" اور اندرونی صفحے کے لی[illegible] شعری و نثری عنوان تجویز کرنا دلچسپ مشغلہ ہے [illegible] خدارا اسے بند نہ کریں!

جولائی کے شمارے میں جن شعرا نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ان میں اظہر عنایتی، حکیم انور تمناپوری، بھگوان داس اعجاز اور حکیم منظور شامل ہیں۔

—— واحد اختر، گیلا صاحب گنج

○ "ایوانِ اردو دہلی" جولائی ۸۸ء کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ سبھی غزلیں اور دیگر مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ میں ایم۔ ایل احمد کی رائے سے متفق نہیں کہ "ہم طرح اشعار" صفحوں کی بربادی کا باعث بنے ہوئے ہیں بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے بہت سے باذوق قارئین کے لیے شعر کہنے کا ایک اچھا موقع فراہم ہوجاتا ہے اور انھیں "ہم طرح اشعار" کے مصرعے سے مدد ملتی ہے۔

—— احسن امام احسن، ہزاری باغ

○ جولائی ۸۸ء کے شمارے میں جناب مقصود گمنام پھریہوی رائے بریلی کا مشورہ نظر سے گذرا۔ میں بھی اس مشورے سے اتفاق رکھتا ہوں۔ مگر ایم۔ ایل احمد ہزاری باغ کی رائے مجھے پسند نہیں آئی کیونکہ انھوں نے بڑے تلخ انداز میں یہ کہا ہے کہ "ہم طرح اشعار" صفحوں کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے "ہم طرح اشعار" ایوانِ اُردو دہلی میں شائع ہونے سے نومشق شاعروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ "ہم طرح اشعار" کے دیے گئے مصرعے سے متاثر ہوکر کچھ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں لہٰذا "ہم طرح اشعار" صفحوں کی بربادی نہیں بلکہ اس سے ادبی ذہن کو فروغ ملتا ہے۔

—— م۔ ٹ۔ خان تیغ، ہزاری باغ

○ "آپ کی رائے"، "اُردو کا خبرنامہ" اور "شعری یا نثری" عنوانات جیسے کالموں کی موجودگی افادیت اور دلچسپی کی حامل ہے۔ کم قیمت میں ایک معیاری اور دلکش جریدہ جاری کرکے آپ لوگوں نے دوسرے صوبوں کی اردو اکادمیوں کو ایک مشعلِ راہ دکھائی ہے جس کے لیے آپ سبھی متعلقہ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں۔

—— محمد ابراہیم صدیقی، الٰہ آباد

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جولائی ۸۸ء کا نظرنواز ہوا۔ "آپ کی رائے" بھی پڑھی صفحہ نمبر ۵۷ پر جناب مقصود گمنام پھریہوی رائے بریلی کے خیال کی ہم تائید کرتے ہیں۔

—— صابر رضوی، مظفرپور

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا سرورق جاذبِ نظر ہوتا جا رہا ہے خوبصورت کتابت و طباعت بھرپور ادبی مواد کی وجہ سے "ایوانِ اُردو دہلی" ہر خاص و عام میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود چند چیزیں جن کی جانب کئی ایک قارئین نے آپ کی توجہ دلائی ہے میں بھی ان کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرا رہا ہوں اگر ہوسکے تو آپ غور کریں۔

۱۔ سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ صرف تین عنوانات ہی شائع کریں یعنی اول، دوم اور سوم۔ تمام عنوانات شائع کرکے صفحات ضائع نہ کریں۔

۲۔ ہم طرح اشعار کا سلسلہ غیر دلچسپ اور بیکار ہے۔ "ایوانِ اردو دہلی" کے قیمتی صفحات ضائع ہو رہے ہیں اس کالم کی جگہ انعامی غزل کا سلسلہ شروع کریں تو بہتر ہوگا۔

۳۔ بلا عنوان کہانی کا سلسلہ بھی بہتر رہے گا سب سے اچھے عنوان پر انعام رکھا جائے۔

—— منظور وقار، گلبرگہ شریف

○ جولائی کا شمارہ نظر سے گزرا۔ تمام مشمولات نظر سے گزرے سبھی مضامین نثر و نظم قابلِ قدر اور مطالعہ طلب۔ پھر بھی جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کا مضمون موضوع کے اعتبار سے غور طلب ہے۔ حصۂ نظم میں جناب خوش دیومینی کی غزل نے اتنا لطف دیا کہ میں یہ خط پہلی بار "ایوانِ اُردو دہلی" کے کسی شمارے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر کر رہا ہوں۔

—— روشن، وارانسی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا جولائی ۸۸ء کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ شفق کا افسانہ "چٹکی بھر زندگی" بے حد پسند آیا۔ ایک عام بات کو جو ہمارا آپ کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے شفق نے بڑے ہی متاثر کن انداز میں افسانے کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ افسانے کا کلائمکس واقعتاً دل کو چھو لیتا ہے۔

دراصل ادھر ہمارے افسانہ نگار عظیم موضوعات کو شکار کرنے کی تاک میں رہتے ہیں اور اس کوشش میں اکثر پہاڑ کھود کر چوہیا برآمد کرتے ہیں۔ اگر افسانہ نگار کی نگاہ تیز اور مشاہدہ گہرا ہو تو زندگی کا ہر گام ایک افسانہ اور ہر موڑ ایک کہانی ہے۔

—— سلام بن رزاق، بمبئی

○ جولائی ۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظرنواز ہوا۔ "سمندر کے نیچے کی دُنیا۔ ماضی اور مستقبل" معلوماتی ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر تشنگی بڑھ گئی۔ اور سمندر کے نیچے کی دُنیا سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے دل میں کرید پیدا ہوگئی۔ اس سلسلے میں تفصیلی مضمون دستیاب ہو تو شائع فرمائیں۔

م۔ ق۔ خاں کا افسانہ "نوشیرواں" پسند آیا۔ لیکن ایک نکتے پر ذہن کام نہیں کرتا کہ ایک ضعیفہ کی جھونپڑی مسمار کرنے کے لیے "بلڈوزر اور ٹینکوں کی قطار جھونپڑی کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی"۔ کیا یہ کام ایک ٹینک سے نہیں ہو سکتا؟

—— ڈاکٹر ابوالبرکات، سہسوان

○ مَیں "ایوانِ اُردو دہلی" کا ایک قدیم قاری اور شیدائی ہوں بلکہ مَیں تو یہ کہوں گا کہ یہ میری رُوح کی غذا ہے۔

مَیں نے اُردو کے بہت سارے رسالے دیکھے ہیں مگر اس میں جو خوبی ہے وہ دوسرے رسائل کو نصیب کہاں۔ کتابت، طباعت بھی ماشاء اللہ شاندار ہے کہا جا سکتا ہے کہ:

کونسا حسن ان اوراق پریشاں میں نہیں
پھول وہ تم نے چُنے ہیں جو گلستاں میں نہیں

—— عبدالحق انصاری، رانچی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا جولائی کا شمارہ مطالعہ میں آیا۔ یہ رسالہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو اس کے مضامین، مقالات، افسانے اور غزلیں وغیرہ سب ہی معیاری، معلومات افزا، گوناں گوں اسلوب کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن "ہم طرح اشعار" کی ہزار رنگ دبو والی محفل، اور سرورق کے اندرونی صفحے کی تصاویر کے عنوانات بھی خوب ہوتے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ "ایوانِ اُردو دہلی" نے بہت تھوڑے عرصہ میں معیاری جرائد کی صف میں اپنا جو مقام پیدا کر لیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کے حُسنِ ذوق کے ساتھ محنت، لگن اور ذہن آخاذ کی کرشمہ سازی اور اس کا ثمرہ ہے۔

جولائی کے شمارے میں جو مصرعۂ طرح دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے عمر کہ مَیں آشنائے خواب نہیں

اس سے متعلق کچھ ہم طرح اشعار پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور ساتھ ہی قارئین "ایوانِ اُردو دہلی" کی معلومات کے لیے اُس تاریخی آل انڈیا طرحی مشاعرہ کا تذکرہ کر دینا بھی چاہتا ہوں جو اس طرح میں ہمارے ٹونک میں منعقد ہوا تھا۔

یادش بخیر۔ اب سے ۵۲ سال پہلے اپریل ۱۹۳۶ء میں راجستھان کی سابق مسلم ریاست ٹونک میں بعہد نواب سعادت علی خاں، ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا مصرعِ طرح یہی تھا۔ اس مشاعرے میں سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، جگر مرادآبادی حتّٰی کہ بوم میرٹھی نے بھی شرکت کی تھی اور طرح غزلیں پڑھی تھیں۔

شاعرِ رومان اختر شیرانی اس زمانے میں لاہور سے رسالہ "رومان" نکالا کرتے تھے، اختر صاحب نے اس مشاعرے کا انتخاب مئی/جون کے شماروں (دو قسطوں) میں شائع کیا تھا، اور ساتھ ہی اس زمین میں اپنی غزل اور غزل کے ساتھ کچھ ایسے اشعار بھی شائع کیے تھے، جن سے ان کے اپنے وطن ٹونک سے تعلق قلبی اور جذبات فرحت کا اظہار ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

بُجھا سا رہتا ہے دِل جب سے ٹونک چھوٹا ہے
وہ صحن باغ نہیں سیرِ ماہتاب نہیں
بسے ہوئے ہیں نگاہوں میں وہ حسیں کوچے
ہر ایک ذرّہ جہاں کم ز آفتاب نہیں
وہ باغ اور وہ باغوں کا دِل نشیں منظر
کہ جن کے ہوتے ہوئے خُلد مثل خواب نہیں
وہ سرد اور مصفّٰے بناس کا پانی
شراب سے نہیں کچھ کم مگر شراب نہیں
برنگ زُلف پریشاں وہ موج ہائے رواں
کہ جن کی یاد میں راتوں کو فکرِ خواب نہیں
وطن کا چھیڑ دیا کس نے تذکرہ اختر
کہ چشمِ شوق کو پھر آرزوئے خواب نہیں

اس تاریخی مشاعرے کی دِلچسپ یادوں میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مشاعرے میں دوسرے روز جب شمع حضرت بوم میرٹھی کے سامنے آئی تو انھوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں غزل پڑھی لیکن جب مقطع پڑھا تو نواب سعادت علی خاں کبیدہ خاطر ہو کر مشاعرے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ محفل میں سناٹا چھا گیا اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ بالآخر سب نے معذرت کی اور بوم نے معافی چاہی، اس طرح نواب صاحب کا تکدر ہوا، بات آئی گئی ہو گئی، لیکن مقطع اپنی جگہ رہا۔ مقطع میں بوم صاحب نے اپنے تخلص کی رعایت کے پیشِ نظر ظریفانہ شوخی سے کام لیا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

بناؤ ٹونک میں اے بوم آشیاں اپنا
یہ وہ جگہ ہے جہاں کی فضا خراب نہیں

بوم صاحب نے مصرعۂ طرح پر گرہ بھی لگائی تھی:

کبھی نہ چین سے سونے دیا جدائی نے
ہوئی ہے عمر کہ مَیں آشنائے خواب نہیں

معاف کیجیے کا خط طویل ہو گیا، مگر "نوشتن بجائے خود" کے پیشِ نظر دراز نویسی سے کام لیا۔ اب چند "ہم طرح اشعار" پیش کر کے رُخصت ہوتا ہوں۔

شبِ بہار میں زُلفوں سے کھیلنے والے
ترے بغیر مجھے آرزوئے خواب نہیں

—— (اختر شیرانی)

وہیں سے اُٹھتے ہیں ہر انقلاب کے بادل
وہ میکدہ کہ جہاں کوئی انقلاب نہیں

—— (بسمل سعید)

مری وفا میں نہ اُن کی جفا میں فرق آیا
عجیب دَور ہے یہ جس کو انقلاب نہیں

—— (اطہر باوفا)

ادا کا، ناز کا انداز کا جواب نہیں
بَلا ہے، قہر ہے، آفت ہے یہ شباب نہیں

—— (نواب سعادت علی خاں سعید و[illegible])

—— رفیع احمد برکاتی، ٹونک

فون نمبر:
۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۳۴۴۸

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۵ ● فی کاپی ۵۰ر ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● ستمبر ۱۹۸۸ء

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے شمع آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

ہر سال کی طرح اس سال بھی ۱۵ اگست کو یومِ آزادی کی تقریبات ملک بھر میں دھوم دھام سے منائی گئیں۔

لال قلعے سے ہندوستانی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی نے ان کامیابیوں کا ذکر کیا جو ملک نے زرعی اور صنعتی شعبوں میں حاصل کی ہیں۔ یہ کامیابیاں بلاشبہ آزادی کی دین ہیں۔ آزادی سے پہلے ہم اس موقف میں نہیں تھے کہ اپنا بُرا بھلا خود سوچ سکیں یا اپنی سوچی ہوئی تجاویز کو عملی شکل دے سکیں۔ ہمارا یہ اختیار آزادی کا مرہونِ منت ہے۔

وزیرِ اعظم نے ان مسائل کا بھی ذکر کیا جن سے ہمارا ملک ان دنوں دوچار ہے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ان ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی کرائی جو ملک کے ہر شہری پر عائد ہوتی ہیں۔ سیاسی اختلافات جمہوریت کا خاصہ ہیں لیکن یہ بھی جمہوریت کا تقاضا ہے کہ یہ اختلافات ملک و قوم کے مجموعی مفادات پر غالب نہ آنے پائیں۔ ان مفادات کو پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ فکر و عمل کے کامل اتحاد کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔

اس وقت ملک کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ اس اندازِ نظر کا فروغ ہے کہ اپنے مطالبات بہ زورِ تشدد منوانے کی کوشش کی جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت میں تشدد کی کوئی گنجائش نہیں۔ جمہوریت میں اپنے اختلافات دور کرنے کا واحد راستہ افہام و تفہیم ہے یا پھر پُر امن ذرائع سے اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامّہ کو ہموار کرنے کی کوشش۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہوسکتی ہے اور کسی وجہ سے ناکام بھی لیکن ناکامی کی صورت میں جھنجھلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا ہو جانا اور اپنی بات منوانے کے لیے غیر جمہوری طریقے اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر ایک بار تشدد اور جوابی تشدد کا سلسلہ چل پڑے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں جاکر ختم ہوگا البتّہ اس کے تباہ کن اثرات کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں خاصی مضبوط ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں پُر امن بقائے باہم کے اصول کو استحکام دینے میں بھی ہمارے ملک کا خاص کردار رہا ہے۔ اسی اصول کی پاسداری ہماری داخلی سلامتی کے لیے بھی ضروری ہے۔ بقول پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی قوم کثرت میں وحدت کی شان رکھنے والی قوم ہے۔ اس قوم کا یہ امتیاز قائم رہنا چاہیے۔ کسی ایک فرقے یا طبقے کا یہ بھرم کہ وہ کسی دوسرے فرقے یا طبقے کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کا حقدار ہے، قومی یک جہتی کے اس تصور کے عین منافی ہے جو اکابرِ قوم کو ہمیشہ عزیز رہا ہے اور جسے قبول کیے بغیر ایک جمہوری سماج کی تعمیر و ترقی ممکن نہیں۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

دہلی کے نئے لیفٹننٹ گورنر
اور
اُردو اکادمی، دہلی کے نئے چیئرمین

جنابِ رومیش بھنڈاری کو، جو ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء کو فارن سیکریٹری کے عہدے سے رٹائر ہوئے ہیں، دہلی کا نیا لیفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف اُر
اکادمی، دہلی کے چیئرمین بھی ہوں گے۔

بھنڈاری صاحب کی تاریخ ولادت ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء ہے۔ آپ کے والدِ محترم پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

بھنڈاری صاحب کا تعلیمی کیریر بہت شاندار رہا ہے۔ ایچ۔ ایس سی کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر آپ نے چرچل ہاؤس میڈل حاصل کی
اور ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں سرِ فہرست رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے آپ نے اقتصادیات میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی
اور کیمبرج کی ہندوستانی مجلس کے صدر رہے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کے محکمۂ امورِ خارجہ سے وابستہ ہوئے اور نیویارک میں وائس کونسلر کی حیثیت سے کام کیا۔ واپسی پر آپ
فروری ۱۹۵۶ء سے جولائی ۱۹۶۱ء تک جناب وی۔ کے کرشنا مینن کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے جو اُن دنوں وزیرِ بے قلمدان تھے اور بعد میں وزیرِ دفاع ہوئے۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک متعدد عہدوں پر فائز رہنے کے بعد آپ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک تھائی لینڈ میں اور ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک
عراق میں ہندوستان کے سفیر رہے۔

فروری ۱۹۷۷ء میں بھنڈاری صاحب وزارتِ خارجہ کے ایڈیشنل سیکریٹری مقرر ہوئے، اس عہدے پر آپ نے جولائی ۱۹۷۹ء تک کام کیا
یکم اگست ۱۹۷۹ء کو آپ نے اسی وزارت میں سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔

یکم فروری ۱۹۸۵ء کو جنابِ رومیش بھنڈاری حکومتِ ہند کے خارجہ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ خارجہ سیکریٹری کی حیثیت سے بھنڈاری صاحب نے "پڑوسی
ملکوں سے تعلّقات استوار کرنے" کی ذمّہ داری سنبھالی جو وزیرِ اعظم کی اعلان کردہ پالیسی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں وزیرِ اعظم کی ہدایت پر انھوں نے جنوب ایشیائی ممالک
کے کئی دورے کیے اور علاقائی مسائل پر ان ممالک کے سربراہوں سے نتیجہ خیز گفتگو کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سری لنکا میں لسانی تنازعے کو حل کرنے میں ہندوستانی
کوششوں کے ساتھ وابستہ رہے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری نے گزشتہ چند برسوں میں ہونے والی متعدد چوٹی کانفرنسوں کی تیاری میں حصّہ لیا۔ ہوانا میں منعقدہ چھٹی ناوابستہ ممالک کی کانفرنس،
۱۹۸۰ء میں منعقدہ دولِ مشترکہ کے سربراہوں کی کانفرنس، ۱۹۸۱ء کی کانکن چوٹی کانفرنس، ۱۹۸۳ء میں نئی دہلی میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کی کانفرنس، نیویارک
میں جنرل اسمبلی کی ۳۸ ویں نشست کے موقعے پر سربراہانِ حکومت کی یکجائی، ۱۹۸۳ء میں نئی دہلی میں اور ۱۹۸۵ء میں نساؤ میں دولِ مشترکہ کے سربراہوں کی کانفرنس
اور ۱۹۸۵ء میں ڈھاکہ میں منعقدہ سارک ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے انتظامات میں بھنڈاری صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا۔

بھنڈاری صاحب کئی زبانیں بہ آسانی بول لیتے ہیں۔ اُردو، ہندی اور فارسی کے علاوہ وہ فرانسیسی، اسپینی اور رُوسی بھی جانتے ہیں۔ بھنڈاری صاحب
کھیلوں کے شیدائی ہیں اور گولف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ مذاہب اور فنون کے تقابلی مطالعے سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کا عہدہ سنبھالتے وقت جنابِ رومیش بھنڈاری کُل ہند کانگریس کمیٹی (آئی) کے شعبۂ امورِ خارجہ کے صدر اور ہندوستان کی آزادی
کی چالیسویں سالگرہ نیز پنڈت جواہر لال نہرو کا صد سالہ جشنِ ولادت منانے والی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ وہ کُل ہند دیہی ترقیات کونسل کے صدر اور آل انڈیا
شیڈول کاسٹ اینڈ شیڈول ٹرائبس کانگریس (آئی) نیز افرو ایشین اسٹڈیز کی ہندوستانی سوسائٹی کے سرپرست بھی تھے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری نے پٹیالے کے مہاراجہ بھوپندر سنگھ کی صاحبزادی سے شادی کی۔ دو اولادیں ہوئیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔

حرفِ آغاز

ہر سال کی طرح اس سال بھی ۱۵ اگست کو یومِ آزادی کی تقریبات ملک بھر میں دھوم دھام سے منائی گئیں۔

لال قلعے سے ہندوستانی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی نے ان کامیابیوں کا ذکر کیا جو ملک نے زرعی اور صنعتی شعبوں میں حاصل کی ہیں۔ یہ کامیابیاں بلاشبہ آزادی کی دین ہیں۔ آزادی سے پہلے ہم اس موقف میں نہیں تھے کہ اپنا بُرا بھلا خود سوچ سکیں یا اپنی سوچی ہوئی تجاویز کو عملی شکل دے سکیں۔ ہمارا یہ اختیار آزادی کا مرہونِ منت ہے۔

وزیرِ اعظم نے ان مسائل کا بھی ذکر کیا جن سے ہمارا ملک ان دنوں دوچار ہے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ان ذمہ داریوں کی یاددہانی بھی کرائی جو ملک کے ہر شہری پر عائد ہوتی ہیں۔ سیاسی اختلافات جمہوریت کا خاصہ ہیں لیکن یہ بھی جمہوریت کا تقاضا ہے کہ یہ اختلافات ملک و قوم کے مجموعی مفادات پر غالب نہ آنے پائیں۔ ان مفادات کو پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ فکر و عمل کے کامل اتحاد کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔

اس وقت ملک کو جو سب سے بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ اس اندازِ نظر کا فروغ ہے کہ اپنے مطالبات بہ زورِ تشدد منوانے کی کوشش کی جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت میں تشدد کی کوئی گنجائش نہیں۔ جمہوریت میں اپنے اختلافات دور کرنے کا واحد راستہ افہام و تفہیم ہے یا پھر پُرامن ذرائع سے اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہوسکتی ہے اور کسی وجہ سے ناکام بھی لیکن ناکامی کی صورت میں جھنجھلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا ہوجانا اور اپنی بات منوانے کے لیے غیر جمہوری طریقے اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر ایک بار تشدد اور جوابی تشدد کا سلسلہ چل پڑے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں جاکر ختم ہوگا البتہ اس کے تباہ کن اثرات کا اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں خاصی مضبوط ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں پُرامن بقائے باہم کے اصول کو استحکام دینے میں بھی ہمارے ملک کا خاص کردار رہا ہے۔ اسی اصول کی پاسداری ہماری داخلی سلامتی کے لیے بھی ضروری ہے۔ بقول پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی قوم کثرت میں وحدت کی شان رکھنے والی قوم ہے۔ اس قوم کا یہ امتیاز قائم رہنا چاہیے۔ کسی ایک فرقے یا طبقے کا یہ بھرم کہ وہ کسی دوسرے فرقے یا طبقے کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کا حقدار ہے، قومی یک جہتی کے اس تصور کے عین منافی ہے جو اکابرِ قوم کو ہمیشہ عزیز رہا ہے اور جسے قبول کیے بغیر ایک جمہوری سماج کی تعمیر و ترقی ممکن نہیں۔

——— سید شریف الحسن نقوی

دہلی کے نئے لیفٹننٹ گورنر
اور
اُردو اکادمی، دہلی کے نئے چیئرمین

جنابِ رومیش بھنڈاری کو، جو ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء کو فارن سیکریٹری کے عہدے سے رٹایر ہوئے ہیں، دہلی کا نیا لیفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف اُردو اکادمی، دہلی کے چیئرمین بھی ہوں گے۔

بھنڈاری صاحب کی تاریخِ ولادت ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء ہے۔ آپ کے والدِ محترم پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

بھنڈاری صاحب کا تعلیمی کیریر بہت شاندار رہا ہے۔ ایچ۔ ایس ہی کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر آپ نے چرچل ہاؤس میڈل حاصل کیا اور ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں سرِ فہرست رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے آپ نے اقتصادیات میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ اور کیمبرج کی ہندوستانی مجلس کے صدر رہے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کے محکمۂ امورِ خارجہ سے وابستہ ہوئے اور نیویارک میں وائس کونسلر کی حیثیت سے کام کیا۔ واپسی پر آپ فروری ۱۹۵۷ء سے جولائی ۱۹۶۱ء تک جناب وی۔ کے کرشنا مینن کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے جو اُن دِنوں وزیرِ بے قلمدان تھے اور بعد میں وزیرِ دفاع ہوئے۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک متعدد عہدوں پر فائز رہنے کے بعد آپ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک تھائی لینڈ میں اور ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک عراق میں ہندوستان کے سفیر رہے۔

فروری ۱۹۷۷ء میں بھنڈاری صاحب وزارتِ خارجہ کے ایڈیشنل سیکریٹری مقرر ہوئے، اس عہدے پر آپ نے جولائی ۱۹۷۹ء تک کام کیا۔ یکم اگست ۱۹۷۹ء کو آپ نے اسی وزارت میں سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔

یکم فروری ۱۹۸۵ء کو جنابِ رومیش بھنڈاری حکومتِ ہند کے خارجہ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ خارجہ سیکریٹری کی حیثیت سے بھنڈاری صاحب نے "پڑوسی ملکوں سے تعلّقات استوار کرنے" کی ذمّہ داری سنبھالی جو وزیرِ اعظم کی اعلان کردہ پالیسی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں وزیرِ اعظم کی ہدایت پر انھوں نے جنوب ایشیائی ممالک کے کئی دورے کیے اور علاقائی مسائل پر ان ممالک کے سربراہوں سے نتیجہ خیز گفتگو کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سری لنکا میں لسانی تنازعے کو حل کرنے میں ہندوستانی کوششوں کے ساتھ وابستہ رہے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری نے گزشتہ چند برسوں میں ہونے والی متعدد چوٹی کانفرنسوں کی تیاری میں حصّہ لیا۔ ہوانا میں منعقدہ چھٹی ناوابستہ ممالک کی کانفرنس، ۱۹۸۰ء میں منعقدہ دولِ مشترکہ کے سربراہوں کی کانفرنس، ۱۹۸۱ء کی کانکن چوٹی کانفرنس، ۱۹۸۳ء میں نئی دہلی میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کی کانفرنس، نیویارک میں جنرل اسمبلی کی ۳۸ ویں نشست کے موقعے پر سربراہانِ حکومت کی یکجائی، ۱۹۸۳ء میں نئی دہلی میں اور ۱۹۸۵ء میں نساؤ میں دولِ مشترکہ کے سربراہوں کی کانفرنس اور ۱۹۸۵ء میں ڈھاکہ میں منعقدہ سارک ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے انتظامات میں بھنڈاری صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا۔

بھنڈاری صاحب کئی زبانیں بہ آسانی بول لیتے ہیں۔ اُردو، ہندی اور فارسی کے علاوہ وہ فرانسیسی، اسپینی اور رُوسی بھی جانتے ہیں۔ بھنڈاری صاحب کھیلوں کے شیدائی ہیں اور گولف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ مذاہب اور فنون کے تقابلی مطالعے سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کا عہدہ سنبھالتے وقت جنابِ رومیش بھنڈاری کُل ہند کانگریس کمیٹی (آئی) کے شعبۂ امورِ خارجہ کے صدر اور ہندوستان کی آزادی کی چالیسویں سالگرہ نیز پنڈت جواہر لال نہرو کا صد سالہ جشنِ ولادت منانے والی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ وہ کُل ہند دیہی ترقیات کونسل کے صدر اور آل انڈیا شیڈول کاسٹ اینڈ شیڈول ٹرائبس کانگریس (آئی) نیز افرو ایشین اسٹڈیز کی ہندوستانی سوسائٹی کے سرپرست بھی تھے۔

جنابِ رومیش بھنڈاری نے پٹیالے کے مہاراجہ بھوپندر سنگھ کی صاحبزادی سے شادی کی۔ دو اولادیں ہوئیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی، دونوں شادی شدہ ہیں۔

زندگی میری نظر میں

جولائی ۸۸ء کے شمارے میں اکبر علی خاں عرشی زادہ کا مضمون "فیض اور اختر شیرانی کچھ اشارے" شائع ہوا تھا۔ اس مضمون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہمیں مشہور شاعر خلیل تنویر صاحب نے جو خط لکھا ہے وہ نیچے درج کیا جارہا ہے۔ خلیل تنویر صاحب نے اختر شیرانی کی ایک ریڈیائی تقریر بھی ہمیں ارسال کی ہے جو اپنے عہد کے ممتاز ادبی رسالے 'ساقی' دہلی کے جون ۴۲ء کے شمارے میں چھپی بھی تھی۔ یہ تقریر ایک اہم شاعر کے شعری اور فنی نظریات کو ظاہر کرتی ہے اس لیے ہم ان صفحات پر اسے دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔

۱۵ر جولائی ۱۹۸۸ء

آپ کی کوششوں سے "ایوانِ اردو" برابر خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔ جولائی کے شمارے میں ذاکر صاحب کا خطبۂ صدارت شائع کر کے آپ نے اردو والوں کو دعوتِ فکر دی ہے۔ اکبر علی صاحب کا مضمون "فیض اور اختر شیرانی کچھ اشارے" بہت اہم مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے جن حقائق کی نشان دہی کی ہے، ان سے اُردو والوں کی انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارا ادب ہمیشہ انتہا پسندی کا شکار رہا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اس وقت ایک خاص طرزِ فکر کے ادبا کو اچھالا جاتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر جدیدیت کا رجحان فروغ پانے لگا۔ لیکن یہ رجحان بھی انتہا پسندی کا شکار رہا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اختر شیرانی اُردو شعر و ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اثرات فیض اور ن۔م۔ راشد کی ابتدائی شاعری میں آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا۔ اکبر علی صاحب نے اپنے مضمون میں غالباً پہلی بار اس طرف دھیان دلایا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "اختر شیرانی سے اپنے نیازمندانہ تعلقات کے ذکر کے باوجود فیض نے خود کہیں یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ براہِ راست اختر شیرانی سے متاثر ہیں"۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اختر شیرانی نے ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ساقی شمارہ جون ۴۲ء میں اختر شیرانی کا مضمون "زندگی میری نظر میں" شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فیض نے اختر شیرانی سے متاثر ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو۔

اختر شیرانی کے مضمون "زندگی میری نظر میں" کی فوٹو کاپی ارسال کر رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو ایوانِ اُردو میں شائع کرنے کی زحمت فرمائیں۔

آپ کا

خلیل تنویر

جس زمانے میں میری شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اُس زمانے میں ترقی پسندی کے نقطۂ تخیل کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس وقت علامہ اقبال مرحوم زندہ تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے خلاف بھی ایک ردِ عمل ضرور شروع ہو چکا تھا۔ ادبی طبقہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کوئی "حرفِ دل آویز" سننے کے لیے بیتاب تھا۔ میرے نزدیک یہی وجہ ہے کہ میری نظمیں "اے عشق کہیں لے چل"، "اعتراف محبت" اور "وہیں سے آنے والے بتا" وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ اور لوگوں نے میری توقع سے زیادہ ان کی پذیرائی کی۔

میں اقبال کو اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ ہم نے صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا اور جو زمانے کے دل کی دھڑکن کو پہچانتا تھا۔ اقبال کی ذہنی توانائی، اُس کی فراست، اس کے ادراک، اور اس کی صناعی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اس کے کلام میں ایک چیز، جس کی خطرناک حد تک کمی نظر آتی ہے یہ ہے کہ انسان اور فطرت پر اس کی نظر ایک فن کار کی نظر بن کر نہیں پڑتی۔ جس نظر سے وہ انسان اور فطرت اور ان کے باہمی تعلق کو دیکھتا ہے، اس کی تہ میں یہ احساس نہیں پایا جاتا کہ تخلیق کا مقصد ایک لازوال حسن، ایک جاودانی مسرت اور ایک ابدی لذت کی پیدائش ہے۔ اقبال فطرت اور انسان کے باہمی آہنگ کو نہیں دیکھتا۔ ان کے

مشترکہ سرچشمے کا اسے احساس نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے درمیان ایک ازلی کشمکش اور ایک دائمی آویزش کا قائل ہے، وہ فطرت کو انسان کے لیے آلۂ کار سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ وہ فطرت پر انسان کی برتری کا قائل ہے۔ اور فطرت پر غلبہ پانے کا اُسے حقدار سمجھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال دنیا کی کسی دو چیزوں میں آہنگ کا قائل نہ تھا۔ اس کے جس مفروضے پر بھی آپ نظر ڈالیں اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اس کے نزدیک ہر چیز دوسری چیز پر غالب آنے اور اسے گرا کر آگے بڑھنے کے لیے بیتاب ہے۔ اس کی شاعری میں عقل پر عشق کے غلبے، فطرت پر انسان کی حکومت، حسن پر افادیت کی فوقیت اور فرد پر قوم کی فضیلت کے تصورات بار بار آتے ہیں۔ اس کے ہاں خودی اور عمل کے نظریے بھی اسی کشمکش کے احساس کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ صرف فطرت پر ہی غلبہ پانے کے لیے انسانوں کو نہیں اُبھارتا بلکہ خود انسانوں کے اندر ایک جماعت کو دوسری جماعتوں پر یا زیادہ جماعتوں کو دوسری جماعتوں پر حکومت کرنے کی بھی تبلیغ کرتا ہے۔ اس تمام تخیل میں جو بنیادی غلط فہمی ہے، یہ ہے کہ شاعر کی نگاہ فطرت اور انسان یا انسانوں کے باہمی ربط و آہنگ کو دیکھ سکتی ہے نہ ان کے باہمی تعاون کی ضرورت ہی کو سمجھتی ہے اقبال کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانوں کے کسی نہ کسی گروہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت اس طریقے سے کرے کہ دوسرے گروہوں کی خودی پر غلبہ پانے کی راہیں آسان ہو جائیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ہر انسانی ضمیر کی خلوت گاہ میں بقول راشد "خودی کی جو ننھی سی قندیل" روشن ہے، اسے بھی چمکنے کا وہی حق حاصل ہے جو کسی برتر سے برتر چراغ کو ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے اس نگار خانے کی زینت و آرائش کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی ہر قندیل اپنی جگہ روشن ہے اور دوسری قندیلوں سے مل کر اور ان سے ہم آہنگ ہو کر اس نگار خانے میں رنگ اور نور کا ایک سیلاب برپا کرتی رہے۔ کوئی ایک قندیل دوسری قندیلوں کو اپنے ساتھ جنگ آزمائی کی دعوت دے نہ اسے چیلنج کرے نہ اسے بجھا کر خود شعلۂ جوالہ بن جانے کی خواہش رکھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی محسوس کیا کہ دنیا کو پیدا کرنے والی ہستی کا مقصد حسن اور مسرت کو عالمگیر اور دائمی بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف حسن و رنگینی اور نور و سرور کا ایک سیلاب ہے جو ہر چیز پر چھا رہا ہے۔ خدا نے جہاں فطرت کے مناظر کے اندر ایک سادہ اور دلکش حسن پیدا کیا ہے۔ وہیں انسان کے وجود میں بھی ایسی حسین صلاحیتیں رکھ دی ہیں کہ وہ فطرت کی زینت میں اضافے کا باعث ہوں، اور اس کے لیے غازہ و گلگونہ کی گلکاریاں بہم پہنچائیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے فطرت کے حسن اور اپنی اہمیت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اکثر فطرت کو اپنی ہوس نگاری اور زیاں کاری کا شکار بنایا ہے وہ فطرت کا دوست بننے کی بجائے اس کا رہزن بن گیا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کے پردے میں اس کی صورت کو مسخ کرنے میں مصروف رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان دنیا بھر کے جذبات سے زیادہ لطیف جذبے کو جس کا نام عشق ہے، اپنی شیطنت اور ہوس کا آلۂ کار بنا کر رہ گیا ہے۔ انسان نے فطرت کی اس نعمت کو فطرت کے حضور میں عبودیت کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی بجائے اکثر اس پر غالب آنے کا بہانہ بنایا ہے۔ انسان کی اس مکاری یا غلط فہمی کی وجہ سے فطرت کے ساتھ اور اپنے آپ کے ساتھ بارہا اس کی ٹکر ہوئی ہے۔ یہ ٹکر کہیں جرائم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے کہیں جنگ کی شکل میں اور کہیں معاشی مقابلہ بن کر۔ یہ سب مصیبتیں اس عقیدے کی پیدا کی ہوئی ہیں جو ایک انسان کی خودی پر دوسرے انسانوں کی خودی کو غالب دیکھنے کا قائل ہے۔ ہم رنگی اور اتحاد کا نہیں۔

جن لوگوں نے میرے کلام کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنی شاعری میں فلسفہ، سیاست یا اس قسم کے دوسرے بیرونی اور دُور از کار عناصر کو داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مجھے احساس ہے کہ میری شاعری اس آرزو کی پیداوار ہے کہ میں زندگی کے حسن کو زیادہ سے زیادہ روشن کر سکوں۔ مجھے کبھی تو مرجھائی ہوئی کلیوں کا حسن لبھاتا ہے، کبھی نغمے کی دلآویزی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کبھی رنگ اور نور کی فراوانی دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اور کبھی دنیا کے تمام رنگ و بو اور نور و نغمہ کی تمثیل یعنی کہ عورت کے جسم کی دلکشی پر مرمٹا ہوں۔ میری زندگی میں غم انگیز واقعات کی کمی نہیں۔ لیکن ان واقعات نے آج تک مجھے زندگی سے بیزار نہیں کیا۔ زندگی سے نفرت نہیں دلائی۔ بلکہ شاید زندگی کی ان ہی شوخیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی لازوال حقیقتوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا ہوں۔

میں نے جب شعر کہنا شروع کیا تھا تو شاعری کے افادی مقصد کا وہ تصور کہیں موجود نہ تھا جسے آج ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس تخیل نے کافی فروغ پا لیا۔ لیکن میں اسے مغربی فیشن کی تقلید سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ ترقی پسندی بھی یورپ والوں کی نقالی ہی کا ایک کرشمہ بن کر

رہ گئی ہے۔ اسے بھی مغربی عقل و فراست کے خزانوں سے اسی طرح جڑا گیا ہے جس طرح کئی اور عقیدے، رسمیں اور رواج ان کے ہاں سے ہم نے جڑائے ہیں۔ اقبال کی افادی شاعری میں فطرت، انسان کی ایک کنیز سہی لیکن خوبصورت اور دل کے قریب تر ہے۔ مگر ہمارے ترقی پسندوں کی شاعری کے ہاں تو اس کا چہرہ اتنا گھناؤنا اور مکروہ نظر آتا ہے کہ ایک خوش مذاق شاعر اُسے دور سے دیکھنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ شاعر کا کام زندگی کے حُسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں۔ زندگی میں "ہر کالے و ہر مردے" کا اصول ہر جگہ کار فرما ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی ہی سے اس کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً درزی کا کام آپ کے جسم کو چھپانا اور ایسے لباس سے چھپانا ہے جو آپ کے جسم پر خوبصورت معلوم ہو۔ لیکن اگر آپ کے پاؤں پر کوئی زخم ہو تو آپ درزی سے اس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ آپ کے جسم پر پوشاک پہنانے سے پہلے آپ کے زخم کا علاج بھی خود کرلے۔ کون نہیں جانتا کہ زخموں کو اچھا کرنا جراح یا طبیب کا کام ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام زندگی سے حسن حاصل کرکے انسانوں کی رُوح کو زیبائش دینا ہے۔ اس کا کام اُن کی روحوں کے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں کرنا یا ان کے علاج کی کوشش کرنا ہرگز نہیں۔ اسی لیے میں آج تک اس نام نہاد ترقی پسندی کا قائل نہیں ہوسکا جو ہمارے ملک میں بدقسمتی سے رواج پارہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے نے بعض ایسے ناگوار مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں جن سے گریز ممکن ہے نہ مصالحت۔ سیاست میں عوام کی آواز اور خیالات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اقتصادی کشمکش ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری دنیا کے نیم وحشی اور پسماندہ سے پسماندہ ملک بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ بلکہ شاید مہذب ملکوں سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور بے شمار گروہ اور ملک ہماری دنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرسکتے۔ لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی کرکے انھیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے کم نہ ہوگا۔ ان کا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے اور انھیں پر علاج کا فرض بھی عائد ہوتا ہے۔

شاعری افراد اور اقوام کے لیے ایک لطیف اور لذیذ غذا تو بن سکتی ہے جو ان کے ذائقے کی تشفی کرے اور ان کی عمدگی کو برقرار رکھے لیکن اس سے بیمار اور بوڑھی قوموں کے حق میں معجون شباب آور، کا کام لینا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک کو جس قدر بھی فروغ اب تک حاصل ہوا ہے۔ اس کا باعث اس کے بنیادی تصور کی دلکشی نہیں بلکہ اس کے لیبل کی دلکشی ہے۔ اس کے لیبل کو دیکھ کر ذہن سب سے پہلے ترقی کے لفظ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور اکثر لوگ اسی وجہ سے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس تخیل نے مزدور، کسان اور فقیر کی اہمیت کو تو نمایاں کیا ہے لیکن اس نے حکمت اور صناعی کے اس مفہوم کا خاتمہ کردیا ہے۔ جس نے شکسپیر، کالی داس، حافظ، سعدی اور غالب کے نام کو زندہ کیا تھا۔

مجھے اور میرے ہم خیال شعراء کو جن کے فن کا مقصد زندگی کے حسن کی پرستش اور پرورش کرنا ہے، عام طور پر رجعت پسند کہا جاتا ہے۔ ہمیں عام طور پر فراری کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اور ان ترقی پسند شاعروں کو فراری نہیں کہا جاتا جو زندگی کے بعض مکروہ اور ناگوار پہلوؤں کو نمایاں کرکے زندگی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی چیز ہمیں زندگی کے قریب لاسکتی ہے تو وہ صرف زندگی کے حسن کا احساس ہے۔

میرے نزدیک شاعر کے لیے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری ہو یا پھر اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لیے ان میں سے ایک بھی قابلِ توجہ نہیں۔ شاعر کی قدریں یعنی (VALUES) ان سب سے الگ اور آزاد ہیں۔ شاعر کی مثال شہد کی مکھی کی سی ہے۔ جو زندگی کے باغ سے حسن کی شادابیوں اور رنگینیوں کا رس لے کر دوسرے انسانوں کی مسرت اور تسکین کا سامان تیار کرتی ہے۔ اس کا کام باغ کو صیاد یا باغبان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا نہیں۔ نہ ان کے کام میں دخل دینا اس کے بس کی بات ہے۔

شاعری پر میں نے اس لیے آپ سے مفصل گفتگو کی کہ میں اپنی شاعری کو اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں جانتا۔ یہی میری زندگی کا تاروپود اور یہی میری زندگی کی روح رواں ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کو کسی اضافی چیز کے بغیر سمجھنا اور سمجھانا ویسے بھی ناممکن ہے۔ ایک عرصہ ہوا میں نے ایک سانٹ لکھا تھا جس میں میں نے اس احساس کو واضح کرنے

کی کوشش کی تھی کہ زندگی اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود ایک ایسی چیز ہے جسے سمجھنا ہمارے لیے بے حد دشوار ہے۔ یہ سانٹ میں آپ کو سناتا ہوں، اس میں میں نے زندگی کو ایک پرندے سے تشبیہ دی ہے جو راستہ بھول گیا ہو۔ کہیں پہنچنا چاہتا ہو لیکن افق کی پہنائیاں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں اور وہ آخر کار انھیں پہنائیوں کے قفس میں قید ہو کر رہ گیا ہو ـــ

زندگی مست ہے اس طائرِ ناداں کی طرح
جو ہو تنہا نگراں دور فضاؤں کی طرف
مہ و خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف
محوِ نظارہ کبھی نرگسِ حیراں کی طرح
اور کبھی بال فشاں بوئے خیاباں کی طرح
مسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیِ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف
نکہتِ گل کدۂ وسعتِ بیاباں کی طرح

آرزو اڑنے کی کرتی رہے بیتاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یونہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو
نارسائی کی خلش سے رہے بے خواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جسے

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوائیے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

ـــــ ادارہ

کرشن ادیب

بے صدا دیوار و در ہیں، بولتا کوئی نہیں
شہر سارا سو گیا ہے، جاگتا کوئی نہیں

شام، سورج اور سائے ہیں سبھی بھائی بہن
ہیں وہ تنہا رات، جس کا آشنا کوئی نہیں

پُشت پر قاتل کا خنجر، سامنے اندھا کنواں
بچ کے جاؤں کس طرف، اب راستا کوئی نہیں

دُور ساحل، تند موجیں اور طوفانی ہوا
غرق ہوتی کشتیوں کا ناخدا کوئی نہیں

وہ جو میرے ذہن و دل پر آج بھی ہے حکمراں
اُس کو دیکھے سال گزرے، رابطا کوئی نہیں

قہقہے سُنتی ہیں میرے، نیک دل یہ لڑکیاں
رُوح میں ہیں زخم کتنے، جھانکتا کوئی نہیں

گئے دِنوں کی پُرانی کہانیاں بھی گئیں
ہمارے دوست، تمہاری سہیلیاں بھی گئیں

بچھڑ کے تجھ سے میں اکثر اُداس رہتا ہوں
مرا وہ لہجہ، تبسّم، وہ شوخیاں بھی گئیں

بہت دنوں سے مقفّل ہے دِل کا دروازہ
گئے مکیں تو مرے گھر کی چابیاں بھی گئیں

کہیں تو ہوگا کوئی اِن کا منتظر ساحل
غموں کے گہرے سمندر میں کشتیاں بھی گئیں

لبوں کو پھول سمجھ کر جو چومتی تھیں ادیب
بہارِ حسن میں لپٹی، وہ تتلیاں بھی گئیں

یہ تو نہیں اب اور ستم گر نہ آئیں گے
لیکن تمہارے قد کے برابر نہ آئیں گے
ہم آئیں گے تو ہو کے رہِ مُستقیم سے
اوروں کی طرح بھول بھٹک کر نہ آئیں گے
اِس بار کھو دیا جو ہمیں پھر نہ پاؤ گے
اب کے جو ہم گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے
مل جُل کے آؤ بخش دیں اِن لمحوں کو دوام
یہ لمحے زندگی میں مکرّر نہ آئیں گے
کیا یہ لہو کا دور مرے سر پہ ختم ہے
کیا دوسروں کے سر پہ یہ خنجر نہ آئیں گے
ہم نے بھی کوئی گُل تو نہ پھینکے تھے اُس طرف
پتّھر کے کیا جواب میں پتّھر نہ آئیں گے
چہرے ستم گروں کے تو کیا ہوں گے بے نقاب
ان کے تو نام بھی سرِ محضر نہ آئیں گے
آئیں گے ہم بناتے ہوئے اپنے نقشِ پا
چل کر کسی کے نقشِ قدم پر نہ آئیں گے
محسنؔ یہ دور ختم سمجھیے اب اس کے بعد
گردش میں یہ پیالہ و ساغر نہ آئیں گے

محسن زیدی

حیات اللہ انصاری

اندھیر اجالا

اب جو سیٹھ جی نے اپنے ریشمی کرتے کے بائیں جانب سینے پر ہاتھ پھیرا تو سدھو کو یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کرتے کے نیچے بنڈی کی جیب میں ہے کوئی بھاری رقم۔ تبھی تو سیٹھ جی بس اسٹینڈ کی لائن میں کھڑے کھڑے اس کو دو بار ٹٹول چکے ہیں۔ اس بار ٹٹولتے میں ریشمی کرتے پر دو شکنیں آگئی تھیں۔ ان سے سدھو کی مشّاق نظروں نے پرس کی موٹائی کا بھی اندازہ لگا لیا۔ اب وہ بے چین تھا اس رقم کو ہتھیانے کے لیے لیکن کوئی ساتھی نظر نہیں آرہا تھا اور ساتھی کے بغیر اتنا بڑا ہاتھ مارنا استاد کی ہدایت کے خلاف تھا۔

اتنے میں ڈبل ڈیکر بس آگئی اور مسافر سوار ہونے لگے۔ سیٹھ جی تیسرے نمبر پہ تھے اور سدھو پانچویں نمبر پہ۔ لیکن اوپر چڑھنے میں جو دھکم پیل ہوئی تو سدھو جھپٹ کر سیٹھ جی کے بالکل پیچھے آگیا۔ اتنے میں کنڈکٹر کچھ لوگوں کو یہ کہہ کر روکنے لگا۔ لائن سے لائن سے لیکن دو مسافر تو چڑھ ہی گئے۔ ان میں سے ایک سوٹ پوش نے سنبھلتے میں سدھو کے کندھے کا سہارا لیا۔ سدھو نے ایک نظر اس پر ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ موہن ہے، وہی نظر سیٹھ جی کی طرف موڑ دی۔ ابھی بس چلی ہی تھی کہ موہن نے اپنی ناک کی نوک سے سیٹھ جی کی عینک اس طرح اچکا دی کہ وہ گر پڑی۔ وہ بے چلّایا۔

"ارے، ارے۔ ساری۔ ساری"

لوگ گری ہوئی عینک کو دیکھنے لگے۔ موہن چلانے کے ساتھ ہی سیٹھ جی کے ساتھ عینک اٹھانے کو جھک گیا۔ اس کا ہاتھ سیٹھ جی سے پہلے لگ گیا عینک میں۔ لیکن لوگوں کو ایسا لگا جیسے کہ یا تو بس کے ہلنے سے یا ہاتھ کے بے تکا لگنے سے عینک کھسک کر دوسری سیٹ کے نیچے چلی گئی۔

اب تو سب مسافر جھک جھک کر عینک کو دیکھنے لگے۔ دو ایک بتانے لگے کہ "وہ ہے"۔ "وہ اُدھر ہے"۔ سیٹھ جی جو جھکے تو ان کا ریشمی کرتا بھی جھک آیا۔ یہ موقع اور وقت بالکل ٹھیک تھا سدھو کے لیے۔ وہ بائیں ہاتھ سے بس کا ڈنڈا پکڑے اپنے کو سنبھال رہا تھا۔ اس نے داہنا ہاتھ سیٹھ کے کرتے کے نیچے ڈالا اور بات کی بات میں بھاری پرس نکال کر اپنی ران سے چپکا کر پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے ایسا کیا کہ بس کے ہلنے کی جھونک میں آکر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ یہاں آکر اس نے پرس کو اس تھیلی میں پہنچا دیا جس کا منہ پینٹ کی جیب میں کھلتا تھا۔ پھر اس منہ کو زپ سے بند کیا۔ اسی وقت دوسرے ہاتھ سے ایک ڈوری کھینچی جس سے تھیلی آکر داہنی ران کے اندر کی طرف چپک گئی۔

ادھر سدھو کا کام ختم ہوا اور ادھر سیٹھ جی کی عینک ان کی ناک پر پہنچ گئی۔ اب سدھو کو اس اندیشے نے گھیر لیا کہ ابھی سیٹھ جی اپنی جیب کو ٹٹول کر شور مچائیں گے کہ "ہائے ہائے میں لٹ گیا" اور پھر مسافروں کی تلاشی شروع ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چالاک آدمی میری ران کے اندر بھی ٹٹول لے۔ اب کیا کروں؟ اس وقت سدھو کو احساس ہوا کہ لالچ میں آکر میں جلدی کر گیا۔

سدھو نے بس کی رفتار دیکھی اور سڑک کے کنارے پر نظر ڈالی۔ پھر سوچنے لگا کہ اگر میں یہ کہتا ہوا کود جاؤں "ارے روکو، مجھے اس جگہ اترنا ہے" تو کیسا رہے گا۔ دو مرتبہ ایسا کر چکا ہوں لیکن ایک تو بس کی رفتار تیز ہے اور دوسرے جگہ ایسی ہی کہ میں جلد ہی کسی طرف چھپ نہیں سکتا۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ادھر میں کودوں اور ادھر سیٹھ جی اپنی جیب دیکھ کر چلّائیں۔ پھر تو سب مسافروں کو مجھی پر شک ہوگا اور بس رکوا کر دوڑ پڑیں گے۔ ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا کہ ظالم مسافروں نے ایک جیب کترے کو اتنا مارا کہ بیچارا اسپتال پہنچتے پہنچتے مر گیا۔

اب تو سدھو دل میں کہنے لگا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو اونچ نیچ نہیں دیکھی۔

گرو جی روز کہتے ہیں کہ فرار کی راہ دیکھ لو پھر مال پر ہاتھ ڈالو۔ اب کیا ہوگا؟

سیٹھ جی سنبھلے ہی تھے کہ مسافروں میں ایک کھدّر دھاری نے اٹھ کر موہن کے گال پر یہ کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا کہ "ابے سالے سوٹ والے اندھا بن کر بس پر چڑھتا ہے۔ ابھی ان کی عینک ٹوٹ جاتی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جواب میں موہن نے مسافر کے دو تھپڑ مارے اور گالیاں دے کر کہنے لگا۔

"تجھے کیا غرض جس کی عینک گری تھی اس نے تو کچھ نہیں کہا۔"

اب تو دونوں مار پیٹ میں لگ گئے۔ سدھو تھپڑ مارنے والے کھدّر دھاری کو پہچان گیا اور دل میں کہنے لگا۔ "ہے تو مجھے اس حرامزادے سے نفرت۔ لیکن اس وقت بہت کام آیا۔"

سیٹھ جی اور چند مسافر دونوں لڑنے والوں کو الگ

۲۵-۲۴۔ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

کرنے لگے۔ کنڈکٹر زور سے چلّایا،

"لڑائی بند کرو۔ ورنہ بس روک دوں گا۔"

اب تو سب مسافر چلّانے لگے: "لڑائی بند کرو لڑائی بند کرو۔" سیٹھ جی نے دونوں کو الگ کیا۔ مگر وہ الگ ہوتے ہی تھے کہ سیٹھ جی چلّائے۔

"ہائے میں لٹ گیا۔ کسی نے میری جیب کاٹ لی۔"

جس مسافر نے تھپڑ مارا تھا وہ آگے آکر بولا۔

"پہلے میری تلاشی لے لو۔"

موہن کہنے لگا: "پہلے میری تلاشی لے لو۔"

بس اسٹاپ قریب تھا اور بس دھیمی ہونے لگی تھی۔ اسٹاپ کے پاس مسافروں کی بھیڑ اکٹھا تھی۔ سدھو اچانک مسافروں کی طرف منہ کرکے چلّانے لگا۔

"ارے بیٹے" "ارے بیٹے" "تو اب تک کہاں تھا؟"

اور یہ کہہ کر دھیمی ہوتی ہوئی بس سے کود کر مسافروں کے جھنڈ میں گھس گیا اور پھر اس کے اندر سے نکل کر سڑک کے ایک موڑ کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا اور دو منٹ میں وہ بس والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس وقت سدھو کے دماغ میں اپنا کارنامہ گونج رہا تھا۔ اس نے اپنی پانچوں انگلیوں کو اس کام میں کتنی پھرتی اور ہوشیاری سے استعمال کیا تھا۔ گرو جی اپنے چیلوں سے کہا ہی کرتے ہیں کہ یہ کبھی نہ بھولنا کہ جب بھی تم دھیان سے کام کرو گے تو تمہاری دسوں انگلیاں دس ہاتھ ثابت ہوں گی۔ گرو اپنے چیلوں سے ایسی مشقیں بھی کرایا کرتے تھے کہ کبھی دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اور دوسری اور تیسری انگلیاں باندھ دیں اور ایک لڑکی کو جس کے سر میں جوئیں تھیں بٹھا کر کہا کہ اس کی جوئیں نکالو۔ جانے اس طرح کتنی مشقیں وہ کراتے رہتے ہیں۔

سامنے پیشاب خانہ تھا۔ سدھو وہاں چلا گیا اور پینٹ سے پرس نکالا۔ گننے کا موقع تو تھا نہیں۔ ہاں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہزاروں کی رقم ہے۔ اس نے فوراً اپنے جیب سے دس اور پانچ کے نوٹ جو اس کے پاس اس غرض سے موجود رہتے تھے نکال کر سیٹھ جی کے نوٹوں کے بیچ میں لگا دیے اور پھر وہ سب نوٹ اپنے پرس میں رکھ لیے۔

اب اگر تلاشی ہوئی تو سیٹھ کی بتائی ہوئی رقم سے سدھو کی رقم زیادہ نکلے گی۔ سیٹھ جی کا پرس نالی میں ڈال کر اس نے ٹھوکر سے اندر کر دیا۔ اب سدھو بے خوف ہو کر کہ میں پولیس کی زد سے بالکل باہر ہوں پیشاب خانے سے باہر آگیا۔

سدھو کو اس کارنامے کا بدمزہ حصہ اب یاد آیا۔ وہ تھا گردھاری چندر کا اس کی مدد کو آجانا۔ سدھو کا دل بولا مجھے یقین ہے کہ جو لڑکا میری سیتا کو اغوا کر لے گیا ہے وہ چندا کا بیٹا رام بھروسے ہی تھا۔ گواہوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیتا سے جب وہ اسکول جاتی تو ملتا رہتا تھا۔ اس کے سوا اور کسی لڑکے سے ملنے جلنے کی بات سننے میں نہیں آئی۔ اور جہاں تک خبر ملی ہے رام بھروسے بھی تبھی سے غائب ہے۔

سدھو نے سوچا کہ شام ہو رہی ہے۔ گرو جی سے ساڑھے نو بجے سے پہلے تو ملنا ہو نہیں سکتا ہے۔ اس لیے کیوں نہ ایک بوتل لے کر منّی بائی کے یہاں چلیں اور تین گھنٹے مزے کریں۔ یہ سوچ کر وہ شراب کی دکان کی طرف بڑھا تھا کہ بہادر مل گیا وہ تھا تو کنور جی کے گروہ کا لیکن سدھو سے بہت اچھی طرح ملتا تھا۔ بہادر سدھو سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا۔

"کسی طرف جا رہے ہو یا خالی ہو؟"

"یہ وقت کیا خالی ہونے کا ہے؟"

"وقت تو نہیں ہے لیکن ذرا دل بہلانے کو جی چاہ رہا ہے۔ چلو چاند بائی کے یہاں چل کر بیٹھیں۔"

سدھو نے دل میں کہا۔ یہ پروگرام بھی بُرا نہیں رہے گا۔

بولا "چلو"

راستے میں بہادر نے کہا۔

"کیا تمہارے گروہ میں کچھ نئے لوگ آگئے ہیں؟"

بہادر کی آواز میں کچھ ایسی کھٹک تھی کہ سدھو نے چونک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ہفتہ دس دن ہوئے میں اسٹیشن پر ایک گھات میں لگا ہوا تھا کہ گیٹ کے آگے پیچھے کسی نے میری جیب سے نیلا پار کر اڑا دیا۔ تب سے میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔"

"میرے گروہ میں تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے والوں میں سے کسی کی جیب کاٹے۔ اور پھر تم کو تو سب ہی پہچانتے ہیں۔ میں جانوں کالج کا کوئی چھوکرا ہوگا۔ وہ بھی ایسے کام کر ڈالتے ہیں۔"

"نہیں یار! میں ایسے رُخ سے تھا کہ کوئی مشّاق ہی قلم اڑا سکتا تھا۔"

"جانے بھی دو ایک پار کر کی کیا بات ہے۔"

"بات تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن میرے ایسے کی جیب کٹ جائے۔ یہ چیز مجھے بہت کھل رہی ہے۔ اب چلو پی کر غم غلط کریں۔ تمہارا کام کچھ بن گیا یا نہیں۔"

"کچھ بن تو گیا ہے۔ چلو۔"

جب صحبت جم گئی تو ہنسی ہنسی میں سدھو نے بہادر سے پوچھا۔

"یار یہ تو بتا دو یہ چندر کیسا آدمی ہے؟"

"اس کو پوچھتے ہو۔ ایسا آدمی نہ تو تمہارے گروہ میں نکلے گا اور نہ ہمارے گروہ میں۔ اس نے آج تک خود ایک کام بھی نہیں کیا۔ لیکن کاٹے وقت پر اس طرح ہم لوگوں کے کام آجاتا ہے کہ اس کا احسان ماننا ہی پڑتا ہے اور خوشی خوشی ہم اس کو حصہ دے دیتے ہیں۔"

سدھو نے چونک کر پوچھا: "کس طرح مدد کرتا ہے وہ...؟"

بہادر نے قہقہہ مار کر کہا: "چار روز کی بات ہے کہ پرتاپ نے کچھ ایسا بھونڈا کام کیا کہ لوگ اس کو پکڑنے دوڑ پڑے اور وہ بھاگا۔ اس وقت چندر جانے کس طرف سے نکل کر ایسا بے تحاشا بھاگنے لگا کہ لوگوں نے پرتاپ کا پیچھا کرنا تو چھوڑ دیا اور اس کو پکڑ لیا۔ وہ

چلانے لگا۔

"ارے میری بیوی درد سے تڑپ رہی ہے مجھ کو ڈاکٹر کے پاس جانے دو۔"

لوگ اس کو تھانے لے گئے، وہاں پوچھ گچھ کی گئی تو چندر نے ڈاکٹر کا نسخہ دکھایا جس پر فوری لکھا تھا اور کہا کہ میں بیوی کی دوا لینے بھاگا جا رہا تھا۔ تھانے والوں نے تلاشی لی تو اس کے پاس بیس روپیہ سے بھی کم رقم نکلی۔ اور جس شخص کی جیب کٹی تھی وہ پانچ سو روپے سے اوپر کی رقم بتا رہا تھا۔ تب تو پکڑنے والوں نے چندر سے معافی مانگی اور تھانے والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ استاد کنور کو جب حال معلوم ہوا تو انہوں نے پرتاپ کی کمائی میں سے چندر کو تہائی رقم دلوادی اور کہا کہ اگر یہ مدد نہ کرتا تو تم آج جیل میں ہوتے۔ اس طرح کی جانے کتنی حرکتیں کر چکا ہے۔"

چاند چلبلی سی لڑکی تھی۔ دونوں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے اور لطف اٹھاتے رہے۔ سدھو پیشاب خانے چلا گیا۔ اور وہاں اپنی رقم دیکھی تو وہ پورے ساڑھے سات ہزار سے کچھ اوپر نکلی۔ اتنی رقم بہت دنوں کے بعد ملی تھی۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اس میں سے ماں کو کیا بھیجوں۔ اپنی ماں اور بہنوں کے اخراجات کا حساب اس کی سمجھ میں بالکل ہی نہیں آتا تھا۔ جب باپ مرے تھے تو گھر کی کل آمدنی تھی صرف ڈھائی سو روپے ماہوار اور کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا تھا اور اب وہ ہزار روپیہ ماہوار بھیجتا ہے لیکن پھر بھی برابر خط آتے رہتے ہیں کہ فلاں کی شادی کرنا ہے فلاں بہت بیمار ہے۔ فلاں حادثے کا شکار ہو گیا ہے، فلاں کے بچہ ہوا ہے اور فلاں کے بچہ ہونے والا ہے۔ سدھو کو تو ایسا نظر آتا تھا کہ اگر میں اپنی ساری آمدنی بھی بھیج دیا کروں تو بھی وہاں کچھ بھلا نہ ہوگا۔

۲

گروجی چار سال سے اپنا کام چھوڑ کر شنکر کے بھگت بن چکے تھے۔ مگر اتنا ضرور کرتے تھے کہ بے کار مگر ہوشیار نوجوانوں کو کام سکھا کر روزگار سے لگا دیتے تھے شام کو نو بجے رات تک پوجا پاٹھ کرتے تھے اور پھر شاگردوں سے ملتے تھے۔ لیکن شاگردوں کے دن بندھے ہوئے تھے۔ اس لیے دو تین سے زائد شاگرد ایک دن میں اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ آج سدھو اور موہن کا دن تھا دونوں مندر کے لان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ گروجی آگئے۔ پہلے انہوں نے واردات سنی پھر کہنے لگے۔

"جب بس اسٹاپ اتنی دور تھا تو کام کیوں کیا؟ کام کرنے سے پہلے سب ہی طرح کی باتیں دیکھنا ہوتی ہیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ سدھو تجھ کو تو میں بہت ہوشیار سمجھتا تھا اور تو نے ایسا کیا۔"

"گروجی غلطی تو ضرور ہوئی۔ مگر اس وقت میں نے سوچا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سونے کی چڑیا اگلے ہی بس اسٹاپ پر اتر جائے۔"

"اتر جاتا تو اتر جاتا۔ ایسے ایسے دسوں مل سکتے ہیں میں برابر کہتا رہتا ہوں کہ پہلے اپنی خیر منایا کرو پھر کارنامے کی سوچا کرو۔"

سدھو نے وہ بات کہی جو اس کے دماغ پر گھنٹوں سے مسلط تھی۔

"گروجی چندر ہمارے علاقے میں کیوں آیا؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں کسی کام سے جا رہا ہو اور تم لوگوں کو پھنستا ہوا دیکھ کر مدد پر آگیا ہو۔ اب تو ان لوگوں کا احسان ماننا ہی پڑے گا۔ اور ہاں حصہ بھی دینا ہوگا۔"

"گروجی اس کا احسان ماننا اور حصہ دینا یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ اس نے آج مجھ کو بچا لیا۔ لیکن میرا گھر بھی تو اسی کے بیٹے نے اجاڑا ہے۔ بس چلے تو میں اس آدمی کو پھنسوا دوں۔ سالا چندر ..... " (گالیاں)

"تجھے کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ آج کل کے پریم میں نہ صرف لڑکے کا قصور ہوتا ہے اور نہ صرف لڑکی کا۔ اب تو جو بھی کرتے ہیں دونوں مل کر کرتے ہیں۔"

پھر گروجی کہنے لگے۔

"سنو سدھو۔ میں کنور سے بات کر چکا ہوں۔ و
کہنے لگا گروجی میں تو اپنے شاگردوں کو روز سمجھاتا ہوں کہ
تم پریم کے چکر میں پڑے اور ادھر تمہارا فن بگڑا۔ کیونکہ
ہم لوگوں کی آمدنی اگر کسی دن دو تین ہزار ہو جاتی ہے تو
بھی تو ہوتا ہے کہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک پیسہ بھی نہ ملے
اس لیے ہم لوگوں کی بیویوں کو سگھڑ ہونا چاہیے۔ جو پر
کرنے سے نہیں، گھروں گھروں ڈھونڈھنے اور پوچھ گچھ
کرنے سے ملتی ہے ——— بیوی ایسی نہ ہوگی ت
پیسے کے لیے بدحواس رہو گے اور جہاں بدحواسی سے کا
کیا پھر یا تو عقل بہک جائے گی یا ہاتھ۔"

پھر کنور کہنے لگا "گروجی جب چندر اپنے
لونڈے کو لے کر میرے پاس آیا تو میں نے دو روز ا
کی جانچ پڑتال کی اور پھر چندر سے کہا کہ یہ اس قابل
نہیں ہے کہ اس کو یہ فن شریف سکھایا جائے۔ چند
سالے نے بہت واویلا مچایا اور خوشامد کی۔ لیکن میں
نہیں مانا۔"

گروجی بولتے گئے۔

"اور ہاں سدھو، مجھے یقین نہیں ہے کہ سیتا چ
کے لونڈے کے ساتھ بھاگی کیونکہ وہ لونڈا بڑا جاہل
بدصورت ہے اور دیکھنے ہی میں بدمعاش لگتا ہے۔ تیر
سیتا تو سندر ہے اور اسکول میں پڑھتی تھی۔"

"گروجی میں نے خوب پوچھ گچھ کر لی ہے۔ بول
کہ پہلے کسی نے دروازے پر صدا لگائی 'آئس کریم ...
آئس کریم' سیتا اس کو خریدنے نکلی۔ ذرا ہی دیر میں اسک
چلنے کی آواز آئی۔ میری بہنی کھٹک گئی تھی کہ اسکوٹر کے
آنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ پھر یہ کہاں سے آگیا۔ اس
نے باہر جا کر دیکھا تو سیتا اسکوٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی
رہی تھی۔ میں نے ان لوگوں سے جو موقع پر موجود تھے
پوچھا تو سب نے کہا کہ لڑکی جانے پر تیار نہیں تھی لیکن

اسکوٹر والے لڑکے نے بہت اصرار سے بلکہ زبردستی ہاتھ پکڑ کر اسے اسکوٹر پر بٹھالیا اور چل دیا۔"

" اسکوٹر پر زبردستی بٹھانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اور یہ بات بھی کہ آئس کریم . . . آئس کریم سنتے ہی وہ دوڑی چلی گئی۔ ضرور پہلے سے کچھ کہیں بدی ہو گی۔"

" گرو جی میرے بچے، کیا بتاؤں، کہتے بُرا معلوم ہوتا ہے، بے حد چٹورے ہیں۔ اس وجہ سے گھر میں شکر گھی وغیرہ جتنا بھی لاؤ سب اُڑ جاتا ہے۔"

پھر ذرا سوچ کر سدھو بولا۔

" ایک بات اور بھی ہے جو مجھے کھٹک رہی ہے، وہ یہ کہ جانے سے دو دن پہلے سیتا نے مجھ سے اکیلے میں پوچھا تھا کہ پتا جی آپ کے پاس پیسہ کیوں کر آتا ہے؟ اور یہ بات وہ کسی طرح بھی نہیں مانی کہ میں انگوٹھیاں بیچتا ہوں۔ تبھی میں کھٹک گیا تھا کہ کسی نے اسے سکھا پڑھا دیا ہے۔ اب تو یقین ہے کہ چندر کے لونڈے نے یہ کہہ کر بھڑکا دیا ہوگا کہ جو فن تمہارے پتا کے پاس ہے وہی میرے پاس بھی ہے۔ چلو میرے سنگ۔"

موہن کہنے لگا

" میں جانوں کہ چندر اس معاملے میں بے قصور ہے۔ اس نے آج مجھ سے جو باتیں کیں اس سے تو ایسا ہی پتہ چلتا ہے۔"

" کیا باتیں کیں؟" گرو جی نے پوچھا۔

موہن بولا۔

" چندر اگلے اسٹاپ پر میری طرف دیکھ کر اُتر گیا۔ میں اس کے بعد والے اسٹاپ پر جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر میں وہ آ گیا۔ اور آتے ہی سدھو کی تعریف کرنے لگا کہ کیا جیب کاٹی ہے۔ کرتے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اسی وقت سیدھا ہو گیا۔ واہ . . . . واہ میں نے سدھو کے کام کی تعریف سُنی تھی مگر آج خود دیکھ لیا۔ کمال ہے" یہ کہہ کر چندر کہنے لگا۔

" سدھو نے جو پرس نکالا تھا وہ کافی موٹا تھا۔ لیکن جب وہ کود کر گیا ہے تو اس کی پینٹ اور شرٹ کی جیبیں خالی لگ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی شخص نہیں تھا جو کہا جائے کہ پرس اس کو دے دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے بدن میں پرس کہاں اور کیوں کر چھپایا۔ یہ بتا دو تو زندگی بھر احسان مانوں گا۔"

یہ سن کر میں ہنسنے لگا اور بولا۔" ارے کرتب کی، یہ پوچھنا ہے تو گرو جی سے جا کر پوچھ۔ انھوں نے جانے ہم کو کیا کیا سکھا دیا ہے اور ابھی جانے کیا کیا سکھانے والے ہیں۔"

" ہم نے سنا ہے کہ تمھارے گرو جی ہر ایک کو شاگرد نہیں بناتے ہیں اور اپنے ہر شاگرد کو بھی سب باتیں نہیں بتاتے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

میں نے کہا۔" ہاں صحیح ہے۔"

پھر اس نے پوچھا

" میں نے یہ بھی سنا ہے کہ گرو جی کا حکم ہے کہ تم لوگ اپنے بیوی بچوں وغیرہ میں سے کسی کو بھی نہ بتاؤ کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

" ہاں گرو جی کا ایسا ہی حکم ہے۔"

" پھر تمھارے لڑکوں کو یہ فن کیوں کر آئے گا؟ اور اگر نہیں آئے گا تو وہ کمائیں گے کیوں کر؟"

" گرو جی جس لڑکے کو پسند کرتے ہیں اس کو اپنے طور پر یہ فن سکھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سکھاؤ ایسے شخص کو جو فن کو ڈھنگ سے برت سکے۔ اگر بے ڈھنگے کو سکھاؤ گے تو وہ بھی ڈوبے گا اور تم کو بھی لے ڈوبے گا۔"

چندر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا۔

" ٹھیک کہتے ہیں گرو جی۔ میں نے اپنے بیٹے کو سکھایا تو وہ بلا مشق کے کام کرنے لگا اور ایک دو بار جو کامیابی ہوئی تو ایسا اترایا کہ اپنے کو استاد سمجھنے لگا۔"

گرو جی یہ سن کر ہنسے اور کہنے لگے۔

" سکھانے سے پہلے میں صورت بھی دیکھتا ہوں کہ وہ دیکھنے میں شریف معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اگر کہیں شور مچ گیا کہ جیب کٹ گئی جیب کٹ گئی تو پہلے اس آدمی کو پکڑا جاتا ہے جس کی صورت گھٹیا آدمیوں کی سی ہوتی ہے۔ صورت کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ شاگرد نازک وقت میں حواس قائم رکھ سکتا ہے کہ نہیں۔ یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ٹھاٹ باٹ کا شوقین تو نہیں ہے۔ جیب کترے کو چاہیے جتنی دولت مل جائے لیکن اس کو رہنا چاہیے سیدھی سادی طرح۔ ورنہ لوگ سوچنے لگیں گے کہ اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ اسی طرح کی میں درجنوں باتیں دیکھ لیتا ہوں۔ تب شاگرد بناتا ہوں۔"

" بیٹا، وکیل بننا، کلرک بننا یا ٹیچر بننا آسان ہے، لیکن جیب کترا بننے کے لیے بڑا دل اور بڑا دماغ چاہیے۔ تم تو جانتے ہو کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کو شاگرد نہیں بنایا۔ حالانکہ جوان لڑکیاں عام طور سے شریف معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ جلد باز اور بے صبری ہوتی ہیں اور جہاں کوئی ان کی باتیں غور سے سننے اور صورت تکنے لگا بس سمجھ لیتی ہیں کہ اس کو مار لیا۔ کلکتہ کے استاد لڑکیوں کو جیب کترا بناتے ہیں لیکن وہ پکڑ لی جاتی ہیں اور ایسی پکڑ لی جاتی ہیں کہ سزا سے نہیں بچتیں۔"

پھر گرو جی نے پوچھا۔" چندر نے اور بھی کچھ کہا؟" موہن نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ سدھو پوچھ بیٹھا۔

" اس ماں کے . . . . نے اپنے بیٹے رام بھروسے کو کچھ فن ون بھی سکھا دیا تھا کہ نہیں؟"

موہن ہنسا اور بولا۔" ابھی اس کو صرف اوپر کی جیب سے قلم نکالنا ہی سکھایا تھا۔ مگر قلم نکالتے ایک بار پرس بھی نکالنا چاہا تو فوری پکڑ لیا گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ مار پیٹ کر چھوڑ دیا گیا۔ چندر کہتا تھا کہ جب وہ پکڑا گیا تو میں نے اُس کو سمجھا دیا کہ پرس

نکالنے سے پہلے کوٹ ہو یا شرٹ ہو اس کے جھول
اور بدن کے کساؤ کی پہچان ضروری ہے اور یہ کام
بھی بہت مشق سے آتا ہے۔"

پھر چندر کہنے لگا" وہ نکما ایسی باتوں کی طرف
دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ دیکھنا چاہیے کیا حشر ہوتا
ہے اس کا۔"

آخری فقرہ سن کر سدھو پریشان ہو گیا اور بولا۔

"سب کچھ بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔"

پھر گروجی نے پوچھا۔

"یہ تو بتاؤ سدھو سیٹھ جی کے پرس سے کتنی
رقم نکلی۔"

"ساڑھے سات ہزار۔"

"بہت اچھی رقم۔ مبارک ہو" گروجی نے
کہا" اور یہ بھی سن لو کہ ابھی تک کسی نے پولیس میں
اتنی رقم کے نکل جانے کی رپورٹ نہیں لکھائی ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رقم نمبر دو والی ہے۔"

سدھو بولا" تو پھر پولیس کو علم نہیں ہوگا۔
اس لیے اس کو حصہ دینے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں ہم نہ چاہیں تو نہ دیں۔ لیکن پولیس سے معاملے
کو صاف رکھنا ضروری ہے۔ ہم کم دیں مگر دیں ضرور،
وہ ایسی رقم کا احسان ضرور مانیں گے۔"

موہن نے پوچھا

"کیا کنورجی والوں کو بھی حصہ ملے گا؟"

"چندر کو حصے کے ساتھ انعام بھی ملنا چاہیے۔
میرے خیال میں پانچ سو دیے جائیں۔ پھر وہ لوگ جگہ جگہ
ہمارے کام آئیں گے۔ سبھی مل کر چلنا اچھا کام ہوتا ہے۔"

سدھو بگڑ کر بولا۔

"انعام دینا ہے تو کنورجی کو دو، وہ جسے چاہیں گے
دے دیں گے۔"

"چلو یوں ہی سہی۔"

۳

سدھو اپنے فن کا ماہر تھا۔ کام ایسا پلک جھپکتے میں
انجام دیتا تھا کہ اپنے تو اپنے دوسری پارٹی کے لوگ بھی
اس کی پھرتی پر حیران رہ جاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ آج چندر
تک جو فن کا بڑا ماہر تھا تعریف کر بیٹھا۔ لیکن اپنا کام ختم کرنے
اور محفوظ جگہ پہنچ جانے کے درمیان جو چند منٹ کا خطرناک
وقفہ گذرتا تھا۔ اس میں سدھو کو ایسا لگتا تھا کہ کہیں میرا
ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ پھر جیسے ہی وہ وقفہ گذر جاتا تو
اس پر ایک سرشاری سی چھا جاتی تھی۔ پھر تو اس کا جی چاہتا
تھا کہ اپنا کارنامہ سُنا سُنا کر خوشی مناؤں۔ مگر اس وقت وہ
عام طور سے تنہا ہوتا تھا۔ اور ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی کارنامے
کی باتیں وہ کس کو سناتا۔ پارٹی والے تو صرف یہ سُن کر کہ رقم
کتنی ملی ہے دوسری باتیں کرنے لگتے اور پارٹی سے
باہر کے لوگوں سے فن کی باتیں کرنے کی زبردست ممانعت
تھی۔ رنڈیوں سے جن کے پاس سدھو کبھی کبھی چلا جاتا تھا
جسمانی سکون تو مل جاتا تھا۔ لیکن ایسی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔
جس سے دل کو راحت ملے۔ رہا گھر سو آج کل تو سدھو
کو گھر سے الجھن ہوتی تھی۔ کیوں کہ وہاں صرف وہی باتیں
ملتی تھیں جن سے اس کو چڑ تھی۔

بس اگر دل کو کوئی چیز بہلا دیتی تھی تو وہ تھی شراب۔
اس نے کئی جگہیں بنا رکھی تھیں پینے کے لیے۔ ایک جگہ
ٹھرا پیتا تھا' دوسری جگہ وہسکی اور تیسری جگہ وہسکی
کے ساتھ خوبصورت ساقی بھی مل جاتی تھی۔ آج آمدنی
ایسی ہوئی تھی۔ ساتھیوں کا حصہ، پولیس کا حق، مشترکہ
فنڈ اور استاد کے نذرانے کے بعد بھی اس کے حصے
میں ۵ ہزار آئے تھے۔ نوٹ بھی استعمال شدہ تھے۔
اس لیے ان کو کٹوتی دے کر بدلوانے کی ضرورت نہ
تھی۔ اتنی رقم ہونے پر بھی سدھو ساقی والے میخانے
کی طرف نہیں گیا۔ بات یہ تھی کہ چندر کی صورت بار بار
سامنے آ رہی تھی۔ جس سے دل میں عجب الٹ پلٹ
ہو رہی تھی۔ ایک طرف تو چندر کا برے وقت میں کام
آنا اور دوسری طرف یہ یاد کہ میری سیتا کو جو تمام بچوں
میں مجھے پیاری تھی اس کا بدمعاش بیٹا اغوا کر کے لے
ہے۔ ایسی کیفیت میں سدھو ادرگھر میں گھس گیا او
ایک گھنٹے میں ایک بوتل ٹھرا پی گیا۔ جب نشے
لگا تو گھر کی طرف چلا۔ راستے میں مٹھائی کی دوکان پڑ
اس نے کہا کہ آج بہت سی مٹھائی لے لو۔ اس کو د
بیوی اور بچے خوشی کی چیخیں ماریں گے تو ذرا دل بہ
جائے گا۔

راستے میں شمبھو کی پرچون کی دوکان تھی ج
تھی۔ سدھو نے آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ کی تو شمبھو
اندر سو رہا تھا۔ اٹھ بیٹھا اور بولا کون۔ سدھو نے نیچی آو
میں کہا۔

"انگوٹھی"

شمبھو نے دوکان کا ایک گوشہ کھول کر انگوٹھی
کا بکس سدھو کو دے دیا۔ اب سدھو نے کہا۔

"کچھ حساب بھی ہے؟"

"اندر آجاؤ۔"

اندر جا کر سدھو نے اپنی پانچ ہزار کی رقم میں
ساڑھے چار ہزار شمبھو کے پاس رکھوا دیے۔ دوکان
نے پوچھا۔

"کوئی نوٹ بدلنے والا تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

پھر ہنس کر سدھو بولا۔

"ایسی رقم سے آج تم محروم رہ گئے۔"

انگوٹھیوں کا صندوقچہ لے کر سدھو دوکان
باہر آ گیا۔ وہ ہر شخص سے یہی کہتا تھا کہ میں انگوٹھیوں کا کا
کرتا ہوں۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ لوگوں کو اس بات
یقین نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کی بیوی اور بچو
بھی یقین نہیں ہے۔ بیوی تو کبھی کبھی رات کو پوچھ
کرتی تھی۔

"سچ سچ بتاؤ کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو۔ کہیں
کو کین تو نہیں بیچتے ہو؟ لوگ یہی کہتے ہیں۔" جواب

وہ کہتا تھا کہ " ایسا شک کیوں دل میں لاتی ہو کیا انگوٹھیوں سے اچھی آمدنی نہیں ہو سکتی ہے ؟"

گھر میں بھاری فرنیچر تو کافی تھا۔ مسہریاں، تخت میز اور کرسیاں لیکن چادریں اور میز پوش نظر نہیں آتے تھے۔ بیوی نے سدھو کو دیکھتے ہی آواز لگائی " بچو پتاجی آ گئے۔"

دو بڑی لڑکیاں اور دو چھوٹے لڑکے بستروں کو چھوڑ کر آ گئے اور سدھو کے پاس مٹھائی دیکھتے ہوئے شور مچاتے اس پر ٹوٹ پڑے۔

" لڈو، لڈو "

" میں تو برفی لوں گا "

" رس گلہ، رس گلہ۔ واہ واہ "

سب چیخ رہے تھے۔ چھین جھپٹ رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ سدھو تماشہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ بیوی بھی کھاتی رہی۔ لیکن بلا شور کے پھر سدھو نے پوچھا۔

" شنکر کہاں ہے "

" اس حرامی کو سنیما کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ روز دیکھتا ہے، روز دیکھتا ہے، وہیں گیا ہوگا۔"

" روز سنیما دیکھتا ہے۔ پیسہ کہاں سے لاتا ہے؟"

" کیا معلوم، یہ نہیں دیکھتے کہ گھر میں کوئی چیز نہیں ٹکتی۔ پلنگ کی دو چادریں تھیں پرسوں تک وہ بھی غائب ہو گئیں "

سدھو بگڑ کر بولا " ابھی تک کھانے پینے کا سامان اڑ جاتا تھا۔ اب چادروں کی بھی نوبت آ گئی۔ تم روکتی نہیں ہو "

" لڑکا جوان ہونے کو آ رہا ہے۔ بھلا میری وہ ماننے لگا۔ تم بچوں کی خبر لو ورنہ سب سیتا کی طرح بگڑ جائیں گے "

" خبر لو... خبر لو! جیسے میں نے کوئی کسر چھوڑی ہے ان کی خبر گیری کرنے میں۔ روز سمجھاتا ہوں۔ بُری حرکتوں پر خوب پیٹتا بھی ہوں۔ مہنگے اسکولوں میں پڑھاتا ہوں فیشن کے کپڑے پہناتا ہوں تاکہ اچھے لڑکوں اور لڑکیوں سے میرے لڑکے اور لڑکیوں کی دوستی ہو "

کچھ یاد کر کے کہنے لگا " سیتا کے پاس جب ایک لڑکے کا خط میں نے پکڑ لیا تھا تو سیتا کو کتنا مارا تھا۔ اپنے بچوں کے لیے میں نے کیا نہیں کیا "

" بچے پوچھتے ہیں کہ پتاجی کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے ؟ جب کہوں کہ انگوٹھیاں بیچتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ محلے والے کہتے ہیں کہ ان کو انگوٹھی بیچتے کسی نے آج تک نہیں دیکھا "

سدھو غصّے سے بولا۔

" تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ محلے والے ہم لوگوں سے جلتے ہیں "

" میں سب کچھ کہتی رہتی ہوں۔ لیکن سنتا کون ہے۔ ارے محلے والے تو مجھ سے بھی یہی بات پوچھتے ہیں " سدھو بولا " اس سال ابھی تک میں نے کیرتن نہیں کیا ہے۔ وہ کرلوں تو محلے والوں کا دل صاف ہو جائے گا "

یہ کہہ کر سدھو کا موڈ ذرا سنبھل گیا۔ بیوی بولی۔

" تم نے تو سیتا کے اغوا کی رپورٹ تک پولیس میں نہیں لکھوائی۔ پھر کہتے ہو کہ بچوں کی خبر لیتا ہوں "

پولیس کا نام سن کر سدھو پھر بھڑک اٹھا۔

" پولیس... پولیس، تم سے کتنی بار کہا ہے کہ اس کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔ رپورٹ لکھواؤں گا تو وہ الٹا مجھے ہی پھانس لے گی اور جب تک تمہارے سب زیور ہضم نہ کر لے گی تب تک وہ جان نہیں چھوڑے گی۔ پولیس... پولیس "

سدھو ناگوار بحث کو ٹالنے کے لیے کہنے لگا۔

" چلو چائے بناؤ "

" کیا باتیں کرتے ہو، تم تو جانتے ہی ہو کہ گھر میں جتنی بھی شکر یا دودھ ہو سب کا سب ایک ہی دن میں اڑ جاتا ہے۔ ذرا سی چائے کی پتی پڑی ہو تو ہو ؟"

" چلو اسی کی چائے بناؤ شکر کے بجائے برفی ڈال لوں گا "

بیوی نے پہلے ہی کچھ مٹھائی شنکر کے لیے نکال رکھی تھی۔ سدھو سے چائے کی یہ ترکیب سن کر اس نے جھپٹ کر برفی کی دس ڈلیاں مٹھائی کے چھاپے سے اور نکال لیں۔

چائے کے آتے آتے سدھو کا مزاج سنبھل چکا تھا۔ اس نے بچوں کو جو دیکھا کہ وہ مٹھائی کھا کر خوش ہیں تو وہ بھی خوش ہو گیا۔ اسے اپنے بیوی بچوں سے گہری محبت تھی۔ اس وجہ سے جب بھی اچھی آمدنی ہو جاتی کھانے کی عمدہ عمدہ چیزیں ضرور لاتا تھا۔ دو دو سیر مٹھائیاں، بیس بیس سیر آم، چار چار بڑے بڑے تربوز، ٹافیاں اور کیک وغیرہ۔ اس چیز نے بچوں اور بیوی کو بے حد چٹورا بنا دیا تھا۔ ان لوگوں کو ڈھنگ کی چیز پکانا تو آتی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی عجیب عجیب طرح کے بدرنگ اور بدمزہ حلوے بنا بنا کر گھی شکر کو ختم کر دیتے تھے۔ ان حرکتوں سے سدھو بے حد چڑتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو غصّے میں آ کر ایک ایک بچے کو دھنک کر رکھ دیتا تھا۔

چائے بننے اور پینے میں کافی رات آ گئی۔ تب سدھو گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔

" یہ کون سا فلم ہے جو ابھی تک ختم نہیں ہوا "

" شنکر نے آج تک تو اتنی دیر نہیں لگائی تھی جانے معاملہ کیا ہے "

دونوں گھبرا گئے۔ سدھو نے کہا۔

" کس سنیما گھر میں گیا ہے ؟"

" وہ مجھ سے کہہ کر کب جاتا ہے "

" کہاں جاؤں اُسے ڈھونڈنے "

۴

سدھو رات بہت دیر کو سویا تھا دن کو دس

کے قریب آنکھ کھلی۔ اس نے فوراً ہی پکارا۔

" شنکر"

بیوی نے آنسو بھری آواز میں جواب دیا۔

" ابھی تک نہیں آیا۔"

" نہیں آیا؟ تم تو کہتی تھیں کہ سنیما دیکھنے گیا ہے۔"

" میں ایسا ہی سمجھی تھی کیونکہ کئی روز سے سنیما کے نام سے آدھی آدھی رات تک غائب رہ چکا تھا میں محلے میں سب جگہ پوچھ آئی ہوں۔ کسی کو بھی شنکر کی کوئی خبر نہیں۔ جو لڑکے اس کے ساتھ کھیلتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ شنکر نے کئی دن ہوئے ہم سے لڑائی کر کے بولنا چھوڑ دیا تھا۔

سدھو گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ پھر بیوی کو ڈھارس دیتے ہوئے بولا۔

" فکر نہ کرو ہمارے گروجی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ پولیس کے ذریعہ پتہ لگا لیں گے۔ میں جاتا ہوں ان کے پاس۔"

اس محلے میں دس سال ہوئے سدھو نے بیس ہزار کی پگڑی دے کر مکان کرائے پر لیا تھا۔ تب سے وہ محلے والوں کی خوشی اور غم میں برابر شریک ہوتا رہا۔ سال میں جنم اشٹمی دھوم سے مناتا تھا اور ایک بار کیرتن بھی کرتا تھا۔ اس کے لڑکے اور لڑکیاں اچھے اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے محلے والوں سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن جب لوگوں کو سیتا کے اغوا کا حال معلوم ہوا تو وہ ذرا کھنچ کر ملنے لگے۔ اس کا بڑا دکھ تھا سدھو کو۔ اور اس کو محلے والوں سے یہ کہتے برا لگ رہا تھا کہ رات سے بڑا لڑکا بھی غائب ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محلے والے سمجھیں کہ سدھو کا گھرانا ہی ایسا ہے۔ اس لیے جہاں بھی وہ گیا براہِ راست شنکر کی بات نہیں پوچھی۔ صرف یہ ٹوہ ہی لگانے کی کوشش کی کہ کسی کو اس کے بارے میں علم ہے یا نہیں۔

سدھو کا شک تھا کہ شنکر اگرچہ بارہ سال کا ہے لیکن چہرے مہرے کا اچھا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی لڑکی اغوا کر لے گئی ہو۔ لیکن جب محلے والوں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تو وہ سوچنے لگا کہ پھر کیوں گیا اور کہاں گیا۔

تلاش سے مایوس ہو کر سدھو اپنے کام کے لیے انگوٹھی کا بکس لینے شمبھو کی دوکان پر آیا۔ تب شمبھو نے کہا۔

" گروجی کی آگیا ہے کہ آج مقررہ وقت پر تم برلا مندر کے سامنے کے چائے خانے میں ان سے مل لو۔"

آج منگل کا دن تھا اس لیے مقررہ وقت رات کے دس بجے ہوتا تھا۔ سدھو کو فکر ہوگئی کہ گروجی نے اس طرح کیوں بلایا ہے۔ ایسا اس سے پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر کل ہی تو ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اور گروجی اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ ایک آدمی ان سے بلا کسی ضرورت کے ہفتے میں دو دن سے زائد ملے۔ ہے ضرور کوئی بے حد اہم بات۔ کیا ہو سکتی ہے وہ؟ یہ سوچتا ہوا سدھو دورہ کرنے نکل کھڑا ہوا۔

اپنے حلقے میں سدھو کا وقت تھا دن کو ڈھائی بجے سے لے کر نو بجے رات تک۔ اس کے حلقے میں تین سنیما گھر، چار بڑے ہوٹل اور دو بھیڑ بھاڑ والے بازار تھے۔ اس کے اپنے ساتھ ایک مددگار ضرور ہوتا تھا۔ سوچنے لگا کہ کل تو موہن تھا ہو سکتا ہے کہ آج گروجی نے یادو کو بھیجا ہو۔ وہ بھی کافی ہوشیار ہے۔ رنگ محل سنیما کے آس پاس ہو سکتا ہے۔

سدھو کا خیال درست نکلا۔ یادو رنگ محل سنیما کے ٹکٹ کی بلیک کر رہا تھا۔ سدھو کی نظروں نے اس وقت یہ بھی دیکھا کہ ایک لڑکا ایک لڑکی کو جو تنہا معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں سے اشارے کر رہا ہے۔ سدھو اندازہ لگانے لگا کہ یہ اشارے کہیں یہ تو نہیں

بتاتے ہیں کہ دونوں کسی طے شدہ پروگرام کے تحت آ... ہیں۔ ایسے پروگرام کے تحت آنے والے جوڑے کے پاس عام طور سے اچھی رقم ہوتی ہے۔

سدھو کو یاد آیا کہ پندرہ سال پہلے اسی سنیما ہال میں ہی اس نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس نے شہر م... کیسا ہیرو کا ڈنکا بجا دیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ سدھو نے ابھی کام شروع ہی ک... تھا کہ اس سنیما ہال میں دیکھا کہ پختہ سن کی ایک لیڈ... خوب بنی سنوری گلے میں بے حد قیمتی ہار پہنے ٹیکسی... اتر کر سنیما ہال کے اندر آ کر تصویریں دیکھنے لگی۔ وہ با... بار گیٹ کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی۔ ذرا دیر میں کرا... کے اسکوٹر پر ایک نوجوان آیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... جب اس کی نظریں لیڈی سے ملیں تو دونوں کے چہر... چمک اُٹھے۔ مگر دونوں نے دوسری طرف منہ مو... لیے۔ سدھو سمجھ گیا کہ چوری چھپے کی ملاقات ہے۔ ذرا... میں لیڈی تو ہال میں چلی گئی۔ لیکن نوجوان ٹہلتا رہا... اصل پکچر شروع ہوئی تو وہ اندر گیا۔ اس دن ٹکٹوں کی بلی... کرنے والوں میں یادو تھا ہی۔ اس سے ٹکٹ لے کر سدھو اندر چلا... اور ایک طرف کھڑا ہو کر لیڈی کو دیکھنے لگا ایک موقع پر اس... ہار چمکا تو دیکھا کہ اس کے گلے میں نوجوان کی باہیں پڑی... ہیں۔ اب سدھو کو معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں کیا سد... ہے پھر تو وہ تاک میں رہا۔ آخر پتہ چلا کہ تیسرے چو... دن وہ دونوں آتے ہیں اور نوجوان سیٹیں بک کرا... ہے۔

پھر سدھو تاک میں رہا ایک دن جب نوجوا... نے سیٹیں بک کرالیں تو سدھو نے نوجوان کی سیٹوں... دونوں طرف کی سیٹیں بک کرالیں۔

اس دن بھی وہی ہوا کہ پہلے لیڈی جا کر اپنی... سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سدھو فوراً جا کر اس کے برابر کی... سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب پکچر شروع ہوئی تو نوجوا... آگیا۔ اور چند منٹ کے بعد اس نے لیڈی کے گ...

میں باہیں ڈال دیں۔ ادھر اس کی باہیں پڑیں ادھر سدھو کا ہاتھ گیا۔ اور اس نے ڈوری کاٹ دی۔ جیسے ہی نوجوان نے لیڈی کو اپنی طرف جھکایا۔ سدھو نے لیڈی کے سینے پر ہاتھ لے جاکر ہار کھینچ لیا۔ لیڈی چونکی ضرور لیکن جیساکہ سدھو کا خیال تھا وہ یہ سمجھی کہ نوجوان کا ہاتھ اِدھر آگیا ہے۔ اس لیے ذرا سی سسکی بھری اور چُپ رہی۔ سدھو سیٹ پر دوسری طرف دب گیا۔ ابھی دونوں بوس وکنار میں مصروف تھے کہ یہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس کارنامے میں صرف ہاتھ کی صفائی ہی نہیں تھی بلکہ وہ چیز بھی تھی جسے گروجی کہتے ہیں۔ شکار کے دماغ اور مزاج کا اندازہ لگانا۔ پھر سدھو نے یہ کارنامہ اکیلے انجام دیا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شہر بھر کے جیب کترے سدھو کو چھوٹا استاد مان کر عزت کرنے لگے تھے۔

یہ قصہ یاد آنے سے سدھو کے ہاتھ کلبلانے لگے نیا کارنامہ کرنے کے لیے۔ لیکن اس وقت ایک لڑکا نظر آگیا جس پر سدھو کو شنکر کا شک گزرا۔ مگر جب لپک کر اس کے پاس گیا۔ تو وہ کوئی اور نکلا۔ شنکر کے غائب ہونے کی بات یاد آتے ہی وہ بے جان سا ہو گیا۔ اور اس نے طے کر لیا کہ آج میں نے کوئی کام کیا تو ہاتھ بہک سکتا ہے۔ اس لیے چھٹی منالو اور دیکھو کہ گروجی کیا کہتے ہیں۔ بچا ہوا پیسہ کافی تھا اس لیے فکر نہیں تھی۔ اس نے یادو کو اشارہ کر دیا کہ اپنے کام میں لگے رہو۔ پھر ٹہلتا ہوا اپنے خاص شراب خانے چلا گیا۔ وہاں پی کر رنڈی کے گھر جا پہنچا۔

جب سدھو نو بجے گروجی کے پاس گیا تو وہاں بھیکو اور سردار مستانہ سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں گروجی کی پارٹی کے نہیں تھے۔ اور اسمگلنگ وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے۔ سدھو کو دیکھ کر گروجی نے بہت محبت سے بلا کر پاس بٹھایا۔ اور جو باتیں کر رہے تھے وہ جاری رکھیں۔ بولے: "بھیکو! تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کہ عورتیں ناگن ہوتی ہیں۔ ان کے کاٹے کا منتر نہیں اور لڑکیاں جو دیکھنے میں بھولی بھالی نظر آتی ہیں ان کا کاٹا تو پانی نہیں پی سکتا۔ انھوں نے جس جس طرح مجھے گرایا ہے کیا بتاؤں ایک دن ایک شاگرد کی عورت میرے گھر ایک بجے رات کو آگئی اور کہنے لگی اب تو میں تمھارے ہی پاس رہوں گی۔ بھئی میں بھی جوان ہی تھا۔ طبیعت بھر بھر آگئی لیکن شاگرد کو بیٹا سمجھتا ہوں اور اس کی بیوی کو بیٹی۔ اس لیے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اسی طرح رات کٹ گئی۔ لیکن صبح اس نے ایسا فیل مچایا اور وہ ہنگامہ اٹھایا کہ تم لوگوں کو کیا بتاؤں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اس کو رکھنا پڑا۔ لیکن بات اسی جگہ ختم نہیں ہوگئی۔ دو سال کے بعد وہ ایک گوتیے کے ساتھ اس اُمید پر بھاگ گئی کہ سینما میں ہیروئن بن جائے گی۔ اس کے بعد میں نے ایک اچھے گھر کی لڑکی سے شادی کر لی۔ مگر وہ بھی دو سال کے بعد بھاگ گئی۔ وہ کس کے ساتھ بھاگی؟ میرے ہی ایک شاگرد کے ساتھ۔ پھر میں نے ایک بیوہ کو گھر ڈال لیا۔ وہ رہی وفادار۔ بچاری دو سال ہوئے بھگوان کے گھر چلی گئی۔ مگر واہ کیا بیوی تھی وہ! اب اولاد قسمت میں نہیں تھی تو اس کو کیا کروں؟"

سدھو بولا: "ہاں گروجی! وہ تو دیوی تھی۔ مجھ سے تو اولاد کی طرح محبت کرتی تھی۔"

"میں اس کو سمجھایا کرتا تھا کہ میرے شاگرد ہی میرے بیٹے ہیں۔ تم بھی ان کو یہی سمجھو۔"

بھیکو نے کہا: "جیسے آپ گرو ہیں ویسے آپ کے چیلے۔ میں نے سنا کہ کل کس طرح سدھو نے کام کیا۔ سیٹھ ابھی جھکا ہی تھا کہ پلک جھپکتے ہی ان کی جیب اڑ گئی۔"

مستانہ بولا

"بھائی بھیکو یہ مشاقی ہر ایک کے بس کی چیز نہیں۔"

گروجی نے چائے منگوائی۔ چائے کے آنے پر ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر گروجی سدھو کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بولے۔

"یہ بتاؤ سدھو تم کو میں نے اپنا بیٹا سمجھا کہ نہ؟"

"گروجی! میرے تو سب کچھ تم ہی ہو۔ تمھاری وجہ سے میں کچھ بن گیا۔ ورنہ گلی گلی مارا مارا پھرنے والا لونڈا تھا۔"

"اچھا تو اب میری ایک بات مانو۔ تم آج سے سیتا کو میری بیٹی سمجھو اور اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ایسی نکمی لڑکی کو بیٹی بناؤ گے؟"

"تم تو میرا کہا مانو۔ کہہ دو کہ وہ میری بیٹی ہے۔"

"آپ کی آگیا ہے تو میں مانتا ہوں۔"

"تو اب سنو ایک نیا معاملہ۔ میں نے بھیکو اور سردار کو اس میں مدد کے لیے بلایا ہے۔ کل رات میں تین بجے کے قریب اپنے کمرے پر جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ دہلیز پر کوئی لڑکی سو رہی ہے۔ میں نے ڈانٹا کون ہے تو۔ وہ بولی میں ہوں سیتا، سدھو مہاراج کی بیٹی۔

یہ کہہ کر میرے قدموں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے ترس آگیا۔ اندر لے جاکر اس کا منہ دھلایا۔ اس وقت پتہ چلا کہ اس نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ جو کچھ میرے گھر پر تھا اس کو کھلایا۔ چائے پلائی بہر حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ چندر کے لونڈے رام بھروسے نے کانپور اسٹیشن پر اٹیچی اڑانے کی کوشش کی تھی تو وہ پکڑا گیا۔"

سدھو نے کہا: "اتنے بڑے جیب کترے کی اولاد ہو کر چوری کرتے حرامی کو شرم نہیں آئی؟"

گروجی بولے: "ارے بھائی آج کل کے لونڈے بُری صحبت میں پڑ کر خاندانی عزت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ کانپور میں کون تھا جو رام بھروسے کی پیروی کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی سزا ہو گئی۔ سیتا نے اس کے لیے بہت دوڑ بھاگ کی اور جو شخص بھی کام کا نظر آیا اس کے سامنے گڑ گڑائی۔ مگر کچھ حاصل نہیں ہوا اور الٹا پولیس والوں نے اس کو خراب کرنا چاہا۔ یہ حال دیکھ کر وہ کان پور سے

چلی آئی۔ کسی طرح ہمارے وکیل کا پتہ لگا کر ان کے پاس گئی۔ انھوں نے ڈانٹ کر نکال دیا۔ اور کہا میں چور رول اچکوں کا مقدمہ نہیں لیتا ہوں۔ لڑکی نے خوشامد درآمد کر کے کسی طرح میرا پتہ پوچھ لیا۔ اور میرے یہاں آگئی۔"

سدھو کا پارہ چڑھ گیا اور گرم ہو کر بولا۔

"گروجی اب اس حرامزادی کا کیا بناؤ گے نکال دو اس کو اور کہو جائے وہ جیل میں اپنے بدمعاش کے پاس۔"

"دیکھو تم سیتا کو میری بیٹی بنا چکے ہو۔ اب خاموش رہو۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کروں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ ابارشن کرانے پر راضی ہو گئی ہے۔ سردار کی بیوی بڑی ہوشیار دائی ہے۔ وہ یہ کام کر دے گی اور ہاں میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ سیتا اور رام بھروسے کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ رام بھروسے نے یہ کیا تھا کہ کسی مندر میں لے جا کر اس کی مانگ میں سندور بھر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اب تم ہو گئیں میری بیوی۔"

"کچھ دیا بھی اس نے؟ کچھ ساتھ لے کر آئی ہے؟"

گروجی تلخ ہنسی ہنس کر بولے "ہاں لائی ہے ایک سو چالیس بال پوائنٹ پین۔ ان کے کوئی پچیس روپیہ دے دے تو سمجھو کہ بہت دے دیے۔ بس ایک پارکر ضرور ایسا ہے جس کے کچھ دام مل سکتے ہیں۔"

پارکر کا نام سن کر سدھو چونک پڑا۔

"کس رنگ کا ہے وہ؟"

"نیلا۔ کیوں تم نے رنگ کیوں پوچھا؟"

نیلا سن کر سدھو مسکرا دیا بات بنا کر کہنے لگا۔

"ایک جگہ پارکر دینے کا میں نے وعدہ کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اچھے رنگ کا ہو گا۔"

گروجی نے کہا "ہوں" مگر اس ہوں سے یہ ظاہر تھا کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ سدھو کچھ چھپا رہا ہے۔ ذرا دیر خاموش رہ کر گروجی ڈھارس دینے والے انداز سے کہنے لگے۔

"ادھر کئی نوجوان میرے شاگرد بنے ہیں۔ دیکھوں گا کہ سیتا کے لائق کون ہے؟"

"گروجی مجھے اب اپنے پیشے سے نفرت ہو گئی ہے۔ جیب کترے کو میں داماد نہیں بناؤں گا۔ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے۔ میرا گھر تو سرائے سے بدتر ہے اور بچے جن سے محبت کرتا ہوں۔ ان سے تو گلی کے کتے بہتر ہوں گے۔ میں تو اب شمبھو سے مال ادھار لے کر اسی طرح کی دوکان کھولوں گا اور اسی کی طرح ایمانداری کی آمدنی سے جیسی بھی کٹے گی کاٹ لوں گا۔"

شمبھو کا نام سن کر تینوں ہنس پڑے بھیکو نے زور سے کہا۔

"اس سے بڑا جیب کترا شہر بھر میں نہیں ملے گا وہ ترازو کی ڈنڈی سے گاہکوں کی جیب کاٹتا ہے۔"

"اور طرح سے بھی کاٹتا ہے۔ ہمارے سو کے مال کے پچاس بھی نہیں دیتا۔ چالیس اور پینتالیس پر مول کرتا ہے۔ جو روپیہ اس کے پاس رکھاؤ اس کو سود پر چلاتا ہے اور اس میں سے ہم کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتا ہے۔"

سردار بولا "جیب کون نہیں کاٹتا ہے۔ میری بیٹی سے پوچھو جو کہ اسپتال میں کام کرتی ہے ڈاکٹر کیسی کس طرح مریضوں کی جیب کاٹتے ہیں۔"

گروجی سنجیدہ آواز میں کہنے لگے۔

"ساری دنیا جیب کاٹتی ہے۔ سدرشن وکیل کو لو جو ہمارے مقدمے لڑتا ہے۔ سادھو مل سیٹھ کو لو جو ہماری ضمانتیں لیتا ہے۔ اس کو ماہوار رقم بھی دو اور جب کوئی مقدمہ ہو تو اس کے پیسے الگ دو۔ دو رقمیں ایک ہی کام کے لیے۔ یہ جیب کاٹنا نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر عدالت کو لو وہاں کون ہے جو مظلوم کی جیب نہیں کاٹتا ہے۔ سب دیکھ چکا ہوں سدھو۔ تمہارا کام شروع ہی سے اچھا چل رہا ہے۔ اس لیے تم نے ابھی اونچ نیچ نہیں دیکھی۔ دیکھو گے تب معلوم ہوگا کہ جیب کترے بہتوں سے اچھے ہوتے ہیں۔"

"لیکن گروجی اب میرا دل اکھڑ رہا ہے۔ اس کام سے بلکہ اس کی وجہ سے زندگی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔"

"سدھو عقل کے ناخن لو۔ جس دن تم الگ ہو گئے تمہاری برادری والے دشمن ہو جائیں گے تمہارے کیونکہ سب ڈریں گے کہ جانے کب کس کے راز پولیس کو بتا دو۔ ایسی برادری میں آکر کوئی الگ نہیں ہو سکتا ہے ہوتا ہے تو جان سے ہاتھ دھو لیتا ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ ہم لوگ کس شرافت سے زندگی گذارتے ہیں۔ اور دھرم کرم کے کام کتنے کرتے ہیں۔"

سدھو آنسو بھری آواز میں کہنے لگا

"گروجی کل شام سے شنکر بھی تو غائب ہے۔ آج دوپہر تک تو نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"آتے ہی تم نے یہ بات کیوں نہیں کہہ دی؟"

"سیتا کی بات جو آ گئی تھی۔ وہ بھی اولاد یہ بھی اولاد اور دونوں نکمے۔"

"موہن آتا ہو گا تھانے سے خبر لے کر۔"

آدھا گھنٹہ ادھر ادھر کی باتوں میں گزر گیا۔ آخر موہن آگیا۔ اس نے سدھو کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اور پھر بیٹھ گیا۔ گروجی نے پوچھا۔

"بہت دیر کر دی؟"

"گروجی آج کل کئی نئے افسر آگئے ہیں جو بہت اُڑے اُڑتے ہیں۔ شہر میں اب صرف ایک داروغا اور چند کانسٹبل رہ گئے ہیں اپنے مطلب کے۔ لیکن وہ بھی حالات دیکھ کر ہاتھ زیادہ پھیلانے لگے ہیں۔

گروجی "کوئی خاص بات؟"

موہن نے گہری گہری نظروں سے سدھو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"سدھو کچھ معلوم ہے تم کو کہ شنکر کہاں ہے؟"

"نہیں، کیا کوئی خبر ملی؟"

موہن نے گروجی کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اس نے کہا۔

"جو بات ہو صاف صاف کہو۔ یہ موقع ایسا ہی ہے۔"

موہن کہنے لگا "کل رات پولیس نے کالے نالے کی پلیا کے نیچے سے ایک مرد اور ایک بارہ سالہ لونڈے کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے۔"

سدھو بہت زور سے کڑک کر بولا "جھوٹ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ شنکر نہ ہوگا۔"

موہن نے جواب دیا "دونوں کا ڈاکٹری معائنہ ہو چکا ہے اور دونوں حوالات میں بند کر دیے گئے ہیں۔"

"کون ہے وہ مرد؟"

"مرلی۔"

"وہ بدمعاش میں نے ہزار بار شنکر سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ گھومو پھرو مت۔ زبردستی کی ہوگی اس مادر . . . ."

"شنکر نے بیان دیا ہے کہ مرلی اس کو سینما دکھاتا تھا اور شو کے بعد کالے نالے کی پلیا کے نیچے لے جاکر . . ."

"اب میں سمجھا کہ یہ روز روز کا سینما کیا تھا۔ کیا شنکر نے بھی اقبال کیا ہے؟ اتنا بھی نہ کیا اس کو کر پولیس کے سامنے بیان کیسا دیا جاتا ہے۔"

گروجی نے کہا "سدھو بات سمجھو۔ پولیس تو لوالے پر آتی ہے تو چپ کون رہ سکتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو ایسی باتوں کو۔ وہ ناخون گھسواتے ہیں، سگریٹ سے بدن داغتے ہیں۔ اور جانے کیا کیا کرتے ہیں۔"

سدھو تلملا کر اٹھا "میں جاتا ہوں اور ملاقات کے لیے اجازت مانگتا ہوں۔ اس وقت حرامزادے کا گلا دبا دوں گا۔ یہ اولاد ہے یا حرامی کا پلا۔"

سدھو جوش میں چند قدم بڑھا تھا کہ گروجی چلائے:

"سدھو تم ہم سب کو پھنسوا دو گے۔"

وہ چلتے ہوئے بولا۔

"گروجی میں صرف اپنے بیٹے کی جان لوں گا۔ کیا باپ کا حق اتنا بھی نہیں۔"

"کیا میں تمہارا کوئی نہیں ہوں؟"

سدھو کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ بولا۔

"میرے لیے تو اب تم ہی سب کچھ ہو۔"

گروجی نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔

"ہمارے پاس پیسہ بھی ہے۔ وکیل بھی اور داروغہ بھی۔ گھبراؤ نہیں۔"

سدھو ہولے ہولے قدم دھرتا ہوا واپس آگیا اور بیٹھ کر سر پکڑ کر رونے لگا۔

علیم اللہ حالی

آواز جرم ہے تو خموشی سے کام لوں
کچھ یوں بھی اہلِ شہر سے میں انتقام لوں

بے مایہ بستیاں ہی مقدّر میں ہیں مرے
بِک جاؤں بھی کسی سے تو کیا اس سے دام لوں

زینوں پہ چڑھ کے ناپتے ہیں لوگ اپنے قد
بیٹھوں کہاں پہ بزم میں، مَیں کیا مقام لوں

چھوٹی نہیں ہے مجھ سے ابھی وضعِ کشتگاں
ہو دوست بھی کوئی تو میں دشمن کا نام لوں

آجائے وقت قبضۂ قدرت میں گر کبھی
وہ ساعتیں طلب کروں وہ صبح و شام لوں

فخر الدین ہاؤس، لنگر ٹولی، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

سیّد عاشور کاظمی

خرد، گمان کی وادی میں محوِ فکرِ عمیق
جنوں، یقین کی منزل پہ ذات کی تصدیق

یہ کس مقام پہ لے آئی جستجو تیری
زبان فکر کی ساتھی، نہ ذہن دل کا رفیق

دعائے نیم شبی، نالۂ سحرگاہی
کسے نصیب، مگر تو جسے بھی دے توفیق

ابھی اسیر ہے شمس و قمر میں ذہنِ بشر
ابھی نظر سے ہیں پوشیدہ، نکتہ ہائے دقیق

فنا کو شک ہو وجود بقا پہ حیرت ہے
مجالِ عبد، کہ معبود پر کرے تحقیق

انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ، انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، اردو اکیڈمی، لندن (یو کے)

رئیس انصاری

چل نہ پائی ایک بھی اُس رہ نُما کے سامنے
رکھ دیا جس نے چراغوں کو ہوا کے سامنے

اس لیے تیری عدالت میں رہے خاموش ہم
فیصلہ ہر ظلم کا ہوگا خدا کے سامنے

کون منصف کون مجرم کون قاتل ہے یہاں
گفتگو کرلو کبھی ہم کو بٹھا کے سامنے

تیر جو بھی دشمنوں کی سمت سے مجھ پر چلے
ہوگئے وہ بے اثر ماں کی دُعا کے سامنے

آگیا جب بھی کبھی دریا کو پیاسوں کا خیال
احتراماً رُک گیا ہے کربلا کے سامنے

ہینڈلوم کارنر، نند پاور ہاؤس، امین آباد، نعمت اللہ روڈ، لکھنؤ

عین تابش

خواجہ احمد عباس

تصویر کا تیسرا رُخ

اُردو صحافی اور اُردو افسانہ نگار کی حیثیت سے خواجہ احمد عباس کی شخصیت پر ان کی زندگی میں اور جہانِ آب و گل سے رخصت ہو جانے کے بعد بہت کچھ سوچا بھی گیا اور لکھا بھی جاتا رہا۔ لیکن خواجہ کی ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو یا اس پرکشش تصویر کا تیسرا رُخ شاید بہت زیادہ نمایاں نہیں کیا جا سکا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اردو کی ہی طرح ہند۔ انگریزی (انڈو اینگلین) ادب کا بھی ایک جزو لاینفک تھے۔ لیکن ادب بھی چونکہ اب زندگی کے دوسرے علاقوں کی طرح عصبیت کی زد میں آچکا ہے اور اس میں ایک بڑی تعداد میں آج کے 'کریم چاکلیٹ سولجر' جمع ہو گئے ہیں اس لیے حقائق کی پردہ پوشی یا حق کا کتمان بھی ایک عام رواج بن گیا ہے۔ میرے خیال میں خواجہ کی شخصیت کے اس تیسرے اہم پہلو کے دبائے جانے یا دب جانے میں بھی اسی عمل کا دخل رہا ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب انڈو اینگلین ادب کے ناقدوں کی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ہندوستان میں انگریزی ناول کے تین اہم ناموں (THREE MUSKETEERS) ملک راج آنند، راجا راؤ اور آر۔ کے۔ نارائن کا تذکرہ کرتے ہوئے چوتھے MUSKTEER کو فراموش کر دیا جاتا ہے یا اسے ضمنی طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر جیکو پبلشنگ ہاؤس سے شائع شدہ ان کے اہم انگریزی ناول انقلاب میں پبلشر کی تمہید ایک روشن تحریر کی طرح چمکنے لگتی ہے:

"In a lucid and picturesque Style and With an unusual warmth and Sympathy Khwaja Ahmed Abbas proceeds with The narrative from Which emerge more Than a dozen of powerful and unforgetable characters.

یہ صحیح ہے کہ خواجہ چونکہ بنیادی طور پر صحافی تھے اس لیے ان کی تخلیقی نثر بھی صحافیانہ اسلوب سے متاثر نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں فنی کمال پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ مذکورہ بالا چاروں ناول نگار بشمولیت احمد عباس مختلف رجحان کے حامل ہونے کی بنا پر اپنی فکر اور اس کے اظہار میں جداگانہ رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ملک راج آنند اور خواجہ احمد عباس کے یہاں ترقی پسند نقطۂ نظر کی مماثلت تلاش کی جا سکتی ہے۔ تخلیق کی زمین پر ان کی سوچ کے قدم الگ الگ انداز میں اٹھتے ہیں۔ اس لیے اگر ان کا فنی تجزیہ کیا جائے تو مطالعے کی اساس یہ ہوگی کہ:

جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

ڈاکٹر کے۔ آر۔ سرینواس آئنگر صاحب نے ایک جگہ خواجہ کے بارے میں کہا تھا انقلاب کے حوالے سے کہ ان کے یہاں بالطور خاص مذکورہ ناول میں ذاتی اور سیاسی تاریخوں کا (میرے خیال میں ان کا مدعا ذاتی اور سیاسی ماحول کا تانا بانا رہا ہے) فنکارانہ امتزاج ملتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے کہا تھا کہ اس میں سیاست یا سیاسی بصیرت کا عنصر بہت زیادہ ہے اور اس کا بڑا حصہ صحافیانہ تحریر کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اسے ان کا معترض ہونا نہ سمجھ کر خواجہ احمد عباس کی فکری گہرائی اور گیرائی کا معترف ہونا سمجھا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ایک طرح سے صحافت ان کے لیے جزو ایمان کا درجہ رکھتی تھی اس لیے انھوں نے اپنی ہر تحریر کو اپنے اس انفرادی اسلوب سے جسے صحافیانہ اسلوب کہا گیا مزین کرنا مستحسن سمجھا۔ ان کے فکشن میں بھی تاریخی ریکارڈز کی شمولیت ان کے فکری استحکام کی دلیل ہے۔

خواجہ احمد عباس کی شخصیت میں اتحاد ثلاثہ یعنی اُردو افسانہ و ناول + انگریزی افسانہ و ناول + انگریزی اور اردو صحافت کا اجماع ہوتا نظر آتا ہے۔ جہاں تک ان کے انگریزی ناولوں کا تعلق ہے ان کے دو خصائص ہی انھیں ممتاز کر دیتے ہیں۔ اول ان میں تاریخی اور عصری تسلسل کا احساس اور دوئم ایک رواں دواں غیر رسمی اور ریجنل لہجے کی تشکیل اور ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرنے والی ایک شستہ آواز کی طلسم کاری۔ پہلی صفت موضوع کی تطہیر کرتی ہے۔ اور دوسری خصوصیت اسلوب کے تعین میں مددگار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے انکار ناممکن ہے کہ خواجہ ہر دو سطح پر اپنے مخصوص طریق کار

آنڈاری ہاؤس شاہ بالعلی، سہسرام (بہار)

کے لحاظ سے کامیاب رہے۔

ہندوستان کے انگریزی ناولوں (ہند۔ انگریزی ناول) میں تحریک آزادی ایک جاری و ساری اور اغلب موضوع کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ سینکڑوں ناول اس کے زیرِ اثر لکھے گئے۔ لیکن معدودے چند ایسے ناول ہیں جن میں تحریک کی تصویر کشی خوردبینی (Microscopic View) کے ساتھ کی گئی ہے اور ان میں 'انقلاب' ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ جدوجہد آزادی کی ایک متحرک تصویر اس میں نظر آتی ہے۔ ارضِ وطن کے اس سب سے بڑے انقلاب کی جیسی جامع اور بسیط نمائندگی اس ناول میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں روح اور دماغ میں زندہ رہ جانے والے چند ایسے کردار نظر آتے ہیں جنھوں نے سامراجیت کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں جذبات کی ایسی مضبوط فوج تیار کی جو ہتھیاروں سے لیس نہ ہو کر بھی بے حد جری ثابت ہوئی اور جس نے امکانات کے نئے باب وا کر دیے۔ انور کے ذریعے جو ناول کا مرکزی کردار ہے اس وقت کی نئی نسل کا تحلیل نفسی اور اس کے رجحانات کے مراحل کا تجزیہ بے حد دلچسپ ہے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"The Conversation seemed more animated than usual as Anwer sat in his corner trying to make sense of the grown up voices. For a few minutes he could not follow the trend of the talk. Unfamiliar words like "Rowlatt Bill", "Martial Law", "Hartal", "Congress", "Muslim league" were being bandied round. A name that reurred many times was that of Gandhiji. And every one seemed to be exited about something called Satyagraha."
(CHAP. I. PAGE 7-8)

'انقلاب' ان گنے چنے ناولوں میں ایک ہے جن میں تحریک آزادی کے حوالے سے مسلم تہذیب کی نمائندگی کی گئی ہے۔ یا اس تحریک میں مسلمانوں کی شمولیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس امر کے باوجود کہیں ذہنی علیحدگی کا احساس پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ ایک طرف اگر انور ناول کا مرکزی کردار ہے تو دوسری طرف مہاتما گاندھی کو تحریک کی روح کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت نئی نسل اور نئے ذہن پر گاندھی جی کے اثرات کس طرح مرتسم تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دوست اکبر علی کا لڑکا انور اپنی زندگی میں جن تبدیلیوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کا پہلا حوالہ گاندھی جی تھے۔ فن اور اسلوب کے معیار کے پیشِ نظر اگر انقلاب کو کوئی بہت اہم کوشش نہ بھی کہا جائے۔ تب بھی موضوع کے لحاظ سے اس کی وقعت بے حساب اور دائرہ وسیع ہے۔ اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ ہند انگریزی ناول جہاں سے اپنی روپ ریکھا واضح کرتا ہے وہاں ابتدائی نقوش کی شکل میں جو ناول تاریخ ادب کا حصہ ہیں ان میں انقلاب بھی ایک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان میں انگریزی ناول بہ حیثیت صنف کچھ بہت زیادہ ترقی پذیر نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے جو بھی کام ہوئے ان کی حیثیت تاریخی ہے۔

"Tomorrow is Ours" خواجہ احمد عباس کا دوسرا اہم اور مشہور انگریزی ناول ہے۔ جو ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا اور جس کا موضوع ملک کی سماجی زندگی پر عموماً اور بنگال پر خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے اثرات اور ان کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے تحریک آزادی کے ذریعے ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کے عوامل رہیں۔ اس ناول میں ہندوستانی تہذیب اور اس کی کلاسیکیت کی نمائندگی پاروتی نام کی ایک رقاصہ کے ذریعے کی گئی ہے جو پہلے ایک میڈیکل طالب علم تھی۔ ماں کے ختم ہونے کے بعد اس کا اپنے چچا کے یہاں جانا اور چچا کا اس میں غلط طور پر دلچسپی لینا پھر اس کا رقاصہ بننا' اور پاروتی کا روپ متی سے اختلاف ہونا' پاروتی کی زندگی میں شری کانت کا داخل ہونا پھر شری کانت کی ماں کی طرف سے اسے ناپسند کیا جانا۔ اور ایک جاپانی طیارے کی بمباری پر شری کانت اور پاروتی کا زخمی ہونا اور آخر کار اس کی ماں کا پاروتی کے ساتھ ایک قسم کا ذہنی سمجھوتہ ہونا وغیرہ یہ سب جدید ہندوستان کے چند اہم مسائل کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی ہے۔ جیسا کہ ناول کے سرنامے سے ظاہر ہے۔ یہ اس بات کا داعی ہے کہ آنے والا کل نئی نسل کا ہے اور اس کے ترقی پسند یا Radical خیالات سے جلد یا بہ دیر پرانی نسل کو مصالحت کرنی ہی ہوگی۔ ناول کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس وہم کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رقص کرنے والے لوگ عملی زندگی میں حرکت کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ شری کانت اور پاروتی دونوں ہی اپنی جگہ سماجی سطح پر بے حد فعال شخصیتیں ہیں۔ دونوں کے ساتھ بمباری کے دوران جو حادثہ ہوا اس وقت وہ اپنے کاموں میں بڑی تندہی کے ساتھ مشغول تھے شری کانت ایک ڈاکٹر یا معالج کی حیثیت سے اور پاروتی ایک رقاصہ کے روپ میں۔ واضح ہو کہ جس علاقے پر بمباری ہوئی۔ وہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک پروپیگنڈہ

ٹور کے درمیان پروگرام پیش کر رہی تھی۔ کے۔آر۔ سرنواس آئینگر اس ناول کے بارے میں کہتے ہیں۔

"Mr. K. Ahmad Abbas 'Tomorrow is ours' is a sensitive story of modern India and deals with real people."

(The Indian Contribution to English literature — By K.R.S. Iyengar)

اس ناول کی زمین نشاۃ ثانیہ کے ساتھ انگڑائیاں لینے والا ہندوستان ہے۔ جس میں آنے والا کل تیقّن اور نئے امکانات کا گہوارہ ہے۔ جس کا خواب ناول کے حوالے سے بے حد پُرکشش ہے اور جس سے وابستگی کی پہلی شرط حقیقت پسندی اور حقیقت حال کا اظہار ہے۔ ایک طرف عالمی جنگ کا محاذ اور اس کی تباہ کاریاں اور دوسری طرف ان تباہ کاریوں کا قلع قمع کرنے والے دو اشخاص کا جذباتی اور قلبی محاذ پر مشغول جنگ ہونا ایک تصویر کے دو رُخ ہیں۔ شری کانت اور پاروتی کے زخموں کا اندمال محبت کے ذریعے ہوتا ہے اور شاید یہی ناول نگار کا پیغام ہے سامراجی طاقتوں کے نام تتمۂ کلام یہی ہے کہ امن عالم کے قیام کے لیے محبت شرطِ اولین ہے۔ خواجہ نے یہاں مرد اور عورت کی محبت کو ایک وسیع استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔

انڈو اینگلین ناول اب تک بہ حیثیت صنف ارتقا کی بیشتر منازل طے کر چکا ہے۔ خواجہ احمد عباس، ملک راج آنند، راجا راؤ اور آر۔ کے۔ نارائن کے بعد بھبانی بھٹا چاریہ، منوہر ملگونکر، عطیہ حسین، خشونت سنگھ، کملا مارکنڈے، ان کے بعد نین تارا سہگل، پرویز جہاب والا، جنیت مہا پاترا، انیتا ڈیسائی، اون جوشی، سلمان رشدی، احمد محی الدین، شیو۔ کے۔ کمار اور بیشمار دوسرے ناول نگار کامیاب سے کامیاب تر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ لیکن اول الذکر چار درویش ہند۔ انگریزی ناول کی داستان کے ہیرو ہیں جنھیں ادب کے مورخ فراموش کر کے نہیں گذر سکتے۔

حبیب کیفی

اُدھار

ایک بوند پانی کے لیے ترسی ہوئی دھرتی پر مسلسل یہ تیسرے دن بھی پانی برس رہا تھا۔ جیتے نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ کالے دھولے بادل تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتے ہوئے پانی برسا رہے تھے۔ ساون اتر رہا تھا اور ابھی پورا بھادوں سامنے پڑا تھا پھر؟

پھر وہی ایک بیکرا اور پیکرے سے بھی زیادہ چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے تیر گیا ـــــ کمل بھائی!

بنیا چاہے دھان وغیرہ دینے سے منع کردے' ٹھیکیدار محنت مجوری کی رقم کے لیے ٹال جائے' لُگائی سالی جوڑی ہوئی پونجی انٹی میں دبا کر چھپائے رکھے' رشتے والے سب لوگ مجبوری ظاہر کردیں' ساتھ کھائے پیے' اٹھنے بیٹھنے والے کنی کاٹ جائیں اور خاص اپنا بھی کوئی اپنی مجبوری بتادے ـــــ لیکن کمل بھائی کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے۔

کئی کئی جتنوں سے ہارا تھکا چھپر کے کارن بھیگا ہوا جیتا سوچ رہا تھا کہ بستی کے یہ پانچوں جاپا ہونے والا ہے اور کھیسے میں بیڑی کے بنڈل اور ماچس کے بھی پیسے نہیں ہیں۔ کام دھندہ روزگار بھی ٹھپ پڑے ہیں۔ اور ایسے میں کوئی سو پچاس تو کیا' پانچ دس بھی دینے سے منع کردے گا۔ پر کمل بھائی اپنی خاص مسکان کے ساتھ ضرور ہی اس کا سواگت کریں گے۔

کوئی چارہ نہ دیکھ کر جیتے نے پاؤں میں پھٹی پگرکھیاں ڈالیں اور ذہن میں کمل بھائی کا چہرہ لیے کچی پکی جھونپڑی کے دروازے کی طرف بڑھا تو کانوں میں ہانسی کی آواز پڑی۔

"سنو ـــــ" بیوی سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"صبر پی کر" وہ بولا "ابار آؤں"

"پن (لیکن) ـــــ" اس دفعہ بڑھے ہوئے پیٹ کی لاچاری اس کے چہرے پر صاف طور پر اُبھر آئی۔

جیتے نے ایک نظر ادھ بھوکے چپ اور سمٹے سے بیٹھے چاروں بچوں کو بغور دیکھا۔

"حالت معلوم' پن کچھو کرن ہی دے" بیوی کے ردعمل کا انتظار کیے بغیر ہی وہ دروازے سے باہر آگیا۔

ٹھنڈے اور بھیگے چولہے کے پاس جیتے کا بپتا اُوگھا کان میں بیڑی کا ٹکڑا کھونسے ہوئے جھریوں بھرے چہرے سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی کئی ایک سوال تھے۔

"آپ دھیان راکھجو" بپتا کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے کہا "ابار آؤں"

کیچڑ سنی سڑک پر بغلوں میں ہاتھ دیے بھیگے ہوئے جیتے کی پگرکھیاں چھپک چھپک بول رہی تھیں۔ خنک ہوا کے جھونکے اس کے گٹھیلے مضبوط بدن کو مسلسل گرما رہے تھے۔ چلتے ہوئے وہ بیوی بچوں اور بپتا کی خاطر کمل بھائی کے چہرے کو یاد رکھے ہوئے تھا ـــــ ایک دم سُرخ چکنا چہرہ۔ ہونٹوں پر دلکش مسکان۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے۔ کچھ بھی کہنے سے پہلے من کی بات کو تاڑ جانے والا۔ دوراندیش۔ کمی تھی تو بس ایک ہی کہ اس کی آ... پھٹے بانس کی سی تھی۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ... کام نکلتا ہے اور کام آتا ہے۔ آج بھی وہی کا... آئے گا۔ اور اگر وہ نہیں ملا' تو؟ . . . . نہ... نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے جانا ہی کہ... ہے؟ اور پھر ایسی رُت میں؟

"پچے لاگوں کمل بھائی" اُسے اپنے چھپے... کر جیتے کو تسلی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی عا... سے اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"آ بھئی ہیرو!" عادتاً اس نے مسکرا کر ط... بھرے لہجے میں پھٹے بانس سی آواز میں کہا "پا... لاگے سو تو ٹھیک ہے۔ پر مُنہ مت لگنا"

"کیڑی بات کرو سا؟" بھیگے ہوئے جیتے... جوڑے ہوئے ہاتھ بغلوں میں دے لیے "آ... داتا ہم جاکر"

"واہ ہیرو! تو تو اچھے خاصے ڈائیلاگ... بولنے لگا" وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا "بول' ا... برستے مینہہ میں کیسے آنا ہوا؟"

"جی' وہ . . . . " وہ جھجکا۔

"تیرے چہرے پر تو صاف لکھا ہے کہ تجھے... وقت روپیوں کی حاجت ہے" اس دفعہ اس... چکنے سرخ چہرے پر ہنسی پھیل گئی "ہے کہ نہ...

"آپ جو من کی بات جانو ہو تو پھر کائی بولو...

۱۵۹/۲' ڈاکٹر حسین کالونی' ۱۴۰/۵ چوپاسنی روڈ' جودھ پور (راجہ...

"پھر بھی تو بول تو سہی، ہیرو! کہتے کی ضرورت ہے؟"

"یہی کوئی دو سو ——" جیتا آس بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ایسی مندی میں دو سو —— ؟ مشکل ہے، ہیرو بہت مشکل ہے۔" اس نے لاچاری ظاہر کی۔

"آپ جانو کہ برسات کا رن کام دھام سب رُکیا پڑا ہے اور لگائی رے جاپو ہونو ہے۔"

"ہیرو استادوں سے بھی استادی؟ صاف کیوں نہیں کہتا کہ دارو کے لیے ناڑیں ٹوٹ رہی ہیں۔ یا پھر بیٹھے بٹھائے جُوا کھیلنے کی اِچھا نے زور مارا ہے"۔ کمل بھائی نے بیڑی سلگائی۔ "خواہ مخواہ تو لگائی کے جاپے کا بہانہ کر رہا ہے"۔

"دیوی ری آن، کمل بھائی"۔

"دیوی کی سوگندھ؟" بیڑی کا ایک گہرا کش کھینچ کر اس نے دھواں اگلتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیری لگائی کے واقعی جاپا ہونے والا ہے"۔

"ہاں جی"۔ جیتے کی آس میں وزن پیدا ہوا۔

"ہاں جی کے تاؤ! اور کوئی کام نہیں ہے تجھے؟ آگے ہی جاپے تے ہیں تیرے۔ ان کا تو پورا پڑتا نہیں اور پھر جاپا؟" کمل بھائی نے اُسے اپنے طریقے سے لتاڑا۔ "سالے تم جیسے لوگوں نے ہی سارا ستیاناس کر رکھا ہے۔ لال تکون والوں کو تم جیسے لوگوں کے تار ہی نہیں، بلکہ کھمبے بھی اکھاڑ ڈالنے چاہئیں"۔

غرض مند جیتا خاموش۔ بیڑی کے دھوئیں کے بیچ بھیگا ہوا جیتا بغلوں میں ہاتھ دیے مجرم سا کھڑا تھا۔

"تو اب کیا کریں تیرے لیے؟" بجھے بجھے جیتے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اُسے مخاطب کیا۔ "لے، بیڑی سلگا"۔

"ارج تو کیتی"۔ بیڑی ماچس اس سے لیتے ہوئے وہ بولا۔

"ہاں ہاں، دو سو کی بات تو نے کہی اور میں نے سُنی۔ پر ہیرو! اس وقت کڑکی ہے —— سو (۱۰۰) سے کام چلا لے گا؟"

"کِرپا کر دو!" بیڑی سلگا کر ماچس اس نے لوٹا دی۔

"اچھا ایسا کر، تو تیرے پہلے ہیں ڈیڑھ سو پھر کُل اڑھائی سو۔ ٹھیک؟"

"جیسی اِچھا"۔

"اب پہلے حساب کر —— دس پیسے سو کا بیاج۔ پندرہ ابھی کے ڈیڑھ سو کا بیاج۔ کٹتے ہوئے پچیس اور پندرہ کاٹا" کہتے ہوئے "چالیس ٹھیک؟" کمل بھائی نے حساب سمجھایا۔

غرض مند جیتے نے گردن ہلا کر حامی بھر دی اور دل ہی دل میں وہ کہنے لگا کہ اب وہ اس سے آگے نہ بڑھے تو مزہ ہی آجائے۔ اوجڑی کی بھاجی کے ساتھ جوار کی کراری روٹیاں ہوں گی اور سب بچے بھر پیٹ کھائیں گے اور —— ہو سکا تو ایک پوّا دیسی بھی۔ بہت دن ہو گئے چکھے ہوئے، اور ہاں، لگائی کو جاپا جننا ہے سو جنے وہ۔ ایک نہیں، ایک ساتھ دو!

"لے سنبھال ہیرو"۔ کمل بھائی نے دس دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"کرپا کیتی! دھن بھاگی"۔ روپے لے کر خوش خوش اس نے بھیگے کرتے کی جیب میں ٹھونس لیے اور بولا۔ "انگوٹھا ٹیکوں؟"

"انگوٹھا اُنگلی کسی بنیے کے کرنا"۔ وہ ہنسا۔ "یہاں تو ہاتھوں کی بات کر۔ ڈائری میں تاریخ سمیت لکھ لیا ہے۔ ہے کوئی مائی کا لال جس نے کبھی بھی کہا ہو کہ جھوٹ لکھا ہے؟"

"نہیں کہا، باپ جی"۔ جیتے نے اسی انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔

"اوئے ہیرو، تو بھی اس سے مکر سکتا ہے؟"

"بھو کھراب ہے میرو؟" کہہ کر جیتے نے منگلے کو یاد کیا۔ جس نے کمل بھائی کی ڈائری میں لکھے کو اس روز جھوٹ بتا دیا تھا اور بدلے میں سرِ عام بُری طرح پٹے اور ماں بہن کی سُننے کے بعد بیاج سمیت رقم چکانے کے لیے دیوی کی سوگندھ اٹھائی تھی۔

"ڈائری تو ایک بہانہ ہے رے۔ کل کو یہ کہیں گُم بھی جائے تو کیا کوئی رقم لوٹانے سے انکار کرے گا؟" اس نے بڑے پن سے پوچھا۔

ہاتھ جوڑے جوڑے جیتے نے انکار میں سر ہلایا۔

"ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اپن اگر اچانک ختم ہو جائیں تو اُدھاری پُدھاری سب ختم"۔ وہ ایک بار پھر دل کھول کر ہنسا۔

"کیڑی بات کرو سا —— ؟ پھر تو کئی جنا ناتھ ہو جاویا"۔

"اب آگے تو کہیں یہ مت کہہ دینا کہ کئی جنیاں ودھوا ہو جائیں گی"۔ اس کی ہنسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

احسان مند جیتا بھی ہنسنے لگا۔

"ہیرو! اب تو بادشاہ ہے تو —— ہو جائے کچھ"۔ اِس بار اُس نے اسے براہِ راست دیکھا۔ کمل بھائی کی ہنسی رُکی تو جیتے کو لگا کہ اس کے ہردے کی گتی ہی رک جائے گی۔ آخر وہی سوال اٹھ کھڑا ہوا جس کا اُسے اندیشہ تھا۔ اور جس سے وہ بچ کر نکل جانا چاہ رہا تھا۔

"آپ حکم کرو سا۔" بے دلی سے وہ بولا۔

"میں کیا بولوں؟ بولنا تو اب تجھی کو ہے۔ مجھ پر کوئی زور بھی نہیں ہے۔ چاہے تو جا۔" ایک شاطر شکاری کی طرح وہ بولا۔

"بوتل لاؤں؟" جیتے کو از خود ہی اگلنا پڑا۔

"موسم کی بات بولا نا۔ پر تو کیوں لائے گا؟ نوکر تھوڑے ہی ہے، ہیرو! اپن ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

آسمان میں بادل اسی طرح بھاگے جا رہے تھے۔ پر بارش کا زور اب کم ہو چلا تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پینٹ کے پائینچے چڑھائے کمل بھائی چھاتا تانے سڑک پر چل رہا تھا۔ جیتا اس کے برابر چلتا ہوا پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ وہ دونوں ہی قصبے کے چہل پہل والے اسٹیشن کے پاس والے نان ویج (NON-VEG) ڈھابے کی سمت بڑھ رہے تھے۔

"سگریٹ تو لے آ۔" ڈھابا سامنے دکھائی دیا تو کمل بھائی نے جیتے سے کہا۔ "میں آگے چلتا ہوں۔"

"آپ پدھارو سا۔" جیتا پان بیڑی سگریٹ کے کھوکھے کے پاس ٹھہر گیا۔

دوکان دار سے بیڑی، سگریٹ اور ماچس خریدتے ہوئے جیتے کا جی کٹ رہا تھا۔ رہ رہ کر اُسے جھونپڑے میں بھوکے بیٹھے پریوار کے چھ افراد کا دھیان آ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اُسے پورے دنوں بیٹھی بیوی کی چنتا تھی ---- اس بیچ اس کے جننے کا درد اٹھا ہوگا، تو ---- ؟

یہاں سے اب سیدھے اپنے جھونپڑے کی طرف چل دینا چاہیے۔ پر کمل بھائی ---- ؟ آج اگر اس طرح اسے باٹ جوہتے چھوڑ گیا تو آگے سے آڑے سمے میں کب کام آئے گا؟ کام تو اس سے پڑتا ہی رہتا ہے ---- ہار کر وہ بیڑی سگریٹ اور ماچس لیے بھاری قدموں سے ڈھابے کی طرف بڑھ گیا۔

"آ ہیرو! آ ---- " جیتے کو دیکھ کر کمل بھائی نے کہا۔

"حکم کرو۔" سگریٹ کا پیکٹ ٹیبل پر رکھ کر وہ کھڑا رہ گیا۔

"پھر وہی ایکٹنگ؟" پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔ "اچھا تو بیٹھ سامنے۔"

جھجکتا ہوا جیتا بیٹھا تو اس نے ہوٹل میں کام کرنے والے چھوکرے کو بلایا۔ میلا سا بنیان اور خاکی نیکر پہنے چھوکرے نے ٹیبل پر دو خالی گلاس، پانی سے بھرا جگ اور پیاز کی پلیٹ لا کر رکھ دی تو کمل بھائی نے جیتے کو مخاطب کر کے کہا۔ "اب بول۔"

"آپ کتری لے او؟" جیتے نے پوچھا۔

"کتنی کا کیا مطلب ---- یعنی میں اکیلا پیوں گا؟ سالے! میں کوئی بھکاری ہوں؟" اس نے اسے میٹھی جھڑکی دی۔

"چھورا! آدھی گلاب لے آؤ۔" ہار کر جیتے نے دس دس کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

اور ---- سگریٹ، بیڑی کے دھوئیں کے بیچ گلاب کا دور چلنے لگا۔ کمل بھائی نے سوڈا ملا کر دھیرے دھیرے پینا شروع کیا۔ جیتا سوڈا پانی کے بغیر ہی جلدی جلدی گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں حاملہ بیوی، چار بچے اور بوڑھا باپ چھائے ہوئے تھے۔ پر پیٹ میں پہنچی نیٹ دیسی کے زیر اثر دھیرے دھیرے یہ چہرے گاڑھے دھوئیں کے چھلوں کی طرح ہلکے ہلکے ہوا میں تیرنے لگے اور جیتے کے حصے کی دارو ختم ہوتے ہوتے سبھی آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

"آپ مہان، کمل بھائی ---- آپ مالک ---- " لڑکھڑائی آواز میں جیتے نے عجیب انداز میں اُسے سرخ آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کے گلاس کی سوڈا ملی دارو کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "کھتم کرو نی سا۔"

"میں جیسا بھی ہوں، تیرے سامنے ہوں، ہیرو! پر میں دیکھ رہا ہوں کہ تو مفت کے پیاز سے آگے بڑھ ہی نہیں رہا ہے۔" کمل بھائی نے پیکٹ سے نکال کر نیا سگریٹ جلایا۔

"بھول گو ---- گلتی ہوئی" اُس نے کان پکڑا اور چھوکرے کو بلا کر دو ہاف پلیٹ گوشت کا آرڈر دے ڈالا۔

"یہ ہوئی نا مردوں والی بات" مسکرا کر کہنے کے بعد گلاس اٹھا کر اس نے ایک لمبا گھونٹ بھرا۔

ڈھابے میں دھواں دھواں ماحول کے بیچ الگ الگ ٹیبلوں پر کھانا پینا چل رہا تھا۔ ہر ایک ٹیبل پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی اپنی ایک مستی بھری دنیا تھی اور وہاں پر ہر کہنے والا اپنی داستان کا خود ہی ہیرو تھا۔ ان داستانوں اور باتوں کے کارن اس چھوٹے سے ڈھابے میں ایک شور سا برپا تھا۔

"کھولاک ---- پوری ہوئی ---- سا؟" گوشت کا ٹکڑا چباتے ہوئے جیتے نے پوچھا

"میری تو چھوڑ۔" سُرخ پکتے چہرے پر کمل بھائی مسکرایا۔ "تو اپنی سنا۔"

"آپ ان داتا ---- آپ دیالو ---- کام پڑیا ---- کام آؤ۔" اس نے انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا۔ "پاؤ بھر چالے لا۔" اور رئیسوں کی طرح جیتے نے چھوکرے کو بُلا کر کوارٹر گلاب کے لیے دس کا ایک نوٹ نکال کر پکڑا دیا۔

دارو کے دور نے پہلے پہل جیتے کو سرد

دیا۔ بعد میں یہی سرور بڑھتے بڑھتے نشے میں بدل گیا
اسی سے اپنی جگہ بیٹھے پیتا ہوا وہ بڑی دیر تک خاموش
بیٹھا رہا۔

باہر سے جیتا خاموش تھا، لیکن دل ہی دل
میں اس نے اپنی ایک الگ ہی دنیا رچ ڈالی تھی
مُنہ لٹکائے چاروں ہی بھوک کے بچے ہوا میں تیرتے
ہوئے اس کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں ——
بڑھا ہوا پیٹ لیے ہانسی درد سے تڑپتی ہوئی ہوا
میں ہاتھ پیر مار رہی ہے —— جیتے کا
پتا او گما ادھر اپنی جھریوں میں مسلسل کھانستا چلا
جا رہا ہے —— خود وہ پانی کے تیز ریلے
میں بہا جا رہا ہے —— آپ کسائی (قصاب)
ہو سا! ہولے ہولے ہماں بے بس لوگاں نے کاٹو
ہو۔ ہمیں بول بھی نی سکتاں! آپ رے
مونڈے ری للائی اور چکنائی ہماں لوگاں رد
کھون ہے —— (آپ کے چہرے کی
سرخی اور چکنائی اصل میں ہم لوگوں کے خون سے ہے)

"ہیرو! کہاں کھو گیا؟" پلیٹ کا شوربہ
سڑکنے کے بعد کمل بھائی نے پھر ایک نیا سگریٹ
جلا کر جیتے کو مخاطب کیا۔

"گلت تھوڑے ہی ہے"۔ جاڑی ہوائی
زبان سے کہنے کے بعد جیتے نے ہچکی لی۔

"چڑھ گئی ہے کیا؟" کمل نے سرخ آنکھوں
سے اُسے گھورا۔

"دیوی ری آن —— لوٹ ہے ——
—— لوٹ"۔ اس نے ایک اور ہچکی لی۔

"تیری یہ ہچکیاں بتا رہی ہیں کہ تجھے تیرا اپنا
کوئی یاد کر رہا ہے —— چل اُٹھ کہہ کر
اس نے جیتے کے گلاس کی بچی دارو میں سوڈا ملایا۔

"یاد —— کون کرے؟" کہہ کر وہ عجیب
انداز میں ہنسا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور
ہچکی لی۔

"اٹھ ہیرو! ہٹ نہیں کرتے ——"
کہہ کر کمل بھائی نے جیتے کا گلاس اٹھایا اور سوڈا
ملی شراب ایک ہی گھونٹ میں غٹک کر اٹھ کھڑا ہوا
"لے اٹھ جا اب"۔

"چلو ——" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کمل بھائی ایک طرف لگے سماوار کی ٹونٹی
کھول کر صابن سے ہاتھ دھونے لگا۔ لیکن جیتا
لہراتا اور لڑکھڑاتا ہوا سیدھا ڈھابے کے دروازے
کی طرف بڑھ گیا۔

"گیارہ روپے پچاس پیسے"۔ چھوکرے
نے ڈھابے کے مالک کو بتایا تو جیتے کی رفتار کو
جیسے یک بیک بریک لگ گیا۔ نم اور میلے کرتے
کی جیب سے بارہ روپے نکال کر اس نے سیٹھ
کی طرف بڑھا دیے۔ لوٹائی گئی اٹھنی جیب کے
حوالے کرنے کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے وہ باہر
آگیا۔

"مزہ آیا ہیرو؟" چھاتہ لیے ہوئے کمل بھائی
بھی ڈھابے سے باہر آگیا۔

"ہاں سا —— کھوب آیو ——
کھوب ——"۔

"دیکھ بارش تھم چکی ہے۔ اب سیدھا گھر چلا
جا"۔ کہہ کر وہ اس کے ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر اپنی
راہ لگ گیا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے ڈھابے سے جھونپڑے
تک کا بھیگا اور کیچڑ بھرا راستہ طے کرنے کے دوران
جیتے نے بار بار یاد کرنے کی کوشش کی کہ روپے
کہاں گئے؟ کیا کسی نے جیب کاٹ لی ہے؟ نہیں،
جیب کٹی ہوتی تو روپے بچتے نہیں۔ پھر؟ ہاں، وہ
خود ہی کٹا ہے —— ایک اَن دیکھی چھری
ہے جس نے پریوار کے ہر فرد کا پیٹ کاٹا ہے اور
خود وہ ٹُن ہو کر میٹ بھکوس کر آیا ہے
تھوہ! وہاں بیوی بچے اور بوڑھا باپ بھوکا ہے اور
بیوی کے بچہ ہونے والا ہے اور

جھونپڑے کے باہر ہلچل دیکھی تو جیتے نے
سنبھلنے کی بھرپور کوشش کی۔

"بابا نی ریا" (دادا نہیں رہے)، گیلے پٹے اور
بھیگے سے کپڑے پہنے جیتے کی لڑکی نے آکر بتایا" ہور
بابو ہو یو ہے"۔

باپ کے مرنے اور پانچویں سنتان کی شکل
میں لڑکا پیدا ہونے کی بیک وقت ملی اطلاع نے
جیتے کا نشہ کافی حد تک کم کر دیا۔ گیارہ برس کی بڑی بیٹی
کو مسلسل دیکھتا ہوا وہ سوچنے لگا کہ جیب میں بچے
باسٹھ روپوں اور چند چھوٹے سکوں سے باپ کے
کفن، ارتھی کا انتظام ہو گا کہ زچگی کے جاپے کا سامان
آئے گا۔ یا گھٹنوں سے بھوک کے بیٹھے بچوں کے کھانے
کا انتظام ہو گا؟

اور حالات کا سامنا کرنے کے عزم سے
بیٹی کا ہاتھ پکڑے پکڑے جیتا مضبوط قدموں سے
جھونپڑی کی طرف بڑھ گیا۔

نظمیں

عمر کا اونچا پہاڑ

کیف و قرارِ شوق کی بستی اُجاڑ کر
پہنچا ہوں میں جو عمر کے اونچے پہاڑ پر
پھر سے سکونِ قلب و سرورِ شعور سے
ڈیرا جما لیا ہے یہاں خیمہ گاڑ کر
آگے اب ایک اور بھی آئے گا مرحلہ
اتروں گا جب پہاڑ سے، سب چھوڑ چھاڑ کر

کرشن موہن

لیپی

میرے گھر کی دیواروں پر
جاگ رہا ہے اندھیارا
کھڑکی کی کھول کے چیچے سے
گھر میں گھستی چندر کرن
مجھ کو ڈھونڈ رہی ہے
اور میں تیرے تن کی لیپی
سلجھانے میں ہوں مصروف ـــــ !!

جینت پرمار

۱۷/۳۰، اعبانی فیلیا، سرکواڈ، شاہ پور، احمد آباد ۳۰۰۰۰۱

پچھتاوا

تیرا ملنا روح کی تسکیں ـــــ
تیری قربت دل کا سکوں تھی
لیکن تیری میری رفاقت ـــــ
اوروں پہ بارِ خاطر کیوں تھی؟

تیری فرقت ـــــ روح کی کلفت
تیرا بچھڑنا دل پہ گراں تھا
لیکن جو ہونا تھا ہوا سب ـــــ
کچھ بھی ہمارے بس میں کہاں تھا؟

پل پل پیار پنپتا رہتا ـــــ
برسوں ساتھ نبھاتے ہم تم
نفرت پھیلانے والوں کے ـــــ
دعووں کو جھٹلاتے ہم تم

لیکن ایسا ہو نہیں پایا ـــــ
آگئے ہم ان کی چالوں میں

بے معنی جھگڑا لے بیٹھے ـــــ
بے مطلب تکرار بڑھا لی
پیار بھرے ہردے کے اندر
نفرت کی جوالا بھڑکا لی

نس نس میں دکھ کا لاوا ہے
جینا ـــــ اب اک پچھتاوا ہے

مستّر سنگھ

بی ۔ ۳۳۹، نیو فرینڈز کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۵

انصاری محمد اسحاق خضر

فنِ گداگری

دُنیا کے چند مقبول ترین فنون میں فنِ گداگری کا شمار ہوتا ہے۔ ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق اس فن کے ماہرین کی کثیر تعداد دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اور دنیا کا کوئی خطہ اور کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اس فن کا سکہ نہ چلتا ہو (ویسے بھی سکۂ رائج الوقت سے اس فن کا براہِ راست تعلق ہے) اس فن کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا خود انسان ہے۔ اس فن کی پرانی شکل وہ تھی جب لوگ جنس کے بدلے جنس کا تبادلہ کرتے تھے۔ اب ترقی یافتہ صورت میں محض تبادلہ ہوتا ہے۔ یعنی جنس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے میں دوسرے ہاتھ سے کوئی جنس پہلے ہاتھ میں نہیں پہنچتی۔ ہاں منہ سے چند کلمات کی ادائیگی ضرور ہو جاتی ہے۔ (بلکہ کبھی کبھی یہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا اور زیادہ بہتر شکل یہی ہے)

اس فن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے اکثر و بیشتر شعرائے کرام نے اسے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اُردو کے عظیم شاعر چچا غالب نے تو کمال ہی کر دیا۔ خود فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا جتن کرنے لگے۔ اور نہایت فخر سے اپنے اس تجربے کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ اپنے دیوان میں اسے کافی نمایاں جگہ دی ہے۔ ان کا اندازِ بیاں "اور" ہونے کے ساتھ ہی حقیقت بیانی کا مظہر بھی ہے ____ فرماتے ہیں:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

اور تو اور ناخدائے سخن میر تقی میرؔ بھی اس فن کے باج گزار رہ چکے ہیں۔ انھوں نے تو اس فن کی دو انتہائی لازمی شرائط کو بھی پورا کیا ہے۔ ایک شرط "صدا کرنا" اور دوسری شرط "دعا کرنا" ملاحظہ فرمائیے اور سر دُھنیے۔

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

اس فن کی ایک لازمی شرط اور بھی ہے اور وہ ہر راستے کے "سگانِ دریدہ دہن" سے خوف زدہ ہوئے بغیر اپنی صدا کی تکرار کرتے رہنا (یعنی بار بار صدا لگاتے رہنا) کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ بھونکنے والے کاٹتے نہیں (اس لازمی شرط کا ذکر فارسی کے ایک مشہور شاعر عُرفی نے کیا ہے:

عُرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدا را!

(ہم سے بہتر اردو جاننے والوں کے لیے اس شعر کا اُردو ترجمہ پیش ہے: عُرفی تو رقیبوں کے شور مچانے سے فکر مند نہ ہو۔ کتوں کے بھونکنے سے فقیروں کے آب و دانے میں کمی نہیں آتی۔)

یہاں عرفی نے "آوازِ سگاں" کو غوغائے رقیباں کہا ہے۔ یا غوغائے رقیباں کو آوازِ سگاں سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ ہم تو ریاضی کی مساوات کا ہنر بھی نہیں جانتے ورنہ ... ورنہ کیا؟ ورنہ ہم اپنے کسی ریاضی داں ساتھی کی مدد سے اس طرح کی مساوات بناتے۔

غوغائے رقیباں = آوازِ سگاں
(غوغہ = آواز) اس لیے رقیباں = سگاں
یعنی (یہ کیا؟) رقیب = سگ

(عرفی نے رقیب کو اگر سگ کہا ہے تو یہ سگ یقیناً سگِ لیلیٰ ہوگا۔) ہم ان تمام بکھیڑوں میں پڑے بغیر یقینِ کامل کے ساتھ یہ بات ضرور کہیں گے کہ فارسی کے اس مشہور شاعر نے "رزقِ گدا" کا تذکرہ کر کے فنِ گداگری کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ (اللہ جزائے خیر دے۔ آمین)

جب فنِ گداگری کے مسلم الثبوت ہونے کا ثبوت ایسی ایسی برگزیدہ ہستیوں نے دیا ہے تو ہما شما کا کیا شمار۔ ہمیں تو آنکھ بند کر کے اس فن کی قدر کرنی چاہیے بلکہ حتی المقدور اسے برتنے اور اپنانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ اس فن کو اپنانے کے جواز میں چند امور غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ اس فن میں گھاٹا یا نقصان جیسی کوئی چیز نہیں۔ درآمد ہی درآمد ہوتی ہے۔ برآمد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ گویا سود ہی سود ہے... "زیاں" ناپید... یہ ایسا نفع بخش فن ہے کہ جو کھا رنگ لانے کے لیے ہلدی اور پھٹکری کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ آپ کسی گلی، مکان، دُکان، دفتر کے قریب یا چوراہے پر مسکین صورت بنائے ایک عدد نعرہ (صدا) بار بار بلند کرتے رہیے۔ سارے

ہیڈ ماسٹر تہذیب ہائی اسکول، مالیگاؤں (ناسک) ۴۲۳۲۰۳

مخیرانِ قوم آپ کی تقریر کی لذت" سے آپ کی طرف کشاں کشاں آئیں گے اور اپنی جیب کا بار آپ کے سامنے خراجِ عقیدت کے طور پر ہلکا کرتے جائیں گے۔ آپ کو اتنی یافت ہوگی کہ آپ کا دامن تنگ معلوم ہونے لگے گا۔ ویسے کوشش کرنے پر علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہاتھ آسکتا ہے۔ کیوں کہ :

بر کریماں کارہا دشوار نیست

فنِ گداگری کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کاروبار میں کسی موسم، خطۂ آب و ہوا یا لسانی جھگڑے کا قطعی کوئی گذر نہیں۔ تمام قسم کی عصبیتوں سے پاک اگر کوئی فن ہے تو فنِ گداگری ہے (انتہائی سیکولر قسم کا فن ہے یہ۔ قومی یک جہتی کے لیے اس کا اختیار کیا جانا ازبس ضروری ہے) شاید یہی وجہ ہے کہ غالب نے سو پشت سے اختیار کیے ہوئے فنِ سپہ گری کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ کہ فنِ سپہ گری تو محض میدانِ جنگ ہی میں کام آسکتا ہے۔ میدانِ جنگ سے ہٹ کر یہ فن دہشت گردی کہلاتا ہے۔ فنِ گداگری کو کسی میدان کی ضرورت نہیں۔ زمان و مکان کی حدود اور بندشوں سے آزاد یہ فن ایک خود مختار فن ہے۔ اس فن میں کسی قسم کی مجبوری نہیں ہوتی۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تب بھی اور ہاتھ پاؤں ندارد ہیں تب بھی (بلکہ دوسری صورت افضل ہے) فنکاری اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ فنِ حرب کی طرح اس سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ فنِ گداگری ایک نہایت معصوم قسم کا فن ہے۔ اس کی معصومانہ ادائیں امنِ عالم کی ضامن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ملک جیسے ہی "ترقی پذیر" قسم کا ملک بننے لگتا ہے اس فن کو فوراً گلے لگا لیتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ کوئی ملک فنِ گداگری کو اپنا کر آناً فاناً ترقی پذیر ملکوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کامیاب مشق کر سکتا ہے۔ ہے نا یہ اس فن کی عالمی حیثیت ؟ سچ تو یہ ہے کہ بہت سارے ممالک آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں۔ فنِ گداگری کے گیسوؤں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اسیری انھیں ترقی کے بامِ عروج کی سمت بڑی تیزی سے پہنچانے لگتی ہے۔ خدانخواستہ اس فن کا سہارا انھیں نہ ملتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ "یہ ٹھکرائے ہوئے انسان خدا جانے کہاں جاتے"۔ (بیچارے!!)

اس فن کو اختیار کرنے کے لیے کسی فنکار کو تمام فنونِ لطیفہ میں مہارت حاصل کرنی ہوتی ہے۔ یا کم از کم کوئی ایک فنِ لطیفہ تو اسے آنا ہی چاہیئے۔ (ورنہ اس کی زندگی لطیفہ ہو جائے گی اور ہر کوئی اس پر ہنسے گا۔ چاہے یہ لطیفہ اُسے سمجھے یا نہ سمجھے) جس کو جس فن میں مہارت ہو اسی کا استعمال وہ گداگری میں بے تکلفی سے کر سکتا ہے۔ مثلاً موسیقی کی باریکیاں اور نزاکت جانے بغیر وہ گداگر کیا کر سکتے جو ہاتھوں میں آہنی حلقے پہنتے ہیں۔ اور ایک عدد ڈنڈے سے ان پر مسلسل ضرب لگا کر ایسی وجد آفریں موسیقی پیدا کرتے ہیں کہ سکندر علی وجد بھی کبھی ایسے وجد میں نہ آئے ہوں گے۔ کبھی کبھی تو محض چمٹا بجا کر ہی یہ لوگ ساتوں سروں کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ بات محض چمٹوں اور حلقوں ہی کی نہیں بجانے والے تو دو شیشے کے ٹکڑوں کو، پتھر کی پتلی سلوں اور چٹانوں تک سے موسیقی کے نرم و نازک راگ الاپنے کا کام لیتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کون کون سے بچے راگ ہیں جن کے نمونے گداگروں کی کلاسیکل گلوکاری کے ثبوت پر ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ گویا یہ فن ایک ہی شخصیت میں گلوکار کو یکجا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے ان ہستیوں کی بہت قدر کی اور ان کا کلام گداگرانہ شانِ امتیازی کے ساتھ گلی کوچوں میں عرصے تک گونجتا رہا۔

ایک ذرا سی توجہ سے مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ فنِ گداگری کے ماہرین علمِ نفسیات میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ یعنی کہ جتنے ہنرمند گداگر پائے جاتے ہیں سب کے سب پائے کے ماہرِ نفسیات بھی ہوتے ہیں۔ اچھے قیافہ شناس ہونے کی حیثیت سے "خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"۔ انھیں پورا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ کس ذاتِ شریف کے سینے میں پتھر کا دل ہے اور کون نیک بخت موم دل ہے۔ انھیں اس بات کا بھی پورا پورا علم ہوتا ہے کہ محض کسی کا موم دل ہونا ہی گداگروں کی قدر دانی کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ یہ موم دِل اس وقت تک نہیں پگھلتا ہے جب تک جیب گرم نہیں ہوتی۔ جیب کی گرمی سے دل کا موم پگھلتا ہے۔ ایک اچھا گداگر جیب کی گرمی ناپنے کا چلتا پھرتا تھرمامیٹر ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیتا ہے کہ "بکرا" کتنا موٹا ہے۔ اس میں لحمی اور شحمی تناسب کیا ہے۔ جب تک شحامت (پی پی) کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، بکرے کی شامت نہیں آتی اور ایک مرتبہ اندازہ ہو جائے تو پھر ایک ماہرِ فن اس بکرے کو اس طرح دبوچے بغیر نہیں رہتا جیسے کوئی مکڑا جال میں پھنسی ہوئی مکھی کو دبوچتا ہے۔

فنِ اداکاری بھی فنِ گداگری کا ایک حصہ ہے۔ بلکہ نہایت لازمی قسم کا حصہ ہے۔ جب تک کوئی اچھا بھلا گداگر خود کو لولا، لنگڑا یا معذور بنا کر نہ پیش کرے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دو آنکھوں کی نعمت ہوتے ہوئے نہایت کمال اداکاری سے خود کو نابینا ظاہر کرنا اس فن کے لئے ایک ضروری لازمی یا ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب ہماری بیگم نے ایک انتہائی مسکین صورت مصیبت زدہ عورت کو جھڑک کر گھر کے دروازے سے بھگا دیا۔ ہم نے بیگم سے کہا "ضرورت مند سائل کو اس طرح لوٹانا اچھی بات نہیں ہے"۔ بیگم

نے ہم سے کہا "تم کیا جانو یہ ٹڑھیا لوگوں کو سود پہ قرض دیتی ہے۔ اور سود در سود میں نہیں ہزاروں کا لین دین ہوتا ہے۔ دو ایکڑ زمین کی مالک ہے اور کئی گھر لے رکھے ہیں اس نے۔" ہم تو یہ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ کہ کس خوبصورتی سے وہ یاس و محرومی کی تصویر بن کر دولت اکٹھا کرتی رہی ہے۔ اور ہمیں اس کی اداکاری میں حقیقت کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ اب کے فلم فیئر ایوارڈ کے لیے بہترین اداکاری کا انعام تو اسی کو ملنا چاہیے (ایک سفارشی مضمون تیار کرنا چاہیے اس کے حق میں)

ہم نے پہلے ہی عرض کیا کہ فنِ گداگری میں سوائے فائدے کے اور کچھ نہیں۔ پڑوسیوں نے تو اس فن کو نمک مرچ سے لے کر سبزی اور روٹی تک اور اخبار سے لے کر ٹی۔ وی تک مفت میں حاصل کیا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمیں ایک ایسی کتاب بغرضِ مطالعہ مطلوب تھی جو کہ سارے شہر کے کتب خانوں میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی ہمیں نہ مل سکی۔ پتہ چلا خود ہمارے دوست کے کتب خانے میں موجود ہے۔ گئے۔ علیک سلیک کے بعد مدعا بیان کیا۔ کہنے لگے بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔" ہم بولے "کہو"۔ بولے "بھائی دیکھو، یوں تو سارا کتب خانہ تمہارا ہے۔ لیکن میں نے لوگوں کو گھر لے جا کر کتابیں پڑھنے کے لیے دینا قطعی بند کر دیا ہے۔ جو کتاب چاہو اور جب تک چاہو پڑھو۔ لیکن یہیں بیٹھ کر۔ گھر پر کتاب لے جانا بالکل منع ہے۔" ہم نے کہا "کمال ہے بھئی، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ آدمی اپنے گھر جا کر اطمینان سے مطالعہ کرے گا۔ کچھ نوٹس (NOTES) تیار کرے گا۔ یا پھر ... " کہنے لگے "تمہاری تمام باتیں سر آنکھوں پر لیکن کتاب تو تم گھر نہیں لے جا سکتے۔" ہم نے گھگیا کر کہا کہ "ایسی کون سی غلطی ہم سے سرزد ہو گئی ہے کہ تم ایسی بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہو؟" وہ بولے "تم سے تو نہیں ہوئی کوئی غلطی۔ لیکن دوسرے لوگ کتابیں لے جاتے ہیں تو لوٹاتے نہیں"۔ ہم فوراً بول پڑے "سراسر غلط بات کرتے ہو تم۔ آخر کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس اپنے اس دعوے کا؟" ہمارے دوست نے برجستہ کہا "میرا پورا کتب خانہ ہی اس کا ثبوت ہے۔" اب ہم کیا کہتے سوائے اپنا سا منہ لیے رہ جانے کے ہمارے پاس چارہ بھی کیا تھا؟ فنِ گداگری سے ناواقف جو ٹھہرے۔

تسکین زیدی

مشین کا درد

ایک ماہ کی چھٹی کے بعد جب وہ فیکٹری آیا تو اسے سارا ماحول غیر مانوس اور بدلا ہوا محسوس ہوا۔ فورمین کے رویے میں بھی ناراضگی کا عنصر تھا۔ شاید اس کی جگہ پر کام کرنے والے ملازم نے اپنے خوشامدانہ رویے اور چاپلوسی سے اسے اپنے چنگل میں کر لیا تھا اس کے علاوہ اس نے اس شخص کی تعریف بھی پروڈکشن منیجر سے کر دی ہے تبھی تو وہ اس کے سامنے تنا ہوا مشین کے پاس کھڑا طنز بھری نظروں سے اُسے گھور رہا ہے۔

اور اس خبر نے تو اُسے چونکا دیا اور متفکر بھی کر دیا کہ نئے مزدور نے اس سے دُوگنا پروڈکشن دیا ہے۔ اس کے ذہن پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ اب منیجر ضرور اس سے جواب طلب کرے گا اور پھر پتہ نہیں کیا رویّہ اختیار کرے اس کی نظروں میں بیوی اور بچوں کے زرد مُرجھائے ہوئے چہرے گھوم گئے...

جوان بیٹی جو اپنی شادی کے سپنے دیکھ رہی ہے اس کا کیا ہوگا؟

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری — "ہے بھگوان! تو میرا بار بار کیوں اتنا کڑا امتحان لے رہا ہے۔ میں تو تیرا ایک کمزور بھگت ہوں۔"

کافی دن سے وہ بیٹی کی شادی کے لیے پیسہ جمع کرنے کی دُھن میں شب و روز محنت کر رہا تھا۔ رات بھر کارخانے میں کام کرتا اور دن میں دوسری جگہ مشین چلاتا۔ اسے ایک منٹ کو بھی آرام میسّر نہیں تھا۔ وہ اسی کوشش اور جدوجہد میں لگا رہتا کہ کسی طرح جہیز کا سامان تیار ہو جائے۔ ابھی تو صرف دو زیور اور چند جوڑے کپڑے ہی بن پائے تھے۔ ابھی تو اُسے لڑکے کے لیے ایک سائیکل کا بھی انتظام کرنا تھا جس کی مانگ اس نے خصوصی طور پر کی تھی۔ آج کل سائیکل بھی چھ سو سے کم میں نہیں آتی۔ کتنی تیزی سے حالات بدلے ہیں۔ اس کے زمانے میں تو ساٹھ ستّر روپے قیمت تھی۔ اس کی سائیکل تیس سال پُرانی ہونے کے باوجود آج تک اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ کتنے ہی سخت موسم اس پر سے گذر گئے اور وہ ابھی تک جُوں کی تُوں ہے پھر اُسے خیال آیا کہ بارات کے سواگت اور کھانے کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ تقریباً سو باراتیوں کا انتظام جس میں دو ڈھائی ہزار روپے کا خرچہ تھا۔ آخر یہ سب کیسے ہوگا —؟ اس نے سوچا اور اس کے سینے میں درد جاگ اُٹھا — ایک ماہ کی چھٹی اس نے بیماری کے بہانے منظور کرائی تھی اور اس کے لیے ڈاکٹر کو نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا — چھٹی لے کر وہ دوسرے کارخانے میں تندہی سے رات دن کام کرنے لگا کہ کسی طور زیادہ سے زیادہ پیسہ پیدا کر لے۔ لیکن قسمت کی ریکھا اپنا کام کر رہی تھی اس کی دن رات کی محنت اور کھانے پینے سے لاپرواہی کے سبب صحت پر خراب اثر پڑا۔ رات میں اُسے بخار رہنے لگا۔ کھانسی بھی اٹھتی تھی — نقاہت بڑھتی گئی اور وہ چارپائی پر پڑ گیا۔ بیوی نے اُسے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھایا۔

ڈاکٹر نے جب اس کا چیک اَپ کیا تو مکمّل آرام کی صلاح دی۔ سینے کے ایکسرے کا بھی مشورہ دیا اس نے ٹالنا چاہا لیکن بیوی نے ضد کر کے اس کا ایکسرے کروایا جس میں اس کی کئی دن کی مزدوری کام آگئی۔ پھر ایکسرے کی رپورٹ نے تو اس کی جان ہی نکال دی۔ ایک پھیپھڑے میں داغ آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے ڈھیر ساری دوائیں لکھ دیں اور انجکشن برابر لگوانے کی ہدایت کی — چیسٹ اسپتال کو ریفر کرتے ہوئے بولا۔

"بیمہ اسپتال کا چکّر چھوڑو وہاں کے علاج سے آدمی وقت سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ اچھی غذا لو — دودھ گھی مکھن اور پھل کھاؤ — کسی قسم کی فکر اور بوجھ دل پر نہ رکھو ورنہ ڈپریشن کا شکار ہو جاؤ گے۔"

بھلا وہ ڈاکٹر سے کیسے کہتا کہ اگر وہ

بزم خضر راہ گوالٹولی کانپور ۔۱

اپنی صحت کا اتنا خیال رکھے گا تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا اور بیٹی کی شادی کیسے ہوسکے گی؟ فکروں کے جال سے آزاد ہونا اس کے بس میں نہ تھا اس کی تو یہی خواہش تھی کہ کسی طرح بیٹا کا کنیادان کرکے بھگوان سے جا ملے۔ انھیں حالات کے سبب وہ کارخانے میں صحیح ڈھنگ سے کام نہ کرسکا تھا۔ رات کی ڈیوٹی میں اکثر وہ آدمی شب میں سو جاتا ــــ فورمین نے کئی بار ٹوکا بھی اور ایک بار منیجر نے چیک بھی کرلیا تھا لیکن وہ تو کہیے کہ قسمت اچھی تھی کہ صرف وارننگ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ ابھی وہ انھی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ نئے مزدور نے اسے مخاطب کیا ــــ

"آگئے چاچا؟ کیسے ہو؟"

وہ اس طرح چونکا جیسے کسی نے اُسے سوتے سے جگا دیا ہو ــــ

"ہاں آگیا ــــ ٹھیک ہی ہوں۔"

اُس نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کا خون کھول گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے کچّا ہی چبا ڈالے۔ کم بخت آگ لگا کر تماشا دیکھ رہا ہے اور اب خیریت پوچھ رہا ہے سب کچھ تو اسی کا کیا دھرا ہے۔ آج صبح کیسا اس کی مشین پر تن کر کھڑا تھا۔

وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور پھر اُسے مخاطب کرتے ہوئے بولا ــــ "تم میری نوکری کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ یونہی وفاداری کا سرٹیفکیٹ لیتے رہے تو میری طرح وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاؤ گے۔ میں نے بھی برسوں اسی طرح محنت سے کام کیا ہے لیکن مجھے ملا کیا؟ وہی مزدور کا مزدور ہوں اور ایک جان لیوا مرض الگ لگا بیٹھا۔"

نیا مزدور خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا پھر بولا ــــ "چاچا! میں نے تو مستقل ہونے کے لیے اتنا تیز کام کیا ہے سال بھر سے عیوضی پر چل رہا ہوں، کچھ دن بعد تو میری بھی یہی رفتار ہو جائے گی۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا کہ فورمین آگیا اور اس کی طرف گھور کر ناراضگی سے بولا ــــ

"جاؤ تمھیں منیجر صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

وہ ایک دم گھبرا گیا اور کانپتے ہوئے بوجھل قدموں سے منیجر کے کمرے میں پہنچا اور سلام کرکے خاموش کھڑا ہوگیا۔

"آگئے تم؟ فورمین نے تمھاری رپورٹ کی ہے کہ تم بہت سستی سے کام کرتے ہو ــــ تمھاری عیوضی پر جو آدمی کام کر رہا ہے وہ تم سے ڈبل پروڈکشن دے رہا ہے۔ تم بہت کام چور ہو تم جیسے مزدوروں کی ہماری فیکٹری کو ضرورت نہیں۔"

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سرکار! ایسا نہ کہیے میں پروڈکشن کم ضرور دیتا ہوں لیکن مجھے مشینوں کی دیکھ ریکھ کا پورا خیال رہتا ہے۔ اگر زیادہ تیز چلاؤں گا تو پُرزے جلدی خراب ہو جائیں گے۔ آپ نے اس مشین کی حالت دیکھی؟ کس بے دردی سے اس اناڑی نے اسے چلایا ہے؟ صفائی تک ڈھنگ سے نہیں کی ــــ کیسی آواز پیدا کر رہی ہے؟"

منیجر توجہ سے اس کی باتیں سُن رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اُس سے کچھ کہتا یکایک پشت کے کمرے میں ایک ــــ زوردار دھماکہ ہوا جس سے ساری فضا دہل گئی منیجر نے باہر نکل کر جلدی سے پوچھا ــــ

"کیا ہوا؟ یہ کیسی آواز ہے؟"

فورمین بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا ــــ

"سر! وہ مشین ٹوٹ گئی!!"

سیّدہ شانِ معراج

ماضی کو بھول آئے ہم صورتِ حال کے سبب
چہرہ غبار ہوگیا گردِ ملال کے سبب

روز طلوعِ مہر سے پھوٹی اُمید کی کرن
روز ہی آئی شامِ غم اس کے زوال کے سبب

ربِّ کریم کو بھی کیا میری دُعا سے بیر تھا؟
ہجر نصیب کر دیا شوقِ وصال کے سبب

یہ بھی ہوا ہے بارہا بھول گئے ہیں راستہ
چھوٹ گئی ہیں منزلیں اُس کے خیال کے سبب

اُس نے کچھ اِس ادا سے آج پوچھ لیا مرا مزاج
آنسو پلک تک آگئے پُرسشِ حال کے سبب

تاربن گلی، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱

لفظوں کو سجا کر جو کہانی لکھنا
ہو ذکر لہو کا بھی تو پانی لکھنا
اب عکسِ محبت بھی ہوا ہے کمیاب
اِس دَور میں ہے کیسی گرانی لکھنا
گو یاد ہے اب تک مجھے غم کا موسم
پر ٹھیک نہیں دل کی کہانی لکھنا
رفتارِ ہوا تیز ہوئی ہے کہ نہیں
یہ دیکھ کے پانی کی روانی لکھنا
پیری کے نگر میں تو ہے کہرام بپا
کس حال میں ہے شہرِ جوانی لکھنا
گذرے ہوئے دن کا ہو اگر ذکر صدفؔ
گذری ہے جو اِک شام سہانی لکھنا

صدف جعفری

۲۶، ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

ملکہ نسیم

صلہ جراحتِ غم کا بھی کچھ ملا کہ نہیں
یہ دیکھ تجھ کو زمانے نے کچھ دیا کہ نہیں
گلوں کی چاک قبائیں سوال کرتی ہیں
دیارِ گل سے کوئی کارواں چلا کہ نہیں
فرات آگئی چلّو میں ایک پیاسے کے
مگر یہ دیکھ لبِ خشک تر کیا کہ نہیں
بہت دنوں میں جب آئی تو سب سے یہ پوچھا
مری سہیلی کا ڈولا ابھی اٹھا کہ نہیں
صدائیں دیتے ہیں کہسار کب سے شیشہ گرو
تمہارے بیچ کوئی کوہکن اُٹھا کہ نہیں
ابھی اٹھے بھی نہ تھے ہاتھ بددعا کے لیے
سرِ بریدہ سے آنے لگی صدا کہ نہیں
نسیم دیکھیں ذرا حال شہرِ آتش کا
نشانِ شبنم و گل بھی کہیں بچا کہ نہیں

نزد عدالت، سیوہار ۲۴۶۷۰۱

رضی احمد تنہا

خوابوں کی سرزمین

صدیوں کے شب و روز پر محیط وہ ایک شب گزیدہ سحر تھی ——

سالہا سال کی خشک سالی اور قحط سالی کو مشیتِ ایزدی تصور کر کے ہم صبر و قناعت کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ ہمارے پائے استقلال میں لرزش تک نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب نوبت قحط الرجال تک پہنچی تو ——

ہم نے اپنے اپنے مکانوں کے در و دیوار کو بہ نگاہِ حسرت آخری بار دیکھا۔ نم آلود آنکھوں کے گوشے الٹی ہتھیلیوں سے خشک کیے۔ اپنی اپنی دہلیز دل پر الوداعی بوسے ثبت کیے اور خوابوں کی سرزمین کی سمت گامزن ہو گئے ——

یہ وہی خوابوں کی سرزمین تھی جس کے قصے ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنے تھے۔ جس کے تذکرے ہمارے اسلاف کی دستاویزوں میں تھے۔ اور جس کی بشارت مقدس کتابوں میں دی گئی تھی ——

یہ وہی خوابوں کی سرزمین تھی جس کی —— ہوائیں مشک و زعفران سے معطر، پانی آبِ حیات سے خوشتر، موسموں کی نیرنگیاں نشاط انگیز و روح پرور، چشمے اور دریا صاف و شفاف پانی سے لبریز، سلسلۂ کوہ نشانِ جبروت و عظمت، چراگاہیں سرسبز و شاداب، مزرعہ قسم قسم کے اجناس کا ذخیرۂ نایاب، شاہراہیں کشادہ، عمارات بلند و بالا، دوشیزائیں مجسمۂ حسن و شباب، جواں مثلِ برق گرم جوش، مثلِ فولاد سخت کوش، پیر دانشمند، طفل معصوم و خرسند —— غرض یہ کہ ہر شئے بیش بہا ہر فرد یکتائے روزگار۔

یہ وہی خوابوں کی سرزمین تھی جس کی سمت ہمارا قافلہ گامزن تھا۔ فضائیں اس قدر مخدوش اور ماحول اس قدر مشکوک تھا کہ ہم نے شاہراہوں کی بجائے تنگ و تاریک اور نسبتاً محفوظ راہوں کا انتخاب کیا —— پھر بھی ہر موڑ پر کچھ نہ کچھ نذرانہ جانی یا مالی صورت میں ہم ادا کرتے رہے۔

مرد و زن، پیر و جوان افراد پر مشتمل ہمارا یہ قافلہ، عفریتوں کے تعاقب، آسیبوں کے شب خون کا مردانہ وار سامنا کرتے فصیلِ شہر تک پہنچا ہی تھا کہ ایک کرخت آواز گونج اُٹھی

"خبردار!" —— فضا کی برہنہ پشت پر جیسے کسی نے سٹراک سے چابک رسید کر دیا ہو۔

"جو قدم آگے بڑھایا"

ہمارے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے جب ہمارے حواس بجا ہوئے تو قافلے میں سرگوشیاں ٹڈی دل کی طرح منڈلانے لگیں۔

"یا اللہ! ہمیں آلِ فرعون کے شر سے محفوظ رکھ! ہمیں راستہ دکھا"

زیر لب دعائیہ کلمات کا ورد کرتے ہوئے سالارِ قافلہ نے اس کرخت آواز کی سمت رخ کیا اور قدرے فاصلے سے دریافت کیا "ہمیں اس طرح روکنے کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب!" ایک تمسخر آمیز قہقہہ بلند ہوا۔ "مطلب! قیمت، محصول، ادا کر دو اور جہاں جانا چاہو بلا خطر چلے جاؤ" اب اس کا ہیبتناک اور وحشیانہ چہرہ اور واضح ہو گیا تھا۔ گوشۂ دہن سے رال ٹپک ٹپک کر اس کی آستین کو بھگو رہی تھی۔ دو نوکیلے دانت اور سُرخ لپکپاتی زبان کی وجہ سے وہ عجیب الخلقت لگ رہا تھا۔

"تم کون ہو قیمت وصول کرنے والے؟" سالارِ قافلہ نے بہ ہمت تمام اس سے پوچھا۔

"میں محافظِ فصیلِ شہر ہوں۔ میری اجازت کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ چہ جائیکہ اتنے نفوس پر مشتمل تمہارا یہ قافلہ —— خیر اسی میں ہے کہ جو بھی مال و اسباب ہے جمع کر دو، پروانۂ راہداری بھی مل جائے گا اور بارِ سفر بھی کم ہو جائے گا —— ہم اتنے بے رحم بھی نہیں کہ تمہیں تمہارے خوابوں کی سرزمین سے محروم کر دیں۔"

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اپنا تمام مال و اسباب اس کے سپرد کر دیتے اور ہم نے ایسا کیا بھی۔ کیونکہ خوابوں کی سرزمین کے مقابلے میں اس کی کیا وقعت تھی —— ہم تو اس کے لیے سروں کا سودا بھی کرنے پر آمادہ تھے۔

یوں ہمارا قافلہ سرگرم سفر تھا۔ روز روشن میں شتر بارِ آفتاب کے زیر عناں تو شبِ تاریک میں عفریتوں کے غیر متوقع شب خون کے خوف سے

ادریہ کورٹ، پورنیہ ۸۵۴۳۰۱ (بہار)

ہراساں، لرزاں، صبح خارِ مغیلاں کی وادی میں تو دوپہر آتشناک صحرا میں، شام کسی لق و دق دریا کے کنارے تو رات کسی شیرِ ببر کی ماند میں تھی۔ بادِ سموم کے آتشیں چابک تو کبھی تیغ طوفان کے مرغولے۔ کبھی فاقہ کشی تو کبھی تشنہ کامی، کبھی گیاہ و نباتات پر انحصار تو کبھی صبرِ کلی پر اکتفا۔ کبھی خون آشام نیزوں کی انیاں طفلِ شیر خوار کے تشنہ حلقوم پر، تو کبھی غنجر آسیب دوشیزاؤں کے دامنِ عصمت پر۔ کبھی شمشیرِ عفریت جوانوں کا گرم لہو بہاتی ہوئی ہر قدم، ہر فرسنگ پر، ہر لمحہ، ہر مقام پر ہم سے بقدر حوصلہ وظرف خوابوں کی سرزمین کی قیمت وصولی جاتی رہی مگر ہمارے پائے ثبات میں لرزش تک نہ ہوئی۔ صبر و توکل کو زادِ راہ تسلیم کرکے ہم عزمِ آہنی کے ساتھ پیش قدمی کرتے رہے کرتے رہے۔ . . حتّٰی کہ وہ مقام آگیا جسے عبور کرتے ہی ہم خوابوں کی سرزمین میں داخل ہوجاتے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں سے خوابوں کی سرزمین شروع ہوتی تھی۔ جہاں مختلف شہر و مقامات سے آتے ہوئے قافلے یکجا ہوئے تھے۔

ہمارے اور خوابوں کی سرزمین کے درمیان ایک وسیع و عریض و عمیق خندقِ ازلی حقیقت کی شکل میں موجود تھی۔ مختلف شہر و مقامات سے آئے ہوئے انسانی سروں کا سمندر خندق کے کنارے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ حدِ نگاہ تک خلقِ خدا سراسیمہ، سرگرداں، پریشان حال، پریشان روزگار اور ان کے درمیان دیو قامت، دراز قد، فربہ اندام، کوتاہ گردن، سرخ چشم، سیاہ چہرہ، جسم پر دراز بالوں کا ستر پوش۔ مگر قطعی مادرزاد برہنہ وہ ہیبتناک اور عظیم الجثہ آہنی گرزن اٹھائے انسانی سروں کے اژدہام پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ادھر خلقِ خدا تھی کہ بہر صورت اس خندق کو عبور کرکے اپنے اپنے خوابوں کی سرزمین تک بر عجلت تمام پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کشاکش گہما گہمی اور افراتفری کے ماحول میں قیمتی انسانی جانیں ضائع بھی ہورہی تھیں ——— کچھ جنونی قدموں کی زد میں آکر، کچھ خندق میں پھسل کر تو کچھ حبس کا شکار ہوکر۔

پھر بھی خلقِ خدا تھی کہ امڈی پڑ رہی تھی۔ سارے مجمع پر امید و بیم، اضطراب و اضمحلال کا سماں طاری تھا اور وہ عظیم الجثہ مخلوق آہنی گرز اٹھائے کسی کو بھی خندق کے کنارے آنے سے روکتا تھا۔ خدشہ تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو شاید تمام کے تمام خندق کی نذر ہوجائیں اور ان کے خوابوں کی سرزمین ان کے ساتھ ہی مدفون ہوجائے۔

تمام راستے مسدود، تمام دعائیں بے اثر اور ساری تمنائیں اس ایک عظیم الجثہ مخلوق کے جنبشِ ابرو کی محتاج۔

"ہمیں راستہ دو ——— ہم ہر قیمت پر اپنے خوابوں کی سرزمین تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اس خندق کو عبور کرنا ہے"۔ انسانی سروں کے اژدہام سے اسی قبیل کی آوازیں اور التجائیں بتدریج بلند ہوکر نعروں میں تبدیل ہونے لگیں۔

"ہرگز نہیں! ——— تم اس خندق کو عبور نہیں کرسکتے ——— حتّٰی کہ تم قیمت نہ ادا کردو" وہ عظیم الجثہ گرجا۔

"ہم تیار ہیں . . . ہم تیار ہیں ——— ہمیں کیا قیمت ادا کرنی ہوگی ———" پورا مجمع بیک زبان ہوکر چلّایا۔

"بھائیو! ٹھہرو۔ توقف کرو۔ عجلت نہ کرو۔ قبل اس کے کہ کچھ فیصلہ کرو پہلے حالات پر ٹھنڈے دل سے غور تو کرلو"۔ مجمع سے ایک نحیف اور مدقوق سی آواز ابھری مگر ہم میں سے کسی نے بھی اُسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔

نہ جانے کتنی بار وہ نحیف و مدقوق آواز ہوا کے دوش پر ابھری اور انسانی سروں کے ہجوم میں کھو گئی۔ کسی نے بھی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ "مگر تم ہو کون؟ قیمت وصولنے والے۔ خوابوں کی وہ سرزمین ہماری اپنی ہے۔ ہمارے معاملے میں تم دخل دینے والے کون ہو؟"

بھائیو! عجلت نہ کرو۔ بھائیو ٹھہرو! ———" وہ نحیف و مدقوق آواز اپنی ہی جنبش پر لرز کر دم توڑ گئی۔

اس کی جگہ ایک فلک شگاف تمسخر آمیز قہقہہ توپ کے دھماکے کی طرح پھوٹا اور سارا مجمع لرزہ براندام ہوگیا۔

"میں؟ میں کون ہوں! اے انسانی سروں کے ہجوم دیدۂ عبرت سے مجھے دیکھو اور گوشِ ہوش سے سنو۔ کیا وہ تم ہی نہیں تھے جنھوں نے مجھے اس مقام پر مقرر کیا کہ ہر آنے جانے والے قافلے پر نگاہ رکھوں۔ قبل اس کے کیا میں ایک بے جان و بے ہنگم مجسمہ نہیں تھا؟ کیا وہ تم نہیں تھے جنھوں نے میری صدیوں کی حنوط شدہ لاش میں اپنی روح پھونکی اور فرائض سے آگاہ کرکے اس مقام پر مقرر کیا؟ ——— بلاشک و شبہ وہ تم ہی تھے"۔ وہ خاموش ہوا تو سارا مجمع اپنی جگہ ساکت و جامد تھا۔

اس عظیم الجثہ مخلوق نے فاتحانہ انداز میں حدِ نگاہ تک مجتمع خلقِ خدا کو بہ نگاہِ حقارت دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں گویا ہوا ——— "یہ خندق جو تمھارے پیشِ نظر ہے۔ جس کی وسعت قطب تا قطب، جس کا عرض ناقابلِ عبور اور جس کی گہرائی تحت الثریٰ تک ہے۔ جسے تم عبور کرنا چاہتے ہو ——— کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ

عالمِ وجود میں کس طرح آئی ؟ برہنہ حقیقت تو یہ ہے اس خندق کی مٹیاں تمہارے معبدوں کی تعمیر میں صرف ہوئی ہیں اور یہ کارنامہ تم نے ہی انجام دیا ہے ——— اور اب تم جاننا چاہتے ہو کہ میں کون ہوں ——— میں وہی تمہارا نمک خوار پرانا خادم ——— داروغۂ خندق"

"اگر واقعی تم اپنے خوابوں کی سرزمین تک جانا ہی چاہتے ہو تو میں مزاحم نہیں ہوں گا۔ عبورِ خندق کی قیمت ادا کرو اور جاؤ"

"کیا ہے قیمت ؟ ہم تیار ہیں۔ ہر قیمت پر۔ ہر حال میں" لبیک لبیک کی آواز پورے مجمع میں گونجنے لگی۔

"تو سنو ——— خندق پاٹے بغیر عبور کرنا ممکن نہیں ہے۔ نہیں ہے نا ؟ اور اس کی مٹیاں تم اپنے معبدوں میں صرف کر چکے ہو۔ ہے نا ؟ اب ایک طریقہ ہے۔ اپنے اپنے سروں کو اپنی اپنی تلوار سے قلم کرکے خندق میں ڈالتے جاؤ حتیٰ کہ تمہارے سروں سے خندق پٹ جائے اور زمین ہموار ہو جائے اور تم اپنے اپنے خوابوں کی سرزمین تک بلا خوف و خطر جا سکو۔ سمجھ گئے نا۔ قیمت! سر صرف تمہارا سر!

ہم اپنے اپنے سروں کی قیمت پر خوش تھے کہ خوابوں کی سرزمین کے مقابلے میں سر کی کیا اہمیت ہے اور ہم نے اپنے اپنے سروں کو اپنی اپنی تلوار سے قلم کرکے خندق میں ڈالنا شروع کیا۔ یہ عمل عرصہ تک جاری رہا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ خندق جیسی تھی بدستور ویسی ہی تھی۔ جبکہ مجمع میں ایک بھی جسم ایسا نہیں بچا تھا کہ جس کی گردن پر کوئی سر ہو۔

عرصہ گذر گیا۔ کتنے موسم گذر گئے۔ مگر آج بھی اس وسیع و عریض و عمیق خندق کے دونوں کناروں پر سر بریدہ جسموں کا ہجوم جوں کا توں سرگرداں و پریشان بھٹک رہا ہے ——— اور وہ عظیم الجثہ مخلوق اس سر بریدہ مجمع پر مطلق العنان کی طرح حکمراں اور خندہ زن ہے۔

●

(ڈاکٹر) شفقت اعظمی

ڈھلتی عمر اور اس کے تقاضے

یہ انسانی ذہن کا خاصّہ ہے کہ سر کے بالوں میں چاندی کے تار نظر آتے ہی دنیا کی بے ثباتی اور موت کا یقین مستحکم تر ہوجاتا ہے۔ یہ دراصل تیموسی رشح (THYMIC HORMONE) کی برآمد کے زوال مسلسل کا کرشمہ ہوتا ہے۔ یہ لوتھڑے والے غدے یعنی تیموسیہ سے رستا ہے جو قلب کی سطح پر پیشانی ہڈی کے عین نیچے واقع ہوتا ہے تیموی رشح مناعتی نظام کی تحریک کو کنٹرول کرتے ہیں۔ بالخصوص خون کے سفید ذرّات کو جو جسم کے پاسبان ہوتے ہیں۔ یہ جنسی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پیدائش کے وقت ان غدود کا وزن ۲۰۰ تا ۲۵۰ گرام ہوتا ہے۔ بلوغ کے بعد یہ تیزی سے سکڑنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ۶۰ سال کی عمر میں خلیات کا فقط ایک ٹھنٹھ بن کر رہ جاتا ہے، جس کا وزن مشکل سے ۳ گرام ہوتا ہے۔

۳۰ تا ۸۰ سال کے مابین گردے کی صلاحیت ۸۰ فیصد کم ہوجاتی ہے۔

پھیپھڑے کی زیادہ سے زیادہ سانس لینے کی صلاحیت ۳۰ تا ۵۰ فیصد کم ہوجاتی ہے۔

دماغ کا وزن ۲۰ فیصد کم ہوجاتا ہے، ظاہر ہے اس کے نتیجے میں دن بہ دن ہزاروں دماغی خلیات یا اعصابات (NEURONS) ضائع ہوجاتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں ہوتی، تاہم اس کی کثرت اور قدرتی عمل کے سبب یادداشت کا نقصان اور دماغی کارکردگی کی کم رفتار عام طور سے صحتمند شخص میں بظاہر محسوس نہیں ہوتی۔

۳۰ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد دونوں جنس یعنی عورتوں اور مردوں میں ہڈیوں کا اُبھار ۱ فیصد سالانہ کے اعتبار سے حذف ہونے لگتا ہے۔ سن یاس کے بعد عورتیں کیلشیم کے ضیعان کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ہزال عظام (OSTEOPOROSIS) میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ یہ کبرسنی کی وہ مخصوص حالت ہے، جس میں ہڈیاں بے لوچ اور بوسیدہ ہوجاتی ہیں نیز بآسانی ٹوٹ جاتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ۲۵ سال کی عمر سے ہی قد گھٹنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور آئندہ ۲۰ سال میں ½ انچ گھٹ سکتا ہے کیونکہ عمود الفقار (VERTEBRAL COLUMN) میں اقراص (DISCS) تباہ ہونے لگتے ہیں معمّر اشخاص کو خمیدگی اور کوبڑ کی شکایت ہوجاتی ہے۔ ایک شخص ۶۰ سال کی عمر میں عہدِ شباب کی بہ نسبت ایک انچ کا تین چوتھائی چھوٹا ہوجاتا ہے۔

عضلاتی تودے (مچھلیاں) زوال پذیر ہوجاتے ہیں، چونکہ مزید عضلاتی خلیات کی بازتکوین نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی پابجائی شحوم سے ہوتی ہے ۳۰ تا ۷۰ سال کے دوران اوسط شخص جسمانی عضلات کا ۳۰ تا ۴۰ فیصد حصہ کھو دیتا ہے۔ نیز ایک فرد ۶۰ سال کی عمر میں اپنی ۲۵ سالہ عمر کے مقابلے میں نصف فیصد عضلی توانائی سے محروم ہوجاتا ہے۔

۱۰ سال کی عمر میں سماعت شباب پر ہوتی ہے اس کے بعد زوال شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں میں سماعت کا فرق بہت دیر میں واقع ہوتا ہے۔

۴۰ سال کی عمر سے بصارت متاثر ہونے لگتی ہے اور بالعموم قریب کی نظر زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

پتلیاں سست پڑ جاتی ہیں، چونکہ یہ سکڑ جاتی ہیں اس لیے شبکیہ پر پڑنے والی روشنی کی مقدار بھی کم ہوجاتی ہے اس حالت کو یاسی میوسس (SEMILE MIOSIS) سے تعبیر کرتے ہیں اور دھندلی روشنی میں انسان ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس نے ویلڈر کی عینک پہن رکھی ہے۔ آنکھ کا عدسہ بھی سخت اور دھندلا ہوجاتا ہے۔ نصف فیصد سے زیادہ آبادی، ۶۰ سال کی عمر کے بعد بالعموم موتیابند کا شکار ہوجاتی ہے۔

شامّہ و ذائقہ بھی کم متاثر نہیں ہوتے۔ زندگی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں فقط ۳۶ فیصد بصلۂ ذائقہ (TASTE BUDS) فعال رہ جاتے ہیں۔

خدا کا بے پایاں کرم ہے کہ قوت شامہ کا انحطاط نسبتاً بعد میں یعنی ۵۰ سال کے بعد واقع ہوتا ہے، چونکہ بو کے ادراک کا انحصار مجموعی بو کے ۸۰ فیصد حصے پر ہوتا ہے اور کھانے کی بو رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا معمّر افراد کھانے میں تنوع کے متلاشی ہوجاتے ہیں۔ نتیجتہً وزن گھٹنے،

۴۴۰ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۲۵

بھوک کی کمی اور عدم تغذیہ کی شکایت ہونے لگتی ہے۔

عمر کا سب سے گہرا اثر جلد اور بالوں پر پڑتا ہے۔ جلد کی بیرونی پرت خشک اور داغدار ہو جاتی ہے۔ وسطی پرت یعنی ادمہ (DERMIS) نمایاں حد تک باریک ہو جاتی ہے جس سے اس میں ایک طرح کی نیم شفافیت آجاتی ہے، علاوہ بریں زیرِ جلد شحوم کے ضیاع سے بھی جلد زردی مائل جھری دار ہو جاتی ہے۔

بہر حال انسان کی حیات مستعار کی طرح اس سے متعلق مفروضات اور نظریات کو بھی کبھی استحکام نہ مل سکا۔ یہ ممکن ہے کہ جملہ نظریات یکسر غلط ہوں یا ان میں سے کسی نظریے کو مستقبل کے سائنسداں کی توثیق حاصل ہو جائے انسان کے فکر و شعور کو پختگی اور بالیدگی بڑی عمر میں ہی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی کو عمر کے مختلف ادوار، مختلف پیچ و خم، مختلف نشیب و فراز اور طرح طرح کی کیفیات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے ہر حصے کے تقاضے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ عہدِ طفلی کی نمائندگی اگر چنچل مسکراہٹوں اور بے چین شرارتوں سے ہوتی ہے تو بڑھاپے کی پروقار سنجیدگی سے۔ لیکن ایک چیز جو ہر عمر میں مشترک ہے، وہ ہے حرکت۔ اگر انسان فعال ہے تو عمر کے کسی بھی حصے کو بیکار اور رائیگاں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ باعمل اور متحرک زندگی ہمیشہ پسندیدہ رہی ہے۔ اس پر امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ متحرک زندگی بحال رکھنے کے لیے صحت ناگزیر ہے۔ جس کی طرف توجہ مبذول کرنا انسان پر لازم ہے۔

دفاعی تدابیر

مندرجہ ذیل اصولوں پر بالخصوص شیخوخت (بڑھاپے) میں عمل پیرا ہو کر نہ صرف یہ کہ تیموسی رشیح کو زوال سے قابلِ ذکر حد تک بچایا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس طرح انسانی محسوسات کو بھی شاداب بنایا جا سکتا ہے۔

ایسی تدبیر کی جائے کہ بدنِ انسانی کو ترطیب و تسخین ساتھ ساتھ حاصل ہو، یعنی ایک طرف اگر تیموسی رشیح کا اضافہ ہو تو دوسری طرف حرارتِ غریزی (BMR) بھی اعتدال کے ساتھ بڑھے یا کم از کم زوال سے تو محفوظ رہے۔

جوانوں کی بہ نسبت بوڑھوں کو زیادہ دیر تک نیند کا لطف اٹھانے دیا جائے۔ بستر نرم گرم ہونا چاہیے۔ کروٹیں بدلتے رہنا چاہیے۔

حمام کا مناسب اہتمام کیا جائے۔

مشروبات کا زیادہ استعمال کرایا جائے۔

معدے سے براہِ مثانہ و امعا ادرارِ بول اور اخراجِ بلغم کیا جائے۔ کیونکہ معمر لوگوں کے معدے اور آنتوں میں رطوبتِ غریبہ بہت زیادہ جمع ہو جاتی ہے۔

طبیعت نرم رکھی جائے۔

تیل سے مالش اعتدال کے ساتھ کی جائے۔

مالش میں گرم اور خوشبودار چیزیں استعمال میں لائیں۔ مثلاً روغنِ سوسن، روغنِ عنبر، روغنِ چنبیلی وغیرہ۔

صبح کے وقت گھوڑے پر سوار ہونا اور چلنا پھرنا نافع ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ تھکن ہو جائے۔

ہوائے بد، ابخرات، دھواں، ناخوشگوار بوئیں ضعیف عمری میں زیادہ اثر کرتی ہیں۔ پھیپھڑے اور قوتِ دافعہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان سے گریز کرنا ضروری ہے۔

ڈھلتی ہوئی عمر میں کھانا ایک دفعہ نہ کھانا چاہیے بلکہ مختلف اوقات میں تھوڑی تھوڑی غذا دینی چاہیے، ہضم و قوت کے اعتبار سے دن میں دو تین بار دینا مناسب ہے۔ لیکن اگر معمر شخص ایک ہی دفعہ کھانا کھانے کا متحمل ہو تو شکم سیر ہو کر کھانا روا ہے۔ کھانا اس وقت کھلانا چاہیے جب حمام سے باہر نکلے۔ کھانا کھا کر حمام میں نہ جائے۔

دن کے تیسرے گھنٹے میں عمدہ قسم کی روٹی ہمراہ شہد استعمال کرائیں۔

دودھ کا استعمال اس عمر میں بہت مفید ہے۔ بشرطیکہ دودھ نفخ نہ پیدا کرے اور قوتِ ہضم موجود ہو اور ہضم کے بعد کسی طرح کا تمدد نہ پیدا ہو اور نہ ہی کسی قسم کی خارش اور درد محسوس ہو۔ یہ شکایتیں نہ ہوں تو دودھ کا استعمال بلاشبہ نافع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تغذیہ بخش ہونے کے ساتھ ترطیبِ بدن بھی کرتا ہے۔ نیز تیموسی رشیح کی کمی پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

حمام کے سات گھنٹے بعد ملین چیز استعمال کرائیں بشرطیکہ صحت اجازت دے

قلیہ، گندنا، آبکامہ اور روغنِ زیتون کھانا کھانے سے پہلے دینا مفید ہے۔

لبلاب کو نمک میں پکائیں اور روغنِ زیتون نیز آبکامہ کے ہمراہ کھلائیں۔ ضعیف العمری میں بہت مفید ہے۔ طبیعت کو نرم کرتا ہے۔

افیتموں۔ ۱۲ گرام۔ انجیر خشک۔ چند دانے کسم کے بیج حسبِ ضرورت کے ہمراہ کوٹ اور دیں۔ ازالۂ قبض کے لیے نہایت مفید ہے۔

انجیر خشک شہد کے پانی میں ملا کر کھانا کھانے سے پہلے کھلائیں، بے حد مفید ہے۔

مذکورہ چیزیں بدل کر کھلاتے رہیں تا کہ کسی چیز کی عادت نہ پڑ جائے۔

گرم مربے کا استعمال اس حد تک روا ہے

جس سے گرمی پیدا ہو جائے اور وہ ہضم ہو جائے۔ نہ کہ اس قدر جس سے بدن میں خشکی پیدا ہو جائے۔ اگر قوت اجازت دے تو رات کی غذا میں کچھ اضافہ کر لینا چاہیے۔

حقنہ: روغن سے کرنا چاہیے کیونکہ اس میں قوت استفراغ کے باوجود تلیینِ احشا کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس غرض سے روغنِ زیتون کا انتخاب موزوں ہے۔ تیز حقنوں سے اجتناب ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے کبر سنی میں آنتوں میں خشکی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حقنۂ تر جس میں روغن شامل ہو، اس عمر میں انتہائی نافع ہے

سدہ کی تدابیر: معجون فلافلی یا فودنجی مفید ہے۔ لیکن تریاق بزرگ مفید تر ہے۔ اگر پھیپھڑوں اور اعضائے تنفس میں سدہ ہو تو اس کے لیے زوفا، ہنسراج اور سلیخہ شربت کا میں استعمال کرائیں۔ شربت زوفا بےحد نافع ہے۔ مویز منقی بھی نہایت مفید ہے۔

غسل: آرد باقلا، تخم خربزہ کوفتہ اور خربوزے کا گودا جسم پر مل کر دھونا مفید ہے۔

یہ وہ چند تدابیر ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر کبر سنی کو بھی متحرک، فعال اور زیادہ سے زیادہ پرکشش بنایا جا سکتا ہے۔

چندربھان خیال

جاگتے زخموں کی محفل ہے کہ شب
یہ کوئی ٹوٹا ہوا دل ہے کہ شب

کو بہ کو ساری فضا خاموش ہے
شہر پر رکھی ہوئی سِل ہے کہ شب

قبر سے باہر نکل آئی ہے آج
داستانِ کربِ حاصل ہے کہ شب

چیختا ہے چاند ہر دم خوف سے
سنسناتی تیغِ قاتل ہے کہ شب

جسم کے صحرا میں جھرنے کھوجتی
تشنگی منزل بہ منزل ہے کہ شب

۱۷۰، ڈھکہ، دہلی ۱۱۰۰۰۹

وہ لمحے پُر بہار، خزاؤں میں ڈھل گئے
اِک بے رُخی سے آپ کی موسم بدل گئے
حالات نے عجیب تماشے دکھائے ہیں
رشتے بدل گئے کبھی رستے بدل گئے
شدّت کی ہے یہ دھوپ کہ پھر تیری یاد ہے
رُوحیں جھلس کے رہ گئیں، جذبے پگھل گئے
گزری ہے حادثات کے سائے میں زندگی
ٹھوکر لگی، گرے پھر اُٹھے اور سنبھل گئے
آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہیں رہی
دُنیا کی بھیڑ بھاڑ میں چہرے بدل گئے
الفاظ کے زوال کا ماتم نہ کر بدؔر
قدریں بدل گئی ہیں، معانی بدل گئے

یعقوب بدؔر

گلاوٹھی روڈ، سکندرآباد ۲۰۳۲۰۵

ارشد کمال

روشنائی کے سوا کیا نقص تھا سوچا بہت
حرف کیوں اُبھرا نہیں کاغذ تو تھا چکنا بہت

ہم سا قدآور نظر آیا نہ پورے شہر میں
ہم نے اونچائی پہ چڑھ کر دور تک دیکھا بہت

حادثے میں تھی کشش بڑھ کر مری آواز سے
بھیڑ میں جاتے ہوئے میں نے اسے روکا بہت

ایک اِک منظر سفر کا کیمرے میں بند ہے
تھا تمھیں تو تندیِ رفتار کا دعوا بہت

اب تو ہجرت کے سوا چارہ نظر آتا نہیں
دوستوں نے کر دیا ہے شہر میں رُسوا بہت

چاہ شیریں اسٹریٹ، بجنور ۲۴۶۷۰۱

ہم طرح اشعار

اس کالم کا مقصد قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنا ہے اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو اس کالم کی افادیت ختم ہو جاتی ہے پچھلے مہینے ہم طرح اشعار کے لیے ہم نے غالب کی ایک مشہور غزل کا مصرعہ دیا تھا، اکثر قارئین نے اسی غزل کے شعر ہمیں بھیج دیے، دوسرے بیسیوں شعرا کی جو غزلیں اس زمین میں موجود ہیں، ان تک رسائی کی کوشش بہت کم حضرات نے کی۔ اس مہینے سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی شاعر کی جس غزل سے "ہم طرح اشعار" کے لیے مصرعہ دیا جائے، اس غزل کے شعر شریکِ مقابلہ نہ کیے جائیں —— اب کی بار اصغر گونڈوی کے اس مصرعے پر اپنی پسند کے اشعار اس کالم کے لیے بھیجیے اور ان میں اصغر کی غزل کا کوئی شعر شامل نہ کیجیے :

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا

قافیہ ردیف

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، پچھلے ماہ کے مصرعے پر موصولہ بیشتر اشعار اس مصرعے کے خالق غالب ہی کے ہیں جو درج ذیل کیے جا رہے ہیں۔ دیگر اشعار کا انتخاب بھی پیش خدمت ہے "گلدستہ" اس بار صرف ایک ہی شعر پر دیا جا رہا ہے جو حاشیے میں درج ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : عاصم اقبال سمیلوی (دربھنگہ)، انصار زبیر اعظمی (مالیگاؤں)، حیرت پروین راجو کیٹھان، افسانہ بانو (مالدہ)، محمد مہدی حسن (مدھوبنی)، انتخاب عالم (شاہجہانپور)، بیگم نکہت واحد (صاحب گنج)، محمد جہانگیر اشرف دیوانہ (کٹیہار)

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : اے۔ ریحان (مالیگاؤں)، محمد فصاحت کوثر (سنبھل)، محمد نواب عالم گلاب (رسلی گوڑی)، رضوانہ نکہت (صاحب گنج)، محمد شہزاد عالم ارشاد (جبار چک)، نور الدین تحسین بھائی (بیٹر)۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : محمد عارف سمیلوی (دربھنگہ)، محمد مخمور صدری (وارانسی)، رئیس اظہر (دربھنگہ)۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : محمد وسیم احمد (رسلی گوڑی)، لائبریرین انٹرنیشنل لائبریری (جبار چک)، عبد المناف (صاحب گنج)، فخر الدین قربان حسین (بیٹر)۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : ارشاد عالم نوشاد (بھاگلپور)، شگفتہ مظفر (صاحب گنج)، گلستاں افروز منصور (جبار چک)، ممبران "بزمِ اہلِ قلم بھاگلپور" (بھاگلپور)۔

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : شکیل احمد (لہریا سرائے)، نکہت افشاں (گریڈیہ)، محمد شوکت سمیلوی (دربھنگہ)، محمد عبد العلیم رضوی (اندور)، محمد ذکی سروش (سنبھل)، بلقیس فخر الدین (بیٹر)، نوشابہ بیلی (بھاگلپور)، نسرین بانو عشرت (جبار چک)، کماری نیلم چودھری (صاحب گنج)، محمد رازق (اعظم گڑھ)، شہناز بیگم (صاحب گنج)۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : عبد الودود عالم (جبار چک)، ماریا فخر الدین (بیٹر)، عبد الصمد ناز (بھاگلپور)، رب نواز عرف باپی (صاحب گنج)، شازیہ اختر نازیہ (جبار چک)، محمد انعام الحق شہزاد (جبار چک)، مرزا محمد الحسنی بیگ شاداب (مظفرپور)۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : نرگس بیگم (جبار چک)، شمع فخر الدین (بیٹر)، رحمت آرا (مدھوبنی)، نازیہ پروین "چتنی" (بھاگلپور)، آصف اعجاز محمد اعظم (صاحب گنج)، محمد مظفر خان (بھوپال)، محمد ارشاد چھوٹو (جبار چک)، محمد امتیاز صدری (سمستی پور)۔

یاد تھیں، ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : نظام علی جنگ (دھنباد)، شبنم جبیں شبنم (بھاگلپور)، عظمت النسا (مدھوبنی)، مظہر بچن (بھاگلپور)، محمد شارب ضیا (کٹیہار)، محمد جان عالم جان (صاحب گنج)، اعجاز پروین گڑیا (جبار چک)، بے بی پروین نوشاد (جبار چک)۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں (غالب)

مرسلہ : محمود عالم (مدھوبنی)، عشرت بانو نصرت (بھاگلپور)، حسن حنا عرف رانی (صاحب گنج)، ایم شاکر حسین شاکر "ویلکم" (صاحب گنج)، محمد ساحر احسانی (کٹیہار)۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: کیرتی کونڈے (اندور)، وقار عثمانی
انعام (دھنباد)، تسلیم اللہ خان غوری (بدایوں)، شمشاد
احمد شمیم (بھاگلپور)، طارق اعجاز، محمد اعظم (صاحب گنج)
محمد منصور عالم شاہین (صاحب گنج)، نسرین خان (بھاگلپور)
غلام ربانی (گیا)، محمد زاہد انصاری (شاہجہاں پور)
اقبال پروین ریشما (کلکتہ)، علی انجان مسکی (کٹیہار)
عمران احمد خان (مراد آباد)، واحد اختر اکیلا (صاحب گنج)
محمد ایاز الحق ارشو (جبار چک)، محمد قمر خوشنود (کٹیہار)۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: محمد ارمان (بھوپال)، ریاض الدین
(لہریا سرائے)، ودیا سکسینہ (کانپور)
ثاقب رضا نازاں (سمستی پور)، محمد ہاشم (دھنباد)
شکیل جاوید (سہسرام)، سید ذوالفقار حسین زیدی
"گڈو" (پٹنہ)، طلحہ وقار غالب (سنبھل)، جمال پروین
شیرو (کلکتہ)، محمد واعظ الحق حکیم (صاحب گنج)
شکیل ناداں (صاحب گنج)، عارف انصاری نایاب
(بھاگلپور)، نجمہ شاہین ترانہ (جبار چک)، اسرار الحق
(مظفر پور)، محمد ارشاد عالم شہزاد (جبار چک)، فاخرہ
شبنم (دھنباد)، بی بی شگفتہ پروین (کٹیہار)، شاہد اختر
رضوی (کلکتہ)، محمد یحییٰ خان دانش (ہزاری باغ)۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: شبیر خان بابا (بھاگلپور)، فیروز۔
کے۔ نگری (بیٹر)، مسرور قیصر (مونگیر)، بیگم ڈاکٹر محمد نوشاد
عالم آزاد (جبار چک)۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: خورشید ظفر (دربھنگہ)، محمد شارالحق (جبار چک)۔

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: محمد اعجاز الحق (جبار چک)۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں (غالب)

مرسلہ: مسٹر سکندر (بھاگلپور)، سید احسن اللہ
(اورنگ آباد)، سکریٹری سرتاج اسپورٹس کلب
(جبار چک)، محمد محفوظ انصار طوفان (کٹیہار)۔

پنجۂ وحشت نے سینہ پر جو کیں گل کاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہو گئیں (مراد آبادی کا درد)

مرسلہ: راغب مسعود، گیا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیونکر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں (عزیز لکھنوی)

مرسلہ: محمد آدم گردش، صاحب گنج

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں (عزیز لکھنوی)

مرسلہ: محمد مراد عالم ناشاد، گیا

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں (اقبال)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن، بھاگلپور

دیکھنا تعمیرِ نو کا بھی ہے اے ناطق مآل
دیدنی وہ بستیاں بھی تھیں جو ویراں ہو گئیں
(مولانا ناطق گلاؤٹھوی)

مرسلہ: شبینہ پروین، ناگپور

آرزوئیں تھیں جو میرے دل کے پردے میں نہاں
التفاتِ ناز کو دیکھا تو عریاں ہو گئیں (ناطق)

مرسلہ: محمد نعیم الرحمٰن، ناگپور

اور بھی میرے لیے آفت کا ساماں ہو گئیں
ہائے وہ مخمور آنکھیں جب پشیماں ہو گئیں (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: این۔ زیڈ۔ جذبی (مدھوبنی)، ابوذر
ہاشمی (بھلائی نگر)، مقصود حسن خاں گمنام سہرسوی
(رائے بریلی)، ماجد عقیل (بتیا)۔

ان جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی امید
حسرتیں بھی دفن زیرِ خاکِ زنداں ہو گئیں (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: شاداب ظفر، مدھوبنی

ہائے میری مشکلو تم نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دلچسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں (جوش)

مرسلہ: شہنشاہ رضوی، پٹنہ
اے۔ علی، برہان پور۔

میری آنکھیں جانتی ہیں کربِ افراطِ خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں (جوش)

مرسلہ: ایم۔ علی شیشہ بھٹی والے، برہانپور

ظلمتِ غمگیں فضا میں بال بکھرانے لگی
صبح کی رنگینیاں خوابِ پریشاں ہو گئیں (جوش)

مرسلہ: کاشف عمر بن جدید، صاحب گنج

عمر بھر اس شخص کو پھر نیند آ سکتی نہیں
جس کے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں (اختر شیرانی)

مرسلہ: کماری رشدی، بھوپال

دل کے داغوں میں جھلک ان کی نظر آتی ہے رب
پھول سی جو صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں (رواں)

مرسلہ: ابن غوری، ٹلگنڈا

ہر مصیبت تھی مجھے تازہ پیامِ عافیت
مشکلیں جتنی بڑھیں اتنی ہی آساں ہو گئیں (رازی مچھلی شہری)

مرسلہ: مصباح الدین طارق، گیا

اک ذرا سا مسکرا دینے کا حاصل یہ ہوا
ہستیاں غنچوں کی اوراقِ پریشاں ہو گئیں (سلام مچھلی شہری)

مرسلہ: ماسٹر نسیم احمد صدیقی، نینی تال

آج یہ کس کا تبسم بن گیا نورِ سحر
کھل گئیں نرگس کی آنکھیں اور حیراں ہو گئیں
(عثمان عارف نقشبندی)

مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ (صاحب
گنج)، عالیہ پروین راغب (گیا)۔

عشق ہی آرامِ جاں ہے حُسن کے جلوے کہاں
خواب کی باتیں تھیں وہ خوابِ پریشاں ہوگئیں (عثمان عارف)

مرسلہ: بیگم امیرون ضیا، صاحب گنج

ہمّت اس کی ہے کہ جس کو صبر کرنا آگیا
مشکلیں پڑنے نہ پائی تھیں کہ آساں ہوگئیں (ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

مرسلہ: ایم صابر سرگم، صاحب گنج

چلتی پھرتی صورتیں جو آج ہیں، کل دیکھنا
باعثِ آبادیِ گورِ غریباں ہوگئیں (ہاشمی)

مرسلہ: شگفتہ پروین، صاحب گنج

دیکھیے انساں کب پائے توہم سے نجات
ہائے وہ رسمیں جو اپنا دین وایماں ہوگئیں (ہاشمی)

مرسلہ: محمد قادر حسین، صاحب گنج

جن سے تھی اپنی نظر میں تازگی دل میں سرور
صورتیں یارب وہی نظروں سے پنہاں ہوگئیں (ہاشمی)

مرسلہ: محمد ذاکر حسین، صاحب گنج

اب کہاں پائیں ہم ان صدیوں کے آثار ونشاں
مثلِ موجوں کے جو ساحل سے گریزاں ہوگئیں (ہاشمی)

مرسلہ: ادیب اجمل، صاحب گنج

کوششیں جن کی چراغِ بزمِ امکاں ہوگئیں
ہستیاں وہ مطلعِ صد مہرِ تاباں ہوگئیں (کامل قریشی)

مرسلہ: محمد زاہد (صاحب گنج)، محمد ارشاد عالم شہزاد (جبّار چک)، اعجاز بدر دین گڑیا (جبّار چک)۔

دل میں رہ رہ کر مچلتی ہیں تمنّائیں ہزار
یہ بھی گویا صحبتِ ناداں میں ناداں ہوگئیں (کامل قریشی)

مرسلہ: علی شبیر اختر (جبّار چک)، بے بی ناہید پروین نوشاد (جبّار چک)، محمد ضیاء الحق ضیا (صاحب گنج)۔

زندگی کچھ ہے تو اب بھی دشت پیمائی میں ہے
بستیاں اس عہد کی شہرِ خموشاں ہوگئیں (کامل قریشی)

مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد (جبّار چک)، عشرت بانو نسرین (جبّار چک)۔

وہ تمھیں روحِ دوستی وہ تمھیں کبھی جانِ حیات
جو ادائیں دوست کی اب دشمنِ جاں ہوگئیں (کامل قریشی)

مرسلہ: کماری رینا پانڈے، امراوتی

تیرے آنے سے چمن میں آج اے جانِ بہار
ٹہنیاں سرسبز، شاخیں گل بداماں ہوگئیں (شاہد ساگری)

مرسلہ: محمد ندیم، بھوپال

لکھتے لکھتے تھک گئی جب سیف یہ عمرِ رواں
ساری تحریریں مرے رُخ پہ نمایاں ہوگئیں (سیف سہسرامی)

مرسلہ: سیدہ ماہ نور، سہسرام

آرزوئیں خود ہی دل کے غم کا درماں ہوگئیں
جب مٹی اِک آرزو لاکھوں نمایاں ہوگئیں (مسعود حیات)

مرسلہ: راشدہ رخسانہ، بھلائی نگر

پھر کسی کی یاد سے روشن ہوا شہرِ خیال
پھر سرِ شامِ جنوں شمعیں فروزاں ہوگئیں (نامعلوم)

مرسلہ: فردوس کنول، بمعرفت مختار علی خاں صاحب، محلہ شیخ پورہ، سہسرام روہتاس (بہار) ۸۲۱۱۱۵

کھوگئے شاداں کہاں اربابِ علم وفن کہو
محفلیں شعر وسخن کی آج ویراں ہوگئیں (شاداں)

مرسلہ: انور جاوید شاداں، سہسرام

اکادمی کی زیرِ طبع کتابیں

۱۔	آثار الصنادید	مرتبہ	ڈاکٹر خلیق انجم
۲۔	مصنفین و شعراء کی ڈائرکٹری	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ جناب عبداللطیف اعظمی
۳۔	نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو تدریس	مرتبہ	سید شریف الحسن نقوی
۴۔	ڈاکٹر ذاکر حسین، حیات اور کارنامے	مرتبہ	ڈاکٹر کامل قریشی
۵۔	اُردو شاعری میں ہندی اصناف	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۶۔	اُردو مرثیہ	مرتبہ	ڈاکٹر شارب ردولوی
۷۔	اردو ریسرچ اسکالرز سیمنار	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۸۔	مقالاتِ طنز و مزاح	مرتبہ	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
۹۔	آنند نرائن ملا کے کلام کا انتخاب	مرتبہ	ڈاکٹر خلیق انجم
۱۰۔	دہلوی اُردو کی کرخنداری بولی	مصنف	پروفیسر گوپی چند نارنگ

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے
موصولہ عنوانات

اگست ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

شعری عنوانات

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دِل ہُوا ہے چراغ مفلس کا (میر تقی میر)

مرسلہ: رحمان انور، پٹنہ

نغمہائے غم کو بھی اے دِل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن (غالب)

مرسلہ: علی اصغر فخرالدّین، معرفت ملن سوڈا فیکٹری، جونا بازار، بیڑ ۴۳۱۱۲۲

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں (شادؔ)

مرسلہ: مرزا عبدالباقی بیگ، ناریل کوٹھی نواب روڈ، چندواڑہ، مظفر پور ۸۴۲۰۰۱

دیکھا بھی دکھایا بھی سُنایا بھی سُنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں (اقبال)

مرسلہ: محمد مہدی حسن، مدھوبنی

موقوفِ آرزو ہے، توانائیِ حیات
پیری شباب ہے جو تمنّا جواں رہے (اقبال)

مرسلہ: شہنشاہ رضوی، پٹنہ

بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں
کانوں میں آرہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: فخرالدّین قربان حسین، بیڑ

ناز کرتی ہے خانہ ویرانی
ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: نورالدّین حسین بھائی، بیڑ

کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے (فراقؔ)

مرسلہ: محمد منصور عالم شاہین، صاحب گنج

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے (نامعلوم)

مرسلہ: محمد فصیح اللہ خاں، بریلی

ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا
(ساحر لدھیانوی)

مرسلہ: سیّد مسعود حسن، گیا

پھر جس طرح سے چاہو کرو ہم پہ تبصرہ
پہلے ہماری طرح سے جینے کی خو کرو (خلیل الرحمٰن اعظمی)

مرسلہ: مظفر جمال، پٹنہ

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں (اقبال ساجد)

مرسلہ: سرفراز نواز، سہسرام

سوچنے کے لیے موضوعِ سخن کوئی نہیں
صبح سے شام تلک صرف دھواں کھینچتے ہیں (والی آسی)

مرسلہ: حسن کاظمی، ہمایوں باغ، کانپور

میں اپنی زیست کی رعنائیاں کہاں ڈھونڈوں
سکوتِ شام کو نغموں میں ڈھالتا ہے کوئی (اظہر تیر دربھنگوی)

مرسلہ: راشدہ رخسانہ، بھلائی نگر

حادثوں کی بھیڑ میں گم ہوگئی راہِ حیات
کب کا بدلہ اس طرح عمرِ رواں لینے لگی (آزر بارہ بنکوی)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد، جبار چک

روٹی کپڑا اور مکاں یہ دُکھ تو جیون بھر کے ہیں
پھر بھی چند مسرّت کے لمحے ہم ڈھونڈ ہی لیتے ہیں (عقیل نعمانی)

مرسلہ: محمد اسلم جہانگیری، بریلی

فہم ان کو بھی غنیمت جانو
چند لمحے جو سکوں سے گزریں (افتخار فہم)

مرسلہ: افتخار فہم، کٹیہار

جذبۂ شوق کو اس درجہ بھی باطل نہ بنا
تھک کے بیٹھا ہے جہاں اب اُسے منزل نہ بنا (شمس فرخ آبادی)

مرسلہ: زاہد انور، گیا

اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں
منزل سے کچھ دُور نکل کے (ناظر الحسینی)

مرسلہ: رتن لعل گپتا، صاحب گنج

تنہائی تو کچھ اور بڑھا دیتی ہے غم کو
یہ سوچ کے تنہا کبھی بیٹھا نہیں کرتے (فردوس گیاوی)

مرسلہ: عرشی یاسمین قاضی، امراوتی

نثری عنوانات

"گوشۂ عافیت" (پریم چند کا ناول)

مرسلہ: محمد کاشف رضا، معرفت محمد ایم۔ حق، نزد نئی مسجد، واسع پور، دھنباد ۸۲۶۰۰۱۔

"ریڈیو خریدا ہے" (کنہیا لال کپور کا مضمون)

مرسلہ: ماجد عقیل، بتیا

"تنکے کا سہارا" (شکیلہ اختر کا ناول)

مرسلہ: محفوظ احمد، دربھنگہ

"درد و درماں" (صالحہ عابد حسین کا افسانہ)

مرسلہ: علی شبیر اختر، بھاگلپور

"فرار" (ظفر پیامی کا ناول)

مرسلہ: عذرا بیگم، دہلی

"شب گزیدہ" (قاضی عبدالستار کا ناول)

مرسلہ: عارف انصاری نایاب، بھاگلپور

"آخری دن کی تلاش" (محمد علوی کا شعری مجموعہ)

مرسلہ: نیّر ہاشمی، بھلائی نگر

"اُداس شام کے آخری لمحے" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ: محمد طارق صدری، دربھنگہ

"آتے جاتے لمحوں کی صدا" (مخمور سعیدی کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: محمد امتیاز صدری، سمستی پور

"اِک عکس ٹوٹتا ہوا" (عظیم اقبال کا افسانہ)
مرسلہ: ترنم الماس، بتیا

"سارے دن کا تھکا ہوا پرش" (صلاح الدین پرویز کا ناول)
مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروز آباد۔ محمد راشد مظہر، دھنباد۔ محمد ذکی سروش، سنبھل

"ایک بوڑھا آدمی" (محسن ملیح آبادی کا افسانہ)
مرسلہ: سہانی بیگم، صاحـ

"سکون" (منظور وقار کا افسانہ)
مرسلہ: خواجہ حسین، شہ

"گلدستہ" دوسرے اور تیسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

نئی مطبوعات

انتخاب کلامِ داغ

مرتبہ: بیگم ممتاز میرزا
صفحات: ۲۴۹
قیمت: ۴۳ روپے
ناشر: اُردو اکادمی، دہلی

اُردو کے کلاسیکل شعری سرمائے میں کلامِ داغ کی اہمیت کئی اعتبار سے مسلّم ہے۔ آج بھی اساتذہ نومشقوں کو ابتدا میں داغ کے مطالعے کا مشورہ دیتے ہیں کہ اس سے ذوق میں ستھراپن، رموزِ زبان سے واقفیت اور غزل کے سفر سے آگاہی ہوتی ہے۔ اُردو اکادمی دہلی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شعرائے دہلی کے انتخاب شائع کیے جائیں کہ اس طرح کی کتب کی جتنی ضرورت ہے یہ اتنی ہی کم یاب ہیں۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

بیگم ممتاز میرزا صاحبہ ہندوستان کی نمائندہ شاعرات میں شمار ہوتی ہیں مگر کتاب کے شروع میں داغ کی شاعری پر ان کا تفصیلی اظہارِ خیال اس بات کا غماز ہے کہ وہ گہرا تنقیدی شعور بھی رکھتی ہیں:

داغ کے یہاں زبان اور بیان کی جو خوبیاں ہیں، ان کا انحصار اس پر ہے کہ داغ نے محاوروں کو بڑی چابک دستی سے اشعار میں کھپایا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ روزمرہ کو بڑی خوبیوں کے ساتھ باندھا ہے۔ انھوں نے عربی فارسی کے بہت زیادہ الفاظ ثقیل نہیں کیے ہیں اور جو استعمال کیے ہیں وہ سب سادہ اور عام فہم ہیں۔ (صفحہ ۱۸)

"داغ کی ایک حیثیت اور بھی ہے اور وہ بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں وہ یہ ہے کہ اپنے زمانے میں وہ زبانِ دہلی کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ رامپور کے دربار میں لکھنؤ کے بہت سے باکمال اساتذہ جمع تھے، جن میں امیر مینائی اور جلال کے نام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ دہلی کی نمائندگی صرف داغ کے حصے میں آئی تھی۔ اسی زمانے سے انھوں نے زبانِ دہلی کے فروغ کی طرف خاص توجہ کی۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے بھی دہلی و لکھنؤ میں بہت سے لفظوں میں اختلاف ہے اور یہی صورت کچھ لفظوں کے استعمال کے سلسلے میں سامنے آئی ہے روزمرہ اور محاورے کا فرق جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ داغ نے اپنے شاگردوں کے وسیلے سے اور اپنی شاعری کے بل پر اس طرف زیادہ توجہ کی۔ انھوں نے مولانا احسن مارہروی کی فرمائش پر قواعدِ شاعری سے متعلق ایک طویل قطعہ بھی لکھا تھا جو اس انتخاب میں شامل ہے۔"
(صفحہ ۲۸)

۴۲ صفحات کو محیط مرتبہ کا طویل مقدمہ خاصے کی چیز ہے اور کتاب کی کتابت و طباعت بھی بہت خوشنما ہے۔

نیلا آکاش

شاعر: احتشام اختر
صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۲۵ روپے
ناشر و ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔

نیلا آکاش احتشام اختر کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ اُردو میں اب نثری نظم سے متعلق بحث تقریباً ختم ہو چکی ہے اور شاید یہی امر نثری نظم کی موت کا سبب بھی بنا ہے۔ اُردو میں روایت کے سطحی احساس یا روایت سے عدم واقفیت کے سبب مثبت تجربے کے امکانات پچھلے چند برسوں میں نظر نہیں آئے۔ اُردو کے بُرے دَور کے نتائج اس کے عبوری دَور کے بعد اب منظرِ عام پر آنے شروع ہوئے ہیں نثری نظم بھی ایک تجربہ تھا، ناکام ہی سہی مگر یہ عبوری دَور کی شناخت اور اس کے سفر کی نشاندہی میں بہت معاون ہوئی۔ مگر ہر ناکام تجربے کے بعد چند مستثنیات کا وجود ناگزیر ہوتا ہے احتشام اختر کی نثری نظم انھی مستثنیات میں ہے۔ ہندوستان کی کامیاب نثری نظموں کی جب بات کی جاتی ہے تو احتشام اختر کا نام لیا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان پر عجزِ بیان کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ کامیاب غزل گو بھی ہیں، لفظوں کے خوبصورت استعمال، شدتِ احساس اور سلیقۂ اظہار نے ان کی نثری نظموں کی فضا کو قابلِ قبول بنا دیا ورنہ اُردو شاعری میں غنائیت کی بات کرنے والے اور اسی حوالے سے نثری نظم کو قابلِ استرداد ٹھہرانے والے لوگ انھیں کسی بھی قیمت پر تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

ذکرِ رفتگاں

مصنف: محمد ایوب واقف
صفحات: ۲۰۸
قیمت: ۴۰ روپے، ناشر: مصنف
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ، بمبئی، دلی، علی گڑھ۔
انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی۔
نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

خاکہ نگاری یا مرقع نگاری یا پھر ان دونوں

کے بین بین جیسی کوئی چیز جسے ہم شخصیتوں پر مضامین کا نام دیں بہت مشکل کام ہے۔ شخصیت کا تجزیہ سب سے دشوار گذار راہ ہے اس کی مختلف تشریحات کی جاتی رہی ہیں۔ اُردو میں اس کی کوئی بہت مستحکم اور ہمہ گیر روایت موجود نہیں ہے۔

ذکرِ رفتگاں میں بھی اسی نوع کی بیس تحریریں ہیں جن میں عقیدت کے رنگوں کی جلوہ گری بہت گہری ہے۔ اور مصنف نے اعتراف بھی کیا ہے کہ انھوں نے عیوب گنوانے کے بجائے شخصیت کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ ایوب صاحب کو زبان پر عبور ہے ان کے یہاں الفاظ کا اجنبی استعمال نہیں ہے۔ ان کا لہجہ بعض مقامات پر بُری طرح چونکا دیتا ہے اور بعض جگہ فکر کی سنجیدہ دعوت بھی دیتا ہے؛

"یہ بات بھی میری سمجھ سے باہر ہے کہ ندا فاضلی سے میری دوستی کیسے ہوگئی۔ مَیں جن انسانی قدروں کا والہ و شیدا ہوں وہ ان کا دشمن ہے۔ مَیں اس کے لیے لفظ دوست کا استعمال کر رہا ہوں حالانکہ وہ اس لفظ کا بھی قایل نہیں وہ کہتا ہے کہ یہ دوستی کیا چیز ہے ہم ایک دوسرے سے ضرورتاً ملتے ہیں۔" (صفحہ ۱۵۶)

"انور نے یہ بھی بتایا کہ گھر پر کبھی ادبی قسم کی کوئی نشست ہوتی تو اس میں شرکت کی اجازت بھی ہمیں نہیں دیتے تھے۔ ساحر صاحب کے بارے میں تو ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے آزاد خیال انسان تھے لیکن ان کی گھریلو زندگی میں عورت کے متعلق یہ رویہ تھا تو یہ ان کے کیریکٹر کا انتہائی اہم رُخ ہے۔" (صفحہ ۱۴۲)

جیسا مَیں نے شروع میں عرض کیا کہ محمد ایوب واقف صاحب کے یہاں ہر سطح پر عقیدت کی جلوہ گری زیادہ ہے اسی لیے ان کے ان شخصی خاکوں یا مضامین پر نفسیات کے مخصوص زاویوں سے گفتگو مناسب نہیں، ان کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی یہ ممکن ہے یہ اس کا اثر ہو مگر اس سے فضائے فکر محدود و مختصر ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ندوے سے متعلق صرف ایک ہی رُخ سے لکھا ہے یعنی عقیدت مند کے خراجِ تحسین کے انداز میں۔ کاش انھوں نے ندوے کے اس پہلو پر بھی قلم اُٹھایا ہوتا جس نے علامہ شبلی کو مایوس اور دل برداشتہ کر دیا تھا۔ یہ تاریخ کا اہم باب ہے کیا تاریخ ندوے کے اس کردار کو فراموش کر دے گی؟ علامہ شبلی اپنے عہد میں روشنی کے مینار تھے جب محمد ایوب واقف کو ان سے عقیدت ہے تو پھر ندوے کا صحیح تجزیہ کرنے سے وہ کیوں گھبراتے ہیں۔

فصیل (افسانوی مجموعہ)
افسانہ نگار: تسکین زیدی
صفحات: ۱۵۲
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: تسکین زیدی
تقسیم کار: بزمِ خضرِ راہ، گوالٹولی، کانپور

اس وقت اُردو کی سب سے زوال پذیر صنف افسانہ ہے اس زوال کے اسباب متعدد ہیں مگر سب سے اہم یہ کہ ہمارے افسانہ نگار ہندوستان کی تہذیبی روایت سے اتنا علاقہ نہیں رکھتے جتنا افسانہ لکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ فارمولائی افسانوں کی بات اگر چھوڑ دیں تو افسانہ سب سے مشکل نثری تخلیق ہے اس کا کینوس وسیع ترین ہونا چاہیے اور افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دُنیا کے جدید ترین افسانوی ادب سے واقفیت رکھتا ہو۔

تسکین زیدی کے افسانے پچھلے چند برسوں میں اُردو کے غیر کاروباری رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے افسانے کی فضا ان کا اپنا اور اپنے آس پاس کا ماحول ہے۔

تسکین زیدی نے جدید افسانوی ادب پڑھا ہے مگر کہیں کہیں اس سے غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔ اپنے ایک افسانے "رشتوں کی دوڑ" میں انھوں نے SALMAN RUSHDIE کے دو ناولوں MIDNIGHTS CHILDREN اور SHAME کا بہت غلط تجزیہ کیا ہے۔ جسے انھوں نے رومانی فضا سے تعبیر کیا ہے وہ باشعور لوگوں کا سیاسی سحر ہے یورپ میں رومانویت کی اصطلاح ہر دہے میں اپنی تعریف بدلتی رہتی ہے Midnights Children کا معاملہ اس سے بھی الگ ہے ہندوستان کی فضا کو ملحوظ رکھ کر ایک نیم یورپین کا یہ ناول جذبات نگاری کی الگ کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ ویسے بھی اس ناول کی مقبولیت کا سبب کچھ سیاسی تنازعات ہیں اور یہی سبب ہے کہ اب Salman کے ناول Shame کے ٹائیٹل پر ان کی شناخت اسی متنازعہ ناول کے حوالے سے کی گئی ہے۔

تسکین زیدی کے افسانے ابہام کے دھندلکوں میں پناہ نہیں لیتے ان میں افسانے کی بنیادی صفت "افسانہ پن" بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھیں ابھی اپنے کردار نگاری کے زاویے کو مزید وسعت دینی ہے اور "بیانیے" کو اختصار کی غیر ضروری حد بندیوں سے آزاد بھی کرنا ہے۔

یہ افسانوی مجموعہ اُردو افسانے کے موجودہ دور میں اچھی خاصی اہمیت کا حامل ہے زیدی صاحب کو الفاظ کے استعمال میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ "شہرِ خموشاں کی بستی" جیسے الفاظ کا استعمال"

ذمہ دار ادیب کو زیب نہیں دیتا۔

—— اطہر فاروقی

کسک

شاعر: حسن نجمی سکندر پوری
صفحات: ۹۶
قیمت: ۲۰ روپے
ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔

نجمی ہمارے عہد کے بزرگ شاعر ہیں جن کا دوسرا مجموعۂ کلام "کسک" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "شب چراغ" کے نام سے منظرِ عام پر آیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ "موم کی عورت" کے نام سے ہندی میں اور ۱۹۸۲ء میں اردو میں چھپ چکا ہے۔ نجمی کی عمر اس وقت ۷۵ سال کے قریب ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کا شوق جوان اور ذوق تر و تازہ ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نجمی ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے سروس کرتے رہے اور سفر کرتے ہوئے انسانوں کے خالی، بھرے ہوئے، سُرخ، ملگجے اور پیلے چہروں کو پڑھتے رہے۔ ان کے ہجر کو وصال میں تبدیل کرنے کی سعی میں ان کی اَن کہی داستانیں شعر کے سانچے میں ڈھالتے رہے:

شہرے لوٹیں سب کے ساجن باٹ نہ جوہے کوئی۔ برہنی
گاؤں کی سُونی پگڈنڈی پر ایسی دُعا کر دیتے سائیں

مشہور ترقی پسند افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ڈاکخانے میں خطوط پر لگے ٹکٹوں پر مہر لگاتے جاتے تھے اور بغیر خط کھولے مضمون پڑھ لیا کرتے تھے۔ حسرت زنداں میں چکّی پیستے ہوئے مشقِ سخن جاری رکھتے تھے۔ ایسی ایک دو نہیں اَن گنت مثالیں ہیں جن کی روٹی روزی کا وسیلہ نہ شعر گوئی تھی نہ شعر فہمی۔ ایسی ہی ایک شخصیت نجمی سکندر پوری کی ہے۔ زیرِ نظر شعری مجموعے کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کی محبوب صنف غزل ہے جس میں موجودہ معاشرے کا کرب شاعر کا ذاتی کرب بن کر شعر میں ڈھلتا ہے۔ تخیل اور جذبات میں زندگی کے ہنگامہ خیز تجربوں کے ساتھ جو تبدیلیاں آئیں اور عصری زندگی نے جو رنگ بدلے ان کا اُتار چڑھاؤ بھرپور تاثر کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے:

تابوتوں کی مانگ ہے آتی جو ہو سفارش کام بنے گا
مردہ گھروں میں آج کہاں ہے ہُو کا عالم پہلے جیسا
سب کو ملتی جو مناسب تو بھرا ے پیرِ مغاں
شاہراہوں پہ نہ یوں خون خرابا ہوتا

نجمی نے غزل میں دِل کے پھپھولے پھوڑنے کے بجائے موجودہ عہد کے سماجی تقاضوں کو عصری حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آزاد خیال بھی ہیں۔ ان کے اشعار عصرِ جدید کے انسان کی ناکامی اور محرومی سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں، ان میں طنز بھی ہے شیرینی بھی ہے اور کسک بھی:

ڈوبنے والوں کی لاشوں سے پٹا ہے ساحل
ایک میلہ سا سفینے پہ لگا ہے پھر بھی
مرا یہ جسم مٹا دے گا بھوک مٹّی کی
جو بے لباس ہو دے دو اسے کفن میرا
قلم قاتل کے ہاتھوں میں ہے خنجر دستِ منصف میں
کہاں پہنچا ہے آئینِ جہاں آہستہ آہستہ

نجمی کی شاعری حساس فنکار کی شاعری ہے اچھے شعری مجموعے خال خال ہی منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ایسے شعری مجموعوں میں کسک کا نام بھی شامل ہے۔

—— (ڈاکٹر) مجیب الاسلام

اقبال اُردو ٹائپ رائٹنگ و شارٹ ہینڈ انسٹرکٹر

مصنّفین: محمد یوسف بٹ بی۔اے۔آنرز
ڈاکٹر نجم الاسلام نجم
صفحات: ۲۰۰
قیمت: دس روپے
ناشر: شمسی پبلی کیشنز کیرانہ مظفر نگر، یوپی
ملنے کا پتا: کتب خانہ عزیزیہ جامع مسجد، دہلی ۶

اُردو میں شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ پر بے شمار کتابیں ہیں لیکن فنی کتابوں کا فقدان اب بھی محسوس کیا جا رہا ہے ابھی تک اُردو تکنیکی سہولتوں سے بڑی حد تک محروم ہے حالانکہ زبان کی ترقّی و ترویج کے لیے زبان کو تکنیکی زیور سے آراستہ کرنا ضروری ہے۔

زیرِ نظر کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے پہلے حصّے میں آسان اُردو ٹائپنگ کے طریقے اسٹینسل کٹنگ اور دوسرے کلیدی خاکوں کا تعارف کرایا گیا ہے دوسرے حصّے میں اُردو مختصر نویسی کے فن کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس کی معیاری علامات دی گئی ہیں۔ لکھنے کا طریقہ اور حرکات لگانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ ہر سبق کے بعد جملوں کی مشق اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سبق سے متعلّق رموز اور آخر میں ایک ہزار مشکل الفاظ کی علامتی صورتیں واضح کی گئی ہیں۔

اُردو میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے ذریعے تھوڑی سی مدّت میں اسٹینوگرافی سیکھ کر اُردو ہی کر زبان کی خدمت کے ساتھ روزگار بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات عام طور پر اُردو کتابوں میں پائی

جاتی ہے کہ ان کی کتابت وطباعت معیاری نہیں ہوتی۔ یہی حال اس کتاب کا بھی ہے نفسِ موضوع قابلِ توجہ ہونے کے باوجود مصنّفین کی اتنی توجہ حاصل نہیں کرسکا جتنی درکار تھی۔

——— رزّاق ارشد

یگانہ: شخص اور شاعری
مصنّف: (پروفیسر) ممتاز حسین
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۶۰ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یگانہ کا مشہور مطلع ہے:

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اس مطلع میں ان کی زندگی کی پوری داستان مضمر ہے۔ انھوں نے اپنی شعر گوئی کے آغاز میں یاسؔ تخلص اختیار کیا تھا، فکر کی صلابت اگرچہ ان کی اس زمانے کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے لیکن وہ گداز دل سے بھی خالی نہیں۔ آگے چل کر انھوں نے یاسؔ کی جگہ اپنا تخلص یگانہ کرلیا اور اس کے ساتھ چنگیزی بھی لکھنے لگے۔ یہ ان کے اس سفر کا نقطۂ آغاز تھا جو بالآخر ذلّت و رسوائی کی موت پر اختتام پذیر ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یگانہ اپنے ہم عصروں میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، ان کے کلام میں تعقّل و تفکّر کی جو فضا ملتی ہے اس سے ان کے اکثر معاصرین کا کلام خالی ہے لیکن دھیرے دھیرے ان پر جو جھنجھلاہٹ غالب آتی گئی اور جس طرح نیکی کے وجود پر سے ان کا ایمان اُٹھتا گیا، اُس کے نتیجے میں ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کا پھکڑپن آتا چلا گیا اور غیر شائستہ باتیں بھی ان کی زبان پر آنے لگیں۔ اس نے ان کی شخصیت کو بھی مجروح کیا اور ان کی شاعری کو بھی نقصان پہنچایا۔

زیرِ نظر کتاب کے ابتدائی چار صفحوں میں یگانہ کے حالاتِ زندگی بہت اختصار کے ساتھ اور بڑے سرسری انداز میں دیے گئے ہیں۔ پھر صفحہ نمبر ۵ سے صفحہ نمبر ۹۳ تک ان کی شاعری کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں ان کے کلام کا انتخاب دے دیا گیا ہے۔

"کتاب کا نام "یگانہ: شخص اور شاعر"، یا "یگانہ شخصیت اور شاعری" ہونا چاہیے تھا۔ یہ نام کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

——— محمود سعیدی

اُردو خبر نامہ

ہریانہ اُردو اکادمی کے کام

رواں مالی سال کے دوران ہریانہ میں اُردو کی ترویج و ترقّی کے لیے ہریانہ اُردو اکادمی کی ایگزیکیٹو کونسل نے کئی اہم اور جامع منصوبے منظور کیے ہیں۔ اس میں کتابوں کی اشاعت، سیمناروں اور پروگراموں کا انعقاد، ہریانہ کے ضرورت مند اُردو ادیبوں کی مالی امداد وغیرہ شامل ہیں۔

۱۔ سال برائے ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے اکادمی نے ہریانہ کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد منظور کی ہے۔ چار ہزار روپے فی مسودہ پر مشتمل یہ امداد جن ادیبوں کے مسودوں کے لیے منظور کی گئی ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

نثر میں جناب ستیش بترا (آنجہانی) کا سفرنامہ "جوے لدّاخ" اور جناب این۔ ڈی۔ آہوجہ کا تحقیقی مسودہ بعنوان "تمدّنِ ہند میں ہریانہ کا حصّہ" شامل ہیں۔

شعری مسودات میں جناب طلعت عرفانی کے مسودے "تعارف" شرر فتحپوری کے مسودے "کہاں کی رباعی کہاں کی غزل" ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی کے "تحریر شوق" جناب کنول ہریانوی کے "صدائے تیشہ" پروفیسر ایس۔ پی۔ شرما تفتہ کے "نقوشِ ناتمام" اور جناب رئیس نیازی کے مسودے "شرارِ سنگ" کو برائے اشاعت مالی امداد منظور کیا گیا ہے۔

۲۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے فریدآباد کے شاعر جناب انجم زیدی کے نوحوں کے مجموعے بعنوان "لہو کے پھول" پر ۲۵ سو روپے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۳۔ اکادمی ہر برس ہریانہ کے کسی ایک ادیب یا شاعر کو اس کی مجموعی ادبی خدمات کے عوض مظفر حسین برنی ایوارڈ پیش کرتی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے یہ ایوارڈ جناب مصوّر سبزواری کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ۵۱ سو روپے نقد، ایک پلیگ، ایک شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

۴۔ رواں مالی سال کے دوران اکادمی کے تحت جن کتابوں کی اشاعت متوقع ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) ہریانہ کے مجاہدینِ آزادی
(۲) غیر اُردو دانوں کو اُردو سے واقف کرانے کے لیے ابتدائی قاعدہ
(۳) دیوانِ حالی کی دیوناگری میں اشاعت
(۴) ہریانہ کے صوفی سنت
(۵) ہریانہ کے مشہور اُردو ادیبوں پر تحریر کیے گئے مضامین پر مشتمل کتاب
(۶) ہریانہ کے اُردو ادیبوں کی ڈائرکٹری
(۷) نئے اُردو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی اُردو کی پانچ کتابوں کا ایک سیٹ
(۸) ہریانہ کے آئی۔ این۔ اے والنٹیروں کی ڈائرکٹری

۵۔ کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ رواں مالی سال کے دوران پانچ سیمناروں کا انعقاد کیا جائے گا جن کی مکمل رپورٹیں کتابی شکل میں شائع کی جائیں گی۔

یہ سیمنار مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) دو روزہ کُل ہند خواجہ احمد عباس سیمنار
(۲) اُردو کی ترقی میں ہریانہ کے ادیبوں اور شاعروں کا حصّہ
(۳) رامائن سیمنار
(۴) پانی پت تاریخ کے آئینے میں
(۵) ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی ہریانہ کے پس منظر میں

۶۔ اکادمی کے پروگراموں میں ضرورت مند ادیبوں کو مالی امداد دینا بھی شامل ہے۔ کونسل نے اس اسکیم کے تحت ہریانہ کے بزرگ صحافی اور شاعر جناب آتش بہاولپوری اور حال ہی میں فوت ہوتے فریدآباد کے بزرگ شاعر جناب خموش سرحدی کی بیوہ کو امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ امداد ۲۵ سو روپے فی پر مشتمل ہوگی۔

۷۔ ہریانہ میں اُردو رسم الخط کو سکھانے کے لیے اکادمی نے اُردو مرکزوں کا اہتمام کیا ہے۔ یہ مراکز ہریانہ کے مختلف شہروں میں شروع کیے گئے ہیں جن میں چھ مرکزوں میں باقاعدگی سے اُردو جماعت شروع ہوگئے ہیں اس کے علاوہ بھی اکادمی دیگر شہروں میں اُردو مرکزوں کے قیام کے لیے کوششوں میں مصروف ہے۔

(شمس تبریزی، پروگرام اسسٹنٹ)

کل راجستھان انعامی مقابلہ اُردو مضمون نگاری

راجستھان اُردو اکادمی کی جانب سے پچھلے

سال کی طرح اس سال بھی راجستھان کی یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں میں پڑھنے والے طالب علموں کا اُردو مضمون نگاری کا مقابلہ کیا جارہا ہے جس کے تین درجے رکھے گئے ہیں۔ اور ہر درجے کے لیے الگ الگ تین تین انعامات مقرر کیے گئے ہیں۔

(۱) یونیورسٹی اور کالج سطح

عنوان: جنگِ آزادی میں مولانا آزاد کا کردار

(مضمون فل اسکیپ سائز کے ۵ صفحات سے زیادہ نہ ہو)۔

(۲) ہائر سیکنڈری و سیکنڈری سطح

عنوان: پنڈت جواہر لال نہرو، آزاد ہندوستان کے معمار (مضمون فل اسکیپ کے ۴ صفحات سے زیادہ نہ ہو)۔

(۳) پرائمری و مڈل سطح

عنوان: ہمارے چاچا نہرو

(مضمون فل اسکیپ سائز کے ۳ صفحات سے زیادہ نہ ہو)۔

مضمون ادارے کے صدر/ہیڈ ماسٹر صاحب سے تصدیق کرا کے ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء تک راجستھان اُردو اکیڈمی، بے ۳، سبھاش مارگ، سی، اسکیم جے پور کے پتے پر بھیجا جاسکتا ہے۔

ادیب اور شاعر فرقہ وارانہ منافرت دور کرسکتے ہیں

۹ جولائی کو اقبال اکیڈمی جموں وکشمیر کی جانب سے کالج آف ایجوکیشن سری نگر میں منعقدہ ایک جلسے میں مہمانِ خصوصی وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے مظہر امام کے تازہ ترین مجموعۂ کلام "پچھلے موسم کا پھول" کی رونمائی کی رسم ادا کرتے ہوئے ملک کے متعدد حصّوں میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس ہیجان خیز صورتِ حال کی شدت کو کم کرنے کے لیے قلم کاروں اور دانش وروں کو ایک کلیدی رول ادا کرنا ہے۔ انھوں نے شاعروں اور ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں میں خیرسگالی کے رشتے کو مستحکم بنانے کے لیے اپنی کاوشیں بروئے کار لائیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب اور شاعر فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی روشنی سے ملک کو منور کرسکتے ہیں اور یہ کام وہ سیاست دانوں سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ان کی حکومت اُردو اور کشمیری زبانوں کی ترقی اور ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ انھوں نے مظہر امام اور دیگر دانش وروں سے ریاست جموں وکشمیر میں ان دونوں زبانوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں تجاویز اور مشورے بھی طلب کیے۔

پروفیسر مشیر الحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے مظہر امام کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے "پچھلے موسم کا پھول" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کشمیر کی غزلوں پر مشتمل ہے اور ان غزلوں میں کشمیر کے خارجی حسن کا بیان اس طرح نہیں ہے، جس طرح بعض شعرا کی رسمی نظموں میں نظر آتا ہے۔ بلکہ مظہر امام نے کشمیر کے باطن میں اُترنے کی کوشش کی ہے۔ مظہر امام نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا کہ سیاست زدہ اور حصول زر میں اُلجھے ہوئے معاشرے میں ادیب کا مرتبہ کیا ہے؟

اس موقعے پر اُردو اور کشمیری کا ایک ملا جلا مشاعرہ بھی ہوا، جس کی صدارت حامدی کاشمیری نے کی۔

(ڈاکٹر بشیر احمد غوری، سکریٹری اقبال اکیڈمی سری نگر)

اردو — ایک تہذیب کا نام ہے

مظفر پور — ۲۹ جولائی ۱۹۸۸ء کو شعبۂ اُردو، بہار یونیورسٹی میں اُردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شکیل الرحمٰن کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آزادی کے ۴۰ سال بعد بھی ہمارا قومی نظامِ تعلیم افسوس ناک حالات سے گذر رہا ہے۔ یونیورسٹیوں میں سیاسی بالادستی کی وجہ سے ان کی کارگذاریاں بہت ہی مایوس کن بن چکی ہیں۔ حد یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو اپنی علاقائی ضرورتوں کے تحت نصابِ تعلیم بنانے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ جب تک اس طرزِ عمل اور اندازِ نظر میں تبدیلی نہیں ہوگی، اس وقت تک یونیورسٹیوں کی کارگذاریاں مؤثر نہیں ہوسکتیں۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس کی وضاحت بھی کی کہ اُردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ دُنیا کی مختلف زبانوں کی علمی و تہذیبی خصوصیتیں اس کے اندر سما گئی ہیں۔ اُردو زبان و ادب کے تحقیقی اور تنقیدی مسائل پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی اور نوجوان اسکالروں کو اس کی تلقین کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ شوق و شغف کے ساتھ علمی اور ادبی کاوشوں کو منظرِ عام پر لائیں۔ آج بھی سرزمین بہار میں جو ادبی ذہانت اور بصیرت ملتی ہے ہندوستان کے کئی خطوں میں اس کا فقدان ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کی تحریریں اور تصنیفیں قومی سطح پر اہمیت رکھتی ہیں لیکن ہمارے اندر چونکہ منظم رابطہ نہیں ہے اس لیے دوسری جگہوں کی کم مایہ تحریریں اور تصنیفیں سرزمین بہار کی کاوشوں کے مقابلے میں زیادہ اہم تصور کرلی جاتی ہیں۔

(حبیب الرحمٰن، جنرل سیکریٹری)

کوکن کے پچاس اساتذہ کو اعزاز و اسناد

نقشِ کوکن ٹیلنٹ فورم بمبئی کی مجلسِ عاملہ کے حالیہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس سال سے کوکن کے ہر اردو ہائی اسکول کے ایک اُستاد کو "بہترین اُستاد" کا اعزاز دیا جائے۔ فورم کے جلسۂ تقسیم انعامات و اسناد میں ان اساتذہ کو ایک یادگاری تمغہ اور سند پیش کی جائے گی۔ سالِ رواں کے بہترین اساتذہ کے انتخاب کی ذمہ داری اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور انتظامیہ کو سونپی گئی ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء تک ہیڈ ماسٹر اور اسکول انتظامیہ کے دستخط کے ساتھ جن اساتذہ کے نام ادارہ نقش کوکن ۴۴، جیل روڈ (ایسٹ) ڈونگری، بمبئی ۴۰۰۰۰۹ کو موصول ہوں گے انھیں اعزاز و اسناد پیش کیے جائیں گے۔ بہترین اُستاد کا انتخاب کرتے وقت اُستاد کی تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ غیر تدریسی سرگرمیاں، کھیل کود، مذہبی، علمی، ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

(سکریٹری)

حوّا بائی میموریل مضمون نویسی مقابلہ

نقشِ کوکن ٹیلنٹ فورم بمبئی کے زیرِ اہتمام اس سال کوکن کے اُردو اسکولوں کے اساتذہ کے لیے حوّا بائی میموریل مضمون نویسی کے مقابلے کا نیا سلسلہ جاری کیا جا رہا ہے جس کے لیے اوّل انعام تین سو روپے، دوم ڈھائی سو روپے اور سوم ڈیڑھ سو روپے ہے ساتھ میں اسناد بھی پیش کی جائیں گی۔

عنوانات:

۱۔ کوکن کے اُردو اسکولوں میں طلبہ کے ڈراپ آؤٹ کی وجوہات اور حل

۲۔ کوکن میں بچّوں کا ادب: آغاز و ارتقا

۳۔ کوکن کے بچّوں میں مطالعے کا فقدان: وجوہات اور حل

۴۔ کوکن میں اُردو لائبریریاں: ایک جائزہ

درجِ بالا عنوانات میں سے کسی ایک عنوان پر دو سو تا ڈھائی سو سطروں پر مشتمل تحقیق و تجربات کی روشنی میں لکھا ہوا مضمون نقش کوکن ٹیلنٹ فورم ۴۴، جیل روڈ (ایسٹ) ڈونگری، بمبئی ۴۰۰۰۰۹ کے پتے پر ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء تک پہنچ جانا چاہیے۔ مضمون کے ساتھ مضمون نگار کا پورا نام، تعلیمی لیاقت اسکول کا نام اور پتہ، رہائشی پتہ اور دیگر تفصیلات درج کی جائیں۔

(سکریٹری نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ)

تذکرہ شعرائے میرٹھ

جناب نور احمد میرٹھی ۲۸/۱۱-۵۳-B کورنگی کراچی پاکستان تذکرہ شعرائے میرٹھ مرتب کر رہے ہیں اس میں ضلع میرٹھ سے تعلق رکھنے والے تمام شعرا شامل ہوں گے۔ قدیم و جدید کا کوئی امتیاز نہیں ہے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جو اصحاب ان کی رہنمائی فرما سکیں وہ درج بالا پتے پر رابطہ قائم کریں۔ بر قیدِ حیات شعرائے میرٹھ نمونۂ کلام اور تصویر بھی روانہ فرمائیں۔

عمیق حنفی کا انتقال

اُردو دنیا میں یہ خبر رنج اور افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب عمیق حنفی ۱۳ اگست کی صبح کو دل کا دورہ پڑنے سے دلی میں انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ساٹھ برس تھی اور وہ دو برس پہلے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے تھے۔

عمیق حنفی اُردو کے جدید شاعروں کی پہلی صف میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور بہ حیثیت تنقید نگار بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

عمیق حنفی صاحب اردو کے علاوہ ہندی کے ادبی حلقوں میں بھی معروف تھے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کی کئی شعری تخلیقات اور نثری تحریریں ہندی کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ آسانی سے پُر ہونے والی نہیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی بیوہ اور دوسرے پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

آپ کی رائے

● اگست کا "ایوانِ اُردو دہلی" اپنے خاص اندازِ دلربائی کے ساتھ ملا۔ اس بار بھی اس میں حسبِ معمول دلچسپ اور مفید مشمولات ہیں۔ سب سے پہلے سید شریف الحسن نقوی کے "حرفِ آغاز" پر نگاہ پڑی۔ پڑھا تو محسوس ہوا کہ اس مختصر تحریر میں بڑی سچائی ہے جو اُردو کی بقا اور بھلائی چاہنے والوں کے لیے نہایت پُر اثر ہے۔ شریف الحسن صاحب نے بڑی سادگی کے ساتھ اُردو والوں کے اُردو سے متعلق بے جا شکوک کا پردہ چاک کیا ہے اور اُن کی صحیح رہنمائی کی ہے۔

بے شک مادری زبان کے بچانے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اُردو والے صرف اُردو پڑھیں، کوئی بھی اُردو کا شیدائی اُردو والوں سے اس بات کا خواہش مند نہیں ہے وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اُردو اپنے گھروں میں باعزت رہے، اُردو کا ہر گھر اُردو کا قدرداں رہے، اس کا شیدائی رہے۔ اس کی اہمیت سے واقف رہے اُردو کا وجود اُردو والوں کے حق میں کس قدر مفید ہے اس سے آگاہ رہے۔

بلاشبہ آزاد ہندوستان کے اکتالیس سال کے ختم ہوتے ہوتے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ کہیں آہستہ آہستہ خود اُردو والوں کے گھر اُردو سے خالی نہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ جس انداز سے اُردو والے احساسِ کمتری کا شکار ہو رہے ہیں اور اپنی مادری زبان اُردو سے بے اعتنائی برت رہے ہیں اس کا آخری انجام یہی ہو سکتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، اُردو والے اپنی مادری زبان کو بچانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ وہ اُردو زبان کی عظمت اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اُردو کے بغیر خود اُن کی شناخت ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنے ماضی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اور ان کی حیثیت کٹی پتنگ کی ہو جائے گی۔

اِدھر ۲۵، ۲۶، اور ۲۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام جو کُل ہند کانفرنس ہوئی اس کی روداد سے کچھ ایسا اندازہ ہو رہا ہے کہ انجمن اُردو کی غیر تشفی بخش حالت سے نہ صرف باخبر ہے بلکہ مضطرب بھی ہے۔ انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کے نئے صدر سید حامد صاحب کی تحریر "انجمن کا نیا نقطۂ نظر نیا لائحۂ عمل" نہایت فکر انگیز ہے جسے پڑھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ اُردو والوں کے یہاں جو جمود پیدا ہو گیا ہے اب اس میں کمی آئے گی اور ان میں زندگی کی لہر پیدا ہوگی۔ اس کانفرنس کا اچھا اثر یہ بھی ہوا کہ کئی رسائل، 'کتاب نما'، 'ایوانِ اُردو'، مریخ اور معارف وغیرہ نے اس کانفرنس کا نہ صرف اپنے رسالوں میں ذکر کیا بلکہ انجمن سے آئندہ کے لیے اچھی اُمیدیں بھی وابستہ کیں۔ خود خلیق انجم صاحب 'ہماری زبان' کے ذریعے اُردو والوں کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ جوش و خروش وقتی ثابت نہ ہو بلکہ مسلسل اس میں تیزی اور گرمی آئے یہاں تک کہ ہندوستان گیر بن جائے۔ میرا اپنا خیال یہی ہے کہ اُردو کو اُردو والوں کی محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اُردو کو اُردو والوں نے اگر اپنے گھروں میں زندہ رکھ لیا تو پچاس فی صد سے زیادہ ہم کامیاب ہو گئے۔ پھر اس کے وطن میں اس کے حقوق حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ دقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اور اگر دقّتوں کا سامنا ہوا بھی تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم حوصلہ مند رہیں گے۔

—— عبدالقوی دسنوی، بھوپال

● "حرفِ آغاز" میں آپ نے بجا فرمایا ہے کہ اُردو پڑھنے والے بچّے دوسرے بچّوں سے زیادہ ذہین اور ذکی ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا احساس ہو رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں روزہ نماز بھی لوگ انگریزی میں ہی ادا کریں گے۔ اگر اپنے بچّوں کو اُردو تعلیم سے نابلد رکھیں گے تو کیا وہ دن قریب نہیں ہے؟

میں یہ خط اُردو پتے سے ارسال کر رہا ہوں اس اُمید پر کہ محکمۂ ڈاک اپنی ذمّہ داری کو سمجھتے ہوئے اس خط کو ضرور منزلِ مقصود تک پہنچائے گا۔ اور ہم حکومتِ ہند اور خصوصاً محکمۂ ڈاک کے ممنون ہوں گے کہ اُردو کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ بلکہ جس طرح انگریزی اور ہندی میں لکھے پتوں کے خطوط کو ذمّہ دارانہ طور پر اپنی منزل پر پہنچانے کا خیال رکھتا ہے ویسے اُردو کا بھی خیال رکھا ہے۔[1]

—— تابش رانچوی، رانچی

(۱) آپ کا خط ہمیں بروقت مل گیا —— ادارہ

● یہ تو دُرست ہے کہ اُردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا جنم بھی ہندوستان میں ہی ہوا ہے۔ لیکن عام لوگوں میں اُردو کے متعلق جو شکوک ہیں۔ انھیں دُور کرنا بہت ضروری ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" اُردو کو اُس کا مناسب مقام دلانے کے سلسلے میں جو کام کر رہا ہے قابلِ ستائش ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں جوش میں آ کر ایسا کچھ نہیں کرنا ہے،

جس سے جریدہ تنگ نظری کا شکار ہوجائے[1] اور جس کی وجہ سے اُردو کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچے۔

—— ایس۔ پی۔ بھاٹیہ، بھلائی

(۱) یہ گمان آپ کو کس لیے گزرا؟

● اگست کا شمارہ لے آیا ہوں "حرفِ آغاز" میں آپ نے پتے کی بات کہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اُردو والے عملی طور پر کچھ کرنا نہیں چاہتے —— سریندر پرکاش کا افسانہ جاندار ہے۔ میری جانب سے مبارکباد پہنچادیں۔ اور یہ درخواست بھی کہ قلم تیز رکھیں۔ محترم مظفر حنفی صاحب نے تشنہ چھوڑا۔ دوہے پر بہت گنجائش تھی۔

—— احسان آوارہ، باندہ

● "حرفِ آغاز" میں کہی گئی باتوں سے میں پوری طرح متفق ہوں۔ اُردو کی بقا کے لیے ہمیں اُردو کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہیے اور اس کی تعلیم کی تلقین کرنی چاہیے۔

اِس شمارے میں طباعت میں جگہ جگہ نقص دیکھنے کو ملا۔ کئی تصویریں دھندلی شائع ہوئی ہیں۔ اِس جانب دھیان دیں۔

—— راشد انور راشدؔ، رانچی

● اگست ۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" باصرہ نواز ہوا۔ میں آپ کے اداریے سے متفق ہوں۔ بچوں کو اُردو تعلیم دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں سے انھیں دُور رکھا جائے۔ بات صرف اتنی سی ہے —— کہ دیگر مضامین کے ساتھ ابتدا سے ہی بطورِ لازمی مضمون اُردو کی تعلیم بھی دی جائے۔ شجاع خاور اور اسعد بدایونی کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔

—— فہیم نادرؔ، دربھنگہ

● اگست ۸۸ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ یوسف ناظم صاحب کا کیا کہنا۔ سریندر پرکاش کی کہانی بڑی طویل ہے۔ طوالت سے کہانی کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔

—— انوار انصاری، رانچی

● سریندر پرکاش کا افسانہ "بچپن میں سُنی ہوئی ایک کہانی" مجھے بہت پسند آیا۔ "حرفِ آغاز" میں لکھی ہوئی باتوں سے میں متفق ہوں۔

—— مصطفےٰ مومن، دھنباد

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ کافی جاذبِ نظر اور معیاری لگا۔ مظفر حنفی، خورشید انور اور فاروق اعظم صاحبان کے مضامین نے متاثر کیا۔ فضا ابن فیضی اور اسعد بدایونی کی غزلیں معیاری ہیں مگر بہار کے سب سے بڑے جدید غزل گو جناب سلطان اختر کو کیا ہوگیا ہے جن کی غزل آپ نے سرِفہرست شائع کی ہے۔ موصوف کا ایک شعر ہے:

مری آنکھوں کے لب بھی ہل رہے سے ہیں
تری تصویر بھی کچھ بولتی سی ہے

کیا "آنکھوں کے لب" کی ترکیب درست ہے؟ اب اگر کوئی ہونٹوں کے کان لکھے تو آپ کیا کہیں گے؟

"نئی مطبوعات" کے تحت شفیقہ فرحت کے "رانگ نمبر" پر جناب رضا نقوی واہی کا تبصرہ خوب ہے مگر رسالہ "شہود" پر دلیپ بادل صاحب کے تبصرے کا یہ جملہ خوشامدانہ لگا "غزلوں کے چند اشعار ایسے ہیں جو مجھے جان سے عزیز نظر آئے۔" ان کے پانچ چھ اشعار میں صرف مخمور سعیدی ہی کے دو اشعار ہیں جن کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ مخمور سعیدی کے ایک شعر کی تصحیح بھی انھوں نے کی ہے:

ایک اک سانس پہ ہو موت کا پہرہ جیسے
زندگی یہ ہے تو مخمور کیا کیا جائے

اِس شعر کی جناب دلیپ بادل نے یوں تصحیح کی ہے:

ایک اِک سانس پہ ہو موت کا پہرہ جیسے
زندگی یہ ہے تو مخمور جیا کیا جائے

دلیپ صاحب کی یہ اصلاح نادرست ہے ممکن ہے مخمور صاحب نے ایسے ہی لکھا ہو جیسا کہ دلیپ بادل صاحب فرماتے ہیں[1] تو بھی میری ناقص رائے میں شعر کی پہلی صورت ہی دُرست ہے۔

—— ابرار احمد آرزو، سمستی پور

(۱) اصل شعر وہی ہے جو دلیپ بادل صاحب نے لکھا ہے۔

● "ایوانِ اُردو دہلی" ہی ایک ایسا رسالہ ہے جس میں سائنسی اور معلوماتی مضامین کا گذر ہے اور یہ ایک اچھی بات ہے اُردو زبان و ادب کو جدید معلومات سے بہرہ اندوز کرنے ہی میں اس کی بقا اور مقبولیت کی ضمانت ہے —— تازہ شمارے میں "پوسٹ مارٹم: وقتِ مرگ کا تعین" معلوماتی ہے۔ چوں کہ زبان سائنسی ہے اس لیے عام لوگ اسے مشکل محسوس کریں گے۔ میرے خیال میں اس مضمون کی زبان عام فہم ہونی چاہیے تھی پھر بھی اُردو زبان میں پوسٹ مارٹم جیسے عنوان پر یہ مضمون غنیمت ہے۔

—— سید انعام الدین، علی گڑھ

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسبِ روایت یہ شمارہ بھی معیاری ہے۔ ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کا مضمون معلوماتی ہے پوسٹ مارٹم میں کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں عام لوگ بھی جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لیکن مذکورہ مضمون کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس گذرتا ہے کہ جگہ جگہ مختلف نکات کی وضاحت میں غیر ضروری اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ حالاں کہ ہر نکتے (Point) پر سیر حاصل وضاحت ہوسکتی تھی۔

—— راز بگھونوی، سمستی پور

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ مطالعے میں ہے۔ ایک معیاری جریدے کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہوا کرتی ہے انھیں بحسن وخوب یہ پورا کر رہا ہے۔ خصوصی طور پر یہ شمارہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ "اُردو میں دوہے" ایک معلوماتی مضمون ہے منظفر حنفی صاحب نے اس پر سیر حاصل مواد اکٹھا کر کے دونوں ملکوں کا ایک طرح سے تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ لیکن پاکستان سے دوہا لکھنے والوں میں ایک اہم نام کو انھوں نے پتہ نہیں کیوں فراموش کر دیا ہے۔ جمیل عظیم آبادی کا نام پاکستان میں دوہا لکھنے والوں میں قابل قدر نام ہے۔ دوہے اور گیت پر مشتمل موصوف کا مجموعہ "گیان درپن" ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ دوہے میں حمد، نعت ـــــ اور دوسرے تصوفانہ اظہارات پیش کیے گئے ہیں۔ شعری حصّے میں سلطان اختر، ظہیر صدیقی، اسعد بدایونی، والی آسی کی چیزیں بطورِ خاص پسند آئیں۔ فضا صاحب نے حمد میں اپنا مخصوص لب ولہجہ برقرار رکھا ہے۔ ذوق کی منتخب غزل پر آپ کے حسنِ ذوق کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس غزل کے کئی اشعار ایسے ہیں جو آج بھی تازہ ہیں۔ خصوصاً مقطع کی ترکیب میں سدا بہار جدّت کا رنگ ہے۔

ـــــ رونق شہری، دھنباد

● "ہم طرح اشعار" کے کالم میں جو آپ نے چند تبدیلیاں کی ہیں پسند آئیں۔ پہلی یہ کہ انعام یافتہ شعروں کو نہایت سلیقے سے الگ الگ حاشیے میں مزیّن کیا ہے۔ دوسرے اگر ایک ہی شعر کو کئی حضرات نے ارسال کیا تو اس شعر کے نیچے ان سب بھیجنے والوں کے اسمائے گرامی درج کر دیے۔

ـــــ م۔ ث۔ خاں تیغ، ہزاری باغ

● اگست ۱۹۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" ریشماں بک ڈپو سے دستیاب ہوا۔ اس رسالے کو عوام میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ آثارِ قدیمہ کا سلسلہ بند ہو جانے کا افسوس ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ خلیق انجم صاحب اپنی تحقیقی کاوشیں جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے متعلّق آثارِ قدیمہ پر مضامین پیش کرتے رہتے۔ فضا ابن فیضی، سلطان اختر، شجاع خاور، اسعد بدایونی کی غزلیں کافی متاثر کرتی ہیں۔ سریندر پرکاش کا افسانہ "بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی" خاص طور پر پسند آیا۔

ـــــ ایم۔ صابر سرگم، صاحب گنج

● حُسنِ ادارت، پیش کش کی ندرت، کتابت و طباعت کی خوش سلیقگی، عمدہ کاغذ کا استعمال، موزوں تصاویر کی شمولیت، نام نہادادق اور بے رس تنقیدی مضامین کی بجائے کارآمد اور معلومات افزا مضامین کا انتخاب اور دوسری بہت سی خوبیوں نے "ایوانِ اُردو دہلی" کو اُردو رسائل کا سرتاج بنا دیا ہے۔ جولائی کے شمارے میں "گاہے گاہے باز خواں" عنوان کے تحت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کا خطبۂ صدارت دراصل اُردو تحریک کی پوری تاریخ، غرض و غایت، خدشات ـــــ و توقعات، اختلاف وحمایت، ضرورت و اہمیت کی مکمّل تصویر ہے۔ اُردو تحریک کی تاریخ اور مزاج و رفتار کو سمجھنے کے لیے یہ تقریر اسم اعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ـــــ رفیع حیدر انجم، رضی احمد تنہا اور اراکین "ہم سب"۔ پورنیہ

● "ایوانِ اُردو دہلی" جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں فیض اور اختر شیرانی کے شاعرانہ رشتوں پر مضمون بہت خوب ہے۔ اس میں ندرت بھی ہے اور یہ خیال انگیز بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے دونوں شعرا کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے۔ فیض کا اعتراف نہ کرنا خود اس بات کا غمّاز ہے کہ وہ بے حد متاثر ہیں۔ اس مضمون نے فیض کے مطال[عے] میں ایک بالکل نئی راہ کھولی ہے۔

ـــــ نقی احمد، کانپور

● شمارہ مارچ ۸۸ء کے صفحہ ۵۳ پر سرفروشی کی تمنّا والی غزل کے متعلّق لکھا ہے کہ شاد عظیم آبادی کی اس پر اصلاح ہوئی ہے لیکن اس مصرعہ:

آئیں وہ، شوقِ شہادت جن کے جن کے دل میں ہے

میں 'جن کے جن کے' فصاحت کے خلاف ہے۔ اس کو کم از کم یوں ہونا چاہیے:

آئے وہ، شوقِ شہادت جس کسی کے دل میں ہے

اشعار اور عنوانات بھیجنے والوں کی فہرست زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرتی جا رہی ہے اس لیے مناسب ہوگا اگر ایک ماہ ہم طرح اشعار اور دوسرے ماہ تصویری عنوانات کا کالم دیا جائے۔

حصّۂ نظم کا ایک صفحہ صرف ان شعرا کے لیے مختص کیا جائے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔

ـــــ ابن غوری، نلگنڈا

● آج کل دہلی سے بے شمار رسالے شائع ہو رہے ہیں جو غزلوں، نظموں اور کہانیوں پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان رسالوں میں وہ بات نہیں جو "ایوانِ اُردو دہلی" میں ہے۔ آپ لوگ "ایوانِ اُردو دہلی" کے ذریعے اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے بنیادی مقصد کے ساتھ ساتھ تہذیبی قدروں کو بھی فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اور ہر قاری کو بھی چاہیے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کی توسیع و اشاعت پر زور دے۔

ـــــ مختار احمد، کلکتہ

● جولائی کے شمارے میں امیر قزلباش کے مجموعۂ کلام "رجز" پر بشر نواز صاحب کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ موصوف نے امیر قزلباش کی نام نہاد شاعرانہ عظمتوں کے ثبوت میں زمین اور آسمان کے جس قدر بھی قلابے ملائے ہیں مجھے اس پر تو کوئی اعتراض نہیں کیوں کہ یہ قصیدہ نگاری کی رسم خود اہلِ قلم کو ورثہ میں ملی ہے۔ لیکن بشر نواز صاحب نے جو شعر نقل کیے ہیں ان میں سے کئی اشعار "مالِ مسروقہ" کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً:

ندامت اسے میں حنے ہونے نہ دی
میں خود اس کی باتوں میں آنے لگا
(امیر قزلباش)

آپ کو کتنی اذیت ہوگی
میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں
(شاد عارفی)

کیسا اندازِ نظر ہے اُس کا
نظر انداز نہ کردے مجھ کو
(امیر قزلباش)

عجب انداز ہے اس کی نظر کا
کہ جب چاہے نظر انداز کردے
(امید فاضلی)

دیکھے کوئی بجھا کر مجھ کو
لے پہلو شرط لگا کر مجھ کو
(امیر قزلباش)

کون ہے مجھ کو بجھانے والا
ہے کوئی شرط لگانے والا
(رحمٰن خاور)

ایک دن سب سے جدا ہو جاؤں
اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جاؤں
(امیر قزلباش)

بھیڑ میں سب سے جُدا ہوں دیکھو
اپنے پیروں پہ کھڑا ہوں دیکھو
(انور مسعود)

اس روشنی میں امیر قزلباش کی فنکارانہ صلاحیتوں اور خود بشر نواز صاحب کی ناقدانہ بصیرت و استعداد کا اندازہ آپ اور "ایوانِ اُردو" کے قارئین بہ آسانی کرسکتے ہیں۔ امید ہے آپ یہ مراسلہ شائع فرماکر اپنی اخلاقی جرأت اور ادبی دیانت داری کا ثبوت دیں گے۔

——— مظاہر حسین وارثی، مراد آباد ●

اُردو اکادمی، دہلی

کے

اغراض و مقاصد

① دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترک حصے کے طور پر اُردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔
② اُردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔
③ اُردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اُردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔
④ اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔
⑤ قدیم اُردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔
⑥ اُردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔
⑦ اُردو کے مستحق مصنفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔
⑧ گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اُردو تصنیفات کے مصنفوں کو انعامات کی تقسیم۔
⑨ اُردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت۔
⑩ اُردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔
⑪ مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔
⑫ ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے پس منظر میں اُردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اسی کے ساتھ اُردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔
⑬ اُردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے، جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔
⑭ اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔
⑮ اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔
⑯ اُردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اُردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔
⑰ ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تعمیل میں مدد مل سکتی ہو۔
⑱ سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

مخمور سعیدی

ایک دوست کی جدائی

عمیق حنفی مجھ سے عمر میں کئی برس بڑے تھے۔ عمر ہی نہیں علم میں بھی وہ مجھ سے بڑے تھے لیکن ان کا رویّہ ایسا تھا کہ یہ فرق انھوں نے کبھی محسوس نہ ہونے دیا۔ ہمارا شاعرانہ مزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن یہ اختلاف بھی ہماری دوستی میں حائل نہ ہوا۔

ان سے میری پہلی ملاقات اُردو بازار کے آزاد ہند ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اس ہوٹل کے مالک افضل پشاوری تھے جو خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدر شناس بھی۔ جو شاعر دہلی میں نووارد ہوتا اور اسے سر چھپانے کو کسی ٹھکانے کی ضرورت ہوتی وہ اس ہوٹل کا رُخ کرتا اور یہاں اسے خاصی رعایتی شرح پر کمرہ کرایے سے مل جاتا۔ یہ سہولت غیر معینہ مُدّت کے لیے ہوتی۔ مہینے دو مہینے، برس دو برس جب تک کوئی دوسری مناسب جگہ نہ مل جائے وہاں اطمینان سے رہا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ مَیں نے کہا کرایہ رعایتی ہوتا لیکن اس کی بھی باقاعدہ ادائگی ضروری نہ تھی۔ مَیں بھی ان دنوں دہلی میں نووارد تھا اور اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ بسمل سعیدی اور سلام مچھلی شہری وہاں پہلے سے مقیم تھے۔ انھی دنوں عمیق حنفی کا تبادلہ بھوپال سے دہلی ہوا اور وہ بھی اس ہوٹل میں آبسے۔ سلام مچھلی شہری کی طرح وہ آل انڈیا ریڈیو سے اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ بعد میں سلام اردو سروس میں پروڈیوسر ہوگئے تھے اور عمیق حنفی اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔

عمیق حنفی کا پہلا شعری مجموعہ "سنگ پیرہن" ان دنوں شائع ہوچکا تھا مگر ان کا نام ابھی زیادہ مشہور نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی ترقی پسندی کے سحر سے نئے نئے نکلے تھے اور اتنا حوصلہ مجتمع نہ کرپائے تھے کہ اپنے ادبی ماضی کا کُھل کر استرداد کرسکیں۔ یہ نوبت "شب خون" کے اجرا کے بعد آئی جو الٰہ آباد سے شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں نکلا۔ اس رسالے کے صفحات پر عمیق حنفی کی پروفیسر احتشام حسین سے ساتھ ایک طویل بحث چلی جس میں عمیق حنفی کا پلڑا بھاری رہا۔ اس بحث کے نتیجے ہی میں عمیق حنفی کی علمی لیاقت تنقیدی صلاحیت اور فنی بصیرت سے پوری اُردو دُنیا آشنا ہوئی اور ان کا نام جدید ادبی رجحان کو استحکام دینے والوں میں سرفہرست آگیا۔ پھر ان کا دوسرا شعری مجموعہ "شب گشت" شائع ہوا جو ان کے بدلے ہوئے شعری رویّے کی مکمل نمائندگی کرتا تھا۔

عمیق حنفی نے مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی غزل بھی کہی لیکن اصلاً وہ نظم کے شاعر تھے، بالخصوص طویل نظموں میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے تھے۔ "سندباد" اور "صلصلۃ الجرس" ان کی مشہور طویل نظمیں ہیں جو الگ الگ کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ "سندباد" ایک طرح کا شہر آشوب ہے جس میں عصر زندگی کا کرب بڑے موثر پیرایے میں ظاہر ہوا ہے۔ "صلصلۃ الجرس" عمیق حنفی کے ہاں ایک دوسری فکری تبدیلی کی غمّاز ہے ـــ عصری مسائل کے حل بالخصوص فرد کی روحانی تسکین کے لیے مذہبی سرچشموں سے فیضان حاصل کرنے کا رجحان۔ یہ نظم جو پیغمبرِ اسلام کی بارگاہ میں شاعر کا خراجِ محبت و عقیدت ہے اُردو کی نعتیہ شاعری میں ناقابلِ فراموش اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

عمیق حنفی کا تعلق سرزمینِ مالوہ سے تھا لیکن وہ عین عالمِ جوانی میں دہلی آگئے تھے۔ ایک مختصر سی مدت کو چھوڑ کر جب ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا تھا، پھر ان کی ساری زندگی دہلی ہی میں بسر ہوئی اور ۱۳ر اگست کی صبح کو ۶۰ سال کی عمر میں وہ اسی شہر کی خاک کا پیوند ہوگئے۔ انھیں کچھ برس سے دل کا عارضہ لاحق تھا۔ دل کے آپریشن کے بعد وہ بظاہر صحت مند نظر آتے تھے، جب ملتے ہمیشہ کی طرح خوش و خرم لیکن ایسا لگتا ہے کہ مرض دفع نہیں ہوا تھا اور آخر جان لیوا ثابت ہوا۔

شاعری اور ادب کے علاوہ ثقافت، تہذیب، تاریخ اور جدید و قدیم فلسفیانہ افکار سے بھی عمیق حنفی گہری ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی، انگریزی اور ہندی زبانوں سے بھی انھیں اچھی واقفیت تھی اور تھوڑی بہت سنسکرت بھی وہ جانتے تھے۔ ہندوستانی فنونِ لطیفہ رقص، موسیقی، مصوری پر وہ عالمانہ گفتگو کرسکتے تھے اور انھوں نے انھیں اپنا موضوعِ شعر بھی بنایا ہے۔ علم نجوم سے بھی انھیں آگاہی تھی اور اس کی پرچھائیاں بھی ان کے کلام میں یہاں وہاں نظر آتی ہیں۔

عمیق حنفی ایک سچے ادیب اور شاعر کی طرح قلندرانہ روش سے زندگی گزار گئے۔ نہ وہ جھوٹی نام و نمود کے پیچھے کبھی بھاگے، نہ جلبِ منفعت کی خاطر کسی ادبی سیاست میں پڑے۔ ان کا کام پڑھنا لکھنا تھا، وہ پڑھتے لکھتے رہے ـــ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان کی قدر و قیمت جانیں اور ہمارے ادبی اور شعری افق کو انھوں نے جو وسعت بخشی ہے اس کی اہمیت کو پہچانیں۔

فون نمبر:
۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۳۴۴۸

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۶ — فی کاپی ۵۰ر ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — اکتوبر ۱۹۸۸ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔
ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع شدہ تحریریں حوالے کے ساتھ نقل کی جا سکتی ہیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

ہندوستان میں بہت سی تنظیمیں ہیں جو اُردو کی ترویج و ترقّی کے لیے کام کررہی ہیں یا کم ازکم اس کی دعویدار ہیں ۔ ان میں سے اکثر مقامی نوعیت کی ہیں لیکن کچھ صوبائی سطح پر اور کچھ ملک گیر سطح پر بھی سرگرم ہیں ۔

مقامی انجمنیں زیادہ تر ادبی نشستوں اور مشاعروں وغیرہ کے انعقاد تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھتی ہیں اور ان کا خاص مقصد اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے ۔ ادبی نشستیں اور مشاعرے اُردو کے حق میں کسی دور رس اور پائدار افادیت کے حامل نہ سہی لیکن یہ اُردو والوں کے شعری اور ادبی ذوق کو زندہ رکھنے اور اسے تازگی بخشنے کا ایک وسیلہ ضرور ہیں ۔ ان میں شرکت کی بدولت بہت سے غیر اُردو داں بھی اُردو کے قریب آجاتے ہیں اور اس طرح وہ لسانی تعصب جو محض ناواقفیت کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں جگہ بنائے ہوتا ہے کم ہوجاتا ہے ۔ اس تعصب کا کم ہوجانا اُردو کے لیے یقیناً ایک نیک شگون ہے ۔

صوبائی اور ملک گیر انجمنیں اُردو کے تعلیمی مسائل سے بھی دلچسپی لیتی ہیں اور سرکار تک اپنے مطالبے پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً عوامی تحریکیں چلانے کی کوششیں بھی کرتی ہیں ۔ یہ مان لینا ایک حقیقت کو تسلیم کرلینے کے مترادف ہوگا کہ یہ کوششیں بالعموم ناکام رہی ہیں ۔ ان کوششوں کی ناکامی کا سبب کیا ہے ؟ کوشش کرنے والوں کے کردار و عمل کی کوئی خامی یا اُردو کے مطالبات کی طرف سے اُردو عوام کی بے توجہی اور عدم دلچسپی ؟

ہمارے خیال میں دونوں ہی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ہے ۔ جو لوگ اُردو تحریک کے قائدین میں شمار ہوتے ہیں ان میں اتحادِ عمل کی بہت کمی ہے اور اکثر اپنا اخلاقی بھرم بھی کھوچکے ہیں ۔ عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ اُردو کو زینہ بناکر ذاتی ترقّی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں ۔ ایسا سمجھنا زیادہ غلط بھی نہیں ۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو اس خیال کی توثیق کے لیے کافی ہیں ۔ دوسری طرف عام اُردو والوں کا بھی یہ حال ہے کہ ان کے لیے روٹی روزی کا سوال ہی سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرگیا ہے اور دوسرے معاملات و مسائل کو وہ تقریباً نظر انداز کیے ہوتے ہیں ۔ انھیں کسی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ اُردو عملی اور کاروباری زندگی میں کام آنے والی زبان نہیں رہ گئی ہے اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ اس بے مصرف زبان کے تحفظ اور ترقّی کی کوششوں میں اپنا قیمتی وقت کیوں صرف کریں ۔

بحالاتِ موجودہ اُردو تحریک کے قائدین پر دوگونہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ اوّلاً یہ کہ وہ اپنے باہمی اختلافات دور کرنے کی کوشش کریں اور ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر بے غرضانہ انداز میں کام کرنے کی عادت ڈالیں ۔ دوسرے اُردو عوام کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کریں کہ اُردو سے دست برداری اپنے تہذیبی تشخص اور تاریخی شناخت دونوں سے دست برداری کے مترادف ہوگی اور یہ نقصان ایسا نہیں جسے کچھ وقتی مصلحتوں کی خاطر برداشت کرلیا جائے ۔ عوام ان کی آواز پر دھیان تبھی دیں گے جب اس سے ان کا خلوصِ نیت ظاہر ہوگا اور لوگ یہ یقین کرنے لگیں گے کہ اس آواز کے پیچھے ان کی ذاتی اغراض کارفرما نہیں ہیں ۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

سید ظہور قاسم

بحری سائنس اور ٹیکنالوجی

ہندوستان کا ساحل چھ ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ لمبا ہے اور بحر ہند جو اس نیم براعظم کے چرن دھوتا ہے بحر انٹارکٹک تک پھیلا ہوا ہے۔ ساحلی علاقوں میں رہنے والی انسانی آبادی ماہی گیری اور جہاز رانی کے لیے سمندر کا استعمال کرتی رہی ہے۔ آج ہم سمندر کے اندر چھپی ہوئی دولت کا اندازہ لگانے کے لیے اعلیٰ ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں، تاکہ ہم سمندر کے اندرونی ماحول کو خطرے میں ڈالے بغیر اس دولت کا پتہ لگا سکیں اور اسے بروئے کار لا سکیں۔

گذشتہ چالیس برسوں میں ہندوستان نے سمندری شعبوں میں چنوتیوں سے بھرے ہوئے کام کرنے کے لیے تنظیمی ڈھانچہ بنانے نیز سہولیات اور افرادی قوت فراہم کرنے میں کافی پیش رفت کی ہے۔ اس وقت ملک میں ۳۰ تنظیمیں سمندری تحقیق و ترقی کا کام کر رہی ہیں۔ ان میں کچھ عمدہ ترین اور ترقی یافتہ تنظیمیں بھی شامل ہیں، جو جدید ترین خطوط پر پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہمارے پاس کچھ اعلیٰ ترین تحقیقی جہاز بھی ہیں۔ اور ایک ہزار تربیت یافتہ سائنسداں، انجینئر اور تکنیکی افراد دستیاب ہیں۔ وزیر اعظم کے ماتحت سمندری ترقی کے نئے محکمے کا قیام اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہندوستان سرکار سمندری تحقیق و ترقی کو اعلیٰ ترجیح دے رہی ہے۔ ہمارے بھاری اخراجات اور بھاری جوکھم والے نئے پروگراموں سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک نے سمندری سائنس میں کافی پختگی حاصل کر لی ہے۔ اور وہ ایسی مہمیں شروع کر سکتا ہے۔ جو پہلے مالدار اور ترقی یافتہ ملکوں کا اجارہ سمجھی جاتی تھیں۔

سمندروں کے تعلق سے ایک نیا نظام دسمبر ۱۹۸۲ء میں وجود میں آیا، جب کہ دنیا کی ۱۱۹ اقوام نے خلیج مونٹیگو (جمائیکا) میں سمندر کے قانون اور سمندری وسائل کے استعمال کے بارے میں ایک نئے معاہدے پر دستخط کیے۔ یہ نظام سمندری تحقیق و ترقی کے لیے وسیع امکانات فراہم کرے گا، بالخصوص ترقی پذیر ممالک کو۔ بحر ہند کے خطے کا ایک سرکردہ ملک ہونے کے ناتے ہندوستان کو بحر ہند کے عظیم وسائل کی تلاش اور استعمال کی ذمہ داری سنبھالنے میں ایک نہایت اہم رول ادا کرنا ہوگا۔

ہندوستان میں بحریات کی سائنس ایک کم سن سائنس ہے۔ مختلف ڈسپلنوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ تمام سائنسوں پر محیط ہے۔ ان سائنسوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے ایک مربوط اندازِ فکر کی ضرورت ہے۔ بحریات کی سائنس کو مستقبل میں متعدد چنوتیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لیے بحریات میں عمدہ تربیت یافتہ ایک نئی نسل درکار ہوگی۔ بحر ہند کی بین الاقوامی مہم کے اختتام پر ۱۹۶۶ء میں گوا میں بحریات کے قومی انسٹی ٹیوٹ اور کوچین، بمبئی اور والیٹر میں اس کے تین علاقائی مراکز کے قیام سے ملک میں بحری سائنسوں کو نئی تقویت حاصل ہوئی۔ پھر بھی اگر ان یونیورسٹیوں اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو، جہاں سمندری سائنس اور ٹیکنالوجی کی تربیت دی جاتی ہے۔ شمار نہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ملک میں سمندری تحقیق و ترقی سے متعلق کلیدی اداروں کی تعداد بہت کم ہے۔

سمندری ترقی اور سمندری وسائل کو ملک کے سماجی و معاشی فائدے کے لیے استعمال کرنے کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے حکومت ہند نے جولائی ۱۹۸۱ء میں سمندری ترقی کا ایک محکمہ قائم کیا۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں "سمندری پالیسی کا بیان" کے عنوان سے ایک دستاویز پیش کی گئی، جس میں سمندری ترقی کے اہم مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

سمندری ترقی کے مختصر المدت مقاصد میں سمندری سائنس کی تحقیق و ترقی، سروے، نقشہ کشی، مخصوص معاشی خطے اور براعظمی حصے کے جاندار اور غیر جاندار وسائل کے جائزے لینا۔ معاون تنظیمی ڈھانچے کی نشوونما، موزوں ٹیکنالوجی کا حصول و ترقی، افرادی قوت کی تربیت و تیاری اور سمندری آلودگی کی روک تھام شامل ہیں۔

طویل المقاصد یہ ہیں:

سمندروں کا جاندار اور غیر جاندار وسائل کا فائدہ مند استعمال، سمندری معدنیات کی کھوج اور استعمال، توانائی کے قابل تجدید وسائل کو کام میں لانا اور بحر انٹارکٹک میں تحقیق کی حوصلہ افزائی اور تحقیق کے نتائج کا فائدہ مند استعمال۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۶ء تک ۲۴ برسوں کے دوران سمندری تحقیق و ترقی کے کچھ اہم سنگ میل درج ذیل ہیں:

اہم سنگ میل :

۱۹۶۲ء　بحرہند کی بین الاقوامی مہم۔

۱۹۶۶ء　گوا میں بحریات کے قومی انسٹی ٹیوٹ اور اس کے علاقائی مراکز کا قیام۔

۱۹۷۶ء　پہلے ہندوستانی تحقیقی جہاز "گویشنی" کا حصول۔

۱۹۸۱ء　محکمہ سمندری ترقی کا قیام ' انٹارکٹیکا کے لیے پہلی مہم۔

۱۹۸۲ء　ہندوستان کو اولین سمرایہ کار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ انٹارکٹیکا کے لیے دوسری مہم سمندری پالیسی سے متعلق بیان۔

۱۹۸۳ء　سمندری تحقیق کے لیے "ساگر کنیا" نامی جہاز کا حصول۔ انٹارکٹک معاہدہ کی مشاورتی حیثیت۔ انٹارکٹیکا کے لیے تیسری مہم۔

۱۹۸۴ء　انٹارکٹیکا میں مستقل اسٹیشن کا قیام، سمندری تحقیق کے واسطے "ساگر سمپدا" نامی جہاز کا حصول۔ انٹارکٹیکا کے لیے چوتھی مہم۔

۱۹۸۵ء　انٹارکٹک کے بارے میں تحقیق کی سائنسی کمیٹی کی رکنیت۔ انٹارکٹیکا کے لیے پانچویں مہم۔

۱۹۸۶ء　بحرانٹارکٹک کے جاندار وسائل کے استعمال سے متعلق کنونشن کی رکنیت۔ انٹارکٹیکا کے لیے چھٹی مہم کا آغاز۔

اہم پروگرام :

محکمۂ سمندری ترقی مندرجہ ذیل پروگراموں پر تسلسل کے ساتھ عمل پیرا ہے

۱ :　جاندار اور بے جان وسائل کے جائزے۔

۲ :　پانی کا کھارا پن دور کرنے کا پروگرام۔

۳ :　سمندر کی تہہ میں گہرائی تک کھوج۔

۴ :　افرادی قوت کی تربیت۔

۵ :　انٹارکٹک پروگرام۔

۶ :　سمندری ماحول۔ آلودگی کی روک تھام۔

۷ :　زیرِ آب ٹیکنالوجی کی ترقی۔

۸ :　امواج سے پیدا ہونے والی توانائی کا حصول و استعمال۔

۹ :　سمندر کی حرارتی توانائی کا مبادلہ۔

(۱) جاندار و بےجان وسائل کے جائزے

ہندوستان مدت دراز سے سمندر کے جاندار وسائل کا استعمال کرتا رہا ہے۔ یہاں ہر سال سمندر سے جتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ ان کے حساب سے یہ دنیا کے ملکوں میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ہندوستان کی آبادی کے لیے ۴ر۱۱ ملین ٹن مچھلی کی ضرورت پڑے گی۔ اس وقت ہندوستان میں ہر سال ۳ر۲ ملین ٹن مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ اس میں سے ۶۰ فیصد حصہ سمندر سے اور باقی تازہ پانی کے وسائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔

سمندری مچھلی کی زیادہ تر مقدار ساحل کے نزدیک کے تنگ علاقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں ان وسائل کے استعمال میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے ابھی تک غیر مشینی کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن حال ہی میں پیداوار میں جو نمایاں اضافہ ہوا ہے' وہ بڑی حد تک مشینی کشتیوں کے استعمال کا مرہونِ منت ہے۔

میری کلچر (MARI CULTURE)

ایک اور اہم پیداواری سیکٹر ہے۔ لیکن ابھی ہندوستان میں یہ بخوبی منظم نہیں ہے۔ یہ طریقہ ایک چھوٹے پیمانے پر کیرالہ' کرناٹک اور مغربی بنگال کے بند عقبی پانیوں اور دہانے کے علاقوں میں رائج ہے۔ مچھلیوں کی افزائش زیادہ تر روایتی ڈھنگ سے ہی کی جاتی ہے۔ سمندر کی پرزور لہروں کے ذریعے آنے والی مچھلیاں اور جھینگے بند علاقوں میں جہاں کھلنے بند ہونے والے گیٹ لگے ہوتے ہیں۔ روک لی جاتی ہیں اور وہاں تین سے نو ماہ تک ان کی افزائش ہونے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہاں سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ ایکوا کلچر کے طریقوں سے مچھلی اور جھینگوں کی کل پیداوار تقریباً بیس ہزار ٹن ہے۔ ابھی تک انڈیا میں کھارا پانی کے بہت تھوڑے علاقوں میں ماہی پروری کی جاتی ہے۔ لیکن اس سیکٹر میں فروغ کے امکانات بہت امید افزا ہیں۔ ۲۰۰۰ء تک اس سیکٹر سے چار ملین ٹن کی پیداوار کا حصول حدِ امکان کے اندر نظر آتا ہے۔ سمندر کے اندر اگنے والی گھاس ترسل اور کائی ایک اور وسیلہ ہے۔ جس کا استعمال انسان' جانوروں کے چارے' کیمیاوی کھاد و کیمیکل اور فارماسیوٹیکل مصنوعات کے لیے کرتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اس ذخیرے کو پوری طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

سمندری تحقیق کے پہلے ہندوستانی جہاز "گویشنی" کا استعمال دسمبر ۱۹۷۵ء میں شروع کیا گیا تھا۔ گارڈن ریچ شپ بلڈرز اینڈ انجینئرز کلکتہ میں تیار شدہ یہ جہاز سارے بحرہند میں اس وقت تک ۸۰ اگشت لگا چکا ہے۔ اس دوران اس نے جو قیمتی سائنٹفک معلومات جمع کی ہیں۔ وہ مستقبل کے تحقیقی جہازوں کے لیے اہم سنگ میل ثابت ہوں گی۔ یہ جہاز چار غیر ملکی بندرگاہوں پر بھی جا چکا ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران محکمہ سمندری ترقی نے "ساگر کنیا" اور "ساگر سمپدا" نامی دو جہاز اور حاصل کیے۔

گذشتہ چند برسوں میں مخصوص معاشی خطّے کے تقریباً ۲۵ فیصد علاقے کے امکانی وسائل کے بارے میں معلومات جمع کی جا چکی ہیں۔ سروے کے ابتدائی مراحل میں مادی' کیمیاوی اور حیاتی معلومات فراہم کرنے کے لیے بہت سے گرڈوں اور اسٹیشنوں کا احاطہ کیا جا چکا ہے۔ اس کام کے لیے سمندر میں تقریباً ۲۵ ہزار اسٹیشن مقرر کیے گئے ہیں۔

(۲) پانی کا کھارا پن دور کرنے کی ٹیکنالوجی

ہندوستان میں ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں پینے کے پانی کی کمی ہے اور لوگوں کو کھارا پانی پینے تک مجبور ہونا پڑتا ہے جس میں اکثر ضرر رساں کیمیاوی مادے ملے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پینے کے پانی میں کلورین کی موجودگی سے فلوروسس نام کی بیماری ہو جاتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ ہڈیوں کی شکل بگڑ جاتی ہے۔

محکمۂ سمندری تحقیق کی حوصلہ افزائی سے سینٹرل سالٹ اینڈ میرین کیمیکلز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھاؤنگر میں کھارا پانی دور کرنے کے لیے ایک خاص ٹیکنالوجی تیار کی گئی ہے۔ جسے بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ جہاں اس میں مزید بہتری لائی گئی ہے اور تامل ناڈو و آندھرا پردیش میں پانی کا کھارا پن دور کرنے والے دو پلانٹ لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پلانٹ ایک روز میں پچاس ہزار لیٹر پانی صاف کر سکتا ہے۔ آندھرا پردیش کے پلانٹ کی صلاحیت بڑھا کر ایک لاکھ لیٹر روزانہ کر دینے کا منصوبہ ہے۔ تامل ناڈو اور آندھرا پردیش کے دونوں پلانٹ اطمینان بخش طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ اور پانی کو کھارا پن سے مبرا کرنے کی لاگت فی لیٹر ایک سے تین پیسے تک آتی ہے۔

(۳) سمندر کی گہرائیوں سے معدنیات کا حصول

محکمۂ سمندری تحقیق کا ایک بڑا پروگرام سمندر کی تہہ سے مختلف دھاتوں کے ذرات کو باہر نکالنا ہے، جو بحر ہند میں ۳۵۰۰ سے چھ ہزار میٹر تک کی گہرائی میں سمندر کی تہہ پر ۱۰ تا ۱۵ ملین مربع کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ مینگنیز، نکل، تانبے اور کوبالٹ جیسی کئی اہم دھاتوں کے حصول کا اہم ذریعہ ہیں۔ ان سے کسی حد تک وینڈیم، جست، سیسہ اور کیڈیم وغیرہ دوسری دھاتیں بھی برآمد کی جا سکتی ہیں۔

اس پروگرام کے چار حصے ہیں۔

۱: سروے اور کھوج۔ ۲: دھاتوں کے اجزا کو صاف کر کے الگ الگ کرنا۔ ۳: کان کنی اور ماحول کا مطالعہ۔ ۴: نقل و حمل اور مارکیٹنگ۔

پہلی جولائی ۱۹۸۱ء میں محکمۂ سمندری تحقیق کے قیام کے بعد چھ سالوں کی مختصر مدت میں تحقیقی جہازوں "ساگر کنیا" اور "گویشنی" کے ذریعے اور کچھ عرصہ تک کرائے پر لیے ہوئے جہازوں "اسکندری سروئیر"۔ "فرنیلا" اور "گارے" کے ذریعے وسیع پیمانے پر سروے اور کھوج کا کام کیا جا چکا ہے۔ سروے کے پہلے دور میں وسطی بحر ہند میں چالیس لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد رقبہ کا سروے مکمل ہو چکا ہے۔ ۱۲۰۰ مقامات سے نمونے اکٹھے کیے جا چکے ہیں۔ اور ۱۲۹۵ مقامات پر سمندر کی تہہ کی فوٹوگرافی کی جا چکی ہے۔ تقریباً ٹن معدنی ذرات بطور نمونہ جمع کیے جا چکے ہیں۔ اور اب ان کا فلزاتی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ سمندری سروے سے وسطی بحر ہند میں دو اور معدنی مقامات کا پتہ چلا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کا رقبہ ۱۵۰۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ ہندوستان نے ان میں سے ایک مقام کی رجسٹریشن کے لیے اقوام متحدہ کو درخواست بھیج دی ہے۔

(۱) معدنی اجزا کو صاف کرنے کا عمل

نکل، تانبہ، کوبالٹ اور مینگنیز جیسی دھاتوں کو صاف کرنے کے عمل کو پروسیسنگ ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔ ملک کی کئی لیبارٹریاں ریسرچ اور کچھ ڈیولپمنٹ کے کام میں مصروف ہیں۔ مثلاً ریجنل ریسرچ لیبارٹری بھوبنیشور، نیشنل میٹلرجیکل لیبارٹری... جمشید پور، ہندوستان زنک لمیٹڈ اودے پور اور وزاگ اور ہندوستان کاپر لمیٹڈ، کھیتری۔

(ب) کان کنی کا نظام

کان کنی کا نظام تین ذیلی نظاموں۔ جمع کرنے، اوپر اٹھانے اور سطح پر لانے کے سسٹموں پر مشتمل ہوگا اس نظام کو وسیع تر پیمانے کی صلاحیت و کارکردگی کا حامل بنانا ہوگا۔ دنیا کے بہت سے ملک جو ٹیکنالوجیکل ترقی میں پیش پیش ہیں ابھی مختلف نظاموں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کو مکمل اور بہتر بنانا اس نظام کی معاشی اعتبار سے اہل کارکردگی کی کلید ہے۔

(ج) نقل و حمل اور مارکیٹنگ

کان کنی کی جگہ سے نکالے ہوئے مختلف دھاتوں کے ذرات وغیرہ کو دھاتیں صاف اور الگ الگ کرنے کے مراکز تک بھیجنے کے معاشی پہلو کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ طے کرنے کے لیے کہ سمندر سے معدنیات نکالنے کا سلسلہ کہاں تک فائدہ مند ہے۔ یہ دیکھنا پڑے گا کہ عالمی مارکیٹ میں خشکی پر واقع کانوں سے نکالی گئی دھاتوں کے مقابلے میں، سمندر سے حاصل کی گئی دھاتوں کی دستیابی کی کیا پوزیشن ہے۔

(۴) افرادی قوت کی ترتیب

ساتویں پنجسالہ منصوبے کے مشمولات اور سمندری سیکٹر کی موجودہ و آئندہ ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگلے پندرہ برسوں میں سمندری سائنسوں کے مختلف شعبوں میں تقریباً ۳۵۰۰ تربیت یافتہ افراد کی ضرورت پڑے گی۔ آنے والے سالوں میں تکنیکی عملے کی ضرورت بڑھے گی۔ خاص کر ساحل کے نزدیکی علاقوں اور گہرے سمندر میں کان کنی، ساحل کے نزدیکی علاقوں میں تنصیبات لگانے، آبدوز پائپ لائنیں بچھانے، جمع کردہ معلومات کی پروسیسنگ اور ماہی گیری اور دیگر سمندری صنعتوں کے بندوبست وغیرہ کے لیے۔ اس وقت سمندری سیکٹر میں افرادی قوت کی تربیت کا کوئی قومی سینٹر نہیں

ہے کچھ یونیورسٹیاں سمندری سائنس کی محض کچھ برانچوں میں ہی تربیت دے رہی ہیں۔ بمبئی اور مدراس کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں بحری انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے نصابات شروع کیے گئے ہیں اس کے علاوہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشینوگرافی، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف فشریز ایجوکیشن۔ سینٹرل میرین فشریز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تیل اور قدرتی گیس کمیشن جیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے بھی بحری سیکٹر میں افرادی قوت کی تربیت کے پروگرام مرتب کیے ہیں۔ آج ملک میں تیس علمی اور تربیتی درس گاہیں بحری سائنسوں کی تعلیم دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۰ سے زائد تنظیمیں ایسی ہیں جن میں سمندری سیکٹر کے تربیت یافتہ افرادی قوت کو ملازمت دی جا سکتی ہے۔

(۵) انٹارکٹک ریسرچ پروگرام

انٹارکٹیکا کئی دہائیوں سے سائنٹیفک تجسس کا موضوع رہا ہے۔ اس کی وسعت، محل وقوع، علیحدگی اور اس کی آب و ہوا کا انوکھاپن سائنسی مطالعہ کا ایک نادر موقع فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۵۹ء کے انٹارکٹک معاہدہ کے زیر سایہ انٹارکٹک کا خطہ ایک پُر امن خطہ رہا ہے، جو نیوکلیائی اور دوسرے ہتھیاروں سے مُبّرا ہے۔ اقوام متحدہ کا کوئی بھی ممبر ملک، یا کوئی اور ملک جسے معاہدے کے ارکان دعوت دیں، انٹارکٹک معاہدے کو قبول کر کے اس میں باقاعدہ طور پر شامل ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک ۳۵ ممالک اس معاہدے کو تسلیم کر چکے ہیں۔ جن میں سے صرف ۱۸ ملک اور وہ جو انٹارکٹک میں تحقیق میں مصروف ہیں، معاہدے کی "مشاورتی پارٹیوں" کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور انھیں انٹارکٹک کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار ہے۔

لیکن انٹارکٹیکا میں سائنسی تحقیق کی اہمیت و امکانات صرف بنیادی سائنسوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اس براعظم اور اس کے ارد گرد کے سمندروں میں معاشی قدر و قیمت کے وسائل موجود ہیں۔ اگرچہ ابھی تک یہاں معدنیاتی دریافتوں کا کوئی حوصلہ افزا اعلان نہیں ہوا۔ (کیونکہ ان کے لیے تحقیق ابھی شروع نہیں ہو پائی ہے) اس سوال پر زور دیا جا رہا ہے کہ برف کے نیچے کے ممکنہ وسائل کو کیسے کام میں لایا جا سکے گا۔ اور کون ان کا فائدہ اٹھائے گا۔

ہندوستان کے انٹارکٹک پروگرام کا مقصد سائنسی مطالعات و تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۶ء تک کی مدت میں چھ مہمیں بھیجی گئیں، جنھیں کافی کامیابی ہوئی۔ چھٹی مہم نومبر ۱۹۸۶ء میں شروع کی گئی تھی۔ پہلی پانچ مہموں کے دوران انٹارکٹیکا میں سائنسی تحقیقات جاری رکھنے کے لیے ضروری تنصیبات لگائی گئیں۔ تیسری مہم کے دوران وہاں پر ایک مستقل اسٹیشن دکشن گنگوتری کے نام سے قائم کیا گیا۔ اور ہندوستان کے سائنس مصنوعی سیارے کے ذریعے ضروری مواصلاتی رابطوں کا اہتمام کیا گیا۔ پانچویں مہم کے دوران موسمیاتی رابطہ بھی قائم کیا گیا۔

ہندوستان ایشیا کا واحد ترقی یافتہ ملک ہے جس نے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل اسٹیشن قائم کیا ہے۔ چین نے اپنا پہلا اسٹیشن ۸۵-۱۹۸۴ء میں قائم کیا۔ اور اکتوبر ۱۹۸۵ء میں یوروگوئے کے ساتھ مشاورتی حیثیت حاصل کی۔

محکمۂ سمندری تحقیق انٹارکٹک ریسرچ پروگرام کے لیے اپنے ملک کی ایجنسیوں کے وسائل اور افرادی قوت ہی استعمال کرتا رہا ہے۔ مہم کے انٹارکٹیکا میں قیام اور نقل و حرکت کے معاملے میں تینوں افواج اس کی رہنمائی و مدد کر رہی ہیں۔ سائنسی عملہ اور سامان ملک بھر کے ریسرچ انسٹی ٹیوشنوں اور سرکاری محکموں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

انٹارکٹیکا کے لیے ہندوستان کی چھٹی مہم ۱۹۰ ارکان پر مشتمل تھی۔ ۲۶ نومبر ۱۹۸۶ء کو گوا سے روانہ ہو کر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کو انٹارکٹیکا پہنچی تھی۔ اس میں ملک کے ۱۴ سائنسی اداروں سے لیا گیا ۲۵ نفری سائنسی عملہ شامل تھا اور قیام و نقل و حرکت سے متعلق امور میں رہنمائی کے لیے ہندوستان کی بری فوج، فضائیہ بحریہ اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ۱۶۵ ارکان لیے گئے تھے۔ اس مہم کی قیادت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشینوگرافی کے ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ پر... نے کی۔ ڈپارٹمنٹ آف اوشن ڈیولپمنٹ کے پرسنل سائنٹیفک افسر جناب۔ ایچ۔ پی۔ راجن بھی ٹیم میں ڈپارٹمنٹ کے نمائندے کی حیثیت سے بطور رکن شامل تھے۔ مہم کی گرمائی پارٹی ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو واپس آ گئی تھی۔

چھٹی مہم میں ۱۷ افراد چوتھی سرمائی پارٹی کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ انٹارکٹیکا میں ہی رہ گئے۔ ہندوستانی فوج کے کرنل وی۔ ایس۔ آیئز کو سرمائی ٹیم کا قائد مقرر کیا گیا۔ اس ٹیم میں چار سائنسی اداروں (جیالوجیکل سروے آف انڈیا، ہندوستانی محکمۂ موسمیات، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف جیو میگنیٹزم اور ڈیفنس انسٹی ٹیوٹ آف فزیالوجی اینڈ ایپلائڈ سائنس) کے چھ سائنسداں اور دفاعی افواج کے ۱۱ ارکان شامل تھے۔

(۶) سمندری ماحول۔ آلودگی کی روک تھام

سمندر کا ساحل کے قریب کا حصہ خوراکی اور معدنی وسائل کے اعتبار سے مالا مال ہے۔ اس لیے ماحول کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ سمندر کے ساحلی پانیوں کی آلودگی کی کئی وجوہات ہیں جن میں بڑے شہروں سے گندگی اور سیوریج، کارخانوں کے گندے اور بیکار مواد، کوڑا کرکٹ، پیٹرولیم اور گندے

اور بے مصرف زراعتی مواد وغیرہ کا سمندر میں چھوڑا جانا شامل ہیں۔ سمندری ماحول میں تیل کی آلودگی بھی برابر بڑھتی جارہی ہے۔ خاص کر ساحلی پانیوں میں تیل کی آلودگی تیل بردار جہازوں کے حادثوں۔ ان جہازوں کی دھلائی۔ تیل صاف کرنے کے کارخانوں سے نکلنے والے بیکار مواد' پائپ لائنوں سے ہونے والے رساؤ۔ ساحل کے قریب پیداواری پلیٹ فارموں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سمندری ماحول میں پیٹرولیم اور پیٹرولیم کی مصنوعات کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی کا حصہ کافی زیادہ ہے۔ اس لیے بہت سے زہریلے مادوں کے اثرات کو بخوبی سمجھنے کے لیے سمندروں کی صحت کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہندوستان میں اس شعبے میں ریسرچ اور مانیٹرنگ میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ ملک کے مختلف ادارے ۱۹۷۵ء سے سمندری ماحول کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ آلودگی پیدا کرنے والے تمام مادوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے سروے کیے جارہے ہیں۔ پگھلی ہوئی شکل میں بھاری دھاتوں کے اجتماع اور بحرہ عرب اور خلیج بنگال سے اکٹھی کی گئی مچھلیوں کے بارے میں معلومات جمع کی جارہی ہیں۔

سمندری آلودگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کی ذمہ داری محکمۂ سمندری تحقیق کے سپرد کی گئی ہے۔

(۷) زیرِ آب ٹیکنالوجی کا فروغ

کئی صدیوں سے انسان سمندر کی گہرائیوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ کیونکہ ان میں بے شمار دولت چھپی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کا آغاز غوطہ خوری سے ہوا تھا آج زیادہ گہرے سمندر میں آبدوزیں بھیج سکتے ہیں' جن میں انسانوں کو بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ لیکن سمندر کی تہہ میں بہت سے کاموں اور تحقیق وغیرہ کے لیے بغیر انسان کے آبدوزیں بھیجنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ ان پر کم خرچ آتا ہے' بمقابلہ ایسی آبدوزوں کے جن میں انسان کو بھیجا جاتا ہے۔

(۸) سمندر کی لہروں سے توانائی

آئی۔ آئی۔ ٹی مدراس سمندر کی لہروں سے توانائی حاصل کرنے کے پراجیکٹ پر گذشتہ پانچ برسوں سے کام کررہا ہے۔ مدراس کے ساحل کے قریب پہلی بار گذشتہ دو برسوں میں لہروں کے بارے میں' ایک خاص ویو رائڈ بوائے (WAVE RIDE BUOY) کے استعمال کے ذریعے سائنٹیفک معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس کے اشارات کو وائرلیس کے آلات سے مانیٹر کیا گیا۔ اور اس کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا۔ تاکہ سال کے تمام مہینوں اور دنوں میں لہروں کا زور معلوم ہوسکے۔ سینٹر ہی میں مطلوبہ کمپیوٹر آلات تیار کیے گئے ہیں۔ سینٹر کو اپنے کام میں مدراس پورٹ ٹرسٹ اور ماہی گیری کے اداروں سے "ویو رائڈ بوائے" کا استعمال کرنے اور اُسے حفاظت رکھنے میں پورا تعاون ملا۔

پروجیکٹ کے ابتدائی مراحل میں لہروں سے توانائی پیدا کرنے کے مختلف طریقوں اور آلوں کے بارے میں تحقیقات کی گئیں اور ان میں سے کچھ کو تجربے کے طور پر آزمایا گیا اور آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارے ساحل کے لیے ایک او سی لیٹنگ واٹر کالم (او۔ ڈبلیو۔ سی) موزوں ترین رہے گا۔ او۔ ڈبلیو۔ سی سے نکلنے والی ہوا کی قوت کو توانائی میں بدلنے کے لیے ایک خاص ٹربائن پر بہت سے تجربات کیے گئے۔

(۹) اوشن تھرمل انرجی کنورژن

یہ حقیقت سب پر آشکار ہے کہ سمندر میں توانائی کے بے پناہ وسائل موجود ہیں۔ سمندری توانائی کا اظہار لہروں' موجوں اور مدوجزر سے ہوتا ہے اس کے علاوہ سمندری توانائی کے ایسے وسائل بھی ہیں جو اتنے ظاہر نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک حرارتی توانائی یا تھرمل انرجی ہے۔ امریکہ' جاپان' فرانس' نیدرلینڈ اور اسکینڈے نیویا کے ممالک اس توانائی کو استعمال میں لانے کے امکانات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کررہے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' اس کے ارد گرد اور لکش دویپ اور جزائر انڈمان نکوبار کے اطراف میں سمندری حرارتی توانائی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

○

نظمیں

اختر بستوی

ڈپارٹمنٹ آف اُردو، یونیورسٹی آف گورکھپور، گورکھپور

گنتیوں کی فتح

مادّی دور کے جوانوں نے
عہدِ حاضر کے پاسبانوں نے
گنتیوں کا بنا کے اک لشکر
کرلیا قبضہ ساری دُنیا پر
ہند سے ہوگئے خرد کے نقیب
ضرب و تقسیم سے بنی تہذیب
دہر کی رہنما ہوئی تعداد
کچھ نہ باقی رہا بجز اعداد
آدمیّت کا غم مٹا ڈالا
اسم کو بھی عدد بنا ڈالا

سمندر کی پیاس

مرکوز کس لیے ہے تمھاری نظر بھلا
آشفتگانِ دل کے دریدہ لباس پر
دیکھو تو اہلِ حکمت و دانش کا اضطراب
تسخیرِ کائنات کی ناکام آس پر
صحرا کی تشنگی کے نظارے میں کیوں ہو گم
ڈالو ذرا نگاہ سمندر کی پیاس پر

آشوبِ دورِ آہن

رقص ہر جانب مشینی بھوت کا
حکمرانی ہر طرف فولاد کی
اجتماعی زندگی کا شور و شر
روح ہر سو مضطرب افراد کی
آرزوئیں زیرِ دامِ روزگار
خواہشوں پر غلبۂ فکرِ معاش
دورِ آہن میں سکوں کی جستجو
دوپہر میں اپنے سایے کی تلاش

زندگی

دہر کے گلدان میں آراستہ
زندگی ڈالی سے ٹوٹا پھول ہے
وقت کی اک مدّتِ محدود پر
اس کی ساری دلکشی محمول ہے
کون جانے بعد ازاں اس کے لیے
لامکاں کا باغ ہے، یا دھول ہے

اسرار گاندھی

واپسی

آخر کار اس کی وہ خواہش پوری ہو گئی جو نہ جانے کب سے اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تو یہ خواہش اب سے نہ جانے کتنے پہلے ہی پوری ہو چکی ہوتی۔ لیکن اس کے لیے اسے اپنے وجود میں جلتی ہوئی اس شمع کو بجھانا پڑتا جو اس کا قیمتی سرمایہ تھی۔

اس نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی خوبصورت اور قیمتی گھڑی کو ایک بار پھر بڑے پیار سے دیکھا تو اسے لگا کہ جیسے اس نے گھڑی نہ خریدی ہو بلکہ دنیا جہان کی تمام خوشیاں خرید لی ہوں۔

گھڑی میں اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ آج اُس نے اب تک اپنا کام شروع نہیں کیا جبکہ وہ روز ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیتا تھا۔

اس نے آفس کے لمبے چوڑے ہال پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے دوسرے ساتھی کلرک اب آدھے سے کچھ زیادہ ہی آ چکے ہیں اور آدھے سے کچھ کم کو آنا ابھی باقی ہے۔ یہ آفس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ جس وقت وہ آفس پہنچتا اس وقت تو خود کو بالکل تنہا ہی پاتا۔

اس نے چپراسی کو آواز دے کر پانی مانگا اور پھر ایک ریک سے ایک فائل اٹھائی اور اپنے کام میں حسبِ معمول لگ گیا۔

"صاحب پانی لے لیجیے۔" چپراسی نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے گلاس پکڑنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا دیا۔

"اوہو! صاحب آپ نے نئی گھڑی خرید لی۔ بڑی خوبصورت ہے۔ کب لی؟" چپراسی نے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کل ہی لی ہے۔"

"کتنے کی ہے صاحب؟"

"بارہ سو روپے کی۔ جاپان کی ہے نا۔" وہ جاپان پر ذرا زور دیتے ہوئے بولا۔

"صاحب آپ نے بڑی قیمتی گھڑی لی۔"

اس نے چپراسی کے لہجے میں کچھ عجیب سی بات محسوس کی۔ جیسے اس نے گھڑی نہ خریدی ہو بلکہ چوری کی ہو۔ اس نے سوچا کہ دراصل اس میں چپراسی کا قصور کم ہے۔ بلکہ اس کی اپنی ایمانداری کا قصور زیادہ ہے جس نے اسے اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرح کبھی ٹھاٹ باٹ سے رہنے نہیں دیا۔ پھر اتنی قیمتی گھڑی دیکھ کر اگر چپراسی کے لہجے میں بے اعتباری تھی تو اس میں چپراسی کی کیا غلطی۔ ایمانداری زندگی کے چہرے پر کتنی گہری خراشیں ڈال دیتی ہے۔

"صاحب گھڑی کی خوشی میں کچھ چائے وائے ہو جائے۔" خاموشی کی اس دھند کو دوبارہ چپراسی نے ہی ہٹایا۔

"ہاں... ہاں کیوں نہیں۔ لنچ میں تمہیں چائے ضرور پلاؤں گا اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ میں لنچ سے پہلے اپنی سیٹ پر سے کبھی نہیں اُٹھتا۔"

"اچھا صاحب ٹھیک ہے۔ بس یاد رکھیے گا۔" چپراسی جانے کے لیے مڑ ہی رہا تھا کہ کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ پلٹ پڑا۔

"صاحب آپ اپنی پرانی والی گھڑی کا کیا کریں گے؟"

"کیوں؟"

"بس یوں ہی پوچھ لیا۔"

"وہ گھڑی ـــــ" وہ کچھ کھویا کھویا سا بولا۔ "وہ گھڑی دراصل مجھے میرے دادا نے دی تھی۔ میں نے ان کی نشانی سمجھ کر بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھ لی ہے۔"

چپراسی کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی کے آثار نظر آئے پھر وہ لنچ والی بات دوبارہ یاد دلا کر چلا گیا۔

چپراسی کے جانے کے بعد یکایک بہت سی یادوں نے اسے گھیر لیا۔

جس دن اُسے نوکری ملی تھی گھر والے کتنے خوش تھے۔ جیسے کلرکی نہ ملی ہو بادشاہت مل گئی ہو۔ اس دن جو بھی گھر آیا تھا مٹھائی ضرور کھلائی گئی تھی۔ پھر شام اس کے دادا نے اسے اپنے پاس بلا کر اپنی کلائی سے گھڑی کھولی تھی اور پھر اس کی کلائی پر اپنی گھڑی باندھتے ہوئے بولے تھے۔

"بیٹا اب اس گھڑی کی ضرورت مجھ سے زیادہ تمہیں ہے۔ تم اسے لے لو اور ہاں یاد رکھنا وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے کہ

جے۔ ۵ گلاب باڑی کالونی۔ الٰہ آباد۔ یو۔ پی

اس کے بغیر سب کچھ بے معنی ہے۔"

پھر کچھ ہی دنوں بعد دادا چل بسے تھے اور اسے اس گھڑی سے نہ جانے کیسا لگاؤ پیدا ہو گیا کہ ہمیشہ وہ اس گھڑی کو بڑی احتیاط سے رکھتا کہ دادا کے دور کی چیزیں اب آہستہ آہستہ ختم ہو چکی تھیں۔

کل جب اس نے دادا کی گھڑی اتار کر نئی گھڑی پہنی تھی تو اسے بے پناہ خوشی کے ساتھ تھوڑا سا دکھ بھی ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی زندگی تک وہ اس گھڑی کو بڑی احتیاط سے رکھے گا۔ پھر اس کے بعد آنے والے لوگ جو بھی چاہیں کر لیں گے۔

"صاحب آپ کو بڑے صاحب بُلا رہے ہیں۔" چپراسی کی آواز نے اس کی سوچ کے تانے بانے بکھیر دیے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر واپس لوٹ رہا تھا تو چپراسی اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا۔

"صاحب لنچ ہونے والا ہے۔"

اس نے چپراسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چپ چاپ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر چپراسی اُسے بار بار چائے کے بارے میں کیوں یاد دلا رہا ہے کہیں اس لیے تو نہیں کہ اوروں کے مقابلے میں اس نے چپراسیوں کو بہت کم چائے پلائی ہے کاش اس کے پاس بھی بہت سے پیسے ہوتے اس نے سوچا کہ پیسے تو ہو سکتے تھے لیکن اس کے لیے اس کو اس شمع کو بجھانا پڑتا جو کہ اس کے وجود میں روشن تھی۔

لنچ ہوا تو وہ اس چپراسی کو لے کر کینٹین پہنچ گیا۔ جس نے اس سے چائے کی فرمائش کی تھی۔ لوگوں کو اسے خلافِ معمول کینٹین میں دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ شاذ و نادر ہی وہاں جاتا تھا۔ لیکن جب انھیں اس کے کینٹین میں آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو وہ سب اس کے پیچھے پڑ کر چائے کی فرمائش کرنے لگے۔ پھر اسے انھیں چائے پلانی ہی پڑی۔

چائے پیتے وقت لوگوں نے جب اس کی گھڑی کی تعریفیں کیں تو وہ قدرے شرما گیا۔ اچانک اس کے کلرک ساتھیوں میں سے ایک بولا۔

"گرو تم تو چھپے رستم نکلے۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ سچ مچ بھگت ہو۔"

"میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ سچ مچ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"سب کو اتنا ہی بیوقوف سمجھتے ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اتنی قیمتی گھڑی صرف تنخواہ سے نہیں خریدی جا سکتی۔ ضرور کچھ گھوٹالہ کیا ہوگا تم نے۔"

اس بات کو سن کر کئی لوگوں کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کو بے حد شدت سے غصہ آگیا۔ دل چاہا کہ کہنے والے کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ مار دے مگر ضبط کر گیا۔

اس نے جلدی جلدی گھونٹ لے کر اپنی چائے ختم کی۔ کاؤنٹر پر جاکر پیسے دیے اور اپنی سیٹ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس نے سوچا کہ شاید سچ وہ نہیں ہے جسے وہ سچ سمجھتا ہے۔ بلکہ سچ تو کچھ اور ہی ہے جسے وہ سچ نہیں سمجھتا۔

پھر آفس میں دن بھر اس کا منہ کڑوا کڑوا سا رہا۔ نہ جانے کتنے احساسات دھوئیں کے گنجان مرغولوں کی طرح اس کے پورے وجود میں اِدھر سے اُدھر دندناتے رہے شام جب گھر لوٹا تو اس کا ذہن پوری طرح بوجھل ہو چکا تھا۔

رات جب وہ کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سوچ کے دائروں کا گھیرا کبھی کبھی پھیل کر بے حد وسیع ہو جاتا اور کبھی کبھی اتنا تنگ ہو جاتا کہ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اسے لگا کہ اس کی زندگی کا کارواں جن شاہراہوں سے گذر رہا ہے وہ تقریباً ویران ہو چکی ہیں۔ بس اِکّا دُکّا کبھی کبھی کوئی نظر آجاتا ہے۔ ورنہ ہر طرف ایک طویل سناٹا پھیلا ہوا ہے۔

اُسے وہ دن یاد آگئے جب ان شاہراہوں پر بھی خاصی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ ان وقتوں میں ہر کسی کا دل کتنی شفقت اور کتنے خلوص سے مالا مال تھا۔ نہ کوئی گھپلا نہ کوئی مکاری۔ ایک سیدھی سادی سی زندگی جس میں نرمی تھی۔ لوچ تھا اور نہ جانے کیا کچھ۔

پھر یہ بھیڑ آہستہ آہستہ کہاں غائب ہو گئی؟

جانے والے پلٹ کر واپس کیوں نہیں آئے؟

کیا یوں ہی ہوتا ہے؟

کیا یہ شاہراہیں بے معنی ہو چکی ہیں؟

ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ بھی ہو کہ زندگی یقین اور بے یقینی کے درمیان نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔

رات دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی آخری موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اس کی بائیں کلائی پر اب بھی بندھی گھڑی کی ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک اس

کے پورے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ ٹک ٹک کبھی اس کے ذہن میں موسیقی کی بے حد لطیف لہریں پیدا کرنے لگتی اور کبھی ذہن کے دریچوں پر ہتھوڑے برسانے لگتی۔ اور پھر ہتھوڑوں کی چوٹ اور موسیقی کی لطیف لہروں کے درمیان رات یوں ہی بیت گئی اور جب صبح ہوئی تو آخری نومبر کے سورج کی لذت آگیں شعاعوں کا جال ہر سمت بکھر گیا۔

وہ تھکا تھکا سا بستر سے اُٹھا اور اس کمرے کی طرف چل پڑا جہاں اس کا جوان بیٹا سو رہا تھا۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے سوتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔ پھر اس نے بائیں کلائی سے کھول کر بڑی احتیاط اور خاموشی کے ساتھ اپنے بیٹے کی کلائی پر اپنی نئی گھڑی باندھنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں کُھل ہی گئیں۔

باپ کو اپنی کلائی پر نئی گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں تمھارے ہاتھ پر گھڑی باندھ رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"بیٹے بہت سی خوبیوں کو دیکھ کر ہی میں نے یہ نئی گھڑی خریدی تھی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے اب عمر کے اس حصے میں یہ گھڑی میری کلائی پر کچھ زیادہ مناسب نہیں لگتی۔ تمھاری جوان کلائیاں شاید اس گھڑی کے لیے زیادہ ٹھیک ہیں۔"

وہ بیٹے کی کلائی پر گھڑی باندھ کر پھر اس کمرے کی طرف چل پڑا کہ جہاں رات اس نے سو کر گذارنے کے بجائے جاگ کر گذاری تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اس کونے کی جانب چل پڑا جہاں پالش اتری ہوئی ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے الماری کھولی اور دادا کی دی ہوئی گھڑی نکالی۔ گھڑی بند ہو چکی تھی۔ وہ اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کوک بھرنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں پھر سے اپنے محور پر گردش کرنے لگیں اس نے ٹیبل واچ سے گھڑی ملا کر اپنی کلائی پر باندھ لی۔ اور آہستہ آہستہ قدموں سے بستر کی طرف چل پڑا۔

چند لمحوں کے بعد وہ بستر پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون کے سائے رقص کر رہے تھے۔

سید قیصر قلندر

اوپرا

ادب اور موسیقی کی مشترکہ اصطلاح

ان گنت خیالوں کے صوری پیکر، نت نئی اصناف اور اسالیب ادب کی تعمیر و تزئین میں سہارا بن جاتے ہیں۔ جمالیاتی تجربے، سماجی ذمہ داریاں، مطالعے اور مشاہدے کی وسعتیں اور گہرائیاں فنی تخلیق کو مہمیز کرتی اور سنوارتی ہیں۔ فنی تخلیق میں تمناؤں کا لہو شامل ہوتا ہے اشک و تبسم کی آمیزش ہوتی ہے۔ ادب جہاں داخلی احساس اور جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے وہاں ماحول اور سماج کی بولتی ہوئی صورتوں اور قدروں کا عکاس بھی ہے۔ ادب کا مقصد نہ تو خالص تفریح ہے اور نہ ہی نری نعرہ بازی یا شوشہ راشی۔ انسان اور سماج کو ادب کی ضرورت پڑتی ہے یا یوں کہیں کہ ادب سے دونوں کا واسطہ پڑتا ہے۔ ٹیگور نے کہا تھا "تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے انا کی کینچلی اتارو۔ کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے۔ روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔" (ترقی پسند ادب از سردار جعفری) اقبال نے فنونِ لطیفہ کی تخلیق کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر یہ شعر اپنے اندر بے پناہ معانی رکھتا ہے اور ایک ایسے نظریے کا ترجمان ہے جس کی حقیقت سے انکار مشکل ہے۔ اقبال نے مختلف ذرائع ابلاغ و ترسیل اور فنونِ لطیفہ کو بلیغ لیکن مختصر انداز میں اس شعر کے پہلے مصرعے میں بیان کیا ہے اور ان سہاروں کی بھی نشان دہی کی ہے جو مختلف فن کار اپنی تخلیقات میں آزماتے ہیں:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

گویا کہ تخلیقِ فن میں خیال آرائی کے لیے مختلف ذریعوں اور وسیلوں — مصوری، پیکر تراشی، موسیقی یا شاعری — کا سہارا لیا جاتا ہے ہر فن کار مقدور بھر اپنی تخلیق کو جذبات اور شعور کے آب و گل سے مرتب کرتا ہے۔ اس عمل کا تعلق ماحول اور تاریخ سے بھی رہا ہے۔ احساسِ حسن اور ذوقِ جمال، زمان و مکاں کی قیود سے الگ بھی نہیں رہ سکتے۔ بہرحال، ادب کی تعمیر و ارتقا اس گفتگو کا موضوع اگرچہ کلیتاً نہیں ہے لیکن پھر بھی اس سے علاقہ ضرور ہے۔ کیوں کہ ایک ایسی صنف پر بات کرنا مقصود ہے جو بیک وقت ادب کا بھی حصہ ہے اور موسیقی اور تمثیل میں بھی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ غالباً یہ اسلوب یا صنف یکہ و تنہا طرزِ اظہار و تحریر ہے جس کی تعمیر و تدوین میں تین اصناف یا اسالیب بیک وقت کام آتے ہیں یعنی:

(الف) شاعری
(ب) موسیقی
(ج) تمثیل

ادب کی اصطلاح میں اسے اوپرا (OPERA) کہتے ہیں۔ ہیئت، تشکیل اور تدوین کے اعتبار سے فنِ موسیقی کی اصطلاح میں بھی اسے اوپرا ہی کہتے ہیں۔

اوپرا کی تاریخ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو ہمیں اس بات کا احساس ہوگا کہ اس … لحاظ سے قدیم مشرق میں اس کی کوئی واضح … پرانی روایت نہیں رہی ہے۔ البتہ بیسویں صدی … دوسرے اور تیسرے عشرے سے ایران اور کچھ … ملکوں میں اس صنف نے موسیقاروں کو اپنی … متوجہ کیا ہے۔ اس کے برعکس برِصغیر ہند میں … صنف میں اس صدی کے وسط تک کوئی نمایاں … ہوتی نظر نہیں آتی۔ اوپرا اصل میں مغرب کی … موسیقی کی ایک مقبول و معروف صنف ہے جس … باقاعدہ آغاز سترہویں صدی کے ابتدائی برسوں … ہوا اور ایسے یونانی تمثیلی فن پاروں پر یہ صنف … سبقت لے گئی جن میں موسیقی کا عمل دخل رہا …

اوپرا کی تعمیر و تدوین کے لیے صاحبِ تخلیق … تین اصناف یعنی شاعری، موسیقی اور ڈراما … بخوبی واقفیت ہونی چاہیے صرف کورس (اجتما… نغمہ یا سہ گان) یا ایک دو گیت یا نغمے کسی تخ… کو اوپرا نہیں بنا سکتے۔ کیوں کہ ڈرامائی عناصر … ماحول کو موسیقی کے سروں اور شعری زمینوں … حوالے سے مرتب اور آراستہ کرنا ہوتا ہے … اداکار کو پیش کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ … یا شدتِ تاثر و اظہار میں کوئی رکاوٹ پیدا … ہو سکے۔ برِصغیر ہند میں مثنوی، قصیدے، داست… رہس اور طویل نظمیں اوپرا کے پیمانے پر پوری نہ… اُتر پاتیں اس لیے اس بحث سے انھیں خار… سمجھا جائے۔

دیکھا جائے تو اوپرا خالص اسٹیج کی چیز … یعنی اوپرا صرف پڑھنے یا چھاپنے کے لیے ہی قلم … نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے لازمی شرط یہ ہے … اسے اسٹیج پر کھیلا جائے۔ اسٹیج پر پیش کرنے …

گریز، ۱۹۸، جواہر نگر، سری نگر

مختلف مناظر اداکاری سے حسبِ ضرورت ربط رکھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اداکار کا گایک ہونا بھی ضروری ہے۔ گایک اداکاروں کے پہناوے، ملبوسات منظروں سے ہم آہنگ ہونا بھی شرط ہے۔ موسیقی بھی ایسی موزوں کی جاتی ہے جو مختلف کرداروں کی ادائیگی کے عین مطابق ہو۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ موسیقی میں مختلف ساز حسبِ ضرورت، اجتماعی یا انفرادی طور پر استعمال کیے جائیں۔ ہاں ان سازوں کی تعداد معین یا مقرر نہیں ہوا کرتی بلکہ ہر اوپرا کے لیے سازوں کا انتخاب ضرورت کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ اوپرا میں گایکوں کے کورس (سہ گان) یا سولو (انفرادی نغمہ) سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے جیسا کہ قدیم یونانی ڈراموں میں ہوا کرتا تھا۔ اوپرا کو اسٹیج پر پیش کرنا عموماً مصنف کا کام نہیں ہوتا۔ دیکھا گیا ہے کہ اوپرا لکھتا کوئی ہے اور پیش کشی کے فرائض کوئی اور انجام دیتا ہے مگر پیش کار کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ موسیقی سے پوری واقفیت رکھتا ہو، شعر و تمثیل سے آگاہ ہو تاکہ وہ حسبِ ضرورت موسیقی مرتب و موزوں کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے۔ اوپرا کی تعریف کرتے ہوئے لغات اور انسائیکلوپیڈیا میں کچھ اس طرح سے لکھا گیا ہے:

"Dramatic performance on Composition of Which Music is an Essential part branch of art Consrred with These."

"Musical work for Stage with Singing Characters originated in early 17th Century..."

گویا کہ موسیقی تنہا کرداروں کی شخصیت کو لباسِ الفاظ، کلمات، مناظر اور دوسرے عناصر سے ارتباط قائم کرنے میں معاون بن جاتی ہے اور اوپرا کا متن ان ساری ضرورتوں کے پیشِ نظر قلم بند کیا جاتا ہے۔ بے شک موضوع، مفہوم اور تدوین میں اوپراؤں کا یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور غالباً کوئی یک رنگی یا یکسانیت ممکن بھی نہیں ہے۔

اب ذرا چلیے دیکھیں کہ مغرب میں اوپرا کی کون کون سی قسمیں رائج رہی ہیں اور اب بھی ممتاز و معروف ہیں: ——

(الف) GRAND OPERA:

وہ تصنیف جس میں نثری مکالمات نہ ہوں۔

(ب) OPERA BUFFA OR OPERA BOUFFE:

موضوع کے اعتبار سے ہلکا پھلکا ہو اور پورے کا پورا گایا جا سکے۔ دراصل ایسے اوپرا، اٹلی اور فرانس میں مروج رہے ہیں۔

(ج) OPERA CONIC OR OPERA COMIQUE:

جن میں مزاح کی چاشنی ہو اور طربیہ رنگ نمایاں ہو منظوم حصّوں کے ساتھ (حسبِ ضرورت) نثری مکالموں سے بھی کام لیا جا سکے۔

(د) OPERA SERIA:

یہ Grand opera کے قبیلے کی قسم ہے جو موضوع کے اعتبار سے غیر سنجیدہ نہیں ہوتا بلکہ مندرجہ بالا اصناف ب اور ج کی ضد بھی متصور کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے اوپرا قدیم دیوی دیوتاؤں اور شجیع کرداروں کی زندگیوں کے اِردگرد گھومتے ہیں۔

اب ذرا اِس صنف کی شروعات پر نظر ڈالیں کہ ابتدا کہاں سے ہوئی اور کون اس کا موجد تھا۔ اس سرسری جائزے کے بعد ہم ایک نظر اپنے گرد و پیش پر بھی ڈالیں اور دیکھیں کہ اُردو میں اس صنف کے بارے میں کیا کچھ ہوا ہے۔

اٹلی میں سولہویں صدی کے اواخر میں اوپرا کی پہلی کاوش ملتی ہے جہاں ایک موسیقی دان جیکوپ پیری (Jacopo Peri) نے اوتھاوُو ری نوکی نی (Ottavio Rinniccini) کے ایک متن Dafne پر کام کیا اور بڑی تیاری کے بعد فلورنس میں ۱۵۹۷ء میں پیش کیا۔ جس کے دیکھنے والوں میں ڈیوک فرڈی ننڈ بھی شامل تھا۔ تو یہ اوپرا اسٹیج کرنے کے ضمن میں ابتدائی کاوش متصور ہوتی ہے۔

ری نوکی نی ایک ایسا فن کار تھا جو اوپرا جیسی محنت طلب صنف میں گہری دل چسپی رکھتا تھا اور اس کی تخلیق میں ایک گونہ مسرّت حاصل کرتا تھا اس لیے وہ اوپرا لکھتا رہا چنانچہ اس کے ایک اور مسودے یوری ڈائس (Euredice) پر دو الگ الگ موسیقی دانوں پیری (Peri) اور گلیئو کاشینی (Giulio Caccini) نے اوپرا مرتب کیے۔ پیری (Peri) کو اپنی تخلیق پیش کرنے کا ایک نادر موقعہ ملا۔ اور فرانس کے ہنری چہارم اور میریا (Maria) کے جشنِ عروسی کی ایک نمایاں تقریب کے طور پر پیرس میں اسٹیج ہوئی۔ اس کے تماشائیوں میں جہاں بادشاہ اور اس کی ملکہ تھے وہاں فرانس اور یورپ کے دیگر ملکوں سے آئے ہوئے خاص الخاص لوگوں نے اس اوپرا کو دیکھا، خوبصورت، شان و شوکت، جاہ و حشم اور پیراہنوں کے نت نئے ڈیزائنوں کی ایسی نمائش ہو رہی تھی جو دائرۂ تحریر میں نہیں

اُسکتی۔ نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ اس اوپرا کی چند نمائشیں ہوئیں اور پھر کبھی بھی اسٹیج پر کھیلا نہیں گیا۔ جب ہم قدیم زمانے کے اوپراؤں کا حال پڑھتے ہیں تو ہمیں یوں لگتا ہے کہ اوپراؤں کے ساتھ دراصل یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ شاہی درباروں یا امرا اور روئسا کے محلوں یا کاشانوں میں ہی اوپرا کھیلے جاتے اور محدود سامعین و ناظرین کے لیے سامانِ فرحت پیش کرتے اور بس! گویا کہ حکمرانوں کی مرضی کے مطابق اس قسم کی تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا' ان کی طبیعت سیر ہو جاتی اور اوپرا کی نمائشیں بند ہو جایا کرتیں۔ عوام اس دل آویز صنف سے نا آشنا رہتے یا رکھے جاتے۔ عوام اپنے حال میں مست لوک ورثے (Folk Loze) میں سے لوک ناٹک' رزمیہ یا رجزیہ' داستان' مثنوی اور دوسری اصنافِ فن سے لطف اندوز ہوا کرتے یہ سلسلہ یورپ میں لگ بھگ دو اڑھائی صدیوں تک جاری رہا۔

جدید اوپرا کی سنجیدہ اور واضح کوشش کلاڈیو مونٹ وردی (Claudio Monteverdi) (۱۵۶۷ء — ۱۶۴۳ء) کے دو اوپراؤں اورفیو (Orfeo) اور آری یانا (Arianna) سے ہوئی جن میں اس کی فن کارانہ صلاحتیں پوری طرح سے اجاگر ہوئی تھیں۔ اورفیو ۱۶۰۷ء میں اسٹیج کیا گیا اس کے بارے میں ناقدین اور موسیقی دانوں کی یہ رائے تھی کہ اوپرا کی دُنیا میں یہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان اوپراؤں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں جہاں مترنم' بیانیہ انفرادی نغمہ (Aria) اور گیت کے بعض حصّوں کا اعادہ ہوا ہے وہاں وہ تمثیل اور موسیقی کے اعتبار سے جدّت آمیز تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ مونٹ وردی ان ایام میں اپنی زندگی کی سخت ترین اُلجھنوں اور مشکلوں میں گرفتار تھا مگر اس نابغۂ روزگار نے فن کی دُنیا کو کئی نہایت عمدہ اوپرا دیے افسوس یہ ہے کہ دست بردِ زمانہ سے انھیں کوئی بچا نہ سکا اور اب دو تین ہی اوپراؤں کے متن موجود ہیں۔ مونٹ وردی اساطیری فضا قائم کرنے کا ملکہ رکھتا تھا اور صاحبِ ذوق لوگوں نے اعتراف کیا کہ اس سے پہلے کوئی ایسی تخلیق پیش نہیں کر پایا ہے۔ شاید مونٹ وردی اپنی پریشاں حالیوں کی پناہ گاہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تھا' اپنے دونوں اوپراؤں کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ آریانا اسے چیخنے پر آمادہ کرتا ہے جبکہ اورفیو عبادت پر مائل۔ مونٹ وردی ۷۷ سال تک زندہ رہا اور لگ بھگ ساٹھ سال تک اس کے احساسِ جمال اور ذوقِ موسیقی نے اوپرا کے فن کی آبیاری کی۔ ۷۵ سال کی عمر میں اس نے اپنا آخری مگر مکمل اوپرا L'Inconorazione Di Poppaea لکھا جس میں اس نے کرداروں کی شخصیت پر خاص توجہ دی اور Situations ان کے تابع دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ایک Viola (وائلن کی قدیم ترین اور ابتدائی صورت) بجانے والے سازندے کے درجے سے جدید اوپرا کا موجد بن گیا۔ اس کی تخلیقی اور فنّی صلاحیتوں نے رفتہ رفتہ اٹلی' اسپین' فرانس' جرمنی' انگلستان اور آسٹریا کے فن کاروں اور تخلیق کاروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ انگلستان میں اگرچہ موسیقی اور تمثیل کے امتزاج کو اولاً تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا مگر دھیرے دھیرے کئی روپ بدل کر اوپرا کی صنف کی طرف دھیان دیا جانے لگا اس سے پہلے ڈرامہ نگار بن جانسن (Ben Joh-nson) سے ماسک (Masque) لکھوائے گئے جن میں کچھ نثر' کچھ گانا تھوڑے سے س...
کچھ سازینہ' کچھ اداکاری اور کچھ رقص شامل...
اور جب اوپرا کو اپنایا گیا تو مفہوم اور موضو...
زندگی سے مستعار لیے گئے جن میں پیشہ ور...
یا یوں کہیے کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے وا...
افراد کی زندگی کی عکاسی ہونے لگی اور اس...
سے اوپرا کا دائرۂ عمل و موضوع وسیع تر ہو گ...
وینس اور اڈونس (...e Venus and
Adonis) کو صحیح معنوں میں پہلے انگلیس...
کا درجہ دیا جا سکتا ہے جو جان بلو (...hn
Blow) (۱۶۴۹ء-۱۷۰۸ء) کی تخلیق...
مونٹ وردی کے جانشینوں میں ک...
(Cavelli) (۱۶۰۲ء-۷۶) کیسٹی (...
(...sti) (۱۶۲۳ء-۶۹) سٹراڈے لا (...n
(...adella) (۱۶۴۲ء-۸۲) تھے جنھ...
نے انفرادی آواز (Solo Voice) ک...
زیادہ سے زیادہ فوقیت دی۔ ایسے گانے وال...
کی ہر دل عزیزی آج کے پاپ (Pop) گائیک...
سے کچھ کم نہ تھی۔ ان تینوں فن کاروں کے ع...
مونٹ وردی کے بعد اس صنفِ ادب و مو...
کی طرف کئی عظیم موسیقار راغب ہوئے جن...
کارسینی (Canssini) پورکل (...urcell)
(-۱۶۸۵) (Bach) باخ (۱۶۵۸ء-۹۵)
(۱۷۵۰ء) ریمیو (Rameace) ہے ڈ...
(Mozant) موزار (Haydn) بیتھو...
(...endi) (Begthovan) گیسپی وردی
(۱۸۱۳ء-۱۹۰۱ء) ہنڈل (۱۶۸۵ء-۱۷۵۹ء)
مینڈل سن (Mendel Ssohn) شو...
(Schumann) واگنر (Wagner) برھام...
(Brahms) چند نمایاں فن کار ہیں جنھوں...
اپنی بے پناہ صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس صنف...

یوروپی زندگی میں اعلیٰ مقام دلوایا۔ ان کی یہ کوششیں ۱۶۳۰ء سے ۱۸۹۰ء تک برابر جاری رہیں۔ اتنے طویل عرصے میں اوپرا کے فن کو جہاں تقویت ملی وہاں موضوعات کے ضمن میں بھی نئے نئے تجربے ہونے لگے اور اوپرا شاہی سرپرستی سے آزاد ہوکر سماج میں اہم مقام حاصل کر پایا۔ سب سے معتبر اور منفرد اوپرا حجّام کا اوپرا (The Barbers Gray Opera) رہا جو محنت کش عوام کی زندگی سے کافی قریب تھا اور حجّام کے پیشے سے نزدیک تر۔ اوپرا کے باب میں کئی تحریکیں آئیں اور اثرات چھوڑ کر چلی گئیں بالکل اسی طرح سے جیسے ادب میں تحریکوں نے جنم لیا اور پھر معدوم ہونے سے پہلے ادبی قدروں اور رجحانات کو متاثر کرتی گئیں۔ انیسویں صدی میں انگریزی ادب میں رومانویت (Romanticism) کی تحریک شروع ہوئی اور ہئیت موضوع اور اسالیب کے کئی تجربے کیے گئے۔ موسیقی میں بھی یوروپ نے رومانی تحریک دیکھی جب کہ کلاسیکی سنگیت کی گرفت سے چھٹکارا پانے کے جتن کیے گئے اور شوبرٹ (Schubert) شومان (Schumann) لسٹز (Liszt) اور برلوز (Berlioz) نے اظہارِ فن کے لیے نئے آہنگ اور اسالیب تلاش کرنا شروع کیے اور ہئیت کو ثانوی درجہ ملنے لگا جب کہ مفاہیم کو اوّلیت ملنے لگی۔ انھوں نے چند سازوں ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑے بڑے ارکسٹرا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی نغموں کی فوقیت بڑھتی گئی۔

بہرحال، یہ مختصر گفتگو اوپرا کے فن کے ابتدائی دور اور تاریخی رفتار کے بارے میں معزز قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کی گئی تاکہ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ہم برصغیر ہند پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اس فن میں کسی طرح کی بھی پیش رفت ہوئی ہے کہ نہیں!؟ اور یہ بھی معلوم کرسکیں کہ یوروپ کے بلند پایہ موسیقاروں کی طرح ہمارے ملک اور پاس پڑوس میں کسی بھی موسیقار یا موسیقاروں نے اس فن کی طرف توجّہ مبذول کی ہے یا نہیں!؟ اگر ملکی موسیقی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو جواب کوئی حوصلہ افزا نہیں ملے گا۔ کسی بھی زمانے میں اوپرا کی صنف میں "مشقِ سخن" ہوتی نظر نہیں آتی ہاں، کچھ انفرادی کوششیں ہوئی ہیں اور چند گنے چنے موسیقاروں کے دورِ حیات یا کچھ ان کے بعد اوپرا کی صنف سے ملتی جلتی صنف میں طبع آزمائی ہوتی رہی ہے اور بس۔ یوروپ کی طرح یہاں کسی تحریک نے جنم نہیں لیا۔ اور برصغیر میں یوروپی اوپرا جیسی صنف کی خاص روایت نہیں ملتی۔

واجد علی شاہ کے دربار میں لااس یا اسی قسم کی Performance اوپرا کے زمرے میں نہیں آسکتی، اوّل تو اوپرا جیسی کوئی بھی تخلیق ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئی اور اگر کوئی کاوش ہوئی بھی تو اوپرا کے اتحادِ ثلاثہ۔ موسیقی، شاعری اور ڈراما ـــــ میں کسی نہ کسی جُز یا عنصر کی کمی پائی گئی، لوک ورثے (Folk Lore) میں بھی خالص اوپرا جیسی چیز نہیں ملتی۔ رشیا ما شاستری تیرونل تھیاگا راجہ اور ٹیگور کی بدولت جنوبی ہند اور بنگال میں اوپرا کے میدان میں کچھ کاوشیں ضرور ہوئی ہیں اور علاقائی موسیقی اور ڈرامہ میں وہ اپنا مقام رکھتی ہیں۔ ایچ۔ اے۔ پاپلے (H. A. Popley) کا خیال ہے کہ ایسی تخلیقات کو "سنگیت ناٹک" کے زمرے میں لایا جاسکتا ہے۔ تکنیکی اور قطعی طور پر انھیں اوپرا کی صنف میں نہیں رکھ سکتے۔ ایسی تخلیقات میں کسی بادشاہ یا دیوی دیوتا یا اوتار کی زندگی سے موضوع یا مفہوم مستعار لیا جاتا ہے اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب "بھارت کا سنگیت" میں کچھ مثالیں پیش کرتا ہے جن میں راجہ ہریش چندر، راجہ نل، ساوتری اور رام سیتا کی جیون سے وابستہ کئی قصّے، سنت مُنیوں اور بھگتی بھاؤ کے پرچارکوں کی زندگیوں کے کچھ واقعات شامل ہوتے ہیں۔ آج کل بھی ایسی کئی ٹولیاں یا جماعتیں یا کمپنیاں ملک کے دیہات میں موجود ہیں جو مختلف تہواروں یا میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر "سنگیت ناٹک" میں کوئی منظر کوئی واقعہ یا کوئی رُوپ پیش کرکے تماشائیوں کی تفریح کا سامان مہیا کرتی رہتی ہیں۔ ایک اور موسیقی دان پروفیسر پی۔ سامبہ مورتی (Prof P. Sambamoorty) ایسی (Perfor-mance) کو "سنگیت ناٹکم" کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ غنائی تمثیل کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ مثالوں میں وہ تھیاگا راجہ اور گیت گوندم، کرشن لیلا ترنگنی، پرہلاد بھگتی وجیایم، ناوکا چریتم، سیتارام وجیایم، رام ناٹکم نندنار چریتم پیش کرتا ہے۔ ان سے صاف عیاں ہے ایسے سنگیت ناٹک یا سنگیت روپک زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اب جب کہ کمپنیوں کی بات چلی ہے تو ہمارے ذہن میں کچھ تھیٹریکل کمپنیوں کے نام ابھرتے ہیں اور پارسی تھیٹریکل اور آغا حشر کاشمیری کا تھیٹریکل گروپ، اور لکھنؤ اور دیگر شہروں میں مقامی کمپنیوں کا خیال آتا ہے۔ جو اگرچہ کلیتاً ناٹک پیش کیا کرتی تھیں مگر کبھی کبھی دیوی دیوتاؤں یا راجہ مہاراجوں یا

رشی منیوں کی زندگی کا کوئی واقعہ بھی سنگیت کے سہارے پیش کیا جاتا۔ اب بھی کئی عوامی کلاکار ٹولیاں یہ کام کرتی ہیں اور پھر انھیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سے اپنے فن کی نمائش کے مواقع ملنے لگے ہیں۔ آغا حشر کاشمیری نے ابتدائی یونانی ڈرامہ کا سہارا بالعموم لیا ہے ان کی تخلیقات میں کچھ شاعری بھی ہے اگرچہ نثر کا حصہ وافر ہے کچھ سہ گان یا کورس یا مناسب جگہوں پر گانے بھی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تہذیبی اور تعمیری افکار کو نظم و نثر اور موسیقی میں پیش کرنے کی اس کوشش نے نئی راہ سجھائی مگر پھر بھی ایسی تخلیقات اوپرا کے فنی معیار پر پوری نہیں اتر پاتیں۔ امانت لکھنوی کی اندر سبھا اگرچہ موسیقی، بیانیہ اور کچھ کچھ ڈرامہ سے مزین ہے مگر پھر بھی اُس اوپرا کے معیار پر نہیں رکھی جا سکتی جو یوروپ نے دنیائے موسیقی اور عالمِ ادب کو دیا ہے۔

اُردو میں طویل نظموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ جن میں مثنویاں، رزمیہ حکایتیں، داستانیں، رجزیہ کہاوتیں، بیانیہ نظمیں، ساقی نامے، گتھائیں، اور دیگر طویل شعری تخلیقات شامل ہیں مگر وہ سب ہماری گفتگو کے دائرے میں نہیں آسکتیں کیوں کہ ان میں اوپرا کے "اتحادِ ثلاثہ" والی خوبی نہیں پائی جاتی۔ لیکن جب ہم پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کے شعری ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اوپرا کی جانب کچھ اہلِ قلم کی توجہ مبذول ہوتی نظر آتی ہے۔ اوّل اوّل مختار صدیقی نے کچھ کوشش کی اور پانچ ہزار سالہ تہذیب کے دو بڑے آثار موہن جوڈارو اور ہڑپہ کو موضوعِ سخن بنا کر دو طویل نظمیں لکھیں جن میں کرداروں کی وساطت سے کچھ ڈرامائی کیفیتیں پیدا کی گئیں مگر ان کرداروں کو پیش کرنے میں اوپرا کی سی موسیقی یا اندازِ تخاطب یا طرزِ ادا سے بہت زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ مختار صدیقی کے علاوہ سلام مچھلی شہری نے کچھ مسودے لکھے جو چھوٹے چھوٹے اوپرا (Operetta) تھے جن میں مختلف شعری اسالیب اور بحور کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی استفادہ کیا گیا۔ ساغر نظامی نے مختلف بحروں کا کچھ زیادہ استعمال نہیں کیا بلکہ عام طور سے دو ایک بحروں میں موضوع قلم بند کیا۔ جس کی وجہ سے اوپرا کی ڈرامائی کیفیت یا موسیقی کی ترتیب میں دقت پیش آتی ہے۔ "ہفت پیکر" کے مصنف جعفر طاہر نے واقعاتِ کربلا کے بارے میں ایک پر اثر شعری تخلیق پیش کی ہے اور اساطیری ماحول پیدا کر کے موضوع میں شدت پیدا کی ہے، معلوم نہیں کہ یہ اوپرا پاکستان میں کہیں اسٹیج ہو سکا یا ٹی۔ وی یا ریڈیو پر نشر ہوا کہ نہیں، جعفر طاہر کی تخلیقوں میں اوپرا کی سی خوبیاں موجود ہیں۔ طویل نظموں کے باب میں ہمیں معاصر شاعر عبدالعزیز خالد کا خیال آتا ہے زردِ داغِ دل یا دوسری منظومات محض طویل نظمیں ہیں اور بس۔ لیکن اوپرا نہیں کہلائی جا سکتیں۔ ہاں اُن کو بنیاد بنا کر اوپرا خلق ہو سکتے ہیں۔ رفعت سروش نے چند اہم اوپرا لکھے ہیں جن میں سے اکثر اسٹیج ہو چکے ہیں، حال ہی میں کشمیر کی ایک مایۂ ناز ملکہ حبّہ خاتون کی زندگی کو موضوع بنا کر اوپرا لکھا ہے۔ شیلا بھاٹیہ اگرچہ خود اوپرا نہیں لکھتیں مگر پھر بھی انھوں نے لوک کہانیوں کے آدھار پر بڑے ہی خوب صورت اوپرا اسٹیج کیے ہیں اور شائقین اور اربابِ نظر سے برابر دادِ تحسین پا چکی ہیں۔ عمیق حنفی نے نئے تناظر میں طویل نظمیں لکھی ہیں۔ علی سردار جعفری کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" اوپرا کی ایک قسم ہے جس میں مختلف بحروں اور شعری زمینوں کو بروئے کار لا کر ڈرامائی کیفیت پیدا کی گئی ہے "نئی دنیا کو سلام" عصری تقا[illegible] سیاسی اور سماجی شعور کی ترجمان بھی ہے ا[illegible] تخلیق کا ایک نمونہ۔

اگر آپ تعلی پر محمول نہ کریں تو یہ کہہ د[illegible] (غالباً) میری تخلیق "سازِ جمال" اُردو می[illegible] پہلا مجموعہ ہے جس میں سات اوپرا شامل ہ[illegible] "اتحادِ ثلاثہ" پر پورے اُترتے ہیں، ہر اوپ[illegible] موضوع ایک دوسرے سے جدا ہے۔ بحروں کا [illegible] ارکان کی کمی بیشی، لہجے کے تغیّرات، ردیف و[illegible] کا محتاط و مناسب استعمال، ڈرامائی عناصر[illegible] کے لیے دشواریاں پیدا نہیں کرتے۔ موسیقی [illegible] گہری وابستگی، اسٹیج اور ڈرامے سے دل چ[illegible] اور ریڈیو اور ٹی۔ وی کی ملازمت نے مجھے "[illegible] جمال" اور زیرِ ترتیب و طبع "سازِ آرزو" کے او[illegible] کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے، یہ اوپرا رنگ و آ[illegible] ہیئت و موضوع کی مختلف راہوں کی نشان[illegible] کرتے ہیں۔

غرض اوپرا میں اظہار، اسلوب اور ذ[illegible] عکاسی بڑا ہی محنت طلب عمل ہے، موضو[illegible] مفہوم کے سرچشمے یا خزینے ہمارے پاس[illegible] جو لوک ورثے سے لے کر عصری احوال و کوائف[illegible] پھیلے ہوئے ہیں مگر ان کو شعر، ترنم اور تمثیل[illegible] رنگ و لباس پہنانے کے لیے خلاقانہ ذہن او[illegible] حوصلگی کی ضرورت ہے۔

غزلیں

علقمہ شبلی

جنونِ شوق، محبت کی آگہی دینا
خودی بھی جس پہ ہو قرباں وہ بے خودی دینا

نہ شور چاہیے دریا کی تند موجوں کا
مرے لہو کو سمندر کی خامشی دینا

نقاب الٹ دے جو بڑھ کر رخِ تمنّا سے
یہ آرزو ہے کہ مجھ کو وہ تشنگی دینا

جھکا سکے نہ مرا سر کوئی بھی قدموں پر
جو ہو سکے تو مجھے بھی وہ سرکشی دینا

نئے جہات سے فن کو جو آشنا کردے
مرے قلم کو خدایا وہ کج روی دینا

۸۹/۵، رپن اسٹریٹ (پہلی منزل) کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

یہ کس کا عکس مرے آئینے پہ چھایا ہے
کوئی تو ہے جو مری ذات میں سمایا ہے

نوازشات پر اُس کی بہت غرور نہ کر
وہ شخص دھوپ ہے پل میں تو پل میں سایا ہے

ندی کی دھار پہ لکھی ہوئی عبارت ہوں
ہر ایک موجِ نفس نے مجھے مٹایا ہے

تمھیں بھی کل وہ تماشائیو! نہ بخشے گا
جو خنجر آج مرے خون میں نہایا ہے

وہ سنگ ہوں جو بشر بن سکا نہ صدیوں میں
مری حیات پہ اک بد دعا کا سایا ہے

گماں یہ ہوتا ہے اب تو ہر ایک دستک پر
کواڑ پھر کسی قاتل نے کھٹکھٹایا ہے

شکستہ شیشوں سے ہی اب گھروں کے پہرے دار
یہ پوچھتے ہیں کہ پتھر کہاں سے آیا ہے

ہمارے عہد کا یہ المیہ عجب ہے شباب
جسے ہم اپنا سمجھ لیں وہی پرایا ہے

شباب للت

فیلڈ پبلسٹی افیسر گورنمنٹ آف انڈیا ریلوے بورڈ بلڈنگ شملہ ۱۷۱۰۰۳

خورشید افسر بسوانی

دل کا غبار، پیاس کا لشکر لیے پھرے
ہم شہر شہر دشت کا منظر لیے پھرے

جب تشنگی نے ریت کا جامہ پنہا دیا
بادل ہمارے گرد سمندر لیے پھرے

میں وقت کی گرفت سے آزاد جب ہوا
لمحے مری تلاش میں خنجر لیے پھرے

بادل، مکان، پیڑ کہاں دشتِ فکر میں
ہم اپنے سر پہ دھوپ کی چادر لیے پھرے

تیرے بجھے لبوں پہ نہ آئی ہنسی کہیں
ہم بھی کہاں کہاں تجھے افسر لیے پھرے

بسواں، سیتا پور (یو۔پی)

ایم رمبین

عذاب کا ایک دن

دوپہر دو بجے سے کچھ پہلے بڑے صاحب کا حکم آیا:

"مظاہرین ان سرکاری آفسوں پر پتھراؤ کر رہے ہیں اور آگ لگانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں جو کھلے ہیں۔ اس لیے اوپر سے احتیاطی طور پر آفس بندکر دینے کا آرڈر آیا ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جا سکتے ہیں۔"

'گھر جا سکتے ہیں؟' وہ چیخ اٹھا۔ "اِس وقت ہم کس طرح گھر جائیں؟ نہ تو کوئی ٹرین چل رہی ہے نہ دوسری سواری؟"

"ایسا تھا تو ہمیں آنے کے لیے کیوں کہا گیا تھا" جوشی اپنے سر کو تھامے چیخا۔

"جب تک سواریاں شروع نہ ہوں ہم کہاں مارے مارے پھریں گے؟ ہمارے گھر یہاں سے ۲۰ - ۲۰ کلو میٹر دور ہیں؟" جادھو چیخا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں صاحب" چپراسی نے بے بسی سے کہا۔ "صاحب نے حکم دیا ہے کہ میں بھی آفس کو تالا لگا کر گھر چلا جاؤں، وہ بھی گھر چلے گئے ہیں۔"

"سلے کے پاس موٹر سائیکل ہے نا" جوشی دانت پیس کر بولا۔ "اسے ان باتوں کا کہاں احساس ہوگا۔"

جھنجلاتے، بڑبڑاتے، اوپر والوں اور بند کا نعرہ لگانے والوں کو کوستے وہ آفس سے باہر آئے۔ آسمان سے سورج لاوا برسا رہا تھا۔ پسینے کا تار نہیں ٹوٹتا تھا۔ سارے شہر کو ایک پُر ہول سناٹے اور وحشت نے اپنی شیطانی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ سڑکیں جن پر قدم رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی تھی سنسان پڑی تھیں۔ نہ ہی گاڑیوں کے بریکوں کے چرچرانے کا شور تھا۔ نہ ہارنوں کا کان کے پردے پھاڑ دینے والا غل۔

وہ سب آکر ایک عمارت کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔

سامنے کی سڑک پر چلچلاتی دھوپ کی شدت سے جگہ جگہ سے تارکول بہہ رہا تھا۔ دھوپ کی وجہ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ان لوگوں نے دھوپ کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں آدھی میچ رکھی تھیں۔

سویرے سے ہر کسی کا بُرا حال تھا۔ آفس کی چار دیواری میں انھیں اس بات کا احساس تو تھا کہ وہ اس چار دیواری میں محفوظ ہیں۔ کام کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یا تو باتیں کر رہے تھے یا کرسیوں سے سر لگائے سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

ان میں سے اکثر کے پاس سگریٹ یا بیڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ باہر کوسوں تک کوئی بیڑی سگریٹ کی دوکان کھلی ہوئی نہیں تھی۔ چائے کا بھی یہی عالم تھا۔ سویرے سے کسی کو ایک کپ چائے بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے وہ جمائیاں پر جمائیاں لے رہے تھے۔

"سونو مائی باپ یار کہیں سے چائے وغیرہ کا بندوبست کر . . ."

"ارے سونو چائے نہیں مل سکتی تو کہیں ۔ ایک تمباکو والا پان ہی لا دے۔"

"سونو سگریٹ ختم ہو گئی ہے لا ایک بیڑ[ی] دے اسی سے کام چلا لیں گے۔"

رہ رہ کر وہ چپراسی سے کہتے اور ہر مرتبہ چپراسی کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"صاحب چائے کی ایک بھی دوکان کھلی نہ[یں] ہے۔"

"صاحب پان کی ایک بھی دوکان کھلی نہیں ہے۔"

"صاحب میرے پاس بھی بیڑیاں ختم ہو گ[ئی] ہیں۔"

اس عمارت کی دیوار سے پشت لگائے و[ہ] سوچ رہا تھا اگر وہ آج آفس نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ رات اسی سلسلے میں اس کی اور اس کی بیوی کی زبردست بحث ہوئی تھی۔

"کل بند ہے۔ کل تو آفس بند ہوگا نا؟"

"آفس تو کھلا رہے گا۔ اور صاحب کا آرڈ[ر] ہے کہ سب کا آنا ضروری ہے . . ."

"لیکن گاڑیاں، ٹرینیں تو بند رہیں گی؟ آپ کس طرح جائیں گے؟" بیوی جھنجلا اٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑیاں سات آٹھ بجے کے بعد بند ہوں گی۔ کیونکہ عام طور پر ایسا ہی ہو[تا]

۲۱۴۔ نیو طوری پاڑہ۔ بھیونڈی۔ ۴۲۱۳۰۲ ضلع تھانہ مہاراشٹر

ہے۔ اس لیے میں سویرے کی پہلی لوکل سے ہی چلا جاؤں گا۔"

" لیکن ایک دن آفس نہیں جاؤ گے تو زیادہ سے زیادہ ایک سی ایل ہی کٹے گی نا؟ پھر اتنا بڑا خطرہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

" تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہو آفس نہ جانے کا مطلب ہوگا بند کی حمایت، سرکاری آفس ہے۔ ہو سکتا ہے بند کی حمایت کا الزام لگا کر کوئی کارروائی بھی کی جائے۔ اوپر سے سخت آرڈر ہے۔ صاحب نے صاف کہہ دیا کہ جو کل نہیں آئے گا اس کو میمو دیا جائے گا۔ اس لیے ہر حال میں جانا تو پڑے گا ہی نوکری کا سوال ہے۔"

اس کی باتیں سن کر بیوی کی آنکھوں میں بے بسی کی پرچھائیاں ابھرنے لگی تھیں۔

" اس سے پہلے بھی دو تین بار آپ بند کے دوران آفس جا چکے ہیں۔ ہر بار آپ کو کتنی مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں کیا آپ بھول گئے ہیں؟"

" دیکھو! ایک میں ہی تو نہیں جاتا ہوں۔ ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔ ان کے بھی گھر والے ہیں بیویاں ہیں۔ تم کیوں بے کار کی باتیں سوچتی ہو۔"

اس نے کسی طرح بیوی کو سمجھا دیا تھا۔

اس دن بیوی سویرے چار بجے ہی جاگ گئی تھی۔ جلدی سے اس کے لیے ناشتہ اور دوپہر کا کھانا تیار کیا تھا۔ ناشتہ کر کے دوپہر کے کھانے کا ڈبہ لے کر وہ سویرے ساڑھے پانچ بجے کے قریب گھر سے نکلا تھا۔

اس دن خلافِ معمول سویرے ساڑھے پانچ بجے کی لوکل میں بھی بے حد بھیڑ تھی۔ ٹرین میں سبھی وہ لوگ تھے جن کو اسی کی طرح آفس جانا ضروری تھا۔ لوکل نمبر ا سے روانہ ہوئی تو کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ اس کے بعد آنے والے ہر اسٹاپ پر بھی ٹرین میں بھیڑ بڑھتی ہی گئی۔

وقتِ مقررہ پر وہ ٹرین وی۔ ٹی بخیریت پہنچ گئی۔

دن نہیں نکلا تھا اس لیے بند کا اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

آفس کھلنے میں پورے دو گھنٹے تھے اور اسے وہ دو گھنٹے کسی طرح گذارنے تھے۔ وہ یونہی بے مقصد گیٹ وے آف انڈیا تک چلا آیا اور وہاں بیٹھ کر بے مقصد سمندر کے پانی کو دیکھنے لگا۔

سورج نکلا اور دھیرے دھیرے اس کی تمازت بھی بڑھنے لگی۔

موٹروں کے ہارن اور شور وغل کے عادی اس کے کان اس مانوس شور کو سننے کے متوقع تھے۔

جب آفس کھلنے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تو وہ آفس کی طرف چل دیا۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا تھا۔

وہ سڑک جس کو عام دنوں میں پار کرنا جوئے شیر لانے کی طرح تھا۔ اس وقت سنسان پڑی تھی۔

ان سڑکوں کو گھبراہٹ کے عالم میں تیزی سے پار کرتے ہوئے اس کے لاشعور میں ہمیشہ ایک خواہش چھپی رہتی تھی کہ کبھی تو اسے ایسا موقع ملے جب وہ اس سڑک پر اطمینان سے سکون سے چلتے ہوئے اسے پار کرے۔

آج اس کی وہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

سڑک پر اس طرح کے دو چار لوگ لاپرواہی سے آجا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ٹیکسیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

لیکن ان خالی ٹیکسیوں کو دیکھ کر کوئی بھی اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ آج یہ اپنے مقام سے ایک انچ بھی نہ ہلیں گی۔

سڑک پر نہ تو کوئی ٹیکسی نظر آتی تھی نہ کوئی پرائیویٹ کار نہ کوئی بس کبھی کبھی کوئی موٹر سائیکل فراٹے بھرتی گذر جاتی تھی۔ یا کوئی سائیکل سوار مستی میں سائیکل چلاتا گذر جاتا۔

آفس پہنچا تو آفس کا نصف عملہ آفس میں موجود تھا۔ وہ سب اس کی طرح اپنے علاقوں سے پہلی لوکل ٹرین پکڑ کر آئے تھے۔

جیسے جیسے وقت گذرنے لگا بند کے آثار واضح ہونے لگے۔

نیچے خاموشی میں ڈوبی سنسان سڑک اور سڑک کے دونوں کناروں کی دکانوں کے گرے ہوئے شٹر اس بات کا ثبوت تھے کہ بند کا آغاز ہو گیا ہے۔

" بھائی میں جب گھر سے نکلا تو ایسا لگتا تھا کہ پورا علاقہ مکمل بند رہے گا۔"

" ارے اپن کے ایریے کا دادا اس بند میں پیش پیش ہے اور اس نے اپنے چیلوں کو حکم دیا ہے کہ جو بھی دکان کھلی دیکھے اسے لوٹ لیا جائے۔ بھلا پھر کون اپنی دکان کھول کر اپنی شامت کو دعوت دے گا۔"

ہر کوئی اپنے علاقے کی پوزیشن بتا رہا تھا۔

" اچھا یہ بتاؤ اگر یہ بند سو فیصدی کامیاب بھی رہا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟" کئی دنوں سے اس کے ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال آخر اس کے ہونٹوں پر آ گیا تھا۔

" اے بھائی" شیٹی بولا۔ " دیکھ اب یہ پولیٹکس پر بحث کرنے کے لیے اتر آیا ہے۔۔۔ اب میرا خیال ہے کہ ٹوپک بدلا جائے۔"

" ارے یہ بھی کوئی سیاست ہے۔۔۔ ہر طرح کی تکلیفیں تو عوام کو ہی سہنی پڑتی ہیں نا۔

دس بیس روپے کلو سبزی بکے گی۔ گھروں میں
چولہے نہیں جلیں گے۔ جو لوگ روزانہ مزدوری
کرکے اپنا پیٹ بھرتے ہیں آج انھیں تو بھوکا
سونا پڑے گا۔۔۔"

اس کی جوشیلی تقریر زیادہ دیر جاری نہ
رہ سکی۔ اسی وقت جوشی کمرے میں داخل ہوا۔
اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور
کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے تھے۔

"کیا ہوا جوشی؟"

"کچھ نہ پوچھو کیا ہوا" وہ اپنا سر پکڑ کر
بیٹھ گیا" پہلے بس سے آنے کی کوشش کی پریل
کے پاس بس پر پتھراؤ ہوا۔ بس روک دی گئی اور
مسافروں کو بس سے اُتار کر آگ لگا دی گئی۔
مجبوراً لوکل پکڑی۔ ابھی لوکل پریل سے چھوٹی
بھی نہیں تھی کہ اچانک زبردست پتھراؤ شروع
ہوگیا۔ بڑے بڑے پتھر شیشے توڑ کر اندر آنے لگے
کئی مسافر زخمی ہوگئے۔ ایک پتھر مجھے بھی لگا۔ اور
وی۔ ٹی تک آتے آتے کئی جگہ پتھراؤ ہوا۔ میں تو
سمجھتا ہوں شاید ہی کوئی مسافر ہوگا جسے چوٹ
نہیں آئی ہوگی۔"

"کل تو آپ اس بند کی حمایت میں بڑی
لمبی چوڑی تقریر کر رہے تھے۔"

"ہماری پارٹی کو بدنام کرنے کے لیے یہ
سب غنڈوں کی شرارتیں ہیں۔" جوشی بولا

"میرا خیال ہے کہ اب پوائنٹ بدلا جائے۔"
جادھو درمیان میں بول اٹھا۔

اس کے بعد خبر اسی تھوڑے تھوڑے وقفے
سے اگر شہر میں رونما ہونے والے واقعات کی رپورٹیں
دیتا رہا۔

دوپہر تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ
شہر مکمل بند ہے اور اس بند نے تشدد آمیز
موڑ بھی لے لیا ہے۔ جگہ جگہ پتھراؤ آتش زنی
لوٹ مار کی رپورٹیں مل رہی تھیں۔

بند کے باوجود لوکل ٹرینیں اور بسیں چلانے
کا جو دعویٰ کیا گیا تھا وہ حکام نے مسافروں کی
حفاظت کے خیال سے واپس لے لیا تھا اور
تمام سروسیں منسوخ کردی تھیں۔

اور اس وقت دو بجے وہ اس عمارت
کے سائے میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ کس
طرح گھر جائیں۔

"دیکھو بھائی میرا ایک رشتہ دار پاس ہی
رہتا ہے میں وہاں جا رہا ہوں۔ شام اگر بسیں اور
گاڑیاں شروع ہوگئیں تو واپس گھر چلا جاؤں گا نہیں
تو وہیں قیام کرلوں گا۔ میں گھر کہہ کر آیا ہوں کہ اگر
گاڑیاں شروع نہیں ہوئیں تو رشتے دار کے گھر
رک جاؤں گا۔ پھر سر بھی سخت درد کر رہا ہے۔
آرام ضروری ہے۔" یہ کہتا جوشی چلا گیا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے میں
ملاڈ تک کیسے جاؤں۔" شیٹی بولا۔

"تم ملاڈ کو رو رہے ہو مجھے تو ممبرا جانا ہے۔"
وہ بولا۔

"بھائی اپن کو تو بائیکلہ تک ہی جانا ہے
اور میں آج سائیکل لایا ہوں۔"

جادھو بولا" اکبر اگر تم چاہو تو میرے
ساتھ بائیکلہ تک پیچھے بیٹھ کر چل سکتے ہو۔ وہاں
سے گھر جانے کے لیے کوئی راستہ نکال لینا۔"

"ارے بائیکلہ ہے ہی کتنی دور۔۔۔" وہ
بولا" وہاں تک تو میں پیدل ہی چلا جاؤں گا لیکن
مجھے تو ممبرا جانا ہے۔ اور یہ صرف لوکل سے ہی
ممکن ہے۔"

"دیکھ چلنا ہے تو چل۔ نہیں تو اپن چلا۔"
جادھو سائیکل پر بیٹھ گیا۔

"ٹھہر آتا ہوں۔ اچھا ساتھیو! خدا حافظ
صرف ایک لمحے میں اس نے جادھو کے ساتھ
جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اچھل کر سائیکل کی
پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"دیکھ سالی یہ سڑک کیسی سنسان ہے
سائیکل چلانے کا مزا آرہا ہے۔ ہی۔ ہی۔ ہی
جادھو کہہ رہا تھا اور اس کی نظر سڑک کے کنار
کی بند دکانوں پر تھی۔

"کیا سوچ رہا ہے بے؟" اسے چپ پا ک
جادھو نے ٹوکا۔

"سوچ رہا ہوں۔ ہم زیادہ سے زیادہ آد
گھنٹے میں بائیکلہ پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد

"ارے تو اس کی فکر کیوں کرتا ہے۔ اس
لیے فکرمند ہے نا کہ اگر شام تک گاڑیاں شرو
نہ ہوئیں تو کیا ہوگا۔ آج رات تو اپنے گھر رہ جا
سویرے یا تو گھر چلے جانا یا آفس۔ سویرے تک
تو گاڑیاں شروع ہو ہی جائیں گی۔"

"نہیں یار گھر میں بیوی اکیلی ہے۔ وہ فکر
مند ہوگی۔ اگر میں رات تک گھر نہیں پہنچا تو
وہ ایک لمحے بھی چین سے نہیں سو سکے گی اور
پتہ نہیں کیا کیا سوچ لے گی۔ میرا گھر جانا ب
ضروری ہے۔"

جادھو کا گھر آگیا۔

اس وقت صرف تین ہی بجے تھے۔
بند کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے
جب تک لوکل شروع نہ ہو وہ کیس
کرے اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اور
پھر اچانک اس نے عجیب سا فیصلہ کیا اور
پیدل ہی چل دیا۔

سنسان سڑکوں پر اکّا دکّا لوگ آ جا
رہے تھے۔ کچھ جگہ لوگ اکٹھا ہو کر آپس میں باتیں

کر رہے تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں پتھروں اور سوڈا واٹر کی ٹوٹی بوتلوں کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔

ایک دو جگہ اُسے جلی ہوئی بسیں ٹیکسیاں کاریں بھی نظر آئیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر طرح طرح کے وسوسے اس کو جکڑنے لگے اس کے پیر لڑکھڑانے لگتے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگتا ماتھے پر آئی پسینے کی بوندوں کو وہ صاف کرتا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی چال تیز کرنے کی کوشش کرتا۔

چلتے ہوئے وہ بار بار گھڑی دیکھتا۔ وقت کچھوے کی طرح رینگ رہا تھا۔

اَب شام کے چھ بجنے کو تھے اس کو محسوس ہوا کہ زندگی معمول پر آ رہی ہے۔

کاریں اور ٹیکسیاں سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ اِکّا دُکّا بسیں بھی دکھائی دینے لگی تھیں وہ پیدل کرلا تک آ گیا تھا۔ اور بے بسی سے آتی جاتی بسوں اور ٹیکسیوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بسیں اور ٹیکسیاں اس کے کسی کام کی نہیں تھیں۔ کیونکہ اسے جہاں تک جانا تھا وہاں تک وہ نہیں جاتی تھیں۔

کرلا پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ لوکل ٹرینیں بھی شروع ہو گئی ہیں۔

اسے جلد ہی ممبرا کے لیے لوکل مل گئی۔

سات بجے کے قریب جب اس نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو آنکھوں میں زندگی کی چمک اُبھر آئی۔

اُس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا لیا۔

عذاب کا ایک دن گذر چکا تھا۔

عذاب کا وہ دن بھی ان دنوں میں سے ایک دن بن گیا تھا جو وقتاً فوقتاً سیاست کے خدا اس جیسے لوگوں پر مسلّط کرتے ہیں۔

برج پریمی

مارتنڈ
سوریہ مندر

سوریہ پوجا نہایت قدیم ہے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ بہت سے مذاہب کا سرچشمہ سوریہ پوجا ہی ہے۔ ویدک آریہ زندگی کے رجائی پہلوؤں کے عاشق تھے۔ اس لیے سورج کی پوجا ان کی عبادت کا ایک فعال پہلو تھا۔ رگ وید میں بعض مقامات پر سورج کو واحد دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ ہندو تثلیث (برہما، وشنو، مہیش) کو سوریہ دیوتا میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے تین جسموں والا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اس کی تین طاقتوں کی علامت بھی ہے۔ اپنی تولیدی حدت سے ہیئت دینے والا، روشنی سے تحفظ فراہم کرنے والا اور اپنی آتشیں آگ سے تباہ کرنے والا۔ ویدوں کا بہت ہی اہم منتر "گایتری" سورج کی طرف منسوب ہے اور اسی کی طرف مخاطب ہے۔ سورج بنسی خاندان اپنا تعلق سورج سے ہی ظاہر کرتا ہے۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو خصوصی طور پر سورج پوجا کرتا ہے۔ اور اسے دیوتا تصور کرتا ہے۔ وشنویوں اور شیویوں کی طرح یہ طبقہ سوریہ پت کہلاتا ہے۔

علم و فن کے مختلف شعبوں میں اس زبردست قوت کو مختلف رنگ روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ مصوری میں اسے ایک گہرے سیاہ فام انسانی پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسا انسانی پیکر جس کے جسم پر تین آنکھیں اور چار بازو ہیں اسے سات گھوڑوں والے رتھ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ یہ سات گھوڑے ہفتے کے سات دنوں کی علامت ہیں۔ اس کا رتھ بان اُرن ہے۔ جس کے معنی طلوع صبح کے ہیں۔

ہندوستان میں بہت کم سوریہ مندر ہیں۔ اس سلسلے کے اہم مندر کونارک (اڑیسہ) اور موڈھیرا (گجرات) میں ہیں۔ کشمیر کے مارتنڈ مندر کا شمار انھی اہم مندروں میں ہوتا ہے، جو اپنی قدامت، اپنی عظمت، اور اپنے پرشکوہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ تاریخی شہادتوں کے مطابق یہ مندر مہاراجہ للتادتیہ مکتاپیڈا کے عہد میں آٹھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں سورج پوجا اس سے قبل ہوتی تھی۔ نیل مت پوران کے مطالعے سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ سورج پوجا کا رواج زمانۂ قدیم میں ایران سے آیا تھا، جیسا بعض عالموں کا خیال ہے۔ اس سے اس بات کی بھی توثیق ہوتی ہے کہ سورج پوجا کشمیر میں قدیم ہے اور اس کا چلن آٹھویں صدی سے بہت پہلے تھا۔

مارتنڈ ــــ یعنی سورج، ہندو اساطیر کے مطابق، وشنو کا ایک روپ ہے۔ کشمیر کا مارتنڈ مندر، سوریہ مندروں کے حلقے کی ایک اہم کڑی ہے اور زمانۂ قدیم سے ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب اس کی حیثیت صرف تاریخی رہ گئی ہے۔ تیرتھ یاترا کرنے والے اب مارتنڈ کے بجائے مٹن کے متبرک چشمے پر جاتے ہیں جو مارتنڈ سے پانچ چھ کلومیٹر نشیب میں ہے اور اب مارتنڈ کہلاتا ہے لیکن تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے متوالے اصلی مارتنڈ کو دیکھنے اور اس کے بڑے بڑے پتھروں اور ٹوٹے ہوئے در و بام کی خاموش گفتگو سے آج بھی آسودگی پانے کے لیے وہاں جاتے ہیں اور ذہن کے بیابانوں میں ایک عجیب اور بے نام سی سرسراہٹ لے کر لوٹتے ہیں۔

مارتنڈ ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ فنِ تعمیر کا ایک دیو ہیکل نمونہ۔ جیمز گوسن اسے فنِ تعمیر کا شیر قرار دیتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں کشمیر میں کئی وشنو مندر تعمیر ہوئے۔ لیکن مارتنڈ غالباً واحد مندر ہے۔ جو سوریہ (سورج) پوجا کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ جہاں مندر میں کڑی عبادت کے لیے کئی حجرے بھی بنائے گئے تھے۔ جن کے آثار اب تک موجود ہیں۔

مارتنڈ موجودہ مٹن (اننت ناگ) سے جسے بھون اور مارتنڈ بھی کہا جاتا ہے پانچ چھ کلومیٹر مشرق میں واقع ایک بلند مقام پر ہے۔ یہاں سے وادی کے اطراف میں دُور دُور تک نظر جاتی ہے۔ یہ مندر پُرشکوہ تعمیر کا ایک انوکھا اور حیرت زا نمونہ ہے۔ اس مندر کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ یہ کافی بلندی

ریڈر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۰۰۰۶ (کشمیر)

مارتنڈ کے آثار —— ذرا فاصلے سے (تصویر بشکریہ ظہیر اختر)

پر واقع ہے۔ اغلب ہے کہ یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ اسی بلندی کے باعث اسے جیمز فرگوسن "سنسان جلال" والا مندر بھی کہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس مندر کا جلال کیسا رہا ہوگا اس کا اندازہ اس وقت بھی ہوتا ہے۔ آج بھی اہلِ نظر اور آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے سیلانی اِن کھنڈروں کے قطار اندر قطار ستونوں اور شرایدِ زمانہ سے گھسے ہوئے پتّھروں میں تراشی ہوئی مورتیاں دیکھ کر ایک دِل ہلا دینے والی کیفیت کا احساس کرتے ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ کسی زبردست بھونچال کے باعث مندر کی عمارتیں گری ہیں۔

عمارت کے اُوپر کوئی چھت نہیں ہے۔ بیرن ہوگل[1] نے جب ان کھنڈروں کو دیکھا تھا تو اُسے شبہ ہوا تھا کہ غالباً یہ عمارت بے چھت کی تھی۔ اگرچہ چھت کے آثار کہیں پر بھی نظر نہیں آتے لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ اس عمارت پر چوبی چھت رہی ہوگی۔ اگر چھت پتّھر کی ہوتی تو ان پتھروں کے آثار کہیں نہ کہیں نظر آتے۔ کشمیر میں عام طور سے چوبی طرزِ تعمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت بعد کی چیز ہے لیکن تواریخی شواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بہت پہلے بودھ عہد میں چوبی طرزِ تعمیر موجود تھا۔ اور بودھ چیتیہ میں چوبی چھتوں کا استعمال ہوتا تھا۔

ذکر ہو چکا ہے کہ مارتنڈ کا مندر کشمیر کے مشہور حکمراں مہاراجہ للتادتیہ مکتاپیڈا (۶۹۵ء —— ۷۳۱ء) نے بنوایا تھا۔ للتادتیہ تاریخ کشمیر میں ایک بڑے معمار بادشاہ کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ اس نے نہ صرف کشمیر میں بلکہ کشمیر سے باہر بھی کافی تعداد میں مندر بنوائے لیکن بعض عالموں کا خیال ہے کہ مارتنڈ کا مندر للتادتیہ کا تعمیر کروایا ہوا نہیں۔ لیفٹیننٹ کول کا خیال ہے کہ سورج پوجا سے منسوب یہ مندر للتادتیہ سے بہت پہلے غالباً سمدھی آریہ راجا (۳۵ ق۔م) نے تعمیر کروایا تھا، جو خود شِو کے نشان (ترشول) کا زبردست پجاری تھا۔ فرانس ینگ ہسبنڈ کے مطابق اس مندر پر یونانی عبادت گاہوں کی شان کا شبہ ہوتا ہے۔ جنرل کنگھم بھی اس پر یونانی فنِ تعمیر کے گہرے اثرات کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس کو سوریہ (سورج) مندر ہی قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے خیال کی توثیق اس بات سے کرتا ہے کہ اس مندر کا محلِ وقوع دھوپ کی فضا کے لیے مناسب تھا۔ آر۔ سی۔ کاک اس مندر پر بودھ فنِ تعمیر کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں راج ترنگنی بھی اس مندر کی تعمیر کا سہرا للتادتیہ کے سر باندھتی ہے۔ کلہن واضح الفاظ میں "چوتھے ترنگ" میں لکھتا ہے کہ مارتنڈ کا شان دار مندر اور اس کے پتّھر کی بڑی دیواریں اس آزاد خیال بادشاہ نے ایک رفیع الشان احاطے (پرسادنتر) میں بنوائیں اور اس کا قصبہ انگوروں سے لدا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر اس مندر کی تعمیر ۲۲۳ بعدِ مسیح کے آس پاس بتائی جاتی ہے جب کشمیر پر راجہ رانادتیہ کی حکومت تھی[2]۔ اور اس کی دوسری ملحقہ عمارتیں رانی امرت پربھا نے بنوائی تھیں۔ پنڈت آنند کول بامزی بھی شبہے کے ساتھ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ذہن پر شکوک اور شبہے کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ اس افراط و تفریط میں لیفٹیننٹ کول کی بات کو حتمی طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ یہ بات البتہ تسلیم کی جا سکتی ہے کہ موجودہ مندر کے کھنڈرات جہاں موجود ہیں اس جگہ للتادتیہ کے عہد سے بہت پہلے کوئی اور مندر تعمیر ہوا تھا کیوں کہ

---

[1] بیرن چارلس ہیوگل مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں کشمیر آیا یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں افغان حکومت کے بعد سکھ عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہیوگل نے تفصیل کے ساتھ اپنی سیاحت کی روداد قلم بند کی ہے۔ (ب۔پ)

[2] راج ترنگنی کی تیسری ترنگ میں درج ایک اشلوک کی بنیاد پر جنرل کنگھم نے اپنے خیال کو استوار کیا ہے جسے جیمز فرگوسن اور سر ارل سٹاین رد کرتے ہیں۔ (ب۔پ)

موجودہ مندر کی نیو کے ساتھ ساتھ دوسری پرانی نیو بھی موجود ہے۔

مارتنڈ ڈورک گاندھارا طرزِ تعمیر کی دوسری منزل کا[1] ایک نفیس اور عمدہ نمونہ ہے۔ یہ فن یونانیوں سے لیا گیا اور اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلی لائی گئی۔ مندر ۲۲۰ فٹ لمبا اور ۱۴۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے سامنے ۸۴ ستونوں کی قطار دونوں اطراف میں ہے۔ پنڈت آنند کول بامزئی کے مطابق ۸۴ کا یہ عدد سوریہ مندر کی خاص خصوصیت ہے۔ کیوں کہ یہ راس چکر (ZODIAC) کی علامتوں اور ہفتے کے سات دنوں کی کل تعداد کے برابر ہے۔

مارتنڈ ازمنہ وسطیٰ کے بیشتر مندروں کی طرح ایک مرکزی عمارت اور ایک وسیع وعریض احاطے پر مشتمل ہے۔ وسطی مندر درمیان میں واقع ہوا ہوگا۔ آر۔ سی۔ کاک کے مطابق وسطی مندر ۶۳ فٹ لمبا اور ۳۶ فٹ چوڑا تھا اور دروازے کے پاس اس کی چوڑائی ۲۷ فٹ تھی اور مندر ۶۰ فٹ اور ۳۸ فٹ چوڑا تھا۔ اس کی بلندی بھی ۶۰ فٹ رہی ہوگی۔ یہ تین حصوں پر مشتمل تھا:

(۱) سب سے باہر کا حصّہ: اردھمان داپہیہ یا نصف مندر

(۲) وسطی حصّہ: انترالا یا وسطی مندر

(۳) اندرونی حصّہ: گربھ گرہہ یا عمارت کا رحم

تقریباً ۴۰ فٹ بلند یہ مندر ایک بڑے پتھر پر تعمیر ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ان ستونوں کی قطار ہے جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ ستونوں کے ساتھ دائیں بائیں پتیا کرنے کے لیے حجرے تھے۔ مندر کے کھنڈر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر سیدھی سادی تھی لیکن اس میں فنِ تعمیر کی خاص ہنرمندی اور مہارت کو دخل تھا۔ مرکزی مندر میں اردگرد پتھروں

مارتنڈ — بیرونی حصہ

پر مورتیاں کندہ کی گئی تھیں جن کی گھسی ہوئی شبیہیں آج بھی زبانِ حال سے اپنی گزشتہ عظمت کی داستان دہراتی ہیں۔ یہی شبیہہ کاری مندر کے بنیادی ستونوں کا امتیاز بھی ہے۔ مندر کا مرکزی حصّہ کافی پرشکوہ ہے۔ اس کی چار دیواری ایک مستطیل کی شکل میں ہے جس کے گرد ایک برآمدہ پھیلا ہوا ہے۔

مندر کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک اور مستطیل چار دیواری ہے۔ جہاں تین دروازوں کی جگہ موجود ہے اور اب کھنڈروں میں بدل چکی ہے۔ دروازے چونے کے پتھروں سے بنے ہیں جن کی لمبائی ۶ یا ۸ فٹ ہوگی۔ ہر ایک دروازہ ۹ فٹ کا ہوگا۔ اس بات کو دیکھ کر آج عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ یہ سنگلاخ اور دیوہیکل پتھر اس قدر بلندی پر کس طرح پہنچائے گئے ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کشمیر کے لوگ اس زمانے میں جرِ ثقیل کے استعمال سے واقف تھے۔ جس کے ذریعے یہ بڑے بڑے پتھر ان اُونچائیوں پر پہنچائے جا سکے۔ اُوپر مندر کے

[1] ڈورک طرزِ تعمیر کئی منزلوں میں کشمیر میں پہنچا تھا اور ہر منزل میں کئی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ (ب۔پ)

تیسرے اور اندرونی حصّے کا ذکر ہوا جو گربھ گرہ کہلاتا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سورج کی مورتی نصب تھی۔ اب یہ مورتی یہاں نہیں ہے۔ گربھ گرہ میں سادگی ہے۔ یہاں مندر کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں کوئی تراش خراش نظر نہیں آتی۔ یہ حصّہ تین اطراف سے بند ہے۔ اِدھر اُدھر مورتیاں یا تو ٹوٹی ہوئی ہیں یا گھس چکی ہیں۔ دائیں طرف احاطے میں شاردا رسم الخط میں ایک کتبہ کندہ ہے۔ پتھر کی بڑی سِل پر یہ کندہ حروف اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہی رسم الخط مروّج تھا۔ انترالا میں کئی شبیہیں نظر آتی ہیں۔ پاس ہی گنگا (دیوی) کی مورتی ہے جو اپنے واہن (سواری) مگر مچھ پر کھڑی ہے جو اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دائیں طرف ایک عورت اس کے سر پر ایک چھتر تھامے ہے۔ اور بائیں طرف ایک اور چھتر بردار ہے۔ گنگا کے دائیں ہاتھ میں کمل پھول ہے اور بائیں ہاتھ میں پانی کا گھڑا ہے۔ انترالا کے سامنے جمنا (دیوی) اپنے واہن (سواری) کچھوے پر سوار ہے۔ اُوپر شمالی دیوار پر گاندھرو محوِ پرواز ہیں۔ دالان میں مغرب کی طرف وشنو کی مورتی ہے۔ جو فرگوسن کے مطابق سانپ کا پھن ہے لیکن آر۔ سی۔ کاک اور دوسرے ماہرین کے مطابق یہ چھوٹے تاج کے حصّے ہیں۔ ساری مورتیاں تین چہرے والے وشنو کی مورتیاں ہیں۔ مورتیوں کے بائیں طرف کا چہرہ "وراہ" اور دائیں طرف کا چہرہ "نرسمہا" کا ہے۔ یہ دونوں وشنو کے آٹھ بازو والے اوتار ہیں۔ دالانوں میں دیواروں پر دیوتاؤں کی شبیہیں ہیں جو اب گھس گئی ہیں اور ان کی شناخت کرنا ناممکن ہے ایک طرف بلندی پر سوریہ کے رتھ بان ارُن کی شبیہہ کندہ ہے جس کے رتھ میں سات گھوڑے جُتے ہوئے ہیں اور جن کی لگام ارُن کے ہاتھ میں ہے۔ مارتنڈ کے آس پاس جو کھدائی کی گئی ہے

اس سے ماہرین اور خاص طور سے جنرل کنگھم نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ چار دیواری اور احاطہ جس کے اندر مندر کی عمارتیں واقع تھیں' پانی سے بھرا ہوا تھا اور سطحِ آب ستونوں کی بنیاد سے اُوپر ایک فٹ تھی۔ اور مندر کے اندر پتھروں سے بنی ہوئی اُونچی روشیں تھیں جو مندر کو جانے والی سیڑھیوں کو ملاتی تھیں۔ اس احاطے کے باہر دروازے کے شمالی اطراف میں ایک نہر تھی جو زاید پانی کا اخراج کرتی تھی۔ اس سے احاطے کے اندر سطحِ آب برابر رہتی تھی۔

جنرل کنگھم کا خیال ہے کہ مندر کو پانی کے اندر تعمیر کرنے کا سبب صرف یہ تھا کہ مندر ناگوں کی حفاظت میں رکھ دیا جائے جو انسانی جسموں اور سانپوں کی دُموں والے دیوتا تھے اور جن کی کشمیر میں صدیوں تک پوجا ہوتی تھی۔ لیکن اس کلیے کو حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مندر وشنو یا سوریہ سے منسوب تھا اور بعض شبیہوں پر سانپ کا سایہ کیا ہوا پھن اس بات پر دال ہے کہ یہ سوریہ یا وشنو کی مورتی ہے۔

مندر کا احاطہ بارہا قلعے اور جائے پناہ کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے اور راج ترنگنی کے مطابق راجا کلش (۵۰۷۔۱۳۷) نے پرائشچت کے لیے اس میں پناہ لی تھی اور سونے کی مورتی نصب کی تھی۔ فرگوسن راجا جے سمہا (۱۱۴۹۔۱۱۲۸) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے بھی اسے قلعے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

مارتنڈ پتھروں کی معمارکاری کا ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ اور اس بات کے باوصف کہ یہ ڈورک طرزِ تعمیر کا ایک حسین و جمیل نمونہ ہے اور کشمیریوں نے اسے یونان کے فنِ تعمیر سے اخذ کیا تھا اور اس میں تصرف کرکے اسے اپنے طرز میں ڈھالا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ مندر اپنی پُرشکوہ طرزِ تعمیر اور جسامت کے اعتبار سے شمالی ہندوستان کے بڑے بڑے مندروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے متعدّد حصّوں کو جون راج کے مطابق سکندر بت شکن نے چودھویں صدی کے اواخر میں منہدم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سخت جان مندر کو مکمّل طور سے تباہ نہ کیا جاسکا۔ مارتنڈ آج بھی اپنی نیم منہدم شکل و صورت میں بلاشبہ کشمیر کے فنِ تعمیر کا ایک معتبر اور قابلِ اعتنا نمونہ ہے۔

نظم

وہ کون ہے ؟

وہ کون ہے ؟
جو شب و روز یکّہ و تنہا
کسی نگر میں،
سرِ رہگذار،
یا گھر میں
ملا تو صورتِ صورت گراں خموش ملا
نہ جذب و شوق کی دہلیز پر کوئی دستک
نہ انتظار کے موسم کی سرخوشی کا فریب
نہ کھنکھناتے ہوئے قہقہوں کی آہٹ سے
نگاہ و دل کے دریچوں پہ روشنی کی لکیر
سمن رخوں کی اداؤں میں دلبری نہ کشش
نہ حسنِ ذات کی عظمت کا ترجماں کوئی
نہ فکر و فن کے محاسن کا رازداں کوئی
کوئی جلیس، نہ ہمدم، نہ غم شناس کوئی
نہ انتشار، نہ شورش، نہ کوئی ہنگامہ
وہ اپنے گھر ہی سہی
ہے مگر وطن سے دُور
وہ ایک پھول سہی
ہے مگر چمن سے دُور

اعجاز اعظمی

۲۹۸، گاؤں کامراوان، پوسٹ نردھا، ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)

دوہے

روی بھاردواج

چلیں غموں کی آندھیاں چڑھی گگن پر ریت
بوند بوند کے واسطے ترسا من کا کھیت

اپنا رونا کس لیے روتا ہے دن رات
ہونٹوں سے نکلی روئی ہوئی پرائی بات

ہم نے کاٹے عمر بھر یوں نوکیلے جھاڑ
جیسے تنہا تیتری کھودے کوئی پہاڑ

آنکھوں میں ویرانیاں سینے میں طوفان
جیون کی دشواریاں کیسے ہوں آسان

ماضی کے بکھرے کھنڈر دیتے ہیں آواز
لوگو! ہم سے پوچھ لو مستقبل کا راز

۲۴۳/۱۲، جواہر نگر، نئی ریلوے روڈ گوڑگاؤں (ہریانہ)

عابدہ بیگم

بیب کی ماں

خدا گواہ ہے میں ماضی پرست نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں بعض شخصیتیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ آپ اُنھیں لاکھ بھولنا چاہیں لیکن وہ آپ کے ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت حبیب کی اماں تھیں جو دلّی کی پُر بہار شخصیتوں میں سے ایک تھیں۔ خود تو غم کا مجسمہ تھیں لیکن دوسروں کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ آئیے آپ کو ان سے ملوادوں۔

گورا رنگ گداز جسم، درمیانہ قد، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں، کھچڑی بال، دانت ندارد، چکن کا کرتا پہنے گلے میں پان کی گلوری دبائے وہ جب بھی آتیں، اپنے دہانے کے دونوں طرف سے پان کو ہاتھ سے سمیٹنے کی کوشش کرتیں اور اس کوشش میں منہ کو ایسا سکیڑتیں مانو بھوپالی بٹوے کو دونوں طرف سے ڈوری کھینچ کر بند کر دیا گیا ہو۔ سلام کے بعد ہی اپنی مشکلات کا بیان شروع کر دیتیں۔ ہماری امّی کو دلہن کہتیں۔ کیونکہ وہ عمر میں امی سے واقعی بہت بڑی تھیں، دلہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتیں۔

"بس دلہن کیا بتاؤں اللہ عزت و آبرو سے خاتمہ کردے اب کیا جینا اور کیا مرنا"۔ کبھی بہو کی طرف اشارہ کر کے کہتیں۔ "اس منگی نے تو مجھے آٹھ آٹھ آنسو رُلا رکھا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ دلہن اس مہنگائی کے زمانے میں اس کے لیے ایک کلو گوشت کہاں سے لاؤں جو اس نواب زادی کی سمجھ میں آئے۔ ہنڈیا پکاتے ہوئے کہتی ہے "لے چار بوٹیاں ناچ رہی ہیں"۔ اس کی اماں کے یہاں پکتا ہی کب تھا۔ اسے تو بازار کا کھانے کی عادت ہے۔ اے دیکھو دلہن مجھ سے بڑے کا گوشت تو کھایا نہیں جاتا۔ ایمان سے سارے جسم کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اب پاؤ بھر گوشت منگاتی ہوں تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہتی ہے پتیلی میں چار بوٹیاں ناچتی ہیں۔ ایسے ننگے گھر کی ہے کمبخت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسی ہے۔ ہرگز شادی نہ کرتی۔ پھر آنسو پونچھتی ہوئی کہتیں۔ جب سے بیب کے باپ سے شادی ہوئی ہے میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ (اپنے بیٹے کو جس کا نام حبیب تھا پیار سے بیب ہی کہتیں)

میرے بڑے والے (اپنے پہلے شوہر کی طرف اشارہ کر کے کہتیں) اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انھوں نے مجھے کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ وہ تو پڑھے لکھے تھے۔ حکیم تھے۔ نہ وہ مرتے نہ میرے بھاگ پھوٹتے۔ پھر آپ ہی آپ آنسو پونچھ ڈالتیں۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھ جاتیں: چلتی ہوں چل کر دیکھوں وہ کیا کر رہی ہے بدنصیب (چھوٹی بہو کی طرف اشارہ) اور وہ چلی جاتیں اور پھر کھانا کھا کر پان منہ میں دبائے کھانے کی رپورٹ دینے چلی آتیں: دلہن دیکھنا ایسا بُرا کھانا پکایا۔ ذرا مزہ نہیں آیا۔ دیکھنا کریلے میں نے کیسے شوق سے پکوائے تھے۔ کمبخت نے ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ تمھارے یہاں سے کریلے جاتے ہیں کیسے مزے کے ہوتے ہیں۔ اے بیب کے باپ کہہ رہے تھے کہ دلہن سے کہنا کہ ایک دفعہ کریلے اور کھلادو بہت دل چاہ رہا ہے۔ اور پھر اپنا پہلا زمانہ یاد کرنے لگتیں۔ ان کے بڑے والے کیسے شریف تھے۔ انھوں نے کیا کیا عیش کرائے۔ وہ دلی کی رہنے والی تھیں۔ جب ان کے میاں کا انتقال ہوا تو ان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ بیوگی کے بعد چاروں بچوں کو لے کر اپنی خالہ کے ہاں چلی آئیں اور خالہ نے بیب کے باپ سے نکاح پڑھوا دیا۔ جو لاہور کے رہنے والے تھے۔ اور چاندی کے زیور بناتے تھے۔ چاندی والی تو وہ خود بھی تھیں۔ لیکن بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ یعنی بیب کے باپ لاہوری چاندی والے تھے جو ان کی نظر میں ان کے برابر نہ تھے۔ دوسری شادی کے بعد دو لڑکے ہوئے۔ ایک کا نام حمید اور دوسرے کا حبیب رکھا۔ لیکن وہ اس دوسری شادی سے بالکل مطمئن نہ تھیں۔ کیونکہ ان کی آمدنی کبھی ایسی نہ ہو سکی کہ بقول خود ان کے عیش کر سکتیں۔ چاروں بڑے بچوں کی شادیاں کیں اور اب تو ماشاء اللہ دونوں چھوٹے لڑکوں کی بھی شادی سے فراغت پا چکی تھیں۔ اب وہ چھوٹی بہو کے ساتھ رہ رہی تھیں جس نے بقول ان کے ان کی زندگی کو جیتے جی جہنم بنا رکھا تھا۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ ماں باپ کبھی کے مر چکے تھے۔ اسی لیے اپنے ہر دکھ کا مداوا کرنے دلہن کے پاس چلی آتیں۔ پھر آنے میں کون سے پیسے خرچ ہوتے تھے یا گھر بند کرنا پڑتا تھا۔ جب ذرا دل گھبرایا نیچے اُتر آئیں۔

دلہن کے کمرے میں کھڑکی کھلتی تھی اور کھڑکی کے پاس ہی ان کا زینہ تھا۔ جس پر سے اللہ جھوٹ نہ بلوائے وہ دن میں آٹھ آٹھ دس دس پھیرے کرتیں کبھی آٹا ختم ہو جاتا تو آٹے کی سینی اور ناپ کا ڈبہ لیے چلی آتیں۔ دلہن ذرا چار ڈبے آٹا دینا کل راشن آئے گا تو دے دوں گی۔ کبھی تھوڑی سی ہلدی کبھی مرچ۔ گھرداری کا سامان کمبخت روز کچھ نہ کچھ ختم ہو جاتا۔ اور پھر ان کا واحد سہارا دلہن ہوتیں۔ اس بات پر بیب کے باپ

ایف ۹/۱۱، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔ غصّے کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہ تو پیاری باتیں کرتیں تب بھی بیب کے باپ لڑ پڑتے جب کبھی کسی پڑوسی مرد کی تعریف میں دو چار جملے کہتیں کہ بس بیب کے باپ کا پارہ آسمان پر پہنچ جاتا۔ اب خرافات بیان کرنا بھی مشکل تھی۔ ان کے نزدیک شرافت کا ایک ہی معیار تھا کہ فلاں مرد اپنی بیوی کو بڑی فراغت سے رکھتا ہے۔ اس پر بیب کے باپ جل کر کہتے کہ: "چلی جا سالی تو بھی اُسی کے پاس"۔ اس پر بات بڑھ جاتی اور وہ ماں باپ سے لے کر اپنے بڑے والے تک سب کو ہی یاد کر ڈالتیں اور سینہ پیٹتے ہوئے کہتیں "ہائے ابراہیم کے باپ تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے"۔ (ابراہیم سب سے بڑے بیٹے کا نام تھا) دونوں بہویں خوب لطف اٹھاتیں کہ ساس پر بھی لعن طعن کرنے والا ہے۔ کیونکہ چھوٹی بہو جو بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور بقول ان کے تن کے تین کپڑوں کے علاوہ جہیز میں کچھ لے کر نہیں آئی تھی۔ اس کو کیا حق تھا گھر کی کسی کمی کی طرف احساس دلانے کا اس بات پر بہو کو طعنے دیتیں کہ اپنے باپ کے گھر سے کیا لائی تھی پانی پینے کا کٹورا بھی نہیں۔

زندگی جیسے تیسے گھسٹتی جا رہی تھی۔ اکثر بیچاری پان چھالی سے پریشان رہتیں اور دلہن نقدی سے سہارا لگا دیتیں۔ جب کبھی خوب لڑ جھگڑ کر دلہن کے پاس آتیں تو دلہن کو پورا قصہ سناتے ہوئے کہتیں "دیکھنا دلہن میں نے تو ہوں سے تو نہیں کی جاڑوں کی راتوں میں جب سب لوگ لحافوں میں دبک جاتے تو ایسے میں جیب کی اماں کی کمی محسوس ہوتی۔ آواز دی جاتی اور آواز کے ساتھ ہی حبیب کی اماں نیچے اتر آتیں۔ اور پلنگ پر لحاف میں پائوں دباتے ہوئے کوئی نہ کوئی قصہ چھیڑ دیتیں۔ بات کسی بھی موضوع پر ہو حبیب کی اماں پر ضرور ختم ہوتی۔ ایک بار سب لوگ بیٹھے ایسے ہی گپ شپ کر رہے تھے کہ میری چھوٹی پھوپھی کو شرارت سوجھی؟ بولیں اگر خدا پیسے دے تو کارچوبی چاندنیاں بچھائی جائیں وہ فوراً بولیں: اے ہمارے ابا کے یہاں ایسی خوبصورت کارچوبی چاندنیاں بچھی تھیں کہ کیا بتاؤں۔ گندگی سے اُنھیں بہت نفرت تھی۔ وہ کہتیں: دلہن میں گندگی سے بہت گھبراتی ہوں۔ میں تو طہارت بھی ہاتھ پر کپڑا باندھ کر کرتی ہوں بچوں کا ذکر چھڑتا تو کہتیں: ہاں یہی بات ہے ہم نے اپنے بچوں کو کبھی نہیں رلایا۔ میں تو پاخانے میں بھی بچہ کو ساتھ لے کر جاتی تھی۔ آج کل والیاں تو بچوں کا رُلا رُلا کر خون کرتی ہیں۔

کہاں تک ان کی باتیں بتاؤں وہ کون سی ایسی بات تھی جو ان پر نہ گذری ہو۔ ان کی صبح ہمیشہ گیارہ بجے ہوئی اس طرح۔ اس طرح رات بھی بارہ بجے سے پہلے نہیں ہو سکتی تھی۔ رات کے بارہ بجے جب وہ بیب کے باپ کو خطاب کر کے کہتیں: اے جی کھانا زلدی (جلدی) کھالو تو ہمیں سوئے ہوئے کئی گھنٹے ہو جاتے ہیں— زندگی جیسے تیسے گذر رہی تھی۔ کیونکہ بقول ان کے گذارہ تو کرنا ہی تھا۔ لیکن خدا کو یہ بھی منظور نہ ہوا اور ہمیشہ ہی لڑنے جھگڑنے والے بیب کے باپ بغیر لڑائی جھگڑے ہمیشہ کے لیے ان سے روٹھ کر چلے گئے۔ ایک بار وہ پھر تنہا ہو گئیں۔ کئی دن تک آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہا۔ جب کچھ دن بعد اس کا دل ٹھکانے ہوا تو وہ نیچے اتریں اور دلہن کو خطاب کر کے بولیں اے دلہن بیب کے باپ تو ایسے سخت دل نکلے کہ زندگی بھر تو لڑتے رہے۔ لیکن مرنے کے بعد ایک دفعہ بھی خواب میں نہیں آئے۔ میرے بڑے والے تو دیکھنا مرنے کے آٹھ دن بعد ہی خواب میں آ کر کہہ گئے تھے کہ ابراہیم کی ماں تم پریشان نہ ہونا۔ دوسرا نکاح کر لینا۔

بیب کے باپ کے مرنے کے بعد وہ اداس رہنے لگیں۔ اب لڑنے کی طاقت جیسے ختم ہو چکی تھی۔ بہوؤں سے کچھ نہ کہتیں خاموش لیٹی رہتیں۔ دلہن کے پاس آتیں تو سوائے مالی پریشانی کے اور کچھ بیان نہ کرتیں۔ پوچھنے پر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں: اب سر کا تاج تو چھن گیا اب تو محتاجگی کی زندگی ہے۔ بیب کے باپ کے مرنے کے چند ماہ بعد ہی ایک صبح وہ بھی خاموشی سے اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اب اللہ ہی جانے وہ بیب کے باپ کے پاس گئیں یا پھر اپنے بڑے والوں کے پاس۔

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

ادارہ

توقیر غازیپوری

افواہ

جھگڑے کی نوعیت کوئی الگ طرح کی نہ تھی۔ اسی طرح کے جھگڑے آج کل عام طور پر ہو رہے ہیں۔ کہیں مندر کا جھگڑا کہیں مسجد کے لیے فساد، کہیں مذہب کے لیے لڑائی اور کہیں قبرستان کے لیے تکرار، یہ بھی انھیں جھگڑوں میں سے ایک تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ سڑک کے کنارے چند اینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس جگہ کو مسلمان اپنے کسی بزرگ کا مزار بتا رہے تھے۔ اور بہت ساری کہانیاں اس بزرگ شخص سے منسوب کر رہے تھے۔ ہندو اسے ہنومان چبوترہ کہہ رہے تھے۔ اور وہاں پر ہنومان مندر بنوانا چاہتے تھے۔ اسی بات کو لے کر مار پیٹ ہو گئی اور معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ اسی دوران پولیس والوں نے ایک فرقے کے رہنماؤں سے مل کر انھیں قبضہ دلانے کی سازش کی، جس کے خلاف دوسرے فرقے کے لوگوں نے احتجاج کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات بڑھ گئی اور یہ معاملہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر گیا۔ دھیرے دھیرے یہ آگ قریب کے قصبوں اور شہروں میں بھی پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے حکام کو کرفیو لگانا پڑا۔ تب کہیں جاکر فساد کی لہر کم ہوئی۔ مگر آگ ابھی اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ جائے واردات پر پولیس کا پہرا تھا۔ اور وہ جگہ اپنی پہلی والی حالت پر ہی تھی۔ ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہم کئی روز سے اس شہر میں رکے ہوئے تھے۔ یہ شہر جائے واردات سے قریب ہی تھا۔ یہاں کچھ زیادہ ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ جب فساد کی لہر کچھ کم ہوئی تو ہم وہاں سے چلے لیکن ڈر رہے تھے۔ کیونکہ ہم کو اسی راستے سے ہو کر گذرنا تھا۔ جہاں جھگڑا ہوا تھا۔ جب وہاں سے گزرنے لگے تو دیکھا کہ پولیس کا پہرا ہے اور کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہم نے سڑک کے ایک کنارے گاڑی کھڑی کی اور اتر کر اس جگہ کو دیکھنے کے لیے پولیس کے ایک افسر سے اجازت چاہی۔ پولیس افسر نے ہمیں شریف آدمی سمجھ کر اپنے ساتھ لے جا کر وہ جگہ دکھائی جہاں چند اینٹیں ابھی بھی رکھی ہوئی تھیں۔

○

میرا ڈرائیور میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ لمبی مسافت پر بھی میں اکیلا نکل پڑتا ہوں۔ اس دو مہینے کی سیاحت میں بھی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے رفیق تھے۔ ہم لوگ آگرہ سے دہلی کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ گاڑی کو دھکے لگا کر سڑک کے ایک کنارے کیا گیا۔ وہ جگہ شہر سے دس کلومیٹر کی دوری پر تھی۔ اس لیے بہت جلدی میں کوئی میکینک بھی نہیں مل سکتا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کو جیک پر اٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ گاڑی میں کچھ ایسی خرابی تھی کہ پوری گاڑی کو اٹھانا تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی جیک تھا۔ اس سنسان جگہ پر دوسری کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس پر گاڑی کو اٹھایا جا سکے۔ ہم لوگ بہت پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ تبھی اُدھر سے ایک ٹرک کا گذر ہوا جس پر اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔ ہم نے ہاتھ دے کر ٹرک کو روکا۔ اور اپنی پریشانی بتائی اس نے ہمارے اوپر مہربانی کی اور دس بارہ اینٹیں دے دیں۔ میرے ڈرائیور نے آگے کی طرف ان اینٹوں کو لگایا اور پیچھے کی طرف اپنے جیک کو۔ اس نے گاڑی کے نیچے گھس کر دیکھا۔ گاڑی میں کوئی بہت بڑی خرابی نہیں تھی، اس نے اُسے خود ہی ٹھیک کر لیا۔ پھر ہم وہاں سے چل دیے تھے۔

ہم دو ماہ بعد اب اپنی سیاحت پوری کر کے لوٹ رہے تھے کہ فساد کی وجہ سے ہمیں کئی روز تک اس شہر میں رک جانا پڑا۔ پھر وہاں سے چل کر جائے واردات پہ پہنچے اور اس جگہ کو دیکھا جس کے لیے جھگڑا ہوا تھا۔

جب میں نے اس جگہ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ کیونکہ اسی جگہ پر میری گاڑی خراب ہوئی تھی اور جھگڑے کی وجہ وہی دس بارہ اینٹیں تھیں جس سے ہم نے جیک کا کام لیا تھا۔ ابھی تک ان اینٹوں پر تیل لگا ہوا تھا جو میری گاڑی سے ٹپکا تھا۔

⬡

بی۔ ڈی۔ ڈگری کالج رام گڑھ۔ ضلع روہتاس (بہار)

سیّد رونق رضا

جو باقی رہ گئے ہیں معرکے اب سر نہیں ہوں گے
بہاریں اب کے آئیں بھی تو شاید پر نہیں ہوں گے

ہر اک منظر کو یوں آنکھوں میں رکھتا جا رہا ہوں میں
کہ آنکھیں بھی رہیں باقی تو کل منظر نہیں ہوں گے

وہ شاخیں بے مکیں ہو کر دعا مانگیں گی رو رو کر
پرندے شام کو جب اپنی شاخوں پر نہیں ہوں گے

میں اپنی بند مٹھی پر ہی خوش ہوں، جانتا ہوں میں
مری مٹھی میں جو بھی ہو مگر گوہر نہیں ہوں گے

ہوائیں لے اڑیں گی آنکھ سے آنسو کا ہر قطرہ
بہت روئیں گے ہم آنکھوں کے گوشے تر نہیں ہوں گے

تارین بنگلی، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱

پیار میں جسم کی شرکت سے بہلتا جاؤں
قرب کی آنچ ملے تو میں پگھلتا جاؤں
اس کے سینے میں بھی ہے ایک تڑپ میرے لیے
اور میں بھی اسے پانے کو مچلتا جاؤں
اور اب اس کے سوا سوچنا کیا ہے مجھ کو
ٹھوکریں کھاؤں زمانے کی سنبھلتا جاؤں
دھوپ بن کر ترے آنگن میں رکے دیر ہوئی
شام ہونے لگی دیوار سے ڈھلتا جاؤں
اک نئی طرز کا پیکر تو بنالوں پہلے
خود بدلنا ہے تو سانچے کو بدلتا جاؤں
آہ نکلے مرے ہونٹوں سے نہ سینے سے دھواں
سرخ انگاروں کو بے خوف نگلتا جاؤں
جاں بلب شہر کا اب چاہے کلیجہ جل جائے
میں تو چمنی سے دھواں بن کے نکلتا جاؤں

ف۔س۔ اعجاز

ماہنامہ انشاء، ۱۹ اے کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

مرتضیٰ علی شاد

پیاس کچھ اور بڑھے تو یہ تماشہ دیکھوں
ہر بنِ مو سے ٹپکتا ہوا دریا دیکھوں

پھر کسی زخمِ تمنّا پہ نمک پاشی ہو
پھر رگ و پے میں ابلتا ہوا لاوا دیکھوں

خود سے بھاگوں تو ملیں کرب و بلا کے منظر
خود میں اتروں تو سلگتا ہوا صحرا دیکھوں

تجھ سے بچھڑے ہوئے مدت ہوئی لیکن ہر شب
خواب دہلیز پہ رکھوں، ترا رستا دیکھوں

لوٹ آیا ہے گپھاؤں کا زمانہ شاید
بھیڑ میں رہ کے ہر اک شخص کو تنہا دیکھوں

پروفیسر آف اکنامکس، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال

پرویز یداللہ مہدی

میں تلسی تیرے فلیٹ کی

ایک زمانہ تھا جب گھر کے اجزائے ترکیبی دالان، پیش دالان، دیوان خانے، باورچی خانے اور کئی عدد خواب گاہوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے، اس کے علاوہ ایک عدد طویل و عریض آنگن اصل کے ساتھ سود کے مصداق ہر گھر کا جزو لاینفک ہوا کرتا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ شناسا، جن کی عمر کا بڑا حصہ آنگن میں چارپائی بچھائے اس پر لوٹیں لگاتے گزرا ہے۔ اکثر فرماتے ہیں کہ بغیر آنگن کا گھر ایسے ہے جیسے بنا سہرے کا دولہا یا بنا ایندھن کا چولہا۔۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمارا بچپن بلکہ جوانی کا دور بھی جس وسیع و عریض گھر میں بیتا ہے اس کا آنگن بلا مبالغہ کسی "پلے گراونڈ" سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ کبھی ہمیں "مارننگ واک" کے لیے گھر سے باہر نکل کر سڑکیں ناپنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ علی الصبح گھر کے آنگن کے دو "راونڈ" لگالینا ہی کافی و شافی ہو جایا کرتا تھا۔ صبح کی سیر کے علاوہ لڑکپن میں گلی ڈنڈا اور اوائل جوانی میں کرکٹ اور فٹ بال جیسے میدانی کھیل بھی بفضلِ تعالیٰ آنگن میں ہی کھیل کر اپنا شوق پورا کیا کرتے۔ موسم گرما کی راتوں میں گھر کے سارے مرد آنگن میں چارپائیاں بچھا کر تپتی ہوئی گرمی میں گلابی جاڑوں کا لطف اٹھایا کرتے۔ کڑاکے کی سردیوں میں آنگن کے بیچوں بیچ رات رات بھر الاؤ جلا کر جملہ افرادِ خاندان آگ تاپتے اپنے بدن کو گرماتے بارش کے سیزن میں آنگن میں جھولے ڈال کر ایک طرف لڑکیاں ساون کے مزے لوٹتیں اور دوسری طرف آنگن میں جمع ہونے والے برسات کے پانی میں گھر کے تمام لڑکے بالے کاغذ کی کشتیاں اُتار کر ان کے تیرنے، ڈولنے اور ڈوبنے کے دل خوش کن مناظر سے محظوظ ہوا کرتے۔ ان موسمی خوش فعلیوں کے علاوہ خوشی غمی کی کوئی تقریب چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔ گھر والوں کے لیے کبھی پریشانی کا باعث نہ بنتی، کیونکہ زائد مہمانوں کے عارضی قیام و طعام کا معقول اور فی الفور بندوبست وسیع آنگن میں شامیانے لگا کر چٹکیوں میں ہو جایا کرتا۔ غرض یہ کہ ماضی میں ہر گھر کا آنگن ہمہ مقصدی ہوا کرتا تھا۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے آنگن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی کہ اس میں امرود، شہتوت انار، بلکہ آم، نیم اور املی جیسے چھتنار درختوں کو پھولنے پھلنے اور پھیلنے کے پورے پورے مواقع بھی فراہم ہوا کرتے۔ مالدار اور متوسط طبقے کے آنگنوں پر تو خیر باغ بغیچوں کا گمان ہوتا ہی تھا۔ غریب غربا کے یتیم آنگنوں کے دامن بھی خالی نہیں ہوا کرتے تھے۔

یہ بھی گھاس پھوس اور خودرو پودوں سے مالا مال ہوا کرتے، اسی لیے اگلے وقتوں میں گھر خریدنا ہوتا یا کرائے پر لینا، ہر دو صورت میں گھر کی مکانیت کے ساتھ ساتھ آنگن کی وسعت پر بھی بطور خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ مکینوں کی وسعت قلبی، ذہنی کشادگی اور وسیع النظری کا اندازہ آنگن کی کشادگی سے لگایا جاتا تھا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آنگن جتنا بڑا ہوتا۔۔۔ مکینوں کے دل بھی اتنے ہی بڑے ہوا کرتے۔ لیکن آج سارے پیمانے یکسر بدل گئے ہیں۔ اب آنگن کی وسعت سے صاحبِ خانہ کی کشادہ دلی کا اندازہ نہیں لگایا جاتا بلکہ بینک بیلنس کے اعداد و شمار، تجوری کے حجم اور اس کے پھیلاؤ کی مناسبت سے آدمی چھوٹا یا بڑا کہلاتا ہے۔

خدا بھلا کرے بڑھتی ہوئی آبادی کا، جوں جوں کنبہ بڑھتا گیا، گھروں کا رقبہ گھٹتا چلا گیا۔ پہلے تو لمبے چوڑے آنگن سکڑ کر انگنائی میں ڈھلے، یعنی کہ "ظرفِ انگنائے غزل بقدرِ شوق" نہیں رہے پھر یہ سمٹی ہوئی انگنائی بھی آہستہ آہستہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ اور یوں آنگن کے ساتھ اخلاق، آداب، اخوت، میل جول، بھائی چارہ، غرض ساری انسانی قدریں معاشرے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوشحالی کی جگہ مفلوک الحالی اور گھروں کی جگہ فلیٹوں نے اور کوارٹروں عرف کھولیوں نے لے لی۔ فلیٹ یا کوارٹر، دراصل آنگن سے محروم اُس محدود چار دیواری کا مہذب نام ہے۔ جس میں ایک کنبے کے جملہ افراد نہ صرف زندگی کے دن کاٹتے ہیں بلکہ ایک دوسرے شخص کی آزادی کو بھی کاٹ کر رکھ دیتے ہیں ہندی میں ایک کہاوت ہے، بوڑھا بالا ایک سمان، اس کہاوت کی جیتی جاگتی بلکہ چلتی پھرتی تصویریں دیکھنا ہوں تو کسی فلیٹ یا کوارٹر میں کسی بہانے، کچھ دیر کے لیے چلے جائیے انشاء اللہ وہاں آپ کو بچے وقت سے پہلے بالغ اور بالغ حضرات قبل از وقت نابالغ یعنی بوڑھوں کے روپ میں نظر آجائیں گے۔ اصل میں بنی نوعِ انسان کے خلاف یہ ایک منظم اور سوچی سمجھی سازش ہے۔ ان سرمایہ داروں کی جنھوں نے بڑے شہروں میں زمین کو زر اور زن سے زیادہ قیمتی بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ محض اس بات سے

پرویز یداللہ مہدی۔ ۲۱۹۔ بہرام۔ باندرہ ایسٹ: بمبئی

لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے جس زمین کی خرید و فروخت ایکڑ، بیگھہ اور مربع گز میں ہوا کرتی تھی۔ اب اس کا سودا مربع فیٹ میں ہونے لگا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زمین کی قیمت اگر اسی طرح آسمان پر چڑھتی رہی تو آئندہ چند برسوں میں زمین کے سودے مربع انچ میں ہوا کریں گے، اور کیا عجب کہ اُردو کی آئندہ نسل ظفرؔ کا یہ شعر اس طرح پڑھا کرے:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
"دو انچ" زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بڑے شہروں میں زمین کی قلت نے نہ صرف آنگن کو لقمۂ تر کی طرح ہڑپ کر لیا، بلکہ خواب گاہوں، دالانوں، دیوان خانوں، اور باورچی خانوں کی بھی اس بری طرح کانٹ چھانٹ کر ڈالی کہ اب ان کی شکل بھی پہچانی نہیں جاتی، ان پر بھی اگلے وقتوں کے معشوق کی کمر کی طرح ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کا گمان ہوتا ہے۔ جوتیوں میں دال بٹنے والا محاورہ آپ نے سنا ہوگا۔ لیکن اگر اسے حقیقت کے روپ میں دیکھنا ہو تو شہر بمبئی کے متوسط طبقے کے فلیٹ دیکھ لیجیے۔ تین ساڑھے تین سو مربع فٹ کی تنگنائی کو ہال، بیڈ روم، کچن اور باتھ روم میں اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا جو غریب خانہ اس وقت ہماری تحویل میں ہے، اس کا نقشہ یقیناً کسی ایسے آرکیٹکٹ نے بنایا ہے جو بذاتِ خود سزا یافتہ تھا یا پھر جیل کی کال کوٹھریوں کے نقشے بنانے پر مامور تھا۔ کہنے کو تو غریب خانے میں وہ تمام خانے موجود ہیں جو ایک متوسط درجے کے فلیٹ کے لیے از بس ضروری تصور کیے جاتے ہیں لیکن ان کی تنگ دامانی کا یہ عالم ہے کہ خدانخواستہ ہال میں اگر گھر کے سارے افراد بہ یک وقت اکٹھا ہو جائیں تو "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی کہاوت ہر فرد پر صادق آنے لگتی ہے۔ بیڈ روم کی تنگی کا یہ حال ہے کہ اس میں سوائے بیڈ کے ہر چیز بہ آسانی سما سکتی ہے۔ جیسے بچوں کے اسٹول... تپائی لکھنے کی چھوٹی میز وغیرہ ـــــ اب رہا بالغوں کا ساز و سامان جو اتفاق سے قدِ آدم قسم کے فرنیچر پر مشتمل ہے۔ وہ ہمارے مختصر بیڈ روم میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی لمبائی کو دو سے تقسیم نہ کر دیا جائے۔ اس مجوزہ روزگار کوارٹر میں منتقل ہونے سے پہلے جو قدِ آدم فرنیچر ہمیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا تھا، اُسے مذکورہ فلیٹ کے حدود اربعہ کے پیشِ نظر دل پر پتھر رکھ کر کباڑیے کے ہاتھوں اونے پونے داموں بیچ دینا پڑا۔ اور اس کے بدلے جو فرنیچر ہم نے خریدا، دکاندار اسے بھی قدِ آدم ہی کہتا رہا۔ حالانکہ قدِ آدم کا لیبل اس "برانڈ نیو" فرنیچر پر "پھبتی" معلوم ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب ہم نے دکاندار سے اس کی وجہ تسمیہ پوچھی تو طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا: "حضور، دنیا میں کہیں بھی قدِ آدم کا اسٹینڈرڈ یکساں نہیں۔ یہ ہر جگہ مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ کا قدِ آدم ہم بھارت واسیوں کے قدِ آدم کا ڈبل ہے۔ چینی اور جاپانی قدِ آدم ہمارے قدِ آدم کا نصف ہے۔ اور یہ جو فرنیچر آپ نے خریدا ہے۔ اصل میں یہ تاریک براعظم افریقہ کے اس خطے سے برآمد کیا گیا ہے۔ جہاں آدم خور بونے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی اکثریت، یہی قدِ آدم فرنیچر استعمال کرتی ہے۔"

خیر یہ تو ہوئی فرنیچر کی بات، خود ہم بھی اپنے بیڈ روم کے اختصار میں اس وقت تک نہیں سما سکتے جب تک کہ اپنے لحیم شحیم جغرافیے کو تہہ نہیں کر لیتے۔ ہم نے اکثر اپنی نصف بہتر کو یہ شکایت کرتے سُنا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے جیسے اور قد و قامت کے سلسلے میں اس قدر فیاضی نہ دکھائی ہوتی یا پھر ہمارے کوارٹر کا نقشہ بنانے والے آرکیٹکٹ ہی کو اتنی توفیق دی ہوتی کہ کم سے کم بیڈ روم کے طول و عرض کے معاملے میں اس قدر کاٹ کسر کا مظاہرہ نہ کرتا ـــــ اتفاق سے ہمارے کوارٹر میں ایک عدد باتھ روم بھی ہے۔ لیکن اس کے آداب نشست و برخاست، چونکہ دوسرے باتھ روموں سے یکسر مختلف ہیں اس لیے اس کے استعمال سے پہلے اس کی ترکیب استعمال سے واقفیت ضروری ہے۔ ظاہر ہے جس باتھ روم میں آدمی نہ بیٹھ کر نہا دھو سکتا ہو اور نہ کھڑے ہو کر، کیونکہ بیٹھنے پر گھٹنوں کا دیواروں سے ٹکرانے کا احتمال رہتا ہو، اور کھڑے ہونے پر سر کے چھت سے ٹکرانے کا اندیشہ، ایسی سنگین صورت حال میں باتھ روم کا صحیح استعمال صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے۔ جب ضرورت مند شخص رکوع کی حالت میں کھڑا ہو۔ سچ کہتے ہیں باتھ روم کے اختصار نے ہمیں نہ صرف رکوع کا بلکہ خشوع و خضوع کا بھی عادی بنا دیا ہے۔ اب آیئے ذرا غریب خانے بلکہ عجائب خانے کے کچن کی بھی ایک سرسری جھلک دیکھتے چلیں۔ ہمارے کچن کے مختصر رقبے اور چھوٹی بحر کے غزل کے معاملے میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یقین مانیے اس کا رقبہ اس قدر چھوٹی بحر میں عرض کیا گیا ہے کہ جملہ برتن بھانڈے و دیگر لوازماتِ کچن اس میں اسی وقت سما سکتے ہیں جب انھیں دیواروں سے لگے "CABINETS." اور مختلف کھونٹیوں کی صلیب سے ٹانگ دیا جائے گویا ہمارے کچن کی ہر شے کھڑے پیر کا روزہ رکھ کر ہی عافیت سے رہ سکتی ہے، یہاں تک کہ کچن کی ملکہ، عرف بیگم صاحبہ بھی جب تک کچن میں باادب باملاحظہ پوزیشن میں نہ کھڑی ہو جائیں

پکوان نہیں کر سکتیں۔

جن شہروں میں گھروندے، بھی گھر کہلاتے ہوں، وہاں پروان چڑھنے والی نئی نسل، آنگن کی جگہ بالکونیوں، برآمدوں، اور راہ داریوں میں کھیل کود کر بڑی ہوتی ہے۔ اس لیے نہ صرف آنگن کے لطف و لذت سے ناآشنا ہوتی ہے بلکہ اس کے تصور سے بھی محروم ہوتی ہے۔ یہاں ہم ثبوت کے طور پر اپنے قریب ترین پڑوسی قاسم بھائی رسّی والا کی سب سے چھوٹی رسّی یعنی ان کے آٹھ سالہ صاحبزادے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں برخوردار نے ہمارے سامنے یہ انکشاف کیا کہ ان کی اردو کی درسی کتاب میں جو محاورے اور کہاوتیں زیورِ طبع سے آراستہ کی گئی ہیں ان میں اکثر غلط ہیں۔ جب ہم نے ان سے مع مثال کے وضاحت طلب کی تو مسئی پھٹاک سے بولے ——

"اب یہی محاورہ دیکھیے انکل، ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔"

ہم نے مسکرا کر کہا۔ "محاورہ تو صحیح ہے برخوردار۔"

بولے۔ "غلط انکل، ایک دم غلط —— آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم ——"

ہم نے حیرت سے پوچھا —— "پھر صحیح محاورہ کیا ہے بیٹے؟"

برجستگی سے فرمایا۔ "صحیح محاورہ ہے، ناچ نہ جانے اسٹیج ٹیڑھا۔ کیونکہ ڈانسر لوگ ناچ کا پروگرام اسٹیج پر پیش کرتے ہیں نا، اس لیے محاورے میں آنگن کی جگہ اسٹیج ہونا چاہیے۔"

ہم نے برخوردار کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ بیٹے، جس زمانے میں اس محاورے کا چلن عام ہوا تب آج کی طرح کرائے کے اسٹیج ایجاد نہیں ہوئے تھے اس لیے لوگ اپنے ٹیڑھے آنگن ہی میں ناچا کرتے تھے۔"

برخوردار نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"آخر آنگن ہوتا کیسا ہے انکل؟"

ہم نے انھیں سمجھانا شروع کیا۔ "آنگن ایک دم کھلا کھلا ہوتا ہے، خوب بڑا سا، جس میں تم دوڑ سکتے ہو، کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی جیسے گیم کھیل سکتے ہو اور . . ."

برخوردار نے فوراً قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گیا انکل، آنگن کا مطلب ہے جوہو چوپاٹی ——"

برخوردار کے اس جواب نے ہمیں لاجواب کر دیا اور ہم صرف ان کا مُنہ تکتے رہ گئے۔

دراصل بمبئی کی نئی پود کا المیہ یہ ہے کہ اس کے حصے میں انفرادی آنگن کی جگہ اجتماعی آنگن آئے ہیں۔ مثلاً جنوبی بمبئی کے نونہالوں کے اجتماعی آنگن ہیں آزاد میدان، اوول میدان، چوپاٹی، جھولا میدان، وسطی بمبئی کے ہونہاروں کا اجتماعی آنگن ہے۔ شیواجی پارک، شمالی بمبئی کے بچوں کا اجتماعی آنگن ہے جوہو بیچ ——

یوں بھی انفرادی آنگن اب یا تو دور دراز دیہاتوں، پرانی نسل کے بڑے بوڑھوں کی یادداشتوں یا پھر پرانے گیتوں کے ریکارڈوں میں ہی محفوظ ہیں کچھ فلمی گیتوں کے مکھڑے تو ہمیں بھی یاد ہیں مثال کے طور پر:

جھلمل ستاروں کا آنگن ہوگا۔

چھوٹا سا بالما مورے آنگن میں کھیلے گلی ڈنڈا۔

میرے انگنا میں تمہارا کیا کام ہے۔

میں تلسی تیرے آنگن کی۔

آخر الذکر مکھڑے کے سلسلے میں ہماری بیگم صاحبہ کا خیال ہے کہ بمبئی شہر میں اس گیت کے بجانے بلکہ گنگنانے پر بھی پابندی لگا دی جائے، یا پھر اس میں سے آنگن کا لفظ حذف کر کے اس کی جگہ فلیٹ، کوارٹر، یا کھولی کا لفظ فٹ کر دیا جائے —— بیگم کے اس معقول استدلال سے چونکہ ہمیں بھی اتفاق ہے اس لیے آخر میں بمبئی کی تمام بیاہتا استریوں، عرف آنگن سے محروم تلسیوں سے دست بستہ گذارش کرتے ہیں کہ جب بھی یہ مکھڑا گنگنائیں تو اس طرح گنگنائیں:

میں تلسی تیرے فلیٹ کی . . . !

تاباں نقوی امروہوی

شہد

غذا بھی دوا بھی

یوں تو فیاض قدرت نے اپنی بے حساب نعمتوں سے اس دنیا کو نوازا ہے لیکن ایک لطیف و نفیس غذا اور ایک موثر دوا کی حیثیت سے شہد بے مثال نعمت ہے شہد کو عربی میں عسل، فارسی میں انگبیں اور ہندی میں مدھو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شہد میں کم و بیش وہ سبھی مفید اجزا پائے جاتے ہیں جو غذائی اعتبار سے مقوی بدن اور بطور دوا خصوصیت سے شفا بخش ہیں جدید تحقیق کے مطابق اس میں سبھی محافظ صحت وٹامن موجود ہیں۔

شہد کی پیداوار کا طریقہ بھی بڑا عجیب اور انوکھا ہے۔ جالینوس کہتا ہے پھولوں میں جو بہت لطیف قسم کی ایک شبنمی رطوبت ہوتی ہے شہد کی مکھیاں اسے چوستی اور اپنے چھتے میں آکر اگل دیتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی بدبودار اور بد ذائقہ پھول کا رس چوس کر آتی ہے تو مکھیوں کی ملکہ (ملکتہ النحل) اس کی بو محسوس کرکے مکھی کو چھتے میں داخلے سے روک دیتی اور اسے ہلاک کر دیتی ہے اس طرح شہد کی نفاست، پاکیزگی اور افادیت برقرار رہتی ہے شہد مانع امراض ہے اور موجود امراض کا ثانی علاج بھی۔

شہد کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس موسم اور کس علاقے کی پیداوار ہے گرم علاقوں کا شہد لطیف اور رقیق اور ٹھنڈے علاقوں کا غلیظ اور کسی قدر کثیف ہوتا ہے ربیع کی فصل کا شہد خریف کی فصل کے شہد سے بہتر خیال کیا جاتا ہے شہد کی مکھیوں نے اگر نیم کے پھولوں کا بھی رس چوسا ہے تو ایسے شہد میں ناگزیر طور پر کسی قدر تلخی ہوتی ہے اگرچہ ایسا شہد بعض امراض میں خصوصیت سے مفید ہے۔

شہد کی مکھیاں بڑی اور چھوٹی ہوتی ہیں چھوٹی مکھیوں کا شہد بڑی مکھیوں کے شہد سے بہتر سمجھا جاتا ہے شہد پیدا تو ہندوستان کے تقریباً سبھی علاقوں میں ہوتا ہے مگر دامن کوہ کے علاقے مدھیہ پردیش اور نیپال وغیرہ اس کی پیداوار کے خاص علاقے ہیں۔

شہد کا مزاج

اطبا نے تازہ شہد کو دوسرے درجے میں گرم اور پہلے درجے میں خشک ٹھہرایا ہے پرانا شہد پہلے درجے میں بھی گرم مانا جاتا ہے جالینوس نے سُرخ رنگ کے شہد کو بطور دوا افضل قرار دیا ہے اور سفید اور بھورے رنگ کے شہد کو بطور غذا اور لذت۔ شہد بنیادی اعتبار سے مانعِ عفونت ہے جو پھل یا دوائیں شہد میں ڈال دی جاتی ہیں وہ مدت تک سڑنے سے محفوظ رہتی ہیں اطبا اپنے مرکبات شہد میں ملاکر محفوظ کرتے ہیں اس طرح وہ مدت تک اصل حالت میں بھی رہتی ہیں اور ان کے اثرات میں بھی خاص طور پر اضافہ ہو جاتا ہے اگر آم کی گٹھلی کو موم لگاکر شہد میں ڈال دیا جائے تو کم از کم چھ ماہ تک پختہ آم اپنی اصل حالت پر رہتا اور خلافِ موسم ضیافتِ کام و دہن کے کام آتا ہے۔

گیلانی کی رائے

گیلانی کی رائے میں شہد کا مزاج گرم ہے یہ ملیّن اثر کرتا اور اندرونی مادّوں کو پکاکر خارج کر دیتا ہے اپنی حرارت کی بنا پر انسانی بدن میں گہرائی تک اتری ہوئی فاضل رطوبت کو خشک اور گہرے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔

طبّی افادیت

شہد ایک لذیذ مفید اور خون صالح پیدا کرنے والی غذا ہے اسے استعمال کرتے رہنے سے انسان اکثر امراض سے محفوظ رہتا ہے قلب و دماغ کو تقویت حاصل ہوتی ہے سمّی اثرات زائل ہو جاتے ہیں ریاح کو تحلیل اور سدّوں کو توڑ کر خارج کر دیتا ہے نوشادر کے ساتھ گہرے زخموں میں مفید ہے گیہوں کے آٹے میں شہد ملاکر ضماد کرنے سے ہر قسم کے ورم دُور ہو جاتے ہیں مصطگی ملاکر پینے سے دماغ کی فاضل رطوبات خشک ہو جاتی ہیں شہد کے استعمال سے بلغم بننا بند ہو جاتا ہے اور موجود بلغم خارج ہو جاتا ہے۔

جالینوس کے خیال میں زخموں کو صاف اور مندمل کرنے میں شہد خاص طور پر مفید ہے فالج، لقوہ اور استرخا (اعصاب کا ڈھیلا پن) میں نفع بخش ہے بصارت میں اضافے اور جلا کا سبب ہے آنکھ میں پانی اترنے کی ابتدا ہو تو کسی قدر مُشک کے ساتھ آنکھ میں لگانا مفید ہے شہد میں نمک اندرانی ملاکر نیم گرم کان میں ٹپکانے سے کان میل سے پاک و صاف ہو جاتا ہے ثقل سماعت (بہرا پن) کو دُور کرتا اور سردی سے

۵۲ سی، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۲

ہونے والے دردوں میں نفع بخش ہے۔ نیم کے تازہ پانی میں بکری یا عورت کا دودھ یا انڈے کی سفیدی شہد میں ملا کر غرارے کیے جائیں تو حلق، زبان اور تالو کا ورم دُور ہو جاتا ہے۔

شہد دانتوں اور مسوڑھوں پر ملنے سے انھیں تقویت حاصل ہوتی ہے شہد بھوک بڑھاتا اور پیاس کو دُور کرتا ہے۔ شیخ الرئیس کے بقول نیم گرم شہد میں روغنِ گُل ملا کر استعمال کرانا سگ گزیدہ (جس کو کُتّے نے کاٹا ہو) کے لیے مفید ہے افیون کے زہریلے اثرات میں شفا بخشتا ہے مقوی باہ ہے خواہش جماع میں اضافہ کرتا ہے بوڑھے لوگوں، مرطوب اور بلغمی مزاج والوں کے لیے بطور خاص مفید ہے۔

لو (گرم ہوا) کے اثرات میں شہد مطبوخ فائدہ مند ہے۔ فالج زدہ مریض کے لیے شہد کا استعمال بہت نفع بخش ہے چھوٹے بچوں کے مسوڑھوں پر ملنے سے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔

مضرات

شہد اگر غلیظ اور ثقیل غذا کھانے کے بعد استعمال کیا جائے تو قبض پیدا کرتا ہے صفراوی مزاج (پت) والوں کے لیے مضر ہے۔ جوانوں اور گرم مزاج والوں کے لیے اس کا استعمال مفید نہیں شہد کا بدل ترش انار، ترنج، آب لیموں اور سرکہ ہے۔

ایک خاص تجربہ

حکیم کلب علی صاحب کا تجربہ ہے کہ اگر کسی کو بجلی کا شاک لگا ہو تو اسے فوراً شہد پلایا جائے۔ بمقام اذیت پر شہد میں تر کیا ہوا کپڑا لپیٹنا فائدہ مند ہے۔

قرآن مجید کا فیصلہ

اللہ نے "فیہ شفاء للناس" کہہ کر اس کی افادیت پر سند توثیق عطا کی ہے روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سرکار دو عالم شہد پانی میں ملا کر ناشتہ فرمایا کرتے تھے۔

اچھے شہد کی شناخت

اچھے اور خالص شہد کی شناخت یہ ہے کہ جب اسے انگلی پر اٹھایا جائے تو نیچے کی طرف جاتے ہوئے اس کا سلسلہ نہ ٹوٹے چینی ملا ہوا شہد اس خصوصیت سے محروم ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے چھتّے سے نکالا جانے والا شہد بھی سوفیصدی قابلِ اعتبار نہیں ہوتا ہنرمند لوگ اس میں بھی اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔

غزلیں

اختر حسین اختر

چاہتوں، رشتوں، اصولوں کو بھلا دینا پڑا
مجھ کو جینے کے لیے کیا کیا گنوا دینا پڑا

ہاتھ میں بچّوں کے پتھر تھے پھلوں کو دیکھ کر
پیڑ کی شاخوں کو سر اپنا جھکا دینا پڑا

آگیا اُس پیڑ کی حالت پہ موسم کو ترس
شاخ سے جب آخری پتّہ گرا دینا پڑا

موت ساہوکار کی مانند تھی در پر کھڑی
زندگی اِک قرض تھی فوراً چکا دینا پڑا

اس قدر غالب تھا اختر گھر کے جل جانے کا خوف
مجھ کو فوراً ہی چراغوں کو بجھا دینا پڑا

بے حسی کے موسم میں دم گھٹا شرافت کا
شہر کی فضاؤں میں زہر تھا سیاست کا
ہر وجود بکھرا ہے ٹوٹ کر ہواؤں میں
کس کو راس آیا ہے یہ سفر بغاوت کا
خوشبوؤں کے پنکھوں پر لکھ دیا صبا نے کچھ
عکس پھر سے ابھرا ہے ذہن میں عبارت کا
سرد و گرم موسم کا اب خیال کس کو ہے
کھوئے کھوئے سے ہیں سب سب کو غم ہے ہجرت کا
ختم ہے تکلّف بھی کھل گئیں تہیں ساری
ریزہ ریزہ آئینہ ہو گیا ہے قربت کا
دشمنوں کے نرغے سے صاف بچ کے آیا تھا
یاد ہے مجھے اب تک وہ کرشمہ قدرت کا

عمران عظیم

واجد سحری

پیار ہر اک سے کیے جانا ہے عادت میری
میرا ٹوٹا ہوا دل ہی تو ہے قیمت میری

زندگی کاٹ رہا ہوں میں سزاؤں کی طرح
بات سنتی ہی نہیں کوئی عدالت میری

وقت یہ سنگ زنی مجھ پہ کرے گا کب تک
اِک نہ اِک روز چمک اٹھے گی قسمت میری

سحر و شام سے کچھ بھی تو نہیں میں نے کہا
پھر بھی ہر پل کی زباں پر ہے حکایت میری

مجھ سے واجد مرے احباب ہیں بدظن کتنے
نیکیوں کو بھی سمجھتے ہیں شرارت میری

رین والا فلور مل، محلہ مظفر نگر، مقام ضلع آکولہ ۴۴۴۰۰۱ (مہاراشٹر)
معرفت شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
سیکریٹری بزمِ ساز و ادب، B-28، قرول باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

تنویر احسن اعظمی

سیّد مودی
ایک اُبھرتا ستارہ جو ڈوب گیا

"میری خواہش ہے کہ ۹۰ ـ ۱۹۸۹ء کا قومی خطاب جیت کر پرکاش پڈوکون کا نو بار قومی خطاب جیتنے کا ریکارڈ برابر کر دوں۔"

ہندوستان کے اوّل درجے کے کھلاڑی سیّد مودی کی یہ خواہش پوری ہونے سے پہلے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ وہ آٹھ بار قومی چیمپین کا خطاب جیت چکے تھے جو لوگ مودی کو جانتے تھے ان کے لبوں پر ایک ہی سوال ہے کہ اتنے صاف ستھرے نیک دل انسان کو کیوں اور کس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا؟

سیّد مودی جن کا اصلی نام سیّد مہدی تھا، ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ان کا نام سیّد مہدی سے سیّد مودی ہو گیا کیونکہ گورکھپور میں لیڈی پیونکر انٹر کالج جہاں وہ پڑھتے تھے کے کلرک کو یہ نام لینے میں کافی دشواری ہوتی تھی اور وہ ان کو سیّد مودی کے نام سے پکارنے لگا اور پھر وہیں سے سیّد مہدی سیّد مودی بن کر عالمی بیڈمنٹن میں مشہور ہو گئے۔ گورکھپور سے ۲۷ کلومیٹر دور دیوریا روڈ پر ایک چھوٹا سا قصبہ سردار نگر ہے۔ یہاں داخل ہوتے ہی سریا شوگر مل اور اس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے کوارٹرز، مکانات اور جھگیاں ہیں یہی سیّد مودی کی جائے پیدائش ہے مل کے ایک بہت بڑے افسر سریندر سنگھ مجیٹھیا کی دلچسپیوں کے باعث فیکٹری کے احاطے میں ایک بیڈمنٹن کورٹ بنایا گیا تھا اور اسی کورٹ پر کھیلتے ہوئے سیّد مودی ایک جانے مانے عالمی درجے کے پلیئر بنے۔

سیّد مودی غریبی کی حالت میں پیدا ہوئے اور ابھی وہ تین ہی سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا جو سریا شوگر فیکٹری میں ایک معمولی مُلازم تھے۔ ان کے بڑے بھائی سیّد حسنین حیدر کے کاندھے پر گھر کی ذمّہ داری آپڑی۔ اسی فیکٹری میں ایک کم تنخواہ والے ملازم کی حیثیت سے تکنیکی کام کرنے والے بھائی نے ساری ذمّہ داری اُٹھائی۔ والد کے انتقال کے بعد سیّد حسنین حیدر سے چھوٹے بھائی سیّد پیارے کو بھی شوگر فیکٹری میں ایک معمولی تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔ سیّد پیارے فیکٹری میں پچاس روپے ماہوار پر کام کرتے تھے لیکن مودی کے لیے وہی ایک بہت بڑا سہارا ثابت ہوئے کیونکہ مودی سے پہلے انھوں نے ہی

بیڈمنٹن میں نام کمایا اور یوپی اسٹیٹ ٹیم کے لیے چُنے گئے۔ ہندوستان کے سابق قومی کھلاڑی پی۔ کے۔ مجمدار کے مطابق سیّد پیارے ملک میں اس وقت سب سے اچھا بیک ہینڈ کھیلنے والے کھلاڑی تھے۔ لیکن ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر انھیں بیڈمنٹن کو خیرباد کہنا پڑا۔ سیّد مودی کو انھوں نے بیڈمنٹن کھیلنے سے کبھی نہیں روکا بلکہ ان کا حوصلہ بڑھایا، انھیں کھیل کے گُر سکھائے اور سیّد مودی نے بھی ان کو مایوس نہیں کیا۔

۱۹۷۳ء میں جب مودی صرف گیارہ سال کے تھے یوپی بیڈمنٹن کا جونیئرس ڈبل خطاب جیتا۔ ویسے وہ جونیئرس سنگل میں رنر اپ تھے۔ دو ہی سال بعد سیّد مودی نے گورکھپور کو ہندوستان کے نقشے پر اُبھار دیا۔ انھوں نے نیشنل جونیئرس خطاب ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۵ء میں جیتے اور اگلے دو سال کے لیے بھی اسے اپنے قبضے میں رکھا۔ ستیش گوئل ایک بہترین بیڈمنٹن کھلاڑی جو اس وقت اعلیٰ کھیل کھیلنے والوں میں تھے اور جنھوں نے اسی سال ہندوستان کے نمبر ایک کھلاڑی نندو ناٹیکر کو ہرا کر پہلی پوزیشن حاصل کی تھی وہ بھی سیّد مودی کے کھیل سے متاثر ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی عجب نہیں کہ یہ لڑکا کچھ ہی دنوں میں مجھ سے یہ خطاب چھین لے جو میں نے

۹/۱۹۱۹، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

اتنی مشکلوں سے نندو ناٹیکر کو ہرا کر حاصل کیا ہے۔ سید مودی نے بھی اپنے بیڈمنٹن کھیلنے کے انداز کو سریش گوئل کے انداز سے ملتا جلتا رکھا۔ گوئل بذاتِ خود ایک زبردست کھلاڑی تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مودی نے پرکاش پڈوکون کو چیمپئن شپ سے ہٹا دیا۔ لیکن اس وقت پرکاش پڈوکون ہندوستان سے باہر یورپ میں بیڈمنٹن سے لطف اٹھا رہے تھے۔ اور پھر مودی لگاتار آٹھ بار قومی خطاب جیتتے چلے گئے جو آخری بار انھوں نے ۲۱ جنوری ۸۸ء کو جمشید پور میں جیتا۔

فاضل احمد صدر بیڈمنٹن ایسوسی ایشن آف انڈیا اور ایتا مودی (سید مودی کی شریک حیات) بار بار اس بات کو دہراتے ہیں کہ سید مودی کی خواہش تھی کہ وہ دس بار قومی خطاب جیتیں اور پرکاش پڈوکون کا ریکارڈ توڑ دیں۔ پچھلے سال یوپی کے بیڈمنٹن کپتان انیل دھیانی کو مودی نے بتایا کہ وہ اس سال کافی پریشان ہیں کیونکہ وہ اس سال اپنے آپ کو جسمانی لحاظ سے چست نہیں رکھ پا رہے ہیں اور یہ بات سبھی لوگ سمجھ رہے تھے کہ ان کی پریشانی جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ وہ اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ حال ہی میں لکھنؤ میں ایک چھوٹی سی چیمپئن شپ کھیلتے ہوئے مودی ایک بہت ہی نچلے درجے کے کھلاڑی سے ہار گئے۔ الجھن ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ ہندوستان کے نمبر دو کھلاڑی وِمل کمار نے بار بار ان سے پوچھا کہ اس پریشانی کا کیا سبب ہے۔ مودی نے ہر بار بس اتنا کہا کہ میں بہت پریشان ہوں اور میری پریشانی کا بیڈمنٹن سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو مودی دو دنیاؤں میں بٹ چکے تھے ایک دنیا تھی ان کی ماں، بھائی، غربت کا بیتا زمانہ اور ایک عام درجہ کے مسلمان کا رہن سہن والا پس منظر۔ دوسری طرف ان کی بیوی کے کانونٹ اسکول میں پڑھی بیوی اور امیٹھی کے راجہ کے بیٹے سنجے سنگھ جیسے لوگوں سے دوستی یہ دو دنیائیں تھیں جن کے درمیان وہ کسی بھی طرح توازن قائم نہیں رکھ پا رہے تھے۔

ایتا مودی اور سید مودی کے گھریلو کلچر اور ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا ایتا مودی نے اس دُور اندیشی سے سید مودی سے شادی کی تھی کہ وہ ایک دن بیڈمنٹن کے نمبر ایک عالمی کھلاڑی بنیں گے کیونکہ جہاں ایتا مودی فراٹے سے انگریزی بولا کرتی تھیں وہیں سید مودی قاعدے سے اُردو یا ہندی بھی نہیں بول پاتے تھے۔ ان دونوں کے دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر دیکھا جائے تو ایتا مودی نے یہ شادی زبردستی کی تھی کیونکہ اس شادی میں مودی کے گھر والوں سمیت کسی بھی رشتہ دار نے شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن ایتا مودی نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ سید مودی عالمی درجے کے ایک کھلاڑی بن جائیں۔ اس سال وہ مودی کے ساتھ مل کر کافی محنت کر رہی تھیں کیونکہ وہ خود قومی سطح کی کھلاڑی رہ چکی ہیں اس لیے وہ دونوں ساتھ ساتھ ہی دوڑتے اور جسمانی کسرت کرتے اور لکھنؤ کے کنور ڈگ وجے اسٹیڈیم میں بیڈمنٹن کی مشق بھی ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔ ایتا مودی کا کہنا ہے کہ سید مودی، پرکاش پڈوکون سے کہیں بہتر کھلاڑی تھے اور وہ کافی عرصہ پہلے ہی عالمی نمبر ایک ہو جاتے اگر ان میں ذرا سی بھی لگن اور محنت کرنے کا حوصلہ ہوتا۔

فاضل احمد کا کہنا ہے کہ سید مودی نے اپنے بیڈمنٹن کیریئر کے سب سے اہم وقت میں ایک زبردست چوک کی۔ وہ موقع ایسا تھا کہ اگر سید مودی کھرے اُترتے تو عالمی چیمپئن بن سکتے تھے۔ بمبئی انٹرنیشنل ٹورنامنٹ میں آرلانڈ کوپس نے (سابق عالمی چیمپئن اور فی الحال عالمی نمبر ایک کوچ) جو نئے لڑکوں کو ٹریننگ دینے کے معاملے میں کافی کنجوس سمجھے جاتے ہیں مودی کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور فاضل احمد سے کہا کہ اگر اس لڑکے کو صحیح کوچنگ مل جائے تو یہ کچھ ہی دنوں میں نمبر ایک عالمی کھلاڑی بن سکتا ہے فاضل صاحب نے آرلانڈ کوپس سے گذارش کی کہ وہ مودی کو اپنی سرپرستی میں لے لیں۔ آرلانڈ کوپس مودی کو کوچنگ دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ فاضل صاحب نے سید مودی کو کوچنگ کے لیے ڈنمارک بھیج دیا۔ کوچنگ شروع ہوئے بیس پچیس دن ہی ہوئے تھے کہ مودی واپس ہندوستان چلے آئے یہ کہہ کر وہ اتنے دن تک گھر سے دُور نہیں رہ سکتے اور یہی سید مودی کے بیڈمنٹن کیریئر کا ایک ایسا موڑ ثابت ہوا جس سے وہ کبھی اُبھر نہ سکے۔ اگر سید مودی چھ مہینے بھی کوپس کی سرپرستی میں رہ جاتے تو وہ یقیناً ایک دوسرے قسم کے کھلاڑی ہوتے۔

اگر سید مودی کی عالمی کارکردگی دیکھی جائے تو وہ اتنا وزن نہیں رکھتی یہ بات صاف ہے کہ مودی نے اپنے فن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ۱۹۸۲ء کے ایشین کھیلوں میں انھوں نے لویم سوئم کنگ (Lium Sium King) کے ساتھ جو اس وقت نمبر دو عالمی کھلاڑی تھے ایک زبردست مقابلہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا دیے لیکن تیسرا گیم ہارنے کے بعد مودی کو صرف تانبے کا تمغہ ہی مل سکا پھر ۱۹۸۳ء میں مودی نے بیڈمنٹن کی دُنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ جب انھوں نے ہندوستان کو پانچویں ایشین بیڈمنٹن کنفڈریشن چیمپئن شپ کے فائنل میں پہنچا دیا جو کلکتہ میں ہو رہی تھی ۱۹۸۴ء

میں آسٹریلیا میں ہو رہے کامن ویلتھ گیم میں مودی نے سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ یہی ہے کُل ملاکر مودی کی عالمی سطح کی کارکردگی لیکن مودی اس سے زیادہ کرنے کے لائق تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مودی نے کبھی اپنے ہُنر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ فاضل احمد کا کہنا ہے کہ سید مودی ہمیشہ سے ہی آرام پسند کھلاڑی تھے وہ زیادہ تر "جیسا ہے ٹھیک ہے" جیسے خیالات رکھتے تھے کئی لوگ اب بھی مانتے ہیں کہ سید مودی پرکاش پڈوکون سے جو ۱۹۸۰ء کے آل انگلینڈ اور ورلڈ چیمپئن تھے بہتر کھلاڑی تھے یا ہو سکتے تھے۔ پرکاش نے محنت اور لگن کا سہارا لیا اور ایک صحیح پیشہ ور کھلاڑی کی طرح کھیلے جب کہ مودی کا رویہ برعکس تھا۔ فاضل احمد جو ریٹائر ہونے کے بعد گورکھپور ہی میں بس گئے تھے انھوں نے سید مودی کو بچے سے بڑا ہوتے دیکھا اور ان کے کھیل کو سدھارنے میں کافی مدد کی لیکن ان کا کہنا ہے کہ "مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۷۹ء میں ہم لوگ ہندوستان کی ٹیم لے کر تھامس کپ کھیلنے جکارتا گئے ہوئے تھے تو وہاں بارش ہو رہی تھی لیکن پرکاش نے ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں ہی ورزش کرنی شروع کر دی جب کہ ٹیم کے اور ممبر سید مودی، اُدے پوار اور پارتھو گانگولی کمرے میں لیٹے آرام کرتے رہے اور یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہی چیمپئن بننے کے لیے کافی اہمیت رکھتی ہیں"۔

اصل میں سید مودی اپنی ذاتی زندگی میں بھی کافی اُلجھے ہوئے اور پریشان تھے۔ اس کم عمری میں جب ایک کھلاڑی اپنا سب کچھ اپنے کھیل کے کیریئر پر لگا دیتا ہے سید مودی کی منگنی ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں جب مودی صرف ۱۹ سال کے تھے امیتا سے ان کی منگنی ہو گئی اور تبھی سے وہ کافی تناؤ میں تھے کیونکہ مودی کے گھر والے، ان کی ماں اور بھائی اس شادی کے خلاف تھے لیکن مودی اڑے ہوئے تھے کہ وہ امیتا سے ہی شادی کریں گے مودی کے گھر والوں کو جھکنا پڑا منگنی امیتا کے گھر بمبئی میں ہوئی اور مودی کی طرف سے صرف ان کے بڑے بھائی سید پیارے ہی شامل ہوئے لیکن اس کے باوجود سید مودی اپنی والدہ سے بہت زیادہ قریب تھے شادی کے بعد امیتا چھ مہینے گورکھپور کے چھوٹے سے مکان میں آکر رہیں اس کے بعد وہ چاہتی تھیں کہ مودی گورکھپور سے باہر نکل کر رہیں آخر سمجھوتہ لکھنؤ پر ہوا اور سید اور امیتا مودی لکھنؤ میں آکر رہنے لگے جبکہ مودی کی والدہ چاہتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ گورکھپور ہی میں رہے۔ مودی نے اپنی بہنوں کی شادی میں تقریباً ۷۵ ہزار روپے دیے لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ رقم انھوں نے امیتا سے چھپا کر دی تھی پھر مودی کا تبادلہ کرانے کی کوشش بھی کی گئی۔ سید مودی ایک نیک دل اور ہنس مکھ انسان تھے اور ان کی سارے کھلاڑیوں میں کافی ساکھ تھی جس کی وجہ سے یوپی بیڈمنٹن ایسوسی ایشن کے کئی افسران ان سے چڑنے لگے تھے اور ایک بار ایک افسر نے یوپی کے ہی ایک ممبر پارلیمنٹ قاضی جلیل عباسی کا لیٹر پیڈ چُرا کر دلی میں شکایت لکھ کر بھیج دی کہ سید مودی راجیو گاندھی کے خلاف اور سنجے سنگھ کے کافی قریب ہیں اس لیے ان کا ٹرانسفر گورکھپور کر دیا جائے مودی کسی بھی طرح گورکھپور جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مودی نے کہا کہ اگر میرا تبادلہ گورکھپور ہوتا ہے تو وہ ریلوے سے جس کے وہ ملازم تھے استعفیٰ دے دیں گے۔ بعد میں وہ فاضل احمد کے ساتھ جا کر ریلوے وزیر مادھو راؤ سندھیا سے ملے اور یہ معاملہ سامنے آیا کہ افسر نے قاضی جلیل عباسی کا لیٹر پیڈ چرا کر غلط الزام لگایا تھا تب جا کر ان کا تبادلہ رُکا۔ سید مودی کے قتل ہونے کے وقت بھی ان کی چھ مہینے کی تنخواہ جو ۱۸ ہزار روپے بنتی تھی رُکی ہوئی تھی اور دو ہزار گز کا پلاٹ جو۔ یوپی گورنمنٹ نے ان کو دینے کا وعدہ کیا تھا ان کو ابھی تک نہیں مل پایا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مودی اپنی ذاتی زندگی میں کافی دنوں سے اُلجھے ہوئے تھے اور ظاہری بات ہے کہ ایک عالمی درجے کا کھلاڑی ان حالات میں اپنے کھیل پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔

قتل کیسے کیا گیا

یوں تو قتل کے دو تین چشم دید گواہ ملے ہیں وہ کچھ ان پڑھ اور دبے ہوئے لوگ ہیں اور واقعات کو واضح طور سے بیان نہیں کر سکے۔ ۲۸ جولائی کی رات ۸ بجے سید مودی روز کی طرح کنور دگ وجے سنگھ اسٹیڈیم سے بیڈمنٹن پریکٹس کر کے اپنے اسکوٹر پہ اسٹیڈیم سے باہر نکلے بارش ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے باہر نکلتے ہی اسکوٹر کی رفتار دھیمی کر لی سامنے ماروتی کار کھڑی تھی جس میں چار یا پانچ لوگ تھے سامنے سے ہی انھوں نے سید مودی پر پہلی گولی داغی، سید مودی وہیں اسکوٹر سے گر پڑے ان میں سے دو لوگ دوڑتے ہوئے سید مودی کے بالکل قریب آگئے اور صرف ڈیڑھ دو فٹ کی دوری سے ان پر چار گولیاں اور چلائیں سید مودی نے وہیں دم توڑ دیا۔ مارنے والے بہت آرام سے کار میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔

واقعات اور حقیقت حال جو بھی ہو لیکن سید مودی کی موت خاص طور سے کھیل کی دنیا میں ہمارے ملک کے لیے ایک انتہائی افسوسناک حادثہ ہے۔

ہم طرح اشعار

پچھلے مہینے ہم طرح اشعار کے لیے جو مصرعہ دیا گیا تھا وہ اصغر گونڈوی کا تھا۔
"گلدستہ" حاشیے میں درج اشعار بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔
موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر درج ہیں:

اس خانۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا
اُس بُت کو کب اللہ کا مہماں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: کمال اختر کمال بدایونی، بدایوں

کیا ذوق ہے کیا شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں
پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: محمد ذکی سروش، سیف خاں سرائے، سنبھل (مراد آباد) ۲۴۴۳۰۲۔ (یو پی)

میں نے اسے دیکھا مرے دل نے اسے دیکھا
تو نے اسے اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، بھاگلپور

ہر چند ترے ظلم کی کچھ حد نہیں ظالم
پر ہم نے کسی شخص کو نالاں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: طلعت وقار غالب، سنبھل

لو اور سُنو کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو
جو حال سُنا تھا وہ پریشاں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: شفقت علی وفا، فیروز آباد اور محمد فصاحت کوثر، سنبھل۔

تم مُنھ سے کہے جاؤ کہ دیکھا ہے زمانہ
آنکھیں تو یہ کہتی ہیں کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: فرح خان، مراد آباد

محشر میں وہ نادم ہو خدا یہ نہ دکھائے
آنکھوں نے کبھی اس کو پشیماں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: فاطمہ خان، مراد آباد

جو دیکھتے ہیں دیکھنے والے ترے انداز
تو نے وہ تماشا ہی مری جاں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن، بھاگلپور

کیا پوچھتے ہو کون ہے کس کی ہے یہ شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا (داغ)

مرسلہ: محمد اختر بدایونی، بدایوں

وہ خار ہوں جس نے کبھی داماں نہیں دیکھا
وہ پھول ہوں میں جس نے گریباں نہیں دیکھا (امیر مینائی)

مرسلہ: اے علی، برہان پور

وہ دل تھا ہمارا کہ تری تیغ نظر نے
تلوار کے منھ پر بھی ہراساں نہیں دیکھا (امیر مینائی)

مرسلہ: ایم علی، برہان پور

جو سر پہ بلا آئی ہے غفلت ہی سے آئی
بے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا (مرزا ثاقب لکھنوی)

مرسلہ: محمد احتشام حیات، معرفت محمد سعید حیات
ایڈووکیٹ، عقب بلال اسکول، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸ (مہاراشٹر)

اللہ رے مجبوریِ آدابِ محبت
گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا (جگر)

مرسلہ: محمد کوثر اعظم، پٹنہ

ہمت کو ہی جب سلسلہ جنباں نہیں دیکھا
پھیلا ہوا پھر عالمِ امکاں نہیں دیکھا (حفیظ)

مرسلہ: افسانہ بانو، مالدہ، ویسٹ بنگال

کیا پردہ دری اس سے ہو اسرارِ جنوں کی
چھو کر بھی کبھی جس نے گریباں نہیں دیکھا (حفیظ میرٹھی)

مرسلہ: محمد عارف انصاری، معرفت عثمان انصاری
مجاہد پور (ویسٹ)، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

مانگا کیے دُنیا کے اندھیروں سے اُجالا
اور اپنا چراغِ تہِ داماں نہیں دیکھا (حفیظ)

مرسلہ: منظر امام، بھاگلپور

اے عصرِ رواں تیرا جہاں روشن و تاباں
سب کچھ یہاں دیکھا مگر انساں نہیں دیکھا (حفیظ)

مرسلہ: شبانہ بیگم، بھاگلپور

گاتا ہے حفیظ آج بھی آزاد ترانے
گستاخ نے شاید درِ زنداں نہیں دیکھا (حفیظ)

مرسلہ: منظر حسن، بھاگلپور

تیرے اثرِ حسن سے پابندِ وفا نے
زنداں کے علاوہ درِ زنداں نہیں دیکھا (اکبر عظیم آبادی)

مرسلہ: فضل ربانی صدیقی، پٹنہ

کہتے ہو کہ برباد ستم کہتے ہیں کس کو
کیا تم نے مرا حال پریشاں نہیں دیکھا (نور تقی نور)

مرسلہ: پرویز عالم چمن، میرٹھ

کیا شام کی دہلیز پہ مغرور خداو
تم نے کبھی سورج کو بھی لرزاں نہیں دیکھا (سیف سہسرامی)

مرسلہ: ربیعہ خانم، سہسرام

پھل توڑنے والوں میں کسی کو کبھی ہم نے
ویرانیِ اشجار پہ حیراں نہیں دیکھا (سیف سہسرامی)

مرسلہ: سیدہ ماہ نور، سہسرام

کیفیتِ دل میری سمجھ پاؤ گے کیسے
تم نے تہِ دریا کبھی طوفاں نہیں دیکھا (راشد)

مرسلہ: سرفراز نواز، سہسرام

یا دیر و حرم دیکھے ہیں یا دشت و سمندر
تم نے ابھی میرا دلِ ویراں نہیں دیکھا (شہاب)

مرسلہ: فردوس کنول، سہسرام

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

ستمبر ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

شعری عنوانات

میں نے سوچا تھا اس اجنبی شہر میں زندگی چلتے پھرتے گذر جائے گی
یہ مگر کیا خبر تھی تعاقب میں ہے ایک نادیدہ زنجیر ہمسایگی (رسا چغتائی)

مرسلہ: محمد رازق، موضع کرولی، ڈاک خانہ سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)

نہ پوچھو کون ہیں کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں (نامعلوم)

مرسلہ: رحمت آرا نور چکوی، معرفت ایم۔ایم۔ حسن، مقام و پوسٹ نور چک، وایا کیوٹی رنوے، ضلع مدھوبنی (بہار)

مل جل کے آؤ بخش دیں ان لمحوں کو دوام
یہ لمحے زندگی میں مکرّر نہ آئیں گے (محسن زیدی)

مرسلہ: قیصر ندیم، مجھولیا، مظفرپور

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں (غالب)

مرسلہ: مسعود اللہ خاں غوری، برہانپور اور عالیہ پروین راغب، گیا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (غالب)

مرسلہ: محمد ذکی سروش، سنبھل۔ واحد اختر کیلا، صاحب گنج۔ شمع فخر الدین، بیڑ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں (غالب)

مرسلہ: شائستہ خان، برہان پور

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے (ذوق)

مرسلہ: ایم۔ ایس۔ شیخ، فیض پور، جلگاؤں

ناتوانی نے کیا اب تو ہمیں بے دست و پا۔۔۔!
دست و پا مارے تھے ہم بھی جب تلک تھے دست و پا (نعیم عبداللہ اعظمی)

مرسلہ: ایس۔ مسعود حسن، گیا

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں (بہادر شاہ ظفر)

مرسلہ: معبود عامر صدیقی، رانچی

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں (انشا)

مرسلہ: محمود عالم مکی، نور چک

حسن و الفت کا مزہ جوشِ جوانی تک تھا
اب نہ وہ آنکھ تمہاری ہے نہ وہ دل میرا (جلیل مانکپوری)

مرسلہ: قدسیہ طلعت، گیا

موقوفِ آرزو ہے، توانائیِ حیات
پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے (اقبال)

مرسلہ: جمال احمد سیتاپوری، بھوپال

ضعفِ پیری جو بڑھا موت کے پیغام چلے
آگیا وقتِ سفر، صبح چلے، شام چلے (ریاض خیرآبادی)

مرسلہ: ایم۔ صابر آزاد، صاحب گنج

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
رنگِ دوئی مٹا دیں نقشِ وفا جما دیں (اقبال)

مرسلہ: شفقت علی وفا، فیروز آباد

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے (حفیظ جونپوری)

مرسلہ: مختار عالم، فیض پور

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی (ناصر کاظمی)

مرسلہ: قریش حسین، برہان پور

بچا لے آج جو کشکول تو غنیمت ہے
یہ بات سچ ہے تو ماضی میں شاہزادہ تھا (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: خالد ظفر، بمبئی

دو گھڑی وہ جو پاس آ بیٹھے
ہم زمانے سے دُور جا بیٹھے (ساحر)

مرسلہ: سردار راہی، فیض پور

گئے دنوں کی پرانی کہانیاں بھی گئیں
ہمارے دوست تمہاری سہیلیاں بھی گئیں (کرشن ادیب)

مرسلہ: محمد اظہر، برہان پور

اب تھکن پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے
راہ کا خوف یہ کہتا ہے کہ چلتے رہیے (معراج فیض آبادی)

مرسلہ: محمد راشد جمیل، بھدرک (اڑیسہ)

ماضی کو بھول آئے ہم صورتِ حال کے سبب
چہرہ غبار ہو گیا گردِ ملال کے سبب (سیدہ شان معراج)

مرسلہ: سید ضیغم علی، بردوان

راستے دشوار تر ہیں پاؤں میں ہیں آبلے
دور ہے منزل، ٹھہر یے دم ذرا لے لیجیے (کماری کمل)

مرسلہ: رخشاں پروین، صاحب گنج

وہ اُمنگ نہیں وہ ترنگ نہیں وہ نکھار وہ روپ وہ رنگ نہیں
نہ وہ ہم ہی رہے نہ وہ تم ہی رہے نہ وہ عمر رہی نہ زمانہ رہا (مُنیکش سنبھلی)

منصور حسن خاں، رائے بریلی

تنہائی تو کچھ اور بڑھا دیتی ہے غم کو
یہ سوچ کے تنہا کبھی بیٹھا نہیں کرتے

مرسلہ: محمد قیصر، کلکتہ

نثری عنوانات

"بھتی سال پہلے کا وہی دن" (رام لعل کا افسانہ)
مرسلہ: محمد مراد عالم ناشاد، معرفت فیروز جنرل مرچنٹ کریم گنج گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

"اپنے دکھ مجھے دے دو" (راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ)
مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ، صاحب گنج

"درد کے رشتے" (نفیس صدیقی)
مرسلہ: مسعود پرویز، نصیر آباد

"منزل ایک مسافر دو" (مہندر ناتھ کا ناول)
مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیا، صاحب گنج

"یادوں کی برات" (جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح حیات)
مرسلہ: شاہینہ پروین، جمشید پور

"میرے پاس رہو" (فیض کی نظم)
مرسلہ: شاہد عقیل احمد، بتیا

"جنم جنم کے ساتھی" (رضیہ بٹ کا ناول)
مرسلہ: ایس مسعود حسن، گیا

"شامِ زندگی" (علامہ راشد الخیری کا ناول)
مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پہر یموی، رائے بریلی

"رفاقت یہ ذرا سی" (رضیہ فرحت کا ناول)
مرسلہ: بیگم نکہت واحد، صاحب گنج

"ایک ندی دو پاٹ" (گلشن نندا کا ناول)
مرسلہ: محمد واعظ الحق حکیم، صاحب گنج

"یادِ ماضی" (ایم۔ فاروق انصاری کا افسانہ)
مرسلہ: ذہین فاطمہ بشرہ، کانپور

"عمرِ گریزاں" (رضیہ جمیل کا ناول)
مرسلہ: واجدہ تبسم، صاحب گنج

"آؤ ہم دوست بن جائیں" (کشمیری لال ذاکر کا افسانہ)
مرسلہ: رتن لال گپتا، صاحب گنج

"شریکِ غم" (کنول پونا سوی کا افسانہ)
مرسلہ: صبا ناز سہانی، صاحب گنج

"احساس کا دھواں" (بشیرا بھگونوی کی کہانی)
مرسلہ: عارفین سعیدی، سمستی پور

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

بقیہ

ہم طرح اشعار

یہ کیسے کہوں اس کو کوئی غم ہی نہیں ہے
جس شخص کے چہرے کو پریشاں نہیں دیکھا (امیر عالم مظہری)

مرسلہ: کائنات مرزا، صاحب گنج

دیکھا ہے زمانے میں ہزاروں کو ہراساں
خود سا کوئی دنیا میں پریشاں نہیں دیکھا (مرزا)

مرسلہ: مرزا محمد مرزا، مظفر پور

کچھ اب کے عجب حسرتِ دیدار ہے ورنہ
کیا گل نہیں دیکھے کہ گلستاں نہیں دیکھا (امید امیٹھوی)

مرسلہ: حامد مرزا، بیٹر اور جمال پرویز، پٹنہ

اڑتا ہوا رنگِ رخِ جاناں نہیں دیکھا
ڈھلتی ہوئی شب میں مہِ تاباں نہیں دیکھا (گمنام پہر یموی)

مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پہر یموی، رائے بریلی

ہے جرم کا اس شخص کو احساس یقیناً
میں نے کبھی اس شخص کو خنداں نہیں دیکھا (نافع)

مرسلہ: مرزا عبد الباقی بیگ، مظفر پور

بستی کے ہر ایک گھر سے یہ اٹھتے ہوئے شعلے
ایسا تو کبھی جشنِ چراغاں نہیں دیکھا (فیاض رشک)

مرسلہ: فیاض رشک، مونگیر

بھانپے تو بہت آپ نے ہر موج کے تیور
کشتی میں جو پلتا ہے وہ طوفاں نہیں دیکھا (پرویز شاہدی)

مرسلہ: شاہد جلال حشمی، کانکی نارہ مغربی بنگال

آئندہ کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر ارسال کریں:

کیا دِوانے نے موت پائی ہے
قافیہ ردیف

یہ مصرعہ میر کی غزل کا ہے اس لیے آپ میر کی اسی غزل سے شعر نہ بھیجیں

نئی مطبوعات

شگوفہ (مجتبیٰ حسین نمبر)

مدیر: ڈاکٹر سیّد مصطفےٰ کمال

ضخامت: ۴۶۳ صفحے

قیمت: ۵۵ روپے

ملنے کا پتہ: ۳۱، بیچلرز کوارٹرز، معظّم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

مجتبیٰ حسین اُردو کے مشہور مزاح نگار ہیں۔ اور اب ان کی شہرت ملکی سرحدیں پار کر چکی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جہاں جہاں اُردو جاننے والے موجود ہیں۔۔۔ مجتبیٰ حسین کا نام وہاں معروف بھی ہے۔ اور محبوب بھی۔ ان کی مزاح نگاری کا خاص وصف جو انھیں اکثر مزاح نگاروں سے ممتاز کرتا ہے اس کا "خالص پن" ہے۔ زندگی کی جو تلخ سچائیاں یا مضحک پہلو جو دوسروں کو طنز و تعریض پر اکساتے ہیں، مجتبیٰ حسین نہ صرف یہ کہ خندہ پیشانی سے ان کا سامنا کرتے ہیں بلکہ ان کا بیان بھی اس طرح مزے لے لے کر کرتے ہیں کہ سننے والوں کے لیے بھی لطف اندوزی کا سامان پیدا ہو جائے۔ ان کی مزاح نگاری کا ایک اور پہلو بھی ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔ اور وہ ہے اداسی اور حزن کی ایک زیریں لہر جو غیر محسوس طور پر ان کے قاری کو اپنی گرفت میں لیتی جاتی ہے۔ اور جب وہ ان کی تحریر کا لطف اٹھا چکتا ہے اور اختتامی سطروں تک پہنچتا ہے تو خود کو کچھ سوچنے پر مجبور پاتا ہے۔ کچھ اس طرح کی سوچ جس کے لیے فراقؔ نے کہا تھا:

سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

"شگوفہ" کا زیرِ نظر نمبر مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ان کے فن کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے۔ یہ سات حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ "قصّہ مختصر" کے عنوان سے ہے جس میں مجتبیٰ حسین کے سوانحی حالات بیان ہوئے ہیں۔ دوسرا حصّہ "قطع کلام" کے زیرِ عنوان تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ جو کہ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کا محاسبہ کرتے ہیں "تکلف برطرف" کے عنوان سے وہ خاکے شائع کیے گئے ہیں جو مجتبیٰ حسین کے قریبی ادیب دوستوں کے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ہیں۔ "سو ہے یہ بھی آدمی" مجتبیٰ حسین سے انٹرویو ہے جو زبیر رضوی، کمار پاشی اور راقم الحروف کی مجتبیٰ سے گفتگو پر مشتمل ہے۔ اسے حامد اکمل صاحب نے مرتب کیا ہے۔ "الغرض" کے تحت مجتبیٰ حسین کی منتخب تحریریں درج کی گئی ہیں اور "بہر حال" کے زیرِ عنوان بیگم مجتبیٰ حسین اور ان کے بچوں کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں چند منظومات ہیں جنھیں "سو ہے یہ بھی مجتبیٰ" کا عنوان دیا گیا ہے۔

شگوفہ کا یہ خاص نمبر مجتبیٰ حسین کے چاہنے والوں کے لیے (اور کون سا اردو والا ہے جو ان کا چاہنے والا نہ ہو) ایک قیمتی تحفہ ہے

——— مخمور سعیدی

مُسکراہٹ ہی مُسکراہٹ (مزاحیہ مضامین کا انتخاب)

مُصنّف: اندرجیت لال

صفحات: ۱۳۶

قیمت: ۴۰ روپے

ملنے کا پتہ: سادھنا پبلی کیشنز، ۱۴۱-ڈی، گل مُہر پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

اندرجیت لال اردو کے جانے پہچانے ادیب اور صحافی ہیں۔ جو لگ بھگ تین دہائیوں سے اردو ادب کا دامن اپنی نگارشات سے مالا مال کر رہے ہیں۔ وہ اب تک بیس کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ جن میں سے بیشتر انعام و اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔

وہ بیک وقت انگریزی اُردو ہندی اور پنجابی میں لگاتار کئی برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ سائنس ادب، فنونِ لطیفہ، بچوں کے ادب، شعری ادب ریڈیائی نشریوں میں انھیں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اور تبصروں کے کیا کہنے۔ اُردو شخصیات و مطبوعات پر جتنے تبصرے خصوصاً انگریزی زبان میں اندرجیت لال نے رقم کیے ہیں۔ وہ ہندوستان بھر میں دوسرے کسی ادیب یا صحافی نے نہ کیے ہوں گے۔

طنز و مزاح بالکل الگ صنف ہے جس کے لیے بڑی باریک حس اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ موصوف کبھی کبھار انشائیے اور مزاحیے لکھتے رہتے ہیں۔ اور اب میدان میں ان کی کتاب (تالیف و تصنیف) "مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" اتری ہے۔ جس میں ملک بھر کے ممتاز مزاح نگاروں کے چوبیس شاہ پارے، جن میں تین تحریریں مؤلف کی ہیں شامل ہیں۔ جلوہ گر ہیں۔ ان مزاح نگاروں میں چند نام یوں ہیں۔ پطرس۔ رشید احمد صدیقی۔ شوکت تھانوی

حسن نظامی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، فکر تونسوی، شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا، احمد جمال پاشا، وغیرہ وغیرہ۔

ان چوبیس مزاحیوں میں نہ تو موضوع تکرار آتا ہے اور نہ تکرار ہے اور سچویشن کی تکرار ہے۔ ہر مزاحیہ اپنی انفرادیت رنگ و آہنگ اور مواد کا تنوع رکھتا ہے۔ اور جہاں وہ متعلقہ مزاح نگار کی تحریر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کتاب میں دوسرے مزاحوں سے کئی اعتبار سے ممیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ 'اردو کے عصری مزاح و طنز کے کئی انتخاب اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ اعلیٰ نثری مزاحیوں کا یہ غالباً پہلا اور واحد انتخاب ہے جو بھرپور دلکشی شگفتگی اور انفرادیت رکھتا ہے۔ آج کے گھٹن کے دور میں یہ انتخاب کئی زاویوں سے خوش آئند ہے اور مؤلف یقیناً تحسین کا مستحق ہے۔

—— یوسف ناظم

دائرے (شمارہ ۴)

قیمت: ۱۰ روپے

ملنے کا پتہ: ۱۰۱-اے، نذیر احمد روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

دائرے کے چوتھے شمارے میں، اسعد بدایونی، جو اس رسالے کے مرتبین میں شامل ہیں۔ اپنے اداریے بعنوان "زاویہ" میں کہتے ہیں کہ ہمارے نقاد، پچاس سال کی عمر تک پہنچنے کے باوجود، ایلیٹ، رچرڈز، ایمپسن، ٹیٹ وغیرہ وغیرہ سے پیچھا چھڑا نہیں سکے اور آج بھی اردو ادب کو آنکنے اور پرکھنے کے لیے انہی پیمانوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جو اہلِ مغرب نے وضع کر رکھے ہیں۔ بات واقعی معقول ہے اور کان چونکا دینے والی لیکن افسوس کہ اس شمارے کے مشمولات سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر شکوہ محسن مرزا کا مضمون "فکشن کی حمایت میں" جو ۲۰ صفحات پر حاوی ہے۔ جا و بیجا مغربی مصنفین کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ بظاہر یہ مضمون شمس الرحمان فاروقی کی کاٹ کے لیے لکھا گیا ہے۔ لیکن بباطن اپنی ہمہ دانی کا مظاہرہ کرنا مقصود ہے۔ مضمون کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موضوع کی جزئیات، محسن مرزا کے قابو سے باہر ہوگئیں اور وہ اس طرح دلیلوں پر اتر آئے کہ غزل کا فلاں شعر کسی قاری کو سنایئے تو وہ مزید شعروں کو سننے پر اصرار کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے۔

اس شمارے کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ مرتبین نے 'اردو تنقید کے بارے میں ایک مباحثہ بھی رکھا ہے۔ لیکن موضوع کا عنوان غلط ہے اسعد بدایونی، نقاد کو اردو ادب کا غیر اہم آدمی سمجھتے ہیں اور ان کی کچھ باتیں دل کو لگتی بھی ہیں لیکن یہ انتہا پسندی ٹھیک نہیں ہے۔ نقاد غیر اہم تو نہیں، ثانوی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور اس کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اب یہ اور بات ہے کہ اردو والوں نے یہ ترتیب بدل دی۔ اس طرح کے مباحثے، عام طور پر نتیجہ خیز نہیں ہوتے اور اس مباحثہ کے شرکا بھی، اختلاف رائے پر متحد ہیں۔

شمارے میں ۴ افسانے شامل ہیں۔ اور افسانوی حصہ، منظومات کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے اور سب سے اچھی کہانی، جوگندر پال کی "لو" ہے۔ جوگندر پال، زندگی کی تلخیوں کو حلاوت آمیز بنانے کے گر سے واقف ہیں اور یہی ان کے فن کی پہچان بھی ہے۔ سعید نجفی کے افسانے سے مشرقِ وسطیٰ کی خونریز سیاست کا علم ہوتا ہے۔ وہ واقعات کو ایک با معنی لڑی میں پرونے اور کہانی کہنے کے فن کو جانتے ہیں لیکن اگر وہ جزئیات پر بھی نظر رکھتے تو جو تھوڑی بہت جھول "زمین کی طہارت" میں در آئی ہے، وہ نہ آتی۔ مثلاً کہانی کے ہیرو، راکس احمد کو اسرائیلی سپاہی، گرفتار کر لیتے ہیں اور اس کی محبوبہ، نورا جو دراصل اسرائیل کی جاسوس ہے، اس سے صحرائے سینا میں مصر کے راکٹ اڈے کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ اس پر راکس احمد جیب سے نقشہ نکالتا ہے۔ سعید نجفی کو معلوم ہونا چاہیے کہ فوجیوں یا دشمن کے کسی شخص کو گرفتار کرنے کے فوراً بعد اس کی جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر "زمین کی طہارت" ایک اچھا افسانہ ہے اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ سعید نجفی، ایرانی ہونے کے باوجود، اردو میں لکھتے رہیں گے۔

ایک مضمون، توصیف تبسم کی غزلوں کے بارے میں ہے۔ مضمون نگار، ذکاالدین شایان نے کوشش تو بہت کی کہ توصیف کی انفرادیت سامنے آجائے لیکن بات نہیں بن سکی اور انہیں بالآخر بین السطور کہنا ہی پڑا کہ داخلی آنچ کی گلباریوں کے باوصف یہ غزلیں، رسمی لہجے کے معیار کی زیادہ پابند ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ توصیف تبسم کا لہجہ ابھی تک نہیں بن پایا اور ان پر فیض کا اچھا خاصا اثر ہے۔ جسے جاتے جاتے دیر لگے گی۔ بطور نمونہ یہ شعر دیکھیے:

صرف تُو، ہوتا تو تیرا وصل کچھ مشکل نہ تھا
کیا کریں تیرے سوا کچھ ہم نے چاہا اور بھی

اس شعر کو دیکھیے اور فیض کی نظم کا یہ مشہور مصرع یاد کیجیے۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" میری بات کا ثبوت مل جائے گا۔

دائرے کے اس شمارے کا دلچسپ ترین پہلو، وہ خط ہے جو ساقی فاروقی نے نہ جانے

سب اور کہاں سے افتخار عارف کے نام لکھا ہے۔ اس خط کی اشاعت کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خط کی اشاعت سے اُن اثرات کو زائل کرنا مقصود ہے جو افتخار عارف نے بھارت میں اپنے قیام کے دوران پیدا کیے تھے اور جن کا ایک نتیجہ قومی آواز کے ضمیمہ میں عثمان غنی صاحب کے مضمون کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر افتخار عارف ٹیلی فون پر' سر سر کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو اس سے اُردو زبان و ادب کا کون سا مسئلہ سلجھ جاتا ہے۔ اس خط کے مندرجات سے اگر افتخار عارف کی قلعی کھلتی ہے تو دوسری طرف ساقی فاروقی کے بارے میں بھی کوئی خوشگوار تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ اسعد بدایونی کو ایسے خطوط کی اشاعت سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستانی شاعروں اور افسانہ نگاروں کو اپنی تشہیر کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی پلیٹ فارم کی تلاش رہتی ہے۔ اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کی طرح انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے کے چکر میں رہتے ہیں۔

تبصروں میں سب سے اچھا تبصرہ ابوالکلام قاسمی کی تصنیف "تخلیقی تجربہ" پر خورشید احمد کا تبصرہ ہے۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ رہا وزیر آغا کی کتاب "شام کی منڈیر سے" پر اسعد بدایونی کا تبصرہ تو یہ تبصرہ کم اور کتاب کی فروخت کا اشتہار زیادہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں اسعد بدایونی کا یہ کہنا کہ "تنقیدی مضامین کو ہاتھ لگائیے تو عمیق سمندر کا شکوہ دکھائی دے گا" محض حسن ظن ہے۔ اور حقیقت سے بعید۔ اس عمیق سمندر کی بیشتر موجیں' اہلِ مغرب کے دریاؤں کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو پہلے ٹوئنی کی ہسٹری آف ہسٹری پڑھ لیں۔ اور بعد میں "اردو شاعری کا مزاج"۔

میں نے دائرے کے پچھلے تین شمارے نہیں دیکھے۔ لہٰذا ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس شمارے کے بارے میں جو تاثر' اداریہ پڑھ کر ہوتا ہے' وہ آخر تک برقرار نہیں رہتا۔ اور "ردِ عمل" پڑھ کر تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرتبین کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ بھی اپنے پیش رووں کی مٹی پلید کر کے' ان کی کرسیوں پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔ "ردِ عمل" سے' جو خطوط کا حصہ ہے' دوست نوازی اور بھائی بندی کی بو بھی آتی ہے۔ جوگندر پال کے افسانے "بو" میں مردہ خانہ کی بو اسے زیادہ شدید ہے۔ سب کچھ وہی ہے جو ہم نے چھٹی اور ساتویں دہائی میں دیکھا تھا یعنی "تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ"

——— صہبا وحید

غیر مسلم شعراے بدایوں

مرتبہ: شاداب ذکی بدایونی

صفحات: ۱۹۲

قیمت: ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ: ذکی منزل' محلہ سوتھا بدایوں (یو۔پی)

بعض مستند محققین نے جو اصول تحقیق وضع کیے ہیں اگر ان پر پوری طرح کاربند رہا جائے تو اچھی تحقیق تو ہو سکتی ہے مگر قصبات اور اردو کے اہم ترین مراکز کی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی اب ایسے مراکز اور قصبات میں نہ تو پرانے لوگ ہیں نہ اولین ماخز نہ ہی ثقہ شہادت۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ تذکرہ غیر مسلم شعراے بدایوں کا کیوں ہے۔ مسلم شعراے بدایوں کا کیوں نہیں بحث اس سے ہے کہ مرتب نے اس کے لیے کتنی محنت کی۔ بالعموم چھوٹے مقامات سے اس نوعیت کے جو تذکرے مرتب ہوتے ہیں ان کے مرتبین آداب ترتیب و تدوین سے بے خبر ہوتے ہیں۔ مگر اس سے ان کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا' شاداب ذکی ترتیب و تدوین کے آداب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ پھر موضوع بھی انھوں نے ایسا منتخب کیا کہ جس کا ایک ایک صفحہ لکھنا ایک ایک تفصیل فراہم کرنا ہفت خواں طے کرنے سے کم نہیں ہوتا۔

اس کتاب پر بہت سیر حاصل گفتگو تو کوئی بدایونی ادب سے شغف رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ مگر چند عمومی باتیں جو مجھے عرض کرنا ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر مرتب اس میں تاریخی تواتر کو ملحوظ رکھتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کتاب پر جن دو اصحاب کے مضامین شامل ہیں ان کی ادبی حیثیت مسلّم مگر وہ بدایونی ادب سے تقریباً غیر متعلق ہیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ مضامین وہ اطہر کمالی صاحب' ظہیر صدیقی صاحب یا دیگر کسی پرانے آدمی سے تحریر کراتے۔ کمالی صاحب پرانے آدمی ہیں بہت محفلیں دیکھی ہیں اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کے مالک ہیں اور آج کل غالباً بدایوں ہی میں قیام پذیر ہیں۔

بہر حال! شاداب ذکی کا یہ کام ہر طرح قابلِ ستائش ہے اور اُمید ہے کہ وہ آئندہ اس خاک میں دفن دوسرے خزانوں کی بازیافت بھی کریں گے۔

——— اطہر فاروقی

رشتوں کا بوجھ

افسانہ نگار : خورشید ملک
صفحات : ۱۸۴
قیمت : ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ : خورشید ملک ــــــ، تارین ٹکی، شاہ جہاں پور۔

افسانے اور حیاتِ انسانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان کی زندگی افسانے کے بغیر نامکمل ہے اور افسانہ انسانی زندگی کے بغیر ادھورا ہے۔ مرحوم بیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ افسانے کو شاعری سے زیادہ ڈسپلن کی ضرورت ہے۔

افسانہ زندگی کی تفسیر کو بیان کرتا ہے چنانچہ ایک کامیاب افسانہ وہی ہے جس کو قاری اپنے قرب وجوار کی گرفت میں محسوس کرے

زیرِ نظر کتاب خورشید ملک کے ۲۷ افسانوں پر مشتمل ہے۔ "یورپ سے یورپ" افسانے کو چھوڑ کر تمام افسانے یو۔پی کے متوسط گھرانوں کی کہانیاں ہیں۔ افسانوں کے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ "ایک خط" میں جوان عمر فریدہ نے اپنے شوہر پر جو ہندوستان سے باہر محض دولت کمانے کے لیے چلا جاتا ہے، بڑا تیکھا طنز کیا ہے۔ یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے:

"میرے سرتاج! آج آخری استدعا یہ ہے کہ خدا کے لیے عادل اور شعیب کو مزید کمانے کے لیے کسی دوسرے ملک نہ بھیج دیجیے گا۔"

• "جذبات کی صلیب" ایک نفسیاتی تجزیے پر مبنی ہے۔ ظاہری حسن اپنی جگہ لیکن حسن کا ایک داخلی معیار بھی ہوتا ہے۔ "یاسمین" کی نظر میں بدصورت فیض، اپنے حسن کردار سے خوبصورت بن چکا تھا۔ یاسمین فیض کو قبول کر چکی تھی۔ مگر مصنوعی روپ دیکھ کر اسے دھکا لگتا ہے۔

• "مانگے کا اُجالا" عورت کی جنسی نفسیات کا عکاس ہے۔ بامحاورہ افسانے کے قارئین کے لیے "رشتوں کا بوجھ" دلچسپی کا حامل ہوگا۔

ــــــ دلیپ بادل

اُردو خبر نامہ

اُردو اساتذہ کا مشاعرہ

۵ ستمبر کو شام ۶ بجے اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ہر سال کی طرح اس برس بھی یومِ اساتذہ کے موقع پر اُردو اساتذہ کے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ مشاعرہ نئی دہلی کے پیارے لال بھون میں ہوا۔ مشاعرے میں ان شعرا اور شاعرات کو مدعو کیا گیا تھا جو دہلی کے اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں۔ مشاعرے کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت برائے ٹیکسٹائل جناب رفیق عالم صاحب نے کیا۔ جناب کلانند بھارتیہ ایگزیکیٹو کاؤنسلر (تعلیمات) نے مسندِ صدارت کو رونق بخشی۔ جناب کرنل بشیر حسین زیدی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت فرمائی اور پروفیسر عنوان چشتی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے میں تقریباً ۳۰ شعرا اور شاعرات نے اپنا کلام سنا کر باذوق سامعین کی کثیر تعداد کو محظوظ کیا۔ جناب رفیق عالم، جناب کلانند بھارتیہ اور جناب کرنل بشیر حسین زیدی نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں اُردو کے کردار پر روشنی ڈالی اور ان کوششوں کا ذکر کیا جو حکومت اس زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے کر رہی ہے۔ تینوں حضرات نے اردو والوں سے یہ اپیل بھی کی وہ اپنے طور پر بھی اپنے ملک کی اس ہر دلعزیز زبان کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں اور اسے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ جگہ دیں جس کی یہ مستحق ہے۔ سکریٹری اکادمی کے شکریے پر یہ محفل مشاعرہ اختتام پذیر ہوئی۔

تصویر میں بائیں سے، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر عنوان چشتی (ناظم مشاعرہ) مرکزی وزیر جناب رفیق عالم (موصوف نے مشاعرے کا افتتاح کیا) کرنل بشیر حسین زیدی (مہمانِ خصوصی) جناب کلانند بھارتیہ (صدر مشاعرہ) جناب بشیر جھنجھانوی اور جناب مغیث الدین فریدی نمایاں ہیں۔

اُردو اکادمی، دہلی کا جلسۂ تقسیم انعامات

۱۳ ستمبر کو دہلی کے لفٹیننٹ گورنر اور اُردو

محترم لیفٹیننٹ گورنر اور محترم چیف ایگزیکٹو کونسلر جلسے سے مخاطب ہیں

اکادمی دہلی کے چیرمین جناب رومیش بھنڈاری نے حاضرین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں کہا کہ اُردو ہمارے اتحاد کی علامت بن چکی ہے۔ وہ دہلی اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام دہلی کے مصنفین کی ۱۹۸۷ء کی منتخب اردو تصانیف پر انعامات کی تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ موصوف نے اپنے دستِ مبارک سے اردو کے ۱۴ مصنفین اور دو ناشرین کو انعامات تقسیم کیے۔ مصنفین کو جو انعامات دیے گئے ان میں دس انعامات ۳ ہزار روپے اور ۴ انعامات ڈیڑھ ہزار روپے اور توصیفی سند پر مشتمل تھے۔ ناشرین کے انعامات تین تین ہزار روپے پر مشتمل تھے۔ بھنڈاری صاحب نے انعام یافتگان کو مبارکباد دی اور کہا کہ اُردو اکادمی نے ایوارڈ حاصل کرنے والوں کی عزت نہیں بڑھائی بلکہ ایوارڈ یافتگان نے اکادمی کی عزت

انعام یافتگان لیفٹیننٹ گورنر اور چیف ایگزیکٹو کونسلر کے ساتھ

بڑھائی ہے۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اُردو اکادمی کی دارا شکوہ لائبریری عوام کے لیے ۱۴ ار نومبر سے کھل جائے گی۔ اور ہماری کوشش ہوگی کہ لائبریری کی کتابوں میں تیزی سے اضافہ کیا جائے۔ تقریب کے صدر، دہلی کے چیف ایگزیکیٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے دہلی کی تینوں اکادمیوں کے کاموں کی ستائش کی اور اعلان کیا کہ انعامات کی رقم آئندہ برس سے ۴ ہزار اور ۲ ہزار کردی جائے گی۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے زور دیا کہ کسی صلے کی پرواہ کیے بغیر اُردو کی خدمت کی جانی چاہیے۔

ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں مولانا وحیدالدین موجود نہیں تھے۔ ان کا ایوارڈ ان کے لڑکے نے حاصل کیا۔ دیگر ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں جناب مجتبیٰ حسین، محترمہ آمنہ ابوالحسن، جناب مجیب رضوی۔ جناب شجاع خاور، جناب نوین سوری، ڈاکٹر محمد اکرام خاں۔ جناب عقیل الغروی۔ جناب عقیل احمد۔ ڈاکٹر علاؤالدین خاں۔ محترمہ شاننا گرو، جناب عطاالرحمٰن قاسمی۔ جناب پریم نارائن سکسینہ راز اور جناب ارتضیٰ کریم شامل تھے۔ منشی نول کشور ایوارڈ برائے ناشرین سیمانت پرکاشن کی طرف سے جناب نریندر ناتھ سوز اور ادارہ فکر جدید کی جانب سے جناب ایم کمار نے حاصل کیے۔

جناب نوین سوری نے لیفٹننٹ گورنر کو روزنامہ ملاپ کی طرف سے تین ہزار روپے کا چیک پیش کیا اور اسے اردو کے کسی ضرورت مند طالب علم کو دینے کی اپیل کی۔ ابتدا میں اکادمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی نے استقبالیہ تقریب میں انعام پانے والوں کو مبارکباد دیتے ہوئے اکادمی کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔ اس تقریب کے بعد ممتاز گلوکار صاحب سنگھ نے غزلیں پیش کیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد انعام

مولانا ابوالکلام آزاد صدی کے موقع پر اس سال سے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے ہر سال پندرہ ہزار روپے کا ایک انعام اتر پردیش اردو اکادمی ہندوستان کے کسی مصنف کو پیش کرے گی۔ یہ فیصلہ اتر پردیش اُردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے اپنی ایک میٹنگ میں کیا ہے۔

(پریس ریلیز)

خواجہ احمد عباس نگر اور حالی ایوارڈ

پانی پت (ہریانہ) مولانا الطاف حسین حالی کو خراجِ عقیدت کے طور پر ہریانہ سرکار نے قومی سطح پر سالانہ "حالی ایوارڈ" قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۱۵ ہزار روپے پر مشتمل یہ اعزاز ہر سال ملک کے ایک ایسے ادیب کو دیا جائے گا جس نے مجموعی طور پر اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے نمایاں خدمات سر انجام دی ہوں۔ ہریانہ کے وزیر اعلیٰ چودھری دیوی لال نے یہ اعلان مولانا حالی اور خواجہ احمد عباس کی جنم بھومی پانی پت میں خواجہ احمد عباس کی شخصیت پر دو روزہ کل ہند سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا ہریانہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۳۰ اور ۳۱ اگست کو منعقدہ اس سیمینار میں ملک بھر کے چالیس سے زائد ادیبوں، ایڈیٹروں، صحافیوں، شاعروں اور نقادوں نے شرکت کی۔

چودھری دیوی لال نے یہ اعلان بھی کیا کہ تاریخی شہر پانی پت کے اس علاقے کا نام "خواجہ احمد عباس نگر" رکھا جائے گا۔ جہاں مولانا حالی اور ان کے نواسے خواجہ احمد عباس کا آبائی مکان واقع ہے۔

ہریانہ اردو اکیڈمی کے سکریٹری اور مشہور ناول نگار کشمیری لال ذاکر نے اکیڈمی کے کاموں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ہریانہ میں اردو تعلیم کے بندوبست، اردو ادیبوں کی تصنیفات کی اشاعت اور ضرورت مند بزرگ ادیبوں اور شاعروں کی مالی اعانت کے لیے بھی اکیڈمی نمایاں خدمات سر انجام دے رہی ہے۔

پروفیسر نوگندر پال نے مقالوں کی اولین اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس کو آنے والے ادیبوں کا رہنما قرار دیا۔ سیمینار کا افتتاحی مقالہ پڑھتے ہوئے نامور ادیب اور صحافی ظفر پیامی (دیوان بیریندر ناتھ) نے کہا کہ خواجہ احمد عباس بیک وقت افسانہ نگار، ناولسٹ، ڈرامہ نویس، انشاپرداز ہونے کے علاوہ اردو ہندی اور انگریزی کے سرکردہ صحافی بھی تھے۔ اور ملک کے اہم ترین فلم ڈائرکٹروں، فلمی کہانی نویسوں اور فلم پروڈیوسروں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ اتنی ہمہ جہت شخصیت اُردو کے کسی اور ادیب کی نہیں تھی۔

مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے تاثراتی مضمون میں خواجہ احمد عباس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔ خواجہ احمد عباس ان معدودے چند شخصیتوں میں سے تھے جن سے کبھی ملاقات نہ بھی ہو تو بھی گہری شناسائی لگتی ہے۔ برعکس ان لوگوں کے جن سے میل جول بڑھنے کے ساتھ ساتھ دوری بڑھتی جاتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی بھتیجی اور خواجہ غلام السیدین کی صاحبزادی محترمہ ذکیہ ظہیر نے اپنے چچا کی ذاتی زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک

ایسی شخصیت کا خاکہ پیش کیا جو "بیک وقت عالم بھی تھی اور بچوں کی طرح معصوم بھی"۔

مشہور کہانی کار رتن سنگھ نے خواجہ احمد عباس کو کہانی کی دنیا کا ایسا کرم یوگی قرار دیا جس کے لیے انسانی خدمت سب سے بڑی عبادت تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ خواجہ صاحب کی اہم ترین کہانیوں کا انتخاب ہونا چاہیے جس سے یہ ثابت ہوگا کہ ان کا مقام اپنے کسی بھی ہم عصر سے کم نہیں تھا۔

بیسویں صدی کی جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے خواجہ احمد عباس کے فن میں طنز و مزاح کے عنصر کو نمایاں کیا اور ڈاکٹر تنویر احمد خاں نے خواجہ صاحب کے ادبی نظریات کو ان کی سب سے بڑی طاقت قرار دیا۔ افسانہ نگار شری اوم کرشن راحت نے اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ خواجہ صاحب جتنے بڑے ادیب تھے اتنے ہی مخلص دوست اور مکمل انسان بھی تھے۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

اردو کتب، اخبارات اور رسائل کی خریداری
اُترپردیش اُردو اکادمی کو درخواستیں مطلوب

لکھنؤ ۲۱ ستمبر۔ اترپردیش اُردو اکادمی کو اترپردیش کے ان رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں / دارالمطالعوں سے جنھیں قائم ہوئے کم سے کم دو سال کا عرصہ ہو چکا ہو نیز ان ڈگری / پوسٹ گریجویٹ کالجوں سے جنھوں نے تعلیمی سال رواں ۸۹-۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ ڈگری سطح پر اردو سیکشن کھولے ہوں، اردو کتابیں اخبارات اور رسائل خریدنے کے لیے مالی امداد دینے کی غرض سے اکادمی کے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ یہ فارم دفتر اترپردیش اُردو اکادمی سے بلا قیمت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اکادمی میں درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ نومبر ۱۹۸۸ء ہے اُس کے بعد موصولہ کوئی درخواست قبول نہ کی جائے گی۔

(پریس ریلیز)

آندھرا پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

حیدرآباد۔ اُردو تلگو کونسل نے ریاستی سرکار سے اپیل کی ہے کہ وہ فوری طور پر حیدرآباد میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کرے ساتھ ہی ان دوسرے علاقوں میں بھی اُردو کو باضابطہ دوسری سرکاری زبان بنایا جائے جہاں اردو والوں کی آبادی ۳۰ فیصد ہو۔ جنرل سکریٹری علی بن بدر کی پیش کردہ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ چیف منسٹر مسٹر این۔ ٹی۔ راما راؤ نے یکم اگست کو اعلان کیا تھا کہ حکومت ریاست میں جہاں بھی ۳۰ فیصد آبادی ہو وہاں اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دے گی اور خود چیف منسٹر کے مطابق حیدرآباد میں اردو مادری زبان والوں کی تعداد ۴۳ فیصد ہے قرارداد میں کہا گیا ہے کہ حیدرآباد میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے ساتھ ہی آر۔ ٹی۔ سی بسوں، دفاتر، ریلوے اور بس اسٹیشنوں، ہوائی اڈہ، بلدی پولیس کارروائیوں، عدالتی کاروبار اور تمام دیگر امور میں لازمی طور پر تلگو اور اُردو کا استعمال ہونا چاہیے۔

ایک اور قرارداد کے ذریعے جسے جناب اسمٰعیل الرب انصاری نے پیش کیا حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ اُردو مدارس کی حالت کو درست کرکے نصابی کتب فراہم کرے، اردو اکادمی کے حالات کو سدھارے اور اردو کاز کو آگے بڑھائے۔

(منصف، حیدرآباد)

کرناٹک میں اُردو کے مسائل

گلبرگہ۔ کرناٹک اُردو اکادمی نے اپنے دستور کی روشنی میں ایک رابطہ کمیٹی قائم کی ہے جو ریاست میں اردو کے مسائل کا جائزہ لے کر ایک مبسوط یادداشت حکومت کو پیش کرے گی۔ یہ انکشاف صدر اکادمی ڈاکٹر لئیق صلاح صاحبہ نے انجمن ترقی اُردو گلبرگہ کے جلسۂ تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کے لیے متحدہ جدوجہد کے ساتھ حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سہولیات سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اُردو تحریک سے وابستہ اصحاب اور اساتذہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو مدارس میں داخل کرائیں۔ ورنہ دو عملی اُردو کے ساتھ ساتھ ہمارا مستقبل بھی تباہ کردے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ دہلی میں قائم شدہ بچوں کے ادبی ٹرسٹ نے کرناٹک اُردو اکادمی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کم عمر بچوں کے ادب کی اشاعت اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے سیمینار اور ورکشاپ کا انعقاد عمل میں لائے اکادمی بچوں کے لیے ایک انجمن کے قیام کے لیے بھی کوشاں ہے۔

(سیاست، حیدرآباد)

جامعۂ اُردو، علی گڑھ کے عہدہ داروں اور اراکین کا انتخاب

جامعہ اُردو، علی گڑھ کی مجلس عام کا ایک جلسہ ڈاکٹر رفیق زکریا کی صدارت میں انڈیا انٹرنیشنل

سینٹر، نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ جلسے میں سب سے پہلے جامعۂ اُردو کے آئین کے مطابق عہدہ داروں اور مختلف مجالس کے اراکین کا اگلے چار سال کے لیے انتخاب عمل میں آیا۔

حسب ذیل عہدہ داران بہ اتفاق رائے منتخب ہوئے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا (امیر جامعہ) جناب مالک رام (نائب امیر جامعہ) پروفیسر مسعود حسین خاں (شیخ الجامعہ) پروفیسر مختار الدین احمد (نائب شیخ الجامعہ) اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (اعزازی خازن)۔ نئی مجلسِ عام، مجلسِ منتظمہ، تعلیمی کمیٹی اور امتحان کمیٹی کی بھی تشکیل عمل میں آئی۔

جن کے اراکین کے چند خاص نام یہ ہیں:

۱۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔
۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔
۳۔ پروفیسر قمر رئیس۔
۴۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی۔
۵۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی۔
۶۔ پروفیسر حکم چند نیر۔
۷۔ پروفیسر قاضی عبدالستار۔
۸۔ پروفیسر مغنی تبسم۔
۹۔ پروفیسر محمد ذاکر۔
۱۰۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔
۱۱۔ ڈاکٹر عبدالمغنی۔
۱۲۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی۔
۱۳۔ ڈاکٹر ابوالفیض سحر۔
۱۴۔ ڈاکٹر آفاق احمد
۱۵۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی۔

(جامعۂ اُردو، علی گڑھ)

تامل ناڈو میں اُردو نشریات

نئی دہلی۔ جناب سید شہاب الدین ایم۔ پی نے وزیر اطلاعات و نشریات کو اپنا ایک شخصی مکتوب روانہ کیا ہے جس میں انھوں نے مدراس سے کی گئی ایک نمائندگی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ شکایت کی ہے کہ تامل ناڈو کے کسی بھی ریڈیو اسٹیشن سے اُردو زبان میں نشریات نہیں ہو رہی ہیں۔ حالانکہ ریاست تامل ناڈو کی جملہ آبادی میں چوتھی سب سے بڑی اقلیت اُردو زبان بولنے والوں کی ہے۔ جناب سید شہاب الدین نے اپنے مکتوب میں خصوصی طور پر یہ حوالہ بھی دیا کہ ریاست تامل ناڈو کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے ملیالم زبان میں نشریات ہو رہی ہیں۔ حالانکہ تمل ناڈو میں ملیالم بولنے والوں کی تعداد اردو بولنے والوں سے کم ہے۔ جناب سید شہاب الدین نے مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات سے اپیل کی ہے کہ وہ ازراہِ مہربانی تامل ناڈو کے عہدیداران آل انڈیا ریڈیو کو یہ ہدایت دیں کہ تامل ناڈو کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے کم از کم ہر ہفتہ ایک اُردو پروگرام نشر کریں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

گجرال کمیٹی سفارشات کی تکمیل کا مطالبہ

نئی دہلی۔ ترقی اُردو بورڈ نے حکومت سے اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے گجرال کمیٹی رپورٹ کی سفارشات پر تیزی سے عمل کرنے کا مطالبہ کیا ہے بورڈ کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے جناب سیف الدین سوز ایم۔ پی کی صدارت میں منعقد نشست میں کہا کہ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کو تمام وزرائے اعلا کو گجرال کمیٹی رپورٹ کے متعلق سرور کمیٹی کی تجاویز پر غور کرنے کی ہدایت دینی چاہیے۔ بورڈ کی اس نشست میں اراکین بورڈ، ڈائرکٹر آف اردو بورڈ اور وزارت فروغ انسانی وسائل کے اعلیٰ افسروں نے شرکت کی تھی۔ اس نشست میں قومی خبر رساں ادارے یونائیٹیڈ نیوز آف انڈیا کی اردو ٹیلی پرنٹر لگانے اور اردو خبر رساں ادارہ شروع کرنے کے اعلان کا بھی خیر مقدم کیا گیا اور کہا گیا کہ کمیٹی اس سلسلے میں یو۔ این۔ آئی کو مالی اعانت بھی دے گی۔ اور ہر طرح کی مدد بھی بہم پہنچائے گی۔ نشست میں فیصلہ کیا گیا کہ وزارت فروغ انسانی وسائل اور وزارتِ اطلاعات و نشریات سے اردو ٹیلی پرنٹر سروس کے سلسلے میں قریبی ربط رکھا جائے گا۔ محسوس کیا گیا کہ اردو ٹیلی پرنٹر سروس اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔ اسٹینڈنگ کمیٹی نے اردو انسائیکلوپیڈیا اور اردو انگریزی لغت کی ترتیب کے کام میں سرعت لانے کی ضرورت پر زور دیا۔

(سالار، بنگلور)

پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض

گورکھپور یونیورسٹی نے محترمہ درخشاں تاجور کو ان کے تحقیقی مقالے "ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ موصوفہ کا یہ مقالہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے ۱۹۴۷ء کے حصولِ آزادی تک کی تاریخ کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اور اس عرصہ میں ہمارے ملک کی طویل جدوجہدِ آزادی میں اردو زبان کی شاعری کا جو ناقابلِ فراموش حصہ رہا ہے اس پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا گیا ہے۔

زیب غوری کی یاد

کانپور میں شاعر زیب غوری کی تیسری برسی کے موقع پر ان کی یاد میں ایک سیمینار اور شعری نشست کا انعقاد "زیب غوری لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی" کی جانب سے ڈاکٹر عبدالحلیم پرنسپل حلیم کالج کی رہائش گاہ پر ہوا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر علی رضا حسینی نے کی۔ . . .

تسکین زیدی نے کہا کہ ہمیں اس طرح جلسے کر کے مرحومین کی یاد کو تازہ کرنا چاہیے۔ زیب غوری جس تیزی سے شہرت اور بلندی کی طرف گامزن تھے شاید انھیں کسی کی نظر لگ گئی اور وہ دیارِ غیر میں جا کر ہم سے بچھڑ گئے۔

اس کے بعد انھوں نے نامی انصاری کا مضمون "زیب غوری کی شخصیت ایک اجمالی خاکہ" پڑھ کر سنایا۔ عارف محمود نے اپنے مقالے میں کہا کہ زیب غوری ایک زندہ جاوید شخصیت کا نام ہے جو ہم سے بچھڑ کر بھی ذہنوں میں زندہ ہے ان کے یہاں بھرپور عصری آگہی ملتی ہے۔

حضرات ابوالحسنات، ابوالبرکات نقلی، قاسمی جنید۔ ظفر اقبال۔ اور ظفر اکبرآبادی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

شعری نشست میں مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

(تسکین زیدی)

"شاعر" کا ضخیم اقبال نمبر

علامہ اقبال کی پچاسویں برسی (۱۹۳۸ء: ۱۹۸۸ء) کی مناسبت سے اُردو کا سب سے اہم اور قدیم علمی و ادبی جریدہ ماہنامہ "شاعر" ستمبر میں اپنا ضخیم و عظیم اقبال نمبر شائع کر رہا ہے۔ اقبال پر شائع ہوئی کتابوں اور رسائل پر خصوصی نمبروں کی بھیڑ میں ایک فقید المثال نذرانۂ عقیدت۔ ہندوستان میں شخصیات پر خوب سیرت اور ضخیم خاص نمبروں کی ادبی روایت کی ابتدا اور اس کی توسیع شاعر کا ایک اور تاریخی کارنامہ۔

اقبال نمبر میں شجرۂ اقبال، توقیتِ اقبال، اقبال البم، ہند و پاک کے مشاہیر قلم کاروں کے تازہ و غیر مطبوعہ مضامین۔ اقبال کی دو مشہور نظمیں "ترانہ ہندی" اور "مسجد قرطبہ" پر ادبی فیچر۔ سفرنامہ دکن، تصاویر اور ۳ غیر مطبوعہ خطوط کے عکس۔ اقبال کے شاہین کے تحت گوشۂ لمعہ حیدرآبادی، اقبال کے معنوی شاگرد افسر سیمابی اور آزاد اقبال (نبیرۂ اقبال) کے متعلق نہایت ہی اہم معلومات۔ دو مکمل کتابیں: اکبری اقبال اور خدوخال اقبال (امین زبیری) کے عکس مظلوم اقبال (شیخ اقبال احمد) میں شامل اقبال کے ۱۰۳ خطوط پہلی بار شاعر کے صفحات پر۔ مظلوم اقبال پر ایک تبصرہ اور ایک بحث طلب مقالہ "قصہ ایک خط کا ......" ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تحقیقی کاوش "اقبال یورپ میں" سے کئی اہم مضامین کے ساتھ اقبال کے ۲۷ مکاتیب بنام مس ایما ویگے ناسٹ کے جرمن انگریزی خطوط کا متن مع ترجمہ۔ یورپ میں اقبال کی نادر و نایاب تحریروں، کتابوں اور مختلف سوانح دستاویزات کے عکس۔ تصانیف اقبال کے اولین نسخوں کے عکس مع تحقیقی و توصیفی مطالعہ و جائزہ نوادرات کے تحت اقبال کے پانچ نو دریافت غیر مطبوعہ خطوط بخط اقبال۔ نایاب کتب و رسائل سے اقبال کی تحریروں کے عکس۔ بخط اقبال کئی نایاب خطوط کے عکس۔ اقبال کے اعزا کے خطوط ان کے عکس مع تعلیقات۔ اقبال کی ازدواجی زندگی کے متعلق نئی تحقیقی معلومات۔ مکتوب اقبال بنام جناح۔ (انگریزی خط، متن اور ترجمہ) مکتوب بنام مس بینیسی آرنلڈ (انگریزی خط، متن اور ترجمہ) اقبال کی نو دریافت چند نایاب تحریریں، اشعار اقبال بخط اقبال۔ "اقبال اور عصری اردو شاعری" کے موضوع پر ایک گراں قدر علمی مذاکرہ جس میں ۶۷ نئے پرانے قلم کاروں نے حصہ لیا! اسی موضوع پر پانچ طویل مگر بحث طلب مقالے۔ اقبال نمبر کا ایک وقیع باب "مزید روشنی" جس میں اقبال کے متعلق اقتباسات، شذرات، تحقیقی تجزیے، اشارے اور حوالے، تفہیم اقبال کے تحقیقی ماخذات اقبال پر نئی مطبوعات کی تفصیل و تبصرے۔ نصف صدی کو محیط اقبال پر شائع ہوئی۔ قابلِ ذکر کتابوں اور مضامین کا جدید اشاریہ۔ اقبال نمبر کا اشاریہ قلم کاروں کی تصاویر۔ مکاتیب اقبال بخط اقبال۔ عالمی شہرت یافتہ مصور صادقین کی خطاطی کی تشکیل اشعار اقبال سے مزین ابواب۔ اقبال مہدی کی فنکاری اقبال پورٹریٹ شاعر کا دیدہ زیب سرورق کئی رنگوں میں۔ ان سب کے علاوہ بھی بہت کچھ شاعر کے اقبال نمبر میں ملاحظہ کیجیے۔

۶۰۰ سے زائد صفحات کا اقبال نمبر ۱۹۸۸ء کا سب سے عظیم ادبی کارنامہ جس کی گونج مدتوں سنائی دے گی۔ اپنے شہر کے کتب فروش سے اقبال نمبر خریدیے یا رابطہ قائم کیجیے۔

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۸۔

آپ کی رائے

● "ایوانِ اُردو دہلی" درحقیقت اُردو کا بہترین ترجمان ہے۔ کتنے ہی رسالے پڑھے مگر جن خصوصیات کا حامل یہ رسالہ ہے۔ وہ کہیں نظر نہ آئیں۔ میں ادب کی طرف سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں کہ رسالے پڑھنا جو میرا اہم مشغلہ تھا اب اس سے بھی نفرت ہونے لگی تھی مگر جُوں جُوں "ایوانِ اُردو دہلی" سے قریب ہوتا گیا۔ نفرت محبت سے بدلتی گئی۔

—— محمد رئیس عالم، بھوپال

● "ایوانِ اُردو دہلی" اور "اُمنگ" کے پسندیدہ ہونے کا حال یہ ہے کہ ہمارے ماہانہ بجٹ میں ان کے نام سرفہرست ہیں۔ ہر مہینے کے تیسرے عشرے سے ہی ہم تازہ شمارے کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ میری سب سے چھوٹی بہن طیبہ تو "اُمنگ" کے نئے شمارے سے اس طرح چمٹتی ہے کہ کھانا پینا بھی بھول جاتی ہے۔ میرے گھر میں "ایوانِ اُردو دہلی" اس وقت سے آنا شروع ہوا جب آپ نے 'خواجہ احمد عباس نمبر' شائع کیا تھا۔ آپ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نمبر شائع کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں، یہ ایک مستحسن امر ہے۔ 'حرفِ آغاز' نے تو ہمارے مُنہ کی بات چھین لی۔ اُردو کا سچا ہمدرد اور مخلص ہی ایسی باتیں لکھ سکتا ہے۔

آپ کا ادارہ اور آپ کا رسالہ اُردو کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ 'ہم طرح اشعار' کے سلسلے کو اگر آپ کے رسالے کی رُوح کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ اس کی شہرت و مقبولیت کا اہم سبب ہے۔

—— مرزا محمد الحسنی بیگ شاداب، مظفرپور

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا میں ایک قدیم قاری ہوں۔ اُردو کے طالب علموں کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔ افسانے، "ہم طرح اشعار" اور اندرونی صفحے کی تصویر کی مناسبت سے جو شعری اور نثری عنوان تجویز کرنے کے سلسلے آپ نے شروع کیے ہیں وہ واقعی اُردو داں طبقے کے اندر ایک نئے عزم کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کرتے ہیں۔ ان کالموں کو برقرار رکھیں۔

—— ظہیر اکرام، ہزاری باغ

● ستمبر ۸۸ء کا شمارہ نظر نواز ہوا جناب خلیل تنویر کی مہیّا کردہ —— اختر شیرانی کی ریڈیائی تقریر "زندگی میری نظر میں" کو آپ نے "ایوانِ اُردو دہلی" میں دوبارہ شائع فرما کر اُردو کی نئی نسل پر ایک احسان کیا ہے۔ اُمیّد ہے کہ آئندہ بھی ایسی گرانقدر چیزیں "ایوانِ اُردو دہلی" کے ذریعے ہمیں دستیاب ہوتی رہیں گی۔

—— صدف جعفری، کلکتہ

● ستمبر کا تازہ شمارہ سرسری طور پر دیکھ رہا تھا کہ آخری ورق کے صفحے پر نظر پڑتے ہی ذہنی جھٹکا لگا۔ یقین جانیے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کے توسط سے ہی معلوم ہوا کہ ایک اور قادرالکلام شاعر عمیق حنفی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم موصوف کے متعلق محمود سعیدی صاحب نے اپنی مختصر تحریر میں بہت ساری باتیں قلم بند کی ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے اپنائیت ٹپکتی ہے۔ اُمید کہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں مرحوم موصوف کی شخصیت و شاعری پر مضامین بھی آئیں گے۔

اختر شیرانی کا مضمون "زندگی میری نظر میں" پڑھا۔ انھوں نے بے حد کھلے انداز میں اپنے خیالات و تفکرات کا اظہار کیا ہے۔ بے شک وہ ایک سچے اور اچھے شاعر تھے۔

حیات اللہ انصاری کا افسانہ 'اندھیرا اُجالا' سیدھا سادہ ہونے کے باوجود زندگی کی ایک سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ "خوابوں کی سرزمین" میں رضی احمد تنہا، حسین اور ثقیل الفاظ کے استعمال کے باوجود ذہن کو متاثر نہیں کر سکے۔ عام قاری تو کیا ذہین قاری بھی اسے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

کرشن ادیب، صدف جعفری، چندربھان خیال اور ارشد کمال کی غزلیں اچھی رہیں۔ نظم "عمر کا اُونچا پہاڑ" پسند آئی۔ مضمون "فنِ گداگری" دلچسپی سے خالی نہیں۔ "ڈھلتی عمر اور اس کے تقاضے" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

—— افتخار فہیم، کٹیہار

● ستمبر ۸۸ء کے شمارے میں جناب حیات اللہ انصاری کا افسانہ نظر نواز ہوا۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت ہی کامیاب تخلیق ہے۔ بہت دِنوں بعد اتنا دلچسپ افسانہ پڑھنے کو ملا۔ افسانہ نگار نے موضوع کے تمام پہلوؤں پر جس خوبصورتی اور چابکدستی سے روشنی ڈالی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کوئی نکتہ، کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ تمام جزئیات کو اس قدر خوش اسلوبی اور فنکاری کے ساتھ افسانے میں سمویا گیا ہے کہ ہر جملہ پر بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ سماج کی دکھتی رگوں پر اتنی ہوشیاری سے نشتر چلائے ہیں کہ درد کا احساس تک نہیں

ہوتا اور زخم کھل جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ موصوف کو اتنی ساری "اندر کی باتیں" کہاں سے اور کیسے معلوم ہوئیں۔ افسانہ طویل ہونے کے باوجود کہیں بوجھل نہیں ہوتا اور ہر ہر قدم پر اس کی دلچسپی بڑھتی ہی جاتی ہے۔

—— شاہین سہسرامی، سہسرام

● ستمبر ۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب اور محفوظ رکھنے لائق ہے۔ بزرگ افسانہ نگار حیات اللہ انصاری صاحب کے طویل افسانے "اندھیرا اُجالا" نے بہت متاثر کیا۔ موصوف نے اپنے افسانے میں موجودہ زندگی کے اندھیرے اُجالے کی عبرتناک داستان بیان کی ہے جس میں گروجی کی زبانی موجودہ سماجی برائیوں پر بھرپور طنز کیا ہے اور سدھو کے کردار کے ذریعے موجودہ سماجی ڈھانچے میں انسان کی بے بسی اور لاچاری کو اُجاگر کر دیا ہے۔ تسکین زیدی کا افسانہ بھی متاثر کرتا ہے۔

ڈھلتی عمر کے تقاضوں کے بارے میں ڈاکٹر شفقت اعظمی کا مضمون اچھا اور معلوماتی ہے اگر موصوف طبّی اصطلاحات کی (قوس میں) مختصر تشریح کر دیتے تو عام لوگ زیادہ مستفید ہو سکتے۔ فن گداگری پر جناب اسحٰق انصاری صاحب کا انشائیہ نہ دلچسپ ہے۔ خواجہ احمد عبّاس کی انگریزی ناول نگاری پر عین تابش کا مضمون بھی خوب ہے لیکن مختصر ہے۔

—— غلام نبی مومن، نیرل

● ستمبر کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا تنوع معنویت وجاذبیت ورق ورق بلکہ لفظ لفظ اور حرف حرف سے ظاہر ہے۔ "حرفِ آغاز" سے لے کر "ایک دوست کی جدائی" تک دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ خدا کرے کر بھنڈاری صاحب کے زیرِ قیادت اکادمی ترقی کی طرف گامزن رہے۔

عین تابش نے خواجہ احمد عبّاس کی شخصیت میں جن ابعاد ثلثہ کی نشاندہی کی ہے اس میں کا تیسرا رُخ (3rd Dimension) کافی چونکا دینے والا ہے۔ ڈاکٹر شفقت اعظمی کا مضمون "ڈھلتی عمر اور اس کے تقاضے" کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ لیکن دفاعی تدابیر بہت مختصر ہیں حالانکہ یہ حصّہ کافی تفصیل طلب تھا۔

—— شاہد صدیقی، لکھنؤ

● "ایوانِ اُردو دہلی" خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے آپ کے رسالے میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ایک عام قاری کو چاہیے خاص طور پر معلوماتی مضامین۔

—— امجد علی فیض، گلبرگہ

● میری ایک ناچیز رائے یہ ہے کہ "ہم طرح اشعار اور اندرونی صفحے کی تصویر کے عنوانات کے لیے جو صفحات وقف ہیں ان میں سے ثانی الذکر کے لیے جو صفحات ہیں انھیں ادبی شخصیات سے انٹرویو کے لیے وقف کر دیے جائیں تو یہ ایک مفید و مستحسن امر ہوگا۔

تازہ شمارے کے سارے مضامین اور تخلیقات معیاری اور معلوماتی ہیں۔

—— مغنی رضا، بھاگلپور

● مضامین، انشائیے، افسانے، نظمیں، غزلیں، ہم طرح اشعار، شعری اور نثری عنوانات، اُردو خبر نامہ، آپ کی رائے اور سب سے بڑھ کر حقیقت افروز "حرفِ آغاز" کیا صاف گوئی اور ایمانداری سے آپ بات کہتے ہیں۔

—— نوخیز فتحپوری، بھاگلپور

● "ایوانِ اُردو دہلی" کے صفحات بڑھائے جائیں۔ صفحات ۱۵۰ اور قیمت ۵ روپے کر دیں۔ صفحہ اوّل (Cover Page) پر کسی ادیب کا فوٹو ہو تو بہتر ہے۔ انٹرویو، مذاکرہ، نایاب (قدیم) کتب کے تلمیحات پر آپ توجہ کریں۔ سیمینار کے مقالوں کو بھی شائع کریں۔ اگر آپ خصوصاً بیرون ممالک کے سیمیناروں کے مقالے شائع کریں تو بہتر ہوگا۔ ان خیالات کو اظہار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ سے یہ ممکن ہے۔ اُردو خبر نامے کو بھی وسعت دیں۔

—— شیخ احمد کریم نگر

● کچھ نئے چہروں کو بھی آپ روشناس کرا رہے ہیں یہ ایک نیک شگون ہے۔ "ہم طرح اشعار" اور "شعری عنوانات" کے تحت کئی نئے پرانے شعر ذہن کو تر و تازہ کر جاتے ہیں۔ پرچے کی ترتیب کے کیا کہنے، آخری صفحے تک خالص ادبی۔

—— بھگوانداس اعجاز، نئی دہلی

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ کل ملا۔ "آپ کی رائے" کے تحت جناب ابرار احمد آرزو دستی پور سے لکھتے ہیں: "بہار کے سب سے بڑے جدید غزل گو جناب سلطان اختر کو کیا ہوگیا ہے جن کی غزل آپ نے سرفہرست شائع کی ہے موصوف کا ایک شعر ہے:

مری آنکھوں کے لب بھی ہل رہے ہیں
تری تصویر بھی کچھ بولتی ہے

کیا "آنکھوں کے لب" کی ترکیب درست ہے؟ اب اگر کوئی ہونٹوں کے کان لکھے تو آپ کیا کہیں گے؟"

آپ کچھ کہیں یا نہ کہیں البتہ میں آرزو صاحب کی ناقدانہ بصیرت کی داد ضرور دوں گا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آرزو صاحب کے نزدیک لفظ "لب" کے معنی صرف مُنہ کا وہ باہری حصّہ ہے جسے عام زبان میں ہونٹ کہتے ہیں حالانکہ لب کے معنی ہونٹ کے علاوہ کنارہ، حاشیہ اور منڈیر بھی ہوتے ہیں یہاں آنکھوں کے

ب' مژگاں کے لیے آیا ہے جسے عام فہم زبان میں پلک کہتے ہیں۔ وفورِ جذبات میں پلکوں کا ہلنا ایک فطری امر ہے۔

آگے چل کر آرزو صاحب اپنی "جراحی" کی صداقت میں ہونٹوں کے کان پیش کرتے ہیں۔ ان کی اس معصومیت پر صرف مسکرانے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے اگر میں کہوں کہ آنکھیں بولتی ہیں یا آنکھیں کہتی ہیں تو ممکن ہے کہ آرزو صاحب اس پر بھی اعتراض کریں کہ واہ صاحب جب آنکھیں بولتی ہیں تو ٹانگیں کیوں نہیں بولیں گی۔

—— قیصر ندیم، مظفر پور

● اگست ۸۸ء کا "ایوانِ اُردو" بغور پڑھا نتیجتاً ذہن میں کچھ اختلافی اور قدرے توصیفی تاثرات پیدا ہوئے، جن کا برملا اظہار اپنی غیر جانبدارانہ مجبوری سمجھتا ہوں ——

فضا ابن فیضی کی حمد، غزلوں کی فہرست میں شامل ہے۔ جب کہ محض غزل کے فارم میں لکھی گئی حمد/ نعت/ نظم ہرگز غزل قرار نہیں پاتی ہے۔ اگر یہ دانستہ فعل ہے تو اگلے شمارے میں اس کی وضاحت ہونی چاہیے اور غیر دانستہ ہے تو معذرت۔

سلطان اختر کی غزل میں برتی گئی ردیف "سی ہے میں" سی" فطری طور پر نہیں کھپ سکی ہے، بلکہ ایک دو شعر کے علاوہ تمام اشعار میں، بُری طرح کھٹکتی ہے، جو سراسر حشو قبیح ہے۔ میر تقی میر کا ایک لافانی شعر ہے:

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اس شعر میں "سی" ناگزیر ہے۔ اگر اسے ہٹا کر مصرعہ ثانی کو یوں کر دیں:

ساری مستی شراب جیسی ہے

تو بات بگڑ جاتی ہے، حالانکہ "سی" اور "جیسی" ہم معنی ہے۔

مگر سلطان اختر کی غزل کے معاملے میں بات بالکل الٹی نظر آتی ہے۔ غزل کا تجزیہ اس سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ مثال کے طور پر مطلع دیکھیں:

کئی صدیوں سے ایک ساعت رکی سی ہے
ابھی تک ان کے زیرِ لب ہنسی سی ہے

اس سے یہ لفظی مفہوم نکلتا ہے کہ —— "کئی صدیوں سے اک ساعت رکی نہیں ہے بلکہ رکی سی رکی جیسی اور ابھی تک ان کے زیرِ لب ہنسی نہیں ہے بلکہ ہنسی جیسی کوئی شے ہے" ایسا ابہام شاذ و نادر ہی شعری حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ حالانکہ وقت ساعت کی تغیر پذیری کے پیشِ نظر شاعر کا یہ کہنا کہ "کئی صدیوں سے گذرنے والی ایک ساعت رُکی نہیں ہے بلکہ رُکی سی محسوس ہوتی ہے" درست ہے اور اسی طرح یہ بات کہ "ان کے زیرِ لب ہنسی نہیں ہے بلکہ ہنسی جیسی کوئی شے (غیر معلوم) ہے۔ شعر میں کچھ حد تک تہہ داری ضرور پیدا کرتی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ بیان کے سقم کو ظاہر کرتی ہے، جو اوپر کے دونوں مصرعوں سے دائرہ بند "سی" کو خارج کرنے سے دُور ہو جاتا ہے، گرچہ غزل کا موجودہ وزن (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) تبدیل ہو کر (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ مذکورہ غزل کے آخری شعر کو چھوڑ کر "سی" کا استعمال کسی بھی شعر میں اس کی شدت یا تاثیر کو نہیں بڑھاتا ہے،

اب ظہیر صدیقی کی غزل دیکھیے۔ مطلع ہے:

موتی اچھال کر جو تہہ آب کھو گئے
بے درد ساحلوں کی بھی پلکیں بھگو گئے

یہاں "بھی" کی جگہ "وہ" لازمی ہے، مصرعہ اولیٰ کے "جو" کی مناسبت سے۔

پانچویں شعر کے مصرعہ اولیٰ میں:

خوابوں میں جھاگ ابھرتے رہے آفتاب کے

خوابوں میں آفتاب کے جھاگ چھوڑنے والی بات لمحہ بھر کے لیے قاری کو چونکا ضرور سکتی ہے، مگر اس مشاہدے یا تخیل کا شعری منطق سے کہیں علاقہ نہیں بنتا۔

آخری شعر کا مصرعہ اولیٰ توجہ طلب ہے:

ایسے شناوروں سے ہوا سابقہ ظہیر

"ایسے" کی جگہ "کیسے" شعر کو پُرزور اور پُراسرار بنا سکتا ہے۔ اسی طرح "سابقہ ہونا" کی بجائے "سابقہ پڑنا" با محاورہ ہے:

کیسے شناوروں سے پڑا سابقہ ظہیر

والی آسی سے اتنی ہلکی غزل کی توقع نہیں تھی۔ اسعد بدایونی اور دیپ بادل گوارا ہیں۔ شجاع خاور کی دوسری غزل مزے کی ہے۔ شجاع خاور لفظ "شجاع" کو 'مفاع' کے بجائے 'مفا' کے وزن پر بھی باندھتے ہیں۔ مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔ بہتر ہو کہ وہ 'مفا' کے وزن پر کوئی دوسرا لفظ مثلاً 'وفا' 'عطا' 'انا' وغیرہ "شجاع" کے بدلے اپنے نام میں شامل کرلیں۔ اس طرح "شجاع" کی صحت پر ان کا خاص احسان ہوگا۔

سید غلام سمنانی کی نظم اضافتوں کے بے سنبھال بوجھ تلے دب کر دم توڑتی محسوس ہوتی ہے۔ البتہ معصوم نظر زیادہ اور صابر فخر الدین کچھ حد تک متاثر کرتے ہیں۔

سریندر پرکاش نے پھر اُردو ادب کو ایک اچھی کہانی دی ہے۔ مظفر حنفی کا مضمون ... "اُردو میں دوہے" محض معلوماتی اور تنقید و تجزیہ سے کوسوں دور ہے۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ خورشید انور کا مضمون اچھا ہے۔ سلام بن رزاق کے مضمون کی

زبان کہیں کہیں کہانی کی زبان بن گئی ہے۔ یوسف ناظم کی "زود فراموشی" ناقابلِ فراموش ہے۔
نقوی صاحب کا اداریہ بے حد پسند آیا۔ انھوں نے "اردو تعلیم" کے تعلق سے بہت ہی کار آمد باتیں کہی ہیں۔ اردو دوستوں کا یہ اوّلین فرض بنتا ہے کہ ان تجاویز پر عمل پیرا ہوں۔

—— خورشید اکبر، پٹنہ

● ہندوستان میں کئی اُردو اکادمیاں ہیں۔ اور ان کے اپنے رسالے بھی نکل رہے ہیں۔ مگر ایوانِ اُردو اپنی مثال آپ ہے۔ اگست کے شمارے میں آپ کا یہ لکھنا صد فیصد درست ہے کہ "آپ اُسے (اپنے بچے کو) ہندی میڈیم سے پڑھائیں اور چاہیں تو انگریزی میڈیم سے لیکن ایک مضمون کے طور پر اُسے اُردو بھی پڑھوائیے یہ آگے چل کر اس کے حق میں ضرر رساں نہیں مفید ہی ثابت ہوگا۔" اِن جملوں میں کتنی خود اعتمادی جھلک رہی ہے۔

—— دلشاد عالم لاری، گورکھپور

● جولائی کے شمارے میں مظہر امام صاحب کا خط پڑھا۔ نام کے سلسلے میں مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ ڈاکٹر علیم کا پورا نام عبدالعلیم ہی تھا اور ان کے سارے مضامین اسی نام سے شائع ہوئے ہیں۔
علیم صاحب خود کو نمایاں کیے بغیر کام کرنا پسند کرتے تھے۔ نام و نمود سے اس قدر بے نیاز شخص مشکل ہی سے ملے گا۔ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ موجودہ "قومی آواز" کا پیش رو "ہفت روزہ ہندوستان" لکھنؤ میں علیم صاحب کی قیام گاہ واقع شیر دروازہ سے شائع ہوتا تھا۔ حیات اللہ صاحب اس ہفت روزہ کے اڈیٹر تھے اور ڈاکٹر عبدالعلیم بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیئرمین تھے۔ دوسرے دو ڈائرکٹر زاچاریہ نریندر دیو اور رفیع احمد قدوائی تھے۔ انگریزی ماہنامہ نیو اِمین لٹریچر بھی جس کے شعبہ ادارت میں علیم صاحب کے علاوہ ملک راج آنند اور احمد علی شامل تھے۔ بیرور روڈ سے ملحق ان کے مکان ہی سے شائع ہوتا تھا۔
مظہر امام صاحب نے کرشن چندر کے جس رپورتاژ کا ذکر کیا ہے وہ ۱۹۴۷ء میں 'پودے' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا۔ "ہندوستانی انسائیکلوپیڈیا" کے نام سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں "پودے" (صفحہ ۹۷ تا ۱۰۸) سے متعلقہ اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔
"اسی طرح PEN کانفرنس کے موقع پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹ کی طرح ایک تحریک کی جائے تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکر بھی شامل تھے۔ لیکن صرف ایک آدمی کی پُر زور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہو کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اُٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے لیکن میں پوچھتا ہوں فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور والٹیئر۔ یہاں کون ایسا ادیب ہے کون ایسا مفکر ہے۔ آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ مجھے آپ لوگوں میں ایک آدمی بھی اس پائے کا نظر نہیں آتا۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ کسی من چلے نے کہا۔" اور کیا ڈائس پر بھی ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔" ڈائس پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں، جواہر لال نہرو تھے، فلسفے داں رادھا کرشنن تھے، ہرمین اولڈ، فارسٹر، ملک راج آنند اور شاہ بخاری پطرس اور دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈائس پر نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مجمع کی طرف مڑ کر کہنے لگے۔ "نہیں ان میں کوئی نہیں" تحریک گر گئی۔
علیم صاحب کے کسی کارنامے کا ذکر جناب حیات اللہ انصاری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "علیم صاحب مصنف بھی تھے اور نقاد بھی۔ اگرچہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ان کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ ہے جسے میں جانتا ہوں۔ میں ارادہ کر رہا تھا کہ اسے ظاہر کر دوں اور علیم صاحب کو اسی نومبر (۱۹۷۵ء) میں اس بات کا الٹی میٹم بھی دے دیا تھا۔ وہ اس کے خلاف تھے لیکن میں اس پر مصر تھا۔ لیکن افسوس ان کی موت نے فیصلہ ان کے حق میں کر دیا۔" (ہفتہ وار سب ساتھ ۲۸ فروری ۱۹۷۱ صفحہ ۴۲) معلوم نہیں حیات اللہ صاحب کا اشارہ کس کارنامے کی جانب ہے۔

—— عابد سہیل، لکھنؤ

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۳۴۸

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۲، شمارہ: ۷ — فی کاپی ۲/۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — نومبر ۱۹۸۸ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی ـــ گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے عمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

حرفِ آغاز

اگلا شمارہ ابوالکلام آزاد نمبر ہوگا۔

اکثر محققین کے نزدیک مولانا آزاد کی ولادت اگست ۱۸۸۸ء کی آخری ۲۰ تاریخوں یا ستمبر ۱۸۸۸ء کی ابتدائی ۹ تاریخوں میں کسی تاریخ کو ہوئی تھی، اس سے پہلے ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ستمبر میں آزاد نمبر اور نومبر میں نہرو نمبر شائع کیا جائے۔ لیکن حکومتِ ہند نے مولانا آزاد کی تاریخ ولادت ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء تسلیم کی ہے اور اسے بعض دوسرے محققین کی تائید بھی حاصل ہے لہٰذا ستمبر کی بجائے ایوانِ اُردو کا مولانا آزاد نمبر اب نومبر میں منظرِ عام پر آرہا ہے۔ ہمارا ارادہ نومبر میں پنڈت جواہر لعل نہرو نمبر شائع کرنے کا تھا لیکن ظاہر ہے کہ ایک مہینے میں دو نمبر شائع نہیں ہوسکتے تھے اس لیے نہرو نمبر کی اشاعت کو مؤخر کردیا گیا ہے۔ اب یہ نمبر انشاء اللہ جنوری یا فروری کے مہینے میں شائع ہوگا۔

مولانا آزاد صحیح معنوں میں ایک ہمہ صفت موصوف انسان تھے عالمِ دین، مفسرِ قرآن، ادیب، انشاپرداز، صحافی، مقرر اور خطیب اور فکری اور سیاسی رہنما۔ ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں۔ ایسی شخصیتوں کے کارناموں کو زندہ اور یاد کو تازہ رکھنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں ان سے فیض حاصل کریں اور ماضی اور مستقبل کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کا آزاد نمبر مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرسکے۔ ہماری اس کوشش میں جن قلمکاروں نے ہم سے تعاون کیا ہے، ان کے ہم شکر گزار ہیں۔ ہماری یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی ہے، اس کا فیصلہ تو قارئین نمبر دیکھ کر ہی کرسکیں گے لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ مولانا آزاد پر ایسی جامع تحقیقی اور تنقیدی دستاویز غالباً اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی ہے۔

یہ نمبر تقریباً تین سو صفحوں پر مشتمل ہوگا اور اس میں ممتاز قلمکاروں کے گراں قدر مضامین کے علاوہ، خود مولانا آزاد کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب بھی شامل ہوگا۔ اس نمبر کے لیے ہم نے مولانا آزاد کے غیر مطبوعہ خطوط اور ان کی بہت سی نادر تصویریں بھی حاصل کی ہیں جن کی شمولیت سے اس نمبر کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے۔

ایجنٹ حضرات سے گزارش

مولانا آزاد نمبر کی قیمت چھ روپے رکھی گئی ہے جو واجبی سے بھی کم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچ سکے۔ اگر ایجنٹ حضرات اس کی زائد کاپیاں منگوانا چاہیں تو اپنے آرڈر فوراً ہمیں ارسال کردیں۔ بصورتِ دیگر اتنی ہی کاپیاں بھیجی جائیں گی، جتنی عام شمارے کی بھیجی جاتی ہیں۔ بعد میں آنے والے آرڈروں کی تعمیل مشکل ہوگی۔

خریدار حضرات

کو یہ نمبر سالانہ قیمت ہی میں پیش کیا جائے گا لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ نمبر بہ حفاظت ان تک پہنچے تو رجسٹری خرچ کے لیے پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر ہمیں ارسال کردیں تاکہ نمبر انھیں رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کیا جائے۔ سادہ ڈاک سے بھیجی جانے والی کاپیاں اگر راستے میں گم ہوگئیں تو ہم دوبارہ بھیجنے سے قاصر رہیں گے۔

ایک پیشکش

جو حضرات ۱۵؍ نومبر تک "ایوانِ اُردو دہلی" کی سالانہ خریداری قبول کرلیں گے انھیں بھی یہ نمبر سالانہ قیمت ہی میں پیش کیا جائے گا۔ ایسے حضرات ۲۵ روپے زرِ سالانہ اور ۵ روپے رجسٹری خرچ (کل ۳۰ روپے) کا منی آرڈر سیکریٹری اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کے نام جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ شکریہ

——— سید شریف الحسن نقوی

نظمیں

شاید

کچھ لوگ
جو میرے دل کو اچھے لگتے تھے
عمروں کے ریلے میں آئے
اور جا بھی چکے

کچھ دھندوں میں مصروف ہوئے
کچھ چوہا دوڑ میں جیت گئے
کچھ ہار گئے
کچھ قتل ہوئے
کچھ بڑھتی بھیڑ میں
اپنے آپ سے دور ہوئے
کچھ ٹوٹ گئے، کچھ ڈوب گئے

مجھ پر یہ خوف اب چھایا ہے
میں کس سے ملنے جاؤں گا
میں کس کو پاس بلاؤں گا

آندھی ہے، گرم ہوا ہے، آگ برستی ہے
کچھ دیر ہوئی

اک صورت، شبنم سی صورت
اس تپتی راہ سے گذری تھی
دو بچے پیڑ کے پتوں میں چھپ کر بیٹھے تھے
ہنستے شور مچاتے تھے
اک دوست پرانا
برسوں بعد ملا مجھ کو
اس جلتے دن کی صبح کچھ ایسی روشن تھی
جب بادِ صبا، وارفتہ رو
خوشبوؤں، نغموں، ننھی منّی باتوں کا
انداز سے آنگن میں چلی

میں زندہ ہوں
یہ سوچ کے خوش ہو جاتا ہوں
وہ تھوڑی دیر تو میرے پاس سے گذری تھی
وہ میرے دل میں اتری تھی
اس بے محرم سے موسم میں
شاید وہ کل بھی آئے گی
شاید وہ کل بھی میری راہ سے گذرے گی

بلراج کومل

ای ۔ ۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

محمد علوی

(۱)

بخشش

محمدؐ محمدؐ محمدؐ کہوں
اسی نام کا لطف لیتا رہوں
یقیں ہے کہ بخشش ملے گی مجھے
یہ سچ ہے بہت ہی گنہگار ہوں!

(۲)

دونوں کا دوست

اِتنے بہت سے تاروں میں
اِک ایسا بھی تارا ہے
میری جس سے دوستی ہے
جو اس کو بھی پیارا ہے

(۳)

دُعا

ایسا ہو بچوں کے بدن پر میل نظر نہ آئے
نئے نئے کپڑوں کی بو سے سارا گھر بھر جائے
اب کے عید کا دن آئے تو کھیر سویّاں کھائے

(۴)

مُکتی

برف درختوں پہ گرتی ہے، شاخ شاخ جھکتی ہے
پھٹے پُرانے پیرن سے بھی ٹھنڈ کہیں رُکتی ہے
ایسے برفانی موسم میں کانگڑیوں کا کام نہیں
چتا جلا کے سو جاؤ پھر مُکتی ہی مُکتی ہے

روانہ ردولوی

علمائے لدھیانہ

اور تحریکِ آزادی

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں علمائے
ہند نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کے گوشے
گوشے میں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے خلاف عوام کو
بیدار کیا، بلکہ خود بھی نہایت بہادری ہمت اور
استقلال کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر انگریزوں
سے جنگ کی۔ انگریزوں کے خلاف علمائے ہند کی
اِن جدوجہد کا مقصد مغل سلطنت کے بجھتے ہوئے
چراغ کی لو تیز کرنا یا مغل بادشاہت کو دوبارہ
مضبوط و مستحکم بنانا نہ تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انگریز
ہندوستان سے چلا جائے۔ اور خود ہندوستان کے
عوام ایک ایسی عوامی حکومت قائم کریں جس میں سب
کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ انسانی قدروں کا بول
بالا ہو اور طبقہ وارانہ اونچ نیچ اور استحصال نام کو
بھی نہ رہ جائے۔ ان مجاہد علما میں شاہ عبدالقادر
لدھیانوی بھی شامل تھے وہ اپنے زمانے کے برگزیدہ
عالم اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشہور مشائخ
میں سے تھے۔

ان کے چار بیٹے تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادر
اور ان کے چاروں بیٹوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ
آزادی میں عملی حصہ لیا۔ وہ مجاہد دستوں کے ساتھ
پٹیالہ اور کرنال ہوتے ہوتے انگریزی افواج سے
لڑتے بھڑتے دہلی پہنچے۔ مجاہدین کے اس قافلے کے
ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادر
کے بڑے بھائی بھی اہلِ خاندان کے ساتھ اس
قافلے میں شامل تھے۔ مسجد فتح پوری اور چاندنی چوک
سے لے کر لال قلعے تک مولانا عبدالقادر صاحب
کی کمان میں مجاہدوں نے انگریزی فوجی دستوں سے
دست بدست جنگ کی۔ حالاں کہ مجاہدینِ آزادی
تعداد میں زیادہ تھے مگر وہ غیر منظم تھے اور انگریز
سائنٹیفک جنگ لڑ رہا تھا اس لیے مجاہدوں کو شکست
ہوئی۔ مولانا شاہ عبدالقادر اور ان کے چاروں بیٹے
دہلی سے کرنال ہوتے ہوئے پٹیالہ کے جنگلوں میں
جا پہنچے۔ کمپنی بہادر نے مولانا اور ان کے چاروں
بیٹوں کی گرفتاری کے لیے ایک لاکھ روپے انعام مقرر
کیا۔ لدھیانہ میں ان کی جائیداد جس میں مسجد بھی
شامل تھی انگریز سرکار نے ضبط کر کے نیلام کر دی
مگر اُسے مولانا شاہ عبدالقادر ان کے چاروں بیٹوں
اور افرادِ خاندان کو گرفتار کرنے میں کامیابی حاصل نہ
ہو سکی جو پٹیالہ سے دس کوس دور راجپوتوں کے
ایک گاؤں ستانہ میں مقیم تھے۔ جب انگریزوں نے
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو پوری طرح کچل دیا اور
اس جنگ میں شامل تمام افراد سے خوں ریز انتقام لے
چکے تو انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں میں کام کرنے
کے لیے کچھ با اثر لوگوں کی خدمات حاصل کیں اور عام
معافی کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۶۰ء میں مولانا شاہ عبدالقادر
اہلِ خاندان کے ساتھ لدھیانہ کے لیے روانہ ہوئے مگر
راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بیٹوں نے تجہیز و
تکفین کی اور قافلے کو لے کر لدھیانہ چلے آئے۔ مولانا
شاہ عبدالقادر کے سب سے بڑے بیٹے مولانا
سیف الرحمٰن ہجرت کر کے کابل چلے گئے اور پھر
واپس نہ آئے۔ دوسرے بیٹے مولانا محمد صاحب عالم
بے بدل اور فقیہہ زمانہ تھے تیسرے بیٹے مولانا
محمد عبداللہ صاحب اور چوتھے بیٹے مولانا عبدالعزیز
صاحب نے لدھیانہ ہی میں قیام کیا۔ انگریز سرکار کا
خیال تھا کہ اب اس خاندان کو کبھی سرسبزی و شادابی
نہ حاصل ہوگی۔ لیکن اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔
جس شخص نے ان کی جائیداد خریدی تھی۔ اس نے
جائیداد واپس کر دی۔ جس مسجد اور جن مکانوں کو
منہدم کیا گیا تھا، ان کو تمام شہریوں نے مل کر چند
مہینوں میں دوبارہ پُرانے ہی نقشوں کے مطابق تعمیر
کرا دیا۔ اور ایک بار پھر شہر میں علم و عرفان کے دریا
بہنے لگا اور آزادیِ ہند کا مکتب کھل گیا۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔
اس کے سرگرم حامیوں میں طیب جی علی محمد بھیم جی۔
اور احمد اللہ سیانی تھے مگر انگریزوں کے حواری
مسلمانوں نے جن کے سربراہ سرسید احمد تھے۔
مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے قانونی
انتظامی سیاسی اور مذہبی دلائل کی بنا پر روکا۔
اس کانگریس مخالف پروپیگنڈہ کی دو بنیادیں تھیں ایک
یہ کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگریس میں کام کرنا
مذہباً ناجائز ہے۔ دوئم یہ کہ سیاسی طور پر مسلمانوں
کا کسی جماعت میں شامل ہونا جو آزادانہ طور پر
انگریزوں سے حقوق و اختیارات کا مطالبہ کرے
اپنی موت کے حکم نامے پر دستخط کرنا ہے۔ جب انگریز
پرست مسلم لیڈروں کے پروپیگنڈے نے شدت
اختیار کر لی تو طیب جی نے علی محمد بھیم جی کو ہندوستان
کے آزاد خیال علما کی خدمت میں کانگریس کے حق
میں فتوے حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ جن علما نے

۱۶۵، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

کانگریس میں مسلمانوں کے شامل ہونے کے حق میں فتویٰ دیا۔ ان میں شاہ عبدالقادر کے صاحبزادگان مولانا شاہ محمد صاحب اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھی شامل تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تو برسرِ منبر جمعہ کے خطبے میں ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ "کانگریس میں مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیے اور سید احمد کی کسی جماعت یا کام میں مسلمانوں کا شامل ہونا شرعاً حرام ہے۔"

سرسید اور ان کے رفقاء نے کانگریس سے مسلمانوں کو دور رکھنے کی بڑی کوشش کی مگر انھیں ناکامی ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا شاہ احمد صاحب اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوے کی تائید میں سیکڑوں علمائے کرام میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمود الحسن جیسے جیّد علمائے کرام بھی شامل تھے۔

ان علماء نے کانگریس کی حمایت کر کے ایک بار پھر ملک میں آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ سیکڑوں عربی مدارس کانگریس کے دفاتر بن گئے اور ہزاروں مساجد میں کانگریس کے حق میں خطبے دیے جانے لگے۔ سرسید احمد اور ان کے رفقاء کی سرگرمیوں کے خلاف ملک بھر میں علما کے طبقے نے جوابی سرگرمیاں شروع کر دیں اور مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اس سلسلے میں فتویٰ دیتے ہوئے اعلان کیا کہ "سید احمد زبانی دعویٰ اسلام رکھتے ہیں، حقیقت میں دام در سبزہ و مارِ آستین ہیں۔ ان کا زہر گو دافسوس انجام کار لوگوں کو ہلاک کر دے گا اس لیے ان کے ساتھ ملنا شرعاً ناجائز ہے۔"

مولانا شاہ احمد صاحب نے دسمبر ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے حق میں علمائے اسلام کے فتوے کتابی صورت میں شائع کر دیے اور فتاویٰ کی یہ کتاب ۲۲ دسمبر ۱۸۸۸ء کو کانگریس الٰہ آباد کے اجلاس میں مولانا کے مُرید خواجہ احمد شاہ نے پیش کی۔

مولانا محمد میاں دیوبندی اپنی کتاب علمائے حق میں ص۔ ۱۰۲ پر رقمطراز ہیں۔

"۱۸۵۷ء میں جس طرح حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے شیخ طریقت حاجی امداد اللہ صاحب کے زیرِ قیادت جہادِ آزادی میں حصہ لیا۔ اسی طرح لدھیانہ کے اس خاندان نے بھی اس جہاد میں کافی حصہ لیا تھا جس کے ایک رُکن مولانا عبدالعزیز صاحب لدھیانوی نقشبندی مجددی تھے۔"

بہرحال علمائے لدھیانہ نے میدانِ سیاست میں ۱۸۸۵ء میں انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جو بیج بویا تھا جلد ہی اس نے پودے کی شکل اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ یہ پودا پھلنے پھولنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی جڑیں ملک کے کونے کونے میں پھیل گئیں۔

ویر ساور کر نے اپنی کتاب "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء" کے صفحہ ۱۵۵ پر "لدھیانہ" کے زیرِ عنوان لکھا ہے۔

"جالندھر دوآبہ کے فوجیوں نے ایک منظم بغاوت کرنا طے کیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ یہ فوجی ایک رسالے کی صورت میں جالندھر سے روانہ ہوں اور دہلی جاتے ہوئے پھلور اور لدھیانہ کی فوجی رجمنٹ کے بھائیوں کو اپنے ساتھ لے لیں اور اس طرح دہلی پر یلغار شروع کر دی جائے۔ اس منصوبے کو خفیہ رکھنے کی تمام کوشش کی گئی تھی مگر نہ جانے کس طرح لدھیانہ میں فرنگی افسروں کو اس کی اطلاع مل گئی۔ جب رات کے وقت یہ رسالہ دریائے ستلج پار کر رہا تھا تو فرنگی فوج سے جس میں سکھ سپاہی شامل تھے، اس رسالے کی باقاعدہ جنگ ہوئی۔ قوم پرست فوجیوں کی ایک گولی کا فرنگی کمانڈر کے سینے سے پار ہونا تھا کہ ساری انگریز اور سکھ فوج پسپا ہو کر واپس ہو گئی۔ سکھ اور فرنگی فوجوں کے خلاف اپنی اس تازہ فتح کی خوشی اور مسرت سے سرشار ہو کر قوم پرست فوجی رسالہ دوپہر کے وقت لدھیانہ شہر میں داخل ہوا۔ شہر میں ایک باا‌ثر مولوی تھے جو ہمیشہ وہاں کے لوگوں کو فرنگی طوقِ غلامی کو اتار پھینکنے اور سوراجیہ قائم کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے اس مولوی کی تقریروں کا یہ اثر تھا کہ یہ شہر پنجاب کی انقلابی پارٹیوں کا مضبوط مرکز بن گیا تھا۔ جب فرنگیوں اور غلامی کی زنجیروں پر آخری ضرب لگانے کا وقت آیا تو سارا شہر مولوی صاحب کے اشارے پر بیدار ہو گیا۔ سرکاری گوداموں کو لوٹا اور آگ لگا دی گئی۔ گرجا گھر فرنگیوں کے مکانات۔ پریس الغرض ہر چیز کو جلا دیا گیا ——— جیلیں توڑ دی گئیں۔ جو چیز جلائی نہ جا سکی وہ کسی نہ کسی طرح برباد کر دی گئی۔ پس اس طرح لدھیانہ میں بھی انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی۔ جالندھر، پھلور اور لدھیانہ کی انقلابی فوج اور شہریوں کی قومی فوج مولوی صاحب کی کمان میں دہلی کی طرف روانہ ہو گئی۔"

ویر ساور کر نے جن مولوی صاحب کا ذکر کیا ہے وہ مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی تھے۔

خورشید مصطفیٰ رضوی امروہوی نے اپنی کتاب "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء" میں لکھا ہے "مولانا عبدالقادر نے شہری عوام کو بغاوت پر اکسایا۔ اُن کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ ہنگامہ ہوتے ہوتے بچا۔ ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار چھین لیے۔ لیکن مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔"

رئیس الاحرار' مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی انھیں مولانا عبدالقادر کے پڑپوتے تھے۔ آپ نے ۴۴ برس کی عمر میں سے دس سال چھ مہینے قید خانے میں گذارے اور بقول شورش کاشمیری "عام حسابی قاعدے کی رو سے دیکھا جائے تو ہفتہ میں ڈیڑھ دن آپ نے جیل کی نذر کیا ہے۔" بقول میر:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

انور قمر

گم شدہ باپ

ہم تمام بہن بھائیوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ ہمارا باپ نہیں ہے۔ تو پھر 'کون ہے'؟ یہ ایک راز تھا اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ہمارے گھر میں باپ ہی کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ ہماری ماں اُسی کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ موروثی جائیداد بھی اسی کے قبضے میں تھی۔ رسموں کی ادائیگی کے وقت اور سماجی تقریبوں میں وہی پیش پیش رہتا۔ ہم چاروں بھائیوں کی بیویوں سے ٹھٹھا مذاق کرتا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں اپنی اپنی تنخواہ کے لفافے اس کے سپرد کردینے ہوتے تھے۔ جن میں سے بڑی معمولی سی رقم وہ ہمیں جیب خرچ کے لیے دیا کرتا تھا۔ گھر کا تمام خرچ وہ خود ہی چلاتا، ہمیں گھر کے کام کاج میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ کنبے کی ساری ذمے داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

لیکن وہ کیا بات تھی کہ جس نے ہمارے دل میں شک کے کانٹے چبھو دیے تھے، جن کے زخموں سے اٹھتی ہوئی ہر ٹیس ہمیں بار بار وہ ناخوش گوار بات یاد دلایا کرتی تھی کہ وہ ہمارا باپ نہیں ہے۔ وہ ہمارا باپ نہیں ہے 'تو پھر کون ہے؟ یہ ایک راز تھا' اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔

دراصل میانے قد، درمیانے ہاڑ، سانولے رنگ اور بیضوی چہرے کا کوئی بھی شخص ہمارے باپ کی جُون بدل سکتا تھا۔ جون بدلنے میں مزید سہولت یہ تھی کہ ہمارے باپ کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ وہ ڈھیلی ڈھالی ہندوستانی پوشاک پہننے کا عادی تھا۔ ساتھ ہی چکا چوندھ سے بچنے کے لیے وہ سیاہ چشمہ لگایا کرتا تھا۔ چوں کہ اس کے حلیے میں افشا کا کم اور اخفا کا زیادہ امکان تھا۔ اس لیے کوئی بھی شخص اس کا حلیہ اختیار کرسکتا تھا۔ ہوا بھی یہی تھا۔ ایک پُراسرار شخص ہمارے باپ کا مرتبہ حاصل کر بیٹھا تھا۔

سال بھر پہلے کی بات ہے کہ ہم نے اپنے معالج کے مشورے پر اپنے باپ کو شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں داخل کیا تھا۔ ستر برس کے آدمی کو اس گنجان آباد شہر میں جو بھی طبعی عارضے لاحق ہو سکتے تھے خوش قسمتی سے کسی ایک سے بھی وہ دوچار نہ تھا۔ جو تھا تو بس یہی کہ ہمارا باپ برون کائی ٹس (BRON-CHITIS) کا شکار تھا۔

نومبر کے مہینے میں اس شہر میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ پڑنے لگتی ہے۔ ہمارا باپ صرف تہمد پہن کر سونے کا عادی تھا پہلے تو اس ٹھنڈ سے اس کا سینہ جکڑ گیا۔ پھر وقفے وقفے سے اس پر کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ ایسے دورے کہ ہر بار یوں محسوس ہوا کہ کوئی 'آسیب' اس کا سینہ پھاڑ کر، باہر نکلنے پر آمادہ ہے۔ اور بخار ایسا چڑھا کہ تپش پیمانے کے قالب میں نہ سماتا تھا۔

اسپتال میں دوسرے ہی روز اس کے مرض پر قابو پالیا گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اب وہ بڑی راحت محسوس کر رہا ہے۔ بخار میں کمی آچکی ہے۔ کھانسی کے دورے بھی اب اُسے کم پڑتے ہیں۔

اسے اسپتال میں داخل ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ہم روز آکر اس کی مزاج پُرسی کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز جب ہم اسپتال پہنچے تو ہم نے اپنے باپ کے کمرے میں ایک اجنبی کو لیٹا ہوا پایا۔

ایک نرس کمرے میں موجود تھی اور مریض کے چارٹ میں اندراج کرکے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔

ہم نے اُس نرس سے پوچھا:

"سسٹر! یہ کون صاحب ہیں، جو ہمارے باپ کی جگہ پر لیٹے ہوئے ہیں؟"

"یہ شہر کے بڑے معزز آدمی ہیں۔ ان کا نام..."

اس شخص میں بنا کوئی دلچسپی لیے ہم نے پوچھا۔

"مگر ——— ہمارے بابا کہاں ہیں؟"

"وہ ——— وہ ——— جنرل وارڈ میں موجود ہیں۔"

"جنرل وارڈ ——— ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"جی، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ جنرل وارڈ ہی میں ہیں۔ اُنھیں کے شدید اصرار پر ہم نے انھیں یہاں سے منتقل کیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس نے معائنے کا سامان بٹورا۔ اور جب وہ کمرے سے جانے لگی تو بولی:

"آپ کے بابا اکثر مجھ سے کمرے کا ریٹ اور دیگر اخراجات کی تفصیل معلوم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں انھیں ایسی راحتوں کی چنداں ضرورت نہیں۔ حتی الامکان انھیں فضول خرچیوں اور سماجی چونچلوں سے بچنا چاہیے۔"

نرس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ آج ان کا جنرل وارڈ میں منتقل ہونے کا اصرار اتنا بڑھا کہ انھوں نے اسپتال

اے۔۳۱ کشتی اپارٹمنٹس، پی۔ نمبر ۲۴۴ سینٹ اینڈریوز روڈ، باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

کے ڈین (Dean) کو فون پر دھمکی دی کہ اگر انھیں اس کمرے سے جنرل وارڈ میں منتقل نہ کیا گیا تو وہ عملے کی نظر بچا کر اسپتال سے فرار ہو جائیں گے۔

اس بات کو ہمارا ذہن تسلیم کرنے سے قاصر تھا کیوں کہ ہمارا باپ عمدہ رہائش، عمدہ غذا، عمدہ سواری، حتیٰ کہ عمدہ علاج پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اپنے آپ کو پرائیویٹ روم سے جنرل وارڈ میں منتقل کروانے میں کیا مصلحت تھی؟ ہم اس مصلحت سے ناواقف تھے۔

جنرل وارڈ کے داخلی دروازے پر پہنچ کر ہم ٹھٹھک گئے۔ وارڈ میں بیسیوں مریض اسپتال کی یونیفارم پہنے ہوئے تقریباً یکساں انداز میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند اپنی پشت تکیے سے ٹکائے نیم دراز تھے۔ اکثر اپنے ملاقاتیوں سے باتوں میں مشغول تھے۔

ایک وارڈ بوائے دواؤں کی ٹرالی لیے ہوئے وہاں سے گزر رہا تھا۔ ہم نے اُسے روکا، پھر اسے اپنے باپ کا نام بتا کر معلوم کیا کہ کیا وہ ہماری رہنمائی اس تک کر سکتا ہے۔

وارڈ بوائے نے وارڈ کے آخری سرے پر ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی نرس کی جانب اشارہ کیا، پھر ہمیں اُس نرس سے رجوع کرنے کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

پل بھر کے لیے ہمیں محسوس ہوا کہ ہم نے اپنے باپ کو اس مجمع میں کھو دیا ہے۔

کیا یہ محض اندیشہ تھا؟ کیا حقیقت اس کے برعکس تھی؟

چالیس پچاس قدم چل کر ہم نرس کے پاس پہنچ گئے۔ جب ہم نے اپنے باپ کی تمام تفصیل اسے کہہ سنائی تو اس نے یہ کہہ کر ہماری ڈھارس بندھائی کہ ہمارا باپ اسی وارڈ میں ہے اور وہ اس سے واقف ہے۔ پھر وہ ہماری رہنمائی کرتی ہوئی وارڈ کے آخری کونے میں رکھے ہوئے بیڈ تک آئی۔ اس بیڈ پر ہم نے اپنے باپ کو لیٹا ہوا پایا۔ اس کے نتھنوں سے آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا اور کلائی میں گلوکوز کی سوئی گڑی ہوئی تھی۔

اپنے باپ کو اس عالم تہہ و بالا میں دیکھ کر ہم مضطرب ہو اُٹھے۔

"سسٹر! یہ کیا؟ کل تک تو یہ بھلے چنگے تھے ڈاکٹر آج انھیں ڈسچارج کرنے والے تھے!"

نرس نے بتایا۔

"دوپہر میں جوں ہی یہ اس وارڈ میں منتقل ہوئے توں ہی ان کی صحت کا توازن بگڑ گیا۔ ان پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ یہ جاں کنی کے عالم میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے ریذیڈنٹ ڈاکٹر (Resident Doctor) کو فوراً طلب کیا۔ وہ دوڑے دوڑے آئے، ان کی مکمل جانچ کی، دو انجکشن لگائے، ایک دو دوائیاں بدلیں۔ ہم انھی کی ہدایت پر آپ کے بابا کو آکسیجن اور گلوکوز دے رہے ہیں۔"

ہمارے باپ کی آنکھیں بند تھیں اس کے ہونٹ یوں کھلے تھے گویا وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ ہم نے اپنے اپنے کان اس کے قریب کر دیے۔ چند مہمل سے الفاظ اس کے منہ سے ضرور نکلے۔ لیکن ہم ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ اپنی بات دہرائے، ہم اس کے سرہانے بدستور بیٹھے رہے لیکن ہمارے باپ نے نہ تو دوبارہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی اپنے لبوں کو جنبش دی۔ بس نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔ جب ملاقات کا وقت ختم ہوا، تب ہم تمام بہن بھائی گھر کو روانہ ہوئے۔

آج ہم تمام واقعات پر از سرِ نو غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ گھر سے اسپتال پہنچتے پہنچتے یا اسی پرائیویٹ روم میں قیام کے دوران میں ہمارے باپ کی جگہ اس کے ہمزاد نے لے لی تھی۔

اُس شام گھر پہنچ کر ہم تمام بہن بھائی اِسی نکتے پر زیادہ تر خیال کرتے رہے کہ ہمارا باپ آخر جنرل وارڈ میں کیوں منتقل ہوا۔ ساتھ ہی اس کی حرکات و سکنات سے ہمیں جس اجنبیت کا پُراسرار احساس ہونے لگا تھا، آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

دو روز بعد ڈاکٹر نے ہمارے باپ کو اسپتال سے ڈسچارج (Discharge) کر دیا۔ ہم اُسے گھر لے آئے۔

آٹھ دس دنوں میں ہم تمام بہن بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد نے باپ کے عادات و اطوار میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھی۔ باپ کے رویے میں زمین آسمان کا فرق آ چکا تھا۔ مذہبی رسموں اور سماجی تقریبات میں پیش پیش رہنے والا شخص اب گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کمرے میں ہی پڑا رہتا۔ کسی ضروری حاجت ہی کے تحت باہر آتا۔ ہماری ماں کو بھی اس نے اپنے کمرے میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس دوران میں حسبِ معمول ہمیں تنخواہیں بھی ملیں۔ خلافِ توقع تنخواہ کے لفافے اس نے ہم سے طلب نہ کیے۔ لگتا تھا کہ دنیاداری سے اس کا جی اچاٹ ہو چکا ہے۔ دنیاوی امور سے وہ ہر ممکن طریقے سے کنارا کش ہو جانا چاہتا تھا۔ ایک دن تمام جائیداد اور دیگر املاک اس نے ہمارے نام لکھ دیں۔ اس کے باوجود ہمارا شبہ رفع نہ ہوا۔

ہم اکثر سر جوڑ کر بیٹھتے اور اسی کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ یوں بھی ہوتا کہ جب بھی ہمیں اپنے کاموں سے فرصت ملتی، اس کی شبیہہ ہمارے ذہن میں گھوم جاتی۔ اس کی بوالعجب شخصیت ہمیں ہانٹ کرنے لگتی۔ ہم کسی صورت میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ وہ ہمارا حقیقی باپ ہے۔ وہ ہمارا حقیقی باپ نہیں ہے؟ تو پھر کون ہے؟ یہ ایک راز تھا۔ اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔

ایک روز ہم بہن بھائیوں نے طے کیا کہ ہم اپنے باپ کا بلڈ ٹیسٹ (Blood Test) کروائیں

اور معلوم کریں کہ آیا اس کا بلڈ گروپ اور ہمارے باپ کا بلڈ گروپ یکساں ہے بھی یا نہیں۔ بلڈ سیمپل (BLOOD SAMPLE) لینے کے لیے ہم پیتھے لوجسٹ (PATHALOGIST) کو گھر پر ہی بُلا لیتے ہیں۔ لیکن یہ اپنا خون دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ہم نے اُسے کئی واسطے دیے اُسے باور کرانے کی کوشش کی کہ فیملی ڈاکٹر ہی کی ہدایت پر اس کا بلڈ ٹیسٹ کروایا جارہا ہے جو اس کے مرض کی شناخت کے لیے ضروری ہے۔ بجائے اپنا بلڈ سیمپل (BLOOD SAMPLE) دینے کے وہ بار بار یہی کہتا:

"تم لوگوں کو مجھ پر شبہ ہے۔ تم سدا میری ٹوہ میں رہتے ہو۔ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے میری اصلیت جاننے کی کوشش کرتے ہو۔ اپنا سب کچھ تو تمھیں دے چکا۔ مکان کے اس کونے میں پڑا رہتا ہوں۔ تم سے کچھ بھی تو طلب نہیں کرتا۔ اس کے باوجود تم مجھے آزار پہنچانا چاہتے ہو۔ اگر مجھ سے ہی اتنے بیزار نظر آتے ہو تو مجھے کسی ویرانے میں چھوڑ آؤ۔ جہاں کوؤں کی خوراک بن جاؤں گا"!

اس کی منت سماجت سے ہم بہن بھائیوں کا دل نہ پسیجا۔ اصلیت کا پتہ چلانے کے جنون میں، ہم بہن بھائیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔ جوں ہی ڈاکٹر نے سرنج اس کی رگ میں گھونپی اس کے شریر میں تشنج سا پیدا ہوگیا۔ پھر اس نے ایک گہری سسکی لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اگلے روز پیتھے لوجسٹ نے رپورٹ پیش کردی۔ ہمارے باپ کا بلڈ گروپ او پوزیٹو (O+VE) تھا اس کا بھی وہی نکلا۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ یہ بڑا کامن بلڈ گروپ ہے۔ اکثر لوگوں کا یہی بلڈ گروپ ہوتا ہے۔ کسی کی پیدائشی اصلیت جاننے کا یہ کوئی جینوئن (GENUINE) ٹیسٹ نہیں ہے ہمیں اپنی اسکیم کی ناکامی کا بے حد افسوس ہوا۔

دن بیتتے چلے گئے۔ لیکن ہم بہن بھائی اس کے متعلق اپنے شکوک دلوں سے رفع نہ کرسکے۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا کہ اس نشتر کی چبھن ہم اپنے جگر میں محسوس نہ کرپاتے ہوں۔ ہم ہر دم یہی سوچا کرتے کہ وہ ہمارا حقیقی باپ نہیں ہے ـــــ تو پھر کون ہے؟ یہ ایک راز تھا اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔

ذہن پر مسلسل تناؤ رہنے کی وجہ سے اس کے تعلق سے ہمارے رویے میں برہمی جھلکنے لگی۔ ایسی برہمی کہ جیسے ہر ہوش مند محسوس کرسکتا تھا تو پھر وہ کیوں نہ محسوس کرتا۔ ہم اپنی جھنجلاہٹ اور ناراضگی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہ کرتے۔ بلکہ بعض بعض موقعوں پر بلا کسی رو رعایت کے اپنے رویے کو جارحانہ بنا لیا کرتے تھے۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے ہم اپنا لہجہ درشت اور آواز بلند رکھا کرتے تھے۔

ہم بہن بھائیوں میں سے ایک دور کی کوڑی لایا۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ اس کی بتیسی اپنے (FAMILY DENTIST) فیملی ڈینٹسٹ کو دکھلائی جائے۔ ہمارے باپ نے اسی دندان ساز سے اپنی بتیسی چند ماہ قبل بنوائی تھی۔ ہمارے بھائی کا کہنا تھا کہ دندان ساز اپنے مخصوص گاہکوں کے دانتوں کے سانچے عموماً جلدی نہیں توڑتے۔ بلکہ سال دو سال تک انھیں محفوظ رکھتے ہیں۔

دندان ساز کو جب ہم نے اپنے منصوبے سے واقف کرایا تو بدقت تمام وہ ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہوا۔ اوّل تو اسے بیسیوں غلیظ اور متعفن سانچوں اور بتیسیوں میں سے ہمارے باپ کی بتیسی کا سانچہ تلاش کرنا تھا۔ دوم یہ کہ رات گئے اسے ہمارے گھر آکر بتیسی کی جانچ کرنی تھی۔ دو روز بعد اس نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ تلاش بسیار کے بعد اس نے ہمارے باپ کی بتیسی کا سانچہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اگلے روز اس نے ہمارے یہاں آنے کا پروگرام بنایا۔

ہمارا باپ رات میں جلد سونے کا عادی تھا۔ اس کے باوجود رات دیر گئے ہم چوری چھپے اُس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ حسبِ معمول صرف تہمد پہنے مسہری پر سو رہا تھا۔ اُس کے سرہانے ایک تپائی رکھی ہوئی تھی، تپائی پر بلوری پیالہ رکھا ہوا تھا، جو پانی سے بھرا ہوا تھا اور پیالے کی تہہ میں اس کی بتیسی رکھی ہوئی تھی۔ ہم وہ پیالہ اس کے کمرے سے اُٹھا لائے۔

دندان ساز نے وہ بتیسی ہمارے باپ کے سانچے پر رکھ دی۔ وہ ایک دوسرے میں یوں پیوست ہوگئے گویا ایک جان دو قالب ہوں۔ دندان ساز نے محدب شیشے کی مدد سے انھیں ہر ہر زاویے سے پرکھا پھر بولا۔

"گوشے سے گوشہ ملا ہوا ہے۔ کہیں کوئی خلاء نظر نہیں آتا۔ یہ بتیسی یقیناً اسی سانچے پر تیار کی گئی ہے۔ چوں کہ یہ سانچہ آپ کے باپ کا ہے اس لیے یہ بتیسی یقیناً آپ کے باپ ہی کی ہے"!

دندان ساز کے رخصت ہوجانے کے بعد ہم تمام بہن بھائی انتہائی خاموشی کے عالم میں پائیں باغ میں آکر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد چائے آگئی۔ سب نے چسکیاں لے لے کر چائے پی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ بظاہر ہر کوئی مطمئن سا نظر آرہا ہے لیکن اندرونی طور پر دکھی ہے۔ جھجکتے ہوئے میں نے اپنے احساسات کا اظہار کردیا۔

"آپ سب کو کوئی غم کھائے جا رہا ہے"!

"غم ــــ؟ کیسا غم ــــ؟ ہمیں کوئی غم نہیں"!

وہ یک زبان ہوکر بولے۔

میں نے کہا: "قدرت کرے کہ آپ ہر فکر سے آزاد ہوں، کسی قسم کا کوئی غم نہ ہو۔ لیکن وہ کون

سا اشارہ ہے کہ جو اُس کی موجودگی کا پتا دیتا ہے۔"

بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ گویا سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹول ٹٹول کر جواب برآمد کرنے میں کوشاں ہوں۔ میں نے کہا:

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے باپ سے علیحدگی اور بے گانگی کا دکھ بھوگ رہے ہوں۔ ان کی جھکی ہوئی گردنوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔

جانے کب ہمارا باپ برآمدے کو پار کرتا پائیں باغ کا افقی حصہ طے کرتا ہمارے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کی غیر متوقع آمد نے ہمیں بوکھلا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ہم مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔

اس نے کہنا شروع کیا:

"تمھاری پریشانی کا باعث میں نہیں ہوں۔ میں تو وہی ہوں۔ تمھارا باپ۔ اعتقاد تمھارا اٹھ چکا ہے مجھ پر سے۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ بپتا۔ یہ حیرانی۔ یہ وسوسے تمھارے اپنے پیدا کیے ہوئے ہیں، بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو قصور وار ٹھہراؤ۔ مجھے الزام نہ دو۔

ہم تمام بہن بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"بوڑھے چپ ہو جا۔ زیادہ نہ بول۔ تو ہوتا کون ہے ہمیں اس سن میں عقیدے اور ایمان کا درس دینے والا۔ آخر تیری بساط ہی کیا ہے۔ تُو تو بہروپیا ہے بسوانگ بھر کر تو آج ہمیں جُل دے رہا ہے۔ تو دیسے چلا جا۔"

یہ کہتے کہتے ہماری آواز کافی بلند ہو گئی۔

"یہ کر یاد رکھ، جس روز بھی ہمارا حقیقی باپ ہمارے ہاتھ لگا اس روز ٹھوکریں مار مار کر ہم تجھے اس چوکھٹ سے باہر کر دیں گے۔"

یہ سن کر وہ کپکپانے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اپنے جسم کے گرد یوں لپیٹ لیے۔ گویا اس کا بدن ننگا ہو اور ہم اس کے ننگے بدن کو نچیوں سے کھسوٹ رہے ہوں۔

"چل ہٹ پرے۔"

ہماری گھُڑکی سن کر وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ پھر گردن جھکائے ہوئے ڈگمگاتے قدموں سے مکان کے اندر چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد ہمارے اور اس کے درمیان برابر فاصلہ قائم ہوتا گیا۔ اس کے باوجود ہم اُس کے وجود سے غافل نہ تھے۔ ہمارے دوستوں میں ایک صحافی بھی تھا۔ ایک روز اپنے اخبار کے تعلق سے قارئین کی رائے معلوم کرتا ہوا وہ ہمارے یہاں بھی آپہنچا۔ باتوں باتوں میں ہم نے اپنے باپ کی نسبت شبہے کا اظہار کر دیا۔ خلافِ توقع اس معاملے میں اس نے ایسی دلچسپی دکھائی کہ اگلے ہی دن اس نے ہمارے باپ سے ملاقات کی ٹھان لی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کا انٹرویو لے گا۔ تاریخ پیدائش، مقامِ پیدائش۔ مدرسہ، اسکول اور کالج کی تفصیل اس سے معلوم کرے گا۔ پھر پہلی ملازمت سے لے کر آخری ملازمت کے متعلق اس سے سوال پوچھے گا۔ اس کے مشاغل معلوم کرے گا۔ ہمارے دوست کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی گوشے سے حقیقت خود بخود اُبھر کر ہمارے سامنے چلی آئے گی۔

ہمارا باپ اس انٹرویو کے لیے آمادہ نہ ہوا دادی کے بڑے اصرار پر اُس نے ہمارے صحافی دوست سے چند منٹ گفتگو کی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ وہی بتایا کہ جس کا علم ہم پہلے سے رکھتے تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ البتہ ازراہِ گفتگو وہ یہ ضرور کہہ گیا کہ چوں کہ اس کا بچپن بڑی عسرت میں بسر ہوا تھا اس لیے غیر شعوری طور پر وہ جزرس واقع ہوا ہے

اس نے بتایا کہ اسکول میں یونیفارم کے طور پر پہننے کے لیے اُسے کینوس (Canvas) کے جوتے مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ اپنے گھِسے پٹے جوتے اسے اس حد تک پہننے پڑتے تھے کہ ان کے گھِسے ہوئے تلوں سے اس کے پنجے جھانکنے لگتے تھے۔ ان جھانکتے ہوئے پنجوں کو اوروں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے اُسے اپنی انگلیوں کو سختی سے بار بار بھینچنا پڑتا تھا۔

اگر وہ جزرس تھا۔ خرچ دیکھ بھال کر کرتا تھا۔ فضول خرچی سے پرہیز کرتا تھا تو اس کا یہ وصف ہمیں حال ہی میں کیوں معلوم ہوا۔ ہم تو بچپن سے دیکھتے آرہے تھے کہ یہ ہاتھ کا کھُلا تھا۔ آرام و آسائش کے تمام لوازمات اس نے مہیا کر رکھے تھے۔ عید تہوار کا کوئی موقع بغیر جشن منائے ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ عزیز و اقارب کی تواضع میں فیاضی سے خرچ کرتا۔ کفایت شعاری کا دھیان اس کے من میں کب آیا؟ اس وقت کہ جب پرلوک سدھارنے کا سمے آیا۔ اور یہ جو لوگوں سے بیزار ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھا ہے۔ آخر اس میں کیا تک ہے۔ نہ اچھا کھاتا ہے، نہ اچھا پہنتا ہے۔ نہ کہیں جاتا ہے اور نہ کسی کو اپنے قریب آنے دیتا ہے۔ یہ طور تو ہمارے باپ کے ہرگز نہ تھے۔ وہ بڑے خوش اخلاق، خوش گفتار، زندہ دل اور محفلوں کی جان تھے۔ اُن سے جو بھی ایک بار ملتا، دوبارہ ملنے کا خواہش مند ہوتا۔ لیکن یہ محرم کی پیدائش رونی صورت انسان ہمارا باپ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

یہی باتیں ہم نے ایک روز اپنے بزرگ دوست کے گوش گزار کر دیں۔ ہندی فلسفے سے متعلق ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ آواگون پر یقین رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسان اچھے کرموں سے اپنی آتما کو رفعت و شان عطا کر سکتا ہے۔

انھوں نے فرمایا "مجھے لگتا ہے کہ تمھارے پتا کے شریر میں کسی بھرشٹ یوگی کی آتما ہے۔"

" بھرشٹ یوگی کی آتما۔"

ہم نے یک زبان ہو کر کہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

" باؤجی! بھرشٹ یوگی کسے کہتے ہیں؟"

انھوں نے فرمایا۔

" منشیہ دنیاداری سے بیزار ہو کر یوگی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے من کو آجلہ سے ہٹا کر آخرت پر لگاتا ہے۔ اُسے یوگ اور مسلسل یوگ کرنا پڑتا ہے۔ ریاض اور تپ کے سہارے وہ اپنے نفس پر قابو پانے میں لگ جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ تپسیا کرتے کرتے یوگی کا من ان دنیاوی خواہشات کی جانب پھر مڑجاتا ہے کہ جن کی تکمیل کا خیال اس کے من میں کسی کم سن بالک کی طرح مچلا کرتا تھا۔ اگر یوگی ایسے شدید جذبے پر قابو پالے تو کیا کہنے اور اگر اسے رام کرنے میں ناکام رہے تو یوگی کو اپنا یوگ تیاگ دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد خدانخواستہ یوگی کے جیون کا انت ہو جائے، تو وہ یوگی 'بھرشٹ یوگی' کہلاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ قدرے توقف کے بعد فرمایا۔

" تمہارے پتا کے شریر میں بھی کسی بھرشٹ یوگی کی آتما نے پرویش کیا تھا۔ ان کے ابتدائی جیون میں وہ اپنی تمام نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کرتی رہی اور جب سیر ہو چکی تو اس نے تمہارے پتا کو دوبارہ یوگی کا جیون اختیار کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ باؤجی کی باتوں میں ان کے دھارمک عقیدے کا عمل دخل تھا۔ آواگون پر یقین رکھنے والے شخص کے لیے ان کے تجزیے میں معقولیت بھی تھی اور دلائل بھی تھے۔ ابھی ہم کفر و ایمان کی کشمکش سے دوچار تھے کہ باؤجی نے سکوت پھر توڑا۔

" ان باتوں سے بھی تمہاری تسلی نہ ہوئی ہو تب بھی میری تم سے یہی پرارتھنا ہے کہ تم ان کے سادھارن جیون اور ان کی خلوت پسندی کو نامناسب ارتھ نہ پہناؤ اسے دوسرے رُخ سے یوں سمجھو کہ اب وہ بان پرست ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک عرصے تک خانہ داری کی زندگی گزاری۔ پھر اُسے اپنی مرضی سے ترک کر دیا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ گرہست آشرم سے بان پرست آشرم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ سنیاس لے لیں گے۔ اور جس دن سے ان کے سنیاسی جیون کا آغاز ہوگا، اُسی دن سے وہ محض تمہارے کنبے کے فرد نہیں رہیں گے، بلکہ وہ بنی نوع انسان سے جا ملیں گے۔ جزو کل میں مل کر فنا ہو جائے گا۔"

باؤجی کی باتوں سے ہمارے دلوں میں اس کی نسبت پیدا ہوئے شکوک رفع نہ ہوئے نہ ہی ان کے دور ہونے کا امکان نظر آیا۔ البتہ باؤجی کے دلائل نے ہمیں اپنے باپ کی مشکوک شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا تناظر عطا کیا۔ ہمیں کم از کم اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اس بیگانے شخص کی جانب سے ہمیں کسی زیاں یا آزار کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ہم شعوری طور پر اس سے بے تعلقی اور بے اعتنائی برت رہے تھے۔ لیکن وہ قطعی فطری طور پر ہم سے نہ تو کوئی تعلق رکھتا تھا۔ نہ کوئی لگاؤ ــــ اُس نے اپنی تمام کائنات سمیٹ کر اپنے حجرے میں لے لی تھی جس کے باہر اُس کی دانست میں ایک بے معنی سا خلا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم اس کے عادی ہو گئے۔ ہمارے رویّے میں وہ پہلے کی سی شدت نہ رہی۔ ہم اس سے برہم بھی نہ ہوتے تھے۔ اور نہ اُسے درشت و حقارت آمیز الفاظ سے مخاطب کرتے۔ البتہ برف کی ایک پتلی سی چادر ہم نے اپنے اور اس کے درمیان ضرور تان دی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی حرکات و سکنات کو اپنے شبہات کی اسکرین پر جانچنے کا مشغلہ ہم بدستور جاری رکھے ہوئے تھے۔

منشاء الرحمٰن خاں منشا

بوڑھے قصّوں میں اثر مت ڈھونڈو
سوکھے پیڑوں پہ ثمر مت ڈھونڈو

آگ ہی آگ برستی ہو جہاں
وہاں شاداب شجر مت ڈھونڈو

تیرگی پھیلی ہے آنگن آنگن
ابھی انوارِ سحر مت ڈھونڈو

میری سنتے ہو تو اک بات کہوں
"اُتھلے پانی میں گہر مت ڈھونڈو"

راہِ ہموار پہ چلنا ہے تو پھر
لذّت و لطفِ سفر مت ڈھونڈو

ایک ہی در سے رہو وابستہ
عمر بھر نت نئے در مت ڈھونڈو

آج کے اہلِ ہنر میں منشا
لگے لوگوں سا ہنر مت ڈھونڈو

۱۰ ۔ اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

(۱)

لے کے جائے گا کہاں خوابِ تماشا اُس کا
سوچتے رہتے ہیں دشوار ہے رستہ اُس کا

ڈھلتے سورج کے اُجالوں سے تھا رشتہ اُس کا
شام ہوتے ہی اُبھر آتا ہے چہرہ اُس کا

دِل کی دُنیا کو بدلنا کوئی آسان نہیں
دامنِ دشت میں ہے درد پُرانا اُس کا

کون سی چیز ہے ایسی جو سدا رہتی ہے
بُجھ کے رہ جائے گا ہر نقش سنہرا اُس کا

بھولنا چاہا مگر اُس کو بھلا بھی نہ سکے
آج احساس ہوا زخم تھا گہرا اُس کا

(۲)

کھلی جو آنکھ تو خوابوں کا سلسلہ ٹوٹا
ہمارے ہاتھ سے دامانِ سبز بھی چھوٹا

رفاقتوں میں عجب رنجشوں کے پہلو تھے
ہر ایک رشتۂ جاں بھی تھا کس قدر جھوٹا

طنابِ جسم جو اکھڑی تو لوگ چونک پڑے
کسے خبر ہوئی جب دِل کا آبلہ پھوٹا

وہ کون لوگ تھے؟ اپنے تھے یا پرائے تھے
جنھوں نے شہرِ تمنّا کو بارہا لوٹا

خلیل تنویر

کیوریٹر گورنمنٹ میوزیم، جے پور

ارتضیٰ کریم

فیض کا تنقیدی رویّہ

ہمارے ادبی منظرنامے میں اکثر ایک ادیب کا کوئی ایک پہلو زیادہ نمایاں ہوا ہے تو دوسرا پردہ خفا میں رہ گیا' یا کم معروف ہوا۔ نظیر کی نظمیں مقبول ہوئیں اور اس کی غزلوں پر زمانے کی گرد پڑتی چلی گئی۔ غالب کی غزلوں کی تہہ داری نے لوگوں کو ان کے خطوط کی طرف بہت بعد میں متوجہ ہونے دیا۔ میراجی شاعر ہی رہے نثر نگار کی حیثیت سے کم ہی لوگ ان سے آشنا ہوتے۔

اسی طرح فیض نے اپنی شاعری سے عوام کو اس قدر فیضیاب کیا کہ ان کی دوسری صلاحیتیں لوگوں پر ظاہر نہ ہو سکیں۔ فیض احمد فیض کی ایک بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے' اہم شاعر تھے۔ لیکن کچھ ضمنی حقیقتیں یہ بھی ہیں کہ وہ TRADE UNIONIST تھے' ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں تھے' ڈرامانویس' لیفٹننٹ کرنل' پروفیسر اور افروایشائی ادیبوں کی انجمن کے سربراہ تھے۔ انھیں حقائق میں ایک اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تنقید نگار بھی تھے۔ حالانکہ خود انھوں نے اپنے اس 'وصف' کا کبھی نہ تو ذکر کیا ہے۔ نہ وہ اپنی تحریروں کو تنقید کے زمرے میں شامل کرتے ہیں ان کے الفاظ ہیں:

"ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کے لیے نہ کبھی فرصت میسر تھی نہ دماغ۔ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ان مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع البتہ ملتے رہے۔ یہ مضامین ان ہی باتوں کا مجموعہ ہیں' اس لیے ان میں سخن علمار سے نہیں' عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے۔۔۔ ان میں سے بیشتر اب سے پچیس برس پہلے جوانی میں لکھے گئے تھے۔۔۔ ان تحریروں میں جگہ جگہ ترمیم و وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں نے یہ ردّ و بدل مناسب نہیں سمجھا۔ اول اس لیے کہ بنیادی طور سے ان تنقیدی عقائد سے اب بھی اتفاق ہے اور دوئم اس لیے کہ ہمارے ادب کے ایک خاص دور اور اس دور کے ایک مکتبِ فکر کی عکاسی کے لیے ان مضامین کی موجودہ صورت شاید زیادہ موزوں ہو۔"

اس عبارت سے چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں یعنی فیض ان مضامین کو تنقیدی یا تحقیقی مضامین نہیں بلکہ "تحریریں" کہتے ہیں۔ اسی لیے وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ 'ان تحریروں میں سخن علمار سے نہیں ہے۔ لیکن سب سے اہم بات جس پر زور دیتے ہیں۔ ان تنقیدی عقائد سے متعلق ہے جن پر وہ روزِ اوّل ایمان لائے تھے۔ سوال یہ ہے کہ فیض کے وہ تنقیدی عقائد کیا ہیں؛ جنھیں وہ تخلیقی عمل کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کے لیے زیادہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تنقیدی عقیدہ ادب کے اس نظریہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جسے ہم ادب برائے زندگی سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کے ڈانڈے مارکس کے خیالات اور مارکسی جمالیات سے جا ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے مارکس کے فلسفے کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ ہر بڑے جینوئن اور نابغہ فنکار کی طرح اپنے دماغ سے بھی سوچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ادب میں ترقی پسند نظریے" کے زبردست حامی اور پیروکار ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری اور شخصیت میں روایت پسندی' رومانیت اور انقلاب کی حسین آمیزش ہے جو انھیں تمام ترقی پسند شعرا میں ممتاز و ممیز کرتی ہے۔

تنقید اور تخلیق کا رشتہ چولی اور دامن کا ہے۔ تخلیق کے بطن سے تنقید کا جنم ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل میں قدم قدم پر تخلیق کار کا تنقیدی شعور اُسے راہ دکھاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ ہر اچھا تخلیق کار عمدہ تنقیدی شعور رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے فن پاروں کی تراش خراش کرتا ہے۔ اپنی دانست میں انھیں بہتر سے بہتر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

زندگی' سماج' ادب اور کائنات کے متعلق فیض کا اپنا ایک اندازِ فکر تھا۔ اس لیے وہ ادبی فن پاروں سے متعلق اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ انھیں آرا کا اظہار انھوں نے اپنے مضامین میں کیا ہے یہ مجموعۂ مضامین ــــ "میزان" کے نام سے پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین کا سلسلہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۱ء تک محیط ہے۔ گذشتہ پچیس برسوں میں ادب اور تنقیدی تصورات میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ نئے تصورات نے جنم لیا اور نئے تنقیدی افکار کے

شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی' دہلی

ذریعے ادب کی پرکھ کا کام کیا گیا۔ اس کے باوجود فیض کے تنقیدی مضامین سے ایک خاص عہد کے شعری اور ادبی منظر نامے کی تفہیم میں مدد ضرور ملتی ہے۔

فیض نے نظریاتی مسائل پر بھی لکھا اور سیاسی و سماجی موضوعات پر بھی۔ معاصرین اور متقدمین کی تخلیقات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو ناول اور افسانے پر بھی گفتگو کی۔ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے علمبرداروں پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس اعتبار سے ان کے مضامین میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ یوں بھی جن لوگوں نے فیض کو قریب سے دیکھا ہے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے۔ وہ فیض کے مزاج سے واقف ہیں کہ وہ کس قدر خوش مزاج، کشادہ ذہن، وسیع النظر اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔ بغیر کسی تعصب کے وہ اپنے عہد کے شاعروں اور نئے شاعروں پر بھی گفتگو کرتے تھے۔

ان کے اس وصف کا اندازہ کرنا ہو تو ـــــ "صلیبیں مرے دریچے میں" کے خطوط پڑھیے وہ خطوط جو "ایام اسیری" میں ضبط تحریر میں آئے ہیں۔ فیض کے ان خطوط میں بھی ان کے تنقیدی شعور کی کرنیں پھوٹتی دکھائی پڑتی ہیں۔ قید کے زمانے میں وہ دوستوں سے یا اپنی شریک حیات سے علمی، ادبی کتابیں منگواتے اور ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ مطالعے کے بعد خطوط میں ان پر مختصر سی رائے ضرور دیتے تھے اور اپنی بیگم کو بعض کتابوں کے پڑھنے کی ترغیب بھی دلاتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"آج میں بستر سے اس لیے نہیں نکلا کہ ایک ناول جو شروع کر رکھا ہے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نام ہے THE DIPLOMATE مصنف JAMES ALDRIDE ہیں۔ اور BODLEY HEAD نے شائع کی ہے۔ میں نے بہت زمانے سے ایسی اچھی کتاب نہیں پڑھی۔ تم بھی کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ جو لطف مجھے ملا ہے اس میں شریک ہو سکو۔ ناول کا موضوع تو ایران میں برطانیہ کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے۔ خوبی اس اخلاقی اور جذباتی کش مکش کے بیان میں ہے جو عالمگیر قوتیں ایک فرد کی ذات پر نازل کرتی ہیں"۔

یہاں محض ایک خط میں انھوں نے ایک ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور وہ حضرات جو یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند نقاد موضوع کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اسلوب اور انداز بیان کو اہمیت نہیں دیتے وہ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ فیض نے یہاں موضوع کی بجائے THE DIPLOMATE کے بیان کی تعریف کی ہے اور اسی کو ناول کا اہم وصف بتایا ہے۔

فیض کے یہاں خود احتسابی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ اپنے ایک خط مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں تخلیقی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوتے اپنی ایک نظم کے متعلق اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

"یہ نظم جو ابھی ہوئی ہے ایک طرح کا ترانہ ہے جو میں نے پہلے نہیں لکھا۔ شعر تو شاید اچھے نہیں ہیں۔ لیکن نعرے بازی بُری نہیں ہے"۔

فیض کے خطوط سے اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ لیکن میں "میزان" کے مضامین کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ فیض جنھوں نے ترقی پسند اذہان کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی اہمیت کا کام کیا ہے۔ اس تحریک کے آغاز میں اختر حسین رائے پوری، سید سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں، محمد دین تاثیر وغیرہ نے نظریاتی مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔ انھیں میں فیض بھی شامل تھے۔ یہ زمانہ ۳۶ء، ۳۷ء، ۳۸ء کا ہے۔ فیض نے نظریاتی مسائل سے متعلق کئی اہم مضامین لکھے۔ مثلاً "ادب کا ترقی پسند نظریہ" "ادب اور جمہور" "خیالات کی شاعری" "موضوع اور طرز ادا"۔

ادب کا ترقی پسند نظریہ ـــــ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا۔ اس میں فیض نے کھل کر ترقی پسند ادبی نظریے سے بحث کی ہے۔ ترقی پسند ادب کس طرح ہمہ گیر اور آفاقی ہوتا ہے؟ ترقی پسند ادیب کیوں کر سماج، زندگی اور انسانی تہذیب کی ترقی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ ان پر نہایت تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ایک مقام پر بڑی وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی میں مدد دیں (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں"۔

وہ حضرات جو ترقی پسند ادب کو نعرے بازی سمجھتے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادیب فن کے قائل نہیں یا قائل ہیں تو کم کم، ان کے اذہان فیض کے اس خیال کے بعد صاف ہو جانے چاہییں۔

یہ بات سو بار دہرائی جا چکی ہے کہ ادب زندگی کی تفسیر ہے۔ اس لیے ادیب بھی جو اسی سماج میں سانس لیتا ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول کی پیش کش کرتا ہے۔ فیض احمد فیض کا کہنا ہے کہ ترقی پسند ادیب محض عکاس ہی نہیں نقاد بھی ہوتا ہے۔ "ایک افسانے میں محض واقعات کے انتخاب اور ترتیب اور کرداروں کی تفسیر و تجزیہ سے تنقید کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری

نہیں کہ اس میں سیاسیات اور اقتصادیات پر مستقل لیکچر بھی شامل کیے جائیں۔"

اس عبارت کی روشنی میں فیض کا تنقیدی رویہ اور کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ ادب میں محض پروپگینڈہ کے حامی نہیں بلکہ سیاسیات اور اقتصادیات پر پند و نصیحت کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

"شاعر کی قدریں" ـــــ ان کا ایک اہم مضمون ہے جس میں شعر کے جمالیاتی اور افادی پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ شاعر کی بنیادیں قدریں متناسب، متوازن اور سماج کے لیے مفید ہیں تو لامحالہ اس کا شعری سفر کائنات میں تغیر و تبدل کے ساتھ ارتقار میں بھی معاون ہوگا۔ اسی لیے فیض کے نزدیک "مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار ہی پر نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اُترے۔"

فن اور زندگی کے اسی مناسب امتزاج نے فیض کی شاعری کو پائداری بخشی۔ فیض کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بار بار احساس ہوتا ہے کہ فیض ادبی تاریخ کا بڑا عمیق اور گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس کے ثبوت میں "خیالات کی شاعری"، "موضوع اور طرزِ ادا" جیسے مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے شعری منظرنامے کا ذکر ہو رہا ہے۔ الفاظ دیکھیے اور زبان و بیان پر سر دُھنیے:

"جب مولانا حالی نے روایتی شاعری کے خلاف جہاد شروع کیا تو نئی روشنی کے جملہ نقاد یہ تلقین کرنے لگے کہ ہمارا کلاسیکی ادب سب کا سب دفترِ بے معنی ہے۔ نظیر اکبرآبادی اور شاید میر و غالب تو کچھ آدھ پون شاعر تھے اس لیے کہ انھیں اپنے گرد و پیش کا کچھ نہ کچھ احساس تھا لیکن باقی بزرگوں نے تو رنگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کے علاوہ کچھ کر کے ہی نہیں دیا۔ چنانچہ جب لوگ محض طرزِ ادا کے دلدادہ تھے تو ذوق کو استاد اور غالب کو مہمل گو سمجھتے تھے اور اب جو اس نظریے سے برگشتہ ہوئے تو سودا، مصحفی اور داغ کو مسخرہ بنا دیا . . . یوں نہ ہونا چاہیے تھا۔"

نظریاتی مباحث سے قطعِ نظر ان کے سیاسی، سماجی، تنقیدی شعور کی گہرائی اور گیرائی اور وسعت کا اندازہ کرنا ہو تو پاکستانی تہذیب کے مسائل، اردو شاعری کی پُرانی روایتیں اور نئے تجربات، جدید فکر و خیال کے تقاضے اور غزل وغیرہ مضامین دیکھیے۔ جہاں مسائل کو ایک نئے اور وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فیض کے ان مضامین کی خوبی ان کا استدلال اور توازن ہے۔ وہ زیرِ بحث موضوع سے سوال پیدا کرتے ہیں اور خود اعتراض اور اعتراف کرتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں اور مثالوں کے ذریعے، دلائل کی روشنی میں اپنی بات سامنے رکھتے ہیں۔ غزل کے متعلق ترقی پسند ادیبوں کا ہی نہیں حالی، عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد کا بھی رویہ ہمدردانہ نہ تھا۔ فیض نے ان کے درمیان اعتدال کی راہ نکالی اور کہا کہ:

"اول تو یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ تنگنائے غزل کا استعارہ ایک اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اس طریقِ اظہار کی چند مخصوص حدود ہیں۔ جن سے اس صنف کی طبعی صورت مسخ کیے بغیر تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ محدودیت کچھ غزل ہی کا خاصہ نہیں۔ مثلاً آپ کسی تصویر سے گانا نہیں گوا سکتے۔ نہ کسی گیت کو نیلا، پیلا رنگ دے سکتے ہیں . . . اسی طرح غزل میں . . . کسی سیاسی یا سماجی مسئلے کی مکمل تصویر پیش نہیں کر سکتے . . . بہت سے فکری انکشافات کا براہ راست بیان غزل میں مشکل ہے۔"

فیض کے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ غزل کی اپنی انفرادیت ہے۔ لیکن ان کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ غزل میں کسی خاص نظریے، کسی سیاسی سماجی مسئلے یا دورِ جدید کے حقائق اور ایجادات کو بیان کرنا دشوار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غزل نے حد درجہ اپنے زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ غزل سے کسی بھی عہد کی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ خود فیض نے اپنی غزلوں میں غمِ روزگار، غمِ حیات اور غمِ کائنات کی خوبصورت اور موثر ترجمانی کی ہے۔

فیض کو بھی غزل کی وسعتوں کا احساس ہے۔ اسی لیے اختتامِ مضمون پر لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے ذاتی اور عمومی تجربات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے اظہار کے لیے اب بھی غزل ہی سب سے موثر اور سب سے مقبول صنفِ سخن ہے۔"

فیض نے اپنے متقدمین پر بھی مضامین لکھے ہیں اور ان کے متعلق بھی بڑی دو ٹوک باتیں کہی ہیں۔ "نظیر اور حالی" کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ اپنی نوعیت کا واحد مضمون ہے۔ حالی اور نظیر میں کہاں اور کس قدر مشابہت ہے اور کہاں اختلاف اس پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کی طوالت کا احساس ہے لیکن مثالوں کے بغیر فیض کی تنقید کی بوطیقا کے اصول و ضوابط کو سمجھنا مشکل ہوگا۔ مذکورہ مضمون کے کچھ جملے پیش ہیں۔

۱:۔ نظیر اور حالی دونوں باغی شاعر تھے۔ دونوں پُرانی درباری شاعری میں رسوم و روایات سے بیزار اور ایک نئی طرزِ سخن ایجاد کرنے کے خواہاں تھے۔

۲:۔ دونوں نے شعر اور زندگی کا درمیانی فاصلہ کم کرنا چاہا۔ شعر کو ایک محدود طبقے کے چنگل

سے چھڑا کر اس کی لذتیں عوام میں بانٹنا چاہیں۔

۳:۔ حالی کو مجرد اخلاقی مضامین کا چسکا ہے۔ لیکن نظیر مادیت پسند ہیں۔

۴:۔ مولانا حالی کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جا چکا ہے۔ لیکن نظیر کے نام پر عام طور سے نقاد کچھ شرما کر سر جھکا لیتے ہیں۔

۵:۔ حالی اردو کا پہلا سائنٹیفک نقاد ہے۔ اردو کا پہلا قومی شاعر نظیر کو ہم اس لیے نہیں کہتے کہ عوام کی کوئی قوم نہیں ہے۔

اِن جملوں میں ادبی تاریخ کے اوراق کی سچائیاں فیض نے سمو دی ہیں۔ حالی اور نظیر کی اس مشابہت اور اختلاف پر ہماری نظر پہلے کبھی نہ گئی۔ علاوہ ازیں ہم نظیر کو قومی شاعر کہتے ہیں یہاں فیض نے یہ کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا کہ "عوام کی کوئی قوم نہیں ہے" یہ جملہ دراصل فیض کی اس بین الاقوامی نگاہ، وسعتِ قلب اور انسان دوستی کا ثبوت ہے۔ جہاں یں کو ہم بنانے کا جذبہ ہے اور جو ساری انسانیت کو، ساری دنیا کو ایک اور متحد سمجھتا ہے۔

بڑا فن کار ہر جگہ اپنی نئی راہ بنا لیتا ہے۔ فیض بھی بڑے فنکار تھے انھوں نے مضمون نگاری میں ڈرامائیت کی فضا پیدا کر دی۔ غالب نے مکالے کو مراسلہ بنا دیا تو فیض نے مکالے کو مضمون کی شکل دے دی۔ "غالب اور زندگی کا فلسفہ" اور "پریم چند" جیسے مضامین اس کی مثالیں ہیں۔ جن میں مکالماتی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مضامین ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء کے قریب لکھے گئے ہیں۔ . . .

"پریم چند" سے متعلق مضمون کو ہم ریڈیائی بحث کے زمرے میں رکھ کر بات ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن غالب اور زندگی کا فلسفہ میں فیض نے بہر صورت مکالے کا انداز اختیار کیا ہے۔ اور یہ انداز بے سبب اختیار نہیں کیا گیا۔ بلکہ آپ فیض کا کوئی بھی مضمون پڑھیے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنی بات سے سوال پیدا کرتے ہیں اور پھر اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ مکالماتی مضمون میں یہ آسانی ہو گئی کہ کردار فرض کر کے دوسرے کرداروں سے سوالات کرائے اور پھر خود ان کے جوابات دیتے چلے گئے۔ اس طرح اپنا نظریہ اور اپنی بات زیادہ استدلال سے کہنے کا موقع مل گیا۔

فیض شاعری کے آدمی تھے۔ لیکن چونکہ وسیع المطالعہ تھے۔ اس لیے اردو فکشن پر بھی انھوں نے کچھ مضامین لکھے تھے۔ پریم چند کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ "اُردو ناول"، "رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری"، "شرر" وغیرہ پر مضامین ملتے ہیں۔ فکشن پر لکھے گئے مضامین کا زمانۂ تحریر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب اُردو میں فکشن کی تنقید کی باضابطہ داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اُردو ناول پر شرر نے لکھنا شروع کیا تھا، ۱۹۰۴ء کے بعد پھر سید سجاد حیدر، پریم چند وغیرہ نے اس کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی۔ اُردو ناول پر فیض کا یہ مضمون ناول پر لکھی جانے والی تنقید میں بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو ناول کے ارتقا پر اجمالی گفتگو کے ساتھ نذیر احمد سے لے کر بیدی تک کے ناولوں پر نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بھی اُردو ناول کے معیار اور وقار سے اسی حد تک نا امید اور مایوس ہیں جس حد تک آج کا نقاد۔ انھوں نے بھی انھیں خامیوں اور کمزوریوں کی طرف اشارے کیے ہیں جنھیں آج کا ناول نگار بھی دور نہیں کر پایا ہے۔

مولوی نذیر احمد کے متعلق فیض نے بالکل منفرد رائے دی ہے۔ عموماً ہم انھیں واعظ، مصلح اور خطیب کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن فیض کا خیال ہے کہ:

"مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں مولوی اور آرٹسٹ کی مسلسل ہاتھا پائی ہوتی رہی ہے۔ اور آرٹسٹ عام طور سے جیت جاتا ہے۔ مولانا کا مقصد عام طور سے کسی مذہبی، اخلاقی یا معاشرتی نکتے کی حمایت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ناول کے دوران وہ اپنے کرداروں میں اتنا کھو جاتے ہیں کہ نکتہ انھیں بھول جاتا ہے اور لمبے لمبے وعظوں کے باوجود ناول کا VILLIAN اکثر ہیرو بن جاتا ہے۔"

پریم چند کے ناولوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صاف لفظوں میں لکھتے ہیں:

"منشی پریم چند نے ناول کی تکنیک یا ناول کے فن میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا۔ انھیں کہانی لکھنے کا ڈھب ضرور ہے۔ پلاٹ بننے کا زیادہ ملکہ نہیں ہے۔ جگہ جگہ ناول غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔"

یہ وہ خامیاں ہیں جو آج کا نقاد بھی پریم چند کے ناولوں میں ڈھونڈ لیتا ہے۔ فیض کے تنقیدی رویے کی خاص بات ان کی بے باکی اور صاف گوئی ہے۔ نہ وہ غیر ضروری تعریف کرتے ہیں، نہ تنقیص۔ نہ دوستی کا منہ دیکھتے ہیں، نہ دشمنی کا۔ ایک مقام پر کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک اور بیدی کے ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کرشن چندر اور اشک کے ناول "شکست" اور "قفس" کی قیمت ابتدائی تجربات سے زیادہ نہیں"

فیض کی اس رائے پر چالیس سال کا زمانہ گذر چکا ہے۔ لیکن کیا ہم اس میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فیض وقتِ مطالعہ فن پاروں اور فن کاروں کو پوری طرح سامنے رکھتے تھے۔ اور ادبی روایت اور معیار کے پیشِ نظر کوئی رائے دیتے تھے۔ اس رائے کو آپ "ادبی تنقید" کے سوا اور کیا نام دیں گے۔ خصوصاً اس

وقت جب کہ اس دائرے میں گہرائی اور گیرائی بھی ہو، استدلال اور استدراک بھی۔

رتن ناتھ سرشار پر سب سے پہلے پنڈت برج نارائن چکبست نے تفصیلی مضمون لکھا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں پریم چند نے ان پر اظہار خیال کیا جو نہایت غیر منصفانہ تھا۔ سرشار پر فیض کی یہ تحریر ۱۹۴۵ء کی ہے۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں لکھنؤ کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے تضادات اور تنزل کو خوبیوں اور کمزوریوں کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اسے فیض نے بڑے مدلل انداز میں سراہا ہے اور فکشن کی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

شرر پر تو لکھا ہی بہت کم گیا ہے۔ اس لیے فیض کا یہ مضمون اور اہم ہو جاتا ہے۔ فیض احمد فیض نے شرر کے ناولوں پر نہایت گہری تنقیدی گفتگو کی ہے اور آپ ان باتوں سے بڑی مشکل سے اختلاف کر سکیں گے۔ وہ شرر کے ناولوں کو تاریخی ناول نہیں مانتے۔ کیونکہ ان کے ناولوں سے کسی تاریخی دور کو سمجھنا مشکل ہے اور نہ کسی تاریخی شخصیت کی کوئی صحیح تصویر بن پاتی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"بات ذرا سخت ہے۔ لیکن کہنا ہی پڑتی ہے کہ شرر اخلاقی اور مذہبی جوش کی وجہ سے کبھی کبھی کلیسوں، راہب خانوں یا موجودہ سماج کی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تحریریں فحش نویسی کی حد تک جا پہنچتی ہیں . . . شرر کا ناول نویس مشہور ہونا قدرت کی ستم ظریفی ہے ان کا صحیح میدان صحافت یا طنز نظم ہے۔"

جن اہلِ ذوق نے شرر کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے وہ فیض کے ان خیالات میں خود کو شریک پائیں گے۔

معاصرین پر لکھنا کسی حد تک دشوار کام ہوتا ہے۔ اس میں تعصب کا رنگ یقینی طور پر شامل ہو جاتا ہے اور غیر جانبداری سے ان کے فن پاروں پر لکھنا دوست کو دشمن بنانے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن فیض نے اپنے معاصرین پر بھی لکھا۔ ان میں اقبال بھی تھے جو بزرگ معاصر کہے جا سکتے ہیں ان کے علاوہ مجاز، جوش، میراجی، ن م راشد وغیرہ بھی۔

عام طور پر یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ فیض نے راشد اور میراجی کی شخصیت اور شاعری کو جب جب موقع ملا ہے DAMAGE کرنے کی کوشش کی ہے۔ یا ان کے متعلق فیض کی رائے اچھی نہیں تھی۔ لیکن فیض کے مضامین میں کہیں ایسی بات نہیں ملتی، جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ راشد یا پھر میراجی کی شاعری کے قائل نہیں یا اُسے لغو اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ البتہ جہاں کہیں انھوں نے کچھ تنقیدی گرفت کی ہے۔ اس سے اختلاف ممکن ہے۔ فیض سے انٹرویو کرنے والوں نے اکثر راشد کی شاعری کے بارے میں پوچھا ہے۔ اور فیض نے ہر انٹرویو میں راشد کو اچھا شاعر کہا ہے۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ:

"راشد کی شاعری کے مختلف پہلو ہیں۔ اور اس کے مختلف دور ہیں۔ ان کی شاعری یقیناً ایک اضافہ ہے۔ ان کی بہت سی شاعری تندرست شاعری ہے محض تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ ہماری روایت میں شامل ہیں۔

راشد بہت اچھے شاعر تھے، بہت تہہ دار شاعر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے بہت سے ہیئتی تجربے کیے مگر اس زبان میں کیے جس سے بیشتر لوگ مانوس نہیں تھے۔ تجربے کی حد تک تو لوگوں نے انھیں مان لیا، لیکن زبان اور خیالات کے حوالے سے وہ لوگوں تک ٹھیک سے نہیں پہنچ پائے۔"

فیض کے جن تنقیدی مضامین پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ وہ ان کے تنقیدی مجموعے میزان میں شامل ہیں۔ یہ تینتیس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف شعری مجموعوں پر دیباچے اور مقدمے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان میں بھی ان کے تنقیدی افکار نظر آتے ہیں۔ اس مضمون کا مقصد صرف یہ ہے کہ فیض کی ادبی شخصیت کے ایک پہلو کی نشاندہی ہو جائے۔

چنانچہ صرف "میزان" کے حوالے سے ہی اگر ان کے تنقیدی رویے پر غور کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک گہرا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ تاریخ ادب اردو پر ان کی نظر تھی۔ وہ تنقید میں جذباتیت اور جانبداری سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کے تنقیدی رویے کا خاص وصف "انداز استفہامیہ" ہے۔ یہ وصف ان کے تنقیدی مضامین کی شناخت ہے۔ ان کی تنقید تخلیقی بھی ہے اور سائنٹفک بھی۔ کہیں کہیں طنز کی لہر بھی موجود ہے۔ ان کی نثر رواں دواں اور سلیس ہے۔ تحریر کہیں گنجلک اور مبہم نہیں۔ صاف شفاف ایک موج کی مانند بہتی چلی جاتی ہے۔ طنز کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"میں یوں باتیں کر رہا ہوں جیسے ہم نے اب تک بیسیوں اوّل درجے کے ناول نویس پیدا کر رکھے ہیں۔ لیکن ناول نویس کیا ہمارے اچھے ناولوں کی تعداد بھی درجن ڈیڑھ درجن سے اوپر نہیں جاتی یوں ناول تو سینکڑوں کیا ہزاروں لکھے گئے ہوں گے۔ جام عشق، زہر عشق، خون عشق، عشق کے ساتھ کوئی سی اضافت لگا لیجیے یا خونی کے ساتھ کوئی سا لفظ جوڑ لیجیے۔ خونی ڈاکو۔ خونی معشوق، اس نام کا ایک نہ ایک ناول آپ کو ضرور مل جائے گا۔"

استدلال کی مثال میں یہ اقتباس پیش کرنا

(بقیہ ص ۳۰ پر)

عارف محمود

شاید

"جی ہاں. آپ نے ٹھیک کہا" تیسرے مسافر نے داہنے ہاتھ سے اپنی صلیب کو پکڑ کر کہنا شروع کیا" یسوع مسیح نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ دنیا نیک لوگوں کے لیے اور نیکی کرنے کے لیے بنائی گئی ہے. اگر کوئی بہک بھی جاتا ہے تو اس کو پیار سے فتح کر لو."

"ارے صاحب ہمارا مذہب بھی یہی کہتا ہے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں' ہمارے پیغمبر تمام انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے. یہ دنیا بھی بس اس ریل کے ڈبے کی طرح ہے" سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر نے اپنی شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کہا" کیوں پنڈت جی آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"میاں جی آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں" ماتھے پر موٹا سا تلک لگائے ہوئے مسافر نے شیروانی والے کی تائید کی." دیکھیے میاں جی ہمارے اوتار بھی یہی کہتے رہے ہیں کہ اس سنسار میں ہم سب ہی ایک مسافر کی طرح سے ہیں جس کی جہاں منزل آئی اُتر گیا."

"اُفوہ' بڑی سخت گرمی ہے" شیروانی والے نے اپنی شیروانی اُتار کر کھڑکی کے پاس ٹانگ دی. اور پھر پنڈت جی سے مخاطب ہوا" دیکھیے پنڈت جی دنیا میں جتنے بھی اوتار اور پیغمبر آئے سبھی اچھی باتوں کی تعلیم دیتے رہے ، سب کی منزل ایک ہے بس ذرا راستے الگ الگ ہیں. اب اس ریل کے ڈبے کو دیکھیے' ابھی دو گھنٹے پہلے جب ٹرین روانہ ہوئی تھی تو کتنا سخت شور اور جگہ کے لیے لڑائی جھگڑا مچا ہوا تھا' وہ جو تری دار پاجامے والا دھوتی والے کو مار ڈالنے پر آمادہ تھا کیونکہ شاید دھوتی والے نے اس کی نئی نئی بیوی کو ہاتھ پکڑ کر اپنی سیٹ سے اٹھا دیا تھا. اور وہ اُس پتلون والے کے ساتھ جو لڑکی ہے اس کو اس بوڑھے سردار نے اپنے پاس بٹھا لیا تھا تو وہ پتلون والا لڑکی پر کس قدر ناراض ہوا تھا اور پھر لڑکی کو وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس کھڑا کر لیا تھا. مجھے تو سوچ کر ہنسی آتی ہے بیچارہ بوڑھا سردار پتلون والے کی اس حرکت پر کس قدر گھبرا گیا تھا" تینوں مسافر ایک ساتھ ہنسنے لگے پھر صلیب والا بولا" ارے آپ اس بڑھیا کو تو بھول ہی گئے جس کی ٹوکری اس تہبند والے نے صرف ہمدردی سے اٹھا کر اوپر برتھ پر رکھ دی تھی تو وہ کتنے زوروں سے اس پر چلائی تھی. جیسے کہ اس ٹوکری میں کوئی خزانہ بھرا ہوا اور پھر جب تک ٹوکری دوبارہ اس کے ہاتھ میں نہیں آگئی. اس کو چین نہ آیا تھا اور اب دیکھیے سب یہاں سے وہاں تک کیسی میٹھی نیند سو رہے ہیں. جیسے سب ایک ہی خاندان کے ہوں. اس وقت سارے بھید بھاؤ' اونچ نیچ اور مذہبی دیواریں سب ہٹ چکی ہیں. وہ بڑھیا اپنی ٹوکری کی طرف سے بے خبر ہے' نئی دلہن کا سر تہبند والے کے کندھے سے ٹکا ہوا ہے"

ٹرین کی اس سیکنڈ کلاس ٹو ٹائر بوگی میں یا تو یہ تین بوڑھے ابھی تک جاگ رہے تھے. یا پھر اوپر کی برتھ پر لیٹی ہوئی وہ نوجوان خوبصورت عورت جو کہ شروع رات سے کوئی انگریزی ناول پڑھنے میں مشغول تھی. اور اس کے سامنے کی برتھ پر لیٹا ہوا ایک مسافر جو سونے کی ناکام کوشش میں کروٹیں بدل رہا تھا' لیکن شاید نیچے والے تینوں بوڑھوں کی مستقل باتوں کی وجہ سے سو نہیں پا رہا تھا. بوڑھوں کی باتوں میں رہ رہ کر کبھی کبھی اتنی تیزی آجاتی کہ جیسے اب لڑ پڑیں گے. کیونکہ بحث اب اس رُخ پر پہنچ گئی تھی کہ کون سا مذہب سب سے بہتر ہے. تینوں ہی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہی مذہب اچھا ہے جس کو وہ مانتے ہیں. اوپر لیٹی ہوئی عورت کبھی کبھی اپنے' ناول کو الٹ کر سینے پر رکھ لیتی' ور ان بوڑھوں کی باتیں سننے لگتی یا پھر مسکرا کر اپنے سامنے والی برتھ کے مسافر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے لگتی. اوپر کی برتھ والے نے اپنی گھڑی دیکھی رات کے بارہ بج چکے تھے اور وہ اچانک جیسے اُبل پڑا" کیوں صاحب آپ لوگوں کے مذہب میں کسی کے یہاں یہ بھی لکھا ہے کہ رات سونے کے لیے ہوتی ہے اور کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہیے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو"

عورت نے ناول کو پھر اپنے سینے پر رکھا اور مسکرا کر نیچے دیکھنے لگی. پہلے تو تینوں مسافر اس اچانک حملے سے بوکھلا سے ہو گئے. پھر ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کرنے لگے. آخر کار شیروانی والا بولا "خود تم کو سونے کے لیے برتھ مل گئی اس لیے ہم کو راستہ دکھلا رہے ہو. ہم کو تو صبح تک بیٹھ کر ہی سفر کرنا ہے' اور پھر ہم لوگ کوئی گندی باتیں تو نہیں کر رہے ہیں. آخر تمھیں کیوں بُرا لگ رہا ہے ؟"

۱۴۰/۹۲، پرو وا ہیرامن، کانپور ۲۰۸۰۰۱ (یوپی)

"ہاں اور نہیں تو کیا۔ میاں جی بالکل ٹھیک کہتے ہیں، اگر سونا ہے تو ریل کی یہ کھڑکی پھر بھی بند کروا دیں، ہم تو ایسے ہی صبح تک بولتے رہیں گے، نہیں سننا ہے تو کان بند کر لیں۔ مجھ کو تو یہ ناسنک معلوم پڑتا ہے۔" تلک والے نے آہستہ سے کہا اور شیروانی والے نے فوراً اس کی تائید کر دی۔ "جی ہاں بالکل لامذہب ہے۔ ورنہ اتنی اچھی باتوں سے اس کو چڑ کیوں ہوتی؟"

برقعہ والا مسافر دانت پیس کر رہ گیا اور اس کے سامنے والی عورت نے مسکرا کر پھر اپنا ناول پڑھنا شروع کر دیا۔

بحث کا سلسلہ اب اور زوروں سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اب صلیب والا مسافر ذرا کم بول رہا تھا۔ وہ صرف ہوں ہاں سے ہی کام چلا رہا تھا شاید اُوپر کی برقعہ والے کی بات اس کو ٹھیک لگی تھی۔ ٹرین کی رفتار کے ساتھ ہی باتوں کا سلسلہ گھٹتا بڑھتا آگے چل رہا تھا اور اب بات یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ کہ جب سب ایک ہی ہیں تو آخر یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں، تینوں مسافر اس بات پر متفق تھے کہ فسادات کسی نہ کسی بات کا ردِ عمل ہوتے ہیں۔

"ہاں تم دونوں ہی ٹھیک کہتے ہو کہ ہر جھگڑے کے پیچھے کسی نہ کسی عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔" اوپر کی برقعہ والا بول پڑا۔ "اب یہی دیکھو کہ تم لوگ جو حرکت کر رہے ہو اس کا ردِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ میں تم میں سے کم از کم دو کو تو نیچے پھینک دوں کیونکہ تمہارا تیسرا ساتھی مجھے کچھ معقول نظر آتا ہے، اگر میں نے ایسا کر دیا تو کل صبح کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو جائے گی کہ ایک آتنک وادی نے دو مسافروں کی ہتیا کر دی، کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ دو آتنک وادی کس طرح ایک شریف مسافر کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔"

"کیا کہا؟ تمہاری یہ ہمت۔" شیروانی والا آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ اُوپر کی برقعہ والی عورت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "بھئی واہ اس ناول میں بھی اس وقت یہی ہو رہا ہے کہ ہیرو نے دو بدمعاشوں کو اٹھا کر ٹرین کے نیچے پھینک دیا ہے۔"

صلیب والے مسافر نے اپنے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ساتھ والے کو بٹھایا۔ "ارے چھوڑیئے صاحب سفر میں ہر طرح کے لوگ ملا ہی کرتے ہیں۔" بقیہ دونوں مسافروں نے بہت گھور کر عورت کو دیکھا لیکن اس کی مسکراہٹ دیکھ کر دونوں دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے سرگوشی کی "آوارہ معلوم ہوتی ہے" ــــــ "ارے آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے میں تو بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ اوپر والے کو دیکھ دیکھ کر برابر کچھ اشارے کر رہی ہے۔" یہ سرگوشی بھی غالباً اوپر کی برقعہ والے کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اور اس بار وہ پوری طاقت سے چیخا۔ "آپ دونوں مکّار ہیں، دکھانے کے لیے مذہبی باتیں کر رہے ہیں اور نگاہیں اس عورت پر لگی ہیں۔ اگر اب آپ میں سے کسی کی بھی آواز آئی تو میں نیچے آتا ہوں۔" اس نے ابھی اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ ٹرین کو ایک جھٹکا لگا اور پھر رفتار کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ بالکل رک گئی۔ ٹرین کے باہر اندھیرا تھا۔ گاڑی شاید جنگل میں رک گئی تھی۔ لوگوں نے سر باہر نکال کر آہٹ لینی چاہی کہ آخر اس سنسان جنگل میں ٹرین کیوں رکی؟ کچھ لوگ اندھیرے میں انجن کی طرف جاتے نظر آئے۔

"کیوں بھائی کیا ہوا؟"

"شاید کوئی ٹرین سے گر گیا ہے اور زنجیر کھینچی گئی ہے۔"

"نہیں شاید آگے پٹری اُکھڑی ہوئی ہے۔"

"کیوں بھائی صاحب آپ تو انجن کی طرف سے آرہے ہیں کیا ہوا ہے؟"

"شاید آگے کوئی گڑبڑ ہے۔"

"گڑبڑ! کیسی گڑبڑ" ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں۔

"ارے صاحب میں کیا جانوں آپ نے پوچھا تو میں نے بتلا دیا۔ لوگ کہہ رہے ہیں انہی سے جاکر پوچھئے"

"لیکن صاحب یہ ٹرین رُکی کیسے؟" ٹرین کے اندر سے پھر ایک سوال آیا۔

"آپ عجیب آدمی ہیں ٹرین کے اندر سے ہی سوال کرتے جا رہے ہیں۔ نیچے آکر دیکھیے تو وہ سگنل کی لال بتی نظر آ رہی ہے۔ شاید آگے کوئی اسٹیشن ہے۔"

ٹرین کے رکنے سے ڈبوں کے اندر گرمی کی شدت نے حملہ کیا اور رفتہ رفتہ تمام مسافر جاگ گئے پھر ٹولیوں کی شکل میں نیچے اُتر کر باتیں کرنے لگے! ... میں پھر کچھ لوگ انجن کی طرف سے تقریباً دوڑتے ہوئے آتے نظر آئے، مجمع نے انکو گھیر لیا۔

"کیوں صاحب کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں ہم لوگ سگنل تک گئے تھے اندھیرے میں کچھ دکھائی تو نہ پڑا لیکن اُدھر سے کچھ آوازیں ایسی آ رہی تھیں جن سے یہ اندازہ ہوا کہ شاید فساد ہو گیا ہے"

"ہائیں فساد ہو گیا" "ارے بھئی فساد ہو گیا"

"کیا کہا فساد ہو گیا؟!"

"ارے بھئی خود جاکر معلوم کر لو نا وہ لوگ بھی دیکھ کر آتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" "یہاں پر اب میں یہ کیسے بتلا دوں کہ کون لوگ ہیں اندھیرے میں کسی کی صورت نظر آتی ہے؟"

"اب کیا ہوگا؟" شیروانی اور تلک والے مسافروں کے منہ سے ایک ساتھ ایک سوال نکلا دو تھر تھر کانپ رہے تھے۔ صلیب والا دونوں ہاتھوں اپنی صلیب تھامے ہوئے جلدی جلدی کوئی دعا پڑھ تھا۔ "کیوں بھائی صاحب اب کیا ہوگا؟" پہلی بار مسافروں نے اوپر کی برقعہ والے سے براہِ راست ا

معصوم سا سوال کیا۔

"اب ہوگا یہ کہ میں کسی باہر والے کو تو اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم لوگوں کو مارے لیکن میں تم دونوں کو ضرور مار دوں گا کیوں کہ اب اس سے بہتر موقع اور نہ مل پائے گا۔" اوپر کی برتھ والا جواب تک اپنی برتھ پر ہی لیٹا تھا اٹھتا ہوا بولا۔

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" دونوں مسافر ایک ساتھ پھر بولے اور ایک دوسرے کی طرف دشمنوں کی طرح دیکھتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "تم ہم دونوں کو کیسے مار سکتے ہو! تم کسی نہ کسی کا ساتھ تو ضرور دو گے۔"

"نہیں ——— میں تو ناستک ہوں، لامذہب ہوں۔ تم دونوں کی بکواس سنتے سنتے اتنا عاجز آچکا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم جیسے لوگوں سے نجات حاصل کرلی جائے۔ اور یہ بھی سن لو کہ یہ اوپر جو آوارہ عورت لیٹی ہوئی ہے یہ میری بیوی ہے۔"

دونوں مسافروں کے چہروں پر موت کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ ٹرین کے باہر لوگ فساد کی ہی باتیں کر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ آپس میں بحث و تکرار بھی شروع ہوگئی تھی۔ دونوں مسافروں نے دھیرے دھیرے اپنا سامان اکٹھا کیا اور ڈبے سے نکل جانا چاہا کہ اوپر کی برتھ والا کود کر نیچے آگیا۔ "تم دونوں باہر نہیں جاؤ گے یہ میرا حکم ہے۔" اتنے میں باہر کسی نے کہا "ضرور فساد ہوا ہے۔ کیوں کہ چیخ پکار اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں بھی انجن کے پاس سنائی دے رہی ہیں۔"

"تو پھر شاید کرفیو بھی لگا ہوگا۔ میرا خیال ہے شاید کچھ لوگ مارے بھی گئے ہوں گے جبھی تو چیخ پکار کی آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔"

"کیا آپ نے سُنی ہیں؟"

"میں کیوں سنتا۔ لوگ کہہ رہے ہیں۔"

"آخر کون لوگ ہیں وہ؟" ایک دوسری آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"دیکھیے صاحب مجھ سے تو بحث نہ کیجیے۔ وہاں انجن کے پاس جاکر خود سن لیجیے۔ لوگ اکٹھا ہو رہے ہیں۔ حالات یہاں بھی بگڑنے ہی والے ہیں۔"

"کیوں بھائی صاحب یہ اگلا اسٹیشن کون سا ہو سکتا ہے؟"

"شاید تیواری پور ہوگا۔"

تیواری پور کا نام سنتے ہی تلک والے کے چہرے پر زندگی کی لہر سی آگئی اور اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ منہ لگا کر اندھیرے میں ہی تائید کردی۔ "آپ کا خیال صحیح ہے یہ شاید تیواری پور ہی ہے۔" اور پھر جلدی جلدی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ نیچے سے پھر آواز آئی۔ "ابھی چھوڑیے کیا بات کرتے ہیں۔ تیواری پور تو کب کا نکل چکا یہ ضرور کمال پور ہوگا۔"

"یہی میں بھی کہنے والا تھا" شیروانی والے نے رومال سے اپنا پسینہ خشک کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔ وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اتنی دیر میں کئی بار اپنی شیروانی پہن کر اتار چکا تھا۔ برتھ پر لیٹی ہوئی عورت جواب بھی ناول پڑھنے میں مشغول تھی کبھی کبھی ان لوگوں کی حرکتوں کو دیکھ کر مسکرا دیتی جیسے اس پر ان فساد کی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ ٹرین کے باہر اب لوگ ایک بڑے مجمعے کی صورت میں اکٹھے ہو رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مجمع دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ کچھ لوگ ٹرین کے انجن کی طرف جا رہے تھے اور کچھ پیچھے گارڈ کے ڈبے کی طرف پھر اچانک ہی انجن کی طرف زیادہ شور ہونے لگا۔ ٹرین کے اندر جو بھی عورتیں اور بچے رہ گئے تھے چیخ و پکار کی آوازوں کے ساتھ اپنا اپنا سامان سمیٹ کر ٹرین سے کودنے لگے کچھ سروں پر سامان رکھے انجن کی طرف جا رہے تھے اور کچھ گارڈ کے ڈبے کی طرف۔ ساری ٹرین شاید خالی ہو چکی تھی۔ سوائے ان پانچ مسافروں کے، جن میں تین کو زبردستی روکا گیا تھا۔ اور دو اپنی مرضی سے رکے تھے۔ صلیب والا مسافر بالکل خاموش بیٹھا کوئی دعا پڑھ رہا تھا... تلک والے اور شیروانی والے مسافروں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور وہ کچھ پڑھنے لگے۔ اوپر کی برتھ والا مسافر جواب ان دونوں کے بیچ میں بیٹھا تھا وہ بھی باہر کے نعروں کو سُن سُن کر کچھ فکر مند سا لگ رہا تھا۔ لیکن اس نے پھر دونوں مسافروں کو ڈھارس دی۔ "میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے جیتے جی تم لوگ باہر والوں سے محفوظ رہو گے۔ بس تم اپنی دعائیں پڑھتے رہو۔ باہر سے نعروں کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ پھر ان نعروں کا درمیانی وقفہ بڑھنے لگا۔ شاید دونوں طرف کے لوگ تھک چکے تھے یا اندھیرا کم ہو رہا تھا اور اب ایک دوسرے کے چہرے کچھ نظر آنے لگے تھے۔ برتھ والے مسافر نے اپنی گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے کہ اتنے میں ٹرین نے ایک لمبی سیٹی دی اور دونوں طرف مجمع میں ایک افراتفری مچ گئی۔ "ارے بھائی سگنل ہوگیا وہ ہری بتی دکھائی دے رہی ہے۔" پھر انجن لگاتار سیٹیاں دینے لگا لوگ اپنا اپنا سامان لے کر ٹرین میں کسی طرح داخل ہونے کے لیے دوڑ رہے تھے۔ نعرے سرد ہو چکے تھے۔ ان کے بیچ کی سرحد کا اب کہیں پتہ نہیں تھا۔ ہر شخص جلد سے جلد ٹرین میں بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ اور جب شاید آخری آدمی بھی ٹرین میں داخل ہو چکا تو ٹرین نے حرکت کی۔ ہر شخص بالکل خاموش تھا کسی کی زبان پر کوئی نعرہ نہیں تھا۔ شاید آگے آنے والی مصیبت کے لیے لوگ خود کو تیار کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنے سامنے والے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی جان اسی کے قبضے میں ہو۔ ٹرین نے یہ دو ڈیڑھ میل کا فاصلہ اتنی سست رفتاری کے ساتھ طے کیا کہ جیسے اُسے بھی فساد زدہ علاقے میں داخل ہونے میں ہچکچاہٹ ہو۔

اور پھر پلیٹ فارم آگیا۔ کوئی چھوٹا سا جنکشن تھا۔ لوگ دوڑ بھاگ رہے تھے کچھ پولیس کے لوگ بھی دکھائی پڑے لیکن فساد جیسے کوئی حالات نہیں تھے۔ برتھ والے مسافر نے ایک صاحب سے پوچھا "کیوں جناب ہماری ٹرین کو باہری سگنل پر کیوں روک ۔۔۔ لیا گیا تھا؟"

"ارے صاحب کیا بتلائیں۔ کوئی بتلانے والی بات ہو تو کہیں۔ کچھ نیتا لوگ لات سے ہی کسی مانگ کو لے کر پٹری پر دھرنا دیے بیٹھے تھے اب پولیس آکر سب کو لے گئی ہے۔ دونوں ہی طرف ساری ٹرینیں رکی ہوئی تھیں۔"

خسرو متین

رنگ زاروں میں گلابوں کو اگانا چاہوں
اپنی آنکھوں میں ترے خواب سجانا چاہوں

تو کہ خوشبو کا بدن، خواب کا نازک پیکر
اور میں ہوں کہ تجھے ہاتھ لگانا چاہوں

ایک ذرہ ہوں، مگر، چاند ستاروں کی طرح
روشنی بن کے ترے گھر کو سجانا چاہوں

دل میں ہر لمحہ ترے پیار کی خوشبو جاگے
اور تو سامنے آتے تو چھپانا چاہوں

صبح کے وقت ستاروں سے اُجالا مانگوں
شام کے وقت چراغوں کو بجھانا چاہوں

حقیر آستانی

حق سبھی کو ہے جینے کا یارو
جینا، وہ بھی قرینے کا یارو
خوں کی صورت نظر جو آیا تھا
رنگ نکلا پسینے کا یارو
ٹوٹنے پر بکھر گیا ہوگا
کیا ہوا آبگینے کا یارو
پی کے ہم اور بھی سنبھلتے ہیں
ڈھنگ آتا ہے پینے کا یارو
اب ہمیں کب خیال رہتا ہے
سال کا یا مہینے کا یارو
حال اپنا ہے اِن دِنوں جیسے
پتھروں میں نگینے کا یارو
جاں ہی لے لے حقیر کی شاید
یہ نیا داغ سینے کا یارو

شاہد انور

چوٹ کھانے کا سلیقہ دوستو! پیدا کرو
آئنوں کے شہر میں پتھر کو مت رسوا کرو

دیوتا بننے کی خواہش سب کو ہوتی ہے ضرور
پتھروں کو اس نظر سے بھی ذرا دیکھا کرو

یہ گھنے جنگل کسی کو راستہ دیتے نہیں
ان کے سائے میں خود اپنا راستہ پیدا کرو

صرف اپنے ہی غموں کا تذکرہ بے سود ہے
بے زبانوں کی زباں بن کر بھی تم بولا کرو

اب تو اے انور حقیقت بھی مسلسل خواب ہے
اس لیے تم خواب کی تعبیر مت سوچا کرو

۲۴۹، کلیان واس، دہلی ۱۱۰۰۹۱
۲۰۷، گولڈ کراؤن، جے۔ پی۔ روڈ، اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۶۱
پوسٹ بکس ۱۱۷۸۹، جدہ ۲۱۴۶۳ (سعودی عربیہ)

صہبا وحید

مزارِ التتمش

چند نئے تاریخی حقائق

مسجد قوت الاسلام کے شمال مغربی زاویے پر مربع شکل کا ایک مقبرہ ہے جسے عام طور پر التتمش کی آخری آرام گاہ سمجھا جاتا ہے۔ مقبرے کا ہر ضلع ۴۲ فٹ ہے؛ شمالی جنوبی اور مشرقی دیوار میں ایک ایک محرابی در ہے؛ چوتھی دیوار جو مغربی رُخ پر ہے، باہر سے بند ہے لیکن اندر کی طرف تین محرابیں بنی ہوئی ہیں؛ ان محرابوں کے اطراف آیاتِ قرآنی اور حاشیے ہیں؛ وسطی محراب پر سنگِ سُرخ کے پس منظر میں سنگِ مرمر کے نقش و نگار ہیں جو کافی دلآویز ہیں۔ وسطی محراب کے اغل بغل میں واقع دونوں محرابیں، سنگِ سُرخ سے بنائی گئی ہیں۔ وسطی محراب — بنگڑی دار (Lobed Arch) ہے۔ ہندی — اسلامی فنِ تعمیر میں بنگڑی دار محراب کی یہ اوّلین مثال ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ بیرونِ ہند کی عمارتوں سے ماخوذ ہو کیوں کہ اس طرح کی محراب، بغداد سے تقریباً ۷۵ میل جنوب مغرب میں واقع، قصرِ اُخیضر (سنِ تعمیر ۷۷۴ء یا ۷۷۵ء) کے علاوہ، عرب اور ایران کی بیشتر تعمیرات میں مروّج تھی؛ لہٰذا اِسے ہندو ماخذ سے مستعار سمجھنا دُرست نہ ہوگا۔[1] اِسی طرح کی بنگڑی دار محراب، تقریباً دو سو سال بعد، جامع مسجد احمد آباد میں اور کوئی ۲۶۵ سال بعد بنگال کے شہر گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد میں نظر آتی ہے۔ بہر حال محراب بنگڑی دار ہو یا ہلالی وضع کی (Cusped Arch) اُسے متعارف کرانے کا سہرا، التتمش ہی کے سر بندھتا ہے۔

شمالی، جنوبی اور مشرقی دیوار میں محرابی کمانیں، البتّہ نکیلی اور زیریں جانب ہموار ہیں۔ مقبرے کا اندرونی حصّہ ۳۰ فٹ فی ضلع کے دالان پر مشتمل ہے اور اس کے بیچوں بیچ قبر کا صندوق ہے جو سنگِ مرمر کا ہے۔ اصل قبر، مقبرے کے نیچے تہ خانے میں ہے جس میں جانے کے لیے شمالی رُخ پر ایک زینہ ہے لیکن یہ زینہ، عام طور پر بند ہی رہتا ہے۔

دیواروں کی سطح پر آرائش، بیش از بیش اسلامی ہے اور قرآنی آیات کے علاوہ ہندسی نمونوں پر مشتمل ہے۔ ہندو طرزِ آرائش کی آمیزش نسبتاً کم ہے لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ نظر انداز کی جا سکے؛ مرغولوں کے نیچے دھاریاں، دیواروں کے بالائی حصّوں میں کنگنیاں اور بالائی جانب مثمّن گوشوں پر توڑے ہندو طرزِ آرائش کی غمّازی کرتے ہیں۔ وسطی محراب یا قبلہ نما، الینوں پر ایستادہ ہے جس سے اُس کے حُسن میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ مقبرے کی اسی لطیف حُسن کاری کی وجہ سے فرگسن کو کہنا پڑا کہ یہ مقبرہ "ہندو آرٹ کا شاندار نمونہ ہے جسے مسلم مقاصد کے لیے بروئے کار لایا گیا"۔[2]

لیکن مزارِ التتمش کی اہم ترین خصوصیت فنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے، اُس کی چھت کی بناوٹ ہے جو منہدم ہو چکی ہے تاہم اِس وقت جو آثار موجود ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چھت پست اور مخروطی رہی ہوگی۔ یہ چھت پکھوائی ڈاٹوں پر اُٹھائی گئی تھی لیکن مقامی کاریگر، چونکہ ڈاٹ تعمیر کرنے کے اسلامی طریقے سے واقف نہ تھے لہٰذا انھوں نے دیواروں کے زاویوں پر سب سے پہلے پتھر کی ایک تکونی سل (توڑا) رکھی؛ پھر اس کے اغل بغل میں دیواروں پر دو سلیں اور رکھی گئیں جس سے ایک "نیم حلقہ" وجود میں آ گیا۔ اس نیم حلقہ پر مزید سلیں رکھی گئیں جس سے دیواروں کے زاویوں پر جوف بن گیا؛ اس جوف کے اُوپر نکیلی محراب بنا دی گئی اور اس طرح مربع کمرہ، مثمّن میں تبدیل ہو گیا۔ اِس مثمّن کے ہر گوشے پر گُل مہرے بنائے گئے اور گُل مہروں کے اُوپر مزید ترچھی سلیں یعنی توڑے رکھے گئے؛ ان توڑوں کے اُوپر گنبد کی نچلی کنار تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ گوشوں پر پکھوائی ڈاٹ، تیر کش چنائی سے تعمیر کی گئی تھی۔ ڈاٹ تعمیر کرنے کا یہ اصول غیر سائنسی ہے لیکن مقامی طور پر دستیاب صلاحیتوں کے پیشِ نظر، اِسے مسئلے کا ایک مؤثر اور جمالیاتی حل قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔

مقبرے کا سنِ تعمیر

اس مقبرے کے بارے میں کئی امور ہنوز

سیکٹر ۱۲/۱۱۶۶، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۲۲-۱۱۰۰

تصفیہ طلب ہیں مثلاً مقبرے پر کوئی کتبہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض ماہرین اسے التتمش سے منسوب کرنے میں متامل ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ یہ مقبرہ کب تعمیر کیا گیا۔ سرسید کا خیال ہے کہ اسے التتمش کی بیٹی، سلطان رضیہ نے اپنے عہدِ حکومت (۶۳۴ھ - ۶۳۸ھ/۱۲۳۶ء - ۱۲۴۰ء) میں بنوایا تھا[۳] مگر سرسید نے اپنی رائے کے لیے کوئی سند پیش نہیں کی لہٰذا ہمیں ان کی تائید کرنے میں تامل ہے۔ دوسرے یہ کہ التتمش کے دونوں متصل جانشینوں ــ رکن الدین فیروز اور سلطان رضیہ کو حکمرانی کی اتنی کم مدت نصیب ہوئی کہ اُن کے عہد میں کسی بڑی اور اس پایے کی عمارت کا، جیسا کہ یہ مقبرہ ہے، تصور بھی نہیں کیا جاسکتا؛ پھر یہ کہ ان دونوں کا عہدِ حکومت، خلفشار اور انتشار سے عبارت رہا ہے اور ایسی خوب صورت عمارت، طوائف الملوکی کے زمانے میں تعمیر ہونا، ممکن نہیں ہے؛ لیکن اگر ہم اس مقبرے کے اسلوبِ تعمیر کا مطالعہ کریں تو اس کا سنِ تعمیر متعین کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے، مقبرے کے محرابی دروں کی ڈاٹیں، زیریں جانب ہموار ہیں جس سے اُن کی وضع متساوی الاضلاع ہوگئی ہے۔ ڈاٹوں کی یہ وضع، پہلی بار اجمیر کی مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کے مقصورے میں اور پھر مسجد قوت الاسلام، دہلی کے مقصورے کی توسیع شدہ کمانوں میں نظر آتی ہے۔ تعمیریات (Archite-ctonic-) کے نقطۂ نگاہ سے ایک اور نکتہ، جو ہماری رہنمائی کرسکتا ہے، اس مقبرے کی وسطی محراب یا قبلہ نما سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وسطی محراب میں بنگڑیاں بنی ہوئی ہیں؛ بنگڑی دار یا کثیر البرگی کمانیں، خواہ وہ ہلالی وضع ہی کی کیوں نہ ہوں، سب سے پہلے اجمیر کے مقصورے میں بنائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ، مقبرے کی آرائش بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس مقبرے میں جیسا کہ کہا جاچکا ہے، آرائش، بیش از بیش اسلامی ہے۔ حسن کاری کا یہ تصور، التتمش کے زمانے ہی میں پروان چڑھا تھا۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ مقبرہ اُسی زمانے میں تعمیر کیا گیا جب اجمیر میں مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کا مقصورہ بنایا جارہا تھا۔ ان دلائل کے پیشِ نظر، اس مقبرے کا سنِ تعمیر ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء تجویز کیا جاسکتا ہے۔

کیا مقبرے پر گنبد موجود تھا؟ یہ سوال بظاہر غیر اہم معلوم ہوتا ہے لیکن پچھلے سو برسوں میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اس سوال پر جو بحث مباحثہ کیا ہے، اُس کے پیشِ نظر، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس معاملے کے بارے میں بھی کوئی قولِ فیصل تلاش کریں۔ یہ معاملہ، فرگسن نے چھیڑا تھا؛ فرگسن کا کہنا ہے کہ گنبد کی تعمیر "اگر واقعی شروع کی گئی تھی تو اسے کبھی بھی مکمل نہیں کیا گیا[۴]" لیکن دیگر ماہرین نے فرگسن کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ مقبرے پر گنبد موجود تھا۔ جنرل کننگھم، کار اسٹیفن، جے۔ اے۔ پیج (Page) اور پرسی براؤن۔ سبھی نے یہی رائے دی کہ اس مقبرے پر گنبد تھا جو بہت زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے اپنا بوجھ سنبھال نہ سکا اور گر پڑا۔

اس وقت اس مقبرے کی جو حالت ہے، اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ مقبرے پر کوئی گنبد بھی تھا لیکن پچھوائی ڈاٹوں اور گل مہروں کی موجودگی سے ثابت ہوتا ہے کہ گنبد، واقعی تھا جو بعد کے کسی زمانے میں گر پڑا اور انہدام کی وجہ یہی تھی کہ اسے غلط طریقے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ گنبد کے انہدام کے بارے میں عجیب و غریب کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یہ مقبرہ بن کر تیار ہوچکا تو التتمش نے اپنی بیٹی رضیہ کو جس نے اس کہانی کے مطابق یہ مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ اُسی رات خواب میں ہدایت دی کہ چونکہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر گنبد نہیں ہے اور اس مقبرے پر گنبد کی تعمیر، ترکِ ادب ہے؛ لہٰذا، مقبرے کا گنبد گروا دیا جائے۔ اُس کے لیے صرف گنبدِ نیلی ہی کافی ہے۔ چنانچہ صبح کو مقبرے کا گنبد منہدم کردیا گیا اور مقبرہ، اب تک بغیر گنبد کے ویسا ہی ہے[۵]۔

راقم الحروف نے اس کہانی کے بارے میں تاریخی ثبوت تلاش کرنے کی کافی کوشش کی لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ صاف ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے ساتھ التتمش کی عقیدت کے پیشِ نظر، یہ کہانی گھڑی گئی جسے مہرولی کے جاہل گائیڈ لوگوں کو سناتے رہتے ہیں۔ انہدام کی وجہ وہی تھی جو ہم بیان کرچکے ہیں، یعنی پچھوائی ڈاٹیں غلط طریقے سے بنائی گئیں اور گنبد کا گھیر زیادہ رکھا گیا جس سے گنبد گر پڑا۔

کیا یہ مقبرہ واقعی التتمش کا مقبرہ ہے؟

جیسا کہ کہا جاچکا ہے، مقبرے پر صاحبِ قبر کے نام کا کوئی کتبہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ آیا اسے التتمش سے منسوب کرنا مناسب ہوگا اگرچہ کہ پچھلے ایک سو سال سے اسے التتمش ہی کی آخری آرام گاہ قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ انتساب بھی سُنی سُنائی باتوں پر مبنی ہے، کسی تاریخی ثبوت پر نہیں۔ معاصر تاریخ میں صرف ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس میں مقبرۂ التتمش کا ذکر کیا گیا ہے؛ صاحبِ طبقاتِ ناصری نے لکھا ہے کہ ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں جب ملک عز الدین کشلو خاں نے، جو بلبنِ بزرگ کے نام سے

عام رائے کے مطابق، یہ مقبرہ سلطان شمس الدین التتمش کا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ مقبرہ، التتمش کے بڑے بڑے بیٹے اور ولیعہدِ سلطنت، شہزادہ ناصرالدین محمود کا ہے۔ قبلہ رو دیوار میں محراب کی بناوٹ کے علاوہ گوشوں میں گنبد کی نشست کا طریقہ بھی دیکھیے۔

مشہور تھا، دولت خانے پر قبضہ کر کے شہر میں اپنی بادشاہت کا اعلان کروادیا تو دوسرے ترک اُمرا کو اُس کی یہ حرکت پسند نہ آئی اور وہ سب سلطان شمس الدین کے روضے پر جمع ہوئے اور منادی کرنے والے کو مزید اعلان کرنے سے روک دیا۔ اِن ترک اُمرانے اتفاقِ رائے سے سلطان التتمش کے بیٹوں اور شہزادوں کو قیدخانے سے باہر نکالا اور رُکن الدین فیروز کے بیٹے، علاء الدین مسعود کو تخت نشیں کر دیا۔ کشلو خاں کو جب ترک سرداروں کے اِس فیصلے کا علم (اور اپنی کمزوری کا احساس) ہوا تو اُس نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔[۹]

اِس واقعے میں مقبرہ التتمش کے محلِ وقوع کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن بعض نکات ایسے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روضۂ التتمش، جہاں ترک امرا جمع ہوتے تھے، موجودہ مقبرہ نہیں ہوسکتا؛ مثلاً ایک نکتہ یہ ہے کہ شہر اور دولت خانے پر، جو التتمش کا محل تھا، عزّ الدین بلبن کا قبضہ تھا؛ لہٰذا ترک سردار اگر شہر کے اندر کسی مقام پر اکٹھا ہوتے تو حراست میں لیے جاسکتے تھے؛ لہٰذا وہ کسی ایسے مقام پر جمع ہوئے ہوں گے جو عزّ الدین بلبن کی دسترس سے باہر تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان ترک اُمرا نے

خاندانِ شاہی کے شہزادوں کو قید خانے سے باہر نکالا اور علاء الدین مسعود کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

سوال یہ ہے کہ یہ قید خانہ کہاں تھا؟ یہ قید خانہ یقیناً ایسی جگہ رہا ہوگا جہاں ترک امرا کشلوخاں کی دست اندازی سے بچ کر بآسانی پہنچ سکتے تھے۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ یہ قید خانہ بھی کشلوخاں کے حیطۂ اختیار سے باہر تھا۔ منہاج السراج نے قید خانے کے محلِ وقوع کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ "وملوک و اُمرا باتفاق ہر سہ پادشاہزادہ، سلطان ناصر الدین و ملکِ جلال الدین و سلطان علاء الدین را از حبس بیروں آوردند و از قصرِ سپید بہ قصرِ فیروزی در دولت خانہ بردند و برسلطنتِ علاء الدین اتفاق کردند۔"(۷)

منہاج کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادے، قصرِ سپید میں قید رکھے گئے تھے۔ یہ قصرِ سپید وہی تھا جہاں قطب الدین ایبک کے رو برو محمد بختیار خلجی نے ایک فیلِ مست سے مقابلہ کیا تھا۔ قصرِ سپید ایبک کی تعمیر تھا اور قصرِ فیروزی، جو دولت خانہ کہلاتا تھا، التتمش نے تعمیر کرایا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یہ رائے کہ دولت خانہ، دو محلات۔ قصرِ سپید اور قصرِ فیروز پر مشتمل تھا۔(۸) مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں قصر، ایک دوسرے سے کافی دُور تھے ورنہ یہ سازش اِتنی آسانی سے کامیاب نہ ہوتی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ایبک کا قصرِ سپید کہاں تھا لیکن قصرِ فیروزی کے بارے میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محل، مسجد قوت الاسلام کے قریب تھا۔ اِس ذیل میں ابنِ بطوطہ نے بڑی بیش قیمت معلومات فراہم کی ہے۔ ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ رضیہ اپنے سگے بھائی معز الدین (بقول منہاج، قطب الدین) کے ناروا قتل اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینے اور لوگوں کو سلطانِ وقت، رُکن الدین فیروز کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لیے مظلوموں کا سُرخ لباس پہن کر دولت خانے کی چھت پر جا کھڑی ہوئی جو جامع الاعظم (مسجد قوت الاسلام) کے قریب تھا(۹)...

اِن نکات کے پیشِ نظر، صورتِ حال کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ترک اُمرا، شہر سے باہر روضۂ التتمش پر جمع ہوتے؛ اتفاق رائے سے شہزادوں کو قصرِ سپید کے قید خانے سے باہر نکالا اور علاء الدین مسعود کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد، دولت خانے جاکر عزّ الدین بلبن کشلوخاں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ یا تو اُن کے فیصلے کو قبول کرے یا نتائج کے لیے تیار رہے۔

مقبرۂ التتمش کے بارے میں فیروز تغلق کے بیان سے بھی کچھ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ فیروز تغلق نے "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں لکھا ہے کہ "وہمچنیں مدرسۂ سلطان شمس الدنیا والدین ایلتتمش رضی اللہ عنہ را محلہاے کہ انہدام پذیرفتہ بود، عمارت کردہ، درہا از چوبِ صندل نہادیم وستونہاے مقبرہ کہ افتادہ بود، باز بہتر ازاں کہ بود، راست کردیم؛ وصحنِ مقبرہ را وقتِ بنا گچ نہ کردہ بودند آں را گچ کردہ شد و در گنبد نردبان از سنگ تراشیدہ زیادہ کردہ شد؛ و در چہار بُرج پشتبانِ ریختہ برآوردہ شد۔"(۱۰) یعنی اور اسی طرح سلطان شمس الدنیا والدین ایلتتمشؒ کے مدرسے کی عمارتیں (محلہاے) جو منہدم ہوگئی تھیں، تعمیر کراکے (اُن میں) صندل کی لکڑی کے دروازے لگواتے اور مقبرے کے ستون، جو گر گئے تھے، دوبارہ پہلے سے بہتر بنوا دیے اور مقبرے کے صحن کو اُس کی بنیاد کے وقت گچ نہیں کیا گیا تھا، گچ سے پختہ بنوایا اور گنبد میں تراشے ہوئے پتھروں کے زینے کا اضافہ کیا گیا اور چاروں بُرجوں میں ریختہ کی پشتیاں بنوا دیں۔"

فیروز تغلق کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقبرے کے سابقہ ستونوں کی جگہ نئے اور بہتر ستون لگائے گئے۔ مقبرے کے صحن کو گچ سے پختہ کیا گیا اور گنبد میں رسائی کے لیے ایک زینہ بھی تعمیر کیا گیا۔ بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اصل مقبرے میں بُرج بھی تھے جن کے استحکام کے لیے فیروز تغلق نے پشتیاں تعمیر کرا دی تھیں۔ اِس بیان سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اگر مقبرے میں بُرج تھے تو فصیل یا چار دیواری کی طرح کا کوئی احاطہ بھی رہا ہوگا مگر اِس وقت اِس مقبرے میں، جسے التتمش سے منسوب کر دیا گیا ہے، نہ تو کوئی چار دیواری ہے اور نہ کوئی برج، نہ زینہ ہے اور نہ گچ کردہ فرش، اور اگر ہم کسی بُرج دار چار دیواری کا وجود تسلیم بھی کرلیں تب بھی اِس مقبرے کے موجودہ محل وقوع سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں اِس طرح کی کوئی تعمیر رہی ہوگی اس لیے کہ یہ مقبرہ مسجد قوت الاسلام کے اِس قدر قریب واقع ہوا ہے کہ احاطہ کی تعمیر کے لیے گنجائش ممکن ہی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ فیروز تغلق نے جس مقبرے کو التتمش کا مقبرہ سمجھ کر اُس کی مرمت کرائی تھی، وہ یہ مقبرہ نہیں بلکہ کوئی اور مقبرہ تھا۔

"فتوحاتِ فیروز شاہی" میں یہ بھی مذکور ہے کہ فیروز تغلق نے التتمش کے مدرسے کی مرمت بھی کرائی تھی اور اُس میں صندل کے تخت لگوائے تھے(۱۱)۔ اِس ذیل میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مسجد اور مدرسہ، بالعموم مقبرے کے تعمیری لوازمات میں شمار کیے جاتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی مسجد کی بجائے محض ایک محراب ہی بنادی جاتی تھی۔ اِس رواج کے پیشِ نظر، بعض ماہرین نے نواحِ قطب میں

مدرسۂ علائی کو التتمش کا مدرسہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور اس طرح مقبرے (یعنی مبینہ مقبرۂ التتمش) مسجد (قوت الاسلام) اور مدرسے (یعنی مدرسۂ علائی) کے مثلث کو مکمل کرنا چاہا ہے مگر فیصلہ بہرصورت علاء الدین خلجی کے حق ہی میں ہوگا اس لیے کہ التتمش کے زمانے میں پست اور مخروطی شکل کے گنبد اور ہندو طرز کی توڑے دار ڈاٹیں تعمیر کی جاتی تھیں جب کہ علاء الدین خلجی کے عہد میں گنبد نیم کروی ہوتا تھا اور اس کی نشست پچھوائی ڈاٹوں پر رکھی جاتی تھی جنھیں شعاعی وضع یعنی نیم دائرے میں ترچھے غالبوں (Radiating Vouss-eaux) کے ساتھ ترتیب دیا جاتا تھا۔[۱۲] اسی ضمن میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ مقبرے کے ساتھ مسجد اور مدرسے کی تعمیر، ہندوستان میں پہلی بار علاء الدین خلجی کے دور ہی میں شروع ہوئی۔ ان تین اکائیوں پر مشتمل اس یکجائی کو مقبول بنانے میں سلاجقہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور علاء الدین خلجی کے زمانے میں جہاں سلاجقہ کے طرز تعمیر سے براہ راست اکتساب کیا گیا، وہیں یہ یکجائی بھی قبول کرلی گئی۔ یہ رائے جزوی طور پر تو صحیح ہو سکتی ہے، کلّی طور پر نہیں، اس لیے کہ فیروز تغلق کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ التتمش کے مقبرے کے ساتھ مدرسہ بھی تھا اور جب یہ دونوں تھے تو مسجد بھی ضرور رہی ہوگی۔

اس مفصّل جائزے سے یہ بات ضرور واضح ہو جائے گی کہ مسجد قوت الاسلام کے شمالی مغربی زاویے پر واقع مقبرے کو التتمش کا مقبرہ قرار دینے کے لیے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے، البتہ اس کی تردید کے لیے کچھ ثبوت ضرور موجود ہے۔ مثلاً بابر نامے میں مذکور ہے کہ بابر نے رجب ۹۳۲ھ (اپریل ۱۵۲۵ء) میں اس علاقے کی معروف یادگاریں دیکھی تھیں جن کا اس نے خصوصی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"سہ شنبہ کونی شیخ نظام اولیا منیک مزارینی طواف قلیب دلی نوغر تیسے جون لقاسیدا نو شلدی او شبو، چہار شنبہ اختتامی اوق دہلی فور غانی برقلیب کیچہ سپی انداوبوں نانکلاسی، پنج شنبہ کونی خواجہ قطب الدین منیک مزارینی طواف قلیب، سلطان غیاث الدین بلبن و سلطان علاء الدین خلجی منیک مقبرہ و عمارت لاری و میناریسی حوض شمسی و حوض خاص نی و سلطان بہلول و سلطان اسکندر مقابرے و باغایتنی سیر قلیب، کیلب او رود غہ تو شوب کیمہ کیرب عرق ایچسلدی۔"[۱۳]

یعنی "منگل کے روز ہم نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مزار کا طواف کیا اور دہلی کے قریب دریائے جون (جمنا) کے کنارے قیام کیا، بدھ کے روز ہم قلعۂ دہلی میں داخل ہوئے اور وہیں رات بسر کی، جمعرات کے روز ہم نے حضرت خواجہ قطب کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی اور سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاء الدین خلجی کے مقابر اور محلّات (عمارت لاری)، اس کا مینار (مینارینی) اور حوض شمسی، حوض خاص اور سلطان بہلول لودی اور سکندر لودی کے مقابر اور باغات دیکھے۔ اس کے بعد ہم (دریائے جمنا کے کنارے) اپنے پڑاؤ پر واپس آئے اور ایک کشتی میں سوار ہوئے جہاں ہم نے عرق نوش کیا۔"

بابر کے اس بیان کا معنی خیز پہلو یہ ہے کہ اس نے بلبن، علاء الدین خلجی، بہلول لودی اور سکندر لودی کے مقابر اور باغات حتیٰ کہ حوض شمسی اور حوض خاص کا تو ذکر کیا مگر اسی علاقے کی ایک اہم عمارت یعنی موجودہ مقبرۂ التتمش کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اسے کسی یادگار کے بارے میں مغالطہ تو ہوسکتا تھا جی
قطب مینار اور مینار علائی کے بارے میں
ہو گیا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ اسے مقبرۂ التتم
کے بارے میں بھی کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ با
اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ
مقبرہ، جسے التتمش سے منسوب کر دیا گیا ہے
کے زمانے میں بھی گمنام تھا اور کوئی نہیں جانت
کہ یہاں کون ابدی نیند سو رہا ہے۔ لہٰذا ا
التتمش سے منسوب کرنا، مناسب نہیں ہوگا۔ مق
کے اسلوب تعمیر کی روشنی میں، البتہ اتنا اضاف
کیا جاسکتا ہے کہ یہ عمارت التتمش ہی کی بن
ہوئی ہے اور یہ کہ یہ مقبرہ، کسی ایسے شخص
آخری آرام گاہ ہے جو التتمش کو عزیز تھ
عجب کہ یہ مقبرہ، اس کے عزیز ترین بیٹے اور
سلطنت شہزادہ ناصر الدین محمود کا ہو۔[۱۴] یہ
ممکن ہے کہ التتمش نے یہ مقبرہ، خود اپنے
بنوایا ہو بلکہ زیادہ امکان یہی ہے کہ اس
یہ مقبرہ اپنے لیے بنوایا تھا مگر قضا و قدر
کوئی مفر نہیں، عزیز ترین بیٹا داغ مفار
دے گیا اور التتمش کو اپنی جگہ، بیٹے کو دی

لیکن ہمارا اصل سوال ہنوز باقی۔
یعنی سلطان شمس الدنیا والدین ایلتتمش
آخری آرام گاہ کہاں ہے۔ انشا اللہ، اس راز
کسی اگلی نشست میں سلجھائی جائے گی۔

حواشی

(۱) دیکھیے ضیاء الدین ڈیسائی کی تصنیف،
اسلامک آرکی ٹیکچر (پبلیکیشنز ڈویژن، حکومت
۱۹۷۰ء) ص ۵۔ ڈاکٹر ڈیسائی نے مقبرۂ التتم
کی اس محراب کو Cusped Arch
تعبیر کیا ہے اور اسے ہندو طرز تعمیر سے ما

قرار دیا ہے۔ یہی بات پرسی براؤن نے بھی چھوٹا سونا مسجد کے بارے میں کہی ہے (دیکھیے انڈین آرکیٹکچر اسلامی دور' ص ۴۰)۔ سچی بات یہ ہے کہ بیشتر مصنفین نے اصطلاحات کے معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ ہم نے Lethaby کی پیروی کی ہے جو فنِ تعمیر کے باب میں اس صدی کا اہم ترین اور مستند ماہر ہے۔ "بنگڑی دار محراب اور ہلالی محراب میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں قوسیں مکمل ہوتی ہیں جب کہ مؤخر الذکر میں مقامِ جست پر صرف نیم قوس بنائی جاتی ہے۔" (دیکھیے 'لتھابی' Architecune an Introduction to the History and the Theory of the Art of Building. آکسفورڈ' ۱۹۵۵ء' ص ۱۱۰-۱۱۱)۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں (حصّہ ۱' ص ۵۰' انجمن ترقی اُردو' ۱۹۳۹ء) میں معمولی گولائی دار قوس کو 'بدرومی' اور مکمل گولائی والی قوس کو بنگڑی دار کہا گیا ہے۔ ہم نے بدرومی (یا بدر۔ رومی) کی جگہ ہلال نما کو ترجیح دی ہے۔

(۲) "ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکیٹکچر" جلد ۲' لندن ۱۹۱۰ء' ص ۲۰۹۔

(۳) آثار الصنادید (دہلی ۱۹۶۵ء) ص ۱۷۶۔

(۴) بحوالہ کار اسٹیفن' The Archaeology and Monumental Remains of Delhi (مکرر اشاعت) دہلی ۱۹۶۷ء' ص ۴۷)۔ لیکن فرگسن کی تصنیف اے ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکیٹیکچر (ج ۲' لندن ۱۹۱۰ء) کے صفحہ ۲۰۹ پر یہ تحریر ملتی ہے کہ چھت نہ ہونے کی وجہ سے جو عرصہ ہوا' نابود ہو چکی ہے' اس وقت تاثر مجروح نظر آتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ جملہ فرگسن کی تصنیف میں اُس کے مؤلفین کی تحریف ہے۔

(۵) اس کہانی کے لیے دیکھیے' مرزا محمد اختر دہلوی کی تصنیف 'تذکرۂ اولیائے ہند و پاکستان (دہلی ۱۹۵۴ء)' ص ۴۳۔

(۶) منہاج السراج' طبقاتِ ناصری (کلکتہ ۱۸۶۴ء)' ص ۲۴۹۔

(۷) ایضاً (کلکتہ ۱۸۶۴ء)' ص ۱۹۷۔ (نسخۂ کابل' جلد ۱' ۱۹۶۳ء)' ص ۴۶۸۔ ایلٹ اور ڈوسن' جلد ۲' ص ۳۴۲۔

(۸) "A Comprehensive History of India" Vol. V, The Delhi Sultanat (دہلی ۱۹۷۰ء)' ص ۲۵۰۔

(۹) رحلۃ 'الجزالثانی (قاہرہ ۱۹۳۳ء)' ص ۲۲۔ اصل عبارت یوں ہے: "فصعدت رضیۃ علی سطح القصر القدیم المجاور للجامع الاعظم وهو یسمی (دولت خانہ) ولبست علیہا ثیاب المظلومین"۔

(۱۰) فتوحاتِ فیروز شاہی (بہ تصحیح پروفیسر رشید مخدومی' علی گڑھ)' ص ۱۴۔ اس نسخے میں "گچ کردہ" لکھا ہوا ہے جو قرینِ قیاس ہے لیکن پروفیسر ڈوسن نے (ایلٹ و ڈوسن' جلد ۳' ص ۳۸۳) "گچ" کی بجائے "کج" پڑھا' جس سے جملے کے معنی ہی بدل گئے۔ اُن کا ترجمہ ہے: "When the tomb was built, its Count had not been made Curved, but now I made it so." اس غلط ترجمے سے جو صورت پیدا ہو سکتی ہے' اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو کے۔ وی۔ سندرراجن کی تصنیف Islam Builds in India (دہلی ۱۹۸۳ء) کا صفحہ ۸۷ دیکھیے جہاں سندرراجن نے اِس جملے سے یہ تعبیر اخذ کیا ہے کہ فیروز تغلق نے مربع کو مثمن میں تبدیل کر دیا۔ اس کتاب میں تاریخی اعتبار سے کئی غلطیاں بھی ہیں' مثلاً التتمش کے بیٹے کا نام فتح خاں دیا ہوا ہے جو دراصل فیروز تغلق کے بیٹے کا نام تھا۔ فنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کتاب غیر معیاری ہے۔

(۱۱) شمس سراج عفیف کا کہنا ہے: "بلکہ در حظائر سلاطین و مشائخ دین تختہائے چوب صندلیں در گنبد ایشاں داشتہ ہر یک مقبورا از سر آراستہ۔" (تاریخ فیروز شاہی بہ تصحیح مولوی ولایت حسن' کلکتہ ۱۸۹۰ء) ص ۳۳۳۔

(۱۲) "غالب" محراب کے دہن میں؟ چکر کی شکل کے جو پتھر لگاتے جاتے ہیں' انھیں غالب کہا جاتا ہے جو دراصل "قالب" کا بگاڑ ہے یعنی محراب کا سنگین قالب جس پر محراب کا لداؤ رہے (دیکھیے فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں' حصّہ اوّل' ص ۷)۔ غالب کو انگریزی میں Voussoin کہا جاتا ہے۔ فرہنگِ اصطلاحات (انجمن ترقی اُردو' پاکستان) کے مرتبین نے اس انگریزی لفظ کا مترادف "ڈاٹیہ" تجویز کیا ہے جو ایک گھڑا ہوا لفظ ہے اور پیشۂ معماری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا راقم الحروف نے اُسی لفظ کو ترجیح دی جو ہمارے معمار استعمال کرتے رہے ہیں۔ (ص۔و)

(۱۳) بابر نامہ' بزبانِ جغتائی ترکی (سالار جنگ میوزیم' حیدرآباد' دکن۔ روٹو گراف ایڈیشن' اینٹ ایس۔ بیورج' گب میموریل سیریز' لندن' ۱۹۰۵ء) جلد ۱' ورق ۲۴۷ ب تا ورق ۲۴۸۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو قطب مینار اور مینار علائی میں کچھ مغالطہ

ہوا تھا کیوں کہ اس نے قطب مینار کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

(۱۴) ٹوکیو یونیورسٹی کے کوئی پروفیسر آرا ہیں جنھوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے مگر میں نہیں جانتا کہ انھوں نے کن دلائل کی بنیاد پر یہ بات ثابت کی۔ اُن کی تصنیف جاپانی زبان میں ہے اور میں اس زبان سے واقف نہیں ہوں (ص-۹)

(۱۵) سلطنتِ دہلی کے اِس المناک پہلو پر شاید ہی کسی نے توجّہ دی ہو کہ ولیعہد سلطنت کو تخت نشین ہونا بہت کم نصیب ہوا۔ کم از کم تین خانوادے ایسے ضرور گذرے ہیں جن کا ولیعہد تخت نشینی سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ التتمش کا بڑا بیٹا شہز[ادہ] ناصرالدین محمود، بلبن کا بڑا بیٹا محمد قاآ[نی] اور فیروز تغلق کا بڑا بیٹا فتح خاں اِس [...] تقدیر کا شکار ہوتے۔ مُغلوں کے دَور میں [...] دارا شکوہ کے لیے بھی نوشتۂ تقدیر یہی ر[ہا] (ص-۰)۔

بقیہ

فیض کا تنقیدی رویّہ

کافی ہوگا:

"فنی تخلیق کے عمل میں مشاہدہ اور تجربہ گوشت پوست اور استخواں کے مترادف ہے جذبہ اس تخلیق میں لہو کی گرمی پیدا کرتا ہے اور فکر، دماغ کی دَروشنی، صناعت اور قدرتِ اظہار سے اس تخلیق کا ناک نقشہ اور نوک پلک سنواری جاتی ہے۔ اور تخیل وہ پُراسرار شے ہے جس سے اس تنِ مردہ میں جان پڑتی ہے۔ اسے آپ دمِ عیسیٰ تصور کیجیے یا حرفِ کُن فیکون۔"

فیض کے تنقیدی رویّے میں جو غیر جانبداری، گہرائی اور وسعت ہے۔ جو توازن اور استدلال ہے۔ وہ ان کی شاعری کا بھی حصہ ہے اور شخصیت کا بھی۔ دراصل وہ بڑے صابر اور کم گو انسان تھے۔ جو بات کہتے کافی غور و فکر کے بعد۔ اسی لیے اس میں وزن بھی ہوتا اور وقار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی توازن کا احساس برابر قائم رہتا ہے اور خود مجموعے کا نام "میزان" اپنی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

O

ایس۔ ایم۔ عبّاس

دوسرا راستہ

"جب تک دنیا کے سبھی ملک جنگ کا راستہ نہیں چھوڑ دیں گے، جب تک تمام قوموں اور نسلوں کے بیچ آزادی و مساوات کی فضا عام نہیں ہوگی اور جب تک ہر آدمی کو عزت کے ساتھ جینے کا حق نہیں ملے گا اس وقت تک اس زمین پر امن قائم نہیں ہو سکتا ہے۔"

یہ اسی کی بات ہے۔ میری نہیں۔

وہ کوئی دیوتا نہیں تھا۔ کوئی یوگی اور سنیاسی بھی نہ تھا۔ لیکن وہ ستیہ اور اہنسا، امن اور سلامتی کا پیامبر ضرور تھا۔

ادھ ننگا بدن، ہاتھ میں سونٹی، چہرے پر ہلکے فریم کا عینک، عینک کے اندر، نئے دور اور نئی زندگی کے خوابوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور پُرنور پیشانی ——— اس کی زندگی کی طرح، اس کی تصویر بھی سادگی اور پُرکاری کا مجسمہ ہے۔

جب بھی چوک سے گذرتا ہوں، اور سنگ مرمر کا وہ مجسمہ نظر آتا ہے تو جی چاہتا ہے۔ اس کے نیچے لکھ دوں ———

"جس طرح تاج محل، محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو ہے، جو وقت کے رخسار پر جم کر رہ گیا ہے، اسی طرح تیری زندگی بھی، وہ غریب۔ سادہ و رنگین، تصویر ہے جو زمانے کے ورق پر ابھر گئی ہے۔"

نہ تو اس نے کسی راج کی بنیاد رکھی۔ نہ کسی ملک پر حملہ کیا نہ ہتھیاروں کی کوئی جنگ لڑی۔

اس نے کوئی نیا دھرم بھی نہیں پھیلایا اُس نے بڑی صفائی سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"مجھے کوئی نیا فرقہ قائم کرنے کی قطعی خواہش نہیں ہے نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ ایک محدود فرقہ میری پیروی کرے۔ میں کوئی نئی حقیقت نہیں پیش کر رہا ہوں۔ میں سچائی کے اصولوں کی پیروی اور ان پر زندگی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں سچائی کا پرستار ہوں۔"

عجیب فقیرانہ زندگی کا مالک تھا وہ۔

وہ اسی دھرتی پر پیدا ہوا اور اسی کی خاک میں سو گیا۔

وہ نیکی اور سچائی کا پیکر تھا۔

اس نے نیکی اور سچائی کے راستوں پر چلنے کی سزا میں بہت سی سختیاں جھیلیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن اس نے سچائی کی راہ نہیں چھوڑی۔ اپنی حب الوطنی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

"میں اس حب الوطنی کو ٹھکرا سکتا ہوں جو دیگر قوموں کی پامالی اور تکلیف پر مبنی ہو۔ میری حب الوطنی کے تصور کی بنیاد تمام انسانیت کی فلاح ہے۔"

وہ زندگی بھر ملک کی آزادی کے لیے لڑتا رہا۔ لیکن اس نے اس لڑائی میں کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔ بڑے بڑے جبر و ظلم کا جواب اس نے صبر و تحمل سے دیا۔

اس کے ہتھیار صرف دو تھے۔ ستیہ اور اہنسا

انہیں ہتھیاروں سے اس نے آزادی کی لڑائی جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ ———

"ستیہ اور اہنسا کا پرچار کتابوں کی بہ نسبت ان پر باقاعدہ عمل کے ذریعے زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ سچائی کی بنیاد پر بسر کی جانے والی زندگی، کتابوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔"

وہ عمل پر یقین رکھتا تھا۔ نام و نمود اور نمائشی چیزوں سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کہا:

"میرے دوست، میری جو سب سے بڑی عزت کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ان اصولوں کو اپنا لیں جن کا میں نے پرچار کیا ہے۔"

"——— کسی شخص کی یاد میں مٹی یا دھات کا مجسمہ کھڑا کرنے کو میں صرف روپے کی بربادی تصور کرتا ہوں۔ کیونکہ میں ان نمائشی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

"یہ سطریں، ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہہ کی حیثیت رکھتی ہیں جو میرے اعزاز میں کوئی مجسمہ نصب کرنا چاہتے ہیں یا میری تصویر لگانا چاہتے ہیں۔ میں ان نمائشی باتوں کا دل سے مخالف ہوں۔"

اس کی موت کے بعد، اس کی باتیں بھول میں پڑتی چلی گئیں صرف صورت یاد رہ گئی۔

گاؤں، گاؤں، نگر نگر، اس کے نام پر جو چبوترے بنائے گئے اس کی مورتیاں استھاپت کی گئیں۔ گھروں میں دفتروں میں تصویریں لٹکائی گئیں۔

اور ایک روز کچھ لوگ، اس چوک میں بھی اس کا ایک مجسمہ لگا گئے تھے۔ اس مجسمے کو گاہے گاہے لوگ مالائیں ارپت کرتے ہیں۔ اکثر پندرہ اگست اور

مقام و ڈاک خانہ مانی کلاں، ضلع جونپور (یو۔پی)

چھبیس جنوری کو وہاں بڑی بڑی سبھائیں ہوتی ہیں۔ ان جلسوں میں لوگ بڑے جوش کے ساتھ اس کی قربانیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے پیغام پر چلنے کی بات کرتے ہیں۔

لیکن جیسے جلوس کے بعد دُور دُور تک کہیں اس کے خیال و عمل کا سایہ بھی نہیں دکھائی دیتا۔ بس وہ تنہا کڑی دھوپ میں جھلستا رہتا ہے۔ عجیب عجیب منظر اس کے سامنے سے گذرتے ہیں:

توڑ پھوڑ، دھرنا، تالا بندی کرنے والے مزدور ـــــ

زور زبردستی کرکے اپنی مانگیں منوانے والے کرمچاری۔

لوٹ مار کرنا، پتھر پھینکتا اسکولی لڑکوں کا جلوس، فرقہ وارانہ فساد پھیلانے والے بلوائی:

اُگروادی اور آتنک وادی۔

اور جب کوئی ایسا منظر وہ دیکھتا ہے، جیسے اس کی آنکھ نم ہو جاتی ہے اور تبھی جیسے وہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے۔

'راستہ ادھر ہے'

ستیہ اور اہنسا کا راستہ جسے لوگ بھول گئے ہیں۔

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوایئے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

ـــــ اِدارہ

کریم خاں ساز

گلی کے موڑ پہ اکثر دکھائی دیتا ہے
وہ آدمی مجھے پتھر دکھائی دیتا ہے

اٹھا کے کشتیاں کاغذ کی اپنے کاندھے پر
تھکا تھکا سا سمندر دکھائی دیتا ہے

نہ بچ سکے گا گلستاں کسی طرح اب کے
ہوا کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے

جلے جلے سے مکاں اور لہو لہو سے بدن
نگر نگر یہی منظر دکھائی دیتا ہے

کبھی وہ ساز میں ڈھلتا ہے راگنی کی طرح
کبھی وہ گیت کا پیکر دکھائی دیتا ہے

مچھلی پیٹھ، راؤپورہ، بڑودہ ۳۹۰۰۰۱

کس کے در پر لگاؤں صدا کون ہے
تو نہیں ہے تو میرا خدا کون ہے
مجھ کو پیہم یہ للکارتا کون ہے
میرے اندر یہ مجھ سے جدا کون ہے
کھٹکھٹاتا ہے زنجیر احساس کی
کون ہے یہ، ذرا دیکھنا کون ہے
سب ضرورت کے دھاگوں سے مربوط ہیں
بے غرض کون ہے، بے ریا کون ہے
ذہن ہے، دیکھنے والی آنکھیں بھی ہیں
سوچتا کون ہے، دیکھتا کون ہے
میری سچائی کے معترف ہیں سبھی
بات میری مگر مانتا کون ہے

محبوب راہی

بارسی ٹاکلی ۴۴۴۴۰۱، ضلع اکولا

عزیز پریہار

آج جو شخص ملا کیوں وہ لگا اُس جیسا
یہ بھی کیا دے گا محبت کا صلا اُس جیسا

دل نہ مانے کبھی، اس کو میں کہوں ہرجائی
کس نے آنگن مرا خوشبو سے بھرا اُس جیسا

کیوں نہ اب اور کہیں دور ہی ڈھونڈوں اُس کو
بھیڑ میں تو مجھے ہر شخص لگا اُس جیسا

چھو کے مجھ کو مری نس نس میں اُتر جاتا تھا
وہ تو خوشبو تھا کوئی پھر نہ ملا اُس جیسا

عمر بھر شعر کہو، شعر پڑھو، شعر سُنو
عشق میں کس نے کیا پیدا خلا اُس جیسا

ای۔جے۔۱۴۵۰، ہاؤسنگ بورڈ کالونی، فیروز پور روڈ، لدھیانہ

اسد رضا

غیر ممالک میں
نایاب ہندوستانی پینٹنگس

ہندوستان میں متعدد عظیم مصوّر پیدا ہوتے ہیں جن کے شاہکاروں کو نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی انتہائی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بہت سے ہندوستانی شاہکار غیر ممالک کے میوزیموں کی زینت ہیں۔

۱۶ ویں تا ۱۸ ویں صدیوں کی ہندوستانی پینٹنگس کا ایک ثروت مند مجموعہ سوویت سائنس اکادمی کے انسٹی ٹیوٹ برائے مشرقی مطالعات کی لینن گراد شاخ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ تقریباً ۵۰۰ پینٹنگس پر مشتمل ہے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق مصوری کے مغل اسکول سے ہے۔

ہندوستانی اور ایرانی پینٹنگس کا ایک البم بھی یہاں نمائش کے لیے رکھا گیا ہے جو ۱۸ ویں صدی کے وسط میں ایران میں تیّار کیا گیا تھا۔ ابھی یہ ثابت کیا جانا باقی ہے کہ اس البم کو روس میں کون لایا تھا۔ آخری روسی زار نکولس دوئم نے یہ البم روسی میوزیم کو ایک تحفے کے طور پر دیا تھا جہاں یہ ۱۹۲۱ء تک رکھا رہا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دیگر پینٹنگس کی طرح انھیں بھی نادر شاہ دُرّانی ۱۷۳۸ء میں ہندوستان سے باہر لے گیا تھا۔

اس البم میں وہ تصویریں بھی شامل ہیں جنھیں مُغل اسکول کے عظیم مصوّروں نے بنایا تھا۔ مشہور مصوّر ابوالحسن نادر الزماں کی اصلی تخلیقات آج نایاب ہیں لیکن اس البم میں اس عظیم مصوّر کے اپنے ہاتھوں کی بنائی سات تصویریں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پینٹنگ " جہاں گیر کی تاج پوشی کی تقاریب" کے بارے میں ہے اور اسے ۱۶۰۵ء میں تیّار کیا گیا تھا۔ یہ تصویر اعلیٰ ترین فنّی معیار کی حامل ہے اور اپنے رنگوں کی

مغل اسکول کی تصویر ——— بادشاہ جہاں گیر

E-11/47، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

مصوّر: ابوالحسن نادر الزماں ـــــ عنوان: جہانگیر، نورجہاں اور کنیزیں (۱۷ ویں صدی عیسوی)

انتہائی چمک دمک نیز جزئیات کی انتہائی دُرست تفصیل کے لحاظ سے قابلِ دید ہے۔

مشہور ہندوستانی مصوّر وشنوداس نے عبّاس شاہ کی دو تصویریں بنائی تھیں۔ مُغل دربار کے ایک مصوّر منوہر کی تیّار کردہ ایک تصویر میں جہاں گیر کو اپنے درباریوں کے ساتھ ایک باغ میں تخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پگڑیوں کی وضع اور پیڑ پودوں کے اندازِ پیشکش سے پتہ چلتا ہے کہ اس تصویر کا تعلق ۱۷ ویں صدی کے اوائل سے ہے۔

اس البم میں ۱۷ ویں صدی کے دیگر اعزاز یافتہ مصوّروں ننھ اور گوردھن کی پینٹنگس بھی موجود ہیں۔

شاہ جہاں کی تصویریں بھی دلچسپ ہیں۔ ایک تصویر "شاہ جہاں کی شہ سواری" کا تعلق ۱۷ ویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہے۔ بادشاہ کے شاہی لباس، ہتھیاروں اور گھوڑے کے سازوسامان کی شان وشوکت کے لحاظ سے یہ تصویر قابلِ ذکر ہے۔

کئی درجن تاریخی شخصیتوں کی گروپ تصویریں، درباری زندگی کے واقعات کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھیں نہایت نفاست اور باریکی سے بنایا گیا ہے۔ ایک پینٹنگ "جہاں گیر کا دربار" میں ۷۵ لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ماہرین نے ان کی پوشاکوں کے کالروں پر لکھے ان کے ناموں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں میں اعتماد الدّولہ اور مہابت خاں جیسی تاریخی ہستیاں شامل ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کا تجزیہ کرنے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ پینٹنگ اس دربار کی تصویر کشی کرتی ہے جو ۱۶۱۰ء تا ۱۶۱۴ء میں منعقد ہوا تھا۔

مُغلیہ دَور کے مشہور مصوّر منوہر کی تیّار کردہ کئی پینٹنگس برطانوی میوزیم میں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک تصویر میں جہاں گیر کو اپنے درباریوں کے ساتھ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ برطانوی میوزیم میں دیگر ہندوستانی مصوّروں کے شاہکار بھی رکھے ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ ہندوستانی پینٹنگس دُنیا کے دیگر ممالک ـــــ میں بھی موجود ہیں اور انھیں انتہائی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

O

محمد ظفر الدین

صِلہ

کــــــــــــــــــــــــــس دار

نوجوان : بلجیت

بڑھیا : بلجیت کی ماں

کھدّر پوش : ڈیوڈ ڈیسوزا کا آدمی

ڈیوڈ ڈیسوزا : وزیر

دو نیتا، دو سرمایہ دار، ایک پولیس کمشنر، ایک کرنل اور دو تین پولیس افسران

پہلا منظر

[کمرے کی چھت جس سے مکڑی کے جالے لٹک رہے ہیں، رسیوں سے بُنا ایک چھینکا چھت سے لٹک رہا ہے جس پر مٹّی کی کالی ہنڈیاں رکھی ہیں۔ چھت سے متصل دروازے کا بالائی حصہ بوسیدہ نظر آرہا ہے۔ کمرے میں تاریکی ہے، سکوت ہے۔ بیچ بیچ میں کراہنے کی ایک نہایت درد انگیز آواز اس سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ پھر سکوت اور پھر کراہنے کی آواز۔ یہ سلسلہ تھوڑے وقفے تک چلتا رہتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ پورے کمرے میں مدّھم روشنی پھیل جاتی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں جھنگی چارپائی پر ایک بڑھیا لیٹی ہے۔ ایک طرف ایک کے اوپر ایک کر کے چار خشک گھڑے رکھے ہوئے ہیں اور ان پر ٹین کا ایک ڈبّہ۔ ایک طرف الگنی پر کچھ پُرانے کپڑے لٹک رہے ہیں اور انھیں کپڑوں کے زیرِ سایہ ایک صحت مند، قوی ہیکل جوان بیٹھا ہوا ہے۔ دروازے سے ایک سن رسیدہ کھدّر پوش آدمی جس کے چہرے پر داڑھی اور آنکھوں پر کالا چشمہ ہے اندر داخل ہوتا ہے۔ بیٹھا ہوا نوجوان ہڑبڑا جاتا ہے اور بڑھیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھدّر پوش کو دیکھنے لگتی ہے۔]

نوجوان : جی! آپ... یہاں... کس سے ملنا ہے؟

کھدّر پوش : گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تمہارا نام بلجیت ہی ہے نا؟

نوجوان : جی— ہاں... نام تو میرا بلجیت ہی ہے مگر آ... پ؟

کھدّر پوش : ارے بھئی، بیٹھ جاؤ۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

نوجوان : حُکم کیجیے۔

کھدّر پوش : حکم کرنے نہیں آیا ہوں بلجیت۔ مجھے پتہ لگا کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے اور تم اس کے لیے بڑے پریشان ہو۔ سو چا ملتا چلوں۔ مزاج پُرسی کر لوں۔

نوجوان : بہت بہت شکریہ! مگر میں اس لائق کہاں۔

کھدّر پوش : دیکھو بھئی۔ مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ آخر میں اس ملک کا ایک خادم ہوں، تم اس ملک کے شہری ہو۔ تمہاری خدمت کرنا تو میرا فرض ہے۔

[تینوں ایک دوسرے کا مُنھ تکنے لگتے ہیں۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد]

کھدّر پوش : کسی ڈاکٹر کو دکھایا کہ نہیں؟ کیا کہا ڈاکٹر نے؟

نوجوان : یہی تو پریشانی ہے جناب۔ سلمان اسپتال لے گیا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر کہتے ہیں انھیں بڑی سخت بیماری ہو گئی ہے۔ ٹھیک کرنے کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ ڈھیر سارے پیسوں کی بھی ضرورت ہے اور میں ٹھہرا ایک مزدور آدمی۔ روز کماتا ہوں، روز کھاتا ہوں۔ جو تھوڑے بہت روپے بچا کر رکھے تھے اب تو وہ بھی ختم ہو گئے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا میرے پاس۔

[نوجوان جذباتی ہو جاتا ہے]

اب میری ماں نہیں بچے گی۔ میں ہٹا کٹا ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکتا ہوں میں۔

کھدّر پوش : صبر کرو بیٹے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمّت نہ ہارو۔ ڈاکٹر نے کتنی رقم بتائی ہے؟

نوجوان : پچیس ہزار۔ لیکن اس کے ذکر سے کیا فائدہ۔ اتنے روپے تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے ہیں۔

کھدّر پوش : خواب میں نہیں دیکھے تو کیا ہوا۔ تم چاہو تو اس سے کہیں زیادہ روپے حقیقت میں دیکھ سکتے ہو۔

[نوجوان پژمردہ ہوکر سر جھکا لیتا ہے اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ سر اٹھاتے ہوئے گویا ہوتا ہے چہرہ متحیر و مضطرب ہے]

نوجوان : کیوں مذاق اڑا رہے ہیں جناب۔ میں بھلا اتنے روپے کہاں سے لا سکتا ہوں۔ یہ میرے بس سے باہر کی بات ہے۔

[کھدّر پوش نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کنارے لے جاتا ہے کہ بڑھیا ان دونوں کی گفتگو نہ سن سکے]

کھدّر پوش : (بات پر زور دیتے ہوئے) تمہارے بس کی بات ہے۔ تم چاہو تو میں تمہیں اتنی رقم دے سکتا ہوں کہ تم اپنی ماں جیسی دس مریضہ عورتوں کا بھی علاج کرا سکتے ہو۔

نوجوان : یہ کیسے ممکن ہے جناب۔ بھلا مجھے آپ اتنے پیسے کیوں دیں گے۔

کھدّر پوش : تمہاری بات تو معقول ہے کہ بھلا اتنے پیسے میں تمہیں کیوں دے دوں گا۔ دراصل مجھے تم سے ایک کام ہے۔ کام بہت معمولی ہے مگر . . . کر سکو گے تم ؟

نوجوان : کیوں نہیں کر سکوں گا۔ اگر مجھ سے ممکن ہے تو میں ضرور کروں گا۔ میں اپنی ماں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔

کھدّر پوش : نا . . . نا . . . نا۔ جان دینی نہیں ہے، جان لینی ہے۔

نوجوان : جان لینی ہے۔ یعنی قتل۔ کس کا قتل ؟

کھدّر پوش : ڈیویڈ ڈیسوزا کا۔

نوجوان : جی ! منتری جی کا قتل . . . یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟

کھدّر پوش : دُنیا یہی سمجھے گی کہ تم منتری جی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

نوجوان : چاہتے تھے . . . کیا مطلب ؟

کھدّر پوش : مطلب یہ کہ وہ قتل نہیں ہوگا اس پر محض قاتلانہ حملہ ہوگا۔

نوجوان : قتل . . . قاتلانہ حملہ . . . دیکھیے میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ کون سا کام مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ صاف صاف بتائیے۔

کھدّر پوش : غور سے سُنو۔ پہلی بات تو یہ کہ میری تمہاری ملاقات، بات چیت کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے اور اگر کسی کو پتہ چل گیا تو تمہاری ماں کو موت آنے سے پہلے مار دیا جائے گا۔ تمہاری زندگی ایسی کر دی جائے گی کہ تم موت کو بھی ترسو گے۔

نوجوان : اس کے لیے آپ بے فکر رہیں۔ جلدی بتائیے کہ کرنا کیا ہوگا۔ آپ مجھے روپے کب دیں گے۔ میری ماں کب ٹھیک ہوگی۔

کھدّر پوش : کام کی تفصیل تمہیں میرے آدمی بتا دیں گے لیکن مختصراً سُنو۔

[کھدّر پوش جو شروع میں نہایت ہی نرم مزاج لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کرخت ہو گیا۔ اس کی آواز میں تحکم اور دھمکی کا انداز شامل ہو گیا]

بیچ میں بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج سے ٹھیک دسویں دن ۱۲ اکتوبر کو راجہ فیرکس مل کا جنم دن ہے۔ اتفاق سے اس دن وزیراعظم اور صدر دونوں ایک اہم میٹنگ میں شرکت کی غرض سے لوکاچی جا رہے ہیں۔ اس دن ان دونوں کی طرف سے راجہ فیرکس مل کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھانے شری ڈیسوزا ہی جائیں گے۔ تمہیں ہمارے آدمی ان دس دنوں کے اندر ٹرینڈ کر کے نقلی ہتھیار کے ساتھ سمادھی پر ان سے پہلے ہی پہنچا دیں گے۔ تم ان پر قاتلانہ حملہ کرو گے۔ وہ بچ جائیں گے۔ ان کا نام ہٹ لسٹ میں ہے۔ لوگ سمجھیں گے ان پر ملک دُشمنوں نے حملہ کیا ہے — اور . . .

نوجوان : (بیچ میں بات کاٹ کر) لیکن میرا کیا ہوگا۔ سیکورٹی والے مجھ پر اتنی گولیاں برسائیں گے کہ جس ماں کے لیے میں سب کچھ کر رہا ہوں وہ بھی میری لاش کو پہچان نہیں پائے گی۔

کھدّر پوش : بے وقوف ! سیکورٹی کس کی ہوگی۔ اپنی ہوگی۔ وہاں سب اپنے آدمی ہوں گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا اور تم خود ہی سوچو جو تمہیں وہاں پہنچائے گا وہ تمہیں کیوں مارے گا۔

نوجوان : مگر اس سے فائدہ . . . ؟ آخر آپ ہیں کون ؟ یہ سب کیوں کر رہے ہیں آپ ؟

کھدّر پوش : تمہیں یہ سب پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس یہ سنو کہ میں کہہ کیا رہا ہوں اور تم بس وہ کرو کہ میں چاہ کیا رہا ہوں — ہاں . . . تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ تم منتری جی پر گولی چلاؤ گے مگر وہ بچ جائیں گے۔ سیکورٹی والے بھی تم پر گولیاں چلائیں گے مگر تم بھی بچ جاؤ گے۔ اس کے بعد دو صورتیں ممکن ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ تمہیں پلان کے مطابق وہاں سے فرار کروا دیا جائے گا۔ تمہارا اور تمہاری ماں کا فرضی نام سے پاسپورٹ پہلے ہی تیار رہے گا جس پر لکشمن دیپ کا ویزا بھی لگا دیا جائے گا تم اپنی ماں کے ساتھ پہلی فلائٹ سے لکشمن دیپ چلے جاؤ گے۔ وہاں بھی تمہارا پورا انتظام پہلے ہی سے کروا دیا جائے گا اور تم اپنی ماں کے ساتھ پرسکون طور پر لکشمن دیپ کے شہری بن کر رہو گے۔ مگر . . . ایک

گڑبڑ ہوسکتی ہے وہ یہ کہ اس مقام پر کچھ اسپیشل سیکورٹی بھی ہوگی۔ ان کی گولیاں تو تم پر بیکار ہوں گی چونکہ تمھارے جسم پر بلیٹ پروف لباس اور ہیلمٹ ہوگا لیکن اگر انھوں نے تمھیں گرفت میں لے لیا تب تمھیں بتانا کچھ نہیں ہوگا۔ چاہے وہ تمھاری جان ہی کیوں نہ لے لیں۔ صرف چند دن کی بات ہوگی چونکہ تمھیں لاک اپ سے جیل میں شفٹ کر دیا جائے گا اور وہاں سے تمھارے فرار ہونے کا مکمل انتظام کر دیا جائے گا۔ فرار میں کامیابی کے بعد لکشمن دیپ ... عیش و عشرت کی زندگی ... تمھاری صحت مند ماں ... تم ...

نوجوان : نہ عیش و عشرت کی زندگی اور نہ ہی کچھ اور — بس صرف میری صحت — مند ماں ...

کھدر پوش : یہ لو بریف کیس۔ اس میں پورے ایک لاکھ روپے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رقم تمھیں بعد میں دی جائے گی۔ ہمارے آدمی تمھیں سب کچھ سمجھا دیں گے۔ اب ہم لوگ ۱۲ ار اکتوبر یعنی راجہ فیرکس مل کے جنم دن کی شام کو ملیں گے۔

نوجوان : کہاں ؟

کھدر پوش : جہاں تمھیں میرے آدمی لائیں گے۔

[کھدر پوش دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ نوجوان کبھی بریف کیس کو اور کبھی دوسرے کنارے پر لیٹی بڑھیا کو عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ پردہ گر جاتا ہے]

دوسرا منظر

[پردے کے پیچھے سے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی ہے۔ کبھی کبھی بے ڈھب قہقہے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے۔ کافی کشادہ ہال ہے۔ چھت کے بیچ میں بہت بڑا فانوس لٹک رہا ہے۔ اس کے اطراف میں چار چھوٹے چھوٹے خوبصورت پنکھے اپنی پنکھڑیاں گھما رہے ہیں۔ دیوار پر جا بجا پینٹنگز اور بڑے بڑے فریم لگے ہوئے ہیں۔ کئی دروازے اور کھڑکیاں ہیں جن پر شیشوں کے آگے پردے لٹک رہے ہیں۔ فرش پر قیمتی قالین ہے۔ صوفے اور صوفوں کے بیچ راؤنڈ ٹیبل اس طرح سے ہے کہ ہر صوفہ نشیں کی پہنچ ٹیبل تک ہوسکتی ہے۔ صوفوں پر مختلف وضع کے لوگ بیٹھے ہیں۔ کچھ نیتا ہیں، کچھ پولیس کے اعلیٰ افسران ہیں۔ ایک دو ملٹری مین بھی ہیں اور چند سرمایہ دار بھی — اور ان سب میں نمایاں مقام پر جلوہ افروز ہیں ڈیوڈ ڈیسوزا — ان سب کی شناخت ان کے لباس سے ہو رہی ہے]

ایک نیتا : کمشنر صاحب آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسے ایسے بھاگے جیسے واقعی کوئی ملک دشمن ہی بھاگ رہا ہو۔

کمشنر صاحب : عزت افزائی کا شکریہ۔

دوسرا نیتا : اور کرنل صاحب، آپ نے جو اسٹین گن اسے دی تھی کیا ساخت اور کیا آواز، ہر اعتبار سے اصلی لگ رہی تھی۔ آپ کا بھی جواب نہیں۔

کرنل : دیکھیے صاحب، میں ٹھہرا ملٹری مین — میں جو کہتا ہوں کرتا ہوں۔ ہر ذمے داری کو پورے طور پر نباہنا اپنا اصول ہے اور فرض کو پورا کرنے پر کسی طرح کی مبارکباد مجھے پسند نہیں۔

ایک سرمایہ دار : یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔

[اتنے میں دو تین پولیس افسران کے ساتھ نوجوان، بلیٹ آتا ہے۔ وہ کافی پریشان لگ رہا ہے۔ اِدھر اُدھر تاکتا جھانکتا آگے بڑھ رہا ہے جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ ڈیوڈ ڈیسوزا بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہے]

ڈیسوزا : آؤ — آؤ — میرے شیر، تم نے تو اس کھیل کو حقیقت کا رنگ دے دیا۔ سار دُنیا میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ صدر اور وزیر صاحب نے لوکاچی سے سلامتی پر مبارکباد ہمدردیاں بھیجی ہیں۔ پورے ملک سے ہمدرد بھرے خطوط آرہے ہیں۔

نوجوان : (چیختا ہوا) خطوط آرہے ہیں آنے دو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میری ماں کہاں ہے ٹریننگ کے پہلے ہی دن تمھارے آدمی میری ماں لے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے تمھیں خیریت ملتی ر گی۔ مگر یہ لوگ کچھ نہیں بتاتے کہ میری ماں کہا ہے (جذباتی ہوتے ہوتے) مجھے میری ما سے ملا دو۔

ڈیسوزا : او ... ہو۔ تمھیں اپنی ماں کی ہے۔ یہاں میرے بہت آگے جانے کے چان بن رہے ہیں۔ وزیر اعظم صاحب کے آتے کابینہ میں تبدیلی ہوگی۔ اور میں، میں جو چاہ مجھے وہی ملے گا۔ اب سب کی ہمدردیاں میر ساتھ ہیں۔ میں بہت اوپر جاؤں گا۔

نوجوان : بند کرو بکواس ... جلدی بتاؤ ماں کہاں ہے۔ اب کیوں چھپا رکھا ہے اسے

دوسرا سرمایہ دار : (جو عمر رسیدہ سمج اور بُردبار نظر آرہا ہے) دیکھو بیٹے، پریش ہو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ فکر نہ کرو۔ تمھارے ابھی پوری دنیا پڑی ہے۔

نوجوان : آگ لگا دوں گا اس ساری دُ کو ... مجھے دُنیا سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے ماں چاہیے۔ (دیوانوں کی طرح چلاتا ہے) ما

تم کہاں ہو؟ کہاں ہو ماں؟

وہی سرمایہ دار : بیٹے دھیرج رکھو۔ ہم لوگوں نے تمھاری ماں کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر . . .

نوجوان : مگر کیا . . .؟ کیا تم کہنا چاہتے ہو میری ماں . . . نہیں، میری ماں کو کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈیسوزا : تمھارا ٹکٹ تیار ہے فلائٹ میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ یہ بریف کیس لے کر تم لکشمن دیپ چلے جاؤ۔

نوجوان : ارے تم ٹکٹ، فلائٹ اور لکشمن دیپ کی باتیں کر رہے ہو۔ میری ماں کے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتاتے۔

ڈیسوزا : سننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ تمھاری ماں کا انتقال ہو گیا۔

نوجوان : کیا کہا . . .؟

ڈیسوزا : میں نے کہا تمھاری ماں کا انتقال ہو گیا یعنی تمھاری ماں مر گئی۔

[نوجوان مشتعل ہو جاتا ہے۔ ببھوکے شیر کی مانند وزیر پر جھپٹ پڑتا ہے]

نوجوان : یوں کیوں نہیں کہتے کہ مار ڈالا تم نے میری ماں کو۔ تم سب نے مل کر جان لے لی اس کی۔ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا ختم کر دوں گا تمھیں۔

[سب مل کر نوجوان کو وزیر سے الگ کر لیتے ہیں]

تم مجھ سے بچ سکتے ہو۔ عوام سے نہیں بچ سکتے۔ ساری دنیا کو بتا دوں گا تم سب کے کالے کارنامے۔ تم سب کا پول کھول دوں گا میں۔

ایک نیتا : منتری مہودے! ایسا لگتا ہے اس کی زبان بند کرنی پڑے گی۔

ڈیسوزا : نہیں بھائی . . . گاڈ نے زبان دی ہے چلانے دو زبان کو ـــ ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے۔

دوسرا نیتا : یہ کیا کہہ رہے آپ؟

ڈیسوزا : ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ اور پھر اس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بھی تو کچھ فرض بنتا ہے۔

نوجوان : کسی کو فرض اور ذمہ داری کا ہی خیال ہوتا تو آج دیش کی یہ حالت ہوتی؟

ڈیسوزا : میرے تمھارے بیچ یہ ہلک کیسے آ گیا بھئی ـــ میں تو سوچ رہا ہوں کہ تمھیں اپنی ماں سے اتنی محبت ہے کیوں نہ تمھیں اسی کے پاس پہنچا دیا جائے۔

[سبھی حاضرین اس طرح مسکراتے ہیں جیسے وزیر کی عقلمندی کی داد دے رہے ہوں۔ وزیر اپنے گاؤ تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالتا ہے اور اس نوجوان پر پے در پے تین گولیاں چلا دیتا ہے۔ پورے اسٹیج کی لائٹ سمٹ کر نوجوان پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسٹیج پر صرف نوجوان نظر آ رہا ہے جو سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ جھکتا جا رہا ہے۔ خون جاری ہے ـــــ نوجوان منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف کو لڑھک جاتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے ـــ پردہ گر جاتا ہے]

نظمیں

عتابِ آسماں

منظرِ ہر صبحِ نو آتش فشاں
جلتے سورج سے تپیدہ دوپہر
شام، جیسے اِک پرندہ خوں میں تر
'صحنِ شب میں ' سایۂ آسیب سا
کل ' ہو جیسے کوئی گزرا حادثہ
"آج" بھی ہے ایک تازہ سانحہ
سب صدائیں ہیں بکھرتی کرچیاں
لُو کے جھونکوں کا گماں انفاس پر
چہرہ چہرہ بے بسی کا اشتہار
بکھرا بکھرا نوحۂ سرگشتگی ـــــ!
وحشت آگیں منظروں کے درمیاں
لگ رہی ہے اب، عتابِ آسماں
یہ زمیں ہم جس پہ نازاں ہیں بہت!!

انور مینائی

الامین تعلیمی کمپلکس، کولار ۵۶۳۱۰۱

ادھوری پہچان

وہی کیف ولذت سے بیگانہ آنکھیں
نہ کانوں میں بے صوت لفظوں کی آہٹ
تصوّر میں آسودگی ہے نہ ہیبت
خدا، اے خدا میں
تجھے مان کر بھی
جہاں تھا وہیں ہوں
مجالس میں
تیری ثنا، ذکر تیرا،
تری حمد کہتا ہوں سنتا ہوں یارب
مگر میری تنہائیاں
تجھ سے خالی پڑی ہیں

ادریس صدر

نورالدین روڈ، آسن سول (مغربی بنگال)

ہائیکو

(۱)
کالی کالی راتیں
کالے کالے دن
اب تو بیٹھے گن

(۲)
تونے چھوڑا سات
الٹے دن اور رات
آئینہ اپنے ہات

(۳)
سات سمندر پار
چھوڑ کے اپنا دار
سونے کا بیوپار

(۴)
کل تھی کرسی تیری
آج ہے میری
میز پہ دھول ہے اٹی پڑی

(۵)
چار دہائی گذری
سانس اکھڑی کی اکھڑی
اُمیدوں کی بتّی بجھی پڑی

وقار قادری

۹، جاتے بیلے، تھرڈ فلور، موری روڈ ماہم، بمبئی

عشرت امیر

ماہرِ نفسیات

اور اُن کی قیاس آرائیاں

اس سے انکار مشکل ہے کہ اگر نفسیات کا علم نہ ہوتا تو انسان نے انسان کو اتنے اچھے ڈھنگ سے نہ سمجھا ہوتا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ نفسیات کے نام پر آج بہت سی بے سرو پا باتیں بھی ہو رہی ہیں۔

معمولی سی بات کو بھی ماہرِ نفسیات غیر معمولی بنا دیتے ہیں یہی نہیں کبھی کبھی وہ خود اپنی کہی ہوئی باتوں کو غلط بھی ثابت کر دیتے ہیں، لہٰذا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کب جھوٹ بول رہے ہیں اور کب سچ ——!

انگلینڈ کے جانے مانے ماہرِ نفسیات پروفیسر کارل ہینبر کا کہنا ہے —— "اگر کوئی آدمی ہر وقت قہقہے لگاتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ قطعی سُکھی اور خوش نہیں ہے، اصل میں وہ ان قہقہوں کے ذریعے اپنے غم اور دُکھ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے —— اور جو شخص دلچسپ سے دلچسپ لطیفہ سُن کر بھی قہقہہ نہیں لگاتا اور صرف مُسکرا کر رہ جاتا ہے وہ سُکھی اور مطمئن شخص ہے۔"

لیکن ایک اور ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ جو لوگ قہقہوں کی جگہ صرف مسکراہٹ سے کام لیتے ہیں وہ ڈرپوک اور بُزدل ہوتے ہیں۔

لباس کو لے کر بھی ماہرینِ نفسیات نے بال کی کھال نکالی ہے اچھے کپڑے پہننا بھلا کسے بھلا نہیں لگتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کپڑوں کی خوش نمائی اور صفائی پر دھیان نہیں دیتے۔

کناڈا کے مشہور ماہرِ نفسیات اینڈریو سیمونلس نے کہا ہے —— "اچھے کپڑے پہننے والے دراصل کپڑے نہیں پہنتے، بلکہ جنگ کرتے ہیں وہ اپنے رُتبے اور حیثیت سے دوسروں کو ہرانے نکلتے ہیں۔"

اسی ماہرِ نفسیات نے آگے لکھا ہے "جو لوگ کپڑے سلیقے سے نہیں پہنتے وہ ہمیشہ احساس کمتری کے شکار دیکھے گئے ہیں، وہ بنا لڑے ہی اپنی ہار تسلیم کر لیتے ہیں، وہ پہلے سے مان کر چلتے ہیں کہ ہم جیت ہی نہیں سکتے اور ہمیشہ شکست خوردہ حالت میں رہنے کے لیے ہی وہ گھٹیا کپڑے پہنتے ہیں۔" صحیح وقت پر کبھی کہیں نہ پہنچ پانے کے لیے ہندوستانیوں نے ساری دُنیا میں نام کمایا ہے اس پر بھی ماہرینِ نفسیات نے اچھی خاصی مغز پچی کی ہے، اگر آپ وقت کے پابند ہیں تو للو ہیں اور اگر پابند نہیں ہیں تو پھر تو للو ہیں ہی ——!

امریکی ماہرِ نفسیات جیفری ٹمس کا کہنا ہے: "ہمیشہ صحیح وقت پر پہنچنے والے لوگ دراصل اپنا جھگڑالو پن چھپا رہے ہوتے ہیں۔ وقت کی پابندی کو وہ ہتھیار کے رُوپ میں استعمال کرتے ہیں۔"

لیکن جیفری ٹمس آگے کہتے ہیں: "جو لوگ ہمیشہ تاخیر سے پہنچتے ہیں اُن میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے، دراصل وہ وہاں جانا چاہتے ہی نہیں، جہاں جا رہے ہوتے ہیں، وہ اس مقام سے، اس موقع سے، وہاں موجود لوگوں سے آمنا سامنا کرنے کے قطعی متمنی نہیں ہوتے، اس لیے وہ وہاں ٹھیک وقت پر نہیں پہنچ پاتے —— انھیں ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کسی بھی قدم پر انھیں چیلنج دیا جا سکتا ہے۔ ایسا چیلنج جسے وہ قبول نہیں کر سکتے۔"

دیکھا آپ نے! —— ماہرینِ نفسیات چت بھی اپنی رکھتے ہیں اور پٹ بھی اپنی —— آپ اُن سے کبھی جیت ہی نہیں سکتے۔

فیشن کا بول بالا ان دِنوں چاروں طرف ہے، نہ صرف عورتیں، بلکہ مرد بھی اب اپنے رنگ رُوپ، رکھ رکھاؤ پر دھیان دیتے ہیں، موٹاپا کسی کو پسند نہیں، سب چھریرا اور سڈول جسم چاہتے ہیں۔

نیو یارک کے ماہرِ نفسیات ہنری ہیٹن نے کہا ہے: "جو مرد اپنے رنگ رُوپ کو نکھارنے اور سنوارنے میں زیادہ وقت لگاتے ہیں وہ بلاشبہ اس غلط فہمی میں جیتے ہیں کہ ہم تو خود کے اطمینان اور خوشی کے لیے سنورتے ہیں، جب کہ اصل میں یہ مرد اپنے اندر چھپی ہوئی عورت کو ہی ظاہر کر رہے ہوتے ہیں، ایسے مرد اکثر حاسد، لُچے اور بُزدل دیکھے گئے ہیں۔"

فیشن ایبل عورتوں کے بارے میں اس کی رائے ہے: "موٹاپے سے بچنے کے لیے جو عورتیں نہیں کے برابر کھانا پینا شروع کر دیتی ہیں دراصل وہ اپنے تمام رشتے داروں اور چاہنے والوں سے بدلہ لے رہی ہوتی ہیں۔ نزاکت کے پھیر میں یہ عورتیں جسمانی طور پر اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ

قصبہ مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ (یو۔پی)

آس پاس کا ہر شخص انھی کی فکر کرنے لگتا ہے اور یہی وہ چاہتی ہیں یہ دوسروں کو فکر مند کرکے ڈرانا چاہتی ہیں، اس لیے ہر فیشن ایبل عورت کو حملہ آور کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ عورتیں دوسروں کو روندنے کے لیے فیشن کرتی ہیں نہ کہ اپنی خوشی کے لیے۔

فیشن تو پھر بھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے، ماہرین نفسیات نے تو ــــ "آپ انڈا کیسے کھاتے ہیں؟" جیسا معمولی سوال بھی اُٹھاکر نتائج اخذ کیے ہیں۔ پچھلے دنوں فلوریڈا کے محکمۂ تعلیم نے اس موضوع پر ریسرچ کی، اور نتیجہ یہ رہا ــــ

انڈوں کو زیادہ اُبال کر کھانے والے ایماندار، ضدی اور سخت محنتی ہوتے ہیں۔

انڈوں کو کم اُبال کر کھانے والے لوگ نازک، رحم دل اور صابر ہوتے ہیں۔

آملیٹ پسند کرنے والوں کو ذرا قدامت پسند لیکن بھروسے کے قابل پایا گیا ہے

انڈوں کی بھُرجی پسند کرنے والے آرٹ کے دلدادہ اور سیکسی ہوتے ہیں، انڈے فرائی کرکے کھانے والے ہمیشہ دوسروں پر اپنا حق جتاتے رہتے ہیں۔

فلوریڈا کے محکمۂ تعلیم نے اس ریسرچ پر کتنی رقم خرچ کی اس کا کوئی حساب موجود نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سبزی خور جو انڈا چھوتے بھی نہیں، ان کی شخصیت کو کیسے پہچانا جائے گا ــــ؟

ایک اور سوال بھی ہے۔ اگر ماہرین نفسیات کی خود نفسیاتی جانچ کرائی جائے تو کیا نتائج نکلیں گے ــــ؟

ہم طرح اشعار

اس بار اس کالم کے لیے اشعار تو بے شمار موصول ہوئے لیکن بھیجنے والوں نے صرف ردیف قافیے کو ملحوظ رکھا، بحر کو نظر انداز کر دیا۔ ایسے تمام اشعار مجبوراً ہمیں نظر انداز کر دینے پڑے۔ جو اشعار صحیح بحر میں تھے، ان کا انتخاب ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

"گلدستہ" حاشیے میں درج اشعار بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

اے لبِ یار تجھکو میری قسم
کبھی سچی قسم بھی کھائی ہے؟ (داغ)

مرسلہ: محمد یٰسین احمد جمالی، بھاگلپور

آرزو اس بلند و بالا کی!
کیا بلا میرے سر پہ آئی ہے (امجد حیدرآبادی)

مرسلہ: احمد مرزا، بیڑ

قطرہ دریائے آشنائی ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے (فانی)

مرسلہ: حامد مرزا، بیڑ

حُسن نے جب شکست کھائی ہے
عشق کی جان پر بن آئی ہے (جگر)

مرسلہ: منظہر بچن، بھاگلپور، محمد شکیل الرحمٰن، بھاگلپور

جب مسرت قریب آئی ہے
غم نے کیا کیا ہنسی اُڑائی ہے (جگر)

مرسلہ: افسر امام، بھاگلپور

خاک منزل کو منہ سے ملتا ہوں
یادگارِ شکستہ پائی ہے (جگر)

مرسلہ: منظہر امام، بھاگلپور

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے (جگر)

مرسلہ: محمد عقیل الرحمٰن، ایشیا ٹائمس، آدرش مارکیٹ، ڈی۔ این۔ سنگھ روڈ، خلیفہ باغ، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)۔

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں
زندگی نے شکست کھائی ہے (جگر)

مرسلہ: محمد قیصر امام، بھاگلپور، تسنیم تہمینہ، ناگپور

ہائے وہ سبزۂ چمن کہ جسے
سایۂ گل میں نیند آئی ہے (جگر)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا، محلہ حسینی، فیروزآباد (آگرہ)۔

ہجر سے شاد وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے (جگر)

مرسلہ: فضل الباسط صدیقی، پٹنہ

حُسن کو رام کر کے چھوڑوں گا
مجھ سے دل نے قسم یہ کھائی ہے (جوش)

مرسلہ: کاشف عمر، صاحب گنج

آئی عاشق میں شانِ محبوبی
یعنی اب عشق انتہائی ہے (جوش)

مرسلہ: اسلم ناز، صاحب گنج

دل نے غم سے شکست کھائی ہے
عمرِ رفتہ تری دہائی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: بے بی پروین نوشاد، جبار چک

حُسن مصروفِ خود نمائی ہے
عشق کا دور ابتدائی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: شہزاد عالم ارشاد، جبار چک

دل کی بربادیوں پہ نازاں ہوں
فتح پاکر شکست کھائی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: ارشاد احمد، سہارنپور۔ شاہد عقیل، بتیا، محمد سیف اللہ منظور سیف، بھاگلپور۔ بیگم ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد، جبار چک۔

کھل گیا ان کی آرزو میں یہ راز
زیست اپنی نہیں پرائی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: محمد امتیاز منظور، بھاگلپور۔ نایاب بچن، جبار چک

شمع و پروانہ ہوں کہ غنچہ و گل
زندگی کس کو راس آئی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: انور جاوید شاداں، سہسرام۔ شوبھا رانی، جبار چک

وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی
ہائے کس وقت نیند آئی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: افسر علی خاں، حسن پور

میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم
احتیاطاً جبیں جھکائی ہے (شکیل بدایونی)

مرسلہ: شکیل جاوید، سہسرام۔ آفرین نوشاد، جبار چک

کچھ حسیں خواب اور کچھ آنسو
عمر بھر کی یہی کمائی ہے (مظہر امام)

مرسلہ: ماجد عقیل، بتیا

سر چھپانے کو گھر نہ تھا لیکن
قبر پر گنبدِ طلائی ہے (عثمان عارف)

مرسلہ: روشن آرا (سیما)، منظہر ٹولہ، صاحب گنج ۸۱۶۱۰۹ (بہار)

ہچکیاں آ رہی ہیں پے در پے
کیا انھیں میری یاد آئی ہے (عمر وارثی)

مرسلہ: شاہد حسین، سنبھل

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

اکتوبر ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانات میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

حسن والے ہیں کم روشن سارے
ہوئے دوچار رُو براہ تو کیا (میرؔ)

مرسلہ: طارق عقیل، گنج ۲، نزد مدرسہ اسلامیہ، بتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (غالبؔ)

مرسلہ: عبدالرزاق رضوی، پٹنہ

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی (فراقؔ گورکھپوری)

مرسلہ: محمد قیصر امام، معرفت عبدالکریم، مجاہد پور، ویسٹ بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)۔

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی (بہادر شاہ ظفرؔ)

مرسلہ: محمد یوسف خاں، آگرہ

اوّلیں شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی
اجنبی مہک پاکر ہم نکل پڑے گھر سے (ناصرؔ کاظمی)

مرسلہ: خلیق الزماں، اعظم گڑھ

عشق کا ذوقِ نظارہ مُفت میں بدنام ہے
حُسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے (مجازؔ)

مرسلہ: ماجد عقیل، بتیا

رس میں ڈوبا ہوا لہرایا بدن کیا کہنا
کروٹیں لیتی ہوئی صبحِ چمن کیا کہنا (فراقؔ)

مرسلہ: محمد شاکر حسین شاکرؔ، صاحب گنج

مجھ کو شام بتا دیتی ہے
تم کیسے کپڑے پہنے ہو (بشیرؔ بدر)

مرسلہ: غلام احمد، شورا پور

اپنی پرچھائیں بھی ڈس لیتی ہے
ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھیے (حفیظؔ بنارسی)

مرسلہ: ایم۔ علی، برہانپور

اپنی آنکھوں میں کھلائے ہوئے خوابوں کے کنول
اس کڑی دھوپ میں نکلو گے تو جل جاؤ گے (نامعلوم)

مرسلہ: محمد عمر انصاری، رچھا، بریلی

زمین ہلتی ہے متوالی چال سے تیری
اسیر کون ہے جادو کا آج کل تیرے (عبدالعزیز خالدؔ)

مرسلہ: محمد اقبال حسین، صاحب گنج

رُکے نہ قافلہ، صبحِ نو بہار چلے
بلا سے راہ میں آندھی چلے غبار چلے (عبدالسلام)

مرسلہ: صبیحہ فاروقی، بھاگلپور

بجائے سینے کے آنکھوں میں دل دھڑکتا ہے
یہ انتظار کے لمحے عجیب ہوتے ہیں (انور حسین انورؔ)

مرسلہ: محمد عارف، علی گڑھ

مسافر ہو تو سن لو راہ میں صحرا بھی آتا ہے
نکل تو آئے ہو گھر سے تمھیں چلنا بھی آتا ہے؟ (نامعلوم)

مرسلہ: نفیس شیراز، نئی دہلی

اک دامنِ رنگیں لہرایا مستی سی فضا میں چھا ہی گئی
جب سیرِ چمن کو وہ نکلے پھولوں کی جبیں شرما ہی گئی (نشورؔ واحدی)

مرسلہ: نغمہ پروین اعظمی، علی گڑھ

نثری عنوانات

"تلاشِ بہاراں" (جمیلہ ہاشمی کا ناول)

مرسلہ: محمد عارف انصاری نایاب، معرفت عثمان انصاری، مجاہد پور (ویسٹ) بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

"ایک آوارہ کی خاطر" (بشریٰ رحمان کا ناول)

مرسلہ: محمد اشتیاق حسین پرنس، بھاگلپور

"دو سہیلیاں" (ندا فاضلی کی نظم)

مرسلہ: محمد شکیل الرّحمٰن، بھاگلپور

"شکاری عورتیں" (سعادت حسن منٹو کا ناول)

مرسلہ: محمد ذکی سروش، سنبھل

"زندگی مُسکرائی" (زلیخا حسین کا ناول)

مرسلہ: محمد شہاب الدّین، بھاگلپور

"ایک ہی ڈگر" (زلیخا حسین کا ناول)

مرسلہ: قدسیہ طلعت، گیا

"دو سکھیاں" (مینا ناز کا ناول)

مرسلہ: شاہینہ پروین، جمشید پور اور طلحہ وقار غالب، سنبھل۔

"گلدستہ" پہلے اور تیسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

نئی مطبوعات

معتبر (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف: سلام بن رزاق
قیمت: ۲۵ روپے
پتہ: سیفی بک ایجنسی، ۱۱۔ آمین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سلام بن رزاق کی کتاب 'معتبر' پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ افسانے صنعتی تہذیب کے بعض تاریک گوشوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں تشدد اور قتل کے اسباب و نتائج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس قسم کے واقعات ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ لیکن اصل حالات پر لوگوں کی نظر نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے 'معتبر' کے افسانے ہمیں چونکا دیتے ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'ندی' ہے۔ یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ جو موجودہ سماج کی تنقید اور افسانہ نگار کی سماجی تصوریت کی ترجمان ہے۔ اس کتاب کا ایک قابلِ ذکر افسانہ "ایک لوریہ" ہے جس میں کئی صدیوں کے سماجی تقابل کی ایک سمت پیش کی گئی ہے۔ اس افسانے کا کینوس نسبتاً وسیع ہے ___ 'ایک اور شرون کمار' میں مذہبی وفاشعاری ایک ایسی سنگین صورت اختیار کر لیتی ہے جہاں زندگی کی نسبت موت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ افسانہ 'ستی' مذہبی جاں نثاری پر ایک کاری ضرب ہے۔ اس مجموعے کے دیگر افسانوں 'دو دو چراغ'، خون بہا۔ دست بریدہ لوگ۔ صلیب۔ اور جراءت میں انسانی خون کی ارزانی موضوع ہے۔ ان کے علاوہ تصویر، مسٹر نوبڈی اور کام دھینو جیسے افسانے زندگی کی عام ناہمواریوں کو سامنے لاتے ہیں۔

'معتبر' کے مرکزی کردار انقلابی ذہن کے مالک ہیں۔ وہ شدید ذہنی بحران اور نفسیاتی پیچ و خم سے گذرتے ہوئے پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور نہایت حساس ہونے کی وجہ سے اپنی چھٹی حس کو لاشعوری طور پر خوابوں کی دنیا میں دیکھتے ہیں اور پھر حقیقی دنیا میں ان خوابوں کی تعبیر کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لاشعور کا یہ پہلو تہذیبی شعور کی وہ منزل ہے جہاں انسان بہت پہلے آئندہ حقیقتوں کا ادراک کر لیتا ہے۔ لاشعور سے حقیقی زندگی تک کا یہ سفر اس کتاب کے بیشتر افسانوں کا ایسا فنی تجربہ ہے جس کی وجہ سے قارئین کے ذہنی بہاؤ میں ایک شگاف کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ کہانی کے ایسے موڑ پر جہاں ایک طویل خواب ختم ہو۔ وہاں ایک خوفناک حقیقت سے قاری کو نجات بھی ملتی ہے۔ یہ وہ خواب ہیں جو شرمندۂ تعبیر ہو چکے ہیں۔ تاریخ کا یہ تاریک اثاثہ اگر شعور میں جاگ اٹھے تو اسے ہم 'خواب' نہیں حقیقت کہیں گے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانوی مجموعے کا نام معتبر رکھا ہے۔ جو ماضی اور حال کے رشتوں کو سامنے لا کر مستقبل کا اشاریہ فراہم کرتا ہے ایک افسانہ 'معتبر' کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔

ان افسانوں میں موجودہ تہذیب کی جو صورتِ حال ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی دنیا کا باسی اغراض کے سائے میں جیتا اور مرتا ہے۔ ایک دوسرے کے وجود کی سالمیت کو گوارا کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ فنی اعتبار سے ان افسانوں میں ذہنی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کو زیادہ داخل کیا گیا ہے۔ اس لیے طوالت کے باوجود افسانوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ دوسرے فنی وسائل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کو مختلف طبقوں کی زبان اور اس کے تازہ تخلیقی اظہار پر قدرت حاصل ہے۔ دو ایک افسانوں میں فلسفے کے علمی اظہار نے زبان کے بہاؤ کو متاثر بھی کیا ہے۔ لیکن یہ سلام بن رزاق کی تحریر کا عام انداز نہیں ہے۔ مجموعی طور پر 'معتبر' کے افسانوں میں پیش کردہ مسائل کرداروں کے نفسیاتی پیچ و خم، فضا آفرینی اور لاشعور کے وسیلے سے حقیقت کا ادراک ایسی خصوصیات ہیں جو قارئین کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ کتاب پسندیدۂ خاطر رہے گی۔

—— صادقہ ذکی

باتیں کچھ سُریلی سی
مصنف: داؤد رہبر
صفحات: ۱۵۲
قیمت: ۳۶ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

ہندوستان میں اگر موسیقی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً اس کی ابتدا کا زمانہ وہی ہوگا جہاں سے ہندوستان کی تاریخ شروع ہوگی۔ موسیقی یہاں مذہب سے جڑی ہوئی ہے مندروں میں صرف پنڈتوں کا بیان نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بھجن گائے جاتے تھے۔ گویا موسیقی یہاں کی تہذیب کا لازمی حصہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی

حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت پر کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ خود مسلمان سلاطین اور امرا نے اس فن کی سرپرستی کی۔ سلاطین دہلی کے عہد میں امیر خسرو نے موسیقی کے میدان میں بہت شہرت پائی، بہت سے راگ اور آلاتِ موسیقی انھیں کی ایجاد ہیں۔ ہندو تہذیب میں موسیقی اگر مندروں سے جڑی ہوئی تھی تو مسلمانوں نے اسے خانقاہوں سے جوڑ لیا اور قوالی خانقاہوں کا باقاعدہ حصہ بن گئی۔ حضرت بختیار کاکیؒ کا وصال ایک قوال کی زبان سے شعر سننے کے بعد وجد کی کیفیت میں ہوا۔ بقول علامہ اقبالؔ "ہندی موسیقی نے مشرف بہ اسلام ہو کر قوالی کی صورت اختیار کی ہے۔" مسلم سلاطین کی موسیقی سے دلچسپی کا یہ حال تھا کہ محمد بن تغلق کے دربار سے دو ہزار سے زیادہ قوال وابستہ تھے ـــــ اسی طرح دوسرے سلاطین کو سمجھنا چاہیے۔ مغلوں کے زمانے میں اس فن کو اور زیادہ عروج حاصل ہوا۔ میاں تان سین نے اسی عہد میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا جن کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ گذشتہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں ایسا باکمال گویا پیدا نہیں ہوا۔ موجودہ صدی میں بھی بے شمار ایسے باکمال موسیقار پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کو آسمان ترقی سے ہمکنار کیا۔

اردو میں چند کتابوں کے علاوہ موسیقی یا موسیقی کی تاریخ یا موسیقاروں کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔ داؤد رہبر صاحب نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر رہبر بوسٹن یونیورسٹی (امریکہ) میں ادیانِ عالم کی تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ موسیقی سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ وہ بوسٹن یونیورسٹی میں ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر ایک کورس بھی پڑھاتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کی کتاب "باتیں کچھ سُریلی سی" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کی موسیقی کی تاریخ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اسے بیسویں صدی کے ہندوستانی کلاسیکل موسیقاروں کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔

کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں کلاسیکل موسیقی کے ماہر خاں صاحبان کا تذکرہ ہے۔ اس میں استاد عبدالکریم خاں، استاد فیاض خاں، استاد امیر خاں، استاد بڑے غلام علی خاں وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے باب میں ہندو موسیقار پنڈت رام کشن بواوازے، کرشنا راؤ پنڈت، پنڈت اوم کار ناتھ ٹھاکر، کمار گندھرو وغیرہ کا ذکر ہے۔ ایک باب "نسوانی آوازیں" کے عنوان سے ہے۔ اور اس میں کیسر بائی کیرکر، روشن آرا بیگم، ہیرا بائی۔ پروین سلطانہ وغیرہ کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ متفرقات میں امریکہ میں ہندوستانی سنگیت کی مقبولیت کو بیان کیا ہے اسی ضمن میں پنڈت اودے شنکر، پنڈت روی شنکر استاد اللہ رکھا خاں، استاد علی اکبر خاں کا تذکرہ شامل کیا ہے۔ کتاب کے آخری ابواب میں ہندو دیو دیوتاؤں اور جدید موسیقی پر گفتگو کی ہے۔

فنکاروں کے بیان کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر فنکار کے بیان میں مختلف راگوں کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ راگوں پر دلچسپ بحث کی ہے۔ مثلاً استاد فیاض خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے آگرہ گھرانے کی گائکی کا حق ادا کر دیا، اس گھرانے کی گائکی میں گھن گرج ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اکبر نے اس شہر کو دارالسلطنت بنایا ـــــ ملاحظہ ہوں اس تجزیے کے کچھ اقتباس:

"آگرے کو اکبر کی روح سے جدا نہیں کیا جا سکتا ـــــ اکبر کی روح کا پتہ دو چیزوں سے ملتا ہے، دُھرپد اور راگ درباری۔ ان دونوں چیزوں کا دھڑا مسلّم ہے، خیال گائکی جمال گائکی ہے اور دھرپد گائکی جلال گائکی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اکبر کا نام بھی جلال الدین تھا جمال الدین نہ تھا۔ خیال کی پتنگ محمد شاہی دور میں چڑھی۔ خیال عیاشی ہے اور دُھرپد میں ڈنکے کی چوٹ ہے۔ دُھرپد دلاوروں کے چیلنج کی آواز ہے۔ اکبر کا کام کوہ پیمائی اور مہمات سر کرنے کا تھا۔ اس لیے دُھرپد کی آواز ہی مناسب تھی۔ جس میں لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دیتی ہے۔"

"تان سین نے اکبر کے مزاج کو سمجھ کر ہی یہ بات پیدا کی، گوجری ٹوڈی میں پنچم کو شامل کر کے میاں کی ٹوڈی بنائی ـــــ میاں کی ملہار میں اور درباری میں دھاک کا اندولن مشترک ہے، یہ اندولن وہ جھُلاوا ہے جو خطرے میں کود پڑنے سے پہلے اولعزم کے ذہن میں ہوتا ہے۔" ص ۳۹.۳۸.

غرض کہ پوری کتاب میں اس طرح کے تجزیے شامل ہیں۔ جس نے کتاب کو دلچسپ اور سودمند بنا دیا ہے۔ اندازِ نگارش نہایت بے تکلف ہے، اور اس میں سنگیت کی جھنکار سنائی دیتی ہے جس کی وجہ سے دل و دماغ کو تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔

ـــــ ڈاکٹر ابن کنول

کربِ احساس

شاعر: نظمی سکندرآبادی

صفحات: ۱۶۰

قیمت: ۳۰ روپے

اشاعت: اُردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے۔

ملنے کا پتہ: ادارۂ تبلیغ دینیات، اُردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

موجودہ عہد میں اردو کا شعری ادب مختلف

لہجوں اور رویوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ لہجے اور رویے ہیئتی اور فکری دونوں لحاظ سے ابھی تک پُراعتماد رنگوں سے آراستہ نظر نہیں آتے۔ انھی کے دوش بدوش کچھ تجربات، داخلی کیفیات کے سانچے میں ڈھل کر مستحکم فضا پیدا کر رہے ہیں۔ اور ایسی شاعری اب عوام اور خواص دونوں حلقوں میں ترجیحی نظروں سے دیکھی جارہی ہے۔ ان رجحانات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے والے شعراء میں جناب نظمیؔ سکندرآبادی بھی شامل ہیں:

گلوں کی طرح جنھیں پیرہن دریدہ ملے
انھی میں کتنے ہی فن کار برگزیدہ ملے

نظمیؔ صاحب کی عمر کا بیش تر حصہ اساتذۂ سخن کی ہم نشینی میں گزرا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں فن کی پختگی نمایاں ہے۔ تقریباً پندرہ سولہ سال سے میں ان سے اور ان کے کلام سے متعارف ہوں لیکن سکون کے ساتھ اُنھیں سمجھنے اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع ان کے مجموعۂ کلام "کربِ احساس" نے فراہم کیا۔ انھوں نے غزل کے پیرہن میں اپنے دل کے لہو سے ایسی زر کاری کی ہے جو ہر حساس دل کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے:

لفظ لفظ رہتا ہے خامہ دل فگار اپنا
حرف حرف بہتا ہے خونِ قلبِ زار اپنا

نظمیؔ صاحب نے آدابِ فن کو نئے رجحانات اور خیالات کے ساتھ اپنی غزل میں خوش اسلوبی سے برتا ہے اور اپنی اس صلاحیت کو ہنر کے دائرے میں شامل کرلیا ہے۔

غزل وَلی سے لے کر میرؔ تک اور میرؔ سے لے کر آج تک اپنی ہیئت میں کسی تبدیلی کی روادار نہیں لیکن اس کے موضوعات کا دامن وسیع ہوتا رہا۔ نظمیؔ صاحب کی غزل میں بھی موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اُن کی غزل میں تازگی کی فضا موجود ہے اور موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے:

پڑھنے کا شوق تھا مجھے اکثر دلوں کا حال
آئے نظر کے سامنے جیسے کتاب سے
اک وقت ہوگیا انھیں اٹھ کر گئے ہوئے
اب تک اس انجمن کی فضا عطر بیز ہے
آج ان پیڑوں سے پتے گر رہے ہیں ٹوٹ کر
دھوپ میں جن کے تلے جاکر ٹھہر جاتے ہیں لوگ

نظمیؔ صاحب ذات کے ایلیے پر بہت گہرائی تک سوچتے ہیں۔ اُن کی انانیت عصری ماحول سے ہم آہنگ نہیں۔ ہر صاحبِ دل اور حساس کردار کا یہی حال ہے لیکن نظمیؔ صاحب نے اسے بھی ایک سلیقے کے ساتھ نظم کیا ہے وہ اس موضوع پر برہم ہونے کے بجائے ایک تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کی یہ اعتدال پسندی نہ قدامت کو ہدفِ ملامت بناتی ہے اور نہ جدیدیت کی نفی کرتی ہے۔

نظمیؔ صاحب کا کلام انسانیت کے کرب اور زندگی کی تلخ سچائیوں کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے سہل الفاظ میں پُرتاثیر گفتگو کی ہے اور ان کی اس شعری گفتگو میں نئی معنوی فضا سانس لیتی نظر آتی ہے جو براہِ راست دلوں پر اپنے نقش مرتسم کرتی ہے۔

——— ظفر مرادآبادی

> **سہ ماہی لمحے لمحے (جگن ناتھ آزاد نمبر)**
> **مرتبین: حسیب سوز اور خان فہیم**
> **ضخامت: ۴۰۰ صفحات**
> **قیمت: ۸۰ روپے**
> ملنے کا پتہ: اُردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲۔
> دفتر لمحے لمحے، امام باڑہ، اعلیٰ پور، بدایوں (یوپی)

اردو ادب میں ایسے اہلِ قلم کم گذرے ہیں جو بیک وقت شاعر، ادیب، محقق اور اچھے انسان ہوں یہ تمام خوبیاں آزاد صاحب میں موجود ہیں۔ جہاں تک آزاد کی شاعری کا تعلق ہے اس میں ماحول کی سخت گیری کا شدید احساس ہے۔ دورِ حاضر کی جان لیوا فضا سے باہر نکلنے کی خواہش نے ان کی شاعری میں تڑپ اور حوصلہ مندی کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ جہاں ان کی شاعری ایک شاعر کے زخمی دل کی پکار ہے وہاں دورِ جدید کے انسان کی للکار بھی ہے۔

آزاد کی شعری و نثری تصانیف کو سامنے رکھتے ہوئے اردو شعر و ادب کو ان کی دین کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مختلف انجمنوں اور اداروں نے جو انھیں اعزازات سے نوازا ہے۔ اسے بجا طور پر ان کی گراں مایہ علمی ادبی خدمات کا اعتراف کہا جاسکتا ہے۔

"لمحے لمحے" کا جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبین نے نہایت سلیقے اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ یہ آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کی گوناگوں علمی ادبی کارگزاریوں کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد ایک عرصہ یہ شوشہ خوب چلا کہ غالب ہندوستان کے حصے میں آیا اور اقبال پاکستان کے حصے میں مگر آزاد کے قلم نے یہ ثابت کردیا کہ اقبال نہ صرف ہند و پاک کا ہے بلکہ ہر اس ملک کا ہے۔ جسے انسانیت سے پیار ہے اور جو کارزارِ حیات میں قوتِ علم و عمل کا جویا ہے۔

اس نمبر میں ہند و پاک کے صفِ اوّل کے ادیب، محقق اور شاعر شامل ہیں۔ سرِورق نہایت دل کش، کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے۔

——— دلیپ بادل

اُردو خبر نامہ

ایک شام دو افسانہ نگار

اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام ۳۰ ستمبر کی شام ۴ بجے مشہور افسانہ نگار حضرات قمراحسن اور پیام آفاقی کے ساتھ اکادمی کے کانفرنس روم میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی اور کلچرل پروگرام اور سیمینار سب کمیٹی کے چیئرمین دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی نے اس ادبی تقریب کے آغاز میں اپنی مختصر تقریروں میں اکادمی میں ہر ماہ کے آخری جمعہ کو کسی شاعر یا ادیب کے ساتھ ایک ادبی نشست کا اہتمام کیے جانے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمان افسانہ نگاروں کا تعارف پیش کیا۔ ابھی کسی فنکار کو اپنی تخلیق پیش کرنے کی دعوت نہیں دی گئی تھی اور کانفرنس روم باذوق سامعین سے فل ہوگیا تھا۔ پہلے قمراحسن صاحب کو افسانہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا ان کے افسانہ پڑھنے کے بعد پیام آفاقی صاحب نے اپنا افسانہ پیش کیا۔ دونوں افسانوں سے متعلق سامعین نے بہت سے تنقیدی سوالات کیے جن کے افسانہ نگاروں نے تسلی بخش جوابات دیے۔ ظفر پیامی صاحب نے دونوں افسانوں پر اپنا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ آخر میں سیکریٹری اُردو اکادمی نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نشست کے اختتام کا اعلان کیا۔

میری شاعری انسانی رُوح کا کرب ہے
اخترالایمان

"آج کا انسان کرۂ ارض سے باہر چلا گیا ہے۔ جتنی بڑی اور لامتناہی زندگی ہے شاعری بھی اتنی ہی بڑی ہونی چاہیے، شاعری کی تخلیق میں جو شخصیت کام کرتی ہے وہ شاعر کی جبلی شخصیت نہیں بلکہ اس کی نفسیاتی اور بسا اوقات اضافی شخصیت ہوتی ہے، اضافی شخصیت نہاد سے بنتی ہے۔ گزراں کو معانی پہنانے کی کوشش ہی فلسفہ شاعری اور ادب ہے، مگر یہ کرب ہی مسرت اور تخلیق کی روح ہے، اسی لیے میں نے اپنی شاعری کو 'انسانی روح کا کرب' کا نام دیا ہے۔ خلجان ان لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جنھیں آپ اہلِ فکر کہہ لیجیے یا شاعر۔" اقبال سمان یافتہ۔ شاعر اخترالایمان نے مہاراشٹر اُردو اکادمی کی جانب سے یکم اکتوبر ۱۹۸۸ء کو منعقد اعزازی تقریب میں بولتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مزید کہا: "ہم لوگ تقریروں کے بہت عادی ہو چکے ہیں زبان کے لیے حکومت اور دوسروں سے مدد مانگتے رہتے ہیں، اپنے آپ کو مستحکم اور تبدیل نہیں کرسکتے۔"

ڈاکٹر ظ۔ انصاری (نائب صدر مہاراشٹر اُردو اکادمی) نے استقبالیہ تقریر میں کہا "اخترالایمان کی شاعری بے سروسامانی کی شاعری ہے، زندگی کے گرم و سرد تنہائی کا عذاب اور کرب جھیلنے کے باوجود ان کا کردار مستحکم ہے، ایک چٹان کی طرح۔ اپنی شاعری میں انھوں نے دانستہ اجنبی اور نامانوس لفظوں کو برتا ہے اور ناتراشیدہ لفظوں کا استعمال کیا ہے، ان کے ہاں گزراں کا شدید احساس ہے مگر وہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔"

بنگلہ دیش سے آئی مہمان پروفیسر کلثوم بشر نے بنگلہ دیش کے ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے اخترالایمان کو مبارکباد پیش کی۔

مہاراشٹر اُردو اکادمی کے ادبی جریدے امکان (مراٹھی/اُردو) عصری ادب کا انتخاب کی رونمائی جناب اخترالایمان کے ہاتھوں ہوئی، انھوں

نے اکادمی کے اس اقدام اور رویّے کی تحسین کی۔ ممتاز مراٹھی ادیب کیشو میشرام نے اپنی تقریر میں کہا کہ مراٹھی امکان میں اُردو کی ۲۷ کہانیاں شریک ہیں، آسمانِ ادب کے ۲۷ ستارے ہیں اس طرح ہم دوسری زبان کو سمجھتے ہیں، انسانوں کو اور ان کے جذبات کو سمجھتے ہیں، قریب آتے ہیں، اُردو اکادمی نے جو کام کیا ہے وہ فی الحال اور کوئی نہیں کر رہا ہے، اکادمی اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

امکان کے کنوینر قاضی سلیم نے افسانے اور شاعری کے انتخاب کے تعلق سے کہا کہ پہلے پانچ سال کے ادب کا انتخاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مگر پھر وقت کی حد بندیوں کو پھیلا دیا گیا، بہ حیثیت مجموعی تمام اہم رجحانات اور ادیبوں کی نمائندگی ہو سکی ہے۔ غزل کو ہم نے آئندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے اسی طرح تنقید اور ڈرامے کو بھی ہم آئندہ پیش کریں گے۔ ادب کا یہ آدان پردان بہت ضروری ہے اس سے قومی یکجہتی کو فروغ ملتا ہے۔

گاندھی جینتی کے موقع پر منعقد اس جلسے میں پروفیسر یونس اگاسکر نے گاندھی جی اور ہندوستانی معاشرہ کی تشکیل نو اور شمیم طارق نے گاندھی جی کی لسانی پالیسی پر گفتگو کی۔

جلسے میں شہر کے بزرگ اور نوجوان اہم ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

(پریس ریلیز)

اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل پر سیمینار

اُردو کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ اُردو ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول ہیں وہاں نصابی کتب کی فراہمی اور ان کا معیار ترقیٔ اُردو کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ پھر یہ مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کیوں یا کیوں نہیں؟ یہیں سے اُردو کے روزی روٹی سے جڑنے کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کی سکندرآباد شاخ نے ۱۱ ستمبر ۸۸ء کو اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل پر غور وفکر کرنے کے لیے ایک مذاکرہ منعقد کیا جس کا افتتاح وزیرِ مملکت برائے صنعتِ پارچہ بافی جناب رفیق عالم نے کیا اور صدارت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر مسعود حسین خاں شیخ الجامعہ جامعہ اُردو علی گڑھ شریک ہوئے۔

جلسے کی ابتدا میں اطہر فاروقی صاحب نے جلسے کی غرض و غایت پر اظہارِ خیال کیا۔ اس کے بعد انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کی خدمات پر روشنی ڈالی اور تفصیل کے ساتھ اُردو کے مسائل پر پورے ہندوستان کے پس منظر میں عموماً اور یو۔پی کے پس منظر میں خصوصاً اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے بہت واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ اگر اگلے بیس سال بھی اسی طرح نکل گئے جس طرح آزادی کے بعد کے چالیس سال گزرے ہیں تو پھر اُردو کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ یو۔پی کی حکومت نے اُردو کو منظم طریقے پر قتل کیا ہے اور وعدوں کے سوا اُردو عوام کو کبھی کچھ نہیں دیا۔ خلیق انجم صاحب نے اس امر پر بھی زور دیا کہ اب اُردو والوں کو آپسی رسّہ کشی چھوڑ کر مثبت انداز میں عملی کام کرنے چاہئیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس بات پر زور دیا کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہی ہونی چاہیے۔ انھوں نے اس مفروضے کی تردید کی کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم زیادہ طاقت ور اور مؤثر ہے۔ انھوں نے کنیڈا سے آتے ہوئے ایک وفد کا حوالہ دیا جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے ملاقات کی تھی، اور جس کا ہندوستان آنے کا مقصد یہی بتانا تھا کہ دنیا کا سب سے مؤثر ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ اس وفد سے جب مسعود صاحب نے ملاقات کی تو مسعود صاحب نے ان سے سوال کیا کہ آپ مجھے کوئی ایسا ملک بتا سکتے ہیں جو آزاد ہو اور ابتدائی تعلیم وہاں کی آبادی کی مادری زبان میں نہ دی جاتی ہو۔ سربراہِ وفد نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ مسعود صاحب نے پھر پوچھا کہ کیا کناڈا، امریکا یا انگلینڈ میں کوئی خطّہ ایسا ہے جہاں بنیادی تعلیم کا ذریعہ انگریزی کے سوا کوئی دوسرا ہو؟ جب سربراہِ وفد نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا تو پھر مسعود صاحب نے ان سے پوچھا کہ پھر آخر آپ ہندوستان میں انگریزی کو کیوں ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس پر سربراہِ وفد سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اسے یہ کہنا ہی پڑا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم مؤثر نہیں بلکہ ایک ضرورت ہے۔

سیمینار کا پہلا مقالہ انجمن ترقی پسند مصنفین سکندرآباد کے جنرل سکریٹری شکیل احمد ایڈووکیٹ نے "اُردو ذریعۂ تعلیم اور ہمارے قومی اداروں کا کردار" کے عنوان سے پیش کیا، جو سیمینار کا سب سے متنازع مقالہ ٹھہرا۔ اور تقریباً ہر مقرر نے اپنی تقریر میں یہ تسلیم کیا کہ جن حقائق کا اظہار اس مقالے میں کیا گیا ہے ان کو نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا۔ شکیل صاحب نے بنیادی بحث
موجودہ سیاسی پسِ منظر اور حکومت کے کردار کو
لے کر کی۔ انھوں نے تلخ لہجے میں یہ بات بھی کہی کہ
اُردو کی تباہی کا سبب اُردو کی مفاد پرست قیادت
ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ
نے بھی اُردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ اتنا
ہی متعصبانہ ہے جتنا حکومت کا رویّہ۔ مقالے پر
بحث کرتے ہوئے اطہر فاروقی صاحب نے کہا کہ
مقالہ اچھا ہے مگر اندازِ بیان تلخ ہے۔ انجمن ترقیِ
اُردو (ہند) سکندرآباد کے صدر ڈاکٹر فطرت
انصاری نے کہا کہ میں شکیل صاحب کی اس بات
سے متفق ہوں کہ اُردو کا تحفظ بطورِ خاص مسلمانوں
کو کرنا ہے۔ مسلمانوں سے زیادہ جذباتی وابستگی
اس زبان سے کسی کو نہیں۔ اور جب جذباتی وابستگی
نہیں تو پھر تحفظ کی ذمّے داری بھی کسی اور پر نہیں
ڈالی جاسکتی۔ اس مرحلے پر بحث نے بہت شدید
رُخ اختیار کر لیا تبھی صاحبِ صدر پروفیسر جگن ناتھ
آزاد نے مداخلت کی اور کہا کہ وہ اب کسی کو بھی
(بہ مع مقالہ نگار) اس بحث میں حصہ لینے اور
وضاحت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

اگلی مقررہ بیگم سلطانہ حیات صاحبہ نے
یو۔پی اور دہلی میں انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کی خدمات
پر روشنی ڈالی اور کہا کہ حکومت تو اُردو کو دوسری
سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہتی ہے مگر حکومت
کے احکامات پر عمل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جناب
حیات اللہ انصاری نے بیوروکریسی کے متعصبانہ
رویّے کے متعلق اپنے ساتھ گزرے ہوئے چند
واقعات پر روشنی ڈالی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی
کے ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ ہمیں ذریعۂ تعلیم
کے مسائل پر تو غور کرنا ہے مگر اس سے پہلے اس
پر بھی اصرار کرنا ہے کہ آئینی طور پر اُردو کو اس کا
تحفظ کس طرح ملے۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کا تحفظ
ہوگا تو آئین ہی کے ذریعے مگر ہمارا آئین ایک
ایسی کھٹارا موٹر کار ہے جو کبھی بغیر دھکّے کے نہیں
چلتی اس لیے ہم اس زاویے کو کبھی فراموش نہیں
کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل جو غزل گائیکی
اور غزل شنوائی کا فیشن عام ہو رہا ہے اس
سے اُردو کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ کیوں کہ
کمرشیل سوسائٹی میں فیشن بہت تیزی سے بدلتے
رہتے ہیں اور کسی فیشن پر کسی زبان کے مستقبل کا
انحصار کرنا دانش مندی نہیں۔

یو۔پی کے وزیرِ محنت سعید الحسن صاحب
کی تقریر کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے سخت احتجاج
کرتے ہوئے کہا کہ یو۔پی میں مراعات کے ذریعے
اُردو کی قبر کھودی گئی ہے۔ انھوں نے اُردو عوام
سے ایک بار پھر گزارش کی کہ وہ باہمی اختلافات
کو ختم کر کے صرف اُردو کی خوشحالی اور بقا کے لیے
کوشش کریں۔ اس کے بعد مہمانِ خصوصی جناب
رفیق عالم صاحب نے کہا کہ اُردو ہماری تہذیب و
تمدّن کی اساس ہے۔ صدرِ محترم جناب جگن ناتھ
آزاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم نے یہ فرض کر لیا
ہے کہ اُردو صرف ادب کا نام ہے اور جو کچھ ادب
کے نام پر لکھا جا رہا ہے وہی اُردو ہے۔ جب کہ
اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل سائنس اور ٹیکنالوجی
معاشیات اور ریاضی کے میدان میں سب سے
زیادہ ہیں۔ ایک ادبی فن پارے کا ترجمہ سائنس
کے اصطلاحی مضمون کا ترجمہ کرنے سے کہیں زیادہ
مشکل کام ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم بعض
معاملات میں سیاسی حالات کے پیشِ نظر اُردو کے
معاملے کو غلط انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں
اُردو ضرور پڑھنی چاہیے مگر یہ کہنا کہ صرف اُردو ہی
پڑھنی چاہیے کوئی دانش مندانہ بات نہیں۔

اس کانفرنس میں درج ذیل قرار دادیں
پیش کی گئیں اور اتفاقِ رائے سے منظور ہوئیں۔

۱۔ اتر پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری
زبان کا مرتبہ دیا جائے اور وہی مراعات فراہم
جائیں جو حکومتِ بہار نے کی ہیں۔

۲۔ سہ لسانی فارمولے میں مادری زبان کی
بجائے سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر جنوبی ہند کی زبا
کو جو فوقیت دی گئی ہے، اسے ختم کیا جائے۔ اور اتر پر
کے ہر اسکول میں ایک اُردو اُستاد کا تقرّر کیا جائے

۳۔ ریاست کی جن تحصیلوں اور بلدیاتی علاقو
میں اُردو آبادی دس فیصد ہے وہاں اُردو میڈ
پرائمری اور سیکنڈری اسکول قائم کیے جائیں۔

آخری قرار داد امان اللہ خالد صاحب
نے پیش کی جس میں کہا گیا کہ انیسویں صدی کے
اہم فارسی شاعر منشی ہرگوپال تفتہ جن کو مرز
تفتہ کہا جاتا ہے کے مکان کو حکومت اپنی تحویل
میں لے کر اس میں ان کی یادگار قایم کرے۔ انھ
نے اس بات کا بھی پر زور مطالبہ کیا کہ ہندوستا
کی قدیم لائبریری جو ایم۔ ایس۔ انٹر کالج سکندرآ
میں موجود ہے اس کی کتابوں کی فہرست حکومت
اپنے نمائندے کی نگرانی میں مرتّب کرائے کیوں
لائبریری کئی سال سے بند ہے۔ اور اسے گرلز ر
بنا دیا گیا ہے۔ لائبریری کی کتابیں وقتاً فوقتاً ردّ
میں بیچی جاتی ہیں۔ اس قرار داد کا ڈاکٹر خلیق انجم
پرتپاک استقبال کیا اور یہ بھی یقین دلایا کہ وہ اس
معاملے کو اعلا سطح پر حکومت کے سامنے رکھیں گے۔

(محمد مقصود جالب

سیمینار "شعرائے جے پور"

۱۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کو راجستھان اُردو اکاد

اور بزمِ رنداں جے پور کے تعاون و اشتراک سے "جے پور کے شعرا" موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت راجستھان یونیورسٹی جے پور کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ بی ماتھر صاحب نے کی۔ بزمِ رنداں کے سیکریٹری جناب نظور بہاری ناگ نے بزمِ رنداں کا تعارف کراتے ہوئے سیمینار کے انعقاد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سیکریٹری راجستھان اُردو اکادمی جے پور نے اپنے والدِ مرحوم مولانا احترام الدین شاغل کے تحریر کردہ حالاتِ مرزا مائل مرحوم پڑھ کر سُنائے۔ جناب پرکاش جوہری نے منشی چاند بہاری لال صبا، جانشین مرزا مائل پر ایک طویل نظم پڑھی اور صبا صاحب کے صاحبزادے منشی اودھ بہاری لال ماتھر نے صبا صاحب کے حالات اور کلام پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے پنڈت چاند نرائن مہر تیکو اور مولانا کوثر پر اپنا مقالہ پڑھا۔

دوسری نشست میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیاز نے الحاج مولانا سید انوار الرحمٰن بسمل مرحوم پر اپنا مقالہ پیش کیا جس میں بسمل صاحب کی ۱۹ مطبوعہ نثری تصانیف کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی۔ جناب نظور بہاری ناگ صاحب نے منشی مانگی لال تجلی تلمیذ حضرت آگاہ دہلوی کی شخصیت اور شاعری پر اپنا مقالہ پڑھ کر سُنایا۔

آخر میں صدرِ جلسہ پروفیسر ایم۔ بی۔ ماتھر نے مقالات پر اظہارِ خیال کیا اور کہا کہ اس قسم کے سیمیناروں کی آج ضرورت ہے اس کے بغیر ادبی تاریخ کے پوشیدہ پہلو سامنے آنا ممکن نہیں ہیں آج کے دور میں مائیکرو ہسٹری کا رُجحان پھیل رہا ہے اُردو ادب کی مائیکرو ہسٹری مرتب کرنے کے لیے ایسے سیمینار بہت ضروری ہیں۔

(پریس ریلیز)

اُردو شاعری میں سانحہ کربلا

انجمن ترقی پسند مصنفین کانپور کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ "اُردو شاعری میں سانحہ کربلا" کے موضوع پر سید علی رضا حسینی کی صدارت میں منعقد ہوا بحث کا آغاز کرتے ہوئے نامی انصاری نے کہا کہ سانحہ کربلا ایک ایسا استعارہ ہے جو جدید شاعروں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ قدیم شعرا نے بھی اس استعارے کو مسلسل استعمال کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جدید شعرا نے اس کو آج کے حالات کے تناظر میں شعوری طور سے استعمال کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کربلا کو علامت بنا کر جو شاعری کی جا رہی ہے کہیں یہ آج کے جدید شعرا کی انفعالی کیفیت کا نتیجہ تو نہیں! اس لیے کہ آج کی شاعری میں جہد و استقلال کے بجائے مایوسی اور شکست خوردگی کے عناصر زیادہ نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ عارف محمود نے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ آج کی شاعری میں شکستِ ذات کا المیہ ضرور ملتا ہے مگر اسے انفعالی کیفیت کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ حسن عزیز کا خیال تھا کہ اس طرح کی علامات کے استعمال سے شکستگی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس سے جرأت، حمیت، صبر، استقلال اور ایثار کا درس ملتا ہے۔ وزیر حسن نے خیال ظاہر کیا کہ کربلا کے عظیم کرداروں سے ہمیں نہ صرف روشنی ملتی ہے بلکہ اس سے عزم و حوصلہ کا پیغام بھی ملتا ہے۔ تسکین زیدی نے کہا کہ نئے شعرا کو ایک ایسے موضوع کی ضرورت تھی جو ان کے عہد کے مسائل سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور جس کے وسیلے سے وہ اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کر سکیں۔ اسی لیے آج کے شعرا کے یہاں اس قسم کے استعاروں کا چلن زیادہ ہے۔ ابوالحسنات حقی کی رائے تھی کہ سانحۂ کربلا جدید شاعروں کے سامنے ایک ایسی علامت بن کر آیا جو انسانیت کی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ انھوں نے خود اپنے اور دوسرے شعرا کے اشعار سے مثالیں پیش کر کے اپنی بات کی وضاحت کی۔

آخر میں صدرِ جلسہ سید علی رضا حسینی نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان واقعات اور ان کے نتائج میں جو وسعت اور آفاقیت ہے اس نے ہر دور کے شعرا کو متوجہ کیا ہے۔ جدید غزل گو شعرا نے بھی اس پس منظر میں اشعار کہے ہیں اور اس طرح ظلم و ستم، جبر اور استحصال کے خلاف احتجاج کی لَے کو تیز کیا ہے۔

جلسے کے اختتام پر عتیق حنفی سے سانحۂ ارتحال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ جدید نظم گو شعرا کے سرخیل تھے۔ خاص کر ان کی طویل نظمیں 'سندباد' اور 'صلصلۃ الجرس' اُردو نظم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ شرکا جلسہ نے پربھان شنکر سروش اور شمسی مینائی کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ دونوں شاعر ہماری اس رنگا رنگ تہذیب کے نمائندے تھے، جس کے نقوش اب روز بروز مدھم پڑتے جا رہے ہیں۔

(تسکین زیدی)

وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت سے درخواست

ہم اراکین بزمِ افسانہ اور تمام اُردو دوست

حضرات آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ دوردرشن کے گوناگوں دلچسپ پروگراموں اور خصوصیت سے نیشنل پروگرام میں اُردو پروگرام کے نہ ہونے سے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اب جب کہ دُوردرشن کے ٹیلی کاسٹ پوری طرح مستحکم ہوچکے ہیں اور نہ صرف بھارت بلکہ پڑوسی ملکوں کے عوام میں بھی مقبولیت پاچکے ہیں نیشنل پروگرام کے تحت اُردو پروگرام اور اُردو میں خبریں نشر کرنا اب ناممکن نہیں رہا ہے۔

ہمیں پوری اُمید ہی کیا بلکہ یقین ہے کہ آپ اُردو داں طبقے کے جذبات، احساسات اور خواہشات کو ملحوظ رکھ کر بہت جلد دُوردرشن پر نیشنل پروگرام کے تحت اُردو میں خبروں کے ساتھ ساتھ دوسرے پروگرام بھی شامل فرمائیں گے تاکہ اُردو بولنے اور سمجھنے والے (جن کی تعداد پورے بھارت میں ہے) اپنے ملک اور بیرونی ممالک کے حالات سے بخوبی واقف ہوسکیں اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے سکیں۔

اس معاملے میں آپ کی بروقت کارروائی بھارت کے اُردو داں طبقے کے لیے باعثِ خوشی و تشکّر ہوگی۔

(ایوب اثر)

جوشؔ ملسیانی ایوارڈ

ساہتیہ منچ جالندھر کی طرف سے ہر سال جوشؔ ملسیانی ایوارڈ اُردو شاعر اور نثرنگار کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایوارڈ میں ۲۱۰۰/- روپے کی تھیلی، ایک شال اور ایک سرٹیفکیٹ شامل ہوگا ساہتیہ منچ کے صدر جے۔ سی۔ ودیدیہ کے مطابق یہ ایوارڈ پنجاب کے مشہور شاعر ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی کی یاد میں شروع کیا جارہا ہے۔ جوشؔ صاحب کے شاگرد جناب ساحرؔ ہوشیارپوری جو ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ ادیبوں کو پہلا جوشؔ ملسیانی ایوارڈ پیش کریں گے۔ ساہتیہ منچ کی طرف سے ایک ادبی کمیٹی کی بھی تشکیل کی جائے گی۔ اس کمیٹی میں اُردو کے شعرا، نثرنگار اور نقاد شامل ہوں گے۔ ساحرؔ ہوشیارپوری اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔ اس تقریب پر ایک کل ہند مشاعرہ جالندھر میں منعقد کیا جائے گا۔ اس میں ہندوستان کے مشہور شعرا کے علاوہ پنجاب کے کلاسیکی اور جدید شاعر بھی شرکت کریں گے۔

(روزنامہ پرتاپ، جالندھر)

شبِ افسانہ

۶؍ اکتوبر ۸۸ء کی رات صولت پبلک لائبریری رامپور میں شبِ افسانہ کا پروگرام منعقد ہوا۔ جس میں رامپور و بیرونِ رامپور کے افسانہ نگاروں نے حصّہ لیا۔ اور اپنے منتخب افسانے سُنا کر اہلِ ذوق حضرات سے داد حاصل کی۔ شبِ افسانہ پروگرام میں کلکتہ سے آئے ہوئے مہمان جناب آس محمد صاحب نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔ صدارت جناب وصی اقبال اور جناب مسرت حسین خاں آزادؔ نے کی۔ اور نظامت کے فرائض آل احمد خاں سرورؔ نے انجام دیے۔

(آل احمد خاں سرور)

افسانوی و شعری مقابلہ

گزشتہ برس کی طرح اس سال بھی سرسید ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی رامپور کی جانب سے ایک آل انڈیا افسانوی و شعری مقابلہ منعقد کیا جارہا ہے۔ اس مقابلے میں بہترین افسانے پر ایک ہزار روپے نقد اور بہترین نظم پر بھی اتنا ہی انعام دیا جائے گا۔ کچھ دوسرے پسندیدہ افسانوں اور نظموں پر بھی انعامات دیے جائیں گے۔ تفصیلات درجِ ذیل پتے سے حاصل کی جاسکتی ہیں:

ایس۔ فضیلت، منیجر سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی، راجہ وارہ روڈ، ہیڈ پوسٹ آفس، رامپور (یو۔پی)

رئیس امروہوی اور اختر انصاری نہیں رہے

برِصغیر ہند و پاکستان میں یکساں طور پر مقبول شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی رئیسؔ امروہوی کے سانحۂ ارتحال کی خبر سے اُردو کے ادبی حلقوں میں سوگواری کی فضا طاری ہوگئی۔

ان کا ۷۴ برس کی عمر میں کراچی میں پُراسرار حالات میں انتقال ہوا تھا۔ اس حادثے کی خبر ملنے پر اُردو اکادمی دہلی کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں اکادمی کے اراکین اور اسٹاف نے ان کے انتقال پر دِلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے درجِ ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی:

قرارداد

دہلی اُردو اکادمی، دہلی انتظامیہ کے اراکین اور اسٹاف کا یہ جلسہ برِصغیر کے نامور شاعر، ادیب اور صحافی جناب رئیسؔ امروہوی کے سانحۂ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور نظم و غزل اور قطعات و رباعیات پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تقریباً گذشتہ نصف صدی سے حالاتِ حاضرہ پر

روزانہ ایک قطعہ لکھ رہے تھے۔ ان کے کلام کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے انھوں نے مختلف موضوعات پر مُسلسل کالم لکھے ہیں۔ انھیں ادب شاعری اور صحافت کے علاوہ نفسیات، رمل علم اعداد سے بہت دلچسپی تھی، جن پر انھوں نے بہت مضامین لکھے ہیں۔

رئیس امروہوی مرحوم ہند و پاک دوستی کے بہت بڑے مبلغ تھے انھوں نے پاکستان میں ہند و پاک پریم سبھا کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی چند سال پہلے وہ دہلی تشریف لاتے تھے اس وقت بھی انھوں ہر جگہ اپنی تقریر میں ہند و پاک کی دوستی کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ وہ ہماری قدیم تہذیب کی علامت تھے ان کے انتقال سے ہماری تہذیب کا ایک دور ختم ہو گیا۔

یہ جلسہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے اعزا کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور ادیب جناب اختر انصاری کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی میٹنگ دفتر اُردو اکادمی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں اکادمی کے سیکریٹری جناب سید شریف الحسن نقوی، ڈپٹی سیکریٹری جناب بی۔ ایس۔ گیرا اور اسٹاف کے جملہ اراکین نے شرکت کی۔ میٹنگ میں مرحوم کے لیے ایصال ثواب کی دعا کی گئی اور مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ آخر میں دو منٹ کی خاموشی کے بعد سیکریٹری صاحب نے باقی وقت کے لیے اکادمی کے دفتر بند کرنے کا اعلان فرمایا۔

قرارداد

ہم اُردو اکادمی دہلی کے جملہ اراکین جناب اختر انصاری کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے اور زندگی بھر اُردو زبان و ادب کی خدمت میں منہمک رہے۔ آپ نے غزلیں بھی لکھیں، قطعات بھی اور افسانے بھی لیکن ان کی پہچان ان کے قطعات سے تھی جن میں موصوف کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

ہم خدا کے حضور دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جملہ متعلقین کو صبر سے نوازے۔

[ان دونوں مرحوم شعرا کے فکر و فن پر تفصیلی مضامین عنقریب شائع کریں گے]

بقیہ

ہم طرح اشعار

مل بھی جائے حیاتِ خضر تو کیا
زندگی کس کو راس آئی ہے (طالب اکولوی)

مرسلہ: عبدالکلیم اختر، اکولہ

کیوں نہ مجھ پر نثار ہوں خوشیاں
آپ کے غم سے آشنائی ہے (کوثر ساگری)

مرسلہ: محمد مظفر خاں، بھوپال

یاد جب بھی تمھاری آئی ہے
دردِ غم اپنے ساتھ لائی ہے (نامعلوم)

مرسلہ: کمال اختر کمال، بدایوں

شب کہاں جاؤ گے اندھیرے میں
مِسّی ہونٹوں پہ کیوں جمائی ہے (منظور)

مرسلہ: محمد واعظ الحق حکیم، صاحب گنج

پاؤں آنکھوں سے اُس کے سہلانا
خوب خدمت یہ ہاتھ آئی ہے (منظور)

مرسلہ: حُسن حنا عرف رانی، صاحب گنج

دست رس تیرے پاؤں تک ہے اسے
خوب مہندی یہ رنگ لائی ہے (منظور)

مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیا، صاحب گنج

ہم نے عزم و عمل کے تیشے سے
اپنی تقدیر خود بنائی ہے (نور اندوری)

مرسلہ: ایم صابر کریم محمد شاکر حسین شاکر، صاحب گنج

ان کے نالوں کی حیثیت ہی کیا
جن کو احساسِ نارسائی ہے (شارق جمال)

مرسلہ: ظفر راہی جونپوری، ناگپور

اُمڈے آتے ہیں اشک آنکھوں میں
یاد کیا پھر کسی کی آئی ہے (محمود الحسن محمود)

مرسلہ: کماری نیلیم چودھری، صاحب گنج

کس کو سمجھیں ہم اپنا اے گوہر
دشمنِ جاں ہمارا بھائی ہے (گوہر فرخ آبادی)

مرسلہ: انصار زبیر اعظمی، مالیگاؤں

آئندہ شمارہ ابوالکلام آزاد نمبر ہوگا جن میں صرف مولانا آزاد کے بارے میں تحریریں ہوں گی۔ اس لیے اس مہینے ہم طرح اشعار کے لیے کوئی مصرعہ نہیں دیا جارہا ہے۔ نمبر کے بعد یہ سلسلہ انشاء اللہ پھر شروع کردیا جائے گا۔

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اگست ۱۹۸۸ء میں "سرودِ رفتہ" کے تحت ذوق کی جو غزل دی گئی ہے اس کے کئی اشعار کے متن میں تصرف کر لیا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد کے دیوانِ ذوق سے استفادہ کرتے ہوئے ملک محمد عنایت اللہ مرحوم (پروفیسر فارسی مشن کالج لاہور) نے دیوانِ ذوق مع قصائد (و شرح) کا جو نسخہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا اس میں اس غزل کے ان چند اشعار کا متن یہ ہے جن میں تصرف کیا گیا ہے:

ایوانِ اُردو :

ہے ان کا سادہ پن بھی تو اک بانکپن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی تو ہے کیا کیا پھبن کے ساتھ

تیرے قصورِ قدِ رعنا میں آج ہم
کیا کیا پٹک کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

دستِ جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کرے تو
ٹکڑے اُڑا دے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

دیکھا نہ گل سے نکہت گُل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں اُلفت وطن کے ساتھ

مشکل ہے ذوقؔ قیدِ تعلق سے چھوٹنا
جب تک کہ رُوح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

دیوانِ ذوق مرتبہ عنایت اللہ :

ہے ان کی سادگی بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں!
کیا کیا پٹک کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں!!
ٹکڑے اُڑا دے جسم کے تو پیرہن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہتِ گُل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں اُلفت وطن کے ساتھ

ممکن نہیں ہے ذوقؔ علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ رُوح کو ہے تعلق بدن کے ساتھ

اسی طرح ستمبر ۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرودِ رفتہ میں غالبؔ کی غزل کے شعر نمبر ۷ میں مصرعِ اولیٰ کے آخری الفاظ "دلِ ناداں" ملتے ہیں جبکہ نسخۂ عرشی میں "دلِ نالاں" لکھا ہوا ہے۔[1]

"ایوانِ اُردو دہلی" جولائی ۱۹۸۸ء میں "فیض اور اختر شیرانی" کے تحت جناب اکبر علی خاں نے یقیناً فیض کی افہام و تفہیم کے لیے ایک نیا زاویہ دیا ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اختر شیرانی سے اپنے نیازمندانہ تعلقات کے ذکر کے باوجود فیضؔ نے کہیں بھی اس کا اعتراف اس لیے نہیں کیا کہ اختر شیرانی ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی کے مخالف تھے۔ جناب خلیل تنویر نے "غالباً" کی پناہ گاہ سے اپنے ۱۵ر جولائی ۸۸ء کے مکتوب (ایوانِ اُردو دہلی ستمبر ۸۸ء) میں اس ضمن میں جو کہا ہے وہ "کاتا اور لے دوڑی" کے مترادف ہے۔

اختر شیرانی نے اپنے مضمون (ایوانِ اُردو دہلی ستمبر ۸۸ء) میں "زندگی" کو اپنی نظر سے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھیں اس کا حق ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ اقبالؔ بھی ان کی نظر سے زندگی کو دیکھیں، اب چونکہ وقت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا
کہ کون کس منزل میں ہے۔ اس لیے اس موضوع بحث
سے احتراز کرتے ہوئے صرف دو باتیں عرض کر
چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ اختر شیرانی (اور ان کے
ہم خیال طبقہ) اقبالؔ سے جس "حرفِ دلآویز" کو
کے لیے بے تاب تھا۔ وہ اقبالؔ کے پاس موجود تھا
شیریں کی شکل میں۔ مگر وہ اپنے "حرفِ شیریں"
ترجمانِ انسانیت بنا چکے تھے جبکہ اختر شیرانی
کسی کے جسمِ حریری کو اپنے آغوش میں لے کر، اس
روئے نازنیں اور سرمئی کاکل سے کھیلنے کی "تمنا"
اپنا آرٹ قرار دے لیا تھا۔ اب یہ بات دوسری
کہ "شاعری کے افادی مقصد" سے دانستہ کنارہ کش
کے باوجود اختر شیرانی کی کئی نظمیں افادیت کی
دوسری بات یہ کہ اختر شیرانی ادب میں افادیت
آج کی ترقی پسندی کو مغربی فیشن کی تقلید
زیادہ اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ وہ سمجھتے ہیں
ترقی پسندیت کو "مغربی عقل و فراست کے خز
سے اسی طرح چرایا گیا ہے جس طرح کئی اور عقید
رسمیں اور رواج ان کے ہاں سے ہم نے چرائے
یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مغربی عقل و فراس
کے خزانوں سے چرائے ہوئے مال میں کیا اختر شی
کے عقیدۂ شاعری کی نشاندہی کی جا سکتی ہے یا
اور کیا ان کی شاعری میں "معجونِ شباب آور"
محرکات ملتے ہیں یا نہیں؟

——— وہاب تسنیم

[1] ذوقؔ کی اور غالبؔ کی غزلیں بالترتیب ڈاکٹر تنویر
علوی اور مالک رام صاحب کے مرتبہ دواوین سے لی گئی

———

○ ستمبر کا "ایوانِ اُردو دہلی" ملا۔ اپنی کہ
"خوابوں کی سرزمین" کی اشاعت کے لیے

مشکور ہوں۔ واقعی اب ایمان پختہ ہوگیا کہ تخلیقات کے انتخاب میں نئے اور پُرانے قلمکاروں میں آپ امتیاز نہیں برتتے بلکہ صرف تخلیق کو فوقیت دیتے ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ بھی حسبِ روایت اِک جہانِ لفظ و معنی ہے۔ اختر شیرانی کی تحریر "زندگی میری نظر میں" اقبال اور فیض کے حوالے سے بحث کے نئے دروازے کھول سکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اقبال جیسی عہد آفریں شخصیت کو زاویوں کے حصار میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ عین تابش کا مضمون "خواجہ احمد عباس ــ تصویر کا تیسرا رُخ" اچھی کوشش ہے۔ مگر خواجہ صاحب کی تصویر کا ایک چوتھا اور نمایاں رُخ اُن کا فلمکار ہونا بھی ہے جو کسی بھی طرح صرفِ نظر کے قابل نہیں ہے۔

ـــــ رضی احمد تنہا، پورنیا

○ خلیل تنویر کے خط کے ساتھ شائع شدہ اختر شیرانی کا مضمون ایسا ہے کہ اسے آج کے شعرا کو پڑھنے کی تاکید کی جائے۔

مظاہر صاحب کا خط قابلِ مطالعہ ہے۔ اس سے قبل راحت اندوری اور بشیر بدر کی سرقہ بازی کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔

آخر میں آپ کو ایک رائے دینا چاہتا ہوں اگر آپ بہتر سمجھیں تو . . . . وہ یہ کہ آپ ہر رسالے میں ایک ہی شاعر کی جو دو یا تین غزلیں دیتے ہیں اس کی جگہ ایک غزل دے کر۔ دوسری غزل کی جگہ پر کسی اُبھرتے ہوئے شاعر کو موقع دیں اس سے نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور انھیں ادب کی خدمت کرنے کا شرف حاصل ہوگا۔

ـــــ ذہین حیدر دلکش، وارانسی

○ رسالہ "ایوانِ اُردو" ستمبر ۸۸ء پیشِ نظر ہے۔ سرورق خوبصورت ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس عمارت کی یہ تصویر ہے؟ کیا کچھ اشارے بل سکتے ہیں یا مبہم رکھنے ہی میں حُسن ہے؟

کہہ کے کچھ لالہ و گُل رکھ لیا پردہ مَیں نے

آپ کے اس رسالے میں جناب حیات اللہ انصاری کا افسانہ 'اندھیرا اُجالا' شاید بزرگ محترم کی ساری زندگی کے مشاہدے اور تجربے کا نچوڑ ہے۔ بہت ہی فنی مہارت اور چابکدستی سے اس افسانے کے تانے بانے تیار کیے گئے ہیں۔ سدھو کی مہارت سے زیادہ بزرگ محترم کی مہارت اور فنی پختگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

خاص طور پر سدھو کی جیب تراشی کے دو نمونے تو حاصلِ افسانہ ہیں۔ ایک تو بس میں سیٹھ جی کی موٹی رقم اُڑانے کا منظر اور دوسرے سنیما ہال میں قیمتی ہار کے اُڑانے کی پلاننگ۔ دونوں جیب تراشی کے عمدہ نمونے ہیں۔ قوتِ مشاہدہ کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ انصاری صاحب کے ذہنی کیمرے نے عمدہ کلوز اَپ پیش کیا ہے۔ مَیں نے یہاں اپنے ایک ماہر جیب تراش دوست کو یہ افسانہ پڑھنے کے لیے دیا، انھوں نے بھی ان دو واقعوں کی بڑی تعریف کی اور اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ دونوں واقعات جیب تراشی کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں چنانچہ اس افسانے کی وجہ سے یہاں کے جیب کتروں نے اس افسانے کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور فخر محسوس کرتے رہے کہ ان کے پیشے کو بھی ادب میں بلند جگہ ملی ہے اور ملتی رہے گی۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جیب تراشی کا فن عالمگیر فن بن گیا ہے اور اس کے لیے بڑے وِٹس اینڈ گٹس (Wits and Guts) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بھی ٹیکنکل تعلیم دی جاتی ہے۔ نفسیات بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستان اس فن میں ابھی بہت پیچھے ہے۔

افسانہ 'اندھیرا اُجالا' میں بزرگ محترم نے افسانے کی فضا کی مناسبت سے شراب نوشی، رنڈی بازی، اغلام بازی۔ لڑکی کا اغوا، عورتوں کا دوسرے مردوں کے ساتھ بھاگنا۔ اسقاطِ حمل وغیرہ کا ذکر کر کے سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔

اس طرح کے افسانے جن کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے۔ منظرِ عام پر آنے چاہئیں جیسے حجام، اسمگلر، گداگر، ہیجڑے وغیرہ وغیرہ۔

رسالے کے دوسرے فن پارے بھی دلکش اور دلچسپ ہیں۔

ـــــ سیّد محی رضا، بمبئی

لہ یہ جیسلمیر (راجستھان) کے ایک قدیم محل کی تصویر تھی۔ (ادارہ)

○ ستمبر کے شمارے میں جناب عین تابش کا مضمون "خواجہ احمد عباس۔ تصویر کا تیسرا رُخ" ایک اچھا مضمون ہے۔ لیکن یہ کیا صاحب کہ جگہ جگہ انگریزی کی بھرمار ہو، موصوف کو اس کا ترجمہ کر دینا چاہیے تھا تاکہ مجھ جیسے انگریزی سے نابلد قارئین کی رسائی آسانی سے ہو جائے۔ "ڈھلتی عمر اور اس کے تقاضے" بھی ایک اچھا مضمون ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے جو دفاعی تدابیر تحریر کی ہیں وہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں! افسانہ "اندھیرا اُجالا" طویل ہوتے ہوئے بھی آغاز سے خاتمہ تک قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ حبیب کیفی صاحب کا افسانہ 'ادھار' بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ آج کے سماج میں جیتے جیتے کمزور، لاچار اور مجبور شخص کو نوچنے کھسوٹنے والا کمل بھائی ہر جگہ موجود ہے نہ جانے اس کا خاتمہ کب ہوگا! حبیب کیفی نے جگہ جگہ علاقائی زبان کا استعمال کر کے افسانے کو اور خوبصورت بنا دیا ہے۔

ـــــ فردوس گیاوی، گیا

○ ہم طرح اشعار کے کالم میں آپ کی یہ تبدیلی کہ جس شاعر کا مصرعہ ہوگا اس کی غزل کا کوئی شعر

شریک مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔ پسند آیا صفحہ ۴۴ کے کالم دو پر غالباً کاتب کے سہو کی وجہ کر غالب کا یہ ٹکڑا "شمعیں دو فروزاں" چھپ گیا ہے جبکہ صحیح اس طرح ہے "دو شمعیں فروزاں"[1]۔

صفحہ ۵۷ پر اگر مظاہر حسین وارثی کے بیان کو درست مان لیا جائے تو "ایوانِ اُردو دہلی" کی ساکھ کو دھچکا لگے گا۔ سرقہ کی اوقات ایک شعر یا کم سے کم ایک غزل کی ہوتی ہے۔ مظاہر صاحب کے بیان کی روشنی میں تو ایسا محسوس ہوا کہ پورا کلام سرقہ ہے کیونکہ ۸ شعر میں ۴ شعر میں سرقہ بتایا گیا ہے میر مغال سا میر قزلباش کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیے۔

——— پروفیسر اختر پرویز، آسنسول

[1] دیوان غالب کے بعض نسخوں میں "شمعیں دو" ہی ملتا ہے۔ (ادارہ)

○ میں "ایوانِ اُردو دہلی" کے سلیم الطبع اور باذوق قارئین سے مخلصانہ گذارش کرتا ہوں کہ کسی غزل، نظم، کہانی، افسانے، مضمون کو پسند فرماتے وقت وجہ ضرور تحریر کریں[1] جس سے مختلف آرا کا پتہ چل سکے گو کہ یہ کام وقت طلب اور کچھ مشکل ضرور ہے لیکن نئے قلم کاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ جس سے نئے قلم کار حضرات آپ کی پسند، ذوق اور معیار کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تخلیقی قوت کو اُبھار سکیں گے۔

ادارے سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ انہیں خطوط کو شائع کرے جن میں کچھ ٹھوس بات کہی گئی ہو یا تفصیلی تبصرہ ہو۔

——— ارشاد احمد، طہرہا سیوان

[1] قارئین ضرور توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" ستمبر کے شمارے میں آخری صفحے پر "ایک دوست کی جدائی" پڑھ کر دل بھر آیا۔ عمیق حنفی مرحوم نہ صرف یہ کہ اہم شاعر اور اچھے انسان تھے بلکہ وہ بہت اچھے منتظم اور عمدہ براڈکاسٹر بھی تھے۔ ان سے میری ذاتی ملاقات ۱۹۶۹ء سے شروع ہوئی تھی جب میں ریڈیو میں نہیں تھا۔ جب پروگرام ایگزیکیٹو کا انٹرویو دینے ۱۹۷۴ء میں دلی گیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ اور لگا کہ میں اور عمیق حنفی بہت دور دور نہیں رہے۔ ان کا خلوص ان کا پیار، ایک دوسرے کے لیے Concern وہ چیزیں تھیں کہ بھلائے نہ بھولیں گی۔ جب وہ اسٹیشن ڈائریکٹر ہو گئے۔ (اور ترقی کر کے وہ سیلیکشن گریڈ اسٹیشن ڈائریکٹر ہوئے)۔ تب ان کو AIR Staff of Training Insti کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ انھوں نے سری نگر میں ایک اُردو پروگرام ورکشاپ منعقد کیا جس میں میں بھی بُلایا گیا۔ ان کے لیکچر کے درمیان میں نے کسی بات پر ایک بحث اُٹھائی۔ اور وہ بحث کسی طور ختم ہونے پر نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار انھوں نے اپنے اختیارات کا Veto استعمال کیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے ان سے اور کوئی سوال نہیں پوچھا اور نہ کسی نکتے پر بحث کی۔ میری خاموشی کا مطلب وہ سمجھ گئے۔ ورکشاپ کے بعد وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور بولے "دیکھو انیس رفیع اس وقت میں تمہارا دوست عمیق حنفی نہیں ڈائریکٹر بول رہا تھا۔ کلاس کی باتیں کلاس میں ہی ختم۔ بولو کل کا کیا پروگرام ہے۔ ہم لوگ Sight Seeing پر نکل رہے ہیں۔ دفتر کی Van جائے گی۔ تم تو بچوں کو لے کر آئے ہو ان کو بھی لے چلنا۔" میں نے کہا "مگر انتظام میں میری فیملی کا جانا مناسب نہ ہوگا" انھوں نے اصرار کیا "یہ دیکھنا میرا کام ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں کہ تم بچوں کو اس ٹرپ میں شامل کرو۔ ہر جگہ دفتر گیری نہ کرو۔" اور پورے Sight Seeing میں انھوں نے بچوں کا خاص خیال رکھا۔ ان سے آخری ملا
مارچ ۸۸ء دلی کی اُردو سروس میں ہوئی۔ معی
نے بتایا کہ عمیق حنفی صاحب تقریباً ایک گھنٹ
آپ کے منتظر ہیں۔ میں بھاگا بھاگا ان کی خد
میں حاضر ہوا۔ انھوں نے کہا "بھئی کل ہی
پاکستان کے دورے پر جا رہا ہوں۔ معلوم
آئے ہو۔ اس لیے تمہارا انتظار کر رہا ہوں" پھ
ساری باتیں ہوئیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ
آخری ملاقات ہو رہی ہے۔

——— انیس رفیع

○ ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" کو بغور اور دلچ
ساتھ پڑھتا ہوں۔ کیا آپ کے موقر جریدے میں
باتیں پوچھنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے
انھیں شائع نہیں کریں گے لیکن امید کہ غور
کریں گے[1]

۱۔ جب اُردو رسم الخط میں "ڑ" کی س
آواز کی صوت اور آہنگ موجود ہے تو اس کا
ایوانِ اُردو دہلی میں کیوں نہیں ہوتا۔ جیسے
اور رتن دیو، گنیش اور گنیش، نرمان، جنّ مر
سنت باٹی، گرامین بینک۔

۲۔ دہلی میں اُردو کے صرف چند گنے چنے
ہیں جو کہ جامعہ ملیہ میں ملتے ہیں اور دہلی یونی
میں ملتے ہیں اور وہی "مجاور" صاحبان "ایوا
دہلی" میں ملتے ہیں۔ نئے شاعر اور نئے ادی
موقع پا سکتے ہیں؟

۳۔ اُردو کے لیے دور درشن پر بزم کا سلس
ہے لیکن اس سلسلے میں آج تک کسی بھی عیسا
بھی پارسی کو متعارف نہیں کرایا گیا۔ جبکہ د
میں آل انڈیا کرسچین اُردو کانفرنس کا دفتر مو
ایک بہت ہی شاندار کرسچین اُردو کانفرنس

کیا آپ بھولتے ہیں کہ پارسی انجمن کا دفتر دہلی میں ہے؟ اگر آپ اُردو کے "مجاور" صاحبان سے ہٹ کر سوچیں تو میری بات صحیح ثابت ہوگی۔

——— اقبال فریدی، آگرہ

لے ہم آپ کا خط جُوں کا تُوں شائع کر رہے ہیں جو باتیں آپ نے پوچھی ہیں، ان کے سلسلے میں عرض ہے:

(الف) جب ایک زبان کا لفظ کسی دوسری زبان میں داخل ہوجائے تو اس کا تلفظ بھی بدل سکتا ہے اور بعض صورتوں میں مفہوم بھی۔ یہ لسانیات کا مسلمہ اصول ہے۔ ایسے بہت سے فارسی اور عربی الفاظ ہیں جو اُردو میں اپنے اصل تلفظ یا مفہوم کے ساتھ نہیں بولے جاتے اور اُردو میں انھیں اسی طرح دُرست مانا جائے گا جس طرح اہل اُردو انھیں استعمال کرتے ہیں۔ یہی صورت ان لفظوں کی بھی ہے جو آپ نے تحریر کیے ہیں۔ ہم انھیں جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھتے بھی ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔

(ب) دہلی صدیوں سے اُردو زبان و ادب کا مرکز ہے۔ اسے کچھ گنے چُنے 'مجاوروں' کا دیار کہنا طعنے طن کی انتہا ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" پر بھی یہ الزام کوئی غیر جانبدار شخص شاید ہی لگا سکے کہ اس میں نئے ادیبوں اور شاعروں کو جگہ نہیں دی جاتی۔ جیسا کہ خود آپ نے کہا ہے اگر آپ اس رسالے کو بغور اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں تو آپ کو بھی یہ الزام عائد نہیں کرنا چاہیے۔

(ج) دُور درشن والوں کا طریق کار کیا ہے اس کی بہتر وضاحت تو وہی کر سکتے ہیں لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ادب کو قومیتوں یا فرقوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جوشؔ ملیح آبادی صاحب کا یہ شعر شاید آپ نے کبھی پڑھا یا سُنا ہو:

ادب، ادب ہے، ادب کا نہیں کوئی مذہب
خُدا کے فضل سے یہ کُفر ہے نہ یہ اسلام

——— (ادارہ)

○ یہ خط "ایوانِ اُردو دہلی" اکتوبر ۸۸ء (آپ کی رائے) کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔

خورشید اکبر صاحب نے اپنے ایک خط میں اس بات کو محسوس کیا ہے کہ مَیں لفظ شجاع کو 'مفاع' کے بجائے 'مفا' کے وزن پر بھی باندھتا ہوں' اور یہ کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ اکبر صاحب نے لفظ بھی سے یہ تو یقین مجھے دلا دیا کہ انھیں علم ہے کہ مَیں کبھی کبھی اور کہیں کہیں ایسا کرتا ہوں اب رہی ضرورت کی بات تو اس کے لیے وہ میری تازہ کتاب "مصرعِ ثانی" کے صفحہ ۸۳ ملاحظہ کریں، ضرورت مَیں نے صاف اور واضح فوٹ نوٹ میں بیان کی ہے جہاں تک لفظ 'شجاع' کی صحت کی بات ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کی صحت تحریر کے ماحول میں کچھ ہوتی ہے اور گفتگو میں کچھ۔ ایسے الفاظ کی صحت اوّل الذکر ماحول میں خورشید اکبر جیسے ذی علم صاحبان انشاءاللہ ہمیشہ محفوظ رکھیں گے نئی گفتگو اور شاعری کا معاملہ مجھ جیسوں پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔

——— شجاع خاور، نئی دہلی

○ اکتوبر کے شمارے میں سائنس اور ٹیکنالوجی ادب اور موسیقی کے ساتھ سوریہ مندر اور شہد کی افادیت پر مضامین شامل کرکے آپ نے رسالے کی انفرادیت میں اضافہ کیا ہے۔ غزلوں میں علقمہ شبلی، شباب للت، خورشید احمد بسوانی، اختر حسین اور عمران عظیم متاثر کرتے ہیں۔ رسالے کے مستقل کالم بھی کم متاثر کن نہیں۔

——— مہدی پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اکتوبر ۸۸ء کے شمارے کا اداریہ "حرفِ آغاز" نظر سے گذرا، مَیں شکر گذار ہوں کہ آپ نے حرفِ آغاز کے ذریعہ اُردو تحریک پر بحث کا آغاز کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

اداریے میں بہت سے نکات ایسے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے تاکہ قارئین کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی آجائے۔

۱۔ آپ نے مشاعروں کی افادیت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان میں شرکت کی بدولت بہت سے غیر اُردو داں بھی اُردو کے قریب آجاتے ہیں اور اس طرح ان کے لسانی تعصب میں کمی آجاتی ہے۔ جناب کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے اگر آپ ثبوت چاہتے ہوں تو کم سے کم ان غیر اُردو داں افسران کے دفاتر میں اُردو میں درخواستیں بھجوایے جنھوں نے دہلی کے بڑے مشاعروں میں صدارت فرمائی ہو یا کسی دیگر حیثیت میں شرکت کی ہو۔ اگر وہ افسران اُردو میں درخواست دیکھ کر اپنی پیشانی پر شکن پیدا کرتے ہیں تو میری بات صحیح ہوگی اور اگر خندہ پیشانی سے ان پر مناسب احکامات صادر کردیں تب آپ کا خیال دُرست ہوگا، یہ اس لیے عرض کیا گیا ہے کہ مجھے یقین کامل ہے کہ جناب نے ایسی کوشش آج تک نہیں فرمائی ہوگی۔

۲۔ آپ نے فرمایا ہے کہ 'عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُردو تحریک کے قائدین اُردو کو زینہ بنا کر ذاتی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں" یہ ایک مصلحت آمیز بہتان ہے جو اُردو قائدین کے خلاف اُردو عوام کو ورغلانے اور حکمران جماعت کو فائدہ پہنچانے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ اُردو عوام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جو لوگ اُردو کو زینہ بنا کر ذاتی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں ان کا اُردو تحریک ——— سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیے سب ہی حضرات تو اپنی ذات خاص کے لیے یا اپنے اپنے متعلقہ اداروں کے لیے سرکار سے زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو ریٹائرمنٹ کی عمر گذر جانے کے بعد بھی اُردو کو زینہ بنا کر ذاتی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ اداریے میں جناب اُردو والوں کی سوچ پر تنقید فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ان کے لیے روٹی روزی کا سوال ہی سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ انھیں غلط فہمی ہوگئی ہے کہ اُردو عملی اور کاروباری زندگی میں کام آنے والی زبان نہیں رہ گئی ہے۔ مَیں عرض کروں گا کہ

عام اُردو والوں کی یہ سوچ غلط بھی تو نہیں ہے۔ وہ اُردو کو صرف ذہنی عیاشی کی زبان کے طور پر کیوں قبول کرلیں اور اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت میں ایک باعزت مقام پر دیکھنے کی کوشش اور خواہش کیوں نہ کریں؟

۴۔ آپ نے اپنے اداریے میں شروع سے آخر تک اُردو قائدین اور عام اُردو والوں کو تو نشانہ بنایا ہے مگر اس سیاسی پارٹی کے طرزِ عمل پر ہلکی سی روشنی بھی ڈالنا مناسب نہیں سمجھا جس نے دو بار اپنے انتخابی منشور میں یہ وعدہ کیا کہ وہ اُردو کو مختلف ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے گی، جو اس منشور کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرکے اقتدار میں تو آگئی مگر اب اپنے وعدے پر عمل کرنے سے جان بوجھ کر گریز کر رہی ہے، وجہ صاف ہے اگر اتنی ہی دیانتداری اور متوازن انداز میں قلم سے کام لیا جائے گا تو ذاتی ترقی کے مدارج کیسے طے ہوں گے؟

مجھے امید ہے "حرفِ آغاز" شائع کرنے والے اُردو دانشور میرے ان چند جملوں کو بھی شائع فرماکر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گے[۱]

—— ایم شفیق انصاری، مرادآباد

[۱] اداریے میں کچھ عمومی باتیں کہی گئی تھیں، روئے سخن کسی خاص طرف نہیں تھا لیکن فاضل مکتوب نگار نے اسے کسی خاص نقطۂ نظر سے دیکھا اور اداریے میں جو سوال اُٹھائے گئے تھے، ان پر اظہارِ خیال سے زیادہ اس خاکسار کی ذات کو ہدفِ ملامت بنانا ضروری سمجھا —— بہرحال ان کا مکتوب گرامی حرف بہ حرف شائع کیا جارہا ہے۔ دیگر کار لائق سے یاد فرمائیں۔ (ایڈیٹر)

○ 'حرفِ آغاز' میں نقوی صاحب کی خصوصاً دو عبارتیں قابلِ اعتنا ہیں۔

"ادبی نشستیں اور مشاعرے اُردو کے حق میں کسی دُور رَس اور پائدار افادیت کے حامل نہ سہی لیکن یہ اُردو والوں کے شعری اور ادبی ذوق کو زندہ رکھنے اور اسے تازگی بخشنے کا ایک وسیلہ ضرور ہیں۔"

"اُردو عملی اور کاروباری زندگی میں کام آنے والی زبان نہیں رہ گئی ہے اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ اس بے مصرف زبان کے تحفظ اور ترقی کی کوششوں میں اپنا قیمتی کیوں صرف کریں۔"

پہلی عبارت سے میں ہی کیا ہر ذی ہوش متفق ہوگا اور دوسری عبارت تو ان کی دُور اندیشی اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ انھوں نے بالکل حقیقت پسندانہ بات کہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اُردو کی روٹی بھی کھاتے ہیں اور اس کے متعلق حوصلہ شکن باتیں بھی کرتے ہیں۔ یہ دو رُخی بھی عجیب ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ اُردو والے خود ہی احساسِ کمتری کی ردا اوڑھ لیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم نقوی صاحب کی تحریر کو سنجیدگی سے لیں

—— شاذ رحمانی، کیٹھار

○ اکتوبر ۸۸ء کا شمارہ بلا 'حرفِ آغاز' میں نقوی صاحب نے اُردو تحریک کے قائدوں کو ایک اہم اور قابلِ قبول مشورہ دیا ہے۔

ایک مشورہ ہے، رسالے میں لطائف کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے، کچھ لطیفے بھی شایع کریں۔

—— اصغر علی چک منگوری، ترکیرہ

○ اکتوبر کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر سے گذرا۔ حرفِ آغاز کے تحت آپ کا مشورہ دل کو بھلا لگا۔ آج ضرورت اسی بات کی ہے کہ ذاتی اختلافات کو بھلا کر ہم اُردو کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ کاش اُردو کے قائدین اس پر کچھ سوچیں اور اپنے ضمیر کو جگائیں۔

اس بار افسانوں کا حصہ کمزور لگا۔ غزلیں ٹھیک ہیں۔ پرویز ید اللہ مہدی صاحب کی تحریر لطف دے گئی۔

—— اختر واصف، پٹنہ

○ "حرفِ آغاز" میں آپ کے خیالات ب
ہوا کرتے ہیں۔ اس بار بھی آپ نے اُردو
سید ظہور قاسم کا "بحری سائنس ا
خاص انداز کا مضمون ہے۔ اس طرح کا
بار کسی ادبی رسالے میں نظر سے گذرا ہے
خلائی کا سلسلہ جاری رکھیے، بہ
توقیر غازی پوری، اسرار گاندھی کے اف
خاص طور پر متاثر کیا۔

—— اظہر نیّر

○ اکتوبر ۸۸ء کے شمارے میں
اور سید قیصر قلندر کے مضامین معلوماتی
بلکہ دلچسپ بھی ہیں۔ اسرار گاندھی کا
موجودہ صورتِ حال اور Gape ...ien
پر اچھا افسانہ ہے۔ ایم مبین کے افس
ٹریٹمنٹ بہت کمزور ہے۔ اس بار ک
پہلے سے بہتر ہے لیکن خورشید افسر بسو
شعر کا مصرعہ اولیٰ میں؛

جب تشنگی نے ریت کا جامہ پہنا

لفظ "پنہا" کو وزن میں لانے کے لیے "
پر استعمال کیا گیا ہے جو بالکل غلط ہے[۱]
خطوط کے کالم میں خورشید اکبر کا خ
کی دعوت دیتا ہے ظہیر صدیقی کا مصر

خوابوں میں جھاگ اُبھرتے رہے

میرے خیال سے "خوابوں" کی مناسبت
جھاگ چھوڑنے والی بات صحیح ہے ویسے فیض
اس مصرعے کے بارے میں خورشید اکبر کی کیا
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر ش

—— قیصر ج

[۱] یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ جوش ملیح آبا
تمنا کو دھانی شعلوں کا پہنا کر

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ماہنامہ ایوانِ اردو

فہرست

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد : ۲، شمارہ : ۸ ——— فی کاپی چھ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے

فون نمبر : ۲۷۴۲۱۱، ۲۶۳۴۴۸ ——— دسمبر ۱۹۸۸ء

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

آئینۂ ذات وصفات:

انتظاریہ:

سرورق اور تزئین: ارشد علی خاں ـــــ خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر

ابوالکلام آزاد نمبر پیشِ خدمت ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا آزاد اس صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کے نام سے یہ صدی پہچانی جائے گی۔ اس دور کی کوئی ادبی، علمی اور سیاسی تاریخ ایسی نہیں لکھی جاسکتی جس کے اوراق مولانا آزاد کے گوناگوں کارناموں کے ذکر سے خالی رکھے جاسکیں۔ ایسی عظیم شخصیت کی سیرت و سوانح اور افکار و اعمال کی مختلف جہات کا احاطہ چند سو صفحات میں ممکن نہیں پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ صفحات مولانا آزاد کی ذات و صفات کا مفصل نہیں تو ایک مجمل خاکہ ہمارے قارئین کے سامنے ضرور لے آئیں۔ اس کوشش میں اگر ہمیں کچھ کامیابی ہوئی ہے تو اس کے لیے ہم ان حضرات کے مرہونِ منت ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر مضامین لکھے اور مولانا کے بارے میں ایسا معلوماتی مواد بہم پہنچایا جو اس سے پہلے پردۂ خفا میں تھا یا جزوی طور پر ہی سامنے آسکا تھا۔

نمبر کو ہم نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں وہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو مولانا کی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی پبلک لائف کے بعض اہم حالات و کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے مہد سے لحد تک مولانا کے شب و روز کا ایک واضح خاکہ ذہن میں مرتب ہو جاتا ہے اور ان کے خاندانی پس منظر سے بھی خاطر خواہ آگاہی ہو جاتی ہے۔ دوسرے حصّے میں وہ مضامین درج کیے گئے ہیں جو احوال و آثار کے ساتھ ساتھ مولانا کے افکار سے بھی بحث کرتے ہیں اور علم و ادب اور مذہب و سیاست کے شعبوں میں ان کی فکری اور عملی فتوحات کو سامنے لاتے ہیں۔ تیسرے حصّے میں مولانا کی ایسی منتخب تحریریں پیش کی گئی ہیں جو ان کی فکر اور ان کے ذہن و ذوق کی مکمل طور پر آئینہ دار ہیں۔

پہلے حصّے میں جو تصویریں دی گئی ہیں وہ ہمیں جنابِ گلزار نقوی کی عنایت سے حاصل ہوئی ہیں جو مولانا آزاد کے قائم کردہ اِدارے آئی سی سی آر میں چیف لائبریرین ہیں۔ اپنے مضمون "مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیتیں" کے ساتھ آئی سی سی آر کی دفتری فائلوں پر مولانا کے احکامات کا عکس بھی ہمیں موصوف ہی نے مرحمت کیا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کی کچھ اور تحریریں بھی ہمیں 'ایوانِ اردو' کے آئندہ شماروں کے لیے دیتے رہیں گے۔ ہم ان کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔

"انڈیا ونز فریڈم" کے وہ تیس صفحے جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھے اور مولانا کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے تیس برس بعد اب منظرِ عام پر آئے ہیں، ان دنوں عام بحث کا موضوع بنے ہوتے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کا ایک تعارفی تجزیہ بھی اس نمبر میں شامل کر لیا جائے۔ جناب پروانہ ردولوی نے ہماری درخواست پر بہت ہی کم وقت میں یہ محنت طلب کام انجام دیا، ہم ان کا بھی دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ مضمون اور مولانا آزاد کی شریکِ حیات زلیخا بیگم کی ڈائری کا عکس جو ہمیں خواجہ منیر احمد صاحب کی طرف سے اس وقت حاصل ہوا جب کاپیاں پریس جارہی تھیں، آخری صفحات میں "انتظاریہ" کے زیرِ عنوان دیے گئے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں ہماری یہ حقیر پیشکش آپ کو پسند آئے گی۔

——— سید شریف الحسن نقوی

उप-राष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

8 نومبر 1988

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ اُردو اکادمی دہلی مولانا ابوالکلام آزاد پر 'ایوان اُردو دہلی' میگزین کا خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا خاکہ صحافی ماہر تعلیم، ادیب، مجاہد آزادی اور سیاستدان ان سب کا مجموعہ ہے۔ وہ بھارت کے لئے قومی یکجہتی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کے کئے گئے کام یادگار ہیں

مجھے یقین ہے کہ آپ کے رسالے کے ذریعہ ایک ایسے قوم پرست نیتا کی شخصیت مکمل طور پر سامنے آسکے گی۔

شنکر دیال شرما
(شنکر دیال شرما)

उपराज्यपाल
दिल्ली
LIEUTENANT GOVERNOR
DELHI

राज निवास
दिल्ली–११००५४
RAJ NIWAS
DELHI-110054

MESSAGE

I am glad to know that Urdu Academy is bringing out a Special Number of its monthly magazine "Aiwan-e-Urdu Delhi" on Maulana Abul Kalam Azad to coincide with his centenary celebrations. Maulana Abdul Kalam Azad as a scholar, writer, thinker and as a guide par excellence for the Indian people strove with exceptional courage and conviction for national integration. He was an avowed enemy of narrow mindedness and was truly an embodiment of communal harmony. He was an inspiring fountain for millions of people to join the freedom struggle of the country.

I send my good wishes to the Academy for bringing out a special number of its monthly magazine.

(ROMESH BHANDARI)

جگ پرویش چندر

अ० शा० पत्र सं०/मु० का० पा०/2545/Admn.
मुख्य कार्यकारी पार्षद
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
CHIEF EXECUTIVE COUNCILLOR
DELHI ADMINISTRATION, DELHI
दिल्ली, दिनांक
Delhi, Dated 8 NOV 1988

پیغام

مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ دلی اردو اکادمی
کا ماہنامہ رسالہ "ایوان اردو دلی" امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد
کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک خصوصی نمبر
شائع کر رہا ہے جو مولانا کی حیات اور انکی صحافتی، علمی، ادبی،
سیاسی، سماجی اور مذہبی خدمات کے مختلف عنوانات کے تحت
فکر انگیز مقالات مشتمل ہوگا۔ اس سے عوام وخواص دونوں ہی
مولانا کی گراں قدر خدمات سے واقف تو ہونگے ہی لیکن خاص
طور پر ملک کی نوجوان نسل کو حب الوطنی، سیکولرزم اور
قومی اتحاد جیسی قدروں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین ملے گی۔

مولانا کی دوسری حیثیتوں میں انکی علمی اور ادبی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔
مولانا کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو زبان کو انہوں نے نئے ادبی شہ پارے عطا کئے۔
مولانا اعلیٰ پایہ کے سیاسی رہبر اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز
انشاء پرداز بھی تھے۔ امید کرتا ہوں کہ خصوصی نمبر مولانا کی ذات بابرکات
کے شایان شان ہوگا۔

میں دلی اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کے لئے ہمیشہ میری
نیک خواہشات رہی ہیں۔

جگ پرویش چندر
(جگ پرویش چندر)

جناب شریف الحسن نقوی
سکریٹری دلی اردو اکادمی
دریا گنج۔ نئی دلی

कार्यकारी पार्षद (शिक्षा)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली

EXECUTIVE COUNCILLOR (EDU.)
DELHI ADMINISTRATION, DELHI

दिल्ली, दिनांक ۸۸ نومبر
Delhi, Dated

پیغام

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے دیش کی آزادی کی لڑائی کے ایک جیالے سپاہی تھے - ایسے سپاہی کہ ہمیشہ لڑنے والوں کی پہلی صف میں نظر آئے اور اس وقت تک قدم آگے بڑھاتے رہے جب تک دیش کو غیر ملکیوں کے تسلط سے چھڑا نہیں لیا ۔ آزادی ملنے کے بعد دیش کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں بھی مولانا صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - خاص طور سے اس دیش سے جہالت کی تاریکی دور کرنے کے لیے انہوں نے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جو تعلیمی پالیسیاں بنائیں ، ان کی روشنی آج بھی اسکولوں اور کالجوں سے لےکر ہماری یونیورسٹیوں تک کی فضا میں دیکھی جاسکتی ہے - انہوں نے تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثوں کو محفوظ کرنے اور انہیں ترقی دینے کے لیے بھی اہم فیصلے کیے اور ان فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جن کی افادیت اور اہمیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے -

خوشی کی بات ہے کہ ملک اور قوم کے اس محسن کی یاد میں اردو اکادمی دہلی اپنے ماہانہ رسالے کا خاص نمبر نکال رہی ہے - میں اس نمبر کی کامیابی کی تمنا کرتا ہوں -

(کلانتھ بھارتھ)

بخدمت جناب شریف الحسن نقوی ،
سکریٹری ، اردو اکادمی ، دہلی

ابوالکلام آزاد — کچھ کرنے کے کام

تمام دوسرے لوگوں کی طرح ہم مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق بھی دو پہلوؤں سے لکھ سکتے ہیں۔ اوّل' ان کے سوانح حیات ہیں' جن میں ان کے خاندان کا تذکرہ اور اس ماحول کا ذکر ہوگا جس میں ان کی پیدائش ہوئی اور انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے' انھیں کی روشنی میں ان کے اخلاق و عادات اور کردار کی تشکیل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے' ان کے کام اور کارنامے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے کن میدانوں میں کام کیا اور ان میں کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

جہاں تک ان کے سوانح حیات کا تعلق ہے' اس بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے' اور چھپ کر ہمارے سامنے آیا ہے' میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ بنیادی طور پر تمام کوائف ہمارے علم میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ تحقیق و تجسس سے ان کی ابتدائی زندگی کی بعض جزوی تفصیلات سے متعلق کوئی نئی بات منظرِ عام پر آجائے' ورنہ کسی اہم واقعے کے اضافے کے امکانات اب بہت کم ہیں۔ خود مولانا آزاد اپنے بارے میں بہت کم گو تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے حالات تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ایک دوست کی فرمائش پر وہ اپنی سوانح عمری لکھنے پر آمادہ بھی ہوئے تو "تذکرہ" میں اپنے متعلق چند اشارے کر کے رہ گئے جو اسی زمانے میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے ان سے متعلق دو کتابیں شائع کیں: "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" اور "ذکرِ آزاد"۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور مولانا امداد صابری نے بھی ان کی سوانح عمریاں قلمبند کی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ساہتیہ اکادمی نے "سلسلۂ اکابرِ ادب" میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی لکھی ہوئی مختصر کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسی موضوع پر ایک مفصّل کتاب بھی لکھی ہے' جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ایک تفصیلی کتاب انگریزی میں میرے ایک اور دوست لکھ رہے ہیں۔ یہ غالباً اس سال کے اواخر تک شائع ہو جائے گی۔ ایک انگریزی مصنف کا لکھا ہوا انگریزی مقالہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ جہاں تک ان کی سوانح عمری کا تعلق ہے' ہم اس مطبوعہ مواد پر بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک ایک پہلو ایسا ہے' جس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اور اسی پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نابغۂ روزگار شخصیت اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے متعدد میدان تھے اور وہ ہر جگہ منفرد مقام کے حامل۔ وہ صحافی تھے' ادیب اور انشا پرداز تھے۔ عالمِ دین تھے' مفسّرِ قرآن تھے' مفکّر تھے' سیاست داں تھے' تحریکِ آزادی کے ممتاز سپاہی تھے' حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کی ان گوناگوں سرگرمیوں پر بہت کم لکھا گیا ہے' حالاں کہ میرے نزدیک کرنے کا کام تھا۔

مالک رام
C-504' ڈیفنس کالونی' نئی دہلی

دعوت الہلال

مولانا آزاد اپنی خاندانی روایات اور تعلیم زیرِ اثر ایک عالمِ دین ہی کی حیثیت میں ملک متعارف ہوئے۔ مدتوں ان کی تحریروں کا محور ا افہام و تفہیم ہی رہا اور لوگوں نے اُنھیں اسی صو میں جانا اور مانا۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات اور اسلام کی تعبیر و تفسیر اور "مسلمان را مسلماں با کے سلسلے میں جو رول ادا کیا' وہ اتنا اہم ہے کہ ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں' کوئی اسے مانے یا نہ مانے کہ یہ "الہلا کی دعوت" کا اثر تھا' اور الہلال ہی نے وہ زمین کی تھی جس پر بعد کو جماعتِ اسلامی اور تبلیغی نے اپنی اپنی عمارت کھڑی کی۔

افسوس کہ یہ موضوع آج تک تشنۂ تحقیق الہلال کی دعوت کا عمیق اور وسیع مطالعہ کرنے ک ہے۔ دیکھا جائے کہ اس نے ہر ہفتے کیا پیغام لوگو پہنچایا۔ اور وہ کس طرح کے اسلامی معاشرے کی کے لیے کوشاں رہا۔ الہلال کی عمر بہت کم رہی' دے کے ہی تین برس یا کچھ زیادہ۔ لیکن اس ز کے حالات کے پیشِ نظر اس کی اشاعت غیر معمو یہ ہر ہفتے ۲۰ - ۲۵ ہزار چھپتا تھا۔ گویا اس کے ق ایک لاکھ کے قریب ہوں گے۔ اسی لیے اس اثرات اور نتائج بہت دور رس اور پائدار ثا

ہوتے۔

تقابلی مطالعے سے دیکھنا چاہیے کہ جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار اور مقاصد نے الہلال کی دعوت سے کس حد تک فائدہ اٹھایا۔ مطالعے کے دوران میں انحراف اور ردوبدل کے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ الہلال کی دعوت کی اہمیت کم ہوتی ہے، نہ ان تحریکوں کے اس سے متاثر ہونے کی تغلیط۔

سیاسی اصلاح

الہلال کی دعوت کا دوسرا محاذ سیاسی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر جو افتاد پڑی، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کا وقتی علاج سرسید احمد خاں مرحوم نے، اپنی بصیرت کی روشنی میں، پوری دیانت داری سے پیش کیا۔ ان کی تحریک بہت حد تک کامیاب رہی، جس سے مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور اعتماد بحال بھی ہو گیا۔ لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقۂ کار میں یک رُخا پن تھا۔ اس میں حالات کی تبدیلی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا ظاہر ہے کہ ایسی پالیسی میں استواری اور پایندگی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس میں تبدیلی یا اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی اصلاح اور علاج کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال نے مہیا کی۔ بیشک، ان کے خیالات بعض ہمعصر مصری اکابر اور دوسرے مفکرین مثلاً سعید حلیم پاشا، مصطفیٰ کامل پاشا، جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ وغیرہ سے بہت متاثر تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا ماخذ اور منبع قرآنِ کریم اور حدیث و سنہ تھے۔

افسوس، اس موضوع پر بھی جتنا اور جس انداز سے لکھنے کی ضرورت تھی، نہیں لکھا گیا۔ اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ہمیں الہلال کے اثرات کو متعین اور مرتب کرنا چاہیے۔

ترجمان القرآن

دوسرا موضوع ترجمان القرآن کا ہے۔ افسوس کہ یہ تفسیری ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس وقت ہمیں ان اسباب کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں، جو اس کے نامکمل رہ جانے کے باعث ہوئے۔ مولانا مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انھوں نے دو مرتبہ کیا۔ دونوں دفعہ پولیس کی خانہ تلاشی کے نتیجے میں

> ...مولانا نے اردو ادب کو، خاص کر نثر کو، کیا کچھ دیا یا اُن کا اردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وسیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اُردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟...

یہ مسودے درہم برہم بلکہ تباہ ہو گئے۔ اور انھیں اسے نئے سرے سے تیار کرنا پڑا، جو ہمارے سامنے ہے۔

لیکن میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جن اصحاب نے لکھا ہے کہ مرحوم نے تیسری جلد بھی مکمل کر لی تھی اور اس کا مسودہ ضرور کہیں نہ کہیں ان کے کاغذات میں موجود ہو گا، وہ غلطی پر ہیں۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے دو ہفتے قبل جمعہ، ۷ رفروری ۱۹۵۸ء صبح کے وقت ہوئی تھی اور یہ اچھی خاصی طویل اور تفصیلی ملاقات تھی۔ اس دن منجملہ اور باتوں کے میں نے ان سے گذارش کی کہ وہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل کر دیں۔ اس پر انھوں نے صراحت سے فرمایا کہ واقعی میری گوناگوں مصروفیتوں کے باعث ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام آج تک معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے، اور میں اس طرف توجہ نہیں کر سکا۔ اب ان شاء اللہ جلد ہی میں اسے لکھنا شروع کر دوں گا، اور حسبِ معمول (عبدالقیوم خاں صاحب) کاتب کو بلوا کے مسودہ انھیں دیتا جاؤں گا۔ اس کے ہفتہ بھر بعد وہ غسل خانے سے نکلتے ہوئے پھسل کر گرے۔ اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر وہاں پہنچ گئے جو ہم سب کی منزلِ مقصود ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

لیکن جو دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ان سے بہت حد تک پورے قرآن کی تفسیر کا اسلوب اور انداز ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے تو جس سرگرمی اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا، وہ حیرتناک تھا۔ میں یہاں صرف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی رائے پر اکتفا کروں گا۔ انھوں نے "معارف" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے، ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔"

سوال یہ ہے کہ بیسیوں ترجمے اور تفسیر کی کتابیں موجود ہوتے ہوئے ترجمان القرآن کو یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے محققوں اور مصنفوں کو ترجمان القرآن پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی زبان، ترجمے کی صحت

استدلال کی جدت اور بیان کی شگفتگی نے اسے ایک تخلیقی کارنامے کا درجہ دے دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے کہ یہ کس حد تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ضروریات کو، فقہ اور مذہب کی موشگافیوں میں جائے بغیر، پورا کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں ترجمان القرآن پر اس پہلو سے ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔

مولانا آزاد تفسیر میں ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے "سلف" کے طریقے کی حمایت میں اور "تفسیر بالرائے" کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن تیمیہ کا بھی یہی اصول تھا۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تحریروں اور ترجمان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور واضح کیا جائے کہ کہاں تک مولانا آزاد نے ان کا تتبع کیا۔ اور کس جگہ اور کتنا اس پر اضافہ کیا۔

آزاد بحیثیت ادیب

الہلال کی سب تعریف کرتے ہیں۔ اور بے شک، یہ تعریف کے قابل تھا بھی، اور آج تک ہے۔ اس کی شکل و صورت، اس کا معیارِ طباعت و تصاویر وغیرہ ہماری صحافت میں بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ آج تک بھی، اِلّا ماشاءاللہ، کوئی پرچہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا۔

اس کی اصلی اہمیت اور کشش اس کی معنوی خوبیاں تھیں۔ مولانا آزاد اور ان کے ہمکاروں نے مضامین کا جو نمونہ پیش کیا، اس سے ملک بھر چونک اٹھا۔ خود مولانا آزاد کی تحریریں، ان کا موضوع اور دعوتی اندازِ کلام اور اسلوبِ تحریر ایسا بدیع تھا کہ الہلال کے قاری مسحور ہو گئے۔

ستم یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو، خاص کر نثر کو، کیا کچھ دیا، یا ان کا اُردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اُردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

آزاد کا نظریۂ تعلیم

مولانا آزاد ۱۹۴۶ء سے اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک بارہ برس ہندوستان کے وزیرِ تعلیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پارلیمنٹ میں، مختلف کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں بیسیوں تقریریں کیں، سیکڑوں فائلوں پر مختلف مسائل کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی یہی آرا ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ جن اصحاب کو حکومتی دفتروں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی محکمے کا وزیر کس حد تک پالیسی کے تعین اور تشکیل میں مؤثر اور معاون ہوتا ہے۔ یقیناً مولانا آزاد بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

میں نے "خطباتِ آزاد" میں ان کی اس نوع کی دو تقریریں شامل کی ہیں؛ ہندوستانی کمیٹی، ... ۱۹۴۷ء اور عربی نصاب کمیٹی لکھنؤ، فرو... ۱۹۴۷ء) افسوس کہ بوجوہ میں آج تک خطبات ... بقیہ جلدیں شائع نہیں کر سکا۔ اور انھوں نے اپنی تق... میں اور فائلوں پر جن خیالات کا اظہار فرمایا، ... مجبوریوں کے باعث انھیں بھی جمع نہ کر سکا۔ ... کرنے کا کام ہے اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ... ماہرِ تعلیم ان تمام تحریروں کو جمع کرنے کے لیے تیا... ہو جائے۔ کام وقت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اس سے ہمیں ان کے نظریۂ تعلیم اور طریقِ ... کے بارے میں روشنی ملے گی۔ اور ممکن ہے کہ ہما... کچھ تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں بھی وہ معا... ثابت ہوں۔

کرنے کے بعض اور کام بھی ہیں۔ لیکن اگر ... طور پر اتنا کچھ بھی ہو جائے، تو بہت حد تک ہم مو... آزاد کی صحیح تصویر اور ان کی خدمات کا صحیح جائز... پیش کر کے اپنے آپ سے اور دین و مذہب ... سُرخرو ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

مذہب کی دُکان

مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیال، تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسے میں علم ہے، نہ محرابِ مسجد میں اخلاص، اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دو... ہے۔

ہم کعبہ و ہم بُت کدہ سنگ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

(طنزیاتِ آز...

عکس ذات

قلمی فوٹو

سرو قد۔ دوہرا بدن۔ گورا رنگ۔ ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں۔ کتابی چہرہ۔ سفید چھوٹی داڑھی، آواز شریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں۔ مگر پیری مریدی کے زیادہ دل دادہ نہیں ہیں۔ قوم سید۔ پیشہ آزادی اور بے نیازی۔ حافظہ کی قوت بے مثال۔ تصور کی طاقت، چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ۔ نازک مزاجی میں تاناشاہ۔ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔ بیرونِ ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں میں مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور یورپین مورخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یورپین کیوں کر ثابت کیا جائے۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تاہم ظاہر داری اور نمود کاری سے بیزار ہیں۔ مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکتے، تو ابوالکلام ہوتے۔ بلکہ سرسٹیفورڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں۔ جواہر لال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیوں کہ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ نئے زمانے کی سیاست میں یہ بات گناہِ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں اور اُس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں، اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے۔" قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اُس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا: "سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ" گویا چونتیس برس پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں، جب وہ امرتسر میں اخبار "وکیل" کے ایڈیٹر تھے تو انھوں نے حسن نظامی سے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ سارا ہندوستان میری مٹھی میں ہوگا۔ اور آج حسن نظامی یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ وقت آگیا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سرکرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعے کرتے تھے کہ سرکرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جاتے تو وہ اکبرِ اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔ سوائے اُن کے جو اُن کی بادشاہی کو اپنی ذات کے لیے نقصان رساں سمجھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بہت عمدہ تجویزیں پیدا کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں میں وہ آج کل ہیں اُن میں ان پر عمل کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ سارے ہندوستان میں ریاکار اور نمود کار لیڈروں کی کثرت ہے جن میں نہ سمجھ ہے نہ عمل ہے۔

بہر حال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندوستان کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔ اُن کو سیاسی چراغ بھی کہا جاسکتا تھا، اگر دوسرے سیاسی چراغوں کو روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی (مرحوم)

عمرِ رواں کے نقشِ قدم
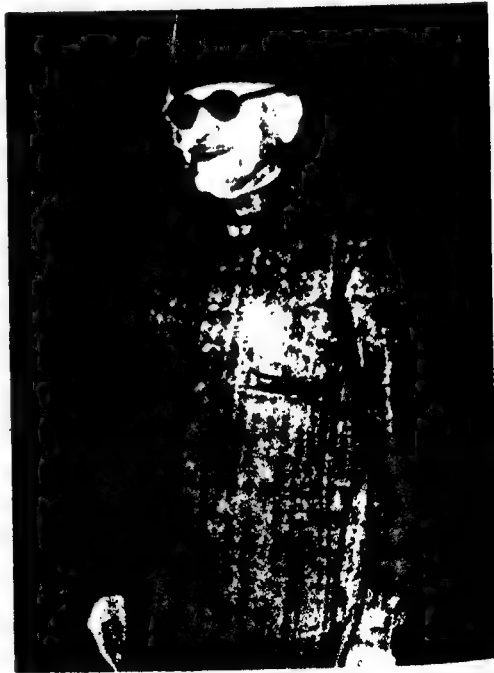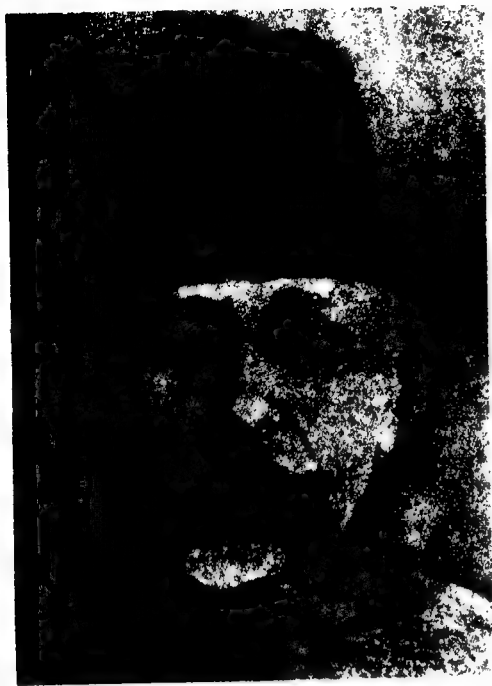
مولانا آزاد بائیں سے چوتھے نمبر پر کھڑے ہیں

مہاتما گاندھی سے مصروفِ گفتگو

پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ

سردار پٹیل کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے

سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خاں کے ساتھ ـــــ ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ساتھ ـــــ اگست ۱۹۴۷ء

بیرسٹر آصف علی اور ارونا آصف علی کے ہمراہ

خضر حیات خاں کے ساتھ
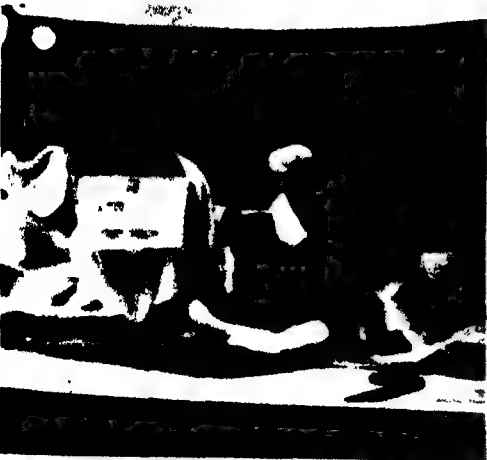
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں خان عبدالغفار خاں، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور آچاریہ کرپلانی

تبادلۂ اقتدار پر گفتگو کے دوران میں سر اسٹیفرڈ کرپس کے ساتھ ـــ ۱۹۴۲ء

بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی جی اور اچاریہ کرپلانی کے ساتھ ـــ اگست ۱۹۴۲ء

شملہ کانفرنس (جون، جولائی ۱۹۴۵ء) کے موقع پر ماسٹر تارا سنگھ سے گفتگو کرتے ہوئے۔ گووند ولبھ پنت، محمد علی جناح، راج گوپال آچاریہ بھی تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں

صدر کانگریس مولانا آزاد شملہ کے سیسل ہوٹل میں ـــ ۲۴ جون ۱۹۴۵ء

مولانا آزاد بہ حیثیت صدر کانگریس وائسریگل لاج میں۔ بائیں سے دائیں:
اے۔ وی۔ الیگزنڈر، سر اسٹیفورڈ کرپس، مولانا آزاد اور لارڈ پیتھک لارنس
۵، مئی ۱۹۴۶ء

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، دہلی میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا خیر مقدم کرتے ہوئے ـــ دسمبر ۱۹۴۷ء

مہاتما گاندھی کی چتا پر ـــ جنوری ۱۹۴۸ء

مہاتما گاندھی کی آخری رسم کی ادائیگی کے موقعے پر راج کماری امرت کور، لیڈی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پامیلا ماؤنٹ بیٹن اور چینی سفیر لوچیا لوین کے ساتھ

گاندھی نگر کے آئی این سی سیشن میں پنڈت نہرو اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ ـــــ دسمبر ۱۹۴۸ء

قانون ساز اسمبلی کے ایک سیشن میں مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ۱۶، مئی ۱۹۴۹ء

آل انڈیا کانفرنس آن آرٹس، کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے ـــــ ستمبر ۱۹۴۹ء

انڈین نیشنل کمیشن فار کوآپریشن وِد یونیسکو کے افتتاحی اجلاس میں خطبۂ صدارت فرماتے ہوئے ـــــ اپریل ۱۹۴۹ء

ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کے درمیان ثقافتی تعاون کانفرنس
کا افتتاح کرتے ہوئے ـــــ اگست ۱۹۴۹ء

غالب ڈے پر تقریر کرتے ہوئے ـــــ ۱۵ فروری ۱۹۵۱ء

مغربی ایشیا کے دورے کے موقع پر ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی
کے ساتھ ـــــ ۱۹۵۱ء

کراچی میں محمد علی جناح کے مزار پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے
جولائی ۱۹۵۱ء

یونائیٹڈ نیشنز ریجنل یوتھ ویلفیر سیمینار کے موقع پر برما کے مندوبین
کے ساتھ ـــــــ نومبر ۱۹۵۱ء

نئی دہلی میں گاندھی ازم پر منعقدہ ایک سیمینار میں جرمنی کے پاسٹر نیمولر
لارڈ بوایڈ آر اور لیڈی آر کے ساتھ ـــــــ جنوری ۱۹۵۳ء

نیشنل لائبریری بیلویڈر کا افتتاح ـــــ یکم فروری ۱۹۵۳ء

ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رڑکی کی مرکزی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے
اپریل ۱۹۵۳ء

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سفیر چیسٹر باؤلز (داہنے سے دوسرے نمبر پر) سے نیشنل فزیکل لائبریری نئی دہلی کے لیے کتابوں کا تحفہ قبول کرتے ہوئے۔ تصویر میں ڈاکٹر کے۔ایس۔کرشنن (بائیں) اور ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ بھٹناگر (بائیں سے تیسرے نمبر پر) بھی نظر آرہے ہیں ـــــ مئی ۱۹۵۳ء

انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کے خیر سگالی دورے سے واپسی پر ـــــ پالم ایئرپورٹ پر۔ محترمہ اندرا گاندھی اور پروفیسر ہمایوں کبیر بھی نظر آرہے ہیں

یورپی ممالک کے دورۂ خیر سگالی سے واپسی پر ایک استقبالیہ تقریب میں
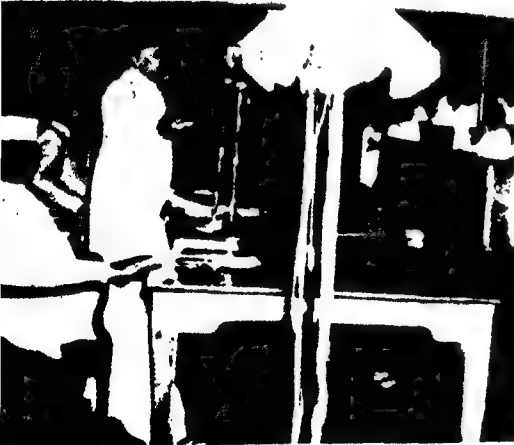
للت کلا اکادمی کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ـــــ اگست ۱۹۵۴ء

ایرانی اساتذہ اور طلبہ کے ایک وفد کے ساتھ

سندھیا اسکول، گوالیار کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے

سعودی عرب کے شاہ سعود کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں ـــــ تصویر میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ملا طاہر سیف الدین بھی نمایاں ہیں

آل انڈیا ریڈیو میں بچوں کے پروگرام میں شریک

نیپالی طلبہ کے ایک وفد کے درمیان ـــــ فروری ۱۹۵۷ء
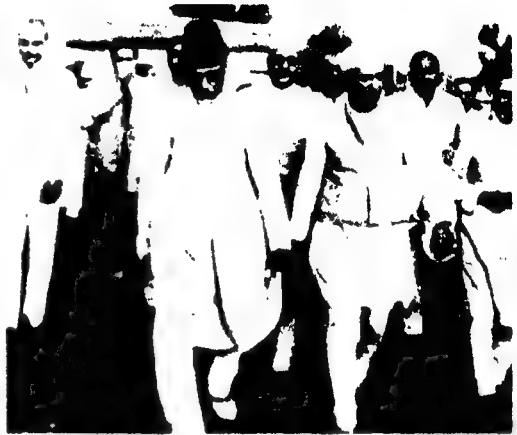
پنڈت نہرو، پروفیسر ہمایوں کبیر اور ایم۔ این۔ سعود کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر آتے ہوئے

افغانستان کے شاہ ظاہر شاہ سے مصافحہ کرتے ہوئے درمیان میں پنڈت نہرو ـــــ فروری ۱۹۵۸ء

گھانا کے وزیر تعلیم اور وزیر مالیات کے ساتھ ـــــ ستمبر ۱۹۵۷ء

دوستوں اور معتقدوں کے درمیان ـــــ تصویر میں پنڈت نہرو کے علاوہ
اندرا جی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے

سفر آخرت

راج پتھ پر جلوسِ جنازہ

حیاتِ ابوالکلام — ماہ و سال کے آئینے میں

[مولانا آزاد مرحوم کے کچھ عقیدت مندوں نے مرحوم کی زندگی کی اہم تاریخیں مرتب کی ہیں، مگر ابتدائی زندگی کی تاریخوں میں — از پیدائش تا اجرائے الہلال — اچھا خاصا اختلاف ہے۔ مگر ان تاریخوں کے فاضل مرتب چونکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ لائبریری سائنس میں استاد ہیں، اس لیے اُمید ہے کہ انھوں نے پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد ان کو مرتب کیا ہوگا۔

اس مضمون میں ایک جگہ — ۱۹۰۳ء کے تحت "ایڈورڈ گزٹ" (شاہجہاں پور) کا ذکر ہے۔ مولانا کی صحافت کے سلسلے میں پہلی مرتبہ یہ نام سامنے آیا، اس لیے اس کے بارے میں مجھے شبہہ تھا، لہٰذا اس کا ماخذ معلوم کرنے کے لیے فاضل مضمون نگار اور ماہر ابوالکلامیات ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب (کراچی) کو خطوط لکھے۔ قریشی صاحب کا تو جواب نہیں آیا، شاید میرا خط نہیں ملا، البتہ شاہجہاں پوری صاحب نے لکھا کہ خود مولانا آزاد نے "لسان الصدق" کے آخری شمارے — اپریل و مئی ۱۹۰۳ء — میں اس اخبار کا اور اس کی ادارت کا ذکر کیا ہے۔]

مرسل: عبداللطیف اعظمی

۱۸۸۸ء — ۱۷ اگست: پیدائش مکۂ معظمہ
۱۸۹۲ء — رسمِ بسم اللہ
۱۸۹۸ء — آمدِ ہندوستان — آغازِ شاعری
۱۸۹۹ء — والدہ کی وفات
۱۸۹۹ء — ماہنامہ "نیرنگِ خیال" کا کلکتہ سے اجرا
۱۹۰۰ء — یا ۱۹۰۱ء — شادی
۱۹۰۱ء — ۲۲ جنوری: ہفتہ وار "المصباح" کا اجرا
۱۹۰۲ء — ۵ جنوری: قدیم ترین دستیاب مطبوعہ تصنیف "اعلان الحق"
۱۹۰۲ء — ہفتہ وار "احسن الاخبار" کلکتہ کی ادارت
۱۹۰۳ء — درسِ نظامی سے فراغت
۱۹۰۳ء — مارچ: ماہنامہ "خدنگِ نظر" لکھنؤ کے معاون مدیر
۱۹۰۳ء — "ایڈورڈ گزٹ" شاہجہاں پور کی ادارت
۱۹۰۳ء — ۲۰ نومبر: ماہنامہ "لسان الصدق" کا اجرا
۱۹۰۴ء — یکم تا ۳ اپریل: انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت
۱۹۰۵ء — ۲۲، ۲۳ اپریل: انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت اور "اسلام آیندہ زمانے میں" کے عنوان پر تقریر
۱۹۰۵ء — اپریل و مئی: "لسان الصدق" کا آخری شمارہ آگرہ کے مشہور مفیدِ عام پریس سے شائع ہوا۔
۱۹۰۵ء — سفرِ عراق
۱۹۰۵ء — اکتوبر: ماہنامہ "الندوہ" لکھنؤ کے معاون مُدیر
۱۹۰۶ء — مارچ: "الندوہ" سے علیحدگی
۱۹۰۶ء — اپریل: سہ روزہ "وکیل" امرتسر کی ادارت
۱۹۰۶ء — بڑے بھائی ابونصر یٰسین آہ کی وفات
۱۹۰۶ء — نومبر: "وکیل" سے علیحدگی اور کلکتہ واپسی
۱۹۰۶ء — دسمبر: مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت۔ اسی اجلاس میں مُسلم لیگ کی تاسیس بھی عمل میں آئی
۱۹۰۷ء — جنوری: ہفتہ وار "دارالسلطنت" کلکتہ کی ادارت
۱۹۰۷ء — اگست و ستمبر: "وکیل" امرتسر کی ادارت
۱۹۰۸ء — اگست: والد کی شدید علالت کی بنا پر "وکیل" سے مستعفی

قاضی افضل حق قریشی

۱۹۰۸ء — ۱۵ر اگست : والد کا انتقال

۱۹۰۸ء — ۱۹۰۹ء — مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر

۱۹۱۲ء — ۱۳ر جولائی : ہفتہ وار "الہلال" کا اجرا

۱۹۱۳ء — ۱۸ر ستمبر: "الہلال" پریس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو ۲۳ر ستمبر کو جمع کر دی گئی۔

۱۹۱۴ء — اکتوبر: ۱۴ر اور ۲۱ر اکتوبر کا مشترک شمارہ حکومت بنگال نے ضبط کر لیا۔

۱۹۱۴ء — ۱۶ر نومبر: پچھلی ضمانت ضبط اور ۱۰ ہزار کی نئی ضمانت کا مطالبہ۔ مطالبہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے ۱۸ر نومبر کی اشاعت کے بعد خود ہی "الہلال" بند کر دیا۔

۱۹۱۵ء — ۱۵ر نومبر: ہفتہ وار "البلاغ" کا اجرا

۱۹۱۶ء — ۲۸ر مارچ : حکومتِ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت حکم دیا کہ چار روز کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدودِ بنگال سے نکل جائیں۔ بعد میں یہ مدت بڑھا کر ایک ہفتہ کر دی گئی۔

۱۹۱۶ء — اپریل: صوبہ بدر ہونے کی وجہ سے ۲۴ر اور ۳۱ر مارچ کی اشاعت کے بعد "البلاغ" بند ہو گیا۔

۱۹۱۶ء — ۷ر اپریل: رانچی (بہار) چلے گئے اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا۔

۱۹۱۹ء — تذکرہ اور "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد" کی تصنیف۔

۱۹۲۰ء — یکم جنوری: رانچی کی نظر بندی سے رہائی

۱۹۲۰ء — ۲۸، ۲۹ر فروری: بنگال پیراونشل خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں حکومت سے ترکِ موالات کی دعوت۔

۱۹۲۰ء — "مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب" کی تصنیف نیز صدارت اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس ناگپور۔

۱۹۲۱ء — ۲۳ر ستمبر: تحریک ترکِ موالات کی دعوت کے لیے اپنی نگرانی میں ہفتہ وار "پیغام" کلکتہ سے جاری کیا۔

۱۹۲۱ء — ۲۵ر اکتوبر: صدارت اجلاس پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ۔

۱۹۲۱ء — ۱۸، ۲۰ر نومبر: صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء ہند لاہور۔

۱۹۲۱ء — ۱۰ر دسمبر: گرفتاری، مقدمہ اور ایک سال قید کی سزا۔ اسی مقدمے میں وہ بیان دیا جو "قولِ فیصل" کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۹۲۳ء — ۱ر جنوری: قید سے رہائی

۱۹۲۳ء — یکم اپریل: عربی کا رسالہ "الجامعہ" کا اجرا

۱۹۲۳ء — ۱۵ر ستمبر: صدارت اجلاس خاص کانگریس دہلی

۱۹۲۵ء — ۲۹ر دسمبر: صدارت اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور

۱۹۲۷ء — ۱۰ر جون: "الہلال" دوبارہ جاری کیا

۱۹۲۷ء — ۹ر دسمبر: اس اشاعت کے بعد "الہلال" مستقل طور پر بند ہو گیا۔

۱۹۲۹ء — ۲۷ر جولائی: صدر مسلم نیشنلسٹ پارٹی

۱۹۳۰ء — قائم مقام صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس

۱۹۳۱ء — گرفتاری

۱۹۳۱ء — ستمبر: ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت

۱۹۳۲ء — گرفتاری

۱۹۳۶ء — اپریل: ترجمان القرآن جلد دوم کی طباعت

۱۹۳۹ء — قائم مقام صدر آل انڈیا کانگریس

۱۹۴۰ء — کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل ۱۹۴۶ء تک رہے

۱۹۴۰ء — ۱۹ر مارچ: صدارت اجلاس کانگریس بہ مقام رام گڑھ

۱۹۴۰ء — گرفتاری، دو برس کی سزا، نینی جیل میں قید

۱۹۴۱ء — ۴ر دسمبر: رہائی

۱۹۴۲ء — مارچ، اپریل: کرپس میشن سے گفتگو

۱۹۴۲ء — ۹ر اگست: بمبئی میں گرفتاری اور قلعہ احمد نگر میں نظر بندی

۱۹۴۳ء — ۹ر اپریل: کلکتہ میں اہلیہ کا انتقال

۱۹۴۳ء — جون: چھوٹی بہن حنیفہ آبرو بیگم کا بھوپال میں انتقال

۱۹۴۵ء — اپریل: احمد نگر سے بانکوڑا منتقل

۱۹۴۵ء — ۱۵ر جون: رہائی

۱۹۴۵ء ـــ ۲۶ جون: شملہ کانفرنس میں شرکت

۱۹۴۶ء ـــ "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" کی اشاعت

۱۹۴۶ء ـــ اپریل-جون: وزارتی مشن سے گفتگو

۱۹۴۷ء ـــ ۱۵ جنوری: عبوری حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے شرکت

۱۹۴۷ء ـــ ۱۵ اگست: آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم

۱۹۵۱ء ـــ کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر

۱۹۵۲ء ـــ پہلے عام انتخابات میں منتخب ہوئے۔ تعلیم، قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیقات کی وزارت۔

۱۹۵۵ء ـــ دوبارہ کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر

۱۹۵۶ء ـــ مئی تا جون: یورپ اور مغربی ایشیا کا خیرسگالی دورہ[۵]

۱۹۵۶ء ـــ یونسکو کی نویں جنرل کانفرنس دہلی کے صدر

۱۹۵۷ء ـــ دوسرے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ دوبارہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت۔

۱۹۵۸ء ـــ ۱۵ فروری: انجمن ترقی اردو ہند کے اجلاس دہلی میں آخری تقریر۔

۱۹۵۸ء ـــ ۲۲ فروری: وفات، جامع مسجد کے سامنے اردو پارک میں دفن کیے گئے۔

حواشی

۱۔ مولانا آزاد نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۰۸ء میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو لکھا کہ: "والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے۔" (مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری، صفحہ ۷۶) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کے والد کا انتقال ۱۷ اگست ۱۹۰۸ء کو ہوا ہے۔ (عبداللطیف اعظمی)

۲۔ "الہلال" کا جو مشترک شمارہ ضبط کیا گیا تھا، اس کی تاریخیں ۱۲ اور ۱۷ اکتوبر تھیں اور جو مضامین قابلِ اعتراض قرار دیے گئے تھے، وہ "حدیث الجنود" اور "سقوط اسٹروپ" تھے۔ ایک بلجین تصویر بھی قابلِ اعتراض سمجھی گئی تھی جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج تھی: "وما ظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون" (یعنی ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ خود انھوں نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے۔) (عبداللطیف ا

۳۔ میری تحقیق کے مطابق یہ گرفتاری ۱۹۴۱ء میں ۳ جنوری کے سوا پانچ بجے دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے، الٰہ آباد ریلو- اسٹیشن پر ہوئی اور ۸ جنوری کو سٹی مجسٹریٹ الٰہ آباد - ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۳۸ (۵) کے تحت ڈیڑھ قیدِ محض کی سزا دی مگر تقریباً گیارہ ماہ کے بعد رہائی میں آئی۔ (عبداللطیف

۴۔ مولانا آزاد کی کوئی چھوٹی بہن نہیں تھی۔ تین بہنیں تھیں تینوں بڑی تھیں۔ (عبداللطیف

۵۔ یہ سنہ غلط ہے۔ یا تو فاضل مرتب سے سہو ہوا ہے یا طب کی غلطی ہے، صحیح سنہ ۱۹۵۵ء ہے۔ اس سفر یا دور تفصیل یوں ہے: مولانا آزاد ۲۳ مئی ۱۹۵۵ء کو نئی سے بمبئی کو بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئے۔ وہاں سے مئی کو بذریعہ اسٹیمر براہِ کراچی انگلستان کے لیے رواز ۲۶ مئی کو کراچی پہنچے۔ رات کا وقت جہاز کے اندر ہی گذا روز اسٹیمر انگلستان کے لیے روانہ ہوا، روانگی سے پہلے کے وزیر اعظم محمد علی نے مولانا سے ملاقات کی۔ ۸ جولائی میں مولانا نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا، جس میں ظاہر کی کہ انڈیا آفس لائبریری کے مستقبل کا مسئلہ گفت و شنید سے طے ہو جائے گا۔ یورپ سے واپسی ۲۹ جولائی کو نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں اپنے دورہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔ اسی دوران میں ذرا سخ میں فرمایا کہ برطانوی دولت مشترکہ کے سکریٹری کی یہ ہندوستان ایک منٹ کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری برطانوی حکومت کی ملکیت۔ (عبداللطیف اعظمی)

مولانا آزاد ــ کچھ نجی یادیں

کسی شاعر کا مشہور مصرع ہے:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

یہ مصرع اپنی معنویت کے ساتھ حرف بہ حرف مولانا ابوالکلام آزاد کی مجموعۂ صفات شخصیت پر صادق آتا ہے۔ مولانا جہاں اپنی ذات سے سیاست کا ایک مستقل ادارہ اور علم و ادب کا ایک مستقل دبستان تھے۔ وہاں وہ اپنی دلچسپ اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر ایک انجمنِ باغ و بہار بھی تھے۔ جس کے قریب پہنچ کر ایک افسردہ دل انسان بھی شگفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ باغ و بہار شخصیت اپنے اندر علم کی پہنائیوں کے علاوہ ادب کی دلچسپیاں اور رجملہ فنون لطیفہ کی دلکشیاں بھی رکھتی تھی۔ ایک انجمن میں کبھی نغمہ و سرود کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ کبھی شعر و ادب کی گونج اور کبھی علوم و سیاست کی بلند آہنگ اور گمبھیر آوازیں۔

مولانا آزاد کی ذات کو ہم ایک انجمن اسی لیے کہتے ہیں کہ ہم نے بیک وقت ان کی صحبت میں مولانا کے علمی ارشادات بھی سُنے مولانا کی ادبی نکتہ پردازیوں سے بھی مستفیض ہوئے اور مولانا کے سنجیدہ مزاح کے وہ نمونے بھی دیکھے جنھیں ہم مجلسی زندگی کی جان کہہ سکتے ہیں مولانا کا سنجیدہ مزاح لبوں پر تبسم تو لا سکتا تھا لیکن یہ تبسم کبھی قہقہے کی صورت میں نمودار نہیں ہو سکتا تھا۔ اِسے آپ مزاح کی سنجیدگی کہہ لیجیے یا مولانا کی شخصیت کی ادب آموز ہیبت جو بیٹھنے والوں کو ہر حال میں مؤدب رہنے کی تاکید کرتی رہتی تھی۔

مولانا سے میری رسمی ملاقاتیں تو ۱۹۳۴ء سے پہلے بھی ہوئیں لیکن پہلی ملاقات جسے ہم باضابطہ تعارف کہہ سکتے ہیں، وہ اس وقت ہوئی جب کہ میں آل انڈیا اردو لٹریری کانفرنس کلکتہ کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا کو کانفرنس کی شرکت کے لیے دعوت دینے گیا اور رخصت ہوتے ہوئے مولانا سے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ اجازت دی اور کہا کہ بھئی سنیچر کی شام کو آؤ روزہ رکھتے ہو یا نہیں رکھتے ہو لیکن میرے ساتھ افطار کرو۔ پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ تم اتنے بد ذوق تو ہو نہیں کہ اگر روزہ نہ رکھتے ہو تو افطار سے بھی پرہیز کرو۔ میں نے تسلیم کی اور آئندہ حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ تیسرے دن حاضر ہوا۔ مولانا کو اطلاع کرائی۔ مولانا نیچے اترے اس حال میں کہ افطار کا خوان اُن کے پیچھے پیچھے ایک ملازم کے ہاتھوں میں تھا۔ افطار کے بعد چائے آئی اور مولانا نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے کی ایک پیالی بنا کر میری طرف سرکائی۔ مجھے اُس دن زکام کی شکایت تھی میں نے عذر کیا۔ میرے اس عذر پر مولانا کچھ گھبرا سے گئے اور کہنے لگے آپ چائے بالکل نہیں پیتے ہیں یا اس وقت کسی خاص وجہ سے نہیں پی رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں، پیتا تو ہوں، اور شوق سے پیتا ہوں۔ لیکن اس وقت زکام میں مبتلا ہوں۔ یہ سن کر اک ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ الحمدللہ۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ مولانا خدا کا شکر تو بہرحال کرنا چاہیے۔ مگر اس وقت الحمدللہ کہنے کا کوئی خاص سبب؟ کہنے لگے بھئی معاملہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جو چائے پینے سے پرہیز کرنے والے تھے جب جب میری زندگی میں آئے تو میرے لیے خطرناک ثابت ہوئے اور میں ایسے لوگوں سے ڈرنے لگا جو چائے جیسی نعمت سے پرہیز کرتے ہوں۔ یہ معلوم کر کے کہ تم چائے ایک خاص وجہ سے نہیں پی رہے ہو اطمینان سا ہوا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد کچھ علمی بحثیں چھڑ گئیں جن کو اگر یہاں چھیڑا جائے تو اس مضمون کا سلسلہ اتنا دراز ہو کہ ایک چھوٹی سی کتاب بھی اس کے لیے کافی نہ ہو سکے۔ یہ تو معلوم ہے کہ مولانا علم و فضل کے اتھاہ سمندر تھے اور اس کی ہر موج طوفانی ہوا کرتی تھی، ہم نے چار پانچ سال مولانا کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف علوم و فنون پر ان کی بصیرت افروز گفتگو سنی اور اپنی معلومات کی خالی جھولیاں بھرتے رہے لیکن میں اس مقالے میں مولانا کی علمی شخصیت سے گفتگو نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ اس پر مجھ سے بہتر لوگ اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ میں صرف اس مضمون میں مولانا کی نجی صحبت کی ایک ہلکی سی تصویر کشی کروں گا اور ان کے سنجیدہ مزاح کے بعض نمونے سنا کر مولانا کی یاد تازہ کروں گا:

جمیل مظہری (مرحوم)

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

مولانا سے اس پہلی باضابطہ ملاقات کے بعد میں نے اکثر و بیشتر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی اجازت چاہی اور یہ بھی پوچھا کہ اگر خاطر اقدس کو ناگوار نہ ہو تو بعض اور خوش ذوق احباب کو بھی ساتھ لاؤں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی ناگوار خاطر ہونے کی کیا بات ہے میں تو خود چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے نوجوانوں سے باتیں کرنے کا موقع ملے تاکہ یہ اندازہ ہو کہ ہندوستان کی آئندہ نسل کیسی تیار ہو رہی ہے۔ تم آؤ اور ضرور آؤ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لیتے آؤ۔ سنیچر کی شام میری ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اس کے بعد سے ہمارا یہ دستور ہو گیا کہ ہم چند احباب ہر سنیچر کی سہ پہر کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آٹھ بجے رات تک برابر ان کے قدموں کے سامنے بیٹھ کر اپنا دامن تہی پھیلاتے اور جب اٹھتے تو اس دامنِ تہی کو مختلف علمی جواہر ریزوں سے لبریز پاتے۔ اس اثنا میں مولانا کے دلچسپ فقرے بھی ہوتے رہتے جن کا زیادہ تر نشانہ میرے مرحوم دوست پروفیسر طاہر رضوی ہوتے۔ مولانا نے ان کی بھولی اور معصوم شخصیت سے دلچسپی لینی شروع کر دی اور اس کا سبب یہ ہے کہ طاہر مرحوم نے ان ہی دنوں میں پارسی مذہب کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ پارسی، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اہلِ کتاب ہیں۔ مولانا نے وہ کتاب ملاحظہ کی اور پروفیسر طاہر رضوی کی محنتوں کی بھرپور داد دی۔ ایک دن پوچھنے لگے کہ بھئی طاہر اس کتاب کے لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کس راستے سے آیا۔ میں مولانا کی خدمت میں ذرا گستاخ ہو چلا تھا۔ طاہر رضوی کو ستانے کے خیال سے بولا کہ مولانا ممکن ہے محبت کے راستے آیا ہو۔ مولانا مسکرا کر طاہر صاحب سے مخاطب ہوئے۔ دیکھو بھئی تمہارے یہ احباب بڑے ناقدر شناس ہیں۔ تمہارے علمی شغف کو ایک جذباتی انہماک کا نتیجہ بتلاتے ہیں یہ صریحی ظلم ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جب جب مجلس کچھ سونی سی ہونے لگتی تو مولانا طاہر صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھتے اور پوچھتے کہ کہاں بھئی آپ کے احباب کا وہ شبہ اب تک قائم ہے یا رفع دفع ہوا۔ طاہر صاحب کا جھینپنا، مولانا کا مسکرانا اور جملہ احباب کا کھلکھلانا ابھی تک یاد آتا ہے۔

... مولانا باتوں باتوں میں کچھ ایسے جملے بھی کہہ جاتے تھے کہ جن کی اگر شرح کی جائے تو ایک مقالہ ہو جائے مطالب کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کرنا، مولانا کے اندازِ تقریر کی خاص صفت تھی میں نے اکثر ان کی زبان سے علی السبیل تذکرہ ایسے جملے سنے کہ جب ان پر غور کیا تو فکر و نظر کی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی۔ . .

ایک دوسرا لطیفہ بھی سنیے۔ اسی اثنا میں بہار کے محبوب لیڈر پروفیسر عبدالباری بھی کلکتہ تشریف لائے اور ہم ہی لوگوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہ اتفاق سے ان لوگوں میں تھے جو چائے سے پرہیز ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک متنفر بھی تھے۔ میں نے جرأت کر کے مولانا سے پوچھا کہ مولانا آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جو لوگ چائے نہیں پیتے تھے وہ ہمارے لیے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئے، پروفیسر باری بھی اتفاق سے ان ہی لوگوں میں ہیں جو چائے نہیں پیتے۔ ان کے متعلق حضور کی کیا رائے ہے؟ ایک سنجیدہ اور متین تبسم مولانا کے ہونٹوں پر ابھرا اور ارشاد ہوا "نہیں خطرناک تو نہیں لیکن ایک گوشہ ان کے ذہن کا بہرحال خالی ہے سو وہ چائے نہ پینے کا نتیجہ ہے۔" باری صاحب شرمندہ سے ہو گئے اور مولانا نے ان کو شرمندہ دیکھ کر بہار کے سیاسی حالات کی طرف گفتگو کا رُخ پھیر دیا۔

ایک مرتبہ طاہر صاحب کی انگلی میں زخم ہو گیا۔ وہ اپنی انگلی پر کپڑے کی پٹی لپیٹے ہوئے تھے۔ مولانا کی نظر پڑ گئی پوچھا بھئی یہ کیا معاملہ ہے طاہر صاحب؟ طاہر صاحب بولے مولانا، ایک زخم ہے۔ یہ سن کر مولانا کلمے کی انگلی کو اپنے سینے کے بائیں طرف لے گئے اور دل کے قریب رکھ کر بولے۔ طاہر صاحب اس کی جگہ یہاں تھی، کیا غلط جگہ چن لی ہے آپ کے زخم نے۔

ایک مرتبہ مجھے اختلاجِ قلب کی شکایت ہوئی۔ مولانا نے مزاج کی کیفیت پوچھی تو میں اپنا حال بیان کرنے لگا۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی کہا کہ جب تکیے پر سر رکھتا ہوں تو کان بجنے لگتے ہیں۔ اور کچھ بدبداہٹ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ مولانا نے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے بھئی یہ تو نبوت کے آثار ہیں۔

مولانا باتوں باتوں میں کچھ ایسے جملے بھی کہہ جاتے تھے کہ جن کی اگر شرح کی جائے تو ایک مقالہ ہو جائے مطالب کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کرنا، مولانا کے اندازِ تقریر کی خاص صفت تھی میں نے اکثر ان کی زبان سے علی السبیل تذکرہ ایسے جملے سنے کہ جب ان پر غور کیا تو فکر و نظر کی ایک

نئی دنیا سامنے آگئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریسی وزارت بنی اور اس کے ساتھ ہندوستانی کی کانگریسی تحریک کے باوجود اخبارات میں، اسمبلیوں میں، سیاسی جلسوں میں تقریر و تحریر دونوں کے اندر ہندی کے الفاظ کی فراوانی ہونے لگی تو ڈاکٹر اعجاز حسین جعفری نے مولانا سے اس کا شکوہ کیا کہ مولانا یہ کانگریسی لیڈر ہندوستانی زبان کو خالص سنسکرت بنانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے یہ سن کر آنکھیں بند کریں اور صرف یہ فرمایا' ہوسکتا ہے۔ لیکن شخصی جذبات کو اور شخصی پسند کو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر جعفری جب باہر نکلے تو کہنے لگے کہ مولانا نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ مجھ پر زبان کے سلسلے کے تمام مباحث روشن ہوگئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مولانا آخری مرتبہ پٹنہ تشریف لائے اور ڈاکٹر محمود صاحب کی کوٹھی پر ٹھہرے تو میں ان سے ملنے کے لیے گیا۔ شہر کے کچھ مسلمان رؤسا بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا سے ہندوؤں کی فرقہ پرستی کی شکایت کر رہے تھے۔ مولانا کچھ دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے اور اس کے بعد ایک جملہ کہا جو میرے خیال میں ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ سیاست کا نچوڑ ہی نہیں تھا بلکہ ہماری آئندہ سیاست پر ایک ایسا تبصرہ تھا جس پر مستقبل کا مورخ ہمیشہ ماتم کرے گا فرمانے لگے کہ بھئی یہ تو ہوگا ہی اور اس کو ہونا ہی ہے۔ مسلم فرقہ پرستی کو جو کرنا تھا کر چکی۔ اس نے ملک کو دو حصوں میں بٹوا دیا اور ہم باوجود کوشش کے اسے روک نہ سکے۔ اب اس کے ردِ عمل میں ہندو فرقہ پرستی کو جو کرنا ہے وہ کرے گی۔ جب ہم اُسے نہ روک سکے تو اِسے کیا روک سکیں گے۔ یہ سن کر وہ مسلمان رؤسا شرمندہ سے ہو گئے اور جب باہر نکلے تو یہ اعتراف کرتے ہوئے نکلے کہ مولانا نے سچ کہا جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری ہی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے ایک جملے میں حقیقت کا پورا جائزہ لے لینا۔ ایک جملے میں مستقبل کی طرف اشارہ کر دینا۔ ایک جملے میں ماضی و حال کی پوری تاریخ پر تبصرہ کر دینا۔ مولانا کی وہ خطیبانہ خصوصیت تھی جو غالباً ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے قبر میں دفن ہو گئی۔

اب ہم ان خصوصیتوں کو یاد کر کے صرف آنسو ہی بہا سکتے ہیں ایک ٹھنڈی سانس بھر سکتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اور میرے دوست احباب سالہا سال تک مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ مولانا نے علاوہ اپنے علمی فیضان کے ہماری نجی زندگی سے دلچسپی لی۔ ہم میں جو بیکار تھے انھیں باکار بنانے کی کوشش کی۔ جو لوگ مولانا پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ مولانا کے پاس دماغ تو تھا' لیکن سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل نہیں تھا میرا تجربہ ان کے اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ مولانا کے پاس دماغ بھی تھا اور دل بھی تھا اور دل بھی۔ وہ اپنے دوستوں اور معتقدوں کے حالات سے متاثر بھی ہوتے تھے لیکن ان تاثرات کے اظہار کو سنجیدگی اور متانت کے منافی سمجھتے تھے۔ عقل ہر حال میں ان کے جذبات کی رہنما رہی اور سنجیدگی ہر حال میں ان کے قلبی اضطراب کی پردہ پوش۔ مولانا کے کردار کی اس خصوصیت نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں لیکن مولانا نے اپنا یہ مدبرانہ اور عاقلانہ رویہ نہیں بدلا۔

مولانا سے بعض ناواقف کاروں کو یہ بھی شکایت ہے کہ وہ لوگوں سے ملنے جلنے میں فیاض نہ تھے۔ یہ شکایت مولانا کے کرسیِ وزارت پر آنے کے بعد اور قوی ہو گئی اور لوگوں نے عام طور سے کہنا شروع کیا کہ مولانا کو اقتدار کا نشہ ہو گیا ہے۔ ان کی ڈیوڑھی پر سنگینوں کا پہرہ رہتا ہے۔ کوئی غریب شریف مسلمان یا ہندوستانی مشکل سے وہاں پھٹک سکتا ہے۔ یہ بات جتنی زیادہ مشہور ہے اتنی ہی زیادہ غلط ہے۔ بلاشبہ مولانا طبعاً مجلسی ہونے کے باوجود کم آمیز تھے ملنے جلنے کے سلسلے میں اُن کا ایک ضابطہ تھا' ایک معیار تھا جسے وہ اس وقت بھی برتتے تھے جب کہ وہ مسندِ اقتدار پر نہ تھے بلکہ ایک درویش کی طرح کلکتہ میں زندگی بسر کر تھے۔ اس زمانے میں بھی مولانا کے یہاں حاجب و دربان رہا کرتے تھے اور ہر شخص مولانا سے بآسانی مل سکتا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ مولانا کی نیم درویشانہ او اور نیم فلسفیانہ طبیعت اپنے وقت کی آپ مالک رہنا چاہتی تھی۔ وہ جب ادبی موڈ میں ہوں تو اس وقت نہ سیاسی گفتگو پسند کرتے تھے نہ سیاسی لوگوں سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ جب علمی موڈ میں ہوں تو اس وقت ادب، مزاح یا اس قسم کے لوگوں کی ان کے یہاں گنجائش نہ تھی۔ او جب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوں تو ان کا کسی سے ملنا سینے پر پہاڑ رکھنے کے برابر تھا ان کا خلوت کدہ ان کی ایسی محدود دنیا تھی جس میں وہی آسکتا تھا جو مولانا کے معیار پر پورا اُترتا اس کے علاوہ مولانا کا وقت معین تھا۔ جب وہ اپنے خاص دوستوں سے ملتے ہوتے تو اس وقت عام لوگوں کو بالکل باریابی نہ ہوتی وہ کتنے ہی مقتدر اور صاحبِ عز کیوں نہ ہوں۔ اگر مولانا کسی خاص مشغلے میں منہمک ہیں تو انھیں واپس آنا پڑتا۔ استاد محترم مولانا رضا علی وحشت مرحوم جو مولانا کے بچپن کے دوستوں میں تھے' ناقل تھے کہ ایک مرتبہ وہ مولانا کی خدمت میں تھے شعر و شاعری کا تذکرہ تھا کہ دفعتاً

موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ خادم خاص نے ایک کارڈ لاکر دیا۔ مولانا نے کارڈ دیکھ کر کہا کہ کہہ دو اس وقت میرے بہت ہی پرانے اور خاص دوست آئے ہوئے ہیں اور اُن سے میں نجی گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر مولانا نے جب کارڈ میز پر رکھا تو حضرت وحشت نے دیکھا کہ وہ کارڈ مسٹر سی۔ آر۔ داس کا تھا جو اس وقت بنگال کے بے تاج بادشاہ تھے۔

میرا خود یہ تجربہ ہے کہ ہم چند غریب طالب علم بیٹھے ہیں مولانا کی خدمت میں کہ ایک مرتبہ سر ناظم الدین اور ایک مرتبہ سر عبدالحلیم غزنوی واپس کر دیے گئے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں اور گاندھی جی تشریف لائے تو مولانا نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ شام کو میں خود آپ سے ملوں گا۔ جب مولانا کا یہ عالم اس زمانے میں تھا جسے ہم زمانۂ درویشی کہہ سکتے ہیں تو پھر والیانِ ملک، وزرائے سلطنت اور حکام ذی وقار زمانۂ وزارت میں اگر واپس کر دیے گئے تو کون سی بڑی بات ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ شاید ہی کوئی غریب ان کی ڈیوڑھی سے بغیر ملے ہوئے واپس آیا ہو۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ادھر تین سال کے عرصے میں ہر سال دلی گیا اور بعض ایسے اوقات میں پہنچا کہ مولانا بہت مصروف تھے اور ان کے سکریٹری مولانا اجمل خاں صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ مولانا اتنے مصروف ہیں کہ فلاں مہاراجہ یا فلاں وزیر کو وقت نہ دے سکے میں نے ان سے کہا کہ خیر میرا نام مولانا کی خدمت میں پہنچا دیجیے یہی کافی ہے۔ لیکن جب مولانا کی خدمت میں میرا نام پہنچا تو مجھے بلایا گیا۔ اور مجھے وقت دیا گیا۔

میرے ایک عزیز خاص سید اختر حسین رئیس اکبر پور کا بیان ہے کہ مولانا سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن غریب کے آنسو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایام وزارت میں ضابطے کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن کبھی کبھی غریب کے آنسوؤں کی دھار میں اس ضابطے کا حصار بھی ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ مولانا اپنی کوٹھی سے باہر نکلے ہیں۔ موٹر پر سوار ہو رہے ہیں۔ ایک غریب برساتی میں کھڑا ہے۔ مولانا کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ مولانا اجمل خاں صاحب کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بھئی یہ جو چاہتے ہیں کر دو" غریب بہت پریشان حال معلوم ہوتا ہے۔

یہ تھے ہمارے مولانا ابوالکلام آزاد، جنھیں دنیا نے ان کی زندگی میں ہمیشہ غلط سمجھا لیکن مجھے یقین ہے کہ جب مولانا کی زندگی کی سچی تصویر دنیا کے سامنے آئے گی تو وہ محسوس کرے گی :

تو ظہوری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز رفتی و کسے قدرِ تو نشناخت دلے

(بہ شکریہ "بہار کی خبریں" اگست ۵۸، بہ توسط جناب شاکر انصاری)

علمائے دنیا پرست

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایۂ ناز علمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علمِ جدل و خداع ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔ فساق و فجار، خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ صحت پیتے ہیں اور چور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانق[اہ] میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمی[شہ] ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا او[ر] پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے ا[و]ر پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر ہمیں محرا[ب] مسجد کے نیچے پیشوائی و امارت کے لیے ان میں سے ہ[ر] ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آ[نکھ] دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مس[یح] علیہ السلام نے احبار و یہود سے فرمایا "تم نے داؤد [کے] گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے۔" ڈاکوؤں کے بھ[ٹ] کا حال تو نہیں معلوم، لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن می[ں] بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشا[م] دانت مارتے دیکھا ہے۔

(ملفوظاتِ از

مولانا آزاد — چند ملاقاتیں

مولانا آزاد کا نام زبان پر آتے ہی غالب کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

دُنیائے فانی میں کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جنھیں تاریخ بناتی ہے اور کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جو خود تاریخ بناتے ہیں جنھیں تاریخ ساز کہا جاتا ہے بے شک مولانا آزاد ایک ایسی ہی تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔

میری پہلی ملاقات اُن سے تب ہوئی جب مَیں ایک وفد کے ساتھ اُن کے دولت کدے پر گیا۔ جب وفد بات چیت کرکے اُن سے رُخصت ہونے لگا تو مولانا نے مجھے روک لیا۔ سب لوگ چلے گئے تو مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے خادم کو آواز اور مجھے اپنے نزدیک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ مَیں ازراہ ادب و احترام ذرا ہٹ کر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اُن کے اصرار پر ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں خادم نے چائے سامنے لاکر رکھ دی۔ مَیں چائے سے نفرت کرتا ہوں اور شاید یہ بات مبالغہ نظر آئے لیکن میں نے اپنی ساری زندگی میں چار پانچ دفعہ چائے چکھی ہوگی۔ اب میرے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہوگئی اور مولانا کی عظمت کا اثر تھا کہ مَیں نے چُپکے سے چائے کی پیالی لے لی اور ایک دو گھونٹ احتراماً پی بھی لیے۔ مَیں نے سُن رکھا تھا کہ مولانا چائے کے رسیا ہیں اور خود چائے تیار کرنے میں بھی ماہر ہیں۔ اسی دوران میں مولانا مجھ سے پھر مخاطب ہوئے اور فرمانے لگے کہ بیدی صاحب گو میں آپ سے پہلے مِل نہیں پایا لیکن آپ کے بارے میں لوگوں کی زبانی بہت کچھ سُن چکا ہوں مَیں نے گذارش کی کہ خُدا کرے کہ آپ کو تصویر کا ایک ہی رُخ نہ دکھایا گیا ہو اس پر مُسکرانے لگے اور فرمایا کہ مجھے آپ کی تصویر کے سب رُخ معلوم ہیں اور وہاں کوئی کالا داغ نہیں ہے۔ مولانا کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ مولانا سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے اور ان کی اس فطرت سے سب واقف تھے۔ جب خادم نے چائے بڑھادی تو فرمانے لگے کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے۔ ہم آزاد بھی ہو گئے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اب محنت ایثار رواداری اور امن و آشتی کی ضرورت ہے آزادی مِلی ہے تو آزادی کی کچھ ذمہ داریاں بھی ساتھ لائی ہے جن سے اگر ہم عہدہ برآ نہ ہوسکے تو غلامی سے بدتر حالات رونما ہو جائیں گے پھر فرمانے لگے کہ اس وقت ہمیں ایسے کارکنوں کی اشد ضرورت ہے جو فرقہ وارانہ اور متعصب عناصر کو نہ پنپنے دیں آپ کے بارے میں لوگ اچھی رائے رکھتے ہیں اور مَیں خوش ہوں کہ آپ آج مجھ سے ملے۔ مَیں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور یقین دِلایا کہ اپنی بساط کے مطابق ملک کی خدمت کرنے کی سعی کروں گا۔

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وقت گزرتا گیا حالات بھی بدلتے گئے اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہندو مسلم تفرقات کی وجہ سے ملک کی فضا مکدر ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ تقسیم وطن کے دوران میں اور فوراً ہی بعد جو قتلِ عام اِدھر اور اُدھر ہوا اُس سے اتنے گہرے زخم لگے تھے کہ ان کے مندمل ہونے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت چونکہ اپنے ہاتھوں میں آگئی تھی سبھی فرقے اور گروہ چاہتے تھے کہ سارا اقتدار اور اختیار اُنھیں ہی حاصل ہو اور پھر خود غرض لیڈر اور سیاستدان ایسے جذبات کو دیدہ ودانستہ اُبھار رہے تھے۔ ان حالات میں اس رو میں بہہ جانا تو آسان تھا لیکن اس سے ملک کا مستقبل اور بھی تاریک ہو جاتا۔ اس وقت جو چند ہستیاں مشعلِ راہ بنیں اور جنھوں نے چٹان کی طرح ہر طوفان کا مُنہ موڑ دیا مولانا آزاد اُن میں سے ایک تھے۔ گاندھی جی، نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے رہبرانِ قوم نے ہی اس آڑے وقت میں قوم اور ملک کی رہنمائی کی۔

مجھے مولانا سے ملنے کے اَن گنت مواقع ملے۔ مَیں نے کبھی بھی ان کو غصے میں نہیں دیکھا۔ بڑے متحمل مزاج تھے اور ہر مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کچھ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی اور نہرو جی ان کی رائے کی قدر کرتے تھے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
W-57۔ گریٹر کیلاش پارٹ I۔ نئی دہلی۔

تقسیم کے فوراً ہی بعد رفیوجیوں کو بسانے
سئلہ سامنے آیا۔ جو مکان مسلمان خالی کر گئے
ان پر رفیوجیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور کچھ لوکل لوگوں
مل لگا رکھے تھے۔ جن میں سے بعض نے رفیوجیوں
بلڈی لے کر ایسے کچھ مکان ان کے حوالے کر دیے۔
رحکومت کا تقاضہ تھا کہ ایسے سب مکان خالی
ے جائیں۔ چنانچہ میری اور چند اور حضرات
نیوٹی لگائی گئی کہ یہ مکان خالی کرائے جائیں اور
سجدیں بھی جن پر رفیوجیوں نے قبضہ کر رکھا
۔ ہم لوگوں نے کافی محنت اور منت سماجت
بہت سے مکان اور مسجدیں خالی کروالیں
ن کچھ لوگوں نے مولانا سے شکایت کی کہ کام کی
نار سست ہے۔ چنانچہ مولانا کے سامنے
ی پیشی ہوئی۔ جب مولانا کے سامنے سارے
نعات رکھے گئے تو انھوں نے شکایت کرنے
وں کو سمجھایا کہ کام ٹھیک ڈھنگ سے ہو رہا
اور اس میں جلد بازی کی گئی تو اس کا اثر اُلٹا
گا بالآخر جب خدا خدا کر کے یہ کام تمام ہوا تو
انا نے مجھے یاد فرمایا اور میری پیٹھ ٹھونکی اور
دھی جی کو یہ تمام رپورٹ دی۔

وقت گزرتا گیا، میں دہلی سے تبدیل
رسونی پت روہتک ہوتا ہوا گوڑگاؤں ڈپٹی
شنر لگ گیا۔ وہاں بھی میووں کو از سرِ نو
دکرانے کا مسئلہ تھا لیکن وہ بھی بخوبی حل
گیا۔ مولانا کو مجھ پر اعتماد تھا اور میرے لیے
بات باعثِ فخر تھی۔ کچھ عرصہ بعد لوک سبھا کا
ؤ تھا۔ مولانا نے مجھے یاد فرمایا اور باتوں باتوں
ذکر کیا کہ ان کو کئی اضلاع سے چناؤ لڑنے
پیش کش کی گئی ہے لیکن ان کا ارادہ گوڑگاؤں
لڑنے کا ہے چنانچہ وہ گوڑگاؤں ہی سے لڑے

الکشن کے دوران میں مخالف سیاسی جماعتوں نے
یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مولانا ڈنڈے
کے زور سے ووٹ لینا چاہتے ہیں ورنہ ان کو
چاہیے تھا کہ وہ لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے آتے۔
اجمل خاں نے مجھ سے دریافت کیا کہ میری کیا رائے
ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک میں عوام کی نبض
دیکھ سکا ہوں وہ مولانا کے حق میں ہیں اور اگر
مولانا کو آنا ہی ہے تو الیکشن کے بعد عوام کا شکریہ
ادا کرنے کے لیے آئیں۔ چنانچہ الیکشن ہوا۔ مخالف
پارٹیوں نے لاکھ کوشش کی لیکن مولانا کو شاندار

... ایک روز میں اور جوش صاحب مولانا
کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوش صاحب کو کچھ کام
تھا لیکن میں یوں ہی ساتھ ہو لیا۔ مولانا ملاقاتیوں
میں گھرے ہوئے تھے جب کچھ دیر رکنے کے بعد بھی
ہماری باریابی نہ ہو سکی تو جوش صاحب کہنے لگے
بھئی ہم تو اب چلتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً
یہ شعر لکھ کر چپراسی کے حوالے کیا اور چل پڑے:
نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

کامیابی نصیب ہوئی۔ الیکشن کے ایک ہفتہ بعد
مولانا نے گوڑگاؤں ضلع کا دورہ کیا اور پل وَل
فرید آباد گوڑگاؤں وغیرہ میں بڑے بڑے جلسوں
کو خطاب کیا اور شکریہ ادا کیا لوگ عام طور پر
الیکشن کے بعد بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے
الیکشن کے دوران میں کیا کیا وعدے لوگوں کے
ساتھ کیے ہیں لیکن مولانا نے گوڑگاؤں کے لوگوں
کا پورا پورا خیال رکھا اور ہر مناسب موقع پر
امداد بھی فرمائی۔

میں نے مولانا کے 'الہلال' کے کئی شمارے
پڑھ رکھے تھے اور "غبارِ خاطر" بھی نظر سے گذر چکی تھی۔
نثر لکھنے میں وہ یقیناً صاحبِ طرز تھے مرصع مگر
صاف زبان میں بڑے موثر انداز سے سب بات کہہ
جاتے تھے۔ تقریر بھی اُن کی انھیں خوبیوں کی حامل
تھی۔ فارسی کے اشعار ان کو ہزاروں یاد تھے اور
اپنی تحریروں میں انھیں کثرت سے استعمال بھی
فرماتے تھے۔ مولانا کے حافظے کے بارے میں یہ
مشہور تھا کہ کسی کو ایک بار دیکھ لیتے تو وہ ان کے
ذہن پر اس طرح نقش ہو جاتا تھا جیسے کیمرے
میں تصویر۔

ایک روز میں اور جوش صاحب مولانا
کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوش صاحب کو کچھ
کام تھا لیکن میں یوں ہی ساتھ ہو لیا۔ مولانا
ملاقاتیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جب کچھ دیر رکنے
کے بعد بھی ہماری باریابی نہ ہو سکی تو جوش صاحب
کہنے لگے بھئی ہم تو اب چلتے ہیں۔ میں نے انھیں
لاکھ سمجھایا کہ مولانا نے تو آپ کو نہیں وقت دیا
آپ خود ہی تشریف لائے ہیں ذرا اور انتظار کیجیے۔
جوش صاحب ان معاملات میں ضرورت سے
زیادہ حساس تھے چنانچہ انھوں نے فوراً ہی یہ شعر
لکھ کر چپڑاسی کے حوالے کیا اور چل پڑے:

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

ابھی ہم دس بیس قدم ہی گئے ہوں گے کہ
اجمل خاں ہانپتے ہانپتے ہمارے پاس آئے اور
کہا کہ مولانا کو تو آپ کے آنے کا علم ہی اب ہوا
ہے آپ آیئے مولانا یاد فرما رہے ہیں چنانچہ ہم
لوٹ آئے اور مولانا نے ہمیں بُلا لیا اور معذرت کی
کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ فرمانے لگے کہ تمام وقت
سیاسی لوگوں کی صحبت میں گذر جاتا ہے جی بہت

چاہتا ہے۔ کہ کبھی کبھار علمی صحبت بھی میسر ہوتی رہے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ دو چار دس دن میں کبھی تشریف لے آیا کریں تو کچھ راحت ملے۔ جوش صاحب نے وعدہ فرمالیا۔ مَیں تو چونکہ جوش صاحب کے ساتھ تھا مولانا نے مجھے بھی یہ دعوت دی حالانکہ ان دونوں حضرت کے سامنے میری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی بھی نہیں تھی۔

اسی سلسلے میں ہم ایک شام آٹھ بجے کے قریب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اجمل خاں آئے اور کہنے لگے کہ "مولانا پنڈت جواہرلال جی کا فون آیا ہے کہ وہ کسی ضروری مشورے کے لیے آپ کے پاس آرہے ہیں" یہ سُن کر مولانا نے اجمل خاں صاحب سے کہا کہ پنڈت جی کو فون کر دو کہ مَیں ابھی فارغ نہیں ہوں۔ مَیں نے اور جوش صاحب نے لاکھ کہا کہ ہمارا تو کوئی خاص کام تھا ہی نہیں یوں ہی چلے آئے تھے آپ ہماری وجہ سے پنڈت جی کو نہ روکیں لیکن مولانا نہیں مانے۔ اتنے میں پھر اجمل خاں آگئے اور کہنے لگے کہ پنڈت جی تو گھر سے چل پڑے ہیں اور دو چار منٹ میں آتے ہی ہوں گے۔ ہم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن مولانا نہیں مانے۔ اتنے میں پنڈت جی آگئے تو مولانا نے اجمل خاں صاحب سے کہا کہ پنڈت جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دو۔ اس کے بعد بھی مولانا نے پانچ سات منٹ ہم لوگوں کے ساتھ گذارے لیکن جب انھیں احساس ہو گیا کہ ہمیں سخت کوفت ہو رہی ہے تو فرمانے لگے آپ ابھی جائیے نہیں مَیں پنڈت جی سے بات کر کے آتا ہوں۔ چنانچہ دس بیس منٹ کے بعد مولانا تشریف لائے اور آدھ پون گھنٹہ ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے سے مولانا کی عظمت، خودداری، مہمان نوازی اور وقار کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے ورنہ کتنے آدمی ایسے ہوں گے جو پنڈت جی کو آنے سے روک دیتے

جوش صاحب اُردو شاعری کے بادشاہ تھے۔ جتنا ذخیرۂ الفاظ اُن کے پاس تھا شاید کسی اور کو نصیب نہ ہوا ہو لیکن صرف دو ایسی ہستیاں تھیں جن کے سامنے جوش صاحب خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھتے اور وہ مولانا آزاد اور مولانا عبدالسلام نیازی۔ ایک روز مَیں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ جب کبھی آپ مولانا آزاد یا مولانا عبدالسلام نیازی سے ملتے ہیں تو اکثر خاموش ہی رہتے ہیں کیا وجہ ہے تو جوش صاحب کہنے لگے کہ یہ دونوں حضرات اسی قدر پڑھے لکھے اور عالم ہیں کہ ان کے سامنے مُنہ نہ کھولنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

مولانا کا سگریٹ نوشی کا بھی عجب انداز تھا۔ انگوٹھے اور پہلی اُنگلی کے درمیان سگریٹ کو لے کر آہستہ آہستہ گُھماتے بھی رہتے تھے اور کش بھی لگاتے تھے جس سے انھیں سگریٹ کی ایش گرانے کے لیے جھٹکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اتنے میں مَیں دہلی سے ذرا دُور سنگرور ضلع میں ڈپٹی کمشنر ہو کر وہاں چلا گیا۔ وہاں سے بھی ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ بار دہلی آنا ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں اس دوران میں ان سے ملنے گیا تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے مَیں نے گذارش کی کہ حالانکہ پینشن کا زمانہ قریب آگیا ہے لیکن مَیں نے کبھی اس معاملہ پر غور نہیں کیا۔ فرمانے لگے کہ آپ کو سیاست میں آنا چاہیے اور یہ بھی فرمایا کہ جب آپ ریٹائرڈ ہوں گے تو میں آپ کو راجیہ سبھا میں نامزد کراؤں گا یا اگر آپ چاہیں کے تو کانگریس سے ٹکٹ دلوا دوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ مَیں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سنگرور سے فون پر ان کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ اجمل خاں سے بات ہوتی تھی اور وہ فرماتے تھے کہ اب دوا کی نہیں دُعا کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مَیں نے کیا لاکھوں، کروڑوں لوگوں نے دُعائیں مانگی ہوں گی لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے۔ دو دن کے بعد مولانا اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے جو اس دُنیا میں آیا ہے اُسے ایک روز جانا بھی ہے لیکن مولانا کی وفات سے ملک کی سیاست میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جو اب تک بھی نہیں پُر ہو سکا۔

مرحبا اے ابوالکلام آزاد۔ تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانوں میں خود رہا رہوں۔ ملک کو قید سے کیا آزاد

مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور اور مقبول ترین کتاب
بارِ خاطر" کے ایک خط ۱۱راگست ۱۹۴۲ء میں اپنی گرفتاریوں اور
زاؤں کے بارے میں لکھا ہے: "قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔
لا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند
ں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے
ی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اُسی منزل سے قافلۂ باد پیمائے عمر
زر رہا ہے:

بازمی خواہم زسر گیرم رہِ پیمودہ را

جلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس
ٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ۵۳ برس جو گزر چکے ہیں ان سے
مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے، گویا زندگی کے
ر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گزرا۔ تورات کے احکام عشرہ
ں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا، یعنی ہفتے کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس
ن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی، سو ہمارے
ے میں بھی سبت کا دن آیا، مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں، گویا
اجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے:

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خورد نہ ماہ پارسائی باش

ت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب
رتا ہے، اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس
ر صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود"

مولانا نے حاشیے میں مزید لکھا ہے: "یہ مکتوب ۱۱راگست ۱۹۴۲ء
کو لکھا تھا، اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے اور
مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہو گئی۔
اس اضافے کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ اس کا افسوس
ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصے کی مناسبت کی بات مختل ہو گئی اور سبت
کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔"

مولانا آزاد نے اپنے اس خط میں اپنی گرفتاریوں اور سزاؤں
کی جو مجموعی مدت لکھی ہے، وہ محض تخمینی ہے، مگر چونکہ لوگوں کے
سامنے اس کے علاوہ کوئی اور تفصیل نہیں ہے، اس لیے مجبوراً اسی کا
حوالہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے غلطیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا
اخبارات سے تحقیق کرنے کے بعد ذیل میں جملہ گرفتاریوں اور سزاؤں کی
صحیح مدت تاریخ وار پیش کرتا ہوں:

نمبر	کیفیت	تاریخ	مدت
۱۔	رانچی کی نظربندی	اواخر مارچ ۱۹۱۶ء	تقریباً ۳ سال ۹ ماہ
	رہائی	یکم جنوری ۱۹۲۰ء	
۲۔	گرفتاری	۱۰ردسمبر ۱۹۲۱ء	مقدمے کی مدت شامل کرکے تقریباً ایک سال ایک ماہ
	سزا	۹رفروری ۱۹۲۲ء	
	رہائی	۶رجنوری ۱۹۲۳ء	
۳۔	گرفتاری	۲۱راگست ۱۹۳۰ء	تقریباً ۶ ماہ
	رہائی	۲۷رجنوری ۱۹۳۱ء	
۴۔	گرفتاری	۱۲رمارچ ۱۹۳۲ء	۲ ماہ
	رہائی	۱۱رمئی ۱۹۳۲ء	
۵۔	گرفتاری	۳رجنوری ۱۹۴۱ء	تقریباً گیارہ ماہ
	سزا	۸رجنوری ۱۹۴۱ء	
	رہائی	۴ردسمبر ۱۹۴۱ء	

عبداللطیف اعظمی

۲۳۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

● ابوالکلام آزاد: غبار خاطر (تیسرا ایڈیشن) صفحات ۵۵-۵۶۔

۶۔ گرفتاری : ۹ اگست ۱۹۴۲ء]
رہائی : ۱۵ جون ۱۹۴۵ء] ۳ سال ۲۴ دن

کل مدت : ۹ سال ۷ ماہ ۲۴ دن

یعنی : ۳,۵۱۹ دن تقریباً

عمر کی کل مدت : ۶۸ سال ۷ ماہ ۹ یا ۱۰ دن

یعنی : ۲۵۰۴۰ دن تقریباً

اس نئے حساب سے بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو مولانا آزاد کے حساب سے نکلا تھا، یعنی کل زندگی کا ساتواں حصہ جیل میں گزرا، گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گزرا۔ اس طرح مولانا کو جو افسوس تھا کہ : " وہ ساتویں حصّے کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا " وہ از سرِ نو درست ہوگیا۔

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوائیے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبّی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

—— ادارہ

آزاد وادیِ صحافت میں

(۱۹۰۸ء تک)

عبدالقوی دسنوی
اردو ڈپارٹمنٹ، سیفیہ کالج، بھوپال (ایم۔ پی)

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا مطالعہ اور ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ لینے سے یہ بات بہت واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ ان کی دیگر خصوصیات اور خوبیاں جو کچھ بھی ہوں، وہ علم و عرفان کی جس بلندی پر پہنچ گئے ہوں، فکر و عمل کی جن منزلوں کو انھوں نے پالیا ہو، وہ ایک صحافی کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، اسی وجہ سے ابھی وہ نثر کی ابتدائی منزل میں ہی تھے کہ "المصباح" جاری کر کے صحافت کی راہ پر چلنے کا اعلان کر دیا تھا اور پھر اس راہ پر تقریباً اٹھائیس سال تک چلتے رہے۔

اس سفر کے ابتدائی سرے کی اگر تلاش کی جائے تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا سرا، ان کی ابتدائی شعر و شاعری سے جا ملتا ہے۔ اسی زمانے میں انھیں احساس ہوا تھا کہ شعر و شاعری کا لطف گلدستوں میں کلام کی اشاعت سے ہے۔ چنانچہ جب پہلی بار ان کا کلام "ارمغان فرخ" بمبئی میں شائع ہوا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بہت دنوں تک ایک عجیب سرشاری کی کیفیت سے سرشار رہے۔

گلدستوں کی شعر و شاعری میں اہمیت اور ابتدائی زمانے کے کلام کے اُن میں چھپنے کی پوشیدہ لذت نے مولانا آزاد کے دل میں گلدستہ نکالنے کی خواہش پیدا کر دی، جس کی تکمیل شاید ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" نامی گلدستہ نکال کر انھوں نے کی۔ لیکن اس نے مختصر عمر غالباً اس لیے پائی کہ مولانا آزاد نے جلد ہی ایک ادبی رسالہ "المصباح" نکالنے کا نہ صرف فیصلہ کر لیا۔ بلکہ جنوری ۱۹۰۱ء[1] میں اسے نکالنے میں کامیابی حاصل کی، جسے انھوں نے علمی، تاریخی اور سوانحی مضامین کے لیے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے شمارے دستیاب نہیں ہیں نہ ہی اس کا علم ہو سکا کہ اس کے کتنے شمارے منظر عام پر آئے اور کب، اور کن حالات میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ قیاس یہی ہے کہ اس کے تین چار شمارے ہی شائع ہو سکے تھے۔ مولانا آزاد کی ادارت میں یہ پہلا ادبی ماہنامہ تھا۔ جس نے بحیثیت نثر نگار آزاد کو ایک محدود حلقے سے روشناس کرایا تھا۔ یہ رسالہ چونکہ عید کے موقع پر نکلا تھا اس لیے مولانا آزاد نے "عید" سے متعلق ایک مضمون پہلے ہی شمارے کے لیے قلمبند کیا تھا، جو بعد میں دوسرے اخباروں میں بھی نقل کیا گیا تھا۔

"المصباح" کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد ہفتہ وار "احسن الاخبار" سے منسلک ہو گئے۔ یہ ہفتہ وار احمد حسن صاحب کی ادارت میں ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ مولوی احمد حسن کو مولانا آزاد کی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا۔ اس لیے اخبار کا تقریباً تمام کام ان کے سپرد کر دیا تھا، اسی اعتماد کی وجہ سے مولانا آزاد کا لکھا ہوا براہِ راست کاتب تک پہنچ جاتا تھا مولوی احمد حسن دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

یہیں مولانا آزاد کو غیر ملکی عربی اخبارات اور رسائل دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا جن کے مطالعے سے انھیں دنیائے اسلام سے گہری دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی "احسن الاخبار" کے لیے مولانا آزاد بعض اہم تحریروں کے ترجمے بھی کرتے تھے۔ اسی اخبار میں مولانا آزاد کا ایک مضمون "اسلام اور محرم" کے موضوع پر شائع ہوا تھا جس نے بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔

اسی زمانے میں حکیم محمد علی کی ادارت میں "مرقع عالم" ہردوئی سے نکلتا تھا جس میں آزاد کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ جون ۱۹۰۲ء میں حکیم محمد علی کے نام مولانا آزاد کا ایک مکتوب شائع ہوا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون "مرقع عالم" میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس خط میں مولانا آزاد نے اڈیٹر کو اس بات پر توجہ دلائی تھی کہ "مرقع عالم" میں سائنس سے متعلق جو مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان کی روک تھام کی فکر بھی کرنی چاہیے۔

یہ آزاد کی پہلی تحریر ہے جس سے ان کی صحافت سے باخبری کا پتا چلتا ہے۔ ماہنامہ "مخزن" لاہور جو اپنے زمانے کا نہایت معیاری رسالہ تھا مولانا آزاد کی دو نثری تحریریں "فن اخبار

---

[1] ارمغان آزاد: ابوسلمان شاہجہانپوری۔ ص۔ ۱۰۸

نویسی" (مئی ۱۹۰۲ء) اور حکیم خاقانی شروانی (اگست ۱۹۰۲ء) شائع ہوئی تھیں۔ اس کم عمری میں ان تحریروں نے اہل نظر کو مولانا آزاد کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

• "فن اخبار نویسی" مولانا آزاد کا پہلا مضمون تھا جس سے ان کی صحافت سے گہری دلچسپی اور باخبری کا پتا چلتا ہے۔ اس عمر میں ان کی یہ باتیں حیرت میں ڈالتی ہیں:

"یورپ اور امریکہ نے جو آج کل حیرت انگیز ترقی کی ہے اور علوم و فنون تہذیب و شائستگی میں جو ان کا آج طوطی بول رہا ہے ان میں منجملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب اخبار دیکھنا ہے جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اور بچے سے لے کر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے اور علمی عملی فیوضات حاصل کرتا ہے۔"

انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے:

"اخبار دراصل زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے۔"

۱۹۰۲ء ہی میں مولانا آزاد کی مندرجۂ ذیل تحریریں ہفتہ وار 'البنچ' پٹنہ میں چھپی تھیں۔

۱۔ جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ ۵ر جولائی ۱۹۰۲ء۔

۲۔ اک بت سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد ۴ر اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

پہلی تحریر مشاعرے کی روداد ہے جس کے مطالعے سے اس وقت کے مولانا آزاد میں انگریزوں سے کسی نفرت کے احساس کے بجائے "انگریز بہادر" کی حکومت سے "وفادار رہنے" کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کے ذہنی سفر کو سمجھنے اور اس کی ارتقائی منازل سے آگاہی کے لیے اس مضمون کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں دوسری تحریر بھی بڑی معاون ہے اور ان کے قومی شعور پر روشنی ڈالتی ہے۔

'ایڈورڈ گزٹ' شاہجہانپور پہلا ہفتہ وار تھا جس کے مولانا آزاد باضابطہ وقتی اڈیٹر تھے۔ لیکن ابھی اس کی ایڈیٹری کے زمانے کا صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے نہ اس کے شمارے اب تک دستیاب ہو سکے ہیں جن کے مطالعے سے صحیح صورت حال سے واقفیت ہو۔

'احسن الاخبار' بند ہو جانے کے بعد سید احمد حسن صاحب کو ایک بار پھر "تحفۂ احمدیہ" جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بات کا علم جیسے ہی مولانا کو ہوا انھوں نے احمد حسن صاحب کو اس خیال کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ احمد حسن تیار ہو گئے۔ مگر اس شرط پر کہ آزاد اس کی ترتیب کی ذمہ داری سنبھالیں۔ آزاد تو خواہشمند تھے ہی ان کی شرط مان لی۔ اس طرح یہ رسالہ بظاہر احمد حسن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ لیکن ترتیب کی ذمہ داری آزاد ہی سنبھالے رہے۔

> ...اس سفر کے ابتدائی سرے کی اگر تلاش کی جائے تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا سرا ان کی ابتدائی شعر و شاعری سے جا ملتا ہے۔ اسی زمانے میں انہیں احساس ہوا تھا کہ شعر و شاعری کا لطف گلدستوں میں کلام کی اشاعت سے ہے...

اسی زمانے میں ایک نہایت صاف ستھرا اور معیاری رسالہ "خدنگ نظر" منشی نوبت رائے نظر کی ادارت میں لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔ مولانا آزاد کی اس رسالے سے دلچسپی لینے کی وجہ سے منشی نوبت رائے نظر نے اس کے حصۂ نثر کی ذمہ داری انھیں سونپ دی۔ چنانچہ آزاد نے مارچ ۱۹۰۳ء کے بعد بحیثیت اسسٹنٹ اڈیٹر اس رسالے کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ اس عہدے کو سنبھالنے سے پہلے ان کے حسب ذیل مضامین اس رسالے میں شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ زمانۂ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک (دو قسط) مئی، جون۔ ۱۹۰۲ء۔

۲۔ پنکچوئیشن۔ غالباً اکتوبر ۱۹۰۲ء

۳۔ مبادلۂ سنین جنوری ۱۹۰۳ء

۴۔ آثار قدیمہ فروری ۱۹۰۳ء

۵۔ منار خسرو گرد (بسلسلۂ آثار قدیمہ) مارچ ۔ ۱۹۰۳ء

اور "خدنگ نظر" کے حصۂ نثر کی ادارت سنبھالنے کے بعد مولانا آزاد کی یہ تحریریں منظر عام پر آئیں۔

۶۔ افغانستان اپریل ۱۹۰۳ء

۷۔ ضوء غیر مرئی (دو قسط) مئی، جولائی۔ ۱۹۰۳ء۔

ان تحریروں کے مطالعے سے مولانا آزاد کی اس عمر میں مختلف موضوعات تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور دوسرے علوم سے لگاؤ ہی کا پتا نہیں چلتا اس وقت ان کی توقعات اردو رسائل سے کیا تھیں ان سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب وہ ایک طرف تعلیم سے فارغ ہو رہے تھے تو دوسری طرف کلکتہ کی شعری فضا میں دھوم مچا کر اس سے علیحدگی اختیار کرنے کی فکر میں تھے اور نثری میدان میں ایک خاص انداز فکر کے ساتھ قدم جمائے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اردو صحافت میں اپنی پہچان

کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور اس حد تک وہ کامیاب ہو چکے تھے کہ اہلِ علم اور اصحابِ فکر کی آنکھیں ان کی طرف اٹھنے لگی تھیں اور وہ انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ پندرہ سال کے نوعمر لڑکے نہیں ہیں بلکہ کوئی سن رسیدہ تجربہ کار صحافی اور باصلاحیت شخص ہیں۔

طالب علمی کے زمانے کی نثر نگاری اور صحافتی تجربوں نے ہمت بندھائی اور اب آزاد اپنا ایک بامقصد ماہنامہ نکالنے کی فکر کرنے لگے۔ دھن کے پکے تھے، حوصلہ مند تھے، بلند ہمت تھے۔ خواہشات کو عملی جامہ پہنانا جانتے تھے۔ اسی لیے اس خواہش کی تکمیل میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اختتام تعلیم کے چند ماہ بعد ہی ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتہ سے ایک سولہ صفحات کا ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ماہنامہ ہادی پریس ہیریسن روڈ دارالسلطنت کلکتہ سے شائع ہوا، جس میں "عام علمی، اخلاقی، تاریخی، سائنٹفک" موضوعات کے علاوہ حسب ذیل چار مقاصد سے متعلق تحریریں شائع کرنے کا اعلان ہوا:

۱۔ سوشل ریفارم ۲۔ ترقی اردو ۳۔ تنقید ۴۔ علمی مذاق کی اشاعت، خصوصاً بنگالہ میں اور اس کے پہلے شمارے کے پہلے نصف صفحے پر یہ عبارت تھی:

"الصدق ینجی والکذب یہلک" لسان الصدق کا دستور العمل ہے اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ انھیں ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر "سچائی کی زبان" کیوں کر شیریں معلوم ہو گی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا جو اگرچہ تمھیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانے کو دور نہ سمجھو جبکہ صدق کا منجی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔"

نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک اس رسالے کے کل تیرہ شمارے نکلے جن میں جون جولائی ۱۹۰۴ء، اگست ستمبر ۱۹۰۴ء اور اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے شمارے مشترکہ تھے۔ آزاد کے علاوہ اس کے مضمون نگاروں میں محمد یوسف رنجور عظیم آبادی، ابوالنصر آہ دہلوی، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی، رضا علی وحشت، سید محمد سعید بلگرامی، محسن الملک اور سید شاہ حسین اثیم امروہوی کے نام اہم ہیں۔

بلاشبہ اس رسالے نے اپنے جن چار مقاصد کا ابتدا میں اعلان کیا تھا اُن پر سختی سے کاربند رہا، اس کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرتی برائیوں اور مذموم رسوم کی اصلاح کی برابر کوشش کی گئی۔ اس نے ترقی اُردو کے لیے احساس دلایا، اور فکرمند بنایا اور اپنے قارئین میں علمی مذاق پیدا کرنے کے لیے فضا تیار کی۔ اور مفید و بے لاگ تبصروں کے ذریعے اردو ادب کی خدمت کی۔ تبصروں میں سب سے طویل اور اہم تبصرہ "حیات جاوید" پر مولانا آزاد کے قلم سے لسان الصدق کے صفحات پر محفوظ ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک نہ نکل سکا۔ اس کے لیے یہ کہنا درست ہے:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

بلاشبہ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود مولانا آزاد اچھے مدیر کی بہت سی خوبیاں رکھتے تھے اور صحافتی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے جن سے وہ اس رسالے کی ادارت کے دوران غافل نہ رہے۔ اس ماہنامے کے مطا[لعے کے] دوران، ان کے سیاسی شعور کی جھلکیاں بھی [دکھائی] دیتی ہیں۔ اور معاشرتی زندگی سے ان کی د[لچسپی] اردو کے لیے فکرمندی کا احساس ہوتا [ہے]۔

اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ [پختہ] ارادے، بلند عزائم اور بے پناہ ہمت او[ر حوصلے] کے مالک تھے انھوں نے اسی زمانے میں [اپنے] راستے اور اپنی منزل کا تعین کر لیا تھا او[ر اس] کو پانے کے لیے اس راہ پر مستقل مزاجی [سے] نکلے تھے۔

اس دوران میں مولانا آزاد نے مو[لانا] حالی اور دوسرے اہلِ علم کو اپنی طرف متوج[ہ کرنے] میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ حالی اور ش[بلی کو] انھوں نے بھی جاننے پہچاننے کی کوشش [کی] ذہنی طور پر ان دونوں حضرات کے بہت قر[یب] تھے۔ انھوں نے ان کے مخالفوں کی نہ صرف [...] ساتھ مخالفت کی تھی بلکہ ان کی خوبیوں اور م[...] سے اردو والوں کو آگاہ کرنے کی کوشش [...]

"حیاتِ جاوید" پر شیخ عبدالقاد[ر ...] حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے سخت تبص[رے کیے] تھے جن کا تفصیلی اور مدلل جواب لسان الص[دق کے] صفحات پر مولانا آزاد نے دیا اور مولانا ش[بلی کے] مخالفوں کا بھی انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کی[ا ...] نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حضرات بھی مولانا آزاد کے ق[...] اور ان کی قدر افزائی کی۔

علامہ شبلی تو ان سے اس قدر متا[ثر ...] انھیں ندوہ آنے کی دعوت دی اور الندوہ [...] میں شمولیت کے لیے ان کو آمادہ کیا ــــــ [...] راضی کیوں نہ ہوتے۔ وہ شبلی کی بہت ع[...] تھے۔ الندوہ کی ادارت میں شمولیت میں ا[...]

اور ذہنی سکون کا سامان تھا چنانچہ اس کے ادارے میں بحیثیت اسسٹنٹ اڈیٹر مولانا آزاد کا نام شامل ہوا۔ لیکن یہاں بھی وہ زیادہ مدت تک کام نہ کر سکے کل چھ ماہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وہ الندوہ کی ادارت میں شامل رہے۔ اس دوران میں ان کی حسب ذیل تحریریں اس رسالے میں شائع ہوئیں:

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ۔
اکتوبر ۱۹۰۵ء۔

المراۃ المسلم۔ نومبر ۱۹۰۵ء، دسمبر ۱۹۰۵ء
فروری ۱۹۰۶ء۔

علمی خبریں۔ دسمبر ۱۹۰۵ء، جنوری ۱۹۰۶ء
مارچ ۱۹۰۶ء۔

ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت۔ فروری ۱۹۰۶ء

القضافی الاسلام۔ فروری ۱۹۰۶ء

یورپ میں گونگوں کی تعلیم۔ مارچ ۱۹۰۶ء

ندوہ سے اس چھ سات مہینے کے تعلق اور الندوہ کی ادارت نے مولانا آزاد کو علامہ شبلی سے قربت اور تربیت حاصل کرنے کا زبردست موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے اس موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھایا، وہ اپنے آپ کو زیادہ باصلاحیت بنانے اور ایک وسیع حلقے میں روشناس کرانے میں کامیاب ہوئے لیکن یہ زمانہ بہت مختصر تھا۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے بعد وہ کسی سبب سے الندوہ سے الگ ہو گئے، جس کی اطلاع جیسے ہی شیخ غلام محمد (مالک "وکیل" امرتسر) کو ہوئی انھوں نے "وکیل" کی ادارت قبول کرنے کے لیے مولانا آزاد سے خواہش کی، آزاد راضی ہو گئے اور امرتسر پہنچ گئے۔ اس اخبار سے وہ پہلی بار اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک منسلک رہے اگرچہ عمر کے لحاظ سے "وکیل" جیسے اخبار کی ادارت آزاد کے لیے آسان نہ تھی۔ لیکن انھوں نے ہمت کی اور کامیاب ہوئے۔ لیکن ابھی اس اخبار میں آئے چھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ ستمبر میں آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے والد مولانا خیرالدین نے انھیں کلکتہ واپس بلا لیا اور کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ کلکتہ ہی میں رہیں اور ان کے کام کو سنبھالیں۔ اسی غرض سے ان کی شادی بھی کر دی اور "دارالسلطنت" کلکتہ جو کچھ عرصہ پہلے بند ہو گیا تھا دوبارہ آزاد کی ادارت میں جاری کرانے کی کوشش کی۔ اس مقصد میں مولانا آزاد کے والد اور احباب کامیاب ہوئے۔ یہ بات غالباً دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ ۱۹۰۷ کے ابتدائی مہینوں میں "دارالسلطنت" مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا، البتہ یہ بات اب بھی تحقیق طلب ہے کہ مولانا آزاد کب تک اس سے متعلق رہے۔ اس لیے کہ اس کی جلدیں دستیاب نہیں ہیں۔ مولانا آزاد کی اس سے علیحدگی کی وجہ شاید اخبار کے مالک اور مولانا آزاد کے اندازِ فکر کا فرق تھا، اس کے مالک ہر معاملے میں مداخلت کرتے تھے جو آزاد پسند نہیں کرتے تھے۔

"دارالسلطنت" سے بے تعلقی کے بعد "وکیل" امرتسر کے مالک کی ایک بار پھر کوشش ہوئی کہ آزاد ایک بار پھر "وکیل" کی ادارت میں شامل ہو جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے مولانا آزاد اگست یا ستمبر ۱۹۰۷ء میں اس کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ اور اس بار ان کا تعلق اس اخبار سے تقریباً ایک سال رہا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ البتہ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ شاید اس کی وجہ وہی ہو جو کہ "دارالسلطنت" سے علیحدگی کی تھی۔ یعنی اس کے مالک شیخ غلام محمد اور مولانا آزاد کے خیالات میں اتفاق نہ ہو سکا ہو۔ مولانا آزاد اپنے اصول اور انداز فکر کبھی بھی بدلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اس طرح مولانا آزاد کا وہ صحافتی سفر جو ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں المصباح سے شروع ہوا تھا اس کا پہلا مرحلہ جولائی ۱۹۰۸ء میں "وکیل" امرتسر کی ادارت پر ختم ہوا۔ یہ زمانہ جو تقریباً آٹھ سال پر محیط ہے آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اسی میں انھوں نے صحافتی تجربے حاصل کیے۔ مضامین لکھنے کے سلیقے سے انھیں آگاہی ہوئی، مدیر کی ذمہ داریوں سے واقفیت ہوئی۔ بیشتر کی خامیوں اور خرابیوں کے تجربے سے وہ گذرے۔ اسی دوران میں انھیں ایک اچھے مدیر کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنے میں مدد ملی اور وہ ایک معیاری اور معتبر ہفتہ وار نکالنے کی ہمت کرنے لگے اور آخر وہ کامیاب ہوئے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ان کا آٹھ سالہ تجربہ ہفتہ وار "الہلال" کی صورت میں طلوع ہوا جس نے مولانا آزاد کے نام کو گھر گھر پہنچایا اور مقبول بنایا۔

آزاد — وادیٔ صحافت میں

(۱۹۰۸ء کے بعد)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں یعنی پہلی ناکام جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے کم و بیش تیس برس بعد ہوئی۔ یہ تاریخی صداقت ہمارے پیشِ نظر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے انیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں اصلاحی سرگرمیوں نے قومی شعور، قومی احساس اور قوم پرستانہ آرزومندی کے چراغ کی لو کو تیز کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں قومی اور سیاسی سطح پر ہندوستانیوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے باضابطہ جد و جہد کا آغاز ہوگیا۔ انگریزوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے ہندوستانیوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں اور عزائم کے خلاف اپنے اقدامات میں جیسے جیسے اضافہ کیا، ہندوستان کے عوام میں اضطراب و التہاب کی رو اتنی ہی تیز تر ہوتی گئی۔ یہی زمانہ ابوالکلام آزاد کی ذہنی نشوونما کا تاریخی پس منظر فراہم کرتا ہے۔ اپنے عہد کے ناساعد حالات سے انھوں نے جو اثرات قبول کیے، ان کے لازمی ردِعمل کے طور پر ان کے باطن میں ایک انقلابی روح نے انگڑائی لی۔ اپنی تحریر و تقریر اور دانشورانہ قیادت کے ذریعے مولانا نے ایک خوابیدہ معاشرے میں زندگی کی تڑپ پیدا کردی، اور ان کی علمی اور عملی، صحافتی اور سیاسی جد و جہد نے ہندوستانی قوم کو ایک نئی شاہراہ پر لاکھڑا کیا۔ نیاز فتحپوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنالیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر علومِ حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔"[۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا بالاستیعاب مطالعہ اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انسانی آزادی کے اس بنیادی حق کی وکالت اور غیر مصلحت پسندانہ حمایت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، جسے آج انسانی معاشرے کا بنیادی تقاضا تصور کیا جارہا ہے۔ اس کے لیے ریاضتوں کے ساتھ ساتھ رواداری، صبر و ضبط اور مذہبی حق پسندی کا جو تصور ان کے پیشِ نظر رہا ہے اس کی نشاندہی ارونا آصف علی نے درجِ ذیل سطروں میں کی ہے۔

"Tolerance to him did not mean religious tolehance. He believed in absolute ri-ght of individual to differ and hold what ever opin-ion he believed to be corr-ect."[۲]

محمد حامد علی خاں

معرفت پروفیسر محمد امجد علی خاں، جیل روڈ، چندوارہ،
مظفرپور ۸۴۲۰۰۱ (بہار)

جس کی تائید خود مولانا کی زبانی ملاحظہ فرمائیے
...ve never tried to find
...path of another, but
...ought out a path
...self and left my foot
...or those who come[۳]

اصلاحی تحریک کے آغاز و فرو...
اردو صحافت کی روایات کی توسیع و ترقی...
مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بے حد...
جنھوں نے ایک ایسی حیات آفریں نثر...
کے پیشِ نظر سجاد انصاری نے "انھیں" فو...
دیتے ہوئے تحریر کیا کہ "اگر قرآن نہ ناز...
تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے من...
اقبال کی نظم "موت و حیات کے تین"...
والے اخبار "الہلال" کا پہلا اجرا ۱۳ ج...
کو ہوا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء تک یہ نکلتا...
ہوگیا۔ دوبارہ یہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو...
کی صورت میں سامنے آیا۔ "البلاغ"...
تک جاری رہا۔ گیارہ سال کے وقفے...
۱۹۲۷ء کو پھر "الہلال" کی تجدید ہوئی ا...
۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ بند ہوگیا۔

مولانا آزاد نے اپنی صحافت...
کی فلاح و بہبود کے لیے وقف رکھا۔
انھوں نے تجارت اور منفعت کی نیت...
نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ذریعے وہ...
تاریکیوں کو دور کرکے ایک نئی اور...

لانا چاہتے تھے، قومی اور ملّی بیداری پیدا کرنے کے متمنی تھے اور ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ غفلتوں کو، ناامیدیوں اور مایوسیوں میں حیات پرور حوصلوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ "الہلال" کے پہلے ہی شمارے کے ذریعے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہندوستانی معاشرے میں یہ آواز گونج اٹھی۔

"آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اسی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمھیں موت کی جگہ حیات زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔"

اسی شمارے میں اپنے ایثار پسندانہ اور مجاہدانہ نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے صدا لگائی تھی:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔"

ایک رئیس کی طرف سے ایک خطیر رقم کا چیک بطور اعانت بھیجے جانے پر مولانا نے یہ چیک واپس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہو، وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے ہم اخبار نویسوں کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سمِ قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچہ "کام ایڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔"

مولانا سمجھتے تھے کہ صحافت رائے عامہ میں

"... ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔..."

انقلاب برپا کرنے کا ایک مؤثر اور طاقتور وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے قومی اور ملّی زندگی میں ایک نئے عزم حیات کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی صراحت انھوں نے ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں ان لفظوں میں کی:

"نہ صرف علم و ادب کی ترقی کے لیے بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کی نشوونما کے لیے ان کا (مطبوعات) کا وجود ناگزیر ہے۔ علم و ادب کی صحیح ترقی بجائے خود قوم کے اجتماعی ذہن و فکر کی ترقی ہے۔ جیسی جیسی اس کی سطح بلند ہوگی اتنی ہی قومی زندگی کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی جہاں تک پریس اور صحافت کا تعلق ہے دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب دس برس پیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک بنیادی اینٹ زبان ہے۔ زبان کی ترقی کے لیے پہلی چیز اس کی ادبیات ہیں۔ ادبیات کی نشوونما اعلیٰ درجے کے رسائل و مطبوعات کے بغیر ممکن نہیں۔"

سیاسی بیداری، حب الوطنی اور قوم دوستی کے احساسات کو چھیڑ کر، مولانا نے حرّیت پسندوں کے جوش و خروش کو آگے بڑھایا اور آزادی کی طلب کو قوم کی ایک فطری طلب بنا دیا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" کے یہ جملے آج بھی مولانا کے حریت پسندانہ محکم عزائم کی یاد دلاتے ہیں:

"ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند و استبداد غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔"

یہی وہ دعوتِ فکر و عمل تھی جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک "نئی دعوت" قرار دیتے ہوئے —— "THE DISCOVERY OF INDIA" میں لکھا تھا:

"مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار "الہلال" سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔ سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ "الہلال" مسلمانوں کے کسی بھی مکتبِ خیال

سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔"

واقعہ یہ ہے کہ "الہلال" اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل بن گیا تھا۔ مولانا نے "الہلال" کے ذریعے اس کی تلقین و تاکید کی کہ مسلمانوں کے سر صرف خدائے واحد کے سامنے جھکتے ہیں وہی عظمت و جبروت کا حامل اور پرستش کے لائق ہے۔ خدا کی زمین پر حق و صداقت کی شہادت اور حمایت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ مولانا نے اپنے ان خیالات کو جرأت و استقلال اور ایمان و ایقان کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جمود اور تعطل کی جو فضا تھی تیزی کے ساتھ ختم ہونے لگی اور ایک نیا عوامی ماحول، برطانوی استبداد سے متصادم ہونے کے لیے تیار ہونے لگا۔ "الہلال" کے اسی حریت مندانہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مولانا نے لکھا ہے:

"الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ ان کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ اندازانہ پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ خلافت و سوراج ہے۔"

اور یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ "الہلال" کی یہ صدائے حق، جتنی مقبول ہوتی گئی، ایوانِ اقتدار اتنا ہی متزلزل ہوتا گیا۔ کئی مرتبہ زرِ ضمانت کی طلبی اور ضبطی ہوئی۔ ہندوستانی صحافت پر برطانوی اقتدار کے اس حملے کا مولانا نے جس جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا، وہ بھی ہماری صحافتی تاریخ کا ایک کارنامہ ہے۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا لیکن جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا "ابتدائے عشق"۔

"انسان صرف کام کے لیے بنایا گیا پس اس کو چاہیے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنیٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کیا کہ حق و صداقت کی راہ میں کامیابی کے لیے کانٹوں سے الجھنا لازم ہے۔ باطل کے پاس خواہ ساز و سامان کچھ بھی ہو اور وقتی کامیابی اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دے لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں وضاحت کی کہ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے ۲۸ تک داخل کرنے کی مہلت تھی لیکن ۲۳ ہی کو یہ رقم داخل کر دی گئی:

"ضمانت کا روپیہ تو اس تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن "الہلال" پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آ گیا تھا۔ اگر کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ . . . بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیِ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی فکر کے لیے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

اس اقدام کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ مولانا کی عملی [illegible] پر پابندی عاید کرنے کے لیے ہندوستان [illegible] علاقوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور [illegible] بھی ہوئیں۔ مولانا نے تمام سختیوں اور آزما[illegible] جس خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، اس [illegible] ساز مثال ہمارے سامنے ہے۔ مولانا کی صحا[illegible] عوامی ذہن کی تربیت میں جو غیر معمولی کامیابی [illegible] اس کا اصل سبب، ان کا شفاف نقطۂ نظ[illegible] نصب العین ہی تھا۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں [illegible] ہوئے سورج کو گویا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے ان [illegible] خیالات میں کہیں کوئی تشکیک نہیں ملتی۔ یکم [illegible] ۱۹۱۳ء کے "الہلال" کی یہ عبارت ملاحظہ [illegible]

"پس سفر سے پہلے زادِ راہ کی فکر کر لو [illegible] سے پہلے کشتی بنا لو کیونکہ سفر نزدیک ہے اور طو[illegible] آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس زادِ راہ ن[illegible] بھوکے مریں گے اور جن کے پاس کشتی نہ ہو گ[illegible] میں غرق ہو جائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطل[illegible] ہے اور دن کی روشنی بدلیوں میں چھپ گئی تو [illegible] کہ برق و باراں کا وقت آ گیا، پھر تمھیں کیا ہو [illegible] دنیائے امن و سلامتی کا مطلع غبار آلود ہو [illegible] دینِ الٰہی کی روشنی ظلمتِ کفر و طغیان میں چھ[illegible] ہے۔ مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے وا[illegible] تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہتوں سے ک[illegible] کے سخت جلال کی منادی پھر بلند ہو اور احکا[illegible] اسی کے لیے ہو جائے۔"

یہ اندازِ تحریر اس کی وضاحت کرتا [illegible] کی صحافت سیاسی سرگرمی سے زیادہ ایما[illegible] پھیلا رہی تھی۔ انھوں نے اندازِ فکر اور طرزِ [illegible] احتساب کرتے ہوئے معاشرتی گمراہیوں کی [illegible] کاوش بھی کی اور اس سلسلے میں عوام و خواص [illegible]

ناخوشی کی پروا کیے بغیر اپنے مصلحانہ تصور کو دردمندانہ اور مخلصانہ جذبے کے ساتھ یوں پیش کیا :

" ہم نے اپنی تمام خوبیاں گنوادی اور دنیا کی مغضوب قوموں کی تمام برائیاں سیکھ لیں۔ ہم اپنوں کے آگے سرکش ہو گئے اور غیروں کے سامنے ذلت سے جھکنے لگے۔ ہم نے اپنے پروردگار کے آگے دستِ سوال نہیں بڑھایا لیکن بندوں کے دسترخوان کے گرے ہوئے ٹکڑے چننے لگے۔ ہم نے شہنشاہِ ارض و سماں کی خداوندی سے نافرمانی کی مگر زمین کے چند جزیروں کے مالکوں کو اپنا خداوند سمجھ لیا۔ ہم پورے دن میں ایک بار بھی خدا کا نام ہیبت اور خوف کے ساتھ نہیں لیتے پر سینکڑوں مرتبہ اپنے غیر مسلم حاکموں کے تصور سے لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔"

ابوالکلام آزاد کی صحافت نے ملک و ملت کو جو پیغام دیا، اس پر آج بھی عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام، حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور مولانا عبداللہ عمادی جیسی ممتاز شخصیتوں نے مولانا ابوالکلام کی معیت اور رفاقت میں "الہلال" اور "البلاغ" کی صحافت کو ہندوستان کی قومی اور ملی زندگی کے لیے چراغِ راہ بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ مولانا کی صحافیانہ قیادت میں ان حضرات نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کرکے آزادی کی تحریک کو منزلِ مراد تک پہنچانے کے لیے کامیاب مجاہدے کیے۔

کے باعث انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ پیش کردیا جو کانفرنس کے مذکورہ اجلاس میں پیش ہوا۔ علامہ شبلی اس اجلاس میں علالت کے باعث شرکت نہ کرسکے۔ آپ کا استعفیٰ پیش ہوا جسے اتفاقِ رائے سے منظور کرلیا گیا۔ اور آپ کی جگہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس موقعے پر خواجہ غلام الثقلین نے تجویز پیش کی کہ:

"مَیں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چند خاص معاون مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے ہوں۔ مَیں ابوالکلام محی الدین صاحب آزاد، خواجہ غلام الحسنین صاحب اور سید امجد علی صاحب اشہری کے نام پیش کرتا ہوں۔ یہ ایسے ذی لیاقت اصحاب ہیں جو ہمارے حبیب الرحمٰن خاں صاحب کا ہاتھ اس مفید کام میں بٹا سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ حتی الوسع اس میں دریغ نہ کریں گے۔"[۸]

اس کے بعد مولانا آزاد نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی:

"حضرات! غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ شمس العلما جناب مولانا شبلی نعمانی اس شاخ کے سکریٹری قرار دیے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ مسلسل تین ماہ سے بیمار ہیں اور باوجود حتمی ارادے کے شریکِ کانفرنس نہ ہوسکے۔ مجھ کو خوشی ہے کہ میرے مخدوم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی اب اس سیکشن کے سکریٹری مقرر کیے گئے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ مَیں بھی اپنی خدمات سے اس شاخ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ اگر یہ خیال صرف حسنِ ظن ہی نہیں ہے بلکہ صحیح ہے، تو مَیں حاضر ہوں۔"[۹]

خود مولانا آزاد نے علامہ سے اپنی پہلی ملاقات ۱۹۰۴ء ہی میں بمبئی میں بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب مَیں نے اپنا نام ظاہر کیا، تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں۔ مَیں نے کہا کہ نہیں، مَیں خود ہوں۔"[۱۰]

اس کے علاوہ ایک اور سلسلے میں مولانا علامہ شبلی سے اپنی اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کے چند ماہ بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں پہلی ملاقات ہوئی اور مَیں نے 'محصل' کا ذکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گذری تھی اور اس کے انطباع کی انھیں خبر نہ تھی۔"[۱۱]

مندرجہ بالا تمام شہادتیں، میرے خیال میں، یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ مولانا آزاد کی علامہ شبلی سے پہلی بار ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی البتہ اتنا ضرور ہے کہ غائبانہ طور پر دونوں ایک دوسرے سے کئی سال قبل واقف ہوچکے تھے اور دونوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت بھی قائم ہوچکا تھا۔

دوسرا مسئلہ جس پر محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے؟ ایک عام خیال یہ ہے کہ مولانا ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ لیکن معتبر ذریعوں سے اس خیال کی تردید ہوچکی ہے۔ جناب

ابوسلمان شاہجہانپوری نے اپنی تالیف
'تعمیرِ افکار' میں تفصیلی بحث کی ہے اور
کہ مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد نہ
ضمن میں آپ نے اخبار مدینہ بجنور مورخ
۱۹۶۰ء اور ہفت روزہ ایشیا لاہور
اپریل ۱۹۶۰ء کے حوالے سے مشہور نیشن
اور سابق ممبر پارلیمنٹ (لوک سبھا
بجنوری کا حسبِ ذیل بیان نقل کی

"ایک دن مَیں نے دورانِ گفتگ
مولانا سے دریافت کیا: حضرت کیا م
مرحوم آپ کے اُستاد تھے؟
مولانا نے جواب میں فرمایا: نہ
وہ میرے دوست تھے، اُستاد نہیں۔

دراصل مولانا کی تمام تر تعلیم
ہوئی اور درسیات کے لیے انھیں کہ
نہیں پڑا۔ چنانچہ خود مولانا آزاد نے
میں ایک جگہ فرمایا ہے:

"جہاں تک تعلیمی زمانے کا تع
کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا
نہیں ملا۔"

اس کی تصدیق سید سلیمان ند
بنام عبداللہ بٹ مورخہ ۱۰ر مارچ ۲
ہوتی ہے۔ اس میں سید صاحب فرما

"ان کی تعلیم جو کچھ ہوئی او
ہوئی وہ کلکتہ میں ہوئی۔"[۱۲]

اس کے علاوہ 'لسان الصدق
۱۹۰۳ء) کی اشاعت میں شیخ محمد عبد
آزاد کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس
کی عبدہٗ سے ملاقات کا تذکرہ بھی ہے
کسی طرح بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ د

بیان خردی اور بزرگی کا رشتہ تھا بلکہ یہ ظاہر
ہوتا ہے کہ دونوں میں مخلصانہ اور دوستانہ مراسم
تھے۔ فرماتے ہیں:

"حال ہی میں عباس حلیمی خدیو مصر نے
۱۹۰۱ء میں ٹرکی اور یورپ کی سیاحت کی
تھی، ان کی ہمرہی میں شیخ موصوف بھی تھے۔ ہمارے
مخدوم دوست مولانا شبلی نے زمانۂ سیاحت
میں ان سے ملاقات کی تھی اور ان کی روشن خیالی
کا اعتراف کیا تھا۔"

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح
ہو جاتی ہے کہ مولانا کو علامہ شبلی سے تلمذ نہیں
تھا۔

دراصل دونوں ایک دوسرے کی غیر معمولی
ذہانت، علمی فضیلت، وسعتِ مطالعہ اور اعلیٰ
ادبی و علمی ذوق سے بے حد متاثر تھے۔ اسی لیے
دونوں ایک دوسرے کا ادب و احترام کرتے تھے۔
علامہ شبلی مولانا سے عمر میں تقریباً ۳۱ سال بڑے
تھے اور جس وقت دونوں میں روابط قائم ہوئے
اس وقت مولانا کا سن مشکل سے پندرہ، سولہ
سال رہا ہوگا۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود وہ اپنے
وقت کے پختہ کاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔
علامہ کی عمر اس وقت چالیس سال سے متجاوز تھی
لیکن علامہ کی یہ خوبی تھی کہ انھوں نے عمر کے
تفاوت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور مساوی
سطح پر ان سے تعلقات قائم کیے۔ علامہ شبلی
مولانا کی طباعی اور وسعتِ مطالعہ سے تو متاثر
تھے ہی، اس سے بڑھ کر وہ مولانا کو اپنا مخلص
اور بہی خواہ تصور کرتے تھے اور پریشانی و مصائب
میں اپنے دیگر مخلصین کے ساتھ مولانا سے
بھی مدد کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ پہلی ہی
ملاقات میں مولانا سے متاثر ہو گئے تھے اور ان
کا یہ تاثر زندگی بھر قائم رہا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ شبلی ۱۹۰۴ء میں پروفیسر
آرنلڈ کو الوداع کہنے بمبئی آئے تھے۔ یہیں مولانا سے
ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دفعہ علامہ شبلی یہاں کافی
دن ٹھہرے۔ اس عرصہ میں مولانا کی ملاقاتیں اکثر
علامہ سے رہتیں۔ اس دوران جوہر شناس شبلی نے
نوجوان ابوالکلام کو ہر طرح آزمایا اور پرکھا اور
علم و فضل، علوئے فکر، وسعتِ مطالعہ، نفاستِ
ذوق، حسنِ ظاہری و حسنِ باطنی، غرض ہر کسوٹی پر
کھرا پایا۔ اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

"سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے
شوقِ مطالعہ اور وسعتِ مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس
وقت تک میرا مطالعہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ عربی
کی تمام نئی مطبوعات اور تصنیفات تقریباً میری
نظر سے گزر چکی تھیں اور بہتیری کتابیں ایسی بھی
تھیں کہ مولانا اُن کے شائق تھے اور انھیں معلوم
نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں۔ ۔ ۔" [۱۴]

یہیں مردم شناس شبلی نے آزاد کو پہچانا۔
یہیں انھوں نے ابوالکلام کے شاندار مستقبل کا
اندازہ لگایا۔ یہیں ان پر یہ حقیقت منکشف
ہوئی کہ "مولانا کا ذہن و دماغ عجائبِ روزگار میں
سے ہے" انھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک
اعجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔" اور یہیں انھوں نے
یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ نوجوان ان کی علمی اور ادبی
سرگرمیوں میں بہترین معاون ثابت ہو سکتا
ہے۔ چنانچہ یہیں علامہ نے مولانا سے 'الندوہ' سے
وابستہ ہو جانے کی درخواست کی۔ 'الندوہ' دارالعلوم
ندوہ لکھنؤ کا ترجمان تھا جس کی ادارت کے فرائض
علامہ شبلی انجام دے رہے تھے۔ لیکن قیام حیدرآباد
میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولانا آزاد سے فرمایا کہ
وہ حیدرآباد چلے آئیں اور الندوہ کو اپنی تحویل میں
لے لیں۔ اس کی تفصیل خود مولانا نے ان الفاظ میں
بیان فرمائی ہے:

"۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں
عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں
نکلا۔ وہاں سے جب واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی
مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس
وقت مولانا مرحوم حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون تھے
اور تقریباً پانچ سال سے میری خط و کتابت ان سے جاری
تھی۔ میں ان کی ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں
چونکہ ان کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا، اس لیے
اُن کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا،
اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت و
صحبت کا موقع حاصل ہو۔

مولانا مرحوم تقریباً دو تین ہفتہ رہے اور
اکثر اوقات میں ان کے ساتھ رہا۔ اسی زمانے میں
مولانا مرحوم نے الندوہ کو جاری کیا تھا۔ شاید ایک
یا دو نمبر نکل چکے تھے۔ جب چند دنوں میں گفتگو و
صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ
ہو گیا تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے
ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح
حیدرآباد آ سکو تو 'الندوہ' اپنے متعلق کر لو، اور
وہاں مزید مطالعہ و ترقی کا بھی موقع ملے گا۔" [۱۵]

لیکن مولانا آزاد نے علامہ شبلی کا یہ مشورہ
قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد شبلی نے اصرار کیا کہ
وہ الندوہ کے لیے کم از کم مضامین ہی لکھ دیا
کریں:

"ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور
کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال کے دیکھ رہے

تھے۔ اس میں 'خدنگ نظر' کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا 'جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو، کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو۔ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔'[۱۹]

لیکن مولانا نے نہ تو حیدرآباد جانا پسند کیا اور نہ الندوہ سے وابستہ ہونے پر رضامند ہوئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد علامہ شبلی نے حیدرآباد کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مستقل قیام کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے آئے۔ . .

دارالعلوم ندوہ میں اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات کی حیثیت سے آپ کا باقاعدہ انتخاب عمل میں آیا۔ اس کے بعد علامہ کی تمام تر توجہ ندوہ کی اصلاح و ترقی اور اس کے ترجمان الندوہ کی اشاعت پر مرکوز ہوگئی۔ یہاں پھر انھیں ابوالکلام کی یاد آئی۔ چنانچہ انھوں نے مولانا سے پھر اصرار کیا کہ وہ الندوہ سے وابستگی قبول کرلیں۔ اس دفعہ مولانا انکار نہ کرسکے اور الندوہ کا نائب مدیر ہونا منظور کرلیا۔ اس کی تفصیل خود مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"اس اثنا میں مولانا مرحوم نے استعفا دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر ندوہ کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں اور اعظم گڑھ ہوکر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے انھوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے لکھنؤ میں آکر رہو۔ تو حیدرآباد سے بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔

اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کرلیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ[۲۰] سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سن کر پھر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور ان کا تار آچکا ہے کہ اگر ہوسکے تو اعظم گڑھ آجاؤ۔ چنانچہ میں اعظم گڑھ گیا۔ عجیب اتفاق، جس دن پہنچا اسی دن ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا اور الندوہ کی ایڈیٹری میرے متعلق کردی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔"[۲۱]

اس طرح مولانا اکتوبر ۱۹۰۵ء میں باقاعدہ الندوہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ قیام مستقلاً ندوہ ہی میں رہا۔ اب دونوں کی ملاقات کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شبلی کو آزاد جیسے وسیع المطالعہ، صاحب اسلوب انشا پرداز، ذہین اور ہونہار نوجوان کی ضرورت تھی۔ جس سے تبادلۂ خیال کرکے وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کرسکیں اور جو علمی و ادبی مصروفیات میں ان کی معاونت کرسکے، ادھر خود ابوالکلام کو بھی ایسے عالم فاضل کثیر المطالعہ شخص اور نظم و نثر کے شہنشاہ کی ضرورت تھی جس کے تجربے اور تبحرِ علمی سے وہ مستفیض ہوسکیں اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو صحیح سمت دے سکیں۔ اس طرح دونوں نے ایک دوسرے سے بقدرِ ضرورت اور بقدرِ ذوق استفادہ کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں مولانا زیادہ فائدے میں رہے۔ ان کی عمر اور تجربے کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ مولانا کی تحریروں میں جو فصاحت اور شگفتگی ہے وہ بڑی حد تک شبلی کے ہی خوانِ تکلم کی ریزہ چینی کے طفیل ہے۔ ندوہ میں علامہ شبلی سے جو صحبتیں رہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے سے اٹھنے کے عادی تھے اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر۔ جاڑے کا موسم تھا۔ صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص ٹون میں ترنم کرتے۔ ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے۔ شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی و ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتاً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہوگئے۔ وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پرلطف صحبت تھی، جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق، جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ایک ساتھ ہی مدفون ہوچکا ہے۔"[۲۲]

جب تک مولانا آزاد الندوہ سے متعلق رہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کا زیادہ تر کام مولانا ہی انجام دیتے رہے۔ علامہ شبلی مولانا کے طرزِ تحریر کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ مطالعہ کی جو وسعت اور گہرائی مولانا کے پاس تھی، دوسروں کے یہاں ملتی نہیں۔ پھر جو یگانگت اور اخلاص دونوں میں قائم ہوگیا تھا، اس کی بھی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی لیے علامہ شبلی مولانا پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الندوہ کا سارا کام مولانا کے سپرد کردیا تھا۔ مولانا نے بھی حقِ دوستی ادا کیا۔ انھوں نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ ان کے زمانے میں الندوہ کی وقعت بڑھی اور اس کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ خود مولانا کا الندوہ میں پہلا مضمون جو 'مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ' کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بہت معیاری اور پُر از معلومات تھا۔ اور یہ کسی طرح بھی باور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ سترہ سال کے نوجوان کا مضمون ہے۔ اس کے بعد مولانا

کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک مضمون کو قبولِ عام نصیب ہوا۔ لیکن مختلف وجوہ سے مولانا زیادہ عرصہ یہاں نہ رہ سکے اور چھ ماہ تک اس سے وابستہ رہ کر مستعفی ہوگئے۔ مولانا کے اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُرشور ہے ـــــ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنادیا۔ مولانا شبلی مرحوم اُن کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانے تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یہیں انھوں نے مولانا حمیدالدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔"[۱۲]

سید صاحب نے بڑے واضح انداز میں مولانا آزاد کی الندوہ سے وابستگی اور علامہ شبلی سے مراسم پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن محولہ بالا اقتباس میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں جن پر دوسرے محققین اور ناقدین نے بھی اشکال کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ سید صاحب کا یہ فرمانا کہ مولانا کی علامہ شبلی سے ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی درست نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ یہ ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ اسی سلسلے میں سید صاحب فرماتے ہیں: "الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُرشور ہے۔" اس کے بعد انھوں نے مولانا عبداللہ العمادی، مولانا عبدالسلام ندوی اور خود اپنا تذکرہ کیا ہے۔ اسی زمرے میں مولانا آزاد کو بھی شامل کرلیا ہے۔ اور فرماتے ہیں: "اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوتے تھے۔" نہ معلوم کیوں کر سید صاحب نے یہ رائے قائم کرلی۔ ان کے سامنے تو مولانا آزاد کی زندگی کے تمام پہلو روشن تھے۔

جس زمانے میں مولانا کی ملاقات علامہ شبلی سے ہوئی ہے اور اُن کے اصرار پر وہ الندوہ سے وابستہ ہوئے، اس وقت تک مولانا ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہوچکے تھے اور ان کو سن رسیدہ اور پختہ کار شخصیات کے برابر مقام دیا جاتا تھا۔ خود علامہ شبلی بھی غائبانہ طور پر مولانا سے واقف ہوچکے تھے اور وہ انھیں عمر رسیدہ اور پختہ کار شخصیت متصور کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں جب وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے تو انھوں نے مولانا کو اس کا رکن بنالیا حالانکہ اس وقت تک مولانا اور علامہ شبلی کی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں خود مولانا فرماتے ہیں:

"اسی زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اُردو قائم ہوچکی تھی اور مرحوم مولانا شبلی اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے خط و کتابت کی تھی اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شایق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔ دوسری شاخ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاحِ رسوم کی قائم کی تھی اور 'عصرِ جدید' نکالا تھا۔ اس میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ 'لسان الصدق' کے خاص خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے۔ یعنی ترقی اُردو اور اصلاحِ رسوم۔ اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اُسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا۔ اور مولانا مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں انھیں سب سے پہلے اسی میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے اور تمام ممبرانِ انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کردی تھی کہ اس پرچہ کو ضرور منگوائیں۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہوگئی تھی۔ دو تین نمبروں کے بعد ہی چھ سات سو خریدار ہوگئے تھے۔"[۱۳]

الندوہ سے وابستہ ہونے سے قبل مولانا کو صحافت کا بھی خاصا تجربہ ہوچکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں جب ان کی عمر مشکل سے گیارہ برس کی ہوگی، انھوں نے 'نیرنگِ عالم' کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ جاری کیا تھا۔ جو تقریباً آٹھ ماہ تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ پھر انھوں نے ہفت روزہ المصباح کو ایڈٹ کیا۔ اس میں مولانا کے جو مضامین شائع ہوتے تھے۔ انھیں دوسرے اخبار اپنے کالموں میں نقل کرتے تھے۔ یہ چار ماہ تک پابندی سے نکلا، پھر بند ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا 'خدنگِ نظر' سے متعلق ہوگئے۔ جسے لکھنؤ کے منشی نوبت رائے نظر نکال رہے تھے۔ یہاں بھی مولانا نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا جس کے نتیجہ میں رسالہ کو استحکام نصیب ہوا۔ لیکن مولانا دوسروں کا پابند ہوکر کام کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جلد ہی انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور نومبر ۱۹۰۳ء میں اپنا ذاتی پرچہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔ اس کے بارے میں ضروری معلومات اُوپر دی جاچکی ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ 'مخزن' جیسے اعلیٰ معیار کے جرائد میں بھی مولانا

کی شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں اس طرح ۱۹۰۵ء تک مولانا کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی کا یہ فرمانا کہ اس وقت تک وہ علمی اور ادبی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ خلافِ واقعہ ہے۔

سید صاحب کا یہ فرمانا بھی تعجب خیز ہے کہ "یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنادیا۔" مولانا آزاد کبھی 'مسٹر آزاد' نہیں رہے۔ ان کی تعلیم خالصتہً مذہبی طور پر ہوئی اور ماحول بھی شدید قسم کا مذہبی تھا۔ مولانا کے والد جیسا کہ سب کو معلوم ہے، عالمِ دین اور پیرِ طریقت تھے، مریدوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی اولاد کو خالص مذہبی تعلیم دی تھی۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی غلام لیسین آہ بھی مذہبی آدمی تھے۔ مولانا کی تین بہنیں تھیں۔ زینت بیگم، فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو۔ ان میں زینت بیگم کا تو کم سنی میں ہی انتقال ہوگیا تھا، البتہ بقیہ دونوں بہنوں نے طبعی عمر پائی۔ یہ دونوں عمر میں مولانا آزاد سے بڑی تھیں۔ ان میں سے آرزو بیگم کا بھوپال میں ۱۳ر اپریل ۱۹۶۶ء کو اور آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔ ان دونوں ہمشیرگان کی تعلیم بھی خالص مذہبی انداز پر ہوئی تھی۔ ان کے معیارِ تعلیم کا اندازہ مولانا آزاد کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"ــــــــ منجھلی بہن (آرزو بیگم) کو چوں کہ ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے کے بعد بھی ڈیڑھ سال تک مزید درس کا موقع ملا، اس لیے انھوں نے حدیث و فقہ کی کتابیں بھی بہت حد تک ختم کرلی تھیں۔ ان سے چھوٹی بہن چوں کہ اس کے بعد بہت بیمار ہوگئی تھیں اور عرصہ تک رہیں، اس لیے وہ اس حصۂ تعلیم میں شریک نہ ہوسکیں۔"

اس طرح مولانا اور ان کے دوسرے بھائی بہنوں کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت سخت قسم کے مذہبی طرز پر ہوئی۔ پورا گھریلو ماحول شدید مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ سید صاحب ان تمام حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ شبلی کی صحبت نے 'ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنادیا' کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ابوالکلام علامہ شبلی کی ملاقات سے پہلے ہی مولانا ابوالکلام بن چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید صاحب علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھیں شبلی سے استفادے کے بہت موقع ملے اور انھوں نے ان سے حتی المقدور فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سید صاحب کے مقابلے میں وہ مولانا آزاد کی صلاحیتوں کے زیادہ معترف تھے اور جب تک ان دونوں کا تعلق علامہ شبلی سے رہا، وہ سید صاحب پر مولانا آزاد کو ترجیح دیتے رہے۔ جس کی تصدیق متعدد واقعات سے ہوجاتی ہے۔ ان میں سے چند کے خود سید صاحب بھی راوی ہیں۔ ایک واقعہ شاہ معین الدین صاحب ندوی نے 'حیاتِ سلیمان' میں خود سید صاحب کے حوالے سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"سید صاحب مولانا ابوالکلام کی ذہانت، طباعی اور علم و وسعتِ نظر کے پورے معترف تھے۔ راقم نے بارہا ان کی زبان سے اس کا اعتراف سنا ہے۔ ایک واقعہ اب تک یاد ہے۔ فرماتے تھے کہ الندوہ کی سب ایڈیٹری کے زمانے میں ایک مرتبہ مولانا شبلی نے مجھ کو امام بخاری پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ میں بڑی محنت سے لکھ کر لے گیا۔ لیکن مولانا کو پسند نہیں آیا۔ اس درمیان میں مولانا ابوالکلام آگئے۔ مولانا نے ان کو ہدایت فرمائی۔ انھوں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔ میرا مضمون لے کر اس کو ایک نظر دیکھ لیا اور دوسرے دن مضمون لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کردیا۔ مولانا نے پسند کیا اور فرمایا: اسے مضمون کہتے ہیں۔"

اسی بات کو مولانا علی میاں صاحب نے تھوڑی سی تعمیم کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے مواد و معلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا۔ ان کے بعض لائق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کیے لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے بعض مرتبہ کئی بار یہ کوشش کی گئی اور ناکام رہی۔ مولانا آزاد کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی۔ وہ اسی وقت بیٹھ گئے۔ اور مضمون لکھ کر پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا: بس میں یہی چاہتا تھا:

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے۔ حاضرینِ مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقعے پر نوجوان انشا پرداز کا، جس نے اپنی طلاقتِ لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعہ کا سکہ بٹھا رکھا ہے۔ بھرم جاتا رہے گا اور اس کی علمی کم مایگی کا راز فاش ہوجائے گا، لیکن معاملہ الٹا ہوا۔ اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔"

مولانا آزاد نے الندوہ میں جو مضامین لکھے ان سے اُن کی شہرت اور ناموری میں یقیناً اضافہ ہوا۔ تمام علمی حلقوں نے انھیں پسند کیا اور ہر طرف سے ان کے بارے میں استفسار ہونے لگے۔ اس سلسلے میں اردو کے مشہور اہلِ قلم اور صاحبِ طرز انشا پرداز مہدی افادی کو ایک خط میں علامہ شبلی لکھتے ہیں: "آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے، معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔"

مولانا زیادہ عرصہ تک الندوہ سے وابستہ نہ رہ سکے۔ صرف چھ ماہ بعد انھوں نے اسے خیرباد کہہ دیا۔ گویا اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وابستگی رہی اس دوران مولانا آزاد اور علامہ شبلی کی خوب ملاقاتیں رہیں۔

مولانا کے ہر وقت یک جائی رہتی تھی۔ اور ہر
ع پر کھُل کر گفتگو ہوتی تھی۔ ان صحبتوں کی یاد مولانا
یں ہمیشہ تازہ رہی۔ مولانا کو ان سے بہت فائدہ
یکن ان صحبتوں کا اثر یکطرفہ نہیں تھا۔ مولانا کے مطالعے
بت ان کے اسلوبِ نگارش اور فہم و تدبر نے علامہ
متاثر کیا۔ شیخ محمد اکرم نے دونوں کے تعلقات کا
تے ہوئے درست لکھا ہے :

" شبلی اور ابوالکلام کی عمروں میں جو فرق تھا اس
ر رکھ کے شبلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان کے خیالات
ثر ہو جانا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آزاد
ابتدائی عمر میں پرلے درجے کے [کذا پختہ] کار تھے
ی کی دماغی ساخت اس طرح کی تھی کہ وہ قدیم کے
ہونے کے باوجود ہر سمت سے نئے اثرات قبول
تھے۔ اس کے علاوہ جس طرف آزاد کے اثر صحبت
بلی کو کھینچا اس سمت کے لیے ہر طرح کے طبعی ذہنی
ر سیاسی رجحانات تو پہلے سے موجود تھے' فقط
بت میں ان رجحانات نے ایک واضح صورت
کرلی۔

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی ' عالمِ اسرار ' اس
پردہ نہ اٹھائے، قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ
ے قیامِ ندوہ کے دوران میں شبلی کا آزاد پر زیادہ
یا شبلی اس ذہین اور تیز و طرار نوجوان سے زیادہ
ہوئے۔ لیکن کم از کم یہ امر تو قرینِ قیاس ہے کہ اس
ن میں دونوں کے درمیان جو گفتگوئیں ہوئیں ان
ون کا [illegible] زیادہ واضح اور منضبط ہوا۔ یہ
جب اربابِ علی گڑھ کے خلاف اعلانِ جنگ کا
آیا تو شبلی اور آزاد دونوں پہلو بہ پہلو صف آرا
ور دونوں کے درمیان اس زمانے میں اس درجہ
خیال اور اتحادِ عمل تھا کہ اس جنگ میں علی گڑھ کے
جو اسلحے استعمال کیے گئے ان کی نسبت یہ بھی نہیں

کہا جا سکتا کہ وہ آزاد کے دماغ کی اختراع تھے یا شبلی
کا عطیہ تھے[۲۴]

علامہ شبلی مولانا آزاد سے کس حد تک متاثر تھے اس
کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء
میں مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا ہندوستان تشریف
لائے۔ یہ دورہ دراصل دارالعلوم ندوہ کی دعوت پر ہی کیا
گیا تھا۔ چنانچہ آپ ندوہ تشریف لے گئے اور ۶ اپریل
۱۹۱۲ء کو ندوہ کا وہ تاریخ ساز اجلاس ہوا جس کی صدارت
آپ نے فرمائی۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے خاص طور
پر مولانا آزاد کو مدعو کیا کہ وہ علامہ رشید رضا کی عربی
تقریر کا اردو ترجمہ کریں۔ یہ بہت بڑی بات تھی مولانا
آزاد اس وقت کلکتہ میں تھے۔ انھیں خصوصی طور پر اتنے
دور دراز کے علاقے سے ترجمہ کرنے کے لیے بلایا جانا ہے'
جب کہ سید سلیمان ندوی اور دیگر تلامذہ کی خاصی بڑی تعداد
خود ندوہ میں موجود تھی۔ مولانا نے جس حسن و خوبصورتی
سے ترجمہ کرنے کی خدمت انجام دی۔ اس سے حاضرین
جلسہ بے حد متاثر ہوئے۔ غالباً خود شبلی کو بھی اپنے
انتخاب پر فخر محسوس ہوا ہوگا۔ اس جلسے کی تفصیلات بتاتے
ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

" اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قوتِ تقریر کی
کے خوب خوب مظاہرے سامنے آئے۔ وہ سید رشید رضا
کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے
تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر
دیتے تھے"[۲۵]

[illegible]
علیحدگی اختیار کر لی اور اوسیل مدرسہ سے وابستہ ہو گئے۔
جہاں دو سال تک انھوں نے کام کیا۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ الندوہ مولانا کے مذہبی افکار اور علمی مزاج
سے میل کھاتا تھا' اسی لیے انھوں نے بڑی لگن اور دلچسپی
سے کام کیا۔ تاہم اس کا کینوس محدود تھا جو مولانا کے بیان

کی وسعت کے لیے ناکافی تھا۔ ان کا میدان خالص مذہبی
نہیں تھا۔ وہ ادب اور سیاست میں بھی اتنی ہی دلچسپی
رکھتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے معاشرتی مسائل بھی کبھی
مولانا کی نظر سے اوجھل نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان تمام
موضوعات کے لیے الندوہ میں گنجائش نہیں تھی۔ پھر یہ
بہت ہی سنجیدہ پرچہ تھا۔ جس میں جوش اور جذبات کو
بہت کم دخل تھا۔ اس کے برخلاف مولانا جس طرزِ تحریر
کے موجد تھے اس میں خطیبانہ انداز اور جوش و ولولہ کی
بالادستی تھی۔ لہٰذا علامہ شبلی کی پُر خلوص صحبتوں کے باوجود
انھوں نے الندوہ کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن اس جدائی کے
باوجود دونوں میں تعلقات آخر وقت تک انتہائی
مخلصانہ اور دوستانہ رہے۔ علامہ شبلی ہر مشکل مرحلہ پر
مولانا سے مشورہ کرتے اور ان کی امداد کے خواہاں ہوتے
جس کی تصدیق مولانا کے نام ان کے خطوط سے بھی ہو
جاتی ہے۔ یہ خطوط ' مکاتیبِ شبلی ' حصہ اول میں شامل
ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد ۳۵ ہے ان کے علاوہ ایک
ٹیلیگرام بھی ہے۔ جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف
چار دن قبل بھیجا تھا۔ ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا
ہے کہ شبلی نے کبھی خوردی اور بزرگی کا رشتہ قائم
نہیں کیا۔ بلکہ برابری کی سطح پر مراسم قائم کیے اسی لیے
ان خطوط میں تخاطب کبھی برادرم کبھی برادرم عزیز اور کبھی بھائی"
سے کیا ہے۔ اس اندازِ تخاطب سے دونوں میں اخلاص
اور یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ
دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان سے دونوں کے تعلقات کے
مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ
ہوں :

۱۔ بھائی ! تم نے دانستہ خط کتابت ترک کر دی
ہے کہ الیاس احدی الراحتین۔ لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا
لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی۔ یہ بھی منظور کلکتہ گیا۔
ایک خاص کام تھا مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھہرا۔

کی شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں اس طرح ۱۹۰۵ء تک مولانا کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی کا یہ فرمانا کہ اس وقت تک وہ علمی اور ادبی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ خلافِ واقعہ ہے۔

سید صاحب کا یہ فرمانا بھی تعجب خیز ہے کہ "یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔" مولانا آزاد کبھی 'مسٹر آزاد' نہیں رہے ان کی تعلیم خالصتہً مذہبی طور پر ہوئی اور ماحول بھی شدید قسم کا مذہبی تھا۔ مولانا کے والد جیسا کہ سب کو معلوم ہے' عالمِ دین اور پیرِ طریقت تھے' مریدوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی اولاد کو خالص مذہبی تعلیم دی تھی۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ بھی مذہبی آدمی تھے مولانا کے تین بہنیں تھیں۔ زینت بیگم' فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو۔ ان میں زینت بیگم کا تو کم سنی میں ہی انتقال ہو گیا تھا' البتہ بقیہ دونوں بہنوں نے طبعی عمر پائی۔ یہ دونوں عمر میں مولانا آزاد سے بڑی تھیں۔ ان میں سے آرزو بیگم کا بھوپال میں ۱۳ر اپریل ۱۹۶۲ء کو اور آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔ ان دونوں ہمشیرگان کی تعلیم بھی خالص مذہبی انداز پر ہوئی تھی۔ ان کے معیارِ تعلیم کا اندازہ مولانا آزاد کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"_____ منجھلی بہن (آرزو بیگم) کو چوں کہ ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے کے بعد بھی ڈیڑھ سال تک مزید درس کا موقع ملا' اس لیے انھوں نے حدیث و فقہ کی کتابیں بھی بہت حد تک ختم کر لی تھیں۔ ان سے چھوٹی بہن چوں کہ اس کے بعد بہت بیمار ہو گئی تھیں اور عرصہ تک رہیں' اس لیے وہ اس حصۂ تعلیم میں شریک نہ ہو سکیں۔"

اس طرح مولانا اور ان کے دوسرے بھائی بہنوں کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت سخت قسم کے مذہبی طرز پر ہوئی۔ پورا گھریلو ماحول شدید مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ سید صاحب ان تمام حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ شبلی کی صحبت نے "ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا" کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ابوالکلام علامہ شبلی کی ملاقات سے پہلے ہی مولانا ابوالکلام بن چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید صاحب علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھیں شبلی سے استفادے کے بہت موقع ملے اور انھوں نے ان سے حتی المقدور فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سید صاحب کے مقابلے میں وہ مولانا آزاد کی صلاحیتوں کے زیادہ معترف تھے اور جب تک ان دونوں کا تعلق علامہ شبلی سے رہا' وہ سید صاحب پر مولانا آزاد کو ترجیح دیتے رہے۔ جس کی تصدیق متعدد واقعات سے ہو جاتی ہے۔ ان میں سے چند کے خود سید صاحب بھی راوی ہیں۔ ایک واقعہ شاہ معین الدین صاحب ندوی نے 'حیاتِ سلیمان' میں خود سید صاحب کے حوالے سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"سید صاحب مولانا ابوالکلام کی ذہانت' طباعی اور علم و وسعتِ نظر کے پورے معترف تھے۔ راقم نے بارہا ان کی زبان سے اس کا اعتراف سنا ہے۔ ایک واقعہ اب تک یاد ہے۔ فرماتے تھے کہ الندوہ کی سب ایڈیٹری کے زمانے میں ایک مرتبہ مولانا شبلی نے مجھ کو امام بخاری پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ میں بڑی محنت سے لکھ کر لے گیا۔ لیکن مولانا کو پسند نہیں آیا۔ اس درمیان میں مولانا ابوالکلام آ گئے۔ مولانا نے ان کو ہدایت فرمائی۔ انھوں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔ میرا مضمون لے کر اس کو ایک نظر دیکھ لیا اور دوسرے دن مضمون لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا نے پسند کیا اور فرمایا: اسے مضمون کہتے ہیں۔"

اسی بات کو مولانا علی میاں صاحب نے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے مواد و معلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا۔ ان کے بعض لائق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کیے لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے بعض مرتبہ کئی بار یہ کوشش کی گئی اور ناکام رہی۔ مولانا آزاد کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی۔ وہ اسی وقت بیٹھ گئے۔ اور مضمون لکھ کر پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا: بس میں یہی چاہتا تھا؛

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے۔ حاضرینِ مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقع پر نوجوان انشا پرداز کا' جس نے اپنی طلاقتِ لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعہ کا سکہ بٹھا رکھا ہے۔ بھرم جاتا رہے گا اور اس کی علمی کم مایگی کا راز فاش ہو جائے گا' لیکن معاملہ الٹا ہوا۔ اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔"

مولانا آزاد نے الندوہ میں جو مضامین لکھے' ان سے ان کی شہرت اور ناموری میں یقیناً اضافہ ہوا۔ تمام علمی حلقوں نے انھیں پسند کیا۔ وہ ہر طرف سے ان کے بارے میں استفسار ہونے لگے۔ اس سلسلے میں اردو کے مشہور اہلِ قلم اور صاحبِ طرز انشا پرداز مہدی افادی کو ایک خط میں علامہ شبلی لکھتے ہیں: "آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں دیکھا ہوگا' قلم وہی ہے' معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔"

مولانا زیادہ عرصہ تک الندوہ سے وابستہ نہ رہ سکے۔ صرف چھ ماہ بعد انھوں نے اسے خیرباد کہہ دیا۔ گویا اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وابستگی رہی اس دوران مولانا آزاد اور علامہ شبلی کی خوب ملاقاتیں رہیں۔

بلکہ بقول مولانا کے ہر وقت یک جائی رہتی تھی۔ اور ہر موضوع پر کھل کر گفتگو ہوتی تھی۔ ان صحبتوں کی یاد مولانا کے دل میں ہمیشہ تازہ رہی۔ مولانا کو ان سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ان صحبتوں کا اثر یکطرفہ نہیں تھا۔ مولانا کے مطالعے کی وسعت، ان کے اسلوبِ نگارش اور فہم و تدبر نے علامہ کو بھی متاثر کیا۔ شیخ محمد اکرام نے دونوں کے تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے :

"شبلی اور ابوالکلام کی عمروں میں جو فرق تھا اس کا لحاظ رکھ کے شبلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان کے خیالات سے متاثر ہو جانا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نہایت ابتدائی عمر میں پرلے درجے کے [کذا بجزم] کار تھے اور شبلی کی دماغی ساخت اس طرح کی تھی کہ وہ قدیم کے ترجمان ہونے کے باوجود ہر سمت سے نئے اثرات قبول کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ جس طرف آزاد کے اثر صحبت نے شبلی کو کھینچا اس سمت کے لیے ہر طرح کے طبعی ذہنی علمی اور سیاسی رجحانات تو پہلے سے موجود تھے، فقط اس صحبت میں ان رجحانات نے ایک واضح صورت اختیار کر لی۔"

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی 'عالمِ اسرار' اس راز سے پردہ نہ اٹھائے، قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے قیامِ ندوہ کے دوران میں شبلی کا آزاد پر زیادہ اثر پڑا یا شبلی اس ذہین اور تیز و طرار نوجوان سے زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن کم از کم یہ امر تو قرینِ قیاس ہے کہ اس دوران میں دونوں کے درمیان جو گفتگو ئیں ہوئیں ان سے دونوں کا [illegible] زیادہ واضح اور منضبط ہوئے۔ حتیٰ کہ جب اربابِ علی گڑھ کے خلاف اعلانِ جنگ کا وقت آیا تو شبلی اور آزاد دونوں پہلو بہ پہلو صف آرا تھے۔ اور دونوں کے درمیان اس زمانے میں اس درجہ 'اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل' تھا کہ اس جنگ میں علی گڑھ کے خلاف جو اسلحے استعمال کیے گئے ان کی نسبت یہ بھی نہیں

کہا جا سکتا کہ وہ آزاد کے دماغ کی اختراع تھے یا شبلی کا عطیہ تھے۔

علامہ شبلی مولانا آزاد سے کس حد تک متاثر تھے اس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا ہندوستان تشریف لائے۔ یہ دورہ دراصل دارالعلوم ندوہ کی دعوت پر ہی کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ندوہ تشریف لے گئے اور ۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو ندوہ کا وہ تاریخ ساز اجلاس ہوا جس کی صدارت آپ نے فرمائی۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے خاص طور پر مولانا آزاد کو مدعو کیا کہ وہ علامہ رشید رضا کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ کریں۔ یہ بہت بڑی بات تھی مولانا آزاد اس وقت کلکتہ میں تھے، انھیں خصوصی طور پر اتنے دور دراز کے علاقے سے ترجمہ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے، جب کہ سید سلیمان ندوی اور دیگر تلامذہ کی خاصی بڑی تعداد خود ندوہ میں موجود تھی۔ مولانا نے جس حسن و خوبصورتی سے ترجمہ کرنے کی خدمت انجام دی۔ اس سے حاضرینِ جلسہ بے حد متاثر ہوئے۔ غالباً خود شبلی کو بھی اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہوا ہوگا۔ اس جلسے کی تفصیلات بتاتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

"اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قوتِ تقریر کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔ وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔"

[illegible]

علیحدگی اختیار کر لی اور اوس میں مر سمت وابستہ ہوگئے۔ جہاں دو سال تک انھوں نے کام کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الندوہ مولانا کے مذہبی افکار اور علمی مزاج سے میل کھاتا تھا، اسی لیے انھوں نے بڑی لگن اور دلچسپی سے کام کیا۔ تاہم اس کا میدان محدود تھا جو مولانا کے بیان کی وسعت کے لیے ناکافی تھا۔ ان کا میدان خالص مذہبی نہیں تھا۔ وہ ادب اور سیاست میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے معاشرتی مسائل بھی کبھی مولانا کی نظر سے اوجھل نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان تمام موضوعات کے لیے الندوہ میں گنجائش نہیں تھی۔ پھر یہ بہت ہی سنجیدہ پرچہ تھا جس میں جوش اور جذبات کو بہت کم دخل تھا۔ اس کے برخلاف مولانا جس طرزِ تحریر کے موجد تھے اس میں خطیبانہ انداز اور جوش و ولولہ بالاتر تھی۔ لہٰذا علامہ شبلی کی پرلطف صحبتوں کے باوجود انھوں نے الندوہ کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود دونوں میں تعلقات آخر وقت تک انتہائی مخلصانہ اور دوستانہ رہے۔ علامہ شبلی ہر مشکل مرحلہ پر مولانا سے مشورہ کرتے اور ان کی امداد کے خواہاں ہوتے جس کی تصدیق مولانا کے نام ان کے خطوط سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہ خطوط 'مکاتیبِ شبلی' حصہ اول میں شامل ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد ۲۵ ہے۔ ان کے علاوہ ایک ٹیلیگرام بھی ہے۔ جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف چار دن قبل بھیجا تھا۔ ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے کبھی خوردی اور بزرگی کا رشتہ قائم نہیں کیا۔ بلکہ برابری کی سطح پر مراسم قایم کیے اسی لیے ان خطوط میں تخاطب کبھی 'برادرم' کبھی 'برادرم عزیزی' اور کبھی 'بھائی' سے کیا ہے۔ اس اندازِ تخاطب سے دونوں میں اخلاص اور یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان سے دونوں کے تعلقات کے [illegible] پر روشنی پڑتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

۱۔ بھائی! تم نے دانستہ خط کتابت ترک کر دی ہے کہ ایاس احدی الرحمتین۔ لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی۔ یہ بھی منظور کلکتہ گیا۔ ایک خاص کام تھا مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھہرا۔

دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں۔

(لکھنؤ۔ ۱۵ر جون۔ ۱۹۰۹ء)

۲۔ برادرم! جس قدر آپ کی عنایت و محبت کا یقین زیادہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر آپ کی نکتہ سنجی اور نقادی کی طرف سے بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے کہ آپ میری صحبت کو لطف انگیز اور نسبتاً دوسروں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔

(۵ر دسمبر۔ ۱۹۰۹ء)

۳۔ کیا آپ حیدرآباد چلتے ہیں تو میں افریقہ ہو کر کعبہ کو جا سکتا ہوں۔ ترکستان واپسی میں آ جائے گا۔ جزیرہ کو ہرگز جانے کا ارادہ نہیں، البتہ چمنستانِ بمبئی کو چھوڑنا فردوس کو چھوڑنا ہے، جو ایک زاہد سے ممکن نہیں۔

(۱۸ر اکتوبر۔ ۱۹۱۰ء)

۴۔ یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ ہنسی مذاق کی باتوں کو اصلی بات سمجھ جاتے ہیں اور اس پر ایک طومار باندھتے ہیں۔ یہ کس پاجی کا خیال ہو سکتا ہے کہ بغداد آپ کی پیری مریدی کو ترقی دے گا اور اس کے لیے آپ چلنے پر مائل ہوں گے۔ اگر یہی بدگمانی رہی تو جینا مشکل ہو جائے گا۔ ۔ ۔"

(۲۵ر مارچ۔ ۱۹۱۱ء)

۵۔ ۲۰ نومبر کو الٰہ آباد میں اردو نصاب یونیورسٹی کی کمیٹی ہے۔ اردو کو مٹائے جانے کے سامان ہیں۔ میں بھی ممبر ہوں، اس لیے جانا پڑے گا۔ اس کے بعد خالی ہوں اور ممکن ہے کہ زیارت نصیب ہو۔

(لکھنؤ۔ ۲۶ر اگست۔ ۱۹۱۱ء)

۶۔ کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں 'سیرۃ' کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔

(۲۰ر اگست۔ ۱۹۱۳ء)

ان اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی مولانا آزاد کو کتنا عزیز رکھتے تھے اور کس حد تک بے تکلفی اور برابر کی سطح پر آ کر تخاطب کرتے تھے۔ اسی سے ان کی بزرگانہ شان مستحکم رہی۔ ادھر مولانا آزاد بھی اپنے معاملات میں شبلی سے مشورہ کرتے اور ان کی رہنمائی کے خواہاں ہوتے۔ علامہ شبلی کے ہی ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں مولانا آزاد کوئی اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ اس کا نام انھوں نے 'ملک و ملت' یا 'وقت' تجویز کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے علامہ شبلی سے مشورہ کیا جس کے جواب میں علامہ نے انھیں حسبِ ذیل مشورے سے نوازا۔

"اخبار کا نام نہ 'ملک و ملت' موزوں ہے نہ 'وقت'، ایک مطول اور ایک زائد از ضرورت مختصر ہے۔ صرف 'آزاد' نام ہونا چاہیے۔ میں اس سے زیادہ کوئی نام حسبِ حال اور حسبِ ضرورت اور آئیڈیل نہیں سمجھتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگ توافق اسمی کی وجہ سے خود نمائی کا شبہ کریں۔"

(لکھنؤ۔ ۱۲ر جون۔ ۱۹۱۰ء)

علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم ندوہ کے تعلیمی امور کے معتمد مقرر ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھ ہی حکیم سید عبدالحئی (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد بزرگوار) معتمد مراسلات اور مولانا محمد احتشام علی کاکوروی معتمد صیغۂ مال مقرر ہوئے۔ ان حضرات کی رہنمائی میں دارالعلوم کے معاملات بڑی خوش اسلوبی کے چل رہے تھے۔ اس عرصہ میں اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی شہرت عام ہوئی۔ اور بقول سید سلیمان ندوی:

"جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی اور اس کا کام آگے بڑھتا جاتا تھا، اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا (شبلی) کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بن جاتا تھا۔ یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی تھی۔ یہ گو واقعہ تھا مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کر لے جانا ہر انسان کا کام نہیں اس لیے رشک و حسد نے بے اعتمادی، اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا۔"[۲۵]

اس رشک و حسد اور بے اعتمادی نے ندوہ کی فضا کو مکدر کرنا شروع کر دیا اور یہ اندرونی سیاست اور باہمی اختلافات کا شکار ہو گیا۔ یہ سازشیں علامہ شبلی کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ ۱۹۱۰ء تک حالات بہت بگڑ گئے۔ علامہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی تصانیف الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کو بنیاد بنا کر ان پر کفر کے فتوے بھی لگا دیے گئے۔ ظاہر ہے یہ حالات علامہ کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث تھے۔ ایک طرف تو خود ان کی دیانت اور ناموری معرضِ خطر میں تھی، بلکہ ان کے مخالفین نے ان کے اسلام پر بھی حملہ کر دیا تھا، دوسری طرف ندوہ پر سیاہ بادل منڈلانے لگے تھے۔ اس کی ساکھ روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ یہ تصور بھی علامہ کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ ان پریشان کن اور روح فرسا حالات میں اُن حضرات سے مدد چاہنا جو اُن کے اپنے تھے اور جو ان سے اخلاص رکھتے تھے، ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تمام معتمدین سے اس سخت مرحلے پر بیش از بیش حمایت کی فرمائش کی۔ ان مخلصین میں مولانا ابوالکلام بھی شامل تھے۔ چناں چہ انھوں نے مولانا کو بھی ان حالات سے باخبر رکھا اور ان سے ندوہ کے ان اجلاسوں میں شرکت کی بالاصرار درخواست کی جن میں یہ معاملات زیرِ بحث آنے تھے۔ اس سلسلے میں ۷ر نومبر ۱۹۱۰ء کو ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں۔

"برادرم! آج کل سخت نرغہ ہے۔ سہارنپوری،

شاہجہانپوری، پھلواروی، کاکوروی، سب یک جا ہیں۔
ــــ فرد جرم بہت بڑی ہے۔ خود بُرد کا الزام ہے۔
بہاولپور کے عطیے کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے ــــ
ہاں! انھیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔ بھائی
حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا۔ کہاں
تک صبر کروں۔"

(لکھنؤ ۔ ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ء)

اس موقع پر علامہ شبلی مولانا آزاد کو لکھنؤ بلانا چاہتے تھے تاکہ اس جلسے میں شریک ہوں اور علامہ کے موقف کی وکالت کریں۔ لیکن کلکتہ جیسے دور دراز شہر سے لکھنؤ آنا کچھ آسان نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے معذرت کا خط لکھا۔ لیکن علامہ کی بارگاہ میں یہ عذر قبول نہ ہوا اور انھوں نے سخت خط لکھ کر مولانا سے شرکت کے لیے اصرار کیا۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

"ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا" بلکہ قیامت کے بعد بھی۔ میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی اور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ اکثر احباب آرہے ہیں اور آچکے ہیں:

دیر ویراں سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے

(۲۱ دسمبر ۱۹۱۰ء)

بعد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ اس مرحلے پر مولانا نے علامہ کا بھرپور ساتھ دیا اور مسائل کو سلجھانے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے نہ صرف ندوہ میں، بلکہ اس کے باہر بھی شبلی کی حمایت کی اور ان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ انھوں نے الہلال کے اوراق اس کے لیے وقف کر دیے۔ اور نہ صرف یہ کہ خود طول طویل مضامین لکھ کر علامہ شبلی کے موقف کی وکالت کی بلکہ ان کی حمایت میں دوسرے حضرات کے مضامین اور خطوط بھی شائع کیے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا ایک طویل مضمون "شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مسئلۂ الندوہ"

(الہلال۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱۷۔ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء)

خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مخصوص پُرزور اور مدلل انداز میں علامہ کی وکالت کی ہے۔ اس کے علاوہ "شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مسئلۂ الندوہ" از سید علی متقی امروہوی (الہلال۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱۷۔ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء) اور "علامہ شبلی نعمانی پر بے جا الزامات کی حقیقت" از خواجہ رئیس الدین رئیس لکھنوی (الہلال۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱۸، ۷ مئی ۱۹۱۳ء) بھی علامہ شبلی کی حمایت میں شائع ہونے والی اہم تحریریں ہیں۔ شبلی کو الہلال میں شائع ہونے والے ان مضامین کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان تحریروں سے ان کے موافق رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ الہلال کے ذریعہ ان کے مخالفین کے رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہنی چاہیے چنانچہ حیدرآباد سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"ندوہ کا قضیہ اب ٹلنے کی چیز نہیں۔ میرا کلکتہ آنا موقوف علیہ نہیں ہے۔ میرے سر میں اس وقت سخت درد ہے ــــ الہلال وغیرہ نے احساس عام پیدا کر دیا ہے۔ یعنی تمام اسلامی کاموں پر لوگوں کو مداخلت کا دعویٰ پیدا ہو گیا ہے۔ اسی اصول پر الہلال میں یہ صدا بلند ہونی چاہیے اور قطعاً ملک متوجہ ہوگا۔ کم از کم ایک پر زور کمیشن تحقیقات اور درستی طریق عمل کے لیے قائم ہونی چاہیے اور اس میں پانچ ممبر ہوں۔ مسٹر مظہر الحق اور مولوی عبدالباری بھی ہوں (گو موخر الذکر میرے مخالف ہی سہی۔)"

علامہ شبلی اور ان کے حامیوں کی تمام تر مساعی کے باوجود حالات بگڑتے چلے گئے تا آں کہ مجبور ہو کر جولائی ۱۹۱۳ء میں علامہ نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے ندوہ کی صورت حال اور زیادہ بگڑ گئی۔ اب طلبا میں بھی بے چینی پھیل گئی اور انھوں نے علامہ کے حق میں ہڑتال کر دی۔ جس سے حالات بہت ہی سنگین ہو گئے۔ ہر طرف سے استعفیٰ کی واپسی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ علامہ نے طلبا سے پُرامن رہنے اور اسٹرائک واپس لینے کی اپیل کی۔ لیکن بے سود اس موقع پر ملک کے مقتدر اخباروں نے شبلی کی حمایت میں مضامین لکھے اور اس کو ایک ملک گیر تحریک کی شکل دے دی۔ اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"آخر، مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا کی ہر قسم کی فہمایش کے باوجود طلبہ نے اسٹرائک کا عام اعلان کر دیا اور چوں کہ طرابلس و بلقان کی لڑائیوں اور کانپور کے ہنگاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پُرجوش مطالبوں کے باعث طبائع میں عام طور سے بے چینی تھی، اس لیے اسٹرائک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلے کی طرح پھیل گئی۔ زمیندار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانے کے مشہور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پُرزور مضامین لکھ رہے تھے۔ وقت کی سیاسی بے چینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کر دیا تھا۔ ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا، جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام، محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخ طریقت مولانا شبلی تھے۔ دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا جن میں اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے۔ احرار کا طبقہ ہر طرح

ہمدردی وحوصلہ افزائی کررہا تھا اور دوسرا طبقہ ندوہ
ے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا۔ مدارس کی عام
سلین اور کارکنانِ مدارس کی ہمدردی کے نام سے
ی گڑھ کالج کے اربابِ اقتدار اور مدرسۂ دیوبند کے
ماء بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے۔ اور یہ
سادم ملک کے طول وعرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم
ہا۔"

ندوہ کی اس صورت حال سے اس کے بہی خواہ بہت
یشان تھے۔ وہ ہر قیمت پر ندوہ کو بچانا چاہتے تھے۔ اُن
ے نزدیک ندوہ کی بربادی ایک عظیم الشان اسلامی
حریک کی ناکامی تھی جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے
یک زبردست المیہ تھا۔ اس لیے اصلاحِ ندوہ کے لیے
لک میں جگہ جگہ جلسے منعقد کیے گئے۔ اور اصلاح کی
وششوں کو تیز تر کیا گیا۔ اس مرحلے میں بھی مولانا آزاد
یش پیش تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو ان جلسوں میں
قریریں کرکے اس تحریک کو تقویت بخشی اور دوسری
رف 'الہلال' میں مضامین شائع کرکے عوام کو بیدار
یا۔ اس سلسلہ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے
ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے
لک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کار کا صور پھونکا کہ
ہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا۔ انھوں نے الہلال
یں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی
ر اس زور وشور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے
ے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی۔ اور ہر طرف
ندوہ، ندوہ کا شور برپا ہوگیا۔"

اسی دوران ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے
اعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس حادثۂ عظیم سے حالات ایک
م پلٹ گئے۔ دونوں متحارب گروپ کچھ نرم پڑے۔
خلصین کی کوششیں کچھ بار آور ہوتی نظر آئیں۔ مگر

خلیج اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ اس کو پاٹنا نہایت ہی
مشکل کام تھا۔ لیکن حکیم اجمل خاں جیسے بزرگوں کی مسیحا
نفسی، مولانا ابوالکلام، مولانا سید عبدالحئی اور نواب
ناظر یار جنگ (جج ہائی کورٹ، حیدرآباد) جیسے محبانِ
قوم اور عمائدِ ملت کی پُردرد اور پُرخلوص مساعی بالآخر
کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوئیں اور اپریل ۱۹۱۵ء
میں دو گروہوں میں مصالحت ہوگئی۔ اس تصفیہ کی خوبی
یہ تھی کہ اس سے دونوں فریق مطمئن تھے اور کسی کو بھی
احساسِ شکست نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی
کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگوں
نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی
نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف بڑے شاندار الفاظ میں
کیا ہے۔ چنانچہ اس معاہدہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے
حیاتِ شبلی میں وہ لکھتے ہیں:

"اس تصفیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب مسلم
یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے ضروری اجلاس میں شرکت
کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے جہاں سے وہ ۵
اپریل کو واپس آکر ندوہ کے آخری اجلاس میں شریک
ہوئے اور مجلسِ اصلاح کی طرف سے کھلے جلسے میں تمام
اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا، اور دونوں فریق نے
اتحاد واتفاق کے اس پُرمسرت منظر پر خوشی ظاہر کی
لیکن اس خوشی وشادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات
کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے
کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی
سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح اُمید ہے کہ
شاد ہوگی۔"[۲۲]

شبلی کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ
گرامی سے گہری عقیدت تھی۔ انھیں آپ کی سیرتِ مبارکہ
سے خصوصی شغف تھا۔ اسی لیے انھوں نے اس عظیم ترین ہستی کی
ایک مستند اور جامع سیرت لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور

اپنی زندگی میں اس کی دو جلدیں مکمل بھی کرلیں۔ ۱۹۱۳ء
میں اس کی پہلی جلد مکمل ہوئی اور الہلال کو یہ شرف
حاصل ہے کہ کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل اس
کے کچھ حصے اس کے اوراق کی زینت بنے۔ مولانا آزاد
نے ایک طویل تعارفی نوٹ کے ساتھ اس کے ابتدائی حصے
شائع کیے۔ اس نوٹ کے ضروری اقتباسات حسبِ ذیل
ہیں:

"ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصے سے شمس العلما مولانا
شبلی نعمانی ایک عظیم الشان دینی وعلمی خدمت میں مصروف
ہیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع و مکمل
سیرۃ کی تدوین و تصنیف میں، جو نہ صرف یہ کہ اُردو
زبان میں آج تک نہ لکھی گئی تھی۔ بلکہ افسوس ہے کہ عربی و
ترکی زبانوں میں بھی، جن پر اردو سے بہتر تصنیف و تالیف
کا دور گذر رہا ہے۔ لیکن شاید بہت کم لوگوں کو اس کام
کی مشکلات کا صحیح اندازہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کام ایک
شخص کے بس کا نہ تھا۔ گو وہ اپنے اندر قابلیتوں اور
فضیلتوں کا کیسا ہی مجمع رکھتا ہو۔ کیوں کہ قابلیت اور
دماغ نہیں بلکہ وقت اور محنت بھی مطلوب تھی ضرورت
تھی کہ ایک منتخب ترین اربابِ علم کی مجلس قائم ہوتی اور
یورپ کے مجامع علمیہ کے اصول پر اس کام کو انجام دیا
جاتا لیکن افسوس کہ ہم میں دماغ اور دل دونوں کا قحط
ہے۔ اور آدمی کسی مشین میں ڈھال کر پیدا نہیں کیے جا
سکتے۔

اس وقت سیرۃ النبی کا کام جس رفتار سے ہو
رہا ہے اس کے لحاظ سے امید کی جاسکتی ہے کہ غالباً چند
ماہ کے اندر کتاب کا پہلا حصہ پریس جانے کے لیے تیار
ہوجائے گا۔ اس وقت مسودے کی صورت میں اس کا
بڑا حصہ مرتب ہوچکا ہے اور بدر تک کے حالات کی
پہلی تبییض بھی ہوچکی ہے۔ ہم نے مولانا سے عرض کیا کہ
کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کے بعض اہم اجزا رجن

سے طرزِ تصنیف و ترتیب اور مشکلاتِ موضوع کے خاص مقامات سامنے آجائیں، شایع کردینے چاہئیں تاکہ اربابِ فن ورائے کو اس کی نسبت بحث کرنے اور مشورہ دینے کا موقع مل سکے۔

آج کی اشاعت میں ہم دیباچہ کتاب کا ایک ٹکڑا شائع کررہے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے موضوعِ کتاب کے متعلق ناظرین کو نہایت مفید بصیرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اصل کتاب کے بعض اہم حصے بھی شائع کیے جائیں گے۔ ان علمائے کرام سے جن کو فن سیر و حدیث سے دلچسپی ہے، خاص طور پر اُمید کی جاتی ہے کہ وہ بہ تعمق نظر ملاحظہ فرمائیں گے اور کوئی امر قابلِ بحث و مذاکرہ یا مشورۂ ضروری ان کے خیال میں آئے گا تو اُسے دفتر سیرۃ النبی یا صفحات الہلال تک پہنچانے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔ یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ابھی کتاب کے تمام ٹکڑے محض مسودے کی حالت میں ہیں۔ ممکن ہے کہ جو ٹکڑے شائع کیے جائیں ان میں عندالاشاعت بہت سی تبدیلیاں ہوجائیں۔ سر دست مقصود صرف بغرضِ مشورہ و مبادلۂ آرا و بحث و مذاکرہ ان کی اشاعت ہے۔

جو حضرات آج کل کے جدید فن سوانح نویسی و واقعہ نگاری سے ذوق و واقفیت رکھتے ہیں وہ کتاب کی ترتیب و تنظیم مطالب کی نسبت اگر چاہیں تو مفید مشورے دے سکتے ہیں۔"[۴۲]

اس طویل تمہیدی نوٹ کے بعد سیرۃ النبی کے دیباچے کو نقل کیا گیا ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد مزید تین قسطوں میں اس کے بقیہ حصے شائع کیے گئے ہیں (الہلال ۲۹ر جنوری ۱۹۱۳ء، ۵ر فروری ۱۹۱۳ء، ۱۲ر فروری ۱۹۱۳ء) اس پر اہلِ علم حضرات کی طرف سے سخت ردِ عمل ہوا۔ یوں تو حمایت اور تعریف میں بھی چند خطوط آئے جو الہلال میں شائع ہوئے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن میں بعض امور سے اختلاف کیا گیا تھا۔ مگر علما کا بڑا طبقہ علامہ کے بہت سے خیالات سے متفق نہیں تھا اسی لیے ان کے خلاف سخت محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ یہ کتابی شکل میں شائع نہ ہو اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ریاست بھوپال جو اس کے اخراجات کی کفالت کرتی ہے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا جائے۔ کافی دنوں تک یہ ہنگامہ رہا۔ لیکن آخر میں حالات علامہ کے حق میں سازگار ہوگئے۔ ریاست بھوپال سے امداد بھی جاری ہوئی اور سیرۃ النبی شائع بھی ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس جامع منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا علامہ شبلی کو نصیب نہ ہوسکا اور ابھی صرف دو جلدیں ہی مکمل کر پائے تھے کہ وقتِ موعود آپہنچا خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

آخری زمانے میں جب علامہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے اس وقت بھی انھیں سیرۃ النبی کی تکمیل کی ہی فکر لاحق تھی چنانچہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمیدالدین فراہی اور سید سلیمان ندوی کو تار دے کر بلایا۔ مولانا آزاد کو جو تار بھیجا تھا اُس کا مضمون یہ تھا۔

" اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہوجاتا۔ ورنہ سب کارروائی بے کار ہوجائے گی۔ سید سلیمان ندوی اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھادیتا۔"

یہ ٹیلیگرام ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء یعنی علامہ کی وفات سے صرف چار دن قبل لکھا ہے۔ بدقسمتی سے یہ تار مولانا آزاد کو وقت پر نہ مل سکا البتہ سید سلیمان ندوی عین وقت پر پہنچ گئے تھے۔ علامہ نے اُن سے سیرت کو مکمل کرنے کی وصیت کی جس کو انھوں نے پورا کیا۔ اس آخری ملاقات کا نقشہ سید صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

" مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا۔ معلوم نہیں انھیں تار ملا یا نہیں۔ میں اس وقت بانکی پور میں تھا۔ مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا۔ لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ر نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ میں سرہانے کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ 'اب کیا رہا' پھر زبان سے دو بار فرمایا۔ 'اب کیا اب کیا'۔ لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلادیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی۔ تو معاہدے کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: 'سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے' سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو'۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ضرور! ضرور!"[۴۳]

سید صاحب نے اپنا عہد پورا کیا اور اُسی معیار پر سیرۃ النبی کی تکمیل کی جو معیار علامہ شبلی نے قائم کردیا تھا۔

علامہ شبلی مولانا آزاد بہت سے ملکی اور ملی مسائل میں بھی ہم خیال، سیاسی میدان میں بھی دونوں ہم قدم نظر آتے ہیں: کے بارے میں تو سب کو معلوم ہی ہے کہ وہ کٹر قسم کے نیشنلسٹ خیالات کے انسان تھے۔ کانگریس کے صفِ اول رہنماؤں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اسی لیے قدم قدم پر مسلم لیگ سے اُن کا ٹکراؤ ہوا۔

علامہ شبلی بھی بنیادی طور پر قوم پرور خیالات کے حامل تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ سرسید کے رفیقِ خاص ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے حامی تھے اور اس مسئلے پر ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کی طرح وہ

لم لیگ کے نظریات اور اس کی حکمتِ عملی سے اختلاف تے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی سیاسی نظمیں آج بھی ہلالے ں کو گرماتی اور روح کو تڑپاتی ہیں۔ خصوصیت سے ں وہ نظمیں جو مسلم لیگ کی ہجو میں کہی گئی ہیں۔ بہت سپ اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ مولانا طفیل احمد منگلوری کا لکھنا ہے کہ مسلم قوم میں سیاسی بیداری لانے کا کام شبلی نجام دیا اور اس راہ میں ان کی ہمرکابی ابوالکلام نے اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں "سیاسی ری میں مولانا شبلی کا حصہ" کے تحت وہ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا لکلام، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے۔ انھوں رسالہ جات موسوم بہ الہلال اور البلاغ کے ذریعے لمانوں میں مذہبی اور سیاسی روح پھونکی ...."

(ص - ۳۹۱)

اسی طرح مسلم یونیورسٹی تحریک میں بھی دونوں ت انگیز طور پر ہم مسلک و ہم خیال نظر آتے ہیں۔ یوں ی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز خود سر سید احمد خاں ی تھی۔ اور اس کی خشتِ اوّل کے طور پر محمڈن لو اورینٹل کالج قائم کر لیا تھا لیکن یونیورسٹی کی طرف ئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ سرسید کے بعد کے جانشینوں نے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں کوششیں لیکن کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بالآخر ۱۹۱۰ء ، سر آغا خاں کی رہنمائی میں تحریک کا باقاعدہ احیا ہوا یونیورسٹی کے حصول کی خاطر منظم طور پر جدوجہد کی گئی۔ ، کے لیے لکھنؤ اور علی گڑھ میں جلسے منعقد کیے گئے اور سرائے وغیرہ کی خدمت میں وفود بھیجے گئے۔ اس ریک سے علامہ شبلی بھی وابستہ تھے اور مولانا آزاد بھی۔ مدار میں دونوں کے خیالات میں کسی حد تک اختلاف پا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے حسبِ معمول، عام لوگوں مختلف موقف اختیار کیا۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ جب وہ اپنے نظریات میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ مولانا کا ہی موقف درست تھا۔ علامہ شبلی مولانا آزاد کو تمام حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ ۲۵ رمارچ ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں وہ مولانا کو لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا، یہ قطعی ہے۔ باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خوب جانتے ہیں، لیکن بہر حال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔"

اس کے بعد ۱۸ راگست ۱۹۱۱ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے۔ میں بھی ممبر ہوں اس لیے شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد شملہ ڈپوٹیشن میں جانا ہے۔ غرض ان اسباب سے تاخیر ہو رہی ہے ورنہ آپ بچ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت سے منفعل ہو جاتا ہوں کہ جرم سخت ہے، بلکہ سخت سے سخت تر۔ لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل بھی اسی قدر نرم بلکہ نرم تر ہے۔ اس لیے جرأتِ معذرت قائم ہے، اور رہے گی۔"

زعمائے ملک کی مساعی کے نتیجے میں حکومت یونیورسٹی کا چارٹر دینے کو راضی تو ہو گئی۔ لیکن اس شرط پر کہ یونیورسٹی کا نام علی گڑھ یونیورسٹی ہوگا۔ اس کا دائرہ اختیار صرف علی گڑھ تک محدود ہوگا یعنی اس کو ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے الحاق کا حق حاصل نہ ہوگا، اور یونیورسٹی سے متعلق جملہ امور کے حتمی فیصلے کا حق چانسلر کو حاصل ہوگا۔ ظاہر ہے ان شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنے کو مسلمان تیار نہیں تھے۔ لیکن علی گڑھ سے متعلق چند حضرات اس حق میں تھے کہ ہمیں ہر قیمت پر یونیورسٹی کا چارٹر لے لینا چاہیے۔ علامہ شبلی بھی ابتدا میں اسی خیال کے حامی تھے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا خط سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن مولانا آزاد اس خیال سے متفق نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس قسم کی یونیورسٹی قبول کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جس پر بالادستی حکومت کی ہو اور اس کو اندرونی خود مختاری حاصل نہ ہو۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسوں میں بھی کیا اور الہلال میں بھی مضامین شائع کر کے اپنے موقف کی وضاحت کی اور اپنے مخالفین پر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر برسائے۔ رفتہ رفتہ علامہ شبلی بھی مولانا آزاد کے ہم خیال ہو گئے۔ انھوں نے 'کشاف' اور 'وصاف' کے فرضی نام سے چند نظمیں بھی لکھیں جو کہ الہلال میں شائع ہوئیں۔ ان میں انھوں نے یونیورسٹی کے مسئلے پر 'علی گڑھ گروپ' کے رویے پر طنز کیا ہے۔ ان نظموں سے مولانا آزاد کے موقف کی حمایت بھی ہوتی ہے۔

جس طرح علامہ شبلی مولانا آزاد کی ذہانت و طباعی اور وسعت مطالعہ و تبحر علمی سے متاثر تھے، اسی طرح مولانا آزاد بھی ان کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے اور عمر کے تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اور باوجود ندوہ میں کئی ماہ ایک ساتھ رہنے اور بے تکلفانہ مراسم استوار ہونے کے مولانا ہمیشہ علامہ کا بزرگوں کا سا ہی احترام کرتے رہے۔ علامہ کے نام مولانا کا ایک خط ملاحظہ ہو جو ۱۶ راکتوبر ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا تھا۔ دیکھیے القاب سے لے کر آخری لفظ تک کس قدر ادب اور احترام ملحوظ رکھا گیا ہے:

"یا مولی الجلیل! تعلیقہ مبارک پہنچا۔ پچھلے خط میں آپ نے لکھا تھا کہ غضب ہے تم ضروری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے۔ سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کون سی ہوتی ہے۔

________ کاش آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت باتیں کرتا۔ میری قلبی حالت عجیب و غریب ہو رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ بظاہر حالات جلد شرف یاب

نے کی اُمید نہیں۔
الوصول الی سعاد و دونہا
لجبال و دونہن حتیوف
لتوبر میں رنگون بھی چلیے۔ والد کے عقیدتمند
ب"۔
علامہ کی مولانا کے دل میں کتنی وقعت تھی اور
ت کا ان کے دل میں کیا مقام تھا، اس کا کسی قدر
ا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام مولانا کے
یا لگایا جاسکتا ہے:
پ کی غزل پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین
ی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔۔۔۔۔
ت مولانا مرحوم کی ذات بنوع و کمال کے
مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ
ہے کہ دو، تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ
رہ کیا گئے' علم و فن کی صحبتوں کا سر تا سر خاتمہ
انا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی
نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔
ب عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا
جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت
ف و کیفیت کا ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور
ور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں
وق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے
ی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے'
پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی' جس کی طبع
کے مہالک و آفات میں سے ہے' انھیں چھو بھی
ی۔ شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ اُن
آیا تھا۔ اس کی نظیر تو ملنی دشوار ہے ہندستان
شاعری غالب پر نہیں' اُن پر ختم ہوئی۔ کبھی
خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ
ن کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح
کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزّل و مدح کے محدود
میدان میں ہے' لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوق
اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا
کیے جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں خصوصاً حیدر آباد والی
نظم۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر
ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت
کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملے
کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران
کے نئے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں۔ جن کی
ترتیب و اشاعت میں غریب' براؤن نے اس قدر
زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعرا
بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے
محفوظ رکھے"

یہ خط ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء کا مکتوبہ ہے۔ گویا علامہ
شبلی کے انتقال سے تقریباً ربع صدی بعد کا۔ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی یاد ان کے دل میں اس وقت
پر بھی تازہ تھی۔ اور اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی انھیں
تڑپا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ اس خط سے ان کے فارسی
ادب کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ بھی
ہوتا ہے کہ کلاسیکی فارسی ادب بالخصوص فارسی شاعری
کے ساتھ جدید شاعری پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

اور آخر میں ایک بہت ہی دلچسپ بات مولانا
آزاد کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ جس کتاب کا بھی مطالعہ کرتے
اس پر حواشی ضرور تحریر فرماتے۔ یہ عادت انھیں بچپن
ہی سے پڑ گئی تھی۔ یہ دراصل ان کے والد کی نصیحت
کا اثر تھا۔ انھوں نے مولانا آزاد کو ہدایت کی تھی کہ جو
کتاب بھی پڑھو اس کے متعلق یادداشتیں ضرور قلم بند کرو
یہ علیحدہ بیاض پر ہونی چاہئیں اور اگر یہ دستیاب نہ
ہو تو زیر مطالعہ کتاب پر ہی لکھ لینی چاہئیں۔ خود مولانا
خیر الدین کا بھی یہی طریقہ تھا کہ وہ جس کتاب کا مطالعہ
کرتے اس پر نوٹس ضرور لکھتے۔ یہی طریقہ مولانا آزاد
نے بھی اپنایا۔ چنانچہ سیکڑوں کتابوں پر ان کے حواشی
ملتے ہیں۔ یہ کتابیں مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے کی
زینت تھیں۔ یہ کتب خانہ اب' انجمن روابط فرہنگی
ہند' (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز) 'آزاد بھون'
نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں جناب سیّد
مسیح الحسن نے بڑا مفید اور اہم کام انجام دیا ہے۔
انھوں نے اردو کتابوں پر مولانا آزاد کے تمام حواشی
کو سیاق و سباق کے ساتھ مضمون کی شکل میں یکجا کر دیا
ہے۔ یہ سلسلۂ مضامین' مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی
(زیر مطالعہ کتابوں پر)' کے عنوان سے "اسلام اور
عصر جدید" کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اس کی
پہلی قسط جولائی ۷۴ء ۱۹ (جلد ۶۔ شمارہ ۳) میں شائع
ہوئی۔ اسی سلسلے کی ایک اہم قسط اکتوبر ۱۹۸۱ء کی
ہے جس میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تالیف
و تصنیفات پر مولانا کے حواشی شامل کیے گئے ہیں بعض
حیثیتوں سے یہ حواشی بہت اہم ہیں۔ ان سے جہاں مولانا
کے مطالعے کی وسعت اور معلومات کی ہمہ گیری کا اندازہ
ہوتا ہے وہیں علامہ سے مولانا کے گہرے لگاؤ اور
قریبی تعلق کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ قارئین کی ضیافتِ
طبع کے لیے چند حواشی پیش کیے جاتے ہیں یہ اقتباسات
مسیح الحسن صاحب کے مذکورہ مضمون کی جولائی ۷۴ء ۱۹
کی قسط سے ماخوذ ہیں:

۱۔ رسائل شبلی۔ علی گڑھ مطبع العلوم ۱۸۹۸ء:
" ص ۲۶۳: سنسکرت سے عربی میں ترجمہ
شدہ کتابوں کی ایک فہرست درج ہے۔ ان میں سندباد
بھی شامل ہے۔

حاشیۂ آزاد: یہ سندباد دوسری چیز ہے جو
فارسی میں ترجمہ ہوئی تھی۔ خدا یار کا ترجمہ اب چھپ
گیا ہے" (ص ۶۶)

۲۔ ص ۲۹۷: اسپین میں علمی مدارس کے فقدان پر اظہار افسوس کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ زیب و زینت معمور عمارتیں اور قصر و محلات تھے لیکن ان تمام میں کسی کالج یا اسکول کا ہم کو نشان نہیں ملتا۔

حاشیۂ آزاد: تمام مساجد جوامع علوم تھیں۔ کذلک فی الہند" (ص ۶۶)

۳۔ " ص ۲۰ پہلی سطر میں 'لوازمات' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

حاشیۂ آزاد: "لوازم" (ص ۶۷)

۴۔ مقالات شبلی۔ جلد اوّل (مذہبی)

" ص ۵۵۔ کلام پاک میں خدا کی مشیت یا حکم اور ارادے کے ذکر میں شبلی نے دو قسمیں لکھی ہیں: فطری اور شرعی۔

حاشیۂ آزاد: فطری اور شرعی کی جگہ تکوینی و تشریعی کہنا تھا۔ سلف سے بھی مروی ہے اور مفہوم کو بہتر ادا کرتا ہے۔ ابن قیم اور ابن تیمیہ نے جا بجا یہ مصطلحات استعمال کی ہیں۔" (ص ۶۵)

۵۔ مقالات شبلی۔ جلد دوم (ادبی)

" ص ۸۱ شبلی نے اپنے مضمون 'بھاشا اور مسلمان' میں ملک محمد جائسی کے کمال کا ذکر کیا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخری زمانے میں 'کالیداس' گذرا ہے جس نے رامائن کا بھاکا میں ترجمہ کیا ہے۔

حاشیۂ آزاد: مقصود 'تلسی داس' ہے۔ غلطی سے کالیداس لکھ دیا ہے۔" (ص ۶۹)

۶۔ حیات شبلی، مؤلفہ سیّد سلیمان ندوی۔

ص ۹۷: سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں: معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافے کی توقع محض امید موہوم تھی۔ اس لیے صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفا کی۔ علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔ مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے۔ مولوی نذیر حسین صاحب کی ایثار الحق کے جواب میں انتصار الحق ان ہی نے لکھی ہے۔"

حاشیۂ آزاد: اگر اس زمانے میں مولوی شبلی کو مجتہدانہ نظر و فکر کی جستجو ہوتی تو مولوی عبد الحیٔ کو ترجیح دیتے جو حنفیت کے مقلدانہ جمود سے باہر آ چکے تھے لیکن انھوں نے مولوی ارشاد حسین کا انتخاب کیا جو مقلد اُمّی تھے۔ مولوی نذیر حسین کی کتاب ایثار الحق نہیں ہے، معیار الحق ہے۔ مولوی ارشاد حسین کی معلومات کا یہ حال تھا کہ انتصار الحق میں بلوغ المرام کو شاہ ولی اللہ کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ ان کی تعریف میں مجتہدانہ ژرف نگاہی لکھنا کس قدر بے معنی ہے۔" (ص ۸۴، ۸۵)

۷۔ ص ۳۴۸: شبلی کے عقد ثانی کی صورت اس طرح ہوئی کہ ان کے معالج مصطفیٰ خان نے ان کو دوسرے نکاح کا مشورہ دیا چنانچہ مولوی محمد سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن سے نسبت ٹھہری۔ عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے بیٹے حامد حسن صاحب کو نا گوار گذرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہو گئے۔

حاشیۂ آزاد: اس لیے کہ پہلے یہ رشتہ خود حامد کے لیے تجویز ہوا تھا۔" (ص ۹)

حواشی

۱۔ حیات شبلی، ص ۴۴۴۔
۲۔ مولانا ابو الکلام، فکر و فن، ص ۴۴ - ۴۵۔
۳۔ مولانا ابو الکلام، فکر و فن، ص ۹۵۔
۴۔ مکاتیب ابو الکلام، مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری، ص ۳۳۴۔
۵۔ حیات شبلی، ص ۳۵۰ - ۳۵۱۔
۶۔ حیات شبلی، ص ۳۴۷ - ۳۴۸۔
۷۔ مولانا ابو الکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، ص ۴۰۶۔
۸۔ رپورٹ متعلق اجلاس نوزدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء، ص ۳۰۳، ۳۰۴۔
۹۔ رپورٹ متعلق اجلاس نوزدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء، ص ۳۰۴۔
۱۰۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۱۲۔
۱۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۲۸۔
۱۲۔ امام الہند، تعمیر افکار، ص ۲۷۹۔
۱۳۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۲۔
۱۴۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۱۔
۱۵۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۲
۱۶۔ مہتمم دار العلوم ندوہ۔
۱۷۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۴۔
۱۸۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۴-۳۱۵۔
۱۹۔ حیات شبلی، ص ۴۴۳ - ۴۴۴۔
۲۰۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۲۴-۳۲۵۔
۲۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۰۲۔
۲۲۔ حیات سلیمان، ص ۶۴۷ - ۶۴۸۔
۲۳۔ نئے پرانے چراغ، حصہ دوم، ص ۴۵۔
۲۴۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۲۴۔
۲۵۔ شبلی نامہ، ص ۲۲۳، ۲۲۲ ۲۶۔ حیات شبلی، ص ۵۰۱۔
۲۷۔ حیات شبلی، ص ۴۳۷ - ۴۳۸۔
۲۸۔ حیات شبلی، ص ۴۵۳ ۲۹۔ حیات شبلی، ص ۴۵۶۔
۳۰۔ حیات شبلی، ص ۶۶۷۔
۳۱۔ الہلال، جلد ۲، شمارہ ۳ (۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء)، ص ۸۔
۳۲۔ حیات شبلی، ص ۲۲۷۔
۳۳۔ کاروان خیال، ص ۹۲ - ۹۳۔

مولانا آزاد اور انجمن ترقی اردو ہند

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگوں کا آبائی وطن دلی تھا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں مغلوں کا دارالسلطنت آگرہ تھا مگر دلی کو علمی مرکزیت حاصل تھی اور بڑے بڑے علما دلی ہی میں جمع ہو گئے تھے۔ ان ہی علما میں ایک شیخ جمال الدین نام کے بزرگ تھے۔ جن کی حق گوئی اور علمیت کا چرچا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ علم حدیث پر انھیں بڑا عبور تھا۔ اکبر نے ان ہی کے زمانے میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی، اور اس کے بعض درباری علمانے اکبر کے روحانی پیشوا ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔ اس فتوے پر مہر تصدیق ثبت کرانے کے لیے اکبر نے مغل دربار کے نمائندوں کو شیخ جمال الدین کی خدمت میں بھیجا مگر اس مرد قلندر نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہی شیخ جمال الدین عرف بہلول دہلوی مولانا ابوالکلام آزاد کے مورث اعلیٰ تھے۔ دلی کے قیام کے زمانے میں ان کو کئی درباری اعزاز پیش کیے گئے مگر انھوں نے قبول نہیں کیے۔ فرماتے کہ "گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں دل نہ ویران ہو جائے" دلی ہی میں اس عالم دین کا انتقال ہوا۔

قیام دہلی کے زمانے میں مولانا منور الدین نے اپنی بڑی لڑکی کی شادی شیخ محمد ہادی سے کر دی۔ شیخ محمد ہادی، شیخ محمد احسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور ان کا تعلق مولانا شیخ جمال الدین کے خاندان سے تھا۔ شیخ محمد ہادی مولانا ابوالکلام کے دادا تھے ان کا انتقال دہلی میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوا۔ مولانا آزاد کے والد کی عمر اس وقت تین یا چار برس کی تھی۔ یہ زمانہ مغلیہ دور کے خاتمے کا تھا انگریزی حکومت کا تسلط تقریباً ہندوستان کے چاروں طرف ہو چکا تھا۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے نانا مولانا منور الدین کے یہاں ہوئی۔ نانا کی آمد و رفت قلعے میں زیادہ تھی اور بقول مولانا آزاد قلعے کی زندگی کے جو حالات وہ بیان کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود حد درجے تنزل و غفلت کے بے شمار خوبیاں تمدن اور عمدہ سوسائٹی کی قلعے میں موجود تھیں۔ انیسویں صدی کے علما میں مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین کی نمایاں حیثیت تھی۔ وہ دلی ہی کے رہنے والے تھے لیکن یہاں کے ماحول سے وہ مطمئن نہ تھے اس لیے دلی سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ اور مکۂ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی یہیں انھوں نے ایک عرب خاتون سے شادی کی۔ یہ عرب خاتون شیخ محمد بن ظاہر وتری کی بھانجی تھیں جو اس وقت مدینۂ منورہ کے مفتی تھے اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکۂ معظمہ کے محدث بنے۔ پانچ بچے ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ مولانا آزاد ان پانچوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ مکۂ معظمہ میں ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے ان کی تعلیم و تربیت والد ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا آزاد کی والدہ کی مادری زبان عربی تھی اور وہ اپنے بچوں سے عربی زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ اردو زبان نہیں جانتی تھیں۔ البتہ اتنی اردو سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔

مولانا کے والد ۱۸۹۸ء میں مکۂ معظمہ میں سخت بیمار پڑے وہاں کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو عزیزوں اور مریدوں کے مشورے سے انھیں علاج کے لیے بمبئی لایا گیا۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد انھیں کلکتہ لے گئے۔ مولانا خیر الدین کے مریدوں کی تعداد بہت بڑی تھی اور وہ سب مولانا سے بے حد انسیت اور محبت کرتے تھے اس لیے علاج کے بعد ان مریدوں نے ان کو واپس نہیں جانے دیا اور مولانا مع اپنے خاندان کے کلکتہ میں رہنے لگے اور اب یہی ان کا وطن ہو گیا۔ مولانا آزاد بھی اپنے والد کے ساتھ کلکتہ ہی میں بس گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں مولانا خیر الدین مولانا آزاد کو تنہا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا خیر الدین کی وفات کے بعد ان کے مرید مولانا آزاد کو ان کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ مگر مولانا نے انکار کر دیا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز گیارہ بارہ سال کی عمر سے ہوا۔ پہلے شاعری اور بعد میں نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی نے پیدا کیا۔ یہ مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے شاگرد تھے۔ ان کی بہن مولانا کے یہاں گھر کے کام کاج کے لیے ملازم تھیں۔ اس تعلق سے مولوی عبدالواحد خاں کی آمد و رفت ہوئی۔

مولوی عبدالواحد خاں نے ان کا تخلص "آزاد" رکھا۔ مولانا کا شعری ذوق بڑھتا گیا اور کسی اچھے استاد کے متلاشی ہوئے۔ چنانچہ پہلے منشی امیر احمد کو دو غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں جو انھوں نے اصلاح کے بعد واپس بھیج دیں لیکن باقاعدہ شاگرد مولوی ظفر احسن شوق نیموی کے ہوئے بقول مولانا آزاد وہ بہت جی لگا

ایم۔ حبیب خاں

ناظم کتب خانہ، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی ۲

کر اصلاح دیتے تھے۔[۲۸]

مولانا کو صحافت سے دلی رغبت تھی ۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگِ عالم" جاری کیا۔ یہ ۸ ماہ تک نکلتا رہا۔ ۱۹۰۰ء میں "المصباح" نکالا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتے سے "لسان الصدق" جاری کیا۔ چند مہینوں میں یہ ایسا چمکا کہ ادبی حلقوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

اسی زمانے میں مولانا آزاد کو تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے پہلی تقریر ۱۹۰۳ء میں کی۔ اُس وقت حالی، شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے۔ علامہ شبلی کا تعلق مولانا آزاد سے "لسان الصدق" کی وجہ سے ہوا۔ شبلی اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے آنریری سکریٹری تھے۔ اور انجمن کی خبریں اور جلسوں کی رپورٹیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ "لسان الصدق" میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ بعض محققین کا خیال ہے مولانا آزاد کی شبلی سے ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی لیکن خود مولانا آزاد، آصف علی، عبداللہ بٹ اور شیخ محمد اکرام نے مولانا شبلی سے ملاقات کا سنہ ۱۹۰۴ء لکھا ہے جو کہ قرینِ قیاس ہے۔ علامہ شبلی کو مولانا آزاد سے بہت محبت تھی مولانا بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ہمیں "حیاتِ شبلی" اور شبلی کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی سرسید نے اس کی قدرے مخالفت کی اس لیے مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ عرصے تک کانگریس سے الگ رہا۔ مولانا آزاد پہلے ممتاز مسلمان تھے جنھوں نے کانگریس کے حق میں آواز اٹھائی۔ یہ کام انھوں نے "الہلال" سے لیا۔ مولانا آزاد نے "الہلال" ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتے سے نکالا۔ یہ اردو کا پہلا سیاسی اور مذہبی جریدہ تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اس دور کے تمام ادبی اور غیر ادبی جریدوں میں اس کا رنگ سب سے الگ تھا۔ یہ ایک دعوت تھی مسلمانوں کو سیاست کی طرف رجوع کرنے کی۔ اس کے فکر انگیز سیاسی اور دینی مضامین نے ملک میں ہلچل پیدا کر دی۔ "الہلال" کے بعد مولانا نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو کلکتے ہی سے "البلاغ" نام کا دوسرا اخبار نکالا یہ الہلال کی طرز پر تھا لیکن یہ بھی ۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو بند ہو گیا۔ الہلال اور البلاغ کے صفحات اس دور کے ہندوستان کے علمی، ادبی، سیاسی اور دینی رجحانات کے ایسے خزینے ہیں جو کہیں اور نہ ملیں گے۔

> ...مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی، سیاسی، ادبی، علمی اور صحافتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اردو کے ساتھ مولانا کے تعلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے جو ابتدائی زمانے سے آخر تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا...

مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی، سیاسی، ادبی، علمی اور صحافتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولانا کے تعلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ جو ابتدائی زمانے سے آخر تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ سرسید کی تحریک پر علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی۔ ۴ جنوری ۱۹۰۳ء کو اس کانفرنس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں اس کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے ایک شعبے کا نام انجمن ترقی اردو رکھا گیا۔ اس شعبے کے مقاصد میں اردو زبان کی ترقی اور اس کے علمی سرمائے میں اضافہ کرنا تھا۔ انجمن شروع ہی سے ایک سیکولر ادارہ رہی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم فرقوں کے لوگوں نے اُردو کی ترقی اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ انجمن کے قیام کے موقع پر علامہ شبلی اس کے پہلے اعزازی سکریٹری بنائے گئے تھے۔ اور صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ کو بنایا گیا۔ نائب صدور کے لیے مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا الطاف حسین حالی کا انتخاب ہوا۔ مولوی حامد علی صدیقی اسسٹنٹ سکریٹری بنائے گئے یہ سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ یہ علمی شعبہ اُس وقت قائم تو ہو گیا مگر اس کا دستور العمل بننے تک اور ارکان کی تشکیل ہونے میں تین ماہ لگ گئے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو کی سرگرمیوں کا آغاز اپریل ۱۹۰۳ء سے ہوا۔ مولانا شبلی نے بڑے انہماک اور جوش کے ساتھ انجمن کے کام انجام دیے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں انجمن کی بڑی اہم کتابیں شائع کیں ان کتابوں میں دوسری زبانوں کے علاوہ انگریزی فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمے بھی شامل تھے۔ انجمن کی کارگذاری کی رپورٹیں سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل ہوتی تھیں۔

انجمن کی رپورٹوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا تعلق انجمن سے مئی ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ مئی ۱۹۰۳ء کے شروع میں انجمن کا جو جلسہ ہوا اس میں ممبروں کی تعداد ۲۵ تھی۔ مئی ۱۹۰۳ء کے آخر میں علامہ شبلی کی رپورٹ کے مطابق جن ۱۵ ممبروں کا اضافہ ہوا ان میں مولانا آزاد کا نام شامل ہے۔ اب انجمن کے کل ممبروں کی تعداد ۴۴ تک پہنچ گئی۔ "باقیاتِ شبلی" میں مشتاق حسین مرحوم لکھتے ہیں:

"مولوی ابوالکلام صاحب کی شرکت سے بنگال میں انجمن کی اشاعت کی قوی امید ہے کیوں کہ آپ نہایت ہمدردی سے انجمن کی اعانت فرما رہے ہیں اور

ہر کام میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں"[۱]

مولانا آزاد نے نومبر ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدق" کلکتے سے جاری کیا۔ اس میں انجمن کے جلسوں کی روداد یں وہ برابر شائع کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ انجمن کے فروغ کے سلسلے میں خود بھی نوٹ لکھتے۔ نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں مولانا انجمن ترقی اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اُردو نے اردو زبان کے علمی دائرے کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی فارسی کی علمی اور فنی کتابیں شگفتہ اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو۔ چنانچہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتب میں انجمن نے انتخاب کی تھیں ان کے ترجمے اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقے سے ہو رہا ہے اور اُمید ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلائیں گی۔ ان کتابوں کی فروخت کی نہایت آسان اور موزوں صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص انجمن کی چھپی ہوئی کتابوں کو لینا چاہے وہ ایک سال میں پانچ روپے جیسی ایک قلیل رقم کی کتابوں کے لینے کا باضابطہ انجمن سے وعدہ کرے۔ ایسی حالت میں وہ مجبور نہیں کیا جائے گا کہ ایک مشت پانچ روپے کی کتابیں خریدے بلکہ چار مرتبہ یا تین مرتبہ متفرق کتابوں کو منگوانے کا مجاز ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بہتر اور آسان طریقہ کتابوں کے لینے کا جس میں لینے والے کو کسی قسم کے بار کا احساس نہ ہو نہیں مل سکتا۔ ایک سال کے عرصے میں پانچ روپوں کی کتابوں کا لینا کس قدر غیر محسوس صرف ہے؟ ہماری گذارش بالخصوص اہل بنگال سے ہے جن کے کان انجمن کی آواز سے ابھی بہت کم آشنا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی علمی زبان کی ترقی سے غافل نہ ہوں اور نہیں تو کم از کم انجمن کی کتابوں کی مستقل خریداری ہی سے اس اہم کام کی مدد کریں۔ باقاعدہ کارروائی ہونے کے خیال سے درخواست خریداری کے چھپے ہوئے فارم سر شخص انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی ناظم صیغۂ علوم و فنون حیدر آباد سے یا دفتر لسان الصدق سے منگوا سکتا ہے۔"

(ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر لسان الصدق و رُکن انتظامی انجمن ترقی اُردو)[۲]

مولانا آزاد کے اس اقتباس سے انجمن ترقی اُردو سے ان کی والہانہ محبت اور اس کے فروغ میں ان کی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد انجمن کی مجلسِ انتظامیہ کے ممبر مقرر ہو چکے تھے۔ انجمن کے فروغ کے لیے مولانا کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ انھوں نے فروری ۱۹۰۴ء میں کلکتے میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا اس شاخ کے قائم کرنے کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے اخبار میں لکھتے ہیں کہ:

"انجمن ترقی اُردو کے لیے کلکتے میں ایک کوشش۔

"جناب مرزا شجاعت علی خاں بہادر نے (جو کلکتے کے مشہور رئیس ہیں) کچھ عرصے سے ایک ماہوار مشاعرے کی بنا ڈالی ہے جس کا ہر مہینے میں ایک جلسہ ہوتا ہے اور کلکتے کے موجودہ شعرا طرحی کلام سناتے ہیں۔ جنوری میں حسنِ اتفاق سے جناب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی اور جناب مرزا آغا شاعر صاحب ایڈیٹر "آصف الاخبار" بھی کلکتے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس لیے جنوری کا مشاعرہ خاص اہتمام سے ہوا۔ اسی مشاعرے میں ایک کام کی بات یہ ہوئی کہ جناب مرزا شجاعت علی خاں بہادر کی تحریک اور جناب مولوی اشرف الدین صاحب تولی امام باڑہ ہگلی اور جناب مرزا آسمان جاہ بہادر کی تائید سے ایک کمیٹی انجمن ترقی اُردو کی تائید کے لیے کلکتے میں قائم ہو گئی۔ جس کے غالباً بارہ اشخاص خاص رکن انتظامی قرار پائے۔ یہاں تک تو بالکل معمولی کارروائی ہے جس پر کسی قسم کی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک باضابطہ عملی کارروائی نہ شروع ہو جائے اُس وقت تک یہ سرگرمی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ ہمارے سامنے کلکتے کی بہت سی نظیریں موجود ہیں جن میں باوجود اکثر سرگرم حضرات کے شریک ہونے کے آج تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا۔ ہمیں امید ہے کہ جناب مرزا صاحب خان بہادر نے جس طرح اس ضروری کام کی تحریک کی ہے ویسے ہی اسے انجام تک بھی پہنچائیں گے۔ کسی کام کا شروع نہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ کسی کام کو شروع کر کے انجام تک نہ پہنچایا جائے۔ اس کارروائی کو آج ایک عرصہ ہو گیا۔ ابھی تک معلوم نہیں کہ اس کمیٹی کا کوئی اجلاس ہوا بھی یا نہیں اور اگر اجلاس ہوا تو کیا کارروائی کی گئی۔ ہم اس ضرورت کو کہ کلکتے میں ایک شاخ انجمن ترقی اُردو قائم ہو کس قدر ضروری ہے آئندہ نمبر میں دکھلائیں گے لیکن خوشی کی بات ہے کہ جن لوگوں نے اس شاخ کے قائم ہونے کا خیال کیا ہے وہ ہمارے بیان کرنے کے محتاج نہیں ہیں۔ اس کی ضرورت ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس لیے ہم کو اُمید ہے کہ جناب مرزا صاحب ہمیں ان کارروائیوں کی اطلاع دیں گے جو اس وقت تک کی گئی ہیں اور قواعد انجمن اور فہرست ممبران انتظامی بھی ہمارے پاس بھیجنی چاہیے کہ باقاعدہ "لسان الصدق" میں شائع کیا جائے اور ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے اور صرف ممبروں کی ایک فہرست نہایت خوشخط لکھ کر رکھ دی گئی ہے تو ہے تو ہم مثل ان سیکڑوں غزلوں کے جو اس مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں اس تحریک کو بھی شاعرانہ تخیلات کا

ایک کرشمہ خیال کرتے ہیں"۔

۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نے انجمن ترقی اُردو کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مولانا آزاد کی شبلی سے ملاقات ۱۹۰۴ء میں بمبئی میں ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی انجمن چھوڑ کر ندوہ چلے گئے۔ اور 'الندوہ' کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہیں مولانا آزاد علامہ شبلی کے علمی کاموں کی معاونت کرنے لگے اور الندوہ کے نائب مدیر کی حیثیت سے علمی اور ادبی کام انجام دیتے رہے۔ تاہم انجمن ترقی اُردو سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ اور اس کی ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

۱۹۱۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اب تک انجمن کو قائم ہوئے دس سال کے قریب ہو چکے تھے۔ لیکن نامور ادیبوں کی سرپرستی کے باوجود کوئی نمایاں کام نہیں ہوا تھا۔ بقول مولوی عبدالحق جب انھیں انجمن کا چارج دیا گیا تو انجمن کا کل اثاثہ ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی سے بندھا ہوا تھا' کچھ رجسٹر' کچھ غیر مرتب شدہ مسودات' ایک قلم اور ایک ٹوٹی ہوئی پرانی دوات تھی۔ یہ تھا انجمن کا کل اثاثہ جو مولوی صاحب کو اپنے پیش رو کی طرف سے ملا۔ مولوی عبدالحق کو اردو سے والہانہ عشق تھا۔ اس لیے اس اثاثے نے انھیں بددل نہیں کیا۔ اب تک انجمن کا دفتر علی گڑھ میں تھا۔ مولوی صاحب اُسے اورنگ آباد لے گئے اور وہاں رہ کر انجمن کے کام اور اُردو کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انجمن کے لیے ایک کثیر رقم جمع کی اور اس رقم کو علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت پر صرف کیا۔

نومبر ۱۹۳۸ء میں بابائے اُردو نے انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر دلّی منتقل کر دیا۔ اور دلّی میں ڈاکٹر مختار الدین انصاری کی کوٹھی واقع دریا گنج میں انجمن کا دفتر قائم کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں انجمن علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوئی تو اس کا کل اثاثہ ایک پُرانا صندوق اور کچھ غیر مرتب مسودات تھے لیکن جب دلّی لائی گئی تو اس کی شائع شدہ کتابیں اور دوسرا سامان ریل گاڑی کے کئی ڈبوں میں لاد کر دلّی لایا گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا۔ چاروں طرف بلوے' قتل و غارت اور لوٹ مار ہونے لگی۔ پاکستان بنا لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا۔ انجمن کا صدر دفتر بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور بلوائیوں نے انجمن کے دفتر کو آگ لگا دی۔ اس کا قیمتی کتب خانہ برباد کر دیا بظاہر کوئی امید باقی نہیں رہی تھی کہ انجمن کا وجود باقی رہے گا۔ مولانا آزاد کو جب اس بربادی کا علم ہوا تو انھوں نے حفاظتی اقدامات کرائے اور دفتر کو مقفل کرا دیا۔ دفتر پر پولیس کا پہرا بٹھا دیا تاکہ اس کے باقی اثاثے کو بچایا جا سکے۔ بابائے اُردو اس اثاثے کو نئے حالات کے تحت کراچی منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی چاہتے تھے کہ دونوں ملکوں میں رہ کر اردو کی خدمت کریں۔ لیکن مولانا آزاد اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بابائے اُردو نے مولانا آزاد کو جو خط لکھا اس کا جواب مولانا نے ان کو دیا۔ یہ خط انجمن کی تاریخ پنجاہ سالہ میں بابائے اردو نے نقل کیا اس کے بعد قومی زبان اور اُردو کے بابائے اردو نمبر میں شائع ہوا۔ اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ۲۰؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

• آپ اپنے خط مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں کہ آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا اس سے مجھے اتفاق ہے۔ مشورے سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کر دیا جائے؟ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ براہ عنایت اپنے فیصلے کو میرے مشورے کا جامہ نہ پہنائیں ——— آپ نے ایک قدم پاکستان میں جمایا ہے دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے سودمند نہ ہوگا ——— جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ انجمن ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی خواہش مند نہیں کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں لانے کی پوری ذمہ داری ارکانِ انجمن کے سر ہے"۔

مولانا آزاد کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ انجمن کا دفتر کراچی منتقل کر دیا جائے۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی اُردو کی مجلس نظما کا ایک جلسہ ۱۸؍اپریل ۱۹۴۹ء کو حبیب منزل میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے کی۔ مطبوعہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ جلسے میں نواب احمد سعید خاں' ڈاکٹر ذاکر حسین' پنڈت کیفی' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی عبدالحق موجود تھے۔ اس وقت انجمن کی مجلس عام میں ۱۸ جگہیں خالی تھیں۔ ان میں چار جگہوں پر بہ اتفاق رائے حسب ذیل حضرات کا انتخاب ہوا:

۱۔ آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد
۲۔ کرنل سر کیلاش نرائن ہاکسر

۳۔ نواب علی یاور جنگ۔ حیدرآباد

۴۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق۔ پرنسپل پریسی ڈینسی کالج۔ مدراس۔

تقسیم کے بعد مولانا آزاد نے دو اہم کام یہ انجام دیے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو برباد ہونے سے بچایا اگر مولانا اس قومی ادارے کی طرف توجہ نہ کرتے تو سرسید کی اس درس گاہ کو برباد ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا انھوں نے نہایت نازک حالات میں اس کی شیرازہ بندی کر کے ڈاکٹر ذاکر حسین کو وائس چانسلر مقرر کرایا۔ لیکن اس کے برخلاف علی گڑھ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرا کام جو انھوں نے انجام دیا وہ انجمن ترقی اُردو کی حفاظت اور از سرِ نو اس کی تنظیم ہے۔ مولانا نے انجمن کا دفتر دلی سے علی گڑھ منتقل کرا دیا اور اس کا سکریٹری قاضی عبدالغفار کو مقرر کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس کا صدر۔ ان دونوں حضرات نے اس وقت کے نازک حالات کا بہت سے مقابلہ کیا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں قاضی عبدالغفار کا انتقال ہو گیا مولانا کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور ان کے مشورے سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے پروفیسر آل احمد سرور کو انجمن کا اعزازی سکریٹری مقرر کیا۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی مدت ختم کر کے بہار کے گورنر مقرر ہوگئے تو مولانا آزاد پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کو انجمن کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ مگر پنڈت جی اردو سے ہمدردی کے باوجود اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اس عہدے کو قبول نہ کر سکے۔ اس لیے کرنل بشیر حسین زیدی صدر بنائے گئے۔ پھر زیدی صاحب کے بعد پنڈت جی انجمن کے ۵ سال سے زائد صدر رہے۔

سرور صاحب کے زمانے میں مولانا آزاد کے مشورے سے دلّی میں انجمن ترقی اُردو ہند کی آل انڈیا اُردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اور صدارت کے فرائض مولانا ابوالکلام آزاد نے انجام دیے تھے۔ اس موقعے پر پنڈت نہرو، مولانا حفظ الرحمٰن، پنڈت سندر لال اور مولانا آزاد نے تقریریں کیں۔ کانفرنس کا پنڈال عین جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے بنایا گیا تھا۔ پنڈال سے ذرا ہٹ کر اردو بازار کے سامنے اردو کتابوں کے اسٹال لگائے گئے جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا :

" اُردو ایک ایسی زبان ہے جو ملک میں عام طور پر بولی جاتی ہے نہ صرف شمال بلکہ جنوب میں بھی اس کے بولنے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقے میں اُردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یو۔ پی۔ بہار، دلی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں لاکھوں ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ کانفرنس بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی اور اب جب وزیر اعظم نے اس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"[۷]

مولانا آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس نہایت مختصر مگر جامع ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے حکومت سے اُردو کے ساتھ انصاف کا پُر زور مطالبہ کیا ہے اور اُردو والوں کی طرف سے خود ہی وکالت بھی کی ہے کہ وہ ہندی کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن اردو بھی اس ملک کی زبان ہے۔ اس کو بھی ہندی کے برابر حق ملنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی یہ آخری تقریر تھی کسے معلوم تھا کہ ٹھیک اس کانفرنس کے ایک ہفتے بعد یعنی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ انجمن سے ان کا تعلق مئی ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا۔ اور یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں انجمن سے مرتے دم تک قائم رہا۔

حواشی

۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۹۵۔

۲۔ ابوالکلام آزاد، عبداللہ بٹ، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

۳۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

۴۔ باقیاتِ شبلی، ص ۸۱۔

۵۔ لسان الصدق، ص ۱۴۔

۶۔ لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء۔

۷۔ ہماری زبان، ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء۔

فسانۂ ابوالکلام آزاد

منزل:

تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مولانا کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔

یہ مقدمہ مولانا کی دو تقریروں کی بنا پر تھا جو مرزا پور پارک کلکتہ میں کی گئیں تھیں۔ پہلے جلسے کی تقریر کا مقصد تین اشخاص کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا اور دوسری تقریر میں مولانا نے خلافت کے بارے میں عوام کو ان کا فرض یاد دلایا تھا۔ یہ دونوں تقریریں اُردو شارٹ ہینڈ میں سرکاری رپورٹر ابواللیث کی لکھی ہوئی تھیں۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر گولڈی نے ابواللیث رپورٹر اور انسپکٹر اسپیشل برانچ محمد اسمٰعیل گورنمنٹ آف بنگال کو اس وقت ڈیوٹی سونپ دی تھی اور ضروری کارروائی کے لیے حکومت بنگال سے مقدمے کو پیش کرنے کا اختیار حاصل کیا تھا۔

عدالت نے مولانا سے پوچھا کہ مولانا کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اپنا بیان لائے ہیں؟

مولانا نے نہایت بے باکی سے اپنا بیان دیا:

'میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان پیش کروں! یہ ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے، نہ کسی طرح کی امید ہے نہ طلب ہے' نہ شکایت ہے! یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکے ہیں! تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اُٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی طولانی ہے اور تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی ہے۔ ہم اس میں حضرت مسیحؑ جیسے پاک انسانوں کو چوروں کے ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں! ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا' اور آج' جب اس جگہ کھڑے ہونے کی عزت میرے حصے میں آئی ہے تو بے اختیار میری رُوح خُدا کی حمد و ثنا میں ڈوب جاتی ہے! میں مجرموں کے اس کٹہرے میں وہ فخر محسوس کرتا ہوں جو بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہے!

مَیں اقرار کرتا ہوں کہ مَیں نے حکومتِ وقت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے' بلکہ مَیں ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے! مَیں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۷ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا! . . . .

یورآنر (Your Honour) ملزم نے اپنے جن کارناموں کا ذکر کیا ہے وہ قانون کی نظر میں جرائم ہیں! یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے! مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ سرکاری رپورٹر کی اطلاع کے مطابق' مَیں نے اپنی تقریروں میں یہ کہا ہے کہ 'ایسی گورنمنٹ جو ناانصافی کے ساتھ قائم ہو' اسے یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیے یا اسے دُنیا سے مٹا دینا چاہیے! اور یہ بھی کہا ہے کہ' اگر تمھارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے کہ کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انھیں گرفتار کیا ہے وہ اس برِاعظم میں اس طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی' اگر یہ جملے قابلِ اعتراض ہیں تو ہوا کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر میں یہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ مَیں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں! جو چیز بُری ہے یا تو اسے دُرست ہو جانا چاہیے۔ یا مِٹ جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ' جب مَیں اس موجودہ گورنمنٹ کی بُرائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دُعا نہیں مانگ سکتا کہ گورنمنٹ دُرست نہ بھی ہو اور اس کی عمر دراز ہو! ــــ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے آپ اسلامی شریعت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں؟ ــــ تم مجھے اسلامی شریعت کی تعلیم دینے آئے ہو؟ مَیں مسلمان ہوں اور مسلمان ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو' یا جو خود غرض مذہبی پیشواؤں کا ہو یا جو چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو! اس حقیقت کے ہوتے پھر ایک سچا مسلمان انگریزی راج کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ . . . . مَیں سمجھتا ہوں کہ دُنیا کا کوئی مذہب رائج الوقت قوانین کو توڑنے کا مشورہ نہیں

سید حسین

۲۱۹' ساؤتھ صدر بازار' نزد پلٹن مسجد' کیمپ اسکول'
شولاپور ۴۱۳۰۰۳ (مہاراشٹر)

دیتا ___ میرے بھائی قانون کیا چیز ہے؟ تم قانون
سمجھتے بھی ہو؟ تمھاری مرضی کا نام قانون نہیں ہے۔
___ آزادی کی راہ میں قربانی و جاں فروشی مسلمانوں
کا قدیم ورثہ ہے۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ
کرلیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی
بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات
دلائیں گے۔ سرکاری وکیل صاحب نوٹ کر لیجیے!
___ گذشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح کوئی شام مجھ پر
ایسی نہیں گزری ہے جس میں، میں نے گورنمنٹ کے
مظالم کا اعلان نہ کیا ہو، میری عمر ۱۸ برس کی تھی جب
میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی تھی۔ میں
نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہد شباب، صرف
اس مقصد کے عشق میں قربان کر دیا ہے، یہ تو میری
زندگی کا دائمی مقصد ہے، میں صرف اسی کام کے
لیے جی سکتا ہوں ___ میری تقریروں کی جو نقل
پیش کی گئی ہے وہ نہایت ناقص، غلط اور بعض
مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے۔ میرا ادبی
ذوق بے جوڑ جملوں سے مجروح ہوا ہے۔ مثلاً میں
نے اپنی تقریر میں مشہور فرانسیسی ادیب وکٹر ہیوگو
کا ایک قول نقل کیا تھا کہ 'آزادی کا بیج کبھی بارآور
نہیں ہو سکتا جب تک کہ ظلم کے پانی سے اس کی
آبیاری نہ ہو'۔ مگر اس قول کی شاید یہ اصلاح
کی گئی ہے، یعنی 'جب تک دھرم کے پانی سے اس
کی آبیاری نہ ہو' ___ یہ دھرم کا پانی کیا چیز ہے؟
ایک اور جگہ رپورٹ میں درج ہے کہ 'انھوں نے
جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے' ___ کیا
مہمل بات ہے! غالباً جملہ اس طرح ہوگا۔ ___
'انھوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برداشت
کیا ہے!' ___ مشکل یہ ہے کہ انگریزی افسران
ابو اللیث اور محمد اسمٰعیل جیسے لوگوں کو اہل زبان
سمجھتے ہیں! ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان
سے کسی مختلف لہجے میں آواز نکالے 'اردو کا اسکالر
ہوتا ہے اور عدالتوں میں سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔
قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں اپنے
ہم وطن بھائیوں کی نسبت جو اس مقدمے میں
میرے خلاف کام کر رہے ہیں، میں وہی دعا مانگوں
گا جو پیغمبر اسلام نے ایک موقع پر مانگی تھی:
'خدایا ان پر راہ کھول دے کیونکہ یہ نہیں

> "ایوانِ اردو" کے آزاد نمبر کے لیے
> ایک تحریر بعنوان "فسانۂ ابوالکلام
> آزاد" ارسالِ خدمت ہے۔
> اس میں بیشتر اقتباسات، عبارات
> جیسے مختلف ادیبوں کے مضامین سے
> مستعار لیے گئے ہیں۔ میری تحریر آٹے
> میں نمک کے برابر ہے! میں نے ان
> اقتباسات، عبارات، جملے، فقرے، ضمنی
> سرخیوں کی مناسبت سے ربط و تسلسل قائم
> کرنے کے لیے ترتیب دیے ہیں اور ایک تاثر
> پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحریر کی یہ
> کاوش شاید مقبول نہ ہو لیکن دلچسپ
> معلوم ہوگی۔
> سید حسین

جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں! ___ اور آپ ___'
مجسٹریٹ صاحب، زیادہ سے زیادہ سزا جو آپ
کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دیجیے۔ مجھے شکایت
یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا! میرا معاملہ پوری
مشنری سے ہے۔ کسی ایک پُرزے سے نہیں ہے۔
میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی
پُرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔
مسٹر مجسٹریٹ، اب میں کورٹ کا زیادہ
وقت نہیں لینا چاہتا ___ یہ تاریخ کا ایک دل
اور عبرتناک باب ہے جس کی ترتیب میں، ہم
آپ دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں، ہما
حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے اور تمھارے حصے میں
مجسٹریٹ کی کرسی! ___ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس
کے لیے آپ کی وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری ہے جس
یہ کٹہرا! آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو
ختم کر دیں! مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل
کب سے ہماری راہ تک رہا ہے! ہمیں جلد سے
یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے رہو۔
کچھ دنوں تک یہ کام یونہی جاری رہے گا اور ___
اور پھر مسٹر مجسٹریٹ، وہ وقت آئے گا جب ہم
اور آپ میں جگہوں کا تبادلہ ہوگا۔ یعنی تم یہاں
کٹہرے میں ہوگے اور ہم وہاں اس عدالت کی
پر، اور تمھارے چہروں پر تمھارے اعمال کی پھٹ
ہوگی۔'

سفر

'گذشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر
آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں
اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا
کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو ا
طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت
ایسا ہی خیال کیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال
ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احسا
ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ ا
زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خ
حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر
تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھ
وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طر
واقف تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس

طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے
سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے
تعلقات میں باقی رہے گی۔

۱۹۱۶ء میں جب پہلی بار گرفتاری پیش آئی
تھی وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور
میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔

اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی
کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی
کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے
صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت
کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت
کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد
میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار
پھر کیا بات تھی کہ وہ اپنی طبیعت کے اضطراب
پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے
اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا
شروع ہو گئی تھی۔

"مقدمے کا فیصلہ آج سنوایا گیا، انھیں صرف
ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی، یہ نہایت
تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے
سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات
کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے
میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی۔ یہ
تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے!
میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال
میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوتی ہے ان کے
لیے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور
وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو اُن کی
موجودگی میں انجام پاتے تھے ـــــ میرے لیے
یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے لیکن خدا سے مدد کی
پوری امید رکھتی ہوں۔ البتہ ان کی جگہ صرف بنگال ہی
میں خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں، اس کے لیے سعی
کرنا میری دسترس سے باہر ہے۔

میں پہلے چار سال تک ان کی نظربندی کے
زمانے میں اپنی ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں
کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی
پوری اُتروں گی۔

گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت
کمزور ہو گئی ہے۔ دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔
اس لیے باوجود میری خواہش کے، مولانا ہمیشہ اس
سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت
کے کام میں حصہ لوں۔ لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ
ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو
ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے
بنگال پراونشیل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے
بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔"

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل
تھی، ۱۹۴۱ء میں جب میں 'نینی جیل' میں مقید
تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب
ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد
معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت
میں گزرا تھا۔

مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے۔
ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری
کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔

اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح
اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں
نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے۔ میں اس قدر
کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت
کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی
افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے
حالات میں میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند
نہیں کرتا کہ خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی
خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی خاموشی بھی گویائی
سے خالی نہ تھی! ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک
دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب
اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ
ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خدا حافظ
کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں
آگیا تو ۱۳ راگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ
کے سوا کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ اگر کہنا بھی چاہتی تو
اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے
چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس
کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشک بار تھا۔

۹ راگست کو میری گرفتاری کی خبر سے یقیناً
ان کو سخت صدمہ پہنچا ہوگا اور ان کی صحت نے
جو پہلے سے نازک تھی ایک اور پلٹا کھایا۔

۱۹۴۳ء کے شروع میں گھر سے اطلاع ملی
کہ وہ پھر بہت بیمار ہیں۔ اس کے بعد اور بھی
وحشتناک خبر ملی۔ ان کے ڈاکٹر مایوس ہو گئے
تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی حکومت کو لکھا کہ
مجھے بیوی سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ اس لیے کہ
ان کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ ڈاکٹروں کے اس
خط کو حکومت نے بالکل نظر انداز کیا۔ میں نے بھی
وائسرائے کو لکھا مگر ہماری خط و کتابت بے نتیجہ رہی۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی
خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک
ٹیلی گرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی
کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا

ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

جونہی خطرناک صورت حال کی خبر ملی مَیں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقع پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا اسے کام میں لینے میں کوتاہی نہیں کی:

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم مَیں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، مَیں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

"ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورت حال بہت تشویشناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظربندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔

اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سُن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں! ان کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دِق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کیے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر معالج سے یہی کہتی تھیں: "بس خُدا کے لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو!" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سُن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔"

"مَیں فوراً پہنچ گیا۔

گھر کے اُداس نظارے ہی نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھ سے کہا گیا، بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو۔ مجھے تامل ہوا، مدتوں ایک ہی گھر میں رہا تھا اور پردے کا بھی سوال نہ تھا مگر کبھی اچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا پس و پیش دیکھ کر کہا گیا۔ بیگم صاحبہ مصر ہیں کہ تم پہنچو، وقت آخری ہے دیر نہ کرو! مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا۔ مگر نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگیں۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ ان سے کہنا کہ تمھارے ہی نام پر مر رہی ہوں، مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا!—— ہاتھ بُری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں —— مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں!—— ہچکی آئی، اب وہاں کچھ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی۔"

"گذشتہ جمعرات کے دن ۸/ اپریل ڈاکٹر محمد ارطبی صلاح کار نہایت ہی مایوسی کے عالم میں ان کے کمرے سے باہر آئے۔ کہا کہ اگر مولانا کسی طرح آ سکیں تو مریضہ میں کچھ حوصلہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ قریب رات کے ۱۱ بجے اچانک وہ ہوش میں آئیں کہا کہ انھیں اُٹھا کر بٹھایا جائے۔ انھیں بٹھایا گیا۔ گھر کے ہر فرد سے وہ باتیں کرنے لگیں۔ نوکروں اور خدمت گذاروں سے معافی کی طلب گار ہوئیں۔ کہا کہ میری بیماری کی وجہ سے آپ لوگوں کو بہت زحمتیں اُٹھانی پڑیں —— تمام حاضرین ان کی اس سنبھلی ہوئی حالت سے خوش نظر آتے تھے۔

انھوں نے دروازے پر نظر ڈالی اور پوچھا کہ آیا مولانا آ گئے ہیں، نفی میں جواب پا کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش بیٹھ گئیں۔ پھر اپنے خادموں کو کچھ تحفے عنایت کرنے کے وعدے انھوں نے کیے اور تلاوت قرآن کرنے کی التجا کی۔ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی تا آنکہ جمعہ کی صبح ۶ بجے ان کی رُوح پرواز کر گئی۔"

"بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فَاِنَّ مَا تَعُدُّ رَبِّنَا قَدْ وَقَعَ

دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالے کیا جس میں حادثے کی خبر دی گئی تھی، بعد کو

معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی .....

اس طرح ہماری ۲۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔"[18]

"بوڑا اسٹیشن اور پلیٹ فارم پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں بڑی ہی مشکلوں سے اپنے ڈبے سے باہر نکلا اور کار میں سوار ہوا۔ بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبانیا پربھا دتا اور متعدد دوسرے مقامی لیڈر میرے ساتھ کار میں تھے۔

ہم روانہ ہونے والے ہی تھے کہ میری نگاہ بینڈ بجانے والوں پر پڑی جو میری کار کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے مسز دتا سے پوچھا کہ وہ بینڈ باجا کس لیے آیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ میری رہائی کی خوشی منانے کے لیے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ خوشی منانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں آزاد ہو گیا ہوں مگر ہزاروں میرے دوست اور ساتھی اب بھی جیل میں ہیں۔

میری درخواست پر بینڈ بجنا بند ہو گیا اور وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جس وقت کار پُل پر سے گزر رہی تھی مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھی۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔

مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا:

مگر اب وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے
میری دُنیا کیسی بدل گئی ہے!

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لیے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔

میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا۔"[19]

رہرو:

"وہ میری دادی کے حقیقی بھائی تھے۔ چونکہ وہ لاولد تھے اس لیے اپنی بہن کے بچوں کو ہی اپنی حقیقی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کی تین بہنیں تھیں جن میں سے ایک کا انتقال بہت عرصہ پہلے ہو گیا تھا۔ باقی دو آبرو بیگم اور آرزو بیگم ہیں۔

یہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ مولانا کی بڑی بہن میری دادی ہیں جو عرصۂ دراز سے بھوپال میں سکونت پذیر ہیں۔ بھوپال کی بیگمات ان کی بڑی قدرداں رہی ہیں۔ وہ بھوپال لیڈیز کلب کی سرگرم رُکن رہ چکی ہیں۔ اس کلب کے ذریعے بیگمات بھوپال کی سرپرستی میں بڑی سوشل سرگرمیاں ہوتی رہتی تھیں۔ عورتوں کے لیے خصوصاً نمائش منعقد کی جاتی تھی جس کی وہ رُوحِ رواں تھیں۔

ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ کو ہندوستان کے سیاسی، ادبی اور سماجی حلقوں میں کون نہیں جانتا؟ وہ مولانا آزاد مرحوم کے بھانجے سید یوسف علی کی اِکلوتی بیٹی ہیں۔ مرحوم بھوپال کے صرف خاص میں شاہی باغات کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کی والدہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ مدظلہا کا مولانا کی حقیقی ہمشیرہ ہیں جن کا عوام و خواص سب ہی احترام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ ۱۳ر اپریل ۱۹۴۰ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں جو کبھی ریاست بھوپال کا دارالحکومت اور اب مدھیہ پردیش کی راجدھانی ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوئیں وہاں بڑے بڑے مرکزی وزرا مولانا کی ہمشیرہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ کو سلام کرنے جاتے رہے ہیں۔"[20]

"کہا جاتا ہے کہ ابوالنصر آہ کی وفات کے بعد غالباً ۱۹۰۶ء میں مولانا خیرالدین نے اپنے چھوٹے صاحبزادے مولانا ابوالکلام آزاد کو وکیل امرتسر سے بے تعلق ہو کر کلکتہ بُلایا اور اپنا جانشین بنایا اور اس خیال سے کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر باہر نہ جائیں، پہلا کام یہ کیا کہ ان کی شادی کر دی۔"[21]

"نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھنویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے۔ میں نے اسی دُنیا کی حُور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زُلیخا نہیں، یوسفِ ہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زُلیخا بیگم تھیں۔"[22]

"زلیخا بیگم آفتاب الدین صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور ابوالکلام غلام محی الدین آزاد دہلوی کی رفیقۂ حیات تھیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں شادی ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر ۱۹ یا ۲۰ سال کی ہوگی۔"[23]

"آفتاب الدین جن کا سلسلۂ نسب صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے کلکتہ کے سروے آفس میں ملازم تھے اور مولوی خیر الدین کے بہت عزیز مریدوں میں سے تھے۔ ان کی پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی زلیخا بیگم تھیں۔ ان سے بڑی کی شادی مولانا کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ سے ہوئی تھی۔"[24]

"وہ (زلیخا بیگم) سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف۔ مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ، شیریں زبان بھی، سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔"

"مولانا کو قدرت نے ایک نہایت خوبصورت بچہ 'حسین' دیا تھا لیکن زندگی نے ساتھ نہیں دیا اور وہ کم عمری میں ہی فوت ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا کو پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"[25]

"شاید ہی ہندوستان کی کسی زبان میں ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی جیسا کم عمر صحافی پیدا ہوا ہو جس نے اس راہ کی پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی اپنی فکری بلندی، اپنی ادبی صلاحیت، اپنے مذہبی رجحان، اپنے قومی خیالات، اپنے تعلیمی نظریات، اپنے اصلاحی پروگرام، اپنے اُردو زبان کی خدمات کے جذبے، اپنے تنقیدی شعور، اپنے روشن خیال اور صالح جذبات سے سارے ہندوستانی مسلمانوں کے اہلِ نظر، اہلِ خبر، اہلِ کمال، اہلِ ادب اور قومی خدمت گذاروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔"[26]

"تقریباً نصف صدی تک مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات، تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہندوستان کی فضا میں گونجتے رہے۔ اس گونج میں سمندر کا سا طوفانی زور بھی تھا اور پربت سے اترتی ہوئی ندی کا تیز دھارا بھی۔ اس گونج کی لہروں میں ایسا جوار بھاٹا بھی تھا جس نے انگریزوں کے قدم ڈگمگا دیے، ان کے جذبۂ حکمرانی میں تھرتھراہٹ پیدا کردی اور ایسی تیزی اور ولولہ انگیزی بھی تھی جس نے ہندوستانیوں کو پل پل میں کئی منزلیں مارنے کے لیے تیار کردیا۔

ان کی تحریروں نے اگر ایک طرف ہندوستانیوں کے بجھے ہوئے دلوں کو روشن کرنے کا سامان مہیا کردیا تھا تو ان کی تقریروں نے دوسری طرف دِلوں کو برمایا۔ ان میں ایسی حرارت بھردی جس کی گرمی سے غلامی کی زنجیریں پگھلتی نظر آنے لگیں اور آج جب ہم آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے پچھلے غلامی کے طویل دَور کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جنگِ آزادی کا سب سے بڑا سپاہی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے پریم مندر کا سب سے انوکھا پجاری، وطن کا دیوانہ، شمع اُردو کا پروانہ، مسجدوں میں بیٹھ کر خدا سے لَو لگانے والا اور میدانوں میں اُتر کر اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش انگریزوں کے ساتھ تیغ آزمانے والا آزاد تھا۔ آزاد صرف ایک شخص نہیں تھا۔ اس کے اندر کئی شخصیتیں پرورش پا رہی تھیں اور ان کی خصوصیتوں نے مل کر آزاد کو جنم دیا تھا۔"[27]

"ان کا آبائی وطن دہلی تھا، بمقام مکہ معظمہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے، حجاز و مصر میں ۱۵ سال کی عمر میں جید عالم ہوئے۔ آپ کے [والد] بھی زبردست عالم تھے۔

ہندوستان آنے کے بعد آزاد [کلکتہ] میں بود و باش اختیار کی اور اپنا مشہور 'الہلال' نکالا جس نے اُردو ادب میں [ہیجان] انگیز انقلاب برپا کردیا۔ حکومت نے ۱۹۱[۴] کو فوراً بند کردیا۔ اور انھوں نے بھی فوراً اخبار 'البلاغ' کے نام سے جاری کیا۔

آزاد ہندوستان کی قومی تحریک ایک اہم جزو تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۱۶ء [سے] نظربندی اور جیل کا سلسلہ شروع ہوا وہ ['۴]۵ تک جاری رہا۔

آزاد خلافت اور کانگریسی تحریک [کی] روحِ رواں تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ وہ کانگریس [کے] صدر رہے۔ آزادی کے بعد آپ مرکزی حکو[مت] میں وزیرِ تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ [کی] وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

آزاد نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں [حاصل کی] تھی بلکہ ساری تعلیم گھر پر ہی ان کے والد [کی] زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ اساتذہ کا انتخاب اچھا [تھا] جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے جلد ہی عربی، [فارسی] اور اُردو تینوں زبانوں میں بڑی حیرت ا[نگیز] استعداد پیدا کرلی تھی۔ عربی زبان میں تو ا[نھوں] نے لوریاں سنی تھیں اور ماں کا پیار اسی ز[بان] کے ذریعے ملا تھا۔ اس کا پوچھنا کیا؟ اور ار[دو] فارسی والد سے وراثتاً ملی تھی۔ چنانچہ ان تینوں زبانوں میں کم عمری ہی میں بڑی دستر[س] حاصل کرلی تھی ـــــ انگریزی اور فرانسی[سی] اپنی خداداد اکتسابی صلاحیت سے سیکھ لی تھی۔

بہت سے ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی پہلا
...م شعر وسخن کی وادی میں رکھا تھا۔ اس وقت آزاد
... عمر تقریباً ۱۲ سال کی تھی۔ عمر کی ناپختگی کے باوجود
... اشعار کی پختگی اور کلام میں موزونیت بڑی
...رت کا باعث تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا
... اس صغر سنی کے باوجود آزاد ایسے اشعار کا خالق
... سکتا ہے۔ ان متحیر لوگوں میں مرزا غالب کے ایک
... گرد نادر شاہ خاں شوکی رام پوری بھی تھے جنھوں
... اپنے شک وشبہ کو دور کرنے کے لیے ایک موقع
...اد کا امتحان بھی لیا اور آزاد امتحان میں کامیاب
...ے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ...۔ 'صورت سے
... دس بارہ سال کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو
...ن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی! شعر وسخن کو
... زیادہ عرصے تک نہ اپنا سکے، انھیں بیان کے لیے
...ر اور وسعت چاہیے تھی۔ ایسی بیکراں وسعت
...س میں وہ اپنے عظیم خیالات کا اظہار کر سکتے، چنانچہ
...د ہی شعر ونغمہ کو خیرباد کہا اور نثر کے میدان میں
...ر آئے۔"[۲۸]

...شانات:

"۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو جب مولانا ابوالکلام
...زاد کا انتقال ہوا تو سارے ملک میں غم اور افسوس
... لہر دوڑ گئی۔ عام طور سے یہ احساس پیدا ہونے
...ا کہ ایک عظیم شخصیت سے ہندوستان محروم ہو گیا
...ے۔ اظہارِ عقیدت کے لیے مختلف اخبارات،
...سائل، ہفتہ وار اور ماہناموں کی جانب سے
...زاد نمبر بطورِ یادگار شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا
...یا۔ ... (آج بھی یہ سلسلہ تواتر سے جاری
...ے)"[۲۹]

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ...

نڈر اور بے باک لیڈر ہونے کے علاوہ ایک زبردست عالم، مفکر، شعلہ بیان خطیب، صحافی اور انشا پرداز تھے۔

اُردو کے منفرد اہل قلم اور بے باک صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے آزاد بہت مقبول و مشہور ہوئے۔ ان کے مضامین، خطبات، مقالات اور مکاتیب کے مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ روانی، رنگینی، عالمانہ شکوہ اور پُر وقار اظہارِ خیال کے باعث ان کے مضامین بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

قول فیصل، تذکرہ، مقالاتِ آزاد، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر ان کی شاہکار تصانیف ہیں۔ غبارِ خاطر ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام احمد نگر جیل سے لکھے تھے مگر جیل کی پابندیوں کے باعث ڈاک سے نہ بھیجے جا سکے تھے۔ رہائی کے بعد یہ کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔

۱۹۱۶ء میں مولانا کو پہلی بار گرفتاری پیش آئی۔ انھیں پہلی بار بنگال چھوڑنے کا حکم ہوا چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مولانا کو رانچی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو پہلی بار سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا اور بعد میں ایک سال کی سزا سُنائی گئی تھی۔

۱۹۴۱ء میں مولانا 'نینی جیل' میں بند تھے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا ہوئے۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو مولانا کو گرفتار کیا گیا اور احمد نگر قلعے میں بند کر دیا گیا۔

۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو مولانا بانکوڑا (بنگال) کے جیل سے رہا کیے گئے۔

...

سے ہی ابوالکلام ہونے کا ثبوت دیا تھا۔"[۳۰]

"۱۹۰۱ء میں ہفتہ وار 'المصباح' اپنی ادارت میں منظرِ عام پر لا چکے تھے۔"[۳۱]

"۱۹۰۲ء میں احسن الاخبار کی ترتیب و اشاعت میں معاونت کرنے لگے تھے۔"[۳۲]

"'مرقع عالم' ہردوئی میں چھپنے لگے تھے۔ 'مخزن' کے مضمون نگاروں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔"[۳۳]

"'ایڈورڈ گزٹ' شاہجہانپور کے وقتی ایڈیٹر ہو گئے تھے۔"[۳۴] ہفتہ وار 'تحفۂ احمدیہ' کی ترتیب کا کام سنبھال لیا تھا۔"[۳۵] ماہنامہ خدنگ نظر لکھنؤ کے حصۂ نثر کے اسسٹینٹ ایڈیٹر ہو گئے تھے۔"[۳۶]

"کامیابی اور فتوحات کی یہ ساری منزلیں وہ گیارہ بارہ سال کی عمر سے تقریباً پندرہ سال کی عمر تک طے کر چکے تھے۔ ادبی اور صحافتی مشغولیات اور تجربات کی بدولت ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اپنا بامقصد ماہنامہ 'لسان الصدق' دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔"[۳۷] یہ ماہنامہ کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے انھوں نے ملک وقوم اور اُردو کی خدمات انجام دیں۔

"آج بلا شبہ یہ بات نہایت یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صحافی پیدا ہوئے اور ہندوستانی سیاست داں کی بلند اور محترم جگہ حاصل کر کے سفر زندگی کو اختتام تک پہنچایا۔"

انھوں نے شاعری کا جادو جگایا، نثر کی ساحری کی، مذہبی میدان میں اپنی شناخت کرائی اور بلند مرتبہ پایا۔

لیکن ان کی یہ تمام فتوحات صحافت سے سیاست کے سفر میں گم ہو گئیں۔[۳۸]

مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) لکھ کر وصیت فرمائی تھی کر اس کے بقیہ اور مخصوص تیس اوراق، ان کی وفات کے ۳۰ سال بعد شائع کیے جائیں اور منظر عام پر لائے جائیں!
پچھلے چھ سات ماہ سے ان ۳۰ اوراق کا چرچا رہا ہے۔ اب عدالت نے فیصلہ صادر کیا ہے اور اجازت دی ہے کہ ان اوراق کی اشاعت کی جائے۔
ایک دُنیا کو عموماً اور ہندوستانیوں کو خصوصاً ان اوراق کے دیکھنے اور ان باتوں کو معلوم کرنے کا بے تابی سے انتظار اور اشتیاق ہے جو ان اوراق میں تحریر ہیں۔
ان پُراسرار اوراق میں غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی گمشدگی یا بازیابی کے نشانات ملنے کی سب کو جستجو ہے۔

حواشی

لہ نوڈراے احسان الحق
کہ تہ کہ غبار خاطر
ھ لہ قول فیصل
ے ث غبار خاطر
ؤ نلہ ہماری آزادی
لله ٹلہ تلہ ٹلہ غبار خاطر
شلہ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان
للہ ذکر آزاد ملیح آبادی
ڪلہ تاریخ کانگریس، حصہ دوم، ص ۴۳
۱۸ غبار خاطر
۱۹ ہماری آزادی
۲۰ نجمہ ہبت اللہ سے ملاقات۔ غزالہ صدیقی
۲۱ زلیخا کی کہانی۔ عبدالقوی دسنوی
۲۲ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان
۲۳ ۲۴ غبار خاطر
۲۵ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان
۲۶ ۲۷ ۲۸ نوعمر صحافی اور لسان الصدق از عبدالقوی دسنوی
۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ نوعمر صحافی اور لسان الصدق از عبدالقوی دسنوی۔

مولانا آزاد کا اخلاق و کردار

میر شفقت علی وفا

محلہ حسینی، فیروز آباد، آگرہ (یو.پی)

مولانا آزاد کا سرسری مطالعہ کیا جائے یا بالاستیعاب! ان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو ہمارے قلب و نظر کو کھینچتی ہے ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت ہے۔ اپنے غیر معمولی حافظے اور درّاکی کا انھیں بچپن ہی سے احساس تھا۔ خواجہ احمد فاروقی کو ان کی منجھلی بہن فاطمہ بیگم آرزو (پیدائش ۱۸۸۴ء) نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ "ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کبھی گھر کے تمام صندوقچوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم چلا چلا کر کہو ہٹو ہٹو راستہ دو دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سُن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی بھائی سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔" (مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ خلیق انجم ص۳۷)

مولانا کی ذہنی تیز رفتاری . . . . کا یہ عالم تھا کہ دورانِ تعلیم میں ان کے ہم جماعت طلبا ان کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔ لہٰذا انھیں ترقی دے کر طلبا کی اگلی جماعت میں شامل کر لیا جاتا اور قلیل عرصے میں اگلی جماعت کے یہ طلبا بھی اُن کے آگے جریانِ سست گام ثابت ہوتے تھے۔ اس تیز رفتاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چودہ برس کی عمر میں وہ درسِ نظامی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور ادبیات، منطق، فقہ اور حدیث کے مضامین پر انھیں عبور حاصل ہو گیا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ خیال رائج تھا کہ جب تک فارغ التحصیل طالب علم دوسرے طلبا کو نہ پڑھائے اپنے مضمون میں اسے پختگی حاصل نہیں ہوتی اس لیے کچھ طلبا کے پڑھانے کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا جنھیں وہ مطوّل اور ہدایہ وغیرہ کا درس دینے لگے۔ ۱۹۰۴ء میں جب ان کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی تو انھیں یہ باور کرنا دشوار ہو گیا کہ یہ نوجوان واقعی لسان الصدق کا ایڈیٹر ہے۔ اسی طرح اسی سال یا ۱۹۰۵ء میں جب بمبئی میں انھیں شبلی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تو علامہ شبلی نے مولانا آزاد کے مضامین کی اس طرح تعریف کی گویا وہ مولانا سے نہیں اُن کے صاحبزادے سے ہمکلام ہوں۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کو دیکھا نہیں تھا صرف ان کے مضامین پڑھے تھے مولانا شبلی کی طرح اکثر ان سے یہ غلطی سرزد ہو جاتی تھی کہ وہ آزاد کو ایک عمر رسیدہ بزرگ سمجھنے لگتے۔ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے کارکنان نے ۱۹۰۴ء میں انھیں مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، نواب محسن الملک اور مولانا شبلی کی طرح عمر رسیدہ سمجھ کر اسلامی اور قومی مسائل پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا لیکن انھیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ آزاد جسے وہ ایک معمر بزرگ سمجھے ہوئے تھے ایک نوجوان ہے جس کے لب و رخسار بھی پوری طرح ریش و بروت سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ سروجنی نائیڈو نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں مولانا آزاد کی عبقری قدآوری کو نمایاں کیا ہے۔ لکھتی ہیں "آزاد کی عمر پیدائش کے وقت پچاس برس تھی۔"

جے.پی. کرپلانی نے ہمایوں کبیر کی مرتبہ کتاب "مولانا آزاد" میں لکھا ہے ـــــ "ان کی آواز حقیقت میں عقل کی آواز تھی جو مترادف ہے اعتدال اور سلامتی کے۔" ہندوستان کی آزادی کی انقلابی جنگ میں بھی ان کے یہی امتیازی اوصاف رہے۔ ان کی وفات پر عوام کا یہ محسوس کرنا فطری تھا کہ اب ملک کی سیاسی زندگی سے دانش و خرد کا وہ عنصر غائب ہو گیا جو کسی چیز کو اپنی حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتا تھا۔" (جامعہ فروری ۱۹۸۸ء ص۴۷)

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے اکیس سال تک دوش بدوش کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ان میں تین سال تک تو احمد نگر کی جیل میں شب و روز کی رفاقت رہی۔ وہ اپنی اس دیرینہ رفاقت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ان کی یادداشت حیران کُن ہے اور مختلف مضامین پر ان کی معلومات قاموسی ہے۔ وہ جدید خیالات کے بہت سے رجحانات سے خاصے واقف ہیں۔ ڈھیروں کتابیں پڑھتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ بالخصوص عالمِ عرب، مغربی ایشیا اور

مسلم عہد کے بھارت پر ان کی دسترس گہری ہے۔ افلاطون اور ارسطو ان کی نوکِ زبان پر ہیں۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ اس قدر وسیع علم، غیر معمولی ذہن اور پُر تاثیر اسلوب کے باوجود وہ اتنا کم لکھ پائے۔"

(جامعہ فروری ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱۶)

مولانا کی اسی عبقریت، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کی بنا پر صرف پینتیس سال کی عمر میں انھیں ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چنا گیا۔ اس کم عمری میں کانگریس جیسی موقر تنظیم کی صدارت ایک ایسا ریکارڈ تھا جو آج تک قائم ہے۔ آزاد نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے والد کے ہزاروں مُرید تھے جن سے محبت اور عقیدت کے ساتھ کثیر تعداد میں نذرانہ بھی ملتا تھا۔ مادی دولت کے ساتھ خدا نے آزاد کو حُسن کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ مولانا عبدالماجد جنھوں نے ۱۹۰۹ء میں پہلی بار انھیں دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں: "وہ صورت شکل اور تکلف رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ایرانی شہزادے معلوم ہوتے تھے۔" بعض انسانوں میں انانیت فطری ہوتی ہے۔ حالات اس میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ مولانا کے پاس دولت تھی، وجاہت تھی۔ دینی و دنیاوی علم تھا۔ والد کے ارادت مندوں کا حلقہ ہر وقت ان کی پرستش کے لیے مستعد رہتا تھا۔ ان حالات میں آزاد کے اندر احساسِ برتری اور انانیت کا پیدا ہو جانا فطری تھا۔ اس کے علاوہ مولانا مزاجاً کم آمیز تھے اور وقت کی پابندی کے معاملے میں کسی انگریز سے کم نہیں تھے۔ بغیر اجازت یا پیشگی تعینِ وقت کے ان سے ملاقات ناممکن تھی۔ طرزِ معاشرت اور طرزِ گفتگو سے ایک مولوی کے بجائے ایک اشرافی (ARISTOCRAT) کی شان ٹپکتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر ان کے حاسد پیدا ہو گئے اور بہک کر وہ کچھ دن کے لیے اس راہ پر پڑ گئے جو امرا یا رئیس زادوں سے مخصوص ہے تو اس میں کونسی انہونی بات ہوئی؟ ممکن ہے انھوں نے شراب بھی پی ہو۔ مورخوں اور زبیدہ جیسیوں نے بھی انھیں اپنی طرف ملتفت کیا ہو۔ مسلسل سگریٹ پینے کے تو وہ سدا سے عادی تھے حتیٰ کہ گاندھی جی کے سامنے بھی اپنے اس شغل کے جاری رکھنے میں انھیں کوئی تامل نہ تھا۔ ایسی صورت میں مولویوں اور عالموں کا وہ طبقہ جو سادہ زندگی گزارنے کو تقویٰ کا جزو لاینفک سمجھتا ہے خصوصاً سید سلیمان ندوی اور ان کے ہمخیال صحافی اور دانشور جن کے پندار میں مولانا آزاد

> ... مولانا عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا کے خلاف محاذ قائم کرنے والے ان حضرات پر مولانا کے وزیر تعلیم بننے کے بعد جب افتاد پڑی اور وہ مولانا سے امداد اور پشت پناہی کے طالب ہوئے تو مولانا نے ان کی اس طرح دستگیری کی کہ جیسے وہ مولانا کے ہمیشہ غمگسار اور مداح رہے ہوں۔

اور الہلال کی مقبولیت اور گرم بازاری ان کے دم قدم سے تھی وہ مولانا کی روز افزوں مقبولیت کو کیسے برداشت کر لیتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں آزاد کے قریب رہنے والے لوگوں نے آزاد کو زیادہ بدنام کیا۔ خصوصاً عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی نے ان کے خلاف ایک محاذ بنا لیا۔ سید صاحب نے آزاد سے علیحدہ ہو جانے اور پونہ میں فارسی کا لیکچرر ہو جانے پر اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے ان تاثرات کا اظہار عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں کرتے ہیں۔ "بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں سونگھنے کے نہیں۔ مولانا آزاد وہی پھول ہیں۔ افسوس ہے کہ میں بھی دور سے دیکھ کر اس کو سونگھنے کے قابل سمجھا۔"

(مکتوبات سلیمانی ص۱۱)

یہ خط سید صاحب نے مولانا عبدالماجد صاحب کو ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتہ سے لکھا تھا جب وہ مئی ۱۹۱۳ء سے الہلال کے اسٹاف میں کام کر رہے تھے۔ الہلال کے بارے میں ان کی جو رائے تھی وہ ذیل کے خط سے ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں: "البصائر (مجوزہ رسالہ کا نام) کو آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ اس کو کون نکالے۔ وہ الہلال نہیں کہ الفاظ کا طلسم اس کے لیے کافی ہو۔" سید صاحب کا دوسرا خط جو مکتوباتِ سلیمانی میں شامل ہے اس پر ۳۱ جنوری ۱۹۱۴ء کی تاریخ درج ہے اور پونہ سے لکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تین مہینے میں ہی انھوں نے الہلال سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور مولانا آزاد اور الہلال کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکرِ آزاد میں بطور خاص اس کا نوٹس لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "خدا ان صاحب کی مغفرت کرے دورِ اول الہلال میں ملازم تھے پھر اتفاقِ زمانہ اور اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بڑا نام پیدا کیا۔ نام آوری نے مولانا سے حسد کی آگ دل میں لگا دی اور حسد نے بڑھتے بڑھتے جنون کی شکل اختیار کر لی اور مرحوم ہر کس و ناکس حتیٰ کہ ان پڑھوں سے بھی مولانا کی برائی کرنے لگے۔" (ذکرِ آزاد صفحہ ۳۲)

ظاہر ہے کہ سطور بالا میں ملیح آبادی کے مشارٌ الیہ سلیمان ندوی ہیں۔ اس ضمن میں آگے چل کر مولانا ماجد دریابادی کے بارے میں رقمطراز ہیں جو کس کس کا رونا رویا جائے۔ ایک صاحب خود معترف ہیں کہ پہلے پکے ملحد تھے پھر خیالات بدلے اور بفضلِ الٰہی نعمتِ اسلام و ایمان سے مالا مال ہوئے۔ کچھ مدت وہابیت کا غلبہ رہا پھر صوفی با صفا بن کر حال و قال

میں ڈوب گئے۔ سب تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں مگر ایک تبدیلی نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ مولانا آزاد سے بغض للّٰہی کا تنور سینے میں جلتا رہا۔" (ذکرِ آزاد ص ۲۶)

الہلال کے گورنمنٹ کے خلاف باغیانہ مضامین اور خود مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مولانا کو اندیشہ تھا کہ حکومت کسی وقت بھی ان کے خلاف تادیبی کارروائی کر سکتی ہے اور ایسا ہوا بھی۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی جو جمع ہونے پر ضبط ہو گئی۔ اس کے بعد حکومت نے مزید دس ہزار کی ضمانت مانگی جس کا انتظام نہ ہونے یا حکومت کا رویہ معاندانہ ہونے کی بنا پر ضبط ہو جانے کے اندیشے سے جمع نہیں کی گئی اور الہلال کو بند کر دینا پڑا۔ حکومت نے الہلال پریس ضبط کر لیا۔ لیکن مولانا کے ارادوں میں تزلزل پیدا نہیں ہوا اور وہ البلاغ نکالنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ان سارے واقعات پر سید سلیمان کی نظر تھی۔ ہو سکتا ہے انھیں یہ اندیشہ ہوا ہو کہ آئندہ مولانا کے ساتھ یا بعد میں انھیں بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے مولانا سے اس اندیشے کا صفائی سے اقرار کرنے کی بجائے الہلال سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ وہ مولانا کی غیر محتاط روشِ زندگی کو پسند نہیں کرتے اس لیے ان کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ مولانا کو اس وقت سید صاحب کی رفاقت کی بہت ضرورت تھی۔ وہ ہر قیمت پر سید صاحب کا تعاون چاہتے تھے۔ جب سید صاحب کسی طرح راضی نہ ہوتے تو انھوں نے سید صاحب کی ناراضگی یا کبیدہ خاطری کی وجہ پوچھی۔ سید صاحب کو منانے اور الہلال کی ادارت سنبھالنے کے لیے مولانا نے جو خط لکھا تھا دارالمصنفین کے دفتر میں دوسرے خطوط کے انبار میں دبا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے نکالنے اور مکتوباتِ سلیمانی میں شامل کرنے کے ذمہ دار مولانا عبدالماجد ہیں۔ اس خط میں مولانا کے اس وقت کے درد و کرب اور عارضی اخلاقی لغزشوں اور آلودگیوں پر ندامت کا اظہار ملتا ہے اور مولانا کے اخلاق کے ایک خاص پہلو پر خود ان کی زبانی شہادت مہیا ہو جاتی ہے۔ ذیل میں تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مولانا نے اعتراف کیا ہے "برادرِ جلیل واعز۔ سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسبِ وعدہ اپنے خیالات ظاہر کر دیے اور اس کے بعد احسان مند ہوں اس احسانِ عظیم کے لیے کہ آپ کے اس اظہارِ خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے اس خط کو میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لیے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ سچ ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں سچ بھی تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجیب طرح کی ہے۔ میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا پھر میں اس طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی لیکن اتنا ضرور رہتا کہ اس عالم میں بھی کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ پڑ جاتا تھا۔ لیکن پھر قائم نہ رہتا۔ تقریباً پانچ برس ہوئے جبکہ میں بمبئی میں تھا کہ بعض حالات غم آلودہ ایسے پیش آئے کہ میری حالت میں انقلابِ عظیم ہو گیا اور خدائے تعالیٰ نے توبہ و انابت کی توفیق دی۔ میں نے عہدِ واثق کیا ہے کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اوامر پر عمل کروں گا۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ عملاً فسق و فجور ترک ہو گئے اور پھر ان کی طرف قدم نہیں بڑھا لیکن جس چیز کو دل اور جذبات کا تقویٰ کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوا اور دل میں گناہ کی خواہش ہوتی رہی۔ یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں لیکن میرے خیال میں یہ ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں ہے۔ ہاں اب ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے کہتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے۔ میں نے جی میں کہا یہ تو سچ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط میں شراب پیتا تھا اور شراب پر ہی کیا موقوف ہے'، میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللّٰہ کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور اب نہیں کرتا ـــــ آپ نے لکھا ہے کہ "تم" میں" لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے میں "تو" "میں" اور "ہم" دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر تحریر میں "ہم" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بربنائے حُسنِ انشا و بیان دلیل اس کے لیے نہیں دی جا سکتی تاہم اسے چھوڑوں گا اور کیا کروں۔ ایک دفعہ آپ نے چندے کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی ہے جو میں سمجھتا تھا (اس ضمن میں مولانا نے مسجد کانپور کے سلسلے میں جو چندہ آیا تھا اس کے متعلق اپنی صفائی پیش کی ہے) بے شک آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور اخبث ہو گیا ہوں لیکن پھر تسکین ہوئی کہ یہ بھی تو آپ اپنی ایمانی قوت اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا۔ آخر میں آپ نے ایک اور مبہم بات لکھی ہے " تم بہت مشغول و مصروف آدمی ہو اپنے

مکان کے حالات سے بھی بے خبر رہتے تھے۔ اس کو میں نہیں سمجھ سکا۔ خدا کے لیے اشارات وابہام سے کام نہ لیجیے۔ آپ آکر الہلال بالکل لے لیجیے اسے ایڈٹ کیجیے مجھے سوا اس کے اصول وپالیسی کے اور کسی بات سے تعلق نہیں۔ میں بالکل آپ پر چھوڑے دیتا ہوں اور خود اپنے کام میں مصروف ہوجاتا ہوں۔" (مکتوبات سلیمانی ص ۲۳-۲۲)

خط ہٰذا میں مولانا نے جتنی صفائی سے اپنی نفسیاتی کیفیات اور اخلاق وکردار کو الم نشرح کیا ہے۔ میرا خیال ہے ان کی کوئی دوسری تحریر اس ضمن میں مقابلتاً پیش نہیں کی جاسکتی۔ تذکرہ میں اور کسی قدر غبار خاطر میں انھوں نے اپنی لغزشوں پر نظر ڈالی ہے لیکن اس کی حیثیت ڈاکٹر اقبال کے اس شعر سے زیادہ نہیں۔

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغ عافیت داماں زدم

جس طرح اس شعر سے اقبال کے میخوار اور رند شاہد باز ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا اسی طرح مولانا کے دوسرے بیانات اور تحریروں کو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سید صاحب کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی مولانا کی میخواری پر انگشت نمائی کی ہے۔ "گنجے فرشتے" میں منٹو نے لکھا ہے کہ جب عیسائیوں سے مولانا اور آغا حشر کاشمیری مناظرے کے دوران تھکن اور اعصاب شکنی کا احساس کرتے تھے تو اپنے اضمحلال اور بے کیفی کو دور کرنے کے لیے شراب کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد متقائی نے مولانا کی میخواری ثابت کرنے کے لیے پورا زور قلم صرف کردیا ہے اور متقائی کا سہارا لے کر پاکستان میں مولانا کے کئی حریفوں نے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔ ہم اس سلسلے میں مولانا کی کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے لیکن جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے شراب ہی نہیں دوسرے فسق وفجور کی دلدل سے مولانا جلد باہر نکل آئے۔ مولانا کو متقی اور پرہیزگار ہونے میں کتنا عرصہ لگا اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دریابادی صاحب کے اندازے کے مطابق مولانا نے یہ خط سید صاحب کو شروع فروری ۱۹۱۴ء میں لکھا ہوگا۔ اس خط میں مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں وہ بمبئی میں کچھ ایسے حالات سے گزرے کہ ان پر توبہ وانابت کا دروازہ کھل گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا کی عمر ۱۷ سال تھی۔ غبار خاطر سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طالب علمی کے دوران یا درس نظامی کی تکمیل کے وقت وہ الحاد اور دوسری گمراہیوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲-۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک یعنی تین چار سال تک فسق وفجور کا دور چلا۔ راج موہن گاندھی نے اپنی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں اس کی مدت سترہ مہینے بتائی ہے۔ بہرحال یہ دور چار پانچ سال یا کچھ کم وبیش عرصے پر محیط رہا اور جب خود مولانا نے اعتراف کیا ہے تو ہم انکار کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر مولانا اس کردے وگذاشتے کی منزل سے نہ گزرے ہوتے تو آگے چل کر ان میں جو صفائی قلب انسانی ہمدردی اور عفو و درگذر کا مادہ ابھرا اس سے کبھی بہرہ ور نہ ہوتے۔

ماجد صاحب اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا کے خلاف محاذ قائم کرنے والے ان حضرات پر مولانا کے وزیر تعلیم بننے کے بعد جب افتاد پڑی اور وہ مولانا سے امداد اور پشت پناہی کے طالب ہوئے تو مولانا نے ان کی اس طرح دستگیری کی جیسے وہ مولانا کے ہمیشہ غمگسار اور مداح رہے ہوں۔ ملیح آبادی کی روایت کے بموجب جب دریابادی اور سید صاحب کا حیدرآباد سے وظیفہ بند ہوگیا اور انھوں نے مولانا سے رجوع کیا تو اس ضمن میں مولانا نے بہت آسانی سے ان کا وظیفہ بحال کرادیا۔ اسی طرح پاکستان روپیہ بھیجنے پر جب سید صاحب کے خلاف انکوائری قائم ہوگئی اگر مولانا اپنے رسوخ سے کام نہ لیتے تو نہ معلوم سید صاحب پر کیا بیتتی۔ یہی نہیں پاکستان جانے پر سید صاحب کی حسب دل خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ انھیں ہندوستان کی یاد ستانے لگی تو مولانا نے ان کے واپس آنے کے سب انتظام کردیے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ اور اس قسم کے کتنے واقعات ہیں جو مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی پر دلالت کرتے ہیں۔

قائد اعظم جناح نے مولانا کو کانگریس کا شو بوائے کہا۔ لیکن مولانا نے کبھی اس کا لوٹ کر جواب نہیں دیا بلکہ ان کی تنظیمی صلاحیت اور اعلیٰ کارکردگی کو ہمیشہ سراہا۔ ترجمان القرآن کی اشاعت پر ایمان بالرسل کے مسئلے پر مولانا کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ بعض علما خصوصاً اہل حدیث نے مولانا کی شان میں بڑے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ مولانا نے اس ہنگامہ آرائی سے اس طرح اعراض کیا گویا اس سے انھیں کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ مولانا کے نیازمندوں میں سے مولوی غلام رسول مہر نے جواب دینے کی اجازت طلب کی تو مولانا نے لکھا۔

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب الہلال نکالتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب تھا کہ نہیں معلوم کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے لیکن اب میرا یہ حال ہے کہ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو میں یقین کے ساتھ اسے برا کہنا پسند نہیں کرتا ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو برا کیوں نہ کہوں۔"

انتقاماً دوسروں کو برا کہنے سے قبل خود اپنے نفس کا جائزہ لینا مولانا کے اخلاق وکردار کا ایسا پہلو ہے جس کی مثال عصر حاضر میں تو کیا اسلاف میں بھی مشکل سے ملے گی۔

مولانا آزاد کی چینی چائے

غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے میں نان پارہ (سابق ریاست) کے سعادت انٹر کالج کے نویں درجہ میں پڑھتا تھا اخبار بینی کا شوق بچپن سے تھا اور اُردو زبان و ادب سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ مقامی مکتب انجمن اسلامیہ نان پارہ میں درجہ چار کا طالب علم تھا لیکن مولانا صادق حسین سردھنوی اور مولانا عبدالحلیم شرر کی زیادہ تر ناولیں پڑھ چکا تھا اور طلسم ہوش ربا کے مطالعے میں مشغول تھا۔

اسی اخبار بینی کے شوق اور اُردو زبان سے والہانہ لگاؤ کے باعث اس زمانے کے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور مولانا کی مرغوب چینی چائے (وہاٹ جیسمن) مولانا کے لفظوں میں "گوری چنبیلی" کا تذکرہ بھی پڑھنے کو ملا۔ میں نے بلا تکلف مولانا کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا کہ آپ کی پسند سے مجھے اتفاق ہو کر نہ ہو لیکن اس کا غائبانہ عشق ضرور ہوگیا ہے مولانا نے جواباً تحریر فرمایا:

"عزیزی! مجھے خوشی ہوئی کہ میری اس ہیچوں ڈھیچوں چائے کا کوئی قدردان تو ملا افسوس کہ میرے پاس اس کا پیکٹ بھی نہیں۔ بہر حال جب بھی نیا ڈبہ آیا میں آپ کو ضرور بھیجوں گا۔"

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء تک کا زمانہ بیت گیا اس دوران نہ تو مولانا کو چائے بھیجنے کا خیال آیا اور نہ میں نے ہی یاد دہانی کا کوئی خط بھیجا لیکن اسمبلی کے کانگریسی اُمیدواروں کے سلسلے میں اپنے حلقے کی نمائندگی اور مسلم امیدوار کی نامزدگی کے سوال پر مولانا آزاد کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا کی کوٹھی پر اس وقت مسلم اقلیت کے زیادہ تر امیدوار موجود تھے ان میں گونڈا گاؤں پارلیمانی حلقۂ اسمبلی کے ایک امیدوار اور مجاہد آزادی مولوی محمد ابراہیم بھی موجود تھے۔ مولانا اس وقت اپنی کوٹھی پر موجود نہ تھے اور مجمع مولانا کے انتظار میں بے قرار تھا۔ مولانا کے پرائیوٹ سیکریٹری مولوی اجمل خاں اپنی ممتاز خوش مزاجی کے ساتھ حاضرین سے نپٹ رہے تھے کہ مولوی محمد ابراہیم نے مولانا آزاد کی بابت دریافت کیا اور کہا کہ اجمل صاحب مولانا کہاں ہیں انھوں نے حسب عادت مولوی صاحب کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ آئیے میری جیب میں ہیں اس پر مولوی ابراہیم صاحب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

ابھی تھوڑا ہی وقفہ گزرا تھا کہ ایک کالے رنگ کی کار پھاٹک سے دڑاتی ہوئی برآمدے میں آکر ٹھہری کار کا دروازہ کھلا اور سرخ و سفید رنگ کی ایک پہلو دار شخصیت اس کار سے برآمد ہوئی۔ (وہ مولانا آزاد تھے) اُن کے ہمراہ دو صاحبان اور بھی کار سے نکلے۔ اور پھر یہ حضرات بھی برآمدے ہی میں دو کرسیوں پر مولانا آزاد کے سامنے بیٹھ گئے۔ مولانا ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اچانک مولانا کی نظر مولوی محمد ابراہیم پر پڑ گئی اور برجستہ فرمایا کہ میرے بھائی مولوی صاحب آپ کہاں تھے دہلی کے کنوؤں میں بانس ڈالا گیا لیکن آپ کا پتہ نہ چل سکا۔

مولوی ابراہیم تو اجمل خاں صاحب سے جلے بھنے بیٹھے موقع کی تاک میں تھے فوراً بے باکی سے گویا ہوئے کہ حضرت میں تو بڑی دیر سے یہاں حاضری دے رہا ہوں لیکن آپ نے ایسے گستاخ دربان پال رکھے ہیں (اجمل خاں کی طرف اشارہ) کہ آپ کو صحیح اطلاع نہیں دیتے۔

مولانا نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے فرمایا کہ خیر میرے بھائی یہ بتائیے کہ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے۔ مولوی ابراہیم نے کہا مولانا میں تو صرف "درس نظامیہ" کا فاضل ہوں۔ مولانا آزاد پھر مخاطب ہوئے اور دریافت کیا کہ میرے بھائی کس مدرسے سے سند حاصل کی ہے مولوی صاحب نے جواب دیا کہ مدرسۂ امینیہ حسینیہ دہلی سے! مولانا اس وقت آرام کرسی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے فوراً سیدھے ہوگئے اور فرمایا کہ میرے بھائی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسے سے! مولوی ابراہیم نے کہا کہ جی ہاں!

اب مولانا اپنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دو حضرات کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ مسٹر مانک لال (جو غالباً اس وقت راجستھان صوبہ

راحت علی خاں
کاشانۂ راحت، قلعہ، نان پارہ (بہرائچ) اودھ (یوپی)

کانگریس کے صدر تھے) آپ لوگ جس شخص کو جاہل بتا رہے ہیں وہ آپ کو ۲۵ برس سبق پڑھائے گا۔
اس جملے پر مولوی ابراہیم پھر گویا ہوئے کہ حضرت ان لوگوں نے میرے خلاف راجستھان میں یہ پروپیگنڈہ کر کے کہ میں مقامی باشندوں کو پاکستان بھیجنے میں مدد کر رہا ہوں اس طرح سے ایک جاسوس ہوں، میرا اسمبلی کا ٹکٹ کاٹ دیا۔ حالاں کہ آپ خود واقف ہیں کہ میں نے کئی بار ملک کی آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اور آج جب کہ یہ معاملہ کانگریس کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے سامنے پیش ہے تو یہ سمجھ کر کہ راجستھان والا پروپیگنڈا آپ کے سامنے نہیں چل پائے گا میری فائل پر یہ لکھ دیا کہ میں جاہل ہوں۔!

مولانا آزاد نے مولوی محمد ابراہیم کی زبانی گفتگو سُن کر فوراً فائل مانگی اور اس پر اپنا نوٹ لگا کر اجمل خاں صاحب سے مخاطب ہوئے کہ اسے دھیبر بھائی (جو اس زمانے میں صدر کانگریس تھے) کے پاس بھیج دیجیے اور پھر اپنی چھڑی اٹھائی اور برآمدے سے کمرے میں داخل ہونے لگے جو بھیڑ مولانا کی کوٹھی پر موجود تھی اس کی طرف دیکھے بغیر۔!
میں نے لپک کر مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ حضور ۱۹۴۶ء سے میں اپنے خط کے جواب کے لیے ترس رہا ہوں ایک سیاسی ضرورت سے جناب والا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو خیال آیا کہ اسی بہانے مذکورہ خط کا تذکرہ بھی آجائے گا مولانا نے ایک سرسری نظر میری طرف ڈالی اور فوراً اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور آواز دی کہ عبداللہ چائے لے آؤ۔!
تھوڑی دیر میں مولانا کی مخصوص چینی چائے آئی اور پھر وہ فنجانوں میں انڈیلی گئی ایک فنجان میرے حصے میں بھی آیا اور میں نے نہایت اشتیاق بھرے انداز میں اس خوددار چائے کا ایک گھونٹ اپنے حلق میں اتارا جس نے شکر اور دودھ کا کوئی لگاؤ بھی گوارا نہ کیا تھا لیکن مجھے اس چائے کا کوئی لطف پہلے اور دوسرے گھونٹ میں نہیں ملا خاموش رہا جب چائے کے دو چار گھونٹ اور حلق سے اترے تو عجیب و غریب کیف و سرور حاصل ہوتا گیا۔
ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک صاحب مولانا آزاد کی خدمت میں آئے یہ صاحب تھے مولانا کے باورچی سرور صاحب پختہ رنگ کے مالک، کاکل دراز، میری صورت دیکھتے ہی کہا کہ میاں آداب!
بات دراصل یہ تھی کہ سرور صاحب شاہی رکاب دار تھے اور نواب صاحب رامپور کے یہاں ملازم تھے کسی بات پر تنگ گئے تو بقول شخصے (مرزا یگانہ چنگیزی):

"ہارے تو چلے نان پارے صاحب"

راجہ صاحب نان پارہ کے مطبخ میں داخل ہوئے وہاں میرے عزیزوں میں جناب محمود احمد خاں سکون راجہ صاحب کے پرائیوٹ سیکریٹری اور پیش کار کے عہدے پر تھے اُن کی بدولت مجھ سے بھی سرور صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد احساس ہوا کہ سرور صاحب نہ صرف بے پناہ حافظے کے مالک ہیں بلکہ انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کے ساتھ اُردو زبان کی شیرینی کے بھی جیتے جاگتے نمونے ہیں اور انھیں ہر موضوع پر اُردو کے متقدمین سے لے کر متاخرین تک شعرا کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔
انھیں دیکھتے ہی میری زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا کہ سرور صاحب آپ یہاں کیسے۔ میرے اس انداز پر مولانا نے دریافت کیا کہ آپ انھیں کیسے جانتے ہیں۔ تو میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی اور مولانا کی محفل بھی برخاست ہوگئی۔
تھوڑے دنوں کے بعد میرا انجمن ترقی اُردو (ہند) کی سالانہ کانفرنس (۱۵، ۱۶، اور ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء) کے موقعے پر دہلی جانا ہوا تو اتفاقیہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سرور صاحب سے میری دوبارہ ملاقات ہوگئی وہ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے کہ میاں آپ نے مولانا کو میری دلچسپی سے آگاہ کر کے میرے لیے مصیبت کر دی۔ کہنے لگے کہ ایک دن میں باورچی خانے میں کوئی چیز پکا رہا تھا کہ مولانا دندناتے ہوئے آگئے اور کہنے لگے بھئی سرور صاحب آپ بھی بڑے ہی بد ذوق معلوم ہوتے ہیں۔ ترشح ہو رہا ہے اور آپ موسم کا ساتھ نہیں دیتے۔ میرے بھائی اس موقعے پر جلال لکھنوی نے کیا کہا ذرا یاد دلائیے۔ غرض یہ کہ مولانا اکثر و بیشتر مجھے چھیڑتے رہتے ہیں۔
میں نے سرور صاحب سے تعجب کے ساتھ ایک بات دریافت کی بھئی آپ میٹھی چیز پکانے کے اُستاد ہیں جب کہ مولانا چائے میں بھی شکر کا استعمال برائے بیت کرتے ہیں تو آپ کو کس مقصد سے اپنے اسٹاف میں شامل کر رکھا ہے۔ سرور صاحب نے کہا کہ مجھے دوسرے مہمانوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے جو آئے دن بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں ورنہ مولانا کی مرغوب غذا تو دوہری روٹی اور آلو پالک ــــــ کی بھجیا ہے۔

مولانا آزاد کے آخری لمحات

①

فیروز بخت کی آخری گھڑیاں

معاصر الجمعیۃ کے کالموں سے "حضرت مولانا بقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی نے مشرقی پنجاب کے اوقاف کے سلسلے میں ایک یادداشت پیش کرنے کے لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے جن کو آج مدظلہ العالی کے بجائے رحمتہ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے، وقت لیا تھا۔ اور اسی غرض سے مولانا دہلی تشریف لائے ہوئے تھے ملاقات ہوئی مگر اس حالت میں کہ حضرت مولانا آزاد سکرات میں تھے، اور مولانا عثمانی یٰسین شریف پڑھ رہے تھے۔"

مولانا بقاء اللہ پانی پتی جیسے متقی و دیندار کا عین نزع کے وقت آپہنچنا ایسی خبر نہیں کہ اسے محض اتفاقاتِ زمانہ کے تحت درج کیا جائے، مرحوم کی یہ عین فیروز بختی تھی اور بالفرض مرحوم کی مغفوریت کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی، تو انشاء اللہ یہی ایک دلیل کافی ہو جاتی۔ مولانا عثمانی کے ایمانی درجہ و مرتبہ کے لوگ اُمت میں بس ڈھونڈھنے ہی سے مل سکتے ہیں ـــــ مولانا مرحوم کا تاریخی نام یاد کر لیجیے کہ "فیروز بخت" تھا۔

صدق جدید، ۷ / مارچ ۱۹۵۸ء

②

[مولانا دریابادی نے اپنے "سفرِ دکن" (۹) میں ڈاکٹر عبداللطیف سے اپنی ملاقات کی روداد کے ضمن میں حضرت مولانا آزاد کے آخری لمحاتِ حیات کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔]:

ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلقات مولانا ابوالکلام سے خصوصی تھے۔ ان کی ایک آدھ کتاب کو انگریزی کے قالب میں یہ لائے ہیں۔ ان کے زمانۂ علالتِ وفات میں' یہ وہیں' انھیں کی کوٹھی پر مقیم تھے، انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھا کر گرے، پھر ہوش نہ آیا اور نہ کچھ بول ہی سکے۔ صرف ایک بار وقتِ وفات سے چند گھنٹے قبل' ذرا سے آثارِ ہوش آنے کے معلوم ہوئے، ڈاکٹری تدبیروں سے سخت کرب و اذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سُنائی دی، کہ:

چھوڑ دو' بس خدا پر چھوڑ دو!

اور بس پھر کوئی آواز اس عالمِ آب و گل میں نہ نکل سکی۔ مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو۔ مضطرب کی آخری پکار چارہ سازِ حقیقی کے نام کی۔

سفرِ دکن (۹) صدق جدید، لکھنؤ

۷ / فروری ۱۹۶۴ء

سفرِ آخرت

زندگی کی آخری تقریب ۵ ار فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں منعقدہ کُل ہند اُردو کانفرنس جس کا افتتاح وزیرِاعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا ہوئی جس میں اُردو زبان کا یہ مجدّدِ وقت بھی شریک ہوا اور اپنی جرأتِ حق و کمالِ خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا آخری پیغام سُنا گیا۔

" اُردو کو ہندوستان کے آئین میں جو پوزیشن دی گئی ہے اسے گورنمنٹ تسلیم کرے اور ملک بھی مانے۔"

۱۹ ار فروری ۱۹۵۸ء کی صبح تھی کہ عالمِ قدس میں اس علم بر دار وراثتِ انبیا و مصلحین امت کی آمد آمد کے غلغلے بلند ہونا شروع ہوئے اور ان کی صدائیں رُوحِ آزاد تک پہنچنے لگیں حضرت مولانا آزاد حسبِ معمول صبح سویرے اُٹھے اور غُسل خانے میں گئے اسی وقت سفرِ آخرت کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بہ ظاہر آپ کے جسم پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور آناً فاناً اس خبر نے پورے ملک کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا۔ مسلسل تین دن مرض کی شدّت نے حضرت مولانا آزاد کو بے ہوش رکھا درمیان میں ایک دو بار حواس میں کچھ لہر سی آئی کسی قریب بیٹھے ہوئے کو پہچانا اسی اثنا میں پنڈت جواہر لال نہرو قریب آئے تو ان کو "خدا حافظ" کہا یعنی شعور ذہنی سفرِ آخرت کے لیے مستعد ہو چکا تھا ایک موقعے پر معالجین کے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے بس اللہ پر چھوڑیے۔"

دُنیا کی رسم و رواج کے مطابق علاج و معالجہ کی تمام کوششیں کی گئیں حضرت مولانا آزاد کے معالج خصوصی ڈاکٹر بی۔ سی رائے کلکتہ سے دہلی پہنچے دہلی کے بھی بہترین طبّی دماغ انسانی تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے مگر مشیتِ الٰہی ان کی تدبیروں پر غالب آئی حکومت کے اعلیٰ ترین ارکان سے لے کر آخری طبقے تک صدرِ جمہوریہ، وزیرِاعظم، وزرا، عمایدین عوام و خواص سب کے دماغ ایک ہی فکر کا شکار تھے اور سب کے چہرے اُداس، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایسا عزیز ترین سرمایہ ان کے ہاتھوں سے چھنا جا رہا ہے کہ پھر کسی قیمت پر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

وہ ساعت جو مقرر تھی تیزی کے ساتھ قریب آرہی تھی۔ یہاں تک کہ تحریکِ خیزی کے عادی امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو سوا دو بجے شب کو سرمایۂ حیاتِ مستعار اس کے مالکِ حقیقی کے سپرد کر دیا اور قیادت و سیاست کی وہ شمع فروزاں جس نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک مسلسل ہندوستان کی وسعتوں کو نورِ عرفان سے منور اور نغمہ ہائے صداقت و صدا ہائے دعوت و تذکیر سے معمور کیا تھا بالآخر گُل ہو گئی۔

امداد صابری (مرحوم)

---

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کا سورج افقِ ہند پر طلوع ہوا تو اس کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے وہ آنسو تھے جن کو تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ پورا ملک ماتم کدہ بنا ہوا تھا زندگی کے تمام کاروبار معطل نظر آتے تھے تجہیز و تکفین اور پریڈ گراؤنڈ میں تدفین کے تمام انتظامات پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور بخشی غلام محمد نے خود مکمل کرائے۔ اعلان نہیں انتظام نہیں مگر پھر بھی حضرت مولانا آزاد کی میت میں لاکھوں کی بھیڑ تھی، پانچ لاکھ کا اندازہ اخباروں میں آیا ہے مگر اس سے زیادہ پبلک تھی، دہلی دروازہ سے جامع مسجد تک کی سڑک کے دونوں طرف اور چھتوں پر لوگ گھنٹوں بیٹھے کھڑے حضرت مولانا آزاد کے آخری دیدار کا انتظار کر رہے تھے فٹ پاتھ پر لوگ جس خاموشی سے کھڑے تھے ایسا لگتا تھا گویا آج پورا ہندوستان سوگوار ہے بھیڑ میں مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو لے کر بیٹھی تھیں ان کو ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ان کا بچہ کہیں بھیڑ میں کچل نہ دیا جائے۔ ایک بجے دوپہر میت اُٹھائی گئی جو لاکھوں مسلم و غیر مسلم مرد و زن، بوڑھوں اور جوانوں کے سروں سے گذرتی ہوئی تین بجے پریڈ گراؤنڈ میں پہنچی۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت امام الہند کا جسدِ خاکی آغوشِ رحمت کے سُپرد کر دیا گیا۔ ایک طرف جامع مسجد شاہجہانی کے سربلند منارے اور دوسری جانب قلعۂ معلّیٰ کی

برجیاں پکار رہی تھیں :

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل وکمال کی صُورت

حضرت مولانا اپنے مزاج وطبیعت کی افتاد کی بنا پر ایک سیاسی لیڈر ہوتے ہوئے بھی زندگی بھر عوام سے گریزاں رہے، خواص بھی ان کی مجلس میں مشکل ہی سے بار پاتے تھے۔ ان کے احباب خاص کا حلقہ بہت محدود تھا۔ ان کی زندگی معمولات کے خاص سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسا کہ شورش کاشمیری نے لکھا ہے، خیال ہوتا تھا کہ ان کے ماتم گساروں اور جلوسِ میت میں مخصوص و محدود افراد ہوں گے۔ لیکن لوگ ان کے ماتم گساروں کا مجمع اور میت کا جلوس دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ملک کے اطراف و جوانب اور دور دراز شہروں سے ہزارہا افراد انتقال کی خبر پاتے ہی دہلی پہنچ گئے جن کے لیے ملک کی ائیر لائنز کو خصوصی پروازوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ پاکستان بشمول موجودہ بنگلہ دیش سے سینکڑوں افراد حضرت مولانا کی میت کے جلوس اور نماز جنازہ میں شرکت کے لیے دہلی پہنچے اور یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔

("امام الہند مولانا آزاد" مطبوعہ کراچی)

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا پہلا نام "ارمغان احباب" تھا، مولانا حکیم سید عبدالحئی کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا تھا۔ حکیم سید عبدالحئی صاحب، موجودہ دنیائے اسلام کی نادر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد بزرگوار تھے۔

اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو رہے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت دور کی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے۔ اسے علم کی بھی لگن ہے، اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے، بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدر شناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں، عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی، تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحئی
مرتبہ : ڈاکٹر صالحہ ذکی
صفحات : ۱۲۴
قیمت : ۲۵ روپے

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے :

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی لکھا ہے اور نکتہ چینیوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں؛ ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہا جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں، داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی
مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا
صفحات : ۲۴۹
قیمت : ۳۴ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

قطعۂ تاریخ وفات مولانا آزاد

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم ممتاز دانشور، بہترین نثر نگار اور بے مثل مترجم تھے۔ لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شعر بھی کہتے تھے اور ان کی شاعری میں بھی بہت سی خوبیاں تھیں، خاص طور پر مشاہیر کی تاریخ وفات پر انھوں نے جو قطعات کہے ہیں، ان کی معنویت بالخصوص بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر بھی انھوں نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں مرحوم کی صفات اور خدمات پر ایک مخصوص انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عابد صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ محترمہ صالحہ عابد حسین مرحومہ کے مولانا سے گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے۔ جب مولانا کا انتقال ہوا تو اس زمانے میں عابد صاحب مرحوم علی گڑھ میں تھے، جب ریڈیو پر اچانک انھوں نے اس حادثے کی خبر سُنی تو بذریعہ کار میاں بیوی دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مرحومہ کے الفاظ میں: "میں روتی رہی اور عابد صاحب کے آنسو الفاظ میں ڈھل جایا کرتے تھے، وہ فکرِ تاریخ میں گم ہو گئے اور جب ہم لوگ مولانا کو آخری آرام گاہ پہنچانے کے بعد رات کو جامعہ نگر واپس آئے تو عابد صاحب تاریخ کہہ چکے تھے۔ اگلے یا اس سے دوسرے دن مصرعے لگائے اور تاریخ تیار تھی۔"[۱]

اس وقت ڈاکٹر عابد صاحب کے تین قطعات میرے سامنے ہیں: ایک غیر مطبوعہ، خود عابد صاحب کے قلم سے لکھا ہوا، اس کی کاٹ پیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ پہلا مسودہ ہے، دوسرا وہ قطعہ جو ہفتہ وار "ہماری زبان" بابت یکم و ۸، اپریل ۱۹۵۸ء میں صفحہ ۸ پر شائع ہوا ہے، تیسرا وہ قطعہ جسے مرحومہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے "آج کل" — عابد حسین نمبر کے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے، جو عابد صاحب کی شاعری پر ہے۔ ان تینوں قطعات میں کچھ نہ کچھ فرق ہے، سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ "ہماری زبان" کے قطعے میں سالِ وفات ہجری سنہ میں ہے اور بقیہ دو میں عیسوی سنہ ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس مصرعے سے تاریخ وفات نکالی گئی ہے وہ تینوں میں یکساں ہے۔ اب اس فن کے ماہرین بتلائیں گے کہ کیا واقعی ایک ہی مصرعے سے دونوں سنوں میں تاریخ نکلتی ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے غیر مطبوعہ قطعۂ وفات پیش کرتا ہوں، جو میرے ذاتی کاغذات میں محفوظ تھا۔ تاریخ نکالتے وقت اس کو ملحوظ رکھا جائے کہ اس قطعے میں عنوان کا "ابوالکلام" بھی زیر خط ہے اور متعلقہ مصرعے کا "ہجوم یاس" بھی۔

اب مرحوم کے قطعے کا مسودہ ملاحظہ ہو:

قطعۂ تاریخ وفات
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

[illegible]

۱۹۵۸

[illegible]

اس کے بعد "ہماری زبان" کا قطعہ ملاحظہ ہو:

عبداللطیف اعظمی

۳۴۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

[۱] صالحہ عابد حسین: ماہنامہ آج کل — عابد حسین نمبر، بابت جون ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۸۔

مولانا آزاد مرحوم کی تاریخ رحلت

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیس کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد
رحلت کی تاریخ تری نکلی منھ سے نغاں بن کر
دل پہ آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد
اتنے میں محسوس ہوا یہ جیسے کوئی کہتا ہے
من کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد
روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد دیر و حرم میں ہے آزاد

(ڈاکٹر سید عابد حسین)

آخر میں وہ قطعہ ملاحظہ ہو جسے مرحومہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے اپنے مضمون مطبوعہ "آج کل" —— عابد حسین نمبر میں درج کیا ہے:

کل تک ہم سب ہند کے باسی خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیس کی فکر کریں، جب تک ہم میں ہے آزاد
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد
ہے یہ ہمارا نالہ تیری رحلت کی تاریخ بھی ہے
دل پر آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد
۱۹۵۸ء
پھر کچھ محسوس ہوا، جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد
اس کی فکر روح و عمل سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد

ابوالکلام آزاد کی وفا شعار شریکِ حیات — زلیخا بیگم

مولانا ابوالکلام آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ ایک نوعمر لڑکے تھے اور زلیخا بیگم ایک کم سن بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے۔ آفتاب الدین، مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم اُن کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ انھوں نے اس بچی کا زلیخا نام رکھا بعد میں یہ بچی انھیں اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئیں تو وہ ہوش مند ہو چکی تھیں۔ اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی مولانا آزاد کی خدمت میں لگ گئیں۔ مشرقی ماحول کی پروردہ اس لڑکی نے مولانا کی ہر خواہش کو سر آنکھوں پر رکھا ہجر کی سختیاں سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر کبھی زبان پر اُف تک نہ لائیں۔ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں انھوں نے کوئی جھجک محسوس نہیں کی

مولانا آزاد بھی زلیخا بیگم کو بہت چاہتے تھے لیکن اس محبت کو وہ اپنے سیاسی مشاغل پر غالب نہیں آنے دیتے تھے۔ اسی طرح ان کی رفیقۂ حیات بھی ان کی رضا جوئی کو اپنا فریضہ مانتی تھیں اور ان کی مزاج داں ہونے کے سبب کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتی تھیں جو مولانا کے لیے کسی درجے میں ناگواری کی موجب ثابت ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیماری بھی مولانا سے چھپانے کی کوشش کرتی تھیں۔ مولانا ۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں میں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گذرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئیں۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئیں تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی تھی۔"

مولانا اس ایثار و انکسار، محبت و مروت فہم و فراست، صبر و استقلال کی مالک شریکِ حیات کی وفات کے بعد اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرہ بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار ہوگا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔"

زلیخا بیگم کا انتقال ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہوا جب مولانا آزاد احمد نگر کے قلعے میں نظر بند تھے۔ زلیخا بیگم کئی سال سے برابر علیل چلی آرہی تھیں۔ لیکن صورت یہ تھی کہ جب کبھی مولانا جیل سے باہر ہوتے تھے تو وہ اپنی قومی مصروفیات کے باعث اپنی رفیقۂ حیات کی صحت پر اور معالجے پر ٹھیک ڈھنگ سے توجہ نہیں دیتے تھے اور جب وہ جیل میں ہوتے تھے تو زلیخا بیگم انھیں اپنی علالت کی اطلاع دے کر پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اسی لیے ان کی علالت کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور وہ تپِ دق میں مبتلا ہو گئیں۔ بسترِ مرض پر انھیں صرف مولانا کی صحت اور کامیابی کا خیال رہتا تھا۔ بارگاہِ الٰہی میں بارہا انھوں نے رفیقِ حیات کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں ہر خبر ان کے دل پہ گہری چوٹ پہنچاتی تھی۔ رفتہ رفتہ غذا بھی برائے نام رہ گئی اور دواؤں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ مولانا کی یاد میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی۔ ڈاکٹر بی۔ سی رائے نے علاج میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

وہ ہر ملنے والے سے صرف یہی کہتی تھیں۔" بس خدا کے

مناظر عاشق ہرگانوی

مارواڑی کالج، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۷ (بہار)

لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔"

مولانا سے زلیخا بیگم کی آخری ملاقات ۳ اگست ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی۔ اس رخصت کا تذکرہ خود مولانا نے اپنے مکتوب میں اس طرح کیا ہے:

"۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئیں۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا، اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت یہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اسے صورتحال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

مولانا آزاد بمبئی سے گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے۔ جہاں زلیخا بیگم کی علالت کی اطلاع مولانا کو فروری ۴۳ء میں ملی۔ اور وہ بھی خود ان کے خط سے نہیں۔ کیونکہ ان کے جو خط مولانا کو ملتے ان میں کبھی صحت کے متعلق کوئی تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۵ فروری کو جب مولانا کو معلوم ہوا کہ زلیخا بیگم شدید علیل ہیں تو انھوں نے ایک تار دیا جس کا جواب ایک ہفتہ بعد حسب سابق یہ ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے:

"۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔"

مگر تقریباً ایک ماہ بعد قلعہ احمد نگر کے سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے مولانا کو یہ اطلاع ملی کہ ان کی اہلیہ کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی تفصیل مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

"۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے

...زلیخا بیگم نے جدوجہد آزادی میں اپنے شوہر کا ساتھ ان کا حوصلہ بڑھا کر بھی دیا اور اس راہ میں اپنے ذاتی آرام و آسائش کو تج کر بھی...

ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلیگرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلیگرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ خبر مجھے پہنچا دینی چاہیے۔

چوں کہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیوں کہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس کے ذریعے ہی سے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا اور اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو تار کے ذریعے نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چوں کہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتے سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتے سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔"

سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے کہا کہ اگر وہ اس تار کے متعلق کچھ کہنا چاہیں تو فوراً وہ حکومت تک پہنچا دیا جائے گا۔ مگر مولانا نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ اور مولانا اپنے ارادے میں اٹل رہے اور انھوں نے سرکار سے کسی قسم کی کوئی درخواست نہیں کی۔ اس اجمال کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مکتوب میں مولانا لکھتے ہیں:

"جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی وہ صورتحال سے بہت

تر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن
نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی بھی
واست کرنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس
اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے
س آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے
نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے
چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات
ومتِ بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔"

آخر ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو وہ خبر آ گئی جس کے
مولانا نے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ مولانا
تے ہیں:

"۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک
حوالے کیا جس میں حادثے کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو
وم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح
معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے
ں کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔
اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی
م ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی
اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی
ار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی
ی۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں
وس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ ولے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند"

زلیخا بیگم وفا شعار اور شوہر کی خوشی پر قربان
جانے والی ایک مکمل مشرقی خاتون تھیں۔ حمیدہ
سلطان کے ایک مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"ایک مرتبہ صبح دس بجے میری والدہ ان کے
یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت اس دن وہ
پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ
کرتے ہوئے کہا" معاف کیجیے گا۔ آپ کو
اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو
کھانا کھلا رہی تھی۔"

بیگم آزاد کے بکھرے ہوئے بالوں
کی طرف اشارہ کر کے والدہ بولیں" مگر
بھاوج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی کو آپ
کی زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر
کو نہیں گوندھتیں۔"

وہ لجا کر بولیں" جی نہیں یہ بات
نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری
طبیعت کچھ خفقانی سی ہو گئی ہے کہ چوٹی
گوندھنے سے دل گھبراتا ہے۔"

وہ اندازِ حجاب آج بھی یاد ہے۔ میری
والدہ اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کر
گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف
اشارہ کر کے کہا" نوج ایسی بھی کیا سادگی۔ ہم
نہیں آتا۔ اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے۔ ایک
ایک چوڑی ہاتھ میں ڈال لیا کرو۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا" آخا
ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی
طرح طعنہ دے رہی ہیں۔ اچھا میں آئندہ سے
آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔"

دوسرے ہفتے جو خود ملنے آئیں تو
پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکن کا خوبصورت
بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساڑی
زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو چوڑیاں
تھیں۔ کانوں میں بندے۔ اچھے لباس اور
ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو
اور بھی دلربا کر دیا تھا۔ میری والدہ ان کو
گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں" اے ہے کہیں
میری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاءاللہ
چشمِ بددور بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ حسبِ عادت لجا کر بولیں" آپ
کو خوش کرنا تھا ورنہ مجھے اب تو رنگین کپڑے
اور زیور پہنتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"اے ہے اور سنو حد کر دی تم نے بھی
ابھی تمھاری عمر ہی کون سی ایسی ہے سہاگنیں
تو بڑھاپے میں بھی پیلا کپڑا پہنتی ہیں۔"

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد
کی نرگسی آنکھوں میں ڈورے دیکھ کر والدہ
نے ان سے مسکرا کر کہا" کیا بات ہے۔ انھوں
نے جواب دیا" آج کل مولانا قرآن پاک
کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کے دو بجے کے
بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں۔ پنکھا
کھینچتی رہتی ہوں۔ موسم بے حد گرم ہے۔ یہ
کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں اور محنت کریں
اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

زلیخا بیگم نے جدوجہد آزادی میں اپنے شوہر
کا ساتھ ان کا حوصلہ بڑھا کر بھی دیا اور اس راہ میں اپنے
ذاتی آرام و آسائش کو تج کر بھی۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا پر
کلکتہ کی عدالت میں جب مقدمہ چلایا گیا اور انھیں
جیل بھیج دیا گیا تو زلیخا بیگم نے مہاتما گاندھی کے نام
ایک خط میں لکھا:

"میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے
کا فیصلہ آج سنا دیا گیا۔ انھیں صرف ایک سال قیدِ
سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور
پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔
اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم
کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ ناانصافی

برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔ میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزا یابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے بنگال صوبائی خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔"

زلیخا بیگم کا جذبۂ ایثار و قربانی، وطن پرستی غلامی کے خلاف جہاد اور صبر و استقلال اُنھیں مادرِ وطن کی گنی چُنی بیٹیوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے

نقش صفات
فکر و عمل کی تفہیم و تفسیر

حزب اللہ، مولانا آزاد کی انقلابی کتابِ حیات کا ایک ورق

(ا)

مولانا ابوالکلام آزاد نے سیاست کا پہلا سبق

۱۹۰۵ء کے لگ بھگ بنگال کے اُن سیاسی لیڈروں سے سیکھا تھا جو وطن کی آزادی کے لیے خفیہ قسم کی انقلابی تحریکیں چلایا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک اُن لیڈروں کے زیرِ اثر نہ رہ سکے اور تھوڑے ہی دنوں میں ہندو بنگالیوں کی انقلابی تحریکوں سے بددل ہو گئے پھر بھی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاصے دنوں تک وہ اپنے ذہن سے ابتدائے عمر کے اثرات کو پوری طرح سے دور نہ کر سکے۔ ۱۹۱۳ء میں جب ان کے ہفت روزہ الہلال کی عمر بمشکل ایک سال کی تھی انھوں نے اپنی انقلابی سیاست کے تجربوں کو مذہبی رنگ دے کر مسلمانوں میں آزمانے کی ایک کوشش کی۔

الہلال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی دن سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستانی ہونے کے ناطے ان کا فرض تھا کہ وہ وطن کی آزادی کے لیے دل و جان سے کوشش کریں۔ اس سلسلے میں وہ اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ ملک کی آزادی کے لیے جدّ و جہد کو" ایک فرضِ دینی اور جہاد فی سبیل اللہ" کہتے تھے۔ ظاہر ہے جہاد کے لیے سرفروشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے سماجی، علمی اور دینی پس منظر کی بنا پر مسلمانوں کے اس طبقے سے جہادی سرفروشوں کو جمع کر سکتے تھے جو مذہب کے نام پر بے چون و چرا تن من دھن لٹانے کو تیار رہتا ہے۔ الہلال کی وجہ سے اس قسم کے لوگوں پر مولانا اپنا اثر اچھی طرح جما چکے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس طبقے کے ہر شخص نے مولانا آزاد کے خیالات کو پوری طرح سمجھ بھی لیا ہو کیونکہ وہ کچھ اس طرح اچانک اسٹیج پر نمودار ہوئے تھے اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے انھوں نے لوگوں کے ذہنوں کو کچھ اس طرح متاثر کر دیا تھا کہ اچھے خاصے لوگ ان کے خیالات اور تحریروں کا پوری طرح سے تجزیہ کیے بغیر ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار تھے۔

بہرحال ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایک بظاہر مذہبی لیکن حقیقتاً خفیہ سیاسی جماعت قائم کرنی چاہی۔ دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے برخلاف انھوں نے اپنی مجوزہ پارٹی کے اغراض و مقاصد کو ابتدا ہی میں بیان کرنے سے احتراز کیا۔ اس کے بجائے الہلال میں انھوں نے ایک مختصر سا نوٹ بہ عنوان" من انصاری الی اللہ" (خدا کی راہ میں میرے مددگار کون لوگ ہیں؟) شائع کیا۔ اس نوٹ میں انھوں نے خاص طور سے ان لوگوں کو مخاطب کیا جو الہلال کی پالیسی سے پوری طرح متفق تھے اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ مجوزہ پارٹی ——— حزب اللہ (خدائی جماعت) ——— میں شامل ہونا چاہیں تو اپنے نام اور پتے اُن کے پاس بھیج دیں۔ اغراض و مقاصد کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اس کا اعلان اس وقت کیا جائے گا جب ایک معقول تعداد میں نام اور پتے جمع ہو جائیں گے۔[۲]

شمیر الحق

وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

دوسرے ہفتے انھوں نے ایک اور نوٹ شا...
میں یہ خبر دی کہ دو ہفتے بعد وہ حزب اللہ کی "...
منزل" کا اعلان کریں گے۔ "دوسری منز...
نے کوئی تشریح تو نہیں کی لیکن سیاق و سبا...
ہوتا ہے کہ" دوسری منزل" سے ان کی مراد...
کے اغراض و مقاصد کا اعلان تھا۔ الہلال...
شمارے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ا...
کہ ان کے پاس لگ بھگ آٹھ سو آدمیو...
پتے بھیج دیے تھے۔[۳] ظاہر ہے جنگ آزاد...
رکھنے کے لیے آٹھ سو آدمیوں کی فوج کوئی ح...
رکھتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ زیادہ...
لوگ حزب اللہ کے ممبر بن جائیں۔ بہرحال
قارئین کو ناامیدی ضرور ہوئی ہوگی جب دو...
انھیں رسالے میں حزب اللہ کی دوسری منز...
نظر نہ آئی ہوگی۔ دو ہفتے کیا، لگ بھگ ایک...
تک اس سلسلے میں بالکل خاموشی رہی، پھر ا...
میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی کہ حزب ال...
بننے کے لیے باقاعدہ فارم چھپوا لیے گئے ہیں جو...
بھیجے جائیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ ا...
"دعوت و تبلیغ" بھی بھیجا جائے گا۔[۵] مطبو...
فارم کا نمونہ حسب ذیل ہے:[۶]

...نجمن انصار اللہ

(ہم اللہ کے مددگار ہیں...

"میری عبادت، میری قربانی، میرا...
مرنا، غرض یہ کہ ہر چیز صرف اللہ رب العالمی...

ہے، جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی قربانی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اطاعت گذاروں میں سب سے آگے ہوں۔"
(قرآن۔ ۶۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴)

نام..................................
پیشہ..................................
عمر..................................
پتہ..................................

اس کے بعد تقریباً دو ہفتے تک پھر سناٹا رہا اس کے بعد ایک شمارے میں حسب ذیل طویل نوٹ شائع ہوا:

"جن صاحبانِ ایقان اور جاں نثارانِ اسلام نے ایک مبہم و مجمل صدائے دعوت کو سن کر، اپنا نام بلا تامل بھیج دیا، اور ان تمام خطرات و وساوس سے مرعوب نہ ہوئے جو ایسے موقع پر قدرتی طور پر نفسِ انسانی میں پیدا ہوتے ہیں انھوں نے فی الحقیقت راہ جاں سپاری و فدویت کا پہلا امتحان دے دیا۔ اور اس طریق دعوت میں فی الحقیقت ایک بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ اس سے یہی مقصود تھا کہ سچی پیاس رکھنے والے اور جھوٹے مدعیان تشنگی میں تمیز ہو جائے۔ جن کو سچی پیاس ہوگی وہ پانی کا نام سنتے ہی دوڑیں گے، اور پیاس کی شدت انھیں اس کا موقع ہی نہ دے گی کہ عاقبت بینیوں اور مصلحت اندیشیوں میں مبتلا ہوں۔

پس جن لوگوں نے بلا تامل قدم بڑھایا وہ الحمد للہ کہ پہلی منزلِ امتحان سے کامیاب گذر گئے اور بعد کی آنے والی منزل سے گذرنے کا اپنے تئیں مستحق ثابت کر دیا۔ ـــــ تائیدِ الٰہی عنقریب اس دعوت کو ایک عظیم الشان جماعت کی صورت میں ظاہر کرنے والی ہے، لیکن جب کہ اغراض و مقاصد کی اشاعت ہو جائے گی تو پھر یاد رہے کہ اس کی طرف سبھی بڑھیں گے لیکن ان کا اجر ان لوگوں کا سا تو نہیں ہو سکتا، جنھوں نے خطرات و خدشات کے ہجوم میں اس کا ساتھ دیا ہے۔"

اسی شمارے میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ رسالہ "دعوت و تبلیغ" ممبروں کے پاس بھیجا جائے گا۔ ممکن ہے اس میں پارٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہوں لیکن ہمارے پاس اس بات کا پتہ چلانے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے کہ آیا اغراض و مقاصد پر مشتمل کوئی رسالہ شائع ہوا اور ممبروں کے پاس بھیجا گیا یا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے الہلال میں حزب اللہ سے متعلق اجمالی اور بہت حد تک ابہامی قسم کے نوٹ شائع ہوتے رہے۔ جن میں اغراض و مقاصد کی وضاحت کیے بغیر اللہ کی راہ میں "سب کچھ" قربان کر دینے کے فضائل

...مولانا آزاد کی "مذھبی" "جماعت" حزب اللہ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو استخلاص وطن کی خاطر انگریزوں کے خلاف متحد اور مجتمع کرنا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اور خاص طور سے علماء کو مذھب کے نام پر اکٹھا کرنا چاھتے تھے کہ ان کے ذریعے سیاسی محاذ پر مجاھدینِ وطن کے ھاتھوں کو مضبوط کر سکیں...

اور اس کی اہمیت پر زور دیا جاتا رہا لیکن کسی بھی پرچے میں متعین طور سے یہ نہیں بتایا گیا کہ جماعت کا طریق کار کیا ہوگا۔ پھر اچانک چند ماہ بعد مولانا نے حزب اللہ پر ایک خاصا بڑا مضمون لکھا جس میں انھوں نے سورہ توبہ (نمبر ۹) کی آیت نمبر ۱۱۲ کو جس میں مومنین کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں حزب اللہ کی بنیاد بتایا۔ اس آیت میں مومنین کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

"(التائبون) وہ جو توبہ کرنے والے ہیں۔
(العابدون) اللہ کے عبادت گذار ہیں۔
(الحامدون) اس کی حمد و ثنا ہمیشہ ورد زبان رکھتے ہیں۔
(السائحون) اس کی راہ میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر سفر کرتے ہیں۔
(الراکعون الساجدون) اس کے آگے رکوع و سجود میں مشغول رہتے ہیں۔
(الآمرون بالمعروف) نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں۔
(الناھون عن المنکر) برائیوں کو روکنے والے ہیں۔
(الحافظون لحدود اللہ) اور سب سے آخر یہ کہ اللہ نے جو حدود قائم کر دیے ہیں ان سب کے محافظ ہیں تو ایسے مومنوں کو دین و دنیا کی فتح یابیوں کی خوشخبری سنا دو۔"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق "خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں آٹھ وصفوں کو بیان کیا ہے جو مومنین میں ہونے چاہئیں یا آٹھ قسم کے درجوں کو بیان کیا ہے جن میں سے ہر درجہ پچھلے سے اعلیٰ و اکمل ہے اور یہی اس جماعت کا دستور العمل ہوگا ــــ حاصل سخن یہ کہ "حافظین لحدود اللہ" کا مقام" جماعت حزب اللہ" کا مرتبۂ آخری ہے اور ان مراتب ثمانیہ کے طے کرنے کے بعد اس جماعت کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے سورۃ فاطر (نمبر ۳۵) کی آیت نمبر ۳۲ (ثم اورثنا الکتاب...) کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے یہ نکتہ نکالا کہ:

اس آیۂ کریمہ میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ وہ جو اپنے نفوس پر ظلم کر رہے ہیں۔
۲۔ درمیانی طبقہ جو غفلت سے متنبہ ہوا، اعمال حسنہ اختیار کیے، اوامر الٰہیہ کے آگے سرِ اطاعت خم کیا
۳۔ اعلیٰ ترین طبقہ جو نہ صرف خیرات و محاسن کا انجام دینے والا بلکہ ان میں اوروں سے پیش رو بھی ہے

.... پس اس تقسیم قرآنی کی بنا پر اس جماعت کے بھی تین درجے قرار پاتے ہیں۔

۱۔ ہر مسلمان جو راست باری کا متلاشی، اصلاحِ حال کا متمنی اور اسلام کے اس دورِ غربت میں خدمت و جہاد فی سبیل اللہ کی اپنے دل میں سوزش و تپش رکھتا ہے۔ نیت صالح، ارادہ محکم اور اقرارِ واثق کے ساتھ دینِ الٰہی کے اس میثاق کو دہرائے: میری عبادت میری قربانی میرا جینا میرا مرنا غرض یہ کہ ہر چیز صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس قربانی کا مجھے حکم دیا گیا اور میں مسلمانوں میں پہلا "مسلم" ہوں اور اپنی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ خدا کی قربانی کے لیے تیار ہو کر اقرار کرے کہ وہ اللہ کے رشتے میں منسلک ہونا اور اس کی جماعت کے فرائض ادا کرنا چاہتا ہے۔ پس وہ طبقہ "ظالم لنفسہ" میں سے طبقہ "مقتصد" کے لیے منتخب ہو جائے گا اور اس کے بعد اس کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور یہ آزمائش اس وقت تک جاری رہے گی جس وقت تک کہ وہ دوسرے درجے میں شامل ہونے کا اہل ثابت نہ ہو۔

۲۔ (پہلی جماعت سے)، . . . ایک دوسری جماعت چھانٹی جائے گی اور اس میں شامل ہونا گویا اربابِ اقتصاد کے طبقے میں شامل ہونا ہوگا . . .

۳۔ اس دوسری جماعت میں سے جو فرزندانِ حق اپنے اعمال و افعال سے درجۂ مسابقت و مرتبۂ علو و رفعت حاصل کریں گے ان ہی سے یہ آخری جماعت منتخب ہوگی اور یہی جماعت "حزب اللہ" کا خلاصۂ مساعی و جہد اور اس کی اصل حکمراں جماعت ہوگی۔ یہ لوگ "سابق بالخیرات" اور "حافظین لحدود اللہ" ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان سے جو کام لینا چاہے گا خود لے لیگا، اور جس مقصد کی طرف انھیں کھینچے گا وہ اس طرف کھنچ جائیں گے۔ ان کے مقصد آخری کو نہ اس وقت بتلایا جا سکتا ہے اور نہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ جو سالک کہ ابتدائی دو جماعتوں سے ترقی کر کے اس درجے تک پہنچے گا وہ خود وہاں کے اسرار و رموز سے آشنا ہو جائے گا۔ اس سے پہلے وہاں کے حالات کسی پر منکشف نہ ہو سکیں گے کسی عضو جماعت کے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کے انکشاف کے درپے ہو اور وقت سے پہلے انھیں معلوم کرنا چاہے"[۱۱]

حزب اللہ کے ممبروں اور پارٹی کی مالی مدد کرنے والوں کی تفصیلات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ نہ ہی مولانا آزاد نے اس معاملے پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس وقت کی بنگالی خفیہ پولیس کے کاغذات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حزب اللہ کے قیام کے سلسلے میں کلکتہ میں بسے ہوئے غیر بنگالی مسلمان تاجر، دوکاندار اور ٹھیکیدار مولانا کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ پارٹی کے کارکن مبلغین کی شکل میں مختلف علاقوں میں کام کر سکیں۔[۱۲]

حزب اللہ کے دروازے مولانا آزاد کے بقول مرد اور عورتوں دونوں پر کھلے ہوئے تھے۔ ایک خاتون مراسلہ نگار کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے الہلال کے مختلف شماروں میں یہ بات مختلف انداز سے کہی ہے کہ ہر شخص کا دائرۂ کار ایک ہی نہیں ہوتا ہے۔ عورتیں بھی اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے مردوں ہی کی طرح حزب اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص دربدر مارا مارا پھرے"[۱۳]

بہرحال ۱۹۱۴ء میں الہلال بند ہو گیا۔ اور مولانا آزاد کی زندگی میں بھی قید و بند کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ اس طرح "حزب اللہ" کھلنے سے پہلے مرجھا کر رہ گئی۔ بایں ہمہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مولانا آزاد نے تحریک حزب اللہ کو بالکلیہ تہہ کر کے رکھ دیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ الہلال کے بند ہو جانے کے بعد بھی خاصے دنوں تک وہ "زیرِ زمین" انقلابی طرزِ فکر کو اپنائے رہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر کھل کر کبھی بھی کچھ نہیں لکھا، نہ ہی ان کے زمانے میں اس موضوع پر ان کے پیروؤں نے کچھ لکھا، اس خاموشی کی وجہ سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے ابھی دکھلایا ہے، مولانا نے پہلے دن سے اخفا داری پر بہت زیادہ زور دیا تھا، اس لیے اب اگر اس جماعت کے بارے میں ہمیں کچھ مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں تو وہ یا تو خفیہ پولیس کی فائلوں سے مل سکتی ہیں۔ یا پھر ان لوگوں کے ذریعے جو اس جماعت سے باقاعدہ طور پر منسلک رہ چکے ہوں۔ اول الذکر ذریعے پر اگرچہ ہم بہت زیادہ بھروسا نہیں کر سکتے لیکن اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ آگ کے بغیر دھوئیں کا وجود ممکن نہیں ہے۔

پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں تاریخ کے استاد پروفیسر رجت رے نے اپنے ایک مضمون[۱۴] میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ۱۹۰۵ سے ۱۹۲۵ء تک کی خفیہ زیرِ زمین انقلابی کارروائیوں پر بنگال خفیہ پولیس کے کاغذات کی مدد سے کچھ روشنی ڈالی ہے، جس سے ہمیں حزب اللہ کے بارے میں اس وقت کی بنگال گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ ان رپورٹوں کی رو سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکومت کی نظروں میں حزب اللہ ایک خفیہ انقلابی بلکہ کسی حد تک دہشت پھیلانے والی تحریک تھی بلکہ اس وقت تک کی ہندو بنگالی زیرِ زمین انقلابی جماعتیں بھی اسی نظر سے اسے دیکھتی تھیں۔ اور اس کی طرف سے اس اندیشے سے چوکنی رہتی تھیں کہ کہیں یہ جماعت ترکی اور افغانستان کے حکمرانوں کی مدد سے انگریزوں کو نکال کر اس ملک میں پھر سے مسلم حکومت نہ قائم کر دے۔

اگرچہ بنگال خفیہ پولیس مولانا کو کسی دہشت گردی کے معاملے میں براہِ راست ملوث نہیں کر پائی لیکن ایک دو واقعات میں اسے شبہ تھا کہ مولانا بلاواسطہ تو نہیں لیکن بالواسطہ ضرور شریک ہیں۔ ہندو بنگالیوں

کی دہشت پسند زمین دوز جماعت جوگانتر پارٹی کے دو کارکن سنتوش مترا اور بپن گنگولی پولیس کی رپورٹ کے مطابق مولانا کی جماعت کے بھی ممبر تھے۔[۱۴] اسی طرح مولانا کے ایک پرانے خلافتی رفیق کار قطب الدین احمد نے جو الہلال کے منیجر بھی رہ چکے تھے، ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے باورچیوں اور بٹلروں پر مشتمل ایک "انجمن خانساماں" بنائی تھی۔ پہلے تو انھوں نے اس انجمن کے ذریعے انگریزوں کے گھریلو ملازمین میں اسٹرائک کرانے کی کوشش کی لیکن اس میں انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ دوبارہ انھوں نے ایک ہندو انقلابی کی مدد سے انگریزوں کے کلب اور ہوٹلوں میں انقلابی دہشت پسندوں کو خاموشی سے پہنچانے کی کوشش کی تاکہ وہ موقع پاکر انگریز افسروں کو قتل کردیں۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ خفیہ پولیس کا خیال تھا کہ اس پلاٹ میں کہیں نہ کہیں مولانا آزاد کا ہاتھ ضرور ہے لیکن وہ اپنے اس شبہ کو یقین میں نہ بدل سکی۔[۱۵]

حزب اللہ کے بارے میں مزید معلومات کا دوسرا ذریعہ خود اس جماعت کے ممبران ہیں لیکن ایسے لوگ ملیں کہاں، یہ اپنی جگہ خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہاں اگر ہم ان ذرائع پر بھروسہ کرنے کو تیار ہوں جو کہ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد منصۂ شہود پر آئے ہیں تو پھر کسی نہ کسی حد تک حزب اللہ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم مولانا کے دو "مریدین" عبدالرزاق ملیح آبادی (ہندوستان: انتقال ۲۴ر جون ۱۹۵۹ء) اور غلام رسول مہر (پاکستان: انتقال ۲۱ر نومبر ۱۹۷۱ء) کی تحریروں کو مشعل راہ بنائیں تو بہت حد تک حزب اللہ کے مقاصد اور طریق کار پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

(۲)

ملیح آبادی نے ۱۹۱۹ء میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی تھی اور مولانا آزاد نے انھیں صوبہ یو۔پی کے لیے اپنا خلیفۂ مجاز بھی نامزد کیا تھا تاکہ وہ اس صوبے کے لوگوں سے ان کے نام پر بیعت لے سکیں۔ اس سلسلے میں مولانا ملیح آبادی کو تحریری طور سے جو "خلافت نامہ" مولانا آزاد نے دیا تھا وہ حسب ذیل ہے:

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

[فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ
۴ شعبان ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء)]

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے الفاظ میں

"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ فرض دینی سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہوسکتی ہے اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتادیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کرکے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کردے۔ اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دی جائے۔ مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا، ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات زمانہ سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے۔ اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ انہی کو یہ منصب ملنا چاہیے۔"[۱۶]

اگر ہم ملیح آبادی کے الفاظ کو مولانا آزاد کے خیالات کی صدائے بازگشت تسلیم کریں تو پھر ا[...]
کے کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوسکتی کہ حزب [...]
طور سے ایک سیاسی جماعت تھی جس کا مقصد [...]
وطن تھا چوں کہ مولانا آزاد کو یہ اطمینان نہیں تھ[ا ...]
سیاسی مقاصد کے لیے مسلمان ان کے پیچھے چلی[ں ...]
گے اس لیے انھوں نے مذہب کا سہارا ضروری [...]
اور تحریک کو اس انداز سے لوگوں کے سامنے پی[ش ...]
بظاہر مذہبی تحریک نظر آئے۔

مولانا آزاد کے دوسرے مرید غلام [...]
نے بھی مولانا کے انتقال کے بعد ان کا حسب ذ[...]
کیا ہے جو خاص طور سے پنجاب میں مولانا کے م[...]
کے نام ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا تھا:

جن عزیزوں نے گذشتہ سال یا امسا[ل ...]
سے پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان سب [...]
کے لیے میں یہ سطریں شائع کرتا ہوں۔ انھوں [...]
ہاتھ پر پانچ باتوں کا عہد کیا ہے:

اوّل۔۔۔ امر بالمعروف (نہی) ع[...]
اور تواصیہ صبر کا یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم [...]
برائی کو روکیں گے، صبر کی وصیت کر[...]

ثانیاً۔۔۔ الحب فی اللہ و[...]
اللہ کا یعنی اس دنیا میں ان کی دوستی [...]
اللہ کے لیے اور دشمنی ہوگی تو اللہ [...]

ثالثاً۔۔۔ لا یخافون فی ا[...]
لائم کا یعنی سچائی کے راستے میں وہ کسی [...]
نہیں کریں گے اور خدا کے سوا کسی [...]
نہیں ڈریں گے۔

رابعاً۔۔۔ اس بات کا [...]
اس کی شریعت کو دنیا کے سامنے تمام [...]
نعمتوں اور ساری لذتوں سے زیاد[ہ ...]
رکھیں گے۔

خامساً۔۔۔ اطاعت فی المعروف کا یعنی شریعت کے ہر حکم کی اطاعت بجا لائیں گے جو ان تک پہنچایا جائے گا۔

میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ ان کا قول تھا اور اب چاہیے کہ اپنے عمل سے بھی اس کی پوری تصدیق کریں اور کامل انقطاع اور راست بازی کے ساتھ اپنے تئیں اللہ کے سپرد کر دیں۔ یہ ان کا عہد مطالبہ کرتا ہے کہ حسب ذیل باتیں ان کی روزانہ زندگی میں نمایاں ہو جائیں اور ہر شخص ان کو ان کی خصلتوں اور طریقوں کی وجہ سے ممتاز دیکھ لے۔

۱۔ ولایتی کپڑوں کا خریدنا، بیچنا، پہننا پہنانا یک قلم ترک کر دیں اور دیسی کھدر کا لباس اختیار کر لیں۔

۲۔ اسلامی خلافت اور بلاد اسلامیہ کی حفاظت ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے۔ پس جہاں تک ان کے امکان میں ہو اپنے دل سے اپنی زبان سے، اپنے مال سے اپنے عمل سے اس کام میں مدد دیں۔

۳۔ کسی مسلمان کی طرف سے اپنے دل میں کینہ و عداوت نہ رکھیں۔ اگرچہ وہ ان کا کیسا ہی دشمن ہو۔ تمام مسلمانوں سے صلح و محبت کا برتاؤ کریں اور اپنی جانب سے کسی مسلمان کے خلاف قدم نہ اٹھائیں، دوسرا اٹھائے تو جہاں تک بھی ان کے امکان میں ہو بخش دیں۔ کسی طرح بھی اپنے وجود کو تفریق جماعت کا سبب نہ بنائیں۔

۴۔ احکام و مصالح شرعیہ کے مطابق ہندوؤں سے ہمارا اتحاد ہے۔ پس کامل اتفاق اور سازگاری کے ساتھ رہیں اور ان کی جانب سے اپنے دل میں کسی طرح کا کھوٹ نہ رکھیں اور کوئی بات لڑائی جھگڑے کی ایسی نہ کریں کہ جس سے اتحاد کو نقصان پہنچے۔ تمام احکام و ارکان اسلام کی پابندی اور ٹھیک ٹھیک بجا آوری ان چار باتوں کے علاوہ ہے اور ان سے مقدم ہے اور ان کی بابت وہ بیعت کرتے ہوئے سب سے پہلے عہد کر چکے ہیں۔

جو مسلمان مجھ سے اپنی بیعت کا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ ان باتوں پر کاربند ہو۔ جس نے اس پر عمل نہ کیا اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔۔۔۔

ابوالکلام احمد[18]

مذکورہ بالا خط سے بھی بہت حد تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی "مذہبی" جماعت 'حزب اللہ' کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو استخلاص وطن کی خاطر انگریزوں کے خلاف متحد اور مجتمع کرنا تھا۔ ان دونوں خطوط کے علاوہ مولانا آزاد کی دوسری تحریروں سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اور خاص طور سے علماء کو مذہب کے نام پر اس لیے اکٹھا کرنا چاہتے تھے کہ ان کے ذریعے سیاسی محاذ پر مجاہدین وطن کے ہاتھوں کو مضبوط کر سکیں۔

۱۹۲۵ء کے لگ بھگ مولانا آزاد کے ایک پنجابی مرید، محی الدین قصوری نے انھیں ایک خط لکھا تھا جس میں مولانا کے کانگریس دوست رویے کی شکایت کی گئی تھی اور ان پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ وہ "التزام جماعت" کا خیال نہیں رکھتے حالاں کہ آنحضرت صلعم نے سواد اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید کی تھی۔ مولانا آزاد نے اس سلسلے میں قصوری کو جو خط لکھا اس میں انھوں نے اس پر زور دیا کہ لوگوں نے "التزام جماعت" کا مطلب صحیح نہیں سمجھا ہے۔ مولانا کے خیال میں التزام جماعت کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ آنکھ بند کر کے
کی پیروی کی جائے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے
یہ سوال اٹھایا کہ دیکھا جائے تو ہزاروں لاکھوں
میں کہیں ایک دو مسلمان ایسے نکلیں گے جنھیں صحیح
میں مسلمان کہا جا سکتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہو
چند گنتی کے "صحیح" مسلمانوں کو چھوڑ کر اکثر
پیروی کی جائے؟ اس منطقی استدلال کو مولانا آ
اپنے زمانے کی سیاسی صورت حال پر منطبق کر
لکھا "یہ ظاہر ہے کہ قوم پر سیاسی محرومی کی حال
طاری ہوتی ہے جب سواد اعظم عزم و عمل سے مح
جاتا ہے اور محکومیت کی روٹی پر قناعت کر لی
اب اگر کوئی مرد کار سعی و عزم کی دعوت دے گا
اس کی راہ سواد اعظم کی راہ نہ ہوگی، فرد واحد کی
یا ایک قلیل ترین طائفے کی۔ پھر کیا اس کے خلا
یہ فتویٰ صادر کرنا پڑے گا کہ سواد اعظم سے باہ
التزام جماعت کی پیروی نہ کی[19]؟ اس طرح اپنے
کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ان پ
سے الگ رہنے کا الزام لگایا جاتا ہے حالانکہ و
اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس صحیح
کو پیدا کر سکیں جس کے بارے میں آنحضرتؐ
ہے کہ جس نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی
اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنایا۔ ان کے خیال میں عوام
اکثر و بیشتر علما نے بھی "سواد اعظم" اور "
جماعت" کے مفہوم کو صحیح طور سے نہ سمجھا تھا
سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ "۱۹۱۴ء میں جب
ہندوستان کے بعض اکابر علما و مشائخ کو ع
کی دعوت دی، بعض سے خود ملا اور بعض کے
مولوی عبید اللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہ یہ
کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں یعنی علماء و مشائخ
بڑی تعداد ملک میں موجود ہے کسی نے بھی آ

دعوت نہیں دی' اب سواد اعظم کے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا جارہا ہے؟[۲۱]

اس وقت کی ملکی سیاست سے علما جو اپنا دامن بچارہے تھے اس کی ایک بڑی وجہ مولانا آزاد کے خیال میں منافقانہ ذہنیت تھی۔ ترجمان القرآن میں سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۴۸ کی تفسیر میں انھوں نے لکھا ہے:

"غور کروگے تو نفاق کی یہ خصلت آج بڑے بڑے مدعیان علم و مشیخت میں بولتی نظر آئے گی۔ جھوٹی دینداری اور وہمی پرہیزگاری نے سعی و عزم کی تمام راہیں ان پر بند کردی ہیں اور وہ ساعی ہیں کہ امت پر بھی بند کردیں۔ ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علما و مشائخ کو عزائم و مقاصد وقت پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے ——— یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی جو اب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے۔

تم نے بعض علما کے فتوے پڑھے ہوں گے کہ مسلمانوں کو وقت کی سیاسی مجالس میں شریک نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں غیر مسلم عورتیں کھلے منہ موجود ہوتی ہیں اور اس لیے ان کی شرکت فتنہ سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان کی شرکت سے نماز باجماعت فوت ہوجاتی ہے اور یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ یاد رکھو کہ یہ تقویٰ اور دینداری نہیں ہے جو ان کاموں کی مخالفت پر انھیں ابھارتی ہے یہ مرض نفاق کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور قرآن کی شہادت اس کے لیے بس کرتی ہے۔"[۲۲]

مولانا آزاد کے مذکورہ بالا بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علما کو ان کی مرضی کے خلاف سیاست کے میدان کارزار میں نہ صرف گھسیٹنا چاہتے تھے، بلکہ ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ آگے بڑھ کر رہنمائی کا بھی فریضہ انجام دیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہ تھی اور اگر اسلام کے ماننے والے خاص طور سے ان کے مذہبی قائدین 'سیاست کے میدان میں رہنمائی کا کام انجام نہ دے سکیں تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بستر نزع پر سورۂ یٰسین کو دہرا دینے ہی کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے۔"[۲۳]

خواہش اپنی جگہ، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اپنی جگہ پورا یقین تھا کہ علما سیاست میں حصہ لینے سے پہلوتہی کررہے ہیں اس لیے حیرت کی بات نہ ہوگی اگر یہ خیال کیا جائے کہ حالات کے پیش نظر مولانا آزاد نے طے کرلیا کہ ہوسکے تو خود ہی قیادت کا بوجھ سنبھال لیں۔ وہ حزب اللہ کی تحریک چلا ہی چکے تھے اور اس تحریک میں انھوں نے جس طرح کی بے چون و چرا قسم کی پیروی پر زور دیا تھا اس قسم کی قیادت مذہبی اصطلاح میں صرف "امامت" کی شکل میں مل سکتی تھی۔ چونکہ اس وقت مولانا آزاد ایک عالم اور ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں میں پوری طرح متعارف ہوچکے تھے اس لیے ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہوتی کہ وہ خود ہی اپنے دوش ناتواں پر امامت کا بار اٹھانے کے لیے تیار ہوگئے ہوں۔

(۳)

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی پسماندگی کا ایک بڑا سبب "امام" کی غیر موجودگی ہے ان کی رائے میں کسی امام کے بغیر جماعتی زندگی گذارنا پوری امت مسلمہ کے لیے گناہ کا حکم رکھتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک کوئی باقاعدہ امام نہ ہوگا اس وقت تک مسلمان شریعت کے مطابق جماعتی زندگی گذارنے پر قادر نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات کو مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ کوئی جماعت انفرادی غلطیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے یک دم تباہ نہیں ہوتی۔ انفرادی گناہ ایک ایسے سست رفتار زہر کی طرح ہے جو دھیرے دھیرے گھن کی طرح قومی زندگی کو کھوکھلا کرتا ہے۔ لیکن اجتماعی غلطیاں راتوں رات کسی بھی قوم کو تباہ کرسکتی ہیں اور کسی امام کا نہ ہونا ایک اجتماعی غلطی ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ انفرادی اصلاح بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ حکومت کا کوئی صحیح اور صالح نظام نہ قائم ہوجائے۔[۲۴]

مولانا آزاد کے خیال میں پوری قوم کا یہ اجتماعی فرض تھا کہ وہ کسی ایک شخص کو اپنا امام منتخب کرے اور انتخاب کے بعد اس کے ہر حکم کی بے چون و چرا پیروی کرے بشرطیکہ اس سے شریعت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ اس طرح جب کوئی ایسا امام سامنے آجائے گا تو وہی مسلمانوں کی ملکی اور غیر ملکی سیاست میں رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا۔ صرف اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اختلافی مواقع پر فتویٰ جاری کرے نہ تو ہر عالم اس اہم فریضے کو ادا کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ ہی ہر مدرسے کا استاد اس حیثیت کا ہوتا ہے کہ وہ امام کے منصب کو پوری طرح ادا کرسکے۔[۲۵]

اگر ہم خاص طور سے اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوجائے گا کہ جب تک ہندوستان کے علما کا کسی ایک شخصیت پر اتفاق نہ ہوجاتا اس وقت تک کسی شخص کا امام منتخب ہونا آسان نہ تھا۔ مولانا آزاد بھی اس سے واقف تھے اس لیے ہمیں حیرت نہ ہونی چاہیے اگر وہ یہ سوچتے رہے ہوں کہ اس زمانے کے اہم علما انھیں بحیثیت امام منتخب کرلیں۔ اس زمانے کے مشہور علما میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا محمد عبدالباری لکھنوی کی شخصیتیں کافی اہم تھیں

کہ ان کی رائے کے بغیر امامت سے متعلق کوئی اجتماعی فیصلہ آسان نہ تھا۔ اگرچہ خود مولانا آزاد نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ انھوں نے کسی متعین عالم سے اپنی امامت کے سوال پر کوئی گفتگو کی ہو لیکن ان کے سوانح نگار ملیح آبادی کا بیان ہے کہ انھیں مولانا آزاد نے حکم دیا تھا کہ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا محمد عبدالباری سے ان کی امامت کے سلسلے میں گفتگو کریں۔

ملیح آبادی کا بیان ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں شیخ الہند مالٹا سے واپس آکر کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ کے دورے پر گئے تو انھوں نے ان سے تنہائی میں ملاقات کی اور مولانا آزاد کی امامت کے موضوع پر گفتگو کی۔ پہلے تو مولانا ملیح آبادی نے امامت کا منصب خود شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا لیکن جب وہ اس پر راضی نہ ہوئے تو انھوں نے مولانا آزاد کا نام تجویز کیا۔ اس پر بقول ملیح آبادی شیخ نے متانت سے فرمایا: "میرا انتخاب بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کے سوا کوئی شخص امام الہند نہیں ہو سکتا ان میں وہ سب اوصاف جمع ہیں جو اس زمانے میں ہندوستان کے امام میں ہونا ضروری ہیں"۔

شیخ الہند کے بعد دوسرا مرحلہ مولانا عبدالباری کی اجازت کا تھا، اور یہ مسئلہ کچھ آسان نہ تھا۔ مولانا عبدالباری علی برادران کا بہت خیال رکھتے تھے اور اس وقت کی ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد اور علی برادران کی سیاسی چشمک کا حال کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس لیے اس کا خدشہ تھا کہ مولانا عبدالباری "امامت" کی تجویز سے متفق نہ ہوں۔ لیکن شیخ الہند کی رائے سن کر وہ بھی راضی ہو گئے اور ملیح آبادی کی فرمائش پر اپنی رائے لکھ کر دے دی جو حسب ذیل ہے:

"مسئلۂ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بارہا اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں، باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسر و چشم قبول کرنے کو تیار رہوں۔ خود مجھ سے بارہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا نہ آئندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں، ان کی امامت سے مجھے بھی استنکاف نہیں ہے۔ بسر و چشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں اگر کسی نااہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کر لیں گے تو مجھے وہ سب سے زیادہ اطاعت گذار و فرمانبردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیتا تو میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے۔"[27]

یہ خط جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے۔ اس خط پر مولانا آزاد اپنی امامت کی بنیاد کھڑی نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام یہ خط بھیجا:[28]

"مولوی عبدالباری کا خط دیکھا

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

سر دست اس قصے کو تہہ کیجیے اور کام کیے جائیے پنجاب سندھ و بنگال میں تنظیم قریب قریب مکمل ہے"۔

اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اپنی اس کوشش میں ناکامی کے بعد مولانا آزاد نے اس سلسلے میں کچھ اور کیا یا نہیں۔ بظاہر امامت کا مسئلہ نذر طاق نسیاں ہو کر رہ گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے دو سوانح نگاروں کا یہ بیان ہے کہ ۱۹۲۱ء میں علما نے انھیں باقاعدہ "امام الہند" کی حیثیت سے منتخب کر لیا تھا۔

اے۔ بی۔ راجپوت اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" میں لکھتے ہیں:

"لاہور میں ہزاروں علما کا اجتماع ہوا اور سب نے باتفاق رائے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو ان سے پہلے ہندوستان میں کسی شخص کو نصیب نہیں ہوا تھا" مولانا آزاد اس اعزاز کو قبول نہیں کر رہے تھے لیکن علمائے لکھنؤ اور علمائے دیوبند کے اصرار پر انھیں راضی ہونا ہی پڑا۔"[29]

دوسرے سوانح نگار عبداللہ بٹ نے اپنی مرتب کردہ انگریزی کتاب "ابوالکلام آزاد" میں شامل کیے ہوئے اپنے ایک مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد" میں یہ بیان کیا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے لاہور سشن ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کو باقاعدہ امام الہند منتخب کیا گیا تھا۔[30]

یہ دونوں بیانات غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ مولانا آزاد کو عام طور سے امام الہند کہا جاتا تھا لیکن در حقیقت علما کی اس وقت کی واحد سیاسی جماعت جمعیت علمائے ہند کے دفتری کاغذات سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اس عہدے پر ان کا یا کسی دوسرے شخص کا کبھی بھی انتخاب ہوا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمعیت کے لاہور سشن میں اس قسم کی ایک تجویز پر غور ضرور ہوا تھا کہ کسی ایک عالم کو "امیر الہند" مقرر کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ تاکہ وہ مسئلے کے مالہ و ماعلیہ پر اچھی طرح غور کر کے جمعیت کے آئندہ اجلاس پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔[31] ذیلی کمیٹی نے اپنی رپورٹ اگلے سشن میں پیش ضرور کی لیکن اتفاق سے اس وقت کورم پورا نہ تھا اس لیے رپورٹ پر بحث نہ ہو سکی۔[32] جمعیت علما کے بارہویں اجلاس (۱۹۳۵ء) میں اس مسئلے نے پھر سر ابھارا لیکن اس وقت بھی بعض وجوہ سے اس پر بحث و مباحثہ کو ملتوی کر دیا گیا۔[33] کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے مذکورہ بالا دونوں

سوانح نگاروں کو اس مسئلے میں بایں وجہ اشتباہ پیدا ہو گیا
ہے کہ مولانا آزاد لاہور سیشن کے اس اجلاس کے صدر تھے
جس میں پہلی بار امیر الہند کے تقرر کی تجویز پیش ہوئی تھی۔
ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے راجپوت اور بٹ کو غلط فہمی
ہوئی ہو اور انھوں نے مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا ہو۔
قصہ مختصر، اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ استخلاص
وطن کی خاطر مولانا آزاد کے ذہن میں اپنی امامت کا
خیال شروع ہی سے تھا۔ وہ مذہب کے سہارے
اس سیاسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ امامت
کے منصب میں سیاسی اور مذہبی دونوں ہی قسم کے اقتدار
پوشیدہ تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کسی طور اس منصب کو
حاصل کرلیں تاکہ اہم سیاسی مواقع پر پورے اطمینان
کے ساتھ کسی مرحلے تک پہنچ سکیں۔ وہ یہ سمجھ رہے
تھے کہ امامت کے مسئلے کو چونکہ ایک مذہبی بنیاد حاصل
ہے اس لیے انھیں علما کی مدد بھی حاصل ہو جائے گی۔
لیکن حیرت ہے کہ اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھنے کے
باوجود وہ اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ علما بحیثیت
جماعت کبھی بھی امامت کے مسئلے پر متحد نہیں ہو سکتے تھے
وہ کسی حاکم "یا" اولوالامر" کے آگے تو سر تسلیم خم کر سکتے
ہیں بشرطیکہ وہ شریعت کی پیروی کا اعلان کرتا ہے۔
لیکن خود اپنوں میں سے کسی ایک شخص کو کلی اقتدار سپرد
کر دینے پر کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہی
وجہ ہے کہ جب بھی "امیر الہند" کا مسئلہ جمعیت العلما
کے اجلاس میں پیش ہوا تو اسے یا تو کورم کی کمی کی بنا پر
ملتوی کرنا پڑا یا پھر مزید "غور و خوض" کے لیے اٹھا
رکھا گیا۔

حواشی:

۱۔ مولانا آزاد کی انگریزی سوانح "انڈیا ونس فریڈم" کا اردو ترجمہ "ہماری آزادی" مترجمہ پروفیسر محمد مجیب، ص۔ ۱۵۔

۲۔ الہلال، جلد ۱، نمبر ۲۳۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۱۔

۳۔ الہلال، ۲/۱۶۔ ۲۳ اپریل، ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۷۵۔

۴۔ الہلال، ۲/۱۷۔ ۳۰ اپریل، ۱۹۱۳ء

۵۔ الہلال، ۲/۲۰۔ ۲۱ مئی، ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۲۵۔

۶۔ فارم میں اصل قرآنی آیات چھپی ہوئی ہیں۔ ترجمہ نہیں ہے۔ فارم کا نمونہ چونکہ الہلال کے کسی شمارے میں شائع نہیں ہوا تھا بلکہ اسے علیحدہ سے طبع کرایا تھا اس لیے اب یہ فارم بآسانی دستیاب نہیں ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میکگل یونیورسٹی۔ مانٹریال (کناڈا) کی لائبریری میں الہلال کی جو مکمل فائل موجود ہے اس میں شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء کے ساتھ ایک عدد فارم بھی تجلید میں شامل ہو گیا ہے۔

۷۔ الہلال، ۲/۲۲، ۴ جون، ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۳۷۴۔

۸۔ مثلاً ملاحظہ ہو الہلال، ۲/۲۴، ۲۰ جون ۱۹۱۳ء، ص ۵، نیز ۳/۱، ۲ جولائی، ۱۹۱۳ء۔ صفحات ۴۔۸

۹۔ الہلال ۳/۲۲، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء، صفحہ ۴۱۷۔ ۴۲۰

۱۰۔ الہلال ۳/۲۳، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء، صفحہ ۴۲۰۔

۱۱۔ انٹیلیجنس برانچ فائل (IB) ۱۹۱۷ء بعنوان "کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قائم کردہ جمعیت حزب اللہ سوسائٹی" بحوالہ رجت رے، (تفصیل کے لیے دیکھیے نوٹ نمبر ۱۲) ص۔ ۹۲۔

۱۲۔ مثلاً ملاحظہ ہو الہلال۔ ۲/۱۶ ص۔ ۲۵۵۔ ۲۵۸؛ ۲/۱۷ ص ۲۷۹؛ ۲/۱۹ ص ۳۱۳؛ ۲/۲۰ ص ۳۲۵؛ ۲/۲۱ ص ۳۶۷ بحوالہ:
I. H. Douglas, Abul Kalam Azad: An Intellectul and Religious Biography (Delhi, 1988) P.P. 116-117.

۱۳۔ رجت رے کا مضمون: "Revolutionaries, Pan-Islamists and Bolshevik. Maulana Abul Kalam Azad and the Political underworld in Calcutta, 1905-1925"
مشمولہ مشیر الحسن کی مرتبہ کتاب:
Communal and Pan Islamic Trands in Colonial India (Dalhi 1981)

۱۴۔ بحوالہ رجت رے
"Muhammadan Secret Organization, Calcutta."
(مشیر الحسن کی مذکورہ بالا کتاب، ص ۱۰۳)

۱۵۔ ایضاً۔۔۔ نیز IB. 1921, 1922. Listsof labour unions and Associations in Bengal.
(بحوالہ رجت رے، ص۔ ۱۰۳)، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب "ذکر آزاد" (کلکتہ، ۱۹۶۰، ص ۲۹۸۔ ۳۰۱ نیز ص ۳۱۱) میں قطب الدین احمد کا ذکر الہلال کے مینیجر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اور ان کے کمیونسٹ ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن ان کے دہشت پسند ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر

نہیں کیا ہے۔

۱۶۔ عبدالرزاق ملیح آبادی" ذکرِ آزاد" کلکتہ، ۱۹۶۰، ص ۲۵۔

۱۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۴

۱۸۔ "نقشِ آزاد" مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۵۶ء صفحات ۳۴۳۔ ۳۴۵۔ (اس خط پر مولانا غلام رسول مہر کی طرف سے ص ۳۴۵ پر حسب ذیل نوٹ بھی ہے: "یہ تحریر ۱۹۲۱ء کی ہے، یہ میرے نام نہ تھی اور نہ میرے حوالے ہوئی تھی لیکن اس کا مسودہ حسنِ اتفاق سے مجھے اسی زمانے میں مل گیا تھا اسے بدیں وجہ شائع کیا جاتا ہے کہ مولانا بیعت امامت کے وقت جو عہد لیتے تھے اس کی کیفیت واضح ہو جائے۔ خود میں نے مولانا سے بیعت ۱۹۲۳ء میں کی تھی۔")

۱۹۔ "تبرکاتِ آزاد" مرتبہ غلام رسول مہر، دہلی ۱۹۶۳ء، ص ۳۸۔

۲۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۹۔

۲۱۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو مولانا اشرف علی تھانوی کی اردو کتاب "معاملات المسلمین فی مجادلات غیر المسلمین" سب سے پہلے یہ رسالہ النور، تھانہ بھون (جلد ۱، نمبر ۱۱، ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے مفتی محمد شفیع نے افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (دوسرا ایڈیشن، دیوبند ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۵ء) کے نام سے شائع کیا۔ مولانا آزاد نے جس قسم کے فتووں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے لیے ملاحظہ ہو افادات اشرفیہ کے صفحات ۲۱ یا ۳۴۔

۲۲۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۳۶ء، جلد دوم، صفحات ۹۵۔ ۹۶۔

۲۳۔ الہلال، ۱/۱۳، ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء۔ ص۔ ۶۔

۲۴۔ مولانا آزاد کا خطبۂ صدارت، بنگال خلافت کانفرنس، ۱۹۲۰ء... مشمولہ خطبات آزاد، دہلی ۱۹۵۹ء، ص۔ ۹۹۔ ۱۰۲۔

۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ ملیح آبادی" ذکرِ آزاد"، ص۔ ۳۶۔

۲۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۷

۲۸۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۸

۲۹۔ اے۔ بی۔ راجپوت" مولانا ابوالکلام آزاد" لاہور، ۱۹۴۶۔ ص ۶۹۔

۳۰۔ عبداللہ بٹ (مرتب)" ابوالکلام آزاد" لاہور ۱۹۴۳، ص ۲۱۶۔

۳۱۔ مولانا محمد میاں" جمعیت العلما کیا ہے؟ جمعیت علمائے ہند کی ۲۶ سالہ تجاویز" دہلی، جلد دوم، ص ۴۵۔

۳۲۔ ایضاً۔ ص ۴۷۔

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۲۱۵۔

مولانا آزاد کا تاریخی شعور

(۱)

تاریخی شعور، "وجدانِ وقت" کے سایے میں پرورش پاتا ہے، اسی سے تاریخی ذہن بنتا ہے اور اسی سے تاریخی تصور کی آبیاری ہوتی ہے . . . Siegfried Kracauer نے His-tory and the Concept of Time میں بڑی دیدہ وری سے احساسِ وقت کی اہمیت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے انسانی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور تبدیلی کا جو عمل کائنات ہستی میں ظہور پذیر ہو رہا ہے، اس کا جائزہ صحیح پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا "احساسِ زمان" بے حد نازک لیکن بے پناہ تیز تھا۔ اس نے ماضی کو سمجھنے کی ایسی بصیرت ان کو عطا کی کہ ان کی تصنیف کا ہر صفحہ تاریخ و ادب کا ایک شاہکار بن گیا۔

پنڈت نہرو نے اپنی احمد نگر جیل کی ڈائری میں مولانا کی پابندیِ اوقات کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ جب مولانا اپنے کمرے سے نکل کر کھانے کے کمرے کی طرف ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے چلتے ہیں تو ٹھیک ۳۰ سیکنڈ اس وقت میں باقی ہوتے ہیں جو انھوں نے کھانے کے لیے مقرر کیا ہے ——— وقت کا یہ شدید احساس اور زندگی کو منٹوں اور سیکنڈوں سے ناپنے کا یہ انداز، ان کی شخصیت کو سمجھنے . . . اور ان کے تاریخی شعور کا جائزہ لینے میں چراغ راہ کا کام دیتا ہے۔

وقت کے متعلق مولانا آزاد کے نظریات میں بڑی گہرائی تھی۔ لکھتے ہیں۔

"عرب کے فلسفی ابوالعلاء معری نے زمانے کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا۔ کل جو گزر چکا، آج جو گزر رہا ہے، کل جو آنے والا ہے ——— لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسر ہے، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے یا "مستقبل" کی۔ اور ان ہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں ——— ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل دی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں!"

(غبارِ خاطر۔ ص ۲۴۸)

تسلسل وقت کے اس احساس میں بڑی نفسیاتی حقیقتیں مضمر ہیں۔ اس سے نہ صرف اپنی ہی زندگی کا رُخ متعین ہوتا ہے، بلکہ ماضی کو سمجھنے کے لیے پیمانے بھی سامنے آجاتے ہیں۔ فکر کو ذرا اور وسعت دی جائے تو نسلِ انسانی کی وحدت کے تصور کی جڑیں بھی یہیں ملیں گی۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۵۱ء کو یونیسکو کے ایک جلسے میں، جو دہلی میں منعقد ہوا تھا، انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تاریخ کی غلط تعلیم نے انسان کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہماری موجودہ تاریخی کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ انسان مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ان اقوام کی داستان میں باہمی تصادم پر زور رہتا ہے۔ اور مختلف گروہوں میں نفرت اور منافرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ ناگزیر ہے کہ اس طرح جو تاریخ پڑھائی جائے گی اس سے ذہنی تنگی اور تصادم پیدا ہوگا، مطمحِ نظر محدود ہو جائے گا اور بچے کے ذہن میں علیحدگی کا احساس پرورش پانے لگے گا۔"

اس سلسلے میں اپنے افکار کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ جغرافیائی تصورات جو جغرافیہ کی کتابیں پیدا کرتی ہیں، وہ بھی ذہن میں تنگی اور عصبیت کے جذبے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

مولانا آزاد انسانی حد بندیوں کے قائل نہیں تھے۔ وہ بنی نوعِ انسان کی جہد و سعی، اور عروج و زوال کی داستان کو جغرافیائی، نسلی اور لسانی خانوں میں بٹا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ گاندھی جی کی ان کی نظر میں جو عزت اور بڑائی تھی اس کا حقیقی سبب بھی یہ تھا کہ وہ انسانوں کی وضع کی ہوئی مصنوعی دیواروں کو منہدم کرنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"تاریخِ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ جیسے جغرافیائی حد بندی ——— قومی حد بندی ——— لسانی حد بندی ——— یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرے میں رہتی ہیں تو ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں ——— تو وہی مقاصد

خلیق احمد نظامی
نظامی ولا، سر سید روڈ۔ علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱

جو ان کے سہارے چمکتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔
—— مہاتما گاندھی کی ہستی تاریخ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے۔"

تاریخ عالم کا ایک ایسا تسلسل جس میں نہ نسلی امتیازات حائل ہوں، نہ جغرافیائی حدود کو دخل ہو، مولانا کے تاریخی شعور کا بنیادی پہلو تھا۔ مذہب میں اس نظریہ کی کارفرمائی دیکھنی ہو تو ترجمان القرآن میں دیکھی جا سکتی ہے، ثقافتی اور ادبی زندگی پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا ہو تو ان کی تقریر و تحریر کے ہزار ہا صفحات اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے نظر آئیں گے۔

(۲)

مولانا آزاد کے تاریخی شعور نے خود ان کی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ ساز دور کے تاریخی عمل میں شریک محسوس کرنے لگے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں عدالت کے کٹہرے میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

"تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں —— ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کی طرح کھڑے کیے گئے، ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلارنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے۔" (قول فیصل، ص۔ ۳۴)

پھر جب بغاوت کا الزام تسلیم کرتے ہیں تو حریت اور آزادی کی تاریخ نظروں میں اس طرح پھر جاتی ہے:

"مجھ پر سڈیشن کا الزام عاید کیا گیا ہے، لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویرا اور گریفتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کون سا لقب تجویز کرتی ہے؟ اسی آئرلینڈ کے پارنل نے ایک مرتبہ کہا تھا، ہمارا کام ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔"

(قول فیصل، ص ۷۷)

... سر ہنری ایلیٹ نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی تاریخ (جو آپ ELLIOT & DOWSON's. HISTORY OF INDIA, 8 VOLS. کے نام سے مشہور ہے) ترتیب دینی شروع کی۔ اس کا مقصد جس کو اس نے با صراحت ایک عرضداشت میں حکومت برطانیہ کے حکام اعلیٰ کو بیان کیا ہے یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور شکوک پیدا کرنے کے لیے ان کی تاریخ کو استعمال کرنا چاہیے...

ان الفاظ کے پیچھے ایک تاریخی ذہن کام کر رہا تھا جو بالآخر پکار اٹھا۔

"مسٹر مجسٹریٹ —— ! یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرتناک باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں... آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔"

(قول فیصل، ص۔ ۸۰)

پھر جب علماء کو میدانِ عمل میں داخل ہونے کی دعوت دی، تو تاریخ عزیمت کا ایک باب ان کے سامنے پڑھ دیا اور کہا:

"آپ حضرت سعید بن المسیب کو دیکھتے کہ حکام کے جور کے حکم سے ان کی پیٹھ پر دُرّے لگائے جا رہے ہیں مگر ان کی زبان صدق بیان اعلانِ حق میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئی ہے —— آپ مدینے کی گلیوں میں حضرت مالک بن انس کو دیکھتے، ان کی مشکیں اس زور سے کس دی گئی ہیں کہ دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں اور اوپر سے پیہم تازیانے کی ضربیں پڑ رہی ہیں —— آپ امام احمد بن حنبل کو دیکھتے —— کہ نو جلاد یکے بعد دیگرے تازیانے لگا رہے ہیں، پیٹھ زخموں سے چور چور ہو گئی ہے۔ تمام جسم خون سے رنگین ہو چکا ہے ——"

(خطبۂ صدارت لاہور، ص ۴۲، ۴۰)

لیکن تاریخی ذہن رکنے کا نام نہیں لیتا اور وہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ سب کے مصائب کی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ —— اس تاریخی شعور نے ان میں عزیمت اور قربانی کی ایسی تڑپ پیدا کی تھی کہ ان کے روز و شب دار و رسن کی تمنا میں گذرنے لگے تھے۔

تاریخی احساس و شعور کی اس کیفیت نے آگے چل کر ایک اور رنگ اختیار کر لیا۔ ان کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے عہد کے ساتھ ذہنی جذباتی کسی طرح کی مناسبت یا ہم آہنگی نہیں رکھتے۔ ایک انگریز شاعر نے اجنبیت کی اس کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

Wandering between two worlds, One dead the other powerless to be born.

وہ ہر طرف دیکھتے تھے، اور اپنے آپ کو ایک اجنبی

پاتے تھے۔ اس احساس اجنبیت کی جڑیں ان کے تاریخی شعور میں دور تک چلی گئی تھیں۔ لکھتے ہیں:

"فکری موثرات کے جتنے بھی احوال وظروف Environments ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک ایک کو سامنے لاتا ہوں اور ان میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں، مگر مجھے اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا۔"
(غبار خاطر، ص ۹۵)

یہ کیفیت بہت پہلے ان میں پیدا ہو گئی تھی۔ مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب میں لکھتے ہیں:

"افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ساہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔"

وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ بالآخر اس کی شدت نے ان کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ وہ اپنی ذات کو ایک Anachronism۔ غلط اندیشی وقت کا نمونہ سمجھنے لگے، ایک ثمر پیش رس کی طرح، جو وقت سے پہلے نمودار ہو گیا ہو:

"یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے موسم کے دماغ بھی اگا کرتے ہیں ۔۔۔۔ اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے ۔۔۔۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ نا وقت کے پھلوں کی طرح نا وقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشو و نما کے کاروبار کا نقص کہیے، یا زمانے کی غلط اندیشی وقت (anachronism)، لیکن بہر حال ایسا ہوتا ضرور ہے ۔۔۔۔ میرا اور زمانے کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا۔"
(غبار خاطر، ص۔ ۹۱)

ان کے تاریخی شعور نے ان پر یہ کیفیت طاری کر دی تھی کہ وہ بار بار کہتے تھے کہ میں اس محل کا آدمی نہ تھا، لیکن اس دور کے سپرد کر دیا گیا۔ اس جملے کے پیچھے جو فکر کار فرما ہے وہ تاریخی احساس اور اپنے کمالات کے سامنے شرمندگی سے پیدا ہوئی تھی۔

(۳)

مولانا کے نزدیک تاریخ واقعات کی کھتونی تھی۔ وہ اس میں فکر انسانی کے ارتقاء کی داستان اور تہذیب انسانی کے نشو و نما کے نقوش تلاش کرتے تھے، اور اس کے تسلسل کو با معنی سمجھتے تھے۔ جب کسی رسم یا رجحان کا تجزیہ کرتے تو تاریخی تسلسل کی کڑیاں ان کے ذہن میں ابھرنے لگتی تھیں۔ غبار خاطر میں لکھتے ہیں:

"انسان اپنی ساری باتوں میں حالات کی مخلوق اور گردوپیش کے موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ موثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں اور تہ میں اتر کر انہیں ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ تاہم سراغ ہر حال میں مل جاتا ہے۔ نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت ان موثرات کے عنصری سرچشمے ہیں۔" (غبار خاطر، ص۔ ۹۳)

مولانا کو قدیم تہذیبوں کے مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے امتیازی کارناموں پر غور کرتے تھے۔ اور ترقی اور تنزل دونوں کے اسباب پر ان کی نظر رہتی تھی۔ سنا ہے کہ عصر حاضر کا سب سے ممتاز اور دیدہ ور مورخ پروفیسر ٹائن بی (Toynbee) جس کی Study of History (دس جلدوں میں) تہذیب انسانی پر معرکۃ الآرا تصنیف سمجھی جاتی ہے، جب مولانا آزاد سے ملا تو ان کی وسعت معلومات اور قوت اخذ و تجزیہ سے حیرت میں رہ گیا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو مشرق و مغرب میں تصور انسان پر ایک سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے انسان کے ارتقا کی داستان ۶ ہزار سال سے شروع کی اور حیرت ناک تیز نگاہی کے ساتھ مختلف منزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے جس طرح عصر حاضر پر پہنچے، وہ ان کے تاریخی شعور کا اعجاز ہے۔ انگریزی میں اس نوعیت کی کوشش J. F. Gould کے مضمون Man Has Climbed میں ملتی ہے۔

مولانا جب کسی تصور یا اعتقاد کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی تاریخی فکر ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ خدا کی ہستی کا پتہ لگانے کی جستجو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس تصور کی اُمنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حیتوں Hittites۔ اور عیلامیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے، تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گذری ہوئی قوموں سے انہیں ورثے میں ملے تھے۔" (غبار خاطر۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶)

ایک جگہ گولہ بارود اور Greek Fire کا ذکر آگیا تو لکھتے ہیں:

"آتش نشانی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں، ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی، جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی، دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیڑیوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی تھی —— منجنیق کا لفظ اسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا Mechanic، فرانسیسی کا Mecham- اور جرمن کا Mechanismus نکلا ہے۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا، لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ اُسے عربی میں "مدفع" کہتے تھے۔ یعنی کہ پھینکنے والا آلہ۔ یہی "مدفع" بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا" (غبارِ خاطر۔ ص۔ ۱۵۰)

ایک موقع پر Ego کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے ابتدائی سطور میں "ایغو" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی ایرانی Ego کی تعریب ہے جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی سے اختیار کر لی تھی اور پھر فارابی اور ابن رشد وغیرہ برابر استعمال کرتے رہے" (غبارِ خاطر۔ ۱۸۸۔ ۱۸۷)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کا خزانہ ایک تاریخی چوکٹے میں سجا ہوا حاضر رہتا ہے، اور جب چاہتے ہیں اس پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔

چائے کا ذکر نکل آتا ہے تو پندرہ سو برس کی چینی روایت سے داستان شروع کرتے ہیں، اور فرانس، انگلستان، ہندوستان، سیلون سب ملکوں میں اس کے رواج کی تاریخ بیان کر دیتے ہیں۔ (غبارِ خاطر ۱۵۳۔ ۱۶۴)

ساہتیہ اکادمی کا افتتاح کرتے ہیں تو لفظ "اکاڈمی" کی تعریف بیان کر جاتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ Plato کے اسکول کو اس نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہ ایک قدیم یونانی ہیرو Akade- mus کے نام پر تھا۔ پھر کہتے ہیں کہ یونان میں تقریباً ۹۰۰ سال تک ان اکاڈمیوں کی بہار رہی، پھر Justinian نے ان کا خاتمہ کیا۔ مشاہیر کی یادگار قایم کرنے اور باقی رکھنے کا ذکر آتا ہے تو تاریخی ذہن کتنی تصویریں پیش کر دیتا ہے:

"ہومر نے ایلیڈ لکھی، کالڈیا کے حجری کتب خانے میں وہ اینٹیں رکھی گئیں جن پر ناموران ملت کے مناقب و محامد کندہ تھے۔ عرب جاہلیہ نے اپنے سلسلۂ انساب کا ایک حرف ضائع ہونے نہ دیا اور ذوالمجنہ اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر و معالی کی داستان سرائے قایم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے مینار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم و استوار ہیں اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا۔ اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لیے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد زندہ و قائم رکھی جائے۔" (لمعات صداقت۔ ص۔ ۷)

حج پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن اب سے تیرہ سو برس پہلے جب دنیا موجودہ زمانے کے تمام قرب و اجتماع سے محروم تھی بحر احمر کے کنارے، ریگستان عرب کے وسط میں، حجاز کے چٹیل اور بے زراعت وادی کے اندر ایک صدائے اجتماع بلند ہوئی اور نسل انسانی کے منتشر افراد کا ایک نیا گھرانہ آباد کیا گیا۔ انسانی اجتماع و یگانگت کی یہ پکار صرف اتنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ملکوں کی سرحدیں اور جغرافیہ کی حدیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد نسل انسانی کے بکھرے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا تھا۔" (حقیقۃ الحج۔ ص۔ ۱۰)

تاریخی شعور مولانا آزاد کی ہر تحریر اور تقریر سے ٹپکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی سے ان کے یہاں عالمانہ وقار اور بلندیِ فکر کا ماحول پیدا ہوا ہے۔

(۴)

مولانا آزاد نے خالصتاً تاریخی موضوع کو عنوانِ سخن کم بنایا ہے لیکن ان کی ہر تحریر ان کی تاریخی دیدہ وری اور بصیرت افروز قوتِ تجزیہ کی آئینہ دار ہے تاریخ ان کے لیے کوئی علیحدہ موضوع نہیں تھا، بلکہ ان کی تحریر کی روح اور ان کی فکر کی اساس تھا۔ ترجمان القرآن مولانا کا علمی شاہکار ہے۔ اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذاہب عالم کی تاریخ ان کی نظروں کے سامنے روزِ روشن کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جس تصور کی تحقیق منظور ہوئی، اپنے ذہن کے کسی گوشے کو سامنے لے آتے ہیں۔ عقائد کی تشریح میں انھوں نے اپنے تاریخی شعور سے پورا کام لیا ہے۔ اسی طرح ان کے اکثر مضامین جو اعمال و عقائد سے متعلق الہلال میں چھپے ہیں، ان میں بھی تاریخی شعور کی ایسی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب میں انھوں نے تاریخ اسلام کے بنیادی مسائل پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اختلافات کی نوعیت اور اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ غبارِ خاطر کا وہ خط جس میں صلیبی جنگوں کی سرگزشت اور روایات کے تبادلے پر گفتگو کی ہے۔ ان کی تاریخی بصیرت کا شاہد ہے۔ (ص۔ ۱۳۰)

الہلال کے اثرات کے ایک پہلو کا بہت کم جائزہ لیا گیا ہے، اور وہ ہے تاریخی احساس و شعور کی بیداری میں اس کا حصہ۔ اُس وقت اسلامی ممالک ایک ذہنی بحران اور سیاسی کشمکش کے دور سے گذر رہے تھے۔ اور ہندوستان میں بھی عوام کو ان مسائل کی حقیقی نوعیت کا احساس بہت کم تھا۔ مولانا نے جس طرح ان مسائل کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا اور ان کے تاریخی احساس و شعور کی کارفرمائی۔

الہلال کے ابتدائی پرچوں میں جس طرح طرابلس کا ذکر کیا ہے اور تاریخی احساس و شعور کو آواز دی ہے، اس سے ہندوستان میں ان مسائل کو صحیح پس منظر میں سمجھنے اور استبداد و استعمار کی جنگ کی اصلی نوعیت سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اقبال نے اپنی نظم "حضور رسالت مآبؐ میں" یہ لکھ کر:

" جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

جذبات میں ایک آگ لگادی تھی اور حقیقتاً یہ نظم اس تمام لٹریچر پر بھاری تھی جو اس سلسلے میں ہندوستان میں وجود میں آیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مولانا آزاد کے مضامین ہی تھے جنھوں نے معرکۂ طرابلس کے تاریخی پس منظر کو ذہنوں میں بیدار کیا تھا۔

مولانا سید رشید رضا کے ہندوستانی دورے کی تفصیل لکھتے ہیں، تو تاریخی شعور ذہن میں ایک ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

" سرزمینِ ہند ابتدا سے نوواردوں اور اجنبیوں کی سیر و سیاحت کی جولانگاہ رہی ہے۔ اس کے زرخیز موسموں اور طلائی مندروں نے بڑے بڑے کشورستانوں کو اپنی طرف کھینچا ہے اور ہمیشہ اس کے بحری اور بری دروازوں پر ملک گیر سیاحوں کی تلواریں چمکتی رہی ہیں۔ تاریخ میں ہم نے مقدونیہ کے سکندر اور چین کے سیاحوں کو یہاں دیکھا ہے اور پھر اس کے شمالی دروازوں سے فتحیاب علموں اور نیزوں کی قطاریں صدیوں تک نہیں ٹوٹیں ــــــــ شاید سید محمد رشید رضا پہلا سیاح تھا جو عروج و اقبال کی بہار لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ ادبار و تنزل کی خزاں پر ماتم کرنے کے لیے آیا تھا ــــــــ" (الہلال۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۴ء)

پھر تاریخی ذہن، فکر کے نئے نئے پہلو سامنے لاتا ہے اور وہ کتنے ہی سیاحوں کی روئدادِ سفر بیان کرنے لگتے ہیں۔

۵

مولانا آزاد کے تاریخی شعور کو فلسفے سے اور اُن کے فلسفیانہ افکار کو تاریخی بصیرت سے مدد ملی تھی۔ جب فکر کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے تو بے اختیار تاریخ کی روشنی میں چلنا پڑتا، اور وہ نہایت خود اعتمادی سے اس منزل کو طے کرتے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ایک کتاب پر پیش لفظ لکھتے ہوئے طلسم ہستی کے متعلق یہ شعر نقل کرتے ہیں:

مازآغاز و ز انجامِ جہاں بے خبریم
کاوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتاد است

یعنی اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق اس طرح کھو یا گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی، نہ اسی کا سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جاکر ہوگی اور کیوں کر ہوگی ــــــــ؟ لیکن تاریخی شعور یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور لکھتے ہیں:

" اس وقت سے لے کر جب کہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک جب کہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمہ معمہ ہی رہا ــــــــ انسٹائن (Einstein) نے اپنی ایک کتاب میں سائنس کی جستجوے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی ہے ــــــــ ذی مقراطیس Democritus کے زمانے سے لے کر جس نے چار سو سال قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی آج تک، جب کہ نظریۂ مقادیر عنصری Quantum Theory کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سرِ نو تعاقب کر رہے ہیں ــــــــ اس ڈھائی ہزار سال کی مسافت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سراغ پالیا، جو اثنائے راہ میں نمودار ہوتی رہیں، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔" (غبارِ خاطر۔ ص۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰)

یہاں جس طرح ان کے تاریخی شعور نے تاریخِ عالم کا احاطہ کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس تاریخی شعور نے بہت سے عقائد، رسوم، افکار و امیال کی حقیقت ان پر روشن کر دی تھی۔ عقیدۂ وحدت الوجود پر گفتگو کرتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

" دنیا میں وحدت الوجود Pantheism کے عقیدے کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید Neo - Platonism نے، جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا، اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔" (غبارِ خاطر، ص ۱۴۰)

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :

"ہندوستان کے اوپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر "احدیت" اور "واحدیت" کے مراتب میں دیکھی۔"

(غبار خاطر، ص ۱۲۴)

مولانا نے نشو و ارتقا (Evolution)، تخلیقی اصل (Creative Principle) وغیرہ پر جو گفتگو کی ہے اس میں تاریخی احساس و شعور نے کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کسی ایسے سیاسی یا سماجی نظریے سے بحث کرتے ہیں جس کی جڑیں تاریخ میں ہیں تو ان کا ذہن اس کے تجزیے اور تنقید میں غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کو کلکتہ میں آرٹس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کے ابھرنے کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ ہنر (art) اور دستکاری (craft) کا رشتہ ٹوٹ گیا اور ماہرینِ فنون (artists) نے دستکاروں (Craftsmen) کی طرف محض دستکار (artisans) کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں کانوکیشن ایڈریس دیتے ہوئے انھوں نے یورپین نیشنلزم کی مذمت کی اور کہا کہ دنیا اس محدود نیشنلزم کے تصورات سے پریشان ہو چکی ہے، اور چھوٹی چھوٹی Natio-nalities کی جگہ اب Super nation-alism کی ضرورت ہے۔ مولانا کے ان خیالات کے پیچھے یورپ کی پوری تاریخ بولتی ہے۔

(۶)

تاریخ ہندوستان سے متعلق مولانا آزاد کے خیالات میں بڑی وسعت اور گہرائی تھی۔ وہ تاریخ ہند میں ایک تسلسل کا شدید احساس رکھتے تھے اور واقعات کو اسی تاریخی پس منظر میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ کہتے تھے کہ موہنجوداڑو کی تہذیب کا جنوبی ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کی تہذیب سے موازنہ ضروری ہے اور Egyptology اور Syriology کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کے سمجھنے کے لیے پوری طرح استعمال کرنا چاہیے (تقریر انڈین ہسٹاریکل کمیشن، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء)۔ وہ عربی مآخذ سے بھی استفادے پر زور دیتے تھے اور محض فارسی تاریخی کتابوں تک تاریخی زاویۂ نگاہ کو محدود رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ بنگال سے وسط ایشیا تک جس طرح ہنڈیاں جاتی تھیں اس کا تحقیقی جائزہ ضروری ہے۔

مولانا نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کا جگہ جگہ قدیم یونانی تہذیب سے مقابلہ کیا ہے۔ موسیقی کی تاریخ سامنے آتی ہے تو لکھتے ہیں :

"یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور دقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اس معاملے کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

(غبارِ خاطر، ص ۹۳)

انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستان کی موسیقی کا ذکر نہیں کیا۔

ان عوامل و اثرات کا ذکر کرتے ہوئے جنھوں نے ہندی موسیقی کو فروغ دیا، امیر خسرو کو اس طرح خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں :

"امیر خسرو جیسے مجتہدِ فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی۔ اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ سازگری، ایمن اور [illegible] خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں [illegible] جب تک ہندوستانیوں کی آوازیں رس اور تاروں [illegible] زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔"

(غبارِ خاطر، ص ۲۸۰)

پھر ہندوستان میں موسیقی کے نشو و نما پر گفتگو کرتے ہوئے کتنے ہی تاریخی واقعات بیان کر جاتے ہیں، اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کی تفصیل بیان کر دیتے ہیں۔ ۲۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو کلا اکاڈمی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد فنونِ لطیفہ کی سرپرستی حکومت کی طرف سے بالکل بند ہو گئی تھی۔ ان کا تاریخی [illegible] ان سے مطالبہ کرتا تھا کہ نئے ہندوستان میں وہ سر[illegible] واپس آنی چاہیے۔

مولانا کو ہندوستان کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تاریخ سے بہت گہری دلچسپی تھی۔ پنڈت نہرو کا بیان ہے کہ وہ ان صدیوں پر خاصا لٹریچر احمد نگر جیل میں پڑھتے رہتے تھے۔ خود انھوں نے اپنی Discovery of India کا مسودہ مولانا آزاد کو سنایا تھا اور ان کے مشوروں کو خود اپنے نظریات سے ہم آہنگ پایا تھا۔

۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا سبب واضح ہے۔ لیکن انھوں نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کی میٹنگ منعقدہ ۵ جنوری ۱۹۵۵ء میں صاف صاف کہا تھا کہ اس تاریخ کو لکھنے میں معروضیت کو رہبر ہونا چاہیے اور واقعات کی تحقیق میں کسی تعصب کا [illegible] نہیں ہونا چاہیے۔ کہتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا "غدر" جس طرح برطانوی اقتدار کے لیے اچانک اور تعجب خیز حادثہ تھا، اسی طرح بہادر شاہ کے [illegible]

بھی تھا۔

تاریخ ہند کے سلسلے میں مولانا کی دلچسپی کو سمجھنے کے لیے ایک ذاتی واقعے کی طرف اشارہ شاید نامناسب نہ ہو۔ سر ہنری ایلیٹ نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی تاریخ (جواب Elliot & Dowson's History of India. 8 Vols. کے نام سے مشہور ہے) ترتیب دینی شروع کی۔ اس کا مقصد جس کو اس نے بالصراحت ایک عرضداشت میں حکومت برطانیہ کے حکام اعلیٰ کو بیان کیا ہے' یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی پیدا کرنے کے لیے ان کی تاریخ کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح آزادی کی تمام تحریکوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور فرقہ واریت کا زہر ساری تحریکوں کو مضمحل اور بے جان کر دے گا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے محمد بن قاسم سے لے کر آخری مغل بادشاہوں تک کی سیاسی تاریخ چند عربی لیکن بیشتر فارسی مآخذ کے ترجموں کی صورت میں پیش کی اور اس کا خاص اہتمام کیا کہ اقتباسات جو ترجمہ کیے جائیں ایسے ہوں جن میں جنگ و جدال' دشمنی اور منافرت کا ذکر ہو۔ اس نے اپنی تاریخ کا سارا مواد سیاسی تاریخوں سے حاصل کیا اور ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ کو جنگ و جدل کی ایک ہیبت ناک داستان کا رنگ دے دیا۔ یہ تاریخ جو آٹھ جلدوں میں ہے' گذشتہ سو سال میں ہماری ساری نصابی کتابوں کی اساس بن گئی اور فرقہ واریت کا زہر قومی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔

آزادی کے بعد اس پورے نظریے کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ اور ان مآخذ کی نشاندہی بھی ضروری تھی جن کو ایلیٹ نے استعمال نہیں کیا تھا لیکن جن میں سماجی' ادبی' مذہبی زندگی کی بیش بہا تفصیلات موجود ہیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر میں نے ایلیٹ کی ہر جلد پر ایک جلد تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک جلد کو شائع بھی کر دیا۔ اس میں غیر سیاسی مآخذ کی نشاندہی کی اور تمام اس لٹریچر کو سامنے لایا گیا جس کے بغیر ہندی قرون وسطیٰ کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتایا کہ شاہی خاندانوں کی تاریخ تک اپنے نظریۂ تاریخ کو محدود کر دینا صحیح نہیں۔ اگر اس دور کے پورے لٹریچر پر نظر ہو تو اتحاد و یگانگت اتفاق و یک جہتی کے کتنے پہلو سامنے آجائیں۔ اور نقطۂ نظر کے فرق کا بھی اندازہ ہو۔ میں نے اپنا ضمیمہ مولانا کی خدمت میں بھیجا تو وہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ محمد اجمل خاں صاحب نے ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء کو لکھا:

" ایلیٹ کا نیا ایڈیشن انھیں (مولانا کو) مل گیا۔ اُسے دیکھ کر مولانا کو خوشی ہوئی کہ ایک ضروری کام انجام پا گیا۔"

پھر مولانا کے سیکریٹری مسٹر کے کرپلانی نے لکھا:

"*Maulana Sahib* ______ *is very glad that you have done an excellent job.*"

جب مولانا سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ایسے کام کے لیے کس قدر مضطرب تھے اور تاریخی فکر کی تجدید کے لیے اس کو کتنا ضروری سمجھتے تھے۔ دوران گفتگو میں نے عرض کیا کہ التتمش کی بڑائی مورخوں نے اس کی کامیاب جنگوں میں دیکھی تھی' جن کا بازیچہ اس نے سارے شمالی ہندوستان کو بنا دیا تھا' لیکن حضرت شیخ نظام الدین اولیا' کی نظر میں التتمش کا سب سے بڑا کارنامہ جس پر اس کی مغفرت ہوئی' وہ حوض شمسی کی تعمیر تھا جس سے ساری دہلی کو پانی ملا ______ مولانا کی مسکراہٹ کے وہ نقوش اب تک نگاہوں میں ہیں جو یہ جملہ سن کر ان کے چہرے پر ایک دم سے دوڑ گئی تھی۔ انھوں نے بالخصوص تین چیزوں کی طرف اشارہ کیا اور اس سمت میں قدم اٹھ جانے پر گہری مسرت کا اظہار کیا ______ (۱) ایلیٹ کے نقطۂ نظر کی تصحیح (۲) اس عہد کے پورے لٹریچر سے استفادے کی اہمیت پر زور (۳) ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ کو شاہی خاندانوں کے محدود پس منظر سے نکال کر وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت۔

(۷)

قرون وسطیٰ کے بعض مورخین کے متعلق مولانا کے خیالات کی طرف اشارہ شاید ان کے تاریخی شعور کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا یونیورسٹی تشریف لائے تو شعبۂ تاریخ کا بھی معائنہ کیا اور پھر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ اس موقعے پر دو مصنفین کے متعلق ان کی رائے ذہن میں رہ گئی۔ ضیاالدین برنی کے متعلق فرمایا کہ اس میں تطویل بیان" بہت ہے جوہر آفتابچی کے تذکرۃ الواقعات کے متعلق فرمایا کہ اس دور میں جس طرح کی فارسی میں گفتگو ہوتی تھی اس کا بہترین نمونہ ہے۔ مولانا نے البیرونی پر جو مقالہ لکھا ہے' وہ سامنے آچکا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے کتنے گوشے ان کے ذہن میں تھے اور وہ البیرونی کو اس کی تحقیقی صلاحیتوں اور تجسس کی بنا پر کیا درجہ دیتے تھے؟ لکھتے ہیں:

" البیرونی کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علمی یعنی سائنٹیفک دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آئی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ' کوئی قومی روایت' کوئی تاریخی مسلمہ' اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کر سکتا' اس کی عقلیت بے لچک' بے داغ اور ناممکن التسخیر ہے۔"

(ص. ۱۰۵-۱۰۶)

پھر سلطان محمود سے اس کے تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

"ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اُسے کیوں کر مطمئن اور خوشحال کرسکتی تھی جو ریاضیات اور ہیئت کے ایک باکمال شخص کی قدرشناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدر شناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے فنِ نجوم کے اوہام وخرافات کے اعتقاد سے متہم تصور کرے۔" (ص۔ ۹۹)

اب ایسے مورخ کے متعلق بھی مولانا کی رائے سُن لیجیے جو اپنے عقائد وافکار میں بے لچک اور تعصب میں غیر معمولی طور پر سخت تھا۔ یعنی عبدالقادر بدایونی۔ مولانا کی معروضیت یہاں بھی امتیازی رنگ میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

"بدایونی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے۔ طبقۂ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کرکے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کرلی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز اُبھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک 'تنگ نظری' بے روک تعصب اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبری کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اس طرف اُٹھنے سے روک نہیں سکتے۔" (غبارِ خاطر، ص۔ ۱۸۶)

مولانا تاریخی مواد کو استعمال کرنے سے پہلے 'مورخ کا ذہنی تجزیہ اور اس کے ماحول کا جائزہ ضروری سمجھتے تھے' اور یہ وہ بیدار تاریخی شعور ہے جو آج Psychohistory کی شکل میں مغربی مورخین کے لیے جاذبِ توجہ بنا ہوا ہے۔

(۸)

مولانا تاریخی تحقیق کے سلسلے میں آرکائیوز (Documentation) کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ ناگپور میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو کہا تھا کہ ان دستاویزوں ہی کی بنا پر صحیح تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ تاریخ کا بیش قیمت مواد ہے جس کی حفاظت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔ مغل دور میں ان دستاویزوں کا تحفظ خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، خافی خان وغیرہ نے اپنی تاریخیں اسی مواد کی مدد سے ترتیب دی تھیں۔ ضرورت ہے کہ ان دستاویزوں کو مرتب کیا جائے، اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے ان تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک سال بعد پھر اس پر زور دیا۔

(۹)

آثارِ قدیمہ میں مولانا کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ دہلی میں انتہائی مصروف رہتے تھے، لیکن اگر کبھی فرصت میسر آجاتی تو آثارِ قدیمہ کو دیکھنے چلے جاتے۔ ان کی نظر میں آثارِ قدیمہ کی حفاظت تاریخی مواد کی حفاظت کے مترادف تھی۔ ۱۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو ایک تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ تقریباً دو سو سال سے یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ قدیم تاریخ کا سب سے اہم بلکہ واحد ذریعہ آثارِ قدیمہ ہیں۔ کاغذ اس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا اور اس کی ایجاد کے بعد جو چیزیں کاغذ پر لکھی گئیں وہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اب آثار ہی سے قدیم تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اور یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کون کون سی تہذیب کے قافلے یہاں سے گذرے۔ مصر، عراق، شام وغیرہ میں آثارِ قدیمہ کا کام ہندوستان سے زیادہ ہوا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے یورپین تہذیب سے قریب تر تھے۔

(۱۰)

اگر تاریخ قوموں کا حافظہ ہے تو انسانی ذہن
کے تحفظ کا ذریعہ۔ بغیر مضبوط حافظے کے تاریخی
ممکن نہیں۔ مولانا آزاد کو قدرت نے غیر معمولی قوت
حافظہ سے نوازا تھا۔ ان کے تاریخی احساس و شعو
کو اس سے تقویت پہنچی تھی، اور وہ تاریخی حقائق
مختلف پس منظر میں پوری وضاحت کے ساتھ د
سکتے تھے، اور اس سے نتائج کا استنباط کرسکتے
حقیقت یہ ہے کہ حافظہ تاریخی شعور میں حرکت پیدا
ہے۔ واقعات جب پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں تو ت
فکر کی گرہیں خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔ غلام رسول مہر
ایک بار مآثرالامراء سے نقل کی ہوئی عبارت کے ایک
لفظ پر شبہ ہوا۔ مولانا سے معلوم کیا، انھوں نے جواب
فرمایا: میرے ذہن میں تو یوں ہی محفوظ ہے۔ پھ
اصل سے رجوع کیا گیا تو بالکل اسی طرح نکلا جس ط
مولانا نے لکھا تھا۔ خود فرماتے ہیں:

"تیس چالیس برس پیشتر کے نقوش بھی اج
اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتا
دیکھ کر اٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ ص
اور صفحے کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں
تھا یا درمیانی سطروں میں، یا آخری سطروں میں، نیز
کا رخ کر داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

(غبارِ خاطر، ص

مولانا آزاد کا تاریخی شعور کچھ اس طرح ان کی
جزو بن گیا تھا کہ جب کسی مسئلے پر غور کرتے تو اس کا پس
اور تمدنی پس منظر ذہن کے سامنے آجاتا۔ جب ک
صورتحال سے دوچار ہوتے تو تاریخی واقعات اس ط
ذہن میں اُبھر آتے گویا صف بستہ کھڑے ہوئے اُ
اشارے کے منتظر تھے۔ احمد نگر کے قلعے میں قید
گئے تو احمد نگر کی پوری تاریخ زندہ حرکت کرتی ہوئی

کے سامنے آگئی ـــــــ (غبارِ خاطر، ص ۲۵۔۲۶)

ملک احمد سے لے کر جنرل ویلزلی تک اس قلعے کی تاریخ تصور میں روشن ہو گئی اور لکھا:

"جب جنرل ویلزلی نے اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلاب سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے ـــــــ یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے" ـــــــ (غبارِ خاطر، ص ۲۶)

جب ذہن اور آگے بڑھتا ہے تو احمد نگر کے سارے معرکے جن میں عبدالرحیم خانخاناں بھی شریک رہا تھا، سامنے آجاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

"احمد نگر کے نام نے حافظے کے کتنے ہی نقوش یکایک تازہ کر دیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی، میدان کے بعد میدان گذرتے جاتے تھے، ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق بہ ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحے پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔"

یہاں تاریخی شعور جس طرح زندگی کے شعور اور حالات گرد و پیش کے احساس میں تحلیل نظر آتا ہے وہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ قید خانے میں لے جایا جا رہا ہے، قید و محن کی زندگی گھڑی انتظار کر رہی ہے، لیکن تاریخی تجسس کی نگاہیں اس خندق کی تلاش کر رہی ہیں جس کا نقشہ ابوالفضل نے کھینچا ہے۔ جب جیل کا سپرنٹنڈنٹ میجر سینڈک سامنے آیا تو تاریخی ذہن نے چاند بی بی کے زمانے کے قلعہ دار چیتہ خاں حبشی کی شکل پیش کر دی اور اس کا نام چیتہ خاں رکھ دیا۔ (غبارِ خاطر، ص ۵۶)۔ پھر احمد نگر کی آب و ہوا کے ساتھ فیضی یاد آجاتا ہے (ص ۷۱)۔ پھر اورنگ زیب کی طرف ذہن چلا جاتا ہے کہ وہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا (ص ۷۱)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد نگر کے نام کے ساتھ تاریخی خزانوں کے دروازے ذہن نے کھول دیے ہیں۔ اس اندرونی اور بیرونی ہم آہنگی نے ان کے تاریخی ذہن کو تیز کر دیا تھا۔

جب مولانا کے ذہن میں تاریخی واقعات اور احساسات کا قافلہ چلتا تو ان کا ذوق شاعری بھی ہم عنان ہو جاتا اور شاعروں کے احساسات کی دنیا سے شعر ابھار ابھار کر پیش کرتا اور مولانا اپنے احساس جمال، تاریخی شعور اور ادبی ذوق کو ساتھ لے کر آگے بڑھتے۔ جو اشعار ذہن میں ابھرتے ان کا تاریخی پس منظر بھی نظر میں ہوتا۔ اگر اس سے متعلق کوئی تاریخی واقعہ ہوتا تو وہ بھی سامنے آجاتا۔ انھوں نے فارسی تذکروں کا مطالعہ بہت غور سے کیا تھا اور ان تذکروں کے صدہا اشعار مع سیاق و سباق ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ شریف خاں شیرازی، حکیم صدرائے شیرازی کے اشعار جس مناسبت اور تاریخی پس منظر میں پیش کیے ہیں وہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

(۱۱)

مولانا آزاد کے جذباتِ حریت کا پس منظر ان کے تاریخی مطالعے میں مضمر تھا۔ انھوں نے ایران، مصر، شام وغیرہ کی سیاسی تحریکوں، ادبی رجحانات اور ثقافتی تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جس طرح سامراجی قوتوں کے خلاف تحریکیں ابھری تھیں ان کا پورے تاریخی شعور کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اٹلی، آئرلینڈ وغیرہ کی تحریکوں کی تاریخ بھی پڑھی تھی۔ ان کے "حزب اللہ" میں اٹلی کی Carbonari کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا ذہن کبھی تاریخی تاثرات سے خالی نہیں ہوا۔ امیر عبدالقادر الجزائری کے حسرتناک انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلامی عروج و زوال کے ہزاروں افسانہ ہائے حسرت میں سے یہ ایک چھوٹی سی کہانی تھی جو اس طرح ختم ہو گئی۔ اپنی سرگزشت اور یار کی اس کو گویا ایک سطر سمجھیے۔ ہم نے کتنے سکندر اور نپولین پیدا کیے جن کے اعجوبہ زا کارناموں کے نشان دنیا کے چپے چپے پر نمایاں ہیں۔ ہماری سرزمین اقبال پر جب شجاعت و کمال کا ابر گرجتا تھا تو اس کے ہر قطرے سے سینکڑوں امیر عبدالقادر پیدا ہوتے تھے۔"

(الہلال۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء)

جب مولانا آزاد نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو (جو ۱۸۳۱ء اور ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے حسرتناک انجام کے بعد سیاست سے علیحدگی پر مائل تھے) جنگِ آزادی میں حصہ لینے سے گریز کرتا ہوا پایا تو ان کو سخت تکلیف ہوئی۔ اس وقت ان کے تاریخی احساس و وجدان نے جس طرح کام کیا اس کا اندازہ ان سطور سے لگایا جا سکتا ہے:

"اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہو گا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہو گا، مگر جانتے ہو اس میں کیا ہو گا؟ اس میں لکھا ہو گا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل

چڑھا دیے۔"

(الہلال ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء)

تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کو جامع مسجد میں خطاب کیا تو پھر تاریخی ذہن حرکت میں آگیا۔ کہا:

" یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار تم سے اُچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟"

پھر ہمت و عزم کی روح اس طرح پھونکتے ہیں:

"ہمارے ملک کی تاریخ کے کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں" مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں"

مولانا آزاد کا تاریخی شعور، خونِ زندگی کی طرح ان کی تحریر و تقریر میں دوڑتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے ا
تاریخی شعور کو فلسفے کی گہرائی اور ادب کی چاشنی
انتہائی دلکش بنا دیا تھا:

درد می خیزد از دلِ فیضی
سوزشے در کتاب می بینم

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

(فارسی تاریخوں میں)

ہندوستان میں ... دلّی کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ وہ فارسی تاریخیں ہیں جو اس عہد میں لکھی گئیں۔ ... مجبوری ہے کہ ہمارے زمانے میں فارسی کا چلن کم ہو گیا ہے اس لیے ہمارے مؤرخین اور عام لوگ فارسی تاریخوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔ اردو اکادمی کی تحقیقی اشاعتی کمیٹی نے جب فیصلہ کیا کہ دلّی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر کتابیں تیار کرا کے شائع کی جائیں تو دلّی کے آثارِ قدیمہ میں خلیق انجم صاحب کی دلچسپی کے پیشِ نظر اُن سے فرمائش کی گئی کہ وہ فارسی تاریخوں میں دلّی کے آثارِ قدیمہ کا جو ذکر آیا ہے اُسے اردو میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیں۔ ان کتابوں تک رسائی کے لیے اور غیر مطلوبہ مواد کی تلاش میں خلیق انجم صاحب کو کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ محقق حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

یہ خوشی کا مقام ہے کہ خلیق انجم صاحب نے فارسی تاریخوں کے ان اہم اقتباسات کا اردو میں ترجمہ کر کے ایک ایسی کتاب مرتب کر دی ہے جو دلّی کے آثارِ قدیمہ کے موضوع پر غیر معمولی افادیت کی حامل ہے۔

دلّی کے آثارِ قدیمہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس نوعیت کا کام اُردو میں پہلی بار ہوا ہے۔ یقین ہے کہ دلّی کے آثارِ قدیمہ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مددگار اور معاون ثابت ہوگی اور عام پڑھنے والے بھی اس سے استفادہ کریں گے۔

ترجمہ اور مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم

صفحات : ۲۹۶

قیمت : ۴۰ روپے

اُردو میں بارہ ماسے کی روایت

مطالعہ و متن

اردو میں عوامی شعر و ادب کے سلسلے بھی کلاسیکی ادبیات کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ ان شعری اصناف کی رنگا رنگی اور صدیوں تک ان کی روایتوں کا تسلسل ان کی مقبولیت کا بیّن ثبوت ہے۔ ایسی عوامی شاعری اور اس کے مختلف نمونے اور عام پسند قصے کہانیاں اُردو زبان میں لوک ساہتیہ کی وجودگی کی گواہی دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری تنقید و تحقیق نے اس نثری اور شعری روایت پر وہ توجہ نہیں کی جس کی یہ مستحق تھی۔

اُردو میں کلاسیکی شاعری کی ابتدا، جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے، افضل کے بارہ ماسے سے ہوتی ہے۔ بعد میں دوسرے کئی شعرا نے بھی بارہ ماسے لکھے۔ بعض نے ہندی دوہوں کو بھی اس میں شامل کیا جو کھڑی بولی کے علاقے میں خصوصیت کے ساتھ عوامی شاعری اور عوامی شعور کا حصہ رہے ہیں۔ بارہ ماسوں کا مطالعہ اردو زبان کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے اور اس کے علاقائی رشتوں کو جاننے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے جو اردو میں عوامی شعر و ادب کی روایت پر ایک مدت سے کام کر رہے ہیں، ۱۲ بارہ ماسے اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ متن قدیم مطبوعہ اور قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ آغازِ کتاب میں مبسوط و مفصل مقدمے کے علاوہ ہر بارہ ماسے کا تعارف اور اس کا تنقیدی مطالعہ بھی فاضل مرتب نے پیش کیا ہے۔

مصنفین : ۱۲ مختلف شعرا

مرتب : ڈاکٹر تنویر احمد علوی

صفحات : ۳۸۶

قیمت : ۳۹ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

مولانا ابوالکلام کے تعلیمی نظریے

تقسیم ہندوستان کا صدمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور دو قوموں کے جس نظریے سے وہ عمر کے بڑے حصے میں لڑتے رہے اسے تسلیم کر لیا گیا لیکن اپنی تمام اداسی اور افسردگی کے باوجود مولانا نے آزادی کے بعد بھی اہم کارنامے انجام دیے اور ان کارناموں کا ایک اہم باب تھا آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی۔ وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے ذمے دار تھے۔

آزادی کے بعد کے دور میں آزاد کے تعلیمی نظریوں کو سمجھنے کے لیے دو باتیں پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ ایک مسلمانوں کے دینی مدارس، مکاتب اور دارالعلوم کے سربراہوں کی وہ کانفرنس تھی جو انھوں نے لکھنؤ میں طلب کی تھی یہاں ان کا زور تھا۔ ان درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے دینی نصاب کو 'جدید' بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی فلسفہ اور سماجی علوم میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ اس نصاب میں شامل ہوں تاکہ دینی اور دنیاوی فکر کا سنگم ہو جائے وہ دینی علوم سے روگرداں نہیں تھے مگر یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان ہی کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی شامل کر لیے جائیں جو آج کے دور کی پیداوار ہیں۔ صرف یونانی دور کے علوم تک نہ تو خود کو محدود رکھا جائے نہ ان علوم میں جو جدید تحقیقات اور ترقیاں ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کی جائیں۔ مثلاً آج ان دینی مدرسوں میں یونانیوں کی تقلید میں زمین کی گردش اور آسمان کے ساکن رہنے کا نظریہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کانفرنس سے آزاد کے اس رویے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی مشرقی اور دینی علوم اور مغربی اور جدید سیکولر علوم کو ملا کر ایک علمی تسلسل کو تعلیم کے لیے ضروری سمجھتے تھے گویا مشرق و مغرب کے سنگم ہی سے بہتر آگہی ممکن ہے۔

دوسرا اہم واقعہ ہے رادھا کرشنن کی مرتبہ کتاب 'مشرق و مغرب میں فلسفے کی تاریخ' History of Philosophy: Eastern Western ہے۔ جس کا خاصہ طویل دیباچہ مولانا آزاد نے لکھا تھا یہاں صرف یہی نقطۂ نظر کار فرما نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کی مشترک آگہی سے صحیح علم ہوتا ہے اس کے ساتھ فرد اور معاشرے کے ہمہ جہت ارتقا کا تصور بھی کار فرما ہے ان کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ تعلیم محض کاروباری یا معاشی مسئلہ نہیں ہے کہ دو حرف پڑھ کر آدمی روزی روٹی کمانے لگے یہ تو محض اس کا ایک رخ ہے مراد ہے انسان کی تعمیر نو، اس کی آزاد شخصیت کی تعمیر۔

ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیے اور آگے بڑھیے۔

آزاد نے جب وزارت تعلیم کی باگ ڈور سنبھالی تو صورت حال کیا تھی۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا گاندھی جی زندہ تھے اور جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے گاندھی جی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور ان کا واضح نظریہ تعلیم تھا وہ ملک کو مشینوں کی حکومت کی طرف لے جانا نہیں چاہتے تھے بلکہ بڑے بڑے کارخانوں کے بجائے دیہی ترقی اور گھریلو صنعت کے فروغ کے ذریعے نئے طرز کی معیشت کے حامی تھے اس کے مقابلے میں جواہر لال نہرو بڑی صنعتوں کے قیام کے حق میں تھے۔

سوال یہ تھا کہ ملک میں تعلیم کی نوعیت کیا ہوگی؟ ایسی تعلیم جو بڑی صنعتوں میں کام آئے اور ہمارے فارغ التحصیل طلبا بڑے بڑے کارخانے چلا سکیں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تازہ ترین ایجادات پر قابو پا سکیں یا ایسی تعلیم جس کا رخ دیہات کی طرف ہو اور گھریلو صنعتوں کے فروغ میں مدد دے سکے۔ ملک نے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی توازن کو اپنایا یعنی گھریلو صنعتیں بھی اور بڑے بڑے کارخانے بھی مگر رخ بڑے کارخانوں ہی کی طرف رہا۔

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی نے اس رخ کا ساتھ دیا۔

مولانا نے ملک کو جو تعلیمی پالیسی دی بلاشبہ وہ ابھی تک ملک میں عام ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے میں تو کامیاب نہیں ہو سکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ آج ہمارا ملک اس پورے علاقے میں جاپان اور چین کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی اور اس ضرورت کے تحت تعلیم کے مختلف شعبوں کی تیز رفتار ترقی کا جو کام مولانا آزاد نے شروع کیا وہ واقعی بڑا اہم تھا۔ یہ

محمد حسن
ڈی۔ ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی۔

بات یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا آزاد کے بعد وزارت تعلیم ان جیسی شخصیت حاصل نہ کر سکی بلکہ یہ وزارت اتنی اہمیت کی نہیں رہی اور اکثر وزرائے تعلیم کابینہ کی سطح کے وزیر بھی نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا آزاد کے متعین کردہ راستے اور ان کے اقدامات ہی اس وقت سے اس وقت تک قایم اور جاری ہیں بعد کے آنے والے وزیروں نے ان میں بہت کم تبدیلیاں کی ہیں ان کی حیثیت بنیادی نہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔

آیئے اب اس ڈھانچے کے چند حصوں پر غور کریں۔

سائنسی تعلیم و ترقی کے لیے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس داں کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ بن گیا اٹامک ترقی کا ادارہ الگ وجود میں آیا اور صنعت و ٹکنالوجی میں کام کرنے والے سائنسی اداروں کے لیے ایک طرف تو انڈین کاونسل فار انڈسٹریل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ قایم ہوئی تو دوسری طرف زراعت اور دیہی ترقی کے لیے انڈین کاونسل فار ایگریکلچرل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح انڈین کاونسل فار میڈیکل ریسرچ بنائی گئی۔ گویا ملک میں اعلیٰ ترین سائنسی ریسرچ کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور ترقی کے سلسلے میں کئی ادارے وجود میں آئے جو اس تحقیقاتی کام کو زراعت اور صنعت کے شعبوں تک لے جا سکیں۔

اس کا دوسرا پہلو سماجی علوم اور فنون لطیفہ سے متعلق تھا۔ سماجی علوم کے لیے انڈین کاونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ اور انڈین کاونسل فار سوشل سائنسز ریسرچ قایم ہوئیں جن کا دائرہ تاریخ سے لے کر اقتصادیات معاشیات اور سماجیات تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی سلسلے کو مکمل کر رہے تھے دو اور ادارے ایک انڈین کاونسل فار کلچرل ریلیشنز جو ہندوستان کے تہذیبی روابط کا امین تھا اور دوسرے انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز جو مولانا آزاد کی سرپرستی میں سپرو ہاؤس میں قائم ہوا اور بعد کو جواہر لال یونیورسٹی کا ہیولیٰ بن گیا۔

فنون لطیفہ اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا آزاد نے اکادمیوں کی بنیاد ڈالی اور تین اکادمیاں وزارت تعلیم ہی کے ایما سے قائم کی گئیں ادب کے لیے ساہتیہ اکادمی، رقص اور موسیقی کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری وغیرہ کے لیے للت کلا اکادمی ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا آزاد ہی تھے اور ان

> ... آزادی کی لڑائی میں اُن کی عظیم الشان جدوجہد آج بھی ملک اور قوم کو یاد ہے لیکن آزادی کے بعد کے دور میں اُن کو ایک ہارا ہوا سپاہی یا ایک اداس دل گرفتہ آدمی کے طور پر دیکھنے والوں کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی اُن کے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں۔ ...

اکادمیوں کا یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر فنکاروں کو انعام و اکرام تقسیم کریں بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر انھیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی کا ایک رخ تھا اعلیٰ تعلیم کا فروغ چنانچہ اسی مقصد سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم ہوا اور اس کے تشکیلی دور میں چنتامنی دیشمکھ کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک میں یونیورسٹیوں کا جال سا بچھا دیا اور اعلیٰ تعلیم کو نہ صرف مالی امداد کے ذریعے بڑھاوا دیا بلکہ نظریاتی طور پر سمت و رفتار کا تصور بخشا اور ان سبھی اعلیٰ تعلیمی سرگرمیوں میں ایک ضابطہ بندی اور معیار بندی پیدا کی۔

مولانا آزاد محض وزیر تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی کابینہ کے ایک نہایت اہم رکن بھی تھے اس لحاظ سے وہ پورے ملک کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ کانگریس کے لیے ہندوستان اور مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے قریبی رابطے کا تصور نیا نہ تھا گویا سے کانگریس کے سیاسی شعور کا حصہ بنانے میں بھی مولانا آزاد کی کانگریسی رہنما کی حیثیت سے بڑی اہم خدمات رہی ہیں لیکن جب ملک آزاد ہوا تب بھی مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی رابطوں کو اہمیت دی جاتی رہی اور مولانا آزاد نے اسی مقصد سے مجلہ ثقافتہ الہند اپنے رفیق کار عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا اور تعلیمی نظام میں اس علاقے سے ہندوستان کے تعلقات کو بڑی اہمیت دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ علوم شرقیہ اور حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامی کا فروغ بھی مولانا آزاد کا مرہون منت ہے۔

مولانا کو تاریخ سے خاص شغف تھا دراصل وہ ان انسائیکلوپیڈی شخصیتوں میں تھے جو علم کو اکائی سمجھتے ہیں اور اسے ادوار اور اقسام میں تقسیم نہیں کرتے۔ شخصی مہارتوں کے دور میں ایسے قد آور اور ہمہ جہت عالم نایاب ہوتے جاتے ہیں لیکن مولانا انسانی فکر و عمل کی پوری داستان کو ایک ہی سلسلے میں پرو کر دیکھتے تھے اور اس میں ماضی اور حال کی تفریق نامناسب تھی اسی لیے مولانا کی سرکردگی میں خصوصی توجہ ہوئی نیشنل آرکائیوز اور نیشنل میوزیم پر اور ان میں گزرے ہوئے زمانے کی بیش قیمت دستاویزوں اور نشانیوں کو محفوظ رکھنے کو خاص طور پر اہمیت دی گئی۔

سنسکرت اور ہندوستان کے قدیم اثاثے کی بازیافت اور اس کی تعلیم و تدریس پر بھی مولانا نے زور دیا کیونکہ یہ علوم بھی ہماری عظیم الشان وراثت کا اہم حصہ ہیں۔ کئی ادارے قائم ہوئے یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز خاص اسی مقصد سے بنائے گئے۔ اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا تھا جب ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور پورا برصغیر ان کی زد میں تھا کدورتیں اور رنجشیں ہمارے مشترکہ ورثے کو تنکے کی طرح طوفان میں بہا لے جا رہی تھیں لیکن آزاد کی بصیرت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ ان کی نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی تھی۔ اور وہ صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا اگر کوئی مستقبل ہے تو وہ وسیع تر یک جہتی کے تصور ہی سے وابستہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مولانا آزاد کو اپنی کاوشوں میں مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ مختلف حلقوں سے آزادی کے بعد بھی ان کی مخالفت ہوتی رہی ان کو غلط سمجھا گیا کسی نے ان کو اکثریتی فرقے کا ڈھنڈورچی کہا کسی نے ان کو اقلیتی فرقے کا تنگ نظر حامی بتایا اس کے ثبوت آزادی کے بعد کے دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے جلسے میں ان کے خلاف تقریر سے اور ان کی عمر کے آخری زمانے میں پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کی الزامی تقریر اور مولانا آزاد کی جوابی تقریر سے فراہم کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ وہ قیمت ہے جو ہر اس شخص کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اپنے دور کی دھند سے آگے بڑھ کر مستقبل پر نظر جمانے کی جرات اور جسارت کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے اس تنقید کو کس رنگ میں برداشت کیا۔ غصّے اور جھنجھلاہٹ کو راستے کا پتھر نہ بننے دیا۔ اور ملک کے تعلیمی نظام کی وہ ایسی بنیادیں استوار کر گئے جن پر چل کر آج ملک اس منزل تک پہنچا ہے۔

آزادی سے پہلے مولانا آزاد کے کارنامے سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں صحافی کی حیثیت سے اردو صحافت میں ان کا نقش قدم آج بھی جگمگا رہا ہے ادب اور انشا میں ان کے نام سے جو اسلوب پہچانا گیا وہ آج بھی سدا بہار ہے مذہبی ادب اور خاص طور پر تفسیر قرآن کے سلسلے میں ان کے کارنامے آج بھی ناقابلِ فراموش ہیں آزادی کی لڑائی میں ان کی عظیم الشان جدّو جہد آج بھی ملک اور قوم کو یاد ہے لیکن آزادی کے بعد کے دور میں ان کو ایک ہارا ہوا سپاہی یا ایک اداس دل گرفتہ لیڈر کا ہیرو جاننے والوں کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی قائم کردہ بنیادوں پر چل کر آج ملک اس منزل تک پہنچا ہے جب ڈیڑھ سو سے زیادہ یونیورسٹیاں۔ متعدد آئی۔ ٹی۔ آئی۔ میڈیکل اور سائنسی ادارے اور تحقیقاتی مرکز۔ فنونِ لطیفہ کی اکادمیاں۔ تہذیبی عالمی روابط کے ادارے قائم ہیں اور اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمارے ملک کا شمار دنیا کے چند ایسے ممالک میں ہوتا ہے جو سائنسی آگہی تکنیکی مہارت اور واقفیت اور علوم و فنون میں دسترس کے اعتبار سے ترقی پذیر ممالک میں ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو ایک اور خراجِ عقیدت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تصورِ قومیت

عبدالمغنی
وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

انگریزی کے جن لفظوں نے عصرِ حاضر کی اردو آبادی میں افکار و اعمال کی ایک نزاع برپا کی ہے ان میں سرِفہرست لفظ "نیشن" (Nation) اور اس سے مشتق نیشنلزم (Nationalism) ہے۔ ان الفاظ کے مفہوم اور ان سے وابستہ تصور پر بہت ہی گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں، جن میں بعض اوقات بڑے بڑے مشاہیر نے حصہ لیا ہے۔ لیکن کوئی قطعی فیصلہ علمی سطح پر آج تک نہیں ہوسکا ہے، اگرچہ ایک سیاسی نتیجہ ضرور یہ نکلا ہے کہ مغلوں اور انگریزوں کے ادوار کا غیر منقسم ہندوستان پہلے دو، پھر تین حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ تقسیم کے بعد بھی نیشنلزم کی بحث ختم نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ آزاد ہندوستان میں اکتالیس سال سے قومی یک جہتی کا مسئلہ اور اس کے حل کے لیے مباحثہ جاری ہے۔ ملک میں قائم ہونے اور پروان چڑھنے والی جمہوریت (Democracy) نے اس مباحثے کو اکثریت (Majority) اور اقلیت (Minority) کے نام پر کچھ اور تیز کردیا ہے۔ حالانکہ دستورِ ہند نے تمام شہریوں کے یکساں حقوق اور مساوی مرتبے کی ضمانت دی ہے مگر فرقہ وارانہ (Communal) انداز سے مذہب اور زبان وغیرہ کا حوالہ دے کر سیاسی گفتگو میں تعداد کی بنا پر کم اور بیش کی تفریق کردی گئی ہے۔ لہٰذا سیکولرزم (Secularism) کو اسٹیٹ کی پالیسی قرار دینے کے باوجود نیشنل انٹی گریشن (National Integration) یعنی قومی یک جہتی کا مقصد ہنوز حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

اس تناظر میں جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد اور جدید ہندوستان کے ایک اہم معمار، مولانا ابوالکلام آزاد کے تصورِ قومیت کا مطالعہ اہلِ نظر کے لیے بصیرت کا باعث ہوگا اور ممکن ہے کہ اس سے آزاد ہندوستان میں قومی یک جہتی کے مسئلے کا حل دریافت کرنے میں بھی مدد ملے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ "قومیت" اور "قوم پرستی" کے الفاظ ایک دوسرے سے جدا معنی رکھتے ہیں۔ اگرچہ دونوں ہی الفاظ عام طور پر انگریزی کے لفظ "نیشنلزم" کے ترجمے ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف اصحاب نے کیے۔ آج کے محاورۂ زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "قومیت" دراصل ایک دوسرے انگریزی لفظ "نیشنلٹی" (Nationality) کا مترادف ہے جو ایک خالص انتظامی اصطلاح ہے۔ اور اس کے بارے میں کوئی نظریاتی نزاع نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر ملک کے رہنے والے کی قومیت کا تعلق اس کے ملک سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن آج سے پچاس سال قبل کے سیاسی مباحث میں لفظ "قومیت" کا استعمال، مثال کے طور پر، خود مولانا آزاد نے قومی احساس کے معنی میں کیا جس کا مقصود تھا وطن دوستی، یعنی اہلِ وطن کے اجتماعی مفاد اور ان کی مجموعی و عمومی صلاح و فلاح کا احساس و شعور۔ سوال یہ ہے کہ کیا لفظ "قومیت" استعمال کرتے ہوئے مولانا کے سامنے لفظ "نیشنلزم" تھا جس کا ترجمہ وہ کرنا چاہتے تھے؟ اس سوال کا کوئی واضح اور متعین جواب دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت تو ثابت ہے کہ مولانا نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے قوم پرستی کے بجائے قومیت کا لفظ استعمال کیا۔ یہ نکتہ وطن دوستی اور وطن پرستی کے فرق کا تجزیہ کرنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دونوں الفاظ ایک انگریزی لفظ "پیٹریوٹزم" (Patriotism) کے ترجمے ہیں۔ جب کہ اس انگریزی لفظ کا ایک تیسرا اردو ترجمہ "وطنیت" بھی ممکن ہے اور مروج رہا ہے۔ یہاں ایک سوال اٹھتا ہے، کیا وطن پرستی اور قوم پرستی کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اس موقعے پر ایک لسانی سوال یہ بھی اٹھ سکتا ہے کہ کیا وطنیت و وطن پرستی ایک طرف اور قومیت و قوم پرستی دوسری طرف ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں؟

پہلے سوال کا جواب نسبتاً آسان ہے، وہ اس طرح کہ ایک سرزمین کے ساتھ وابستگی کا خیال وطن اور قوم میں بالعموم مشترک ہوتا ہے، الا یہ کہ کوئی قوم اپنی سرزمین سے اکھڑ چکی ہو، لیکن قوم میں حاکمانہ اختیار (Sovereignty) کا پہلو بھی مضمر ہے۔ جب کہ وطن جائے پیدائش اور جائے رہائش کے سوا کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے غلام ہندوستان میں اہلِ ملک کے لیے بلا امتیازِ فرقہ و طبقہ وطن تو ایک حقیقت تھی، لیکن قوم کا تخیل

ایک آرزو پر مبنی تھا جس کی تکمیل آزادی کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ جنگِ آزادی کے زمانے میں وطنیت و قومیت کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال کیے گئے۔ چنانچہ وطن پرستی اور قوم پرستی کے درمیان کم ہی فرق کیا گیا۔ دوسرے سوال کا جواب دینے میں مشکل یہ ہے کہ ہر وطن دوست اور قوم پرور کوئی ضروری نہیں ہے کہ وطن پرست اور قوم پرست بھی ہو۔ اس لیے کہ سرزمین کی محبت ایک بات ہے اور اس کی پرستش دوسری بات۔ ممکن ہے کہ اس وجہ سے وطن دوستوں اور قوم پروروں نے اپنے نقطۂ نظر کے لیے وطنیت و قومیت کے الفاظ بالعموم استعمال کیے ہوں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے وطنیت و وطن پروری میں معنی کا فرق نہیں۔ لسانی اصلیت کا فرق ہے۔ پہلا لفظ عربی قاعدے پر ہے اور دوسرا فارسی قاعدے پر۔ ٹھیک یہی فرق قومیت و قوم پرستی کا بھی ہے۔

بہر حال نصف صدی قبل نیشن کے تصور پر جو بحث و نزاع ہوئی اس میں توجہ اس انگریزی لفظ کے اُردو ترجمے پر نہیں، اس کے سیاسی مفہوم پر مرکوز رہی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان جو مباحثہ ہوا اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مولانا کے پیشِ نظر عربی زبان میں لفظ "قوم" کا قدیمی استعمال تھا۔ جب کہ اقبال کے مدِنظر انگریزی لفظ "نیشن" کے سیاسی مضمرات تھے۔ اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تصنیف "مسئلۂ قومیت" میں مفصل بحث کی ہے۔ یہ تینوں حضرات معروف و مسلّم علما و فضلا ہیں اور ان میں کسی کا مطمحِ نظر خدا پرستی کے مقابلے میں زمین پرستی نہیں ہے۔ نیشن کے ساتھ "ازم" جوڑ کر اردو میں اس کا ترجمہ "یت" کے ساتھ کیا جائے یا "پرستی" کے ساتھ، مقصد کسی کا بھی پرستش نہیں، صرف الفت اور وابستگی ہے۔ لہٰذا لفظوں کے چکر سے نکل کر دیکھنا یہ چاہیے کہ نیشن کے تصور کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر بحث و نزاع کا سارا زور پڑتا ہے۔ اور اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

> ...بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر اُٹھے۔ اس کے بعد انھیں تحریکِ آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ اُبھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک انتشار پیدا کرنے لگا تھا...

نیشن یا وطن بحیثیت سیاسی تصور کے زمین کے علاوہ حسب ذیل عناصر پر مشتمل ہے:

۱۔ نسل
۲۔ زبان
۳۔ عقیدہ
۴۔ تہذیب

غیر منقسم ہندوستان کے باشندے فی الواقع ایک مخلوط نسل سے تعلق رکھتے تھے جو عمومی طور پر سب کے لیے یکساں تھی اور اس کی بنا پر اختلاف کی گنجائش گویا نہیں تھی۔ سوا اس کے کہ ہندوؤں نے اونچی اور نیچی ذات کا ایک بالکل مصنوعی اور غیر انسانی تفرقہ کھڑا کر رکھا تھا۔ زبان کا جھگڑا غیر ملکی سامراج نے زبردستی انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا کیا، ورنہ اُردو پورے ملک کا مشترک عوامی ذریعۂ اظہار بن چکی تھی۔ اور اس کو ہندوی، ہندی اور ریختہ یا ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ جس کا اصلی رسم خط تو عربی و فارسی تھا۔ مگر سنسکرت کی ملاوٹ کے ساتھ اس کا ایک نیا رسم خط دیوناگری بھی بنا لیا گیا تھا۔ اس کے باوجود ہندوستانی بہ خط فارسی و ناگری پر ایک طرح کا قومی اجماع ہو گیا تھا۔ عقیدے کا اختلاف البتہ اہلِ ملک کے درمیان کل بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے اور یہ محض ہندو مسلم ناموں کے دو فرقوں تک محدود نہیں بلکہ نہ صرف عیسائی، یہودی، پارسی اور سکھ فرقوں کے عقیدے مختلف ہیں، خود ہندو کہلانے والوں کے جتنے بھی طبقات ہیں سب کے عقائد ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ تہذیب کا معاملہ یہ ہے کہ معاشرت کا فرق تو فرقوں اور طبقوں کے درمیان کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مگر تمدن پورے ملک کا مغلوں کے وقت سے یکساں رہا ہے۔ تہذیب کا تعلق بلاشبہ اصلاً معاشرت سے ہے جسے انگریزی میں کلچر (Culture) کہتے ہیں، لیکن تمدن (Civilisation) کے اثرات و نقوش بھی تہذیب پر مرتب ہوتے ہیں۔

اب نیشن یا قوم کا لفظ دو معنوں میں لیا جا سکتا ہے: ایک نظریاتی، دوسرے انتظامی۔ انتظامی معنی میں ایک ملک کے تمام باشندگان ایک حکومت کے افراد بن جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک جغرافیائی صورت ہے جس کے بارے میں کسی اختلاف کی ضرورت کبھی کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ برطانوی سامراج کے عہد میں حکومت غیر ملکی تھی۔ لیکن نظریاتی معنی میں جن حضرات نے

ہندوستان میں ایک سے زیادہ قوموں کی بات کی، ان کے پیشِ نظر عقیدے اور تہذیب کا اختلاف خصوصی طور پر تھا۔ جب کہ مسلمانوں کے درمیان ایک قوم کا تصور رکھنے والے بھی عقیدے کا فرق تسلیم کرتے تھے۔ صرف تہذیب کے معاملے میں وہ معاشرت کے بجائے تمدّن کو مدِ نظر رکھ کر یکسانی پر زور دیتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بعض اوقات معاشرتی فرق کا مذاق اڑانے کے باوجود ہندوستانیوں کے اندر بہت سے اختلافات کو "کثرت میں وحدت" - (Unity in diversity) کا نعرہ لگا کر تسلیم کر لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اختلاف کو صرف تنوع سمجھتے تھے جو کسی بھی اکائی کے مختلف پہلوؤں میں پایا جا سکتا ہے۔ اور اسی کی بنا پر ایک مجموعے کے عناصرِ ترکیبی میں فرق کے باوصف تفریق و تقسیم کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ لیکن اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ ہر عنصر اپنی ہستی کے تشخص اور اپنے مستقل کردار کے تحفظ پر اصرار کرے، خاص کر جب اس کو دیگر عنصر یا عناصر کی طرف سے جارحیت کا اندیشہ ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اوّل اوّل "قوم" کا لفظ بالکل غیر سیاسی معنوں میں استعمال کیا، جیسا کہ ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہنامے "لسان الصدق" کی اشاعت مئی ۱۹۰۴ء میں "انجمن حمایت الاسلام" پر ایک تبصرے سے واضح ہے۔ مولانا انجمن کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلوں کو "قومی ہمدردی اور ... حب الوطنی کے گراں بہا خزانے سے مالا مال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "قوم کو ایسے ہی گمنام، غریب، معمولی مگر قومی محبت کے نشے سے چور، حب الوطنی کے جذبات میں سرشار لوگوں کی ضرورت ہے ..."

انجمن حمایت الاسلام مسلمانوں کا ایک ملی ادارہ تھا مگر مولانا کے خیال میں اس کے کارکن حب الوطنی اور قومی محبت کے جذبات سے سرشار تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ایک اجتماعی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اور ان کے کاموں سے عوامی فلاح کے نتائج پیدا ہو رہے تھے، لہٰذا مولانا نے انھیں محبِ وطن اور ہمدردِ قوم قرار دیا۔ لیکن "لسان الصدق" ہی کی اشاعت جنوری ۱۹۰۴ء میں مولانا "نیشنل کانگریس" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس میں اس وقت تک عمومی طور سے مسلمانوں کی عدمِ شمولیت کے مدِ نظر سوال اٹھاتے ہیں:

"پھر اس کانگریس کو قومی کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا لفظ "نیشنل" کے ترجمے، لفظ "قومی" کے سیاسی مفہوم سے واقف تھے۔ اس کے باوجود وہ اس لفظ کا استعمال غیر سیاسی مفہوم میں بھی کرتے تھے، جیسا انجمن حمایت الاسلام پر تبصرے سے عیاں ہے۔ تو اس صورتِ واقعہ سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء تک مولانا آزاد کا تصورِ قومیت بالکل واضح اور متعین نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ ان کے ذہن میں یہ خیال اس وقت بھی پرورش پا رہا تھا کہ قومی کہلانے کی مستحق وہی چیز ہوگی جس میں تمام فرقوں کی شمولیت ہو یا زیادہ صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ جس چیز میں تمام فرقوں کی شمولیت ہوگی تو وہ قومی کہلائے گی۔ (اقتباسات کے حوالے کے لیے دیکھیے "مضامین لسان الصدق" مرتبہ عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۷ء)

قومیت کا خیال کسی انداز سے ذہن کے کسی گوشے میں رکھنے کے باوجود "الہلال" کے دور تک مولانا ابوالکلام آزاد نظریاتی طور پر ایک زبردست ملّی و اسلامی تحریک کے علم بردار رہے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ "الہلال کے مقاصد اور پولٹیکل تعلیم" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں . . . . . اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا۔ اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحیدی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا . . . . . .

الہلال کا مقصدِ اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی، سیاسی ہوں، خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے . . . . .

پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس

میں شریک ہو ئیے، صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے ......

قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استبداد و اقتدار کی مخالفت کرے .....

پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصولِ مذہبی کی خاطر چین نہ لیں ......

اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی کے حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی۔ اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں ......

ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر ہوگا۔ کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ فساد مت کرو ......"

(ص ۱۸ ـ ۲۰ ۔ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد حصّہ دوم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

یہ گویا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کا نہ صرف نظریاتی موقف بلکہ سیاسی منشور رہا ہے جس کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں۔

۱ : دینِ اسلام ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات ہے۔

۲ : اس نظام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔

۳ : اسلامی نظریۂ سیاست مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے کافی ہے۔

۴ : اس نظریے کے تقاضے ہیں ــــ (الف) آزادی (ب) جمہوریت (ج) پرامن جدوجہد۔

۵ : اسلامی نظام آفاقی ہے۔

لہٰذا زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں "عید الفطر" کے موضوع پر بیان دیا گیا ہے :

" اسلام کی اخوتِ عمومی تمیزِ قوم و مرز بوم سے پاک ہے، اور اس کا ایک ہی خدا اپنے ایک ہی آسمان کے نیچے تمام پیروانِ توحید کو ایک جسم واحد کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔" (ص ۱۰ ـ ۱۱)

لیکن مولانا آزاد کا اسلامی سیاسی شعور انھیں اس دور میں مسلم لیگ کے طریقِ کار پر تنقید کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ چنانچہ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں "مسلم یونیورسٹی" کے عنوان سے مندرجۂ ذیل سطریں مولانا کے ذہنی رویّے کا پتہ دیتی ہیں :

" جو قوم چالیس برس تک محض حکومت کی بھیک اور دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی ہو جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے انکار کر دیا، جس نے ہر موقع پر پولٹیکل جدوجہد کو ایک جرم اور بغاوت سمجھا، اور جس نے خود کبھی کچھ نہیں کیا مگر ہمیشہ کام کرنے والوں کی تضحیک و تحقیر کی اور طرح طرح کے باغیانہ خطابات سے انھیں یاد کیا، آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پروا کرے، کیوں نہ اس کو ذلیل و خوار بنایا جائے اور کیوں نہ اس کی امیدوں کو ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے ؟" (ص ۵۰)

آگے چل کر "قوم کی اشخاص پر فتح" کے عنوان سے مسلم لیگ کی بعض کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد کرتے ہیں :

" سلف گورنمنٹ کی خواہش تو مسلمانوں کا قدرتی حق ہے جس کے سیکھنے کے لیے ان کو قرآن کے سوا اور کسی معلّم کی ضرورت نہیں۔" (ص ۸۴)

پہلے اقتباس میں "قوم" سے مراد ملّتِ اسلامیہ ہے جبکہ دوسرے اقتباس میں اس کی سیاسی منزل بھی اسلام کے حوالے سے ہی "سلف گورنمنٹ" بتائی جا رہی ہے۔ اس کے بعد "یالیت قومی یعلمون" کے زیرِ عنوان مولانا ہندوستانی مسلمانوں کو تعداد اور غیرتِ ملّی کے لحاظ سے "خاندانِ اسلام کا سب سے بڑا گھرانا" قرار دیتے ہوئے اعلان کرتے ہیں :

" جو مسلمان یورپ کی تجارت اور مصنوعات کو خریدتا اور استعمال کرتا ہے، وہ گویا دشمنانِ اسلام و توحید کی کھلی اعانت کرتا ہے۔" (ص ۹۳)

ساتھ ہی اپنے اعلان کی توصیف اس طرح کرتے ہیں :

" یہ کوئی ملکی اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک خالص دینی معاملہ ہے، اور ہر مسلمان بشرطیکہ مسلمان ہو، اس کی تعمیل پر مجبور ہے۔"

مذکورہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا دینی و ملّی شعور ہی انھیں بتدریج سیاسی و قومی تحریک کی طرف لا رہا تھا۔ چنانچہ اسلام کے آفاقی تصوّرِ انسانیت کے تحت وہ "خدمتِ عالم و خدمتِ وطن" کو ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور پر ہم آہنگ سمجھنے لگے :

" اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے، تو وہ خاک تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترام محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں، تو وہ انسان تو بہ درجۂ اولیٰ ہمارے احترامِ اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور نسل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے والے اور اسی فضا پر محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔"

(ص ۵۷ ۔ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد حصّہ چہارم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

یہ وہی تخیل ہے جو اقبال کے ترانۂ ہندی

اور ترانۂ ملّی کے درمیان کسی تضاد کے بجائے تطبیق کی کلید فراہم کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے "اتحاد اسلامی" کا بین الملّی نسخہ گویا اسی تخیل کے تحت تجویز کیا:

"درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے۔ اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے، اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور رجنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہو۔"

(کلکتہ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء، منقول از خطبات آزاد مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء)

مذکورہ بالا خطبے میں آگے چل کر مولانا نے پان اسلامزم کی تشریح و تائید کرتے ہوئے اسے "نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں" کی وضع کی ہوئی اس متفقہ حکمت عملی کا سب سے موثر توڑ بتایا ہے جو "مشرقی مسئلے" کے نام سے عالم اسلام میں انتشار برپا کر کے اسے تباہ کرنے کے لیے روبہ عمل لائی گئی تھی۔

پان اسلامزم کا تصور ہی فی الواقع ہندوستان کی اس عظیم الشان تحریکِ خلافت کا محرک تھا جس نے بین الملّی وحدت کے ساتھ ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد اور جنگ آزادی کی متحدہ قومی و عوامی جدوجہد کا صور پھونک دیا، ترک موالات یا عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا اور بالآخر جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر سے برطانوی سامراج کا خاتمہ کر کے اہل ملک کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کا سامان کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے ایک اہم قائد، نظریہ ساز اور مجاہد تھے۔ یہ تحریک الہلال کے دور سے اب تک مولانا کی دس سالہ ملی و قومی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج تھی۔ مولانا کے سیاسی نقطۂ نظر اور تصورِ قومیت کی بہترین عملی شکل اس تحریک کی صورت میں رونما ہوئی۔ مجلس خلافت، آگرہ، ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کا جو خطبۂ صدارت مولانا نے ارشاد کیا اس کے حسب ذیل الفاظ فرقہ وارانہ سوال اور مذہب و سیاست کے مسئلے پر مولانا کے موقف کی موثر ترجمانی کرتے ہیں:

"تحریکِ خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں، تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے اُنھیں انجام دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک سچّی حقیقت ہے۔ مگر سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔ ۔ ۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نصّ قطعی پر مبنی ہے۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو اگر ایک طرف ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے، تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔"

(ص ۲۰۴، خطبات آزاد)

اس تاریخی بیان کے خاص نکات یہ ہیں:

۱۔ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مسلمان ہی کی حیثیت سے ہر کام کرنا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ اپنے وطن کے غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد و اتفاق رکھیں۔

۳۔ اہل ملک کا یہ فرقہ وارانہ اتحاد ہی انھیں ایک غیر ملکی سامراج کے خلاف ترک موالات کے قابل بناتا ہے۔

۴۔ سیاسی سطح پر اہلِ ہند کی قومی یک جہتی اور اس کے بل پر بیرونی اقتدار کے ساتھ مقابلے کی دعوت مولانا آزاد اپنے طور پر پچھلے دس سال سے دے رہے تھے۔

انھی نکات کی بنا پر مولانا آزاد زیرِ نظر خطبے کے شروع ہی میں "تحریک خلافت اور آزادیِ ہند کی تحریک" کا تذکرہ مشترک طور پر کرتے ہیں، اور اس طرح دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ خلافت ایک اسلامی اصول کا نام ہے جو دراصل جمہوریت کی بہترین شکل ہے اور ہر قسم کی ملوکیت کے خلاف۔ اپنے وقت میں برطانوی سامراج ایک بدترین ملوکیت تھی جس سے ٹکر لینے کے لیے مسلم قائدین اور علمائے دین نے ایک سیاسی واقعے سے متاثر ہو کر خلافت کی تحریک چلائی۔ غیر مسلم راہنماؤں نے مسلمانوں کی ہمدردی اور برطانوی حکومت کی مخالفت کے لیے تحریکِ خلافت میں شرکت کی اور اسے تحریکِ آزادی کا ایک معرکہ بنادیا۔ اس طرح ملک میں نہ صرف مذہب و سیاست کی وہ یکجائی

ہوئی جو مسلمانوں کو نظریاتی طور پر مطلوب تھی بلکہ وہ قومی یک جہتی بھی پیدا ہوگئی جو تحریکِ آزادی کی کامیابی کے لیے درکار تھی۔ چنانچہ قومی سیاست کا قوام ملک میں مشترکہ قومیت کے تصور سے تیار ہوا۔ اس قوام سے مولانا آزاد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وہ کام لینا چاہتے تھے جس کا تہیہ وہ میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہوئے بیس سال قبل اپنی فکری زندگی کی بالکل ابتدا میں کر چکے تھے۔ لہٰذا لاہور میں ۱۸۔۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو جمعیتہ العلمائے ہند کا خطبۂ صدارت ارشاد کرتے ہوئے وہ علمائے دین کو یاد دلاتے ہیں:

"ہمارے کاندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق کی شہادت اور امتِ مرحومہ کی احیا و تجدید کا عظیم الشان کام ہے۔"

(ص ۸۹ خطباتِ آزاد)

آگے چل کر اس خطبے میں مولانا "مسئلۂ احیا و تجدیدِ ملت" کو جمعیتہ العلما کے قیام کی اصل وجہ بتاتے ہوئے "اصلاح دینی کے مبادیات" کی تشریح کرتے اور ان کی دعوت و تبلیغ کو ۱۹۱۲ء میں الہلال کی اشاعت کا مقصد قرار دیتے ہیں:

۱۔ "اسلام کے نظمِ شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔"

۲۔ "مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔"

۳۔ "اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعتِ اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔"

۴۔ "مسلمانوں سے ابتدا و اتباعِ شریعت مہجور نہیں ہوا مگر علمائے اسلام کی غفلت و اعراض سے۔" (ص ۱۱۔۱۲، خطباتِ آزاد)

اب مولانا آزاد چاہتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں علمائے اسلام اپنا منصبی فریضہ ادا کریں اور "افراد قوم کی شیرازہ بندی" "یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی" کے بجائے، حیاتِ اجتماعی کے لیے اسلام کے تجویز کیے ہوئے نظم کی بنیاد پر کریں۔

(ص ۱۲۰ خطباتِ آزاد)

یہاں ایک بار پھر مولانا نے "قوم" کا لفظ ملتِ اسلامیہ کے لیے استعمال کیا ہے، جب کہ اس سے قبل وہ اصلاح دینی کے مبادیات بتاتے ہوئے "مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل" قرار دے چکے ہیں۔ اس کے بعد دلی میں ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسِ خصوصی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ترکوں کی فتح پر مبارکباد ان لفظوں میں دیتے ہیں:

"انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے، نہ کوئی قومیت اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔" (ص ۱۶۳ خطباتِ آزاد)

لیکن آگے چل کر اس خطبے میں مولانا تحریک خلافت میں اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار پھر واضح کرتے ہیں کہ یہ خدمت "نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے بلکہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے میرا قومی فرض ہے" (ص ۱۷۱)، اس تاریخی خطبے کے تقریباً آخر میں مولانا نے "ہندو مسلم اتحاد" پر وہ مشہور زمانہ بیان دیا کہ اس اتحاد کے بغیر آزادی ملی تو پورے "عالم انسانیت کا نقصان" (ص ۲۰۵) ہوگا جسے گوارا کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے "ہندوستان کی متحدہ قومیت" (ص ۲۰۹) پر تاکیدی نشان لگاتے ہوئے ہندوستان کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو مطمئن کرکے تحریکِ آزادی میں متحدہ طور پر شامل ہونے کا موقع دینے کے لیے ایک "میثاقِ ملی" کا ذکر کیا۔

متحدہ قومیت کا تذکرہ مولانا آزاد آل انڈیا خلافت کانفرنس، منعقدہ کانپور، ۱۹۲۵ء میں بھی کرتے ہیں، جب کہ اس کے بعد جمعیتہ اہلِ حدیث کو کلکتہ، ستمبر ۱۹۳۴ء میں خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی بھی ہو سکتا ہے، تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے دوسرا کوئی نہیں۔" (ص ۲۴۹ خطباتِ آزاد)

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مولانا آزاد نے قومیت کے تصور کی جو کچھ وضاحت کی وہ ایسے وقت میں تھی جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں مسئلۂ قومیت نے وہ رنگ پورے طور پر اختیار نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں بالآخر ملک تقسیم ہوگیا اگرچہ اس کے ابتدائی آثار تو تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے زمانے سے نمایاں ہونے لگے تھے اور اس سے بھی پہلے برطانوی سیاست اس کی تخم کاری انیسویں صدی کے اواخر میں کر چکی تھی۔ ۱۹۳۴ء تک مولانا نے اس مسئلے پر جو کچھ اظہارِ خیال کیا اس کا ماحصل یہ تھا:

۱۔ ملتِ اسلامیہ ایک مستقل وجود [illegible] ہے اور اس کی تنظیم و ترقی ہمیشہ اس کے اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہوگی۔

۲۔ [illegible] کی ضرورت اس وقت ہوگا جب ملک آزاد ہو جائے:

۳۔ ملک کی آزادی کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ تحریک ضروری ہے۔

۴۔ یہ تحریک سیاسی میدان میں یک متحدہ قومیت کی بنیاد پر ہی چلائی جا سکتی اور کامیاب ہو سکتی ہے۔

۵۔ ایک آفاقی ملت ہونے کے اعتبار سے ملتِ اسلامیہ کے عالی مفاد کا تقاضا ہے کہ وہ ہر حال میں ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانے کی موثر جدوجہد کرے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر اٹھے۔ اس کے بعد انھیں تحریکِ آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ ابھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک ایسا انتشار پیدا کرنے لگا تھا جسے دور کیے بغیر نہ ملت کی صلاح و فلاح کا سامان ہوتا نظر آتا تھا نہ ملک کو آزادی و ترقی نصیب ہونے کی توقع تھی مغربی تصورِ جمہوریت نے عقیدے کے لحاظ سے آبادی کو اکثریت و اقلیت میں تقسیم کر کے قومیت کے مسئلے کی پیچیدگی بہت بڑھا دی تھی، خاص کر اقلیت کے دل میں اکثریت کی جانب سے شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اور اکثریت میں بھی ایسے عناصر نمایاں ہونے لگے تھے جو ان شبہات کو اپنی بعض سرگرمیوں سے تقویت دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ تعداد کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب مسلمانوں پر اکثریت کے بعض حلقوں کے خیالات و اقدامات کا ردِ عمل ہونے لگا، نتیجتہً فرقوں کے درمیان اعتماد کا ایک بحران پیدا ہوا اور مسلمان اپنے ملی وجود کے تشخص و استقلال کے طلب گار ہوئے۔ چنانچہ آزادی کی راہ میں ایک مشکل فرقہ وارانہ مسئلہ چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔

یہی وہ صورتحال تھی جس میں مولانا آزاد کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ منعقدہ ۱۹۴۰ء میں اپنے سیاسی موقف اور تصورِ قومیت کی وضاحت ان ولولہ انگیز الفاظ میں کرنی پڑی:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

(خطباتِ آزاد۔ ۲۹۷۔ ۹۸)

اس اصولی وضاحت کے بعد مولانا نے ہندوستان کو اسلام کی دین "جمہوریت اور انسانی مساوات" وغیرہ کا سراغ لگاتے ہوئے ملکی سیاست میں ابھرے ہوئے فرقہ وارانہ سوال کا یہ قطعی جواب دیا۔

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی اس پر مہر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

(ص۔۔۳۰ خطبات آزاد)

ان بیانات میں قومیت کو ایک قدرتی چیز، ایک ثابت شدہ واقعہ قرار دیا گیا ہے، جو اپنے وقوع کے لیے کسی جماعت کی سیاست اور کسی ادارے کی قانون سازی کا محتاج نہیں، اس میں نظریاتی قوم پرستی (Nationalism) کا کوئی شائبہ نہیں، ایک فطری قومیت (Nationality) کا اعلان ہے، جو ایک جغرافیائی و تاریخی حقیقت ہے اور انتظامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی قومیت ملک کے تمام باشندگان کے درمیان مشترک ہے، خواہ ان کے عقائد و اطوار کتنے ہی مختلف ہوں، اور اسی متحدہ قومیت کی ضرورت تقسیم ہند سے قبل تحریکِ آزادی کی قومی سیاست کو تھی جس کی علم بردار اس وقت مولانا آزاد کے زیرِ صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی تھی۔

اس متحدہ قومیت کے عناصر و عوامل یکساں اور مساوی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں تھے، خواہ مذہب اور کلچر کے لحاظ سے ان کے درمیان جو فرق و اختلاف ہو اور وہ اپنے اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ جتنا بھی فخر کریں، وہ جس طرح چاہیں پوری آزادی، بے خوفی، اطمینان اور اعتماد کے

سائنس اس ورثے کے تحفظ و ترقی کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اسلام پر قائم رہتے ہوئے جہاں تک مسلمانوں کی وطن دوستی اور قوم پروری کا تعلق ہے، مولانا آزاد کے بہ قول "اسلام کی روح" خود اس راہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور ملک کی فلاح و ترقی کی جدوجہد میں "اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب" سدِّ راہ نہیں ہوتی، بلکہ ممد و معاون ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ملک میں اس تعلیم، اس تاریخ، ان علوم و فنون اور اس تہذیب کا فروغ بھی اسی وقت ممکن ہے جب ملّتِ اسلامیہ کے افراد اہلِ ملک کے ساتھ مل کر اپنے قدرتی وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد کے اندر مسلمانانِ دلّی کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے یاد دلایا:

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔"

(ص۔ ۳۰۸ خطباتِ آزاد)

دو قومی نظریے کو حیاتِ معنوی کے لیے مہلک بتانے کے بعد مولانا آزاد کی پوری توجہ دنیا میں قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی ہلاکت آفرینیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ دسمبر ۴۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے ارشاد کیا:

"اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگِ گراں کا حکم رکھتی ہے ...... سیاسیات میں یہ روگ قومیت کا چولا پہن کر آتا ہے۔ علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کی اقلیم میں یہ خرابی قومیت اور وطنیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔"

(ص۔ ۱۸۱۔ آزاد کی تقریریں مرتبہ انور عارف، نیو تاج آفس دہلی)

یہ نہ صرف تقسیمِ ہند کی لکیر کے دونوں طرف نوزائیدہ سیاسی قوموں کی جارحانہ قوم پرستی کی تباہ کاریوں پر مولانا آزاد کا ردِّ عمل اور تبصرہ ہے، بلکہ اس سیاق و سباق میں آگے چل کر وہ عصرِ حاضر کی نظریاتی قوم پرستی کا ایک تاریخی تجزیہ کر کے اہلِ ملک کو آفاقیت کا پیغام دیتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ انیسویں صدی کے یورپ میں جس قومیت کے چرچے تھے اس کے تار و پود بکھر چکے ہیں۔ اور آج دنیا میں قومیت کی قبا کسی کے جسم پر بھی چست و راست نہیں آتی۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ قیود جلد از جلد اٹھا دی جائیں۔ آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق القومیت کی طالب ہے۔ عصرِ حاضر میں تنگ نظری کے لیے مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اقوامِ عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے جب ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل ہو جائیں۔"

اس کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی یادگار کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا نے نئی دہلی میں اہلِ ملک کو خبردار کیا۔

"یہی حال قومی حد بندی کا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی تعارف تھا، یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی، جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی، جب اپنی حد سے گزر جاتی ہے تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوئی ہیں۔"

(ص ۳۲۶ خطباتِ آزاد)

یہاں اشارہ بیسویں صدی کی قوم پرستانہ عالمی جنگوں کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ یونیسکو اور بین الاقوامیت پر ۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو نئی دہلی میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"اگر ہمارے پیشِ نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے اور اس چیز پر سب متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے، تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہرت کی خاطر نئی پود کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہونی چاہئیں۔"

(ص ۲۱۸۔ آزاد کی تقریریں)

اس سلسلے میں تمام بنی آدم کو بہ اعتبار تخلیق ایک جوہر سے متعلق اور کائنات کے تمام افراد کو ایک دوسرے کا گوشت پوست قرار دیتے ہوئے مولانا نتیجہ نکالتے ہیں:

"انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی، آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اعتماد کے باوجود جب تک قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہیں ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔"

(ص۔ ۲۲۲۔ آزاد کی تقریریں)

مولانا آزاد یونیسکو کا سب سے بڑا کارنامہ "انسان کے بنیادی حقوق کا ایک نیا اور عالمگیر اعلان" بتاتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے جون ۵۱ء میں یونیسکو کے اجلاس پیرس میں یونیسکو کے نصب العین پر بولتے ہوئے کہی۔ اس کے بعد نومبر ۵۱ء کو یونیسکو

کی جنرل کانفرنس کے نویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے بین الاقوامی کشیدگی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ امن عالم کے لیے بقائے باہمی کا یہ نسخہ تجویز کیا:

"ہر شخص اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام اقوام کو حق خود اختیاری حاصل ہے۔ اب نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر ملک کو اپنے ہی طرز کی سوسائٹی اور حکومت پسند کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور اس معاملے میں کسی دوسرے ملک کو اپنا حکم جتانے کا حق نہیں ہے۔" (ص ۲۷۲۔ آزاد کی تقریریں)

یہ آفاقی تصور انسانیت کی وہ وسیع النظری اور رواداری ہے جس پر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی مولانا آزاد سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ آفاقیت مولانا آزاد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اوّل روز سے ایک نصب العین کے طور پر اسے اپنی تمام سرگرمیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس لیے کہ جس اسلامی نظریے کا پیغام وہ دنیا کو دینا چاہتے تھے اس کا کلمہ اسی آفاقیت پر مبنی تھا۔ وہ ایک خدا ایک انسان کے قائل تھے۔ اس معاملے میں اصولاً ان کے اور اقبال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ تحریک آزادی کے دوران میں مسئلہ قومیت پر بعض جہتوں سے دونوں کی رایوں میں اختلاف ہوا تو دراصل سیاستِ وقت کے متعلق دونوں کے اندازوں میں فرق پر مبنی تھا۔ نظریاتی قوم پرستی نہ اقبال کا مقصود تھا نہ آزاد کا۔ لیکن آزاد سیاسی قومیت پر زور دیتے تھے، جب کہ اقبال بہ یک وقت بین الملیت اور بین الاقوامیت دونوں پر تاکیدی نشان لگاتے تھے۔ اس جہت سے اقبال نے ملک کے شمال مغربی خطے میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے ملّی استقلال کی تجویز پیش کی، جب کہ آزاد نے مسلم آبادی کے علاقوں کی صوبائی خود مختاری کو کافی سمجھا۔ درحقیقت یہ ملک کی آزادی میں حائل ہونے والے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تھا جو اقبال اور آزاد نے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق پیش کیا۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد یہ مسئلہ اصولی طور پر اپنے آپ تحلیل ہو گیا اور دونوں ملکوں میں انتظامی قومیت کا قانون نافذ ہو گیا۔ جہاں تک فرقہ وارانہ اتحاد کا تعلق ہے، اقبال اور آزاد دونوں ہی اس کے مبلغ تھے۔ لیکن آزادیِ ہند کے بعد ظاہر ہے کہ تبلیغ کا رُخ بدل گیا۔

اس صورت واقعہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں عالمی سیاست کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اہل ملک اور پوری دنیا کو بین الاقوامیت کی تلقین کریں، تا کہ جارحانہ قوم پرستی ماضی قریب کی طرح آئندہ بھی انسانیت کے لیے ایک لعنت نہ بن جائے اور بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے بعد تیسری کسی جنگ کا سدّ باب ہو، بنی آدم کو باہمی کش مکش اور غارت گری سے نجات ملے، بقائے باہم کے اصول پر پائدار امن قائم ہو اور تعمیر و ترقی کے منصوبے روبہ عمل آسکیں۔

اس طرح واضح ہے کہ مولانا آزاد کا تصو
قومیت بہ یک وقت وطن دوستی اور انسان د
سے مرکب ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستانی قوم کی آزا
اصلاح اور ترقی پر سارا زور اسی لیے دیتے تھے
اپنی بود و باش کے مخصوص خطّے میں اپنے خاص ا
سے وہ پوری انسانیت کی خدمت کرنی چاہ
تھے اور بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موجودہ بین ال
دور میں ایک آفاقی نقطۂ نظر کے بغیر نہ تو دنـ
کے کسی گوشے میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ نہ وہا
کے باشندوں کی صلاح و فلاح کے لیے کوئی م
کام ہوسکتا ہے۔ اصولی طور پر مولانا آزاد اپـ
اسلامی نظریۂ حیات کے تحت تمام مخلوقات
اللہ کا کنبہ تصور کرتے تھے اور عملی طور پر ہندوستـ
میں یہاں کے تمام فرقوں اور طبقوں کو متحد کر
حریت، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ا
سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی بہبود
لیے کوشاں تھے۔ مولانا آزاد کا یہ موقف ج
ہندوستان کے بہترین مفادات کا تحفظ اس
طرح کرتا ہے جس طرح عصر حاضر کے عالم انسان
کے بلند ترین مقاصد کا۔

مولانا ابوالکلام آزاد — ایک دُور افتادہ صدا

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے مجاہدینِ آزادی کی صفوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، مگر ابوالکلام محض کسی سیاسی لیڈر کا نام نہیں ہے، وہ ایک روشن ستارہ تھا جو آسمانِ ہند پر اس لیے طلوع ہوا تھا کہ صبحِ آزادی کی آمد کا اعلان کرے اور بشارت دے کہ زندگی اب ایک نئی کروٹ لے رہی ہے۔ اب جو دن طلوع ہوگا وہ مظلوموں کی بالادستی اور ظالموں کی شکست و پستی کا دن ہوگا، وہ ایک شعلۂ جوالہ تھا جس نے ظلمتوں کے دامن کو تار تار کر دیا تھا۔ اُس کے قلم نے نصف صدی تک ایسی آگ برسائی کہ سامراجیوں کی توپ و تفنگ کو تودۂ خاکستر میں بدل دیا۔ اُس کی زبان نے اپنی خطابت سے وہ سیلِ بے اماں پیدا کر دیا کہ سامراج کے سفینے کو دامنِ ساحل تک پہنچنا دوبھر ہو گیا۔

مولانا آزاد پچھلی صدی کے نصف آخر کی پیداوار تھے اور موجودہ صدی کے نصف اول پر چھائے رہے۔ اس طرح انھوں نے دو صدیوں کے قدیم و جدید گہواروں میں پرورش پائی۔ قدیم نے ان کو سنوارا تھا تو جدید نے نکھارا تھا۔ اُن کے ذہن میں حدت ہی نہیں جدت بھی تھی۔ خیالات تر و تازہ اور شاداب تھے۔ افکار میں مذہب، فلسفہ اور سماجی علوم کا ایک سنگم بن گیا تھا جس میں مشرق و مغرب کے دھارے یوں پیوست ہو گئے تھے کہ قدامت کی آبرو اور جدت کی آب و تاب دونوں اپنی جھلک دکھاتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

"جو کچھ قدیم ہے وہ ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔ خاندانی تعلیم اور سوسائٹی نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں روک نہ ہو سکیں۔ تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا۔"

انھوں نے رائج الوقت معیار کے مطابق عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی، اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینیات کا ناقدانہ مطالعہ کیا۔ اور علومِ قرآنیہ میں گہری بصیرت پیدا کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ انگریزی ادبیات سے اور عمر کے آخری دور میں فرانسیسی ادب سے بھی واقفیت حاصل کرتے رہے۔ مبداءِ فیاض سے اجتہادی فکر کا ملکہ ودیعت ہوا تھا۔ اوائل عمر ہی سے اپنے ماحول کا سکوت و جمود توڑنے کے لیے وہ ایک انقلابی صدا اور ایک باغی کی للکار بن گئے۔ یہی جذبہ اُنھیں میدانِ سیاست میں کھینچ لایا۔ اور انھوں نے تقریباً نصف صدی تک اپنے قلم سے اور اپنی شعلہ بار خطابت سے ایسا جادو جگایا کہ غلامی کی زنجیروں میں ہانپتے ہوئے ہندوستانیوں کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور اُن میں ایسی غیرت اور اتنا حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ ان سلاسل کو ریزہ ریزہ کر دیں اور آزادی کے میدان میں قدم بڑھاتے ہوئے ترقی کی منزلوں میں اقوامِ عالم کے ہمدوش ہو جائیں۔

سیاست میں مولانا آزاد کا نظریہ خالص وطن پرستی اور متحدہ قومیت کا نظریہ تھا۔ انھوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مذہب کے دائرے سے نکل کر وہ اپنی شناخت کرانے پر کبھی راضی نہ ہوئے، مگر انھوں نے مذہب کو اپنے سیاسی نظریات پر غالب نہ آنے دیا اور بڑے قومی مفاد کو مذہبی تنگ نظری کی قربان گاہ پر کبھی نہیں چڑھایا۔ مولانا آزاد کا میدانِ سیاست میں کودپڑنا کسی ذاتی مفاد یا نام و نمود کی خواہش کا تقاضا نہیں تھا۔ غالب نے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ میں کچھ اپنی خوشی سے شعر نہیں کہتا، بلکہ خود شعر نے یہ خواہش کی کہ وہ میرا فن بن جائے:

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اسی طرح سیاست نے مولانا آزاد کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اگر وہ غلامی کا دور نہ ہوتا، اہلِ وطن ذلت اور استحصال کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے تو مولانا آزاد کبھی سیاست کا رخ نہ کرتے اور اپنے فکر و فلسفے کے عالمِ دیگر میں مگن رہتے، مگر آزادیِ وطن کے لیے انھوں نے اتنی بڑی قربانی دی کہ اپنا اعلیٰ پایے کے علمی کارنامے بھی نامکمل چھوڑ دیے، یہ علمی دنیا کا ایسا نقصان اور ایسی حرماں نصیبی ہے جس کی کبھی تلافی نہیں ہو سکتی۔

نثار احمد فاروقی

ڈی ۱۱۔ ۱۱، مرکز انگریزی ادب، یونیورسٹی، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

میدانِ سیاست میں جس نظریاتی پلیٹ فارم پر انھوں نے پہلے دن اپنے قدم جمائے تھے ان میں کوئی لرزش یا لغزش نہ آنے دی، نہ اغیار کی بے اعتنائی سے افسردہ ہوئے نہ اپنوں کی بیوفائی سے آزردہ۔ مگر ایک موقع پر دل کا ٹانکا کھل گیا تو کیسی حسرت سے کہتے ہیں:

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے، تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامے کے بندے اور وقتی جذبات و انفعال و ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔"

دوسرے ایک موقع پر انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ:

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کے منبر سے ان کی وہ آخری صدا گونجی تھی جس میں ابوالکلام کا پورا جلال و جمال موجود تھا۔ اس کے بعد تو وہ میر کے لفظوں میں "منقار زیر پر" ہی رہے اور رسمی تقریروں سے زیادہ ان کی زبان سے کچھ اور نہ نکلا۔ انھوں نے کیسے دل کو چھونے والے لفظوں میں کہا تھا:

"سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں، ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی بے وطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ ____ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو، یہ

> ...مولانا آزاد کا سیاست میں کود پڑنا کسی ذاتی مفاد یا نام و نمود کی خواہش کا تقاضا نہیں تھا۔ اگر وہ غلامی کا دور نہ ہوتا، اہلِ وطن ذلت اور استحصال کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے تو مولانا آزاد کبھی سیاست کا رخ نہ کرتے اور اپنے فکر و فلسفے کے عالمِ دیگر میں مگن رہتے...

ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے ____ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا، جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں، ____ آج ہندوستا
کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے، یہ وہ
جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل
آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

مولانا آزاد نے سیاست کے لیے
صحافت کی راہ اختیار کی، الہلال اور البلاغ اُرد
ہی میں نہیں بلکہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں
بقائے دوام کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ الہلا
گھپ اندھیرے میں روشنی کی تیز کرن بن کر پھوٹا
جس نے خواص کے دل و دماغ کو جھنجھوڑا اور
عوام کے لہو کو گرمایا۔ آزادیِ ہند کی تاریخ میں
الہلال کی خدمات کو فراموش کر دیا جائے تو ا
سے بڑی احسان فراموشی اور کچھ نہیں ہو سکتی

مولانا ایک دانشور تھے۔ عصری مسائ
ان کی نظر گہری تھی، اپنی خطابت میں وہ نہایت
جذباتی اور انقلابی تھے مگر ان کے سیاسی نظریا
جذبات کی پیداوار نہیں تھے وہ ٹھنڈے منطق
دماغ سے مسائل کا تجزیہ کرتے تھے، اور وقتی
جوش میں بہہ نہیں جاتے تھے۔ ان کا ذوقِ جمالیا
بھی رچا ہوا اور منفرد تھا، وہ مذہبی عالم ہونے
باوجود موسیقی اور مصوری کے رموز و لطائف
سے بھی آگاہ تھے اس کا اندازہ غبارِ خاطر کے مط
سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ فارسی عربی اور اُردو
ادب کا بھی بڑا ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے ا
اپنی تحریروں میں اشعار نگینوں کی طرح جڑ د
تھے۔ ان کا اسلوبِ نثر بھی یگانہ و یکتا تھا جس
میں ہندوستانی بولی کی صلابت اور کھرا پن، فا
کی جاذبیت و شیرینی، عربی خطابت کا جلال و
جبروت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہو
دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظر حکیمانہ، دماغ فلسفہ

احساس شاعرانہ اور مزاج قلندرانہ تھا وہ لکھتے یا بولتے تھے تو "ماورائے سخن" بھی ان کے جذبات کوندے کی طرح لپکتے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے سیلِ افکار میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے ہیں ہندوستان کی سیاسی تاریخ نے ان سے بڑا خطیب اور مقرر پیدا نہیں کیا جس کی آواز دل کے بعید ترین گوشوں سے ٹکراتی تھی۔ مولانا آزاد کے علم و فضل اور فکر و فلسفے نے ان کی شخصیت کے گرد متانت اور وقار کا ایک ایسا حصار بھی کھینچ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کبھی "عوامی لیڈر" نہیں بن سکے یعنی عوام سے ان کا رابطہ اتنا براہِ راست نہیں تھا جیسا مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تھا۔ تحریکِ آزادی میں اور حصولِ آزادی کے بعد بھی مولانا آزاد کی حیثیت دماغ کی سی تھی، گاندھی جی اس تحریک کا ضمیر اور پنڈت نہرو اُس کا قلب تھے۔

مذہب میں اجتہادی راہ نکالنا آسان نہیں بلکہ پُرخطر ہے۔ مولانا آزاد کی مذہبی فکر میں بھی مجتہدانہ شان ہے، انھوں نے مذہبی مسائل اور مباحث پر بھی گہری بصیرت اور فکر کے ساتھ لکھا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک قرآنِ کریم کی سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، مولانا آزاد نے بھی ترجمان القرآن لکھنی شروع کی جو افسوس کہ ناتمام رہ گئی مگر اس نقش ناتمام میں بھی اُن کی منفرد شان پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔ سورۂ فاتحہ کی جیسی تفسیر مولانا آزاد نے لکھی ہے اُسے علومِ قرآنیہ کے ذخیرے میں ایک قابلِ فخر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد بلاشبہ ایک عبقری (GENIUS) ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور اپنی وضع کے طرح دار دانشور تھے جو آخری دور میں آئے مگر بقول ابوالعلاء المعرّی وہ چیزیں لے کر آئے جو ان کے پیشرو نہ لا سکے تھے مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا آزاد جیسے دانشوروں کی منڈی میں کساد بازاری کا سکہ چل رہا تھا اور طوقِ زرّیں کے لیے "گردنِ خر" ہی کو حقدار سمجھا جاتا تھا، عربی کے مشہور شاعر ابوالطیبُ المتنبی کا شعر ہے:

> ذُو العقلِ یَشقیٰ فِی النَّعیمِ بِعَقلِہٖ
> وَاَخُو الجَہالَۃِ فِی الشَّقاوَۃِ یَنعَمُ

یعنی ایک دانشور نعمتوں میں رہ کر بھی روحانی کرب و اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور ایک جاہل انسان اذیتوں میں بھی عیش کر لیتا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں سے ان کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ انھوں نے پوری زندگی ایک عظیم قومی مقصد کے لیے وقف کر دی، عمرِ عزیز کا بہترین حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذار دیا۔ ایثار اور قربانی کے ہر موقعے پر آگے آئے اور ایسی بھرپور زندگی گذار کر بھی اس طرح چلے گئے جیسے کوئی درویش دامن جھاڑ کر اٹھ جاتا ہے۔ انھیں یقیناً اس کا صدمہ تھا کہ ان کی انتہائی مزاحمتوں کے باوجود ملک تقسیم ہوا اور لاکھوں انسان آوارہ و بے خانماں ہوئے لیکن تقسیم کے بعد وہ برِصغیر میں امن و آشتی کے سب سے بڑے علمبردار اور صلح و بقائے باہم کے طلب گار بھی رہے۔ انھوں نے آزادی کے بعد اس ملک کی تعمیرِ نو میں اور مستقبل کا خاکہ بنانے میں پس پردہ رہ کر بہت اہم رول ادا کیا۔ وہ پنڈت نہرو کے سب سے زیادہ معتبر مشیر تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس ملک کو جہاں پانسو سے زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں، بھانت بھانت کی رسمیں اور مختلف مذاہب ہیں، تہذیب و ثقافت کی ایک طویل اور رنگ برنگی تاریخ ہے، اگر کسی ایک شیرازے میں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے تو وہ قومی اتحاد و یک جہتی، سکولرازم اور باہمی رواداری کی ڈور ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے رہنما خطوط بھی بنائے مگر فرقہ پرستی کی زہریلی ہواؤں کے جھکّڑ ہر نقشے کو مٹاتے رہے، اس نے بھی آخر عمر میں مولانا آزاد کے ذہنی و روحانی کرب کو دوچند بلکہ دہ چند کر دیا تھا۔ اگر غیروں کی حکومت ہوتی تو وہ ایک بار پھر میدان میں کود پڑتے مگر اب جو بساط بچھی تھی اس کے بچھانے میں تو خود ان کا ہاتھ بھی شامل تھا اس لیے فریاد کرتے تو کس سے کرتے؟ وہ اپنے کنجِ عزلت میں سمٹتے گئے اور بقولِ خود ایک دور افتادہ صدا بن کر رہ گئے۔

مگر ہم ہوش کے کانوں سے سنیں تو اُس مردِ مجاہد کی وہ "دور افتادہ صدا" آج بھی فضا میں لرزش پیدا کر رہی ہے، وہ شعلۂ نوا آج بھی رہ رہ کر ہمارے دلوں کی طرف لپک رہا ہے مگر ہم نے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی ہیں، وہ آواز آتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح پلٹ جاتی ہے اس مردِ آگاہ کی زندگی میں کسی نے اُسے نہ پہچانا تو اب جبکہ تین نسلوں کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو کر حجاب بن گیا ہے "اب کون پہچانے گا" جب وہ للکار رہا تھا اس وقت کسی نے کان نہ دھرے تو اب کون سُنے گا؟ بقول میر تقی میر:

> سنگ کو موم کریں پل میں ہماری باتیں
> لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

⬡

میرِ کارواں

محمد عثمان عارف نقشبندی
گورنر اتر پردیش، راج بھون لکھنؤ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ۔ نام ہے اس عظیم المرتبت شخصیت کا جو بیک وقت ایک بلند پایہ ادیب و انشاپرداز، جلیل القدر صحافی منفرد سیاست داں، ممتاز مفسرِ قرآن، عدیم المثال محدث، مایۂ ناز مفکر اور شہرۂ آفاق مجاہد آزادی کی حیثیت سے مشہور و معروف رہی ہے۔ دراصل مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت متنوع اذواق و اشواق کا مجموعہ تھی۔ انھوں نے غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیت سے ادبی، صحافتی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر اپنی تقریر و تحریر سے ایسے لافانی نقوش چھوڑے ہیں، جن کی مثال مفقود ہے۔

دراصل مولانا آزاد جیسی عظیم المرتبت شخصیت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی تو لاکھوں برس سے پیدا ہوتے ہی رہے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، مگر آدمیوں کے اس انبوہ میں کتنے ایسے ہوتے ہیں، جنھیں میرِ کارواں کہا جاسکا اور قدرت نے ان کے اندر وہ اوصاف و محامد جمع کر دیے جن کی طرف شاعرِ مشرق نے اشارہ کیا ہے:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

مولانا ابوالکلام آزاد کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو ان کی شخصیت ان اوصاف کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے وہ ان قومی رہنماؤں میں سرفہرست تھے جو کردار اور گفتار دونوں کے غازی ہوتے ہیں۔ وہ عظیم مفکر، زبردست عالم، آتش نوا مقرر، صاحبِ طرز ادیب اور انشاپرداز، بے مثال صحافی اور اخبار نویس ہی نہ تھے بلکہ فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تاریخ و سیر میں بھی ان کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔ ان کی ذہانت، طباعی اور نکتہ رسی نے ملکی سیاست میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، جہاتما گاندھی اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم رہنما سیاسی پیچیدگیوں میں ہمیشہ ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ تاریخی شخصیت تو تھے ہی لیکن انھوں نے تاریخی کارناموں کے علاوہ تاریخ ساز کارنامے بھی انجام دیے۔ ان کارناموں کی رنگارنگی اور کثرت تاریخ لکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ عام طور پر تاریخی شخصیتیں اپنے کارناموں کو کسی ایک میدان تک ہی محدود رکھتی ہیں لیکن مولانا آزاد نے سیاست، صحافت، ادب، تاریخ اور فلسفہ ہر میدان میں محیر العقول کارنامے انجام دیے۔ ان کا تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ ان کے والد نے تاریخ پیدائش اس مصرعے سے نکالی تھی:

جواں بخت و جواں طالع جواں باد

اس مصرعے کو مولانا کی زندگی کی تفسیر کہا جاسکتا ہے۔ مولانا کے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوگئے تھے اور یہ تینوں خاندان ہندوستان اور حجاز کے بہت ہی ممتاز اور باعزت خاندان میں شمار کیے جاتے تھے۔ قدرت نے علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اتنے اوصاف و محامد مولانا کے خاندان میں جمع کر دیے تھے کہ جن کی بدولت اس کی عظمتوں کا محاصرہ ناممکن نظر آتا ہے۔

اپنے بچپن میں ہی مولانا نے ادب اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے پہلا مضمون لکھا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ ۱۹۰۲ء سے ان کے مضامین اس زمانے کے بلند پایہ رسالے مخزن لاہور میں شائع ہونے لگے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا نے اپنا رسالہ "لسان الصدق" کلکتہ سے شائع کیا۔ اس رسالے نے، حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کو بہت متاثر کیا۔ انھیں دنوں لاہور میں مولانا وحیدالدین سلیم نے جب مولانا آزاد کا تعارف حالی سے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں، تو حالی کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھیں یقین ہی نہیں آیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ مدیر "لسان الصدق" کے صاحبزادے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا الندوہ لکھنؤ کے مدیر رہے۔ اس زمانے میں ان کے قلم سے جو علمی و ادبی تحریریں نکلیں انھوں نے ان کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگا دیے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مختصر مدت

اخبار "وکیل" امرتسر میں گزار دی لیکن مولانا آزاد کی علمی ادبی اور صحافتی شہرت کا دار و مدار "الہلال"، "البلاغ"، "تذکرہ"، "الہلال دورِ جدید"، "ترجمان القرآن" اور "غبارِ خاطر" کا مرہونِ منت ہے۔ یہ مولانا کے ایسے شاہکار ہیں کہ جس کی مثال اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کی تحریر ہو یا خطابت دونوں میں سمندر کی وسعت، پہاڑ کی عظمت، دریا کی روانی، طوفان کی تیزی اور نسیم سحر کی نرمی جھلکتی ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے متعدد علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ طب، فلسفہ، منطق، مذہب، تاریخ، ادب، موسیقی، نفسیات اور جغرافیہ غرض کون سا موضوع ہے جس پر مولانا نے عمیق مطالعہ نہ کیا ہو۔ اسی طرح ان کی تصنیفات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ قدرت نے انھیں حافظہ اتنا غضب کا دیا تھا کہ جو چیزیں ایک مرتبہ مطالعے سے گزر جاتیں تقریباً حفظ ہو جایا کرتی تھیں۔ مطلب، مفہوم اور اشعار ہی نہیں پوری پوری عبارتیں اور مکالمے تک انھیں یاد ہو جاتے تھے۔ اور وہ اکثر یہ تک بتا دیتے تھے کہ کون سی عبارت کس کتاب سے لی گئی ہے اور یہ کہ عبارت کتاب کے داہنے صفحے پر ہے یا بائیں صفحے پر نیز یہ کہ صفحے کے شروع میں ہے، وسط میں یا آخر میں۔

"تذکرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "جو کچھ پایا ہے صرف عشق کی بارگاہ سے پایا ہے، جتنی رہنمائیاں ملیں صرف مرشدِ فیض و ہادیِ طریق سے ملیں۔ علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اسی کی زبان پڑھے، حقیقت کے خزانے اسی کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلّم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے بتلائے۔ اسرار اسی نے کھولے، نظر اسی نے دی۔ دل اسی نے بخشا، کون سا الجھاؤ تھا جو اس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا۔ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اس دارالشفا سے نہ مل سکی۔" اسی عشقِ حقیقی سے مولانا کو علم القرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور حاصل ہوا۔ اسی نے آپ کو سیاست، فلسفہ اور تاریخ کا عالم بنایا۔ اسی نے آپ کو شعر و شاعری اور فنِ تنقید کا

> ...مولانا ابوالکلام آزاد ان کے قومی رہنماؤں میں سرِ فہرست تھے جو کردار اور گفتار دونوں کے غازی کہلاتے ہیں۔ ان کی ذہانت، طباعی اور نکتہ رسی نے ملکی سیاست میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مہاتما گاندھی اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم رہنما سیاسی پیچیدگیوں میں ہمیشہ ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے...

ماہر و کامل بنایا۔ اسی کی بدولت ان میں سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور عوام میں صحیح قسم کا مذہبی اور سیاسی شعور بیدار کرنے کا سلیقہ عطا ہوا۔

آزادی کی جد و جہد اور غیر ملکی حکومت کی مخالفت انھوں نے تحریکِ آزادی کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ "الہلال" ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا تھا ۱۹۱۵ء میں اس کی ضمانت ضبط ہو گئی اور ۱۹۱۵ء میں اسی مخالفت کی وجہ سے مولانا کو بنگال سے جلا وطن کر دیا گیا۔ چار سال تک رانچی میں نظر بند رہنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب وہ رہا ہوئے تو گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اور اسی سال وہ گاندھی جی کی زیرِ قیادت تحریک ترکِ موالات میں شریک ہوئے۔ یہ رفاقت اور دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت و عزت آخر تک برقرار رہی۔ سیاسی مفکر اور قومی رہنما کی حیثیت سے مولانا کا تعارف کرانا بے انتہا مشکل ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے لیے صحیح فرمایا کہ وہ عام دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست داں ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالمِ دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندے اور شارح ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انھوں نے کبھی کوئی دقت محسوس نہیں کی۔

ان کی سیاست کی بنیاد شرافت پر تھی۔ وہ محکومی کو مسلمانوں کے ملّی وقار کے منافی مانتے تھے اور عالمِ اسلام میں اس عزت و وقار کی بحالی کے لیے ہندوستان کی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے تھے۔ "الہلال" کے اجرا کا یہی اصل مقصد تھا۔ مولانا اسلام کی آفاقیت، رواداری، انسان دوستی کے مفسّر بھی تھے اور مبلّغ بھی۔ اس لیے مسلمانوں کو غیر ملکی حکمرانوں کے سحر اور اثر سے نکال کر اہلِ وطن کے دوش بہ دوش آزادی کی جنگ میں صف آرا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق مانتے تھے جتنا کہ اس ملک میں رہنے والے دوسرے فرقوں کا ہے اور ان کا یہی تصور ملک کے لیے خدمات اور فرائض کے بارے میں بھی تھا۔ ان کی سیاسی زندگی میں فہم و فراست کی تابانی کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ انھوں نے آزادی کی قومی تحریک کے

سب سے زیادہ اہم اور طوفانی دور میں یعنی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک اس کی سربراہی جس ذہانت، نکتہ رسی اور ہوش مندی سے کی۔ اس سے حصولِ آزادی کی راہیں سمٹ گئیں اور اس کی منزل بہت قریب آگئی۔ مولانا آزاد ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد دیکھنے کے آرزومند تھے، مگر آزادی کے لیے ہندوستان کے سبھی فرقوں کے آپسی اتحاد کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے بارہا اس کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہاں کے ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ: "آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ آزادی ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی اور سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس اتحاد سے دستبردار نہ ہو سکوں گا کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا میل و محبت اور آپسی اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔"

مولانا آزاد نے اپنے بلند پایہ اخبارات کے ذریعے صحافت کے معیار کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا۔ "تذکرہ"، "ترجمان القرآن" اور "غبارِ خاطر" جیسے علمی و ادبی شاہکار آنے والی نسلوں کی رہبری کے لیے چھوڑے۔ ملک کی آزادی کے لیے دس سال سات مہینے قید و بند کی مصیبتوں میں گزار دیے اور "قولِ فیصل" کے ذریعے ایک ایسی گراں قدر یادگار چھوڑ گئے جو ایک مثالی سیاسی تعلیم ہے۔

مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی عظمتوں کا تذکرہ کیسے کیا جائے، "سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے"۔ وہ ہندوستان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے امین تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی سوئی ہوئی قوم کی روح کو بیدار کیا۔ وہ اپنے انداز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اور یہی خوبی اس عظیم شخصیت کی یگانگی کی دلیل ہے۔

عالم میں انتخاب — دِلّی

اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر سیّد نورالحسن لکھتے ہیں:

"مہیشور دیال صاحب نے "عالم میں انتخاب۔ دلّی" لکھ کر نہ صرف ان لوگوں کو ممنونِ احسان کیا ہے جنھیں دلّی سے پیار ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی زیر بار احسان کیا ہے جنھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر ناز ہے اور جو قومی یک جہتی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ مہیشور دیال صاحب کے اس قول سے چاہے پوری طرح کوئی متفق نہ ہو کہ یہ چیزیں دلّی کی دین ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خصوصیتوں کو بڑھاوا دینے میں جو ہاتھ دلّی کا ہے وہ شاید کسی اور شہر کا نہیں!"

تیرھویں صدی کی ابتدا میں دہلی ترکوں کی سلطنت کا پایۂ تخت بنا اور ایک کے بعد دوسری جگہ آبادی کے بننے کے باوجود دہلی کی رونق قائم رہی۔ مہیشور دیال صاحب نے لال کوٹ، کیلوکھڑی، تغلق آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، دین پناہ اور پرانا قلعہ، شیر گڑھ اور شاہ جہاں آباد کا ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ تفصیلی ذکر شاہ جہاں آباد کا ہے۔

لوگ کیسے مکانوں میں رہتے تھے، کیا ان کے شغل اور مشغلے تھے، پھیری والے کیا آوازیں لگاتے تھے، بچوں کے کھیل کود کیا تھے، کھانا پینا، دسترخوان، پان اور حقہ اور ان سے متعلق کہاوتیں، دلّی کے لوگ گیت، تہذیب اور وضع داری، داستان گوئی، تعلیمی ادارے، فنِ خطاطی، تشبیہیں اور استعارے، میلے اور تہوار، غرض کہ ہر وہ چیز جو طرزِ زندگی کی تصویر کھینچتی ہے، مہیشور دیال صاحب نے پیش کی ہے۔

مصنف : مہیشور دیال
صفحات : ۵۱۶
قیمت : ۵۴ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

مولانا آزاد اور مرزا غالب

مولانا غلام رسول مہر کی مشہور تالیف "غالب" (۱۹۳۶ء) شائع ہوئی اور مولانا کی نظر سے گذری تو انھیں لکھا:

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک مکمل سوانح عمری لکھنی چاہتے ہیں اگر یہ خیال ہوا ہوتا تو بہت سی باتیں آپ کو لکھ کر بھیج دیتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہر تیسرے چوتھے ورق کے بعد ایسے مقامات آئے۔ میرے لیے اس طرح کی معلومات کا زبانی کہہ دینا آسان ہے۔ لکھنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کروں گا کہ پہلی فرصت میں بعض ضروری باتیں لکھ کر بھیج دوں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں کام آئیں۔"

مہر صاحب نے مولانا کے خیالات اور معلومات سے استفادے کی یہ صورت نکالی کہ "غالب" کا ایک نسخہ بیچ بیچ میں سادہ ورق لگوا کر مولانا کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ نسخہ کئی سال تک مولانا کے پاس رہا۔ ان اوراق میں مولانا نے غالب اور اس عہد سے متعلق بہت سی یادداشتیں اپنی معلومات اور اپنے والد کی روایات سے تحریر فرمادیں۔ اور بعض مقامات پر مولانا مہر مرحوم کی تحریر میں اصلاح بھی فرمادی۔ ان یادداشتوں اور اصلاحوں میں بہت سے نکتے زبان و بیان اور لغات و لسانیات سے متعلق ہیں۔ مولانا مہر مرحوم نے "غالب" کے دوسرے ایڈیشن میں ان معلومات کو متن میں شامل کرلیا تھا اور مولانا آزاد کے انتقال کے بعد جب انھوں نے مولانا کے خطوط "نقش آزاد" کے نام سے مرتب فرمائے تو مجموعے کے آخر میں مولانا کے قلم سے یہ تمام یادداشتیں بھی مرتب فرمادیں۔

مولانا آزاد نے زبان و قواعد کے بارے میں اپنی ان یادداشتوں میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً ــــ وہ مباحث جو غالب کی زبان دانی اور فارسی میں ان کی نظر اور عبور سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کے استاد عبدالصمد (ان کی شخصیت کے وجود یا عدم وجود کی بحث سے قطع نظر) اور برہان قاطع کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

• عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا آدمی تھا۔ مرزا غالب نے "درفش کاویانی" کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں اور انھیں عبدالصمد کی طرف نسبت دی ہے، ان سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ فارسی زبان کے اصول و قواعد اور قدیم فارسی کے رموز و دقائق کا اگر وہ ماہر تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز بھی اس پر کھل چکا تھا اور دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں بڑی حد تک اس پر نمایاں ہوچکی تھیں۔"

مرزا غالب "درفش کاویانی" کے فوائد میں لکھتے ہیں:

درزبان دری و زبان سنسکرت توافق بیش ازاں ست کہ شمردہ آید۔

پھر مثالیں دی ہیں، جو صحیح ہیں اور سہ
جولس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں بھی ان ہی
کام لیا گیا ہے۔ مہ اور مہا، سوم بہ معنی ماہ، سکم
رفیق، پاتی بہ معنی مکتوب و پتیا بہ معنی پیام، دش
سنسکرت بہ معنی نگاہ و شست فارسی، پرتاب
ہر دو زبان بہ معنی بزرگی و کرامت، پرشاد و فر
بہ معنی تبرک، باس ہندی و باش فارسی، ہر دو ز
سکونت، مہمان بہ معنی ضیف و ضیافت، کان و ک
بہ معنی معدن، چنگل و چھاگل بہ معنی ظرفے کہ برا
نگاہ داشتن آب از چرم سازند، دُشت در ہر د
زبان بہ معنی مکروہ، حال در ہر دو
بہ معنی وام، تال ہر دو زبان بہ م
آب گیر، تنگل بہ کسر اول مرادف پنبہ و در سنسک
تھنگلی، بوم فارسی بہ معنی زمین، بھوم و بھومی در سنس
بہ ہمیں معنی: تپاس فارسی و تپسیا سنسکرت بہ م
ریاضت، جنگل بہ معنی بیابان در ہر دو زبان مش
ــــ سر بر در فارسی بہ معنی جسم و شریر د
سنسکرت، کام فارسی بہ معنی مقصد و سنسکرت
بہ معنی شہوت و جماع، کامنا بہ معنی خواہش، من
میم مفتوح در ہر دو زبان بہ معنی قلب، بانو و بن
معنی خاتون، ستان و استھان بہ معنی محل، ساسا
در فارسی ہماں معنی دارد کہ در سنسکرت سنیاسی دا
یعنی درویش مرتاض۔

سلاطین ساسانیہ کے تلقب کی وجہ یہ بی
کرتے ہیں کہ ان کا مورث اعلیٰ قلندرانہ زندگی ب
کرتا تھا۔

ابوسلمان شاہجہانپوری
کراچی (پاکستان)

الف فارسی کہ ابتداءِ کلمہ میں افادۂ نفی کرتا ہے۔ مثلاً اخواستی و اجنبان۔ سنسکرت میں بھی یہی اثر رکھتا ہے۔ مثلاً امر و اچل۔

مرزا غالب نے اس مشابہت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور دال اور تے، سین اور شین وغیرہ کے استبدال کی بھی مثالیں دی ہیں، جو بالکل صحیح ہیں۔

پارسیوں کا دینی لٹریچر

پارسیوں کا جو دینی لٹریچر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مستشرقین یورپ اور بمبئی کے پارسیوں کی کوششوں سے نمایاں ہو کر شائع ہوا۔ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو صریح اسلامی عقائد اور اسلامی روایات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً زردشت کی معراج جنت و دوزخ کے شاہدات، پل صراط وغیرہ۔

اسپیکل وغیرہ محققین ان تحریرات کی زبان و اسلوب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ یہ بعد از عہدِ اسلام کے مجوسی اختراعات ہیں۔ اور ان کی قدامت زیادہ سے زیادہ دسویں صدی عیسوی تک لے جائی جا سکتی ہے اور وہ بھی ہر تحریر کے لیے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو چکی تھی۔ چنانچہ "درفش کاویانی" کے خاتمے میں سب سے پہلا فائدہ اسی مضمون کا ہے۔ میمنار اور چنیود وغیرہ مصطلحات کو بعد کی اختراعات قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مولانا ہرمزد م تم عبدالصمد ایں راز با من می گفت و بر فریب و نیرنگ پارسیاں می خندید و نگارندۂ دبستان مذاہب را نیز از ایناں می دانست۔"

البتہ معلوم ہوتا ہے کہ دساتیر کے بارے میں جو دھوکا سر ولیم جونس وغیرہ کو ابتدا میں ہوا تھا، اس کی حقیقت عبدالصمد پر نہیں کھلی تھی۔ وہ دساتیر کو ساسان پنجم کی واقعی تصنیف تصور کرتا تھا۔ اور مرزا غالب بھی عمر بھر اسی دھوکے میں رہے۔ حالانکہ دساتیر بھی سر تا سر جعل و اختراع ہے اور قطعاً ظہورِ اسلام کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ ملا فیروز نے گورنر بمبئی کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر کے مع اصل کے شائع کیا تھا۔ لیکن بہت جلد اہلِ علم کا فیصلہ اس کے خلاف صادر ہو گیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں ساسانی حکومت کے خاتمے اور تازیوں کے استیلا کی خبر بھی صاف صاف لفظوں میں دے دی گئی ہے۔ نیز ظہورِ اسلام کی۔ گویا ساسان پنجم یا اردشیر بابکان کو اہورا مزد کی وحی کر یہ امور معلوم ہو گئے تھے۔

محققین کا فیصلہ ہے کہ اس کی زبان "اوستا" یا اس کی شرح "پاژند" کی زبان نہیں ہے بلکہ محض ایک بناوٹی اسلوب ہے، جس میں پرانے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں۔

بہرحال عبدالصمد ایک غیر معمولی علم و استعداد کا آدمی تھا ______ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بہت بڑا دخل ہو گا اور اس بارے میں وہ جو کچھ لکھتے ہیں، حرف بہ حرف صحیح ہے۔

دبستان مذاہب کے مصنف کی نسبت بھی ان کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آذر کیوان کا ایک شاگرد اس کا مصنف تھا۔ محسن فانی وغیرہ کی نسبتیں غیر معتمد ہیں۔ سر ولیم جونس نے پہلے اس کتاب کو تاریخ ایران کی مشکلات کا حل سمجھ لیا تھا اور بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ ان ہی کی ایما و مصارف سے محمد حسین نے اسے کلکتہ سے چھاپا تھا۔

برہان قاطع والی مصیبت

"رام پور" کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلب علی خاں ابتدا میں مرزا غالب سے ادبی علائق رکھنا چاہتے تھے اور ایک نثر معائنے کے لیے بھیجی تھی۔ بہ ظاہر شاگردانہ درخواست اصلاح تھی۔ مگر دراصل ان سے مداحی کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی تعریف کی، طاہر وحید اور طباطبائی سے بڑھا دیا۔ لیکن چونکہ اصلاح کے معاملے میں دانستہ تسامح ممکن نہ تھا، اس لیے بعض الفاظ کی تصحیح کر دی۔ کلب علی خاں پر یہ بات گراں گذری۔ ان کے اساتذہ نے ہندوستانی لغت نویسوں کی عبارتیں نکال کر پیش کر دیں اور وہ انھوں نے مرزا کو بھیج دیں۔ مرزا بے چارے اب رام پور کے وظیفے پر جی رہے تھے۔ یہ معاملہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ برہان قاطع والی مصیبت یہاں بھی پیش آ گئی۔ پہلے ہندوستانی لغت نویسوں کے باب میں اپنا عقیدہ لکھا۔ پھر جب اس پر کلب علی خاں بگڑ گئے، تو زاری کر کے معافیاں مانگیں۔ ارتنگ اور ارژنگ کو برہان قاطع وغیرہ نے مرادف لکھا ہے، لیکن قطعاً غلط ہے۔ ارتنگ مانی اور ارژنگ ایک مصور کا نام تھا۔ نظامی نے "شیریں خسرو" میں کہا ہے:

بقصر دولتم مانی و ارژنگ
طراز سحر می بستند بر سنگ

نواب کلب علی خاں نے اپنی نثر میں انھیں مرادف سمجھ کر جمع کر دیا تھا۔ غالب نے اس سے اختلاف کیا۔ اسی طرح "آشیاں چیدن" کو عرفی کے مکتبی شارحوں نے "آشیاں بستن" کے معنوں میں لیا ہے، مگر غلط ہے۔ کلب علی خاں اس پر مصر ہوئے اور ثبوت میں عرفی کی شرح پیش کی۔

زمانے کی ستم ظریفی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھنی چاہیے کہ غالب مغرورِ فن و کمال کو ایک خام کار مسند نشین کے آ

کس کس طرح جھکا کر چھوڑا اور کس لیے؟ صرف اس لیے کہ جانتا تھا کہ اگر سو روپے ماہوار بخشش بند ہو گئی تو جینے کا کوئی سہارا باقی نہ رہے گا جب کلب علی خاں نے تواضعاً لکھا کہ نسبت تلمذ رکھتا ہوں، تو لکھتے ہیں:

"یہ دکانِ بے رونق کی خریداری ہے۔ میں تو حضور کو اپنا استاد، اپنا مرشد، اپنا آقا جانتا ہوں اب پیر و مرشد نے لکھا ہے کہ ارژنگ وارژنگ متحد المعانی ہیں، تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ نہ لغت نویسوں کے بہ موجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔"

پھر جب اس پر بھی اظہارِ ناراضگی ہوا تو لکھتے ہیں:

"خط پڑھتے ہی کانپ اٹھا۔ عالم نظروں میں تیرہ و تار ہو گیا۔ گناہ معاف کیجیے نوید عفو سے تقویت پہنچائیے۔"

پھر جس شخص کی رگِ گردن اس قدر سخت ہو کہ ہندوستان کے تمام فارسی ادیبوں میں سے خسرو کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکتی ہو، اور فیضی اور ابوالفضل جیسے باکمالوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا[۱]. وہ کلب علی خاں کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا رہا ہے کہ میں نے خداوند نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا[۲].

اخبار دوربین اور کلکتے کے ادبی ہنگامے[۳]

کلکتے میں انگریزی حکومت کے استقرار کی وجہ سے نئی چیزوں سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ فارسی میں کئی اخبار نکلے۔ من جملہ ان کے "دوربین" بھی تھا جس کے کئی ایڈیٹر ہوئے۔ آخری ایڈیٹر نواب شمس الہدیٰ مرحوم کے والد نواب عبداللطیف تھے۔

میں نے ان کے وہ پرچے دیکھے ہیں، جن میں مرزا غالب مرحوم کے ہنگام ورود و قیام کلکتہ، یہاں کے مشاعرے اور صحبتیں، اور شعرائے کلکتہ کی مخالفت اور مثنوی بادِ مخالف وغیرہ حالات چھپے تھے اور پھر ایک پرچے میں مرزا غالب مرحوم کی بالزام قمار بازی، دلی میں گرفتاری اور سزایابی کی خبر بڑے طعن و تشنیع و استہزا کے ساتھ چھپی تھی۔

اس وقت کلکتے کے شعرا و ادبا ان اخبارات میں فارسی نظم و نثر لکھا کرتے تھے۔ غدر کے بعد جب مرزا غالب مرحوم نے "قاطع برہان" شائع کی، جس میں "برہان قاطع" پر اعتراضات کیے گئے تھے، اور ان کے ایرادات مقلدین لغت ہند پر نہایت شاق گذرے اور ایک عام ایجی ٹیشن ان کے خلاف پھیل گیا تو اس میں بڑا حصہ کلکتہ کے ان فارسی اخبارات ہی نے لیا تھا، اور بہ کثرت مضامین اس موضوع پر شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے وہ تمام پرچے دیکھے ہیں۔

قاطع برہان

میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ مدراس کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" میں "یادگارِ غالب" کا اشتہار دیکھا۔ یہ اخبار ہر ہفتے سرورق پر ایک مخمس قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر چھاپا کرتا تھا، اس لیے حافظ ولی اللہ، والد مرحوم کے خادم خاص اور میرے الف، بے، تے کے استاد، اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ والد مرحوم کے ایک مرید، حاجی مصلح الدین سوداگر، انھیں ہر ہفتے لا کر دیا کرتے تھے۔ بہر حال میں نے بڑے شوق سے کتاب منگائی۔ یہ میرے اردو مطالعے کا بالکل آغاز تھا۔ کتاب میں "برہان قاطع" کے معرکے کا جب حال پڑھا تو شوق ہوا کہ یہ تمام کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ چنانچہ "قاطع برہان" اس کا دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" "قاطع القاطع" "ساطع برہان" "محرق قاطع" "موید برہان" "تیغ تیز" "شمشیر تیز" وغیرہ تمام رسائل بہ سعی و جستجو جمع کیے۔

چوں کہ اس زمانے میں فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیح الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے یہ چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ افسوس ہے کہ خواجہ حالی نے (یادگار غالب میں) اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔

قاطع برہان کے رد میں سب سے زیادہ مبسوط کتاب مولوی احمد علی کی موید البرہان ہے۔ یہ ڈھاکہ کے باشندے تھے مگر ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے تھے۔ کلکتہ کے فارسی دانوں میں اس تصنع کا مرض عام طور پر رہا ہے۔ اب بھی بنگال کے بہت سے خاندان اپنے کو غزنوی، غوری، شیروانی اور سہروردی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح بھی کرتے تھے۔ فارسی مثنویوں کے حال میں ایک رسالہ "ہفت آسمان" لکھا تھا، جو (ایشیاٹک) سوسائٹی نے چھاپ دیا ہے۔

مرزا غالب کے حالات میں ضروری ہے کہ اس معاملے پر بہ تفصیل نظر ڈالی جائے۔ برہان قاطع کی جو خرافات انھوں نے نقل کی ہیں، انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی صاحب علم و بصیرت کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بہ طور دلیل کے پیش کیا جاتا۔

رضا قلی خاں ہدایت صاحب "مجمع الفصحا" نے مرزا غالب کے چند سال بعد "فرہنگ انجمن آرائے ناصری" لکھی، جو تہران میں چھپ گئی ہے۔ اسے پیش نظر رکھنا چاہیے اس معاملے پر اسنلہ مباحث نقل کر کے

بہ تفصیل بحث کرنی چاہیے۔ فارسی لغت کے لیے صرف یہی لغت مستند تصور کی جاسکتی ہے۔

کیا اچھا ہو اگر درفش کاویانی کو بعد کے مباحث کے اضافے کے ساتھ از سرِ نو شائع کر دیا جائے یا تیغ تیز اور لطائف غیبی بہ جنسہٖ آخر میں شائع کر دی جائیں۔ درفش کاویانی میں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔ ان کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

حواشی

۱۔ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے مرزا غالب لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کہ خسروِ قلمرو سخن طرازی ہے۔ یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ بخیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔"

(عود ہندی۔ ص۔ ۶۱)

۲۔ ایک دوسری جگہ فیضی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔"

۳۔ یہاں سے اس مبحث کے آخر تک کی عبارت "ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" مرتبہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ماخوذ ہے۔

دِلّی کی درگاہ شاہِ مرداں

دلی کی درگاہ شاہ مرداں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ محمد شاہ بادشاہ کی بیگم نواب قدسیہ نے قدم شریف حاصل کر کے اس جگہ نصب کیا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ نواب قدسیہ ہی نے علی گنج آباد کیا تھا اور درگاہ شاہ مرداں تعمیر کی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب میں مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ نواب قدسیہ کے زمانے سے دو سو سال قبل بھی قدم شریف یہیں موجود تھا۔ انھوں نے فارسی زبان کی مختلف تاریخوں کے حوالے سے ان تمام مزارات کی بھی نشاندہی کی ہے جو شاہ مرداں کے احاطے میں واقع تھے اور بعد میں مسمار کر دیے گئے۔

کربلا اور شاہ مرداں کی تاریخ، اس کی عمارتوں اور وہاں مدفون لوگوں پر یہ پہلی کتاب ہے — ڈاکٹر خلیق انجم دہلی کے ایک قدیم خاندان کے چشم و چراغ اور اس تہذیبی فضا کے پروردہ ہیں جسے دہلویت سے موسوم کیا جاتا ہے — دہلی اور متعلقاتِ دہلی کے ساتھ جو گہرا تعلقِ خاطر دلی والوں کی پہچان رہا ہے، وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ میں جلوہ گر ہے۔

کتاب بہت سی تاریخی عمارتوں کی تصویروں سے بھی مزین ہے جو فاضل مصنف نے خود اپنے کیمرے سے لی ہیں۔

مصنف : ڈاکٹر خلیق انجم

صفحات : ۱۶۴

قیمت : ۳۳ روپے

دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ہندستان کے صوفیائے عظام اور مشائخین کرام کا اہم کردار رہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اردو نظم و نثر کا آغاز ہی ان مقدس ہستیوں کا مرہون منت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا ہے کہ "انسانی ذہن نثر کی بہ نسبت نظم سے جلد اور زیادہ متاثر ہوتا ہے" چنانچہ اکثر مشائخین متقدمین نے تبلیغ حق کے لیے نظم ہی کو وسیلہ بنایا لیکن ایسا نہیں کہ انھوں نے نثر کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز کر دیا ہو۔ جہاں نثر کی ضرورت تھی وہاں انھوں نے نثر سے بھی کام لیا ہے۔ اس طرح ان کی تحریریں ان دونوں اصناف ادب کے فروغ کا ذریعہ بنی ہیں۔

اس کتاب میں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا سے لے کر سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی تک ایسے ۱۱ اکابرین علم و تصوف کے حالات اور ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ لسانی اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جو دہلی کی سرزمین سے وطنی نسبت رکھتے ہیں۔ کتاب کی مصنفہ بیگم ریحانہ فاروقی خود دہلی کی ایک بڑی درگاہ کی نگراں ہیں اور یہاں کے اکابرین علم و تصوف کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ یہ کتاب ان معلومات کا نچوڑ ہے۔

مصنفہ : بیگم ریحانہ فاروقی

صفحات : ۸۴

قیمت : ۲۱ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت

مفکر، عالم، مُدبّر، مجاہدِ آزادی، مذہبی رہنما، مفسرِ قرآن، صحافی، مقرر محی الدین احمد ابوالکلام آزاد ایک ایسی باکمال ہستی تھے جو بطنِ گیتی سے صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ غبارِ خاطر، جیسی لاثانی تصنیف کے خالق کی آخری کتاب ان کی انگریزی میں سوانحِ عمری India Wins Freedom (ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے) ہے جو ۱۹۵۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ کتاب سیاسی پہلو سے اس نصف صدی کی اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے اور اب تک یہ بیس بار طبع ہو چکی ہے اور کئی ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک عام ہندوستانی کے لیے وہ ایک بلند پایہ سیاسی رہنما تھے جن کا اعتقاد، ایمان اور مسلک آخر تک متزلزل نہیں ہوا۔ مولانا عزمِ استقلال اور ہمت کا پیکر تھے اور سخت، صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات میں بھی انھوں نے کانگرس کا دامن نہیں چھوڑا اس وقت بھی نہیں جب وہ اپنے ہی مذہب کے لاتعداد گمراہ لوگوں اور سیاسی مخالفوں کے طعن و تشنیع اور ملامت کا نشانہ بنے۔ حوادث کے سخت سے سخت طوفانوں اور آندھیوں نے بھی ان کے پائے استقلال کو نہیں ڈگمگایا۔

۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء کی بات ہے کہ مولانا آزاد پہلی دفعہ دلّی میں سُنے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی والوں کی اپنی مخصوص سماجی زندگی تھی اور عوام میں سیاسی شعور زیادہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ آصف علی نئے نئے کانگرس میں شامل ہوتے تھے۔ وہ اپنے عُمدہ وضع قطع کے انگریزی لباس میں دھواں دھار تقریر کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے پہلے پہل دلّی میں ایک کانگرسی کے طور پر ایک مقامی تھیٹر میں تقریر کی تھی۔ اُس وقت کے تحریری حوالوں کے مطابق جہاں آصف علی کی تقریر جذبات کو مشتعل کرنے والی ایک خالی گرج تھی وہاں مولانا آزاد کی تقریر ایک ایسی موثر آواز تھی جو دلوں میں اُتر گئی اور جس نے لوگوں میں حب الوطنی کے ارفع جذبات بیدار کر دیے۔

آزاد، سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو اور لاجپت رائے تحریکِ سول نافرمانی کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کے بمبئی اترتے ہی جو ہڑتال وہاں ہوئی اور عوام پر گولی چلی اس کا اثر دوسرے شہروں میں بھی ہوا۔ برٹش سرکار نے یہی بہتر سمجھا کہ ان سب چوٹی کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر اس سے حالات میں بہتری نہیں آئی۔ ۲۴ دسمبر کو پرنس آف ویلز کو کلکتہ پہنچنا تھا وہاں پرنس کے خلاف ہڑتال اور مظاہروں کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وائسرائے ریڈنگ نے بڑی کوشش کی کہ کلکتے میں ہڑتال اور مظاہرے نہ ہوں اور انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت کانگرس کو صوبائی خود اختیاری دلانے کا وعدہ بھی کیا مگر مولانا آزاد اور موتی لال نہرو ہڑتال کو رد کرنے کے سخت خلاف تھے۔ مولانا آزاد کی طرف سے ایک بیان جاری ہوا جس میں کلکتے کے شہریوں کو اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برٹش سرکار کے سخت اقدامات کے باوجود کلکتے میں ۲۴ دسمبر کو پرنس آف ویلز کی آمد کے خلاف زبردست ہڑتال اور مظاہرے ہوئے اور کرسمس تہوار کی تقریبات کے باوجود سارا کلکتہ ایک نیم تاریک اور اُجڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی میں مولانا آزاد کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا جاتا رہا۔ ۱۹۲۴ء کی بات ہے، گاندھی جی اور مولانا آزاد جیل میں تھے۔ باقی چوٹی کے لیڈروں میں اختلاف رائے تھا۔ سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، اجمل خاں اور وِٹھل بھائی پٹیل اس بات کے حق میں تھے کہ کانگرس کونسلوں کے الیکشن میں حصہ لے اور ان میں طاقت حاصل کر کے اندر سے انگریزی حکومت کا تختہ پلٹ دے مگر راجگوپال آچاریہ راجندر پرشاد اس رائے کے سخت خلاف تھے۔ تاہم خیال یہ تھا کہ چونکہ چوٹی کے لیڈروں کی اکثریت اس کے حق میں تھی اور گاندھی جی اور آزاد جیل میں تھے، اسمبلیوں کے اندر سے لڑائی جاری رکھنے کی تجویز مان لی جائے گی۔ مگر راجہ جی

م۔ م۔ راجندر
۶۸، چتر وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

اور راجندر بابو کی کوششوں سے کانگریس کے گیا
کے اجلاس میں اس تجویز کو رد کردیا گیا۔ سی۔آر۔داس
نے اپنی اس شکست کو اتنا محسوس کیا کہ انھوں نے
صدر کانگریس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔
سال کے اختتام پر مولانا آزاد جیل سے رہا کردیے
گئے۔ وہ جیل میں بھی ان حالات کا مطالعہ کرتے
رہتے تھے اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ
کانگریس ہائی کمانڈ کے ممبروں میں جنگِ آزادی کو
آگے بڑھانے کے طریقوں پر اختلافِ رائے تھا۔
سی۔آر۔داس اور موتی لال نہرو کے گروپ کے
آدمیوں نے اپنے گروپ کا نام سوراج پارٹی رکھ
دیا تھا۔ مولانا آزاد ایک ایسے حل کی تلاش میں
لگ گئے جس سے دونوں گروپوں میں سمجھوتہ
ہوسکے۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی بیچ کا راستہ
اختیار کیا جائے اور کانگریس اسمبلیوں میں داخل
ہوکر اندر سے لڑائی بھی جاری رکھے۔ کوئی اور
لیڈر ہوتا تو شاید اس کی سمجھوتے کی کوشش
کامیاب نہ ہوتی مگر مولانا آزاد کی رائے کا احترام
دونوں گروپ کرتے تھے اور ان کی تجویز کا خیرمقدم
کیا گیا۔ دلی میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس
کا ایک خصوصی جلسہ ہوا اور اس میں رسمی طور پر
ان کے فارمولے کو اتفاقِ رائے سے قبول کرلیا گیا۔
اس طرح سے مولانا آزاد کی دانشمندی سے کانگریس
ایک نازک صورتِ حال پر قابو پاگئی۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں ہونے والا کانگریس
کا اجلاس بڑی تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی
صدارت کے لیے کانگریس کی صوبائی کمیٹیوں نے
سردار ولبھ بھائی پٹیل کا نام تجویز کیا تھا۔ مگر
گاندھی جی نے ایک بیان میں جواہر لال نہرو کو
ترجیح دی۔ اس پر کانگریس کے تمام سینئر لیڈر حیران
رہ گئے اور بہت سوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی
حق تلفی ہوئی ہے۔ لیکن گاندھی جی کا کہنا تھا کہ
اب جنگِ آزادی میں ایک ایسا نازک موڑ آنے
والا ہے جس میں نئے خون اور جوش کی ضرورت
ہوگی۔ اس موقع پر بھی مولانا آزاد نے اپنی مخصوص
دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے کہا کہ جواہر ہندو
اور مسلم نوجوانوں کو یکساں اپیل کرے گا اور صدارت
کے لیے اس سے زیادہ موزوں نام نہیں ہے۔
چنانچہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے لاہور کے
جلسے کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی اور

> ... مولانا آزاد میں غرور کا
> شائبہ تک نہ تھا۔ نہ کبھی انھوں
> نے کسی اہم سے اہم معاملے کو جس کا تعلق
> ان کی ذات اور ساکھ سے ہوا ہو اپنی
> حب الوطنی کے جذبے پر اثر انداز
> ہونے دیا...

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو دریائے راوی کے کنارے
مکمل آزادی کا وہ تاریخی اعلان پڑھا گیا جو بعد میں
ہمارے جمہوریہ کا سنگِ بنیاد بنا۔ اس اعلان کا
مسودہ تیار کرنے میں مولانا آزاد کا ہاتھ بھی تھا۔

۱۹۴۰ء کے رام گڑھ میں ہوئے کانگریس
کے تاریخی سالانہ اجلاس کے لیے مولانا آزاد کا
انتخاب کیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ بڑا اہم دور تھا
کیونکہ محمد علی جناح کا اثر و رسوخ مسلمانوں میں
بڑھ رہا تھا اور وہ یہ دعوے کر رہے تھے کہ وہ
مسلمانوں کے واحد نمائندے ہیں۔ انگریز حکام
ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرکے
"تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا
تھے اور جزوی طور پر کامیاب ہوتے نظر آرہے
تھے۔ اس کے برعکس کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام
ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے جن میں
مسلمان بھی شامل ہیں۔ محمد علی جناح نے اب
مولانا آزاد کے لیے کانگریس کا **Show Boy** یعنی
"نمائشی آدمی" کی تضحیک آمیز اصطلاح استعمال
کرنی شروع کردی تھی۔ مگر مولانا آزاد کردار اور مسلک
کے اعتبار سے لوہے کے آدمی تھے۔ وہ انگریزوں کی
چالوں کو سمجھتے تھے۔ انھیں حب الوطنی سب سے زیادہ
عزیز تھی اور انھوں نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی
کہ ان کے گمراہ سیاسی مخالف انھیں کیا کہتے ہیں۔
انھوں نے ایک اخباری نمائندے سے کہا: "جناح
مجھے کیا سمجھتا ہے مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ نہ ہی
اس کی آواز مسلمانوں کی آواز ہے۔ مجھے اپنا وطن
جان سے زیادہ عزیز ہے اور اس قسم کے سستے اور
رکیک جملے مجھے مشتعل نہیں کرسکتے۔"

بھولا بھائی ڈیسائی اور مولانا آزاد گاندھی جی
کے بہت قریب تھے۔ گاندھی جی شراب نوشی کے
سخت خلاف تھے۔ ایک دن راجکماری امرت کور
نے انھیں بتایا کہ انھوں نے بھولا بھائی ڈیسائی کو
ایک پارٹی میں شراب پیتے ہوئے دیکھا۔ گاندھی جی
کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی نے گاندھی جی کے کہنے پر
بھولا بھائی ڈیسائی کو ایک خط لکھ کر ان سے پوچھا کہ
کیا وہ شراب پیتے ہیں؟ بھولا بھائی ڈیسائی نے
کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر گاندھی جی تو اپنے خاص
آدمیوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ایک مثالی
زندگی گزاریں۔ انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی
ایک میٹنگ میں جو اسمبلی کونسل کے لیے کانگریسی امیدواروں

کے انتخاب کے لیے بلائی گئی تھی۔ راجکماری امرت کور کے اس الزام کا ذکر کر دیا اور اچانک مولانا آزاد کی طرف منہ کر کے یہ سوال داغ دیا: "کیا آپ شراب پیتے ہیں؟" مولانا سٹپٹا گئے کیونکہ اس موقعے پر اس قسم کے سوال کیے جانے کی کوئی توقع نہیں تھی اور پھر سوال کنندہ بھی مہاتما گاندھی تھے۔ انھوں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور بے خوفی سے قبول کیا۔ "میں پہلے پیتا تھا۔" گاندھی جی نے فوراً دوسرا سوال کر دیا: "آپ نے شراب پینی کب چھوڑی؟" معاملے کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر جواہر لال مسکرا کر بولے: "میں نے کل شام ہی شیری پی ہے۔ میرے خیال میں اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔" اس پر ایک قہقہہ لگا اور گاندھی جی چپ ہو گئے مگر بھولا بھائی ڈیسائی کی انھوں نے خبر لے ڈالی۔

مولانا آزاد میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ نہ ہی انھوں نے کسی اہم سے اہم معاملے کو جس کا تعلق ان کی ذات اور ساکھ سے ہو اپنی حب الوطنی کے جذبے پر اثر انداز ہونے دیا۔ ۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس کے دنوں میں جب مرکز میں عارضی حکومت بنائے جانے اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کی تشکیل کی بات چیت چل رہی تھی اور مولانا آزاد کانگرس کے صدر کے طور پر اس بات چیت میں جس میں جناح اور لیاقت علی بھی شریک تھے، پورا حصہ لے رہے تھے تو جناح نے کچھ ایسے سوال اٹھا دیے جن کی وجہ سے بات چیت کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ نہرو آزاد سے کانگرس کی صدارت لے لیں۔ جب مولانا آزاد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بخوشی صدارت نہرو کے حوالے کر دی۔ یہ ایک بڑی ذاتی قربانی تھی اور عام حالات میں ہر آدمی اسے اپنی ہتک سمجھتا۔ مگر مولانا آزاد نے ایک بیان میں کہا:

"یہ بات بالکل غیر اہم ہے کہ کانگرس کا صدر میں ہوں یا جواہر۔ ہم دونوں میں خیالات کا کوئی فرق نہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ شملہ کانفرنس ناکام نہ ہو۔"

پھر ۱۵ر جون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی وہ میٹنگ ہوئی جس میں ملک کی تقسیم کو منظور کیا جانا تھا۔ گاندھی جی اس جلسے میں خاص طور پر مدعو تھے۔ سب لیڈروں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس حل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاندھی جی بھی بے دلی سے اس کے حق میں تھے۔ مگر کچھ مخالفت ناگزیر تھی اور یہ گروپ خاصہ طاقتور تھا۔ گاندھی جی کی تقریر کے بعد مولانا آزاد نے تقریر کی۔ انھوں نے مخالفوں کی تسلی کے لیے یہاں تک کہہ دیا: "جلد ہی ملک کے تقسیم شدہ حصے پھر مل جائیں گے۔" یہ آواز ان کے دل کی تھی اور ان کی تقریر کے بعد مخالفت برائے نام رہ گئی۔

مولانا آزاد نہرو سے بہت محبت کرتے تھے لیکن نہرو کوئی غلطی کرتے تو ان کی مخالفت سے بھی گریز نہ کرتے۔ جب صوبہ سرحد میں اس بات پر ریفرینڈم ہونا تھا کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتا ہے یا پاکستان میں تو خان عبدالغفار خاں کی ریڈ شرٹ پارٹی یعنی خدائی خدمتگاروں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ نہرو ریفرینڈم سے پہلے صوبہ سرحد کے دورے پر جانا چاہتے تھے۔ آزاد نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ وہاں فضا اب سازگار نہیں رہی اور اس موقعے پر آپ کا جانا الٹا اثر پیدا کرے گا اور کانگرس کے حق میں نہیں ہوگا۔ انھوں نے نہرو کو یہ بھی بتایا کہ یہ ریفرینڈم انگریزوں کی گہری چال ہے تاکہ صوبہ سرحد ہندوستان میں شامل نہ ہو اور پاکستان بننے کے بعد جلد یا بدیر پختونستان کا ایک آزاد اور کمزور ملک قائم ہو جائے جو ہندوستان کے اثر سے باہر ہو۔ مولانا آزاد کی یہ بات کہ نہرو کا صوبہ سرحد کا دورہ کامیاب نہیں ہوگا ٹھیک ثابت ہوئی اور وہاں کئی مقامات پر مسلم لیگ اور انگریزوں کی سازش سے ان کے خلاف مظاہرے ہوئے اور ریفرینڈم کا فیصلہ ۴۹ - ۵۱ فیصد ووٹوں سے پاکستان کے حق میں ہوا۔ یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سردار پٹیل نے بھی مولانا آزاد کی اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں جب ملک میں یہ اعلان کیا گیا کہ پنڈت نہرو چاؤ۔ این۔ لائی کی دعوت پر چین کا دورہ کریں گے تو مولانا آزاد پہلے ہندوستانی مدبّر تھے جنھوں نے اس دورے کی کامیابی پر شک کیا اور انھوں نے نہرو کو یہ تنبیہ بھی کی کہ وہ اس پر زیادہ گہرائی سے سوچیں۔ نہرو کے چین جانے سے پہلے ہی کوریا سے یہ خبر آگئی کہ چینی لیڈروں نے چین میں ہمارے نمائندے سے یہ کہا کہ ہندوستان نے ابھی تک اپنی غلامانہ ذہنیت کو نہیں چھوڑا تھا کیونکہ ابھی تک فوجی احکام انگریزی میں دیے جاتے تھے۔ مولانا آزاد نے نہرو سے کہا کہ آپ چینیوں سے دو سوالوں کا جواب معلوم کریں۔ ایک یہ کہ کیا وہ کمیونسٹ پہلے ہیں اور ایشیائی بعد میں اور دوسرے کیا چین دوسرے چھوٹے ایشیائی ملکوں کے تحفظ کی گارنٹی دے گا؟ نہرو چین چلے تو گئے اور ان کا وہاں فقیدالمثال خیر مقدم بھی ہوا اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے بھی لگے مگر نہرو چینیوں سے مولانا آزاد کے بتائے ہوئے سوالوں کے جواب حاصل نہیں کر سکے اور ہم سب جانتے ہیں کہ چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کے شمالی علاقوں پر حملہ کر دیا تھا۔

آزادی کے بعد زبان کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل عمل میں آنی شروع ہو گئی۔ اس وقت اس اقدام کا خطرہ اتنا محسوس نہیں کیا گیا جتنا آج کیا

جا رہا ہے۔ آندھرا کے بننے کے بعد کئی اور علاقوں سے ایسی مانگیں سر اٹھانے لگیں۔ پنڈت نہرو اور ان کی کیبنیٹ اور کانگریس ہائی کمانڈ اس کی مخالفت کرنا چاہتے تھے مگر جب بیلگام میں پنڈت نہرو کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کیا گیا تو انھوں نے فضل علی کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں زبان کے آدھار پر صوبوں کی تشکیل کی بہ حیثیت مجموعی حمایت کی گئی۔ اس سے ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گیا اور بمبئی اور دوسرے علاقوں سے نئی مانگیں اٹھائے جانے کا اندیشہ بڑھ گیا۔ پنڈت نہرو کو صلاح دی گئی کہ فضل علی رپورٹ کو حکومت صرف اپنی رہنمائی کے لیے استعمال کرے اور فیصلہ آزادانہ خود کرے۔ نہرو اس سلسلے میں قوم کو ریڈیو سے مخاطب کرنا چاہتے تھے مگر مولانا آزاد نے اس کی مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک میں صوبوں کی تشکیل زبان اور دیگر علاقائی ترجیحات کی بنا پر کی جائے کیونکہ اس سے قومی یکجہتی کو خطرہ پیدا ہوگا۔ گزشتہ دو تین دہائیوں کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مولانا آزاد اپنے خیالات میں کتنے صحیح تھے۔

مولانا آزاد ہر معاملے میں اپنی آزاد رائے رکھتے تھے اور عام حالات میں ان پر اثر ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایک مثال بابو راجندر پرشاد کے دوبارہ راشٹرپتی کے طور پر کھڑے ہونے کا معاملہ تھا۔ راجن بابو اور نہرو میں کچھ معاملات میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ معاملات راجن بابو کے لیے ذاتی نوعیت کے تھے اور وہ سرکار کے ان معاملوں میں دخل دینے کے خلاف تھے۔ نہرو بضد تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ جمہوریہ ہندوستان کے نئے صدر رادھاکرشنن ہوں۔ مگر مولانا آزاد کی رائے مختلف تھی - وہ بابو راجندر پرشاد کے دوبارہ راشٹرپتی بنائے جانے کے حق میں تھے۔ اس رائے کے لیے ان کے پاس معقول وجوہات تھیں۔ اور آخر میں آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے رہنما اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوئے اور راجندر پرشاد دوسری بار راشٹرپتی کے طور پر منتخب ہوئے۔

جب ۱۹۵۸ء میں کچھ اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ایک مشہور جوتشی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ ٹی۔ ٹی۔ کرشنا ماچاری جو ان دنوں اقتدار کی انتہائی بلندی پر تھے جلد ہی سر کے بل گرنے والے ہیں تو سیاسی حلقوں میں کافی حیرانی ہوئی۔ ستیہ نارائن سنہا نے اس جوتشی کو بلا بھیجا تو اس نے ایک اور پیشین گوئی کر دی — "جس دن کرشنا ماچاری حکومت سے باہر ہوں گے، مولانا آزاد غسل خانے میں گر پڑیں گے اور اس کے چار روز بعد ان کی وفات ہو جائے گی۔"

جب مولانا آزاد کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تو کلکتے سے ڈاکٹر بی۔ سی رائے کو بلوایا گیا۔ انھوں نے معائنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ مولانا آزاد خطرے سے باہر ہیں۔ جب پارلیمنٹ ہاؤس میں ستیہ نارائن سنہا نے پنڈت نہرو سے جوتشی کی بات کا ذکر کیا تو وہ چلّا کر بولے "تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ بدھان (ڈاکٹر رائے) کو یقین ہے کہ آزاد کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس کے چار دن بعد ہندوستان کے وزیرِ تعلیم مولانا آزاد راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

اس طرح آسمانِ سیاست کا ایک آفتاب غروب ہو گیا۔ پنڈت نہرو مولانا آزاد کی وفات سے بُری طرح ہل گئے۔ مولانا آزاد ان کے مشیر تھے۔ وہ مولانا کی ہر رائے کی قدر کرتے تھے۔ ان کی موت پر پنڈت نہرو نے کہا: "وہ ایک گوہرِ یکتا تھے۔ ایسے انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے۔"

حواشی

۱۔ Political History of Modern India By Hutchinson

۲۔ India By Durga Das

۳۔ آزاد میموریل لیکچرز

۴۔ نہرو میوزیم لائبریری میں دستیاب دستاویزات۔

۵۔ ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز اور ٹریبیون کے اُس دور کے پرچے بذریعہ مائکرو فلم۔

۱۹۴۸ء کے شاید اپریل یا مئی میں مولانا آزاد کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اسی سلسلے میں جب مولانا عبدالماجد دریابادی نے انھیں خط لکھا تو مولانا نے تحریر کیا:

"ہر بات اپنے مناسب وقت ہی میں ہوتی ہے۔"

اور واقعی مولانا نے بہت جلد ساٹھ ہزار روپے کی خطیر رقم سے اس ادارے کی امداد فرمائی بلاشبہ یہ ادارہ جس نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے، اس کا مستحق تھا۔

("ابوالکلام آزاد" از عبدالقوی دسنوی)

مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیتیں

گوپی ناتھ امن صاحب نے ایک بار مولانا آزاد کی جامع کمالات شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی شخصیت کا گلدستہ رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ ہے اور ہر رنگ اپنی جگہ اتنا گہرا اور واضح ہے کہ یہ طے کرنا محال ہو جاتا ہے کہ کون سا رنگ دوسرے رنگ پر حاوی ہے اور ان کی ذات کا کون سا پہلو دوسرے پہلو سے برتر یا افضل ہے۔ امن صاحب نے مزید کہا تھا: "جب ایک ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی کون سی خوبی سب سے نمایاں ہے۔ مولانا عالم زیادہ بڑے تھے یا سیاست داں۔ ان میں قوتِ تحریر زبردست تھی یا قوتِ تقریر۔ ان میں ذکاوت زیادہ تھی یا حافظہ۔ ان میں قوتِ برداشت زیادہ تھی یا برجستگی ان میں تنظیم زیادہ تھی یا ادراکِ حقیقت۔ اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ان خوبیوں کو سمجھنے کی پوری صلاحیت ہو۔"

اس میں شک نہیں کہ مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلو میں جن میں یہ طے کرنا آسان نہیں کہ کون سا پہلو دوسرے پہلو پر فضیلت رکھتا ہے۔ وہ عالمِ دین تھے مفکر تھے اعلیٰ درجے کے صحافی تھے خطیب تھے۔ سیاست داں تھے۔ جنگِ آزادی کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے۔ یہ سب ان کی ذات کی وہ صفات ہیں جو روزِ روشن کی طرح ہم سب پر عیاں ہیں۔ ہمارے دور کے مفکروں صحافیوں اور مورخوں نے مولانا کے ایک ایک وصف اور ان کے ایک ایک عمل کا جائزہ لیا ہے پھر بھی ابھی بہت گنجائش ہے کہ ان کے افکار اور اقوال کی مزید چھان بین اور تحقیق کی جاتی تا و نئی نسل کے لوگوں کو اس عظیم الشان شخصیت اور اس کے عظیم کارناموں سے روشناس کرایا جائے تا کہ ان کے اعمال اور اقوال آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں شخصیت کا جائزہ اور سنجیدگی سے لیا جا سکے۔

موجودہ مضمون سے راقم الحروف کا مقصد مولانا کی ذات اور ان کے کارناموں کا تعارف پیش کرنا نہیں یہ میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ مولانا نے دینی مسائل کو سمجھانے میں جو کارنامہ انجام دیا اس کے لیے عالمِ اسلام ہمیشہ ہمیشہ ان کا مرہونِ منت رہے گا۔ صحافت کے میدان میں مولانا نے عوامی ذہن کی جو تربیت کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی کی راہ میں ان کی قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں ان تمام صفات کے علاوہ ایک پہلو اور ہے جو مولانا کی ذات کو سطحِ عام سے بالاتر کرتا ہے اور وہ ہے ان کی عظیم الشان تنظیمی اور انتظامی صلاحیت۔ اس خوبی کا اندازہ ہمیں ان سرکاری اور غیر سرکاری فائلوں کے مطالعے سے ہوتا ہے جنھیں مولانا کی میز تک پہنچنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد مولانا نے حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی تعلیم کے وسیلے سے مولانا نے ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی اور تعلیمی ڈھانچے کو وہ روپ دیا جس پر ہمارا آج کا سماج کھڑا ہے۔

تعلیم اور کلچر کا ڈھانچہ متعین کرتے ہوئے مولانا نے ہندوستانی کلچر کو بیرونی ممالک سے روشناس کرانے کے لیے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی بنیاد رکھی اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ اس کونسل کے کام کو بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ تا زندگی آگے بڑھاتے رہے۔ فی الحال اسی کونسل کی چند فائلوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے جن کی فوٹو کاپیاں پیش خدمت ہیں۔ ان فائلوں پر مختلف حالات میں مولانا کے صادر کیے ہوئے احکامات ہمیں یہ بتائیں گے کہ یہ فیصلے کرنے والی شخصیت کتنی عظیم رہی ہوگی۔

انتظامی فیصلے قانونی فیصلوں سے مختلف اس لیے ہوتے ہیں کہ قانونی فیصلے قانون کے شکنجے میں کسے ہوئے ہوتے ہیں اور قانون کی روشنی ہی میں ہر فیصلہ ہوتا ہے۔ جبکہ انتظامی فیصلے بہت سی پیچیدگیوں اور مصلحتوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ انتظامی فیصلوں میں انسانی جذبات احساسات اور انفرادی رجحانات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے تلخ بھی ہوتے ہیں اور شیریں بھی۔ جو فیصلے دیانتداری اور ایمانداری۔ ۔ ۔ ۔ کے اصولوں پر کیے جاتے ہیں اُن کی نوعیت ان فیصلوں سے مختلف ہوتی ہے جن کے پیچھے خود غرضی یا کسی قسم کا تعصب کارفرما ہو۔

مولانا کے فیصلوں سے خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے فیصلے غیر اخلاقی جذبات سے بالاتر ہو کر کیے گئے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تلخ ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید کنبہ پروری اور جانب داری کی وجہ سے ایسا نہ کر پاتا۔

گلزار نقوی

چیف لائبریرین، آئی۔سی۔سی۔آر، آزاد بھون، نئی دہلی

ان کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نورالدین صاحب کو کونسل کی لائبریری کا کام سونپا تھا اور تنخواہ صرف ایک روپیہ ماہوار مقرر کی تھی یہ صاحب کوئی اور نہیں بلکہ ان کے حقیقی بھتیجے یعنی بڑے بھائی ابوالنصر آہ کے صاحبزادے تھے۔ ایک اور جگہ سرکاری کاموں سے متعلق کوتاہی اور فرض کی ادائیگی میں کمی پاتے ہوئے مولانا نے اپنے ایک دوسرے قریبی عزیز کے لیے خاطر خواہ سزا تجویز کرنے میں ذرّہ برابر بھی تکلف کر کام نہیں لیا۔ کوئی بھی معمولی کردار کا آدمی اپنے متعلقین کے لیے ایسے فیصلے نہیں کر سکتا خواہ وہ سرکاری نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں۔

کونسل کے ابتدائی دور میں مولانا کی دلچسپی اس حد تک تھی کہ انھوں نے تنظیم اور انتظامیہ سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اپنی ذاتی نگرانی میں رکھا تھا۔ اُس دور کے رہنماؤں کو سرکاری پیسے کے صحیح استعمال کا کتنا خیال تھا اس کا اندازہ ہمیں ذیل کے واقعے سے ہوتا ہے۔

موسم گرما کا آغاز تھا اور دفتر میں کوئی معقول انتظام ٹھنڈے پانی کا نہ تھا۔ تجویز ہوئی کہ چار نئے مٹکے یا بڑے مٹی کے گھڑے فراہم کیے جائیں اس کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی زیرِ غور تھا کہ اسٹاف میں اضافہ ہونے کی وجہ سے چند کرسیاں بھی مہیا کرائی جائیں۔ ان دونوں تجویزوں کا ایک سرکاری نوٹ مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس پر مولانا کا فیصلہ یہ تھا کہ گھڑے خریدے جا سکتے ہیں لیکن کرسیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کام زمین پر بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور فیصلہ جو اپنی نوعیت میں تھوڑا سا مختلف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرسیوں کی خریداری کو رد کرنے والا شخص جذبۂ ہمدردی اور انسان دوستی سے عاری نہ تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ کونسل کے اسٹاف میں ایک صاحبزادے کا تقرر ہوا جو کافی بدحال تھے اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے سرکاری اصول کے تحت ضروری تھا کہ تقرر پانے والے کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہو مگر یہ صاحبزادے ابھی سولہویں سال سے ہی گذرے تھے کہ اپنی بے پایاں ذہانت اور لیاقت کی بنا پر کونسل میں ملازمت پا گئے۔ دو سال بعد جب سرکاری حسابات کی جانچ ہوئی تو آڈٹ پارٹی نے اس معاملے کو گرفت میں لے لیا۔ جس وقت یہ اعتراض اٹھایا گیا اس وقت موصوف مقررہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اب برطرفی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی لہٰذا آڈٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ ان کی گزشتہ خدمات کو کم تنخواہ والی جگہ پر سمجھ[illegible] جائے۔ اور آڈٹ پارٹی کے مطابق نقد پچھتر روپے ک[illegible] رقم مذکورہ ملازم سے واپس لے لی جائے۔ یہ مطالبہ نوع[illegible] ملازم کے لیے ناگہانی آفت تھا۔ قلیل آمدنی کے اس ملازم کے لیے پچھتر روپے کی رقم اس زمانے میں واپس کرنا قطعی ناممکن تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا دوستوں کی صلا[illegible] پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنی ساری پریشانی اور رود[illegible] مولانا کی خدمت میں بصورت اپیل پیش کر دی۔ مولانا[illegible] ایک مصیبت زدہ کی درخواست پر انتہائی ہمدردانہ[illegible] سے غور فرمایا۔ اور سارے اصولوں کو برطرف رکھتے ہو[illegible] اپنا حکم ذیل کے الفاظ میں صادر فرمایا۔

"درخواست کنندہ اس حیثیت میں نہیں ہے[illegible] اس رقم کو واپس کرے اور نہ ہی اس میں اس کی کوئی غل[illegible] ہے۔ یہ ذمہ داری ایڈمنسٹریشن کی ہے اس رقم کو واپ[illegible] لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس رقم کو معاف[illegible] کرتا ہوں"۔

مولانا کے انتظامی فیصلوں کے بارے میں مضمون حرفِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے امی[illegible] ہے کہ بشرطِ توفیق میں اس سلسلے میں کچھ اور اہم واقعا[illegible] روشنی میں لا سکوں گا۔

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS,
NEW DELHI-1.

ICCR/103PartII/52- 2819 October 10, 1952.

The President ICCR kindly sanctioned (vide his orders dated 29.1.52) the appointment of Dr.A.C.Sen as Editor, Indo-Asian Culture on Rs.500/- P.M. plus allowances for six months. He joined his post in this office on 24.[illegible].52 (forenoon), hence that period expired on 23.9.52 afternoon.

Dr.A.C.Sen is now recommended to be placed on the same footing as other members of the ICCR i.e. termination of his services in this Council with one month's notice on either side.

The President ICCR's orders in this connection are solicited.

Sd/-
Secretary ICCR.
10.10.52.

To

P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI.

Minister would like a copy of Dr Sen's appointment letter to be attached to this.
[illegible]
13/10/52

Secy ICCR

Sma/Sae.

A copy of the appointment letter of Dr.A.C.Sen is attached herewith.

Secretary ICCR.
13.10.52.
14

P.S. to Minister of Education.

ICCR/103 Part II/52-2838 Dated 14.X.52

مجھے امید ہے کہ جو کام انکے سپرد ہوا ہے وہ اسے برابر انجام دیتے رہینگے - سر دست ایک برس کے لیے آپ کی مدت تقرری بڑھا دی جاتی ہے - شرائط وہی ہونگی جو ابتدائی تقرری کے حکم میں کہی گئی تھی
[illegible]

ایوانِ اردو دہلی

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS,
HYDERABAD HOUSE,
NEW DELHI-1.

File No 33 Confidential

No. ICCR/103 Part III/53- 3127 Dated, the 6th May, 1953.

The Annual Increment of Mr. .... ICCR, falls due on the 1st of June, 1953, which may kindly be got sanctioned by the President ICCR. The copy of the letter of appointment together with that of sanction pertaining to his last year's Annual Increment is enclosed for ready reference.

1. Name: ......
2. Designation: .... ICCR.
3. Scale of Pay: Rs.300-20-600.
4. Rate of Increment: Rs.20/-.
5. Pay before Increment (i.e., on 31.5.53): Rs.340/-.P.M.
6. Pay after Increment (i.e. with effect from 1.6.53) : Rs.360/-.P.M.

S.H. Burney
Secretary, ICCR.

Supdt.
Pl. circulate & do the needful.
S.H. Burney
13.5.53.

To
P.S. to the Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
New Delhi.

..... کی سروس کا پچھلا ریکارڈ جو میرے علم میں آیا ہے نہایت
درجہ خراب وہ اچھا نہیں ہے - میں چاہتا تھا کہ انھیں ملازمت سے
الگ کیا جائے لیکن چونکہ سکریٹری صاحب نے مجھ سے خاص طور پر سفارش کی
اور یہ کہا کہ انھیں وارننگ دیدی گئی ہے اور امید ہے کہ آیندہ انکا طرزِ عمل
درست ہو جائیگا اسلیے میں نے انکی سفارش منظور کرکے اپنی رائے بدل دی -

اب کم سے کم جو بات کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سال آگے کی ترقی روک دی جائے۔ اگر انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے کو حقدار ثابت کیا تو آئندہ سال اس معاملہ پر غور کیا جائے گا

.... کو میری یہ تحریر دکھا دی جائے

ابوالکلام
آزاد ۱۲-۵

Secy ICCR

---مولانا کے اس حکم کے بعد ان صاحب نے اپنی صفائی میں فل اسکیپ سائز کے چار صفحوں پر مشتمل درخواست انگریزی میں دی اور مولانا سے اس فیصلے پر نظر ثانی چاہی۔ مولانا نے اس پر لکھا:

میں نے پوری طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی

ابوالکلام
آزاد ۱۵-۵

Secy ICCR

Supdt. 19/5/53
Pl. Keep it on the Confidential file for the present.
H. Bowry 15-5-53.

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT:
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE: 43205
HYDERABAD HOUSE,
NEW DELHI-1.

REF.

No.EQ.1/6 29th May, 1953.

My dear Mr. Kripalani,

I forward herewith an application of Dr. Sen dated 28th May 1953, requesting for himself regular grades of pay in the scale of Rs.720-40-1000, and an enhanced salary of Rs.800/-, including two increments of Rs.40/- each. He has given his reasons in support of his application briefly but clearly.

The English Quarterly has just now completed its first year successfully and there is no doubt that it has been appreciated equally in India and the foreign countries. We owe much of the success to the efforts of Dr. Sen, its sole Editor.

As the matter lies entirely in the province of the President I send the application for the President's kind consideration and early orders.

I have communicated the orders to Dr. ... Kept the file.
S.H. Burney
10-7-53

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S.H. Burney)
Secretary, ICCR.

Shri K. Kripalani,
P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
New Delhi.

SHB/OCL.

میگزین کوارٹرلی ہے - اس کا تمام آرٹکل مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جنہیں معقول رقم معاوضہ میں دی جاتی ہے - مسٹر سین کو صرف انھیں ترتیب دے کر پریس میں بھیج دینا پڑتا ہے ایسی حالت میں مجھے امید کرنی چاہیے کہ جو تنخواہ انھیں دی جا رہی ہے کم نہیں ہے -

آزاد ۹ - جولائی

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205
HYDERABAD HOUSE
NEW DELHI-1

File No 307

OUR REF. No. 1. R/103PartIII/53- 4934/54-55

Personal File of
Shri N. Krishnaswamy
Welfare officer.

MOST IMMEDIATE

Dated, the 25th September, 1953.

My dear Mr. Kripalani,

I enclose herewith copy of our Vice-President of the African Section, Shri [illegible]'s letter dated the 23rd September 1953, proposing the appointment of Shri Krishnaswamy as Welfare Officer of the ICCR for one year with effect from 1st October 1953; and also copy of the synopsis submitted to me by Shri Krishnaswamy regarding his qualifications and career.

The terms suggested by Shri [illegible] for his appointment are:-

1. Lump sum of Rs.400/- per month only as his salary.
2. Conveyance expenses for his work in Delhi.
3. Travelling and Journey Allowance while sent outside Delhi.
4. The services to be terminable with one month's notice on either side.

I, therefore, place the whole matter for favour of President's earliest orders, as the appointment of a Welfare Office has been awaiting for some time after the departure of Mr. Chavda, our former Welfare Officer.

Supdt.
Pl. keep it on the record. I am dictating the letter of appointment as sanctioned. Register Read out.
S.H. Burney
30-9-53.

Yours sincerely,

S. H. Burney.
(S.H.Burney)
Secretary, ICCR.

[illegible] 30/9/53

Encl: As above.

Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

پہلے جو آدمی مقرر کیا گیا تھا اسکی تنخواہ کیا تھی؟

SHB/Malik.

ابوالکلام ۱۵/۹/۵۳

اچھی بات ہے ۔ سردست صرف ایک برس کیلئے رکھا جا[illegible]

ابوالکلام ۹ [illegible]

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT.
MAULANA ABUL KALAM AZAD

Jaipur House,
PHONE 43105
NEW DELHI-1.

REF. ICCR/33/54- 104

Dated, the 16th February, 1954.

CONFIDENTIAL & MOST IMMEDIATE

My dear Mr. Kripalani,

At the time of the visit of His Highness The Maharaja of Bhutan early last month, our office and the Library were shifted from the Hyderabad House to the Eastern Rotunda of Jaipur House, and at that time I received the enclosed letter from the Ministry of Education, in which it was stated that the ICCR office and the Library would be again re-shifted to the Hyderabad House at the latest by the middle of this month.

I have already addressed to you my letter No. ICCR/30/54-869 dated the 4th instant on this subject.

Yesterday an officer from the Estate Office visited us at Jaipur House and from the papers with him I learnt that now there was a move in the External Affairs Ministry to the effect that our office should not be permitted to return to Hyderabad House, and some other accommodation be found by the Estate Office for the ICCR office. The reason given was that they wanted to treat the Hyderabad House as Guest House, and for safety purposes, they did not want our office to remain there. This is really very surprising since they have another much larger office of their own - External Publicity Division - also there. The ICCR had never given any cause of complaint so long as it was in the Hyderabad House.

Anyhow, this is against the understanding, under which we were shifted, as would be clear from the enclosed letter of the Ministry and so far as I think also against the wishes of the President ICCR. The ICCR has unfortunately no building of its own as yet, and we were paying rent to the Hyderabad State and cleared off their arrears of Rs. 26,000/- last year on the strict understanding that we wanted to stay there.

As the President ICCR is not doing well these days, I did not want to bother him about this matter, but if I do not bring it to his notice at this moment, I do not know, what other difficulties we may have to face for our office and the Library, if proper steps are not taken immediately.

This short note is to be treated as confidential and may kindly be shown to the President ICCR for his information and action. I shall also let you know of further developments in time.

Yours sincerely,

S. H. Burney

(S.H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encls: As above.

Mr. K. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

SHB/Malik.

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

CONFIDENTIAL & SEALED

PHONE · 43205
Jaipur House
NEW DELHI 1.

Ref ICCR/33/54-

Dated, the 19th February, 1954.

My dear Mr. Kripalani,

Mr. . . . . is the . . . . in the ICCR office since the 1st June 1950. Last year the President ICCR did not sanction his annual increment (copy of his order dated the 12th May 1953 enclosed herewith for reference).

The main cause, I think, was the case of misappropriation of stamps and tampering with the despatch work by a clerk, whom I turned out from the ICCR service.

The President's order, withholding the sanction for the increment due to the . . . . last year, was perhaps justified at the moment and, I believe, it has served its purpose.

After having worked in this office for more than 15 months, I am now in a better position to judge things in their right perspective. After all the supervision of the ICCR work was equally the responsibility of the previous Secretary and if he failed to detect those things, I don't think the ~~Superintendent~~ could be solely held responsible for them. I cannot, however, imagine that he had any hand. No one could question his bona fides.

Anyhow the things have certainly improved after that event and the . . . . has been discharging his duties satisfactorily with the help of the small office that we have.

These are hard times and I think he has suffered more than his share of blame for the past event. Recently he had also got married and his financial liabilities have naturally increased.

Full nine months have now elapsed since that order of the President was passed and I had a mind to reopen the case last month, but did not like to bother the President about it as he was not doing well.

I feel it my duty to reopen it now for the President's favourable consideration. I, therefore, recommend that the President may be kindly pleased to revise his order dated the 12th May 1953 and sanction the full payment of the amount due to the . . . . for his annual increment from 1st June 1953.

I am taking this action of my own accord in the hope that the President would be pleased to give it his best consideration.

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S.H.BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encls: As above.

Shri R. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

SHB/Malik.

ایک سال کے لیے .... کی ترقی روک دی گئی تھی
ابھی سال پورا نہیں ہوا ہے بہرحال سکریٹری صاحب اب
اگر اسکے طرزِ عمل سے مطمئن ہیں تو ۱- مارچ ۵۴ سے اسکی تنخواہ میں وہ اضافہ کیا جا

انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز

کونسل کے کتب خانے کی نگرانی اور حفاظت کے لیے
نورالدین احمد کو لائبریرین مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ سردست
یہ کام بغیر تنخواہ کے کریں گے۔ ضابطہ پورا کرنے کے لیے
انکی تنخواہ ایک روپیہ ماہوار لکھی جاتی ہے۔ ۲۵ اگست ۵۴ء
سے انھیں چارج لے لینا چاہیے

آزاد ۲۳ [illegible] ۵۴ء

[initials] 23/8/54

Supt.

Pl. Keep it on the file & inform the gentleman, with letter of appointment, to take over charge immediately on the 25th August forenoon as ordered by the President.

[illegible signature]
23/8/54

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PATAUDI HOUSE, NEW DELHI-1
PHONE 43205

OUR REF. No. ICCR/103PartIV/54 File 307 55 5428
Personal File of Shri N. Krishnaswamy Welfare Officer.

21st September, 1954.

My dear Mr. Kripalani,

I enclose herewith Shri Kakasaheb Kalelkar's original letter (copy retained on the file) addressed to the President ICCR regarding the extension of the term of Shri N. Krishnaswamy's services as Welfare Officer of the ICCR.

I may be permitted to point out the following for the President's information :-

1. In the Council as it is, no appointments are made on the permanent basis. Even the Secretary's appointment and extensions are for specified periods.

Similarly the Welfare Officer's extension could be made for another year or so, as the President may be pleased to sanction.

I have informed Shri Kakasaheb Kalelkar also about it and he agrees to the idea.

2. As to the accounts, the Welfare Officer has submitted yesterday to me his accounts for Rs. 600/-, advanced to him last time for his tour in the South, and those accounts are being checked by the office.

As to the previous bills, he assures me to regularise them shortly, and Shri Kakasaheb Kalelkar has also written to me to say that he will do the needful early to our satisfaction.

Please return the original letter of Shri Kakasaheb Kalelkar with the President's orders on the same. I also enclose herewith copy of the original letter of appointment dated 30.9.53 appointing the Welfare Officer for one year from 1st October 1953.

Yours sincerely,
S.H. Burney
(S. H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encl: As above.

Supdt. Pl. keep on the file for necessary action with effect from 1st Octr. & inform the W.O. & the Note the President's orders about his salary.
S.H. Burney 22/9/54
DU. 24/9/54

To

Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the
Minister of Education,
Government of India,
New Delhi.

شری کرشنا سوامی کی ملازمت ایک برس کے لیے اور بڑھائی جاتی ہے۔ اب انہیں چارسو کا روپیہ تنخواہ ملیگی۔
ابوالکلام ۲۲ ستمبر ۱۹۵۴

SHB/Malik.

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA A[illegible] AM AZAD

PHONE 43205

REF. No. ICCR/103-V/54-576

PATAUDI HOUSE,
~~HYDERABAD HOUSE~~
NEW DELHI-1

October 23, 1954.

My dear Shri Kripalani,

I enclose herewith Shri Kaka Saheb's letter dated the 22nd October 1954, addressed to the President ICCR, enclosing therewith the application of Shri Prabodh Mehta for appointment as the Assistant Welfare Officer of the ICCR.

As he has already discussed the matter with the President and obtained his approval, I have nothing further to add, except to point out that Shri Kaka Saheb has now recommended for a salary of Rs.400/- instead of Rs.250/-, suggesting amendment of the budget provisions also accordingly.

Yours sincerely,
S.H. Burney
(S.H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encl: (i) Shri Kaka Saheb's original letter, and (ii) original application of Shri Prabodh Mehta (to be returned to office with the President's orders).

To
Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the
Minister of Education,
Government of India,
New Delhi.

SHB/Malik.

۳۵۰ - روپیہ اس جگہ کی تنخواہ ہے
اب اسے بڑھانا مناسب نہیں ہوگا
پھر آئندہ دیکھا جائیگا
ازاد ۲۸/۱۰

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

OUR REF. NO. ..R/103PartV/54-5796

PATAUDI HOUSE, ~~HYDERABAD HOUSE,~~
NEW DELHI-1
PHONE 43205

29th October 1954.

My dear Mr. Kripalani,

I forward herewith in original for the President's favourable consideration Dr. Sen's written request with two relevant enclosures for attending the Indian History Congress Session at Ahmedabad from 27th to 29th December 1954 at an estimated expense within Rs.110/- only.

This time Dr. Sen also proposes to read a paper of his own there.

Yours sincerely,

S. H. Burney
(S.H.Burney)
Secretary.

Shri K.R.Kripalani,
P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI-2

Encls: As above.

SHB/Gae.

یہ کاغذ چھٹیوں میں رکھا گیا تھا۔
غالباً سکریٹری صاحب نے پھر دوبارہ
لکھا تھا۔ اور میں نے منظوری دیدی ہے
لیکن اگر غلطی ہوگئی ہو ایسا نہ ہوا ہو
تو اب منظوری دیدیتا ہوں۔
ڈاکٹر سین کانگرس کے اس اجلاس میں ضرور شریک ہوں

File.
Bu. 14/12/54.
ابوالکلام
GN

۱۱ دسمبر

ایوانِ اردو دہلی

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205

PATAUDI HOUSE, ~~HYDERABAD HOUSE.~~
NEW DELHI-1

OUR REF. No. ICCR/103-V/55-482

29th January 1955.

My dear Mr. Kripalani,

On the representation from the Superintendent of my office the President ICCR was pleased on the 19th May 1952 to grant him a relief of Rs.40/- P.M. in excess of the 10% of his pay for paying the rent of his house with effect from 1st May 1952 (the original order and the application flag 'B' enclosed herewith for reference).

The Superintendent has now placed before me a note representing that the rent of his suite has increased considerably and he needs further aid. His original note and the enclosures placed herewith.

From the statement flag 'C' it appears that since 1952 the Superintendent has paid altogether Rs.190/6/- in this manner. Since December 1954 he has been paying in excess of the 10% of his pay plus Rs.40/- already sanctioned by the President, the sum of Rs.17/15/- P.M.

As a non-government servant he is entitled to no concessions from the Government departments concerned and efforts by him to this end have proved unsuccessful.

The Superintendent therefore prays that Rs.190/6/- be sanctioned for his past payments, and Rs.17/15/- P.M. be allowed till his salary itself is high enough to adjust this increased demand by itself.

الف۔ As regards the request for refund I find that a substantial increase has regularly taken place from May 1954 only and if any relief for past payments could be considered, it should be taken since that month only. The total amount since May 1954 would come to Rs.167/12/- only.

ب۔ Now as to his request for further monthly relief of Rs.17/15/- P.M. I may be permitted to put in a word in his favour. There is no doubt that there has been marked increase in the office work and the Superintendent's responsibilities have also naturally increased and he has to manage in a single room with his wife and child.

I feel that he deserves this partial relief and recommend his case for the President's favourable consideration.

Supdt. Pl. keep on the file & do the needful for (ب) S.H. Burney 1.2.55

Yours sincerely,

S. H. Burney
(S.H.Burney)
Secretary.

Encls: As above.

Shri K.R.Kripalani,
P.S. TO Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI.

الف اور ب منظور
ابو الکلام ۵۵

SHB/Gee.

(Ministry of Education).

Minister may kindly see the letter which Kaka Sahib Kalelkar wrote to the Secretary, Indian Council for Cultural Relations. He has sent a minute of the discussions held with the Minister on 1st April 1955. Flag X

Kaka Sahib has suggested that the Vice-President of the African Section will be authorised to sanction payments in connection with the work of the Africa and West Indies Section and Student Service Unit, subject to overall sanction contained in the budget. He has also suggested that the Vice-President may sign cheques. .

The comment of the office on this is that "with the possibility of considerable expansion in the activities of the Council in the near future, it is desirable from every point of view and especially to relieve the growing burden of the President that with some decentralisation of authority is effected at the top."

The Office has suggested that all Vice-Presidents "have authority to take decisions and sanction payment on the recommendation of the Secretary and subject to the overall sanction contained in the budget."

Minister may kindly indicate if this should be done and if so, the amount to which the Vice-Presidents should be authorised to sanction payments.

Regarding the signing of cheques, Office has suggested and I agree that it would add to the confusion over accounts if more persons are authorised to sign cheques and operate bank accounts of the Council. If the money is sanctioned by the Vice-President direct, payment should not present any difficulty.

Of the other points mentioned in Kaka Sahib's note, I am informed that Shri Prabodh Mehta can for the present be sent to Bombay for only two or three months. Question of permanent transfer may be taken up later.

The other proposals of Aka Sahib may be accepted.

(Humayun Kabir).
26. 4. 1955.

Minister.

سکریٹری صاحب یہ فائل لاکر مجھ سے اس کی بابت بات کرلیں۔

آزاد ۲ مئی ۵۵

Secretary will please bring this file and discuss personally.

Sd.(A.K.) Azad.

2. 5. 1955.

Secretary.

بہتر ہے وائس پریسیڈنٹ کو اختیار ہوگا کہ ایک ہزار روپیہ تک کے خرچ کا فیصلہ کردیں اور اس کی اطلاع پریسیڈنٹ کو دیدیں۔ ایک ہزار کی رقم کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت میں اس سے زیادہ کا خرچ نہ ہو اور اگر اس کے بعد پھر کوئی خرچ ہزار روپیہ تک کا پیش آجائے تو ضروری ہوگا کہ ~~اس کی پہلے اطلاع پریسیڈنٹ کو~~ پچھلے ہزار روپیہ کی منظوری پریسیڈنٹ کی انہیں مل گئی ہو

آزاد ۳ مئی ۵۵

(2)

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS,

The Finance Committee of the Council at its first meeting on October 5th, 1955 made the following recommendations regarding the appointment of a Librarian for the Council Library:-

".......that Shri Noor-ud-din Ahmed, at present working as Honorary Librarian be appointed in this post. The post should carry a salary of Rs.275-20-475-25-750. The Committee also recommend that Shri N.D. Ahmed by given a starting salary of Rs.325/- within the scale suggested above. The appointment may take effect from the 1st October, 1955."

As desired by the Vice-President Prof. Humayun Kabir this recommendation of the Finance Committee is submitted to the President for his consideration and approval.

President

Secretary, ICCR.
13. X. 1955

(۱) نورالدین کی تنخواہ سردست ۳۲۵ سے شروع کی جائے

(۲) تنخواہ کے ساتھ وہ الاؤنس بھی دینا چاہیے جو ہم کونسل کے ملازموں کو دے رہے ہیں

(۳) مجھے معلوم ہوا ہے کہ نورالدین [struck out] کو اگست سے تنخواہ دینا طے ہو گیا تھا، اسلیے انکی ملازمت ۱- اگست سے قرار دی جائے نہ کہ ۱- اکتوبر سے

آزاد ۱۹—۱۰

The President,
Indian Council for Cultural Relations,
New Delhi.

Sir,

Most respectfully I beg to state that due to certain personal circumstances of mine I find myself unable to continue in my service as the Librarian of the Council, and therefore I hereby beg to tender my resignation from the said post and request to be relieved of my charge as early as possible.

Yours respectfully,

Nooruddin Ahmed

(Nooruddin Ahmed)
Librarian, I.C.C.R.

Dated: 5th September, 1956.

انڈین کونسل کے لائبریرین نورالدین کی یہ درخواست مجھے ملی ہے
میں ان کا استعفا منظور کرتا ہوں۔ سکریٹری صاحب سردست
لائبریری کی نگرانی کا عارضی انتظام کر دیں۔ آئندہ کسی دوسرے
شخص کے تقرر کے معاملے پر غور کیا جائے گا

آزاد ۵ ستمبر ۵۶ء

Spoken to the President and Vice-President Sri K.G. Saiyidain. The Library Assistant Sri Abbasi will continue to look after the library under the supervision of the Secretary. Sri Nooruddin Ahmad is to be relieved of his charge as soon as possible.

[illegible]

[illegible]
28.9.56.

Ministry of Education
& Scientific Research,
Govt. of India.

سکریٹری انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز

Ay 6820/57

کتب خانہ کے لائبریرین کی جگہ ابھی تک خالی ہے
چونکہ نورالدین احمد نے اسکے لیے آمادگی ظاہر کی ہے
کہ بلا تنخواہ کام کرینگے اسلیے انہیں مقرر کیا جائے
تنخواہ صرف ایک روپیہ ماہوار ہوگی۔

آزاد ۱ ۷/۵۷ Vice-President may kindly see.

Secy. I.C.C.R.

Inam Rahman
1.7.57.

Vice-President (Sri Saiyidain)
Secy/231/57 4955

Secretary / I.C.C.R. Inam Rahman
2.7.57

مولانا آزاد کی کچھ نادر تحریریں

مولانا ابوالکلام کی بکھری ہوئی تحریریں مختلف ادب دوستوں کی توجہ سے کئی مجموعوں کی شکل میں مرتب اور شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے باوجود ابھی ایسی تحریریں باقی ہیں جن سے مولانا آزاد میں دلچسپی رکھنے والے اور ان پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات بھی اس لیے واقف نہیں کہ وہ ابھی تک مدوّن و مرتّب نہیں ہوسکیں۔

آج کی صحبت میں مولانا مرحوم کی ایسی ہی چند تحریریں جو غیر معروف یا کم معروف ہیں پیش کرنا مقصود ہے۔ ان میں سے پہلی تین کا تعلق کتب خانۂ عالیہ رام پور اور میرے والد مرحوم مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ذات سے ہے۔

ذیل میں پہلے انھیں تینوں کا تعارف اور ان کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اصل کے عکس بھی شامل کیے جارہے ہیں۔ یہاں ان میں کی پہلی تحریر مولانا عرشی کی اوّلین مرتبہ کتاب "مکاتیب غالب" کی [illegible] کے بارے میں مولانا ابوالکلام کا مختصر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا کا تبصرہ مکاتیب غالب کے طابع قیمہ پریس بمبئی کے مالکان کی درخواست پر لکھا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا قیام ان دنوں بمبئی میں تھا۔ اس تبصرے کو اسی زمانے میں مکاتیب غالب کے گرد پوش پر بھی چھاپ دیا گیا تھا۔ چونکہ مولانا آزاد نے اپنی اس تحریر میں اس بات پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا ہے کہ مکاتیب غالب کی طباعت میں نسخ ٹائپ استعمال کیا گیا' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ٹائپ کے نمونے کے طور پر کتاب کے گرد پوش سے مطبوعہ تبصرے کا عکس ہی ذیل میں درج کردیا جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ کون سا ٹائپ تھا جس کے حسن سے متاثر ہوکر مولانا نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اُردو میں ٹائپ طباعت سے مولانا کی دلچسپی اس امر سے ظاہر ہے کہ 'الہلال' اور 'البلاغ' دونوں کو انھوں نے ٹائپ میں طبع کرنا پسند کیا تھا گو اُس وقت تک الٰہ آبادی ٹائپ ہی میسّر تھا جو حُسن میں مصری ٹائپ سے کمتر ہے جس کی تعریف و توصیف ذیل کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ مولانا کی ٹائپ کے لیے پسندیدگی کے اظہار پر اب نصف صدی کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اُردو کی قسمت کاتبوں کے ہاتھ ہی میں ہے ایران اور شرق اوسط کے تمام ممالک حتیٰ کہ افغانستان جیسا پس ماندہ ملک بھی ٹائپ کی طباعت کو اپنا چکا ہے اور اسی باعث ان ممالک کی مطبوعات کا معیار نشر و طباعت ہماری زبان اُردو کے معیاروں سے بدرجہا بلند ہے اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ عہد جدید کی رفتار طباعت اور اس کے حسن سے اردو کو آشنا کرنے کے لیے ٹائپ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بہرحال مولانا کا تبصرہ اور ان کے پسندیدہ ٹائپ کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱)

تبصرہ مولانا ابوالکلام

"مکاتیب غالب" کی اشاعت پر ریاست رامپور مستحق تبریك ہو۔ اگر غالب کے رقعات کا یہ مجموعہ شائع نہ ہوتا تو انکی آخری زندگی کے متعدد اہم گوشے تاریخ کی روشنی سے محروم رہجاتے

عرشی صاحب نے ترتیب کے ساتھہ بحث و نظر کا فریضہ بھی مؤلفانہ قابلیت کے ساتھہ انجام دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھہ مجھے اس بات سے خوشی ہوی کہ طباعت کے لیے نسخ ٹائپ اختیار کیا گیا جس سے بہتر ٹائپ اردو طباعت کے لیے نہین ہوسکتا۔ اس سلسلہ مین مطبع قیمہ بمبئی کی کارگزاری کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔

ابو الکلام، ۲۱ مئی ۱۹۳۸ ع

اکبر علی خاں عرشی زادہ
پھلوار' رام پور ۲۴۴۹۰۱

مولانا آزاد مرزا غالب کے شیدائیوں میں تھے جس کا ثبوت مولانا کی متعدد تحریروں سے ملتا ہے چنانچہ 'الہلال' میں بھی انھوں نے غالب کا غیر معروف کلام چھاپنے کا اہتمام کیا تھا۔ اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پسندیدگی کے باوجود شاعر کی زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے میں بھی تامل سے کام نہیں لیتے تھے۔ مکاتیب غالب کے بیشتر خطوط میں غالب نے نوابان رام پور سے مختلف قسم کی مالی امداد کی درخواست کی ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو غالب کے عقیدت مندوں نے اس اشاعت کو ان کی شاعرانہ خودداری کے پیش نظر بادل ناخواستہ ہی قبول کیا تھا۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد نے ان کی اشاعت کو ضروری اور مستحسن جانا مولانا کی رائے میں ان خطوط کی اشاعت سے غالب کی آخری زندگی کے اہم گوشے اہل ادب کے سامنے آئے تھے اس طرح یہ تبصرہ ابو الکلام کی تنقیدی بصیرت اور وسیع النظری کا بھی ایک ثبوت ہے۔

مولانا کی دوسری تحریر کا تعلق بھی مکاتیب غالب اور اس کے طابع سے ہے جو محولہ تحریر سے پانچ ماہ قبل لکھی گئی ہے۔ مکاتیب غالب کو کتاب خانۂ عالیہ رام پور کی مطبوعات کے سلسلے میں بطور سلسلہ ریاست رام پور نے طبع اور شائع کرایا تھا۔ اور اس کی طباعت کا کام جیسا کہ تبصرے سے معلوم ہوگا بمبئی کے مطبع قیمہ نے انجام دیا تھا۔ کتاب کی اہمیت اور اس کی نکاسی کی متوقع تیز رفتاری کے باعث مالکان مطبع نے جو خود عربی فارسی اُردو کی مطبوعات کے تاجر بھی تھے ریاست سے سول ایجنسی لینا چاہی اس کے لیے نقد زر ضمانت کا مطالبہ ریاست کی طرف سے کیا گیا۔ چونکہ مطبع قیمہ کے مالکان یعنی شرف الدین الکتبی و اولادہ' کا مولانا سے گہرا تعلق تھا اس لیے انھوں نے ضمانت کی شرط سے مستثنیٰ کردیے جانے کی غرض سے مولانا کا ایک سفارشی خط مولانا عرشی کے نام لکھوایا۔ اس میں مولانا نے پُرزور الفاظ اور اپنے تجربے کے حوالے کے ساتھ ضمانت سے مستثنیٰ کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جائز معاملات میں سفارش کردیا کرتے تھے۔ یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ مجھے اپنے والد مرحوم سے دریافت کرنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا لیکن مولانا آزاد کے مرتبے کو پیش نظر رکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ میسرز شرف الدین الکتبی کو ضمانت کی شرط سے مستثنیٰ کردیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ وہی اس کتاب کے سول ایجنٹ مقرر کیے گئے تھے اور اس حیثیت سے ان کا پتا کتاب کے فلیپ پر چھپا بھی تھا۔ ذیل میں یہ مکتوب نقل کیا جاتا ہے:

(۲)

بمبئی

۷۔۱۔۱۹۳۸ء

جناب من!

مولوی عبد الصمد شرف الدین صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ ریاست رام پور نے کوئی کتاب چھپوائی ہے اور اس کی ایجنسی کے لیے نقد ضمانت کی شرط قرار دی گئی ہے۔ میں مولوی عبد الصمد صاحب کو ان کے والد مرحوم کے زمانے سے جانتا ہوں۔ انھوں نے کتابوں کی تجارت کا سلسلہ میرے ہی ایما سے شروع کیا تھا۔ یہ کاروباری معاملات میں ہر طرح قابل اعتماد اور دیانت دار ہیں۔ بے عنوانی اور بے قاعدگی کے کسی اندیشے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہوگا کہ ان سے ضمانت کی رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو کوشش کیجیے کہ اس شرط سے یہ مستثنیٰ کردیے جائیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

مولوی امتیاز علی صاحب عرشی
رام پور

تیسری تحریر بھی سابق تحریروں کی طرح کتب خانۂ عالیہ رام پور اور مولانا عرشی مرحوم ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۵۲ء کے پارلیمانی الیکشن میں مولانا آزاد کا انتخاب حلقۂ رام پور سے ہوا تھا۔ اس زمانے میں دوران الیکشن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں رام پور تشریف لاتے تھے۔ پنڈت جی تو کتب خانے نہ آسکے لیکن مولانا اپنی بے انتہا الکشنی مصروفیات کے باوجود بھی کتب خانے کو نہ بھولے اور کچھ وقت نکال کر تشریف لے ہی آئے۔ اس تحریر سے دو تین امور سامنے آتے ہیں پہلا یہ کہ وہ اس سے پہلے بھی کبھی کتب خانے کی زیارت کرچکے تھے اور اس کی اہمیت کا وہی پہلا نقش اب تک ان کے دل پر قائم تھا جو مصروفیات کے باوجود وہ کتب خانے

آنا نہ بھولے۔ دوسرے یہ کہ ان کی نظر میں کتب خانے کی ترویج و ترقی کا پروگرام تھا۔ افسوس یہ کہ وہ اسے اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے اور تیسرے یہ کہ مولانا عرشی کی لیاقت علمی کے وہ کس قدر قائل اور ان کی ذات کو کتب خانے کے لیے اتنا اہم اور مفید جانتے تھے کہ خاص طور پر اپنے اطمینان اور نہایت درجہ خوشی کا اظہار کرنا ضروری جانا۔ ذیل میں کتابِ معائنہ سے اس کی نقل اور آئندہ صفحات میں اس کا عکس پیش ہے:

(۳)

ایک عرصے کے بعد مجھے اس قیمتی کتب خانے کے معائنے کا پھر موقعہ ملا۔ ہندوستان میں جو گنتی کے ذخائر ہیں ان میں ایک گراں مایہ ذخیرہ یہ ہے۔

امید ہے حالات کی تبدیلیوں نے جواب نئی صورت پیدا کر دی ہے وہ اس کتب خانے کی مزید اصلاح و ترقی کا موجب ثابت ہوگی۔

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ایک صاحب علم فرد کی خدمت و نگرانی اسے حاصل ہے۔ یعنی مولوی امتیاز علی صاحب عرشی کی۔

ابوالکلام آزاد

۱۲ جنوری ۵۲ء

چوتھی تحریر ایک مختصر مکتوب ہے جو اُردو والوں کی جانی پہچانی اور کتنی مشاہیرِ ادب کی ممدوح شخصیت عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھا گیا ہے۔ شیخ محمد اکرام مولف شبلی نامہ نے اسے دریافت کیا تھا لیکن وہ اس کی تاریخ تحریر نقل کرنا بھول گئے۔ یہ مکتوب مولانا آزاد کے اپنے مخصوص اسلوب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے اگرچہ بہت مختصر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم اور مولانا کے درمیان بھی سلسلۂ مراسلت تو کم تھا۔ شیخ اکرام نے مولانا کے دو مکتوب عطیہ بیگم کے پاس دیکھے تھے لیکن ضیاء الدین برنی بی اے نے جو عطیہ بیگم کے بہت نزدیک تھے اور جنھوں نے سب سے پہلے اقبال پر ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ اُردو میں شائع کیا، مولانا آزاد کے متعدد خطوط عطیہ بیگم کے ذخیرے میں موجود ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ابوسلمان الہندی صاحب مقیم کراچی کوشش فرمائیں تو باقی ماندہ خطوط بھی منظرِ عام پر آسکیں گے۔

بہر حال ذیل میں وہ مکتوب پیش ہے:

(۴)

بلاشبہ ایک گرفتاری سے رہائی مل چکی ہے لیکن اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ اس گرفتاری کی نہ طلب تھی نہ انکار۔ لیکن بعض گرفتاریاں ایسی ہیں کہ چھوٹنا بھی چاہیں نہیں چھوٹ سکتے مثلاً آپ کے لطف و عنایت کی اسیری:

خلاص حافظ ازاں زلف تاب دار مباد

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ شیخ اکرام نے اس خط کی تاریخ کتابت نوٹ کرنا ضروری نہیں جانا لیکن ایک اور ذریعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جنوری ۲۳ء کی کسی تاریخ کا خط ہے۔ نکہت سہسوانی کے نام انھوں نے کلکتے سے ۱۵ جنوری ۲۳ء کو ایک خط لکھا ہے اس میں بھی اسیری سے رہائی کا تذکرہ تقریباً انھیں الفاظ میں ہے جن میں عطیہ بیگم سے کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس خط کو حنیف نقوی صاحب کے شکریے کے ساتھ مع عکس پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو کہ یہ دونوں خط ایک ہی واقعے اور ایک ہی زمانے سے متعلق ہیں:

(۵)

کلکتہ

۱۵ جنوری ۲۳ء

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

بلاشبہ بریلی کی صحبت مختصر تھی لیکن اس کے لیے کافی تھی کہ آپ مجھے یاد رہیں۔ شکر گزار ہوں اور آرزو مند۔

ایک گرفتاری سے رہائی مل چکی ہے مگر ابھی اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ دیکھیے ان سے کب تک رہائی ملے۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو

وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

فقیر

احمد کان اللہ لہٗ

چھٹی تحریر نذیریہ پبلک لائبریری دہلی سے متعلق ہے۔

دہلی میں ایک بڑے نامی گرامی بزرگ گزرے ہیں میاں محمد نذیر حسین محدث دہلوی۔ (متوفی ۱۳۲۰ء) جن سے صدہا تشنگانِ علم نے فیض حاصل کیا۔ ان کے انتقال کے برسوں بعد ان کی یادگار میں حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر ایک پبلک لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اور کتب خانۂ نذیریہ عامّہ کہلایا۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کتب خانے کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد کے دست مبارک سے کرایا گیا تھا۔ اور اس کے نگراں میاں صاحب محدث کے نواسے مولوی سید عبدالرؤف صاحب مقرر ہوئے تھے جو تاحیات اس کی تندہی سے خدمت انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں یہ کتب خانہ پھاٹک حبش خاں میں تھا جہاں وہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۰ء تک تقریباً ۲۴ سال رہا۔ لیکن عمارت کتب خانے کے شایانِ شان نہیں تھی اس لیے اسے ۵۰ء میں اتحاد منزل پہاڑی بھوجلہ پر منتقل کر دیا گیا۔ نئی عمارت شاندار بھی تھی اور شایانِ شان بھی۔ مولانا نے اس کا دوبارہ معائنہ ۴۹ء میں کیا تھا اور عمارت کے نامناسب ہونے کو محسوس کرتے ہوئے اس کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ عبدالرؤف صاحب کے انتقال کے بعد لائبریری کے حالات دگرگوں ہوتے گئے۔ یہ ذخیرہ نادر کتب کے علاوہ قدیم اخبارات و رسائل کے فائلوں کے لحاظ سے بھی بہت گراں قدر ہے۔ چونکہ یہ مسلسل برباد اور ضائع ہو رہا تھا اس لیے حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمت سے کام لیا اور اپنی تحویل میں اسے ہمدرد نگر تغلق آباد منتقل کر دیا جہاں یہ آج کل ہے، اور اس طرح اسے ایک اچھا مکان اور کافی سرمایہ میسّر آگیا۔ اب یقین ہے کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ مناسب انداز سے محفوظ ہو جائے گا۔ مولانا آزاد نے بڑی دردمندی اور عقیدت کے جذبے کے ساتھ کتاب معائنہ پر ذیل کی رائے تحریر فرمائی:

(۶)

کتب خانۂ نذیریہ عامّہ، بیادگار حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نوّر اللہ مرقدہ، جن کے فیوض اور برکات سے صدہا علماء و طلبہ مشرف نور ہوئے، دیکھنے کا دوبارہ اتفاق ہوا، جو مولوی سید محمد عبدالرؤف صاحب کی سرگرم کوشش سے قائم ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ باوجود ہر طرح کی بے سروسامانیوں کے کتب خانے نے اپنی کمیت اور کیفیت میں کافی ترقی کی ہے۔ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو رہی ہے اور اخبارات و رسائل کی بہت اچھی تعداد فراہم ہے۔ (افسوس) کہ اہل دہلی نے اس ضروری اور مفید کام کی طرف اس درجہ توجہ نہ کی جس درجہ متوقع تھی۔ ورنہ اس کے لیے ایک اچھے مکان اور کافی سرمایے کی فراہمی میں دشواری نہ تھی۔ مجھے امید ہے کہ دہلی سے باہر کے اہل خیر کی توجہ اب اسے زیادہ عرصے تک اسی ابتدائی حالت میں نہ رہنے دے گی۔ اور کم از کم اس درجہ سامان اس کے لیے مہیّا ہو جاوے گا کہ ایک اچھے مکان میں منتقل کیا جا سکے اور کتابوں کی خرید اور جلد بندی کے لیے ایک کافی سرمایہ فراہم ہو جائے۔

ابوالکلام

۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء

مولانا آزاد کی ساتویں تحریر جو یہاں پیش کی جا رہی ہے ان کا ایک مختصر مضمون ہے جو گاندھی جی کے اخبار "ہری جن سیوک" کے لیے انھیں کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اور اس کی اشاعت مورخہ ۲۶ جون ۴۶ء میں شائع ہوا تھا جسے مشترک زبان میں انتخاب کیا گیا۔ گاندھی جی ہندی اور اُردو کے قضیے کو نبٹانے کے لیے سہل زبان کے مبلغ تھے جس کا نام انھوں نے ہندوستانی رکھا تھا۔ چنانچہ یہ اخبار بھی وہ اسی زبان میں شائع کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے خاص طور پر مولانا آزاد سے سہل اردو یعنی ہندوستانی میں ایک مضمون زبان کے مسئلے ہی پر لکھوایا۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ تحریر اس لحاظ سے نادر ہے کہ اس سے پہلے انھوں نے ہندوستانی میں کچھ اور نہیں لکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نے اس میں سنسکرت کے صرف ایک دو لفظ ہی استعمال کیے ہیں جن میں سے ایک جاگرتی بھی ہے زبان کے مسئلے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مضمون بہت اہم ہے ذیل میں اسے تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے:

(۷)

گاندھی جی نے ہندوستان کو بہت سی چیزیں دی ہیں مگر شاید کم لوگوں کا دھیان اس طرف گیا ہو گا کہ ایک بڑی چیز جو ہندوستان کو ان کے ہاتھوں سے ملی وہ اس کی ملکی زبان ہے۔ بہت سی بولیاں رکھنے پر بھی ہندوستان اپنی ملکی بولی نہیں رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اس کی یہ کمی پوری کر دی۔

انگریزی زبان حکومت کے دروازے سے آئی لیکن آتے ہی سارے ملک پر چھاگئی اور اس طرح چھاگئی کہ ہماری تعلیمی علمی اور سماجی زبان کی جگہ اسی کو مل گئی۔ اب پڑھے لکھے ہندوستانی اپنی ملکی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات سمجھنے لگے تھے۔ بڑائی اور عزت کی بات یہی سمجھی جاتی تھی کہ ہر موقع پر انگریزی زبان سے نکلے۔ لوگ اپنی نج کی بات چیت میں بھی انگریزی کو بھلانا پسند نہیں کرتے تھے۔

پچھلی صدی کے آخری حصے میں ملک کی نئی سیاسی جاگرتی شروع ہوئی اور انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اب کانگریس کے جلسے اس لیے ہونے لگے کہ ملک کی قومی مانگوں اور قومی فیصلوں کی آواز دنیا کو سنائی جائے۔ لیکن یہ آواز بھی اپنی زبان میں نہیں اٹھتی تھی انگریزی میں اٹھتی تھی۔ ہندوستان اب انگلینڈ کو یہ بات سنانا چاہتا تھا کہ اس کا ملک خود اس کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے لیکن یہ بات کہنے کے لیے بھی اسے اپنی ہندوستانی زبان نہیں ملی تھی وہ دوسروں ہی کی زبان اُدھار لے کر اپنا کام چلانا چاہتا تھا۔

لیکن جیوں ہی گاندھی جی نے ملک کے سیاسی میدان میں قدم رکھا اچانک ایک نیا انقلاب ابھرنا شروع ہوگیا۔ اب ملک کی آواز خود اس کی زبان میں اٹھنے لگی اور ملک کی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات نہیں رہی۔ انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ شرم کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان بولیں، شرم کی بات یہ ہے کہ اپنی زبان بھول جائیں۔ انھوں نے ۲۱-۱۹۲۰ء میں سارے ملک کا دورہ کیا اور سیکڑوں تقریریں کیں لیکن ہر جگہ ان کی تقریروں کی زبان ہندوستانی ہی رہی۔

مجھے یاد ہے کہ پچھلی لڑائی کے زمانے میں، جب میں رانچی میں قید تھا تو میں نے اخباروں میں اس کانفرنس کی کارروائی پڑھی تھی جو سنہ ۱۹۱۷ء میں لارڈ چیمس فورڈ نے دلّی میں بلائی تھی۔ گاندھی جی اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے مگر انھوں نے یہ بات بطور شرط کے ٹھہرالی تھی کہ وہ تقریر ہندوستانی میں کریں گے۔ اس وقت اخباروں نے اس واقعے کو ایک نئی اور عجیب طرح کی بات خیال کیا تھا۔ لیکن یہ نئی بات بہت جلد ملک کی سب سے عام بات بننے والی تھی چنانچہ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جو جگہ پچیس برس پہلے انگریزی زبان کی سمجھی جاتی تھی وہ ہندوستانی زبان نے لے لی ہے۔

ابوالکلام آزاد

مولانا کے اس مختصر مضمون کے خاتمے پر گاندھی جی نے مضمون کے بارے میں چند جملے لکھے ہیں مناسب ہوگا کہ ان کو بھی قارئین کے سامنے پیش کردیا جائے۔ گاندھی جی نے تحریر کیا ہے۔

"اوپر کا لکھان میری تعریف کے لیے نہیں ہے جو آدمی اپنا دھرم سمجھ کر کچھ سیوا کرتا ہے اس میں تعریف کیا ہے؟ مولانا صاحب عالم ہیں۔ فارسی اور عربی کا گیان رکھتے ہیں اس لیے اُردو خوب جانتے ہیں لیکن وہ مانتے ہیں کہ نہ تو عربی فارسی لدی اُردو ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی ہے اور نہ سنسکرت بھری ہندی۔ اس لیے وہ اُردو اور ہندی کا میل چاہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر بولتے ہیں میں نے ان سے پرارتھنا کی ہے کہ ہر ہفتے ایک چھوٹا ہندوستانی لیکھ دیتے رہیں جس سے ہندوستانی کا ایک نمونہ ہریجن سیوک پڑھنے والوں کو ملتا رہے۔ اس کوشش کا پہلا نمونہ اوپر کا لکھان ہے۔

م ک گاندھی"

گاندھی جی کے اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد سے مستقل کچھ نہ کچھ ہندوستانی میں لکھتے رہنے کے لیے کہا تھا۔ ہو سکتا ہے مولانا آزاد کی تحریریں ہریجن سیوک کے آئندہ شماروں میں تلاش کی جائیں تو کچھ اور بھی مل جائیں۔ اگرچہ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات اور ۴۶ء و ۴۷ء کے پر آشوب زمانے کے پیش نظر کچھ زیادہ تحریریں دریافت ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی شخصیت

("غبارِ خاطر" کے آئینے میں)

حامدی کاشمیری
صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، کشمیر۔

مولانا آزاد نے یوں تو نثر میں کئی چیزیں لکھی ہیں۔ مثلاً تذکرہ وغیرہ تاہم ان کے خطوط کا مجموعہ یعنی "غبارِ خاطر" ہی دراصل ان کی ادبی شخصیت کا نمائندہ بھی ہے، اور تمام و کمال اظہار بھی۔ یہ خطوط مولانا نے قلعۂ احمد نگر میں، جہاں وہ قید تھے، نواب صدر یار جنگ کے نام لکھے ہیں، چونکہ ایامِ اسیری میں خط بھجوانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے ان کے خطوط جو وہ وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے جمع ہوتے رہے، اور بعد میں ان کی رہائی کے بعد چھپ گئے۔

سوال یہ ہے کہ ان خطوط کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خطوط کو مکتوبات سے موسوم کرنے، اور ان میں مکتوب نگاری کے بعض لوازم کی پابندی کرنے کے باوجود، یہ مکتوب نگاری کی روایت سے مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے مکتوب نگاری کی صنف کی حیثیت سے ان کی قدر سنجی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔ عالمی ادب میں مکتوب نویسی ایک منفرد ادبی صنف کے طور پر متعارف ہوئی ہے، اردو میں غالب کے خطوط ادبی روایت کا درجہ رکھتے ہیں، غالب کے بعد اقبال، فیض اور سجاد ظہیر سے لے کر تنہا انصاری تک، جن جن حضرات نے خطوط لکھے ہیں، وہ کم و بیش اسی روایت کی توسیع کرتے ہیں۔ اس روایت کی رو سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں ایک ذہنی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، یہ ایک ذہنی خلوت کا عالم ہے، جس میں کسی تیسرے کا گذر نہیں ہوتا، مکتوب نگار انتہائی بے تکلفی، برجستگی، بذلہ سنجی اور اپنائیت سے مخاطب ہوتا ہے، اور بے ساختہ پن سے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ خط کی ابتدا سے تا آخر یہ رشتۂ مخاطبت قائم رہتا ہے اور مکتوب نگار اپنے معتقدات اور نظریات یہاں تک کہ تعصبات و ترجیحات کا بھی بے محابا اظہار کرتا ہے۔ مکتوب نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سنجیدہ علمی اور فلسفیانہ افکار و نکات بھی سادگی، اختصار اور بے تکلفی سے بیان کیے جاتے ہیں، اور کہیں سے کہیں تک مراسلہ مضمون یا مقالے کی گرانباری کا احساس نہیں دلاتا۔ "غبارِ خاطر" کے مکتوبات پر نظر ڈالیے، تو یہ تاثر قائم ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ مکتوبات مکتوب نگاری کے ذیل میں نہیں آتے، مکتوبات میں حرفِ مخاطبت یعنی کہ "صدیق مکرم" اور خاتمے پر "ابوالکلام" لکھنے سے یا کہیں کہیں پر، جیسا کہ شروع شروع کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، راست تخاطب کے باوجود، یہ مکتوب نگاری کے نمونے قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ان مکتوبات میں مصنف نے دورانِ اسیری، زندگی کے واردات، مطالعات، مشاہدات، فلسفیانہ افکار اور ذاتی تاثرات کی ایک عالمانہ اور محققانہ سطح پر بازآفرینی کی کوشش کی ہے، یہ خطوط علم و آگہی کے دفاتر کھولتے ہیں، مثلاً معمۂ ہستی، فنِ موسیقی یا انانیتی ادب کے بارے میں مصنف کے عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے حافظے کی مدد سے ان موضوعات و مسائل کے بارے میں اپنے علم و خبر کا اظہار کر رہے ہیں، اور مکتوب الیہ سے ان کا تخاطب برائے نام رہ جاتا ہے۔ کم و بیش یہی انداز دیگر مکتوبات کا بھی ہے۔ جن مقامات پر علمی مباحث یا فلسفیانہ تصریحات کے بجائے بذلہ سنجی یا طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے، وہاں مخاطب کی موجودگی کے احساس کے بجائے خطاب کنندہ ہی حاوی نظر آتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو "غبارِ خاطر" کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالتِ اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپردِ قرطاس کیا ہے، اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقاید، افکار اور نظریات، کا اظہار بھی کیا ہے، چنانچہ "غبار خاطر" میں مذہب، خدا، کائنات اور غم و مسرت جیسے گمبھیر مسائل سے لے کر حریفانِ سقف و بام یعنی چڑیوں سے محاذ آرائی جیسے مزاحیہ واقعے کے بیان تک، مصنف نے پوری ذہنی آزادی اور طبیعت کی ترنگ کے مطابق، اپنے خیالات و تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگارشات انشائیہ نگاری ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ انشائیہ بنیادی طور پر طبیعت کی ترنگ، جیسا کہ جانسن نے کہا ہے، کا ہی اظہار ہے، یعنی مصنف ذہنی کیفیت میں قلم برداشتہ، کسی خارجی یا داخلی محرک کے تحت ایک فطری بہاؤ میں ذاتی تاثرات

سے لے کر خارجی اشیا و اشخاص کے بارے میں اپنے خیالات کو قلم بند کرتا ہے، یہ کام غیر منظم اور غیر منصوبہ بند ضرور ہوتا ہے، اور منتشر الخیالی کا تاثر پیدا کرتا ہے، تاہم مجموعی طور پر انتشار کے باوجود تسلسل و تعمیر سے عاری نہیں ہوتا، یہ بات سے بات پیدا کرنے کا صناعانہ انداز ہے، گویا وہ گوئی پر نہیں بلکہ معقولیت اور معنویت پر منتج ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، ان میں چائے نوشی، قلعۂ احمد نگر، مذہب، موروثی عقائد، سحر خیزی، قید خانہ، چیتہ خان، خلوت پسندی، خاندان، عادات و خصائل، تعلیم، زندگی، کائنات، خدا، وحدت الوجود، مادہ، روح، پانچویں صلیبی حملے کے بارے میں، ژو این دیل کی یادداشت، چائے کے اقسام اور تاریخ، آئنس دان، انانیتی ادب، حکایت زاغ و بلبل، پھولوں کی اقسام، چڑیا چڑے کی کہانی، قلندر اور فن موسیقی وغیرہ شامل ہیں، ان موضوعات کے بارے میں مصنف نے بغیر کسی کد و کاوش کے، روانی اور برجستگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور طرز تحریر میں جو بے ساختگی اور شگفتگی ہے وہ بھی انشائیہ نگاری کے اصول کی توثیق کرتی ہے۔ مصنف نے غالباً اسی مناسبت سے کتاب کا نام "غبارِ خاطر" (جو آنند رام مخلص کے ایک رسالے سے مستعار لیا گیا ہے) رکھا ہے۔ مزید برآں، کتاب کے دیباچے میں وہ اپنے مکاتیب کو "قلم برداشتہ لکھے ہوئے" قرار دیتے ہیں، اور عنوان کے نیچے یہ شعر درج کیا ہے:

ہر حرف نامہ نوشت ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست این غبارِ خاطرِ ما

اور اس کا ذکر دیباچے میں بھی کیا ہے، بات سے بات نکلنے کی جانب خود بھی اشارہ کیا ہے:

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوک قلم پر آگئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں سراسر و شانہ ہلنے لگا یا منہ سے ہا نکل گیا۔"

مغربی ادب میں انشائیہ نگاری نے اپنی ادبی اہمیت منوالی ہے، اردو میں حالیہ برسوں میں انشائیہ نگاری کو فروغ ملا ہے، وزیر آغا جدید دور کے ایک اہم انشائیہ نگار ہیں، انھوں نے "اوراق" کے ذریعے اسے مقبول بنانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے، چنانچہ اب کئی مستند ادیب انشائیے لکھ رہے ہیں، اور جو انشائیے لکھے جا رہے ہیں وہ ادبی خوبیوں سے معمور ہوتے ہیں۔ انشائیے میں مصنف کی شخصیت کے پرتو ہر جگہ نظر آتے ہیں، جو قاری کے دل و دماغ کو منور کرتے ہیں، اس میں روزمرہ زندگی کے واقعات، اشخاص، اشیا اور مناظر سے لے کر زندگی، کائنات اور موت کے اسرار تک ہر موضوع پر

> ..."غبارِ خاطر" کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالتِ اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپردِ قرطاس کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقائد، افکار اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے...

خیال آرائی اور خیال افروزی کا انداز نمایاں رہتا ہے۔

مولانا آزاد کی نگارشات کی ادبیت اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے موضوعات کے برتاؤ میں شخصی نقطۂ نظر کو برابر قائم رکھا ہے، ان کی شخصیت کی تب و تاب سے ان کی تحریر کا ہر فقرہ روشن ہے، چنانچہ ان کی شخصیت کی انفرادیت ہمہ گیری اور ترفع کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ شخصیت ان کی انانیت، خلوت پسندی، موسیقی سے لگاؤ... تشکیک، تجسس، تعمل، خود ضبطی، مذہبیت اور شائستگی کے تابناک عناصر سے جگمگاتی ہے اور ممتاز و منفرد ہو جاتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے، جو ان کی نثر کو ادبی وقار عطا کرتی ہے۔

"عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔"

"میں آپ کو بتلا دوں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا، کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔"

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔"

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے، تو کیا مضائقہ، وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔"

"یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں، بہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں۔"

"اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اکتا گئی تھیں، اور سبزہ و گل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔"

مولانا آزاد ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت کے مالک ہیں، وہ ادبی روایت کے سرچشموں سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی پیش رفت کے نتیجے میں جدت پسندی کا احترام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی بالیدہ شعری شعور کے باوصف اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نثر کا پیرایۂ بیان ہی منتخب کیا، اور اسے اپنی معجز بیانی سے آسمان پر پہنچا دیا، ان کا نثری اسلوب منفرد اور توانا ہے۔ یہ ان کی شخصیت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ ان کی شخصیت میں جو نظم و ضبط، تعقل، شائستگی، تمکنت اور شعریت ہے، ان کا اسلوب بھی ان ہی خواص سے آراستہ ہے۔ یہ جمال و جلال کے نادر امتزاج کا مکمل نمونہ ہے، اس میں نزاکتِ گل بھی ہے اور صلابتِ سنگ بھی، تخیل بھی ہے، حقیقت بھی، سنجیدگی بھی ہے، مزاح بھی، غم پسندی بھی ہے، اور خوش طبعی بھی، فلسفہ بھی ہے، اور شعریت بھی، اسلوب کے یہ بدلتے رنگ جادوئی کشش رکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے مختلف کیفیات کے اظہار کے لیے مختلف اسالیب تراشے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ان کے یہاں ایک ہی بنیادی اسلوب کی گرفت برقرار رہتی ہے، یہ اسلوب توازن...، استدلالیت اور ترسیلیت سے قابلِ شناخت ہو جاتا ہے۔ اردو نثر میں غالب، حالی اور سرسید نے اسی نوع کے اسلوب کی ابتدا کی، اور مولانا آزاد نے اسے استحکام عطا کیا، مثلاً:

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقاید ہیں، اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں، وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔"

"ہم اس الجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اور زیادہ الجھتا جاتا ہے، ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے، اُسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سو پردے اور اس کے پیچھے پڑے تھے۔"

"عجیب معاملہ ہے میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتش دان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے، لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتش دان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا، اگر آتش دان نہ سلگ رہا ہو۔"

"بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صناعِ قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا، اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں۔"

مولانا آزاد کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ تعقلی انداز کے باوجود اس میں شعری لطافت موجِ زیریں کی طرح موجود ہے، نتیجے میں فلسفے کے خشک مباحث بھی دلچسپ ہو گئے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ فطرت یا اشیا کی جو تصویر کشی کی ہے وہ لاجواب ہے، ان کا لہجہ شعریت آشنا ہے، شعریت زدہ نہیں۔

"اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔"

"نیچے جو روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں، اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔"

منظر کشی کے علاوہ جو خاص بات ان کی شاعرانہ شخصیت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جس تھیسس یا دعوے پر زور دیتے ہیں اس سے مماثل کسی شعر کو بھی نقل کرتے ہیں، اور قاری کو:

دام ہر رنگ زمیں بود، گرفتار شدم

کے مصداق ان کی دلیل کا قائل ہونا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی کسی شعوری کاوش کا دخل نہ ہو، جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات

برسوں تک حافظے میں تازہ نہیں ہوتی، گویا کسی کونے میں سو رہی ہے یا کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھتی ہے جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہے۔"

بہرحال، جو بھی صورت ہو، وہ متعدد مقامات پر ہمیں خوب صورت اور خیال انگیز اشعار کا سامنا کراتے ہیں، اور ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ مصنف کس ندرت اور زیرکی سے اپنے خیالات کی صحت کی توثیق شعری حوالوں و اشعار کے حوالے سے کراتے ہیں۔ قاری کو اپنے خیالات کے قائل کرنے کا یہ انوکھا انداز مولانا آزاد ہی کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا آزاد کی ادبی شخصیت میں وزن اور وقار ہے۔ وہ اپنے مکاتیب میں زنداں کے شب و روز یادداشت میں محفوظ گھریلو یا سماجی زندگی کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کی طرح مابعد الطبیعاتی مسائل مثلاً ہستی، کائنات، خدا، اخلاق اور مذہب پر بھی غور و فکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ آفرینش اور زوال کے اسرار کو کھوجنے کا فلسفیانہ تجسس بھی رکھتے ہیں۔ اعلیٰ ادب کی ارضیت کے ساتھ ساتھ ماورائیت پر بھی محیط ہوتا ہے، اور غور و فکر کی نئی نئی راہیں کھول دیتا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ انھوں نے فلسفے کا مطالعہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں "طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی۔"

تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ طبعاً مفکر واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تشکیک کی راہوں سے گذر کر بھی تجدید اعتقاد کی منزل پر آ گئے۔ فلسفہ عقیدہ اور مذہب کے باہمی عمل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا، اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا، لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں، اور اس لیے مان لیتے ہیں، یہاں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جنھیں ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے۔"

چنانچہ مولانا آزاد نے کئی ماورائی مسائل کو ایک مفکر کے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو:

"اس طلسم ہستی کے معمے پر غور کیجیے، جو ہمارے اندر چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انس نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی؛ اس معمے کا حل ڈھونڈ رہا ہے۔"

"زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے؟ ا کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ جا کر ختم بھی ہو گا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے، جو ہم سوچ رہے ہیں کہ انسان کیا ہے۔ تو خود یہ اور بجز کیا چیز ہے، اور پھر حیرت اور درماند کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں

اوّلیت کا شرف

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا سرا انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد سے جڑا ہوا ہے، لیکن ا
کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ جنگِ آزادی کی کہانی کے ساتھ اس جنگ کے نہایت دلیر سپاہی، آزادیِ وطن ـ
متوالے مولانا ابوالکلام آزاد کی داستانِ حیات بھی شروع ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ چلتی ہے تو یہ بات بھی ک
باوزن معلوم نہیں ہوتی ہے۔

کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں پڑی اور اس کے صرف تین سال بعد مولانا آزاد مکے میں پیدا ہوئے؛
سے ۱۸۹۵ء میں وہ ہندوستان آئے اور ۱۹۰۳ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کے جانشین بننے ـ
بجائے جنگِ آزادی کے سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں اترنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں، تقسیم بنگال سے مت
ہوتے ہیں، انقلابیوں کے سربراہ شیام سندر چکرورتی سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں
وہاں کے انقلابیوں سے راہ و رسم پیدا کرتے ہیں، واپس آکر چند سال بعد ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء سے "الہلال" جار
کرتے ہیں جس کے ساتھ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی راہ پر آہستہ آہستہ چل نکلتے ہیں اور پھر انگریزوں ـ
خلاف رفتہ رفتہ صف آرائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ مولانا آزاد نے آزا
کی لڑائی میں اس وقت نہایت بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا، جب ہمارے بہ
سے رہنما اپنے متعلق فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ انھیں اس میدان میں کب اور کیسے اترنا ہے اور کس طرح حصہ
لینا ہے۔ ("ابوالکلام آزاد" از عبدالقوی دسنوی، شائع کردہ ساہتیہ اکاد

مولانا آزاد کا ایگو

نامی انصاری

۱۲/۱۲۱ - اے' نواب صاحب کا احاطہ' سول لائنز' کانپور ۲۰۸۰۰۱

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" اُردو کے ادبِ عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ۱۶ مکاتیب میں' دس صفحات پر مشتمل ایک مکتوب (یا مضمون) انانیتی ادب کے بارے میں بھی ہے۔ انانیتی ادب سے مولانا کی مراد ایسی تمام تصنیفات اور تحریرات ہیں جن میں مصنف نے خود اپنے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہو۔ اس میں خود نوشت سوانح عمریاں' ذاتی واردات و تاثرات' اور شخصی اسلوبِ فکر بھی شامل ہیں۔ انانیتی ادب کی معنویت اور ماہیت پر مولانا کی یہ بحث بہت دلچسپ اور خیال انگیز ہے جس میں مولانا نے مصنف اور اس کے ایگو پر متعدد زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اس مکتوب میں اگرچہ مولانا آزاد نے خود اپنے ایگو کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا مگر بین السطور میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس مضمون کا محرک ہے اور وہ سب کچھ بھی جس سے خود مولانا اپنے آپ کو متصف سمجھتے تھے۔

انانیتی ادب کے بارے میں غبارِ خاطر کا درج ذیل اقتباس مولانا کے نقطۂ نظر پر کافی روشنی ڈالتا ہے:

"ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود انھیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی انانیت کی پرچھائی جب کبھی پڑے گی تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا۔ اس کے ابعادِ ثلاثہ ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہوں گے۔

ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے علم و قوانین انھیں اپنے کلیتوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" ان کی ہر "وہ" اور "تم" سے زیادہ دل پذیر ہوتی ہے۔"

(غبارِ خاطر مطبوعہ مکتبہ اسرار لاہور' صفحہ ۲۰۷)

اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم مولانا کی تصانیف غبارِ خاطر' تذکرہ اور انڈیا ونس فریڈم (جس میں کسی نہ کسی طور سے خود نوشت واردات و سوانح کی جھلک پائی جاتی ہے) کا بغور مطالعہ کریں تو اس حقیقت کے آشکار ثابت ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ مولانا خود کو ایک ایسا ہی "اخص الخواص" انسان سمجھتے تھے جس کا زمانے پر یہ حق ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کی ہر "میں" کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔

خود نوشت سوانح کے مصنفین کو مولانا نے تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سینٹ آگسٹائن۔ روسو' اسٹرنڈ برگ' اناطول فرانس اور آندرے ژید' مغربی ادبیات میں۔

۲۔ غزالی' ابن خلدون' بابر' جہانگیر اور ملا عبدالقادر بدایونی' مشرقی ادبیات میں۔

۳۔ ٹالسٹائی۔

نمبر ایک اور دو کے مصنفین میں بقول مولانا آزاد مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ ان کی انانیت مطلق نہیں ہے تاہم ان کی تحریریں اتنی بے تکلف اور بے ساختہ ہیں کہ ہم ان مصنفین کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی تحریروں کو پڑھنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتے۔ اس کے بعد اخص الخواص مصنفین آتے ہیں جن کی انانیت مطلق اور قائم بالذات ہے۔ یعنی ان کو اپنے ایگو کے اظہار کے لیے کسی بیرونی تفاعل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس زمرے کے مصنفین میں مولانا آزاد نے مثال صرف ٹالسٹائی کی دی ہے۔ مگر ان کا اندازِ تحریر اس کا متقاضی ہے کہ خود مولانا کو بھی اسی زمرے کے مصنفین میں جگہ دی جائے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے غبارِ خاطر کے دیباچے پر غور کر لینا چاہیے جو اگرچہ مولوی محمد اجمل خاں کے نام سے شائع ہوا ہے مگر جملوں کی ساخت' زبان اور اسلوب ایسا ہے کہ اسے مولانا سے منسوب کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی

"لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آ گیا۔ اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا۔ لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کریں گے اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائے گی۔ گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے اور مطلب کا تقاضہ پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرزِ تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو کامل

درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں فوراً" حافظہ سے نکال سکتا ہو۔ پھر ساتھ ہی ساتھ اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور بے داغ ہو کر صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے اور حسنِ انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجے سے نہ گرے۔"

(دیباچہ از مولوی محمد اجمل خاں۔ صفحہ ۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس پر مولانا آزاد کے خاص اسٹائل کی چھوٹ کس طرح پڑ رہی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث میں جائے بغیر میں صرف اس فقرے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں :

" جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو۔"

"نکال لے سکتا ہو" مولانا کا خاص اسٹائل ہے۔ اردو والے اس موقع پر" نکال سکتا ہو" لکھیں گے "نکال لے سکتا ہو" کبھی نہ لکھیں گے۔ اس قسم کے فقرے غبارِ خاطر کے متن میں کئی جگہ ملتے ہیں :

"۔۔۔ اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے" بچا لے جا سکتے ہیں" مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے۔

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۲۰۱)

"۔۔۔ چھبیس برس گزر چکے وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ" ٹوٹ جا سکتا ہے" مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۵۸)

مطلب صرف یہ ہے کہ اندرونی شہادتوں اور مولانا کی افتادِ طبع کی بنیاد پر اگر اسے مولانا آزاد کا خود نوشت دیباچہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ دیباچہ بھی اسی ایگو کا ایک نقشِ جمیل ثابت ہوگا جس کی طرف انانیتی ادب والے مکتوب میں مولانا نے بار بار اشارے کیے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا "میں" بولنا بھی چاہتے ہیں اور دنیا پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے کہ وہ "میں" بول رہے ہیں۔ اس کے لیے کبھی وہ محمد اجمل خاں کا سہارا لیتے ہیں کبھی فضل الدین احمد کا اور کبھی دوسرے کا۔ اس ضمن میں وہ "ٹالسٹائی کی" میں" کے قدرتی سرجوش کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کرتے ہیں وہ خاص طور سے قابلِ غور ہے :

"ٹالسٹائی غالباً ان خاص شخصیتوں میں تھا۔ جن کی انانیت کی مقدار اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت

> ... میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ ان کے "دماغ" کا مغرورانہ احساس ہمہ وقت ان کو اپنے پیٹ میں میں لیے رہتا تھا، مگر اتنا کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نہ صرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں بلکہ سارے برصغیر میں خود کو سب سے زیادہ قدآور اور بلند مرتبت سمجھتے تھے...

رکھتی تھی۔ اس کی انانیت خود اُسے جتنی بڑی دکھائی دی، دنیا نے بھی اسے (اتنا ہی) بڑا دیکھا۔ پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا مصنف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا جس طرح یہ عجیب و غریب روسی بولتا رہا۔"

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۲۰۸)

اس عجیب و غریب روسی مصنف کے علاوہ وہ فیضی، ابو فراس ہمدانی، ابن سناء الملک، فردوسی اور میر انیس کے ایگو کے نقوش بھی مرتب کرتے ہیں مگر ان سب کے پسِ پردہ خود ان کی اپنی ذاتِ خوش صفات ہے۔ جسے وہ سامنے لانا بھی نہیں چاہتے۔ مگر اپنی [illegible] قدرتی سرجوش کو دبا بھی نہیں سکتے۔ غبارِ [illegible] اگر سب نہیں تو بیشتر مکاتیب ان کے ایگو کی [illegible] بازگشت بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً چا[illegible] مکتوب جو کتاب کے ۱۸ صفحات کو محیط ہے [illegible] مکتوب میں انھوں نے چائے نوشی کے بار[illegible] اپنے بعض اختیاراتِ خاص اور طریقۂ کار [illegible] ہے۔ مگر پورے مکتوب کا لب لباب درا[illegible] کے ایگو ہی کا عکس ہے۔ جگہ جگہ اس قسم کے [illegible] ہیں :

"واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت [illegible] کی طرح اس معاملے میں بھی طبیعت سوادِ اعظم سے متفق نہ ہو سکی۔"

"غور فرمائیے کہ میرا رُخ کس طرف [illegible] زمانہ کدھر جا رہا ہے۔"

"جمعیتِ بشری کی یہ فطرت ہے کہ [illegible] آدمی اکا دکا ہوگا، بھیڑ بیوقوفوں ہی کی ر[illegible]

"لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی [illegible] نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک ملا ہوا [illegible] اوپر سے اور چھڑک لوں گا۔ میں صباحت [illegible] ملاحت کا قائل ہوں۔"

"جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت [illegible] اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے [illegible] کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو [illegible] اس درجے نمایاں ہے، انھیں بھی محسوس کرا[illegible] کرا سکا۔"

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے مکتوب میں مولانا نے حکیم [illegible] شیرازی کا یہ شعر درج کیا ہے اور لکھا [illegible] کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحر[illegible] شعر خود بخود زبان پر طاری تھا :

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم

اس شعر سے مولانا کو خود اپنی ذات سے مطابقت نظر آتی ہے کہ وہ بے اختیار اپنی زندگی کے کوائف و تجارب اور خاندانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے زندگی کی ہر راہ میں اپنی انفرادیت کا نقش بٹھانے لگ جاتے ہیں۔

"اس بے مزگی میں بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے یا نہ ملے مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔"

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلے ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

"جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ بر سرِ عالم تواں گزشت

"پہلا طریقہ اختیار کر نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا، ناچار دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔"

حکایت بادہ و تریاک، چڑیا چڑے کی کہانی، چائے نوشی، حکایت زاغ و بلبل، موسیقی، حتیٰ کہ زلیخا بیگم کی وفات والے مکتوب میں بھی کسی نہ کسی پیرائے میں مولانا کے ایگو کا واضح اظہار نظر آتا ہے۔ قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے دوران چونکہ فرصت و فراغت بھی میسر تھی اور دل و دماغ بھی اپنی مصنوعی پر تیں اتارنے پر آمادہ تھے۔ اس لیے ان خطوط میں مولانا کے ایگو کا منظر نامہ بہت روشن نظر آتا ہے۔ اور غبارِ خاطر کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی صاحبِ نظر ان کے ایگو کے اثرات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"تذکرہ" کا معاملہ "غبارِ خاطر" سے قدرے مختلف ہے۔ بظاہر یہ مولانا کی خود نوشت سوانح ہے۔ مگر اس میں سوانح سرے سے مفقود ہیں۔ اس لیے کہ مولانا خود کو ستر پردوں میں چھپا کر رکھنے کے عادی تھے۔ اشاروں کنایوں میں وہ "میں" کے اظہار میں مضائقہ نہیں سمجھتے مگر اس کے برملا اظہار کو وہ اپنے مرتبے سے فروتر جانتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں جب مالک رام صاحب نے "تذکرہ" کو نئے سرے سے ایڈٹ کر کے چھاپا تو اس میں انھوں نے دو باتیں خاص طور سے نوٹ کیں۔ اول یہ کہ "تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے۔" اور دوم یہ کہ "وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں۔" مالک رام صاحب کے اس خیال کی بنیاد "تذکرہ" کے دو مقامات ہیں جن کے ضروری اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

ا۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب و کیفِ دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للّٰہ علم حدیث و سنت کی خدمت و چاکری کی سعادت میں ہمیشہ سے یہ خاندان ممتاز رہا ہے۔۔ عجب نہیں کہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہنچے اور یہ سرمستی پارینہ، وارفتے تازہ سے ترکیب پا کر ہنگامۂ گزشتہ اور شورشِ رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کا عالم از سرِ نو تازہ کر دے۔"

(تذکرہ۔ مرتبہ مالک رام۔ صفحہ ۳۰۲)

ب۔ "گو ہمرہانِ راہ اب تک اسی منزل میں کمریں کھولے بے فکر پڑے ہیں مگر اپنا کاروانِ طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے

(تذکرہ ص ۳۳۵

تذکرہ کے آخری باب میں اگرچہ مولانا آزاد نے اپنے حالات و کوائف بیان کیے ہیں مگر اس میں انشا پردازی اور استعارہ سازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تاہم مندرجۂ بالا دونوں مقامات اور ان کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے۔ مولانا نے ۱۹۲۰ء میں پورے ہندوستان میں اپنی امامت پر بیعت کے لیے جو تحریک چلائی تھی یہ بھی دراصل ان کے ایگو کی ہی کرشمہ سازی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بقول مالک رام صاحب اس تحریک کے مضمرات بہت جلد ان کی سمجھ میں آ گئے اور وہ اس راہِ پُرخار سے دامن بچا گئے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کا ایگو عالمِ طفلی ہی میں بیدار ہو گیا تھا اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا:

بادہ گر خام بُود، پختہ کند شیشۂ ما

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز، جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی، اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم رہنما چھوڑا۔" (تذکرہ۔ صفحہ ۳۲۹)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم و ادب، فکر و فلسفہ، دین و مذہب، تدبر اور سیاست کے میدان میں وہ نابغۂ عصر تھے اور ان معاملات میں کم از کم ان کے زمانے میں مشکل ہی سے چند نفوس ان کے ہمسر تھے، مگر ان کی خود پسندی یا انانیت بھی اسی درجے کی تھی اور وہ خود کو ابن تیمیہ، رازی اور غزالی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ امام الہند ہونے کا ان کا دعویٰ ان کے ایگو

کا ہی ایک مظہر تھا. اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کیا دنیا نے بھی ان کے ایگو کو اتنا ہی بڑا دیکھا جتنا خود ان کو نظر آیا اور کیا ٹالسٹائی کی طرح ان کا ایگو بھی مطلق اور قائم بالذّات تھا' اضافی نہ تھا. میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے. ایگو کے لیے خارجی اسباب اتنے اہم نہیں جتنا خود انسان کا اندرونی استحکام اور روحانی ترفع. اس کے لیے صرف خودشناسی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا ترفع بھی ایک بلند روحانی سطح پر ہونا چاہیے. میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد اس وصف سے متصف نہ تھے. قدرت نے ان کو بڑا دماغ' بے پناہ قوتِ حافظہ' اور خود مکتفی خارجی وسائل مہیا کیے تھے جن کا انھوں نے بھرپور استعمال کیا. مگر وہ اس روحانی بلندی پر نہ پہنچ سکے جو شخصی ارتقاء کی اصل منزل ہوتی ہے اور جہاں پہنچنے کے بعد فروتنی' عاجزی اور انکساری کے اوصاف خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں. میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا کہ ان کے "دماغ کا مغرورانہ احساس"[2] ہمہ وقت ان کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتا تھا' مگر اتنا کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نہ صرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں بلکہ سارے برّصغیر میں خود کو سب سے زیادہ قدآور اور بلند مرتبت سمجھتے تھے. غبارِ خاطر میں زندہ افراد کا تذکرہ بہت کم ہے مگر جن لوگوں کے نام آئے ہیں' مثلاً مولانا کا خادمِ خاص عبداللہ' جیلر' وارڈر' چیتا خاں' باورچی' جواہر لال' کلکٹر اور واحد متکلم نے جس بلندی سے ان پر نگاہِ غلط انداز ڈالی ہے اس سے کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو وہ کیا سمجھتے تھے. انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) جن لوگوں نے پڑھی ہے انھوں نے واضح طور سے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں واحد متکلم نے اپنے قد کو اتنا دراز کر دیا ہے کہ گرد و پیش کے سارے لوگ کوتاہ قامت نظر آنے لگے ہیں. مہاتما گاندھی فقیر منش تھے. ان کے خود نوشت سوانح "تلاشِ حق" میں واحد متکلم بہت نمایاں ہے مگر اس میں تصنع نہیں ہے. اس لیے اس کی دل پذیری سے مشکل ہی سے کوئی انکار کرسکے گا. گاندھی نے اپنی خاندانی برتری یا سیاسی بصیرت اور فہم و تدبر کے عُمق کا گانا نہیں گایا ہے بلکہ ہر واقعہ ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر پڑھنے والا ان کی دردمندی اور دل سوزی اور رحم کے لیے ان کے جینے اور مرنے کے جذبے کو مشکل ہی سے فراموش کرسکتا ہے. مولانا ابوالکلام آزاد "میں" بہت کم بولتے تھے مگر ان کے "تم" اور "وہ" میں ہی ان کا "میں" بار بار بولنے لگتا تھا.

حواشی

۱۔ اُردو میں ہم ایگو بجنسہٖ لے سکتے ...
ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہ...
(غبارِ خاطر ...

۲۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول ...
ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے' ا...
میں مشغول ہو جاتا. گویا اخبار دیکھنے کی کوئی ج...
میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداری...
کا ایک پارٹ تھیں. جیسے "دماغ کا مغرو...
کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں...
دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں...
دھبہ نہ لگ جائے. (غبارِ خاطر ...

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی

(اسلوب کی روشنی میں)

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی عیسوی کی دو ایسی عظیم ہستیاں ہیں جنھوں نے تعمیری ادب کی تخلیق میں اپنے شب و روز کو ایک کردیا اور دنیائے ادب اُردو اور عالمِ اسلام کو اپنی تصنیفات کا وہ ذخیرہ عطا کیا جن کی اثر انگیزی نے لاکھوں افراد کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور ان دونوں ہم عصروں کے اسلوب کے حسن اور طرزِ نگارش نے علمی و ادبی حلقوں سے بے پناہ دادِ تحسین وصول کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر طرازی کا زمانہ آج بھی اسی طرح معترف ہے جس طرح ان کی حیات میں تھا اور جس کی تصدیق مولانا حسرت موہانی صاحب نے اس طرح کی تھی:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

اور مولانا مودودی کے متعلق عالمِ اسلام کے ایک ممتاز ادیب و شاعر جناب نعیم صدیقی فرماتے ہیں:

"مولانا مودودی ایک بڑے ادیب کی حیثیت سے زبان و بیان اور اسالیب کا ایک نیا اسٹائل لے کر آئے تھے اور اپنے اسی ہتھیار سے انھوں نے اسلام کی بیت تعمیر کی" جناب ماہر القادری فرماتے ہیں:

نگارش پر تری حسنِ ادب نے ناز فرمایا

مولانا آزاد اور مولانا مودودی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ جو باتیں مشترک ہیں ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کا موضوع بنیادی طور پر "اسلامیات" تھا اور ان دونوں کی بہترین تحریریں ان کی تفاسیرِ قرآن ہیں۔ ان دونوں کے بارے میں یہ بات بھی پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کی دینی کتابوں سے بہتر نثر اُردو زبان و ادب میں نہیں لکھی گئی ہے۔ اُردو زبان و ادب اور صحافت کے میدان میں بھی ان دونوں حضرات کا جو مقام تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور "البلاغ" اٹھا کر دیکھ لیں ان کی عظمت کے اعتراف سے انحراف ناممکن ہوگا۔ اسی طرح مولانا مودودی کے "ترجمان القرآن" پر نظر ڈالیں۔ بہت ساری گتھیاں سلجھتی چلی جائیں گی۔

لیکن دونوں ہم عصروں میں جو چیز دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ دونوں کا اسلوب بیان ہے۔ مولانا آزاد کے یہاں سابقین سے استفادے کے باوجود لطیف احساسات و جذبات کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ آپ کے یہاں رعد کی سی گرج اور طوفان کی سی جلالی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن مولانا مودودی کے یہاں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسیم ... جھونکے مقصدیت کے آب سے ترپھولوں کی شبنم آلود پتیوں کو چھوتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں خطیبانہ للکار اور ولولہ انگیز باتیں ہیں تو مولانا مودودی کے اسلوب میں نرمی اور ملائمت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اُردو کے ان دو صاحب طرز ادیبوں میں دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔

جہاں تک نثری ادب اُردو کے اسلوب کا تعلق ہے اس صدی کے پہلے ربع تک پانچ اسلوب سامنے آتے ہیں۔ اولاً وہ دینی ادب جسے صوفیائے کرام نے تیار کیا تھا اور جس میں اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی جاتی تھی۔ ہاں زبان کی صحت کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ چونکہ اس ادب کا اہم موضوع مذہب اور مذہبی مسائل ہوا کرتے تھے اس لیے وہاں عربی اصطلاحات کا استعمال زیادہ ہے اور تشبیہات و استعارات میں تخیل کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔ دوسری روایت نثر سادہ اور صاف ستھرے ادب کی ہے جس میں مذہب اور کے ساتھ ساتھ معاشی، سیاسی، معاشرتی اور علمی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس روایت کے بانی سرسید احمد خان کہلاتے ہیں۔ سرسید کے بعد علامہ شبلی نعمانی ایک نئی آب و تاب کے ساتھ آسمانِ ادب پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کی کاوشوں نے زیادہ حسین اور زیادہ متوازن روایت اسلوب قائم کی۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار جو سرسید کی نثر میں پائی جاتی تھی اس سے علامہ شبلی نے احتراز کیا اور اُردو نثر کو عربی و فارسی ادب کے

محمد فاروق اعظم
صدر بزمِ اہلِ قلم، بھاگل پور ۲

جاندار اجزا سے مالامال کیا۔ ان کی روایت میں
سادگی، وضاحت، رنگینی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تینوں روایتوں
سے ہٹ کر ایک الگ روایت کی بنا ڈالی۔ مولانا آزاد
مذکورہ بالا تینوں روایتوں سے متاثر تھے لیکن آزاد
کی نثر کی بنیادی خصوصیت خطابت و رومانیت
ہے وہ جذبات سے دلیل کا کام لیتے ہیں اور الفاظ
کے سیلاب میں عقل و احساس کو بہالے جاتے
ہیں۔ ان کی نثر سے اُردو نثر نگاری میں
ایک چوتھے اسلوب کا اضافہ ہوا۔ یہ الگ بات
ہے کہ یہ اسلوب انھی پر ختم ہوگیا۔

اور اگر یہ بات کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ
مولانا مودودی صاحب نے سب سے زیادہ اثر
مولانا ابوالکلام آزاد ہی سے قبول کیا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ ابتدا میں مولانا مودودی کی تحریروں
پر مولانا آزاد کا رنگ نمایاں تھا جو بعد کو اپنے
طرز میں ڈھلتا گیا اور اس طرح قدم بہ قدم اُردو
نثر کی پانچویں روایت کی بنا پڑگئی مولانا مودودی
نے مذکورہ چاروں روایتوں سے استفادہ کیا
اور اپنے لیے ایک الگ راہ متعین کی اس وقت
تک جو ادب پارے عالم وجود میں آئے تھے آپ
نے ان کی خامیوں سے احتراز کیا اور خوبیوں کو
اپنے یہاں جگہ دینے کی کوشش کی۔ ان کی تحریر
میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر غالب ہے۔ مولانا
مودودی کی تحریر میں شبلی کی سی رنگینی بھی ہے
مگر فکری نظم و ضبط کے ساتھ۔ مولانا ابوالکلام
آزاد کی خطابت ان کے یہاں صرف تخاطب کا
رنگ لیے ہوتے ہے۔

مولانا مودودی پر ابتدا میں مولانا ابوالکلام
آزاد کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے ماہنامہ
"ترجمان القرآن" کی عام فضا وہ نہیں ہے جو
"الہلال" کی ہے۔ "الہلال" کی عبارت میں ایک
کڑک اور چمک ہے جو بحر دل کی موجوں میں ایک
اضطراب پیدا کر دیتی ہے لیکن قاری پر بہت
پائدار اثر نہیں چھوڑتی۔ وہ آتش نمرود میں بے خطر
کود پڑنے پر آمادہ ضرور کرتی ہے مگر مولانا مودودی
کی طرح ایسا ٹھنڈا استدلال نہیں رکھتی جو نمرود
وقت کو استدلال کی قوت سے توحید کا قائل کر دے۔
بے شک مولانا آزاد بہ یک جنبشِ قلم دست بوسی
ہی نہیں پابوسی بھی کرا سکتے ہیں لیکن مولانا

> ...مولانا مودودی پر ابتدا میں مولانا
> ابوالکلام آزاد کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے
> ماہنامے "ترجمان القرآن" کی عام فضا وہ
> نہیں ہے جو "الہلال" کی ہے۔ "الہلال" کی
> عبارت میں ایک کڑک اور چمک ہے جو بحر
> دل کی موجوں میں ایک اضطراب
> پیدا کر دیتی ہے...

مودودی لوگوں کو آہستہ آہستہ اپنا گرویدہ بناتے
ہیں۔ ان کی تصنیف آتش نمرود کو گلزار بنانے کا
حوصلہ رکھتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے قلم سے صور
اسرافیل پھونک کر محشر بپا کر دیتے ہیں لیکن پل
صراط پار نہیں کراتے اور مولانا مودودی پل صراط
پار کرانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ بحث سے ان دونوں بزرگوں میں
سے کسی کی برتری دکھانا مقصود نہیں بلکہ اصل
مسئلہ صرف اسلوب کا ہے اور اس میں حالات کو
بڑا دخل ہے مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے
حالات یکسر مختلف تھے۔

مولانا آزاد کی تحریر میں جذ
غالب ہے جب کہ مولانا مودودی ا
پر بندھ باندھتے ہیں۔ زبان کے چٹخ
نہیں دیتے وہ لفظوں کے انتخاب پر
ہیں کہ وہ ان کے استدلال کو پوری
کرنے والے اور عام فہم ہوں۔

مولانا آزاد اپنی تحریر میں اشع
بہت زیادہ کرتے تھے۔ ان کی تحریر
کے استعمال کے سلسلے میں آزاد کے ذو
دی جاتی ہے۔ مولانا مودودی نے بھی
میں مناسب موقع و محل کے ساتھ
استعمال کیا ہے اور جب کبھی انھوں
استعمال کیا ہے تو ان کا حسنِ انتخا
توضیحی نثر میں تخلیقی حسن پیدا کرنے
ہوا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"ایمان فی الحقیقت عشق ہے کہ جب
اس میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس را
مزاحمت نہیں معلوم ہوتی، کوئی ما
نہیں رہ جاتی اور شوقِ منزل راستے
سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ عشق کی آگ
مصائب و شدائد اور تمام آلام ح
خاک کر دیتی ہے:

آلامِ روزگار کو آساں
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں

مولانا آزاد اور مولانا مودو
میں ایک نمایاں فرق اسلوب کی یکس
ہے۔ مولانا مودودی کی تمام تحریر و
کی یکسانیت اس قدر نمایاں ہے کہ
فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی کو

پہلے کی ہے اور کون سی بعد کی۔ مولانا آزاد کی سحر طرازی کا زمانہ معترف ہے لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تحریروں پر اتار چڑھاؤ کے کتنے ادوار گذرے ہیں اور 'الہلال' و 'البلاغ' کی صورت میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد "غبارِ خاطر" کی صورت میں وہ ڈھلی ڈھلائی زبان ملتی ہے جسے بجا طور پر مولانا آزاد کی نثر نگاری کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کی عظمت اور ان کی سحر نگاری کے اعتراف کے باوجود ان کی تحریر میں جو تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے اسے ہر شخص پہلی ہی نظر میں محسوس کر سکتا ہے۔ مولانا الفاظ اور جملوں کا ایک فسوں باندھتے تھے اور اپنی لاہوتی زبان سے مضامین کا ایسا سماں پیدا کر دیتے کہ اس کے اندر پہنچ کر آدمی خود کو بھول جاتا۔

مولانا مودودی بھی آزاد کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔ مولانا مودودی کے عنفوانِ شباب کے دَور میں ایک بار "جہاد" کے موضوع پر مولانا آزاد اپنی سحر بیانی سے لوگوں کو محظوظ کر رہے تھے اور اتفاق سے مولانا مودودی بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ مولانا آزاد کی انقلابی تقریر سننے کے بعد وہیں مولانا مودودی کے دل میں "جہاد" کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا خیا[ل] پیدا ہوا۔ اور وہاں سے لوٹ کر چند دِنوں ک[ی] کاوش کے بعد اپنی پہلی اور شاہکار تصنیف "الجہاد فی الاسلام" مرتب کی جو آج بھی بڑ[ی] دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات کو ختم کر[و] کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابو الاعل[یٰ] مودودی چودھویں صدی ہجری کی اردو نث[ر] میں دو درخشندہ ماہتاب و آفتاب کے ما[نند] تھے اور انھوں نے جو علمی ادبی خدمات انجا[م] دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ◯

داغ دہلوی

حیات اور کارنامے

داغ کی تربیت اور ان کے ادبی مزاج کی پرورش لال قلعے میں اس زمانے میں ہوئی تھی جب بہادر شاہ ظفر اور مغل شاہزادے جانتے تھے کہ مغل حکومت کی شمع کے گل ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اس عہد کے مغلوں اور خاص طور سے بادشاہ کی شاعری کے نشاطیہ لب و لہجے میں حزن و ملال اور مایوسی کی نے تھی۔ یہ لوگ اپنے ذہنی کرب کو نغمہ و شعر میں ڈھال رہے تھے۔ اس کے برعکس داغ کی رگوں میں مغل خون نہیں تھا۔ وہ قلعے کے نہیں، قلعے کے باہر کے آدمی تھے۔ ان کی والدہ چھوٹی بیگم نے ولی عہد مرزا فخرو سے شادی کی تھی۔ داغ ان کے ساتھ قلعے میں داخل ہوئے جہاں انھیں اپنے عہد کے بہترین علوم و فنون حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے میر تقی میر کے شاگرد غلام حسین شکیبا کے بیٹے سید احمد حسین سے تعلیم حاصل کی۔ محمد امیر پنجہ کش سے خطاطی کا فن سیکھا، مرزا عبداللہ بیگ نے بانک بنوٹ پر قدرت حاصل کرائی۔ بھن خاں اور بندو خاں سے گھوڑ سواری اور خود مرزا فخرو سے تیر اندازی اور بندوق چلانے کا فن سیکھا۔ بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد مرزا فخرو کے استاد محمد ابراہیم ذوق نے شعری ذوق کی تربیت کی۔

آسودگی کی زندگی نے داغ کو فکر کی سطح پر زندہ دلی، شگفتگی، رجائیت اور لذت اندوزی عطا کی اور لال قلعے کے ماحول نے اظہار کی سطح پر زبان کی سلاست، فصاحت، محاورے اور روز مرہ کا شعور دیا اور انھیں الفاظ کا مزاج شناس بنایا۔

اُردو اکادمی، دہلی نے داغ پر دو روزہ سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کے لیے ممتاز محققوں اور ناقدوں سے داغ کے سوانح، شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر جو مقالے لکھوائے گئے تھے، وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی
صفحات : ۲۳۸
قیمت : ۳۱ روپے (مجلد)

اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ اس تہذیب کی بنیاد پڑی جسے ہم مشترکہ ہندوستانی تہذیب کہتے ہیں۔ ہندوستان میں داخل ہونے والے پہلے مسلمان عرب تھے، پھر ترک اور مغل آئے اور انھوں نے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ یہ حکمراں خاندان تہذیب و تمدن کی اعلیٰ روایات ساتھ لائے تھے لیکن مقامی آبادی اپنی الگ تہذیبی اور تمدنی روایات رکھتی تھی اور ان روایات کی جڑیں یہاں کی دھرتی میں پیوست تھیں اور قدامت کی سند اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ ابتدا میں غالباً ان قدیم اور نووارد میلانات کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوا ہوگا لیکن بالآخر ان کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جو رواداری اور کشادہ دلی کی قدروں کی حامل تھی۔ مغل دَور میں اس تہذیب کو عروج حاصل ہوا اور آج ہمارے علوم و فنون کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جسے اس تہذیب کی فیض رسانی سے بے بہرہ کہا جا سکے۔ اس تہذیب کی بنیادی خصوصیات دوامی اہمیت رکھتی ہیں اور ان سے آج بھی فیضان کرنے کی ضرورت ہے۔ کثرت میں وحدت کا جو خواب نیا ہندوستان دیکھ رہا ہے اس کی تعبیر تلاش کرنے میں ماضی کے تجربات ہمارے سچے معاون بن سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ممتاز دانش وروں کے جو مقالے شامل ہیں وہ اس مشترکہ تہذیب کی تشکیل اور اس کے فروغ کے مختلف مراحل کو سامنے لاتے ہیں اور اس کی روح کو اجاگر کرتے ہیں، نیز اُردو نے اس روح کی جس طور ترجمانی کی ہے اس سے خیال انگیز بحث کرتے ہیں۔

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی
صفحات : ۴۵۹
قیمت : ۳۹ روپے

مولانا آزاد اور اندیشۂ تعلیم

عقیل الغروی
سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

مولانا آزاد نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تھی، اس سے تقریباً نصف یا پون صدی پہلے ہی ہندوستان میں تعلیمی نظام ٹوٹ کر بے جان ہو چکا تھا۔ یعنی دین و دنیا کی تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ دینی بنیادی تعلیمی ادارے اور غیر دینی یا آزاد تعلیمی ادارے، معاشرے کے دو علیحدہ علیحدہ محور بن چکے تھے۔ آزاد کا خاندانی پس منظر مذہبی تھا اس لیے وہ دینی تعلیمی نظام سے بہرہ ور ہوئے۔ اس تعلیم کا حال خود ان کی زبانی سنیے:

"انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا، لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسے کی تعلیمی زندگی گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسۂ عالیہ کی تعلیم اُن کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں؛ اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انھیں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے اُن سے تعلیم دلائیں۔"[۱]

اپنی تعلیمی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد کی نگاہ پورے تعلیمی نظام پر پڑتی ہے۔ وہ جن الفاظ میں یہاں تنقید کرتے ہیں وہ فنِ تعلیم و تربیت سے متعلق اُن کی ماہرانہ بصیرت کا ثبوت ہیں، لکھتے ہیں:

"خود اُس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں، ایک ایسا فرسودہ نظام جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص...."[۲]

آزاد کا یہ تبصرہ اگرچہ دینی تعلیمی نظام سے متعلق ہے، لیکن ان کے یہ الفاظ اُس وقت کے دینی اور غیر دینی دونوں تعلیمی نظاموں پر صادق آتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ اگر اوپر دیے ہوئے اقتباس میں ماضی کے صیغوں کو حال کے صیغوں سے بدل دیا جائے تو آج بھی دینی اور غیر دینی دونوں ہی تعلیمی نظاموں کے لیے یہ تبصرہ بالکل صحیح ثابت ہوگا! اور اگر رسمی تعلیمی نظام (یعنی موجودہ جمہوری نظامِ تعلیم) کے لیے یہ نہ بھی تسلیم کیا جائے کہ وہ سرتاسر عقیم ہے تو اس کے سقیم ہونے میں بہر حال کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔

جیسا کہ اوپر مکرر اشارہ کیا گیا کہ آ[زاد کی]
اپنی تعلیم و تربیت دینی طریق کار پر ہوئی [اس]
لیے لازمی طور پر انھوں نے پہلے اسی میں ا[صلاح]
اور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ لیکن معاشر[ے کے]
عام حالات اور سیاسیات سے دو چار [ہونے]
کے بعد جب وہ انگریزی زبان اور رسمی [تعلیم]
کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے تو ان کی [تیز]
اور منفرد تعلیمی بصیرت نے اس کی خامیا[ں]
ٹٹول لیں۔ اور اس میں بھی زبردست ا[صلاح اور]
تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس مطالعے سے مولانا ابو الکلام آ[زاد کے]
"نظریۂ تعلیم" تک رسائی کے ساتھ ساتھ [ان کی]
عظمت و انفرادیت کی ایک انوکھی تعبیر بھی [سامنے]
آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آزاد اپنی شخصیت [میں]
ہوئی تعلیمی صداقت' اور اپنے تعلیمی افکا[ر]
کے اعتبار سے اپنے زمانے کے مخروط (CONE)
کی چوٹی پر متمکن نظر آتے ہیں۔ اس تعبیر [کی]
وضاحت یہ ہے کہ آزاد اپنے دور کے عا[م تعلیم]
یافتہ یا دانشور طبقے سے بہت بلند اُس [مقام]
فکر و نظر پر دکھائی دیتے ہیں، جہاں سے
"عبقری" اپنے بعد آنے والے دور کے تعل[یم یافتہ]
طبقے کے فکری رجحانات اور اقدار کی تشکی[ل کرتا]
ہے۔ اور اس اعتبار سے آزاد اگر حکیم ص[ائب]
شیرازی کے اس شعر میں اپنی کیفیت کا اظ[ہار کرتے]
پا رہے تھے تو بالکل بجا تھا:

کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی اثرِ پیشتر از باغِ وجودم!

دیدنی ہے کہ آزاد نے تعلیمی فکر و نظام پر جو اعتراضات اُس وقت وارد کیے تھے وہی آج ہر دانشور کی زبان پر ہیں لیکن قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ جو تجویز اور طریقِ کار آزاد نے پیش کیا تھا وہ آج تک کسی بھی مدرسے میں تعمیل پذیر نہیں نظر آتا۔ آزاد کی بعض تنقیدیں ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں:

"... اگر فنونِ عالیہ کو الگ کر دیا جائے، تو درسِ نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں؛ علومِ دینیہ اور معقولات، علومِ دینیہ کی تعلیم جن کتابوں میں منحصر رہ گئی ہے، اُس سے اُن کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو، لیکن خود اُن علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی، معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے، تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اُس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تاریخِ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے، حالاں کہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنونِ ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں، وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلے میں بمنزلہ صفر کے ہیں، اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے... جامع ازہر قاہرہ کے نصابِ تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے، ہندوستان میں متاخرین کی کتبِ معقولات کو فروغ ہوا، وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی۔

اے طبل بلند بانگ، در باطن ہیچ!

سید جمال الدین اسد آبادی نے جب مصر میں کتبِ حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں، اور علمائے ازہر اُن کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلا شبہ اب ازہر کا نظامِ تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے، لیکن جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی، اور شیخ محمد عبدہ، مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درسگاہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔"

جملۂ معترضہ کے طور پر پھر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ یہ طویل اقتباس آزاد کی ۱۹۴۲ء

> ...آزاد کی اپنی تعلیم و تربیت دینی طریق کار پر ہوئی تھی، اس لیے لازمی طور پر انھوں نے پہلے اسی میں اصلاح اور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ لیکن معاشرے کے عام حالات اور سیاسیات سے دوچار ہونے کے بعد جب وہ انگریزی زبان اور رسمی نظامِ تعلیم کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے تو ان کی تخلیقیت اور منفرد تعلیمی بصیرت نے اس کی خامیاں بھی محسوس کیں۔ اور اس میں بھی زبردست اصلاح اور تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی...

کی تحریر سے پیش کیا گیا ہے، یعنی آج سے ۴۶ سال (تقریباً نصف صدی) پہلے کی تحریر ہے، لیکن کس قدر حسرت انگیز ہے یہ امر کہ بعینہٖ آج بھی "مدارسِ عربیہ" کی صورتِ حال حرف بہ حرف یہی کچھ ہے جو اُس وقت تھی۔

اسی کے ساتھ آزاد کی ایک اور رائے ملاحظہ ہو جس میں ایک ہلکی سی تنقید سرکاری نظامِ تعلیم پر کی گئی ہے۔ ۱۳، دسمبر ۱۹۲۰ء کو مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کی افتتاحی تقریب میں، جس میں گاندھی جی نے شرکت فرمائی تھی، آزاد نے ایک بہت ہی مختصر خیر مقدمی تقریر کی تھی جو بہت حد تک سیاسی CONTEXT بھی رکھتی تھی، لیکن اس کے ساتھ اس میں تعلیم کے حقیقی مسئلے سے متعلق بھی بڑا گہرا نکتہ موجود ہے۔ آزاد کی تقریر کا یہ حصّہ ملاحظہ ہو:

"ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں، اُن میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے، لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلاتی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں، جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوتی ہیں؟ مشتاقانِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے، جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔"

یہ تقریر اگرچہ بہت ہی مختصر ہے، لیکن بڑی شدّ و مدّ کی تقریر ہے۔ آزاد کا یہ ایک فقرہ کہ "علم خدا کی ایک پاک امانت ہے" کس قدر اہم اور اپنی معنویت میں بے پناہ ہے! فلسفۂ معرفت و علوم، Epistimology، فلسفۂ اخلاق یا چاہے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ آزاد نے تعلیم اور معیشت کے ارتباط اور بے تعلّقی کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا ہے،

جو تعلیمی اخلاقیات کے اعتبار سے بہت ہی نازک ہے اور عملی اعتبار سے بے حد پیچیدہ —— اور اگر تاریخ کے معلوم سرے سے تعلیم کی خارجی صداقت کا اقتصادی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ عجب طرح کے نتائج سامنے آئیں گے۔ لیکن اس مطالعے کے لیے آزاد کی تحریروں سے کوئی مدد نہیں ملے گی، اس لیے یہاں بے موقع ہوگا۔

یہاں تک آزاد کے جو تنقیدی خیالات پیش کیے گئے اُن میں تعلیم کے طریق کار اور نصاب کی تشکیل و تدوین سے متعلق خالص تکنیکی موشگافیاں سامنے نہیں آسکی ہیں۔ اس سلسلے میں "عربی نصاب تعلیم کمیٹی" کے اصلاحی اجلاس (منعقدہ لکھنؤ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء) کا صدارتی خطبہ[۶] جو قدرے طویل ہے، از اوّل تا آخر، بے حد اہم ہے۔ اس میں نظری اور عملی، تحقیق اور تنقید، ہر اعتبار سے آزاد کی نظر کی وسعت اور گہرائی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ علوم کی ماہیت، فلسفۂ معرفت، تعلیمی نفسیات غرض کہ کتنے ہی متعلقہ بصائر کے حامل نکات آزاد بکھیرتے چلے گئے ہیں۔ (چونکہ یہ دقیق فنی بحث صرف "مدارس عربیہ" کے طریقۂ تعلیم کے ماہرین ہی کی دلچسپی کی چیز ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر محض طوالت کا باعث ہوگا)۔ لیکن کچھ اسی خطبے پر منحصر نہیں، آزاد اس کے علاوہ، اپنی اکثر تحریروں میں ایک زبردست تعلیمی مفکر کی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ آزاد کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ "ترجمان القرآن" صرف ان کے اندر کے مُصنف کی تخلیقی انفرادیت کا سرجوش نہیں، بلکہ تعلیمی صداقت کے شعور سے بھرپور ایک انقلابی تعلیمی مفکر کا سرجوش ہے۔[۷]

یہ محض ایک اتفاق نہیں تھا کہ آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے مرکزی وزیر تعلیم بنے، بلکہ یہ تاریخ کا ایک عظیم الشان اتفاق تھا کہ آزاد کو وہی منصب ملا جس کے وہ اہل تھے!

یہ ہمارے مورخین اور ناقدین کی بہت بڑی قدر ناشناسی رہی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بالعموم آزاد ہندوستان کے تعلیمی معماروں میں شمار نہیں کیا جاتا؟!

حواشی

۱۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۷۶ء، ص ۹۶ (مکتوب نمبر ۱۱)۔

۲۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۷۶ء، ص ۹۷ (مکتوب نمبر ۱۱)۔

۳۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۷۶ء، ص ۹۰ (مکتوب ۱۱)۔

۴۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۷۶ء، ص ۹۸ (مکتوب ۱۱)۔

۵۔ "خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی۔

۶۔ "خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی

۷۔ دیکھیے "ترجمان القرآن" کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ بعنوان "قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت"۔

ابوالکلام آزاد — شخصیت اور کارناموں پر تفصیلی تبصرہ

دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری شریف الحسن صاحب نے پچھلے دنوں دہلی اردو اکادمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ ہمیں بخشا اور ہم نے گھر لا کر پیکٹ کھولا تو موتیوں کی مالا نکلی۔ اس مالا کا ایک موٹا سا (۵۰۰ صفحے کا) دانہ زیرِ نظر کتاب ہے۔ یعنی اکتوبر ۱۹۸۵ء میں مولانا ابوالکلام پر اکادمی کی طرف سے جو سمینار ہوا تھا اس میں پڑھے جانے والے مضامین کا مجموعہ جس میں ۲۶ مقالے شامل ہیں اور اس کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب جنھوں نے مجموعے کا سب سے تفصیلی اور وزنی مقالہ (مولانا کے سوانح) ۱۳۰ صفحوں میں سمویا ہے اور ماخذ بھی ۲۶ ہی رکھے ہیں۔ جو براہِ راست موضوع سے متعلق ہیں۔ ورنہ دہلی کے بعض اساتذہ اردو سے یہ رسم چل نکلی ہے کہ دائیں بائیں سے بھی ماخذوں اور حوالوں کے نام دیتے چلے جاؤ یہاں تک کہ پڑھنے والا کم بخت مارا پہلے سے مرعوب ہو جائے، دم نہ مار سکے۔

خلیق صاحب نے شرافت برتی کہ سوانح ابوالکلام کی کتابیات میں ان تمام ہستیوں کی آپ بیتیوں یا سوانح اور ان تمام انجمنوں، جماعتوں، پارٹیوں اور متعلقہ پلیٹ فارموں کی رپورٹوں اور تذکروں کے نام نہیں گنا دیے جن کا ذکر اصلاً یا ضمناً اس مقالے میں آگیا ہے، اور ابوالکلام کی سیرت کے تعلق سے آنا بھی چاہیے تھا۔

خلیق صاحب اس قدر "انجمن" ہو گئے ہیں کہ انھیں اپنی تحریروں پر نظرِ ثانی کی مہلت نہیں ملتی جس طرح کے مضامین پر وہ قلم اٹھاتے رہے ہیں انھیں قلم سے لکھا ضرور جاتا ہے لیکن پھر ٹھہر کر، آپریشن تھیٹر میں ٹیبل پر لٹا کر تیز باریک نشتر سے کھرچا بھی جاتا ہے۔ کاٹ پیٹ کر ٹانکے بھی بھرے جاتے ہیں یہ عمل ٹھہراؤ اور صبر و سکون چاہتا ہے جو بہت کم اہلِ قلم کو میسر ہے۔

زیرِ نظر مقالے کو سلامتی یوں نصیب ہو گئی کہ یہاں بیشتر خود مولانا کی تحریروں کے اقتباس جوڑے گئے ہیں۔ اور ان اقتباسات میں خلیق انجم کے لگائے ہوئے جوڑ گراں نہیں گذرتے۔ دلی والوں کی سادہ سلیس زبان لکھنے بلکہ لکھ سکنے میں مولانا آزاد کو تو بیسیوں برس لگ گئے، اس کی وجہیں بھی تھیں۔ خلیق انجم کو یہ نعمت ہاتھ لگے جہاں ہے وہ جب بھی بے تکلفی سے لکھنا (یا بولنا) چاہیں لکھ لیتے ہیں۔ یہ مقالہ "سوانح ابوالکلام" اس کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔

مولانا کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں جنھیں خود مرحوم کے آنکھوں دیکھتے فرضی، افسانوی یا خیالی کہا جانے لگا تھا۔ مثلاً بزرگوں کے کارنامے اور رشتے یا ان کے والد کی دس جلدوں میں مطبوعہ عربی تصنیف یا الازہر، قاہرہ میں مولانا کی طالب علمی۔ خلیق انجم نے اوّل تو ان کی تفصیل سے کنارہ کیا۔ ذکر آیا تو لکھ دیا کہ فلاں فلاں صاحبان نے اختلاف کیا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ نسیم احمد فریدی، یوسف بنوری، قاضی عبدالودود، اور آج کل نثار احمد فاروقی مولانا کے خود نوشت بیانات کو نامعتبر کہتے رہے ہیں۔ موخر الذکر نے تو اس طرح کے آوازے کسے ہیں گویا وہ اور مولانا ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔

ظ۔ انصاری
۲۳۔ شیریں۔ کلابا۔ بمبئی۔ ۳۱

فالتو باتیں ... مگر

اس دیدہ زیب، قابلِ قدر اور بروقت مجموعے کا کم از کم ایک تہائی حصّہ تو قطعاً غیر ضروری ہے اور کم از کم آٹھواں حصّہ ایک دوسرے کو دہرانے میں نکل گیا ہے۔ وہی اشعار، وہی حاشیے وہی اقتباس اور بے ضرورت لمبے لمبے حوالے۔ لیکن مرتب پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ سمیناروں میں ایک محدود موضوع پر جب بھی مقالے پڑھے جائیں گے اور ان سب کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنا لازم ٹھہرے گا، یہی ہوگا۔

پھر ہماری زبان کی تازہ ترین مصیبت یہ ہے کہ سرکاری یا انجمنی اداروں کے "جمہوری" تقاضوں کی تسکین کی خاطر اذان دے کر "سبھی کو" "باجماعت" کے لیے پکارنا پڑتا ہے ـــــ چاہے ان میں بے وضو بھی آجائیں۔ اس مجموعے میں ایک سے زیادہ مقالے ان عزیزوں نے پڑھے ہیں۔ اور مجموعے میں تین کے تین شامل ہیں، جنھیں موضوعِ سخن سے نزدیک و دور کی کوئی مناسبت نہیں۔ اسی طرح مولانا کی شاعری کے باب میں جو پانچ مضامین شامل ہیں۔ اگر وہ کسی کارن چھپنے سے یا جلد بندی کے وقت چھوٹ گئے ہوتے تو آزاد شناسی یا اس مجموعے کی وقعت میں کوئی فرق نہ پڑتا ـــــ حالاں کہ ان کے لکھنے والے سب نامور اور اپنے اپنے دائرے کے مستند اہلِ قلم ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، سید ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور سیدہ شانِ معراج۔ مولانا کی شاعری جو ایک وقتی اور عبوری دور، نوعمری کی ایک لہر تھی، اس کا الگ سے جائزہ لینا اور اس

پر مقالے لکھنا۔ اسی بات یا خصلت کا اظہار ہے جو عموماً
ہماری تمام تقریبوں، تہواروں، جلسوں، جلوسوں سیمناروں
پر بالآخر مشاعرے کی مہر لگاتی رہتی ہے۔

شاعری اور شاعرانہ نثر

مولانا کی شاعری کا تو، ضرورت بے ضرورت
اوروں نے اپنے مقالوں میں تذکرہ کر ہی دیا تھا ـــــ!
اور اس کی اہمیت ضمناً تذکرے سے زیادہ ہے بھی
نہیں۔ مولانا نے اپنے مضامین اور خطوط میں جا بجا اتنے
شعر جڑ دیے ہیں کہ معمولی قسم کا پڑھنے والا بھی بے اختیار
ان کی اعلا درجے کی شاعرانہ صلاحیت کا قائل ہو جائے گا۔
حیرت ہے کہ اس مسلّمہ حقیقت کے باوجود عزیز محترم
آزاد نے یہ کیسے لکھ دیا:

"... اردو میں ایسے بہت سے نثر نگار ہیں
جن کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل ہے لیکن ان کا شعری
ذوق مشکوک ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو معدوم ہے..."

ممکن ہے آزاد صاحب کسی خاص معاصر کو ذہن میں رکھے
ہوئے ہوں لیکن اگر انہیں چیلنج کر دیا جائے کہ "ایسے
بہت سے نثر نگار" کے بجائے سو برس کے دوران پانچ
سات نام ہی گنوا دیجیے تو جواب دیتے بن نہ پڑے۔
ایسا ہو نہیں کرتا۔ جن لوگوں کا شعری ذوق معدوم تو
کیا "مشکوک" بھی ہو وہ شاعرانہ نثر لکھ ہی نہیں سکتے۔
اور ویسے بھی نثر کے لیے "شاعرانہ" ہونا کوئی بڑی صفت
نہیں۔ کہیں کسی موقع پر ہنر ہے، اور کہیں عیب۔ شاعری
کا ذوق منجھا ہوا ہو، طبیعت شعر گوئی کی رسیا رہ چکی ہو،
موزونیت کی جانب آپ سے آپ جھکی پڑتی ہو...
یادداشت کی کیاریوں میں جا بجا اشعار کی چمن بندی سے
قدم اور دامن سنبھال کر نثر کی راہ طے کی جائے۔ تب
"شاعرانہ نثر" یا وہ نثر لکھی جاتی ہے جس میں شعر کی
مہک اور لذت رچی بسی ہو ـــــ شاعری کے
اعلا ذوق سے ایک درجہ بھی کوئی محروم ہو تو نثر کو شعریت
چھو کر نہیں گذرتی۔

پروفیسر آزاد سے اس موضوع پر انصاف کی امید
تھی، انھوں نے بار بار کہی ہوئی باتیں جوڑ جاڑ کر رکھ دیں
اور ان پر اپنا تبصرہ ٹکایا بھی تو ـــــ یہ!

سطحِ دریا پر بلبلے

پروفیسر ظہیر صدیقی نے مضمون دلبستانِ

... CSIR کی اسٹاف
یونین کی دلی کلچرل سوسائٹی کی امیر
خسرو کے مزار پر مولانا کا بے تکلف تشریف
لانا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہ جانا ان کی
ان کی کم آمیزی کو مشروط قرار دیتا ہے
بلکہ مولانا کی مشفقانہ فطرت سے بھی
مانوس کرتا ہے۔ مولانا واقعی اندر سے
ایسے ہی تھے...

شبلی اور جمالیاتی اقدار کے رشتے سے شروع کیا۔
(بات میں وزن تھا، مگر دوسرے ہی پیراگراف کی
یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"مولانا ـــــ کی شخصیت اور ادبی افکار کا
جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ وہ ایک ایسا بے کنار سمندر ہیں
جس کی آغوش میں معلوم نہیں کتنے دریاؤں نے روانی
سیکھی۔ ادب، سیاست، مذہب، سماجیات، تنقید
ـــــ یہ سب ان کے سمندر کی لہریں ہیں..."

"خبِ جمال، ابوالکلام کی جمالیاتی اقدار پر" سمندر کی
آغوش میں دریا کا روانی سیکھنا" اور وہ بھی کتنے دریاؤں
کا! اس طرح کی عبارتیں دیکھتا ہوں سر دھنتا ہوں۔
سمٹتا ہے۔ یہ مختصر مقالہ اس گھیردار جملے پر:

"یہ بات بھی اہم ہے کہ جن شعرا سے ان (ابوالکلام)
کو ابتدا سے لگاؤ رہا، وہ جذبات اور احساسات اور
جمالیات کے شاعر تھے۔ میری مراد نظیری، عرفی، غنی،
میر، غالب اور مومن سے ہے۔"

غور کا مقام ہے، جذبات + احساسات + جمالیات
کے شاعر تو یہ تھے اور ان صفات کے بغیر جو صاحبان
شاعری کر گئے، انھیں آپ اطمینان سے ہیجنوں گنتے
رہیے۔ دوسرا غور طلب نکتہ: غنی اور غالب میں،
عرفی اور مومن میں اور نوٹ کیجیے کہ فیضی اور میر میں شعر
گوئی کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں۔ انھیں "جذبات +
احساسات + جمالیات" کی دوڑ میں یکجا کیسے پھنسایا گیا؟
پروفیسر موصوف نے مومن کو واقعی خوب چھانا ہو گا کہ ان
میں تینوں صفات (جذبات + احساسات + جمالیات)
مل گئیں۔ باقی کے جو تین صدیوں اور مختلف طبیعتوں اور
کیفیتوں کے شاعر گذرے ہیں، ان سے یہاں درگذر ہی
مناسب تھا۔

وہی مفروضہ تقریر

شمیم حسن دہلوی، جنہوں نے دہلی شگفتہ اور بامعنی
چٹی تلی نثر والے قلمکار ہیں اور غیر سیاسی موضوعات پر قابلِ
قدر مضامین لکھ چکے ہیں۔ مگر یہاں "آزاد کی شعلہ نوائیاں"
عنوان دے کر وہ طے نہیں کر پائے کہ ابوالکلام کی شخصیت
کے کس پہلو سے سروکار رکھنا ہے۔ آزاد کی اس فرضی
تقریر کا اقتباس ہے جسے شورش کاشمیری نے شائع کر کے
پھیلا دیا تھا۔ جامع مسجد دہلی کی اس تاریخی تقریر ۱۹۴۸ء

سننے والے حاضرین میں کئی ایک ابھی زندہ ہیں اور
بیت او از یقین دلاتے ہیں اگرچہ یہ الفاظ اور جملے
ولانا کی مختلف اوقات کی تقریروں سے چن کر جوڑ لیے
ہیں لیکن اس روز موصوف نے ہرگز نہیں کہے تھے۔
مختصر سی تقریر آئندہ کے مشورے کے ساتھ کی اور
خصت ہو گئے۔

نسیم حسن صاحب دہلوی ہیں۔ اس فرضی تقریر
کی تصدیق کے مواقع انھیں بہتر حاصل تھے۔
مگر انھوں نے مقالہ ہی بے دلی سے لکھا اس لیے کسی ایک
ہو پر ٹک نہ سکا۔ کبھی مولانا کے زور خطابت جوش
یان اور حسن بیان پر زور دیتا ہے، کبھی اسلام اور
یاسی رویے اور پارٹی پر، کبھی ادھر ادھر کی باتوں
ر ــــــــ ایک عجیب بات ان کے قلم سے نکلی۔ قرآن
کانگریس، انگریز، مسلمان اور بزدلی وغیرہ کے ضمن میں
ولانا کے اقتباسات پے در پے نقل کرتے ہوئے مقالہ
نگار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"... انھوں نے جو راستہ اختیار کیا اس کی سچائی
ان کا ضمیر گواہ تھا۔ اسی لیے وہ آخری گھڑی تک اسے
چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ افسوسناک امر یہ ہے
ان کا واسطہ جن لوگوں سے تھا وہ کچھ اور عقیدہ رکھتے
تھے۔ ابنائے وطن چانکیہ اور میکاؤلی کی ہدایت کے
پیش نظر قدم اٹھانے کے قائل تھے۔ اسی لیے مولانا کے
خواب چکنا چور ہو گئے..."

مولانا اور سیاسی داؤ پیچ

مولانا کا واسطہ جن "ابنائے وطن" سے تھا،
وہ ان پر اور یہ ان پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ مولانا دھوکے
باز نہیں تھے۔ انھوں نے نہ صرف "ابنائے وطن" کو
بنایا بلکہ ان سے محبت اور بڑی سے بڑی عزت بھی پائی
خواب چکنا چور" ہوئے فرزندانِ توحید کی اس

ناعاقبت اندیش لیڈر شپ کے ہاتھوں جو کروڑوں
ہم مذہبوں کو خدا کے حوالے کر کے سدھار گئی۔ رہی
قدیم سیاسی مشیر کوٹلیا (چانکیہ) (تین سو سال قبل
مسیح) کی سیاسی حکمت عملی، خود جواہر لال نے اسے اتنا
بیان کردہ اس کے نکتہ چیں اور منکر ہو گئے تھے اور
اسی فرضی نام سے اپنی شناخت اور تجزیے کا یادگار مضمون
بھی لکھا تھا۔ اطالوی سیاست داں میکا (میکیاولی)
(وفات ۱۵۲۷ء) نے حکمت عملی اور سیاسی داؤ پیچ
کے جو اصول تجویز کیے ہیں، جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا
اور کانگریس پالیٹکس کے چالیس برس (۱۹۱۹ء-
۵۸ء) کو بھی جانچا ہو گا وہ بے چون و چرا مان لیں گے
کہ صداقت پسندی اور اخلاقی جرأت کے باوجود مولانا
نے کئی موقعوں پر میکیاولی کے مطابق "شطرنجی مہرے"
اٹھائے بٹھائے ہیں۔ پنجاب میں اقلیتی پارٹی کانگریس
کے سپورٹ سے جب مولانا نے "یونینسٹ" لوگوں
کو مسلم لیگ کے مقابل جمائے رکھنے کا خفیہ معاہدہ
خضر حیات ٹوانہ سے کیا تھا (۱۹۴۶ء)، جواہر لال
اصولاً اس داؤ پیچ کے خلاف تھے مگر مولانا اپنی اس
کامیاب چال پر نازاں رہے۔ خود پارٹی کی مسند صدارت
کے سلسلے میں ایسے کئی مواقع آئے جب مولانا نے سیاسی
داؤ پیچ میں کبھی چانکیہ اور کبھی میکیاولی کی ہمسری کا
ثبوت دیا۔ سبھاش چندر بوس کی جیت کو ہار میں یا
سبکدوشی میں بدلنے کے جو اندرخانہ جتن (۱۹۳۷ء-
۱۹۳۸ء) ہوئے اس میں مولانا کی سیاسی نباضی گاندھی
جی کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی ــــــــ اور جواہر لال
دم بخود تھے تقسیم سے ذرا قبل سردار پٹیل کی بڑھتی ہوئی
سیاسی طاقت کے توڑ پر جواہر کو کانگریس کا صدر
نامزد کرنا اور اس کے لیے پہلے سے اسٹیج تیار رکھنا مولانا کا
میکیاولین کارنامہ تھا۔ پھر وہ ایک سیاسی ماہر فن کی
حیثیت سے برحق بھی تھے، کامیاب بھی۔ البتہ تقسیم

کے ساتھ خواب صرف مولانا کے نہیں، لاکھوں کروڑوں
کے پوری قومی آزادی کی تحریک کے خواب چکنا چور
ہوئے "ابنائے وطن" اور خود مولانا بھی ایک بے
ہتھیار اور بے بس قوم کو قومی آزادی کی منزل تک
لے جانے کے لیے لیاپا چانکیہ نیا نظام اور طوطی یا
میکیاولی بہرمن تدبیر اختیار کرنے کے قائل تھے
مقصد میں دل و جان سے شریک ہونے والوں میں
یک دلی کے باوجود اگر طریق کار میں فرق کا احساس
ہو جائے یا دونوں کا فرق بڑھا لے تو اتحاد اور عقیدہ
یاد ہو کر نہیں رہتے۔ نسیم حسن دہلوی کا غالباً یہ میدان نہیں
ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔

بت پرستی اور خدا پرستی

اعجاز علی ارشد نے آزاد کا بحیثیت مفکر جائزہ
لینا چاہا لیکن تمہید کے صفحے کے بعد صرف دو ورق...
مصنف کے خود نوشت ہیں ان میں آزاد جیسے جینیس
کے گوناگوں افکار کا جائزہ لینا بھلا کس کے بس کا تھا۔
مقالہ ابھی اٹھان کے بعد تشنہ رہا۔ بہتر چند نکات جن
پر مقالہ نگار کی نظر گئی ہے وہ آئندہ اس موضوع پر وسیع
مطالعے اور تفصیلی مقالات کا باب کھولنے میں مفید
ہوں گے۔ مثلاً "اجتہاد فی المسائل" "تجدید دین و شریعت
اثبات صفات و نفی صفات، فکر و تجسیم ــــــــ

"... ہندوستان کے فلسفۂ ویدانت نے اور
اس کے بعد بودھ مذہب کے حکما نے نفی صفات کا
مسلک اختیار کیا اور تشخص بلکہ تجسیم تک کی لوگوں کو
اجازت دینی پڑی۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ غیر شخصی
تصور سے خدا پرستی کی پیاس بجھ نہیں سکتی ــــــــ
ویدانت کے توحید وجودی کا مسلک اور بودھ حکما کے
سلب و نفی کا تصور فلسفے کا ایک مذہب بن گیا لیکن
انسان کا عملی مذہب نہ بن سکا۔ عملی مذہب کے لیے

اصنام پرستی اختیار کرنی پڑی . . . .

بت پرستی اور خدا پرستی کے تعلق سے یہ وہی لائن ہے جو ابوریحان بیرونی سے لے کر ابوالکلام تک نو صدیاں پار کرآئی ہے اور گھوم پھر کر وحدتِ ادیان کی طرف لے جاتی ہے۔ ارشد صاحب نے نہیں لکھا لیکن بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ابوالکلام خوب سوچ سمجھ کر وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ انھیں وطن' ابنائے وطن' اسلام اور انسانی صفات کی آزادی خود اپنے وجود کی بنیادی تمنّا اور اپنے ارمانوں کا مرکزی نقطہ نظر آئی ——— اور یہ سب ایک ہی سلسلۂ فکر کی کڑیاں تھیں۔

ابوالکلام کو نہ اپنے شاعر ہونے یا کہلانے کی للک تھی نہ محض مفکر منوانے کی اُمنگ ——— مگر یہ خلیق انجم کو کیا ہوا کہ اس مقالے کو انھوں نے باب شاعری میں ڈال دیا۔ پنجابی کی پُرانی مثل ہے کہ جو تیرے تن کو لگ گیا' وہ تیرا' باقی بچا سوا احمد شاہ کا (یعنی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ لگے گا) یہاں بھی پانچ میں سے تین مقالے' جو کہیں اور نہ کھپ سکے وہ احمد شاہ کے ہاتھ لگے اور شاعری کی زنبیل میں ڈال دیے گئے۔

میں اور ابوالکلام

ایک ہیں گلزار زُتشی دہلوی ——— کہ ان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ ابوالکلام جیسی شخصیت پر قلم اٹھائیں اور اس میں اپنے احباب اور بزرگوں کا' اساتذۂ دہلی کا' اپنے کارناموں کا ذکر نہ نکال بیٹھیں' بھلا یہاں کیا موقع تھا اس ذکر کا کہ :

"... میری خواہش تھی کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کو اپنی وہ نظم جس کا عنوان "امن عالم یا نغمۂ انسانیت" تھا کہ جس پر مجھے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا انعام و اعزاز دیا گیا تھا' سناؤں . . . ."

گلزار دہلوی کے مضمون سے پھر بھی ذاتی زندگی کی چند خوشگوار جھلکیاں اور برتاؤ کی وہ نرمیاں مل جاتی ہیں جن کا اوروں کے ہاں ذکر نہیں کیا۔

"... فروری ۱۹۵۸ء کی تاریخی اُردو کانفرنس کے موقعے پر جب عصرانہ چائے کا وقت آیا تو اس نیاز مند سے مولانا نے حسب عادت قیمے کے سموسے' جو وہ رغبت سے نوش فرماتے تھے' فراہم کرنے کے لیے حکم دیا نیاز مند نے لکشمی ریسٹورنٹ چاندنی چوک سے تازہ اصلی گھی کے چار بڑے بڑے سموسے تیار کروا کر اسٹیج پر حاضر کیے جسے مولانا نے نہایت پسندیدگی اور رغبت سے ملاحظہ فرمایا" آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا نے قیمہ بھرے سموسوں کو ملاحظہ فرمایا ؟

اسی طرح CSIR کی اسٹاف یونین میں ڈی کلچرل سوسائٹی میں امیر خسرو کے مزار پر مولانا کا بے تکلف تشریف لانا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہ جانا نہ صرف ان کی کم آمیزی کو مشروط قرار دیتا ہے بلکہ مولانا کی شفقانہ فطرت سے بھی مانوس کرتا ہے۔ مولانا واقعی اندر سے ایسے ہی تھے جیسے گلزار دہلوی نے دکھایا ہے۔ چاہتے اور خود کو ذرا سی آڑ میں رکھتے تو اس مقالے کو اور بھی مالا مال کر سکتے تھے۔ مگر کس دن کے لیے ؟ ابوالکلام جیسا پس منظر ہمیشہ تو میسر نہیں آتا۔

گلزار دہلوی کا مقالہ تخت' دیوان اور مونڈھوں والے "ڈرائنگ روم کی لچھے دار داستان کا مزا دیتا ہے۔ علمی مذاکرے میں نہیں سمجھا۔

صحافت اور ابوالکلام

زیرِ تبصرہ کتاب کے چھ خانے ہیں' ان میں لازماً صحافت کو نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ اس باب میں چار مقالے ہیں۔ مقالہ نگاروں کا اردو صحافت سے رشتہ رہا ہے۔ انور علی دہلوی اور رضوان احمد کا تو اب بھی ہے۔ انور دہلوی نے "ادبی صحافت اور مولانا آزاد" موضوع چُنا۔

ضرورت تھی کہ اس اختلافی موضوع پر ادب اور صحافت کے باہمی فرق اور رشتے پر روشنی ڈال کر مولانا کے اس رویّے کو واضح کیا جاتا کہ وہ بنیادی طور پر ایک انقلابی ادیب اور خطیب ہوتے ہوئے اُردو صحافت کو ادب کی طرف نہیں لائے بلکہ ادبی حسن اور چاشنی کو صحافت کے مقصدی کالموں میں برابر گھولتے گئے اور یوں دشوار اور پُرپیچ عبارتیں اپنا وقار کھوئے بغیر رفتہ رفتہ آسان اور شگفتہ اور عام فہم ہوتی گئیں مولانا خیال کو نازک' باریک پیچدار خیال کو قریب الفہم دلکش اور سلیس بنانے کے لیے اپنے مسودے اس قدر کاٹتے پیٹتے تھے کہ متن کا قیمہ بن جاتا تھا" الہلال" کے دورِ اوّل کی عبارت' پھر "تذکرہ" کی عربیت... اور آخر میں پیغام میں مولانا کے مضامین اور آخری دَور کے خطبات کی زبان اور عام اپیل کو دیکھیے تو یہ فرق' بلکہ یہ فنی سفر صاف نظر آجائے گا۔ علی جواد زیدی سے امید تھی کہ وہ اپنے وسیع مطالعے گوناگوں تجربے اور تحقیقی ذوق کی بنا پر یہ نکتہ مولانا کی صحافت کے تعلق سے ابھاریں گے۔ (خصوصاً اس لیے بھی کہ ہمارے کم سواد معاصرین کو' جو عبارت مغلق کر کے علمیت کی شان جتاتے ہیں۔ ابوالکلام کی روز افزوں بصیرت سے یہ سبق سیکھنے کو ملے)

علی جواد زیدی صاحب نے اس نکتے کا سرا تھام تو لیا :

. . . مولانا کی نثر کی بلند آہنگی اور جوش جو "الہلال" میں شروع شروع میں نظر آیا اور جو ایک متوازن روانی ہے "تذکرہ" میں بھی دیکھنے کو ملا' وہ اس بحرانی دور کی پیداوار تھا . . . "ترجمان القرآن" سے یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ مولانا صاف سلیس' باوقار مگر آہستہ روی کے انداز کی نثر پر بھی اتنے ہی قادر ہیں جتنا

علوم و معارف کے بیان کے لیے وہ ایسا اسلوب اپنا سکتے ہیں جو خاص پسند ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہمی (فہم ؟) سے قریب ترین ہو۔ مولانا کی صحافت کے چوتھے دور میں بھی یہ احساس بیدار نظر آتا ہے ...." اچھا ہوتا اگر زیدی صاحب یہ احساس مولانا کی صحافت کا مطالعہ کرنے والوں میں بیدار کر دیتے۔ اس پہلو سے پورا باب تشنہ رہ گیا۔

زیدی صاحب مستقلاً ادب، صحافت اور قومی تحریک سے وابستہ رہے ہیں، پھر انھوں نے وہ فاش غلطی کیوں کی کہ ابوالکلام کی اس مفروضہ تقریر (جامع مسجد دہلی ۱۹۴۸ء) کا طویل اقتباس یہاں سجا لیا جو حاضرین نے سنی تک نہیں؟ محققوں سے کم از کم ایسی بے پروائی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

مولانا آزاد اور سر سیّد

اس مجموعۂ مقالات کا ایک موضوع ایسا ہے جس کے ساتھ علی گڑھ والوں نے کبھی پوری طرح انصاف نہیں کیا (یہ لکھتے وقت رشید احمد صدیقی، سجاد انصاری، اور شیخ محمد اکرام، میری نظر میں ہیں)، عین ممکن تھا کہ اب ان کلاسیکی بزرگوں کے بعد کوئی نیا بیدار مغز علیگ اس تعلق کو انصاف کی ترازو میں تولے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے، جو علی گڑھ میں ہی برسرِ کار ہیں، یہ موضوع اپنایا اور افراط و تفریط میں اپنے بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ بیشتر تو مولانا کی تحریروں کے اقتباس ہی ہیں، مگر جہاں نوادر ذی علم مصنف نے نتائج پیش کیے ہیں وہاں ہماری عقل گم ہو گئی کہ اللہ اکبر! آج سو برس کے بعد بھی علی گڑھ کے بعض فرزند اس ذہن کی پرورش کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو:

"... لیکن زیادہ دیر تک مولانا سر سید کے ساتھ نہ چل سکے۔ جلد ہی ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ سر سید کا دکھایا ہوا راستہ اسلام کی طرف نہیں، الحاد کی طرف لے جاتا ہے۔" (ص ۲۴۳)

——— مگر مولانا نے اوّل تو سر سید کی عقلیت پسند اصلاحی تحریک کو الحاد کی جانب لے جانے والی کہا نہیں ——— پھر یہ کہ مولانا عقلیت (Scientific Approach) سے بیزار نہیں تھے۔ اس کی اہمیت مانتے تھے ——— البتہ اسی کے ساتھ (امام غزالی کی طرح، وجدان کی روشنی) رہنمائی کے قائل ہو گئے تھے۔

پھر آگے چل کر ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں:

"... سر سید کے وہ مذہبی عقائد جو اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف جاتے ہیں اور جن کی بنا پر انھیں کفر و الحاد کے فتووں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے چند یہاں پیش کیے جاتے ہیں ...."

تو گویا یہ ہیں وہ عقائد جو "اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف" جاتے ہیں۔ ضیاء الدین صاحب نے سر سید کے عقائد سے یہاں بارہ نکات گنائے ہیں۔ ان میں یہ نکتہ بھی شامل ہے:

"... حضورِ اکرم صلعم کو معراج عالمِ خواب میں ہوئی ——— اس کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں ...."

یہ محض سر سید کے عقیدے کی بات نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے فوراً بعد یونانی اور ہندی فلسفے کے عربی تراجم کار یلا آنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دانش ور نسلوں نے پے در پے معراجِ جسمانی کے بجائے معراجِ روحانی پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ علمائے اسلام متکلمین اور متاخرین مفسرین سے ہوتا ہوا عہدِ اکبری (سولھویں صدی) میں تقریباً خواص کا مذہب ہو گیا تھا۔ نظیری نیشاپوری احمد آباد میں بیٹھا ہوا لکھتا ہے:

> نزدِ تو جبرئیل وحی آورد
> عقل برقعِ زرخ کشود اینجا

معراجِ روحانی و جسمانی، وحی و الہام یہ اسلام کے بنیادی عقائد نہیں، نہ ان کا ارکانِ دین میں شمار ہے۔ اسی طرح جنت و جہنم کے متعلق یہ تصور کہ یہ احوال ہیں، مقامات نہیں، گزشتہ بارہ صدیوں میں بڑے بڑے مسلم دانشوروں کا عقیدہ رہا ہے ——— "نہ اسلام کے بنیادی عقائد" سے اسے سروکار ہے، نہ اس کے ماننے نہ ماننے یا شرط ماننے والے الحاد اور کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر مصنف مقالہ نگار نے یہ لکھنے کی جرأت کیسے کی؟

"... یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید نے اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد مسلمات سے انکار پر رکھی جو اسلام کی حقیقی روح کے سراسر خلاف تھی ...." (ص ۲۴۵)

ذہنی کاوش، عقلیت اور عقائد کی چھان بین ایک "بنیادی عقیدہ" تھا۔ سر سید اور ان کے حامیوں کا اور علی گڑھ اس کا مرکز۔ "مسلمات" کیا ہیں؟ اگر سر سید کے عقائد کو مسلمات کے خلاف فرض کر لیا جائے تو عالمِ اسلام ہُو کا عالم ہو جائے گا۔ کانٹوں اور زقوموں بھرا جنگل اور بس!

دانشورانہ اختلاف کو بکران اختلافات کے حامیوں کو جہنم کی بھٹی میں جھونکنا پڑے یا بوعلی سینا اور ابونصر فارابی سے لے کر علامہ اقبال تک کوئی نہیں بچنے والا (غور سے ملاحظہ ہو "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" اور اس کی اسپرٹ)

ضیاء الدین انصاری نے آزاد و سر سید کے موازنے یا باہمی رشتے کی تشریح کرتے ہوئے انھی سر سید کو جی بھر کے مطعون کر دیا ہے جن کی تحریروں اور خیالات کو ابوالکلام ایک زمانے تک آنکھوں سے لگاتے

رہے اور کبھی ان سے پوری طرح منکر نہیں ہوئے۔ کچھ نہیں۔ ضیاء الدین صاحب فرماتے ہیں :

"... وہ (سرسید) عقل پرستی کے چکر میں پڑ کر روحانیت اور خوش عقیدگی سے بہت دور چلے گئے اور ایسی بہت سی باتوں سے انکار کر بیٹھے جن کا تعلق خالص روحانیت اور خوش اعتقادی سے تھا ..."

ضیاء الدین صاحب نے "خوش اعتقادی" کو جو کم و بیش مترادف ہے ضعیف الاعتقادی کا، خالص روحانیت پر اعتقاد شمار کیا ہے۔ خود "خالص روحانیت" کیا شے ہے! نہ ہم بتا سکتے ہیں۔ نہ علی گڑھ کا کوئی وہ فرزند جو سرسید کے ذہنی تجدیدی کارنامے میں پل کر اس سے متنفر ہو چکا ہو۔ سرسید کے عقائد سے ہمیں یہاں بحث نہیں البتہ یہ ہمارے تبصرے کا اصل پہلو ہے اگر نوجوان اہل علم کو کم از کم اتنی دانش دینا بے محل نہ ہو گا کہ "اسلام کے بنیادی تصورات اور مسلمہ عقائد" کا لفظ زبان پر لانے سے پہلے مولانا ابوالکلام کے ترجمان القرآن کا ترجمہ مع حاشیہ ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

میں نے آزاد کو دیکھا

پانچ سو صفحات کے اس مجموعے کے وہ چار مضامین جو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، بہ ترتیب یہ ہیں :

۱. مولانا کے ایک سکریٹری مرزا مسعود بیگ سے انٹرویو (ڈاکٹر صلاح الدین)

۲. مولانا آزاد کی مذہبی فکر، صباح الدین عبدالرحمن

۳. اردو نثر کی تاریخ میں ...... صدیق الرحمن قدوائی

۴. شخصیت ابوالکلام کا اجمالی جائزہ، پروفیسر ضیاء الدین

ان چاروں کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی (پٹنہ) نے "آزاد اور نہرو" کے موازناتی مقالے میں اپنا معیار برقرار رکھا ہے اور اس اہم سوال کا تسلی بخش جواب بھی دے دیا ہے کہ :

"آزادی کی طویل جد و جہد کے بعد حصول اقتدار کے وقت آزاد نے نہرو کے لیے جگہ کیوں خالی کی؟

جواب یہ کہ : خود وزیر اعظم بننے کے بجائے اکثریت کے ایک فرد کو وزیر اعظم بننے کا موقع دینا پسند کیا۔ مولانا کے خیال میں کانگریس کے دوسرے سب رہنماؤں سے زیادہ روشن خیال تھا ...."

قومی تحریک کا اصل مثلث

پروفیسر عبدالمغنی انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہیں۔ اقبالیات اور اس سے متعلقہ موضوع پر وسیع نظر اور تصنیفی کارنامے رکھتے ہیں لیکن محاکمے کے وقت مولویانہ شدت اختیار کر لیتے ہیں اور فتوی بلکہ فتاوی صادر کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہ چند جملے آ گئے ہیں۔

"... نہرو اپنے معلوم و معروف میلانات کے سبب تنہا اتنی متوازن قومی معاشی اور بین الاقوامی پالیسیاں مرتب نہیں کر سکتے تھے ... ایسی پیچیدہ پالیسیوں کی ترتیب میں انھیں گاندھی جی کے سادہ ذہن سے کوئی قطعی رہنمائی نہیں مل سکتی تھی۔ لہٰذا ...."

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مقالے کے موضوع سے انصاف کی خاطر یہ قیاسی فیصلہ درج ہوا یا پروفیسر مغنی صاحب اس مثلث (گاندھی + نہرو + آزاد) کے تینوں ضلعوں اور زاویوں کو متوازن رکھنے میں جلدی کر گئے ہیں۔ کہ مثلث کی اقلیدسی تھیورم درست ہو تو اس میں زاویہ قائمہ کا درجہ گاندھی جی کو حاصل تھا اور حاصل ہے۔ یعنی ۹۰ ڈگری۔ باقی میں نہرو اور آزاد اگر برابر بیٹھتے ہوں تب بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ نہرو نہ صرف دانشوری اور علمی باخبری میں ہی بلکہ عملی سیاست اور قبول عام کی اقبال مندی میں بھی ہر ایک زندہ نیتا سے بہت آگے تھے۔

آخری دو پیراگراف جلدی جلدی دامن سمیٹنے کا سا انداز رکھتے ہیں ______ مگر ہم ان کے احسان مند رہیں گے کہ آزاد و نہرو کے تقابلی مطالعے یا باہمی توازن کے تعلق سے ہمیں آگے تک سوچنے اور جداگانہ مقالہ لکھنے پر اکسایا ہے۔

احمد سعید ملیح آبادی نے مولانا کا کئی زاویوں سے جائزہ لیا اور وہ نکتہ نمایاں کر دیا ہے جسے علی جواد زیدی کے مقالے (صحافت) میں ابھرنا چاہیے تھا :

"... مولانا نے اوائل عمر میں جو زبان لکھی وہ حد درجہ دشوار ہے۔ جسے آج اور کل کے زمانے میں نئی نسل کے لیے صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا کافی دشوار ہو گا۔ کیونکہ اردو تعلیم میں کمی آتی جا رہی ہے۔ مولانا اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ آسان اور سلیس اردو لکھی جانی چاہیے۔ (ص ۲۶۶)

۱۹۲۷ء میں جب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "پیغام" ویکلی جاری کیا تو مقصد میں بھی مولانا ابوالکلام کی تحریروں کی اشاعت شامل تھی۔ مگر یہاں نہ وہ "الہلال" کا سا جاہ و جلال تھا۔ نہ شان و شکوہ ۱۹۱۲ــــ۱۴ء کی جگہ اب وہ شہسوار صحافت آزاد سامنے آیا جو بات کو مختصر اور سادہ عام فہم انداز میں کہنے لگا تھا۔

مولانا کی مذہبی فکر

صباح الدین عبدالرحمن (مرحوم) خود ایک قدامت پسند عالم تھے۔ ندوۃ العلماء کا آخری چراغ تھے۔ دبنگ تھے، بے لاگ اور علمی معاملات میں بے مروت

تھے لیکن مولانا کی نسبتاً آزاد خیالی اور مذہبی وسیع النظری
کہیں قابلِ تعریف معلوم ہوئی۔ مثلاً یہ خیال کہ:

زرتشت اپنے وقت کا نبی تھا۔

یوں تو انھوں نے نجوم، رمل، جفر، طب
و رشاید (؟) موسیقی کی بھی باضابطہ بھی تعلیم پائی لیکن
.... ان علوم میں مہارت تامہ حاصل ہوئی جن کا دروازہ
درس گاہِ الٰہی سے ان کے لیے کھلا تھا۔ ان کے اکتسابی علم
پر ان کا وہبی علم غالب رہا....

امام غزالی کی (تصنیف) "تہافۃ الفلاسفہ"
کا بھی ترجمہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو بے سود
سمجھ کر چھوڑ دیا۔

مولانا صباح الدین نے یہ بیان ضمناً دیا ہے
مگر ہمارے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے" تہافۃ
الفلاسفہ" امام غزالی کے اُس دور کی تصنیف ہے جب
وہ اپنے عہد کا سارا اُمتداول فلسفہ پی چکنے کے بعد
فلسفے کی اہمیت اور خود عقلیت (Rationalism or Reason) سے پھر گئے تھے۔ صوفیا
میں خصوصاً مغرب میں ایمانوئیل کانٹ کے پیروؤں نے
اس کتاب کو بڑی اہمیت دی۔ عقل و وجدان کے معرکے
اس کی روشنی میں گرم ہوئے۔ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں
کہ انیسویں صدی میں آخری بار جب فلسفہ اور قوت ارادی
یا خودی کی بحث چھڑی، آمنے سامنے دو تصانیف سامنے
آئیں Poverty of Philosophy
اور Philosophy of Poverty
تو ایک نے عینیت پسندوں کا، دوسری نے سائنسی مادیت
پسندوں کا ساتھ دیا۔ یہ بحث امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ
سے چلی آ رہی تھی۔ ابوالکلام بھی اس عہد آفریں تصنیف سے
ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ مگر جب اس کام کو ہاتھ
میں لیا، ترجمہ کرنے کے خیال سے تو فلسفہ یا عقلیت کی
تذلیل انھیں گوارا نہ ہوئی، کام ادھورا چھوڑ دیا۔

ایسی اور کئی مثالیں یہاں مل جاتی ہیں جن سے
قطعی ثبوت ملتے ہیں کہ ابوالکلام غیر مقلد تو خیر تھے ہی،
لیکن اس کے علاوہ مذہب اسلام کے ان عقیدوں اور
فریضوں کو خلاصہ سہل کر کے اپنا لیا تھا جو اسے دینِ فطرت
منواتے ہیں اور ان پر سیاسی مخالفین کی طرح مذہبی ٹھیکے
داروں نے یہ گرفت کی کہ ______ "وہ (ابوالکلام)
صرف ایمان باللہ اور بالآخرت کو کافی سمجھتے ہیں، ایمان
بالرسول کے قائل نہیں...." (ص ۳۱۰)

ایک مقالہ جسے تحقیقی اعتبار حاصل ہے لیکن
صرف "ترجمان القرآن" کے اسلوب تک محدود رہا۔
وہ لکھنؤ کے کاظم علی خاں کا ہے جو ادبی تصانیف کے
سرچشموں کا جائزہ لینے میں شہرت پا چکے ہیں، چناں چہ
یہاں بھی انھوں نے اپنے موضوع کو اسی رخ سے دیکھا:

"... اس کتاب میں آزاد نے اس سادہ و پُراثر
اسلوب نگارش سے کام لیا ہے۔ جو آیاتِ قرآنی سے
سادگی میں ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے... اسلوب آزاد
میں سہل نگاری کا رجحان "ترجمان القرآن" میں پہلی بار
بھرپور طور پر نمودار ہوتا ہے.... اس کی وجہ بظاہر یہ
معلوم ہوتی ہے کہ آزاد قرآن فہمی کو عام بنانے کے لیے
زیادہ سے زیادہ صاف، سلیس اور سہل اسلوب کو
برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ بعد کو اسلوب کی اسی سلاست
نے "غبارِ خاطر" کے اوراق کو بھی حسن عطا کیا...."
(ص ۳۲۳)

"محسوس ہوتا ہے" اور "بظاہر" کے احتیاطی الفاظ مقالہ
نگار نے جس مصلحت سے بھی استعمال کیے ہوں، تاہم بلاشبہ
"ترجمان القرآن" مولانا کے بہترین تصنیفی انہماک اور
ذہنی کاوش کا وہ حاصل ہے جس سے مصنف کا فکری اور
فنی ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ ترجمان القرآن میں قرآن فہمی
(بلکہ تفہیم) کی خاطر مولانا نے جو اسلوب اختیار کیا وہ محض
اسلوب نہیں، قرآن کی سادگی اور قوت، سلاست اور
صلابت کا ایسا امتزاج ہے جس کے اثرات مقالہ نگار
کاظم علی خاں کو "غبارِ خاطر" کے خطوط کی عبارت میں
بھی نظر آئے اور انھوں نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے۔
اس مقالے کو تمہید قرار دیا جا سکتا ہے پروفیسر
رضی الدین کے باوقار اور پُرمغز مقالے کی

آزادیِ فکر

رضی الدین احمد نے "نقد ابوالکلام" ایک ضخیم
تحقیقی اور علمی تصنیف دے کر گویا ابوالکلام کا ہمہ سمت
سے احاطہ یا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "ترجمان القرآن" کی اس
روح کو چھو لیتے ہیں یہ کہہ کر کہ "ابوالکلام نے تعقل اور
تفکر کی جس راہ کو حقیقت شناسی قرار دیا ہے وہ فکر سلامتی کی
ضامن ہے" اور پھر

"ابوالکلام نے آزادیِ فکر کو اسلامی فکر کی اساس
قرار دیا ہے، اور یہ بھی ان کی عقلیت کا ایک وسیع باب
ہے...." (ص ۳۴۶)

تفکر، تعقل، غور و فکر پر مولانا نے قرآن کی تفہیم
کرتے ہوئے جو بار بار زور دیا اور کہا کہ:

"... انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ
یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور
اپنے وجود کے اندر اور وجود کے باہر جو کچھ محسوس کر سکتا
ہے اس میں تفکر و تدبر کرے چنانچہ قرآن کی کوئی سورت
اور سورت کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر و تعقل کی دعوت
سے خالی ہو...." (ص ۴۷، ترجمان)

عقلیت پر یہی اصرار ہے جو سرسید کی پوری
تحریک کی جان تھا اور مولانا کبھی اس سے منکر نہیں
ہوئے۔ لیکن ایک مقام ان کے ذہنی سفر میں آتا ہے
جب وہ تعقل کو صاف صاف چراغِ راہ سمجھتے ہیں منزل
نہیں اور اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ یہاں وہ ابن تیمیہ

اور امام غزالی دونوں کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ عقلیت کو چراغ راہ ماننے والے اور عمر بھر اس چراغ کو سیاسی اور سماجی فانوسوں میں سنبھال کر لے چلنے والے ابوالکلام کے ہاں ایک اور پہلو' نہایت اہم پہلو' بلکہ ان کی خلوت نشین شخصیت کی کنجی وہ ہے جسے رضی الدین احمد نے اپنی پہلے کی تصنیف میں مقالوں میں اور خصوصاً اس مقالے میں ابھارا ہے ـــــ ابوالکلام کی حسن پسندی' ذوق کی نفاست' طبیعت کی لطافت اور جمال کو ہر پہلو ہر ایک رنگ میں داد دینے کی سکت اور صلاحیت خود مقالہ نگار کے الفاظ میں:

" عقلیت' خطابت اور صحافت کے ساتھ ساتھ ابوالکلام کے طرز اور شخصیت نے جو چیز یادگار چھوڑی ہے... وہ ایک جمالیاتی قوت کا احساس اور اظہار ہے۔ ابوالکلام کے طرز اور طبیعت میں حسن کا نشہ اور سچائی کا نغمہ ایک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔ ابوالکلام کا یہ نغمہ اور نشہ اسی ذہنی خفگی اور غلامی کے خلاف ایک شدید ردِ عمل بن گیا ہے جو اردو ادب میں' خصوصاً شاعری میں چھایا ہوا تھا۔"

ایک اور مقام پر:

" ابوالکلام کے ہاں حق ہے مگر جمالیات نے حق کی کڑواہٹ کو حلاوت سے بدل دیا ہے...."

پروفیسر موصوف نے اسی لہجے سے اپنے الفاظ تقدیم و تاخیر کرکے دہراتے گئے ہیں' یہاں تک کہ وہ آخر میں اس خلاصے پر پہنچتے ہیں:

"... انشائیات ابوالکلام کے اجزا میں جس دوئی کی وحدت ہے' اسی دوئی کی وحدت ابوالکلام کی شخصیت میں بھی ہے۔ یہ حق پسندی اور حسن پرستی سے عبارت ہے۔ اور اس کی عظمت میں یہ دونوں اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں جس طرح دریا کے دو کنارے۔ ان دونوں کناروں کو جوڑنے والی شخصیت میں جو عظمت اور وسعت ہے وہ ابوالکلام کا مقدر اور منصب بنی..."

(ص ۳۵۹)

اس مقالے نے' جو دراصل ہزار صفحے کی پوری تصنیف کا لبِّ لباب ہے (اس کے باوجود تکرار' خیال و الفاظ سے محفوظ نہ رہ سکا) ابوالکلام کی شخصیت اور فن میں رفتہ رفتہ تین صفات ابھر آتی ہیں۔ اور ان کا ظہور ایک ارتقائی لائن پر نظر آتا ہے:

حق کی جستجو میں عقلیت کی روشنی۔

آزادی پسندی۔

حسن پرستی یا گہرا جمالیاتی شعور

اگر ہم ان کے ذہنی سفر میں ان تینوں کو زادِ راہ مان لیں تو ستر برس کی بھرپور زندگی کے کئی اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ابوالکلام کا باہمہ اور بے ہمہ زندگی کرنا' اپنے خیالات پر اصرار اور قوتِ برداشت اور قوتِ اظہار ـــــ دونوں کی شدت میں توازن و تناسب کا رمز ہم پر آشکار ہو جائے گا۔ ابوالکلام ہمارے لیے اجنبی یا بہت دور کی کوئی ہستی نہ رہ جائیں گے بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا اور ان کی ہمہ وقت قربت کا احساس ہوگا۔ مثلاً یہی کہ:

ایک طرف تو وہ منٹ منٹ کے حساب سے وقت کے پابند ہیں۔ دفتر کے چوکیداروں سے بڑھ کر دفتری پابندی میں چوکس ـــــ اور دوسری طرف وہ شام کے آٹھ بجے کے بعد اور صبح ۸ بجے سے پیشتر کے دوران اپنے معمولات میں کسی قسم کی دخل اندازی یا اونچ نیچ کے روادار نہیں۔

اُردو نثر میں

۲۶ مقالات کے اس مجموعے میں دوسرا نہایت بیش قیمت اور پُر مغز' مدلل مضمون ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی کا ہے۔ کل آٹھ صفحے' لیکن اپنے موضوع "اردو نثر کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام کا عہد" سے پورا انصاف کرنے والے۔ یہ مقالہ ایک نہایت فکر انگیز جملے سے شروع ہوتا ہے۔

" ادبی نقطۂ نظر سے مولانا آزاد کے دور کا ایک سرا علی گڑھ تحریک سے ملتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر ترقی پسند تحریک ہے...."

یہ پورا مقالہ اسی ایک جملے کی تفسیر ہے۔ کیا نکتے کی بات ڈاکٹر قدوائی نے کہی کہ:

"... انانیت صرف سیاسی رہنماؤں میں نہیں' سارے ادیبوں میں پائی جاتی ہے' اور شاید بجا طور پر مولانا آزاد ان میں سب سے آگے ہیں۔ ترجمان القرآن جیسی کتاب کا لکھنے والا اپنے ذہن' اپنے علم اور اپنی قوتِ بیان پر غیر معمولی اعتماد کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا... ہر ہجوم میں' خصوصاً مخالفوں کے ہجوم میں تنہا کھڑا رہنا شاید ان کی انا کو کچھ زیادہ ہی تسکین پہنچا تھا۔ "غبارِ خاطر" کے خطوط کا ہر لفظ اس بات پر اصرار ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جیسے دوسرے ہوتے ہیں۔ اسے وہ ہر طرح منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ استدلال کے ذریعے بھی اور اسلوب سے بھی۔"

ایک اور بات' جو مغربی نثر کے رسیاؤں کو مولانا کی تحریروں میں کھلتی ہے۔ صدیق الرحمن صاحب اسے ہنر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... اشعار کی بھرمار نے ان کی نثر کو اگرچہ جا بجا چھلنی کر دیا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اشعار بھی اکثر کھل اٹھتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ مولانا کی نثر میں آنے سے پہلے اپنے معانی کی تلاش میں تھے...." (ص ۳۳۴)

قدوائی صاحب نے اپنے بیانات اور اندازوں کے

یہ مولانا کی تحریروں سے مثالیں فراہم نہیں کیں تاہم نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جس ادبی اسلوب کی بنیاد مولانا کے قلم نے ڈالی وہ انہی کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ وجہ یہ کہ ان کی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ اور وہ فضا جس میں یہ اسلوب پروان چڑھا ــــــ دونوں اب دہرائے نہ جاسکیں گے . . .

ہمیں اس اندازے سے اتفاق ہے مگر ایک ترمیم کے ساتھ اور ترمیم یہ کہ نہ تو مولانا کی شخصیت ایک محدود دائرے میں بنی نہ ان کا اسلوب اوّل تا آخر ایک سا رہا۔ ان میں رفتار اور ارتقا کا جو احساس ہوتا ہے وہی ارتقائی عمل آج بھی جاری ہے۔ اور مولانا کی دین بدلے ہوئے حالات میں مختلف شخصیتوں اور حیثیتوں کے ساتھ بدلے ہوئے روپ میں ہمارے ساتھ رہے گی۔

مولانا آزاد — چند ہم عصر اکابرین کی نظر میں

ایک رفیقِ کار

مولانا دُنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاستدان تھے۔ آپ ایک کامیاب سیاست داں کے طبعی مزاج سے معرّیٰ تھے۔ جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملے کرنے اور حملے سُننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افتادِ طبیعت سرتا پا اس کے خلاف تھی۔ وہ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند تھے اور مزید برآں اُن کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل تھا۔ باوجود ایک موثر اور باوقار مقرر ہونے کے وہ شور و شغف اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ اُن کو عوام میں تقریر کرنے کے لیے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ اُن کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انھیں حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آ جاتے تھے جو انقلابِ فرانس سے کچھ پہلے موجود تھے۔ تاریخِ اقوامِ ماضی میں اُن کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اور پھر یہ وسیع علم اُن کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلّل، باضابطہ اور سلجھا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اگر اس وقت خلوت پسندی اور شرمیلا پن اُن کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا، تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ کیوں کہ اُن کے قلم میں ایک سحر اور اُن کے لبوں میں ایک اعجاز تھا، جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکتِ عمل کی طرف راغب کر سکتا تھا۔ ہم نے یہ اعجاز اور آواز پبلک میں بہت کم سُنی۔ اور بدقسمتی سے اُنھوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی تھیں۔

مجھے ہمیشہ اُن کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے۔ کیوں کہ جو زبان وہ لکھتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ پُرمعنی الفاظ سے مملو ہوتی تھی۔

شباب میں ہی اُنھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا عرب ممالک اور مصر سے خراجِ تحسین وصول کر لیا تھا۔ اور وہ محض اُن کے قلم کی بدولت تھا۔ اور اب تک یہ حالت تھی کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیّاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اُس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر اُنھوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنابریں صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ محض حالات کا تقاضہ تھا کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لینے کے لیے مجبور ہوگئے۔ اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ بہ وجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم، جنھوں نے اُن کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل کی ہے۔ تاریخ کے فیصلہ کے لیے زحمت کش انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لیے اور ملک و قوم کے لیے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ تھے۔ قطعِ نظر اس کے کہ کبھی ہم نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا بالاتفاق ہمیشہ یہ بات ملحوظِ خاطر رکھتے رہے کہ اُن کی رائے ہمیشہ بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے۔ اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ کیو[ں کہ] وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب د[ماغ] کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فض[ل] اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہوا[...] یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں[...]

بڑے آدمی پیدا ہوتے آئے ہیں اور [...] ہوتے رہیں گے۔ لیکن مولانا جس خاص نوعیت [...] عظمت کے مالک تھے وہ بھارت یا کسی اور جگہ [...] نہ آسکے گی۔ مولانا آزاد نے اسلام کی سب سے بڑ[ی] خدمت کی جب کہ اُنھوں نے یہ کہا کہ اسلامی مما[لک] امپیریلزم کے نتیجہ سے تبھی بچائے جا سکتے ہیں جب [...] بھارت آزاد ہوگا۔ مولانا ماضی کی عظمت اور ح[ال] کی عظمت کا دل پسند مجموعہ تھے۔ وہ پرانے زما[نے] کی عظمتیں، خصلتیں مثلاً رواداری، شفقت، مروّ[ت] تحمّل مزاجی بدرجۂ اتم رکھتے تھے:

آج انسان چاند تک پہنچنے کا متمنی ہے لیـ[کن] ہم میں تحمّل مزاجی، مروّت اور رواداری کا زبرد[ست] فقدان ہے۔ مولانا اس کلچر کے نمائندہ تھے جو مخ[تلف] کلچروں کے آپس میں سموئے جانے سے ظہور پذ[یر] ہوا ہے۔ مولانا آزاد روشن فہم و فراست [کے] مالک تھے اور مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی حیرا[ن کن] صلاحیت رکھتے تھے۔

مولانا ہم سے جُدا ہو گئے ہیں لیکن ان[کا] پیغام زندہ ہے۔ اور یہ ماضی کی طرح ہمیں رو[شنی] دیتا رہے گا۔

—— پنڈت جواہر لال نہ[رو]

(انگریزی سے ترجمہ)

سب سے بڑی خدمت

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو اُنھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے، جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے۔ مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بناکر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے۔ لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیے، تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے۔ تب وہ سچا عیسائی ہے۔ تب وہ سچا پارسی ہے، تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن ہوکر ہمیں ملتا ہے۔ در یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے۔ اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لیے یہ عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

—— ڈاکٹر ذاکر حسین

(مولانا آزاد کے تعزیتی جلسے سے خطاب)

مجموعۂ اوصاف

باضابطہ تعلیم و اصطلاحی تدریس تو مولانا کی یقیناً عقل اور مشاہیر ماضی و حال کی طرح کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ لیکن خدا معلوم کتنے علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہوگئے تھے۔ اور ہر وقت مستحضر۔ طب ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو۔ بس گفتگو چھڑنے کی دیر تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے۔ اور تقریر بھی ایسی دل آویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جاتی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا اور غضب کی خوش دماغی۔ اور زبانوں پر عبور تو اور بھی حیرت انگیز تھا۔

اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ جلسۂ ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے۔

فارسی شعر میں ان کا تبحر دیکھ کر گمان یہ گزرتا تھا کہ اساتذۂ فارسی کے دیوان کے دیوان اس شخص نے نوکِ زبان کر لیے ہیں۔ اور اردو کے بیتے تو پوچھنا ہی تحصیل حاصل ہے۔ زبان مادری ہی ٹھہری۔ پھر بھی اُس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی وسیع اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے اس جامعیت کے معیار پر 'فیل' ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کسی حد تک اگر کسی کی ذات رکھی جاسکتی ہے تو وہ ابوالکلام کی۔ اور یہ اردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخوں کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے۔ تاریخ اردو میں ان کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت صاحب طرز انشا پرداز کے ان کے نام کا باب باب عالی شان بھی ہونا چاہیے۔ اردو کو انھوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس ہی میں نہ پائے۔

—— عبدالماجد دریابادی

رئیس التحریر

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے جن کو زمانہ نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ ورنہ آج ہم انہیں صرف "الہلال" و "البلاغ" کے رئیس التحریر یا "تذکرہ" "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت قدرت کا ایک سربند راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہوسکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانے کے حالات تھے جنھوں نے ان

کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب اُن کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی اپنی "شانِ گراں مایگی" ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعہ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریکِ آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر "الہلال" کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل، اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور "الہلال" کا اور تیسرا "البلاغ" کا۔ دورِ اول خالص علمی تھا، دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی۔ اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اُن کی انفرادیت و انانیت کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ اُن تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیتِ ایقان پائی جاتی تھی، وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جس میں منطقی چون و چرا اور استدلالی "ایں و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قائدانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، عسکرانہ رجز خوانی، مرد مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کاہنوں کا سا وزن و وقار جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

——— نیاز فتح پوری

فقر و فاقہ میں

۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ مولانا نہایت مالی مصائب میں مبتلا تھے۔ میں تو گھر ہی کا آدمی تھا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی ہوتا تھا اور مجھ سے گھر کی کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ مولانا از حد نفاست پسند اور عالی دماغ تھے۔ جو کچھ ہو بہتر سے بہتر ہو اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ سگریٹ کے عادی تھے اور قیمتی سے قیمتی سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں سستے سے سستے، گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پر قانع تھے۔ یقیناً سخت ترین اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ آدمی کے لیے ہر مشکل آسان ہے مگر ذہنی کوفت کا جھیلنا آسان نہیں۔ وہ بڑے انسان ہی ہیں جو ذہنی اذیتوں اور دماغی کلفتوں میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہیں اور اپنی اندرونی ویرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ دولت ہی دولت رہتی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لیے فقر و فاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس فقر و فاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا۔ کبھی جھنجھلائے نہیں۔ بلکہ اُن خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔

——— عبدالرزاق ملیح آبادی

نادر روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے اور اُن میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل، حقایقِ دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلم نہ تھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ کم یاب ذخیرہ ہو۔ جو اُن کی نظر سے نہ گزر چکا ہو اور اس ذخیرے کی ہر مستحقِ اعتنا شے اُن کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور اُن کے وہ مطالب ذہن میں بٹھائے جو انھیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں نہ صرف تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنّفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقایق بیان فرماتے جو اس فن میں درجۂ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُنے گئے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے وہ عمل اور عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز

درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوش گوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا۔ اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں۔ انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی۔ اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُرتاثیر خطابات تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اُٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی، اس پر اونچے سے اونچے عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے۔ اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

——— مولانا غلام رسول مہر

روشن دماغ

قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے۔ اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے ماحول کا تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں الجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے۔ لیکن اُن کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ اُن کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ہندوستان بھر تمام اقلیتیں کو پورا پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ "فلاں چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے"۔ یعنی ان کے ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی۔

——— غلام السیدین

مردِ مجاہد

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سر سید کی پالیسی کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا اور پھر سرکردہ مسلم سیاست دانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف سراسر ایک سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علما کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کی پرورش اور تربیت اُن کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لیے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے اُن کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دیے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے۔ جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر اُبھارا۔ چنانچہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔

——— ہمایوں کبیر

غبارِ خاطر

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ دونوں کا اندازِ نگارش جدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی۔ اس لیے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں۔ پھر بھی "غبارِ خاطر" میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے۔ اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں کہ مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ مولانا کے خطوط ایک

ہم ہستی کے نام یعنی حضرت نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے۔ مولانا کے بیشتر خطوط جن پر "غبارِ خاطر" مشتمل ہے قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا فرق ہے۔ یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر رہا ہے۔

—— گوپی ناتھ امن

انڈیا وِنس فریڈم

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس کتاب میں جتنی باتیں لکھی ہیں ان میں سے بیشتر پہلے بھی کچھ لوگوں نے کہی تھیں، لیکن ان کی کوئی اہمیت نہ تھی اور مستقبل کا مورخ غالباً اُن کو نظر انداز کرتا۔ لیکن مولانا مرحوم نے چوں کہ یہ باتیں قلم بند کی ہیں اور اُن کے بیانات ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سے تیس چالیس سال بعد جب سرکاری ریکارڈ ریسرچ کے لیے کھولے جائیں گے تو مولانا کی یہ کتاب محققین کو تحقیق کی نئی راہیں دکھلائے گی اور یہی اُن کی کتاب کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

—— عتیق صدیقی

ترجمانُ القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسنِ انشاء و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں، یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی و ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اسی بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین نے جو مختلف اقوال نقل کیے ہیں اُن سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارباب علم ان سے استفادہ کر لیں تو کر لیں لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اُن سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل

غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مـ
معیّن کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلـ
کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہو
کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش
کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق
دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصو
یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت
جاتی ہے۔ اِس سے مُراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتا
ساتھ ساتھ جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے
عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مـ
ہوتی رہی۔ قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثر
نمایاں ہوتے رہے۔ چناں چہ امام فخر الدین راز
مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق
وحکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن
ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثا
کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر "جواہر القرآن"
نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذ
ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی
سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو
ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو
نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقہ استدلال وجد
ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کـ
اور اسی وجدانیت کے ذریعے ہدایت اور را
کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے دُنیا
آتے رہے اور جس کے لیے خود قرآن کا نزو
اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک
تو اس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ
نہیں جانے دیتے جو قرآن کے اسلوب بیا
نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب

کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے سائنٹفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چناں چہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آرا کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثارِ قدیمہ، انکشافاتِ جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفے کے طلبا اور علما کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفہ و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

—— سعید احمد اکبرآبادی

سوانح عمری کا مقالہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب بہ مشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیلِ استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آ گیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظرِ ثانی نہ کر سکے، حوالوں کی جانچ نہ کر سکے۔ اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ گئی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا، "لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیٔ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمد ہی ہے جس نے 'تذکرہ' کو اشخاص کا ایسا مؤثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُرجوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اسی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزادؔ کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لیے متبحر علم و فضل اور الفاظ پر پُرزور اقتدار اور غیر معمولی قدرت سے طرزِ بیان

سے کار فرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے [illegible]
واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ [illegible]
جا سکتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالا ارادہ [illegible]
اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ مؤثر [illegible]
ہے۔ اُن کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو [illegible]
انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آو[illegible]
ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہو سک[illegible]
تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتدا[illegible]
جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے [illegible]
اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان [illegible]
آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی سوا[illegible]
عمری لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہٗ سمج[illegible]
ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شرو[illegible]
نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا اندازِ فکر وا[illegible]
ہوگا بلکہ ان کا زورِ بیان، روانی، ان کی اشارہ[illegible]
ان کی اُردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوند[illegible]
بھی۔ وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ و[illegible]
روحانی قوت ہے اور اس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس [illegible]
دُنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفی[illegible]
مزاج کی تخلیق ہے اور اسی کیفیتِ مزاج کے اث[illegible]
میں پڑھا جانا چاہیے۔

—— پروفیسر محمد مجیب

تذکرہ

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت

ابوالکلام آزاد

○

ابھی انگریز کو حاصل تھی گاندھی جی کی ہمدردی
وطن میں گونجتا تھا جب ترا نعرہ بغاوت کا
ابھی تھی منزلوں پیچھے سیاست اُس مجاہد کی
جسے ہونا تھا اِک دن ہمنوا تیری سیاست کا

○

رہیں یک جان و دو قالب کی صورت ہندو و مُسلم
نصیحت جو صدی کی ابتدا میں تو نے فرمائی
اسے سمجھے ہوں یا سمجھے نہ ہوں اہلِ وطن لیکن
حقیقت تھی کہ ہر پھر کر ہمیشہ سامنے آئی

○

اگر تیری نصیحت پر عمل کرتے وطن والے
تو یہ ہندوستاں، تیرا وطن، کچھ اور ہی ہوتا
اگر تیری نوا کچھ اس چمن پر کارگر ہوتی
تو مجھ کو ہے یقیں رنگِ چمن کچھ اور ہی ہوتا

○

ترے افکار کی تعریف ہم کرتے رہے لیکن
حقیقت ہے کہ تیرے درد کو ہم نے نہ پہچانا
جو تیری رُوح میں آباد تھی اِک کرب کی دُنیا
اُسے ہم نے نہ کچھ دیکھا، نہ کچھ سمجھا، نہ کچھ جانا

○

ترا پیغامِ دِل لے کر ترا پیغامِ جاں
لسان الصدق آیا، الہلال و البلاغ
تجلّی سے مگر آنکھیں رکھیں کچھ بند ہی ہ
اگرچہ نور برساتے کئی روشن چراغ

○

تری ہستی عبارت تھی روایت سے، درای
نگاہوں میں تری دیر و زبھی تھا اور فر
ترا اِک ہاتھ مستقبل پہ تھا اِک ہاتھ ما
کہ آئینہ تھا تجھ پر دورِ تازہ بھی، گذشت

○

وہ پہلی جنگ کے دوران میں زورِ ق
کہ جس سے لرزہ بر اندام تھا ایوان
وہ تحریریں تری تھیں یا صداقت کی تھیں
نہ ٹھہری رو برو جن کے فرنگی فِتنہ

○

ادھر ڈالا تجھے زنداں میں افرنگی سیاست
ادھر تیرے قلم کی نوک پر وہ تذکر
جیسے اِس دَور میں تحریر کا اِک معجزہ
ادب نے بھی، سیاست نے بھی جس سے مرتب

جگن ناتھ آزاد
اے۔ ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی
(جموں و کشمیر) ۱۸۰۰۰۴

○

خلافت کا زمانہ ہے مری چشمِ تصور میں
وہ گاندھی جی کا رستہ اور تیری حوصلہ مندی
مجھے اقبال کا آج ایک مصرع یاد آتا ہے
"کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی"

○

تجھے زنداں میں جتنی بار بھی افرنگ نے ڈالا
تو اُتنی بار نکلا کامراں اِس آزمائش سے
تو سونا تھا کہ اس کو ڈالتے ہیں جب کٹھالی میں
تو کندن بن کے ہی باہر نکلتا ہے وہ آتش سے

○

تجھے مذہب میں دیکھیں ہم کہ دُنیائے سیاست میں
ہر اک ماحول میں ہے جلوہ فرما تیری تابانی
ادھر ہیں معرکوں سے کچھ فزوں قربانیاں تیری
ادھر اک معجزے سے کم نہیں تفسیرِ قرآنی

○

قیامت کے فسادوں میں گھرا جب شہرِ کلکتہ
تُو اپنی جاں ہتھیلی پر لیے میداں میں آیا
بچایا ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کو بھی تو نے
خدا کی رحمتوں کا تیری تربت پر رہے سایا

○

ہر اک سو جنگ کے بادل گرجتے تھے، برستے تھے
ملی تجھ کو صدارت کانگرس کی اُس زمانے میں
ترے اُس دور کے زرّیں کاموں کا بیاں کیا ہو
متاعِ بے بہا ہیں وہ سیاست کے خزانے میں

○

ہُوا یہ ملک جب آزاد، تیری ہی فراست نے
جو تھے گتھی سے باہر عقدۂ دُشوار، سُلجھائے
ترا ہندوستاں احساں بُھلا سکتا نہیں تیرے
تری قربانیوں سے جس نے اونچے مرتبے پائے

○

جمال الدّین کی خاکِ پاک پر رحمت کا مینہ برسے
کہ جس کے خانداں پر علم بھی نازاں فقیری بھی
لٹائی جس نے دولت بے نیازی کی، تصوّف کی
جھکی جس کے قدم پر بادشاہی بھی، امیری بھی

○

اِسی معدن نے تجھ سا قیمتی گوہر ہمیں بخشا
اِسی کے فیض سے تجھ سی ملی ایمان کی دولت
اسی نے ہم کو آزادی کی نعمت سے کیا واقف
اِسی سے پائی اہلِ شوق نے عرفان کی دولت

○

وہ خیرالدّین جس کو چشمۂ صدق وصفا کہیے
وہ جس پر علم بھی، تحریر بھی، تقریر بھی نازاں
وہ جس کے حسنِ معنی آفرینی کی تجلّی پر
ضیائے ماہ بھی، خورشید کی تنویر بھی نازاں

○

اسی نے ہم کو بخشا ہے گلِ خوش رنگ تجھ ایسا
چمک اُٹھا ہے جس کے دم سے سارا بوستاں اپنا
اسی نے ہی دیا ہے پیکرِ علم و عمل تجھ سا
کہ جس کی ذات پر نازاں ہے کُل ہندوستاں اپنا

○

نذرِ عقیدت

وائے بر حالِ سیہ بختیِ بھارت اے قوم تجھ سے وہ مردِ مجاہد ہوا رخصت اے قوم
تھی زمانے کو ابھی جس کی ضرورت اے قوم

وہ مفکر، وہ مدبر، وہ امام الاحرار وہ وسیع النظر و ارفع و اعلیٰ کردار
عمل و عزم میں جس کے تھا ہمالہ کا وقار

عالمِ دیں بھی تھا، دانائے سیاست بھی تھا قلزمِ دانش و اخلاص و صداقت بھی تھا
مادرِ ہند کی آنکھوں کی بصارت بھی تھا

جو سمجھتا تھا زمانے کی سیاست کا مزاج جس نے دشمن سے بھی حاصل کیا تحسین کا خراج
جس کا ہر نقشِ قدم، شمعِ ہدایت ہے آج

جس نے اک جام کے طالب کو بھرا خم بخشا جس نے ہر قطرۂ ادراک کو قلزم بخشا
جس نے سوئی ہوئی موجوں کو تلاطم بخشا

حیف وہ رندِ خراباتِ تدبر نہ رہا حیف وہ گوہرِ دریائے تبحر نہ رہا
جس نے بخشا نئے بھارت کا تصور نہ رہا

اُٹھ گیا بزم سے وہ ساقیِ میخانہ بدوش جس کی ہر جنبشِ لب روح کا پیغامِ سروش
جس کے جذبات میں طوفاں کے عزائم کا خروش

نبضِ تہذیب کی رفتار کا محرم نہ رہا ماضی و حال کی قدروں کا وہ سنگم نہ رہا
دلِ ستاروں کے بجھے، نیّرِ اعظم نہ رہا

وہ تو باقی نہ رہا، اس کی مگر یاد رہے ہر قدم پیشِ نظر اُسوۂ آزاد رہے
میکدہ اس کی روایات کا آباد رہے

[یہ نظم مولانا ابوالکلام آزاد کے سانحۂ وفات سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اور پٹنہ ریڈیو سے ۲۷، فروری ۱۹۵۸ء کو نشر کی گئی]

رضا نقوی واہی

۵/۱۴، گردنی باغ، پٹنہ (بہار)

امیرِ کارواں

وہ دن اب یاد آتے ہیں وطن تھا جب غلام اپنا
کہ جب آزاد قوموں میں نہ تھا کوئی مقام اپنا

تھے دل سینوں میں لیکن ہر لگن سوئی ہوئی سی تھی
چمن تو تھا مگر رُوحِ چمن سوئی ہوئی سی تھی

گلستانِ وطن میں بس خزاں کے ہیرے پھیرے تھے
غلامی ہی غلامی تھی اندھیرے ہی اندھیرے تھے

یہ عالم تھا کہ اِک دیوانۂ آزادیِ کامل
جسے آزاد کہتے ہیں بڑھا وہ جانبِ منزل

جو تھے غفلت میں غرق اُن کو صدا دیتا ہوا اٹھا
کہ وہ غیرت کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوا اٹھا

جو تھے جذبات پژمردہ جوانی بخش دی اُن کو
جو تھے ٹھہرے ہوئے دھارے روانی بخش دی اُن کو

خطیب ایسا کہ اندازِ خطابت رشک کرتا تھا
جو سُن لیتا تھا اُس کو دم ہمیشہ اُس کا بھرتا تھا

مسائل کچھ بھی ہوں لیکن زباں جب کھولتا تھا وہ
تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ گوہر رولتا تھا وہ

مُدبّر وہ کہ دُنیا میں ہر اک سو دھوم تھی اُس کی
مُفکّر وہ کہ خود فکرِ رسا محکوم تھی اُس کی

قلم اُس نے اُٹھایا جب پئے تشریحِ قرآنی
اُبھر کر آگئے نظروں میں سب انوارِ یزدانی

وطن کے چہرۂ تاباں پہ جب رنگِ جلال آیا
پیامِ انقلاب قوم لے کر "الہلال" آیا

کہا اُس نے وطن والوں سے اب ہشیار ہو جاؤ
نیا سورج اُبھرنے والا ہے بیدار ہو جاؤ

مگر پیغام اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیا اُس نے
برائے اتحادِ باہمی یوں بھی کہا اُس نے

اگر کوئی فرشتہ آسمانوں سے اُتر آئے
قطب مینار سے پھر وہ اگر اعلان فرمائے

کہ آزادی ابھی دے دوں تمھیں ہندوستاں والو
اگر تم اتّحادِ باہمی کو ختم کر ڈالو

تو میں یہ شرط ٹھکرا دوں گا، بربادی نہیں لوں گا
جو کھو کر اتّحاد آئے وہ آزادی نہیں لوں گا

کبھی وہ اس طرح گرجا کہ اے عشرت کے متوالو
خدا کے واسطے اب جاگ اٹھو آنکھوں کو مل ڈالو

سفینے قوم کے نذرِ تلاطم کر دیے تم نے
ورق تاریخ کے آخر کہاں گُم کر دیے تم نے

عرب کے ریگ زاروں سے کبھی ایران سے آئے
تمھارے قافلے اس ملک میں کس شان سے آئے

لبوں پر آدمیّت کے ترانے لے کر آئے تھے
وہ اپنے ساتھ اخوّت کے خزانے لے کر آئے تھے

وہ جب ظلمت کدوں کے نام پیغامِ عمل لائے
اُجالے اس طرح اُمڈے کہ جیسے دن نکل آئے

اسی بھارت کی دھرتی پر اسی دہلی کی منزل پر
وضو کرنے رُکے تھے وہ اسی جمنا کے ساحل پر

اسی جمنا کو لیکن چھوڑ کر تم بھاگے جاتے ہو
خود اپنی عظمتوں کو اپنے ہاتھوں سے مٹاتے ہو

تمھیں تو تھے جو طوفانوں کے رُخ کو موڑ دیتے تھے
تمھارے واسطے رستہ سمندر چھوڑ دیتے تھے

وطن آواز دیتا ہے وطن کی شان بن جاؤ
اٹھو اٹھ کر نئی تاریخ کا عنوان بن جاؤ

یہ دُنیا جب بھی چھڑ جائے گا اُس کا ذکر روئے گی
ہزاروں سال اُسے تاریخِ علم و فکر روئے گی

جواہر لال کے لفظوں میں بحرِ بے کراں ہے وہ
جو بھارت کا رواں ہے تو امیرِ کارواں ہے وہ

راہی شہابی

ایف-۹۲۵، گاندھی نگر، جے پور ۳۰۲۰۱۵ (راجستھان)

نذرِ عقیدت

فضائے ہند پہ جب اِک خزاں مسلّط تھی
نویدِ عشرتِ فصلِ بہار دی تُو نے
تھی تیرے سینے میں بہبودیِ چمن کی لگن
اِک اِک شگوفے کی قسمت سنوار دی تُو نے

جو راہ منزلِ وہم و گماں کو جاتی تھی
بنا دیا اُسی جادے کو مُعتبر تُو نے
پِرو کے ایک ہی دھاگے میں رنگ رنگ کے پھول
کیا نِفاق کے جذبے کو بے اثر تُو نے

تری زبان کا جادو "غبارِ خاطر" ہے
ترے قلم کا ہے اعجاز "الہلال" ترا
موثّر ایسا تھا تیرا طریقۂ اظہار
کوئی جواب نہیں تھا تری خطابت کا

گناہ ٹھہرا تھا جس وقت ذکرِ آزادی
کہی بہ بانگِ دہل تو نے انقلاب کی بات
بڑھائی ملک میں یوں تو نے اتحاد کی لَو
کہ جس کے خوف سے تھرّا اٹھی غلامی کی رات

مہدی پرتاپ گڑھی

معرفت ایگزیکٹو انجینئر 'اری گیشن ڈویژن' پرتاپ گڑھ (یوپی)

آئینہ ذات و صفات
مولانا کی منتخب تحریریں